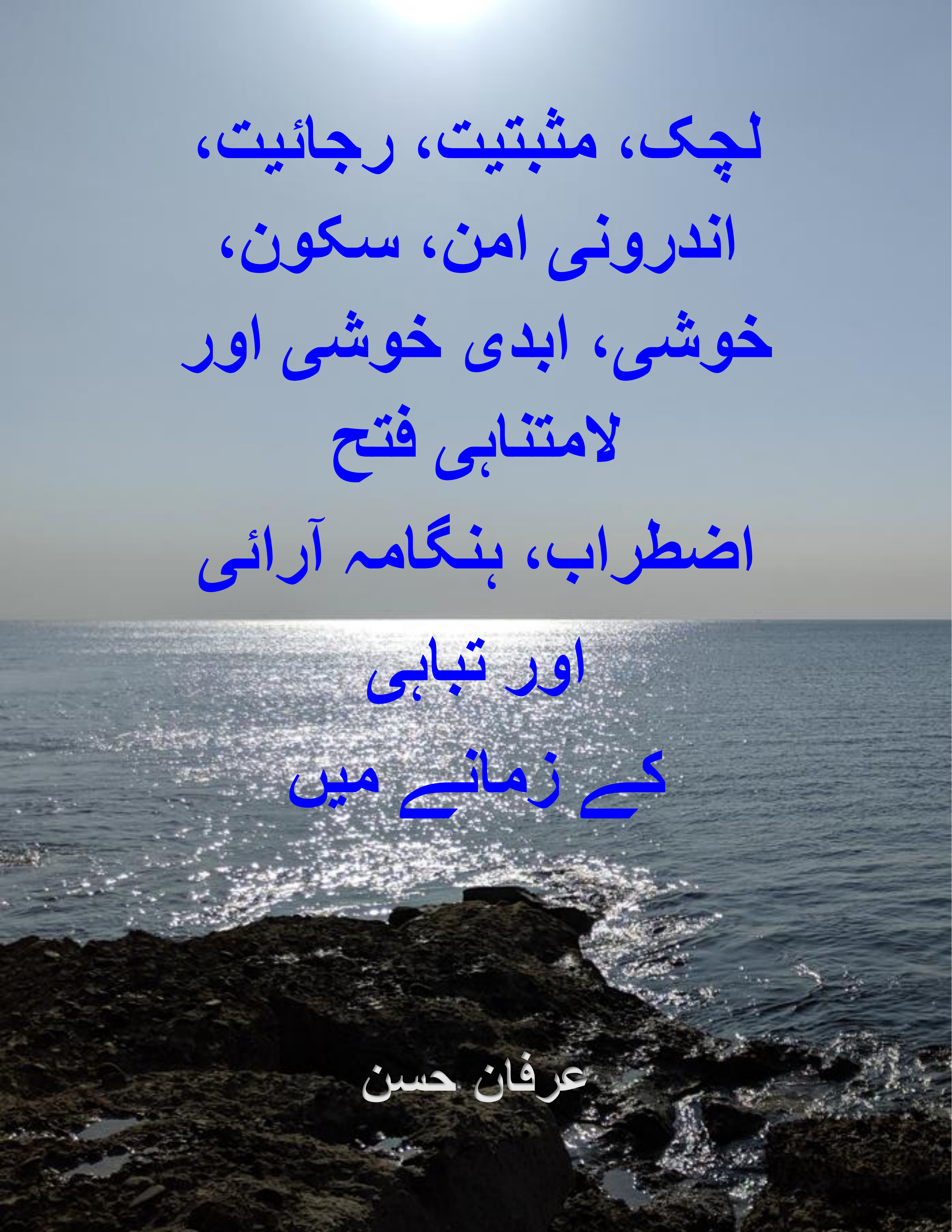


لچک، مثبتیت، رجائیت، اندرونی امن، سکون، خوشی، ابدی خوشی اور لامتناہی فتح اضطراب، ہنگامہ آرائی اور تباہی کے زمانے میں

عرفان حسن

لچک ، مثبتیت ، امید پرستی ، اندرونی امن ، سکون ، خوشی ، ابدی خوشی اور
لامتناہی فتح
اضطراب ، ہنگامہ آرائی
اور تباہی
کے زمانے میں

پوری انسانی تہذیب کے سب سے بڑے مفکرین اور حیات کرنے والوں میں سے ایک امام ابو حامد محمد الغزالی (1058-1111ء) کی لازوال تصانیف سے مرتب ، ترجمہ اور تشریح کی گئی ہے۔

ریاستہائے متحدہ کی لائبریری آف کانگریس رجسٹریشن نمبر: TXu 2-273-620

آئی ایس بی این: 9798543692042

یہ تصنیف امام ابو حامد محمد غزالی (1058-1111ء) کی لازوال تصانیف اور کسی حد تک مولانا جلال الدین رومی (1207-1273ء) کی تصانیف سے تالیف، اختصار، ترجمہ اور تشریح ہے۔ کتابیات میں مکمل ماخذ حوالہ جات فراہم کیے گئے ہیں۔ مصنف نے اہم نکات اور اصطلاحات کو واضح کرنے کے لئے مربع قوسین اور قوسین کے اندر فراہم کردہ تمام وضاحتیں شامل کی ہیں۔ تمام عربی الفاظ اور اصطلاحات کو انگریزی میں ترجمہ کیا گیا ہے ، ترچھی اور ترجمہ کیا گیا ہے۔

قُل لَّوۡ كَانَ ٱلۡبَحۡرُ مِدَادٗا لِّكَلِمَٰتِ رَبِّي لَنَفِدَ ٱلۡبَحۡرُ

قَبۡلَ أَن تَنفَدَ كَلِمَٰتُ رَبِّي وَلَوۡ جِئۡنَا بِمِثۡلِهِۦ مَدَدٗا

"آپ کہہ دیجئے کہ اگر میرے رب کی باتیں
لکھنے کے لیے سمندر سیاہی بن جائے تو میرے
رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے ہی سمندر ختم
ہو جائے گا، اگرچہ ہم بھی اس کے ساتھ مل کر
لے آئیں۔"

(باطنی روحانی علم و تجربے کے بے پناہ سمندر کی وسعت پر قرآن۔ باب 18، آیت 109)

مشمولات

اخذ کرنا

انسانیت آج خود کو اپنی روزمرہ کی زندگی میں اپنے مختلف مثبت اثرات اور مظاہر کے ساتھ اندرونی اور بیرونی امن کی تلاش میں پاتی ہے، جبکہ بے پناہ چیلنجوں اور ہنگامہ آرائی کا سامنا کرتے ہوئے بے پناہ چیلنجوں اور ہنگامہ آرائی کا سامنا کر رہی ہے۔ موجودہ دور کے بحرانوں اور چیلنجوں کے خطرناک پانیوں سے گزرنے کے لیے صبر، رہنمائی، سچائی اور حکمت کی ضرورت ہے۔ تاہم ، ایک عام فرد کو درپیش ہر سطح پر بہت سارے چیلنجز اتنے ناکارہ اور کھپت ہیں کہ کوئی فکری ، نفسیاتی اور روحانی وسائل باہر نکلنے کے لئے کوئی راستہ نہیں چھوڑتے ہیں۔ سرنگ کے اختتام پر روشنی کو دیکھنے اور چیزوں کو مثبت طور پر تبدیل کرنے کے لئے رہنمائی ، یا تو بہت سے لوگوں کے لئے دستیاب نہیں ہے یا بڑے پیمانے پر الجھن ، ہسٹیریا ، منفی ، اور غلط معلومات سے مبہم ہے جو اس "انفارمیشن ایج" نے متضاد طور پر لایا ہے۔ انفارمیشن ایج کو روشن خیالی کے دور کا آغاز کرنا تھا نہ کہ اس کے برعکس جو آج رائج ہے۔

جب ہم حالات اور معاملات کو اس وقت دیکھتے ہیں تو ہم یا تو اپنے آپ کو پریشانی کے دور میں رہتے ہوئے پاتے ہیں، یہاں تک کہ معاشی اور تکنیکی ترقی کے ذریعہ پروان چڑھانے والی مادی خوشحالی کے ساتھ، یا جاری سیاسی اور سماجی تنازعات، جنگوں کی وجہ سے معاشرتی انتشار کا شکار ہونے کی صورت میں انتشار کے دور میں رہتے ہیں۔ بھوک ، بیماری ، ناانصافی ، غربت اور معاشی مشکلات ، یا ہنگامہ آرائی کی حالت میں رہنا - اضطراب اور افراتفری کی حالتوں کے درمیان ایک ایسی حالت جہاں ہمارے پاس سب کے لئے محدود معاشی مواقع ہیں جو معاشرتی انتشار کی کم سطح کے ساتھ منسلک ہیں ، لیکن اس کے باوجود بڑے پیمانے پر ہنگامہ آرائی اور تنازعات کے بغیر۔ اس سے قطع نظر کہ ہم کس حالت میں ہیں، ہماری سماجی، اقتصادی، سیاسی، جغرافیائی اور ثقافتی صورتحال اور سیاق و سباق کی موجودہ حالت پر منحصر ہے، ہم اپنے آپ کو توازن کی حالت کی تلاش میں پاتے ہیں جہاں ہم مثبت، رجائیت، اندرونی امن، سکون، خوشی اور کامیابی کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ اضطراب ، ہنگامہ آرائی ، یا ہنگامہ آرائی پر قابو پانے کے لئے اس مثبت داخلی حالت کو حاصل کرنے کے لئے حقیقی عوامل پر گہری نظر ڈالنے کی ضرورت ہے جو ان منفی اور ناپسندیدہ حالتوں پر قابو پانے کا باعث بنتے ہیں۔

اس مقالے کا مقصد خیالات، احساسات، الفاظ، اعمال اور وجود میں لچک، امید پرستی اور مثبتیت کی شکل میں منفی، مایوسی، افسردگی اور مایوسی کے متبادل کی وضاحت کرنا ہے۔ رویوں میں اس تبدیلی کا نتیجہ - اندرونی اور بیرونی دونوں طرح - کے نتیجے میں اندرونی سکون ، سکون ، خوشی ، اور زندگی اور اس کے چیلنجوں کے بارے میں ایک لازوال نقطہ نظر پیدا ہوتا ہے ، جو ابدی

خوشی اور لامتناہی فتح کو جنم دیتا ہے جو اسی دنیاوی وجود سے شروع ہوتا ہے لیکن پھر وقت اور جگہ کی رکاوٹوں کو عبور کرتے ہوئے ابدیت کی زندگی میں انسان کو امر بناتا ہے۔

خیالات، احساسات، قول و فعل میں منفی حرکتیں دشمنیوں، تنازعات، بے مقصد تباہیوں، جنگوں، پریشانیوں، افسردگی اور اندرونی روحانی اور جسمانی بیماریوں کا باعث بنتی ہیں جبکہ مثبت داخلی حالتیں، خیالات، احساسات، الفاظ اور اعمال اندرونی سکون اور سکون کا باعث بنتے ہیں، جس کے نتیجے میں سب کے لیے زندگی، آزادی، خوشحالی، صحت اور خوشی کو فروغ ملتا ہے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب ہم اپنی روحوں کی گہرائی میں سرایت شدہ مثبت توانائیوں کے ذخائر میں ٹیپ کرتے ہیں اور انہیں پہلے اپنے فائدے کے لئے مثبت چینلز میں منتقل کرتے ہیں ، پھر سب کے فائدے کے لئے اور ہر چیز کے لئے جس پر ہم اثر انداز ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ یہ خود بااختیار بنانا انفرادی اور اجتماعی اندرونی امن، خوشحالی اور ان سب کے لیے خوشی کے فروغ کے لیے بہت ضروری ہے جس کے نتیجے میں ابدی خوشی کا باعث بنتی ہے۔ یہ وہ کیمیا ہے جو کسی کے باطن کے خام مال کو بے پناہ قیمت، چمک اور ذہانت کے انمول جواہر میں تبدیل کر دیتی ہے۔ تو پھر اس واحد زندگی میں حقیقی انسانی صلاحیت اور قدر سے کم کسی چیز پر کیوں طے کیا جائے جو کسی کے پاس ہے جو اسے انجام دینے کے لئے ہے؟ ایسا کرنے میں ناکامی کے نتیجے میں کسی کو کھوئے ہوئے موقع اور غیر مادی صلاحیت کے لئے ابدی پچھتاوا اور مایوسی پیدا ہوتی ہے۔

اس مقالے کا آغاز خود آگاہی اور روحانی روشنی کے راستے کی وضاحت سے ہوتا ہے، اس کے بعد اندرونی تباہ کن خصوصیات کی وضاحت ہوتی ہے جو خود آگاہی اور روحانی روشنی میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ اس کے بعد ان عوامل کی وضاحت کی جاتی ہے جو ہماری روحوں کی گہرائیوں میں سرایت کر گئی مثبت توانائی کے ذخائر کو کھولنے کا باعث بنتے ہیں، جو ہر فرد کو انسانی کامیابی کی بلندی پر لے جاتے ہیں۔ یہ کتاب سب کو دعوت دیتی ہے کہ وہ "برا" یا منفی ہونے پر نظر ثانی کریں اور اس کے بجائے "اچھا" یا مثبت ہونے کی کوشش کریں اور خود ہی ایسا کرنے کے نقصانات اور فوائد دیکھیں۔ یہ سب کو منفی، حقیر، گھٹیا اور برائی سے پرہیز کرنے کی دعوت دیتا ہے جو اس شخص کے ارد گرد محسوس ہونے والے اثرات کے ساتھ اندرونی خزانوں کی بے دریغ تباہی اور اپنی فلاح و بہبود سے غافل ہونے کے مترادف ہے اور اس کے بجائے مثبت، خوشگوار، پرامید اور اچھا ہونا اور ان دونوں کے درمیان فرق کو دیکھنا، اور انسانی کامیابی کی چوٹی تک پہنچنا سیکھنا۔ یہ مقالہ کمال ، روشن خیالی ، ابدی خوشی اور لامتناہی کامیابی کا راستہ کھولنے میں مدد کرتا ہے ، جس سے ہر اس چیز کو روکتا ہے جو اس نتیجے میں رکاوٹ بنتا ہے۔ ہر انسان اس زندگی کی بہترین پیش کش کا مستحق ہے اور یہ مقالہ پہلے اس راستے کی وضاحت کرکے اسے ممکن بنانے میں مدد کرتا ہے ، پھر کسی کو اپنی زندگی کی ذمہ داری سنبھال کر اور اسے بہتر بنانے کے لئے موڑ کر کام اور موقع پر اٹھنے کا چیلنج دیتا ہے۔

بے چینی اور انتشار کے اس دور کی برائیوں کا علاج پیش کرنے کے لیے ہم روحانیت، خود آگاہی، داخلی اصلاح اور داخلی تبدیلی کے بہترین علمبرداروں میں سے ایک کی حکمت اور لازوال خزانوں سے استفادہ کریں گے جس کے اثرات نہ صرف اسلامی تہذیب بلکہ پوری انسانی تہذیب کی ظاہری تجدید کے لیے اثرات مرتب ہوں گے، امام ابو حامد محمد الغزالی (1058-1111ء) غزالی کے نام سے مشہور ہیں - جس کی انہوں نے آخری وقت تک انسانیت کے فائدے کے لیے وضاحت کی۔ غزالی کی شاندار بصیرت اور حکمت سے کارفرما یہ بیان انسان کی باطنی حقیقت اور زندگی کے حقیقی مقصد کی وضاحت سے شروع ہوتا ہے اور یہ کہ کس طرح وہ ابدی خوشی اور لامتناہی کامیابی سے جڑے ہوئے ہیں - ایک ایسا مقصد جس کی ہر انسان کو گہرائی میں خواہش اور قدر ہے۔ ایک بار جب اس علم اور بصیرت سے لیس ہو جاتا ہے، تو یہ اندرونی تخریبی خصوصیات کی وضاحت کرتا ہے جن کو ختم کرنا چاہیے، اس کے بعد اندرونی خوبیوں اور اعلیٰ خصوصیات کی وضاحت کی جاتی ہے جو اسے اپنے اندر کی گہرائی میں پیدا کرنا چاہیے، تاکہ جدید دور کے چیلنجوں سے مؤثر طریقے سے نمٹا جا سکے جو پریشانیوں، ہنگامہ آرائی اور ہنگامہ آرائی سے ماخوذ ہیں، جس کے نتیجے میں ابدی خوشی اور لامتناہی فتح حاصل ہوتی ہے اور اس عمل میں اپنی دنیاوی زندگی کو لچک کے ساتھ نشان زد کیا جاتا ہے۔ مثبتیت ، امید پرستی ، اندرونی امن ، سکون ، سچی خوشی اور لازوال کامیابی۔

یہ کتاب بے سہارا لوگوں کے لیے ایک مدد، ان پریشان لوگوں کے لیے ایک مدد، جن کی حالت ناقابل برداشت ہے، مایوسی، افسردگی، غم، مایوسی اور اندرونی خلا کی شکل میں اندرونی مصائب میں ڈوبے ہوئے لوگوں کے لیے ایک راحت کا کام کرے گی، اندھیروں میں گھرے ہوئے لوگوں کے لیے ایک روشنی، اپنی زندگی کی سچائی، مقصد اور معنی کی تلاش کرنے والوں کے لیے ایک رہنما۔ اور ان لوگوں کے لئے ایک راستہ جو بہتر بننا چاہتے ہیں اور اپنے لئے ، اپنے خاندانوں ، اپنی برادریوں ، اپنی قوموں اور دنیا کے لئے چیزوں کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔

غزالی کی حکمت کے لازوال خزانوں اور پوری انسانیت کے لیے ابدی سچائیوں پر مبنی یہ مقالہ ہمیں اپنی روحوں کو ان کے تمام منفی رجحانات سے چھٹکارا دلا کر اور انہیں مثبت توانائیوں سے بھر کر ہمیں امن، ابدی خوشی اور لامتناہی کامیابی کی راہ دکھاتا ہے۔ اس عمل میں ، کوئی شخص اپنی زندگی کے حقیقی معنی اور مقصد کو دریافت کرتا ہے۔ اپنی زندگی کے حقیقی مقصد کو دریافت کرنا اور اس مقصد کے اثرات پر کام کرنا، کسی کے ذہن، دل اور روح کو دنیاوی زندگی کی مشکلات اور مصائب سے ایک روحانی دائرے میں لے جاتا ہے جو انسان کو ابدی خوشی اور تمام مشکلات پر لامتناہی فتح سے بھر دیتا ہے۔ کوئی بھی معاشرہ انسان کے اندر اور باہر تباہی مچانے والے تاریک ترین محرکات سے محفوظ نہیں ہے اور اکثر ، مذہب کو الہی روشنی کے بجائے ان تاریک محرکات

کو ٹیپ کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ آج ہم دنیا میں جس امن کے خواہاں ہیں، وہ ہمارے اپنے دلوں سے شروع ہوتا ہے۔ غزالی کا "*احیاء العلوم الدین*" یا "خدا کی راہ کے علم کا احیاء"، جو اس مقالے میں بڑے پیمانے پر استعمال کیا گیا ہے، ایک زبردست کام ہے، شاید پوری انسانی تہذیب کا سب سے اہم کام ہے، کیونکہ یہ انسان کے پوشیدہ تاریک محرکات کو ظاہر کرتا ہے اور ان تاریک جذبات کو تسکین دینے کے لیے مذہب کے استعمال کو چیلنج کرتا ہے اور اس کے بجائے، خدا کی روشنی کو مذہب اور انسان کے دل میں لاتا ہے جو اندرونی اور آفاقی امن کی نوید دیتا ہے۔

ہر انسان کے لئے یہ انتہائی ضروری ہے کہ وہ اپنی داخلی حقیقت اور زندگی کے مقصد کو سمجھے جس کے لئے وہ یہاں ہے۔ تب ہی ہم اپنے ارد گرد ہونے والے تمام حالات اور واقعات کو صحیح تناظر میں رکھنے کے قابل ہوجاتے ہیں - چاہے وہ اچھے ہوں یا برے ، خوشگوار ہوں یا ناخوشگوار ، انتظام کرنا آسان یا مشکل - صحیح تناظر میں ، چیزوں کی حقیقت کو سمجھنا ، پھر اپنی زندگیوں کو بہتر بنانے کے لئے تدارک کے اقدامات اٹھاتے ہیں ، قطع نظر اس سے قطع نظر کہ ہم اپنے آپ کو کس بھی صورتحال میں پاتے ہیں۔ یہ لچک ، اندرونی امن ، سکون اور خوشی کو فروغ دیتا ہے جو ہم سب اپنے دلوں کی گہرائیوں میں چاہتے ہیں۔ خود آگاہی اور باطنی روشنی کے لیے اس کوشش کا صلہ، اس کے بعد ذاتی طور پر نقصان دہ باطنی برائیوں کو ترک کرنا، اور ذاتی طور پر فائدہ مند باطنی صفات کو ابدی خوشی اور لامتناہی فتح سے کم نہیں ہے، جو اس دنیاوی زندگی سے شروع ہوتا ہے، محنت کو زندگی کی ابدی زندگی میں امر کرتا ہے۔ یہ وہ نقطہ نظر ہے جو اس کتاب کے پہلے تین حصوں میں استعمال کیا گیا ہے جس میں پہلا حصہ انسان کی حقیقت اور زندگی کے حقیقی مقصد کو جاننے سے متعلق ہے، دوسرا حصہ باطنی تخریبی خصوصیات اور تاریک باطنی محرکات کو سمجھنے اور ان کے خاتمے کے طریقوں سے متعلق ہے، اور تیسرا حصہ انتہائی قدیم مثبت اعلیٰ باطنی صفات سے متعلق ہے جو اچھائی کے سوا کچھ نہیں دیتے اور ان سب کو نکالنے کے طریقوں کی وضاحت کرتا ہے اندر اندھیرا۔ ان تحریروں میں سرایت کرنے والی حکمت کی روشنی اندھیری، منفیات، نقصان دہ محرکات، اندر کی گہرائی میں مایوسی کو دور کرے گی اور اس کے بجائے ہماری زندگیوں کو بہتر بنانے یا ہماری بکھری ہوئی زندگیوں کی تعمیر نو کی خواہش کے ساتھ ان کی جگہ لے لے گی، جس سے لچک، مثبتیت، رجائیت، اندرونی امن، سکون، خوشی، ابدی خوشی اور لامتناہی کامیابی پیدا ہوگی۔ اس کے نتیجے میں ، روح کی گہرائی سے نکلنے والی روشنی ، اس مقصد کے لئے ہر چیز کو گھیر لے گی۔ جیسے جیسے یہ روشنی اپنی شدت میں بڑھتی ہے اور پھیلتی ہے ، اتنا ہی ارد گرد تاریکی ختم ہوتی جاتی ہے ، ہمارے اندرونی وجود ، برادریوں ، قوموں اور دنیا کو روشن کرتی ہے ، اور سب کے لئے پراسرار اور قابل ذکر طریقوں سے چیزوں کو تبدیل کرتی ہے۔ یہ مثالی لگ سکتا ہے ، لیکن یہ کتاب ممکن کے فن کو ظاہر کرتی ہے۔ اس عمل میں ، یہ انسانیت کے سب سے بڑے سنتوں اور اساتذہ میں سے ایک کی حکمت کے لازوال خزانوں کے ذریعے ناممکن کو ممکن بنانے کے راستے کو روشن کرتا ہے۔

حکمت اور رہنمائی کی الہی روشنی آپ کے جہاز کی کشتی کا ملاح ہو، جو اس عارضی اور عارضی دنیاوی وجود کے طوفانی پانیوں کے سمندر میں ایک ساحل کے امن اور سلامتی کی تلاش میں ابدی خوشی اور ابدی فتح کے لافانی وجود میں تبدیل ہو۔

مقدمہ

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

اللہ کے نام سے جو نہایت رحم والا مہربان ہے

ہم اس مقالے کا آغاز انسان کے حقیقی مقصد اور قدر کو سمجھنے سے کرتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے ، چیزوں کو صحیح تناظر میں رکھنے کے لئے درکار بصیرت کے ساتھ مسلح کیا جاتا ہے ، اس کے نتیجے میں اندر کی تمام منفی باتوں کو ختم کرنے اور اندرونی خلا کو مثبت رویہ اور اندرونی مزاج کے ساتھ پر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے ، تاکہ کسی کی زندگی کو بہتر بنایا جاسکے۔ یہ تبدیلی انسان کے دل اور روح سے شروع ہوتی ہے اور جیسے جیسے یہ اندرونی روشنی مضبوط ہوتی ہے، یہ باہر نکل جاتی ہے اور پوری برادریوں، قوموں اور اس کے نتیجے میں دنیا کو بدل دیتی ہے۔ لہٰذا ، کسی کے وجود کی حقیقت اور کسی کی زندگی کے مقصد کو جاننا ضروری ہے اور یہ کس طرح ابدی خوشی اور لامتناہی فتح سے جڑتا ہے۔ اس کے بعد ہمیں ان عوامل کو جاننے کی ضرورت ہے جو ہمیں اس پسندیدہ مقصد سے روکتے ہیں اور وہ عوامل جو اس کے حصول میں سہولت فراہم کرتے ہیں۔ یہ ہمیں ان رکاوٹوں کے بارے میں انمول بصیرت فراہم کرتا ہے جن سے بچنے کی ضرورت ہے اور اعلیٰ اندرونی خصوصیات جو ہماری موجودہ اضطراب، ہنگامہ آرائی یا ہنگامہ آرائی کی موجودہ حالت سے قطع نظر لچک، مثبتیت، امید، اندرونی امن، سکون، ابدی خوشی اور لامتناہی فتح کی ناقابل تسخیر حالت تک ہمارے سفر کو مکمل کرنے کے لیے پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

حصہ 1: اپنی اندرونی حقیقت کو جاننا آج انسانیت کو درپیش بحرانوں ، تنازعات اور چیلنجوں کو حل کرنے کی راہ ہموار کرتا ہے

غزالی نے فارسی زبان میں لکھی گئی *اپنی کتاب "* کیمیا سعادت" یا "کیمیا یا تبدیلی کا تبدیلی کا ایجنٹ" میں ابدی خوشی اور زندگی کی حقیقت اور مقصد کی وضاحت اس طرح کی ہے:

آسمان کے ستاروں، بارش کے قطرے، درختوں کے پتے، صحراؤں کے ریت کے ذرات اور آسمانوں و زمین کے ایٹموں کے برابر بے شمار اور لامحدود شکر و ثناء صرف اللہ تعالیٰ کی ہیں جس کی فطری صفت اس کی وحدانیت ہے اور عظمت، عظمت، بلندی اور فضیلت اس کی مخصوص خصوصیات اور اعلیٰ صفات ہیں۔ کوئی بھی انسان عزت مآب کے کمال سے واقف نہیں ہے۔ اس کی معرفت کی حقیقت میں اس کے سوا کسی کے پاس راستہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کی معرفت کی حقیقت کو حاصل کرنے میں ناکامی کا اعتراف کرنا اس کے قریبی اور دوستوں کی معرفت کا عروج ہے اور اس کی حمد و ثنا میں نااہلی کا اعتراف کرنا فرشتوں اور انبیاء کی طرف سے الٰہی تسبیح کا عروج ہے۔ عزت مآب کی پہلی کرن پر حیران ہونا ذہین لوگوں کی عقل کا انتہا ہے۔ اس کی خوبصورتی کی قربت کی تلاش میں حیرت زدہ ہونا ، راہگیروں اور صوفیانہ راستے کے روحانی مسافروں کا عروج ہے۔ اس کی بنیاد گنوسس کی امید کو چھوڑنا اور اپنی بنیادی نفس کی خواہشات کو چھوڑنا ہے۔ اس کی گنوسس کے معاملے میں کمال کا دعویٰ کرنا مماثلت اور مماثلت کے بارے میں سوچنا ہے۔ اس کے وجود کی خوبصورتی کو دیکھنے میں سب کی آنکھوں کا حصہ ہے۔ اس کے حیرت انگیز کاموں اور تخلیقات کو دیکھ کر، ضروری گنوسس وہ پھل ہے جو تمام عقلوں کو حاصل ہوتا ہے۔ کوئی بھی شخص ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ وہ اپنے وجود کی عظمت پر غور کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ کوئی دل ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ وہ ایک لمحے کے لیے بھی اس کے عجیب و غریب کاموں سے غافل نہ رہے، کہ ان کی حقیقت کیا ہے اور وہ کس کی طاقت کا مظہر ہیں۔ یہ اس لیے ہے کہ کوئی یہ جان سکے کہ سب یقینی طور پر اس کی قدرت کی نشانیاں ہیں، اور اس کی عظمت کی روشنی ہیں۔ تمام عجائبات اور عجائبات جو وہاں موجود ہیں، اس کی حکمت سے نکلتے ہیں، اور خوبصورتی کے تمام عکس صرف اس کی تخلیق ہیں۔ جو کچھ بھی ہے وہ اسی کی طرف سے ہے اور اسی کی وجہ سے ہے۔ بلکہ جو کچھ ہے وہ وہی ہے۔ جیسا کہ حقیقت میں اس کے سوا کوئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ سب کا وجود اس کے وجود کے نور کا عکس ہے۔

اے پیارے محبوب! اچھی طرح جان لیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو کھیل، باطل اور فضول کاموں کے لیے پیدا نہیں کیا۔ بلکہ اس کی ذمہ داری اور اس میں موجود خطرات دونوں بہت زیادہ ہیں، گویا وہ ابدی نہیں ہے بلکہ یقینا وہ ہمیشہ زندہ رہنا ہے۔ یعنی ، اگر کوئی ہمیشہ سے نہیں ہے (یا ازل سے زندہ ہے) ، تو وہ ہمیشہ کے لئے ہوگا۔ اگرچہ کسی کا جسم مٹی سے بنا ہوا ڈھانچہ ہونے کی وجہ سے معمولی ہے، لیکن اس کی روح کی حقیقت خدائی ہونے کی وجہ سے زبردست اور دلکش ہے۔ اگرچہ اس کی ابتدا جانوروں، درندوں، شیطانوں اور ان کی نجاستوں کی صفات میں ملی ہوئی ہے، لیکن جب اسے مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ اپنی نجاستوں سے پاک ہو جاتا ہے اور الٰہی قربت کی صلاحیت حاصل کر لیتا ہے۔ یہ اس کا کام ہے کہ وہ سب سے کم میں سے بدترین اور سب سے زیادہ میں سے بہترین ہو۔ اس کا سب سے کم عروج یہ ہے کہ جانوروں ، درندوں اور شیطانوں کی سطح پر گرنے سے ، یہ غصے اور خواہش کے جال میں الجھ جاتا ہے۔ اس کی معراج یہ ہے کہ وہ (روح) فرشتوں کے درجے تک پہنچ جاتی ہے اور خواہش اور غصے کی الجھنوں کو دور کرتی ہے اور ان کی جگہ انہیں اپنا قیدی بناتی ہے اور ان کا مالک اور بادشاہ بن جاتی ہے۔ جب بادشاہت کا یہ درجہ حاصل کیا جاتا ہے تو وہ عبادت الٰہی اور غلامی کا لائق بن جاتا ہے۔ عبادت

کرنے کی یہ صلاحیت فرشتوں کی صفت ہے اور انسان کے درجے کا کمال ہے۔ جب کسی کو حسن الٰہی کی محبت کا ذائقہ ملتا ہے تو وہ ایک لمحہ بھی الٰہی کی نظر سے محروم ہو کر نہیں گزر سکتا۔ لامتناہی خوبصورتی اور فضل کا نظارہ کسی کی جنت بن جاتا ہے۔ آنکھوں، معدے اور نفسانی لذتوں کی جنت کسی کے لیے بے معنی اور بیکار ہو جاتی ہے۔ چونکہ انسان کی پیدائش کے آغاز میں انسان کی بنیاد نامکمل اور غیر اہم ہوتی ہے، اس لیے کمال حاصل کرنا مشکل اور علاج کے بغیر ممکن نہیں ہے، جیسا کہ کیمیا جو پیتل اور تانبے کو پاک کرتی ہے اور اسے سونے میں تبدیل کرتی ہے، انتہائی مشکل ہے۔ ہر کوئی اس کی شناخت نہیں کر سکتا۔ اسی طرح یہ کیمیا جو انسان کی بنیاد کو حیوانی اور حیوانی عادات کی نجاستوں سے پاک کرتی ہے اور اس میں فرشتہ [روحانی] تطہیر لاتا ہے جس کی وجہ سے اسے ابدی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اس کیمیا کو حاصل کرنا بہت مشکل ہے [جو تبدیلی کا تبدیلی کا ایجنٹ ہے] اور ہر شخص اسے نہیں جانتا۔ اس مقالے کو لکھنے کا مقصد اس کیمیا کے عناصر کو بیان کرنا ہے جو درحقیقت ابدی خوشی کی کیمیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اس کتاب کو "*کیمیا سعادت*" یا "کیمیا یا تبدیلی کا ایجنٹ" کا نام دیا ہے۔ "کیمیا" کا نام اس کتاب کے لیے بہت موزوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تانبے اور سونے میں زرد پن اور وزن کے سوا کوئی فرق نہیں ہے اور اس کیمیا سے اس دنیا میں امیر ہونے کے سوا کوئی مقصد نہیں ہے۔ دنیا کی زندگی چند دن طویل ہے۔ دنیاوی دولت اپنے آپ میں کچھ بھی نہیں ہے۔ مویشیوں کی عادات اور فرشتوں کی صفات میں فرق کی دنیا ہے۔ اس کیمیا کا پھل ابدی خوشی [اور ابدی کامیابی] ہے۔ اس کی مدت کی کوئی انتہا نہیں ہے [کیونکہ یہ ابدی ہے اور ہمیشہ کے لئے رہے گا اور انسان کو امر کرے گا]۔ اس کی نعمتوں کی اقسام کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ کوئی بھی نجاست اس کی پاکیزگی اور لطافت میں داخل نہیں ہو سکتی۔ یہ کتاب حقیقت میں کیمیا ہے۔ اس کے علاوہ (یعنی اس کتاب "*کیمیا سعادت*" یا "کیمیا یا تبدیلی کا تبدیلی کا ایجنٹ" میں پیش کی گئی تعلیمات اور وضاحتیں) کسی اور چیز کو کیمیا کے نام سے منسوب کرنا تمثیلی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

اے پیارے محبوب! آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ چونکہ [تانبے اور دیگر بنیادی عناصر کو سونے میں تبدیل کرنے] کی کیمیا ہر بوڑھی عورت کی جھونپڑی میں نہیں ملتی ہے، بلکہ یہ انتہائی امیر افراد اور بادشاہوں کے خزانوں میں پایا جاتا ہے۔ اسی طرح ابدی خوشی [اور ابدی فتح] کی کیمیا بھی ہر جگہ نہیں ملتی۔ بلکہ یہ خدائی خزانے میں پایا جاتا ہے۔ آسمانوں میں یہ الٰہی خزانہ فرشتوں اور زمین کی مخلوقات ہیں، نبیوں کے پاک دل ہیں۔ جو شخص اس کیمیا کو دربار نبوت کے سوا کہیں بھی تلاش کرے گا وہ گمراہ ہو جائے گا اور بالآخر دھوکہ دیا جائے گا اور دھوکہ دیا جائے گا۔ کسی کو فضول خیالی کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ قیامت کے دن اس کی غربت ظاہر ہو جائے گی اور پوری مخلوق کو اس کے جعلی (جھوٹے) سکوں کا پتہ چل جائے گا اور ہر ایک کی گمراہ عقل عقلمند ہو جائے گی [اور اس حقیقت اور سچائی کا علم ہو جائے گا جس سے وہ ساری زندگی میں غافل تھا]۔ کوئی (خدایہ) اعلان کی پکار سننے کو آئے گا:

لَّقَدْ كُنتَ فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هَٰذَا فَكَشَفْنَا عَنكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ ٱلْيَوْمَ حَدِيدٌ

"تم یقینا اس سے غافل اور لاعلمی میں تھے۔ ہم نے تم سے پردہ ہٹا دیا ہے پس آج تمہاری بینائی تیز ہے (جیسا کہ اس سے پہلے تم سے پوشیدہ تھا) اب تمہاری روشنی میں ہے۔ (سورۃ البقرۃ باب 50، آیت 22)

رحمان (یعنی اللہ) کی رحمتوں اور برکتوں میں سے ایک بڑی رحمت یہ ہے کہ اس نے دنیا میں ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا تاکہ وہ خدا کی مخلوق (اہل العالم) کو اس کیمیا کی نسخے (اجزاء اور تخلیق) کی

تعلیم دیں۔ اور ان سے کہہ دو کہ وہ دل کا سکہ مصیبت کے اوپر ڈال دیں اور دل کی سختی اور گندگی کا سبب بننے والے برے اخلاق سے دل کی اصلاح کا راستہ سکھائیں اور دل کو اچھے اخلاق اور اعلیٰ صفات سے آراستہ کرنے کا طریقہ سکھائیں اور ان کو تمام لوگوں کو سکھائیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی شان و جلال اور حاکمیت سے اپنے آپ کی حمد و ثنا کی تو اس نے انبیاء (اور خاص طور پر اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بھیجنے کی صفت قرار دیا اور اسے مخلوق پر اپنی نعمت قرار دیتے ہوئے فرمایا:

يُسَبِّحُ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوسِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ﴿١﴾

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿٢﴾

"جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اللہ کی تسبیح کرتا ہے جو بادشاہ پاک ہے غالب حکمت والا ہے۔" وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں ان میں سے ایک رسول بھیجا جو انہیں اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اور اس سے پہلے وہ صریح جہالت میں تھے (سورة البقرة سورة البقرة آیت 1 تا 2)

[عربی] لفظ "*یوزکیہیم*" (جس کا مطلب ہے "ان کے دلوں اور روحوں کی تزکیہ کے ساتھ، ان کی تمام صورتوں اور مظاہر میں، ان کے دلوں اور روحوں کی تطہیر کے ساتھ) انہی قابل مذمت صفات اور صفات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو جانوروں کی صفات ہیں اور جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کو نجات دلاتے ہیں [یا اس عمل کے ذریعے انہیں پاک کرتے ہیں] اس کی اعلیٰ تعلیمات اور روحانی کمال کے ذریعے باطنی تطہیر اور روحانی تبدیلی کا]۔ [عربی] کے الفاظ "*یولی محمم الکتابہ والحکمتہ*" [جس کا مطلب ہے "اور انہیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے" اسی آیت میں اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ ان کو فرشتوں کی صفات کے لباس سے آراستہ کرتا ہے۔ اور یہ اس کیمیا کا مقصد اور مقصد ہے (یعنی مکمل باطنی اور روحانی تبدیلی کا ایجنٹ) کہ انسان کو ان تمام نقصان دہ اور ناپسندیدہ چیزوں (یعنی تمام باطنی نقائص اور روح کے مضر منفی رجحانات) سے پاک اور پاک کیا جائے (جو انسان کی فلاح و بہبود کے لیے نقصان دہ ہیں) اور [باطنی] کمال کی صفات سے آراستہ کیا جائے۔ تمام کیمیا میں سب سے بڑا اور عمدہ کیمیا ہے کہ انسان دنیا (دنیاداری، مادیت، خود غرضی اور تمام قابل مذمت اور پست اور منفی صفات) سے اپنا منہ پھیر لے اور اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ دے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سکھایا گیا ہے۔

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا

"*ود کرسما ربیکا و تبت الیہ طبلہ*"

"اور اپنے رب کا نام یاد کرو اور اپنے آپ کو اس کے لیے پوری طرح وقف کرو۔" (سورة البقرة سورة البقرة آیت 8)

[عربی لفظ] "*تبطیل*" [مندرجہ بالا آیت میں] کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کے سوا سب سے الگ ہونا، اور اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سامنے مکمل طور پر تسلیم کر دینا اور اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے استحقاق کے حوالے کرنا۔ یہ اس کیمیا کی مختصر تفصیل ہے [ابدی خوشی اور کبھی نہ ختم ہونے والی کامیابی]۔ اس کی تفصیلات بہت لمبی اور لامحدود ہیں۔ لیکن اس کا عنوان چار چیزوں کو جاننا ہے، [اور] اس کے بنیادی عناصر چار معاملات کو جاننا ہیں، اور ہر لازمی عنصر کے دس بنیادی اصول ہیں۔

[ابدی خوشی اور لامتناہی کامیابی کے اس کیمیا] کے چار عنوانات یہ ہیں:

(1) اپنے نفس کو جاننا،

(۲) خدا کو جاننا،

(۳) دنیا کی حقیقت کو جاننا، اور

(۴) آخرت کی حقیقت کو جاننا۔

مندرجہ بالا چار باتوں کو جاننا دراصل اسلام کو جاننے کا عنوان ہے (یعنی خدا کی مرضی کے سامنے سرتسلیم خیم)۔ لیکن اسلام کے بنیادی عناصر کے معاملات چار ہیں۔

دو ضروری عناصر کا تعلق بیرونی نفس ("*ظہیر*") سے ہے اور دونوں کا تعلق باطن نفس سے ہے۔

بیرونی نفس سے متعلق دو ضروری عناصر یہ ہیں:

(۱) خدا کے احکام کی اطاعت کرنا۔ ان کو عبادات کہا جاتا ہے۔

(۲) اپنی نقل و حرکت اور معاش کے معاملے میں ان کو مدنظر رکھنا۔ ان کو [معاشرتی] معاملات ("*معملت*") کہا جاتا ہے۔

باطنی نفس ("بیٹن") سے متعلق دو ضروری عناصر یہ ہیں:

(۱) دل کو تمام برے اخلاق جیسے غضب، کنجوسی، تکبر، تکبر، نفس راستبازی وغیرہ سے پاک رکھنا۔ ان اخلاقیات کو ایمان کی راہ میں "*مہلکت*" (روح کی منفی یا باطنی برائیاں یا تخریبی خصوصیات) اور "*عقبات*" (تاریک اور تنگ جگہیں جہاں لوگ ڈاکوؤں کا شکار ہوتے ہیں) کہلاتے ہیں۔

(۲) دل کو صبر، شکرگزاری، محبت، امید، خدا پر توکل وغیرہ جیسے اچھے اخلاق سے آراستہ کرنا۔ ان اخلاقیات کو *"مناجیات"* کہا جاتا ہے (روح کی مثبت خصوصیات یا تمام اعلیٰ باطنی خصوصیات جو اسے نجات، خوشی، حقیقی [ابدی] خوشی اور [ابدی] کامیابی لاتی ہیں)۔

چار ضروری عناصر میں سے پہلا جس میں عبادت کا ذکر ہے وہ دس بنیادوں پر مشتمل ہے۔ وہ یہ ہیں:

(۱) اہل سنت کے *عقائد کے معاملے میں* (یعنی وہ لوگ جو اس مستند روایتی طریقہ کار پر عمل پیرا ہیں جو ہر سطح پر [ظاہری زندگیوں، باطنی ایمان اور روحانیت کے چلنے] کی ایک اٹوٹ زنجیر اور تصدیق شدہ اسکالرشپ پر انحصار کرتا ہے جو پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک اور ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ تک جاتا ہے)۔

(۲) علم حاصل کرنے کے معاملے میں،

(۳) صفائی (یا ظاہری پاکیزگی) کے معاملے میں،

(۴) دعا کے معاملے میں،

(۵) زکوٰۃ (یا واجب الادا صدقہ) کے معاملے میں،

(۶) روزے کے معاملے میں،

(۷) حج کے *معاملے میں (*حج مکہ مکرمہ میں جو زمین پر خدا اور اس کی رحمت کی علامت ہے)

(۸) تلاوت قرآن کریم کے معاملے میں،

(۹) خدا کے ذکر اور دعاؤں اور دعاؤں کے معاملے میں اور

(۱۰) لٹینیوں کا انتظام کرنے کے معاملے میں [اپنی تمام ضروریات کے لیے خدا سے دعا مانگنے کے لیے]۔

[تمام لوگوں کے ساتھ] باہمی معاملات سے متعلق دوسرا لازمی عنصر بھی دس بنیادیں [یا اصول] رکھتا ہے:

(۱) کھانا کھانے کے آداب،

(۲) نکاح کے آداب

(۳) تجارت اور پیشوں کے آداب،

(4) حلال کی تلاش کے آداب [اور ناجائز سے پرہیز کرنا]،

(۵) رفاقت کے آداب،

(۶) تنہائی کے آداب

(۷) سفر و سفر کے آداب،

(۸) تلاوت کے آداب (*"سماع"* یا خدا کی محبت اور حسرت سے متعلق عبادت) اور [اس کے نتیجے میں] وجد،

(۹) نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کے آداب اور

(۱۰) حکمرانوں اور حکمرانوں کے لیے آداب۔

"ملیکت" *(یا روح کی تباہ کن برائیوں سے) سے متعلق تیسرا لازمی عنصر بھی دس بنیادیں [یا اصول] ہیں:*

(۱) نفسی نظم و ضبط کے آداب [اور نچلے نفس کی بنیادی خواہشات پر قابو پانے کے لیے روحانی مشقیں]،

(۲) کھانے پینے اور جسمانی لذتوں میں زیادتی کے علاج کے آداب،

(۳) ضرورت سے زیادہ بات کرنے اور زبان کی برائیوں کے علاج کے آداب،

(۴) غصے اور تکبر اور جھوٹے احترام کے علاج کے آداب،

(۵) دنیا کی محبت کے علاج کے آداب،

(۶) جائیداد اور مال کی محبت کے علاج کے آداب،

(۷) شان و شوکت کے علاج کے آداب (نفس کی تسبیح اور خود کو بڑھانا)،

(۸) دکھاوے اور منافقت کے علاج کے آداب،

(۹) تکبر اور راستبازی کے علاج کے آداب، اور

(۱۰) تکبر اور غفلت کے علاج کے آداب۔

منجیات سے *متعلق چوتھا لازمی عنصر* (یا روح کی اعلیٰ باطنی صفات جو اسے نجات اور سعادت لاتی ہیں) سے متعلق ہے اس کی بھی دس بنیادیں ہیں:

(1) توبہ کرنا اور اللہ سے معافی مانگنا۔

(۲) صبر اور شکر ادا کرنا،

(3) [خدا سے] ڈرو اور [خدا سے] امید رکھو،

(۴) فقر [یا خدا کے سامنے مطلق محتاجی کی حالت] اور تپسیا

(۵) نیت، اخلاص اور سچائی،

(۶) عقیدت اور خود احتسابی،

(۷) [روحانی] غور و فکر (یا "*مرقبہ*" یا اپنے دل پر خدا کی نگاہ پر غور کرنا، خود کی عکاسی اور تنقیدی خود تشخیص)،

(8) خدا کی وحدانیت اور خدا پر توکل کرنا،

(۹) خدا سے محبت اور

(۱۰) موت اور اس کی یاد (یا چیزوں کو صحیح تناظر میں رکھنے کے لیے اپنی ناگزیر موت اور اپنے دنیاوی وجود کے خاتمے پر غور کرنا)۔

یہ کتاب "کیمیا سعادت" یا "کیمیا یا تبدیلی کا تبدیلی کا ایجنٹ" کتاب کے *بنیادی اصولوں کی فہرست ہے*۔ ہم ان چار عنوانات اور چالیس اصولوں کو واضح طور پر بیان کریں گے اور اپنے قلم کو مشکل جملوں اور پیچیدگیوں میں الجھنے سے روکیں گے تاکہ یہ کتاب آسانی سے قابل فہم ہو جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو کوئی بھی شخص تحقیق کرنا چاہتا ہے یا پیچیدگیوں کی گہرائی میں جانا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ ہماری عربی کتابوں جیسے *"احیاء العلوم الدین*" یا "علم التاحیات الٰہی"، "*جواہر القرآن*" یا "جواہرات قرآن" یا اس نظم و ضبط پر دیگر تالیفات کا مطالعہ کرے۔ اس کتاب کا مقصد عام لوگوں کو [ابدی خوشی اور ابدی فتح کی اس کیمیا] کی وضاحت کرنا ہے۔

غزالی اس کیمیا کے چار عنوانات (یا تقاضوں) اور چالیس اصولوں کی حیرت انگیز وضاحت پیش کرتی ہے یا ابدی خوشی اور لامتناہی فتح کے تبدیلی کے ایجنٹ کو پیش کرتی ہے۔ غزالی نے اپنی چار جلدوں پر مشتمل حکمت کے مجموعے *"احیاء العلوم الدین*" یا "خدا کی راہ کی احیاء" میں انہی چالیس اصولوں کی تفصیلی وضاحت کی ہے۔ غزالی نے اپنی کتاب "کیمیا سعادت" یا "کیمیا یا تبدیلی کا تبدیلی ایجنٹ" کے اوپر تعارف کے بعد کیمیا کے چار تقاضوں کی تفصیلات فراہم کی ہیں۔ غزالی نے ابدی نعمت اور لامتناہی کامیابی کے حصول کے لیے پہلے عنوان یا ضرورت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

اپنے آپ کو جاننا

پیارے محبوب! ہوشیار رہیں کہ اپنے نفس کو جاننا خدا کے ادراک کی کلید ہے۔ اس لیے اس نے یہ طے کیا ہے کہ:

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ

"جس نے اپنے نفس کو پہچانا، اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔"

سَنُرِيهِمْ ءَايَٰتِنَا فِى ٱلْءَافَاقِ وَفِىٓ أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ ٱلْحَقُّ

"ہم انہیں اپنی نشانیاں دکھائیں گے دور کائنات میں اور ان کی جانوں میں، یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ یہ حق ہے۔" (سورۃ البقرۃ باب 41، آیت 53)

پیارے محبوب! اس ساری دنیا میں آپ کے اپنے نفس سے زیادہ کوئی چیز آپ کے قریب نہیں ہے۔ لہٰذا اگر آپ اپنے وجود یعنی اپنے بارے میں جاننے کی کوشش نہیں کریں گے تو آپ اور کس چیز کو بیکار تلاش کرنے کی کوشش کریں گے؟ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ 'ہم اپنے آپ کو شمار کرتے ہیں اور پہچانتے ہیں' تو یقینا آپ غلطی پر ہیں، کیونکہ اس طرح کا علم کسی کام کا نہیں ہو سکتا۔ یہ کسی بھی حالت میں گنوسس (*"معارفہ"*) کی کلید نہیں ہو سکتی، جو خداوند اعظم اور کائنات کے مالک (یعنی خدا) کے علم کی انسانی کوشش کی کوشش کر سکتی ہے۔ کیونکہ اس طرح جانور بھی اپنے بارے میں جانتے ہیں۔ وہ بھی اپنے جسم کے ایسے اعضاء کو پہچان سکتے ہیں جیسے ان کا سر، ان کا منہ، ان کے ہاتھ، ان کے پاؤں اور ان کا گوشت وغیرہ، جب کہ آپ اپنے دوسرے نفس کو اس حد تک جانتے ہیں کہ جب آپ بھوک لگے تو کھانا کھاتے ہیں، کسی ایسے شخص سے لڑتے ہیں جس سے آپ ناراض ہوتے ہیں اور جب جسمانی خواہشات کی خواہش آپ پر غالب آجاتی ہے، آپ شادی میں داخل ہوجاتے ہیں۔ لہذا، آپ اور ان جانوروں میں کیا فرق ہے؟ درحقیقت، آپ کو جو جاننا چاہیے وہ یہ ہے کہ آپ کیا ہیں، آپ کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جائیں گے؟ تم یہاں آنے کی کیا وجہ ہے؟ تمہیں خداوند نے کس مقصد کے لیے پیدا کیا تھا؟ مختصر یہ کہ آپ کے لیے کیا اچھا ہے اور آپ کے لیے کیا برا ہے؟

یہاں تک کہ پرندے اور درندے بھی شیطان کی کچھ خصوصیات کے علاوہ آپ کی خصوصیات سے مالا مال ہیں۔ پھر بھی ، آپ کے کردار کی ایسی خصوصیات ہیں جن میں آپ اور فرشتے برابر ہیں۔ پھر آپ کی عارضی اور مستقل خصوصیات کیا ہیں؟ آپ کی ابتدا کیا ہے، جوہر کیا ہے؟ لہذا، جب تک آپ اپنے بارے میں ان اہم 'بنیادوں' پر گرفت نہیں کرتے، آپ برکت کا درجہ حاصل نہیں کر پائیں گے۔

ان میں سے ہر ایک کی اپنی الگ 'خوراک' ہوتی ہے جو اس کی پرورش کرتی ہے، برقرار رکھتی ہے اور اس کی نشوونما کو فروغ دیتی ہے، جس کے نتیجے میں نیکی اور قابل تعریف رویے کو فروغ ملتا ہے۔ جانوروں کی بہتری ، جیسا کہ کوئی مشاہدہ کرے گا ، کھانے ، پینے اور صحت مند اور مضبوط ہونے میں مضمر ہے۔ لہٰذا اگر آپ بھی جانور ہیں تو آپ کو دن رات ان کی چالوں پر چلنا چاہیے، پیٹ بھر کر اپنی نفسانی خواہشات پوری کرنی چاہیے۔

حملہ اور قتل جنگل کے جانوروں کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ یہ فطری طور پر ان کے لئے ایسا کرنے کے لئے مناسب ہے ، جبکہ برائی ، اس کے اثرات ، بد اعمال ، اور غداری شیطان کی نشانیاں اور علامتیں ہیں۔ لہذا ، اگر آپ کو لگتا ہے کہ آپ بھی ان شیطانوں میں سے ایک ہیں تو ، آپ کو ان کے نقش قدم پر چل کر اپنے دل کو خوش کرنا چاہئے۔ دوسری طرف جانوروں اور درندوں کے برعکس خدا کی شان و شوکت کی تلاش فرشتوں کی روحوں کی خوراک ہے۔ اور اگر آپ فرشتوں میں سے ہیں تو ، آپ کو ، ان کی طرح ، خدا کے جلال کو دیکھنے کی کوشش کرنی چاہئے ، تاکہ آپ اپنے ساتھی انسانوں پر غیر اخلاقی جنسی لذتوں اور تکبر کے غصے سے آزاد ہوجائیں۔

پھر روح کو اپنے اندر جکڑو، اپنے اندر سچائی کی تلاش کرنے کے لیے۔ ایسا اس لگن کے ساتھ کریں تاکہ آپ کو احساس ہو جائے کہ خدا نے آپ کے درمیان ، جانوروں ، شکاری پرندوں اور درندوں کے درمیان جو یکساں خصوصیات پیدا کی ہیں وہ عام بھلائی کے لئے ہیں ، اس لئے نہیں کہ آپ بھی وحشی اور ظالم بن جائیں۔ جانوروں، پرندوں اور درندوں کو آپ کی خدمت کے لیے بنایا گیا ہے۔

خدا کے بارے میں بصیرت رکھنے والے اور جاننے والوں نے اس مرتبہ کو 'خدا کی راہ میں اور خدا کے سامنے ہونے'*کا نام دیا ہے*۔ لوگ (یعنی عام لوگ) اسے جنت کہتے ہیں۔ چنانچہ یہ آپ کا فرض ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ میں جو عظیم اور نیک باطنی فضیلت پیدا کی گئی ہے اس سے پوری طرح آگاہ ہو جائیں تاکہ آپ اس کی معرفت حاصل کر سکیں۔ یقینا وہ بدقسمت شخص ہوتا ہے جو دین کی قدر جاننے کے باوجود اس سے دور رہتا ہے۔

پیارے محبوب! اگر آپ خلوص دل سے اپنے باطن میں بصیرت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو جان لیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دو چیزوں سے پیدا کیا ہے، یعنی بیرونی ساخت، جسم جو آنکھ سے نظر آتا ہے اور باطن جسے *نفس* کہتے ہیں، قلب یا روح کہتے ہیں۔ تاہم ، انہیں '*باطن*' (باطنی) کی آنکھوں سے دیکھا جاسکتا ہے ، یعنی ، دوسرے مرئی ، غیر واضح نفس کے ذریعے۔ یہی سچائی اصل چیز ہے، ناقابل تسخیر بنیاد، وجود کا بنیادی مفہوم ہے۔ باقی تمام چیزیں اس کے تابع ہیں (یعنی دل کے تابع)۔ لہٰذا جب ہم اپنے دل کی بات کرتے ہیں تو ، ہمارا مطلب واقعی سچ ہے۔ بعض اوقات اسے روح (روح) کہا جاتا ہے۔ بعض اوقات اسے نفس کہا جاتا ہے۔ *قلب* سے مراد انسان کے جسم کے بائیں جانب موجود گوشت کا گٹھا نہیں ہے جو جانوروں اور مردوں کے پاس بھی موجود ہے۔ یہ *قلب* یعنی دل بنی نوع انسان کے لیے حقیقی ناقابل تردید حقیقت ہے۔ یہ وہ منفرد، حقیقی اور بنیادی سچائی ہے جو اگرچہ ظاہر ہے، لیکن انسانی آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ اس کا تعلق اس دائرے سے ہے جسے '*شہادت*' کہا جاتا ہے۔ یہ ایک بلند ڈومین ہے۔ اس سے نیکی اپنی تمام شان و شوکت کے ساتھ نکلتی ہے!

گوشت کا یہ گانٹھ، دل، جسم کا نائٹ سوار ہے۔ باقی جسم اس کے دستے ہیں یا اس کے احکامات کے تابع ہیں۔ دل بادشاہ اور اس فورس کا کمانڈر ہے۔ اس کا بنیادی فریضہ "*معارفہ*" یا خدا کی معرفت کا حصول، اس کی اعلیٰ نعمتوں کا ادراک اور حصول ہے جو اس کی طرف سے انسان کے دل میں عطا کی گئی فطری خصوصیات کی وجہ سے ہے۔ یہ اس کی محبت میں دھڑکتا ہے۔ ہر وقت یہ آواز اٹھاتا ہے، اس کی حمد پڑھتا ہے، کہ صرف وہی عبادت کے لائق ہے۔ صرف وہی ہے، جو مسلسل آواز میں ہے، اپنے لوگوں پر رحم کرنے یا سزا دینے کی طاقت رکھتا ہے۔ بدلہ اور جزا صرف اس کا استحقاق ہے، صرف وہی برکت دے سکتا ہے یا روک سکتا ہے۔ چنانچہ خدا کی معرفت یا معرفت کے حصول کے لیے دل و جان سے کوشش کرنا اس مقصد کی کلید ہے۔

اے پیارے محبوب! آپ کو سمجھنا چاہئے کہ آپ کو اس کا اندازہ کرنا چاہئے ، کیونکہ آپ کا نفس ایک انمول جواہر ہے۔ اس میں فرشتہ کی رشتہ داری ہے۔ سب سے اونچا عروج اس کا آسمان ہے۔ یہ خدا کے حتمی مقصد کی راہ پر گامزن ایک نیک مسافر ہے۔ زندگی کے اس مختصر سفر میں ، یہ ہر وقت [اپنی آخری اور حتمی منزل کی طرف] سفر کرتے ہوئے تجارت اور زراعت اور دیگر پیشوں میں رہتا ہے۔

پیارے دوست! سمجھ لیں کہ جب تک آپ اپنے اندر ایک نظر نہیں ڈالیں گے آپ دل کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکیں گے۔ ایک بار جب آپ دل کو سمجھ لیں تو ، اس کے بعد آپ کو اس کی فوج ، یعنی اس کی ناقابل تسخیر طاقت کی تلاش کرنی چاہئے۔ اس کے بعد "*معارفہ*" اور "*سعدہ*" (ابدی خوشی اور ابدی کامیابی) کے درمیان تعلق کو پہچاننے کی کوشش کریں۔ دل کی عظمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، سطحی جسم کے مقابلے میں، جو لکڑی کے فریم کی طرح ہے، محض ایک غیر فعال انفراسٹرکچر۔ یہ کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ مردوں کی طرح ہے۔ "*قلب*" یعنی دل سے ہماری مراد روح کی صداقت ہے۔ روح کے بغیر ، جسم مردہ اور لاشہ ہے۔ اگر کوئی تھوڑی دیر کے لیے آنکھیں بند

کر لے اور اپنے جسمانی وجود کے تمام خیالات کو دور کر دے، جو پہلے پوری طرح نظر آتا ہے اور اپنے نفس، اپنی روح کی تلاش میں مگن ہو جاتا ہے، تو اسے اپنی جستجو مل جائے گی۔ درحقیقت، اصل جستجو دل کی ہے۔ یہ آخرت میں سے ایک کو بھی بتا دے گا اس کے برعکس جو کچھ بھی ہے اسے چھوڑ کر ، ایک ہی وقت میں دل کی بے قاعدگی کا احساس ہوگا۔

'دل' کیا ہے؟ دل کی خصوصیات کیا ہیں؟ الٰہی قانون اس کی علمی بحث کی اجازت نہیں دیتا۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ کرام نے اس مسئلے پر بحث نہیں کی جس پر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مندرجہ ذیل آیات کا اعلان کیا:

وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلرُّوحِ ۖ قُلِ ٱلرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّى

"اور وہ تم سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دو روح میرے رب کا حکم ہے۔ (سورۃ البقرۃ سورۃ البقرۃ القرآن آیت نمبر 85)

أَلَا لَهُ ٱلْخَلْقُ وَٱلْأَمْرُ ۗ

"دیکھو تخلیق اسی کے لیے ہے اور امر اسی کا ہے۔" (سورۃ البقرۃ سورۃ البقرۃ آیت ۵۴)

"خلق" کے *دائرے میں*، تخلیق اور "*عمرو*" کے دائرے میں، آرڈینیشن ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ "*خلق*" (تخلیق)، طول و عرض کی پیمائش کے عناصر، مقدار اور کمیت قریب ہیں۔ لغت میں ، "*خلق*" (یا تخلیق) کا مطلب تخمینے سے مراد ہے۔ لیکن انسانی دل کو اس آزمائش میں نہیں ڈالا جا سکتا، کیونکہ وہ تقسیم کو قبول نہیں کرتا۔ اگر دل تقسیم کیا جاسکتا ہے تو ، بنیاد اچھی ہوسکتی ہے ، جس کے ذریعہ یہ ایک وقت میں کسی مسئلے پر یا تو ایک رشی یا مکمل نوسکھئیے ہوسکتا ہے۔ چنانچہ ایک شخص کا بیک وقت عالم اور *جاہل* ہونا ناقابل تصور ہے۔ اس کے برعکس ، اگرچہ روح ("*روح*") خدا کی طرف سے پیدا کی گئی ہے ، لیکن یہ بھی مکمل طور پر ناقابل تقسیم ہے ، اور نہ ہی اس کا ماس کے کوڈ ، پیمائش ، یا مقدار سے کوئی تعلق ہے۔ "عمرو" (حکم) خدا کی مرضی ہے، ظاہر اور سب سے اہم ہے۔

اس کے علاوہ جو لوگ نفس کو دور اور دور کی چیز سمجھتے ہیں وہ سب غلط ہیں۔ دائرہ ، جو محدود ہے ، کس طرح حد اور اختیار کے تابع نہیں ہوسکتا ہے؟ جب روح واقعی حقیقی اور غالب ہے تو ، جسمانی فریم ، جسم روح پر کیسے غالب آسکتا ہے؟ اس طرح ، روح "*آرڈ*" یا اسپین کیسے ہوسکتی ہے؟

اسی طرح جن لوگوں نے روح کو جسم کہا ہے، وہ خود سے متضاد ہیں اور اس طرح دھوکہ دہی کا شکار ہیں۔ یقینا جسم کو ٹکڑوں میں بکھر سکتا ہے لیکن روح کو نہیں، جو اوپر بیان کردہ ناقابل تقسیم ہے۔ اس مسئلے پر ایک باریک نکتہ اٹھاتے ہوئے ، جانوروں میں روح کو اس کے آخری خدشات میں ختم ہونا چاہئے لیکن حقیقی روح جسے ہم دل

کہتے ہیں ، خدا کی گنوسس کا عظیم مقام ہے (*"معارفہ"*) لیکن جانور اس [دوسری روح] سے محروم ہیں۔ روح نہ تو جسمانی جسم ہے اور نہ ہی اسپین بلکہ ایک خالص فرشتہ جواہر ہے جس کی تشخیص مشکل ہے ، اس کو بڑھانے یا بڑھانے کی اجازت نہیں ہے۔ کوئی بھی شخص اس کے بارے میں صرف مقررہ پیرامیٹرز کے اندر ہی مناسب معلومات حاصل کر سکتا ہے:

وَٱلَّذِينَ جَٰهَدُواْ فِينَا لَنَهۡدِيَنَّهُمۡ سُبُلَنَاۚ

"جو لوگ ہماری راہ میں جہاد کرتے ہیں ہم انہیں ضرور اپنی راہوں کی راہ دکھائیں گے۔" (سورۃ البقرۃ البقرۃ القرآن آیت نمبر 69)

وَمَا يَعۡلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ

"تیرے رب کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔" (سورۃ البقرۃ باب 74، آیت 31)

مذکورہ بالا قرآنی آیات واضح طور پر اس بات کی دلالت کرتی ہیں کہ دل کو آخرت کے لیے خاص طور پر مختص کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی تڑپ اس کا مقصد ہے۔ یہ نعمتیں خدا کی گنوسس پر منحصر ہیں۔ کسی کو کسی کی مصنوعات سے مصنف یا کسی چیز کے پروڈیوسر کے بارے میں اندازہ ہوتا ہے۔ انسان کے سمجھدار حواس انسان کو ان کی قدر کا اندازہ لگانے میں مدد کرتے ہیں۔ دنیا کے عجائبات کے خالق کے عظیم تخلیقات، ہر ایک اپنی خوبصورتی میں بے مثال اور منفرد ہے، تاہم، انسان میں تمیز کی خارجی اور داخلی صلاحیت کی ذہانت کے ذریعے ہی ان کی شاندار دلکشی کے لیے ان کی تعریف اور تعریف کی جا سکتی ہے۔ ادراک اور دخول کی ظاہری صفات اس کے برعکس بنیادی طور پر جسمانی افعال ہیں، لیکن دل کا اصل مقصد *"معارفہ"* یا خدا کی معرفت ہے جو سطحی طور پر حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح جسم کی حسی صلاحیتیں پھندا (یعنی "حیوانی روح") ہیں ، جبکہ جسم پھندا اور سوار (یعنی حقیقی روح یا "انسانی روح") دونوں کا محافظ اور کیریئر ہے۔ چنانچہ متحد کرنے والا فریم (یعنی جسم) دل کے لیے ایک شرط ہے، جو پانی، مٹی اور گرمی سے بنا ہے۔ لہذا، یہ اتنا مضبوط نہیں ہے۔ یہ باطنی (*"بٹن"*) اور بیرونی (*"ظہیر"*) میں مطلوبہ خوراک کی کمی کی وجہ سے موت کے خطرے سے شدید طور پر بے نقاب ہوتا ہے، باطنی اور بیرونی خواہشات کی وجہ سے، درندے جیسے آگ اور پانی جیسے عناصر کی وجہ سے، انسان میں بنیادی ارتقائی اجزاء کے طور پر۔ لہٰذا ، یہ قدرتی طور پر کھانے کے لئے کھانے اور پینے کے لئے پانی کی خواہش کرتا ہے۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس نے ان دونوں قوتوں کی ضرورت محسوس کی ہے کہ وہ ایک طرف جسمانی دشمنوں کا مقابلہ کریں [جو انسانی زندگی اور اس کی فلاح و بہبود کے لیے خطرہ ہیں] اور دوسری طرف لالچ اور غصہ [کیونکہ یہ اور دیگر اندرونی برائیاں روح کی زندگی اور فلاح و بہبود کے لیے خطرہ ہیں]۔ یہ باطنی قوتیں ہیں۔ چنانچہ پہلے روح کا جوہر آتا ہے، پھر اس کی فوجیں اور اس کے بعد باطنی ان شریر قوتوں کے خلاف "جدوجہد" (یعنی خدا کی راہ میں روحانی جدوجہد) آتی ہے۔ لہذا، سب سے پہلے روح کا جوہر آتا ہے [جسے "انسانی روح" بھی کہا جاتا ہے، اس کے برعکس "حیوانی روح" جو صرف انسانی جسمانی اعضاء اور حواس کی زندگی میں حصہ ڈالتی ہے]، پھر اس کی فوجیں یا قوتیں اور اس کے بعد ان شریر اندرونی قوتوں (یعنی برائیوں اور منفی رجحانات) کے خلاف "جدوجہد" یا جدوجہد کرنا۔

چونکہ غیب چیزوں کو دیکھنا اور جسم اور باطن دونوں کے غیر مرئی دشمن کا تعاقب کرنا ممکن نہیں ہے، اس لیے جسم کے ان حسی اعضاء اور اندرونی حساسیت کی ضرورت ضروری ہو گئی۔ [انسانی حواس] دیکھنا ، سونگھنا ، چکھنا ، چھونا اور سننا جسم کے بنیادی حسی اعضاء ہیں۔ ان میں سے ہر ایک ایک واحد فرض ادا کرتا ہے۔ ان میں سے کوئی گمراہ ہو جائے تو دنیا اور آخرت کے معاملات میں رکاوٹ ڈال دے گا باطنی اور بیرونی [انسانی صلاحیتوں] کی یہ قوتیں دل کے کنٹرول میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی اعلیٰ حکمت سے انہیں اپنی اعلیٰ رضا کے مطابق دل کے تابع کر دیا ہے تاکہ وہ انسانی جسم کی دیکھ بھال کر سکیں۔ اس لیے کہ دل کو اس کا اجر مل جائے، اپنا شکار حاصل کیا جائے، برکت حاصل ہو اور اس کے نتیجے میں آخرت کے لیے اپنا سودا پورا کر سکے۔ اچھے لوگوں کی یہ قوتیں، فرشتے کی طرح بہت زیادہ عقیدت کے ساتھ خدمت کرتی ہیں، اور گہری خوشی میں خدا کی اطاعت کرنے میں بہت فخر محسوس کرتی ہیں۔ وہ کبھی بھی اس کی مرضی کے خلاف کام نہیں کرتے۔ دل کے بارے میں تفصیلات بہت لمبی ہیں۔

پیارے محبوب! مثال کے طور پر جسم ایک شہر کی طرح ہے، ہاتھ پاؤں اس شہر کے مزدوروں کی طرح ہیں۔ خواہش اس کا بنیادی محرک ہے (یعنی ، اکسانے والا)۔ غصہ شہر کے پولیس چیف کی طرح ہے۔ دل اس کا بادشاہ ہے اور وجہ اس کا وزیر اعظم ہے۔ بادشاہ کو حکومت چلانے کے لئے ان سب کی ضرورت ہے لیکن ہوس ، جو ایک مضبوط محرک قوت ہے ، بری اور اشتعال انگیز ہے۔ دوسری طرف عقل جو ایک عقلمند وزیر اعظم کی طرح ہے، ہمیشہ اس کی مخالفت کرتی ہے تاکہ حکومت کے فنڈز کا غلط استعمال نہ ہو یا غصب نہ ہو۔ غصہ ، جو پولیس چیف کی طرح ہوتا ہے ، ہمیشہ بے ترتیب ، رجعت پسند اور اپنی حدود سے تجاوز کرتا ہے۔ ان حالات میں بادشاہ جو ان سب سے بالاتر ہے، ہر چیز کا مضبوطی سے جائزہ لیتا ہے، اپنے وزیر اعظم (یعنی عقل) سے مشورہ کرتا ہے اور معاملات کو قابو سے باہر نہیں ہونے دیتا ہے۔ یہ واضح طور پر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ خواہش اور غصہ [حدود کے اندر] اپنے اپنے کردار ادا کرتے ہیں ، اور برائی کو کلی میں ختم کرنا بادشاہ کا بنیادی فرض بن جاتا ہے۔ یہ دل کی حیثیت ہے۔

جسم کی حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کھانا اور پانی فراہم کیا گیا ہے۔ اس طرح وہ جسم کے خادم ہیں۔ جسم بدلے میں حواس کا بوجھ تھامنے اور برداشت کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے، یعنی احساسات کے یہ سمجھدار ایجنٹ، اس لیے وہ جسم کے خادم کے طور پر کام کرتے ہیں۔ یہ حواس یا حسی صلاحیتیں خدا کی حیرت انگیز ، حیرت انگیز تخلیقات کی سمجھ بوجھ اور حقیقی تعریف کے لئے حقائق کو سیکھنے اور جذب کرنے کی وجہ کے نگران ہیں۔ عقل ، اپنی طرف سے ، ان کی مشعل بردار ، چمکتی ہوئی راہ تلاش کرنے والے کے طور پر کام کرنے کے لئے ہے - انسان کو الہی خوبصورتی کی انوکھی شان سے لطف اندوز ہونے کے قابل بنانے کے لئے رہنما - خدا کی خوبصورتی کے برابر ، اس کائنات میں جو کچھ اس نے تیار کیا ہے اور اس کا ڈیزائن کیا ہے۔ لہٰذا اگر یہ (یعنی حسن الٰہی کی گواہی) "قلب کا عد" ہے تو عقل (یا "*عقل*") اس کا بندہ ہے۔ جیسے ہی انسان کا دل اس طرح مسحور ہو جاتا ہے اور اس کے جلال سے مسحور ہو جاتا ہے، وہ خدا کا بابرکت بندہ بن جاتا ہے۔ اس کی تصویر مندرجہ ذیل آیت مقدس میں دی گئی ہے:

وَمَا خَلَقْتُ ٱلْجِنَّ وَٱلْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ

"میں نے *جنوں* اور انسانوں کو صرف میری عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔" (سورة البقرة باب 51، آیت 56)

خدا نے انسان کو دل اور اس کی بادشاہی دی ہے تاکہ وہ اس پر حکمرانی کرے۔ اس نے ایک کو فوج فراہم کی - ایسا کرنے کے لئے طاقت ، سواری کا سامان بھی ، تاکہ کسی کو عظمت کے اعلی دائروں تک پہنچایا جاسکے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص اس اعلیٰ مقام کی عظمت پر قائم رہنا چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے عہد کی پاسداری کرنا چاہتا ہے، ایک عاجز بندے کی طرح اس کی اطاعت کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ دل و جان سے اس کی عبادت کرے اور اس کے لیے مقرر کردہ راستے پر چل پڑے۔ ان حالات میں ، کسی کو اپنے آپ کو بادشاہ کے تخت پر بٹھانا چاہئے اور خدا کی حضوری میں ہونے کو اپنا حتمی مقصد بنانا چاہئے۔ انسان کو اپنے دل کی پیروی کرنی چاہیے، نیک اعمال کرنا چاہیے اور آخرت کو اپنا حقیقی مسکن سمجھنا چاہیے۔ اس طرح، کسی کو اس دنیا کو عارضی سمجھنا چاہیے، زندگی کے سفر کے لیے ایک عارضی گزرگاہ، خدا کے ساتھ آخری ملاقات کے لیے۔ جسم کو سوار پہاڑ، ہاتھ اور پاؤں خادم، وزیر اعظم کی عقل اور دنیاوی امور کی نگرانی کرنے والا سمجھنا چاہیے۔ کسی کو غصے کو سخت جج کے طور پر لینا چاہئے اور اپنے خدا کے تحفے والے پانچ حواس کو اپنے انٹیلی جنس ایجنٹ کے طور پر استعمال کرنا چاہئے۔ اسی طرح کسی کو اس طرح حاصل ہونے والے شواہد کو چھانٹنے اور اپنے راستے میں آنے والے تمام برے نقصانات اور خطرات سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے اپنے دماغ کو استعمال کرنا چاہئے۔ وزیر اعظم، جو عقل ہے، کو بھی اسی طرح اس بات کی نگرانی کرنی چاہیے کہ سب کچھ اس کے دائرہ کار میں ہے اور اس کی طاقت، اس کی فوج اس کے خلاف بغاوت نہ کرے۔ کسی کو ایسا منصوبہ بنانا چاہیے تاکہ کسی کی ذمہ داری امن کی پناہ گاہ رہے۔ یہ اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ کوئی بھی شخص خدا کی طرف سے نعمت اور بھرپور انعامات کا مستحق ہوگا۔ یہاں تک کہ جلد ہی کوئی کامیابی کا تاج پہن لے گا جس کا وعدہ اس نے ایمانداروں سے کیا تھا۔ ورنہ ان لوگوں میں شمار کیا جائے گا جنہوں نے سب کچھ کھو دیا۔ ایسے بدبخت کو سزا دی جائے گی اور اس کا بدلہ لیا جائے گا۔

اس کے نتیجے میں ، کسی کو یہ نتیجہ اخذ کرنا چاہئے کہ ہر شخص کا براہ راست تعلق باطن ، روح کی قوتوں سے ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لئے ، کسی کو خاص خصوصیات اور خصوصیات سے نوازا جاتا ہے۔ بری خوبیاں اور خصوصیات کسی کو برباد کر دیتی ہیں، جبکہ اچھی خوبیاں خوش قسمت کی بلندیوں پر اٹھاتی ہیں۔ اگرچہ کثیر الجہتی ہے ، لیکن ان میں سے چار مزاج (یا اندرونی صفات) کو انسان میں بنیادی زمرے کے طور پر سمجھا جاسکتا ہے:

1) [جنگلی وحشی] درندوں کی خصوصیات،

2) فرشتہ کی خوبیاں ،

(۳) شیطانی برائیاں

4) جانوروں کی خصلتیں۔

مثال کے طور پر، انسانی لالچ انسان کو ناپاک محرکات کا نشانہ بناتا ہے جبکہ عام خواہشیں، جیسے کھانے پینے، اور قدرتی جنسی جبلتوں کی تکمیل کا سہارا لینے کی خواہشیں، جو جانوروں کے پاس بھی ہیں، دونوں کے لیے مشترک رہتی ہیں (یعنی انسانوں اور جانوروں کے درمیان)۔ دوسری طرف ، جسمانی تباہی کے ذریعہ اپنے دشمن پر حملہ کرنے اور اسے الگ کرنے کی انسان کی [وحشی] درندے جیسی خصوصیات ، ایک بے قابو غصے سے پیدا ہوتی ہیں ، جس کے نتیجے میں سنگین جھگڑے ، چھوٹے جھگڑے اور بہتان تراشی اور ان کو گالیاں دینے میں پیدا ہوتی ہیں جن کو کوئی برداشت نہیں کرسکتا۔

اس کے برعکس ، عقل ، انسان میں حکمت انسان کو اچھائی کرنے اور برے کو روکنے کے بنیادی مقصد کے ساتھ سیرافی اعمال کرنے پر آمادہ کرتی ہے ، تاکہ خدا کو خوش کیا جاسکے۔ ایسا شخص لوگوں کی تعلیم (آگاہی اور روشن خیالی) کو فروغ دیتا ہے، بہت سے طریقوں سے ان کی مدد کرتا ہے اور عام طور پر اپنے ساتھی انسانوں کے لیے خدمت کرنے والا فرشتہ ہوتا ہے۔ انسان حق الٰہی کی قدر کرتا ہے اور جہالت اور برے سلوک کو غلط اور ناپسندیدہ سمجھتا ہے۔

اس طرح ، کردار کے ان خاص جھکاؤ کو وسیع پیمانے پر بدمعاش شکاری جیسے رجحانات ، سور جیسے طریقوں ، شیطانی برائیوں اور فرشتہ کی عادات کے ساتھ علامت بنایا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر ، کتا دیکھنے میں بدصورت نہیں ہے ، لیکن عادت کے مطابق بے قابو ہونے کا موزوں ہے۔ اتنا زیادہ کہ بعض اوقات یہ اپنی نوعیت پر شروع کردیتا ہے۔ اسی طرح ، سور مخلوق میں سب سے بدصورت نہیں ہے ، لیکن گندی اور ناپاک چیزوں کے لئے اس کے پوشیدہ جنون کی وجہ سے عام طور پر اس سے نفرت کی جاتی ہے۔ سور کا لفظ ہی ایک سخت لفظ ہے اور ایک ناپسندیدہ لفظ ہے۔ شیطان اور کتا ایک جیسے ہیں۔ انسان میں بھی یہی خصوصیات ہیں۔ "شیطانی صفات" سے یہی مراد ہے۔ اس کے برعکس "فرشتہ کی خصوصیات" ہیں۔ ان اصطلاحات کا مطلب ہے بالترتیب شیطانی ہونا یا فرشتہ کی طرح ہونا۔

یہی وجہ ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہر شخص میں شیطان موجود ہے۔ میں بھی اس سے محفوظ نہیں ہوں لیکن اللہ نے مجھے اس پر غالب کر دیا ہے وہ (یعنی شیطان) [میرے مقابلے] بے بس ہے۔

اسی طرح انسان کے احکامات اور ذمہ داری ہے کہ وہ ہوس اور فحاشی کے سور اور قتل عام اور وحشی غضب کی لعنت پر قابو پانے کی کوشش کرے۔ پس انسان کو چاہیے کہ وہ ہر برے اور برے کا مقابلہ کرے۔ بلاشبہ جو شخص ایسا کرے گا اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے اجزاءات سے نوازا جائے گا جو اس طرح کے شاندار رویے کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح بد اخلاقی کی مکروہ عادتیں انسان کو بدقسمتی اور خدا کی طرف سے عذاب کی طرف لے جائیں گی۔

ایسے شخص کی حالت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کوئی اپنے آپ کو کتے ، سور ، یا شیطان کے سامنے ہاتھ کڑی لگا کر کھڑا پاتا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر کسی مومن کو کسی کافر کے حوالے کر دیا جائے تو اس کے ساتھ جو سلوک کیا جائے گا وہ واضح ہے۔ اور اگر کوئی فرشتہ، لعنتی یا شیطان کے حوالے کر دیا جائے تو اس کی حالت مومن سے بھی بدتر ہو گی۔ کسی کو انتہائی مایوسی اور غم کی بات یہ ہے کہ دنیاوی غضب کی صفت سے انسان اپنے آپ کو ایک خوفناک شکاری یا بھیڑیے کی شکل میں پائے گا اور جو شخص ہوس کا شکار ہو گیا ہے وہ قیامت کے دن اپنے آپ کو سور کی شکل میں دیکھے گا۔ اگر کوئی بھیڑیا خواب میں اسی طرح دیکھتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ شخص ظالم ہے۔ سور کے معاملے میں ، کوئی یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ وہ گندا اور ذلیل ہے۔ کوئی شخص ان سے اور ان کی طرح جتنا دور ہوتا ہے ، اتنا ہی اس کا عمومی رویہ اور باطن اس کے مطابق ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو کس طرح برتاؤ کرتا ہے۔

اب جب ہم باطنی نفس کے نظم دینے والوں کے بارے میں جانتے ہیں تو اپنی نظریں اپنے باطن پر ڈالیں اور خود ہی اندازہ لگانے کی کوشش کریں کہ ان میں سے کس نے آپ کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے اور آپ کہاں ہیں۔ ہوشیار رہیں کہ آپ کے اعمال اور اعمال آپ میں اسی طرح کی کردار کی خصوصیت پیدا کریں گے جو آپ کو بنائے گا یا خراب کرے گا۔ بے شک نیکی کے سوا کچھ نہیں نکلتا اسی طرح اگر تم خواہش کے سور کے فرمانبردار ہو تو تمہارے پاس بے حیائی، بے شرمی، لالچ، خوشامدی، گندگی اور دوسروں کی شرارت پر خوش رہنے کی اسی طرح کی عادات ہوں گی۔ لیکن اگر آپ کو دبانے میں کامیاب ہو جائیں گے اور اس پر غلبہ حاصل کریں گے تو آپ کو قناعت و عنایت، حکمت، تقویٰ اور بے لوثی وغیرہ کی صفات سے نوازا جائے گا۔

اگر آپ کو خوف اور خوف کے شکاری نے گھیر لیا تو آپ میں جو نقصان دہ [باطنی] خصلتیں پیدا ہوں گی، وہ جلد بازی اور نتائج سے بے پرواہ، ناپاکی، شیخی مارنا، تکبر، اپنی غلطیوں کو بے دریغ ظاہر کرنا، دوسروں کو طعنہ دینا اور اذیت دینا، دوسروں کے ساتھ جھگڑا کرنا اور جھگڑا کرنا ہوں گے۔ اس کے باوجود ، اگر آپ تباہی کے اس کتے پر غالب آجائیں گے تو ، آپ کو صبر ، استقامت ، معافی ، استحکام ، بہادری ، سکون اور پاکیزگی (اندرونی پاکیزگی) کی اضافی خصوصیات حاصل ہوں گی۔

اسی طرح اگر تم شیطان کی اطاعت کرو گے جس کا بنیادی کام شیطان اور کی مدد کرنا اور ان کی مدد کرنا، لوگوں کو اس کے مذموم عزائم سے گمراہ کرنا، پریشانی پیدا کرنا، بددیانتی اور ملاوٹ وغیرہ کا سہارا لینا ہے تو تم خود اس سے یہ شیطانی صفات وراثت میں حاصل کرو گے۔ لیکن اگر تم اس کی چالوں میں نہ آ کر اسے شکست دینے میں کامیاب ہو جاؤ اور اپنی عقل و نیکی کی قوتوں کو مضبوط کرتے رہو تو تمہیں حکمت، معرفت، علم، گہری دانش، قابلیت اور ایک خوبصورت باطنی کردار اور ظاہری رویہ ملے گا")۔ یہ عظیم خصلتیں آپ کے مستقل ساتھی اور رہنما ہوں گی۔ وہ آپ کی خوش قسمتی کے بیج ہمیشہ کے لئے آپ کی اچھی یادوں کی حقیقی بنیاد کے ساتھ بوئیں گے۔

اس کے برعکس برے اعمال کو گناہ یا برائیاں کہا جاتا ہے۔ ان کے برعکس ، نیک اعمال کو "*عبادت*" یا خدا کی عبادت کہا جاتا ہے۔ دل ایک چمکدار نظر آنے والے شیشے یا پالش شدہ آئینے کی طرح ہے۔ بری راہیں بادلوں اور تاریکی کی مانند ہیں۔ برا کردار دل کے آئینے کو داغدار اور تاریک کرتا ہے۔ اس طرح کا کردار رکھنے والا شخص کبھی بھی خدا کی حضوری یا خدا کی گواہی کی مہربان نعمتیں حاصل نہیں کر سکتا۔ کسی کو اس کے فضل و کرم کے اعلیٰ نظارے کی برکت سے نوازا نہیں جا سکتا۔ بے شک کردار کی بلند سالمیت روشنی کی مانند ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اتْبِعِ السَّيِّئَةَ الحَسَنَةَ تَمْحُهَا

"برے کے بعد نیکی کرنی چاہیے تاکہ اس کے برے اثرات دور ہو جائیں"۔

یعنی کسی برائی کے فورا بعد نیکی کرنی چاہیے [جو اس بات کا احساس کیے بغیر کیا گیا ہو کہ وہ جہالت، غفلت یا غلط اثر و رسوخ کے تحت کیا کر رہا ہے]۔ وہی برکت والا ہے جو برائی سے پاک ہو کر آئے گا۔ قیامت کے دن انسان کا دل یا تو روشن ہوگا یا سیاہ ہوگا۔ صرف وہی برکت پائے گا جس کا چہرہ چمکتا ہے (دل کی اندرونی خوبصورتی کی نمائندگی کرتا ہے):

إِلَّا مَنْ أَتَى ٱللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ

"مگر وہ جو اللہ کے پاس سالم دل لے کر آئے (سورۃ البقرۃ باب 26، آیت 89)

تخلیق کے آغاز سے ہی انسان کا دل اسٹیل کی طرح پختہ ہوتا ہے جس سے شفاف دل بنا ہوتا ہے۔ کوئی بھی اس میں پوری کائنات کو دیکھ سکتا ہے ، بشرطیکہ اس کی حفاظت کی جائے اور اسے داغدار نہ ہونے دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے:

كَلَّا ۖ بَلْ ۜ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِم مَّا كَانُوا۟ يَكْسِبُونَ

"ہرگز نہیں، جو کچھ انہوں نے کیا ہے اس نے ان کے دلوں پر زنگ آلود کر دیا ہے۔" (سورۃ البقرۃ سورۃ البقرۃ آیت نمبر 14)

پیارے محبوب! آپ کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ انسان میں درندوں، شیطانوں اور جانوروں کی خصوصیات اور خصوصیات بھی موجود ہیں تو پھر فرشتہ جیسی صفات کسی کا اثاثہ کیوں ہیں اور دوسری چیزیں عارضی ہیں؟ یہ کیسے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ انسان کو فرشتوں کا کردار رکھنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور حقیقت میں اس کا دوسری چیزوں سے کوئی تعلق نہیں ہے؟ اس کا جواب اس ناقابل تردید حقیقت میں مضمر ہے کہ انسان کو "*اشرف المخلوقات*" یا خدا کی تمام مخلوقات میں سب سے برتر کے طور پر پیدا کیا گیا ہے۔ اس طرح انسان جانوروں اور درندوں سے افضل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو جو قد عطا کیا ہے وہ اس کے ساتھ اس کی مہربانی کی انتہا ہے۔ مثال کے طور پر ، گھوڑا گدھے سے بہتر ہے کیونکہ گدھا صرف وزن اٹھاتا ہے ، جبکہ گھوڑا جنگ میں بہادری سے دوڑتا ہے ، حالانکہ اس کی اپنی طاقت میں ، گھوڑا بھی گدھے کی طرح وزن اٹھا سکتا ہے۔ لہٰذا، ان کے درمیان واضح فرق ہے۔ اگر گھوڑے میں یہ خصوصیات اور زیادہ خوبصورت برداشت نہ ہوتی تو اس کا قد بھی تمام ارادوں اور مقاصد کے لیے گدھے کے قد تک کم ہوجاتا۔

اسی طرح کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انہیں کھانے پینے اور جسمانی لذتوں کی خواہش پوری کرنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ اس قسم کے لوگ اپنی ساری زندگی اس طرح کے بے سہارا کاموں میں ضائع کر دیتے ہیں۔ دوسرے لوگ بھی ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ صرف اپنے مخالفین اور اپنے ساتھی انسانوں کو نیچا دکھانے، نیچا دکھانے اور ان پر قابو پانے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ فاتح یا مغلوب ، ان پر بالادستی حاصل کرنے کے لئے طاقت کا اطلاق کیا جاتا ہے ، چاہے وہ عرب ہوں ، ترک ہوں یا کرد [یا اس معاملے میں کوئی اور نسل یا نسل]۔ ظاہر ہے ، یہ دونوں نظریات غلط ہیں ، کیونکہ صرف کھانے پینے اور جنسی تعلقات کی مذکورہ بالا زندگی خواہش کے عنصر سے مایوس ہے۔ یہاں تک کہ جانوروں میں بھی ایسی ہی خواہشات ہیں۔ اونٹ اپنی کیفیت کے لئے مشہور ہے کہ وہ بڑی مقدار میں کھانا اور پانی استعمال کرتا ہے ، جبکہ سور میں ضرورت سے زیادہ جسمانی صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ پھر انسان کو ان کے مقابلے میں اعلیٰ مقام کیسے دیا جاتا ہے؟

نیز ، دوسروں پر قابو پانے اور محکوم کرنے کی مہم بڑھتے ہوئے مزاج اور غصے کی وجہ سے ہے۔ یہ قدرتی رجحان ، دلیل دی جاسکتی ہے ، چرنے والے جانوروں اور جنگلوں کی جنگلی مخلوق میں بھی موجود ہے۔ لہٰذا پھر انسان ان سے برتر کیسے ہے؟ [انسانوں اور جانوروں کے درمیان] فرق اور فرق کہاں ہے؟ اس کا جواب خود وضاحتی ہے کہ اس کے باوجود (یعنی کم بنیادی صفات جو انسان جانوروں کے ساتھ بانٹتا ہے) اس کے مقابلے میں انسان کی نجات کی خوبی یہ ہے کہ انسان کو تمام مخلوقات میں عقل سے نوازا جاتا ہے جس سے انسان اپنے آقا اعظم یعنی خدا کو بھی پہچانتا ہے۔ یہ کسی کو رضاکارانہ طور پر اس کے دستکاری ، اس کی تخلیقی ذہانت کی تعریف اور تعریف کرنے کے قابل بناتا ہے۔ اس سے کسی کو اپنے جان لیوا دشمنوں، غضب اور لالچ کو شکست دینے میں بھی مدد ملتی ہے۔ یہ (یعنی غضب ، لالچ اور نچلے نفس کی دیگر بنیادی خصوصیات کی کمی) فرشتوں کی خصوصیات ہیں۔ ان کی خصوصیات ہی پرندوں، درندوں اور جانوروں کی سطح سے اوپر اٹھ جاتی ہیں۔ چنانچہ انسان تمام مخلوقات سے افضل ہے اور ان پر اس کی برتری واضح ہے۔ یہ سب ایک کے اشارے پر ہیں۔ اشرف *المخلوقات (اشرف المخلوقات)* میں سب سے افضل ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَمَا فِي ٱلْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ ۚ

"اور اسی نے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب اسی کی طرف سے تمہارے تابع کر دیا ہے۔"
(سورۃ البقرۃ باب ۴۵، آیت ۱۳)

چنانچہ انسان کی عظمت اس کی سالمیت کی عظمت میں مضمر ہے، جس حد تک وہ طے شدہ خوبیوں میں سبقت لے جاتا ہے، تمام کارناموں میں سب سے بڑی کامیابی "*معارفہ*" یا خدا کی گنوسی ہے۔ باقی خصلتیں اس کے مقابلے میں مدھم پڑ جاتی ہیں، حالانکہ انسان کو اس کی شان و شوکت کے لیے بے شمار عظیم محرک قوتیں (صلاحیتیں) عطا کی گئی ہیں۔ اس طرح ، یہ سوچنے کی غذا ہے کہ جب انسان مر جاتا ہے تو ، [کم بنیاد] خواہش اور غصہ جیسی بری خصوصیات بھی مر جاتی ہیں۔ [موت کے وقت اور اس کے بعد] جو کچھ باقی رہ جاتا ہے وہ اعلیٰ معیار کا ایک 'جواہرات' ہے جو خدا کی "*معرفہ*" یا گنوسیس کے ساتھ سیرافک انداز میں سجایا جاتا ہے۔ یہ کسی کا مستقل ساتھی ہے۔ یہ جواہر فرشتوں کا دوست بھی ہے، جو ہمیشہ عاجزی کے ساتھ اس کے سامنے سجدہ کرتے ہیں، ہر وقت:

فِي مَقْعَدِ صِدْقٍ عِندَ مَلِيكٍ مُّقْتَدِرٍ

"حق کی نشست پر، ایک قادر مطلق بادشاہ کی حضور۔" (سورۃ البقرۃ باب ۵۴، آیت ۵۵)

یا جب انسان مر جاتا ہے تو اس کی باقیات ایک تاریک اور اندھے چیز ہوتی ہیں جو اپنی برائیوں کی وجہ سے تاریک اور داغدار ہوتی ہیں، لیکن غصے اور تکبر کی عدم موجودگی کی وجہ سے اندھے ہو جاتی ہیں جو [دنیاوی زندگی میں] کسی انا کو تسکین اور تسکین دیتی تھیں۔ اس کے نتیجے میں ، اس کے بعد سابقہ خطے سے وراثت میں ملنے والے اس ادنیٰ دائرے میں رہتا ہے:

وَلَوْ تَرَىٰٓ إِذِ ٱلْمُجْرِمُونَ نَاكِسُوا۟ رُءُوسِهِمْ عِندَ رَبِّهِمْ

"تو گناہگاروں کو اپنے رب کے سامنے جھکے ہوئے دیکھے گا (سورۃ البقرۃ 32، آیت 12)

اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان ایسی حالت میں ہوگا جب اس کے نتیجے میں اسے شیطان کے ساتھ "*سجین*" (آخرت کی زندگی کا سب سے نچلے اور سب سے زیادہ تکلیف دہ دائرہ) میں بھیجا جائے گا۔ "سجین" کی اصطلاح کی تشریح سب کو معلوم نہیں ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے:

وَمَآ أَدْرَىٰكَ مَا سِجِّينٌ

"اور تمہیں کیا معلوم ہے کہ *سجین* کیا ہے؟" (سورة البقرة سورة 83، آیت 8)

دل کی دنیا کے عجائبات لامحدود ہیں۔ جسم کے تمام اعضاء کے مقابلے میں دل کے پاس جو بلند مرتبہ ہے، تقویٰ کا حقیقی مقام اس حقیقت کی وجہ سے ہے کہ دل بذات خود نیا ہے، لیکن زیادہ تر لوگ اس سے غافل ہیں۔ دل کی عظمت اور اس کی تقویٰ دو اہم وجوہات ہیں:

1) "" کی وجہ سے*علم*" یا علم، اور

2) کی وجہ سے "*قدرا*" یا طاقت اور صلاحیت۔

علم کی وجہ سے عظمت دو وجوہات کی وجہ سے ہوتی ہے: ایک سب کو معلوم ہے اور خود واضح ہے اور دوسرا پوشیدہ اور لطیف ہے۔ کوئی بھی اس کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔ علم کو اس کی تمام پیچیدگیوں کے ساتھ جذب کرنے کی دل کی صلاحیت اور طاقت اس کے دائرہ کار میں ہے۔ اگرچہ یہ ناقابل تقسیم ہے ، لیکن یہ آسانی سے ہندسوں ، ریاضی ، طب ، علم نجوم ، الہی قانون وغیرہ کو پڑھ اور سمجھ سکتا ہے۔ اس میں تعلیم کی تمام شکلوں کا احاطہ کیا گیا ہے، جو دل میں اس طرح موجود ہے جیسے صحرا میں ریت ہوتی ہے۔ کچھ ہی عرصے میں یہ اپنی مسلسل حرکت اور دانشمندی کی وجہ سے زمین سے آسمان تک اور مشرق سے مغرب تک کا فاصلہ طے کر لیتا ہے۔ اگرچہ یہ زمین پر ہے ، لیکن یہ وسیع افق کے دور دراز علاقوں کی پیمائش کرتا ہے اور کہکشاں کے تمام ستاروں اور مجمع النجوم اور ان کے درمیان فاصلوں سے واقف ہے۔ یہ مچھلی کو ایک ٹیکل کے ذریعے پانی سے نکالتا ہے، پرندوں کو آسمان سے زمین پر گولی مار دیتا ہے، اونٹ، گھوڑے اور ہاتھی جیسے جانوروں کو کسی کے حکم کی تعمیل کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ جسم کے پانچ حسی ادراک اس کا پیشہ ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ سب کسی کے دل کی طرف ہیں۔ وہ روحانی دائرے (روحوں کے دائرے میں) میں تمیز کے دروازے ہیں، دل میں [روحوں کے دائرے کی طرف] ایک دروازہ کھلا ہے۔ دوسری طرف ، زیادہ تر لوگ صرف مادی دنیا (طبعی دائرے) کی پرواہ کرتے ہیں اور ان جسمانی حساسیت کو علم کے حصول کا واحد راستہ سمجھتے ہیں۔

دراصل یہ دونوں دروازے بہت چھوٹے ہیں، اس کے باوجود دل میں بہت سے دروازے ہیں جو کئی طرح کے علم اور تعلیم حاصل کرنے کے لیے کھلے ہیں۔ ان دونوں احاطے میں سے پہلا فرض لیتے ہیں، یعنی جب کوئی سوتا ہے اور خواب دیکھتا ہے تو یہ حسی اعضاء سوتے ہیں لیکن دل کا دروازہ کھل جاتا ہے، جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ روحوں کے دائرے میں اور "*لوح مہفود*" یا "محفوظ شدہ لوحہ" (یعنی خدا کی کتاب کتاب جس میں ماضی کا علم موجود ہے،

حال اور مستقبل)، کوئی شخص اپنی تقدیر کی چیزوں کو دیکھنا شروع کر دیتا ہے (جس کے بارے میں خدا پہلے ہی واقف ہے) یا مستقبل میں کیا ہونے والا ہے اس کا پتہ چلتا ہے۔ بعض اوقات ، کسی کو آنے والی چیزوں کے اشارے ملتے ہیں جن کے لئے تشریح طلب کی جانی چاہئے۔ یہ اس حقیقت کے باوجود ہے کہ ، ایک اصول کے طور پر ، یہ سمجھا جاتا ہے کہ جو شخص جاگتا ہے وہ "*معارفہ*" یا گنوسس کا زیادہ مستحق ہے۔ اس کے باوجود وہ اس بات کو سمجھتے ہیں کہ عام طور پر ان حسی ایجنسیوں کے ذریعے ان کے علم *الغیب* (غیب اور غیب کا دائرہ) کی ان چیزوں کو جاننے کا امکان کم ہے۔

ان خوابوں کے موضوع پر معمولی طور پر غور کرنا ممکن نہیں لیکن یہ کہنا کافی ہے کہ دل ایک صاف ستھرے پالش شدہ آئینے کی مانند ہے اور محفوظ شدہ لوح (*لوح محفوظ)* ایک آئینے کی مانند ہے جس میں مادی وجود کے دائرے میں تمام چیزوں کی تصویریں (*عالم موجودت*) ہم جس دائرے میں ہیں ، اسے دیکھا جاسکتا ہے۔ جب [دل کا] صاف ستھرا پالش شدہ آئینہ ان فیکسمیلوں کے سامنے رکھا جاتا ہے تو وہ واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ جب دل ایک صاف ستھرے چمکدار آئینے کی طرح ہوتا ہے اور کوئی شخص اپنے نفس کو ان احساسات کے محرکات کو [وجود کے جسمانی دائرے سے] ہٹانے سے منقطع کرتا ہے، تو وہ محفوظ شدہ لوح ("*لوہ مہفود*") کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ جب تک دل اس طرح کے حقیقی احساسات سے بھرا رہتا ہے، وہ روحانی عالم (عالم روحانی) میں وجد میں گھومتا *رہتا* ہے۔ تاہم ، خواب میں ، یہ احساسات رک جاتے ہیں لیکن ان کی تصویر یا سوچ برقرار رہتی ہے۔ جبکہ "*عالم*" (تخیل کے دائرے) میں احساس یا خیال کا تصور کیا جا سکتا ہے، اگرچہ بعض اوقات مدھم طور پر۔ جب انسان مر جاتا ہے تو آخر کار پردہ اٹھا لیا جاتا ہے۔ [جسمانی دائرے سے] کوئی ادراک یا احساسات باقی نہیں رہتا۔ مادہ (یعنی چیزوں کی سچائی، حقیقت اور حقیقی نوعیت) شفاف ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد میت کو بتایا جاتا ہے:

فَكَشَفْنَا عَنكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ ٱلْيَوْمَ حَدِيدٌ

"اب ہم نے تمہاری پردہ تم سے ہٹا دی ہے اور آج تمہاری آنکھیں تیز ہیں۔" (سورۃ البقرۃ باب 50، آیت 22)

ایک جواب دیتا ہے:

رَبَّنَآ أَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَٱرْجِعْنَا نَعْمَلْ صَـٰلِحًا إِنَّا مُوقِنُونَ

"اے ہمارے پروردگار! ہم نے دیکھا اور سنا ہے۔ ہمیں واپس لے آ کر ہم نیک کام کریں گے اب ہمیں یقین ہے [مادے کی حقیقت کے بارے میں]۔ (سورۃ البقرۃ 32، آیت 12)

دل کے دروازے کے فرشتوں کی طرف ہونے کا دوسرا ثبوت یہ ہے کہ کوئی بھی ایسا نہیں جو دانشمندی اور پاکیزہ شکوک و شبہات یا آنے والے ممکنہ تنگوں کے خوف سے محفوظ ہو۔ ایسے خیالات حواس سے نہیں نکلتے بلکہ دل سے نکلتے ہیں۔ ان متوقع خطرات کی ابتدا اور ماخذ کو کوئی نہیں جانتا۔ یہ تجزیہ اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ تمام علم حسی اعضاء سے نہیں نکلتا۔ مزید یہ کہ دل کا تعلق *دراصل "عالم روحانی"* یا روحوں کے دائرے سے ہے نہ کہ اس [مادی] دنیا سے۔ ظاہر ہے ، یہ حسی اعضاء اس دنیا کے لئے بنائے گئے ہیں۔ جب تک انسان اس دنیا کے

دنیاوی خیالات سے چھٹکارا حاصل نہیں کرتا، کوئی بھی دوسرے دنیا کی طرف آسانی سے نہیں جا سکتا، جہاں یہ حسی اعضاء کسی بھی طرح کے کام نہیں آئیں گے۔

لہٰذا یہ غلط فہمی نہ کریں کہ جب تک کوئی انسان گہری نیند میں نہیں جاتا یا مر نہیں جاتا، روحوں کے دائرے کا دروازہ نہیں کھلے گا۔ اگر کوئی سخت محنت کرتا ہے، تکبر پر قابو پاتا ہے، اپنے آپ کو یعنی اپنی روح کو برائی سے پاک کرتا ہے، اپنی آنکھیں بند کرتا ہے، ایک ویران جگہ پر بیٹھ جاتا ہے، تمام دنیاوی خیالات کو ختم کرتا ہے اور اپنے دل و نفس کو روحوں کے دائرے میں اس طرح مگن کر دیتا ہے کہ وہ اپنی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں بولتا بلکہ اس کا ہر ریشہ *"اللہ!* اللہ تعالیٰ (یعنی اللہ کا واحد اور واحد ذاتی نام، جبکہ "خدا" ایک عمومی زبان میں اس ہستی کی طرف اشارہ کرنے کا مخصوص طریقہ ہے جو اس نے پیدا کی ہر چیز کا مالک، خالق، برقرار رکھنے والا اور فراہم کرنے والا ہے) ہر دل کی دھڑکن کے ساتھ، جب تک کہ انسان اپنے آپ سے اور خدا کے سوا پوری دنیا سے مکمل طور پر بے خبر نہیں ہو جاتا، اس کے دل میں برکتوں کا دروازہ کھل جائے گا اور کھلا رہے گا۔ جاگنے کی حالت میں کوئی دیکھتا تھا کہ دوسرے نیند میں کیا کریں گے۔ فرشتوں کی خوبصورت روحیں دلکش شکلوں میں کسی پر اترتی تھیں۔ خدا کے پیغمبروں کو دیکھنا شروع کر دیا جائے گا اور ان سے فائدہ اٹھایا جائے گا۔ اس دنیا کی آسمانی مخلوق اور اس کے بعد *"ملاکوٹ"* - ماورائی فرشتہ ، اسے نظر آئے گی۔ ایک ، جو بہت خوش قسمت ہے وہ عجیب و غریب نظاروں اور مافوق الفطرت چیزوں کا مشاہدہ کرے گا ، جو کسی کے تصور سے کہیں زیادہ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ایسے شخص کے بارے میں ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ایسی چیزیں کسی کے سوئے یا مردہ ہونے کے بغیر ممکن ہیں:

رُوِيَتْ لِي الْأَرْضُ فَأُرِيتُ مَشَارِقَهَا وَمَغَارِبَهَا

"ساری زمین مجھے دکھائی گئی تو میں نے اس کے مشرق اور مغرب کو دیکھا۔"

قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیت بھی اس مسئلے پر روشنی ڈالتی ہے:

وَكَذَٰلِكَ نُرِيٓ إِبۡرَٰهِيمَ مَلَكُوتَ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضِ

"اور اسی طرح ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو آسمانوں اور زمین کی بادشاہی دکھائی۔" (سورة البقرة سورة البقرة آیت (75

انبیاء علیہم السلام کے یقین دہانی اور صحیح فیصلے ایک جیسے تھے۔ اس کا حواس سے کوئی تعلق نہیں تھا، بلکہ یہ شاندار کامیابی خدا کی راہ میں ان کی محنت کا ثمر تھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَتَبَتَّلۡ إِلَيۡهِ تَبۡتِيلٗا

"اور اپنے آپ کو اللہ کے لیے وقف کر کے رکھو۔" (سورة البقرة سورة البقرة آیت 8)

بے شک جب ایسا ہوتا ہے تو وہ ہر چیز کو درست کر دیتا ہے۔ صرف وہی سب قابل ہے:

رَّبُّ ٱلْمَشْرِقِ وَٱلْمَغْرِبِ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ فَٱتَّخِذْهُ وَكِيلًا

"مشرق اور مغرب کا پروردگار۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں پس اسے نگہبان بنا لو۔ (سورۃ البقرۃ باب 73، آیت 9)

پس جب تم اس پر اور صرف اسی پر بھروسہ کرو تو اس کے سوا ہر چیز کے ساتھ اپنے تمام تعلقات کو دور کر دو اور تمہیں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہ ہو (کیونکہ وہ تمہارے تمام معاملات کا بہترین نگہبان ہے)۔

وَٱصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَٱهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا

"اور جو کچھ وہ کہتے ہیں [جھوٹ، تکلیف دہ باتوں، حملوں، الزامات، گالیوں اور تنقید کے بارے میں] صبر کریں اور انہیں شفقت سے ترک کر دیں۔" (سورۃ البقرۃ سورۃ البقرۃ آیت نمبر 10)

اس طرح کی نمایاں خوبی ثابت قدم لوگوں کی انتھک محنت اور اس کے ساتھ مستقل طور پر فرض شناس رہنے کی سخت مشق میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہ انسان کے دل کو پاک کرتا ہے۔ انسان لوگوں کی دشمنی اور دنیاوی پریشانیوں اور خواہشات کے لالچ کے تمام خدشات سے بالاتر ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے علم کا قابل فخر مالک بننا، جو اتنی محنت کے بعد حاصل ہوتا ہے، واحد بابرکت "*ولی*" یا خدا کے دوست اور قریبی کی قابل رشک خوش قسمتی ہے۔ ایک اونچے پیڈسٹل پر نصب ہے۔ خدا کے انبیاء کا مقام ان کے سامنے واضح وجوہات کی بنا پر بلند ہے۔

بہرحال گمراہ نہ ہو کہ اس طرح کی [بلند روحانی] حالت کا حصول صرف خدا کے نبیوں پر لاگو ہوتا ہے۔ در حقیقت ، ہر شخص اپنے آپ میں اس کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر ، کوئی لوہا نہیں ہے ، جو ، اپنے بنیادی اندرونی کردار کی وجہ سے ، ایک پالش آئینے میں ڈھال نہیں سکتا ہے جس میں کوئی دنیا کی کسی بھی چیز کا چہرہ دیکھ سکے۔ یہ ، بعد میں داغدار اور داغدار ہوسکتا ہے ، یہ ایک اور معاملہ ہے۔ قدرتی طور پر دنیاوی لالچ اور فتنہ اس کو بہت نقصان پہنچاتے ہیں اور [پالش] آئینے کو مسخ کر دیتے ہیں۔ برائی ایک ایسی خطرہ ہے [کہ یہ دل کے پالش شدہ آئینے کو ڈھانپ دیتی ہے اور مسخ کرتی ہے جو اب سچائی اور خدا کے نور کی عکاسی کرنے کے قابل نہیں رہتی]۔

انسان کو اپنے آپ کو حقیقت اور سچائی کی سطحی تفہیم تک محدود نہیں رکھنا چاہیے۔ [اس کے بجائے،] انسان کو یہ سمجھنا چاہیے کہ کسی کے پیشے میں اس کی تعلیم میں "*معارفہ*" یا خدا کی گنوسس ہے۔ [سچے] علم کا یہی مطلب ہے۔ بہرحال علم اپنے آپ میں دل سے تنگ اور چھوٹا ہے۔ دل جسم کا سوار ہے [اور اس کے برعکس نہیں]۔ دل کا

مقصد سوار کے لئے اس کے ماؤنٹ پر سوار ہونا ہے۔ گھوڑا (یعنی جسم) سوار (یعنی دل) کے لیے ہے نہ کہ گھوڑے کے لیے (یعنی جسم) کے لیے۔

سمجھیں کہ آپ کی اپنی ذات سے زیادہ کوئی چیز آپ کے قریب نہیں ہے ، لیکن آپ ایسا کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ جو شخص اپنے آپ کو نہیں جانتا اور دوسروں کو جاننے کا دعویٰ کرتا ہے، وہ اس فقیر کی طرح ہے جو اپنا پیٹ نہیں بھر سکتا لیکن شہر کے غریبوں اور بے سہارا لوگوں کو کھانے کی میز پر رکھنے کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس طرح کا دعویٰ مضحکہ خیز ہے۔

اس گفتگو کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو یہ احساس ہو کہ اس کا دل کتنا عظیم اور مراعات یافتہ ہے۔ اللہ نے تم پر یہ عظیم نعمت نازل فرمائی ہے اور اسے تم سے چھپا رکھا ہے۔ اگر آپ اس کی کھوج نہیں کرتے ہیں ، [بلکہ اس کے بجائے] اسے ضائع کرتے ہیں ، اس سے غافل رہتے ہیں تو ، یہ آپ کے لئے بہت بڑا نقصان اور ماتم کی بات ہوگی۔ لہٰذا یہ آپ پر لازم ہے کہ آپ سچائی کو حاصل کرنے کے لیے سخت محنت کریں یعنی اس عظیم خدائی تحفے کی فضیلت ہے۔ اس دنیا کے عام تعاقب میں اپنی جستجو کھونے کے بجائے، اس کے اختتام [اور حتمی مقصد] کی تلاش کرو تاکہ آپ کو دنیا اور آخرت میں عزت و احترام کیا جا سکے۔ یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں ایسی مرتبہ اور استقامت عطا فرمائے کہ اس کے بعد کوئی عدم استحکام پیدا نہ ہو، تاکہ تمہیں ایسی طاقت مل جائے کہ اس کے بعد کوئی کمزوری نہ ہو، تاکہ تم اس طرح "*معارفہ*" یا گنوسی سے پاک ہو جاؤ کہ الٰہی حسن کی قربت تمہاری مقدر قابل رشک ہو۔ آپ کو ایسی خوشی سے نوازا جاسکتا ہے کہ اس کو روکنے کے لئے کچھ بھی نہیں ہونا چاہئے۔ اس طرح آپ جو حقیقی حیثیت حاصل کرسکتے ہیں اس کا انحصار آپ کی کارکردگی اور اس صلاحیت پر ہوتا ہے جو آپ اس کے مستحق ہونے کے قابل ہوسکتے ہیں۔

یہ بہت ضروری ہے۔ ورنہ اگر آپ معاملات کا تجزیہ کریں گے تو آپ دیکھیں گے کہ گرمی، سردی، بھوک، پیاس، بیماری اور پریشانی میں عاجزی سے بڑھ کر کوئی دکھ نہیں ہے۔ جن چیزوں کو کرنے سے کوئی لطف اندوز ہوتا ہے ، بعض اوقات کسی کے لئے نقصان دہ ہوسکتا ہے۔ وہ چیزیں جو کسی کے لئے فائدہ مند ہوسکتی ہیں ، وہ دیکھ بھال ، تناؤ اور تناؤ سے بھری ہوئی ہوسکتی ہیں۔ لہذا ، کسی کو احتیاط کے ساتھ چلنے کی ضرورت ہے۔

ایک قابل احترام شخص ، ہم [عام طور پر] جانتے ہیں ، کسی کے علم ، طاقت ، کارناموں ، مضبوط ارادے ، ہمت اور اچھے پروفائل کی وجہ سے ایک معزز شخص ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جہاں تک کسی شخص کے علم، علم یا تعلیم کا تعلق ہے، اگر ہم اس پر مراقبہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ وہ سب سے زیادہ جاہل ہے، یعنی اگر کسی کے دماغ کی ایک رگ بھی مسخ ہو جائے تو اس کے پاگل ہونے یا موت کا خطرہ بھی ہے۔ کوئی اس کی وجہ یا علاج نہیں جانتا۔ مزید یہ کہ اس کے علاج کی دوا کسی کی آنکھوں کے سامنے پڑی ہو سکتی ہے لیکن اس بات کا علم نہیں ہو سکتا کہ یہی دوا کسی کی بیماری کا علاج ہے۔ اپنی طاقت کے بارے میں ، انسان اتنا بے بس ہوتا ہے کہ بعض اوقات وہ مکھی کو بھی مار نہیں سکتا۔ اس معاملے کے لیے، اگر خدا کی طرف سے شیر کو ایسا کرنے کا حکم دیا جاتا ہے، تو وہ اس سے مارا جاتا ہے۔ اگر کوئی بھڑیا ڈنک مارتا ہے تو ، وہ بے چین ہوجاتا ہے۔ اسی طرح ، کوئی اپنی گرفت کھو دیتا ہے ، اس پر بہت پریشان اور بے چین ہوجاتا ہے چاہے تھوڑی سی چاندی ضائع ہوجائے۔ تو کیا کوئی اپنا توازن کھو دیتا ہے، اگر کسی کو کچھ عرصہ کھانے کے بغیر رہنا پڑے۔ اس طرح انسان سے کمزور کون ہو سکتا ہے؟ کسی کی خوبصورتی اور کسی کے عمومی رویے کی خوبصورتی کے بارے میں بات کرتے ہوئے ، اس کا موازنہ

کیچڑ کے ڈھیر پر چمڑے کے خیمے کی حد سے زیادہ توسیع سے کیا جاسکتا ہے۔ یہ بھی ایک معروف حقیقت ہے کہ اگر کوئی شخص دو دن تک نہاتا ہے تو ، بدبو آنے لگ جائے گی۔ لوگوں کی طرف سے پرہیز کیا جائے اور عام طور پر عوامی طور پر بدنام کیا جائے ، اس کے علاوہ کئی دیگر پیچیدگیوں کے علاوہ جو قائم ہوسکتے ہیں۔ انسان سے زیادہ گندی کوئی چیز نہیں ہے ، کیونکہ گندی مادہ ہر وقت ایک میں رہتا ہے ، جسے وہ اپنے ساتھ لے جاتا ہے اور دن میں کئی بار دھوتا ہے۔

ایک تمثیل نقل کی گئی ہے کہ ایک زمانے میں شیخ ابو سعید رضی اللہ عنہ جو ایک انتہائی قابل احترام بزرگ اور عرفانی تھے، کچھ *صوفیاء* (جو روحانی راہ میں روحانی تبدیلی کے لیے جدوجہد کرنے والے لوگ الٰہی قربت حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں) کے ساتھ کہیں جا رہے تھے۔ وہ ایک جگہ پہنچے اور دیکھا کہ وہاں کے لوگ انسانی فضلہ کو صاف کرنے کا کام کر رہے ہیں۔ راستہ بدبودار گندگی سے بھرا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر سب حیران رہ گئے، اپنی ناک بند کر کے ادھر ادھر بھاگ گئے، لیکن *شیخ* (روحانی پیشود وہیں کھڑے رہے) نے کہا، "سنو اے لوگو! کیا تم جانتے ہو کہ یہ گندگی کا ڈھیر مجھ سے کیا کہہ رہا ہے؟" انہوں نے پوچھا، "کیا؟" انہوں نے جواب دیا کہ کہہ رہا ہے کہ کل تک میں پھلوں اور مٹھائیوں وغیرہ کی شکل میں بازار میں تھا۔ لوگ مجھ پر بے تحاشہ پیسے خرچ کر رہے تھے۔ میں رات بھر ان کے پیٹ میں رہا پھر میں اس ناگوار بدبودار سڑنے میں بدل گیا۔ کیا میں تم سے بھاگ جاؤں، یا تم مجھ سے؟"

حقیقت یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں کمزور، نامکمل اور بے بس ہے۔ اس کے باوجود قیامت کے دن ایک شخص زوروں پر ہوگا۔ ان حالات میں اگر کوئی شخص کسی کے ساتھ "*کیمیا* یا ابدی خوشی اور لامتناہی فتح کا تبدیلی ایجنٹ" برقرار رکھے تو وہ جانوروں کے مقام سے اوپر اٹھ کر فرشتوں کے قد تک پہنچ جائے گا۔ لیکن اگر کوئی شخص دنیا اور دنیاوی خواہشات کا شکار ہو جائے تو کتے اور سور ایک سے بہتر ہوں گے، کیونکہ وہ ختم ہو جائیں گے اور ہمیشہ کے لیے چلے جائیں گے لیکن انسان دنیا کی زندگی میں اپنے برے اعمال کی وجہ سے الٰہی عذاب اور مصائب میں ڈوبے ہوئے رہے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر انسان نے اپنے مرتبے کی وسعت اور بلندی کو تسلیم کیا ہے تو اسے بیک وقت اس نقصان اور نقصان کو یاد رکھنا ہوگا جو کسی کو پہنچنے کا امکان ہے، اگر کوئی اس پر پورا اترنے میں ناکام رہتا ہے۔ چیزوں کا اس طرح کا جائزہ لینا خدا کی "*معرفہ*" یا گنوسس کی کلید ہے۔ یہ سب کچھ اس کے لیے کافی ہونا چاہیے کہ وہ اپنی ذات کو پہچان سکے۔

خدا کو جاننا

غزالی نے اپنی کتاب "*کیمیا* سعادت" یا "کیمیا یا ابدی خوشی اور لامتناہی کامیابی کے لئے تبدیلی کا تغیر پذیر ایجنٹ" میں ابدی خوشی اور حقیقی کامیابی کے کیمیا (یا تبدیلی کے ایجنٹ) کی حیرت انگیز وضاحت جاری رکھی ہے جو "خدا کو جاننا" ہے۔ ابدی خوشی کے تبدیلی کے ایجنٹ کی دوسری ضرورت کی وضاحت کرتے ہوئے - "خدا کو جاننا" ، وہ لکھتا ہے:

پیارے محبوب! سابقہ انبیاء (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر لکھی ہوئی کتابوں میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے:

اَعْرِفْ نَفْسَكَ تَعْرِفْ رَبَّكَ

"اپنے نفس کو پہچانو، تب ہی تم اپنے رب کو پہچان لو۔"

اس کے علاوہ یہ قول حدیث اور صحابہ کرام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے اور مقالات سے بہت مشہور ہے:

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ

"جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا تو اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔"

انسان کا دل ایک [پالش] آئینے کی مانند ہے [بشرطیکہ اس پر بجھی ہوئی دھول کو ہٹا دیا گیا ہو اور سطح کو کسی ایسی چیز سے صاف کر دیا جائے جو اس کے پالش شدہ آئینے کی حیثیت سے کام کرنے میں رکاوٹ بنتی ہے]۔ جو شخص اپنی نظر اور توجہ اس پر مرکوز کرے گا وہ خدا سے واقف ہو جائے گا۔ بات یہ ہے کہ ، ایسے لوگ ہیں جو اس آئینے میں دیکھے بغیر اپنے آپ کو بیکار طریقے سے سراہتے رہتے ہیں ، لہذا وہ اپنے رب کو جاننے کے قریب کہیں بھی نہیں ہوتے۔ ایک بار پھر ، اس کا جواب دل کے اس آئینے کو دیکھنے میں مضمر ہے جس میں "*معارفہ*"خدا کی (عرفان) اس کے صحیح ہم آہنگی میں۔ لہٰذا دل کی حقیقت کو صحیح تناظر میں جاننا اس کے دو نمایاں پہلوؤں میں سے ضروری ہے۔ کسی کو سمجھنا بہت مشکل ہے کیونکہ یہ [عام] لوگوں کی سمجھ سے باہر ہے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ اس پر بحث نہ کی جائے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسان کو اپنی ذات سے قادر مطلق کی تفہیم حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، یعنی اس سلسلے میں موجود خاص خصوصیات کے ذریعے۔ یعنی اس پروردگار کی نعمتوں اور مخلوقات کی خوبصورتی جو پوری کائنات کے وسیع و عریض علاقوں میں پھیلی ہوئی ہے، اس کے ساتھ ساتھ اس نے انسان کے دل کو اس کے جسم اور اس کے اعضاء میں جو کچھ مہربانی سے عطا کیا ہے، اس کا مطالعہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ شروع میں کسی کو اپنی اصلیت پر مکمل طور پر غور کرنا چاہئے ، کہ وہ پہلے محض ایک غیر وجود تھا اور اب وہ ایک 'وجود' ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

هَلْ أَتَىٰ عَلَى ٱلْإِنسَـٰنِ حِينٌ مِّنَ ٱلدَّهْرِ لَمْ يَكُن شَيْـًٔا مَّذْكُورًا ﴿١﴾

إِنَّا خَلَقْنَا ٱلْإِنسَـٰنَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَـٰهُ سَمِيعًۢا بَصِيرًا ﴿٢﴾

"کیا انسان کو ایک زمانہ گزر چکا ہے جب کسی کا ذکر نہ کیا جا سکے اور ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفہ سے پیدا کیا ہے پھر ہم نے ایک کو آزمایا اور ہم نے ایک سننے والا اور دیکھنے والا بنایا (سورة البقرة سورة البقرة آیت 2-1)

کسی کو اس کی عاجزی سے اندازہ ہو گا کہ وہ ناپاک پانی کا محض ایک قطرہ ہے جس میں وہ خوبیاں بھی نہیں ہیں جو بعد میں کسی کو عطا کی گئیں، جیسے عقل، سننے، دیکھنے، ذائقہ، چھونے اور بولنے کی خوبیاں ہیں۔ نہ ہی اس میں کان، آنکھیں، زبان، ہاتھ اور پاؤں ، سر ، رگیں ، ٹشوز ، ہڈیاں یا ریڑھ کی ہڈی وغیرہ شامل تھیں۔ مختصرا، کسی کی جینیاتی وجود صرف پانی کے اس سفید قطرے پر مشتمل ہے، اس کی نوزائیدہ شکل میں۔

ان خطوط پر کسی کے غور و فکر مزید بتائیں گے کہ اتنی اونچی بلندیوں پر چڑھنے کی انسانی صلاحیت کے باوجود، وہ اپنی مرضی سے اور اپنے ارتقاء سے وجود میں نہیں آیا۔ کسی نے اپنے آپ کو پیدا نہیں کیا۔ ایک کو کسی اور نے تخلیق کیا تھا۔ کسی کی اپنی قوت میں ، کوئی بھی ایک ، تنہا بال بھی نہیں بنا سکتا۔ ایک بالکل بے بس ہے۔ بہرحال ، ایک شخص اپنے جوہر میں تھا ، ناپاک پانی کے ایک قطرے کے سوا کچھ نہیں۔ تو اپنے آپ کو تخلیق کرنے کی خوبی کو کس طرح منسوب کیا جا سکتا ہے؟ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس طرح کا خود شناسی انسان کو اپنے وجود اور اپنے خالق کی حقیقت میں روشن خیالی دے گی۔ کائنات میں اس کی مخلوقات کی شاندار شان و شوکت کو چھوڑ دیں، جب کوئی اپنے جسم کے شاندار جاندار، اس کے مختلف افعال پر نظر ڈالے گا، جن میں سے ہر ایک کی اپنی مخصوص خوبی اور کام ہے، تو اسے مالک خالق، خدا تعالیٰ کی عظمت اور بے مثال مہارت کا احساس ہوگا۔

بہت سی چیزوں کے لیے خداوند کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ خدا نے ایک اعلیٰ روح اور خوبصورت جسم کے ساتھ بھی عطا کیا ہے۔ صرف کسی کی خوبصورت پروفائل کو ہی اس کے سامنے گہری شکر گزاری کے ساتھ جھکنا چاہیے۔ اس طرح انسان خوش قسمت ہے کہ اسے "*جمال*" یا خوبصورتی اور "*کمال*" یا فضیلت اور فضل دونوں صرف خدا نے نہیں دیکھا۔ بہر حال ، ایک دوسری صورت میں کیا ہے؟ مٹھی بھر دھول کے سوا کچھ نہیں! اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز بے مقصد نہیں بنائی۔ انسانی اناٹومی کا ہر حصہ ضروری ہے، اس کا ایک خاص فرض ہے کہ وہ مقررہ طریقے سے انجام دے۔ ان میں سے ہر ایک جزو کو مہارت سے تیار کیا گیا ہے ، منصوبہ بندی کی گئی ہے ، اور پروگرام کیا گیا ہے [اس کے لئے مخصوص افعال کے لئے]۔ کچھ بھی غائب اور مطلوب نہیں ہے۔ پورا آئین اتنا کامل ہے کہ اس پر کسی بھی طرح سے مہارت حاصل نہیں کی جا سکتی۔ مثال کے طور پر ، جبڑے میں دانتوں کو دیکھیں۔ سامنے والے نوکدار اور تیز ہیں تاکہ کھانے پینے کی اشیاء کو مناسب طریقے سے کاٹنے اور چھیدنے میں مدد ملے۔ ان کے قریب دوسرے حصے بجائے چوڑے ، گرووی اور چپٹے ہوتے ہیں تاکہ کوئی ان کو ٹھیک ہضم ذرات میں پیسنے کے قابل بناتا ہے۔ زبان کے نیچے کا نچلا حصہ اس طرح بننے والے کھانے کے ٹکڑے کو نم کرتا ہے ، جس سے یہ گلے کے ذریعے آسان اور محفوظ گزرنے کے لئے زیادہ نرم ہوجاتا ہے۔ اسی طرح انسانی ہتھیلی کی پانچ انگلیاں ہوتی ہیں۔ چار انگلیاں ایک جیسی ہیں۔ لیکن انگوٹھا ان سے کچھ فاصلے پر رکھا جاتا ہے۔ یہ ان سے چھوٹا اور تھوڑا سا موٹا ہے۔ اس میں ان میں سے ہر ایک کے ساتھ ہم آہنگی اور مل کر کام کرنے کی صلاحیت ہے اور اچھی گرفت اور ہینڈلنگ کے لئے اجتماعی طور پر تمام انگلیوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کی صلاحیت ہے۔ اس کے نتیجے میں ، ہر انگلی میں تین سوراخ ہوتے ہیں ، لیکن انگوٹھے میں دو ہوتے ہیں۔ انسان اپنی مرضی سے ان سوراخوں کو حرکت دے سکتا ہے اور مروڑ سکتا ہے۔ ان کو اکیلے موڑ کر ، کوئی بھی ہتھیلی کو کپ سکتا ہے۔ دونوں ہاتھوں کے چھیدوں کو جوڑ کر اور مروڑ کر ، کوئی بھی انہیں کھوکھلی پلیٹ کے طور پر استعمال کرسکتا ہے۔ اسی طرح ، ان چھیدوں اور ہاتھ کی ہتھیلی کو بند کرکے ، کوئی بھی اسے اپنے دشمن سے لڑنے کے لئے ایک قسم کے باکسنگ دستانے میں تبدیل کرسکتا ہے۔ دوسری طرف ، کوئی بھی اسے سیدھے کھجوروں کے ساتھ پلیٹ کے طور پر استعمال کرسکتا ہے۔ لہذا ، ان انگلیوں کی پوزیشن ، سائز یا مقدار کے بارے میں کوئی بھی بحث بیکار کی مشق ہوگی۔ وہ بہت عمدہ طور پر بنائے گئے ہیں! ان تمام چیزوں اور کائنات کا سب سے بڑا معمار بہترین منصف ہے۔ وہ سب کچھ جانتا ہے جو اس نے بنایا ہے۔

انسان کی ضروریات اور خواہشات لامحدود ہیں۔ خالق کی تخلیقات بھی لامحدود ہیں۔ انسان کو پہننے کے لیے کپڑے، رہنے کے لیے گھر اور بہت سی دوسری چیزوں کی ضرورت ہے۔ قدرتی عناصر جیسے بارش ، ہوا ، گرمی ، سردی ، اور زمین میں خوراک اگانے کے لئے ، اسی طرح ایک کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ اسی طرح ضروری دھاتیں جیسے ٹن، لوہا، کانسی وغیرہ بھی انسان کو مختلف مقاصد اور صنعتوں کے لیے اپنے اوزار اور آلات بنانے میں مدد فراہم کی گئی ہیں۔ یہ سب چیزیں اور بہت سی دوسری چیزیں ایک کے لئے لینے ، ان سے فائدہ اٹھانے ، آرام دہ زندگی گزارنے کے لئے موجود ہیں۔ کیا انسان کو اس قدر تجسس نہیں ہونا چاہیے کہ وہ بالآخر اس کی قادر مطلق کی موجودگی کو محسوس کرے، جس نے اپنی اعلیٰ مہربانی سے یہ سب کچھ کسی کے لیے کیا ہے [یہاں تک کہ کسی کو احساس کیے بغیر اور ان کے لیے مانگنے کے بغیر]؟ کیا انسان کا دل اس کی محبت اور اس کی عبادت سے مالا مال نہیں ہونا چاہیے؟ ایک حدیث *قدسی* کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

سَبَقَتْ رَحْمَتِیْ عَلٰی غَضَبِیْ

"میری رحمت میرے غضب پر غالب آ گئی ہے۔"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطابق: "انسانیت پر خدا کی رحمت اور مہربانی اس سے کہیں زیادہ ہے کہ ایک دودھ پلانے والے بچے پر ایک پیاری ماں کی طرف سے کیا جائے۔

نسبتا نچلے پیمانے پر، ایک سادہ لیکن ایک اچھا انسان، *ایسی چیزوں میں خدا* کی معرفت یا معرفت کو دیکھتا ہے:

1. پانی کے ایک قطرے کی عاجز اصل سے اپنی تخلیق میں۔
2. کسی کے جسم کے اعضاء کی عجیب و غریب خصوصیات میں۔
3. خدا کی طرف سے کسی کی تمام خواہشات اور ضروریات کی فراہمی میں۔
4. کسی کے جسمانی ساخت کی خوبصورتی میں۔ جمالیاتی چیزیں جو خدا کی تخلیق کی گئی ہیں جو انسان کو دلکش اور دلکش شکل دیتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو پسند کرتا ہے اور اسے اپنی "*معرفت*" یا عرفان سے نوازتا ہے۔ اپنی ذات کا اس طرح کا اندازہ خدا کی معرفت کی کلید بن جاتا ہے۔

آپ میں کائنات

انسان اس چیز کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے جسے وہ نہیں جانتا۔ انسان اپنی پوری کوشش کرتا ہے کہ وہ خدا کو اپنی داخلی اور خارجی خصوصیات سے سمجھے۔ جہاں کسی کی کوشش قابل تعریف ہے وہیں حقیقت یہ ہے کہ انسان

کی فہم اور صلاحیت محدود ہے، چاہے اس کا مرتبہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو۔ اس سلسلے میں کسی کی مسلسل تحقیق بلاشبہ کسی کی زندگی میں اس کی حیثیت کو بڑھا دے گی۔ جتنا زیادہ سے زیادہ نفیس شخص کا دل اور "*لفس*" (یا نفس) اس عمل میں غرق ہو جائے گا، اس کے لیے بے پناہ محبت کی وجہ سے، اس کے نتیجے میں وہ اس کے ساتھ نسبتا قربت حاصل کرے گا لیکن بالآخر وہ اس حقیقت کو سمجھ لے گا کہ "صرف خدا ہی خدا کو مکمل طور پر جانتا ہے" اور یہ کہ اسے گھیر نہیں سکتا۔

مثال کے طور پر، انسان کے دل، "*لفس*" یا نفس، حقیقت میں، کی مقدار نہیں کی جا سکتی۔ اس کی کوئی جہت نہیں ہے۔ یہ ناقابل تقسیم ہے [اور اس وجہ سے وقت اور جگہ کے طول و عرض کی مقدار ، حد اور حدود کی حدود سے اوپر]۔ اس کا کوئی رنگ نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ یہ اس طرح کے تمام تحفظات سے بالاتر ہے۔ ایسی صورت میں کوئی ایسی چیز کی شکل کا تعین کیسے کر سکتا ہے؟ کوئی ایسی چیز کا تصور کیسے کر سکتا ہے جس کی شکل یا اثر معلوم نہیں ہے؟ لہٰذا ، یہ انسان کی کسی بھی خوبی سے مطابقت نہیں رکھتا جو اس کے مطابق سمجھ سکے۔

انسان میں بہت سی چیزیں ہیں جن کو انسان محسوس کرتا ہے لیکن وہ انہیں سمجھ نہیں سکتا۔ مثال کے طور پر ، محبت اور درد کو محسوس کیا جاسکتا ہے لیکن انہیں ذہن میں نہیں دیکھا جاسکتا ہے اور نہ ہی ان کی کوئی شکل ، رنگ یا سائز ہے۔ معاملہ بہت پیچیدہ ہے۔ انسان کی طرف سے محسوس کی جانے والی مختلف فہم اور حالات، کسی کے حواس کے مختلف اجزاء سے متعلق ہیں۔ مثال کے طور پر ، ہم جانتے ہیں کہ آواز کان کے مترادف ہے۔ رنگ آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے اور اس کی تعریف کی جاتی ہے۔ زبان ذائقہ کو پہچانتی ہے اور ناک سے بدبو سونگھتی ہے۔ چھٹکارا دینے والا عام عنصر ، عقل کا اس سے کچھ لینا دینا ہوسکتا ہے۔ دلکش منطق کی کتاب شاید کسی حد تک اس مسئلے سے متعلق ہو سکتی ہے، لیکن یقینا دل اور اس کے خاص عطیات سے نہیں جو بالکل مختلف طبقے کا موضوع ہے۔

خدا ہر جگہ موجود ہے۔ لیکن اس کی موجودگی کو کسی خاص جگہ تک محدود نہیں کیا جا سکتا، باقی لوگوں کو چھوڑ کر۔ اس کی موجودگی اور کمانڈ ہر جگہ محسوس کی جاتی ہے۔ روح کو جسم کے کسی بھی عضو کے تعلق میں تنہا محسوس نہیں کیا جا سکتا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ہاتھوں میں، پیروں میں، سر میں، یا جسم کے کسی دوسرے حصے میں ہے۔ یہ جسمانی اعضاء جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے قابل تقسیم ہیں، لیکن دل اور روح تقسیم نہیں ہوتے۔ منطقی طور پر ، ایک ایسی چیز جو ناقابل تقسیم ہے ، کسی بھی ایسی چیز میں شامل نہیں ہوسکتی جو قابل تقسیم ہو۔

تاہم یہ کہنے سے کہ دل اور روح کا جسم کے کسی عضو سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کا ان پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ حقیقت یہ ہے کہ جسم کے تمام اعضاء اس کے تابع ہیں اور دل، روح یا "*لفس*" یا انسان کی نفس کے براہ راست کنٹرول میں ہیں۔ انسان کی روح اس تناظر میں بادشاہ ہے کیونکہ پوری کائنات خدا تعالیٰ کے براہ راست کنٹرول میں ہے، جو کائنات اور تمام وجود کا بادشاہ ہے۔

روح کا موضوع بہت نازک اور لطیف ہے۔ اس پر تمام تر غور و خوض اور گفتگو کے باوجود ، یہ ایک انوکھا اور اچھی طرح سے محفوظ راز ہے۔ لہٰذا، اسے ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھایا جا سکتا۔ مثال کے طور پر:

إِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰى صُوْرَتِهٖ

"بیشک اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر پیدا کیا"۔

یہ وہ جگہ ہے جہاں کسی کے پاس یہ کہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ خدا بہتر جانتا ہے۔

ہم نے اب تک یہ طے کیا ہے کہ:

1. اللہ قادر مطلق ہے۔ اس کی عظیم الہامی صفات کی نعمت اس میں ظاہر ہوتی ہے۔
2. وہ ہر جگہ موجود ہے لیکن کسی دوسری جگہ یا جگہ کو چھوڑ کر کسی ایک جگہ تک محدود نہیں سمجھا جا سکتا۔
3. نفس کو جاننا اس کی معرفت یا "*معارفہ*" کی کلید ہے۔
4. انسان کا اصل مقصد اس کی معرفت حاصل کرنا ہے۔

اب یہ سمجھنا چاہیے گا کہ کیسے؟ وہ سب سے بڑا حکمران ہے، انسان کی بادشاہی میں سب سے بڑا بادشاہ ہے۔ بہت سے معمے سے پردہ اٹھانا ہے:

1. فرشتوں کو اس کا حکم دینا اور ان کی عاجزی سے اطاعت کرنا۔
2. اوپر آسمان سے اس کی فرمانبرداریاں اور نیچے زمین کی ان کی التجا کی تعمیل۔
3. ستاروں اور مجمع النجوم کی مسلسل حرکت۔
4. اس کے ذریعہ سے اپنی جانداروں کو ان کی روزی کے لئے رزق عطا کرنا۔

یہ اس کی معرفت سے متعلق ٹھوس سوالات ہیں۔ یہ معاملات اور اس طرح کی چیزیں اس قسم کے دائرہ کار میں آتی ہیں جسے "اس کے احسان کے اعمال" کہا جاتا ہے۔

اس مقالے میں ، ہم نے بہت سے طریقوں کا تعین کیا ہے جو اس کی گنوسس ("*معارفہ") کی طرف لے جاتے* ہیں۔ اب ہم اس کے الہامی اعمال کی گنوسس ("افعل") کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ، جب تک آپ کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ انسان جسم کی بادشاہی پر کس طرح حکمرانی کرتا ہے ، آپ یہ نہیں سمجھ پائیں گے کہ وہ ، تمام آقاؤں کا مالک ، پوری کائنات پر کس طرح حکمرانی کرتا ہے۔ چنانچہ ہم ایک بار پھر اس ناگزیر نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جب تک انسان اپنے 'نفس' کو نہیں جانتا اور اس کے ہر عمل کو اس تناظر میں رہنمائی نہیں کرتا، وہ اس معمہ کو حل نہیں کر سکے گا۔

مثال کے طور پر، جب آپ کاغذ کے ٹکڑے پر "*بسم اللہ*" (عربی میں "خدا کے نام سے" لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں، تو آپ کا دل پہلے ایسا کرنا چاہتا ہے، پھر دل (یعنی جسم کے بائیں جانب کا جسمانی عضو نہیں جسے "دل" بھی کہا جاتا ہے) اس اثر میں ہلچل مچاتا ہے اور دماغ کو حکم دیتا ہے کہ وہ اس پر عمل کرے۔ دماغ کا پہلا حساس کمرہ جو انسان کے خیال کی جگہ ہے، یعنی اس کے بارے میں سوچنے کا جادو کرتا ہے۔ فکر کا تصور تصور کیا جاتا ہے۔ یہ دماغ کی طرف سے دماغ کے پٹھوں کو دیا جاتا ہے جو اسے پھیلاتے ہیں اور جسم تک پھیلاتے ہیں۔ لکھنے والی انگلیاں ہدایت کی جاتی ہیں ، رگیں اور ان کے وِتکوں کو اس اثر کا پیغام موصول ہوتا ہے ، اس کے نتیجے میں وہ قلم کو پکڑتے ہیں اور موصول ہونے والے محرکات کے مطابق الفاظ کو کندہ کرتے ہیں۔ دوسرے حسی اعضاء بھی مدد اور مدد کرتے ہیں اور "*بسم اللہ*" لکھا گیا ہے۔ لہٰذا یہ نتیجہ اخذ کرنا ممکن ہے کہ سارا لین دین ایسا کرنے کی بنیادی 'مرضی' کی وجہ سے ہوا ہے۔ اسی طرح ہر چیز کے آغاز یا آغاز میں یہ 'ارادہ' جوہر کا ہوتا ہے۔ جب اسے خدا کی طرف منسوب کیا جاتا ہے تو اس 'ارادہ' کو خدا کی 'سب سے بڑی مرضی' کہا جاتا ہے۔

جس قدر انسان کی مرضی پہلے اس کے دل میں نکلتی ہے اور اس کے بعد جسم کے دوسرے حصوں تک پہنچتی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی مرضی اور اس کا اثر سب سے پہلے "*ارش*" یعنی قادر مطلق الٰہی کی سلطنت سے شروع ہوتا ہے، پھر دوسرے عہدوں اور لوگوں تک پہنچتا ہے۔ مزید برآں ، جس چالاکی سے مرضی کا یہ تصور کسی کے دل ، کسی کی روح کے نازک باریک ریشوں کے ذریعے انسانی دماغ تک پہنچتا ہے۔ اسی طرح، خدا کی مرضی کا یہ ناقابل تسخیر جواہر، اس کی "*ارادہ*" یا "ارادہ" کو "*ارش*" (یا "الٰہی قادر مطلق کی سلطنت") سے لے کر "*کرسی*"، "اعلیٰ الٰہی فضیلت کی آسمانی نشست" تک پہنچایا جاتا ہے۔ یہ جواہر اس کے فرشتہ یا "*روح القدس*" (روح القدس) میں ظاہر ہوتا ہے۔ جس طرح دماغ کی حاکمیت انسان کے دل کے تابع ہوتی ہے، اسی طرح خدا کے احکامات کا اثر اس کے حکم کے تابع دائرے کے ذریعے "*کرسی*" تک پہنچایا جاتا ہے، تاکہ فوری اطاعت اور تعمیل کی جا سکے۔ پچھلے باب میں بیان کردہ سارا عمل دل میں "*بسم اللہ*" ("خدا کے نام پر" رحمن، رحم کرنے والا) لکھنے کے خیال کی آمد سے لے کر اس پر عمل درآمد اسی طرح "*جوہر طلف*" یا "خدا کی غیر معمولی مرضی" سے ایک شاندار انداز میں شروع کیا گیا ہے، جو کہکشاں کے ستاروں اور دیگر برجوں کو متحرک کرتا ہے، انہیں ان کے مطلوبہ کردار تفویض کرنا۔ اس کے نتیجے میں ، ان کی تابکاری (شعاعوں) کے ذریعہ ، ان کی اندرونی صلاحیت کی بنیاد پر ، ماحول کو گرمی ، سردی اور موسم خزاں وغیرہ جیسے موسمی حالات پیدا کرنے کے لئے ہلچل مچا دی جاتی ہے۔

اس کے علاوہ، جب قلم سیاہی کو بکھرے ہوئے الفاظ کو ضم کرنے اور جمع کرنے کے لیے حرکت میں لاتا ہے تاکہ اسے "*بسم اللہ*" کی متحدہ شکل دی جا سکے، اسی طرح گرمی، سردی، پانی اور دھول اپنے مرکبات کو حرکت میں لاتے ہیں تاکہ ان کے تعامل سے تشکیل دی گئی جائز شکلیں جمع کی جا سکیں تاکہ مادے کو ان کی مختلف شکلیں، حرارت اور دھول ان کو یکجا کرنے کے لیے اور خشکی کو یکجا کیا جا سکے۔

قلم جب لکھنے کی طرف بڑھتا ہے، جو کچھ بھی لکھنے کا تصور کیا جاتا ہے، اس کا وژن تشکیل دیا جاتا ہے، جو بالآخر ان الفاظ میں شکل اختیار کرتا ہے جو لکھے جاتے ہیں۔ اسی طرح جب مذکورہ بالا مرکبات کی موروثی اقدار کو حرکت میں لایا جاتا ہے تو اس کے بعد فرشتوں کی ایجنسی کے ذریعے جانوروں اور دیگر نباتات کی شکلوں کو مذکورہ بالا کے نقل کے مطابق تصور کیا جاتا ہے جسے "*لوہ مہفود*" کہا جاتا ہے (محفوظ شدہ تختی جس میں تمام مخلوقات اور وجود اور ان سے متعلق تمام واقعات کا مکمل ریکارڈ موجود ہے)۔ "*عرش*" (صرف "عرش" لیکن حقیقت میں، یہ الٰہی قادر مطلق کی سلطنت ہے)، "*لوہ مہفود*" (محفوظ تختی) اور "*کرسی*" (اعلیٰ الٰہی فضیلت کی آسمانی

نشست) کی بلندی کے پیش نظر بہت سے لوگ قدیم زمانے سے یہ سمجھتے ہیں کہ خدا "عرش" میں جنت میں رہتا ہے! قرآن مجید کی سورۃ یونس کی سورت میں ارشاد ہے:

ثُمَّ ٱسْتَوَىٰ عَلَى ٱلْعَرْشِ ۖ يُدَبِّرُ ٱلْأَمْرَ ۖ

"پھر خدا نے عرش پر قائم کیا اور اس کا انتظام کرتا ہے۔" (سورۃ البقرۃ 10، آیت 3)

"کشف" یا روحانی نقاب کشائی سے *نوازے جانے والوں کے بارے میں بات* کی جائے تو کوئی کہہ سکتا ہے کہ ان کے کلام کی اپنی قیمت ہے:

اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰى صُوْرَتِه

"بے شک خدا نے آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔"

پھر ہوشیار رہیں کہ جیسا کہ کہاوت ہے ، "صرف ایک بادشاہ ہی بادشاہ کی اصل قیمت جانتا ہے"۔ اگر آپ خود اپنی سلطنت میں بادشاہ نہ ہوتے اور اگر اللہ تعالیٰ نے آپ پر اپنی رحمت کی مشابہت نہ دی ہوتی تو آپ کبھی بھی اس کی معرفت کے قریب نہ پہنچ پاتے۔ لہٰذا اس قادر مطلق بادشاہ کا شکر ادا کرو جس نے تمہیں پیدا کیا اور تمہیں تمہاری سلطنت کی بادشاہی کا تاج پہنایا ہے۔

آپ کا "*عرش*" (عرش) حیوانی روح ہے ('حیوانی روح' 'انسانی روح' سے الگ ہے جو انسانی وجود کا سب سے برتر حصہ ہے)۔ اس کا منبع دل میں ہے۔ آپ کا"*اسرافیل*" (وہ فرشتہ جو قیامت کے دن صور پھونکتا ہے جو سب کو زندہ کرے گا۔ روح کو جب زندہ کیا جاتا ہے تو ، انسانی وجود کے ہر پہلو کو زندہ کرنے ، زندہ کرنے اور دوبارہ زندہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے) خدا نے اس سے بنایا ہے۔ آپ کی "کرسی" بھی اسی طرح خیالات کی تعمیر کی گئی ہے۔ آنکھیں، کان اور حسی عناصر فرشتوں کی طرح ہیں۔ دماغ ایک چھتری کی طرح ہے۔ اس کا گنبد ، جو آپ کے ادراک اجزاء سے بنا ہے ، آپ کا آسمان ہے۔ آپ کے دل سے تمام بنیادی تصورات کو صاف کرنے کے بعد ، اسے آپ کے جسم کے تمام حصوں پر حکمران بادشاہ کے طور پر نصب کیا گیا ہے۔ آپ کے لئے بہت کچھ کرنے کے بعد ، آپ سے کہا گیا تھا کہ کبھی بھی ایک لمحے کے لئے بھی اپنے آپ کو یا اپنی بادشاہی کو نظرانداز نہ کریں۔ ورنہ یہ غفلت خدا کے احکامات کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہے جس کے نتیجے میں اس کے سامنے آپ کا مقام شدید خطرے میں پڑ جائے گا۔

فَاِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ آدَمَ عَلٰى صُوْرَتِه فَاعْرِفْ نَفْسَكَ يَا اِنْسَانُ تَعْرِفْ رَبَّكَ

"پھر بے شک خدا نے آدم علیہ السلام (جو پوری انسانیت کا باپ ہے اور اس طرح تمام انسانوں کا باپ) اپنی صورت پر پیدا کیا۔ پس اے انسان اپنے آپ کو پہچانو! تم اپنے رب کو پہچان لو گے۔"

انسان کی بادشاہی کا تصور پوری کائنات پر قادر مطلق کی بادشاہت اور بادشاہی سے چھوٹے سے ماخوذ ہے۔ اپنے آپ میں ، اس تصور میں اس پر زور دیا گیا ہے:

1 . جسم کے مختلف اعضاء کی اہم خصوصیات اور پیشوں کے سیکھنے کے بارے میں انسان کی اپنی ذات کا علم۔
2 . خدا کی معرفت کا علم، خدا کی جانب سے اپنے فرشتوں کی طرف مہربان توجہ کے حوالے سے اس کی بادشاہی، اس کے نتیجے میں فرشتے کا تعلق، ایک دوسرے سے اور اعلیٰ عرش (عرش الٰہی)، آسمانوں اور "کرسی" (اعلیٰ الٰہی فضیلت کی آسمانی نشست) جو کہ بڑی فضیلت کے منفرد علم کا ایک پہلو بھی ہے۔

ایک ہوشیار شخص کبھی بھی ان سے غافل اور لاپرواہ نہیں رہے گا، جیسا کہ ایک لاپرواہ احمق کے مقابلے میں جو صرف اپنی بے مقصد جہالت کی فصل کاٹے گا۔ بدقسمتی سے کچھ 'فطرت پسند' اور 'نجومی' اس موضوع کی محدود تعلیم پر انحصار کرنے سے اس قدر ناواقف ہیں کہ اس طرح وہ حتمی اثر، ہر چیز کے نتیجے کو ستاروں کے اثر سے منسوب کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ اتنا ہٹ دھرمی ، اتنا پیدل چلنے والا ہے کہ اس وہم کے لحاظ سے ، ان کی حالت کا موازنہ کاغذ کے ٹکڑے پر رینگنے والی چیونٹی سے کیا جاسکتا ہے جس سے یہ تاثر مل سکتا ہے کہ قلم [کاغذ کی] سطح پر سیاہ نشان بنا رہا ہے ، کیونکہ یہ بے فکری سے چل رہا ہے۔ کاغذ پر رینگنے والی ایک اور چیونٹی ، جس کی بصارت زیادہ ہے ، اس یقین کو اور بھی بڑھا سکتی ہے کہ ہاتھ [قلم کو تھامے ہوئے] کاغذ پر نشانات بنا رہا ہے۔ یہ فطرت پسندوں کی مثال ہے۔ ان کے [غلط] عقیدے کی واضح غلطی ان کے عقیدے میں ہے کہ تمام انسان دوسرے تمام حقائق سے قطع نظر ستاروں سے ناقابل تلافی طور پر متاثر ہوتے ہیں۔ حقیقت کا ضد فینسی یا مذاق ہے۔ پھر نجومی آسانی سے بھول جاتے ہیں کہ یہ ستارے بھی فرشتوں کی اطاعت میں ہیں، جیسا کہ خدا نے مقرر کیا ہے، آسمانوں اور ستاروں اور کائنات اور اس سے آگے کی تمام چیزوں کا حکم دیا ہے۔ ان کی گرفت صرف مادی چیزوں تک محدود ہے۔ وہ روحانی میدان میں مکمل طور پر نوسکھئیے ہیں جو تمام جسمانی دنیاوی تحفظات سے برتر ہے۔ جسمانی (یا مادی) دائرے کے ستاروں میں روحانی دائرے کی چمکتی ہوئی روشنی (*عالم روحانی*) سے کم چمک ہوتی ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ روح جسم پر حکمرانی کرتی ہے۔ اس کے برعکس سچ نہیں ہے۔ وہ اپنی علم و دانش پر فخر کرتے ہیں لیکن اپنی بے ہودگی میں وہ روح کے روحانی دائرے کی راہ کی برکتوں سے محروم رہتے ہیں جہاں باطن کے بہت سے روشن ستارے خدا کی راہ میں ایک سنگ میل کی نشاندہی کرتے ہیں اور "*معراج*" (روحانی معراج یا خدا کی راہ پر چڑھنے والی بلندیوں کا جلال جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے:

وَكَذَٰلِكَ نُرِيٓ إِبۡرَٰهِيمَ مَلَكُوتَ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضِ

"اور اسی طرح ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو آسمانوں اور زمین کی بادشاہی دکھائی۔" (سورۃ البقرۃ الباب 6، آیت 75)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب میں فرمایا:

إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضَ

"میں اپنا منہ (یعنی اپنا سارا وجود - باطن اور ظاہری دونوں) کی طرف رخ کرتا ہوں جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔" (سورۃ البقرۃ الباب 6، آیت 79)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا:

اِنَّ لِلّٰهِ سَبْعِيْنَ اَلْفَ حِجَابٍ مِّنْ نُوْرٍ لَوْ كَشَفَهَا لَاَحْرَقَتْ سُبُحَاتُ وَجْهِهٖ كُلَّ مَنْ اَدْرَكَ بَصَرُهٗ

"بیشک اللہ کے لیے ستر ہزار خالص نور کے پردے ہیں۔ اگر وہ اس کی نقاب کشائی کرتا تو اس کے چہرے کی کرنیں ہر اس شخص کو جلا دیتی جو اس کی طرف دیکھتا تھا۔"

طب کے علم کے لوگوں نے بھی اسی طرح اپنی پریکٹس کی بنیاد اسی طرح چیزوں کے گرم یا سرد اثرات پر رکھی ہے۔ اس نے ان کے پیشے کی مشق میں ایک حد تک ان کی مدد کی ہے۔ سورج کو روشن اور گرم بنانے میں خالق کی چھٹکارا دینے والی خوبی، زحل کو خشک اور سرد اور عطارد کو مزید گرم کرنے میں اس کے مقصد سے خالی نہیں ہے۔ بیچارہ نجومی اپنی فلکیاتی روشن خیالی میں سورج کو زمین کے قریب رکھنے میں اپنے خالق کی ذہانت کا اندازہ نہیں لگا سکتا، یا دن اور رات کے تغیرات یا اس معاملے کے لیے، آسمان کے تمام ستاروں اور برج کی اس کی اعلیٰ مرضی کی اطاعت میں عاجزانہ اطاعت کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔ ایسے شخص نے اپنے جسمانی وجود اور معلوم خصوصیات کے حوالے سے اپنی روحانی خوبی کو اعتبار دینے سے گریز کیا ہے۔ صرف اگر کوئی جانتا کہ نصف کرہ کے یہ تمام ستارے خدا کی مرضی اور حکم کے تابع ہیں تو وہ ان کے جسمانی پہلو پر آنکھیں بند کرکے یقین نہ کرتا:

ٱلشَّمْسُ وَٱلْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ

"سورج اور چاند اپنے مقررہ راستے پر چلتے پھرتے ہیں۔" (سورۃ البقرۃ باب 55، آیت 5)

وَٱلشَّمْسَ وَٱلْقَمَرَ وَٱلنُّجُومَ مُسَخَّرَٰتٍۭ بِأَمْرِهِۦٓ

"اور سورج، چاند اور ستارے اس کے حکم کے تابع ہیں۔" (سورة البقرة سورة البقرة آیت ۵۴)

ایک چیز کو محکوم سمجھا جاتا ہے جسے استعمال کیا جاتا ہے اور قابو میں رکھا جاتا ہے اور کام کرنے کے لئے بنایا جاتا ہے۔ جیسا کہ انسانی اعضاء انسان کے لئے کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کو انجام دینے کے لئے ایک فنکشن تفویض کیا گیا ہے۔ ستارے بھی خدا کے بندے ہیں جو اس کے احکام کو پورا کرتے ہیں۔ اسی طرح، جس طرح دماغ انسانی جسم کے دوسرے اعضاء کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ اس کی طرف سے انسان کو عطا کردہ سمجھدار صلاحیتوں کے ساتھ مل کر کام کریں، ستارے بھی خدا کی طرف سے تفویض کردہ فرشتوں کے ذریعے اپنی مقررہ کارکردگی میں مصروف رہتے ہیں، جو اس مقصد کے لیے اپنے ہدایت کاروں اور اہم محرکات کا کردار ادا کرتے ہیں۔ درحقیقت، یہ فرشتے اپنے مقررہ دائروں میں بہت سی چیزوں کے زندہ مبلغ ہیں۔

ظاہری وجہ اور اس کا اثر، یعنی نتیجہ، صرف اتنا ہی اہمیت رکھتا ہے۔ نااہل اتفاقات سب کچھ لوگوں کو چیزوں پر اس حد تک یقین دلانے کے لئے موجود ہیں کہ ان کی حیثیت کا موازنہ افسانوی اندھے مردوں سے کیا جاسکتا ہے جنہوں نے ایک ہاتھی کو تاریک حصے میں جزوی طور پر پکڑا ، اور پورے کے بارے میں سوچنے کے بجائے ، ان میں سے ہر ایک کو غلط فیصلے کی بنیاد پر ایک مختلف نام دیا۔ یہی بات اس نجومی پر بھی لاگو ہوتی ہے، جو اسی طرح ایک غلام کو آقا یعنی بادشاہ سمجھتا ہے۔ قرآن کریم میں یہ بات واضح طور پر بیان کی گئی ہے:

لَآ أُحِبُّ ٱلْأَفِلِينَ

"مجھے ان لوگوں سے محبت نہیں ہے جو غروب ہوتے ہیں [جیسا سورج غروب آفتاب کے وقت کرتا ہے]۔ (سورة البقرة القرآن باب 6 آیت 76)

جاہلوں نے چاند اور سورج کو خدا سمجھا ہے کمانڈر کو کمانڈر کہا جاتا ہے جب تک کہ عقل و دانش غالب نہ ہو۔ بارہ "*بروج*" ہیں ، یعنی آسمانی دائرے میں ماؤنٹ۔ اس کا موازنہ ایک اعلیٰ بادشاہ سے کیا جا سکتا ہے جو اپنے "وزیر" (وزیر) کے ساتھ اپنے شاندار حجرے میں بیٹھا ہے۔ اس کے ارد گرد ، امن کے بارہ ممتاز آسمانوں میں "وزیر" (بادشاہ کے وزیر) کے اشرافیہ کے معاونین بیٹھے ہوئے ہیں ، ہر ایک کا ایک دروازہ ہے۔ سات فرمانبردار لیکن چست گھڑ سوار "وزیر" کے معاونین کے اشارے اور پکار پر ہر دروازے کے ارد گرد گھوم رہے ہیں اور موصول ہونے والے سمن کو غور سے سن رہے ہیں۔ ان پر فوری عمل درآمد کے لئے ، ان گھڑ سواروں سے کچھ فاصلے پر چار آدمی پیدل کھڑے ہیں ، جو اپنی کمان کے ساتھ ان گھڑ سواروں کو غور سے دیکھ رہے ہیں ، اس طرح لوگوں کے ایک خاص گروہ کو شامل کرکے اور انہیں ہائی کمانڈ کے سامنے پیش کرکے موصول ہونے والی ہدایات کو پورا کرتے ہیں۔ پھر انہیں یا تو سزا دی جاتی ہے یا انعام دیا جاتا ہے۔

اسی مناسبت سے "*ارش*" ("الٰہی قادر مطلق کی سلطنت") امور کے انچارج ممتاز وزیر ("وزیر") کی امتیازی حیثیت کا مسکن ہے، یعنی آسمان پر پسندیدہ فرشتہ۔ یہ ستاروں کے نصف کرہ میں پہاڑوں کے برعکس ہے جیسا کہ ایک نجومی نے تصور کیا ہے۔ یہ کلیروائنٹس آسمان کے شطرنج کے تختے پر پیادوں اور سامان کی مختلف پوزیشن کو اسی طرح مختلف معنی تفویض کرتے ہیں جس طرح ایک معالج مختلف علامات کے ذریعہ مختلف بیماریوں کو سمجھتا ہے:

ذَٰلِكَ مَبۡلَغُهُم مِّنَ ٱلۡعِلۡمِۚ

"یہ ان کا علم کا مکمل حصول ہے۔" (سورة البقرة باب 53، آیت 30)

لیکن جب اللہ تعالیٰ کی رحمت ایسے بیمار پر آجاتی ہے تو مذکورہ بالا خادمہ اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں جیسا کہ بیان کیا گیا ہے اور وہ نجات پاتا ہے۔ نبی کا راستہ بھی اسی انداز میں ستاروں سے مزین ہوتا ہے اور "*ولی*" بھی کسی کے علاج میں معجزے کرتا ہے۔

اِنَّ الْبَلَاءَ مَوَكَّلٌ بِالْاَنْبِيَاءِ ثُمَّ الْاَوْلِيَاءِ ثُمَّ الْاَمْثَلُ فَا الْاَمْثَلُ
مَرِضْتُ فَلَمْ تَعِدْنِیْ

"بیشک نبیوں کو آزمائشوں اور مصیبتوں سے دوچار کیا جاتا ہے، پھر اللہ کے *قریبی* لوگ اور پھر وہ لوگ جو ان کے جیسے ہیں (لیکن سب اللہ کے حضور اپنے درجات کے لحاظ سے کم درجے کے ہیں]۔ لہذا، جب میں بیمار ہوں، تو میری صحت کے بارے میں مت پوچھو۔" *(حدیث* یا حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

ہم کچھ ایسے لوگوں کو بھی دیکھتے ہیں جو بہت بیمار نظر آتے ہیں لیکن بیمار نہیں ہیں۔ دراصل یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کی محبت کی وجہ سے ایسی حالت میں آ گئے ہیں، جن کی وہ اتنی پرستش کرتے ہیں کہ وہ بیمار نظر آتے ہیں۔ یقینا ، محبت بہت خود کو استعمال کرنے والی ہے!

اب آپ کو "*سبحان اللہ*"، "*الحمدللہ*"، "*لا الہ*" *اور "اللہ اکبر" (اللہ تعالیٰ کے* لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ *سوا کوئی معبود نہیں) اور* "اللہ اکبر" *(اللہ تعالیٰ سب سے بالاتر ہے) کی اصطلاحات کے معنی سمجھ لیں* کیونکہ یہ "معارفہ" کے اٹوٹ مجموعہ ہیں" یا خدا کی گنوسس۔

مفروضہ یہ ہے کہ جب آپ اپنے نفس کو پہچانتے ہیں یعنی اپنے اندر جو تقویٰ اور نیکی ہے اس میں آپ اللہ تعالیٰ کی اعلیٰ تقویٰ اور نیکی کو پہچانتے ہیں اور اس طرح سبحان *اللہ* کو سمجھتے ہیں۔ جب آپ اپنے سلطنت کے بادشاہ ہونے کی وجہ سے خدا کی بادشاہت سے واقف ہوجاتے ہیں اور پوری کائنات پر خدا کی عظیم الشان برتری کی سچائی کو جذب کرتے ہیں کیونکہ ہر چیز اس کے تابع ہے۔ تب ہی آپ غور کر سکتے ہیں کہ آپ کو الحمد للہ کا مفہوم سمجھ آ گیا ہے۔ بے شک تمام تعریفیں اور شکر اسی کے لیے ہیں اور صرف اسی کے لیے ہیں۔

اب آخری لیکن کم از کم، آپ کو یہ سمجھنا ہوگا کہ "*اللہ اکبر*" کا مطلب کیا ہے۔ اس کا مطلب صرف "خدا عظیم ہے" نہیں ہے۔ اس کا مطلب اس سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ وہ دوسروں سے بڑا ہے۔ وہ سب سے بڑا ہے۔ اس کے باوجود، اس کے اور کسی اور کے درمیان کوئی موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ہر طرح کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ وہ لامحدود طور پر سب سے بڑا ہے۔ وہ ہر چیز پر غالب ہے اور اس کا احاطہ کرتا ہے۔ وہ

قادر مطلق ، جاننے والا ، ہر چیز پر حاضر اور رحم کرنے والا ہے ہم اس کی اور اس کی بہت سی منفرد اور شاندار خصوصیات اور طاقتوں کے بارے میں اس کی تخلیقی ذہانت اور اس کے مقدس ناموں سے جانتے ہیں۔ وہ اتنا عظیم اور بے مثال ہے کہ ہم کبھی بھی اس کی وضاحت کرنے یا اس کی نعمتوں کو شمار کرنے کے قابل نہیں ہیں۔

خدا کی تقویٰ انسان کی تقویٰ کی طرح نہیں ہے۔ یہ صرف نہیں ہو سکتا۔ یہ ہم ہی ہیں جو اس کی عظیم صفات کو بیان کرنے کے لیے الفاظ نہیں ڈھونڈ سکتے، اور ایسا کرتے ہوئے اس کی طرف ایسے الفاظ یا تاثرات منسوب کرتے ہیں جو کافی نہیں ہیں کیونکہ وہ اپنی تمام مخلوقات کا خالق ہے۔ تو وہ اس کی طرح کیسے ہو سکتے ہیں؟ اسی طرح، خدا ہمیں معاف کرتا ہے، جب ہم ایک انسان کی بادشاہی جس پر حکمرانی کرتا ہے اور خدا کی بادشاہی جس پر اس کی بادشاہی ظاہر ہوتی ہے کے درمیان موازنہ کرتے ہیں، تو ہمارا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ایک جیسے ہیں۔ اس سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہم کتنے نااہل ہیں، انسان کتنا بے بس ہے اور خدا کتنا جلال والا ہے! مثال کے طور پر ، اگر کوئی بچہ ہم سے کسی ریاست پر حکمرانی کرنے اور اسے سمجھانے کے لئے پوچھتا ہے تو ، ہم جواب دیتے ہیں کہ یہ وہی ہے جو آپ کو اپنے بیٹ اور گیند سے کھیلنے میں ملتا ہے ، آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ہم حقیقت سے کتنے قریب یا دور ہیں۔ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں اور ہم اس بات کا اعادہ کرتے ہیں کہ صرف خدا ہی خدا کو مجموعی طور پر جانتا ہے اور کوئی اور نہیں جانتا۔ ان حالات میں انسان کے لئے اپنانا بہترین طریقہ یہ ہے:

1. اپنی بہترین صلاحیت کے مطابق اس کی گنوسس ("معارفہ") کی تلاش میں مگن ہو جاؤ۔
2. اس کی نعمتوں پر توجہ مرکوز کرنا اور اس کی روشنی (*"نور"*)، اس کی خوبصورتی (*"جمال"*) اور اس کی قدرت (*"قدرہ"*) کو اس کی الہامی صفات اور مخلوقات میں تلاش کرنا۔
3. اس کی مہربانی کے لئے اس کا شکر ادا کرنا۔
4. اپنے دل و جان کے ہر ریشے سے اس کی عبادت کرنا۔
5. اس کے احکام کی اطاعت کرنا۔

ہم سب اسی کی طرف سے آئے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔

اِلَیْهِ الْمَرجِعُ وَ الْمَصِیْرُ

اسی کی طرف ہمارا لوٹ کر جانا ہے اور اس کا ٹھکانہ ہے۔

جتنا زیادہ آپ اس سے محبت کریں گے، اس کی تعظیم کریں گے، اس کی عبادت کریں گے، اتنا ہی آپ [اس کی طرف سے] برکت پائیں گے۔ وہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو مخلص ، مخلص ، عاجز ، محبت کرنے والے اور شکر گزار ہیں۔ اس طرح کے نیک اخلاق کا اجر یقینا ملے گا۔

اَنَا بُدَّكَ اللَّازِمُ فَالْزِمْ بُدَّكَ

"میں (یعنی خدا) تمہارا ناگزیر ہوں اس لیے اپنی ناگزیریت کو مضبوطی سے تھامے رکھو۔"

دل کے دل سے اس کی یاد *(ذکر)* کو صرف اپنی روح سے تمام [حقی] خواہشات کو الگ کرنے، [تمام] مکروہ اعمال کو ترک کرنے اور اس کی عبادت میں مکمل طور پر غرق ہو کر ہی مضبوط کیا جا سکتا ہے۔ مخلص دل پرسکون اور صاف ستھرا ہوتا ہے۔ مومن کی عظمت اس میں ہے:

قَدْ أَفْلَحَ ٱلْمُؤْمِنُونَ

"ایمان والے کامیاب ہوئے (حقیقی، آخری، دائمی اور ابدی کامیابی کے ساتھ)۔ (سورۃ البقرۃ البقرۃ آیت 1)

اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بیان کیا ہے:

قَدْ أَفْلَحَ مَن تَزَكَّىٰ ﴿١٤﴾ وَذَكَرَ ٱسْمَ رَبِّهِۦ فَصَلَّىٰ ﴿١٥﴾

"بیشک وہ کامیاب ہے جو اپنے نفس کو پاک کرے اور اپنے رب کے نام کو یاد کرے اور اس سے دعا کرے۔" (سورۃ البقرۃ سورۃ البقرۃ آیت نمبر 14 تا 15)

دنیا کو جاننا

الغزالی نے اپنی کتاب "*کیمیا* سعادت" یا "کیمیا یا ابدی خوشی اور لامتناہی کامیابی کے لئے تبدیلی کا تغیر پذیر ایجنٹ" میں اس ابدی خوشی (یا تبدیلی کے ایجنٹ) میں سے تیسرے کی وضاحت کرتے ہوئے جاری رکھا ہے جو "دنیاوی زندگی کی دنیا اور حقیقت کو جاننا" ہے۔ ابدی خوشی کے تبدیلی کے ایجنٹ کی تیسری ضرورت کی وضاحت کرتے ہوئے - "دنیاوی زندگی کی دنیا اور حقیقت کو جاننا" ، وہ لکھتے ہیں:

پیارے محبوب! یہ دنیا ایک ایسا راستہ ہے جس پر انسان اپنے سفر پر اگلی دنیا کی طرف سفر کرتا ہے۔ یہ "*معارفہ*" یا گنوسس [خدا] کے ایک وسیع و عریض صحرا کے اختتام پر ایک نخلستان ہے۔ یہ دنیا اور آخرت دو شرائط ہیں۔ ایک حالت انسان کی زندگی اور زمانے سے متعلق ہے [جو کسی کے بہت قریب ہے] موت سے پہلے۔ آخرت انسان کی موت کے فورا بعد شروع ہوتی ہے۔ یہ دنیا (اور دنیاوی زندگی) انسان کے لیے ہے کہ وہ آخرت کی تیاری کرے۔ اس زندگی کا مقصد یہاں قیام کے لیے اپنی کمائی کے طور پر نیک اعمال کا خزانہ جمع کرنا ہے جو آخرت میں نیک مقام پر کھڑا رہے گا۔ اگرچہ انسان کو اپنی ابتدا میں کمزور اور نامکمل پیدا کیا گیا ہے، لیکن بیک وقت اس کو ایسی

ذہانت (منفرد صلاحیت) سے نوازا گیا ہے کہ خدا کے احکامات پر عمل کرتے ہوئے، کوئی شخص "*کمال*" یا کمال اور فضیلت حاصل کرنے کی پوزیشن میں ہو سکتا ہے، فرشتہ کی صفات حاصل کر سکتا ہے اور خدا کے جلال کو دیکھ سکتا ہے۔ یہ کسی کے وجود کا مجموعہ ہے۔ یہی وہ جنت ہے جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔

اس کی معرفت کی کلید انسان کی اس عظیم مہربانی کے شکر گزاری اور اس کی بے شمار نعمتوں کی تعریف اور اس کی تخلیقات کی دلکش خوبصورتی کے ادراک میں مضمر ہے۔ انسان کے ادراک کے حواس انسان کو اس کی پیدا کردہ دلکش چیزوں کا ذائقہ چکھنے اور لطف اندوز کرنے پر مجبور کرتے ہیں، بے پناہ خوبصورتی کی انوکھی شان کو دیکھتے ہیں، جو فطرت میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔ کسی کے کان سکون بخش آوازوں اور موسیقی کی تعریف کرتے ہیں ، کسی کے ہاتھ محبت کے لمس کی گرمی کو محسوس کرتے ہیں ، وغیرہ۔ جب تک انسان زندہ ہے، انسان ان سب سے لطف اندوز ہو سکتا ہے اور (اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر سکتا ہے کہ وہ بغیر کسی سے پوچھے بھی اس کے بے پناہ نعمتوں کا شکر ادا کر سکتا ہے]۔ جب کوئی مر جاتا ہے تو ، وہ ان انٹیلی جنس [جمع کرنے] ایجنٹوں (یعنی حواس) کی آزادانہ طور پر پیش کی جانے والی خدمات سے محروم ہوجاتا ہے جو اب باقی نہیں رہتے۔ لہٰذا انسان کو زندگی میں دو چیزوں کی ضرورت ہے:

1. اپنے دل کو ان چیزوں سے بچانا جو کسی کے دل کو مار دیتی ہیں۔ اپنے دل کو اس کی خوراک [اور غذائیت] فراہم کرنی چاہیے۔

(۲) اپنے جسم کو ان چیزوں کے مضر اثرات سے بچانا جو اسے نقصان پہنچاتی ہیں اور ہلاک کرتی ہیں۔ اسی طرح اسے کھانا فراہم کرنا چاہیے۔

اس سے پہلے ہم نے یہ ثابت کیا ہے کہ دل کی غذا خدا کی محبت اور معرفت ہے جو اس فرمان پر مبنی ہے کہ ہر چیز کی خوراک وہی ہے جو اسے واقعی پسند ہے اور اس کی داخلی اور فطری خصوصیات کی بنیاد پر اس کی خواہش ہے۔ یہ پرورش دینے والا اور پائیدار بھی ہونا چاہئے۔ اس معاملے کے لئے ، جسم کی دیکھ بھال بھی دل کی خاطر ہے۔ کیونکہ جسم آخر کار ہلاک ہو جائے گا لیکن دل زندہ رہے گا [یہاں تک کہ موت کے بعد بھی] ہمیشہ کے لیے۔ اس سلسلے میں ایک سادہ سی مثال دی جا سکتی ہے، جیسا کہ جسم دل کے لیے ہے، جس طرح اونٹ (پرانے زمانے میں نقل و حمل کا ذریعہ ہے) خدا کی راہ میں حج یا حاجی کے لیے ہوتا ہے۔ اس پر سوار ہو کر "*خانہ کعبہ*" (مکہ مکرمہ میں خدا کا مقدس گھر) پہنچتا ہے۔ اس کے برعکس درست نہیں ہے، یعنی حاجی اونٹ کے لیے نہیں بلکہ اونٹ حاجی کے لیے ہے۔ قدرتی طور پر حاجی اونٹ کو اس وقت تک کھانا کھلائے گا جب تک کہ وہ خانہ کعبہ تک نہ پہنچ جائے۔ اس وجہ سے کسی کی طرف سے کسی کی طرف سے کسی بھی طرح کی کمی یا تاخیر ، کسی کی طرف سے کسی کے مقصد کو نقصان پہنچے گا۔

اس معاملے کا مزید تجزیہ کرتے ہوئے انسانی جسم کو تین چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے:

(a) کھانا

(b) کپڑے

c) گھر.

دوسرے لفظوں میں کھانے کے لیے کھانے کی ضرورت ہوتی ہے، اپنے آپ کو ڈھانپنے کی ضرورت کے لیے کپڑوں کی ضرورت ہوتی ہے، گھر حرم کی جگہ ہے جہاں گرمی اور سردی کے حملے سے پناہ حاصل کی جا سکتی ہے تاکہ جسم کو نقصان سے محفوظ رکھا جا سکے۔ مختصرا، یہ تینوں چیزیں جسم کی بنیاد، بنیادی شرائط ہیں، یعنی کسی کے جسمانی وجود کی بنیاد۔ تاہم اگر انسان ضرورت سے زیادہ کھاتا ہے تو وہ مر سکتا ہے۔ گھر اور کپڑوں کی خواہش بھی انسان میں روزی روٹی کے لیے پیدا ہو گئی ہے۔ اس نوعیت کی ضرورت سے زیادہ مانگ نقصان دہ ہوسکتی ہے۔ یہاں عقل، عام فہم کسی کی مدد کے لیے آتی ہے اور جسم کے ان مطالبات میں ضرورت سے زیادہ ملوث ہونے سے روکتی ہے۔ نیکی کا اصول جس میں تمام اخلاقی اقدار شامل ہیں یا جس سے وہ اخذ کی جاتی ہیں، سب سے زیادہ یا اعلیٰ ترین اچھائی جو ان کی نگرانی کرتی ہے، وہ دل ہے۔ اس کا کھانا عمدہ ہے۔ دل کو جتنا زیادہ کھانا ملتا ہے، اتنا ہی روح کے لیے بہتر ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں ایک دل خدا کی محبت اور جستجو کے ساتھ اچھی طرح پروان چڑھتا ہے ، اپنا مقام ڈھونڈ لیتا ہے اور جسم پر ایک نائٹ سوار کی طرح سوار ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں اس کے پہاڑ کی باگ ڈور ہوتی ہے۔ لہٰذا میرے دوست پر توجہ دیں اور اس کی لگام ڈھیلی نہ ہونے دیں۔ جب آپ جسم کی خواہشات پر مکمل طور پر قابو پا لیں گے تو لالچ، بددیانتی، ناپاک اور گمراہ کن خواہشات پر قابو پایا جائے گا۔

دنیا چیزوں کی تین اہم اقسام پر مشتمل ہے یعنی:

(۱) وہ چیزیں جو زمین پر پائی جاتی ہیں جیسے ہر قسم کے نباتات، کانیں اور جانور وغیرہ۔ زمین کی سطح اپنے آپ میں انسانی رہائش، زراعت وغیرہ کی بنیاد بناتی ہے۔

2) معدنیات جیسے لوہا، اسٹیل، کانسی وغیرہ کا استعمال انسانوں کو مختلف مقاصد کے لیے درکار آلات، اوزار اور دیگر آلات بنانے کے لیے کیا جاتا ہے۔

(۳) انسان جانوروں پر سوار ہوتا ہے اور ان کا گوشت کھاتا ہے اور کھانے کی دوسری چیزیں کھا کر اپنے وجود کو برقرار رکھتا ہے۔

اس کے علاوہ بھی بہت سی پیچیدگیاں ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ اپنے روزمرہ کے معمولات میں اپنے ہاتھ پاؤں اور سب سے بڑھ کر اپنے دل کو ان میں مصروف رکھتا ہے، کیونکہ اس طرح کے دل کی مکمل مصروفیت واقعی بہت نقصان دہ ہو سکتی ہے۔ یہ اپنے اصل مقصد کو فراموش کرنے اور دنیاوی لالچ، غیبت، غصے اور اسی طرح کے برے کاموں میں ملوث ہونے کی وجہ سے دل کی موت کا باعث بن سکتا ہے۔

اسی طرح تین پیشے - سنار (دھاتوں کے لیے)، بنائی اور فن تعمیر کے پیشے بھی انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ پیشے نہ صرف کسی نہ کسی شکل میں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں بلکہ ان کے ماتحت تجارتوں سے بھی فعال طور پر وابستہ ہیں۔ جیسے کپاس چننے والے کپاس کے باغات سے کپاس کے پھول چنتے ہیں۔ کاسٹر فلف کو چھانتے ہیں۔ کپاس کے کاتنے والے انہیں دھاگوں میں گھماتے ہیں اور آخر کار کپاس کے بنکر انہیں مختلف قسم کے کپڑوں میں بنتے ہیں۔ اس کے بعد ان کپڑوں کو سلائی اور سلائی کی جاتی ہے۔ لوہا ساز ایسے اوزار بناتا ہے جس سے سلائی ، سلائی اور سلائی کی جاتی ہے۔ اس طرح مختلف پیشوں کے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ کام کرتے ہیں۔

ہر ایک دوسرے پر منحصر ہے۔ قدرتی طور پر ، پیچیدگیاں اور پیشہ ورانہ حسد قائم ہوجاتے ہیں۔ درزی عملی طور پر بنے ہوئے مواد کے لیے بنکر اور کتائی کرنے والے پر انحصار کرتا ہے، جو اسے بڑھئی یا لوہے کے ذریعہ بنائے گئے اپنے مکینیکل آلات سے گھماتا ہے، جبکہ کسی کو سلائی کے لیے اپنے اوزار اور آلات کی بھی ضرورت ہوتی ہے، جس کے لیے لوہے کی خدمات کی ضرورت ہوتی ہے۔ دینے اور لینے کے اس پیچیدہ نظام کے نتیجے میں پیچیدگیاں اور رقابتیں پیدا ہوتی ہیں، جن کے لیے تین اہم چیزیں اور دیگر عوامل جو اس مسئلے پر اثر انداز ہوتے ہیں، ضروری ہیں:

1) سیاسی، دوسرے لفظوں میں، حکمت عملی کی ذہانت اور سیاستدانگی۔

2) مانیٹرنگ گیئر اور حکومت۔

3) "*علم الفقہ*یا مذہب میں طے شدہ قواعد و ضوابط کے مطابق قانون اور ضابطہ اخلاق کا علم۔

حتمی تجزیہ میں، یہ بنیادی ڈھانچہ مذکورہ بالا تین انسانی ضروریات یعنی خوراک، لباس اور گھر یا رہائش کی جگہ کو پورا کرنے اور ان کی تکمیل کے لیے ہے۔ باقی ان کے پیچھے چلتے ہیں۔ یہ بنیادی انسانی ضروریات جسم سے متعلق ہیں۔ بدلے میں جسم دل ، روح کے لئے ہے۔ روح کو جسم پر اس طرح سوار ہونا پڑتا ہے جیسے حاجی (*حاجی*) کو کعبہ (حاجیوں کی آخری منزل - مکہ مکرمہ میں خدا کا علامتی گھر جو زمین پر خدا کی رحمت کی علامت ہے) تک پہنچنا پڑتا ہے۔ انسان کے معاملے میں کسی کا مقصد اس کا مترادف ہے، یعنی "*معارفہ*" یا خدا کی معرفت کے ہدف کو حاصل کرنا۔ *خانہ کعبہ* تک پہنچنے کے مقصد کو ذہن میں رکھنے کے بجائے اگر مذکورہ بالا حاجی سفر کے دوران، اونٹ کی دیکھ بھال اور دیکھ بھال کے دوران اپنا وقت ضائع کرتا ہے تو اس کی سنگین غفلت کا ذمہ دار صرف اپنے آپ پر عائد ہوتا ہے۔ پیارے محبوب! اس سے سبق سیکھیں۔ زندگی کے اصل مقصد اور مقصد کی قیمت پر دنیاوی معاملات میں نہ پڑیں۔ زندگی کے بیکار مشاغل [اور بیکار تعاقب] میں دنیا میں ضائع ہونے والا وقت آپ کو بہت مہنگا پڑے گا۔ یاد رہے کہ زندگی کا یہ سفر دراصل آخرت کی طرف سفر ہے۔ اس دنیا کا کرشمہ بہت پرکشش ہے۔ اندر نہ لیا جائے۔ زندگی کے فتنوں سے اوپر اٹھیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بجا طور پر فرمایا ہے کہ دنیا *ہاروت* اور *ماروت*' (مشہور جادوگروں) سے بڑا جادوگر ہے۔ دنیا کی حقیقت کا خلاصہ اس طرح کیا جا سکتا ہے:

1 . اس دنیا کی طرف سے آپ پر جادو کا پہلا جادو یہ ہے کہ اس سے آپ کو یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ دنیا اور اس کی تمام کشش ہر وقت رہنے کے لئے موجود ہے ، جبکہ حقیقت میں ، معاملہ اس کے برعکس ہے۔ وقت عارضی ہے ، مسلسل آگے بڑھ رہا ہے ، اگرچہ اس کے بجائے سست ، کیونکہ آپ اس کے خوشگوار لمحات میں وقت کی گنتی کھو دیتے ہیں۔ گزرتا ہوا وقت ، دنیا میں اس کا قدم ایک سائے کی طرح ہے۔ یہ ہمیشہ

ایک سائے کی طرح غیر فعال نظر آتا ہے جو ساکت نظر آتا ہے۔ آپ کو بعد میں احساس ہوتا ہے کہ سایہ اب وہ جگہ نہیں ہے جہاں وہ تھا ، اس کے بجائے یہ اپنی اصل پوزیشن سے آہستہ آہستہ اور غیر محسوس طور پر منتقل ہوگیا ہے۔ یقینا دنیا حرکت میں ہے۔ وقت اور جوار کسی کا انتظار نہیں کرتے۔ لہٰذا ہوشیار رہیں اور اپنے پیروں تلے گھاس کو اگنے نہ دیں۔ حاصل کردہ ایک لمحہ ضائع نہیں ہوتا ہے لیکن ایک لمحہ کھویا ہوا کبھی حاصل نہیں ہوتا ہے۔ جیسا کہ یہ ہے ، زندگی مختصر ہے۔ تو کیوں نہ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔

2. اس دنیا کے جادو کی دوسری مثال یہ ہے کہ یہ آپ کے ساتھ ایک پیارے دوست کی طرح سلوک کرتا ہے جس پر وہ دنیاوی محبت اور دوستی کے تحفے دینے کا بہانہ کرتا ہے، گویا یہ ایک وفادار ساتھی کی طرح ہمیشہ آپ کے ساتھ رہے گا۔ یہ آپ کو اس کے حکم پر ہر دلکش چالاکی سے مسحور کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ آپ اس کی توجہ کا واحد سب سے زیادہ پسندیدہ شے ہیں۔ لیکن بعد میں جب یہ آپ کو جھنجھوڑنے میں چھوڑ دیتا ہے تو ، آپ جھٹکے ہوئے اور کھو جاتے ہیں۔ آپ کو اپنی زندگی کا جھٹکا لگتا ہے۔ کیا ہوتا ہے کہ آوارہ فطرت کے ایک خوبصورت عاشق کی طرح ، وہ آپ کو اچانک چھوڑ دیتا ہے ، کسی اور پر اپنی ریشمی بیڑیاں باندھتا ہے ، اس طرح کے آسان شکار کو اپنے خطرناک پارلر میں لے جاتا ہے اور موت اور ویرانی کا مزہ چکھتا ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا عیسیٰ مسیح نے ایسی اکثر شادی شدہ عورت (جو دنیا کی حقیقت کا مجسمہ تھی) کو "کشف" کی حالت میں دیکھا اور اس سے پوچھا کہ اس نے کتنے شوہروں سے شادی کی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ اس نے گنتی کھو دی ہے۔ یسوع نے پھر اس سے پوچھا، "کیا وہ مر گئے تھے یا تم نے ان سے طلاق لی تھی؟" اس نے جواب دیا کہ اس نے ان سب کو مار ڈالا ہے! یسوع اس افسوسناک جواب کو سن کر بغیر نہ رہ سکا، "ان لوگوں پر رحم ہو جو تیرے جادو میں گر گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ ان کے پیشرووں کے ساتھ کیا ہوا تھا ، پھر بھی وہ آپ کی خوبصورتی کے جادو میں چلے گئے ، موت کی طرف اور وقت پر کوئی سبق نہیں سیکھا۔

3. اس تناظر میں تیسری مثال ایک بوڑھی عورت کی ہے جو اپنے چہرے کو دلکش نقاب سے ڈھانپتی ہے، اپنے آپ کو خوبصورت لباس سے سجاتی ہے، اپنے پروفائل کو شاندار انداز میں سجاتی ہے اور نایاب انمول زیورات پہنتی ہے تاکہ جو بھی اس پر نظر ڈالتا ہے وہ فورا اس سے محبت کر سکتا ہے۔ دنیا انسانوں کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرتی ہے۔ یہ اپنی دلکش خوبصورتی اور خوشی کے ساتھ کسی پر ایسا جادو کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ کوئی اپنی عقل سے باہر نکل جائے اور اس کے زرہ بکتر سے دنگ رہ جائے۔ یہ اس کی مشکل پن کے تمام خیالات اور غور و فکر کو ختم کر دیتا ہے۔ انسان یہ بھول جاتا ہے کہ زندگی مشکل اور سنجیدہ ہے۔ بعض اوقات کسی کو بہت دیر سے احساس ہوتا ہے جب یہ کسی کے لئے ایک بدتمیز صدمہ بن جاتا ہے جب بوڑھی عورت فیمی فیٹیل کا روپ دھار کر اپنا نقاب ہٹا دیتی ہے اور اس کے بجائے ایک بھیانک چہرہ دیکھتا ہے۔

4. چوتھی مثال یہ ہے کہ اگر کوئی کائنات کے ارتقاء کے بعد سے گزرے ہوئے وقت کا حساب لگانے کی کوشش کرے ، وہ دور جب یہ کائنات غیر موجود تھی اور اب سے اس کے اختتام تک جو وقت رہ گیا ہے ، تو اسے معلوم ہوگا کہ ایسا کرنا ناممکن ہے اور ایسا کرنے کا سوچنا بھی عقل کی حدود کو عبور کرنے کے مترادف ہے۔ سیدھے الفاظ میں ، انسان صرف اتنا جانتا ہے کہ کسی کی دنیا "جھولے سے قبر تک" ہے ، یعنی ، جھولا اس دنیا کے ذریعے زندگی کے سفر کا آغاز ہے اور قبر اس کا اختتام ہے۔ درمیان میں کچھ اسٹاپ ہیں ، کوئی کہہ سکتا ہے ، جس میں سال ، مہینے ، دن اور آخر میں سانسیں شامل ہیں۔ کچھ لمبا فاصلہ طے کرتے ہیں اور کچھ چھوٹے۔ انسان کی دنیا کی زندگی طویل ہو یا چھوٹی، اس کی عمر [حقیقت] مختصر ہے لیکن انسان اس اہم نکتے کو مکمل طور پر بھول جاتا ہے۔ کوئی یہاں اس طرح رہتا ہے جیسے وہ ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے۔ کتنی ستم ظریفی ہے کہ اگرچہ کسی کو اپنی اگلی سانس کے بارے میں بھی یقین نہیں ہے ، لیکن وہ اگلے دس سالوں کے لئے چیزوں کی منصوبہ بندی کرتا ہے تاکہ وہ ان کی ضرورت کو محسوس نہ کرے یا ان سے کم نہ ہو۔ شاید کوئی اس دن کو دیکھنے کے لئے زندہ بھی نہ رہے!

5. زندگی کی لذتوں میں حد سے زیادہ آغوش انسان کے آخرت کے لیے اتنا ہی نقصان دہ ہے جتنا کہ ضرورت سے زیادہ کھانا لالچی کے لیے نقصان دہ ہے۔ ایک بھوک دار مالامال ، میٹھا ، یا گرم ، مسالہ دار ، چکنائی والے کھانے پر چھلانگ لگاتا ہے اور اسے بے حیائی سے کھا جاتا ہے ، اس طرح کے بھاری اور غیر

ضروری کھانے کے ساتھ اپنے پیٹ پر بوجھ ڈالنے کے نتائج کی پرواہ نہیں کرتا ہے۔ اس کے نتیجے میں قے اور ڈھیلی حرکتیں شروع ہوجاتی ہیں۔ لمحہ بھر کے ذوق اور لذت کے لیے، کسی کی زیادتی انسان کو اس طرح کی ذلیلی، مصائب اور شرمندگی کا شکار کر دیتی ہے۔ یہاں تک کہ کھانے کے اتنے بھاری کورس کے بعد فضلہ بھی بیمار اور ناگوار ہے۔ چنانچہ یہ دیکھا گیا ہے کہ دنیا میں جتنا زیادہ ہوس اور بے حیائی میں مبتلا ہوتا ہے، آخرت میں اتنا ہی ذلیل ہوتا ہے۔ سانسوں کے آخری لمحے میں انسان اپنے گھر میں پیسہ، سونا، چاندی، باغ، نوکروں اور نوکرانی کی پیمائش کرے گا، ان سے علیحدگی کا درد اتنا ہی شدید ہوگا۔ اس کے برعکس غریب کو کوئی پچھتاوا نہیں ہوگا۔ درد کی اس طرح کی تکلیف صرف اس کی بگڑتی ہوئی حالت میں اضافہ کرتی ہے جس کا اختتام "*انب*" یا [خدائی] برے اعمال کا بدلہ لینے پر ہوتا ہے۔

6 . زندگی کا ایک اور غیر معمولی عنصر یہ ہے کہ اس دنیا کے معاملات ان کے بارے میں ناگزیر ہیں۔ وہ عام کاموں کی طرح نظر آتے ہیں ، معمول اور مشکل نہیں۔ دوسرے تمام تصورات اور تفکرات سے غافل ہو کر انسان ان میں مکمل طور پر مگن ہو جاتا ہے۔ کسی کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ پہیوں کے اندر پہیے ہیں اور ان میں پہیے ہیں۔ ایک چیز دوسری چیز کی طرف لے جاتی ہے ، جس کے نتیجے میں کسی کی زندگی ضائع ہوجاتی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا ہے کہ اس دنیا کا متلاشی اس شخص کی مانند ہے جس کے ہونٹ سمندر کے کنارے سے جڑے ہوئے ہیں اور اس سے اپنی پیاس بجھانے میں بے تابی سے مگن ہے۔ اس کی پیاس بڑھتی نظر آتی ہے۔ وہ جتنا زیادہ پیتا ہے ، اتنا ہی وہ ایسا کرنا چاہتا ہے۔ آخر کار ، وہ اس بیکار تعاقب میں مر جاتا ہے ، پیاسا اور غیر مطمئن رہتا ہے۔ یہ ہے شہوت کی لعنت [اس دنیا اور اس کے مال] کے لیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کے بارے میں فرمایا ہے کہ یہ ممکن نہیں کہ کوئی شخص پانی میں ڈوب جائے اور گیلا نہ ہو۔ اس قسم کا ایسا شخص ، جس میں اس دنیا کے لئے اتنا واضح جنون ہے ، یقینی طور پر اس سے بدنام ہوگا۔

7 . اس دنیا کی ساتویں مثال اس مہمان کی طرح ہے جو کسی ایسے میزبان کے پاس جاتا ہے جو بہت امیر ہے اور اس کی عادت ہے کہ وہ اپنے مہمانوں کے ساتھ خوش اسراف کرتا ہے جو استقبال کے بہترین معیار کی وجہ سے بڑی تعداد میں کسی کے پاس آتے ہیں۔ ایک انہیں چاندی کے چولہے میں آبنوس اور عنبر کے خوشبودار ماحول میں عمدہ ڈیزائن اور سجاوٹ کے شاندار ڈیزائن اور سجاوٹ کی پلیٹوں میں عمدہ کھانے پیش کرتا ہے۔ ایک سمجھدار مہمان جو کسی کی فطرت کو سمجھتا ہے، شکر گزاری کے ساتھ اس میں حصہ لیتا ہے، اس میں اپنی تھوڑی سی خوشبو شامل کرتا ہے اور میزبان سے خوشی سے رخصت لیتا ہے، ان کے باہمی اطمینان کے لیے۔ دوسری طرف ، ایک لالچی مہمان اپنی مہمان نوازی کے بعد کسی کے قابل میزبان سے قیمتی سامان لوٹنے کی کوشش کرتا ہے ، اور اس عمل میں میزبان کے نوکروں کے ذریعہ پکڑا جاتا ہے اور اس کی بے عزتی کی جاتی ہے۔ انسانی ہوس اور اس کی گھٹیا خواہشات فحش ہیں۔ اس دنیا کے اس سفر میں ، کسی کی اپنی جائز طور پر حاصل کردہ جائیداد اس کا اپنا حقیقی سامان ہے جسے وہ اپنے سامان کے طور پر اپنے ساتھ لے جا سکتا ہے۔ اس گیسٹ ہاؤس (یا جدید دور میں ہوٹل) میں، کوئی بھی صرف قانونی اور حقیقی سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ لالچ کسی کو کوئی فائدہ نہیں دے گا۔

8 . دنیا کی اگلی مثال یعنی اس کی مشغول نوعیت کی یہ ہے کہ انسان اس میں کھو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ کوئی شخص آخرت کو مکمل طور پر بھلا دیتا ہے مثال کے طور پر ، جہاز پر سوار لوگوں کا ایک گروپ۔ وہ راستے میں ایک جزیرے پر پہنچتے ہیں جہاں وہ تھوڑی دیر کے لئے تھوڑی دیر کے لئے باہر نکلتے ہیں ، ذاتی حفظان صحت اور وضو کرنے کے لئے۔ کپتان اعلان کرتا ہے کہ جہاز کو جلد ہی روانہ ہونا چاہئے ، لہذا انہیں اپنی تمام ضروریات کو جلدی سے پورا کرنا چاہئے اور جلدی سے جہاز پر دوبارہ سوار ہونا چاہئے۔ ان میں سے سمجھدار تیزی سے ایسا کرتے ہیں ، جبکہ سست لوگوں کا دوسرا گروہ ، ادھر ادھر بکھرے ہوئے ، نظروں سے اوجھل ہوجاتا ہے ، غیر ضروری طور پر جزیرے کا دورہ کرتا ہے ، اس جگہ کی قدرتی خوبصورتی ، اس کے نباتات اور حیوانات اور رنگین سمندری خولوں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ جب وہ واپس آتے ہیں تو ، انہیں معلوم ہوتا ہے کہ جہاز پر آرام دہ اور پرسکون جگہیں لے لی گئی ہیں۔ لہذا ، انہیں تاریک اور گندے کونوں میں بیٹھنا پڑتا ہے۔ ان کے بعد آنے والے لوگوں کا اگلا گروہ اپنے ساتھ ان شنکھوں کا بھاری بوجھ لے کر آتا ہے۔ انہیں اسی طرح کے فضول سفر کی وجہ سے اپنے پیشرووں سے بدتر مقامات ملتے ہیں۔ وہ اتنے الجھن میں پڑ جاتے ہیں کہ انہیں جہاز پر بیٹھنے کے لیے شاید ہی کوئی جگہ مل جاتی۔ اس کے علاوہ ، انہیں اپنے گلے میں باندھے ہوئے ان خوبصورت خولوں کا بوجھ اٹھانا پڑتا ہے۔ دو دن کے بعد یہ گولے گندے ہو جاتے ہیں اور بدبودار ہونے لگتے ہیں۔ اس سے بھی بدتر بات یہ ہے کہ جگہ کی کمی کی وجہ سے ، وہ اس بوجھ کو بھی دور نہیں کرسکتے ہیں۔ ان کی شرمندگی اور توبہ بھی

اتنی ہی بھاری ہے۔ بیکار افراد کا آخری گروہ جزیرے کی کھوج میں اتنا مگن ہو جاتا ہے کہ ان کی بے ترتیبی میں، وہ فوری طور پر جمع ہونے کے لیے کپتان کی کال کا نوٹس لینے میں مکمل طور پر ناکام ہو جاتے ہیں، اپنے جہاز سے محروم ہو جاتے ہیں اور بیابان میں مر جاتے ہیں۔

مختصرا یہ کہ ان میں سے پہلا گروہ مومنوں کی طرح ہے اور ان میں سے آخری کفار کا ہے جو ان لوگوں کی طرح ہیں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور قیامت کو بھول گئے ہیں۔

استحبوا الحياة الدنيا على الآخرة

"انہوں نے آخرت پر دنیا کی محبت کو ترجیح دی ہے۔"

بیچوان دو گروہ وہ گنہگار ہیں جنہوں نے اپنے بہتر فیصلے اور مقرر کردہ طرز عمل کے خلاف غلطی کی۔ وہ دنیا اور آخرت میں دکھ اٹھاتے ہیں۔ وہ اپنے بداعمالوں کی سزا کا نشانہ بنتے ہیں۔

ہوشیار رہیں کہ یہ دنیا کی مذمت نہیں ہے۔ بہر حال، دنیا خدا کی طرف سے پیدا کی گئی ہے، لہذا یہ بے مقصد نہیں ہو سکتی۔ اس دنیا میں سب کچھ بری نہیں ہے۔ مثلا علم یا علم بذات خود اور *عمل* اپنے آپ میں دو خوبیاں ہیں۔ یہاں تک کہ یہ دونوں بظاہر دنیا میں ہیں بلکہ آخرت میں انسان کے ساتھ ہیں۔ مثال کے طور پر "*معرفہ*" یا خدا کی معرفت اور اس کا حصول انسان کے وجود کی انتہا ہے۔ "*عمل*" یا کسی کے اعمال اور نیک اعمال کا اپنا مثبت دیرپا اثر ہوتا ہے، یعنی اس کے نتیجے میں روح کی پاکیزگی اور تقویٰ جو برائی کو ترک کرنے اور خدا کی عبادت کے ذریعے روح کی پرورش سے حاصل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ہمیشہ یاد کرنا انسان کا ہمیشہ کا اجر ہے۔

وَٱلْبَٰقِيَٰتُ ٱلصَّٰلِحَٰتُ خَيْرٌ عِندَ رَبِّكَ

"اور دائمی نیکی کا اجر تیرے پروردگار کے ہاں بہتر ہے۔" (سورة البقرة آیت 18، آیت 46)

"ذکر" *کی لذت* ، یعنی خدا کی یاد ، عمدہ ہے۔ ہم اس کی عبادت کرتے ہیں اور اس دنیا میں اس کے سحر سے لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں اس کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ آخرت کی نعمت ہے۔ اس دنیا کی ایک خوشی بھی ہے جو انسان کے مرتے ہی ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کی محبت اور عبادت کی خوشی ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الدنيا ملعونة وملعون مافيها الاذكر الله وما والاه

"دنیا اور دنیاوی اثاثے تجزیاتی ہیں۔ لیکن وہ چیزیں جو خدا کو یاد کرنے میں انسان کی مدد کرتی ہیں اور ان کی مدد کرتی ہیں وہ برکت والی ہیں۔

دنیا اور اس کی بہت سی خصوصیات کے بارے میں یہ مقالہ موجودہ گفتگو کے مقصد کے لیے کافی ہے۔ اس کے نتائج اور دیگر متعلقہ امور پر انشاء اللہ مناسب وقت پر بحث کی جائے گی۔

بعد کی زندگی کو جاننا

الغزالی نے اپنی کتاب "*کیمیا* سعادت" یا "کیمیا یا ابدی خوشی اور لامتناہی کامیابی کے لئے تبدیلی کا تبدیلی کا ایجنٹ" میں ابدی خوشی اور لامتناہی کامیابی کے لئے کیمیا (یا تبدیلی کے ایجنٹ) میں سے آخری کی وضاحت کرتے ہوئے جاری رکھا ہے جو "آخرت کی حقیقت کو جاننا" ہے۔ ابدی خوشی کے تبدیلی کے ایجنٹ کے لئے چوتھی ضرورت کی وضاحت کرتے ہوئے - "آخرت کی حقیقت کو جاننا" ، وہ لکھتا ہے:

پیارے محبوب! یاد رکھو کہ جب تک تم موت کی حقیقت کو نہیں جان پاؤ گے تم یہ نہیں سمجھ پاؤ گے کہ آخرت کا کیا مطلب ہے۔ موت کی حقیقت، بدلے میں، زندگی پر براہ راست حوالہ اور اثر پڑتا ہے۔ زندگی کی صداقت روح کی اہمیت کو سمجھنے کی کوشش میں مضمر ہے جو دوسرے لفظوں میں نفس کے علم کے مترادف ہے۔ تمام ارادوں اور مقاصد کے لئے ، روح اور نفس مترادف ہیں۔ اب تک ہم پہلے ہی اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ انسان کو ایک جسمانی فریم کی شکل میں اس کے مکمل انفراسٹرکچر اور روح ("روح") کے ساتھ تخلیق کیا گیا ہے۔ اس بات کا اعادہ کرنا ضروری ہے کہ روح سوار ہے اور جسم وہ پہاڑ ہے جس پر وہ سوار ہے۔

روح جنت میں ہو گی یا جہنم میں ہو گی اس کی شکل کے مطابق، چاہے جسم کچھ بھی ہو۔ اسے یا تو مقدس کیا جائے گا یا مذمت کی جائے گی۔ جسم کے بغیر انسان پر اللہ تعالیٰ کی نعمت سے سرشار دل کے انمول اثاثے کو "روح کی جنت" کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ایسی ذات کے بابرکت شخص کو آخرت میں خوبصورت محلات، باغات اور بے شمار دیگر لذتوں سے نوازا جائے گا [جو نہ کسی آنکھوں نے دیکھے اور نہ ہی کسی دلوں نے کبھی سوچا ہو]۔ اس کے برعکس روح کو اذیت اور مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جسم کے بغیر اس کی اپنی برائیوں کی وجہ سے، اسے "روح میں آگ" کہا جاتا ہے۔ اس کا ٹھکانا دوزخ ہے کانٹے دار باڑ اور بچھو [وہاں] کسی کے ساتھی ہوں گے۔ اس موضوع پر مزید تفصیلات اس کتاب کی کتاب "*احیاء العلوم الدین*" یا "خدا کی راہ کی معرفت احیاء" میں فراہم کی گئی ہیں۔ بہت سے لوگ اس موت کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے جس پر ہم نے یہاں چھوا ہے۔ لوگ موت کے موضوع کے بجائے جنت اور جہنم پر زیادہ توجہ دینے کو ترجیح دیتے ہیں۔ *حدیث قدسی* (احادیث نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث میں خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے) میں ہے کہ:

اعدت لعبادی الصالحین ما لا عین رأت ولا اذن سمعت ولا شکر علی قلب بشر

"میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے ایسی خوشیاں تیار کی ہیں جو نہ کسی آنکھ سے دیکھی گئی ہیں اور نہ کسی کان نے سنی ہیں اور نہ کسی انسان کے دل میں واقع ہوئی ہیں۔"

مزید برآں ، انسان کے دل میں ایک کھڑکی ہے جو آسمانی (یا روحانی) دائرے کی طرف کھلی ہے جس کے ذریعے وہ غیب کے اسرار کو دیکھتا ہے۔ یہ ان کو سنی سنائی باتوں سے نہیں پہچانتا، بلکہ حقیقت میں ان کو دیکھتا ہے اور آخرت میں برکت کی کیفیت اور آخرت میں ملامت کی کیفیت کو دیکھتا ہے۔ یہ واضح طور پر سمجھتا ہے ، صحت مند یا بیمار ہونے کی دو حالتوں کے مابین واضح فرق جیسا کہ ایک معالج کرے گا۔ یہ بیماری کی صورت میں مناسب دوا لینے اور ڈاکٹر کی طرف سے مقرر کردہ روک تھام پر عمل کرنے کی فضیلت سے پوری طرح زندہ ہو جاتا ہے، اور اس نے حرام کردہ چیزوں سے باز آ جاتا ہے۔ اس عمل کو بدن کی برکت کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس، ضرورت سے زیادہ کھانے اور اپنے ڈاکٹر کی طرف توجہ نہ دینا برا ہے اور اسے جسم کی بیماری (*"شقاوتو بدنیہ"*) کہا جاتا ہے۔ عملی مشاہدے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آدم کی اولاد یعنی انسان کے دل میں نیکی اور مکروہ دونوں موجود ہیں۔ نیکی کا ثواب حاصل کرنے کا 'علاج' خدا کی عبادت اور معرفت میں مضمر ہے، جبکہ لعنت، بد اخلاقی کی زہر جہالت کی حماقت اور ذلت آمیز طرز عمل میں مضمر ہے [کیونکہ نیک مقاصد صرف نیک ذرائع سے ہی حاصل کیے جا سکتے ہیں اور حقیر مقاصد ہی حقیر ذرائع کا نتیجہ ہیں]۔ اس علم کو حاصل کرنے کے لئے ، عظیم حکمت حاصل کرنے کے مترادف ہے۔ بہت سے لوگ جو اپنے آپ کو علماء یا علماء کہہ چکے ہیں، نہ صرف اس علم سے واقف ہیں بلکہ اس کے مخالفین اور منکر بھی ہیں۔ یقینا کسی چیز کو جاننے سے اس کو نہ جاننے کی وجہ سے جھکاؤ (*علیم*) اور جاہل بنا دیتا ہے۔ پھر بھی ، وہ وہاں موجود ہیں۔ وہ صرف جسمانی جنت یا جہنم کے بارے میں جانتے ہیں۔ ان کے نزدیک آخرت سنی سنائی باتوں تک محدود ہے یا آنکھیں بند کر کے ان کی پیروی کرنے میں ہے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہم نے عربی زبان میں ٹھوس دلائل کی بنیاد پر اس موضوع کے مطالعہ اور تحقیق میں حقائق کو تحریر کیا ہے۔

ان حالات میں ہم صرف یہ اضافہ کر سکتے ہیں کہ ایک ذہین اور ہوشیار شخص جس کے باطن یا روح پاک اور غیر جانبدار ہوں، وہ آخرت کے فیصلے کی طرف جانے والا راستہ تلاش کرے گا، اس کے برعکس بہت سے لوگوں کے برعکس، جو اس کے بارے میں مکمل طور پر اندھیرے میں ہیں۔

موت کے بارے میں سچائی کو سمجھنے کے لیے آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ انسان کی دو طرح کی روحیں ہوتی ہیں۔ "*روح ہیوانی*" کا مطلب جسمانی اور حیوانی روح ہے۔ دوسرے کو "*روح انسانی*" کہا جاتا ہے جو انسان میں فرشتوں کی روح کی ابتدا کی روح ہے۔ ماخذ، ڈیلٹا، حیوانی روح کا چشمہ گوشت کا وہ گٹھڑا ہے جسے [جسمانی] 'دل' کہا جاتا ہے جو انسان کے اوپری بائیں طرف رکھا جاتا ہے۔ اس کی مندرجہ ذیل خصوصیات ہیں:

1. اس میں اعتدال پسند فطرت کے جسمانی کنجوگیشن کی نازک طور پر نادان فیبریسٹی شامل ہے۔

2. بخار یا ہلکا بخار جو اپنی ابتدا میں اعتدال پسند ہے، [جسمانی] دل کی رگوں سے نکلتا ہے، دماغ اور جسم کے دوسرے حصوں تک پہنچتا ہے۔
3. یہ دھڑکتا ہے۔

مختصرا، یہ حیوانی روح ہے جو میڈیم اور تحریک کی ذمہ داری اٹھا رہی ہے اور چلا رہی ہے۔ جب یہ دماغ تک پہنچتا ہے تو ، اس کی گرمی کم ہوجاتی ہے اور نرم ہوجاتی ہے۔ آنکھیں اس کے ذریعے دیکھ سکتی ہیں اور کان سن سکتے ہیں۔ یہ آہستہ آہستہ تمام حواس تک پھیل جاتا ہے۔ روح کو چراغ سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ جب یہ گھر تک پہنچتا ہے تو ، جہاں اسے رکھا گیا ہے اس کے ارد گرد کی دیواریں روشن ہوجاتی ہیں۔ اسی طرح جس طرح یہ چراغ ارد گرد کے ماحول کو روشن کرتا ہے، اسی طرح اس کے ارد گرد کے اعضاء ایک گھر میں ہیں، خدا اپنی اعلیٰ رحمت میں روشنی عطا کرتا ہے، آنکھوں میں دیکھنے کی طاقت اور اس روح کے ذریعہ کانوں میں سننے کی صلاحیت اور تمام حسی اعضاء قابل (فعال ہیں)۔

دوسری طرف اگر کوئی رگ متاثر ہو جاتی ہے اور مروڑ جاتی ہے یا گرہ ہو جاتی ہے تو یہ مفلوج اور بے حس اور غیر فعال ہو جاتا ہے اور معالج ہر ممکن کوشش کرتا ہے کہ یہ گرہ کھل جائے اور کسی نہ کسی طرح ہٹا دیا جائے۔ یعنی روح چراغ کے شعلے کی مانند ہے، دل بتی ہے اور کھانا تیل ہے۔ تیل کے بغیر ، چراغ ڈوب جاتا ہے۔ کھانے کے بغیر یعنی تیل کے بغیر روح کا اعتدال پسند مزاج رک جاتا ہے جس کے نتیجے میں موت واقع ہوتی ہے۔ اگر تیل موجود ہے لیکن بتی بہت زیادہ تیل استعمال کر رہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ عیب دار ہو گیا ہے اور وہ مرحلہ پہنچ سکتا ہے جب یہ بالکل کام نہیں کرتا۔ آخر کار دل کے ساتھ یہی ہوتا ہے - وہ اپنے کھانے کو قبول کرنے اور جذب کرنے سے قاصر ہوجاتا ہے۔ اسی طرح چراغ کو ڈھانپ دیا جائے تو بتلی اور تیل کی موجودگی کے باوجود یہ بجھ جائے گا۔ اسی طرح ، ایک جانور اس وقت مر جاتا ہے جب وہ شدید زخمی ہوتا ہے۔

آئیے پالش آئینے کی مثال پر نظر ڈالتے ہیں۔ جب تک یہ صاف ستھرا اور صاف ستھرا رہتا ہے ، وہ اس کو قبول کرتا ہے جو اس پر پیش کیا جاتا ہے اور اسے بہت اطمینان بخش طریقے سے آئینہ دار بناتا ہے۔ تاہم ، جب یہ گندا ، داغدار یا دھول سے ڈھکا ہوا ہے تو یہ ایسا نہیں کرسکتا ہے۔ اس میں چیزوں کی تصویریں اور ظاہری شکل نظر نہیں آتی، اس لیے نہیں کہ وہ وہاں موجود نہیں ہیں، بلکہ اس لیے کہ آئینہ بہت گندا ہو گیا ہے اور اس وجہ سے تصاویر کی عکاسی کرنے سے قاصر ہے۔

اسی طرح، میڈیم کی اس کو ہلنے کے قابل بنانے کی صلاحیت اور حیوانی روح میں اعضاء کی حساسیت کی وجہ سے اس کے موروثی فطری مزاج کی وجہ سے ہے اور اس کی باریک نازک اور نازک تپھ کی وجہ سے بھی۔ لیکن جیسے ہی نرم فطرت کی یہ خصوصیت ، اس کا مزاج ختم ہوجاتا ہے ، اس کی قوتیں جو بنیادی محرک کے طور پر کام کرتی ہیں ، کام کرنا چھوڑ دیتی ہیں۔ اس طرح خدا کی یہ انوکھی نعمت ضائع ہو جاتی ہے۔ جسمانی اعضاء کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں اور انسان کو مردہ قرار دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تفویض کردہ فرشتہ کا کام شروع ہوتا ہے، جسے ہمیں "*ملک الموط*" یا "موت کا فرشتہ" کہا جاتا ہے، شروع ہوتا ہے۔ اس طرح کے معاملات کا ادراک وہ بہتر طور پر جانتا ہے۔ ہم سنی سنائی باتوں سے انہیں "*ملک الموط*" یا "موت کا فرشتہ" کے نام سے جانتے ہیں لیکن ان کی اصل دیانت داری صرف چند لوگوں کے علم میں ہے۔

تاہم انسان کی موت کا سوال مختلف ہے۔ اوپر بیان کردہ حیوانی روح کے علاوہ انسان کی ایک اور روح (*"روح*") ہے جسے *"روح انسانی*" یا "انسانی روح" یا "دل" کہا جاتا ہے۔ یہ روح ، مذکورہ بالا جسمانی یا نامیاتی روح کے برعکس ، بہت اونچی سطح پر ہے۔ انسانی روح تقسیم کو قبول نہیں کرتی۔ اس کی اہمیت اور اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں *"معارفہ*" یا خدا کی گنوسس موجود ہو سکتی ہے۔ بے شک اللہ بھی ایک ہی ہے۔ اس کی *"معارفہ*" یا گنوسس کی تقسیم بھی قابل قبول نہیں ہے۔ لہٰذا اس کی *"معرفہ*" یا گنوسس کا تصور کسی بھی جسمانی شکل میں گھیرے ہوئے ہے، توہین رسالت کے مترادف ہے۔

پیارے محبوب! اگر دلیل کی خاطر ہم بتی، اس کے شعلہ اور انسان میں روشنی کی موجودگی کو پہلے سے فرض کر لیں تو ہم صرف چراغ کے جسمانی اجزاء یعنی اس کی ساخت اور بتی کو حیوانی شکل سے منسوب کرنے کے قابل ہوں گے، تو ہم بھی اس کی روشنی کو اس طرح سے منسوب نہیں کر سکیں گے، انسان کی 'انسانی روح' کے مطابق ہے۔ یہ ظاہر ہے، کیونکہ اس کا سابقہ عارضی ہے، لیکن مؤخر الذکر نہیں ہے، یعنی جسمانی چراغ کی روشنی چراغ کے تابع ہے۔ اگر چراغ ٹوٹ جائے تو اس کی روشنی بجھ جائے گی۔ لیکن انسان کی حقیقی روح (یعنی 'انسانی روح') کبھی بھی ختم یا ختم نہیں ہوتی، اگرچہ کسی کی 'حیوانی روح' فنا ہو سکتی ہے۔ ایک طرح سے، انسان میں حیوانی روح انسان کی حقیقی روح کا پہاڑ ہے جس پر وہ کاٹھی اور دوڑتا ہے۔ یہ ایک ایسا کرنے کا آلہ بھی ہے جو کسی کے فائدے کے لیے ہے۔ چنانچہ جب یہ پہاڑ (یعنی حیوانی روح) فنا ہو جاتا ہے تو انسان اس کا استعمال کھو دیتا ہے۔ اسی طرح ، اس کی غیر موجودگی میں ، ایک شخص زیادہ اعتماد حاصل کرتا ہے اور زیادہ خود مختار اور خود انحصار بن جاتا ہے۔ خاص طور پر اس عرصے کے دوران انسان نے اتنی محنت کی ہے کہ وہ پہلے ہی بے حساب کتاب اور قابل ذکر مقام حاصل کر چکا ہے۔ اس جلال پر مہر لگانے کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے کہ موت مومن کے لیے تحفہ ہے۔

صورتحال ایک شکاری کی طرح ہے جو اپنے شکار کے سامان اور سامان کے ساتھ میدان میں ہوتا ہے۔ دلیل کی خاطر ، اگر کوئی اس شکار کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے جس کے لئے وہ خاص طور پر تمام راستے پر آیا ہے لیکن [اس عمل میں] اپنا سامان کھو دیتا ہے ، تو وہ پھر بھی بہتر ہے۔ متبادل کے طور پر ، اگر کوئی شکار حاصل کرنے سے پہلے ہی اپنے شکار کا سامان کھو دیتا ہے تو ، اس کی حالت اس کی پریشانی کے لئے بدتر ہو جائے گی [کسی کے مقصد کو حاصل کرنے میں ناکامی کی وجہ سے]۔ اس کے لئے اس میں ایک گہرا سبق ہے۔ ایسا شخص اپنی ناکامی کو اپنے ہاتھوں سے پورا کرتا ہے۔ آخرت کا عذاب انسان پر غالب آ جاتا ہے اور بے شمار عذاب کے لیے عذاب ہوتا ہے

ایک شخص کچھ اعضاء میں مفلوج ہوسکتا ہے۔ کسی کے ہاتھ اور پاؤں کام کرنا چھوڑ سکتے ہیں۔ کسی کو یاد رکھنا چاہئے کہ کسی نے ابھی ان آلات کا استعمال کھو دیا ہے۔ جس چیز کا علاج نہیں کیا جا سکتا اسے برداشت کرنا چاہیے۔ لہٰذا جب تک انسان، ماسٹر ایجنٹ زندہ ہے، ان اعضاء کی اہمیت ثانوی ہے۔ کسی کی سچائی ، لہذا حقیقت ان میں نہیں ہے ، نہ پیٹھ میں ، نہ پیٹ میں اور نہ ہی سر میں۔ اس معاملے میں ، یہاں تک کہ اگر کسی کے جسم کے تمام اعضاء کام کرنا چھوڑ دیں ، اپنے خادم بننے سے باز آجائیں اور کسی کے قابو میں نہ رہیں ، پھر بھی اس کی عدم وجود ممکن ہے ، کیونکہ حیوانی روح انسانی روح کی طرح نہیں ہے۔ تاہم، اس کے دو پہلو ہیں جن پر دوبارہ زور دینے کی ضرورت ہے:

1. ایک قسم کے وجود میں [جسے زندگی کہا جاتا ہے] ، جسم کی فعال شرکت ضروری ہے۔ بھوک، پیاس، نیند وغیرہ وہ مظاہر ہیں جو جسمانی شکل کے بغیر نہیں ہوتے اور نہ ہی کام کرتے ہیں بلکہ انسان کے مرنے پر مر جاتے ہیں۔
2. دوسرے وجود میں [صرف 'انسانی روح' یا "*روح انسانی*" کے ساتھ]، جسم کا کوئی وجود نہیں ہے۔ یہ وجود خدا کی گنوسس ("*معارفہ*") کی عظیم الشان خوبصورتی ("*جمال الٰہی*") کی جستجو کا عظیم الشان ہے، اس کی شاندار شان و شوکت اور عظمت کے برابر؛ خوبصورت، حیران کن اور اتنی دلکش ہے، کہ خوشی اپنی اعلیٰ مسرت میں دنگ رہ جاتی ہے۔ یہ وہ دائمی نعمتیں ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کیا ہے۔ یہ 'بابرکت اور اچھائی کی ابدی نعمتیں' خدا کا بے مثال انعام ہیں، جس کے لیے انسانی روح کو ہمیشہ مطمئن رہنا چاہیے۔ خدا کی اشرافیہ، منتخب کردہ افراد کے پاس یہ خوبی ہے جو ان کے نفس میں سب سے اوپر ہے ("*نفس*") جو خود بخود انہیں ہمیشہ چڑھتے ہوئے اونچے مقام پر لے جاتی ہے۔ اس کے برعکس، غفلت، جہالت اور حماقت اس کا دوسرا رخ ہے جو بدحالی اور روح کی اندھا پن کے مترادف ہے:

وَمَن كَانَ فِي هَٰذِهِۦٓ أَعۡمَىٰ فَهُوَ فِي ٱلۡأٓخِرَةِ أَعۡمَىٰ وَأَضَلُّ سَبِيلٗا ﴿٧٢﴾

"اور جو شخص اس دنیا میں اندھا ہے وہ آخرت میں اندھا اور راہ سے زیادہ گمراہ ہو گا۔" (سورۃ البقرۃ البقرۃ آیت 72)

جب تک آپ انسان میں ان دونوں قسم کی روحوں کے درمیان فرق نہیں سمجھیں گے، آپ موت کو سمجھنے کے قابل نہیں ہوں گے۔

حیوانی روح جسمانی کورس کی ترتیب میں ہے ، خام بنیادی طور پر بخارات جینیات سے متعلق ہے ، جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے۔ بائل ، فائبروسس ، اور دیگر فضلہ مل کر اس کا مرکب بناتے ہیں۔ ان کے بنیادی عناصر پانی ، آگ ، دھول اور ہوا ہیں۔ لہذا ان کے تعامل سے پیدا ہونے والی یکسانیت یا تغیر کو متعلقہ گرمی، سردی، نمی اور خشکی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ طبی علم یا اس کا پریکٹیشنر - ڈاکٹر - اس کے نتیجے میں ان کی اہمیت سے پوری طرح زندہ رہتا ہے۔

تاہم، وہ نہیں جانتے کہ اپنے مریضوں کے جسم کے علاج میں، وہ غیر ارادی طور پر جسم کے جسمانی فریم کو 'انسانی روح' کے ذریعہ سوار ہونے کے قابل بنانے کی کوشش کر رہے ہیں، جو انسان کی حقیقی روح ہے۔ فطرت میں فرشتہ، "*نفس المطمینہ*" یا انسان کی نفیس روح جو باطنی سکون اور مکمل اطمینان کی سطح پر پہنچ چکی ہے، اس کی عظیم خصوصیات ہیں۔ انسان کا زندگی کا سفر اپنی مرضی سے نہیں ہوتا۔ کسی کو ایسا کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اس خرابیوں کے راستے کی اپنی حقیقی قیمت کو ظاہر کرنے اور اسے گول پوسٹ تک پہنچانے اور اس محنت اور مصیبتوں کا صلہ حاصل کرنے کے لیے مقرر کیا گیا ہے، جس کا سامنا اس مشکل راستے میں بہادری سے کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلۡنَا ٱهۡبِطُواْ مِنۡهَا جَمِيعٗاۖ فَإِمَّا يَأۡتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدٗى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُونَ ﴿٣٨﴾

ہم نے کہا: تم سب یہاں سے اتر جاؤ (یعنی خدا کی خدمت میں جنت سے)۔ یہ آدم اور حوا کو مخاطب کیا گیا تھا] ایک ساتھ؛ تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت آئے گی پھر جو کوئی میری ہدایت پر چلے گا ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ (سورۃ البقرۃ باب 2، آیت 28)

اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا ہے:

إِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَٰٓئِكَةِ إِنِّى خَٰلِقٌۢ بَشَرًا مِّن طِينٍ ﴿٧١﴾

فَإِذَا سَوَّيْتُهُۥ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِى فَقَعُوا۟ لَهُۥ سَٰجِدِينَ ﴿٧٢﴾

"اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں انسان کو مٹی سے پیدا کرنے والا ہوں پھر جب میں انسان کو ایک میں بنا دوں اور اس میں پھونکوں تو وہ روح جو میری طرف سے پیدا کی گئی ہے۔" (سورۃ البقرۃ سورۃ البقرۃ آیت 71-72)

اس آیت میں ان دونوں روحوں کے درمیان فرق کا ایک لطیف حوالہ ملتا ہے۔ ایک کو خاک سے منسوب کیا گیا ہے اور وہاں کا لفظ فطرت میں اس کے مزاج کے معنی بیان کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے، جب کہ "*لفختو فی من* روحی" یا "میں نے اپنی روح میں پھونک دیا" 'اپنی نفس' کی طرف ایک نازک اشارہ ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے اس بیماری کے جراثیم کو ختم کرنے کے لئے اسے آگ لگانے کے لئے روئی کی اون کی مشعل بنانا۔

یاد رہے کہ اس کا بنیادی عنصر "انسان کے لیے الہی قانون اور ضابطہ اخلاق" ہے جو کسی کے رہنما، ماڈریٹر اور نگران کا کام کرتا ہے۔ حتمی تجزیہ میں ہم ایک بار پھر اسی چیز کی طرف آتے ہیں، یعنی انسان کے وجود کا جوہر، خدا کی "*معرفہ*" یا گنوسس حاصل کرنے کے لیے اپنے نفس کے ادراک میں ہونا۔ اپنے نفس کو کیسے سمجھنا اور پہچاننا یہ کلید ہے کہ کس طرح خدا کی "معرفہ" یا گنوسس کو حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اسی طرح ان روحوں کے بارے میں حقیقت کو سمجھنا آخرت کا علم حاصل کرنے کی کوشش کرنا ہے۔

ایمان کی بنیادی بنیاد ("*الدین*" یا خدا کا راستہ) ، دیگر شرائط کے علاوہ ، خدا اور اس کے مقرر کردہ 'قیامت کے دن' پر واضح ایمان میں مضمر ہے۔ اس میں اس کی تنہائی میں ایک خفیہ ریکونڈائٹ ہے جہاں ہمیں چھونے کی اجازت نہیں ہے۔ اور نہ ہی اسے آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کی گہرائی میں "*معارفۃ الحق*" اور "*اخیرہ*" یعنی رب تعالیٰ کی سچائی اور اس کے وعدہ کردہ آخرت چھپے ہوئے ہیں۔ لہٰذا ، آپ اس کے علم اور تفہیم حاصل کرنے کی کوشش میں مکمل طور پر داخل ہوسکتے ہیں اور اپنی حکمت کو ختم کرسکتے ہیں۔ اس کی تحقیق اتنی خوفناک ، اتنی عجیب ، اتنی پیچیدہ ہے کہ یہ ناقابل فہم حد تک پہنچ جاتی ہے کہ جن لوگوں نے اس کے بارے میں کم سے کم سنا ہے وہ حیرت زدہ ہوگئے ، حیران ہوگئے اور اس کے الفا اور اومیگا کو بھی قبول کرنے سے انکار کردیا اور کہا کہ یہ ناممکن ہے ، فکر کی بے دینی اور بیکار میں ایک بالکل نالائق مشق پر مبنی ہے۔ نہ تو نبوی کی روایات اور نہ

ہی قرآن کریم اس مسئلے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ پھر آپ ایسا کرنے کی ہمت کیسے کر سکیں گے؟ یہی وجہ ہے کہ لوگ اسے نہیں سن سکتے۔ چنانچہ انبیاء علیہم السلام فرماتے ہیں:

كلموا الناس على قدر عقولهم

"لوگوں سے ان کی ذہانت [اور ذہنی صلاحیتوں] کی سطح کے مطابق بات کریں۔"

یہی وجہ ہے کہ بعض انبیاء علیہم السلام کو خدا تعالیٰ کی ان خصوصیات کو چھونے سے منع کیا گیا ہے جن کو لوگ سمجھنے سے قاصر ہوں کیونکہ جب وہ ان کو سمجھ نہیں پائیں گے تو وہ ان پر ایمان لانے سے انکار کر دیں گے جو ان کے لیے نقصان دہ ہوگا۔

انسان کی حقیقی روح ('انسانی روح') کے بارے میں حقیقت کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ 'حیوانی روح' اس وقت مر جاتی ہے جب انسان کے جسم کے اعضاء بے جان اور بے جان ہوجاتے ہیں۔ 'انسانی روح' [زندگی یا موت] سے قطع نظر ظاہر رہتی ہے۔ لہٰذا انسان کا قیامت، قیامت کا دن، قیامت کی اصطلاحات کا مطلب یہ نہیں ہے کہ 'کچھ بھی نہیں' کے بعد انسان دوبارہ وجود میں آئے گا۔ بلکہ ، اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو شکل دی جائے گی ، ایک نیا جسم ، جس طرح سے یہ پہلے کیا گیا تھا اور پھر اسے دوبارہ مطلوبہ خصوصیات اور خصوصیات کے ساتھ تجدید کیا جائے گا۔ یہ خدا کے لیے بہت آسان ہو گا [پہلی تخلیق کے مقابلے میں جس میں جسم اور روح دونوں پیدا کیے گئے تھے]۔

انہیں یہ سمجھنا چاہیے کہ نیک اعمال کے نتیجے میں روح کی پاکیزگی اور عظمت ہوتی ہے۔ اس طرح کے نان کنفارمسٹوں کو تسلیم کرنے میں کیوں ناکام رہنا چاہئے ، یہ کسی کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ لہذا، کسی کو منطقی طور پر سیکھنا چاہیے کہ مقدسین (گنوسٹکس)، خدا کی اشرافیہ، اپنے آپ کو اس دنیا کے سفر میں سمجھتے ہیں۔ ایسا شخص جو اس راستے پر سفر کر رہا ہے، نقصان سے بچنے کے لیے اپنے منافع اور غیر منافع بخش سامان کی تجارت اور جمع کر رہا ہے، دراصل اپنی آخری منزل یعنی آخرت کی راہ میں اپنی طرف سے کی جانے والی اچھی سودے بازی کر رہا ہے۔ کوئی جانتا ہے:

إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّآ إِلَيْهِ رَٰجِعُونَ

"ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف ہمارا لوٹ کر جانا ہے۔" (سورة البقرة باب 2 آیت 156)

لہذا ، کوئی شخص ہر وقت ٹرانزٹ میں ہونے کی حیثیت سے مکمل طور پر زندہ رہتا ہے۔ کسی کا اصل ملک یہ دنیا نہیں ہے۔ چنانچہ انسان اس راستے پر آگے بڑھتا ہے اور اپنے قیام کے دوران مختلف ٹھہرنے والے مقامات (اسٹاپ) اور سنگ میل پر آخری سامان جمع کرتا ہے۔ اس بات سے پوری طرح واقف ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص اپنے مقصد تک پہنچتا ہے تو اس کی مناسب قیمت اس کے لیے حاصل کی جائے گی جو اس نے اب تک اپنے مستقل رہائش گاہ یعنی آخرت کے ملک میں حاصل کی ہے۔

روح کے سفر میں چار الگ الگ مقام یا سنگ میل ہوتے ہیں۔ روح انسان کی حقیقت ہے جبکہ جسم نہیں ہے۔ روح کی ایک آرام گاہ بھی ہے - جس جگہ سے اس کی ابتدا ہوئی ہے وہ اس کا اصل گھر یا ملک ہے اور یہ اپنے سفر میں اس دنیا میں آیا ہے اور اس کے پاس بہت سے سنگ میل ہیں اس سے پہلے کہ وہ اپنی اصل میں واپس آجائے۔ روح کے سفر کا ہر سنگ میل ، اپنے آپ میں ایک دنیا ہے اگر کسی فلسفیانہ غور و فکر سے دیکھا جائے۔ وہ درج ذیل ہیں:

(۱) پہلا سنگ میل عالم *محسوسات* یا "حواس و حساسیت کا دائرہ" ہے۔

(۲) دوسرا سنگ میل "*عالم تخییلات*" یا "تصور کے دائرے" کا ہے۔

(۳) تیسرا سنگ میل عالم *موہمت* کا ہے یا غیب کی عقل کا عالم ہے۔

چوتھا سنگ میل "*عالم مقولت*" یا "نظم و نسب، کامیابی اور خود آگاہی کے دائرے" کا ہے۔ اسی سنگ میل میں انسان کو خود یا اپنی حقیقت اور سچائی کے بارے میں شعور ملتا ہے۔

آئیے مندرجہ ذیل مثال کے ذریعہ ان کی حیثیت کو سمجھنے کی کوشش کریں:

1. جب تک کوئی شخص "*عالم محسوسات*" یا "عقل و حساسیت کے دائرے" میں رہتا ہے یا رہتا ہے، وہ ایک کیڑے کی مانند ہے جو جلتی ہوئی شعلہ کے گرد منڈلاتا اور منڈلاتا ہے۔ کیڑے کی آنکھیں ہیں لیکن اس میں سوچنے اور یاد رکھنے کی عقل نہیں ہے۔ جلتے ہوئے شعلے کے لیے کیڑے کی کشش اس کی اندرونی خصوصیت کے لیے محاورہ ہے کہ وہ اندھیرے سے بچنے اور روشنی کی محبت سے بھڑک اٹھے۔ چونکہ اس کے پاس متوازن سوچ اور حفاظت کی طاقت نہیں ہے ، لہذا روشنی میں باہر نکلنے کی تلاش میں ، یہ غلطی سے جلتے ہوئے شعلے کو وہ افتتاحی سمجھتا ہے ، جس کے نتیجے میں یہ بالآخر تاپدیپت شعلہ پر گر جاتا ہے اور مر جاتا ہے۔ اگر کیڑے کو استدلال کی صلاحیت سے نوازا جاتا تو ، اس کے پروں پر پہلی گرم چمک محسوس ہونے کے بعد وہ شعلے کے قریب نہ جاتا۔ عقل کی یہ کمی کیڑے کو کسی حساب کی حیثیت تک نہیں پہنچتی ہے۔ مثال کے طور پر ، اس کے برعکس ، دوسرے جانور کسی چیز سے دور ہونے کی کوشش کرتے ہیں جب انہیں چوٹ پہنچتی ہے۔ چھڑی کو دیکھ کر ہی وہ خطرے سے بھاگ جاتے ہیں۔

2. عالم تخیلات کے *دوسرے مرحلے میں* انسان مویشیوں اور کمزور جانوروں کے دائرے میں رہتا ہے۔

3. تیسرا دائرہ مذکورہ بالا "*عالم موہمات*" یا "نافہم کی تمیز کا دائرہ" کا ہے۔ اس سطح پر انسان بکری اور گھوڑے کے برابر آتا ہے، یعنی دوسرے مرحلے کے کمزور ذہن والے جانوروں کے برعکس اس مرحلے پر انسان اپنے دشمنوں کو پہچان لیتا ہے اور قدرتی محرکات سے خطرے سے بچنے کی کوشش کرتا ہے، یعنی اپنی جان کے لیے بچنے کی کوششیں، جس لمحے وہ بھیڑیے یا شیر پر نظر ڈالتا ہے، اگرچہ کسی نے انہیں پہلے نہیں دیکھا ہوگا۔ ایک میں کوئی چیز کسی سے کہتی ہے کہ وہ کسی طاقتور بیل ، اونٹ یا زرافے سے نہ ڈرے ، حالانکہ وہ ان سے بڑے ہیں۔ یہ جبلت فطری طور پر [اور اندرونی طور پر] خدا کی طرف سے ایک میں پیوست ہے۔ پھر بھی یہ جانور اتنے ذہین نہیں ہیں ، یعنی ، اس سطح پر جہاں وہ اپنی دیکھ بھال کرنے کے قابل سمجھا جاسکتا ہے جو چوتھے مرحلے میں آتا ہے۔

4. چوتھا مرحلہ "*عالم مقولت*" یا "نظم و نسب، کامیابی اور خود آگاہی" کا ہے جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے۔ تیسرے مرحلے تک انسان گمنامی کے دائرے میں رہتا ہے۔ دراصل یہیں سے ہی انسان انسان کی حیثیت سے

داخل ہوتا ہے، یعنی انسان کی شان و شوکت کے دائرے میں۔ اس مرحلے میں ایسی چیزیں نظر آتی ہیں جہاں قیاس آرائی اور توہم پرستی مکمل طور پر ختم ہو جاتی ہے۔

"*عالم محسوسات*" یا "حواس و حواس کے دائرے" میں انسان آنے والی چیزوں سے گریز کرتے ہوئے چیزوں کو ان کے صحیح تناظر میں جانچنا اور جانچنا شروع کرتا ہے۔ یہاں ، کوئی چیزوں کا خلاصہ کرتا ہے جیسا کہ کوئی ان کو دیکھتا ہے۔ چیزوں کی ایک ہستی ہوتی ہے ، ایک شناخت ہوتی ہے۔ کوئی ان کی صحیح درجہ بندی کرنے کی کوشش کرتا ہے اور عام طور پر ایسا کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ فطری طور پر "*محسوسات*" یا "حواس اور حواس کے دائرے" میں انسان کا ارتکاز ایسے احساسات پر مبنی ہوتا ہے جو زمین پر چلنے جیسے کسی کے فہم احساسات سے انسان تک پہنچتے ہیں۔ لیکن آخر میں ، چوتھے مرحلے میں ، اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ کسی کی اس سے کہیں زیادہ کام کرنے کے قابل ہونے کی صلاحیت بھی ہے ، جیسے پانی پر چلنا۔ یہ انسان کے عروج کا مرحلہ ہے، "*عالم مقامات*" یا "نظم و نسق، کامیابی اور خود آگاہی" کا دائرہ۔ یہاں واضح موازنہ میں ، ایک گھومنے پھرنے والا ایک مختلف نوعیت کے حقائق کی صداقت پر مبنی ہوسکتا ہے ، جسے کسی کی روح قبول کرتی ہے اور اس طرح پانی پر چلنے کے قابل ہونے کا فائدہ اٹھاتی ہے۔ یہ انبیاء اور خدا کے "*والیوں*" یا قریبی دوستوں یا اولیاء کی اعلیٰ حیثیت ہے، جیسے ہوا میں چلنا۔ لوگوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کیا عیسیٰ علیہ السلام یا عیسیٰ مسیح پانی پر چل سکتے ہیں؟ اس نے جواب دیا:

وَلَوْ اِزْدَادَ یَقِیْنًا لَمَشٰی فِی الْهَوَاءِ

"[یسوع پانی پر چلتا تھا، تاہم،] اگر اس کا یقین مضبوط ہوتا تو وہ ہوا میں چلتا ہوتا۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسی چیزیں "*عالم ادراک*" یا "قابل تصور یا ممکن" کے دائرے میں ہیں۔ اس طرح انسان کے پہلے پائیدان سے لے کر آخری پائید تک قد کی سیڑھی پر چڑھنے اور فرشتے کی صفات حاصل کرنے کے بہت سے مراحل ہیں جو انسان کو اپنے "*معراج*" یا کامیابی اور شان کی چوٹی پر لے جاتے ہیں۔ اس چڑھائی میں "*اسفلس سفیلین*" کے نچلے طبقے سے لے کر "اعلیٰ ترین طبقہ" کی چوٹی تک بہت سے خطرات موجود ہیں جیسا کہ قرآن کریم میں بیان کیا گیا ہے:

إِنَّا عَرَضْنَا ٱلْأَمَانَةَ عَلَى ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ وَٱلْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَن يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا
وَحَمَلَهَا ٱلْإِنسَٰنُ ۖ إِنَّهُۥ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ﴿٧٢﴾

"ہم نے امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا لیکن انہوں نے اس کو اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈرنے لگے۔ انسان نے اسے اٹھا لیا جو یقینا ظالم اور جاہل تھا۔ (سورۃ البقرۃ 33، آیت 72)

جانوروں اور پتھروں کی سب سے نچلی حیثیت سے فرشتوں کے مقام تک انسان کے عروج کے مختلف مراحل ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "*جمادات*" یا پتھروں، نشوونما اور نباتات میں زمین پر جو کچھ ہے اس میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ وہ نہیں جانتے۔ اس کے برعکس ، "*آلا علیین*" یا اونچائی میں سب سے سب سے اونچا اپنی شان و شوکت کی بلندی پر کھڑے ہیں۔ ان کے لیے وہاں سے اترنا ممکن نہیں جیسا کہ قرآن کریم میں لکھا ہے:

وَمَا مِنَّآ إِلَّا لَهُۥ مَقَامٌ مَّعْلُومٌ

"ہم میں سے ہر ایک کا وہاں ایک جانا جاتا اسٹیشن ہے۔" (سورة البقرة سورة البقرة آیت ۱۶۴)

جانور سب سے کم "اسفالوس سفیلین" *میں شامل ہیں۔* اس لیے ان کے لیے کوئی پیش رفت نہیں ہو رہی ہے۔ تاہم [روحانی سیڑھی کے درمیانے درجے میں] انسان خطرے میں ہے۔ کوئی بھی جانوروں کی گہرائیوں میں ڈوب سکتا ہے، [ان کی طرح بننے کے لیے]۔ کوئی بھی فرشتوں کی سطح کی بلندیوں ("*ملائکا*") کی بلندیوں تک بھی بڑھ سکتا ہے۔ "*اشرف المخلوقات*" یا تمام مخلوقات میں سے بہترین ہونے کی اتنی سنگین ذمہ داری اٹھانے کی صلاحیت، لہٰذا [انسان] کے جوہر کا معاملہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صرف انسان *ہی اس چیلنج کو قبول کر سکتا* ہے، جو اشرف المخلوقات یا تمام مخلوقات میں بہترین ہے۔

لہٰذا اس مقالے کا مفہوم اور مقصد یہ ہے کہ چیزوں کو گہرائی سے دیکھنا ہے، نہ صرف اس بات پر سطحی نظر ڈالنا ہے کہ وہ سطحی طور پر کیا نظر آتی ہیں بلکہ یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ واقعی کیا ہیں۔ زندگی کے دوران انسان کے سفر کے مقصد کے بارے میں یہ گفتگو ان لوگوں کے لیے سوچنے کی غذا ہے جو حکمت کے الفاظ کو اٹھانا چاہتے ہیں اور ان کی داخلی قدر پر توجہ مرکوز کرنا چاہتے ہیں۔ اس نوعیت کے بہت سے کام نہیں ہیں اور نہ ہی بہت سے لوگ ہیں جو اسے سمجھنا چاہتے ہیں یا سمجھنے کے قابل ہوسکتے ہیں۔ لہٰذا اس موضوع پر موجودہ مکالمہ کافی ہونا چاہیے۔

بہت سے لوگ ایسے ہیں جو نہ تو عقلمند ہیں اور نہ ہی وہ الٰہی قانون پر عمل کرتے ہیں۔ ایسے لوگ ہیں جو آخرت یا آخرت کے بارے میں اپنے آپ کو پریشان پاتے ہیں۔ بلکہ وہ اس کے بارے میں شکوک و شبہات کا شکار ہیں۔
دراصل جب دنیاوی خواہشات ان پر غالب آجائیں تو ان کے لیے مناسب ہے کہ وہ آخرت کی تردید کریں۔ وہ ایسا کرتے ہیں اور اپنے دفاع کے بہانے بناتے ہیں۔ شیطان اپنے برے اعمال ، اپنی تمام دلکشی اور مددوں کے ساتھ ان کی نگرانی کرتا ہے اور انہیں یہ سوچنے پر آمادہ کرتا ہے کہ قیامت کی سزا ایک خیالی فریب ہے جو لوگوں کو خوفزدہ کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ جہاں تک راستبازوں کے لئے جنت کے وعدے کا تعلق ہے تو ، وہ اسے محض کرشماتی نمائش کے طور پر بھی برانڈ کرتے ہیں ، ذہنی دھوم دھام کا ایک تصور جو انسان کو خشک ، اداس زندگی کی مشکلات میں ڈالنے کے لئے تیار ہوا ہے اور کچھ نہیں۔ لہذا، وہ شریعت الٰہی کے پیروکاروں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

کچھ لوگ چیتھڑے (عاجز صوفیاء یا روحانی مسافروں کا لباس) یا روحانی حصول کی راہ میں جدوجہد کرنے والوں کا لباس پہن کر *اس طرح کے تمام تحفظات سے بالاتر ہونے کا بہانہ کرتے* ہیں۔ اس طرح کے دکھاوے ان کی کم سے کم مدد نہیں کرتے۔ اور نہ ہی ان کے پاس میرٹ کا کوئی مقام ہے۔ دراصل، اس طرح کے دھوکے باز اپنے آپ کو اتنا ہی نقصان پہنچاتے ہیں جتنا دوسرے سادہ لوح لوگوں کو جو ان سے دھوکہ کھا کر انہیں کسی روحانی حیثیت کے لوگ سمجھتے ہیں، جسے وہ سمجھ نہیں سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے پاس ان کی تائید کے لیے کوئی منطق یا دلائل نہیں ہیں۔ ایسے لوگوں میں کوئی حقیقی پوشیدہ قدر کیسے ہوسکتی ہے؟ ان کی آستین میں کچھ بھی نہیں ہے۔ ان

حالات میں ان کو بلا شبہ یہ بتانا چاہیے کہ اگر ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء، زمانے کے تمام علماء، تمام علماء اور اولیاء (اللہ کے دوست اور مقرب) سب غلط تھے اور صرف وہی حق ہیں تو ان کی جہالت اور تکبر کی روشنی میں اس موضوع میں مزید اضافہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

کوئی کہہ سکتا ہے کہ شاید آپ ہی غلطی پر ہیں۔ پس تم آخرت اور اللہ کے عذاب کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکے*اذاب*")، روح کی اذیت، ہمارے حسی ادراک کے غلبے کی وجہ سے "روح" کا حکم ہے، جو پانچ حواس کے ذریعہ تجربہ نہیں کیا جاتا ہے اسے قبول کرنا، اس طرح کی کمزور زمین پر غلط ہونے کے طور پر ٹھوس نہیں ہے۔ اس طرح کے تکبر کے حامل شخص کو فوری طور پر تشخیص کرنا ضروری ہے کہ وہ کسی کے صحیح عناصر میں بالکل بھی نہیں ہے خاص طور پر جب کوئی یہ کہتا ہے کہ "جس طرح میں جانتا ہوں کہ دو ایک سے زیادہ ہیں، مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے، میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ 'روح' جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔ اس میں کوئی مستقل حیثیت نہیں ہے ، اور جسمانی خوشی یا درد کو کسی بھی حالت میں روح کی خوشی یا درد کے ساتھ مل کر نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَإِن تَدْعُهُمْ إِلَى ٱلْهُدَىٰ فَلَن يَهْتَدُوٓا۟ إِذًا أَبَدًا

"پس اگر تم انہیں ہدایت کی طرف بلاؤ گے تو وہ ہرگز ہدایت یافتہ نہیں ہوں گے۔" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 18، آیت 57)

فرض کریں کہ میں اپنی باقی زندگی تقویٰ کی جھونپڑی میں کیوں گزاروں اور دنیا نے مجھے پیش کی جانے والی خوشیوں سے غیر ضروری طور پر اپنے آپ کو روکا رکھوں، جب کہ مجھے اس بات کا کوئی اشارہ نہیں ہے کہ آپ مجھے روح اور آخرت کی سچائی کے بارے میں کیا بتانے کی کوشش کر رہے ہیں کیونکہ وہ مجھے بہت دور کی نظر آتی ہیں؟ بہرحال میں ان معاملات سے واقف نہیں ہوں۔ ایسی صورت میں اس کا جواب یہ ہے کہ اب جب تم نے اتنا قبول کر لیا ہے تو تم شریعت الٰہی اور ہدایت کی پیروی کیوں نہیں کرتے؟ یہ منطق پر مبنی ہے کہ جب آپ کو کسی چیز کا علم نہیں ہے تو آپ کو کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہئے۔ فرض کریں کہ آپ پلیٹ سے کھانے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہیں اور آپ کو بتایا جاتا ہے کہ سانپ نے ابھی اس میں اپنا منہ ڈال دیا ہے ، آپ فورا کھانے سے دستبردار ہوجائیں گے۔ یہ بیان غلط ہوسکتا ہے ، پھر بھی ، آپ میں دانشمندی آپ کو کبھی بھی کھانے میں حصہ لینے پر مجبور نہیں کرے گی ، چاہے وہ کتنا ہی مزیدار کیوں نہ ہو۔ اسی طرح فرض کریں کہ آپ بیمار ہیں اور اپنی جان سے ڈرتے ہیں اور شفا یابی کی جادو لکھنے والا شخص آپ سے تھوڑی سی چاندی دینے کو کہتا ہے تاکہ کوئی آپ کے لیے تعویذ تیار کر سکے تو آپ اپنے خدشات [اور تحفظات] کے باوجود اس مطالبے کو قبول کریں گے۔ نیز ، اگر کوئی روشن خیال آپ کو بتاتا ہے کہ جب چاند فلاں مرحلے پر پہنچ جاتا ہے تو آپ کو اپنے علاج کے لئے کچھ تلخ دوا لینی چاہئے۔ اس کی فنتاسی کے باوجود ، آپ اپنی صحت کے لئے کسی کے مشورے پر عمل کریں گے ، اس بنیاد پر بھی کہ کوئی صحیح ہوسکتا ہے۔

تو ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء، درجنوں سنتوں، علماء اور اولیاء اللہ کے اولیاء (*اولیاء*) کیسے غلط اور سنی سنائی دے سکتے ہیں، جبکہ ایک نیم حکیم یا خوش بخت صحیح ہو سکتا ہے؟ اس سے انسان کو اپنی پوزیشن پر نظر ثانی کرنے پر آمادہ کرنا چاہئے۔ ممکن ہے کہ کسی کو اس بنیاد پر ایسا کرنے کی ترغیب مل جائے کہ اگر یہ لوگ حق میں ہیں

تو میں آخرت کا انکار کیوں کروں؟ ہو سکتا ہے کہ ان کی بات نہ سن کر اور آنکھیں بند کر کے دنیاوی لذتوں میں مشغول ہو کر میں آخرت میں ناقابل تلافی طور پر مصیبت زدہ ہو جاؤں۔ تو پھر میں اب کیوں نہ ہٹ جاؤں [اپنی ناقابل برداشت پوزیشن سے جو برقرار نہیں رہ سکتا]؟

فرضی طور پر ، اگر پوری دنیا رائی کارن سے بھری ہوئی ہے اور ایک چڑیا کو ہر ایک ہزار سال بعد ایک رائی مکئی لینے کا کام سونپا گیا ہے ، پھر بھی یہ ایک اہم نکتہ ہے کہ رائی مکئی ابدیت کو پورا کرے گی۔ پس یہاں سے لے کر قیامت تک آخرت کے عذاب کا خطرہ کیوں لیا جائے؟ لوگ کشتیوں اور بحری جہازوں میں سفر کرتے ہیں اور اپنی روزی روٹی کے لیے اپنا سامان بیچنے میں مشکلات کا سامنا کرتے ہیں۔ انسان ایسا کیوں نہیں کرتا؟ تقویٰ ، ہمت اور استقامت اس کو اچھے منافع کی ادائیگی کرتی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک عظیم صحابی اور چچا زاد بھائی) نے ایک دینی بحث میں ایک ملحد سے کہا کہ اگر تم جو کہہ رہے ہو وہ درست ہے تو تم نجات پاتے ہو گے اور ہم نجات پاتے ہیں اور اگر ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ درست ہے [اور جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ غلط ہے] تو صرف ہم ہی نجات پائیں گے اور تمہیں ابدی عذاب الٰہی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک سنت تھے۔ وہ اس دلیل کو اس سے زیادہ طاقتور انداز میں آگے نہیں بڑھا سکتا تھا۔ اس نے ایسا اس لیے نہیں کہا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا اس پر اسے کوئی شک تھا بلکہ اس نے ملحد کی ذہنیت کے پیش نظر اپنے بیان کی بنیاد کو اتنی زبردستی تشکیل دیا تھا۔

چنانچہ ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جو شخص آخرت کی قیمت پر دنیاوی امور میں اپنا وقت ضائع کرتا ہے (اس کے بعد) *خیرۃ* ")، انسان کی آخرت خطرے میں ہے۔ یہاں پیش کردہ مضبوط دلائل اور فراہم کردہ مثالوں کی روشنی میں ، اختلاف کرنے والے کے لئے یہ مناسب ہے کہ وہ کوئی خطرہ مول نہ لے اور ٹیرا فرما (ٹھوس زمین) پر رہے۔

وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی

"اور سلام ہو اس پر جو ہدایت پر چلتا ہے۔"

ہم نے *خدا کی معرفت، نفس* (نفس)، دنیا اور آخرت کے *بارے میں گفتگو کا خلاصہ کیا ہے۔* انشاء اللہ اب ہم ابدی خوشی *اور ابدی کامیابی کے لیے* چالیس ضروری عناصر (اراکان، یا اقدامات) کی وضاحت کریں گے۔

اس طرح غزالی نے اپنی عظیم کتاب "*کیمیا سعادت" یا "کیمیا یا ابدی* خوشی اور لامتناہی کامیابی کے لیے تبدیلی کا ایجنٹ" میں کیمیا یا تبدیلی کے ایجنٹ کی حیرت انگیز وضاحت کا اختتام کیا۔ اس کے بعد انہوں نے ابدی خوشی اور ابدی کامیابی کے چالیس اصولوں کا مندرجہ ذیل تعارف پیش کیا:

ہم پہلے ہی مندرجہ ذیل باتوں پر کچھ تفصیل سے بات کر چکے ہیں:

1. خدا کی *گنوسس ("معارفہ")*،
2. اپنے نفس کو جاننا،
3. دنیا کی حقیقت کو جاننا (*"دنیا"*) ، اور
4. آخرت کی حقیقت کو جاننا۔

اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی نعمتوں کے حصول کا راز اس کی سچی اور سچائی سے عبادت کرنے اور اس کی اطاعت میں مضمر ہے۔ اس کے نتیجے میں انسان کو مندرجہ ذیل کام کرنے میں محتاط رہنا چاہئے:

أ. انسان کو نہ صرف خدا کا سب سے زیادہ عاجز اور فرمانبردار بندہ بننا چاہیے اور اس کی عبادت کرنی چاہیے بلکہ اس میں ایک اچھے انسان کا برتاؤ، شخصیت اور اچھا سلوک بھی ہونا چاہیے۔ کسی کا عمومی طرز عمل اس طرح دوسروں کے لیے پرکشش ہو جائے گا [جو سب خدا کے ساتھی خادم ہیں، چاہے ان کی نسل، مذہب، رنگ، قومیت، ثقافت، عقیدہ یا اس طرح کی کوئی اور چیز ہو]۔

ب. یہ بات ہے کہ ایک شخص کیسا نظر آتا ہے۔ لیکن یہ کافی نہیں ہے۔ معاشرے میں بھی ایسا برتاؤ کرنا چاہیے کہ اس کا طرز عمل خدائی شریعت اور ہدایت کے دائرے میں رہے۔ اس کے بعد کسی کو اس طرح پہچانا جائے گا۔

ت. مذکورہ بالا کسی کے ظاہری طرز عمل کی تشکیل کرتا ہے جو دوسرے دیکھتے ہیں۔ اب ہم کسی کی روح [یا اندرونی حقیقت] کی طرف آتے ہیں۔ چنانچہ انسان پر لازم ہے کہ وہ اپنے دل کو برائی اور اس کی تباہی سے بچائے [کہ یہ کسی کے باطن پر اس کے ظاہری وجود کے لئے منحوس اثرات مرتب کرتا ہے]۔

ث. انسان کو نہ صرف مذکورہ بالا "کیا کریں" کا خیال رکھنا چاہیے بلکہ اس کے "کرنے والے" کا بھی مکمل خیال رکھنا چاہیے، یعنی اپنے دل، اپنی روح کو برائی سے محفوظ رکھنے کے بعد، اس کے ساتھ ساتھ روح کو اچھی نیک اور اعلیٰ باطنی خصوصیات سے آراستہ اور آراستہ کرنا چاہیے۔

اس طرح ، روح میں برائی اور نقصان دہ چیزوں کی اجازت نہ دینے کے "نہ" پر عمل کرنے اور ان تمام چیزوں کو کرنے کے "کرنا" کا تعاقب کرکے جو اچھے اور پاک ہیں اور روح کی خوبصورت داخلی خصوصیات کو فروغ دے کر ، انسان اپنی روح کو ایسی غذا سے کھلا رہا ہوگا جو اس کی فلاح و بہبود کے لئے سازگار ہو۔ اس طرح انسان باطنی برائی کے مہلک اثرات (تمام منفی اور نقصان دہ رجحانات، خصلتوں، مزاج اور باطنی کیفیتوں) سے بچ جائے گا اور روح کی *"منجیات"* یا باطنی صفات سے تقویت ملے گی جو اسے پاک کرتی ہیں، خوبصورت بناتی ہیں اور زینت بخشتی ہیں، جن پر انسان کو فخر ہوگا۔ یہ چار ضروری عناصر [تبدیلی کے کیمیا یا تبدیلی کے ایجنٹ جو ابدی خوشی اور ابدی کامیابی لاتے ہیں] ہر ایک کو دس حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور یہ درج ذیل ہیں...

اس مقام پر غزالی ابدی خوشی اور ابدی کامیابی کے چالیس اصولوں (یا اقدامات) کی وضاحت کا آغاز کرتی ہے۔ ان چالیس اصولوں میں سے بیس اصول ہماری ظاہری زندگیوں کو چلانے سے متعلق ہیں اور بیس اصول ہماری باطنی زندگی سے متعلق ہیں تاکہ ہمارے دلوں اور روحوں کو تبدیل کر کے

ہماری زندگیوں کا رخ موڑ دیا جائے۔ اس تشریح کے اگلے دو حصوں میں غزالی کی حکمت کے مجموعے "*احیاء العلوم الدین*" یا "خدا کی راہ کی احیاء" میں غزالی کی حیرت انگیز تفسیر سے متعلق بیس اصول یہاں مختصر شکل میں پیش کیے گئے ہیں۔

اس مقالے کا پہلا حصہ جو انسان کی حقیقت اور انسانی زندگی کے حقیقی مقصد کی وضاحت اور ابدی خوشی اور لامتناہی کامیابی کے حصول سے متعلق ہے، اب اختتام پذیر ہو رہا ہے۔ اب اس مقالے کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے۔

حصہ دوم: اندرونی تخریبی خصوصیات - منفی داخلی خصوصیات جو افراد، معاشروں اور پوری قوموں کو نقصان پہنچاتی ہیں اور انہیں خطرے میں ڈالتی ہیں

پچھلے مباحثوں میں انسان کے باطنی وجود کی حقیقت اور زندگی کے حقیقی مقصد کی وضاحت کرنے کے بعد اب ہم باطنی تخریبی خصوصیات کی وضاحت کا آغاز کریں گے یعنی نچلے نفس کی منفی داخلی خصلتیں جو روح کی گہرائی میں سرایت کرتی ہیں۔ یہ خصلتیں افراد، معاشروں، پوری قوموں اور دنیا کی فلاح و بہبود کے لیے سراسر تباہ کن ہیں کیونکہ وہ مصائب کا باعث بنتی ہیں جو آج ہمارے اندرونی وجود، معاشروں، برادریوں، قوموں اور دنیا کو متاثر کرتی ہیں۔ اگلے دو ابواب کے بعد جو انسان کی داخلی حقیقت کو مزید دریافت کرتے ہیں ، اگلے آٹھ ابواب ان اندرونی تباہ کن خصوصیات کو سمجھنے اور ان کے خاتمے کے علاج کا خاکہ پیش کرنے کے لئے گہری نظر ڈالیں گے۔ غزالی نے اپنی آخری کتاب میں ایک گہری سچائی کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ قدیم زمانے سے لے کر اب تک پوری انسانی تاریخ میں دنیا میں جو مصیبتیں، افراتفری، تباہی اور تباہ کاریاں رونما ہوئی ہیں اور قیامت تک رہیں گی، انسان کی نیچی نفس کی وجہ سے رونما ہوئی ہیں اور ہوں گی (*منہاج العابدین*) یا "عبادت گزاروں کے لیے بہترین راستہ"، باب 3 جس کا عنوان ہے "چار درختوں کی رکاوٹ [باطنی کمال کی راہ میں]") یہی وجہ ہے کہ نچلے نفس کی تباہی کو باطن میں انتہائی سنجیدگی کے ساتھ ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کتاب کا دوسرا حصہ اس راستے کو روشن کرتا ہے جو اندر سے نکلنے والی تباہی کو شکست دینے کے لیے اختیار کرنا چاہیے، تاکہ اندر کی مثبت قوتیں پروان چڑھ سکیں اور افراد، معاشروں اور پوری دنیا کو اپنی پوری صلاحیتوں کے ساتھ ترقی دے سکیں۔

باب 1 - روح کے اسرار کو جاننا خود آگاہی، روشنی اور روشن خیالی کے روحانی سفر کے لیے ناگزیر ہے

غزالی کی پہلی کتاب *"* احیاء العلوم الدین*" یا "خدا کی راہ کی احیاء" کی تیسری جلد یا چوتھائی جلد میں* دل اور روح کے عجائبات اور اسرار پر روشنی ڈالتی ہے، جس طرح وہ منفی باتوں میں پھنس جاتے ہیں، اور کس طرح ان کی حفاظت اور پرورش کی جا سکتی ہے تاکہ خیالات میں نیکی اور مثبتیت کی راہ پر گامزن ہو سکے، احساسات ، الفاظ ، اعمال اور وجود۔ موضوع کی یہ حیرت انگیز آنکھیں کھولنے والی نمائش سب کو اندرونی سکون ، سکون اور حقیقی خوشی کے حصول کے ذرائع کی طرف رہنمائی کرے گی۔ غزالی کی تفسیر یہاں مختصر شکل میں اس طرح پیش کی جا رہی ہے:

نفس (نفس)، روح، قلب اور عقل (عقل) کی اصطلاحات کے معنی اور مقصود

واضح رہے کہ یہ چاروں اصطلاحات اندرونی تخریبی اور تعمیری خصلتوں، صفات، خصوصیات، رجحانات، مزاج اور مزاج سے متعلق مباحثوں میں کثرت سے استعمال کی جائیں گی۔ علماء میں بہت کم ایسے ہیں جو ان چاروں اصطلاحات کے حقیقی معانی سے واقف ہوں اور ان کے معنی، حدود اور مضمرات کے فرق کا صحیح علم رکھتے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ان شرائط کے ارادے میں غلطیاں کی جاتی ہیں۔ میں ان اصطلاحات کی وضاحت اس انداز میں کروں گا جو ہمارے ارادے اور مقصد سے متعلق ہے [روح کے عجائبات اور اسرار کی تشریح] اس طرح ہے:

<u>پہلی اصطلاح قلب (*قلب*):</u> "دل" کو دو معنوں میں استعمال کیا جا سکتا ہے: گوشت کا ایک ٹکڑا جو سینے کے بائیں طرف ہو۔ یہ ایک عجیب قسم کا گوشت ہے جس کے بیچ میں ایک خلا ہوتا ہے جس میں سیاہ رنگ کا خون ہوتا ہے اور یہ روح کا سرچشمہ اور زندگی کے ذرائع ہے۔ تاہم ، اس کی شکل ، شکل اور حالت کی وضاحت ہماری بحث کے مقصد سے منسلک نہیں ہے۔ یہ ڈاکٹروں کا موضوع ہے۔ دینی اور روحانی معاملات کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ انسانوں کے علاوہ جانور بھی اس سے خالی نہیں ہیں اور مردہ اور زندہ جسموں دونوں میں یہ ہے۔ اس کتاب میں ، جہاں بھی یہ اصطلاح "دل" استعمال کی جائے گی ، اس کا مطلب اس کی جسمانی شکل ، شکل اور حالت نہیں ہوگا کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ گوشت کا ایک ٹکڑا ہے اور مرئی کے دائرے سے تعلق رکھتا ہے۔ نہ صرف انسان بلکہ جانور بھی اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔

اس اصطلاح کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ "دل" ایک الہی روحانی لطافت ہے جس کا تعلق جسم کے اندر موجود جسمانی دل سے ہے اور یہی لطافت انسان کی حقیقت ہے۔ یہ وہی ہے جو ادراک کرتا ہے۔ یہ وہی ہے جس سے [الہامی طور پر] مخاطب کیا جاتا ہے اور نظم و ضبط اور نتائج کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ عقل اس لطافت ["دل"] کے جسمانی دل کے ساتھ اس تعلق کو سمجھنے سے قاصر ہے کیونکہ یہ تعلق وہی ہے جو طول و عرض کو جسموں کے ساتھ ہے اور

[باطنی] صفات ان صفات کے مالک کے ساتھ اور اوزاروں کے مالک کے ساتھ اوزاروں کے استعمال کرنے والے اور رہائش گاہ کے ساتھ رہنے والے کے ساتھ۔ اس مماثلت، رشتے اور تعلق کی وضاحت دو وجوہات کی بنا پر نہیں کی جائے گی۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ اس کا تعلق روحانی طور پر بے نقاب علم (*علوم المکاشفہ*) سے ہے، جبکہ اس کتاب کا مقصد علم الہامی (*علوم المعاملہ*) کی تشریح ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کی وضاحت کے لیے روح کے راز سے پردہ اٹھانا پڑے گا۔ یہ ایک ایسا راز ہے کہ اس کے بارے میں نبوت کی زبان سے کچھ نازل یا بیان نہیں کیا گیا ہے۔ ایک غیر نبی کو کیا حق ہے کہ وہ اس بارے میں کچھ کہے؟ یاد رہے کہ اس کتاب میں جہاں بھی لفظ "دل" استعمال کیا گیا ہے، اس سے مراد الہی روحانی لطافت کی طرف ہے جس کا ذکر پہلے کیا گیا ہے [اور انسانی جسم میں جسمانی دل نہیں]۔ میں اس نزاکت کی حالتوں اور خصوصیات کی وضاحت کروں گا [جسے "دل" کہا جاتا ہے]۔ اس کی حقیقت اور اس کے آئین کے بارے میں بحث کرنا میرا مقصد نہیں ہے۔

__دوسری اصطلاح روح (*روح*):__ اس کے دو معنی بھی ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہ "روح" ایک لطیف مادہ کا نام ہے جو جسمانی دل کے اندر خلا میں رہتا ہے۔ اس مرکز سے روح رگوں اور شریانوں کے ذریعے پورے جسم میں پھیلتی ہے۔ جسم کے اندر روح کا پھیلنا اور جسم کے اعضاء کو زندگی کی روشنی دینا اور پانچوں حواس کو حسی صلاحیتیں عطا کرنا گھر میں رکھے ہوئے چراغ کے مترادف ہے اور اس سے گھر کے اندر روشنی پھیل جاتی ہے۔ اس مثال سے ثابت ہوتا ہے کہ "روح" چراغ کا کردار ادا کرتی ہے ، اور زندگی روشنی کی طرح ہے اور جسم میں دوڑنے والی روح ایک چراغ کی طرح ہے جو اس کے ارد گرد روشنی پھیلاتا ہے اور پھیلتا ہے۔ "روح" کی اصطلاح کا یہ مطلب طبیبوں کی اصطلاح کے مطابق ہے۔ دوسرے لفظوں میں ، روح ایک لطیف بخار یا ہلکا بخار ہے جو اپنی ابتدا میں اعتدال پسند ہے ، [جسمانی] دل کی رگوں سے نکلتا ہے اور اس کی اپنی تپھ سے تشکیل پاتا ہے۔ [روح کا] یہ معنی اس بحث سے متعلق نہیں ہے بلکہ ان طبیبوں کے لیے دلچسپی کا موضوع ہے جو جسمانی بیماریوں کا علاج کرتے ہیں۔ دل کی بیماریوں (یعنی باطنی روحانی بیماریوں) کا علاج کرنے والے دین کے ڈاکٹروں کو اس معنی سے کوئی سروکار نہیں ہے بلکہ وہ کہتے ہیں کہ روح انسان میں ایک ادراک کی لطافت ہے۔ اس نزاکت کی وضاحت دل کی تفسیر میں بھی دی گئی ہے۔ مندرجہ ذیل آیت اسی معنی کی طرف اشارہ کرتی ہے:

قُلِ ٱلرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّى

"ان سے کہہ دو کہ جان میرے رب کے حکم سے ہے۔" (سورة البقرة سورة البقرة آیت 85)

یہ ایک ایسا پراسرار الہامی تعلق والا لطیف وجود ہے کہ زیادہ تر عقلیں اس کی حقیقت اور آئین کو سمجھنے میں ناکام ہیں۔

__تیسری اصطلاح نفس (*نفس*):__ اس اصطلاح کے معنی دیگر اصطلاحات کے ساتھ بھی مشترک ہیں۔ اس اصطلاح کے دو معنی اس وضاحت کے مقصد کے قریب ہیں۔ ایک یہ کہ نفس وہ وجود ہے جو انسان میں غصہ، غضب اور جسمانی لذتوں کا مجموعہ ہے۔ یہ معنی *صوفیاء* میں سب سے زیادہ رائج ہے (روحانی کمال، روشنی اور اس کے نتیجے میں، قربت اور خدا کی معرفت کے طالب علم)۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ نفس کے خلاف باطنی روحانی کشمکش (*مجاہدہ*) اور نفسانی لذتوں کی خواہشات پر قابو پانا اور ان پر قابو پانا ضروری ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشاد میں بھی یہی ارادہ کیا ہے:

اعلیٰعلوکنفسکالنیہین جنبیک

"تمہارا سب سے بڑا دشمن وہی ہے جو تمہارے اندر ہے (یعنی تمہاری نفس)۔ (مجموعہ حدیث سے لیا گیا حضرت *ابن عباس رضی اللہ* عنہ پر بیہقی

نفس کا دوسرا مفہوم (*نفس*) بھی اس روحانی لطافت سے متعلق ہے جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ در اصل اس معنی کے مطابق یہ انسان کی حقیقت اور وجود ہے۔ لیکن یہ نفس مختلف حالات میں مختلف داخلی خصوصیات سے بھرا ہوا ہے۔ چنانچہ جب یہ اطاعت الٰہی کے ساتھ صلح کر لیتا ہے اور اس کی مخالفت اور شکوک و شبہات دور ہو جاتے ہیں تو اسے "نفس میں امن" کہا جاتا ہے۔ خدا نے ان الفاظ کے ساتھ "نفس میں سکون" کو مخاطب کیا ہے:

يَٰٓأَيَّتُهَا ٱلنَّفۡسُ ٱلۡمُطۡمَئِنَّةُ ٢٧ ٱرۡجِعِيٓ إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةٗ مَّرۡضِيَّةٗ ٢٨

"اے امن والے! اپنے رب کی طرف لوٹ جاؤ اس حالت سے کہ تم راضی ہو کر اور وہ تم سے راضی ہو جاؤ۔ (سورة البقرة سورة البقرة آیت نمبر 89 آیت 27 تا 28)

نفس کا جو مفہوم پہلے بیان کیا جا چکا ہے، وہ خدا کی طرف واپسی کی نمائندگی نہیں کرتا جو (خدا کی غلامی) کا جلال ہے بلکہ اس کے بجائے اس معنی میں ہمیں ہدایت الٰہی کی بغاوت اور انکار ملتا ہے جو شیطان کی طرف سے الہام اور اکسایا گیا ہے۔ نفس کی ایک اور کیفیت یہ ہے کہ وہ غلامی اور عبادت کے کمال سے عاری ہے بلکہ اپنی خامیوں پر اپنے آپ کو ملامت کرتا ہے۔ اس حالت میں نفس کو "ملامت کرنے والا" کہا *جاتا ہے*۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَآ أُقۡسِمُ بِٱلنَّفۡسِ ٱللَّوَّامَةِ

"میں اس ملامت نفس کی قسم کھاتا ہوں جو اپنی کوتاہیوں اور برائیوں کا ذمہ دار خود کو ٹھہراتے ہیں، یعنی، *نفس اللوامہ*]." (سورة البقرة سورة البقرة آیت 2)

نفس کی ایک اور کیفیت یہ ہے کہ وہ جسمانی لذتوں اور برائیوں کی بے بنیاد خواہشات کے بہاؤ اور دباؤ کو روکنے میں بے بس ہے اور ذلیل کے ساتھ اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ اس حالت میں نفس کو "برائی الہام نفس" کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید نے حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں مصر کے حاکم کے ساتھ اس حالت میں نفس کا ذکر کیا ہے:

وَمَآ أُبَرِّئُ نَفۡسِيٓۚ إِنَّ ٱلنَّفۡسَ لَأَمَّارَةُۢ بِٱلسُّوٓءِ

"میں پاکیزگی کو منسوب نہیں کرتا اور اپنے 'نفس' کو معصوم نہیں سمجھتا [کیونکہ] ادنیٰ نفس صرف [انسان کے دل میں] برائی کو متاثر کرتا ہے۔" (سورة البقرة باب 12، آیت 53)

خلاصہ یہ ہے کہ نفس اس وقت برا ہے جب وہ برائی، پست خواہشات اور نفسانی لذتوں کی طرف مائل ہو اور جب وہ سکون میں ہو اور مطمئن ہو اور ہر صورت و صورت میں ہر طرح کی برائیوں اور منفیات سے پرہیز کرے (*نفس المطعمہ عنا*)

<u>چوتھی اصطلاح عقل (*عقل*):</u> یہ اصطلاح بھی متعدد معانی کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ ان میں سے دو معنی اس کتاب کے مقصد کے قریب ہیں۔ پہلا یہ کہ 'عقل' معاملات اور چیزوں کی حقیقت کے علم کا نام ہے۔ اس صورت میں عقل علم کی خصوصیت سے منسلک ہے اور اس کا مسکن دل ہے۔ بعض اوقات عقل سے مراد مالک علم (مدرک *العلوم*) ہے جو دل کی خصوصیت ہے۔ اس معنی کی صورت میں عقل وہی روحانی لطافت ہے جس کا ذکر پچھلے تین اصطلاحات کی وضاحت میں کیا گیا ہے۔ عقل کے دو معانی کی وضاحت کے بارے میں سمجھ لیں کہ ہر کوئی اس حقیقت کو جانتا ہے کہ علم یا علم شخص ذاتی طور پر موجود ہے اور ظاہری اور مرئی ہے، اور علم کی خصوصیت ایسے میں گہرائی سے پیوست ہے۔ معیار یا خصوصیت اس کے مالک کے علاوہ کچھ اور ہے۔ لہٰذا 'عقل' سے بعض اوقات اس خصوصیت کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جسے علم کہا جاتا ہے اور بعض اوقات یہ اس خصوصیت کے مالک سے مراد ہے۔ حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی معنی میں مندرجہ ذیل ہے:

اول ما خلق العقل

"خدا نے سب سے پہلے جو چیز پیدا کی وہ عقل تھی (*عقل*)".

یہاں جس خصوصیت کا حوالہ دیا گیا ہے، وہ علم نہیں ہو سکتا کیونکہ علم بذات خود موجود نہیں ہے لیکن جس چیز کا حوالہ دیا گیا ہے وہ ایک جسم (اسپین) ہے۔ جسم کو پہلے کیوں پیدا کیا جاتا ہے کیونکہ پہلے فہم کا مسکن درکار ہوتا ہے پھر علم پیدا کیا جاتا ہے جو اس مسکن کی خصوصیت ہے یا دونوں کو مل کر تخلیق کرنے کی ضرورت ہے؟ نیز ، علم کی خصوصیت کو حل کرنا ممکن نہیں ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان چار اصطلاحات کی درآمد ایک جیسی ہے اور مختلف ہے۔ ان چار اصطلاحات کی حقیقت سے واقف شخص جانتا ہے کہ ان اصطلاحات میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس نکتے کی وضاحت کے لیے ضروری تھا کہ ان چاروں اصطلاحات کے معانی میں مماثلت اور اختلافات کی وضاحت کی جائے۔

جہاں بھی قرآن و حدیث (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوی احادیث میں) 'دل' کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے، وہ اس فیکلٹی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جو چیزوں کی حقیقت کو سمجھتی ہے۔ یہ فیکلٹی انسانوں کے اندر موجود ہے۔ لفظ 'دل' اس فیکلٹی کا حوالہ دینے اور اشارہ کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ ادراک کی اس فیکلٹی کا جسمانی دل کے ساتھ ایک خاص تعلق ہے۔ اگرچہ اس فیکلٹی کا تعلق پورے جسم سے ہے اور جسم کے تمام اعضاء کو اپنے اپنے کام کرنے کے لئے استعمال کرتا ہے ، لیکن اس کا براہ راست تعلق جسم کے اعضاء سے نہیں ہے بلکہ صرف جسمانی دل کے ذرائع سے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی جسم میں جسمانی دل اس الٰہی روحانی لطافت ، علم ، دارالحکومت اور اس پہاڑ کا سوار ہے .... اس کا مطلب یہ ہے کہ جسمانی دل اس الہی روحانی نزاکت کی بادشاہی ہے [جسے "دل" یا "روح" کہا جاتا ہے] اور وہ تخت ہے جس پر وہ بیٹھتا ہے اور جسم کی پوری سلطنت پر

حکمرانی کرتا ہے۔ جسمانی دل اس لطافت کے تسلط کا نقطہ آغاز ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ الٰہی روحانی نزاکت جسے "دل" کہا جاتا ہے وہ جسمانی دل اور جسم کے ساتھ وہی تعلق ہے جو خدا کا "*ارش*" (یا "الٰہی قادر مطلق کی سلطنت") اور "*کرسی*" (یا عرش الٰہی یا "اعلیٰ الٰہی فضیلت کی آسمانی نشست") کے ساتھ ہے۔

دل کے لشکر (*قلب*)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ

"تیرے رب کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔" (سورة البقرة باب 74، آیت 31)

اس آیت میں خدا کے ان لشکروں کا ذکر کیا گیا ہے جن کی تعداد اس کے سوا کسی اور کو معلوم نہیں ہے۔ یہ فوجیں دلوں، روحوں اور دیگر بے شمار کائناتوں میں موجود ہیں۔ چونکہ ہماری بحث کا موضوع دل ہے، اس لیے میں دل کی کچھ فوجوں کا ذکر کروں گا۔

دل کے دو لشکر ہیں: ایک وہ جو بیرونی آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے اور دوسرا عقل کی آنکھ سے ادراک کیا جا سکتا ہے۔ دل بادشاہ کی مانند ہے اور اس کی فوجیں اس کے وزیروں اور نوکروں کی مانند ہیں۔ بیرونی آنکھ سے جن فوجوں کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے ان میں ہاتھ، پاؤں ، آنکھیں ، کان ، زبان اور جسم کے دیگر تمام اعضاء شامل ہیں۔ یہ تمام جسمانی اعضاء خواہ وہ خارجی ہوں یا باطنی، دل کے خادم ہیں اور ان پر اس کی اطاعت واجب ہے اور وہ ان کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرتا ہے اور ان کا فریضہ خدمت اور اطاعت دل ہے اور وہ اس کے خلاف بغاوت کرنے یا اس کی خواہشات اور خواہشات کے خلاف عمل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ مثال کے طور پر ، جب آنکھ کو کھولنے کا حکم دیا جاتا ہے تو یہ کھلتا ہے ، جب بند کرنے کا حکم دیا جاتا ہے تو یہ بند ہوجاتا ہے۔ جب پیروں کو حرکت کرنے کا حکم دیا جاتا ہے تو وہ حرکت کرتے ہیں ، جب زبان کو بولنے کا حکم دیا جاتا ہے تو وہ بولتا ہے۔ تمام اعضاء ایسے ہی ہیں۔ ان کی اطاعت بعض وجوہات کی بنا پر فرشتوں کی اطاعت کے مترادف ہے۔ چنانچہ فرشتے اپنی فطرت کے مطابق فرمانبردار ہیں کیونکہ ان کی تخلیق کا مقصد اطاعت ہے اور وہ اس مقصد سے انحراف نہیں کر سکتے۔ فرشتوں کی حالت یہ ہے:

لَّا يَعْصُونَ ٱللَّهَ مَآ أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ

"وہ اللہ کے احکام سے انحراف نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جو ان سے کہا جاتا ہے۔" (سورة البقرة سورة 66، آیت 6)

تاہم، فرشتوں کی اطاعت اور جسمانی اعضاء کی اطاعت میں ایک فرق ہے: فرشتوں کو ان کی اطاعت کا علم ہے، لیکن جسمانی اعضاء میں ایسا نہیں ہے۔ جب آنکھیں کھولنے کو کہا جاتا ہے تو وہ کھل جاتے ہیں لیکن وہ اپنے وجود سے واقف بھی نہیں ہوتے اور نہ ہی انہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے بادشاہ اور اس کی حکمرانی کی اطاعت میں کھل کر کھل رہے ہیں جو دل ہے۔

جس طرح دل کو سواری کے پہاڑ اور روحانی سفر کے لیے رزق کی ضرورت *ہوتی ہے (خدا کے"* معارفہ" یا خدا کی معرفت تک پہنچنے کے لیے *روحانی جدوجہد* جو زندگی کا مقصد ہے جیسا کہ غزالی پہلے بیان کر چکے ہیں)، اسی طرح اسے مددگاروں اور بندوں کی ضرورت ہے۔ یہ وہی سفر ہے جس کے لیے یہ تخلیق کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَا خَلَقْتُ ٱلْجِنَّ وَٱلْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ

"اور میں *نے جنوں* اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔" (سورة البقرة باب 51، آیت 56)

دل کا سوار پہاڑ جسم ہے، علم اس سفر کے لیے اس کا رزق ہے اور اس رزق کے حصول کا راستہ نیک اعمال کرنا ہے۔ [خدا کا، یعنی انسان] کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اس دنیا میں رہے بغیر خدا تک پہنچے۔ سب سے دور منزل تک پہنچنے کے لئے ، قریب ترین منزل تک پہنچنا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کو "آخرت کا کھیت " کہا جاتا ہے [کیونکہ آپ یہاں جو کچھ بوتے ہیں وہ آپ وہاں کاٹیں گے]، دنیا رہنمائی کی منزلوں میں سے ایک منزل ہے۔ اسے "دنیا" کہا جاتا ہے کیونکہ یہ ایک قریب منزل ہے۔ لہٰذا اگلی منزل تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ اس [قریب] منزل سے سامان لیا جائے۔ چونکہ جسم کو [الہامی حضور] منزل تک پہنچنے کے لیے سواری کے پہاڑ کا درجہ حاصل ہے، اس لیے جسم کی حفاظت اور حفاظت کرنا ضروری ہے۔ جسم کی حفاظت اور حفاظت اسے اس کی صحت اور تندرستی کے لئے سازگار خوراک دے کر اور اسے ایسی خوراک سے روک کر کی جاتی ہے جو نقصان دہ یا مہلک ہوسکتی ہے۔ خوراک کے حصول کے لیے دو لشکروں کی ضرورت ہوتی ہے: پہلا اندرونی اور وہ بھوک (خواہش یا بھوک) اور دوسرا بیرونی ہے جیسے ہاتھ اور دیگر جسمانی اعضاء جو خوراک کے حصول کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

اسی وجہ سے دل میں خواہش پیدا ہوئی ہے اور اس خواہش کی تکمیل کے لیے بیرونی جسمانی اعضاء عطا کیے گئے ہیں۔ اسی طرح تباہ کن چیزوں سے حفاظت کے لیے دو فوجیں [انسانوں کو] عطا کی گئی ہیں۔ پہلا باطنی وجود میں ہے جسے غصہ کہا جاتا ہے اور دوسرا بیرونی حصے میں ہے جو ہاتھوں اور پیروں سے بنا ہوتا ہے۔ انسان غصے کے مضمرات کو انجام دینے کے لئے ان کا استعمال کرتا ہے۔ جسم میں ان اعضاء کی موجودگی ایسا ہی ہے جیسے کسی سپاہی کے پاس ہتھیار اور جنگ کے اوزار ہوں۔ اس کے علاوہ خوراک کی خواہش اور ضرورت کافی نہیں بلکہ انسان کو خوراک کی کیفیت معلوم ہونی چاہیے اور اسی لیے اندرونی اور بیرونی فوجوں کی ضرورت ہے۔ بیرونی فوجوں میں پانچ حواس شامل ہیں جیسے سننا ، دیکھنا ، سونگھنا ، چھونا اور چکھنا اور اندرونی فوجوں میں یہ شامل ہے کہ کوئی ان پانچ حواس کے ادراک سے خالی نہیں ہے۔ دل کے بندوں اور مددگاروں پر بہت بحث کی جا سکتی ہے۔ یہ بحث اتنی مفصل ہے کہ [کتابوں] کی جلدیں بھی اس کے لئے کافی نہیں ہیں۔ میں نے اس پر شکر گزاری کی کتاب میں کچھ لکھنے کی کوشش کی ہے [اس موجودہ کتاب میں "خدا کے راستے کے علم کا احیاء"] (باب 12)۔ طالب حق (*سالک*) کو اس پر مطمئن ہونا چاہیے۔

دل کے بندوں کی تین قسمیں ہیں: پہلی قسم وہ ہیں جو کسی ایسی چیز کی خواہش پیدا کرتے ہیں جو یا تو نفع حاصل کرنے کے لیے ہو یا نقصان کو دور کرنے کے لیے۔ پہلے کی مثال خواہش ہے (مثال کے طور پر بھوک) اور دوسرے کی مثال غصہ ہے۔ اس قسم کے نوکر کو "ارادہ" بھی کہا جاتا ہے۔ دوسری قسم میں وہ نوکر شامل ہیں جو کسی مقصد کے حصول یا ارادے کی تکمیل کے لئے اعضاء (یا جسمانی اعضاء) کی نقل و حرکت کا سبب بنتے ہیں۔ اسے "طاقت" یا "قابلیت" (*قدرہ*) کہا جاتا ہے جو جسم کے تمام اعضاء اور ہر شریان اور رگ میں پھیلا ہوا ہے۔ دوسری قسم میں وہ نوکر شامل ہیں جو جاسوسوں جیسی چیزوں کی حقیقت کو سمجھتے ہیں اور ان کے بارے میں علم حاصل کرتے ہیں۔ بصارت، سماعت، سونگھنے، چھونے اور ذائقہ کی صلاحیتوں کا تعلق اسی سے ہے۔ یہ قوتیں اپنے اپنے اعضاء میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس قسم کو "علم اور ادراک" کہا جاتا ہے۔ ان اندرونی خادموں کے ساتھ ساتھ ، بیرونی نوکر بھی ہیں جو اوزاروں اور اسباب کا کردار ادا کرتے ہیں ، جیسے انگلیوں میں پکڑنے کی طاقت اور آنکھوں میں دیکھنے کی صلاحیت۔ دوسری قوتوں اور اعضاء کو بھی اسی طرح اخذ اور سمجھا جا سکتا ہے۔

ہماری بحث کا محور بیرونی اعضاء نہیں ہے کیونکہ ان کا تعلق جسمانی دائرے سے ہے [جو نظر آتا ہے] بلکہ ہم ان باطنی مددگاروں اور خادموں پر بحث کریں گے جن کو آنکھ سے دیکھا اور مشاہدہ نہیں کیا جا سکتا اور ان کو "ادراک اور فہم کی قوتیں" کہا جاتا ہے۔ پھر ادراک کی یہ قوتیں دو طرح کی ہوتی ہیں: کچھ بیرونی اعضاء میں رہتی ہیں اور وہ سماعت، دیکھنے، چکھنے، چھونے اور سونگھنے کے پانچ حواس ہیں اور کچھ دماغ کی رگوں میں رہتے ہیں اور وہ پانچ بھی ہیں۔ جب کوئی چیز دیکھتا ہے اور پھر آنکھیں بند کرتا ہے تو جو کچھ دیکھا گیا اس کی تصویر اب بھی دل میں رہتی ہے اور اسے "تخیل" کہتے ہیں۔ پھر یہ تصویر اس شے کی یاد سے وابستہ ہو جاتی ہے اور اسے "میموری" کہا جاتا ہے۔ جب کوئی یادداشت میں جو کچھ رہ گیا ہے اس پر غور کرتا ہے اور کچھ کو دوسروں کے ساتھ جوڑتا ہے اور جو بھول گیا ہے اسے یاد کرتا ہے ، اور اس چیز کی تصویر یا تصویر ذہن میں دوبارہ نمودار ہوتی ہے اور اس کے خیال میں تمام حواس ادراک کو جمع کرتی ہے ، تو اسے یاد ، غور و فکر اور مشترکہ احساس کہا جاتا ہے۔ اگر خدا نے حفظ، غور و فکر، یاد، تخیل اور سوچ کی قوتیں پیدا نہ کی ہوتی تو دماغ ان سے اسی طرح خالی ہوتا جس طرح ہاتھ اور پاؤں ان کے لیے مقصود کے علاوہ دیگر قوتوں سے خالی ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ قوتیں فطرت میں اندرونی ہیں، اس لیے ان کا مسکن بھی اندرونی ہے۔

یہ دل کے لشکر کی مختلف قسمیں ہیں۔ ان کو سمجھنا اور سمجھنا دور اندیشی پر منحصر ہے۔ ان کو سمجھنے کے لئے ان لوگوں کو سمجھنے کے لئے جو علم کی کمی رکھتے ہیں ، تفصیلات کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان اقسام پر روشنی ڈالنے کے لیے کچھ مثالیں استعمال کی جائیں گی تاکہ ابتدائی افراد بھی ان کو سمجھ سکیں۔

قلب کے بندے (*قلب*) اور ان کی آسانی سے سمجھی جانے والی مثالیں

جب غصہ اور خواہش دل کے دو خادم دل کی مکمل اطاعت کرتے ہیں اور اس کے تابع ہو جاتے ہیں تو یہ روحانی راہ میں بہت بڑی مدد ہے۔ دل انہیں روحانی سفر کا بہترین ساتھی اور بے لوث اور مخلص مددگار سمجھتا ہے۔ بعض

اوقات یہ دونوں نوکر نافرمانی اور بغاوت پر تلے ہوئے ہیں اور دل کی اطاعت کرنے کے بجائے اسے ان کی اطاعت پر مجبور کرتے ہیں اور دل کی تباہی کا سبب بن جاتے ہیں۔ لیکن دل کے ان کے علاوہ اور بھی بندے اور مددگار ہیں اور اگر خواہش اور غصہ بغاوت کی طرف مائل ہو تو دل کو مایوس نہ ہونا چاہیے بلکہ ان کے خلاف دوسرے بندوں کی مدد حاصل کرنی چاہیے۔ بعض اوقات غصہ اور خواہش شیطان کے گروہ میں شامل ہو جاتی ہے۔ اگر دل لشکر الٰہی سے مدد نہ مانگتا اور اس کے بجائے غضب اور خواہش کے لشکروں کو نفس پر حاوی ہونے دیتا ہے تو وہ تباہی اور بے پناہ نقصان کی راہ پر گامزن ہو جائے گا۔ زیادہ تر لوگ اس حالت میں ہیں، ان کی عقل خواہشات اور خواہشات کے تابع ہے اور ان کی تکمیل کے لیے بہانے تلاش کرتی ہے۔ اس کے بجائے جو ہونا چاہیے تھا، وہ یہ ہے کہ خواہشات اور خواہشات کو ان کی عقل کے تابع ہونا چاہیے تھا۔ اس اہم نکتے کو کچھ تشبیہات کے ذریعے تفصیل سے تفصیل سے بیان کیا جائے گا۔

پہلی تشبیہ: آئیے فرض کریں کہ انسانی نفس، الہی روحانی لطافت جس کا ذکر کئی بار کیا گیا ہے، اپنے ملک اور دارالحکومت میں بادشاہ سے ملتا جلتا ہے۔ جسم اس کے تسلط کا مرکز ہے اور دارالحکومت ہے۔ جسمانی اعضاء شاہی عملے سے ملتے جلتے ہیں۔ عقل کی طاقت اس کا مخلص مشیر اور ذہین اور وفادار وزیر ہے۔ غصہ اس کا محافظ اور شہر کا جج ہے ، اور بادشاہ کو اس کے دشمنوں سے بچانا اس کے شاہی فرائض میں شامل ہے۔ ہوس (یا خواہش) اس کا بد اخلاق اور بد مزاج خادم ہے جو شہر کے لوگوں کو کھانا فراہم کرنے کا ذمہ دار ہے۔ یہ شخص ایک عادی جھوٹا، دھوکہ دہی، دھوکہ باز اور شیطان ہے جو مخلص نظر آسکتا ہے لیکن اس کے خلوص کے چہرے کے پیچھے ایک مہلک زہر ہے۔ مخلص مشیر اور وزیر (یعنی عقل) کی رائے اور منصوبہ بندی سے اختلاف کرنا اس کی فطرت اور عادت ہے اور ایک بھی لمحہ ایسا نہیں ہے جس میں وہ عقل کی مخالفت نہ کرے۔ اس صورت میں، اگر بادشاہ اپنے وزیر کی تجاویز اور منصوبہ بندی پر عمل کرتا ہے، اس سے مشورہ کرتا ہے اور اس برے خادم سے بچ کر یہ ظاہر کرتا ہے کہ حکومت کے بہترین مفاد میں اس سے دور رہنا بہتر ہے۔ اس کے علاوہ ، یہ شہر کے قاضی (یعنی غصے) کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ اس برے بندے اور اس کے پیروکاروں پر نظر رکھے اور اگر وہ غلط کاموں میں ملوث ہے تو اسے سزا دے۔ امید ہے کہ اس صورتحال میں یہ نوکر بغاوت نہیں کر سکے گا اور بادشاہ کے تابع اور محتاج رہے گا اور حکومت انصاف اور نظم و ضبط کے ساتھ چلے گی۔ اسی طرح اگر نفس عقل سے مدد مانگتا رہے اور بعض اوقات غصے کے محافظ کے ذریعے ہوس پر وار کرے۔ اور کبھی غصے کی طاقت اور غلبہ کو کم کرنے کے لیے ہوس (یا خواہش) سے مدد طلب کرتا ہے تو اس کی تمام قوتیں اور صلاحیتیں اعتدال میں رہیں گی، اس کا اخلاق اور کردار اچھا رہے گا۔ اگر وہ اس راستے سے انحراف کرے تو وہ ان لوگوں میں ہوگا جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

أَفَرَءَيْتَ مَنِ ٱتَّخَذَ إِلَٰهَهُۥ هَوَىٰهُ وَأَضَلَّهُ ٱللَّهُ عَلَىٰ عِلْمٍ

"کیا تم نے اس شخص کا حال دیکھا جس نے اپنی خواہشوں کو اپنا معبود بنا لیا اور اللہ نے اسے علم کے باوجود گمراہ کر دیا۔" (سورۃ البقرۃ باب 45، آیت 23)

وَٱتَّبَعَ هَوَىٰهُ ۚ فَمَثَلُهُۥ كَمَثَلِ ٱلْكَلْبِ إِن تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ أَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَث

"اس نے اپنی گھٹیا خواہشات [اور خواہشات] کی پیروی کرنا شروع کی لہذا اس کی حالت کتے کی طرح بن گئی جسے اگر آپ مارتے ہیں تو ، پتلون اور اگر آپ اسے چھوڑ دیتے ہیں تو ، وہ اب بھی پینٹ کرتا ہے۔" (سورۃ البقرۃ آیت 7، آیت 176)

قرآن مجید اس شخص کے بارے میں فرماتا ہے جو نفس کو خواہشات کے فریب سے بچاتا ہے:

وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِۦ وَنَهَى ٱلنَّفْسَ عَنِ ٱلْهَوَىٰ ﴿٤٠﴾
فَإِنَّ ٱلْجَنَّةَ هِىَ ٱلْمَأْوَىٰ ﴿٤١﴾

"وہ جو اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا تھا اور نفس کو روکتا تھا*نفس*) پست خواہشات اور خواہشات سے جنت کا ٹھکانہ ہو گا۔" (سورۃ البقرۃ باب 79، آیہ 40-41)

ایک دوسرے پر غصہ اور خواہش مسلط کرنے کی کیفیت اور اس [داخلی کشمکش] سے حاصل ہونے والے فوائد کو خدا کی مرضی سے نظم و ضبط کے لیے روحانی جدوجہد کے باب میں درج کیا جائے گا۔

دوسری تشبیہ: فرض کریں کہ جسم ایک شہر ہے اور عقل یعنی انسان میں ادراک کی طاقت اس کا حاکم ہے اور خارجی اور باطنی حواس اس کے مددگار اور سپاہی ہیں، جسمانی اعضاء اس کی رعایا ہیں، نیچی نفس برائی کی طرف مائل ہے (*نفس عمارہ*) جسے خواہش اور غصہ سمجھا جا سکتا ہے، اس کا دشمن ہے اور تمام رعایا کو قتل کرنے کے لیے حکومت پر قبضہ کرنے کا خواہاں ہے۔ اس معاملے میں ، جسم میدان جنگ کے مترادف ہے جہاں شہر کا حکمران دشمن سے لڑنے کے لئے ذاتی طور پر موجود ہوتا ہے۔ اگر وہ جنگ پر حاوی ہو جائے اور دشمن کو بھاگنے پر مجبور کرے تو دربار شاہی میں اس جدوجہد کو خراج اور تعریف ملے گی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَضَّلَ ٱللَّهُ ٱلْمُجَٰهِدِينَ بِأَمْوَٰلِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ عَلَى ٱلْقَٰعِدِينَ دَرَجَةً

"اللہ تعالیٰ نے اپنے گھروں اور مالوں سے جہاد کرنے والوں کے درجات بلند اور بلند کر دیے ہیں جو گھروں میں بیٹھے رہتے ہیں اور زیادہ نہیں کرتے۔" (سورۃ البقرۃ باب 4 آیت 95)

لیکن اگر وہ (یعنی عقل) بہادری سے کام نہ کرے اور دشمن (یعنی نچلے نفس) سے شکست کھا جائے تو یہ ایک بدقسمتی کا عمل ہوگا اور غفلت کے سنگین نتائج بھگتنا پڑے گا۔

حدیث میں بھی اسی کوشش کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

رجعنا من الجہاد الاصغر الی الجہاد الاکبر

"ہم ایک چھوٹی سی جدوجہد (ایک حملہ آور فوج کے خلاف جائز اپنے دفاع اور خود کے تحفظ کے لئے لڑی جانے والی جنگ) سے ایک بڑی کوشش (اپنے آپ کو زیر کرنے کے لئے روحانی جدوجہد)۔

تیسری تشبیہ: فرض کریں کہ عقل ایک سوار ہے جو شکار کے ارادے سے رخصت ہو رہا ہے۔ خواہش اور ہوس اس کا گھوڑا ہے ، اور غصہ اس کا کتا ہے۔ اگر سوار کو شکار ، گھوڑے کی تربیت ، اور کتے کو قابو کرنے میں مہارت حاصل ہے تو یہ سوار کسی کے مقصد میں کامیاب ہوگا۔ یہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ سوار شکار کے ساتھ کامیابی کے ساتھ گھر واپس آئے گا۔ دوسرا منظر نامہ یہ ہے کہ سوار اس فن سے بے خبر ہے، گھوڑا باغی اور کتا پاگل ہے۔ ایسے شخص کے بارے میں یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ کوئی کامیابی کے ساتھ واپس آئے گا۔ اگر کوئی صرف محفوظ طریقے سے گھر لوٹتا ہے تو یہ کافی سے زیادہ ہے۔ سوار کی علم اور مہارت کی کمی انسان کی جہالت کے مترادف ہے، گھوڑے کی سرکشی ہوس کا غلبہ اور کتے کا پاگل پن غصے کے غلبے کی طرح ہے۔

انسانی دل کی خصوصیات *(قلب)*

اب تک جو کچھ کہا گیا ہے وہ صرف انسانوں کے پاس نہیں بلکہ جانوروں کے پاس بھی ہے۔ مثال کے طور پر خواہش، غصہ، اندرونی اور خارجی حواس جانوروں میں بھی ہیں جیسا کہ وہ انسانوں میں ہیں۔ یہ اس حد تک ہے کہ بکری بھیڑیے کو دیکھ کر سمجھ جاتی ہے کہ وہ اس پر حملہ کرنا چاہتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنے دل سے بھاگ جاتا ہے۔ یہ وہ باطنی ادراک ہے جو انسان کے لیے مخصوص نہیں ہے اور عقل سے عاری جانور بھی اس صلاحیت سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور اس کے ذریعے ان کے نفع و نقصان کو سمجھتے ہیں۔ یہاں مقصد یہ ہے کہ ان معاملات کو شامل کیا جائے جو انسان کے لیے مخصوص ہیں اور ان کی وجہ سے وہ دوسری مخلوقات پر برتری اور فضیلت حاصل کرتے ہیں اور خدا کے ساتھ قربت اور قربت رکھتے ہیں۔

واضح رہے کہ انسانی دل سے متعلق معاملات صرف دو ہیں: پہلا علم اور دوسرا ارادہ۔ یہاں علم سے مراد دنیاوی، آخرت اور فکری حقیقتوں کا علم ہے۔ ان معاملات اور حقیقتوں کو حواس کے ذریعے نہیں سمجھا جاتا اور جانور انسانوں کے ساتھ ان کو سمجھنے کی صلاحیت کا اشتراک نہیں کرتے۔ مزید برآں ، منطق اور عقل بھی عقل کے لئے عجیب ہے کیونکہ صرف انسان ہی فیصلہ کرسکتا ہے کہ ایک ہی وقت میں دو مقامات پر ایک شخص موجود ہونا ممکن نہیں ہے۔ اگرچہ کسی نے صرف محدود تعداد میں لوگوں کو دیکھا ہے، لیکن یہ اصول دنیا کے تمام لوگوں پر لاگو ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم جانتے ہیں کہ اس اصول کو تمام لوگوں پر لاگو کرنا ایک اضافی معاملہ ہے جس کا تعلق صرف عقل سے ہو سکتا ہے۔ جب حاصل شدہ اور بیرونی علم کے ساتھ ایسی صورتحال ہوتی ہے تو ذاتی مشاہدے کے ذریعے حاصل کردہ علم اس اصول کے زیادہ مستحق ہوتا ہے۔ جب انسان کسی مادے کے آخری انجام کو دیکھتا ہے اور اس میں کچھ خوبی دیکھتا ہے تو وہ اس کے لیے ایک مشابہت پیدا کرتا ہے اور اس کے حصول کا جذبہ اس میں پیدا ہوتا ہے۔ یہ ارادے میں وہ نہیں ہے جسے "ہوس" یا "خواہش" کہا جاتا ہے جو جانوروں میں بھی موجود ہے بلکہ یہ ہوس کے ارادے کے برعکس ہے۔ ہوس اور ارادے کے درمیان فرق ایک مثال سے واضح ہو جائے گا جہاں بیماری کے دوران ہوس ہر قسم کے لذیذ کھانوں کی طرف مائل ہوتی ہے، لیکن عقل اس عیاشی کو نقصان دہ سمجھ کر اس سے روکتی ہے۔ یہ ممانعت ہوس کی طرف سے نہیں بلکہ عقل کی طرف سے ہے۔ اگر خدا نے عقل کو پسند کرنے والی نیت پیدا نہ کی ہوتی اور انسان ان پر عمل کرتا تو عقل کی تخلیق کا مقصد ختم ہوجاتا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کے دل میں علم اور نیت دو ایسی چیزیں ہیں جو جانوروں اور چھوٹے بچوں میں بھی نہیں ملتیں۔ اس کے بجائے [علم و عقل کی یہ خصوصیت جو صحیح اور غلط، نقصان دہ اور فائدہ مند میں تمیز کرنے

میں مدد کرتی ہے] بلوغت کے بعد ان میں پیدا ہوتی ہے حالانکہ ان میں شروع سے ہی ہوس، غصہ، ظاہری اور باطنی حواس موجود ہیں۔

اس علم کے حصول کے دو درجے: ہم جانتے ہیں کہ ایک بچہ بلوغت کے بعد [علم اور عقل] کی یہ خصوصیت حاصل کرتا ہے۔ اس حصول یا حصول کے دو درجات ہیں۔ پہلی ڈگری یہ ہے کہ کسی کے پاس بنیادی باتوں کا علم ہو ، یعنی ، وہ ناممکن کو ناممکن اور ممکن سمجھتا ہے۔ اس صورت میں یہ کہا جائے گا کہ کوئی بنیادی باتوں سے واقف ہے لیکن اس کے پاس مشاہدہ شدہ علم نہیں ہے۔ تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ کوئی شخص مشاہدہ شدہ علم حاصل کرنے کے قریب ہے جو بنیادی علم کے سلسلے میں خطاط کی طرح ہے جو خطاطی سے واقف نہیں ہو لیکن خطاطی کے آلات جیسے سیاہی، قلم اور حروف سے واقف ہے۔ ایسے شخص کو خطاط نہیں کہا جا سکتا، لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس فن کے قریب ہے۔

دوسری ڈگری یہ ہے کہ انسان تجربے، غور و فکر اور فعال تعلیم کے ذریعے ان علوم کی دولت حاصل کرتا ہے اور اس علم کو اپنی یادداشت کے ذخیرے میں اس ارادے سے محفوظ رکھتا ہے کہ جب چاہے اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ ایسا شخص ایک ماہر خطاط کی طرح ہوتا ہے جو شاید اس وقت لکھ نہ رہا ہو لیکن خطاطی کے علم سے بخوبی واقف ہو اور جب چاہے لکھ سکتا ہے۔ یہ انسان کی سب سے بڑی ڈگری ہے۔ اس ڈگری میں بے شمار رینک ہیں۔ علم کی مقدار ، چاہے وہ کم یا زیادہ ہو ، اور کام ، تفتیش کے طریقوں میں اختلافات ہر شخص کے لئے مختلف ہوتے ہیں اور اس وجہ سے ، ہر کوئی مختلف حالت میں ہوتا ہے۔ بعض دل ان علموں کو روحانی بیداری یا الہام (*الہام*) اور روحانی نقاب *کشائی (کشف*) کے ذریعے ادراک کرتے ہیں۔ کچھ دل اسے تعلیم اور سیکھنے کے ذریعے حاصل کرتے ہیں۔ کچھ لوگ اتنے ذہین اور تیزی سے سیکھنے والے ہوتے ہیں کہ وہ سیکنڈوں میں مشکل ترین معاملات کو سمجھ لیتے ہیں۔ کچھ لوگ اتنے سست ذہن اور سست سیکھنے والے ہوتے ہیں کہ وہ تکرار ، غور و فکر اور غور و فکر کے بغیر کچھ بھی نہیں سمجھتے ہیں۔ اس علم میں علماء ، دانشمندوں ، انبیاء اور اولیاء کرام کی درجات مختلف ہیں۔ جہاں تک اعلیٰ ترین عہدے کا تعلق ہے، اس کی کوئی حد یا اختتام نہیں ہے کیونکہ علم کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس میں سب سے بڑا درجہہ اس نبی کا ہے جس پر زیادہ تر یا تمام حقائق اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بغیر کسی کوشش اور علم کے نازل ہوتی ہیں۔ یہ خوش قسمتی اور حقیقی کامیابی (سعدہ) انسان کو خدا کے قریب لے جاتی ہے۔ یہ قربت جگہ اور فاصلے کی قربت نہیں ہے بلکہ یہ روحانی معنی، حقیقت اور داخلی خصوصیات کے لحاظ سے قربت ہے۔ اس قربت [اور خدا کے ساتھ قربت] میں صفوں پر چڑھنا اور اس روحانی سفر میں کسی مقام پر رہنا، روحانی مسافروں کے لیے سنگ میل ہیں۔ اس روحانی سفر میں عہدوں، ڈگریوں اور درجات کی کوئی حد نہیں ہے۔ ہر راہگیر جانتا ہے کہ کیا پڑاؤ طے کیا گیا ہے، لیکن مستقبل کے پڑاؤ سے واقف نہیں ہے۔ لیکن غیب پر ایمان لانے کی وجہ سے ان پر ایمان لاتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے ہم انبیاء اور نبوت پر ایمان رکھتے ہیں، حالانکہ نبوت کی حقیقت انبیاء کے سوا کسی اور کو معلوم نہیں ہے۔ جس طرح جنین میں ایک نوزائیدہ بچہ دودھ پلانے والے بچے کی حالت کو نہیں جانتا اور دودھ پلانے والا بچہ کسی بڑے بچے کی حالت کو نہیں جانتا جس نے چیزوں کو سمجھنا شروع کر دیا ہو اور اس کے نتیجے میں ایسا بچہ کسی بالغ ذہین شخص کی حالت یا اس (بالغ ذہین شخص) کے علم کو نہیں جانتا۔ اسی طرح ایک سمجھدار اور ذہین شخص یہ نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء اور نبیوں پر کیا نعمتیں عطا کی ہیں اور ان پر کون سے راز (غیب کے دائرے کی حقیقتیں جو عام لوگوں کو معلوم نہیں ہیں) ظاہر کی گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

مَّا يَفْتَحِ ٱللَّهُ لِلنَّاسِ مِن رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا

"جب اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور نعمتوں کے دروازے کھولتا ہے تو کوئی ان کو بند کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔"
(سورۃ البقرۃ باب 35، آیت 2)

یہ رحمت الٰہی اور برکتیں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی وجہ سے سب کے لیے مشترک ہیں اور اس میں کوئی بخل نہیں ہے۔ لیکن یہ بات ان دلوں میں ظاہر ہوتی ہے جو رحمت اور فضل و کرم کی ہواؤں کی آمد کا انتظار کر رہے ہیں جو اس طرح کی آمد کے لیے کھلے رکھے گئے ہیں جیسا کہ ایک حدیث میں بیان کیا گیا ہے :

ان لربكم في ايام دهركم لنفحات الا فتعرضوا لها

"تمہاری زندگی کے دنوں میں، خدا کی رحمت اور برکتوں کی بہت سی ہوائیں آتی ہیں۔ آپ کو ان کی تلاش میں رہنا چاہئے [جیسا کہ وہ اس وقت وصول کیے جاتے ہیں جب کوئی تیار ہوتا ہے اور پہلے ان کو وصول کرنے کے قابل ہوتا ہے]۔

"ان ہواؤں کا انتظار کرنا اور ان کی تلاش میں" کا مطلب یہ ہے کہ دل [اور روح] کو ان گندگی ، نجاستوں اور گندگی سے پاک اور پاک کرنے کی ضرورت ہے جو مذموم اور بری خصوصیات اور آداب کی وجہ سے اس میں جمع ہوتی ہیں۔ جلد ہی اس کی تفصیل سے وضاحت کی جائے گی۔ اس الٰہی سخاوت اور سخاوت کا تذکرہ مندرجہ ذیل حدیث (نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روایت ہے) میں آیا ہے:

ينزل الله كل ليلة الى سماء الدنيا فيقول هل من داع فاستجيب له

"اللہ تعالیٰ ہر رات زمین کے آسمان پر اترتا ہے اور کہتا ہے کہ کیا کوئی مجھ سے مانگتا ہے تاکہ میں اسے پورا کر سکوں؟" (بیان کردہ حدیث مجموعے *بخاری* اور *مسلمان* ابو ہریرہ اور ابو سعید رضی اللہ عنہ پر

حدیث *قدسی* (نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روایت جس میں اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے) اسی رحمت الٰہی کا اعلان اس طرح کیا ہے:

لقد طال شوق الابرار الى لقائي واني الى لقائهم اشد شوقا

"نیک لوگ بے صبری سے میری ملاقات کا انتظار کر رہے ہیں اور میں ان سے ملنے کا زیادہ خواہاں ہوں۔" (بیان *کردہابو الدرہ* رضی اللہ عنہ سے حدیث *کا* مجموعہ مسند الفردوس

من تقرب الي شبرا تقربت اليه ذراعا

"جو شخص میرے قریب آتا ہے تو میں ایک ہاتھ سے ایک کے قریب آتا ہوں۔" (بیان کردہ*حادیث* ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے *بخاری* اور *مسلم* کا مجموعہ ہے

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دلوں کا علم اور حکمت کے نور سے عاری ہونا خالق اور عطا کنندہ کی طرف سے کسی رکاوٹ یا کنجوسی کی وجہ سے نہیں بلکہ برائی، گندگی اور گندگی اور خدا کے سوا کسی اور کے جنون کی وجہ سے دلوں کو ان [روحانی] روشنیوں سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ دل برتنوں کی مانند ہیں اور جب تک وہ پانی سے بھر جاتے ہیں ان میں ہوا نہیں بہہ جاتی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی معرفت کا نور ان دلوں میں داخل نہیں ہوتا جو اللہ کے سوا کسی اور میں مشغول ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لولا ان الشياطين يحومون علىٰ قلوب بني آدم لنظروا إلى ملكوت السماء

"اگر شیطان بنی آدم (یعنی تمام انسانوں) کے دلوں میں نہ گھومتے تو وہ آسمانوں کی سلطنت کو دیکھ لیتے۔ (بیان کردہحدیث کا مجموعہ *مسند احمد* ابو ہریرہ رضی اللہ عنہا

خلاصہ یہ ہے کہ انسان کی خصوصیت اور خصوصیت علم اور حکمت کی وجہ سے ہے اور تمام علموں میں سب سے افضل علم خدا کی ہستی (*ذحت*)، صفات (*صفات*) اور اعمال (*عفال*) ہیں۔ اس علم میں انسانی کمال کا راز پوشیدہ ہے اور یہ کمال انسان کی اعلیٰ نعمت، لامتناہی فتح اور ابدی خوشی پر منحصر ہے۔ اس کے ذریعے انسان خدا کی قربت اور قربت میں رہنے اور حضور الٰہی حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ جسم نفس کے لیے پہاڑ (یا نقل و حمل کی گاڑی) ہے اور نفس علم کا مسکن ہے اور علم (خدا کی معرفت) انسانی زندگی کا اصل مقصد ہے اور اس کی امتیازی صفت ہے۔ ایک کو صرف اسی مقصد کے لیے بنایا گیا ہے۔ جس طرح گھوڑا گدھے کے ساتھ بھاری وزن اٹھانے کی طاقت اور طاقت رکھتا ہے لیکن شان و شوکت، خوبصورتی اور رفتار میں اس سے کہیں زیادہ افضل ہے، اسی طرح کچھ ایسی خوبیاں بھی ہیں جو انسان کو گدھے یا گھوڑے سے افضل بناتی ہیں اور یہ امتیازی صفات فرشتوں کی صفات سے تعلق رکھتی ہیں جو خدا کے قریب ہیں۔ انسان فرشتوں اور جانوروں کے درمیان ایک تخلیق ہے کیونکہ خوراک اور غذائیت کے لحاظ سے ایک نباتات ہے۔ حواس ، نقل و حرکت ، صلاحیتوں اور اعمال کے لحاظ سے ایک جانور ہے۔ اور ظاہری شکل اور تعمیر کے لحاظ سے ، ایک دیوار پر ایک تصویر ہے۔ علم کا [انسانی] معیار اور چیزوں اور معاملات کی حقیقت کا ادراک انسان کو جانوروں سے ممتاز کرتا ہے۔ جو شخص اپنے جسمانی اعضاء اور حواس کو علم و عمل کی تلاش میں استعمال کرتا ہے [اس علم کے مطابق، اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہ تمام علوم میں سب سے برتر علم الٰہی ہے جو کسی کو علم کی کیفیت عطا کرتا ہے]، وہ نہ صرف فرشتوں سے مشابہت رکھتا ہے بلکہ فرشتوں کے زمرے میں شامل ہونے اور خدا کا فرشتہ کہلانے کا مستحق ہے (*ملک ربانی*جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کی خوبصورتی کی گواہی دینے والی عورتوں کو بھی اقرار فرمایا:

مَا هَٰذَا بَشَرًا إِنْ هَٰذَآ إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ

"یہ انسان نہیں ہو سکتا بلکہ خدا کا فرشتہ ہے۔" (سورۃ البقرۃ باب 12، آیت 31)

جو شخص اپنے جسمانی لذتوں کو اپنے خیالات و اعمال (یعنی اپنی زندگی کا مقصد) کا مرکز بناتا ہے اور ان میں مکمل طور پر مگن ہو جاتا ہے تو وہ ان چوپایوں کی مانند ہے جن کا چرنے اور کھانے کے سوا کوئی مقصد نہیں ہوتا اور وہ جانوروں کے زمرے میں آ جاتا ہے۔ اس صورت میں کوئی بیل کی طرح بے وقوف یا سور کی طرح لالچی یا کتے کی طرح غصے میں یا اونٹ کی طرح تلخ یا چیتے کی طرح مغرور یا لومڑی کی طرح دھوکہ باز ہو اور اگر کوئی ان تمام خصوصیات اور حیوانی صفات کا مجسمہ ہو تو وہ شیطان (*شیطان الراجیم*) ہو گا۔

کوئی ایک بھی خارجی عضو یا داخلی احساس (یا فیکلٹی) نہیں ہے جسے خدا کے ساتھ قربت اور قربت کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ شکر گزاری اور شکر گزاری کی کتاب میں بیان کیا جائے گا۔ جو شخص اپنے اعضاء کو صحیح طریقے سے (صحیح مقاصد کے لیے) استعمال کرتا ہے وہ کامیابی حاصل کرتا ہے اور جو شخص [احکام الٰہی] کی نافرمانی کرتا ہے وہ بہت نقصان اٹھاتا ہے اور ذلیل ہوتا ہے۔ اپنی خوشی اور کامیابی اور سعادت کی تکمیل کا کمال یہ ہے کہ وہ خدا سے ملاقات کو اپنا مقصد بناتا ہے، آخرت کو اپنے حقیقی گھر کے طور پر، موجودہ دنیا کو ایک عارضی سنگ میل یا مقام کے طور پر، جسم کو اپنے سواری کے پہاڑ کے طور پر، اعضاء اور حواس کو اپنے خادم کے طور پر، اور اس کی ادراک اور فہم کی فیکلٹی ہے، جس کا مسکن [جسمانی] دل کا درمیانی حصہ ہے، بادشاہ کی حیثیت سے اور دماغ کے سامنے والے حصے میں فکر اور تخیل کی فیکلٹی کو بادشاہ کا قاصد سمجھتا ہے کیونکہ حواس سے آنے والی خبریں ایک کے پاس آتی ہیں اور یادداشت، یاد اور یادداشت کی فیکلٹی میں رہتی ہیں اور ان کی حفاظت (یعنی حواس سے خبریں) ایک خزانچی کی طرح کرتی ہیں۔ زبان اس کا اظہار یا ترجمان ہے، فعال اعضاء اس کے اداکار ہیں، پانچ حواس اس کی سلطنت کے جاسوس ہیں اور ان میں سے ہر ایک حواس کو خبروں کی تلاش اور فراہمی کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ آنکھوں کی ذمہ داری کا دائرہ رنگوں کی دنیا سے ، کان آوازوں کی دنیا سے اور ناک کا تعلق خوشبو کی دنیا سے ہے۔ یہ تمام حواس اپنی اپنی دنیا سے خبریں جمع کرتے ہیں اور انہیں غور و فکر اور فکر کی فیکلٹی فراہم کرتے ہیں۔ غور و فکر اور فکر کی فیکلٹی، جو پیغام رساں ہے، ان خبروں کو بادشاہی کے خزانچی تک پہنچاتی ہے جو یادداشت کی فیکلٹی ہے۔ فیکلٹی آف میموری خبروں کو بادشاہ (ادراک اور غور و فکر کی فیکلٹی) کے حوالے کرتی ہے اور وہ ایسی خبروں کا انتخاب کرتی ہے جو ریاست کے معاملات کو چلانے میں مفید ہیں، سفر کو مکمل کرنے میں مدد کرتی ہیں، ریاست کے دشمنوں کو شکست دیتی ہیں اور راستے کے ڈاکوؤں سے نمٹتی ہیں۔ اعضاء کو ان کی ذمہ داریوں سے آگاہ کرنا اور ان کی انجام دہی میں مصروف رکھنا بہت بڑی خوشی اور کامیابی ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ہے۔ جو شخص اعضاء اور حواس کو لاپرواہی میں رکھتا ہے وہ بدقسمتی سے ذلیل اور ذلیل ہارنے والا ہے۔ ایسا شخص خدا کی نعمتوں کا انکار کرتا ہے جس نے خدائی لشکروں یا لشکروں کو ضائع کیا ہے جو دشمنوں کے خلاف استعمال کرنے کے لئے کسی کو دی گئی تھیں، دشمنوں کی عزت کرتی ہے اور الٰہی لشکروں کی تذلیل کرتی ہے۔ آخر کار آخرت میں سخت عذاب اور رسوائی کا مستحق ہے۔ ہم آخرت کی رسوائی اور اس کے عذاب سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں۔ آمین۔

ہماری بیان کردہ تشبیہ کی تصدیق کعب الاحبر رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہوتی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی اور مددگار تھے۔ انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ (جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی تھیں) سے فرمایا کہ انسان کی آنکھیں اس کی راہنمائیں ہیں، کان اس کی محافظ ہیں، زبان ترجمان یا ترجمان ہے، ہاتھ لشکر ہیں، پاؤں رسول ہیں اور دل بادشاہ ہیں۔ اگر بادشاہ اچھا ہے تو اس کی رعایا بھی اچھی ہوگی۔" اس نے جواب دیا: "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا ہی سنا ہے۔ (اس روایت کو منتقل کیا گیا ہے *ابو نعیم* نے "طب نبی" میں، *طبرانی* "*مسند الطاسین*" میں اور "*شعب الایمان*" میں *بیہقی* صحابی اور مددگار ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ (جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابی اور مددگار

تھے) نے دل کی تشبیہ یہ کرتے ہوئے کہی کہ دل زمین پر خدا کی برتن ہیں۔ ان میں سے خدا کو سب سے زیادہ محبوب اور اس کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ سب سے نرم ، پاکیزہ اور مضبوط ترین ہے۔ دل کی نرمی، پاکیزگی اور مضبوطی یہ ہے کہ وہ اپنے بھائیوں کے لیے نرم ہے، اپنی یقین میں صاف اور پاک ہے اور راہ الٰہی (*دین*) پر قائم ہے۔

ابی بن کعب رضی اللہ عنہ (جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی اور مددگار تھے) مندرجہ ذیل آیت کی وضاحت کرتے ہیں:

مَثَلُ نُورِهِۦ كَمِشْكَوٰةٍ فِيهَا مِصْبَاحٌ

"خدا کے نور کی مثال گویا ایک طاق ہے اور اس کے اندر چراغ ہے۔" (سورۃ البقرۃ البقرۃ آیت 35)

فرمایا: یہ مومن کے نور اور اس کے دل کی مثال ہے اور یہ تمثیل ہے۔

أَوْ كَظُلُمَٰتٍ فِى بَحْرٍ لُّجِّىٍّ

'یا ایک گہرے سمندر میں اندھیرے کی گہرائی کی طرح ہے۔' (سورۃ البقرۃ باب 24 آیت 40)

منافق کے دل کی طرح ہے"۔

زید بن اسلم نے اس لوح کو محفوظ لوح کہا ہے۔ محفوظ لوح میں تمام مخلوقات اور وجود اور ان سے متعلق تمام واقعات کا مکمل ریکارڈ موجود ہے) قرآن مجید میں ایک مومن کے دل کے طور پر ذکر کیا گیا ہے اور [مشہور بزرگ اور گنوسٹک] سہل التستری نے دل کو "*عرش*" (صرف "عرش" (صرف "عرش" لیکن حقیقت میں یہ الہی قادر مطلق کی سلطنت ہے) اور "*کرسی*" (اعلیٰ الٰہی فضیلت کا آسمانی تخت ہے) سے تشبیہ دی ہے۔

قلب کی جامع خصوصیات اور اس کی مثالیں

واضح رہے کہ انسان کی تخلیق اور ساخت چار چیزوں کا مجموعہ ہے۔ چنانچہ انسان کی چار قسمیں صفات اور خصوصیات ہوتی ہیں یعنی حیانی، حیوانی، شیطانی اور الہی۔ غصے اور غصے کے غلبے کے لحاظ سے ، وہ کسی کو دشمنی ، بغض ، مار پیٹ ، زبانی گالی اور لعنت جیسے وحشیانہ اعمال کا ارتکاب کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ ہوس اور جسمانی خواہشات کے لحاظ سے ایک پر غلبہ حاصل کرنے کے معاملے میں، انسان لالچ، لالچ، فحاشی اور حسد جیسے حیوانی اعمال کا ارتکاب کرتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ حکم الٰہی ہونے کی وجہ سے:

قُلِ ٱلرُّوحُ مِنۡ أَمۡرِ رَبِّي

"کہہ دو جان میرے رب کے حکم سے ہے۔" (سورة البقرة سورة البقرة آیت 85)

کوئی شخص ربوبیت کا دعویٰ کرتا ہے اور تکبر، دوسروں پر برتری، خصوصیات اور انفرادیت کی خصوصیت کو پسند کرتا ہے اور غلامی، عاجزی اور محکومی کو ناپسند کرتا ہے۔ اسی رگ میں انسان تمام علم سے آگاہ ہونا پسند کرتا ہے اور علم سے وابستگی کسی کو محبوب ہے اور جہالت سے وابستگی کسی کو ناپسند ہے۔ کوئی شخص معاملات کی حقیقت کو سمجھنے کا دعویٰ کرتا ہے اور علم اور غنوسی حاصل کرنے کا دعویٰ کرتا ہے حالانکہ تمام حقیقتوں کو سمجھنے اور تمام مخلوقات پر برتری کی خصوصیات ربوبیت کی خصوصیات ہیں [جو انسان کے لیے نہیں بلکہ صرف خدا کے لیے موزوں ہیں]، لیکن غلامی اور غلامی کی خصوصیات [خدا کے لیے] نہیں۔ درندوں اور جانوروں کے ساتھ غصے اور ہوس کی خصوصیات بانٹنے کے باوجود انسان میں عقل و فہم کی صلاحیت موجود ہے، اس لیے اس کی ایک اضافی خصوصیت ہے جو شیطانی صفت ہے۔ شیطان سر سے پاؤں تک برا ہے اور انسان اپنی عقل کو برے طریقوں سے استعمال کرتا ہے اور اپنے مقاصد کے حصول کے لیے دھوکہ دہی اور فریب کا استعمال کرتا ہے اور نیکی کے گھر (یعنی انسانی وجود) میں برائی کا بیج بوتا ہے۔ یہ شیطانوں کی خصوصیات ہیں اور یہاں تک کہ وہ لوگ بھی شیطانوں کی خصوصیات کا اشتراک کرتے ہیں جن میں الہانی، شیطانی، حیوانی اور حیوانی صفات کے عناصر موجود ہیں۔ ان چاروں صفات کا مرکز دل ہے کہ انسان کی کھال کے اندر سور، کتا، شیطان اور عقلمند سب اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ سور ہوس اور بے حیائی کی علامت ہے۔ یہ ناپاک جانور جو برے باطنی صفات کا مالک ہے وہ اپنے رنگ اور ظاہری شکل و صورت کی وجہ سے برا نہیں بلکہ اپنی لالچ اور ہوس کی وجہ سے برا ہے۔ یہ ایک کتے کی حالت بھی ہے جو غصے کا مجسمہ ہے۔ بعض جانوروں کو اس لیے ناپسند نہیں کیا جاتا کہ وہ جانور ہیں بلکہ اس لیے کہ ان میں حیوانیت اور دشمنی جیسی انتہائی حیوانی خصوصیات ہیں۔ اسی رگ میں انسان کا باطنی وجود درندوں، عداوت، غصے اور خنزیر کی لالچ اور ہوس کا حامل ہے۔ جنگلی درندہ اپنے غصے کو قتل عام کرنے کے لئے اکساتا ہے اور سور اس کے لالچ کو بے حیائی کا ارتکاب کرنے کے لئے اکساتا ہے اور شیطان ان دونوں [بری خصلتوں] کو ایک دوسرے کے خلاف مسلسل لڑائی میں رکھتا ہے - کبھی وہ غصے کے خلاف لالچ کو اکساتا ہے اور کبھی لالچ کی مخالفت کرنے کے لئے غصے کو اکساتا ہے ، اس کے ساتھ ہی ، وہ ان خصوصیات سے پیدا ہونے والی فطری جبلتوں کی تعریف کرتا ہے۔

عقل کو ایک عقلمند شخص کے طور پر سمجھا جاتا ہے۔ اس کا کام شیطان کے فریب اور دھوکہ دہی کو دور کرنا اور اس کی گہری بصیرت اور واضح روشنی کو بروئے کار لانا اور شیطان کے طعموں کو ختم کرنا اور کتے کے غضب سے سور کی ہوس کو شکست دینا ہے کیونکہ ہوس غصے پر ختم ہوتی ہے۔ اسی طرح عقل کو چاہیے کہ وہ کتے پر سور مسلط کرے تاکہ اس کی حیوانیت کو ختم کیا جا سکے اور کتے (غصہ / غصے) کو اپنی حکمت اور حکمت عملی کے ذریعے قابو میں رکھ سکے۔ اگر وہ (عقل) ایسا کرتی ہے تو ، جسم کی بادشاہی ایک منصفانہ اور متوازن نظام کو برقرار رکھے گی اور اعضاء اپنے مطلوبہ فرائض کی انجام دہی جاری رکھیں گے۔ لیکن اگر عقلمند اپنی کوششوں میں ناکام ہو جائے اور شیطان کا مقابلہ کرنے اور سور اور کتے کو محکوم کرنے کی توفیق نہ ہو تو یہ تینوں ایک پر غالب ہو جائیں گے اور کسی کو اپنی زنجیروں میں اس طرح جکڑ لیں گے کہ کوشش کے باوجود آزاد نہ ہو جائے گا بلکہ وہ ساری زندگی اس کا خادم اور فرمانبردار رہے گا۔ زیادہ تر لوگ اسی قید میں اپنی زندگی گزار رہے ہیں [حقیقی آزادی اور آزادی سے دور] کیونکہ ان کی پوری جدوجہد پیٹ اور جنسی اعضاء کی ہوس کے لیے ہے۔ یہ حیرت کی بات ہے جب یہ لوگ بت پرستی کو اپنی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں اور اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اگر ان کی آنکھوں سے غفلت اور غفلت کے موٹے پردے ہٹا دیے جائیں گے تو وہ اپنی اطاعت اور خدا کے سوا کسی اور کی

عبادت کے گواہ ہوں گے۔ کبھی وہ کے سامنے سجدہ کرتے ہیں اور کبھی کتے کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہوتے ہیں اور کتے کے سامنے سجدہ کرتے ہیں۔ ان کی خواہشات کو پورا کرنا ان کا ایمان ہے اور ان کے اشارے اور دعوت کا انتظار کرنا ان کا عمل ہے۔ اگر ایسے لوگوں کے سامنے حقائق جسمانی شکل میں مجسم ہو جائیں تو وہ اپنی آنکھوں سے گواہ ہوں گے کہ ان کے اور مشرکوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ ایسے جانوروں کی پوجا کرکے شیطان کی رضامندی حاصل کرتے ہیں (نچلے نفس کے برے رجحانات اور تقاضا)۔ یہ شیطان ہی ہے جو سور اور کتے کو انسان سے اپنی خدمت کے لیے اکساتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ سور اور کتے کے اشارے پر ہیں وہ شیطان کے دھوکے کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔

خدا کے ہر بندے (یعنی انسان) کو چاہیے کہ وہ اپنی حرکات و سکنات اور خاموشی، تقریر اور خاموشی پر نظر رکھے اور بصیرت کی اندرونی آنکھ کو کھلا رکھے۔ اگر کوئی شخص اپنی اندرونی حالتوں میں عدل و انصاف کے ساتھ ایسا کرنے کے قابل ہو جائے تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ آیا وہ اپنا دن خدا کی اطاعت میں گزارتا ہے یا نچلے نفس کی عبادت میں گزارتا ہے۔ یہ ظلم کتنا بڑا ہے کہ نیچ نفس کے پوجنے والوں نے آقا کو غلام اور غالب کو محکوم بنا دیا ہے! تسلط اور قیادت کا حق عقل کا تھا ، لیکن سور ، کتے اور شیطان نے اسے اس سے چھین لیا ہے اور اسے محکوم اور قید کر دیا ہے۔ جب عقل کو قیادت سے محروم کر دیا جاتا ہے تو اس سے ان تینوں خصلتوں کی اطاعت ثابت ہوتی ہے اور ایسی صفات دل پر سرایت کر جاتی ہیں جس کا آخری انجام تباہی اور ذلت کے سوا کچھ نہیں ہوتا ہے۔

شہوت اور فحاشی کے سور کی اطاعت بے شرمی، بحیائی، فضول خرچی، بخل، دکھاو، بدنامی، بد اخلاقی، لالچ، ہوس، خوشامدی، حسد، عداوت، نفرت اور دیگر مکروہ [اور منفی] خصوصیات ان سے پیدا ہوتی ہیں۔ غصے اور غصے کے کتے کی اطاعت کے نتیجے میں ضرورت سے زیادہ تلخی ، خود غرور ، خود پرستی ، تکبر ، خود غرضی ، تضحیک ، بری نیت اور ظلم کی خواہش اور دیگر بری خصوصیات ان سے پیدا ہوتی ہیں۔
غصے اور ہوس کے معبودوں کی اطاعت دراصل شیطان کی اطاعت ہے جس کے نتیجے میں مذکورہ بالا منفی اور گھناؤنی باطنی خصوصیات پیدا ہوتی ہیں اور اس کے علاوہ دھوکہ دہی، دھوکہ دہی، فریب کاری، ضد ، بے ایمانی، فحاشی اور ان جیسے دیگر برے باطنی خصوصیات کو ہوا ملتی ہے۔ اگر صورت حال اس کے برعکس ہو اور ان تمام برائیوں کا سرچشمہ اور ان کے اسباب الٰہی صفات کی حکمت اور روشن اثر کے تابع ہو جائیں تو علم، حکمت، یقین، چیزوں کی حقیقتوں کی ادراک، معاملات کی گہری بصیرت، دور اندیشی اور حکمت کی طاقت کی وجہ سے دوسروں پر فوقیت کی الٰہی صفات علم کے کمال کی وجہ سے دوسروں پر امتیاز کا حق اور دل کی دیگر خوبیاں دل کو گھیر لیتی ہیں۔ اب یہ ضروری نہیں ہے کہ ہوس اور غضب کی اطاعت اور اطاعت کی جائے بلکہ اس کے بجائے ہوس کے سور کو اس کی حدود میں قید رکھنے سے معصومیت، شائستگی، قناطین، سکون، دنیاداری سے پرہیز اور مادہ پرستی جیسی عظیم باطنی صفات پیدا ہوتی ہیں‌زہد)، سادگی، پاکیزہ خوف، خدا کی تعظیم اور خوف، باطنی اطمینان اور خوشی، حیا اور شرم، ایک خوبصورت جسمانی اور ظاہری شکل، خوبصورت باطنی طبیعت، کردار اور طرز عمل دل کو متاثر کرتا ہے۔ غصے کے کتے کو زنجیروں میں جکڑنے سے بہادری، مہربانی، عظمت، صبر، نچلے نفس کو روکنا، اپنے تمام معاملات میں بردباری، استقامت اور شائستگی اور اسی طرح کی اعلیٰ باطنی خوبیاں دل میں پیدا ہوتی ہیں۔ دل ایک [پالش شدہ] آئینے کی مانند ہے [اس سے پہلے کہ وہ خاک سے ڈھانپ جائے یا روح کی باطنی برائیوں اور منفی چیزوں سے آلودہ ہو جائے]۔ غصہ، ہوس اور شیطان کی اطاعت [اس کے دل میں موجود بری آمادگی کی شکل میں] اس آئینے کی خوبصورتی اور وضاحت پر منفی اثرات مرتب کرتی ہے اور [اس کے نتیجے میں] انسان اس میں اپنی تصویر کو واضح طور پر نہیں دیکھ سکتا۔ [روح کی] قابل تعریف خوبصورت باطنی صفات اس آئینے کی چمک اور چمک کو اس حد تک بڑھا دیتی ہیں کہ [خدا کی] خوبصورتی بھی اس میں اپنے پورے جلال کے ساتھ ظاہر

ہوتی ہے (یہی وہ چیز ہے جسے کہا جاتا ہے *معارفہ* "یا خدا کی گنوسس، جس کا حصول کسی کی زندگی کا حقیقی مقصد ہے) اور مادے کی حقیقت جس کی تلاش کی جاتی ہے [سچائی اور ابدی حقیقتوں کی نقاب کشائی کے لحاظ سے کسی کی اندرونی روحانی کشمکش کے مقصد کے طور پر]۔ ذیل حدیث (پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک نبوت یا قول ایسے صاف ستھرے اور روشن دل کی طرف اشارہ کرتا ہے:

اذا اراد الله لعبد خيرا جعل له واعظا من قلبه

"جب اللہ کسی بندے کے لیے بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو دل میں نصیحت کرنے والا پیدا کرتا ہے۔" (بیان کردہ حدیث مجموعہ *ابو منصور الدیلمی* نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ ام سلمہ رضی اللہ عنہ کی سند پر

ایک اور نبی روایت (حدیث میں) ہے کہ جس شخص کے دل میں نصیحت کرنے والا ہو اللہ تعالیٰ اس دل کی حفاظت کے لیے ایک محافظ مقرر کرتا ہے۔ ایسا دل خدا کی یاد کا مرکز ہوتا ہے اور اس طرح کی الہی یاد سے سکون پاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

أَلَا بِذِكْرِ ٱللَّهِ تَطْمَئِنُّ ٱلْقُلُوبُ

"بے شک دل اللہ کے ذکر سے سکون اور سکون پاتے ہیں۔" (سورۃ البقرۃ القرآن ۱۳ آیت ۲۸)

قابل مذمت اور برے اخلاق اور آداب کا دل پر اسی طرح منفی اثر پڑتا ہے جیسے دھواں اور دھول آئینے کی چمک کو بادل میں ڈال دیتا ہے۔ دل کا آئینہ گناہوں کی تاریکی سے تاریک ہو جاتا ہے۔ یہ تاریکی ایک قسم کا پردہ ہے جو بندے (یعنی انسان) اور خدا کے درمیان کھینچ لیا جاتا ہے۔ اسی پردے کو "مہر" (*طبہ*) اور "مورچا" (*ران) کہا* جاتا ہے۔ قرآن کریم ایسے دل کے بارے میں فرماتا ہے:

كَلَّا ۖ بَلْ ۜ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِم مَّا كَانُوا۟ يَكْسِبُونَ

"یہ مادے کی حقیقت نہیں ہے بلکہ [اس کے بجائے] ان کے [غلط اور برائی] اعمال کی وجہ سے ان کے دلوں پر زنگ چھا گیا ہے۔" (سورۃ البقرۃ القرآن آیت نمبر 83 آیت 14)

أَن لَّوْ نَشَآءُ أَصَبْنَٰهُم بِذُنُوبِهِمْ ۚ وَنَطْبَعُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ

"اگر ہم چاہتے تو انہیں ان کے گناہوں کی وجہ سے ہلاک کر دیتے اور ہم نے ان کے دلوں پر مہر کر دی ہے پس وہ نہیں سنتے۔" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 100)

ایک اور آیت میں [حق و نصیحت] نہ سننا دلوں پر مہر لگانے کے مترادف سمجھا گیا ہے۔ ایک اور جگہ سننے کو خدا سے خوفزدگی، تعظیم اور خوف سے مشروط کر *دیا* گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَٱسْمَعُوا۟ۗ

"پرہیزگار رہو، خدا سے ڈرو اور سنو۔" (سورۃ البقرۃ باب 5 آیت 108)

وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ ۖ وَيُعَلِّمُكُمُ ٱللَّهُ ۗ

"خدا سے ڈرو، تعظیم اور خوف رکھو۔ اور وہی ہے جو تمہیں علم سکھاتا ہے [اور تمہیں تمہارے اپنے فائدے کے بارے میں سکھاتا ہے، مادی اور غیر مادی دونوں باتیں، جن سے تم پہلے واقف نہیں تھے]۔ (سورۃ البقرۃ آیت 282)

جب گناہ (برائی، غیر اخلاقی، نقصان دہ، منفی اور خود کو نقصان پہنچانے والے اعمال) میں اضافہ ہوتا ہے تو دل پر مہر لگا دی جاتی ہے اور حق کو سمجھنے اور اپنی (باطنی منفی) حالتوں کی اصلاح کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ آخرت کا معاملہ کسی کے لیے اہم نہیں رہتا، دنیاوی شان و شوکت انسان کے لیے سب کچھ بن جاتی ہے، انسان دنیاوی اموال اور مال کا لالچ بن جاتا ہے اور اپنی ساری توانائیاں ان کے حصول میں صرف کر دیتا ہے، آخرت کی نصیحتیں دل کو متاثر کیے بغیر ہوا کی طرح اس کے کانوں سے گزرتی ہیں اور اپنی غلطیوں کو درست کرنے کی صلاحیت اور گناہوں سے توبہ چھین لی جاتی ہے۔

قرآن مجید اور حدیث *میں دل کی تاریکی* دراصل دل کی ایسی کیفیت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ میمون بن محران رحمۃ اللہ علیہ (ایک مشہور سنت اور اولیاء) کہتے ہیں: "جب کوئی بندہ گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ نمودار ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس سے باز رہتا ہے اور دل کی سچی توبہ کے ساتھ خدا کے سامنے توبہ کرتا ہے تو یہ نقطہ مٹا جاتا ہے اور دل اپنی حالت میں واپس آجاتا ہے۔ اگر کوئی اس گناہ کی طرف لوٹ جائے یا دوسرے گناہوں کا ارتکاب کرے تو اس نقطے کی تاریکی اور سائز دونوں بڑھ جاتے ہیں یہاں تک کہ [ایک وقت آتا ہے] جب یہ سیاہ نقطہ پورے دل کو گھیرے ہوئے ہے۔ یہ اندھیرا دل کا زنگ ہے [جس کے نتیجے میں اس کی مہر لگ جاتی ہے جو کسی بھی مثبتیت اور روشنی کو اس تک پہنچنے سے روکتی ہے]۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

قَلْبُ الْمُؤْمِنِ أَجْرَدُ فِيهِ سِرَاجٌ يَزْهَرُ وَقَلْبُ الْكَافِرِ أَسْوَدُ مَنْكُوسٌ

"ایک مومن کا دل صاف ستھرا ہوتا ہے جس میں ایک چراغ روشن ہوتا ہے [جو ہر مثبت چیز کی طرف تبدیلی کے لیے کسی کی روحانی کوشش کی وجہ سے اپنی وضاحت اور چمک کے ذریعے روشنی کو ظاہر کرتا ہے] اور کافر کا دل تاریک اور الٹا ہوتا ہے [اس کی روحانی کوششوں کی کمی اور اس کے منفی سے اطمینان کی وجہ سے)، نیچے کی طرف رجحانات]۔ (بیان کردہ *احادیث* کے مجموعے *میں مسند احمد* اور *طبرانی* صحابی ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور نفس کی خواہشات کی مخالفت کرنا دل کی پالش کا کام کرتا ہے اور گناہ اسے (دل) تاریک رات کی طرح تاریک بنا دیتے ہیں۔ گناہوں کے ارتکاب کے بعد نیک اعمال کرنے سے دل کو اندھیرا نہیں چھوڑتا بلکہ اس کی روشنی اس آئینے کی طرح کم ہو جاتی ہے جیسے گرم سانس کا سامنا کرنا پڑتا ہے پھر اسے صاف کیا جاتا ہے اور پھر گرم سانس کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس سے اس کی سطح داغدار ہو جاتی ہے، اس کی چمک میں کچھ

کمی آئے گی اور اس داغ کا اثر مکمل طور پر مٹا نہیں جائے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دلوں کی چار قسمیں بیان کی ہیں:

القلوب اربعۃ قلب اجرد فیہ سراج یزھر، فذالک قلب المؤمن، وقلب اسود منکوس فذالک قلب الکافر، وقلب اغلف مربوط علی غلافہ فذالک قلب المنافق، وقلب مصفح فیہ ایمان ونفاق، فمثل الایمان فیہ کمثل البقلۃ یمدھا الماء الطیب، ومثل النفاق کمثل القرحۃ یمدھا القیح والصدید فای المادۃ غلبت علیہ حکم لہ بھا وفی روایۃ ذھبت بہ

"دلوں کی چار قسمیں ہیں: ایک قسم کا دل صاف ستھرا ہوتا ہے، اس میں چراغ روشن ہوتا ہے۔ یہ ایک مومن کا دل ہے۔ ایک قسم اگر دل سیاہ ہو اور الٹا ہو۔ یہ ایک کافر کا دل ہے۔ ایک قسم کا دل غلاف میں لپٹا ہوا ہے اور اس کا کھلنا بند ہے۔ یہ منافق کا دل ہے۔ ایک قسم کے دل میں ایمان اور منافقت دونوں ایک ساتھ رہتے ہیں۔ ایسے دل میں ایمان کی تشبیہ ہریالی کی مانند ہے جو خالص پانی سے اگتی ہے اور منافقت کی تشبیہ اس زخم کی مانند ہے جو اس میں رطوبت اور گندے مادہ کی وجہ سے تیزی سے پھیلتا ہے۔ جو بھی مادہ غالب ہے وہ ایسے دل کا حکم دے گا۔ (بیان کردہ *احادیث* کے مجموعے *میں مسند احمد* اور *طبرانی صغیر* صحابی نبوی ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّ ٱلَّذِينَ ٱتَّقَوْا۟ إِذَا مَسَّهُمْ طَٰٓئِفٌ مِّنَ ٱلشَّيْطَٰنِ تَذَكَّرُوا۟ فَإِذَا هُم مُّبْصِرُونَ

"بے شک جو لوگ خدا سے ڈرتے ہیں، تنگ کرتے ہیں، ہوشیار ہوتے ہیں اور ڈرتے ہیں، جب ان کے دلوں میں شیطان کی طرف سے آمادہ ہوتا ہے تو اللہ کی یاد میں مشغول ہو جاتے ہیں اور فورا اس سے چونک جاتے ہیں [یہ جانتے ہو کہ شیطان انہیں برائی کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور وہ اپنے دلوں میں ایک لمحے کے لیے بھی اس کا خیال آنے نہیں دیں گے]۔ (سورة البقرة سورة البقرة آیت 201)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دل کی زندگی، حکمت، تدبر اور شعور و شعور اللہ کے ذکر سے حاصل ہوتا ہے اور صرف وہی لوگ یاد الٰہی میں مشغول ہوتے ہیں جو *تقویٰ* کی صفت رکھتے ہیں۔ یاد الٰہی روحانی نقاب کشائی کا باعث بنتا ہے جو ایک زبردست کامیابی ہے اور رب سے ملاقات کا ذریعہ ہے (یعنی گنوسس یا "*معارفہ*" جس کا حصول انسان کی زندگی کا اصل مقصد ہے)۔

علم کے سلسلے میں دل کی تشبیہ - دل کا پالش شدہ آئینہ اور اس میں جھلکنے والی سچائی کی روشنی

واضح رہے کہ علم کا ٹھکانہ اور ٹھکانہ دل ہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں، یہ الٰہی روحانی لطافت ہے جو تمام اعضاء اور فیکلٹیز کے نظام کو چلاتا ہے۔ تمام اعضاء اس لطافت کی خدمت کرتے ہیں اور اس کے تابع ہوتے ہیں۔ چیزوں اور علم کی حقیقی نوعیت کے سلسلے میں دل کی تشبیہ مرئی اشیاء یا فہم چیزوں کے سلسلے میں آئینے کی مانند ہے۔ ہر نظر آنے والی شے اور ظاہری شکل کی تصویر [دل کی] آئینے میں نظر آتی ہے۔ اسی طرح ہر معلوم شے کی حقیقت دل پر نقش ہوتی ہے۔ جس طرح آئینہ ایک الگ شے ہے، اسی طرح نظر آنے والی اشیاء کی ظاہری شکل الگ اشیاء ہوتی ہیں اور آئینے میں ان کا عکس ایک الگ مادہ ہوتا ہے، دل کے لیے بھی یہی تفریق موجود ہے اور آئینے کی طرح دل سے متعلق تین چیزیں ہیں۔ پہلا دل ہے، دوسرا چیزوں کی حقیقت یا حقیقی نوعیت اور تیسرا دل میں ظاہر ہونے والی چیزوں کی حقیقت کا عکاس ہے۔ دل جاننے والا ہے۔ چیزوں کی حقیقت اور حقیقی نوعیت اس میں داخل ہوتی ہے۔ معلوم حقائق اشیاء ہیں اور علم دل میں ان معلوم حقائق کی عکاسی کا نام ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے تلوار کو پکڑنے کے لئے تین چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے: وہ جو پکڑتا ہے ، جیسے ہاتھ؛ وہ جو تلوار کی طرح پکڑا جاتا ہے۔ اور تلوار کو ہاتھ میں رکھ کر تلوار اور ہاتھ کو اکٹھا کرنے کا عمل جسے پکڑنے کا عمل کہا جاتا ہے، اسی طرح عقل کی تصویر کی دل میں موجودگی کو بھی فہم کہا جاتا ہے۔ اسی طرح عقل کی تصویر کی عکس یا دل میں معلوم کو علم کہا جاتا ہے۔ بعض اوقات حقائق اور حقائق موجود ہوتے ہیں اور دل بھی موجود ہوتا ہے لیکن علم و فہم کا حصول نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علم دل میں داخل ہونے والی حقیقتوں کا نام ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے تلوار اور ہاتھ الگ الگ موجود ہیں لیکن اس کی گرفت یا پکڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ، اس کے لئے ، ہاتھ کو تلوار تک پہنچنا اور اسے پکڑنا چاہئے۔ گرفت اور علم میں فرق یہ ہے کہ پکڑنے میں تلوار ہاتھ میں آجاتی ہے لیکن حقیقت دل میں نہیں جاتی۔ ایک شخص آگ کا علم رکھتا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آگ خود دل میں موجود ہے۔ اس کے بجائے یہ کہا جائے گا کہ آگ کی حقیقت دل میں ہے جو اس کے ظاہری وجود اور ظاہری شکل سے ملتی جلتی ہے۔ چنانچہ دل کا موازنہ آئینے سے اس لیے کیا گیا ہے کہ اس میں [طبعی طور پر] کوئی چیز داخل نہیں ہوتی، اس کے بجائے کسی شے کا عکس یا تصویر اس کے حقیقی وجود کے مطابق اس میں ظاہر ہوتی ہے۔

آئینے کے ساتھ دل کی مشابہت اور تشبیہ: دل کا آئینے سے موازنہ کرنا بہتر ہے۔ اس کی ایک وجہ وہی ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ کچھ وجوہات کی بنا پر [کسی شے کی] تصویر آئینے میں ظاہر نہیں ہوتی۔ اسی طرح بعض حالات میں دل کا آئینہ چیزوں کی حقیقتوں کے علم سے محروم رہتا ہے۔ آئینے میں اشیاء کی تصویروں کی عکاسی نہ کرنے کی پانچ وجوہات ہیں: اول ، اس کی تشکیل میں خرابی کی وجہ سے ، مثال کے طور پر ، یہ صرف خام لوہے کا ایک ٹکڑا ہوسکتا ہے [جس کی شکل اور پالش نہیں کی گئی ہے] یا اس کے مادے میں کوئی عیب ہوسکتا ہے ، یا اس کی شکل صحیح نہیں ہوسکتی ہے۔ دوسرا، کسی ایسی خرابی کی وجہ سے جو اس میں گھس گئی ہو یا اس میں زنگ آلود ہو یا اس کی چمک اور وضاحت کم ہو گئی ہو [اس کی سطح کو ڈھانپنے والی دھول کی وجہ سے]۔ تیسرا، کیونکہ اسے اس شے کی سمت سے دور کر دیا گیا ہے جس کی تصویر کو اس کی عکاسی کرنی چاہیے، مثال کے طور پر، شے [اسے منعکس کرنا چاہیے] آئینے کے پیچھے منتقل کر دیا گیا ہے۔ چوتھا ، آئینے اور شے کے درمیان ایک پردہ یا پردہ کھینچا گیا ہے۔ پانچویں بات یہ ہے کہ جس شے کی تصویر آئینے میں دیکھنے کی ضرورت ہے اس کی سمت سے لاعلمی کی وجہ سے جبکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسے آئینے کی پوزیشن اور سمت کے سامنے رکھا جائے تاکہ اس کی تصویر اس میں منعکس ہو۔

دل کے آئینے کی ایسی حال ہے۔ اس میں سچائی اور حقائق کے تمام معاملات ظاہر کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن بہت سے دلوں کو یہ علم نہیں ملتا۔ اس کی وہی پانچ وجوہات ہیں۔ سب سے پہلے، دل فطری طور پر ناقص ہو سکتا ہے، مثال کے طور پر، ایک بچے کا دل ان حقیقتوں کو ظاہر کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ دوسری بات یہ کہ دل گناہوں کی کیچڑ (غلط، منفی اور قابل مذمت خیالات، احساسات، قول و اعمال سے) اور خواہشات کی گندگی سے آلودہ اور داغدار ہو جاتا ہے، جس کے نتیجے میں اس کی وضاحت، لنگڑی، پاکیزگی اور چمک ختم ہو جاتی ہے۔ سیاہ دل میں سچائی ظاہر نہیں ہوتی۔ حقیقت اس میں اس کے اندھیروں اور اس پر ڈھیر ہونے والی گندگی کے تناسب سے ظاہر نہیں ہوتی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے:

من قارف ذنبا فارقه عقل لا يعود اليه ابدا

"گناہ کرنے والے شخص کی عقل اس شخص سے الگ ہو جاتی ہے جو کبھی واپس نہیں آتی [اور اس طرح وہ معاملات کی حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہو جاتا ہے]۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ گناہوں کی وجہ سے دل میں ایسی گندگی اور برائی ظاہر ہوگی جو کبھی ختم نہیں ہوگی اور اس کی کوئی تلافی نہیں کی جا سکتی۔ یہ کہنا درست ہے کہ گناہوں کے ارتکاب کے بعد نیک اور نیک اعمال کرنے سے گناہوں کا اثر دل پر ختم ہو جاتا ہے، لیکن کیا دل اپنی اصل حالت میں واپس آ سکتا ہے جو گناہوں سے پہلے تھا؟ ایسا کبھی نہیں! حقیقت یہ ہے کہ اگر وہ شخص صرف نیک اعمال کرتا تو دل کی چمک اور چمک میں اضافہ ہوتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بڑھتی ہوئی چمک کا نقصان ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی نہیں کی جا سکتی۔ جب زنگ آلود آئینے کا علاج کیا جاتا ہے اور پالش کیا جاتا ہے تو ، یہ اپنی چمک دوبارہ حاصل کرتا ہے ، لیکن کیا علاج شدہ آئینے کا موازنہ اس آئینے سے کیا جاسکتا ہے جو کبھی زنگ آلود نہیں ہوا ہے؟ بہرحال خدا کی اطاعت اور شہوت کے میلانوں کی مخالفت کرنے یا نچلے نفس کی پست خواہشات کی پیروی کرنے سے دل میں شفافیت اور بے تکلفی پیدا ہوتی ہے اور گناہوں کی گناہ اور نتائج دور ہوجاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَٱلَّذِينَ جَـٰهَدُواْ فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۚ

"جو لوگ ہماری راہ میں جہاد کرتے ہیں ہم انہیں یقینا اپنی راہوں پر راہ دکھائیں گے۔" (سورۃ البقرۃ البقرۃ القرآن آیت نمبر 69)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من عمل بما علم ورثه الله علم ما لم يعلم

"اللہ تعالیٰ نے جو علم پر عمل کیا وہ علم عطا فرماتا ہے جو وہ نہیں جانتا۔" (یہ روایت نبوی کے مجموعے میں نقل ہوئی ہے *ابو نعیم فی حلیۃ* رضی اللہ عنہ سے صحابی اور مددگار انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ دل مطلوبہ حقیقت کا سامنا کرنے سے دور ہو سکتا ہے، مثال کے طور پر ایک متقی اور راستباز شخص ہے جو احکام الٰہی پر عمل پیرا ہے اور اسی کی وجہ سے اس کا دل واضح ہے لیکن اس دل میں حق کی عکاسی نہیں ہوتی کیونکہ وہ حق کا طالب نہیں ہے۔ ایسا شخص اپنی پوری محنت اور توانائیاں جسمانی عبادات اور معاشی ذرائع جمع کرنے پر صرف کرتا ہے اور اس طرح خدا کی ربوبیت، حاکمیت اور پوشیدہ الٰہی حقیقتوں اور حقیقتوں پر غور و فکر کرنا کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کا کوئی عادی نہیں ہے۔ سچائی اور الٰہی حقیقتیں ایسے دل میں ظاہر اور عکاس نہیں ہوتیں [کیونکہ وہ ان کی تلاش بھی نہیں کر رہا ہے اور اس کے بجائے دوسرے مادیاتی، دنیاوی اور غیر روحانی معاملات میں مشغول ہے]۔ بلکہ ، صرف وہی معاملات اس پر ظاہر ہوتے ہیں جن پر عام طور پر غور کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص اپنے اعمال اور اعمال کی خامیوں اور خامیوں اور اپنے نچلے نفس کی خامیوں پر غور و فکر کرے تو ان سے متعلق حقائق اس کے دل میں کھل جاتی ہیں۔ اگر کوئی معاشی معاملات کی پیچیدگیوں پر غور و فکر کرے تو یہ پیچیدگیاں اس کے دل میں کھل جاتی ہیں۔ پھر غور کیجئے کہ اگر اپنے آپ کو اعمال صالح اور جسمانی عبادات تک محدود رکھنا حق کی جھلک (روحانی دنیا سے ابدی حقیقتوں، سچائیوں اور حقیقتوں) کی نقاب کشائی کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے تو ادنیٰ نفس کی خواہشات اور خواہشات اور دنیا اور دنیاداری سے وابستگی اور الجھن حقیقتوں کے بے نقاب ہونے کی راہ میں رکاوٹ کیوں نہیں بنتی؟

چوتھی وجہ وہ پردہ ہے جو حق سے پردہ اٹھانے کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ مثال کے طور پر بعض اوقات کوئی شخص اپنی خواہشات اور خواہشات پر قابو پانے والا شخص فرمانبردار اور عبادت گزار بندہ ہونے کے ناطے غور و فکر اور غور و فکر کے باوجود حقائق کی سمجھ سے محروم رہتا ہے۔ یہ محرومی کسی ایسے عقیدے کی وجہ سے ہے جو بچپن سے ہی اپنے آباؤ اجداد کی پیروی کی وجہ سے کسی کے ذہن میں سرایت کر چکی ہے اور ان عقائد کی سخت تشریحات کے خلاف کسی کے دل پر کسی چیز کو ظاہر کرنے سے روکتی ہے جسے اس نے آنکھیں بند کر کے قبول کر لیا ہے۔ یہ عقیدہ اب ہر اس معاملے کے خلاف جو اس کے خلاف ہے یا اس کے بالکل مخالف ہے اس کے خلاف ایک سخت رکاوٹ بن گیا ہے۔ یہ ایک ایسا پردہ ہے جو بہت سے علماء الدینیات، دانشوروں، علماء کو لیکن مذہبی تعصب اور تعصب کے ساتھ چھپا دیتا ہے، اور یہاں تک کہ اصلاحی افراد (*سلاحا*) جن کے خیالات اور غور و فکر آسمانوں اور زمین کی حاکمیت پر مرکوز ہیں، حقیقتوں اور سچائی کی تفہیم سے محروم ہیں۔ وہ اپنے ہٹ دھرمی عقائد کی اندھی پیروی کی وجہ سے پردہ ڈالے ہوئے ہیں جو ان کے دلوں اور ذہنوں میں اس حد تک سرایت کر چکے ہیں کہ وہ کسی بھی ایسی چیز کو قبول کرنے کی صلاحیت کھو دیتے ہیں جو ان کے خلاف ہے [چاہے وہ سچ ہی کیوں نہ ہو]۔ اسی طرح یہ ہٹ دھرمی عقائد ان کے حق کو سمجھنے اور سمجھنے کی راہ میں رکاوٹ اور پردہ بن جاتے ہیں۔

پانچویں وجہ یہ ہے کہ وہ سمت سے لاعلمی ہے جہاں سے مطلوبہ علم حاصل کیا جا سکتا ہے۔ [ابتدائی یا نوسکھئی] طالب علم کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ پہلے اس سے متعلق معلوم علم حاصل کیے بغیر نامعلوم کا علم حاصل کرے۔ اس کے بعد صرف متعلقہ معلوم علم کا ہونا کافی نہیں ہے، بلکہ اسے ایک خاص ترتیب میں ترتیب دینے کی ضرورت ہے جسے اہل علم قابل اعتماد سمجھتے ہیں [تاکہ منطقی تخمینے کی ضرورت ہو]۔ نامعلوم کے مطلوبہ علم پر قبضہ کرنا معلوم علم پر ڈالے گئے جال کے ذریعے ممکن ہے [کٹوتی کے عمل کے ذریعے ایک خاص طریقے سے ترتیب دیا گیا ہے]۔ ہر علم کے لیے ضروری ہے کہ اس سے پہلے دو علوم ہوں جو ایک خاص ترتیب میں ہوں اور ایک دوسرے کے ساتھ مل کر تیسرے علم کے نتیجے میں پیدا ہوں [جو پہلے نامعلوم تھا] بالکل اسی طرح جیسے ایک بچہ مرد اور عورت کے امتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ علم فطری وابستگی کے ساتھ ہم آہنگ اور ایک دوسرے سے قریب سے جڑے ہوں۔ لہٰذا اگر کوئی گھوڑے اور اونٹ کے ملاپ سے بچہ حاصل کرنا چاہتا ہے تو مایوس ہو جائے گا کیونکہ اس کے لیے نر اور مادہ گھوڑوں کی ضرورت پڑے گی اور اونٹ اس ضرورت کو

پورا نہیں کر سکتا۔ اسی طرح ہر علم کے لیے دو خاص اصول ہوتے ہیں اور ان کے اتحاد کا ایک خاص طریقہ ہوتا ہے اور صرف صحیح طریقہ کار پر عمل کرنے سے مطلوبہ علم حاصل ہوتا ہے۔ ان اصولوں سے لاعلمی اور ان کے امتزاج کے انداز سے لاعلمی ہی علم و فہم میں رکاوٹ ہے۔ لہٰذا جیسا کہ آئینے کی تشبیہ میں اوپر ذکر کیا گیا ہے، مطلوبہ شے کی سمت سے لاعلمی جس کی تصویر آئینے میں تلاش کی جاتی ہے، اس کے نتیجے میں تصویر آئینے میں ظاہر نہیں ہوگی اور مقصد حاصل نہیں ہوگا۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص اپنی گردن کو آئینے میں دیکھنا چاہتا ہے لیکن اس نے آئینہ اپنے چہرے کے سامنے رکھا ہے تو ظاہر ہے کہ گردن اس آئینے میں نظر نہیں آئے گی جس کی تلاش کی گئی ہے۔ چہرے کی تصویر ، جس کی تلاش نہیں کی گئی تھی ، اس میں ظاہر ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر گردن کے پیچھے آئینہ رکھا جائے تو گردن نظر نہیں آئے گی بلکہ آئینہ نظروں سے اوجھل ہو جائے گا۔ گردن کو دیکھنے کے لیے دوسرا آئینہ درکار ہے اور اسے آنکھوں کے سامنے اس طرح رکھنا چاہیے کہ اس میں دوسرا آئینہ نظر آئے۔ اس صورت میں اپنی گردن کو دیکھ سکتا ہے کیونکہ گردن کا عکس پہلے آئینے پر ڈال دیا جائے گا اور اس عکس کا عکس دوسرے آئینے پر پڑے گا [آنکھوں کے سامنے تاکہ گردن نظر آئے گی]۔ علم کے حصول میں اس طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، بلکہ ان میں بہت زیادہ پیچیدہ مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ زمین پر ایسے لوگ موجود نہیں ہیں جو ایسی تمام پیچیدگیوں کا سامنا کر سکیں اور یہی وجہ ہے کہ بہت سی حقیقتوں اور علموں کا ادراک نہیں کیا جاتا۔ یہ چند وجوہات ہیں جو دلوں سے حق اور [ابدی روحانی] حقیقتوں کو سمجھنے کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہیں، ورنہ ہر دل (یا نفس) اپنے آپ کو ذاتی طور پر حقیقتوں کو ادراک کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے کیونکہ یہ ایک حکم الہامی ہے، رب اور اعلیٰ ہے اور کائنات کے تمام مادوں اور اس سے ماورا ہے [اس کی خاص خصوصیات اور اعلیٰ صفات کی وجہ سے]۔ دل کی فضیلت، امتیاز اور برتری کا اندازہ ذیل میں الہامی بیان سے لگایا جا سکتا ہے:

إِنَّا عَرَضْنَا ٱلْأَمَانَةَ عَلَى ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ وَٱلْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَن يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا ٱلْإِنسَٰنُ ۖ إِنَّهُۥ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ﴿٧٢﴾

"بیشک ہم نے امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کو پیش کی تھی پھر انہوں نے اس پر عمل کرنے سے انکار کیا اور ڈرنے لگے اور انسان نے اسے اٹھایا بے شک ایک شخص ظالم اور جاہل تھا۔ (سورۃ البقرۃ 33، آیت 72)

یہ آیت انسان کی اس خاص خصوصیت کی طرف اشارہ کرتی ہے جو آسمانوں، زمینوں، پہاڑوں جیسی بلند، وسیع اور مضبوط مخلوقات سے واضح طور پر ممتاز کرتی ہے اور خدا کی توکل کو برداشت کرنے کے قابل بناتی ہے [جب کہ باقی تمام مخلوقات کو ایسا کرنے کے قابل نہیں سمجھا جاتا تھا]۔ یہ توحید یا توحید (توحید) اور خدا کی معرفت (تجرباتی روحانی علم یا *معارفہ*) ہے۔ ہر شخص فطری طور پر اور فطری طور پر اس امانت کا بوجھ اٹھانے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن مذکورہ بالا وجوہات کی بنا پر اس امانت کی تکمیل کی ہمت کھو دیتا ہے اور اب اس امانت کا بوجھ برداشت کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ اس سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

كل مولود يولد على الفطرة فابواه يهودانه وينصرانه ويمجسانه

"ہر بچہ *فطرہ*' پر پیدا ہوتا ہے (انسان کی حقیقی فطری اصل فطرت جو پوری طرح سے خدا کی مرضی، الہی حقیقت اور ابدی آفاقی سچائیوں کے مطابق ہے اور خدا کی اس بھروسے کی طرف مائل ہے جو انسان کو واضح طور پر عطا کیا گیا ہے، یعنی توحید اور الٰہی معرفت)، پھر کسی کے والدین ایک کو یہودی، عیسائی بناتے ہیں، یا میجیئن (دنیا میں موجود متنوع مذہبی اور نظریاتی روایات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس طرح کسی کو اپنے مذہبی، نظریاتی، ثقافتی،

جغرافیائی اور فکری سیاق و سباق کے سانچے میں ڈھال دیا جاتا ہے)۔ (یہ روایت نبوی کے مجموعے سے نقل کی گئی ہےصحیح *بخاری* اور صحیح *مسلم* صحابہ کرام ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر شیطان بنی آدم (یعنی انسانوں) کے دلوں پر منڈلاتے نہ ہوتے تو وہ آسمان کی سلطنت کے گواہ ہوتے۔ یہ ان میں سے بہت سی رکاوٹوں کی طرف اشارہ ہے جو دل اور سلطنت کے درمیان پردہ بن جاتے ہیں۔ کسی نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں اور وہ کہاں ہے اور کیا وہ آسمان میں ہے یا زمین میں، آپ نے فرمایا: اللہ اپنے مومن بندوں کے دلوں میں ہے۔ *نبی کریم صلی* اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ہے کہ

لم یسعنی ارضی ولا سمائی وو سعنی قلب المئومن اللین الوادع

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نہ تو میرا زمین اور نہ آسمان مجھے سکا لیکن میرے بندے کا نرم دل مجھے قابو کرنے کی توفیق رکھتا ہے۔

ایک اور نبوی حدیث اس طرح ہے:

قیل یا رسول اللہ من خیر الناس، فقال کل مئومن مخموم القلب، فقیل وما مخموم القلب، فقال: ھو التقی النقی الذی لا غش فیہ، ولا بغی ولا غدر ولا غل ولا حسد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ افضل لوگ کون ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہر مومن جو مخموم *القلب* ہے۔ آپ سے پوچھا گیا کہ مخموم *القلب* سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا: ایک ایسا دل جو اس قدر پرہیزگار اور پاک ہو کہ اس میں کوئی جھوٹ اور فریب کی گندگی نہ ہو، نہ غداری اور نہ بغاوت، نہ بے ایمانی اور بے اعتباری، نہ بغض اور حسد [اس طرح دل پاک ہے اور ہر طرح کی برائیوں اور منافیوں اور عیبوں سے پاک ہے]۔

یہی وجہ ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب بھی میرے دل نے خدا کو دیکھا تو تقویٰ کی وجہ سے پردہ اٹھا دیا گیا۔ کیونکہ اگر خدا اور اس کے دل کے درمیان کسی کے لیے پردہ اٹھا دیا جائے تو وہ ظاہری مادی دنیا اور غیب کی آسمانی سلطنت یا حاکمیت کا مشاہدہ کرتا ہے اور وہ جنت کو دیکھتا ہے جس کا ایک حصہ آسمانوں اور زمین کی چوڑائی ہے۔ جہاں تک دوسری جنت کا تعلق ہے تو یہ اب بھی محدود ہے حالانکہ یہ وسعت میں وسیع اور دور رس ہونے کی وجہ سے آسمانوں اور زمین کی وسعت میں فٹ نہیں بیٹھتا۔ لیکن جس جنت کا دل گواہ ہے اس کی لمبائی اور چوڑائی کی کوئی حد نہیں ہے، وہ سلطنت الٰہی کے غیبی دائرے اور فرشتوں کی سلطنت کی جنت ہے۔ بہرحال اس کا جو حصہ دل میں آتا ہے وہ محدود ہے لیکن اگر آپ اسے علم الٰہی کے نقطہ نظر سے دیکھیں تو یہ ایک ایسا دائرہ ہے جو لامحدود اور بے پناہ ہے۔ اگر بادشاہی الٰہی کے دو دائروں (*عالم الملک*) اور فرشتوں کے دائرے (*عالم الملکوت*) کو ایک ساتھ ذکر کیا جائے تو ان کو حضوری خداوند کہا جاتا ہے جو تمام موجود چیزوں کا احاطہ کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدائی ربوبیت ہر چیز کا احاطہ کرتی ہے۔ اللہ کے سوا جو کچھ بھی موجود ہے وہ یا تو اس کے اعمال ہیں یا اس کی سلطنت یا بندے ہیں۔ ان وجودوں سے جو کچھ انسان کے دل میں ظاہر ہوتا ہے وہ بعض لوگوں کے نزدیک

جنت ہے لیکن اہل حق کے نزدیک یہ جنت نہیں بلکہ اس کے مستحق ہونے کا ذریعہ ہے اور جنت میں انسان کی حاکمیت اس کے علم کی حد کے متناسب ہے۔ دوسرے لفظوں میں، خدا کی صفات اور اس کے اعمال کے بارے میں جو کچھ جانتا ہے وہ اس حد تک کسی کے لیے جنت کشادہ ہو گی۔ اطاعت و عبادت کا مقصد یہ ہے کہ دل کی سطح آئینے کی طرح پاک اور پاک ہو جائے اور اس میں کوئی گندگی اور گندگی باقی نہ رہے۔ دل کی تطہیر کا مقصد یہ ہے کہ ایمان کا نور اور معرفہ کی چمک اس میں پھیل جائے۔ مندرجہ ذیل دو آیات میں ایمان کے ایک ہی نور اور معرفت کی روشنی اور معرفہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

فَمَن يُرِدِ ٱللَّهُ أَن يَهۡدِيَهُۥ يَشۡرَحۡ صَدۡرَهُۥ لِلۡإِسۡلَٰمِۖ

"اللہ جس کو ہدایت دینا چاہتا ہے، وہ اپنے دل کو اسلام کی طرف کشادہ کرتا ہے (اصطلاح کے حقیقی معنی میں اس سے مراد خدا کی مرضی کے سامنے سرتسلیم خم ہونا اور روح کی پاکیزگی اور روشنی ہے جو ایمان اور الٰہی گنوسس اس میں لاتا ہے)۔ (سورة البقرة باب 6 آیت 125)

أَفَمَن شَرَحَ ٱللَّهُ صَدۡرَهُۥ لِلۡإِسۡلَٰمِ فَهُوَ عَلَىٰ نُورٖ مِّن رَّبِّهِۦۚ

"جس کا دل اللہ تعالیٰ نے اپنے سامنے سر تسلیم ہونے کی خواہش کے ساتھ کھول دیا ہے اور کشادہ کر دیا ہے، ایسا شخص اپنے پروردگار (یعنی الٰہی) کی طرف سے ایک نور سے منور ہوتا ہے [کیا اس کو اندھے اور دل کے بہرے سے تشبیہ دی جا سکتی ہے؟] (سورة البقرة باب ۳۹، آیت ۲۲)

روشنی اور ایمان کے درجے: اس روشنی اور ایمان کے تین درجات ہیں: پہلی ڈگری عام لوگوں کا ایمان ہے جو خالص اندھا تقلید ہے۔ دوسری ڈگری علمی الہیات دانوں کا عقیدہ ہے جو منطقی استدلال کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ تیسری ڈگری گنوسٹک کا ایمان ہے، جو یقین کی روشنی [اور ایمان کی صداقت] کے ساتھ واضح طور پر دیکھ رہا ہے۔

ایمان کے ان درجات کو واضح کرنے کے لیے [یہاں] ایک مثال پیش کی جا رہی ہے۔ مثال یہ ہے کہ زید کی گھر میں موجودگی کا تعین تین طریقوں سے کیا جا سکتا ہے۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ آپ کو اس کی موجودگی کی خبر ایک امانت دار شخص کے ذریعے سے ملتی ہے جسے جھوٹ اور جھوٹ سے منسوب نہیں کیا گیا ہے۔ آپ ایسے شخص کی طرف سے لائی گئی خبروں سے مطمئن ہو جاتے ہیں اور یہ یقین پیدا کرتے ہیں کہ زید واقعی گھر میں ہے۔ یہ عام لوگوں یا عام لوگوں کے عقیدے کی ایک مثال ہے جو [محض اندھے] پیروی پر مبنی ہے۔ عام آدمیوں کا یہ حال ہے کہ جب کوئی بچہ عقل حاصل کرتا ہے [اور زندگی کو خود سمجھنے کے قابل ہو جاتا ہے] وہ اپنے والدین اور اساتذہ سے خدا کے وجود، علم، قدرت اور اس طرح کی دیگر الہی صفات کے بارے میں بغیر کسی ہچکچاہٹ کے جو کچھ سنتا ہے، اسے قبول کر لیتا ہے۔ اس طرح کے عقائد ان کے ذہنوں میں سرایت کر جاتے ہیں اور ان کے ذہنوں میں [گہرائی] جڑ جاتے ہیں کہ ان کے خلاف کوئی بھی چیز ان کے ذہنوں میں نہیں گزرتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے والدین اور اساتذہ کی صداقت کے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہیں اور ان سے کسی بھی خبر کو قبول کرنے اور ان پر یقین کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔ ایسا ایمان آخرت میں نجات کا سبب ہے لیکن ایسے مومن "دائیں ہاتھ کے لوگ" ("*اشعر الیمین*" یا عام پرہیزگار اور صالح لوگوں کی قبولیت کے حقدار ہیں) کے درجے اور زمرے میں رہتے ہیں اور وہ خدا کے مقربین میں شامل نہیں ہیں [جن کا سب سے بڑا درجہہ روحانی کمال ہے) خدا کے سامنے حاصلات اور مرتبہ] کیونکہ تقرب کے لیے ضروری ہے کہ دل صوفیانہ نقاب کشاف، گہری روحانی

بصیرت اور یقین کی روشنی سے دل کی وسعت سے منور ہو۔ یہ [عمدہ] خصوصیات اندھی پیروی کی بنیاد پر ایمان میں نہیں پائی جاتی ہیں اور اس کے علاوہ افراد سے سننے سے جو کچھ یاد کیا جاتا ہے اس میں غلطیوں کا امکان ہوتا ہے۔

گھر میں زید کی موجودگی کا علم حاصل کرنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ خود اس کی آواز اپنے کانوں سے سنتے ہیں جب وہ گھر میں ہوتا ہے اور آپ گھر کی دیوار کے باہر ہوتے ہیں۔ اس کی آواز سننے سے (گھر میں زید کی موجودگی) کا زیادہ اندازہ ہو جائے گا اس کے مقابلے میں کسی شخص (معتبر اور قابل اعتماد) جو آپ کو اس کے بارے میں بتاتا ہے کیونکہ آواز ظاہری شکل اور شکل کے لیے دلیل دیتی ہے اور دل کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آواز کسی خاص شخص کی ہے۔ اگرچہ یہ ایمان محبت اور دلیل سے ملا ہوا ہے لیکن گمراہی کا امکان اب بھی موجود ہے کیونکہ بعض اوقات آوازیں ایک دوسرے سے مشابہت رکھتی ہیں اور بعض اوقات ایک شخص دکھاوے سے دوسرے شخص کی آواز کی نقل کر سکتا ہے اور سننے والا دونوں آوازوں میں فرق کرنے کے قابل نہیں ہوتا اور دھوکہ کھا سکتا ہے۔ کیونکہ کسی نے ایسی کسی چیز کے بارے میں نہیں سوچا تھا [کہ کوئی ایسا کام کرے گا اور اس طرح کی تقلید کا مقصد]۔

تیسرا طریقہ (مثال کے طور پر، گھر میں زید کی موجودگی کا یقین پیدا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ گھر کے اندر جائیں اور زید کو خود دیکھیں۔ یہ حقیقی عرفہ (*معارفہ*) یا حقیقی تجرباتی علم اور تصدیق کے ساتھ مشاہدہ ہے۔ یہ معرفت یا تجرباتی علم خدا کے مقربین اور اولیاء یا صدقین سے مشابہت رکھتا ہے کیونکہ وہ ذاتی مشاہدے کے بعد ایمان رکھتے ہیں۔ اس طرح ان کا ایمان عام آدمی اور علماء کے ایمان پر مشتمل ہے لیکن مشاہدے میں اضافے کی وجہ سے ایمان اس حد تک مضبوط ہو جاتا ہے کہ غلطی کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ تاہم *تمام دوستوں خدا* (مقاربین) *اور اولیاء کرام یا اہل حق* (صدقین) *کا روحانی تجرباتی علم* ایک ہی سطح پر نہیں ہے بلکہ درجات میں اختلافات ہیں [ان کی قربت، قربت، روحانی انکشاف اور خدا کے ساتھ یقین میں]۔ درجات اور درجات میں ان اختلافات کی وضاحت ایک بار پھر زید کی مثال سے لی جا سکتی ہے۔ ایک شخص دن کی روشنی میں گھر کے صحن میں زید کو اچھی طرح دیکھتا ہے۔ دوسرا شخص اسے کسی کمرے کے اندر یا دور سے یا شام کے وقت جب دن کی روشنی کم ہو جاتی ہے تو اسے دیکھتا ہے۔ پہلے شخص کا مشاہدہ دوسرے شخص سے زیادہ کامل ہوتا ہے حالانکہ دوسرے شخص کا ادراک اب بھی درست ہے لیکن اس کے چہرے کی باریک بینی اور پوشیدہ خصوصیات کا مشاہدہ نہیں کرتا۔ الہامی ظاہر کردہ سچائیوں اور [روحانی] علم کو دیکھنے کے درجات میں فرق اسی قسم کا ہے۔ علم کے حصول میں فرق اس طرح ہے جیسے کوئی زید، عمرو اور بکر کو دیکھتا ہے اور دوسرا صرف زید کو دیکھتا ہے۔ اول الذکر کا علم یقینا مؤخر الذکر سے زیادہ ہے [کیونکہ اول الذکر کو معلوم چیزوں کی کثرت ہے اور روحانی تجرباتی علم کے سلسلے میں دلوں کی حالت ایسی ہی ہے]۔

علم (علم) *اور روحانی الہام* (الہام) *کے درمیان فرق* - علمی الہیات اور روحانی راہ کے مسافروں کے درمیان فرق کی حقیقت:

دل میں غیر روایتی علم کی آمد مختلف طریقوں سے ہوتی ہے۔ کبھی یہ علم دل میں اس طرح جمع ہو جاتا ہے جیسے اسے غیر محسوس طور پر اس میں ڈال دیا گیا ہو اور کبھی وہ دلائل اور سیکھنے کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے۔

اول الذکر علم کو "روحانی بیداری یا الہام" (*الہام*) اور مؤخر الذکر کو "حاصل شدہ علم" کہا جاتا ہے۔ اول علم کی دو قسمیں ہیں: پہلی یہ کہ وصول کنندہ اس علم کے منبع کو نہیں جانتا اور اسے روحانی بیداری یا الہام یا "قلب کی نعمت" کہا جاتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جس ذریعہ سے یہ علم پہنچایا جاتا ہے وہ معلوم ہوتا ہے، دوسرے لفظوں میں اس علم کو دل میں ڈالنے والا فرشتہ نظر آتا ہے اور اسے "وحی الہا" کہا جاتا ہے۔ پہلا اولیاء اور گنوسٹکس سے وابستہ ہے اور دوسرا انبیاء علیہم السلام سے وابستہ ہے اور علم و دلائل سے حاصل کردہ علم علماء کے لیے مخصوص ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کا دل اس صلاحیت کا حامل ہے کہ اس میں چیزوں کی حقیقتیں واضح ہوں۔ اگر دل اس صلاحیت سے محروم ہوجاتے ہیں تو ، یہ وہی پانچ وجوہات ہیں جن کا پہلے ذکر کیا گیا ہے۔ یہ اسباب دل کے آئینے اور "محفوظ لوحہ" کے درمیان پردہ بن جاتے ہیں جس میں وہ تمام معاملات درج ہیں جن کا ازل سے فیصلہ کیا گیا ہے۔ محفوظ لوح کے آئینے سے دل کے آئینے میں سچائی کا ظہور ایک آئینے کی تصویر کی طرح ہے جو دوسرے آئینے میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس طرح کی رکاوٹوں کی وجہ سے دلوں کو ان حقیقتوں سے محروم کرنا دو آئینوں کے درمیان پردہ کی طرح آ جاتا ہے۔ جس طرح ہاتھ کی طرح پردہ ہٹایا جا سکتا ہے، اسی طرح محفوظ لوح *محفوض* اور دل کے آئینے کے درمیان کا پردہ رحمت کی الہی ہوا سے ہٹا دیا جاتا ہے اور اس میں وہ حقیقتیں ظاہر ہونے لگتی ہیں جو محفوظ *لوح محفود میں ہیں*۔

یہ کبھی کبھی خوابوں میں ہوتا ہے اور مستقبل کے واقعات کسی سے پہلے آتے ہیں۔ پردے کو مکمل طور پر ہٹانا موت کے وقت ہوتا ہے۔ موت ایک ایسی حقیقت ہے کہ اس کے ساتھ تمام پوشیدہ باتیں واضح ہو جاتی ہیں اور حقیقتوں کو سمجھنے میں تمام رکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں، علم کی پیچیدگیوں کی روشنی غیب دائرے سے ظاہر ہوتی ہے۔ کبھی کچھ لمحوں کے لئے بجلی کے بولٹ کی طرح اور کبھی مسلسل اور مستقل طور پر لیکن ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ علم اور روحانی بیداری یا الہام (*الہام*) میں علم اور مقام کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے جہاں علم (یعنی دل) رہتا ہے۔ اگر کوئی فرق ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ روحانی بیداری یا الہام (الہام) میں پردہ اٹھایا جاتا ہے اور علم میں علم کے حصول کے ذرائع کو استعمال کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور پردہ اٹھانا کسی کے اختیار میں نہیں ہے۔ اسی طرح وحی الٰہی اور روحانی بیداری یا الہام (*الہام*) میں فرق صرف یہ ہے کہ الہام دینے والا مؤخر الذکر میں نظر نہیں آتا اور وحی الٰہی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ الہامی وحی کے ذریعے علم حاصل کیا جائے یا روحانی بیداری یا الہام (*الہام*) *کے ذریعے حاصل کیا* جائے، ہر صورت میں فرشتوں کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُكَلِّمَهُ ٱللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِن وَرَآيِٕ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِۦ مَا يَشَآءُ

"کسی بھی انسان کو ایسا مقام حاصل نہیں ہے کہ خدا کسی سے براہ راست بات کرے لیکن تین طریقوں سے، یا تو روحانی بیداری یا الہام (*الہام*) کے ذریعے یا پردے کے پیچھے سے یا کسی فرشتے کو بھیج کر جو اپنی مرضی یا مرضی کے مطابق پیغام پہنچائے گا۔ (سورة البقرة باب ۴۲، آیت ۵۱)

یہاں یہ وضاحت کرنا ضروری ہے کہ *صوفیاء* (نفس کی اصلاح کے لیے روحانی راہ پر گامزن اور جہاد کرنے والے) روحانی بیداری یا الہام (الہام) سے وابستہ علموں کی طرف مائل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ روایتی تعلیم میں وقت نہیں لگاتے اور نہ ہی مصنفین کی کتابیں پڑھتے ہیں اور نہ ہی اقوال اور ثبوتوں سے بحث کرتے ہیں بلکہ وہ کہتے ہیں کہ روحانی طور پر جدوجہد کرنی چاہیے اور اس طرح تمام منفی اور گھناؤنی (منفی، پست اور قابل مذمت) باطنی خصوصیات کو مٹا دینا چاہیے۔ اس طرح کی تمام رکاوٹوں کو ختم کرنے کے بعد اپنی پوری توجہ خدا کی طرف

مرکوز کرنی چاہیے۔ جب یہ حاصل ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ خود دل کا محافظ اور علم کی روشنی فراہم کرنے والا بن جاتا ہے۔ رحمت الٰہی کا سایہ ایک پر ہوگا، نور دل کو روشن کرے گا اور دل کی وسعت حاصل ہو جائے گی اور دل کے آئینے پر پردہ ختم ہو جائے گا اور اس پر الٰہی امور کی حقیقتوں کی تصاویر پڑ جائیں گی۔ ایک بندے پر صرف یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ دل کو (تمام باطنی برائیوں اور منفی خیالات اور مکروہ رجحانات سے) پاک کرے تاکہ حق کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو۔ پختہ عزم اور سچائی کی تلاش کسی کی ہمت کو جمع رکھے گی، خدائی رحمت کے ذریعے تکمیل کا انتظار کرے گی۔ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام کے سامنے جو باتیں بے نقاب ہوتی ہیں اور اس کے نتیجے میں ان کو باطنی روشنی ملتی ہے، وہ ان کی تعلیم، سیکھنے اور کتابوں کے مطالعہ میں مشغول ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کی دنیا سے لاتعلقی ہے، وہ برے خیالات کے ماخذ کو دور کر دیتے ہیں، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ *زہد* کو اختیار کرتے ہیں (دنیاداری سے لاتعلقی) اور پورے عزم، جرات اور ارادے کے ساتھ، اپنی توجہ صرف خدا پر مرکوز کرتے ہیں۔ جو بھی خدا کی شخصیت بنتا ہے، خدا اس کا بنتا ہے۔

صوفیاء میں *ایک کہاوت ہے* کہ خدا کی شخصیت بننے کے لیے انسان کو دنیاوی رکاوٹوں سے مکمل طور پر الگ ہونا چاہیے پھر دل کو خالی کرنا چاہیے تاکہ وہ روحانی جدوجہد کے لیے دستیاب ہو اور اپنی توجہ رشتہ داروں، اولادوں، جائیدادوں، ملک، علم، شہرت اور طاقت سے ہٹا کر دل میں ایسی کیفیت پیدا کرے تاکہ کسی چیز کی موجودگی یا عدم موجودگی برابر ہو جائے۔ اپنے آپ کو الگ تھلگ رکھیں، صرف ضروری اور ضروری چیزوں اور عبادات پر بھروسہ کریں، خدا کے سوا ہر چیز کے دل کو اس حد تک خالی کر دیں کہ قرآن مجید اور حدیث کی کتابوں پر غور و فکر کرنے سے بھی دل کی توجہ میں خلل نہیں پڑتا۔ بلکہ کوشش کرنی چاہیے کہ خدا کے سوا کسی کے دل میں کوئی اور نہ آئے۔ جب کسی کی زبان پر صرف ایک ہی جملہ *"اللہ اللہ" رہتا ہے* (*"اللہ"* زبان سے قطع نظر خدا کا واحد ذاتی نام ہے، جبکہ "خدا" انگریزی زبان کی مخصوص عمومی اصطلاح ہے جس کا اشارہ اس ہستی کی طرف اشارہ کرنا ہے جو ہر چیز کا خالق، برقرار رکھنے والا اور فراہم کرنے والا ہے کیونکہ ہر زبان کی "خدا" کی اپنی عمومی اصطلاح ہوتی ہے) نجی اور عوامی دونوں میں۔ جب کہ یہ قول دل کی مکمل موجودگی اور اس کثرت سے کہی جاتی ہے کہ اگر زبان حرکت نہ بھی کرتی ہے تو دل اس کی تلاوت کرتے ہوئے نظر آتا ہے، تب ہی ایک ایسی حالت پہنچ جاتی ہے جہاں اس قول کا اثر زبان سے مٹا دیا جاتا ہے اور دل اس کی یاد میں اس حد تک قائم ہو جاتا ہے۔ کہ دل سے بھی حروف اور الفاظ کی شکل غائب ہو جاتی ہے اور معنی ہر وقت مستقل طور پر وہیں رہتے ہیں، گویا دل اور معنی ایک دوسرے کے لیے باہمی طور پر ضروری ہو جاتے ہیں۔ ایک غلام [خدا کا، یعنی ایک انسان] کو [روحانی تبدیلی] کی اس سطح تک پہنچنے کی صلاحیت اور استحقاق حاصل ہے۔ کسی میں یہ صلاحیت بھی موجود ہے کہ اس [اندرونی روحانی] حالت کو مستقل بنانے کے لیے، کوئی بھی خدا کے علاوہ دوسری چیزوں کے خیالات اور اشارے کو دور کر سکتا ہے۔ تاہم، کسی کو خدائی فضل اور رحمت کی کھینچنے اور جذب کرنے پر کنٹرول نہیں ہے، لیکن اس میں الہی فضل کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ [روحانی حصول] کی اس درجے تک پہنچنے کے بعد، ایک غلام کو فضل الٰہی کے کھلنے کا انتظار کرنا چاہیے، تاکہ جس طرح یہ کھلیں انبیاء اور اولیاء کو عطا کی گئی تھیں، اسی طرح وہ ایک کو بھی عطا کیے جائیں گے۔ اس صورت میں اگر کسی کے پاس سچا ارادہ ہو، درست عزم ہو، استقامت کی خوبصورتی ہو، خواہشات اور خواہشات سے پرہیز ہو اور اس کے دل سے دنیاوی وابستگیوں اور پریشانیوں سے کچھ نہ گزرے تو دل میں حق کا نور چمکنا شروع ہو جائے گا، پہلے چند لمحوں کے لیے بجلی کی طرح پھر اسی طرح۔ بعض اوقات تاخیر ہوگی لیکن ان کی وجہ سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آہستہ آہستہ اور آہستہ آہستہ یہ [اندرونی روحانی] روشنیاں دل میں رہنے لگیں گی۔ بعض اوقات وہ جو وقت ٹھہرتے ہیں وہ اتنا کم ہوتا ہے کہ کسی کو ان کی پیاس محسوس ہوتی ہے۔ کبھی کبھی وہ زیادہ دیر تک رہیں گے۔ بعض اوقات [روحانی روشنی کی] یکے بعد دیگرے دل پر چمکتے ہیں۔ اس سلسلے میں گنوسٹکس کے درجات اور درجات اتنے مختلف ہیں کہ ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، بالکل اسی طرح جیسے تخلیقات اور ان کی کردار کی خصوصیات (اخلاق) کے درمیان فرق کا تصور کرنا مشکل ہے۔

اس بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ دل کو زندہ کرنا اور اس کو پاک کرنا بندے کی ذمہ داری ہے (یعنی ہر فرد کو)۔ اس کی صلاحیت میں اضافہ اور اس پر صبر سے کام کرنا بھی انفرادی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ علماء ظہیر بھی اس کی تردید نہیں کرتے کیونکہ زیادہ تر انبیاء، اولیاء اور گنوسٹک ایک جیسی روحانی حالتوں کے مالک ہیں۔ لیکن وہ اس راستے اور طریقہ کار کو مشکل سمجھتے ہیں۔ ان کی رائے میں ، اس راستے پر چلنے والے نتائج اور پھلوں کا طویل انتظار ہے۔ اس راستے میں طے شدہ شرائط پر عمل کرنا آسان نہیں ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ تمام دنیاوی ذمہ داریوں، وابستگیوں اور مسائل سے غافل رہنا مشکل ہے۔ یہاں تک کہ اگر یہ روحانی سختی اور نظم و ضبط کے ذریعے ہوتا ہے تو ، یہ زیادہ دیر تک نہیں چل سکتا کیونکہ دل میں چھوٹی چھوٹی شکوک و شبہات اور [شیطانی] قائل کرنے سے اس کا سکون اور سکون ختم ہوجاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

قلب المؤمن اشد قدرا فی غلیاتها

"مومن کا دل برتن کے ابلنے سے بھی زیادہ ابلتا ہے (یعنی دل مسلسل بہاؤ کی حالت میں رہتا ہے اور بدلنے کا ذمہ دار ہے)۔ (یہ روایت نبوی کے مجموعے سے نقل کی گئی ہے*مسند احمد* اور حکیم رضی اللہ عنہ سے صحابی نبوی مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا:

قلب المؤمن بین اصبعین من اصابع الرحمٰن

"مومن کا دل رحمان کی انگلیوں کے درمیان دو انگلیوں کے درمیان رہتا ہے (یعنی اللہ ہر وقت دل کی حالت پر قابو رکھتا ہے اور جب چاہے اسے بدل سکتا ہے)۔ (اس حدیث کو صحابہ کرام عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے)۔

اس روحانی کشمکش کے دوران مزاج ناگوار ہو جاتا ہے، ذہانت کم ہو جاتی ہے، صحت خراب ہو جاتی ہے اور مختلف قسم کی جسمانی بیماریاں جنم لے جاتی ہیں۔ اگر نفس کی تزکیہ کے لیے روحانی تدبیروں سے پہلے علم نہ مانگا تو دل بے شمار قسم کے برے اور منفی خیالات سے بھر جاتا ہے اور نفس پوری زندگی ان میں الجھ جاتا ہے جو بغیر کسی کامیابی کے گزر جاتا ہے۔ بہت سے *صوفیاء* (روحانی راہ میں جدوجہد کرنے والے) نے یہ راستہ اختیار کیا ہے اور بعد میں کسی بھی ایک (برائی، منفی یا تخریبی) فکر میں الجھے ہوئے ہیں جو بیس سال گزر جانے کے بعد بھی [روحانی راہ میں] ایک قدم بھی آگے بڑھے بغیر گزر جاتے ہیں۔ اس موقع پر انہیں احساس ہوتا کہ اگر انہوں نے علم حاصل کیا ہوتا تو بیس سال ضائع نہ ہوتے اور اس فکر کے نتائج [روحانی ترقی کی اس مایوس کن کیفیت کے ذمہ دار] پہلے ہی دن علم کی وجہ سے ظاہر ہوجاتے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علم کے راستے سے روحانی جدوجہد کی وادی میں قدم رکھنا نہ صرف قابل اعتماد ہے بلکہ اس کے مقاصد کے قریب بھی ہے۔ ظاہری علم کے علماء کا خیال ہے کہ *صوفیاء* کی تشبیہ ان لوگوں کی مانند ہے جو *فقہ* نہیں سیکھتے اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ظاہری علم کو *فقیہ* نہیں بنایا (عالم اور ظاہری دینی علوم پر عمل کرنے والے) وحی و الہام کے ذریعے وہ (یعنی *صوفیاء*) بھی روحانی مشقوں میں استقامت اور استقامت کے ذریعے اور اسی ماخذ [وحی و الہام کے ذریعے] ایسے ہی بن جائیں گے اور وہ وہی ظاہری علم بھی حاصل کریں گے (*فقہ*)۔ ایک شخص اسی طرح کے مضحکہ خیز اور گھناؤنے خیالات میں الجھا ہوا ہے اور اپنی ذات پر ظلم کر رہا ہے اور اپنی زندگی کے قیمتی لمحات

ضائع کرنے میں مصروف ہے۔ ایسا صوفی (یعنی کوئی شخص جو حقیقی *صوفی* نہیں بلکہ صرف ایک خود فریب میں مبتلا شخص ہے جو جھوٹا سمجھتا ہے کہ وہ روحانی راہ پر جہاد کر رہا ہے) اس شخص کی مانند ہے جو نہ تو زمین پر کاشت کرتا ہے اور نہ ہی کسی قسم کے کام کو چھوتا ہے اور پھر بھی یہ امید رکھتا ہے کہ اسے خزانہ مل جائے گا۔ اس طرح کا نتیجہ صرف ممکنہ ہے لیکن ضروری نہیں ہے کیونکہ کامیابی کے امکانات ہیں بہت کم۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک *صوفی* (روحانی راہ پر چلنے کا خواہشمند) پہلے علم حاصل کرے اور علماء کے اقوال کے حقیقی مفہوم کو سمجھے، پھر وہ اس [باطنی] علم کا انتظار کرنے کا حق بجانب ہے جس سے دین کی ظاہری تعلیمات کے علماء (علمی الہیات) عاری ہیں۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ اس طرح کا علم [مستقل اور مستقل] روحانی کوششوں اور تذبذب کے بعد [ظاہری عبادات اور اطاعت الٰہی کے علم کو حاصل کرنے اور اس پر خلوص نیت سے عمل کرنے کے بعد] ظاہر ہوتا ہے۔

واقف مثالوں کے ساتھ وحی اور حاصل شدہ علم کے درمیان فرق کی وضاحت

دل کے عجائبات اور اسرار کا ادراک [انسانی] حواس کے دائرے سے باہر ہے۔ یہاں تک کہ دل بھی حواس کے ذریعے سمجھنے کی چیز نہیں ہے۔ مزید برآں، کسی چیز کو حواس کے ذریعے نہیں سمجھا جا سکتا جو اندرونی طور پر کمزور عقل کے ذریعے سمجھا نہیں جا سکتا، کیونکہ عقل اس وقت تک ایسا کرنے کے قابل نہیں ہے جب تک کہ حواس کے دائرے سے کوئی مثال پیش نہ کی جائے۔ عام لوگوں کو سمجھانے کے لیے یہاں حواس کے دائرے سے مثالیں فراہم کی جا رہی ہیں۔

پہلی مثال: فرض کریں کہ کسی زمین میں پانی کا ذخیرہ کھودا گیا ہے۔ اس میں پانی ڈالنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ اس کے چاروں طرف پانی کی نہریں بنائیں اور ان چینلوں کو [پانی کے ذرائع سے] پانی کے دروازے کھول دیں تاکہ آبی ذخائر میں پانی جمع ہو جائے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آبی ذخائر کے اتھلے حصے کو اتنا گہرائی میں کھودنا ہے کہ پانی خود اس سے نکل جائے۔ دوسرے طریقہ سے حاصل کیا گیا پانی خالص ، دیرپا اور وافر اور وافر مقدار میں ہوسکتا ہے۔ اس مثال کی روشنی میں دل کو پانی کے ذخیرے، علم کو پانی اور پانچ حواس کو پانی کے راستے کے طور پر سمجھا جائے۔ دل کی علم تک رسائی پانچ حواس کے ذریعے ہو سکتی ہے تاکہ جو بھی مشاہدات ہوں وہ دل میں آجائیں جو علم سے معمور ہو جائے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ان آبی نہروں کو خلوت کے ذریعے بند کر دیا جائے تاکہ پانچوں حواس علم کے حصول کے لیے استعمال نہ ہوں اور دل کے پانی کے ذخائر کو اس حد تک گہرائی میں کھودا جائے کہ اندر سے علم کے چشمے نکلنے لگیں۔ یہ تب ہی ہو سکتا ہے جب دل کو باریک بینی سے پاک اور پاک کیا جائے اور اس سے پردے اٹھا کر [روحانی حقیقتوں سے پردہ اٹھا دیا جائے]۔

اس سوال کے بارے میں کہ "علم دل سے کیسے نکلے گا جب وہ اس میں موجود ہی نہیں ہے؟" اس کا جواب دل کے عجائبات اور اسرار سے تعلق رکھتا ہے۔ ظاہری علم کے نقطہ نظر سے اس سوال کے جواب میں صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ چیزوں کی حقیقتیں [مرئی دائرے سے] محفوظ لوح *مہفود* پر پیوست ہیں، بلکہ فرشتوں کے دلوں پر جو [حقیقت الٰہی] کے قریب ہیں۔ جس طرح گھر بنانے سے پہلے ایک انجینئر اس کا بلیو پرنٹ اور تفصیلی ڈیزائن تیار کرتا ہے اور اسی کے مطابق گھر بناتا ہے، اسی طرح آسمانوں اور زمین کے خالق نے بھی شروع سے لے کر لامتناہی ابد تک ہر اس چیز کا خاکہ اور تفصیلی ڈیزائن تیار کیا ہے۔ یہ ماسٹر پلان محفوظ تختی (*لوہ مہفود*) میں محفوظ ہے۔ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اسی کے مطابق ہو رہا ہے۔ اس ماسٹر پلان کے لئے کچھ دل کی عکاسی

کرنا دور کی بات نہیں ہے۔ لہٰذا جب کوئی ایسی چیز وجود میں آتی ہے جو بعد میں ختم ہو جاتی ہے، لیکن پھر بھی ادراک اور تخیل کے ذریعے اس کی شکل اور ظاہری شکل کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص مرئی دائرے کو دیکھ کر اپنی آنکھیں بند کر لے گا تو زمین اور آسمان کی شکل اور ظاہری شکل اس کے ادراک اور تخیل میں ہوگی اور ایسا محسوس ہوگا جیسے وہ ان کو دیکھ رہا ہے۔ اگر فرض کریں کہ آسمان اور زمین کا وجود ختم ہو جائے اور صرف وہی شخص باقی رہ جائے جس نے انہیں دیکھا ہے تو کوئی شخص اپنے تخیل اور فکر میں ان کی تصویر سے محروم نہیں رہے گا۔ یہ فکر دل پر اثر انداز ہوتی رہے گی اور چیزوں کی حقیقتیں دل میں ظاہر ہوتی رہیں گی جو [اس سے پہلے کچھ عرصہ] فکر اور ادراک میں موجود تھیں۔ جو کچھ بھی دل میں آتا ہے وہ اس خیالی شکل اور ظہور کے مطابق ہوتا ہے جو اس شے کی حقیقی ظاہری شکل اور ظاہری شکل سے مشابہت رکھتا ہے جو محفوظ لوح *محفود میں موجود نقشے کے مطابق* ہے۔

وجود کی اقسام: اوپر سے معلوم ہوتا ہے کہ وجود کی چار درجے ہیں۔ پہلی [سطح] وجود وہ ہے جو محفوظ لوح میں ہے۔ یہ وجود جسمانی وجود سے افضل ہے۔ وجود کی دوسری سطح حقیقی وجود ہے - وہ جو اس [دنیاوی] زندگی میں ہے۔ وجود کی تیسری سطح خیالی ہے - جو خیالات اور ادراک میں ہے۔ اس سے مراد وہ وجود ہے جس کی ظاہری شکل حقیقی وجود کے بعد فکر اور تخیل میں ظاہر ہوتی ہے۔ وجود کی چوتھی سطح فکری وجود ہے، جو وہ ظہور اور شکل ہے جو خیالی وجود کے بعد دل میں آتی ہے۔ ان چار وجودوں میں سے کچھ روحانی ہیں اور کچھ جسمانی ہیں۔ روحانی وجود کے اندر بھی تغیرات ہیں کیونکہ کچھ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ روحانی ہیں۔ یہ سب معاملات خدا کی حکمت کے عجائبات اور اسرار ہیں۔ دیکھو کہ اللہ تعالیٰ نے آنکھ کو اتنی چھوٹی ہے کہ اس کے چھوٹے جسامت کے باوجود وہ اس میں آسمانوں اور زمین کی وسعت کو جمع کر سکتی ہے۔ یہ ایک قاعدہ ہے کہ جب تک کوئی معاملہ کسی تک نہیں پہنچتا، اس سے کوئی علم نہیں ہوتا۔ لہٰذا اگر اللہ تعالیٰ نے دنیا کی مخلوقات کی مثال، شکل و صورت و صورت پیدا نہ کی ہوتی تو آپ ان سے واقف نہ ہوتے اور نہ ہی ان کا علم رکھتے ۔ یہ آپ کے رب کی قدرت کے کمال اور تمام چیزوں پر مطلق تسلط کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہے جو اس نے ان عجائبات کے بے پناہ خزانے آنکھوں اور دلوں میں عطا کیے ہیں۔ نصیحت حاصل کرنے کے لیے بعض دلوں کو بصیرت سے محروم کر دیا گیا ہے اور بعض آنکھوں کو بصیرت سے اس حد تک بے خبر کر دیا گیا ہے کہ بعض دلوں کو اس قدر غافل ہو گیا ہے کہ وہ اپنی ذات کے عیب و عجائبات کو نہیں جانتے اور نہ ہی ان عجائبات اور اسرار کی خبر حاصل کرتے ہیں جو دل کے پاس ہونا ضروری ہے۔ اور نہ ہی وہ ان کے بارے میں جانتے ہیں اور نہ ہی ان اسرار سے واقف ہیں۔

اب ہم ان افتتاحی کلمات کے بعد یہاں اپنے بنیادی مقصد کی طرف لوٹتے ہیں۔ یہاں جو بات بحث ہوئی وہ یہ ہے کہ دل میں کسی چیز کا وجود حواس کے ذریعے ہو سکتا ہے اور محفوظ لوح کی وجہ سے بھی۔ جس طرح سورج کی شکل کبھی اسے دیکھ کر آنکھوں میں آتی ہے اور کبھی پانی میں اس کا عکس دیکھ کر اور وہ عکس حقیقی سورج سے مشابہت رکھتا ہے، اسی طرح جب دل اور محفوظ لوح کے درمیان پردہ اٹھا دیا جاتا ہے تو اس میں معاملات کی حقیقتیں جھلکنے لگتی ہیں اور ان کا علم دل میں آجاتا ہے۔ اس صورت میں دل کو اب [علم] اخذ کرنے اور حواس سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس طریقہ کار سے علم کی آمد [اور طلوع آفت] زمین سے نکلنے والے پانی کے مترادف ہے جو پانی کے ذخائر کو بھر دیتا ہے۔ بعض اوقات دل ایسے خیالات میں مصروف رہتا ہے جو حواس کے ذریعے حاصل کرتا ہے۔ یہ خیالات محفوظ شدہ لوح کی راہ میں رکاوٹ بن *جاتے* ہیں، اس لیے اگر اس طرح کے خیالات پانی کے ذخائر کو بھر دیں اور اس کے نچلے حصے کو بھر دیں تو وہ اس کی تہہ سے نہیں نکلتی۔

دل کے دو دروازے: دل کے دو دروازے ہیں۔ ایک دروازہ فرشتوں کے دائرے کی طرف کھلتا ہے اور دوسرا دروازہ ان پانچ حواس کی طرف کھلتا ہے جو ظاہری دائرے یا عالم سے خبریں حاصل کرتے ہیں (*عالم الملک و شہادت*، جسے الٰہی قادر مطلق اور قدرت کے ظہور کا دائرہ بھی کہا جاتا ہے)۔ دونوں دائروں کا قریبی رشتہ ہے۔ جہاں تک پانچوں حواس کی طرف دروازہ کھولنے کا تعلق ہے تو یہ بات مشہور ہے کہ فرشتوں کے دائرے کی طرف دروازہ کھولنا ناممکن نہیں ہے۔ خواب کی کیفیت کو دیکھیں اور اس حالت میں کوئی کس طرح عجائبات کا مشاہدہ کرتا ہے۔ کچھ لوگ مستقبل کے واقعات اور ماضی کے واقعات کو خوابوں میں دیکھتے ہیں، اگرچہ حواس خوابوں میں شامل نہیں ہوتے، لیکن یہ دروازہ صرف ان لوگوں کے لیے کھلا ہے جو اپنی یاد الٰہی میں منفرد ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خدا کی یاد میں اس طرح مگن اور مگن ہیں کہ اللہ کے سوا کسی اور چیز یا کسی سے کوئی سروکار باقی نہیں رہتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک نبوت روایت میں فرمایا: "

سبق المفردون' قیل ومن هم المفردون یا رسول اللہ' قال المتنزهون بذكر اللہ تعالیٰ' وضع الذكر عنهم اوزارهم فوردوا القیامة خفافا

واحد ذہن (*مفریدون*) [خدا کی راہ میں سب کے مقابلے میں] فضیلت اور ترقی کر چکے ہیں"۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: یا رسول اللہ! واحد ذہن رکھنے والے لوگ کون ہیں؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ لوگ جو خدا کی سچی اور پاکیزگی کے ذریعے پاک ہوئے۔ اللہ کی یاد نے ان کے گناہوں کا بوجھ ہلکا کر دیا ہے اور قیامت کے دن وہ ہلکے پھلکے ہو کر آئیں گے۔ (یہ روایت اس کی طرف سے بیان کی گئی ہے *احادیث* کے مجموعے *میں صحابی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے* صحیح مسلم *اور* حکیم رضی اللہ عنہ سے

اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرمایا: میں ان کی طرف اپنا منہ پھیرتا ہوں۔ کیا تم جانتے ہو کہ میں اپنا چہرہ کس کی طرف موڑتا ہوں اور میں انہیں کیا دینا چاہتا ہوں؟ ان کو میرا پہلا تحفہ یہ ہے کہ میں اپنا نور ان کے دلوں میں ڈالتا ہوں پھر وہ میرے بارے میں خبریں دینا شروع کر دیتے ہیں جس طرح میں ان کی حالتوں کے بارے میں جانتا ہوں۔ یہ خبر اسی اندرونی دروازے سے داخل ہوتی ہے [الٰہی قادر مطلق اور قدرت کے ظہور کے غیب دائرے کا سامنا کرنے والے دل] جس کا ابھی ذکر کیا گیا تھا۔ ایک طرف انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام کے علم میں فرق یہ ہے کہ علم نبوت اس دروازے سے آتا ہے جو فرشتوں کے سامنے دل میں کھلتا ہے اور علم عقل حواس کے دروازوں سے داخل ہوتا ہے جو مادی دنیا کی طرف کھلتا ہے (*عالم ظاہر*)۔ اس مثال کے ذریعے دونوں دائروں کے درمیان فرق واضح ہو چکا ہے۔ جہاں تک غیب کے عالم کے اسرار اور عجائبات کا تعلق ہے (*عالم الغیب و شہادہ* جسے ظہور الٰہی اور قدرت کا غیب بھی کہا جاتا ہے) وہ اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا اندازہ انسانی تخمینے کے دائرے میں بھی نہیں کیا جا سکتا۔

دوسری مثال: اس مثال کے ذریعے، میں علماء کے علم اور گنوسٹکس (یا خدا کے اولیاء کے نام سے بھی جانا جاتا ہے) کے علم کے درمیان فرق کو واضح طور پر بیان کرنا چاہتا ہوں۔ علماء علم کی ہستی کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسے اپنے دلوں کی طرف کھینچنے کی کوشش کرتے ہیں اور *اولیاء* (خدا کے مقدس، اولیاء یا مقرب) دل کی تطہیر، اصلاح، پالش اور زندہ کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ جیسا کہ ایک روایت ہے ، رومیوں اور چینیوں نے ان کی تعمیر اور فنکارانہ صلاحیتوں کی بھرپور تعریف کی اور ہر گروہ نے بادشاہ کے سامنے دوسرے کو سبقت دینے کا دعویٰ کیا۔ بادشاہ نے دونوں گروہوں کے ماہرین کو اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے کا موقع دینے کا سوچا۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ دونوں کو اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کے اظہار کے لیے عمارت کا ایک حصہ دیا جائے گا۔ ایک حصے میں چینی آرٹ ورک اور دوسرے حصے میں رومیوں کو انجام دیں گے۔ دونوں حصوں کے درمیان ایک پردہ

ہوگا تاکہ ہر گروہ دوسرے کے کام سے بے خبر ہو۔ دونوں کو یہ کام سونپا گیا تھا۔ رومیوں نے بے شمار حیرت انگیز رنگ لائے جبکہ چینی بغیر کسی رنگ کے عمارت کے اپنے حصے میں داخل ہوئے اور ان کے حوالے کیے گئے حصے کو پالش کرنا شروع کردیا۔ جب رومیوں نے اپنا کام مکمل کرنے کا اعلان کیا تو چینی بھی یہ کہتے ہوئے سامنے آئے کہ ان کا کام بھی مکمل ہو گیا ہے۔ بادشاہ [چینیوں کی] اس قسم کے فن پارے پر حیران تھا جس کو کسی رنگ یا پینٹ کی ضرورت نہیں تھی۔ انہوں نے بادشاہ سے درخواست کی کہ وہ عمارت کے دونوں حصوں کے درمیان پردے اٹھانے کا حکم دے۔ جب پردے اٹھائے گئے تو رومن آرٹ ورک میں رنگوں کی چمک چمکنے لگی اور ان کی چمک اور چمک کئی گنا بڑھ گئی کیونکہ چینیوں نے اپنی عمارت کے حصے کی دیواروں کو اتنا پالش کیا کہ دیواریں صاف پالش آئینے کی طرح خوبصورتی سے پالش ہوگئیں [جو رومن آرٹ ورک کی خوبصورتی کی عکاسی کرتی ہے]۔ اولیاء (اولیاء، عرفان اور خدا کے مقربوں) کی یہ حالت ہے کہ انہوں نے [اس تمثیل میں] چینیوں کی طرح دل کی تزکیہ، احیاء اور اصلاح میں اتنی کوشش کی ہے کہ وہ [سچائی کے نور الہامی] سے منور ہو جاتا ہے جبکہ علماء اور دانشمندان روایتی ذرائع تعلیم کے ذریعے علم اور تاثرات حاصل کرنے پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔

علم کے حصول کا ذریعہ جو بھی ہو، اس دل کے لیے کوئی معدوم نہیں ہے جس میں علم کا نور ہو [جیسا کہ اس سے دل امر ہو جاتا ہے]۔ علم موت پر ختم نہیں ہوتا، نہ ہی موت دل کی پاکیزگی پر اثر انداز ہوتی ہے اور نہ ہی اس میں کوئی گندگی داخل ہوتی ہے۔ چنانچہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایمان کا مسکن (یعنی دل) مٹی نہیں کھاتی (یعنی حقیقت پر ایمان رکھنے والے دل کی زندگی موت پر ختم نہیں ہوتی)۔ مومن (مومن) کے لیے علم، اس کو قبول کرنے کی صلاحیت اور صلاحیت اور دل کی پاکیزگی اور بے دریغ ضروری ہے۔ آخرت میں ابدی خوشی اور لامتناہی کامیابی کا تصور بھی اس کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ نیز ، اس ابدی خوشی اور لامتناہی کامیابی کی مختلف ڈگریوں کی ہے۔ جس طرح ہر دولت کے مالک کو دولت مند کہا جاتا ہے، اسی طرح سعدہ کے ہر مالک کو "سعید" *کہا جاتا* ہے۔ لیکن کیا ایک لاکھ *درہم (*سونے کے سکوں کی شکل میں ماضی کی پرانی کرنسی) کا مالک اس شخص کے برابر ہو سکتا ہے جس کے پاس دس لاکھ *درہم* ہوں؟ ابدی خوشی اور لامتناہی کامیابی کے لئے بھی *یہی* ہے [کیونکہ اس عظیم نعمت کے تمام مالکان کے پاس اس کی ایک ہی ڈگری نہیں ہے]۔ کچھ اس کی اعلی درجے پر ہیں، کچھ اس سے کم اور کچھ اس کی نچلی ڈگری پر۔ ابدی خوشی کے یہ درجات *مختلف درجات کی وجہ سے ہیں جن کی وجہ سے عرفہ* اور ایمان (*ایمان*) ہیں۔

ابو سلیمان دارانی (ماضی کے ایک عظیم عرفان) کہتے ہیں: "دل کی تشبیہ ایک گنبد کی مانند ہے جس کے ارد گرد بہت سے بند دروازے ہیں۔ جو دروازہ ان کے درمیان کھلتا ہے ، دل اس کے ذریعے کام کرتا ہے۔ اس سے ہم جانتے ہیں کہ دل کے دروازوں میں سے ایک دروازہ فرشتوں کے دائرے اور اعلیٰ روحانی دائرے کی طرف کھلتا ہے۔ یہ دروازہ ایک زوردار اور پائیدار روحانی جدوجہد، خدا سے خوف اور نچلے نفس کی خواہشات اور عیش و عشرت سے پرہیز کے بغیر نہیں کھلتا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے سرداروں کو ایک خط میں ہدایت کی کہ وہ خدا کے پرہیزگار بندوں کی طرف سے جو کچھ بھی کہا جاتا ہے اسے یاد رکھیں کیونکہ ان پر اعلیٰ [عالمگیر ابدی] سچائیوں سے متعلق معاملات نازل ہوتے ہیں۔ بعض علماء کا کہنا ہے کہ خدا کا ہاتھ عقلمندوں کے منہ پر ہے اور وہ صرف سچ بولتے ہیں۔ ایک گنوسٹک نے کہا کہ وہ یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ خدا ان لوگوں کو کچھ راز ظاہر کرتا ہے جو اس کے سامنے عاجزی اختیار کرتے ہیں۔

شیطان کا دلوں پر غلبہ (*وسوا*) - شیطان کے غلبے کے معنی اور اسباب

دل کو صرف ایک گنبد کی طرح رکھا گیا ہے جس کے بہت سے دروازے ہیں اور ہر دروازے سے اندرونی حالتیں مسلسل آتی جاتی ہیں۔ اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ مثال کے طور پر دل ایک ایسے ہدف کی مانند ہے جسے چاروں طرف سے تیروں سے مسلسل نشانہ بنایا جا رہا ہے یا یہ ایک آئینے کی طرح ہے جس میں مختلف تصاویر ایک کے بعد ایک جھلکتی ہیں اور کوئی لمحہ بیکار نہیں گزرتا ہے یا یہ پانی کے ذخیرے کی طرح ہے جو اپنے ارد گرد بنائے گئے مختلف منسلک پانی کے چینلز سے پانی حاصل کرتا ہے۔ دل پر مختلف اثرات کی مسلسل ظاہری شکل بیرونی اور اندرونی حواس دونوں کے ذریعے ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خیالات ، ہوس ، غصہ اور دیگر [اندرونی] کردار کی خصوصیات انہی اثرات اور حالتوں کے نام ہیں۔ دل میں مسلسل تبدیلیاں ہر وقت ہوتی رہتی ہیں۔ اگر کسی شے کو حواس کے ذریعے سمجھا جائے تو اس کا اثر دل پر نظر آئے گا۔ اسی طرح اگر غذا کی کثرت اور مزاج کی طاقت ہوس کو بھڑکانے سے دل متاثر ہوگا۔ دل کے خیالات بدلتے رہتے ہیں اور وہ ایک خیال سے دوسرے خیال کی طرف بڑھتا رہتا ہے۔ دل کی تبدیلی کا مطلب یہی ہے۔ غور و فکر اور یادوں کے نتیجے میں دل میں پیدا ہونے والے اثرات کو "خطرات" کہا جاتا ہے۔ دل سے ادراک کیے جانے والے علموں کا حوالہ 'غور و فکر' اور 'یادیں' کے ذریعے دیا جا رہا ہے، چاہے وہ نئے ہوں یا پہلے سے معلوم ہوں اور اب ان کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ [سمجھا گیا] خطرات کو اس لیے کہا جاتا ہے کہ جب انسان ان سے غافل ہوتا ہے تو وہ دل پر مسلط ہو جاتے ہیں۔ یہ خطرات ارادوں اور [انسانی] عزائم کو اکساتے ہیں کیونکہ ارادہ، عزم اور عمل کا منصوبہ صرف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب خیال دل کو عبور کر چکا ہو۔ اعمال ان خطرات سے پیدا ہوتے ہیں اور ان سے شروع ہوتے ہیں۔ خطرہ خواہش کو اکساتا ہے، خواہش عزم کو اکساتا ہے، عزم کو اکساتا ہے، ارادے یا عمل کے منصوبے کو اکساتا ہے، اور ارادہ جسمانی اعضاء کو اکساتا ہے [دل میں سوچ یا سمجھی جانے والی خطرے کے مطابق عمل کرنے کے لیے]۔

***خطرات کی دو قسمیں - الہام الہام اور اشارے:* وہ** خطرات جو خواہش کو اکساتے ہیں وہ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ پہلا خطرہ یہ ہے کہ انسان کو کسی ایسے برے کام کی طرف دعوت دیتا ہے جو زندگی کے حتمی انجام اور ابدی زندگی کے لیے نقصان دہ ہو۔ دوسرا خطرہ یہ ہے کہ وہ انسان کو کسی ایسے نیک اور نیک کام کی طرف دعوت دیتا ہے جو آخرت میں نفع اور بھلائی کا ذریعہ ہے۔ اس طرح دو مختلف خطرات (*خواطر*) ہیں اور ان دونوں کے مختلف نام ہیں۔ اچھے خطرے (*خطیر محمودۃ*) کو "الہام" (*الہام*) اور قابل مذمت خطرے (*خطار مدھموما*) کو "اشارہ" (*وسواسا*) کہا جاتا ہے۔ یہ خطرات عارضی یا اتفاقی ہیں اور ان کے لیے ایک خالق (ہستی یا *حدیث*) ضروری ہے۔ چونکہ خطرات مختلف اقسام کے ہوتے ہیں ، لہذا ان کے اختلافات ہمیں بتاتے ہیں کہ ان کی وجوہات اور ذرائع بھی مختلف ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت اور سنت اسباب و معلول کی ترتیب میں مسلسل پھیلتی رہتی ہے۔ جس طرح وجہ ہے ، اثر اسی طرح ہوگا۔ لہٰذا اگر کسی کمرے میں آگ جلائی جائے اور اس کی روشنی سے کمرے کی دیواریں روشن ہو جائیں اور چھت دھوئیں سے سیاہ ہو جائے تو چھت کی تاریکی روشنی سے منسوب نہیں ہوگی۔ اسی طرح دل کی تاریکی اور روشنی کی مختلف وجوہات ہیں۔ خطرے کی وجہ کو فرشتہ کہا جاتا ہے جو نیکی کا دعوت دینے والا ہے اور پہلے خطرے کا سبب شیطان کہلاتا ہے جو برائی کو دعوت دینے والا ہے۔ جس لطافت اور عاجزی سے دل میں نیکی کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اسے "*توفیق*" (نیکی کرنے کی الٰہی صلاحیت) کہا جاتا ہے اور جو شیطانی اشاروں کو قبول کرنے کے قابل بناتا ہے اسے "*خذلان*" (بدقسمتی کی گہرائی اور نیچے کی طرف روحانی راستے میں نچلی سطح پر ڈوبنا) کہا جاتا ہے۔ معانی کا فرق مختلف اصطلاحات کا باعث بنتا ہے۔

فرشتہ اور شیطان: "فرشتہ" سے مراد وہ تخلیق ہے جو خدا نے اچھائی کو پھیلانے کے لئے پیدا کیا ہے ، علم کی روشنی ، سچائی کو ظاہر کرنے ، اچھائی کا وعدہ کرنے ، اور اچھائی اور اعلیٰ کا حکم دینے کے لئے۔ فرشتہ ان مقررہ کاموں کے لیے [خدا کے ہاتھ میں] اسیر ہے۔ شیطان سے مراد وہ مخلوق ہے جو مذکورہ بالا تمام چیزوں میں فرشتے کے بالکل برعکس ہے۔ دوسرے لفظوں میں ، شیطان کو برائی کا وعدہ کرنے ، برے اور برائی کی طرف مدعو کرنے ، اور کسی کو خوفزدہ کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے جو نیکی کی طرف مائل ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ الہام الہام (*الہام*) کے برعکس ہے، شیطان فرشتہ کے برعکس ہے، اور بدقسمتی کی گہرائی اور نیچے کی

طرف روحانی راہ (*خضرلان*) میں نچلی سطح پر ڈوبنا الٰہی کی نیکی کی صلاحیت (*توفیق*) کے *برعکس ہے*۔ مندرجہ ذیل آیت اسی کی طرف اشارہ کرتی ہے:

وَمِن كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ

"اور ہم نے ہر چیز کو دو جوڑے میں پیدا کیا۔" (سورة البقرة باب 51 آیت 49)

اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام مخلوقات جوڑے میں ہیں سوائے رب تعالیٰ کے جو ایک اور بے مثال ہے، اس سے کوئی مقابلہ نہیں کرتا، وہی حق ہے اور تمام جوڑوں کا خالق ہے۔ فرشتہ اور شیطان دونوں دل کو اپنی طرف کھینچنے میں مصروف ہیں۔ چنانچہ ایک روایت کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

فی القلب لمتان' لمة من الملک ایعاد بالخیر و تصدیق بالحق' فمن وجد
ذالک فلیعلم انه من الله سبحانه و لیحمد الله و لمة من العدو وایعاد بالشرو
تکذیب بالحق' و نہی عن الخیر فمن وجد ذالک فلیستعذ بالله من
الشیطان الرجیم (ثم تلا هذه الآیة) اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَیَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ

"دل میں دو قربتیں ہیں: ایک فرشتہ سے قربت جس کا کام نیکی کا وعدہ کرنا اور سچائی کا پتہ لگانا ہے۔ جو کوئی بھی یہ جانتا ہے اسے معلوم ہونا چاہئے کہ یہ خدا کی طرف سے ہے اور اس کے لئے خدا کا شکر ادا کریں۔ دوسری قربت شیطان کی ہے جس کا کام حق کا انکار کرنا اور نیکی سے روکنا ہے۔ جو کوئی بھی یہ جانتا ہے اسے شیطان سے خدا کی پناہ مانگنی چاہیے۔' اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: "اور شیطان تمہیں تنگدستی سے ڈراتا ہے اور تمہیں برے اور بے حیائی کے کاموں کا حکم دیتا ہے"۔ (یہ روایت اس کی طرف سے بیان کی گئی ہے حدیث میں صحابی نبی عبداللہ بن مسعود *رضی اللہ عنہ کے بارے میں ترمذی* اور *نسائی* کا مجموعہ ہے۔

حسن بصری (ایک عظیم عرفان) کہتے ہیں کہ دو خیالات [نیت اور عزم] دل کے گرد گھومتے ہیں۔ ایک خدا کی طرف سے ہے اور ایک دشمن کی طرف سے۔ اللہ تعالیٰ اس پر رحم کرے جو کسی کی سوچ سے رک جائے۔ اگر یہ اللہ کی طرف سے ہے تو اس پر عمل کرنا چاہیے اور اگر یہ دشمن (یعنی شیطان) کی طرف سے ہے تو اس کے خلاف جدوجہد کرنی چاہیے۔ [مندرجہ ذیل ہے] حدیث (نبوت کی روایت) ان [متضاد اور مخالف] افکار کے درمیان کشمکش کی طرف اشارہ کرتی ہے:

قلب المؤمن بین اصبعین من اصابع الرحمٰن

"مومن کا دل رحمان کی انگلیوں کی دو انگلیوں کے درمیان ہوتا ہے۔"

خدا گوشت ، خون اور ہڈیوں سے بنی انگلیوں سے بلند ہے۔ اس کے بجائے یہاں انگلیاں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ جس طرح انسان اپنی انگلیوں کے ذریعے تیزی سے کام کرتا ہے اور چیزوں کو ان کے ساتھ گھومتا ہے اور ان کے ساتھ [اشیاء] کو حرکت دیتا ہے، اسی طرح خدا بھی فرشتہ اور شیطان کو محکوم کرنے کے بعد ان کے احترام کا کام کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ یہ دونوں (فرشتہ اور شیطان) دلوں کو موڑنے اور ان کو پلٹنے کے لئے محکوم ہیں جیسے آپ کی انگلیاں [آپ کی مرضی کے مطابق] چیزوں کو حرکت دینے اور الٹنے کے لئے محکوم ہیں۔ دل، اپنی فطری فطرت میں، فرشتہ اور شیطان دونوں کے اثرات کو یکساں طور پر قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور ایک دوسرے پر ترجیح رکھتا ہے۔ تاہم نچلے نفس کی خواہشات کی پیروی یا ان کی مخالفت ایک فریق (فرشتہ یا شیطان) کو دوسرے پر ترجیح دیتی ہے۔ لہٰذا اگر انسان غصے اور ہوس کے مضمرات پر عمل کرے گا تو شیطان نچلی نفس سے خواہشات کے ذریعے انسان پر غالب آ جائے گا اور دل اس کا گھونسلہ، انکیوبیٹر اور سہارا

ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نچلے نفس کی خواہشات شیطان کی چراگاہیں ہیں۔ اگر کوئی خواہشات کے خلاف بہادری سے جدوجہد کرے اور انہیں اس پر حاوی نہ ہونے دے اور فرشتوں کی خصوصیات کو اپنا لے تو ایسے کا دل فرشتوں کی آرام گاہ اور منزل بن جائے گا۔ وہ دل جو ہوس، غصہ، لالچ، لالچ اور طویل [بے لگام] خواہشات میں آباد ہے، وہ دل ہر حال میں شیطانی اشاروں کا نشانہ بنے گا۔ ایک نبی روایت میں ہے:

ما منکم من احد الا ولہ شیطان؛ قالوا و انت یارسول اللہ؟ قال و انا الا ان اللہ اعاننی علیہ فاسلم فلا یامر الا بخیر

"تم میں سے ہر ایک پر شیطان مقرر کیا گیا ہے۔" صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: اور تم پر بھی؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں مجھ پر بھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے خلاف میری مدد کی اور وہ *مسلمان* ہو گیا ہے۔ وہ مجھ سے اچھائی کے سوا کچھ نہیں کہتا'۔ (یہ روایت اس کی طرف سے بیان کی گئی ہے *صحابہ کرام عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ* سے حدیث کا مجموعہ صحیح مسلم۔

شیطان ہوس کو اپنے کنٹرول اور ہیرا پھیری کے آلے کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ جس شخص نے اپنی ہوس میں خدائی مدد کی ہے تاکہ وہ اس حد تک محکوم ہو جائے کہ وہ مناسب حدود کے سوا دوبارہ ظاہر نہ ہو، تو وہ برائی کا دعوت دینے والا نہیں رہتا اور نہ ہی شیطان اس کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا طریقہ رکھتا ہے۔ شیطان دلوں میں اس وقت طعنا پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے جب ان پر دنیا کی یاد اور نفس کی خواہشات کا غلبہ ہو۔ اگر دل خدا کے ذکر کی طرف رجوع کرے تو شیطان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ وہ (اس شخص سے دور ہو جس میں یاد الٰہی غالب ہے] اور اس میں بہتان پھیلانے کی صلاحیت باقی نہیں رہی۔ اس وقت ایک فرشتہ آتا ہے اور کسی کو نیکی کا حکم دیتا ہے۔ فرشتوں اور شیطانوں کی فوجیں اس طرح ایک شدید کشمکش میں بند ہیں۔ جنگ کی یہ حالت اس وقت تک جاری رہتی ہے جب تک کہ دل مفتوح نہ ہو جائے اور دونوں [فوجوں] میں سے کسی ایک کے تابع نہ ہو جائے۔ اس صورت میں دل فاتح کا ٹھکانہ اور ٹھکانہ بن جاتا ہے۔ اگر [شکست خوردہ] دشمن اس کے پاس سے گزرتا ہے تو وہ حملہ آور کی حیثیت سے کرتا ہے نہ کہ اس کے مالک اور فاتح کے طور پر۔ افسوس کے ساتھ اور پھر بڑے دکھ کے ساتھ یہ بات کہی جائے کہ [انسانیت کے] بیشتر دلوں کو شیطانوں نے ان کی ہیرا پھیلیوں اور سازشوں کی وجہ سے فتح کر لیا ہے۔ یہ مفتوح، غلام اور محکوم دل [انسانوں کی اکثریت سے تعلق رکھتے ہیں] [گھناؤنے اور مذموم] شیطانی اشاروں (*وسواس*) کا مسکن بن چکے ہیں۔ انہوں نے آخرت پر دنیا کو ترجیح دی ہے شیطانی لشکر [دلوں پر] غلبہ حاصل کرنے کی وجہ نچلی نفس کی خواہشات کی پیروی ہے۔ ان کی خدا کی طرف واپسی صرف اس صورت میں ہو سکتی ہے جب شیطانی گرفت اور کنٹرول ہٹا دیا جائے اور دل کو نچلے نفس سے خواہشات سے خالی کر دیا جائے اور اللہ کی یاد سے آباد اور معمور ہو جائے۔ فرشتے یاد الٰہی کے ذریعے دل کی وادی میں اترتے ہیں اور شیطان کے پاس اپنے لشکر اور ساتھیوں کے ساتھ اس سے بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔

جابر بن زبیدات عدوی کہتے ہیں کہ میں نے علاء بن زیاد رحمہ اللہ سے دل میں پیدا ہونے والے شیطانی خیالات کی شکایت کی۔ انہوں نے کہا: "اس کی مثال ایسی ہے جیسے چور گھر میں گھس جاتے ہیں۔ اگر گھر میں کچھ ہے تو چور اسے اپنے ساتھ لے جائیں گے اور اگر کچھ نہیں ہے تو انہیں ناکامی میں [خالی ہاتھ سے] واپس آنا پڑے گا۔ اس مثال کے ذریعے علاء بن زیاد نے بتایا کہ شیطان ادنیٰ نفس کی خواہشات سے خالی دل میں داخل نہیں ہوتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

إِنَّ عِبَادِى لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَٰنٌ

"[خدا نے شیطان سے کہا] تیرے لیے میرے بندوں پر کوئی اختیار نہ ہو گا۔" (سورۃ البقرۃ باب ۱۷، آیت ۶۵)

جو شخص ادنیٰ نفس کی خواہشات کے تابع ہے، وہ خدا کا بندہ نہیں بلکہ خواہشات کا بندہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ایک اور جگہ فرمایا:

أَفَرَءَيْتَ مَنِ ٱتَّخَذَ إِلَٰهَهُۥ هَوَىٰهُ

"کیا تم نے اس شخص کا حال دیکھا ہے جس نے نفس کی خواہشوں سے خدا کو بنایا ہے۔" (سورۃ البقرۃ باب 45، آیت 23)

ہمیں اس آیت میں بڑی وضاحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ جو لوگ اپنی خواہشات کے تابع ہیں وہ ان میں سے خدا کو نکال چکے ہیں (یعنی وہ اپنی خواہشات کی عبادت کرتے ہیں گویا وہ خدا ہیں)۔

شیطان سے بچنے کا راستہ: عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا: یا رسول اللہ! شیطان میرے اور میری دعاؤں کے درمیان آ جاتا ہے (دوسرے لفظوں میں جب میں اپنی نمازوں میں قرآن پڑھتا ہوں تو شیطان میرے دل اور دل کو اللہ کے سوا دوسری چیزوں میں الجھا دیتا ہے)۔ اس نے جواب دیا:

ذالک شیطان یقال له خنزب' فاذا احسسته فتعوذ باللّٰه منه واتفل عن یسارک ثلاثا

"یہ شیطان ہے جسے 'خنزب' کہا جاتا ہے۔ جب تم اسے محسوس کرو تو اس سے خدا کی پناہ مانگو اور اپنے بائیں طرف تین بار تھوک دو۔" (یہ روایت *حدیث* مجموعہ *صحیح مسلم* سے صحابہ کرام عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب آپ نے یہ طریقہ اختیار کیا تو شکایت کا ازالہ کیا گیا۔ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان سے بچانے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے ذکر الٰہی (ذکر)۔ اس یاد سے شیطان کی روح کو تہہ تک ہلا کر رکھ دیا جاتا ہے اور وہ اپنی تمام سازشوں میں ناکام ہو جاتا ہے۔ خدا کی یاد کی وجہ سے شیطان کے فرار ہونے کی ایک فکری وجہ یہ ہے کہ دل شیطانی اشاروں سے صرف اس وقت خالی ہوگا جب کوئی اور چیز اس میں داخل ہوگی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب دل میں کوئی خیال آتا ہے تو جو پہلے سے تھا وہ نہیں رہتا۔ لہٰذا کسی اور چیز کے ساتھ دل پر قبضہ کرنے سے شیطانی اشارے کا خاتمہ ہو جائے گا، تاہم یہ بھی ممکن ہے کہ دل میں ایک نئی سوچ کی شکل میں اشارہ پیدا ہو۔ الٰہی کی یاد ہی وہ واحد چیز ہے جس میں شیطان اس کی موجودگی میں کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ ایک قاعدہ ہے کہ ہر چیز کا علاج اس کے برعکس کیا جاتا ہے۔ شیطانی اشاروں کے برعکس اپنی طاقت اور طاقت کے بہانے سے انکار کر کے خدا اور یاد الٰہی میں پناہ لینا ہے، جیسا کہ ہم شیطان سے حفاظت کے لیے درج ذیل کہتے ہیں:

أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ

"میں شیطان سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی طاقت اور طاقت نہیں جو سب سے بلند و برائی والا ہے۔

صرف وہی لوگ شیطان سے اپنے آپ کو بچانے کی صلاحیت رکھتے ہیں جو خدا سے خوفزدہ ہیں، تعظیم اور خوف رکھتے ہیں اور جن پر خدا کی یاد غالب ہے۔ شیطان اپنی چالوں سے ان پر غالب آنا چاہتا ہے، لیکن وہ خدا کی یاد کی طاقت سے اسے شکست دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّ ٱلَّذِينَ ٱتَّقَوْا۟ إِذَا مَسَّهُمْ طَٰٓئِفٌ مِّنَ ٱلشَّيْطَٰنِ تَذَكَّرُوا۟ فَإِذَا هُم مُّبْصِرُونَ

"جو لوگ خدا سے ڈرتے ہیں، تعظیم کرتے ہیں اور ڈرتے ہیں، جب ان کے پاس شیطان کی طرف سے کوئی نصیحت آتی ہے، فورا الٰہی کی یاد میں مشغول ہو جاتے ہیں اور اس برے واقعے سے چونک جاتے ہیں اور بیدار ہو جاتے ہیں۔ (سورۃ البقرۃ سورۃ البقرۃ آیت 201)

درج ذیل آیت کی وضاحت میں:

مِن شَرِّ ٱلْوَسْوَاسِ ٱلْخَنَّاسِ

"شیطانی طعموں کی شر سے (میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں)۔ (سورۃ البقرۃ باب 114، آیت 4)

مجاہد (صحابہ کرام عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے ایک بڑے شاگرد جو قرآنی تفسیر میں مہارت رکھتے تھے) کہتے ہیں کہ شیطان دل پر اپنا سایہ ڈالتا ہے، جب کوئی دل کا حامل شخص خدا کا نام یاد کرتا ہے ["*اللہ*" جو خدا کا واحد اور واحد ذاتی نام ہے جبکہ "خدا" اس کی طرف اشارہ کرنے کے لئے ایک زبان کی مخصوص عمومی اصطلاح ہے اور ہر انسانی زبان میں "خدا" کے لئے اپنی مماثل عمومی اصطلاح ہوتی ہے۔ پھر وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے اور سکڑتا ہوا بیٹھ جاتا ہے اور جب انسان اس سے غافل اور غافل ہوتا ہے تو وہ دل پر پھیل جاتا ہے خدا کی یاد اور شیطانی اشارے کے درمیان تضاد اتنا بڑا ہے جتنا دن اور تاریکی کے درمیان ہے یا دن اور رات کے درمیان اس طرح ہے کہ جب ایک آتا ہے تو دوسرے کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ مقدس آیت کے بعد اسی تضاد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

ٱسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ ٱلشَّيْطَٰنُ فَأَنسَىٰهُمْ ذِكْرَ ٱللَّهِ ۚ

"شیطان نے ان پر اپنا مکمل غلبہ حاصل کر لیا ہے اور انہیں اللہ کی یاد کو بھول گیا ہے۔" (سورۃ البقرۃ باب ۵۸، آیت ۱۹)

انس بن مالک رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:

ان الشیطان واضع خرطومہ علی قلب ابن آدم فان ھو ذکر اللہ تعالیٰ خنس وان نسی اللہ تعالیٰ التقم قلبہ

"شیطان نے اپنی دم آدمؑ کے بیٹے کے دل پر رکھ دی ہے۔ جب کوئی شخص خدا کو یاد کرتا ہے تو وہ (شیطان) چلا جاتا ہے اور جب کوئی خدا کو بھول جاتا ہے تو وہ (شیطان) اس کا دل نگل جاتا ہے۔ (یہ روایت *محدثین* کے مجموعہ *ابن ابی الدنیا، ابو یعلہ* اور *ابن عدی سے روایت ہے*)۔

ابن وضہ رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ جب انسان چالیس سال کا ہو جاتا ہے اور اپنے گناہوں سے توبہ نہیں کرتا تو شیطان اس کے چہرے پر ہاتھ ہلاتا ہے اور کہتا ہے: میں اس خوبصورت چہرے کو کس طرح پسند کرتا ہوں جس کے پاس نجات نہیں ہوگی۔ جس طرح ہوس اور فتنیں [انسانی] گوشت اور خون کے ساتھ بکھری ہوئی ہیں، اسی طرح شیطان اپنی رگوں میں خون کے ساتھ گردش کر رہا ہے اور ہر طرف سے دل کو گھیر لیا ہے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان الشیطان یجری من بنی آدم مجری الدم فضیقوا مجاریہ بالجوع

"شیطان انسانی جسم میں خون کے ساتھ گردش کرتا ہے۔ اس لیے بھوک سے اس کے راستوں کو تنگ کر دو (یعنی روزہ رکھنے اور کھانے پینے سے متعلق خواہشات میں عدم دلچسپی کے ذریعے)۔

[شیطان] کے حوالوں کو تنگ کرنے کا مشورہ اس لیے دیا گیا تھا کہ بھوک ہوس کا خاتمہ کر دیتی ہے اور شیطان شہوت کے ذریعے جسموں میں داخل ہوتا ہے اور خون میں گردش کرنے لگتا ہے، خاص طور پر دل کے ارد گرد چاروں سمتوں سے (چاروں طرفوں) کیونکہ شہوت کا مرکز صرف دل ہے۔ شیطان کے چاروں سمتوں سے حملہ کرنے کا ثبوت اس آیت میں ملتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے شیطان کی زبان سے روایت کی ہے جس نے کہا:

لَأَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ ٱلْمُسْتَقِيمَ ﴿١٦﴾

ثُمَّ لَآتِيَنَّهُم مِّنۢ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ أَيْمَٰنِهِمْ وَعَن شَمَآئِلِهِمْ

"میں تیری قسم کھاتا ہوں (اے اللہ!) کہ میں ان (آدموں) کے لیے تیری سیدھی راہ پر بیٹھوں گا پھر میں ان کے سامنے سے اور ان کی پشت سے اور ان کے دائیں اور بائیں طرف سے ان پر حملہ کروں گا۔ (سورۃ البقرۃ باب 7، آیت 16-17)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق کہ [شیطانی] اشارے وہ خدشات ہیں جو اس کے قائل کرنے سے دل کو آتے ہیں۔ کوئی بھی ان خدشات سے خالی نہیں ہے جیسا کہ ایک حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ ہر انسان کے لیے ایک شیطان ہے۔ اگر انسانوں کے درمیان اس کے ساتھ کس طرح کا سلوک کرتے ہیں تو وہ صرف اس حد تک ہے کہ بعض لوگ شیطان کی مخالفت کرتے ہیں اور بعض اس کے تابع ہوتے ہیں۔

شیطان کیا ہے؟ یہاں کچھ لوگ شیطان کی فطرت کے بارے میں سوالات اٹھا سکتے ہیں جیسے "کیا اس کا لطیف جسم ہے یا جسم بالکل نہیں؟"، "اگر وہ جسم ہے تو وہ انسانی جسم میں کیسے داخل ہوتا ہے اور رگوں میں گردش کرتا ہے؟" شیطان کی فطرت اور حقیقت کا تعلق بیرونی علم سے نہیں ہے۔ اس طرح کے سوالات اٹھانے والے شخص کی مثال اس شخص کی ہے جس کے جسم میں سانپ گھس جاتا ہے اور اسے باہر نکالنے کی فکر کرنے کے بجائے اس کی شکل، رنگ، لمبائی اور چوڑائی کے بارے میں کہانیوں میں مشغول ہوتا ہے۔ یہ خالص جہالت ہے۔ شیطان تمہارا دشمن ہے اور اس کی دشمنی کھلی کتاب کی طرح کھلی ہوئی ہے آپ کو بہادری سے جدوجہد کرنے اور اس کے خلاف لڑنے میں مصروف رہنا چاہئے۔ وہ آپ کے جسموں، دلوں اور رگوں میں چھپا ہوا ہے۔ آپ کو اسے باہر نکالنے کے بارے میں فکر کرنی چاہئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب (قرآن) میں کئی بار اس کی دشمنی کا ذکر کیا ہے۔ اس نے کہا:

إِنَّ ٱلشَّيْطَٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَٱتَّخِذُوهُ عَدُوًّا ۚ إِنَّمَا يَدْعُواْ حِزْبَهُۥ لِيَكُونُواْ مِنْ أَصْحَٰبِ ٱلسَّعِيرِ

"بیشک شیطان تمہارا دشمن ہے، پس اسے اپنا دشمن سمجھو۔ وہ اپنے گروہ کو [برائی اور برائی کی طرف بلاتا ہے] تاکہ لوگ جہنم کے باشندے بن جائیں [جو اس کا واحد مشن ہے کہ زیادہ سے زیادہ انسانوں کو اپنے ساتھ جہنم میں لے جائے]۔ (سورۃ البقرۃ باب 35 آیت 6)

أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَٰبَنِىٓ ءَادَمَ أَن لَّا تَعْبُدُواْ ٱلشَّيْطَٰنَ ۖ إِنَّهُۥ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ

"اے بنی آدم! (یعنی شروع سے لے کر آخر تک پوری انسانیت) کیا میں نے تمہیں نصیحت نہیں کی تھی کہ شیطان کی عبادت نہ کرو [اس کے احکام، برے اشاروں اور ہر چیز کے بارے میں مذموم، برائی، منفی اور آپ کی انفرادی اور اجتماعی بہبود کے لیے نقصان دہ ہر چیز کے بارے میں]؟ بے شک وہ تمہارا کھلا اور صریح دشمن ہے۔ (سورۃ البقرۃ باب 36، آیت 60)

انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اس دشمن سے بچائے اور یہ نہ پوچھے کہ یہ دشمن کہاں سے آیا ہے، اس کا نسب اور رنگ کیا ہے؟ اگر کسی کو پوچھنے کی ضرورت ہے تو یہ پوچھنا چاہیے کہ یہ دشمن کس طرح حملہ کرتا ہے، اس کے پاس کس قسم کے ہتھیار ہیں، اور وہ اپنے دشمن (پوری انسانیت) کو محکوم کرنے کے لیے کن حکمت عملی پر عمل پیرا ہے؟ اس بات کی وضاحت پہلے کی جا چکی ہے کہ دشمن کے ہتھیار نچلے نفس کی بنیادی خواہشات ہیں اور انہی خواہشات کے ذریعے اس میں پیدا ہونے والی طاقت کے ذریعے وہ جسم کی بادشاہی اور حکومت میں گہرائی

میں داخل ہو جاتا ہے۔ اشاروں اور برے اشاروں کی حکمت عملی کے ذریعے، وہ کمزور ایمان کے لوگوں کو شکست دیتا ہے۔ شیطان کے حملوں کو روکنے کی حکمت عملی کی بھی وضاحت کی گئی ہے اور اس ہتھیار کا ذکر کیا گیا ہے جو شیطان کے حوصلوں اور عزائم کو مایوس کرتا ہے اور اسے میدان جنگ سے فرار ہونے پر مجبور کرتا ہے۔ عام لوگ عام ہیں ، یہاں تک کہ علماء (علمی الہیات) کو بھی اس سے زیادہ جاننے کی اجازت نہیں ہوگی۔ شیطان کی ہستی اور صفات کی حقیقت کو تسلیم کرنا گنوسٹک ("*عارفین*" یا اولیاء اور خدا کے جاننے والے) سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ لوگ باطنی علم (*علم المکاشفہ* یا روحانی نقاب کشائی کے علم) میں مگن ہیں۔

***دل میں* آنے والے خیالات کی اقسام**: وہ تین قسمیں ہیں: پہلا وہ خیالات جو نیکی کی طرف دعوت دینے والے اور دعوت دینے والے ہیں۔ ایسے خیالات کو بغیر کسی ہچکچاہٹ کے *الہام* یا الہام کہا جا سکتا ہے۔ دوسرا، وہ گزرتے ہوئے خیالات جو برائی [یا منفی، افسردہ اور نقصان دہ چیزوں] کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ اس طرح کے خیالات کو بغیر کسی شک و شبہ کے شیطانی اشارے اور قائل (*وسواسا*) کہا جا سکتا ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ وہ لوگ جو الہامی الہامی اور شیطانی اشارے کے درمیان ہیں اور یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ فرشتہ کی طرف سے ہیں یا شیطان کی طرف سے کیونکہ شیطان کے فریب کی ایک شکل برائی کو نیکی کے طور پر پیش کرنا ہے۔ ان دونوں میں فرق کرنا بہت مشکل ہے۔ زیادہ تر لوگ اس دھوکہ دہی کا شکار ہوجاتے ہیں اور اس سے تباہ ہوجاتے ہیں۔ مثال کے طور پر، شیطان نصیحت کے انداز میں ایک عالم (علمی الہیات دان) سے کہتا ہے، "لوگوں کو دیکھو! جہالت انہیں معدوم ہونے کی طرف دھکیل رہی ہے اور غفلت انہیں تباہی کے قریب لے جا رہی ہے۔ وہ جہنم کے کنارے پر پہنچ چکے ہیں اور ان پر غضب الٰہی آنے والا ہے۔ کیا تم اللہ کے ان بندوں پر رحم نہیں کرتے کہ تم اپنی قیمتی نصیحت اور علمی گفتگو کے ذریعے انہیں ہلاکت سے بچا سکتے ہو۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو واضح بصیرت، گہری سمجھ اور دوسروں کے دکھوں کے لیے محسوس کرنے والے دل جیسی [عظیم] صفات سے نوازا ہے۔ آپ کی تقریر دلکش ہے، آپ کا انداز [گفتگو] مقبول ہے، آپ کے الفاظ میں ایمان کی روشنی ہے۔ تم اللہ کی ان نعمتوں پر ناشکری کیوں کر رہے ہو؟ ایسا نہ ہو کہ آپ کو آپ کے ناشکری کی سزا ملے اور آپ اس کی ناراضگی کا شکار ہو جائیں اور ممکن ہے کہ آپ سے علم پھیلانے اور لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دینے کی صلاحیتیں عذاب کے طور پر آپ سے چھین لی جائیں۔ شیطان اس اور اسی طرح کی دیگر نصیحتوں کو مسلسل اتنی بار نصیحت کرتا ہے کہ کسی عالم کا دل ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ جاتا، اور آخر میں وہ خطبہ دینے کے میدان میں قدم رکھتا ہے اور اپنی تنہائی سے نکل کر لوگوں کے اجتماع میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس پوئنٹ پر ، شیطان کسی کو یہ کہہ کر دھوکہ دیتا ہے کہ دلوں پر کوئی اثر اس وقت تک نہیں پڑتا جب تک کہ نصیحت کرنے والا اور لوگوں کو خوش کرنے والا اچھا نظر نہ آتا ، اچھے لباس میں ملبوس نہ ہو اور اچھی طرح سے بولتا ہو۔ انسان اس [شیطانی] دھوکہ دہی میں پڑ جاتا ہے اور آہستہ آہستہ ایک ایسے مقام پر لایا جاتا ہے جہاں سے دکھاو، تکبر، خود راستبازی اور شہرت اور اقتدار کی خواہش پیدا ہوتی ہے اور اس شخص کے علاوہ ہر کوئی کمتر اور کمتر نظر آتا ہے۔ غور کیجئے کہ شیطان نے کس طرح نیکی کی آڑ میں برائی کے اتنے سارے ذرائع پیدا کیے اور بظاہر یہ تمام نصیحتیں عالم کے ساتھ اخلاص پر مبنی تھیں جبکہ وہ خفیہ طور پر کسی کو تباہی کی طرف گھسیٹ رہا تھا۔ یہ غریب عالم یا مبلغ حکمت کے موتی الفاظ میں پھیلا رہا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ کسی کا مقصد اچھا ہے، حالانکہ دل شہرت اور مقبولیت کی جدوجہد میں مصروف ہے۔ انسان یہ سمجھتا ہے کہ اس کی کوشش رنگ لائے گی اور اسے آخرت میں کچھ مرتبہ ملے گا۔

روایات کے مطابق شیطان ایک شخص کی شکل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا اور ان سے کہا کہ "*لا الہ اللہ*" یا "اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں"۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اگرچہ یہ (خدا کی شہادت) سچ ہے تو بھی میں یہ نہیں کہوں گا کہ تم نے مجھ سے یہ کہنے کو کہا ہے۔ یسوع کے انکار کی وجہ یہی ہے کہ شیطان کی طرف سے اچھے کام کرنے کے لیے آمادہ کرنا نقصانات اور پھنسنے سے خالی نہیں ہے اور نیکی کے ذریعے شیطان کے پھنسنے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان کے ذریعے وہ تمام علماء (علماء اور مبلغین)، عبادت گزار، دنیاداری سے پرہیز کرنے والے، روحانی مسافر اور سخی تباہ ہو جاتے ہیں جو ہر حال میں کھلی برائی کو پسند نہیں کرتے اور مزید یہ کہ وہ گناہوں کے ارتکاب پر راضی نہیں ہوتے۔ شیطان کے فریب کی چند مثالیں تکبر اور تکبر کے بارے میں کتاب میں غزالی کی *عظیم تصنیف "احیاء العلوم الدین"* یا "خدا کی راہ کی احیاء" کی تیسری جلد میں پیش کی جائیں گی

اور اگر خدا مجھے زندگی عطا کرتا ہے تو میں اسی موضوع پر ایک کتاب لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں جس کا عنوان *"تلبیس ابلیس ہے"* " (شیطان کے قائل اور پھنسانا)۔ ہر جگہ، ملک اور قوم میں، ہر شخص شیطان کے آمادہ اور پھنسنے کا شکار ہے۔ خاص طور پر شیطان نے لوگوں کو مذہبی عقائد اور مذہبی مکاتب فکر (مذاہب) کے بارے میں پھنسانے میں تمام حدود سے تجاوز کیا ہے۔ اب نیکی اور راستبازی صرف ایک رسم کا معاملہ بن گیا ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے ہر خیال اور ارادے پر غور کرے اور ان کے تمام اچھے اور برے پہلوؤں کا جائزہ لے اور اس بات کا تعین کرے کہ آیا وہ فکر اور نیت شیطانی اشارہ ہے یا الہامی الہام ہے اور جہاں تک ممکن ہو توقف کرے اور اپنی تمام تر غور و فکر اور تشخیص (ذہنی و فکری صلاحیتوں) کو بروئے کار لائے کیونکہ اس کا تعین علم کی وسعت کے بغیر نہیں ہوتا۔ بصیرت اور خوف کی گہرائی، تعظیم اور خدا کا خوف جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

إِنَّ ٱلَّذِينَ ٱتَّقَوْا۟ إِذَا مَسَّهُمْ طَٰٓئِفٌ مِّنَ ٱلشَّيْطَٰنِ تَذَكَّرُوا۟ فَإِذَا هُم مُّبْصِرُونَ

"جب بھی شیطان کی طرف سے کوئی خیال آتا ہے تو [خدا کے صالح بندے] الٰہی کی یاد میں مشغول ہو جاتے ہیں اور اس سے حیران رہ جاتے ہیں جس کے نتیجے میں ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں [کہ ان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے]۔ (سورۃ البقرۃ سورۃ البقرۃ آیت 201)

دوسرے لفظوں میں، ان حالات میں، وہ (صالح) اپنے دلوں کی تلاش کرتے ہیں اور ان کے اندر کی روشنی انہیں جہالت کے اندھیرے سے نکال دیتی ہے۔ *"کشف"* (بیداری کی حالت میں روحانی نقاب کشائی) اور بصیرت (*بصیرت*) کے ساتھ ، تمام پیچیدگیاں اور رازیں کھل جاتی ہیں۔ ایک شخص جو شخص خدا سے خوفزدہ ہو، تقدس اور خوف سے عاری ہو، اپنی خواہشات پر نچلی ذات سے دباؤ ڈال کر شیطان کے فریب کو قبول کر *لیتا ہے اور* لاشعوری طور پر تباہی کی راہ پر گامزن ہونا شروع کر دیتا ہے۔ قرآن مجید ایسے لوگوں کے بارے میں فرماتا ہے:

وَبَدَا لَهُم مِّنَ ٱللَّهِ مَا لَمْ يَكُونُوا۟ يَحْتَسِبُونَ

"وہ خدا کی طرف سے ایک ایسی بات کا سامنا کریں گے جو ان کے تصور سے باہر ہوگی۔" (سورۃ البقرۃ آیت ۳۹، آیت ۴۷)

شیطان کے فریب کا علم حاصل کرنا ہر فرد پر ذاتی طور پر واجب ہے: ظاہری امور کے علم میں اہم بات یہ ہے کہ نفس کے فریب اور شیطان کی چالاکی سے آگاہ کیا جائے۔ یہ ہر فرد پر واجب ہے لیکن لوگ اس فریضے کو پورا کرنے سے غافل اور لاپرواہی رکھتے ہیں اور ایسے علم کے حصول میں مصروف رہتے ہیں جس سے آگے بڑھے گا ان اشاروں اور اشاروں کو اکسائیں (شیطان کی *طرف سے وسوا)* جو شیطان کو [لوگوں پر] اپنی گرفت برقرار رکھنے کا موقع فراہم کریں گے۔ وہ اس کی دشمنی اور اس طرح کے علم کے حصول میں مشغول ہو کر اس سے خود کو بچانے کے طریقوں کو بھول جاتے ہیں۔ اشاروں اور اشاروں کی کثرت سے چھٹکارا پانے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ایسے خیالات کا دروازہ بند کر دیا جائے۔ ایسے خیالات یا سمجھی جانے والی خطرات کے دروازے (یا "*خواطر*" اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ دل پر اس وقت مسلط ہو جاتے ہیں جب انسان کے اندر کی حفاظت ہوتی ہے اور وہ ان سے غفلت کرتا ہے) ظاہری پر پانچ حواس اور باطن پر ہوس اور دنیاوی الجھنیں ہیں۔ ایک چھوٹے سے گھر میں تنہائی کو اپنانا ، پانچ [خارجی] حواس کے راستوں کو بند کردیتا ہے۔ رشتہ داروں اور دولت سے دوری رکھنے سے ہوس اور دنیاداری کی محبت کم ہوتی ہے۔ اس صورت حال میں [جب تمام باطنی اور ظاہری دروازے بند ہو جاتے ہیں]، صرف خیالات کے دروازے کھلے رہتے ہیں، لیکن ان کی حفاظت اللہ کی یاد کی حفاظت سے کی جا سکتی ہے۔ بعض اوقات یہ خیالات کامیابی کے ساتھ محافظ کو دل میں گھسنے کے قابل ہوجاتے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو ، اس "چور" کے خلاف شدید جدوجہد کی ضرورت ہے۔ یہ [شدید اندرونی روحانی] کشمکش کبھی ختم نہیں ہوتی بلکہ اس کے بجائے زندگی کی آخری سانس تک جاری رہتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک زندہ شخص کبھی بھی شیطان سے محفوظ نہیں رہ سکتا جو موقع ملتے ہی گھات لگا کر حملہ کرنے کی حالت میں ہمیشہ [غور سے] دیکھتا رہتا ہے۔ اس دشمن (شیطان) سے ہر وقت ہوشیار رہنا ضروری ہے۔ بعض اوقات کوئی شخص اس دشمن کو محکوم کرنے میں کامیاب ہو

جاتا ہے اور روحانی جدوجہد کے ذریعے اسے دھچکا لگا دیتا ہے، لیکن یہ شکست دائمی نہیں بلکہ عارضی ہوتی ہے۔ جیسے ہی شیطان کو موقع ملتا ہے، وہ دوبارہ حملہ کرتا ہے۔ جب تک خون رگوں میں گردش کر رہا ہے، شیطان کے خلاف جدوجہد جاری رکھنا ضروری ہے۔ دل کے "مقدس شہر" کے دروازے ہمیشہ شیطان کے لیے زندگی بھر کھلے رہتے ہیں اور وہ کبھی بند نہیں ہوتے۔ یہ ہوس ، غصہ ، حسد ، لالچ اور لالچ کے دروازے ہیں جن کی جلد ہی وضاحت کی جائے گی۔ جب شہر کے دروازے کھلے ہوں اور دشمن چوکس ہو تو شہر کا دفاع صرف روحانی جدوجہد اور چوکسی سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ ایک شخص نے حسن بصری رحمہ اللہ سے پوچھا: اے ابو سعید! کیا شیطان سو رہا ہے؟" اس نے جواب دیا: "اگر وہ سو جاتا تو کیا ہمیں چند لمحے سکون اور سکون نہیں ملے گا؟" اگرچہ ایک مومن بندہ شیطان سے بچ نہیں سکتا، لیکن وہ اسے شکست دے سکتا ہے اور شیطان کی طاقت کو کمزور کر کے اس کے خلاف اپنا دفاع کر سکتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان المؤمن ينضى شيطانه كما ينضى احدكم بعيره فى سفره

"ایک مومن بندہ شیطان کو کمزور اور کمزور بناتا ہے جس طرح تم اپنے اونٹوں کے ساتھ سفر میں کرتے ہو۔" (یہ روایت حدیث کے مجموعہ *مسند احمد* سے صحابہ کرام ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مومن کا شیطان کمزور ہوتا ہے۔ قیس بن الحجاج کہتے ہیں کہ میرے شیطان نے مجھ سے کہا کہ جب میں تمہارے پاس داخل ہوا تو میں اونٹ کے برابر تھا اور اب میں پرندے کی مانند ہوں۔ میں نے اس سے اس کی وجہ پوچھی۔ آپ نے فرمایا: تم اللہ کے ذکر سے میرے جسم کو پگھلاتے رہتے ہو۔ بہرحال خدا کے خوف و تکریم اور خوف کے حامل افراد کے لیے شیطان کے دروازے بند کرنا، ان پر ہوشیاری سے نظر رکھنا، دوسرے لفظوں میں بیرونی دروازے بند کرنا اور گناہ اور برائی کی طرف دعوت دینے والے واضح راستوں کو کم کرنا مشکل نہیں ہے۔ لیکن وہ بھی شیطان کے پیچیدہ طریقوں سے دھوکہ کھا جاتے ہیں اور اس سے اپنا دفاع کرنے کے قابل نہیں ہوتے، جیسا کہ علماء اور مبلغین کے بارے میں مذکورہ بالا میں بیان کیا گیا ہے کہ شیطان خفیہ طور پر انہیں دعوت دیتا ہے اور نیکی کے دروازوں سے برائی کی طرف لے جاتا ہے۔

چیلنج کی وسعت یہ ہے کہ شیطان کے دل میں داخل ہونے کے لئے بہت سے دروازے ہیں جبکہ فرشتے کے داخلے کے لئے صرف ایک دروازہ ہے۔ شیطان کے بے شمار دروازوں کی موجودگی میں یہ ماورائی فرشتہ دروازہ مشکوک ہو جاتا ہے۔ ان دروازوں کے سلسلے میں انسان اس مسافر کی مانند ہے جو سیاہ رات میں جنگل میں سفر کرتا ہے، جو کسی خاص مقام پر رک جاتا ہے جہاں بے شمار مشکل اور مشکل راستے نکلتے ہیں جس سے انسان حیران ہو جاتا ہے کہ کون سا راستہ منتخب کرنا ہے جس سے آگے بڑھنے اور منزل تک پہنچنے میں مدد ملے گی۔ بے شمار اور غیر واضح راستوں میں سے صحیح راستے کا انتخاب دو طریقوں سے کیا جا سکتا ہے: پہلا عقل اور بصیرت کے ساتھ؛ دوسرا سورج کی روشنی کے ساتھ۔ اس معاملے میں پرہیزگاری والا دل، تقدس اور خدا سے ڈرو، عقل و بصیرت، علم کتاب اور سنت کا علم سورج کی روشنی کے مترادف ہے۔ جس طرح سورج کی روشنی منزل کی طرف صحیح راستہ تلاش کرنے میں سہولت فراہم کرتی ہے، اسی طرح کتاب اور سنت کے علم کا نور انسان کو منزل کی طرف رہنمائی کرتا ہے، ورنہ شیطان کی راہیں بے شمار ہیں اور ان سے بچنا بہت مشکل ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لکیر کھینچی اور فرمایا: یہ اللہ کا راستہ ہے۔ اس کے بعد آپ نے اس پہلی سطر کے دائیں اور بائیں طرف مختلف لکیریں کھینچیں اور فرمایا: یہ بھی راستے ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک میں ایک شیطان موجود ہے جو لوگوں کو اس راستے پر چلنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے یہ شلوک پڑھا:

وَأَنَّ هَٰذَا صِرَٰطِي مُسْتَقِيمًا فَٱتَّبِعُوهُ ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا۟ ٱلسُّبُلَ

"اور یہ میرا راستہ ہے جو سیدھا اور ثابت قدم ہے۔" لہٰذا اس راستے پر چلیں اور دوسرے راستوں پر مت چلیں۔ (سورۃ البقرۃ آیت 6، آیت 153)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف خطوط کو سیرت مستقیم کے گرد *کھینچی جانے والی راہیں* قرار دیں۔ شیطانی راستوں کی کثرت کے بارے میں اس نبوت کی روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ ان راستوں میں سے ایک ایسا راستہ ہے جس کی طرف شیطان علماء (علمائے دین) ، پرہیزگاروں ، ان لوگوں کو دعوت دیتا ہے جنہوں نے نچلی نفس سے خواہشات پر قابو پایا ہے اور جو گناہوں کی زندگی سے پرہیز کرتے ہیں ، ان کو اس کے ذریعے دھوکہ دیتے ہیں۔ اب ان راستوں میں سے ایک راستہ بیان کیا جائے گا کہ انسان نادانستہ اور غیر محسوس طور پر چلنے لگتا ہے۔ اس واقعہ کا ذکر حدیث حدیث میں آیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی اسرائیل سے ایک راہب کا ذکر کیا ہے جس کے شہر میں شیطان نے ایک لڑکی کا گلا گھونٹ دیا اور پھر اس کے گھر والوں کے دل میں یہ خیال ڈال دیا کہ اس کا علاج اس راہب کے پاس ہے۔ وہ اسے راہب کے پاس لے آئے جس نے [اس صورتحال سے نمٹنے کے لئے] صاف انکار کر دیا لیکن انہوں نے اس وقت تک اصرار کیا جب تک کہ راہب اس کا علاج کرنے پر مجبور نہ ہوجائے۔ اس کے بعد شیطان نے راہب کے دل میں کے خیالات پیدا کرنے لگے اور اسے بے حیائی پر اکسایا یہاں تک کہ اس نے کیا اور وہ حاملہ ہو گئی۔ اس کے بعد شیطان نے بدنامی اور رسوائی کا خوف پیدا کیا اور راہب کے دل میں اس کے قتل کا اشارہ کیا تاکہ [اس کے جرائم] کا راز چھپا سکے اور پھر وہ کسی طرح اس کے خاندان کو اس کی فطری موت کی یقین دہانی کرا سکے۔ بالکل وہی ہے جو اس نے کیا تھا۔ اس کے بعد شیطان نے راہب کے خلاف اپنی حرکتیں جاری رکھی اور لڑکی کے گھر والوں کے دل میں یہ پختہ کر دیا کہ راہب نے اسے ذلت کے خوف سے حاملہ ہونے کے بعد مار ڈالا۔ وہ راہب کے پاس آئے اور اس سے اس کے بارے میں دریافت کیا۔ راہب نے بھی وہی جواب دیا کہ شیطان نے اس کے دل میں یہ دکھا دیا کہ لڑکی بیمار ہے اور وہ اپنی بیماری کی وجہ سے مر گئی ہے لیکن انہوں نے اس پر یقین نہیں کیا اور اسے گرفتار کرنا چاہتے تھے۔ اس کے بعد شیطان نے راہب کو بتایا کہ جو کچھ ہوا وہ اس کی اپنی تدبیر کی وجہ سے تھا کیونکہ وہ ہی تھا جس نے اس کا گلا گھونٹ دیا تھا، وہی تھا جس نے اس کے والدین کو اس (راہب) کے پاس بھیجنے پر راضی کیا تھا، وہی تھا جس نے اسے (راہب) کو کرنے اور اسے قتل کرنے پر اکسایا تھا اور اب وہ وہی ہے جو اس (راہب) کو سجدہ کرکے اس صورتحال سے نکلنے میں مدد دے سکتا ہے۔ راہب نے اس سے پوچھا کہ وہ اس (شیطان) کی اطاعت کیسے کر سکتا ہے۔ شیطان نے اسے بتایا کہ وہ اس کے سامنے دو بار سجدہ کر کے حالات سے نکل سکتا ہے۔ اس کے بعد راہب نے شیطان کے سامنے سجدہ کیا۔ اس کے بعد شیطان یہ کہتے چلا گیا: "میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ میں تمہارے بارے میں کیا جانتا ہوں؟" اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا ہے:

كَمَثَلِ ٱلشَّيْطَٰنِ إِذْ قَالَ لِلْإِنسَٰنِ ٱكْفُرْ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ إِنِّى بَرِىٓءٌ مِّنكَ

"شیطان کی مثال یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے انسان سے کہتا ہے کہ وہ [خدا کو] کافر ہو۔ پھر جب کوئی کافر ہو جاتا ہے تو شیطان کہتا ہے کہ میرا اس شخص (انسان) سے کوئی تعلق نہیں ہے"۔ (سورۃ البقرۃ القرآن آیت نمبر ۵۹، آیت ۱۶)

غور کیجئے کہ کس طرح شیطان نے راہب کو اپنے فریب سے اس کے احکامات کی تعمیل کرکے بڑے گناہ (کبیر) کرنے پر مجبور کیا۔ اگر وہ [شیطان] کے مشورے پر عمل نہ کرتا تو وہ نہ کرتا اور پھر قتل نہ کرتا۔ ظاہری طور پر علاج کا مشورہ اچھا تھا اور کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس میں برائی سرایت کر جائے گی۔ اس کے باوجود شیطان کی حکمت عملی یہ ہے کہ برائی کو نیکی اور نیک کوششوں کے راستے سے تلاش کیا جائے اور ایک بار جب وہ کسی کو برائی کی راہ پر گامزن کرتا ہے تو وہ ایک برائی سے دوسری برائی کی طرف کھینچتا ہے یہاں تک کہ نجات کے تمام راستے بند ہو جاتے ہیں اور انسان مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ ایسا کرنے کی خواہش کیے بغیر برائی کی راہ پر گامزن رہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مندرجہ ذیل قول میں یہی کہا:

من حام حول الحمى يوشك ان يقع فيه

"جو شخص چراگاہوں میں چکر لگاتا ہے وہ اس میں داخل ہونے کا خطرہ ہے [اس لیے ضروری ہے کہ برائی کے قریب جانے سے گریز کیا جائے تاکہ اس میں گرنے کے امکان سے بچا جا سکے]۔ (یہ حدیث مجموعہ *صحیح بخاری* اور *صحیح مسلم* سے صحابی حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

شیطان کا دلوں میں داخل ہونا

دل ایک قلعے کی مانند ہے اور شیطان ایک دشمن کی مانند ہے جو اس پر قبضہ کرنے اور اس پر قبضہ کرنے کے لئے اس میں داخل ہونا چاہتا ہے۔ قلعے کو دشمن سے بچانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے جو داخلی راستوں اور راستوں کی حفاظت کرنا ہے جو قلعے میں داخل ہونا ممکن بناتے ہیں۔ جو شخص ان داخلی راستوں سے بھی واقف نہیں ہے تو وہ ان کی حفاظت کیسے کر سکتا ہے اور دشمن کو ان کے ذریعے داخل ہونے سے کیسے روک سکتا ہے؟ چنانچہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دل کو شیطان سے بچانا واجب ہے، بلکہ ہر عقلمند اور بالغ شخص پر ذاتی طور پر واجب ہے، اور ہر وہ چیز جو ذاتی واجب تک پہنچنے کا ذریعہ ہے وہ بھی واجب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شیطان کو اس کے داخلے کے راستوں کو جاننے کے بغیر [دل میں] داخل ہونے سے نہیں روکا جا سکتا۔ اس لیے ان راستوں کو جاننا بھی ضروری ہے۔ یہ داخلی راستے اور راستے بیرونی حواس کے ذریعے قابل ادراک نہیں ہیں بلکہ یہ افراد کے داخلی کردار کی خصوصیات یا خصوصیات ہیں۔ شیطان ان خصلتوں کو اپنے دلوں میں داخل ہونے کا ذریعہ بناتا ہے۔ یہ صفات تعداد میں بہت زیادہ ہیں اور اس وجہ سے صرف چند داخلی دروازوں کا ذکر اس طرح کیا جائے گا جہاں شیطان کے لشکروں کی بڑی تعداد موجود ہے:

غصہ اور ہوس: عقل دل کے دو بڑے داخلی دروازوں یعنی غصہ اور ہوس سے منتشر ہوتی ہے۔ شیطان کی فوج [دل] پر حملہ کرتی ہے جب عقل کا لشکر کمزور ہو جاتا ہے۔ جب انسان غصے کا شکار ہوتا ہے تو شیطان اس طرح کھیلتا ہے جیسے بچہ گیند سے کھیلتا ہے۔ ایک روایت کے مطابق شیطان نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات کی اور کہا: اے موسیٰ! اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت کا مقام دیا ہے اور آپ کو اس سے بات کرنے کا شرف عطا فرمایا ہے۔ میں بھی خدا کی تخلیق ہوں۔ میں نے گناہ کیا ہے [جب اس نے شیطان کو آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا] اور توبہ کرنا چاہتا ہوں۔ براہ کرم میری طرف سے خدا سے شفاعت کریں کہ وہ میری توبہ قبول کرے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس کے لیے شفاعت کرنے کا وعدہ کیا۔ اس کے بعد موسیٰ کوہ سینا پر گیا اور خدا سے بات کی۔ اس کے بعد جب وہ پہاڑ سے اتر رہا تھا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! امانت واپس کردو!" حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اے اللہ! اور تمہارا بندہ ابلیس اپنے گناہ پر پشیمان ہے اور توبہ کرتا ہے براہ کرم اس کی توبہ قبول کریں"۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا کہ اے موسیٰ! آپ کی درخواست قبول کر لی گئی ہے! ابلیس سے کہہ دو کہ وہ آدم علیہ السلام کی قبر کے سامنے سجدہ کرو اور افسوس کا اظہار کرے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ حکم شیطان کو پہنچا دیا۔ شیطان نے یہ سن کر غصے میں آ گیا اور تکبر کے ساتھ کہا: "میں نے آدم علیہ السلام کو سجدہ نہیں کیا تھا جب وہ زندہ تھا، کیا اب میں اس کے سامنے سجدہ کروں گا جب وہ مر جائے گا؟ لیکن میں تیری طرف سے خدا کی شفاعت کرنے کا شکر ادا کرتا ہوں اور اس احسان کی وجہ سے اب تمہارا مجھ پر حق ہے۔ اس حق کو پورا کرنے کے لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ اگر تم مجھے تین مواقع پر یاد کرو گے تو میں تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکوں گا: پہلی بات یہ کہ غصے کے وقت کیونکہ میری روح تمہاری روح میں ہے اور میری آنکھ تمہاری آنکھ میں ہے۔ میں خون کی طرح جسم کی ہر رگ میں گردش کرتا ہوں، اس لیے غصے کے وقت میری طرف توجہ ضرور رکھیں۔ جب انسان کو غصہ آتا ہے تو میں اپنی ناک میں پھونک دیتا ہوں تو وہ کیا کر رہا ہے اس کا شعور کھو دیتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ جنگ کے وقت کیونکہ جب انسان کسی جنگ کے محاذ پر دشمن سے لڑنا چاہتا ہے تو میں اپنے گھر، بیوی اور بچوں کی یاد دلاتا ہوں تاکہ وہ جنگ میں لڑنے کا خیال ترک کر دے اور اس سے بھاگ جائے۔ تیسری بات یہ ہے کہ کبھی بھی کسی غیر مہرم عورت کے ساتھ تنہا نہ بیٹھیں (جو ممکنہ طور پر اس سے شادی کرنے کے قابل ہو کیونکہ وہ اس کی ماں ، ساس ، دادی ، بیٹی ، پوتی ، بہن ، بھتیجی یا خالہ کے ممنوعہ رشتہ داروں میں سے نہیں ہے)۔ میں مرد اور عورت کے دلوں کے درمیان ایک پیغام رساں بن جاتا ہوں اور ایک دوسرے کے دل میں ایک دوسرے کے بارے میں اشارہ کرتا ہوں۔ میں یہ کام اس وقت تک کرتا رہتا ہوں جب تک کہ وہ دونوں گناہ کی مصیبت *(فتنہ) میں شامل نہ ہو* جائیں۔

لالچ اور حسد: شیطان نے تین مواقع کے ذریعے تین اندرونی خصوصیات کی طرف اشارہ کیا یعنی غصہ، ہوس اور لالچ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جنگ سے فرار دنیاوی اموال اور مال کی لالچ کی وجہ سے ہے، مرحوم آدم علیہ السلام

کو سجدہ نہ کرنا حسد کی وجہ سے ہے جو شیطان کے لیے بھی ایک بڑا داخلہ ہے۔ ایک سنت (گنوسٹک) نے شیطان سے کہا کہ وہ اسے انسانوں پر اپنا تسلط دکھائے۔ انہوں نے کہا: میں انسانوں کو غصے اور ہوس کی حالت میں پھنساتا ہوں اور ان پر مکمل قابو پاتا ہوں۔ شیطان ایک راہب کے سامنے حاضر ہوا جس نے اس سے پوچھا: "بنی آدم کی کون سی خوبیاں تمہارے لیے زیادہ مددگار ہیں؟" اس نے جواب دیا: "غصے کی شدت۔ لہذا، جب انسان غصے کی شدت کی وجہ سے پریشان ہوتا ہے، تو میں مڑتا ہوں اور کسی کو اس طرح لات مارتا ہوں جیسے کوئی بچہ اپنے پاؤں سے گیند کو لات مارتا ہے۔ شیطان کا یہ قول بھی ہے کہ "آدم کی اولاد مجھ پر کیسے قابو پا سکتی ہے کیونکہ جب کوئی خوش ہوتا ہے تو میں اپنے دل میں رہتا ہوں اور جب غصہ آتا ہے تو میں اس کے سر میں اڑ جاتا ہوں"۔ لالچ یا لالچ بھی شیطان کا ایک بڑا داخلی دروازہ ہے کیونکہ یہ انسان کو اندھا اور بہرا بناتا ہے۔ اس کے بعد کوئی نصیحت نہیں سن سکتا اور نہ نیکی کا راستہ دیکھ سکتا۔ ایک نبوی روایت میں ہے:

حبك الشئ يعمي ويصم

"کسی چیز کے ساتھ آپ کی محبت آپ کو اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے۔" (یہ روایت اس کی طرف سے بیان کی گئی ہے حدیث مجموعہ *ابو داؤد* صحابی ابو الدردہ رضی اللہ عنہ کے حکم پر۔

صرف بصیرت کی روشنی سے ہی انسان شیطان کے داخلی دروازوں سے واقف ہو سکتا ہے۔ جب لالچ اور لالچ کا اندھیرا بصیرت کی روشنی کو زیر کر لیتا ہے تو شیطان اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھاتا ہے اور ہر اس چیز کی خواہش اور لالچ کو اپنے دل میں ڈال دیتا ہے جو کسی کے لیے نقصان دہ اور مہلک ہے۔ ایک روایت کے مطابق جب سیلاب آیا تو حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم کے تمام اہل ایمان اور ہر جوڑے کے ساتھ اپنے جہاز پر سوار ہوئے۔ اس نے جہاز میں ایک بوڑھا آدمی بیٹھا دیکھا جو ایک اجنبی تھا۔ اس نے اس سے پوچھا کہ وہ کون ہے؟ آپ نے فرمایا: میں تمہارے ساتھیوں کے دل چھین لینے آیا ہوں۔ ان کے جسم تمہارے ساتھ ہوں گے اور ان کے دل میرے ساتھ ہوں گے۔" حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا: اے خدا کے دشمن! دفعہ ہو جاؤ یہاں سے! یہاں آپ کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔" آپ نے فرمایا: پانچ چیزیں ایسی ہیں جن کے ذریعے سے میں لوگوں کو ہلاک کرتا ہوں۔ میں تمہیں تین بتاؤں گا لیکن تمہیں دو نہیں بتاؤں گا۔" حضرت نوح علیہ السلام پر نازل ہوا کہ اے نوح! آپ کو ان تین چیزوں کی ضرورت نہیں ہے جو وہ آپ کو بتانا چاہتا ہے۔ اس سے معلوم کرو کہ وہ تم سے کیا چھپا رہا ہے۔" حضرت نوح علیہ السلام نے ان دونوں باتوں کے بارے میں پوچھا۔ اس نے جواب دیا: لالچ اور حسد۔ یہ دونوں چیزیں مجھے کبھی دھوکہ نہیں دیں گی اور نہ ہی لوگوں کو تباہ کرنے میں ناکام رہیں گی۔ یہ وہ حسد ہے جس کی وجہ سے مجھے شیطان کا لقب دیا گیا ہے اور یہ لالچ ہے، کیونکہ آدم علیہ السلام جنت میں سب کچھ اس کے لیے حلال کر دیا گیا تھا سوائے ایک درخت کے اور میں نے اس کی خواہش کو اس کے دل میں ڈال دیا جس نے اسے وہاں سے نکال دیا۔

تسبیح: کھانا چاہیے وہ حلال اور پاک ہی کیوں نہ ہو، شیطان کے لیے دل میں ایک بڑا دروازہ ہے کیونکہ اس کے حوصلہ افزا اور شہوت شیطان کے ہتھیار ہیں۔ ایک روایت کے مطابق شیطان حضرت زکریا کے بیٹے حضرت یوحنا (جسے یحییٰ بن زکریا کے نام سے بھی جانا جاتا ہے) کے سامنے ظاہر ہوا اور اس کے پھنسنے [رسیوں سے بنے ہوئے]۔ حضرت یوحنا علیہ السلام نے ان سے پوچھا: یہ پھنسے کس مقصد کے لیے ہیں؟ اس نے جواب دیا: "یہ ہوس اور بے حیائی کے جال ہیں۔ میں ان کے ساتھ آدم کی اولاد کو قید کرتا ہوں۔ اس نے پوچھا: "کیا میرے لئے بھی کوئی جال ہے؟" اس نے جواب دیا: ہاں۔ جب تم پیٹ بھر کر کھاتے ہو، تو میں تم پر [خدا سے] دعا کرنا مشکل بناتا ہوں۔" اس نے پوچھا: کیا میرے لئے کچھ اور ہے؟ آپ نے فرمایا: اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ کہا اللہ کی قسم میں آج کے بعد کھانا نہیں کھاؤں گا شیطان نے جواب دیا: میں یہ بھی قسم کھاتا ہوں کہ میں کسی مسلمان کو کبھی کوئی فائدہ مند بات نہیں بتاؤں گا (یعنی جو خدا کی مرضی کے تابع ہو کر خدا پر ایمان رکھتا ہے اور اس کی خدمت کرتا ہے)۔ کہا جاتا ہے کہ پیٹ بھر کر کھانے کے چھ نقصانات ہیں: پہلی بات یہ کہ خدا کا خوف دل میں نہیں رہتا۔ دوسرا، کوئی شخص اپنے ساتھی انسانوں اور خدا کی مخلوقات پر رحم محسوس نہیں کرتا کیونکہ وہ دوسروں کو خود سمجھتا ہے (ایک کی طرح مطمئن ہے) اور بھوک کا درد محسوس نہیں کرتا۔ تیسرا، کوئی محسوس کرتا ہے کہ عبادت بوجھ ہے۔ چوتھا، جب کوئی حکمت کی کوئی بات سنتا ہے، تو اس کا دل عاجزی میں پگھلتا نہیں اور سننے اور قبول کرنے کے

قابل نہیں ہوتا؛ پانچویں بات یہ کہ جب کوئی حکمت اور نصیحت کی باتیں کرتا ہے تو دوسروں پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ چھٹا، اس سے مختلف [جسمانی اور روحانی] بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔

شان و شوکت اور چمک: شان و شوکت ، چمک ، نمایاں کھپت اور دولت کی نمائش ، پرکشش تلاش کرنا بھی شیطان کے لئے ایک داخلی دروازہ ہے۔ یہ ڈسپلے ، شان و شوکت اور چمک لباس ، مادی سامان اور رہائش گاہ میں ہوتی ہے۔ شیطان جب انسان کے دل میں شان و شوکت ظاہر کرنے کی خواہش دیکھتا ہے تو وہ اسے مزید بھڑکاتا ہے اور بڑی عمارتوں کا خواب دکھاتا ہے اور اس بات پر قائل کرتا ہے کہ کسی کے گھر کے ارد گرد دیواریں اونچی ہونی چاہئیں، گھر چمکدار اور سجایا جانا چاہیے، کپڑے خوبصورت ہونی چاہئیں اور سواری یا سواری مہنگی اور سجائی ہونی چاہیے۔ جب اس طرح کی خواہشات دل میں مکمل طور پر جڑ جائیں گی تو شیطان جانتا ہے کہ یہ خواہشات کبھی بھی دل سے الگ نہیں ہوں گی اور ایک خواہش دوسرے کو جنم دے گی اور ایک چیز کو حاصل کرنے سے دوسری چیز کو حاصل کرنے کی فکر پیدا ہو جائے گی [ایک کے بعد دوسری چیز حاصل کرنے کی خواہش] یہاں تک کہ موت آ جائے اور دنیا کو چھوڑنے کے لیے سب کچھ پیچھے چھوڑنا پڑے۔ شیطان کی نچلی نفس سے خواہشات کا طریقہ بھی کسی کے ایمان کے لیے خطرناک ہے۔ بعض اوقات خواہشات کا شعلہ اپنے عبادت گزار کو کفر کی راہ پر چلنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ادنیٰ نفس کی خواہشات سے محفوظ رکھے۔

لوگوں سے لالچ اور توقعات: دوسروں سے لالچ اور توقعات بھی شیطان کے لیے [دل میں] ایک اہم دروازہ ہے۔ جب لالچ [اور دوسروں سے توقعات] دل پر حاوی ہو جاتی ہے تو شیطان مسلسل انسان کو مصنوعی پن، دکھاوا اور ان کے سامنے دکھاوے کرنے پر آمادہ کرتا ہے، جن سے وہ توقعات اور لالچ رکھتے ہیں۔ یہ اس حد تک جاتا ہے کہ جس سے کسی کی توقعات ہیں، وہ اپنا خدا بن جاتا ہے اور وہ توقعات رکھتا ہے، وہ ہمیشہ اس کے دل میں جگہ بنانے کی کوشش کرتا ہے جس سے وہ چاہتا ہے، چاہے وہ جھوٹ، دھوکہ دہی، دکھاوے اور قائل کرنے کے ذریعے ہی کیوں نہ ہو۔ اس کی سب سے نچلی سطح یہ ہے کہ وہ جس کی توقع کر رہا ہے اس کی تعریف کرنے میں مبالغہ آرائی کرتا ہے اور کسی کو نیکی کی تلقین کرنے اور کسی کو برائی سے روکنے کا کام کرنے سے گریزاں ہے کیونکہ وہ کسی کو ناراض نہ کرتا۔ ایک مرتبہ شیطان عبداللہ بن حنظلہ رضی اللہ عنہ کے سامنے حاضر ہوا اور کہا: اے حنظلہ کے بیٹے! میں تمہیں نصیحت کرنے جا رہا ہوں اس لیے یاد رکھو۔ عبداللہ بن حنظلہ نے کہا: مجھے تمہاری نصیحت کی ضرورت نہیں ہے۔ شیطان نے کہا: پہلے اسے سنو، اگر اچھا ہے تو اسے قبول کرو، اگر برا ہے تو اسے مسترد کر دو۔ اے حنظلہ کے بیٹے! اللہ کے سوا کسی سے ایسا سوال نہ پوچھو جس میں لالچ اور لالچ شامل ہو۔ اس کے علاوہ، غصے میں اپنے آپ کو قابو میں رکھو کیونکہ جب کوئی نوکر اپنے آپ پر قابو کھو دیتا ہے، تو میں اس پر قابو پانے کے قابل ہوں"۔

عجلت اور استقامت کا فقدان: یہ دو خوبیاں یا کردار کی خصوصیات بھی شیطان کے داخلے کے نکات ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

العجلة من الشيطان والاناة من الله

"عجلت (یا احتیاط سے غور و فکر کے بغیر کچھ کرنے میں جلدی کرنا) شیطان کی طرف سے ہے اور سوچ سمجھ کر رکنا خدا کی طرف سے ہے"۔ (یہ روایت اس کی طرف سے بیان کی گئی ہے حدیث مجموعہ *ترمذی* صحابی نبوی سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کے حکم پر۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

خُلِقَ ٱلْإِنسَٰنُ مِنْ عَجَلٍ

"انسان کو جلد بازی میں پیدا کیا گیا ہے۔" (سورۃ البقرۃ آیت 37)

وَكَانَ ٱلْإِنسَـٰنُ عَجُولًا

"انسان جلد بازی کرنے کا رجحان رکھتا ہے۔" (سورة البقرة القرآن، آیت 11)

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ

وَلَا تَعْجَلْ بِٱلْقُرْءَانِ مِن قَبْلِ أَن يُقْضَىٰٓ إِلَيْكَ وَحْيُهُۥ

"تمہارے پاس آنے والا وحی مکمل ہونے سے پہلے قرآن مجید کی تلاوت میں جلدی نہ کرو۔" (سورة البقرة باب 20، آیت 114)

عجلت سے الٰہی کی منع کی وجہ یہ ہے کہ ہر چیز علم، تحقیق اور تحقیق سے کی جائے اور تحقیق کے لیے توقف اور غور و فکر کی ضرورت ہے جبکہ جلد بازی توقف اور تحقیق کی اجازت نہیں دیتی۔ جلد بازی کے وقت شیطان اپنی برائی انسانوں پر اس طرح مسلط کرتا ہے کہ وہ اس کا ادراک بھی نہیں کرتے۔ ایک روایت کے مطابق جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی تو تمام شیطان (*شیاطین*) اپنے سردار ابلیس کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ آج زمین پر موجود تمام بت گرے ہوئے نظر آئے۔ ابلیس نے کہا: "یقینی طور پر کچھ نیا ہوا ہے۔ میں زمین کو دیکھنے جا رہا ہوں۔" ابلیس زمین پر گھومتا رہا لیکن اسے کچھ نظر نہیں آیا۔ ایک جگہ پر اس نے دیکھا کہ کچھ فرشتے ایک نوزائیدہ بچے کے گرد گھوم رہے ہیں۔ ابلیس اپنی قوم کے پاس گیا اور ان سے کہا: آج رات ایک نبی پیدا ہوا۔ دنیا میں آج تک جو بھی حمل ہوتے رہے ہیں، میں ان سے واقف رہا ہوں اور پیدائش میری موجودگی میں ہوئی ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ مجھے اس عورت کے حمل کے بارے میں معلوم نہیں تھا اور نہ ہی مجھے پیدائش کا علم تھا۔ اب بت پرستی سے مایوس ہو جاؤ۔ لیکن اللہ کے بندوں کو ان کی جلدی کے لمحات میں نصیحت کرو (اور تمہیں ان پر قابو پائے گا)۔

دولت اور مادی املاک: *درہم* اور *دینار* (سونے اور چاندی کی کرنسی)، مادی جائیدادیں، جائیدادیں اور زمین کے ٹکڑے سب شیطان کے لیے [انسانی دل میں] بڑے دروازے ہیں۔ اس شخص کا دل جو ضرورت سے زیادہ مادی اثاثوں کا مالک ہے، شیطان کا مسکن ہے اور صرف ضروری مواد کا مالک آزاد دل رکھتا ہے۔ اگر کسی شخص کو سو دینار ملتے *ہیں تو* دل میں مختلف خواہشات پیدا ہوتی ہیں۔ ان میں سے سب سے بڑا سو مزید حاصل کرنا ہے اور یہ کبھی نہ ختم ہونے والا چکر ہے۔ جب کسی کے پاس کچھ نہیں ہوتا تو ، کوئی خواہش نہیں تھی ، کوئی لالچ نہیں تھی ، اور کوئی ضرورت نہیں تھی۔ جب کسی کو سو دینار ملتے ہیں تو وہ اپنے آپ کو امیر سمجھنے لگا حالانکہ وہ نو سو مزید کا محتاج ہو جاتا ہے۔ سو دینار حاصل کرنے سے یہ خیال آیا کہ اگر کسی کے پاس نو سو اور ہوں تو وہ گھر خرید لیتا۔ گھر کے بعد ، گھریلو سامان کی سطح حاصل کرنے کی ضرورت ہے جس کے بعد ڈریسنگ اور آرام دہ زندگی کے مسائل اور ضروریات کا یہ سلسلہ مسلسل پھیلتا جارہا ہے۔ جو چیزیں موجود ہیں ان کے لئے ، جو چیزیں موجود نہیں ہیں ضروری ہوجاتی ہیں۔ اس سے پہلے کہ کسی کی پریشانی ختم ہوجائے ، دوسرا شروع ہوجاتا ہے اور ضروریات کا یہ سلسلہ جہنم میں ختم ہوجاتا ہے۔ ثابت البنانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو (چالیس سال کی عمر میں) نبوت دی گئی تو ابلیس نے اپنے گروہ سے کہا: آج ایک نیا واقعہ پیش آیا ہے۔ جاؤ اور دیکھو کیا ہوا۔' سب شیطان زمین میں پھیل گئے لیکن کچھ نہ پایا اور ناکام لوٹ آئے ابلیس نے ان سے کہا: یہیں رہو! میں جاؤں گا اور دیکھوں گا۔' انہوں نے واپس آکر اپنے شاگردوں سے کہا: اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت عطا کی ہے۔ اب اس کے دوستوں اور اصحاب کے پیچھے چلے جاؤ تاکہ انہیں ہدایت سے روکے۔ شیطانوں نے زمین کی طرف رخ کیا اور ناکام ہو کر واپس لوٹ گئے اور کہا کہ ہم نے آج تک ایسی قوم نہیں دیکھی۔ جب ہم ان کو غلطی کا سبب بناتے ہیں تو وہ نماز کے لیے اٹھ کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس سے ان کی غلطیوں کی معافی ملتی ہے۔ ابلیس نے کہا: انتظار کرو اور صبر کرو جلد ہی وہ دنیا پر غلبہ حاصل کریں گے تو ہم یقینا اپنی تدبیر میں کامیاب ہوں گے۔

ایک روایت ہے کہ ایک زمانے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام (علیہ السلام علیہ السلام) اپنا سر چٹان پر رکھے لیٹے ہوئے تھے [اسے تکیے کے طور پر استعمال کرتے ہوئے اپنی غربت اور عاجزی کی کیفیت کو ظاہر کرتے ہوئے]۔ شیطان وہاں سے گزرا اور کہنے لگا: "اے یسوع! کیا آپ دنیا کی طرف بہت زیادہ مائل ہیں؟" یسوع نے اپنے سر کے نیچے سے پتھر اٹھا کر شیطان پر پھینک دیا اور کہا: "یہ پتھر اور اس دنیا کی باقی سب کچھ صرف تیرے لیے ہے۔" اس سے اخذ ہونے والا نتیجہ یہ ہے کہ ایک پتھر بھی دنیا کی مادی ملکیت ہے اور شیطان اب بھی پتھر سے [انسانیت کو غلط راستوں پر گمراہ کرنے] اپنا کام کر سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص صبح سویرے *تہجد* کی نماز کے لیے اٹھتا ہے (فجر سے پہلے کی نمازیں جو روحانی ترقی کے لیے انتہائی مفید اور مددگار ہیں اور رات کے تیسرے حصے میں ادا کی جاتی ہیں جب غروب آفتاب اور فجر کے درمیان رات کے وقت کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے) اور نماز میں سجدہ کی جگہ کے قریب ایک پتھر پاتا ہے۔ اس صورت حال میں، شیطان یقینا کسی کے دل میں یہ خیال ڈال دے گا کہ وہ پتھر پر سر رکھ کر تھوڑا سا لیٹ جائے۔ یہ لیٹنا نیند کا پیش خیمہ ہو گا جس کے نتیجے میں انسان کو *نماز تہجد* پڑھنے سے روکا جائے گا۔ اگر پتھر نہ ہوتا تو کسی کو تکیہ رکھنے کا خیال بھی نہ آتا، سونے اور نماز تہجد سے محروم ہونے کے لیے لیٹنے کی ضرورت نہ پڑتی ۔ [جیسا کہ مذکورہ بالا میں دیکھا گیا ہے،] اس ایک پتھر سے بھی اتنا نقصان ہوا تھا تو لوگوں کی حالت پر ایک نظر ڈالو، اپنے لیے سبق حاصل کرنے کے لیے، جن کے پاس ریشم سے بنے آرام دہ بستر اور تکیے ہیں اور ان کے گھروں میں آرام کی تلاش کا سامان موجود ہے۔ کیا ایسا شخص عبادت الٰہی کا ذائقہ بھی لے سکتا ہے؟ کسی کے دل میں سکون کی خواہش ہمیشہ موجود رہے گی۔

غربت اور کنجوسی کا خوف: یہ دونوں گھناؤنی اور منفی صفات بھی شیطان کے لیے دو بڑے دروازے ہیں۔ بخل اور غربت کا خوف دو ایسی منفی تخریبی خصلتیں ہیں جو انسان کو خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے روکتی ہیں اور اپنے مال کو ذخیرہ کرنے اور اپنے قبضے میں رکھنے پر آمادہ کرتی ہیں۔ قرآن ایسے لوگوں کے دردناک نتائج کی پیشن گوئی کرتا ہے:

وَٱلَّذِينَ يَكۡنِزُونَ ٱلذَّهَبَ وَٱلۡفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ فَبَشِّرۡهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٖ

"جو لوگ سونے اور چاندی کی ذخیرہ اندوزی کرتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ہیں، انہیں دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دو۔" (سورۃ البقرۃ القرآن باب 9 آیت 34)

خیثمہ بن عبدالرحمن رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ شیطان کا دعویٰ ہے کہ انسان مجھ پر کتنا ہی غلبہ حاصل کر لے لیکن تین چیزیں ایسی ہیں کہ ان معاملات میں مجھ پر کبھی غلبہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ سب سے پہلے ، کسی کی جائیداد کو بلاجواز سے لینا۔ دوسرا، مناسب موقع اور ضرورت کے بغیر خرچ کرنا؛ تیسرا، جہاں خرچ کرنے کی ضرورت ہے وہاں خرچ نہ کرنا"۔ سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ شیطان کے پاس غربت کے خوف سے زیادہ موثر حربہ نہیں ہے۔ جب انسان غربت سے ڈرنے لگتا ہے تو اس میں جھوٹ اور غلط کی طرف جھکاؤ پیدا ہوتا ہے۔ انسان حق سے باز رہتا ہے، نچلے نفس کی خواہشات کو ترجیح دیتا ہے اور اپنے رب کے بارے میں کم رائے رکھنے کا مجرم ہے۔ بخل لالچ کو جنم دیتی ہے اور لالچ انسان کے قدموں میں ایک زنجیر بن جاتی ہے جو کسی کو بازاروں اور کمانے کی جگہوں سے باہر نہیں جانے دیتی ہے۔ یہ بازار شیطان کا گھونسلہ اور آرام گاہ ہیں [کیونکہ انسان مادیت پرست ہونے کا رجحان رکھتا ہے اور کسی بھی روحانی مصلحت اور اس میں نیک اور بے لوث کاموں سے غافل ہوتا ہے]۔ حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب ابلیس دنیا میں آئے تو اللہ تعالیٰ سے التجا کی: اے اللہ! تو نے مجھے اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے اور مجھے اس زمین پر پھینک دیا ہے۔ براہ کرم میرے لئے یہاں ایک گھر بنائیں۔' اللہ تعالیٰ نے فرمایا: باتھ روم تمہارا گھر ہے۔ اس نے کہا میرے لیے ایک ایسی جگہ مقرر کر دو جس میں کمپنی ہو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بازار اور گلیاں تمہاری صحبت کی جگہ ہیں۔ کہا میرے لیے کھانا اور رزق مقرر کرو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ کھانا تمہاری رزق ہے جس پر میرا نام نہیں لیا گیا۔ انہوں نے کہا: 'کھانا مقرر کیا گیا ہے۔ کیا میں بھی پانی لے سکتا ہوں؟" اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نشہ اور نشہ تمہارا مشروب ہے۔ اس نے پوچھا: براہ کرم مجھے ایک دعوت دینے والا عطا فرما۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ موسیقی کے آلات سے اس مقصد کو پورا کرو۔ آپ نے پوچھا: پڑھنے اور لکھنے کے بارے میں تمہارا کیا حکم ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ایسی شاعری پڑھو جو نیکی کی دعوت نہیں دیتی اور لاشوں کو ٹیٹو بناؤ۔ اس نے پوچھا: مجھے ایک داستان عطا فرما۔ اللہ تعالیٰ نے

فرمایا: آپ کا بیان جھوٹ ہے۔ اس نے پوچھا: مجھے شکار کے لیے جال دے دو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مخالف جنس کی ہوس آپ کو خالص ہے [یعنی اگر غیر اخلاقی اور غیر اخلاقی طریقوں سے تعاقب کیا جائے]"۔

مذہبی تعصب: یہاں جس چیز کو مذہبی تعصب کہا جا رہا ہے وہ مختلف مکاتب فکر [اور مذاہب] کے لوگوں کا ایک دوسرے کے خلاف تکبر اور تعصب ہے۔ اس کی بنیاد حق نہیں بلکہ ادنیٰ نفس کی خواہشات ہیں۔ لوگ اپنے مخالفین سے نفرت کرتے ہیں اور انہیں حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہ ایسی برائی ہے کہ یہ ہر عبادت گزار (یا مذہبی شخص) اور گنہگار کو یکساں طور پر تباہ کر دیتی ہے۔ لوگوں پر تنقید کرنا اور ان میں خامیاں تلاش کرنا جانوروں کی بہت سی خوبیوں میں سے ایک جانوروں کی خوبی سے تعلق رکھتا ہے۔ جب شیطان اس قابل مذمت صفت کو کسی اچھی چیز کے طور پر پیش کرتا ہے تو انسانی مزاج جو پہلے سے ہی اس کے قریب ہے، اسے اختیار کر لیتا ہے اور انسان اس میں مکمل طور پر مشغول ہو جاتا ہے اور اس خیال سے خوش ہوتا ہے کہ وہ کسی مذہبی کشمکش میں ملوث ہے [اور اس لیے اسے خدا کی چیز سمجھتا ہے] اگرچہ وہ شیطان کی اطاعت کر رہا ہے۔ دینی اور فرقہ وارانہ اختلافات کی کیفیت یہ ہے کہ مثلا ایک شخص نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے محبت میں تعصب اختیار کر لیا ہے لیکن یہ محبت خالص نہیں ہے، بلکہ اس میں ملاوٹ اور *حرام* (حرام چیزیں)، جھوٹ، دشمنی اور گڑبڑ کا باعث بنتا ہے۔ اگر ابوبکر رضی اللہ عنہ ایسے شخص کو دیکھتے تو وہ اپنے دوست کی بجائے کسی کو اپنا دشمن قرار دیتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا دوست وہ ہے جو اس کے راستے پر چلتا ہے اور اس کی صفات اور کردار کو اختیار کرتا ہے اور اپنی زبان کو بیکار باتوں سے روکتا ہے۔ ابوبکر کا طریقہ یہ تھا کہ وہ بیکار باتیں کرنے سے بچنے کے لیے اپنے منہ میں کنکریاں ڈال لیتے تھے۔ یہ شخص جو بیکار اور غیر ضروری باتیں کرتا ہے [جو ابوبکر سے محبت کا دعویٰ کرتا ہے]، اس شخص کو ابوبکر رضی اللہ عنہ سے محبت اور دوستی کا دعویٰ کرنے کا کیا حق ہے؟ [لوگوں کے مذاہب کی بنیاد پر تنازعات، لڑائی جھگڑوں اور نفرت کو اس طرح سمجھا جا سکتا ہے]

دوسرا شخص علی رضی اللہ عنہ سے محبت میں مبالغہ آرائی کی تمام حدیں پار کر چکا ہے حالانکہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس کے اعمال اور اخلاق کے ذرا بھی قریب نہیں ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ *نے اپنے دور حکومت* میں ایک *درہم* سے بھی کم کا لباس پہنا تھا جبکہ اپنی محبت کا جھوٹا دعویدار ریشمی کپڑے پہن کر گھوم رہا ہے (جو شریعت کے مطابق مردوں پر حرام ہیں) جو حرام پیسوں سے بنائے جاتے ہیں۔ قیامت کے دن حضرت علی رضی اللہ عنہ ایسے شخص کو اپنا دوست نہیں بلکہ دشمن سمجھیں گے۔ کیا کسی شخص کو اپنی دوستی میں سچا قرار دیا جا سکتا ہے جو اپنے دوست کے پیارے بچے کو اپنے گھر لے جائے اور اسے پیٹے، اس کے بال کھینچے اور اس کے جسم کو زخمی کر دے، لیکن اس کے باوجود یہ دعویٰ کرتا رہتا ہے کہ وہ بچے کے والدین کا مخلص دوست ہے اور اس سے بہت محبت کرتا ہے۔ یہ ان لوگوں کا حال ہے جو چار راشدین خلفائے راشدین (ابوبکر، عمر، عثمان اور علی) اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے محبت کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں اور دین کو تباہ کرنے میں ملوث ہیں حالانکہ یہ دین ان کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب تھا اور انہوں نے اسے اپنی جانوں پر ترجیح دی۔ جائیداد، خاندان اور رشتہ دار۔ یہ لوگ شریعت الٰہی میں مجرم ہیں جنہوں نے اسے خواہشات کی قینچی سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، صحابہ کرام سے اپنی محبت کا دعویٰ کرنے سے باز نہیں آتے، بلکہ حقیقت میں، خدا اور اس کے دوستوں کے مشترکہ دشمن یعنی شیطان کی اطاعت کرتے ہیں۔ قیامت کے دن یہ حقیقت واضح ہو جائے گی جب وہ اپنے دوستوں کے سامنے سزا دی جائیں گی۔ قیامت کے بارے میں بھول جاؤ، اگر انہیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ان کے بارے میں اور اس دنیا میں ان کی پسند کے لوگوں کے بارے میں معلوم ہو جائے تو وہ اپنی حالت کو دیکھ کر بہت شرمندہ ہو جائیں گے اور ان عظیم نیک لوگوں کے نام اپنی غلیظ زبانوں پر لانے کی ہمت نہیں کریں گے۔ شیطان ان پیروکاروں کو بھی یقین دلاتا ہے کہ اگر کوئی ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہ سے محبت میں مر جائے تو جہنم کی آگ اس کے قریب بھی نہیں آئے گی۔ شیطان دوسروں کو یقین دلاتا ہے کہ اگر وہ عثمان اور علی رضی اللہ عنہ کی محبت میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کریں گے تو وہ بغیر کسی حساب کے جنت میں جائیں گے جبکہ حقیقت میں اس دن کسی کی محبت اور قربت کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا، صرف اس کے اپنے (نیک اور نیک عمل) سے فائدہ ہوگا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پیاری بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

اعملی فانی لا اغنی عنکم من اللّٰہ شیئا

"نیک اعمال کرو کیونکہ میں تمہیں اللہ سے کسی چیز سے نہیں بچا سکتا۔ (یہ حدیث مجموعہ صحیح *بخاری* اور صحیح *مسلم* سے صحابہ کرام ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

یہ نچلے نفس کی خواہشات کی پیروی کی ایک مثال ہے جس کا یہاں ذکر کیا گیا ہے۔ یہی بات ان لوگوں پر بھی لاگو ہوتی ہے جو روایتی مکاتب فکر کے بارے میں تعصب رکھتے ہیں (جو روایتی اسلامی طریقہ کار کے ایک حصے کے طور پر ایک ہزار سال سے زیادہ عرصے سے جامعہ کے عام اتفاق رائے سے قبول کیے گئے ہیں جو روایتی اسلامی طریقہ کار کے ایک حصے کے طور پر پیش کیے گئے ہیں اور روایتی تفہیم کی تعمیل کے ذریعے اعتدال کو یقینی بنانے کے لیے بنائے گئے ہیں) اور اپنے تعصب میں اس حد تک آگے بڑھتے ہیں کہ دوسرے مکاتب فکر میں نیچے یقینی ہو جاتا ہے۔ ہر کوئی اپنے امام کی صداقت کا دعویدار ہے لیکن ان کے عظیم کردار کی پیروی نہیں کرتا۔ قیامت کے دن یہ *بڑے ائمہ* اپنے پیروکاروں سے پوچھیں گے کہ ہمارے مکاتب فکر اعمال سے بنے ہوئے تھے اور اقوال اور اقوال بھی اعمال کے لیے نہیں تھے تو کیا وجہ ہے کہ تم اقوال کو اہمیت دیتے ہوئے اعمال سے گریز کرتے ہو اور اس طرح ہمارے طریقہ کار اور کردار کی مخالفت کرتے ہو اور ہمارے مکاتب فکر کے پیروکار ہونے کا جھوٹا دعویٰ کرتے ہو؟ یہ شیطان کے لیے ایک بڑا دروازہ ہے اور اس کے دل میں آنے کا ایک بڑا راستہ ہے۔ بہت سے علماء (علمی الہیات دان) اس طرح شیطان کے ہاتھوں سے تباہی تک پہنچے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خدا سے خوفزدہ نہیں تھے، دنیا کے لیے لالچ اور رجحان رکھتے تھے، دین کے بارے میں ان کی بصیرت کمزور ہے، اور ان کی پیروی میں اس کی محرک اخلاص نہیں بلکہ لوگوں کی طرف سے عقیدت اور احترام حاصل کرنے کی خواہش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مذہبی تعصب میں ملوث رہے ہیں اور اس تعصب کو اچھا سمجھتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ یہ تعصب شیطانی فعل ہے لیکن افسوس کہ یہ لوگ شیطان کے فریب اور چالوں سے واقف نہیں ہیں بلکہ اس کی تدبیر کو عملی جامہ پہنانے میں مصروف ہیں۔ عام لوگوں نے علماء پر تنقید شروع کر دی ہے، دین کے اصولوں کو فراموش کر دیا گیا ہے اور فقہ کی پیچیدگیوں میں اختلاف رائے کو اہمیت دی گئی ہے۔ یہ علمی الہیات دان دوسروں کے ساتھ مل کر خود کو تباہ کر چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری اور ان کی توبہ قبول فرمائے۔ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شیطان کا یہ اقتباس نقل کیا ہے: "میں نے گناہوں کو آراستہ اور آرائشی انداز میں قوم اور *امت* محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکاروں کے سامنے پیش کیا لیکن انہوں نے توبہ کے ذریعے میری کمر توڑ دی۔ اس کے بعد میں نے ان کے سامنے ایسے گناہوں کی زینت بجا دی جن سے وہ توبہ نہیں کرتے۔ یہ گناہ نفس نفس کی خواہشات ہیں۔ شیطان نے [اس معاملے میں] سچ کہا ہے۔ لوگوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ان معاملات میں وہ گناہوں کی طرف بڑھ رہے ہیں، تو وہ توبہ کیسے کریں گے؟ شیطان کا ایک بڑا فریب یہ ہے کہ انسان اپنی ذمہ داریوں کو بھول جاتا ہے اور اس کے بجائے ان اختلافات میں الجھ جاتا ہے جو علمی الہیات اور [عقائد کی پیچیدگیوں] سے متعلق مسائل میں موجود ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک بار بعض لوگ خدا کے ذکر میں مصروف تھے تو شیطان آ گیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ اپنے اجتماع کو چھوڑ دیں اور انہیں روکیں لیکن اس کے عزائم میں کامیاب نہ ہو سکے اور خدا کو یاد کرنے والوں نے اس کی ہر حکمت عملی کو ناکام بنا دیا۔ اس کے بعد اسے مجبور کیا گیا کہ وہ قریب بیٹھے کچھ لوگوں کو اکسائے، جو پریشانی پیدا کرنے کے لیے دنیاوی گفتگو میں مصروف تھے۔ وہ اپنی گفتگو کے دوران آپس میں اس حد تک لڑنے لگے کہ وہ ایک دوسرے کو مارنے اور زخمی کرنے لگے۔ یاد الٰہی کے اجتماع سے کچھ لوگ لوگوں کے دوسرے گروہ کو روکنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور ان سے لڑنے کو منع کرنے کو کہا۔ یہاں شیطان کا مقصد لڑائی کا سبب بننا نہیں تھا، بلکہ وہ خدا کی یاد کو روکنا چاہتا تھا اور ایسا کرنے والے لوگوں کو چھوڑنا چاہتا تھا۔

عام لوک اور فلسفیانہ مباحثے: شیطان کا ایک طریقہ یہ ہے کہ وہ عام لوگوں کو ان علموں میں شامل ہونے کی ترغیب دیتا ہے جس میں وہ کمزور ہیں اور انہیں ان معاملات پر غور و فکر کرنے کی دعوت دیتا ہے جن میں وہ برداشت نہیں کر سکتے۔ مثال کے طور پر خدا کی ہستی اور اس کی الہامی صفات کا علم اور اسی طرح کے دیگر معاملات بھی جن کو ان کی کمزور عقل سمجھنے سے قاصر ہے۔ اس صورت حال میں وہ اپنی کمزور اور محدود عقل کو نہیں دیکھتے اور نہ ہی ان کی کمی کو دیکھتے ہیں، بلکہ وہ دین پر شک کرنے لگتے ہیں اور ان کے ذہنوں میں خدا کے بارے میں ایسے خیالات پیدا ہوتے ہیں جو انہیں دین کے دائرے سے خارج کر دیتے ہیں اور اس کے بجائے انہیں دین میں کفر اور بدعت کے دائرے میں ڈال دیتے ہیں یا دین میں جدت اور اجنبی نظریات کو قبول کر لیتے ہیں۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ انہوں نے ایمان کی انمول چیز کھو دی ہے، بلکہ وہ اس سے خوش ہیں اور سوچتے ہیں کہ ان کے دل میں جو کچھ ہوا ہے وہ حقیقی فہم اور بصیرت ہے، اور یہ ان کی اپنی ذہانت اور حد سے زیادہ عقل سے حاصل ہوا ہے۔ ان بیچاروں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ سب سے زیادہ بے عقل شخص وہ ہے جو اپنی عقل پر بہت زیادہ بھروسہ کرتا ہے اور سب سے زیادہ ذہین وہ ہے جو اپنی عقل کو ناقص سمجھتا ہے اور علماء اور علماء سے پوچھتا رہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ اور معروف عالم اور استاد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ نقل کرتی ہیں:

ان الشیطان یاتی احدکم فیقول: من خلقک؟ فیقول اللّٰہ تبارک وتعالیٰ فیقول فمن خلق اللّٰہ؟ فاذا وجد احدکم ذالک فلیقل آمنت باللّٰہ ورسولہ فان ذالک یذھب عنہ

"شیطان تم میں سے کسی کے پاس آتا ہے اور پوچھتا ہے کہ تمہیں کس نے پیدا کیا؟" ایک نے جواب دیا: 'خدا'۔ پھر وہ پوچھتا ہے کہ خدا کو کس نے پیدا کیا؟ اگر تم میں سے کسی کو یہ صورت حال پیش آئے تو وہ کہے کہ میں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہوں۔ اس طرح کہنے سے [شیطانی] الزام ختم ہو جائے گا۔" (اس حدیث کے مجموعے *احمد*، *بزار*، *ابو یعلی*، *صحیح بخاری* اور *صحیح مسلم سے روایت کی گئی ہے*)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اشاروں کے علاج کے بارے میں فکری بحث کی اجازت نہیں دی کیونکہ اشارے عام لوگوں کے پاس ہوتے ہیں نہ کہ علماء کو۔ اولیہ لوگوں کو چاہیے کہ وہ اپنے ایمان کی تجدید کریں اور عبادات اور معاشی سرگرمیوں میں مشغول ہوں اور علم کو علماء کے لیے چھوڑ دیں۔ ایک عام آدمی خدا اور اس کی راہ کے بارے میں بے بنیاد باتیں کہہ کر کفر تک پہنچ سکتا ہے۔ حقیقی علم میں گہرائی حاصل کیے بغیر کچھ کہنا تیراکی کو جاننے کے بغیر اپنے آپ کو لہروں کے سامنے پیش کرنے کے مترادف ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے نتائج کسی کی اپنی تباہی کے سوا کوئی اور نہیں ہوں گے۔ عقائد اور مذاہب کے بارے میں شیطان کے فریب اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا۔ ان کے بارے میں جو کچھ ذکر کیا گیا ہے وہ ان دھوکہ دہی کا ایک نمونہ ہے۔

منفی اور بری رائے رکھنا: شیطان کے فریب کا ایک دروازہ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں اور ہر ایک کے بارے میں بری رائے رکھیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱجْتَنِبُوا۟ كَثِيرًا مِّنَ ٱلظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ ٱلظَّنِّ إِثْمٌ ۖ

"اے ایمان والو! بہت ساری بری رائے سے پرہیز کریں کیونکہ کچھ بری رائے گناہ ہیں۔ (سورۃ البقرۃ باب ۴۹، آیت ۱۲)

جو شخص اپنے بھائی (یا بہن) کے بارے میں بری رائے رکھتا ہے وہ یقینا شیطان کے فریب کا شکار ہو گا۔ شیطان اس بری رائے کو بھڑکا دے گا جو کسی کے پاس ہے اور کسی کو اس کے خلاف غیبت کرنے یا اس کے بارے میں اپنی ذمہ داریوں کو پورا نہ کرنے یا اس کے بارے میں کسی کی عزت میں سستی کا مظاہرہ کرنے پر آمادہ کرے گا یا اسے حقارت کی طرف دیکھے گا اور اپنے آپ کو اس سے بہتر سمجھتا ہے۔ یہ تمام حالات اپنی تباہی کے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خدائی قانون نے [لوگوں] کو الزام تراشی کی جگہوں سے بچنے کا حکم دیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اتّقوا مواضع التّهم

"الزام تراشی کی جگہوں سے گریز کریں [غلط طریقے سے سمجھنے سے بچنے کے لئے کیونکہ اندرونی اور بیرونی امن کی حالت کو برقرار رکھنے کے لئے غلط فہمیوں اور تنازعات سے بچنے کے لئے تاثرات کو بھی منظم کرنے کی ضرورت ہے]۔"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود ملامت اور شکوک و شبہات سے بچتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علی بن حسین رضی اللہ عنہ سے یہ روایت صفیہ بنت حی بن اختر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں *اعتکاف* میں تھے۔ میں اس سے ملنے آیا تھا۔ میں [اتفاقاً] حیض ہو گیا۔ جب شام ہوئی تو میں نے [اپنے گھر میں] واپس جانا شروع کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی میرے ساتھ چلنے لگے۔ راستے میں انصار میں سے دو آدمیوں کا سامنا مدینہ منورہ کے لوگوں سے ہوا۔ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا اور اپنے راستے پر چل پڑے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بلایا اور فرمایا: یہ صفیہ بنت ہے ہے۔ انہوں نے جواب دیا: یا رسول اللہ! ہم آپ کے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہیں (یعنی ہم آپ کے بارے میں کوئی بری بات بھی نہیں سوچ سکتے ہیں لہذا آپ کو ہمیں یہ سمجھانے کی بھی ضرورت نہیں تھی کہ آپ اپنی بیوی کے ساتھ تھے)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (تم سچ کہہ رہے ہو) لیکن شیطان انسان کی رگوں میں گھومتا ہے [اور دوسروں کو ملامت کرنے اور ان کے درمیان فتنہ پھوٹنے کا بیج بونے کا حکم دیتا ہے)۔ میں نے یہ خیال کیا کہ وہ آپ کے دلوں میں [اس عورت کے بارے میں جس کے ساتھ تھا اور اس وجہ سے، میں نے وضاحت کرنا ضروری سمجھا]۔ (یہ روایت اس کی طرف سے بیان کی گئی ہے *احادیث* کے مجموعے *صحیح بخاری* اور *صحیح مسلم*)

غور کیجئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دین کی حفاظت اور آخرت کی بہتری کے بارے میں کس قدر پرواہ کی۔ اس کے علاوہ ، اس نے اپنے پیروکاروں کو ایسی جگہوں سے بچنے کا طریقہ سکھا کر کتنا مہربانی کی جو شکوک و شبہات اور الزام تراشی کو جنم دے سکتی ہیں اور سکھایا کہ ایک عالم شخص کو بھی اپنی حالت کے بارے میں کاہلی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے۔ جو شخص اپنی تقویٰ ، تعظیم اور خوف خدا (*تقویٰ*) اور شریعت الٰہی پر عمل کرنے کے لئے جانا جاتا ہے ، اسے یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ لوگوں کی کسی بارے میں بری یا منفی رائے نہیں ہوگی اور لازمی طور پر کسی کے بارے میں اچھی رائے ہوگی۔ علم اور خدا پرستی میں کتنا ہی سبقت کیوں نہ ہو، لوگ کسی کو ایک ہی طرف نہیں دیکھتے۔ کچھ لوگ ایک کو اچھا اور کچھ برا سمجھتے ہیں۔ بلکہ ، کسی کے بارے میں برا سوچنے والے لوگوں کی تعداد ان لوگوں سے زیادہ ہے جو کسی کے بارے میں اچھا سوچتے ہیں۔ دوسروں کی بری رائے اور برے لوگوں پر الزام لگانے سے اپنے آپ کو بچانا ضروری ہے۔ ان سے بری رائے کی توقع کی جاتی ہے۔ جب آپ کسی کو دوسروں کے بارے میں بری رائے رکھنے اور ان کے ساتھ خامیاں تلاش کرنے میں

مصروف دیکھتے ہیں تو جان لیں کہ وہ باطن کی برائی [اور منفیت] میں ملوث ہے۔ دوسروں کی بری رائے کسی کی اندرونی برائی [اور منفی] کی عکاس ہوتی ہے اور ہر ایک کو اپنے [برے اور منفی] وجود کی تصویر میں دیکھنا چاہتی ہے۔ مومن اپنے بھائی (یا بہن) کے اعمال کے لیے بہانے تلاش کرتا ہے۔ منافق غیبت کے سوا کچھ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ مومن کا دل ہر شخص کے لیے صاف ستھرا اور صاف ہوتا ہے [اور ان سے کھلے دل سے ملتا ہے اور اس کے بارے میں سوچتا ہے]۔

یہ شیطان کے [انسانی دل میں] داخل ہونے کے بارے میں ایک مختصر بحث تھی۔ یہ داخلی راستے اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ میری رائے میں یہاں جو کچھ بھی لکھا گیا ہے اور جو بھی داخلے ذکر کیے گئے ہیں، ان سے [انسان کے دل میں شیطان کے داخلے] کے دیگر تمام داخلے اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ بہرحال بہت سی منفی باطنی خصلتیں جو انسان میں ہوتی ہیں، ان میں سے ہر ایک خصلتیں شیطان کا ہتھیار اور شیطان کے دروازوں کے درمیان سے ایک دروازہ ہیں۔

شیطان سے بچنے کا طریقہ: یہ سوال یہاں پوچھا جا سکتا ہے: شیطان کی چالوں سے اپنے آپ کو بچانے کا کیا علاج ہے؟ کیا خدا کا ذکر اور *لا حولہ ولا قوتہ الّہٰ*' یا 'اللہ کے سوا کوئی طاقت اور طاقت نہیں ہے' اس سے تحفظ فراہم کرے گا؟ واضح رہے کہ دل کا علاج اسی وقت ممکن ہے جب تمام داخلی دروازے بند ہو جائیں جن کے ذریعے شیطان دلوں میں داخل ہو کر ان کو آلودہ کر دے۔ دوسرے لفظوں میں دل کو تمام منفی اور گھناؤنی باطنی تخریبی صفات سے پاک ہونا چاہیے۔ دل کو اندرونی تباہی سے پاک کرنا ایک وسیع موضوع ہے۔ [موجودہ] کتاب "*احیئ علوم الدین*" یا "خدا کی راہ کا احیاء" کی تیسری جلد یا چوتھائی کا واحد مقصد [انسانی دل میں] باطنی تخریبی صفات کا علاج کرنا ہے۔ چونکہ اس طرح کی ہر باطنی تخریبی صفت کو اپنے باب کی ضرورت ہوتی ہے جیسا کہ آپ اگلے صفحات میں دیکھیں گے، اس لیے یہاں یہ بتانا کافی ہے کہ اگر دل ان اندرونی تباہ کن منفی برائیوں سے پاک اور پاک ہو جائے تو شیطان کو دل میں اپنے قدم مضبوط کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ وہ زیادہ تر کر سکتا ہے کہ وہ آنا اور گزر جائے۔ اللہ کا ذکر اس کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ خدا کی یاد کا اثر اس وقت ہوتا ہے جب وہ خدا کے خوف اور تقدس کی روشنی سے روشن ہوتا ہے اور منفی قابل مذمت باطنی خصلتوں کی آلودگی سے پاک ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی یاد کو صرف ایک خیال یا دل میں ایک لمحہ کی حالت سمجھا جائے گا اور اس پر حکومت اور تسلط نہیں ہوگا۔ یہ آسانی سے دل کے شطرنج کے بورڈ پر اپنا کنٹرول مضبوط کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّ ٱلَّذِينَ ٱتَّقَوْا۟ إِذَا مَسَّهُمْ طَـٰٓئِفٌ مِّنَ ٱلشَّيْطَـٰنِ تَذَكَّرُوا۟ فَإِذَا هُم مُّبْصِرُونَ

"جو لوگ خدا سے ڈرتے ہیں، تقدس اور خوف رکھتے ہیں، جب ان کے دل میں شیطان کی طرف سے کوئی خطرہ آتا ہے تو وہ فورا خدا کی یاد میں آجاتے ہیں اور فورا ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں [کیونکہ وہ اس سے چونک جاتے ہیں اور جانتے ہیں کہ ان کے دلوں میں جو منفی پائے جاتے ہیں وہ شیطان کی طرف سے ہے اور انہیں اس سے فوری طور پر چھٹکارا حاصل کرنے کی ضرورت ہے]۔ (سورۃ البقرۃ باب 7، آیت 121)

اس آیت میں خدا سے ڈرنے والے شخص کے لیے ایک خاص امتیاز کیا گیا ہے۔ شیطان کی مثال بھوکے کتے کی طرح ہے۔ اگر آپ کے پاس اس کے لئے کوئی روٹی یا گوشت نہیں ہے تو آپ اسے اپنے سے دور دھکیل سکتے ہیں لیکن اگر آپ کے ہاتھ میں گوشت ہے اور کتا بھی بھوکا ہے تو وہ اسے دھکیل کر دور نہیں ہوگا بلکہ اس کے بجائے گوشت پر چھلانگ لگا دے گا۔ شیطان دل سے ڈانٹنے کی آواز سن کر بھاگ جاتا ہے جہاں اس کے لیے کھانا نہیں ہے۔

لیکن جن دلوں میں اس کا کھانا موجود ہے، وہ یقینا ان پر حملہ کرتا ہے اور صرف زبان سے ڈانٹنا اس کے لیے کافی نہیں ہے۔ خواہشات کا غلبہ رکھنے والا دل خدا کی یاد کی حقیقت کو اس میں داخل نہیں ہونے دیتا اور وہ دل شیطان کے لیے آرام گاہ بن جاتا ہے۔ وہ پرہیزگاروں کے دروازے پر دستک نہیں دیتا جو نچلی نفس کی خواہشات اور ان کے خواہشات کی وجہ سے باطنی تخریبی صفات سے عاری ہوتے ہیں، بلکہ جب وہ انہیں یاد الٰہی سے غافل اور غافل دیکھتا ہے تو ان پر دستک دیتا ہے۔ لیکن جب وہ اللہ کی یاد کی طرف لوٹتے ہیں تو وہ ایسے دلوں سے بھاگ جاتے ہیں۔ یاد الٰہی کے ذریعے ان کے فرار کا ثبوت وہ قرآنی آیات اور *احادیث* ہیں جو شیطانی اشاروں کے وقت خدا کی پناہ مانگنے کا حکم دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک آیت ہے:

فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ

"شیطان سے خدا کی پناہ مانگو۔" (سورۃ البقرۃ باب 16، آیت 98)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ شیطان مومن اور کافر کے ساتھ ملے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی خیریت دریافت کی۔ کافر کا شیطان زیادہ وزن تھا اور اس کے جسم پر بہت زیادہ چربی تھی لیکن مومن کا شیطان کمزور، کمزور، پریشان اور بے گھر تھا۔ کافر کے شیطان نے اس سے پوچھا: تم نے اپنے آپ کو ایسی شرط کیوں بنائی؟ تم اتنے کمزور اور دبلی پتلی کیوں ہو؟" اس نے جواب دیا: میں ایک ایسے شخص کے ساتھ ہوں جو کھانا کھاتے وقت خدا کے نام سے شروع ہوتا ہے۔ میں بھوکا رہتا ہوں [اس کے نتیجے میں]۔ جب کوئی پانی پیتا ہے تو خدا کے نام سے شروع ہوتا ہے اور مجھے پیاس سے ڈرتا ہے۔ جب کوئی کپڑے پہنتا ہے تو خدا کا نام لیتا ہے، اسی لیے میرا جسم بے نقاب رہتا ہے۔ جب کوئی شخص اپنے بالوں میں [بالوں] کا تیل ڈالتا ہے [جیسا کہ بہت سی ثقافتوں میں رواج ہے] وہ خدا کا نام لیتا ہے، اسی لیے میرے بال خشک اور بکھرے ہوئے رہتے ہیں۔ کافر کے شیطان نے اس پر افسوس کا اظہار کیا اور کہا: مجھے ایک ایسے شخص پر مسلط کیا گیا ہے جو تمہارے ساتھی کی طرح کچھ نہیں کرتا۔ کھانے پینے اور کپڑے پہننے میں میں ایک کا برابر کا ساتھی ہوں۔' محمد بن الواسع رحمہ اللہ شیطان سے حفاظت کے لیے ہر روز یہ دعا کرتے تھے:

اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ سَلَّطْتَ عَلَيْنَا عَدُوًّا بَصِيْرًا بِعُيُوْبِنَا يَرَانَا هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا نَرَاهُمْ اَللّٰهُمَّ فَاٰيِسْهُ مِنَّا كَمَا اٰيَسْتَهٗ مِنْ رَحْمَتِكَ وَقَنِّطْهُ مِنَّا كَمَا قَنَّطْتَهٗ مِنْ عَفْوِكَ وَبَاعِدْ بَيْنَنَا وَبَيْنَهٗ كَمَا بَاعَدْتَ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ رَحْمَتِكَ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ

"اے خدا! آپ نے ہم پر ایک ایسا دشمن مسلط کیا ہے جو ہماری غلطیوں سے بخوبی واقف ہے۔ وہ اور اس کا گروہ ہمیں اس طرح دیکھتا ہے کہ ہم انہیں دیکھنے کے قابل نہیں ہیں۔ اے اللہ! انہیں ہم سے اس طرح مایوس کر جس طرح تو نے انہیں اپنی رحمت سے مایوس کر دیا ہے۔ اسے ہم سے اس طرح ناامید کر دے جس طرح تو نے اسے اپنی معافی سے ناامید کر دیا ہے۔ اس کے اور ہمارے درمیان اتنا فاصلہ اور فاصلہ پیدا کر دے جس طرح تو نے ان کے درمیان پیدا کیا ہے اور تیری رحمت بھی۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔"

محمد الواسع رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ایک مرتبہ میں مسجد کی طرف جاتے ہوئے شیطان سے ملا جس نے مجھ سے پوچھا: کیا تم مجھے جانتے ہو؟ میں نے کہا: 'نہیں'. کہا میں *ابلیس* ہوں میں نے ان سے پوچھا کہ راستے میں مجھ سے ملنے کا کیا مقصد ہے تو انہوں نے کہا: میری خواہش ہے کہ تم کسی اور کو یہ دعا نہ سکھاؤ۔ میں کبھی بھی آپ کی مزاحمت نہیں کروں گا۔' میں نے جواب دیا: خدا کی قسم کھاتا ہوں کہ اگر کوئی یہ دعا سیکھنا چاہتا ہے تو میں اسے سیکھنے سے نہیں روکوں گا۔ جاؤ اور جو دل چاہتا ہے وہ کرو۔ عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ شیطان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نماز پڑھتے ہوئے اپنے ہاتھ میں آگ کی چنگاری لے کر آتا تھا۔ وہ دعا اور خدا کی پناہ مانگنے سے باز نہیں آیا۔ ایک مرتبہ جبرائیل علیہ السلام آئے اور ان سے کہا کہ وہ مندرجہ ذیل دعا پڑھیں:

أَعُوذُ بِكَلِمَاتِ اللهِ التَّامَّاتِ الَّتِي لَا يُجَاوِزُهُنَّ بَرٌّ وَلَا فَاجِرٌ مِنْ شَرِّ مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا وَمِنْ فِتَنِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمِنْ طَوَارِقِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ إِلَّا طَارِقًا يَطْرُقُ بِخَيْرٍ يَا رَحْمٰنُ

"میں اس کے کلام کے وسیلہ سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں جس سے کوئی تجاوز نہیں کر سکتا، چاہے وہ اچھی ہو یا برا، اس چیز سے جو زمین میں داخل ہوتی ہے اور جو اس سے نکلتی ہے اور آسمان پر چڑھتی ہے اور جو آسمان سے اترتی ہے، دن اور رات کی آزمائشوں اور مصیبتوں سے۔" رات اور دن کے اتار چڑھاؤ سے سوائے اس کے جو بھلائی سے بھری ہوئی ہے اے مہربان (اس روایت کو ابن ابی دنیا نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے:امام مالک نے یحییٰ بن سعید رضی اللہ عنہ سے موطہ میں اور ابن عبد البر ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ پڑھے تو شیطان کا شعلہ بجھا دیا اور وہ منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ فرشتہ جبرائیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور ان سے فرمایا: *"ایک جن* تمہیں دھوکہ دینا چاہتا ہے تو جب تم بستر پر جاؤ تو عرش کی آیت پڑھ لو۔

ایک نبوت روایت کے مطابق:

ما سلك عمر فجا إلا سلك الشيطان فجا غير الذي سلكه عمر

"عمر عمر جس بھی راستے پر چلتا ہے، شیطان اس راستے سے بھاگ کر کسی اور راستے پر چلا جاتا ہے"۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ ان معزز شخصیات کے دل شیطان کے لیے کسی خوراک سے عاری تھے، دوسرے لفظوں میں ان کے دلوں میں ہوس نہیں گزرتی تھی۔ اگر کوئی یہ چاہتا ہے کہ شیطان کسی سے دور ہو جائے تو صرف اللہ تعالیٰ کے ذکر سے جس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے دور ہو گیا تو یہ ناممکن ہے۔ کوئی شخص جو اس توقع کو برقرار رکھتا ہے وہ اس شخص کی طرح ہے جو دوائیں لیتا ہے لیکن روک تھام سے گریز کرتا ہے [نقصان دہ چیزوں سے جو دوائیں لینے کے خلاف ہیں]۔ اس صورت حال میں جب معدہ مضر اور مضر صحت کھانوں سے بھرا ہوا ہو تو ادویات کس طرح فائدہ مند ثابت ہو سکتی ہیں؟ اس طرح کے کھانے سے [مضر اثرات] سے چھٹکارا پانے کا وقت نہیں ہوتا حالانکہ دوا کو فائدہ مند بنانے کے لیے جسم کے مختلف حصوں میں منتقل کیا جاتا ہے۔ الٰہی کی یاد دوا کی

طرح ہے اور *تقویٰ* (تقویٰ اور خدا کا خوف جو کسی کو باطنی یا بیرونی غلط اور برے معاملات میں ملوث ہونے سے روکتا ہے) روک تھام ہے۔ اس روک تھام کا نتیجہ یہ ہے کہ دل نچلے نفس کی خواہشات اور خواہشات سے خالی ہو۔ چنانچہ جب خدا کے سوا کسی چیز سے عاری دل میں الٰہی کی یاد آتی ہے تو شیطان اس دل سے اسی طرح بھاگ جاتا ہے جیسے دوا خالی پیٹ میں چلی جاتی ہے تو اس سے بیماری اور بیماری بچ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِمَن كَانَ لَهُۥ قَلْبٌ

"اس میں اس شخص کے لیے بڑی عبرت ہے جو دل کا مالک ہے۔" (سورۃ البقرۃ باب 50، آیت 37)

اللہ تعالیٰ ایک اور جگہ فرماتا ہے:

كُتِبَ عَلَيْهِ أَنَّهُۥ مَن تَوَلَّاهُ فَأَنَّهُۥ يُضِلُّهُۥ وَيَهْدِيهِ إِلَىٰ عَذَابِ ٱلسَّعِيرِ

"جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ جو کوئی اس کے ساتھ تعلق رکھے گا وہ (شیطان) کسی کو گمراہ کرے گا اور اسے جہنم کے عذاب کا راستہ دکھائے۔" (سورۃ البقرۃ باب 22، آیت 4)

جو شخص شیطان کی مدد کرتا ہے وہ اس کا دوست اور ساتھی کہا جائے گا اگرچہ وہ خدا کو اپنی زبان سے یاد کر سکتا ہے [اور ظاہری انداز میں ایک اچھا اخلاقی اور مذہبی شخص ظاہر ہو سکتا ہے]۔

زبان سے الٰہی ذکر کافی نہیں ہے: اگر آپ یہ کہیں کہ ایک *حدیث* (نبوی کی روایت) کہتی ہے کہ ذکر الٰہی شیطان کو کسی سے دور کر دیتا ہے اور اس میں کسی پابندی اور شرط کا ذکر نہیں ہے اور یہ تمام مخصوص تفصیلات علماء الہیات نے ایجاد کی ہیں اور نبوی کی روایت اس (مخصوص) معلومات کو نہیں بتاتی ہے۔ اس اعتراض کا جواب کہ صرف زبان کے ذریعے الٰہی کی یاد موثر نہیں ہے، یہ ہے کہ میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ آپ کو بیرونی دلیل فراہم کرنے کے بجائے اپنے نفس کو دیکھنے کی دعوت دیتا ہوں۔ آپ کو دی جانے والی خبریں اور معلومات گواہی کی سطح پر نہیں ہیں اور آپ دیکھیں گے کہ میرا دعویٰ درست ہے یا نہیں۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ الٰہی کی یاد اور عبادت کا مقصد نماز (*نماز* یا ضروری روزانہ کی نمازوں کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی اختیاری نمازیں) ہیں۔ جب آپ دعا کریں تو اپنے دل کی کیفیت پر ایک نظر ڈالیں۔ شیطان آپ کے دل کو ان گنت جگہوں پر لے جاتا ہے - سڑکیں، گلیاں، بازار، تفریحی مراکز وغیرہ، اور آپ کے خیالات کو مختلف چیزوں میں منتقل کرتا ہے اور اسے بے شمار چیزوں کی اس حد تک یاد دلاتا ہے کہ وہ آپ کو ان چیزوں کی بھی یاد دلاتا ہے جن کے بارے میں آپ مکمل طور پر بھول گئے ہیں، اس سے حقیقی معنوں میں روحانی فوائد حاصل کرنے کے قابل ہونا ، جس میں سب سے اہم خدا کے ساتھ گہرا اندرونی تعلق پیدا کرنا اور اس کے نتیجے میں خدا کی گنوسس ہے۔

شیطان یقینا دعا کی حالت میں آپ کے دل پر حملہ کرتا ہے۔ [اس کے دوران کیا ہوتا ہے] یاد الٰہی اور عبادات کے دیگر اعمال کو نماز کے دوران پیش آنے والی صورت حال سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔ دعا دلوں کی وہ کسوٹی ہے جو دلوں کی قابل تعریف صفات اور عیبوں کو ظاہر کرتی ہے۔ دلوں کی دعائیں جو دنیاوی خواہشات کا مرکز بن چکی ہیں، قبول نہیں ہوتیں۔ اس طرح کی دعائیں شیطان کو دور نہیں کرتیں، بلکہ وہ [شیطان کی طرف سے] اشاروں اور قائل کرنے میں اضافے کے امکان کو آسان بناتی ہیں بالکل اسی طرح جیسے روک تھام کے بغیر ادویات نیکی سے

زیادہ نقصان پہنچاتی ہیں۔ اگر آپ شیطان سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے *تقویٰ* کی روک تھام اختیار کریں جو باطنی ہوں یا ظاہری برے کاموں میں ملوث ہونے سے روکیں، پھر اس کے بعد ذکر کی دوا استعمال کریں۔ شیطان تم سے اسی طرح ڈرے گا جس طرح وہ عمر رضی اللہ عنہ سے ڈرتا تھا۔ وہاب بن منبہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ سے ڈرو اور شیطان کو باہر سے برا نہ کہو جبکہ تم اس کی اطاعت کے معاملے میں اندر سے اس کے دوست ہو۔ ایک بزرگ نے کہا: "لوگوں کے لیے یہ حیرت کی بات ہے کہ وہ اپنے مہربان (خدا) کی نافرمانی کرتے ہیں حالانکہ وہ ان پر اس کی نعمتیں جانتے ہیں اور اس کی سرکشی کو جانتے ہوئے (شیطان) کی اطاعت کرتے ہیں"۔ جس طرح تم دعا کرتے ہو اور وہ قبول نہیں ہوتی حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ مجھے پکارو میں تمہاری پکار قبول کروں گا، اسی طرح شیطان تمہاری یاد کے باوجود تم سے دور نہیں ہٹتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں دعاؤں کی شرائط غائب تھیں اور یہاں ذکر الٰہی کی شرائط غائب ہیں۔ کسی نے ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ علیہ السلام سے بھی یہی سوال پوچھا کہ ہماری دعائیں قبول کیوں نہیں ہوتیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی قبولیت کا وعدہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: یہ اس لیے ہے کہ تمہارے دل مر چکے ہیں۔ انہوں نے پوچھا: ہمارے دلوں کی موت کی وجہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: تمہاری آٹھ صفات دل کی موت کا سبب بنی ہیں: پہلی بات یہ کہ تم نے اپنے اوپر خدا کے حقوق کو جان لیا لیکن تم نے اس کے حقوق پورے نہیں کیے۔ دوسری بات یہ کہ آپ قرآن پڑھتے ہیں لیکن اس کی حدود پر عمل نہیں کرتے [قابل قبول اور ناقابل قبول طرز عمل اور اعمال کے اندرونی اور ظاہری دونوں]۔ تیسری بات یہ کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا دعویٰ کرتے ہو لیکن تم اس کے راستے پر نہیں چلتے۔ چوتھی بات یہ کہ تم کہتے ہو کہ تم موت سے ڈرتے ہو لیکن تم اس کے لیے تیاری نہیں کرتے۔ پانچویں بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّ ٱلشَّيْطَٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَٱتَّخِذُوهُ عَدُوًّا

"بے شک شیطان تمہارا حقیقی دشمن ہے پس اسے اپنا دشمن سمجھ لو۔" (سورة البقرة باب 35 آیت 6)

لیکن تم نے گناہ کر کے اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے (حدود الٰہی کی خلاف ورزی کرنا)۔ چھٹا ، آپ جہنم کے خوف کا اظہار کرتے ہیں لیکن وہ اعمال کرتے ہیں جو آپ کے اس میں داخل ہونے کو یقینی بناتے ہیں۔ ساتویں بات یہ ہے کہ تم جنت کے خواہشمند ہو لیکن ایسے اچھے اعمال نہ کرو جو تمہیں وہاں لے جاتے ہیں۔ آٹھویں بات یہ ہے کہ جب آپ اپنے بستر سے اٹھتے ہیں تو آپ اپنی غلطیوں کو پیٹھ کے پیچھے رکھ دیتے ہیں اور دوسروں کے ساتھ خامیاں تلاش کرنے میں مصروف ہوجاتے ہیں۔ یہ تمام خصلتیں خدا کی ناراضگی کا سبب بنتی ہیں۔ ان کی موجودگی میں آپ کی دعاؤں کی قبولیت کی توقع کرنا بیکار ہے۔

وہیب بن الورد رحمہ اللہ کہتے ہیں: "ہمیں معلوم ہوا ہے کہ شیطان ایک مرتبہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے سامنے حاضر ہوا اور کہا: میں تمہیں نصیحت کرنا چاہتا ہوں۔ فرمایا: مجھے تمہاری نصیحت کی ضرورت نہیں ہے۔ تاہم ، مجھے انسانوں کے بارے میں کچھ بتائیں (یعنی ، آپ کس قسم کے انسانوں کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں)؟ آپ نے فرمایا: انسان کی تین قسمیں ہیں۔ ایک قسم کے لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ وہ ہم پر بہت سخت ہوتے ہیں۔ جب ہم ان کے پاس جاتے ہیں اور انہیں گناہ کی صورت حال میں پھنسا دیتے ہیں اور انہیں اپنے قابو میں لے لیتے ہیں تو وہ گناہوں کے ارتکاب کے بعد فورا توبہ چاہتے ہیں اور اس طرح وہ ہماری ساری محنت برباد کر دیتے ہیں۔ ہم دوبارہ سخت محنت کرتے ہیں ، اور وہ وہی چیز دوبارہ دہراتے ہیں (یعنی ، وہ اپنی غلطیوں پر توبہ کرتے ہیں)۔ ہماری حالت اتنی عجیب ہے کہ ہم نہ تو ان سے مایوس ہیں اور نہ ہی ہم ان کے ساتھ اپنا راستہ حاصل کرنے کے قابل ہیں۔ دوسری قسم کے انسان بچے کے ہاتھ میں گیند کی طرح ہوتے ہیں کیونکہ ہم انہیں اپنی مرضی کے مطابق موڑ سکتے ہیں۔ یہ لوگ

ہمیں ہماری محنت کا پورا بدلہ دیتے ہیں۔ تیسری قسم کے لوگ آپ کی طرح ہوتے ہیں – نیک طبیعت، معصوم اور گناہوں سے دور۔ ہم ان پر قابو نہیں پا سکتے'۔

شیطان کا انسانوں کے سامنے جسمانی طور پر ظاہر ہونا: یہاں سوالات پیدا ہوتے ہیں: "شیطان [بعض] لوگوں کے سامنے جسمانی طور پر کیسے ظاہر ہوتا ہے جبکہ وہ دوسروں کے سامنے ظاہر نہیں ہوتا ہے اور جب وہ ظاہر ہوتا ہے تو کیا یہ اس کی اصل ظاہری شکل یا استعاراتی شکل ہے؟ اگر یہ اس کی اصل شکل ہے تو ، یہ مختلف ظہور میں ظاہر ہوتا ہے اور اسے دو جگہوں پر دو مختلف ظہور میں کس طرح دیکھا جاتا ہے تاکہ دو لوگ اسے دو مختلف ظہور میں دیکھیں ؟" اس ضمن میں یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ شیطان اور فرشتوں کی ظاہری شکل حقیقی ہوتی ہے لیکن ہر کوئی ان کی حقیقی ظاہری شکل دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، بلکہ انہیں نبوت کے نور سے دیکھا جا سکتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرشتہ جبرائیل علیہ السلام کو ان کی حقیقی شکل میں صرف دو بار دیکھا، ایک بار آپ نے خود ان سے درخواست کی کہ وہ انہیں اپنی اصل شکل دکھائیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا کرنے کا وعدہ کیا اور کوہ حرا (مکہ میں) اپنی اصل شکل میں ظاہر ہوئے اور مغرب سے مشرق تک سارا افق ان کے وجود سے بھر گیا۔ دوسری مرتبہ آپ صلی اللہ *علیہ و آلہ و سلم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معراج کی رات سدرۃ المنتحہ* (ایک لوٹ کا درخت جو ساتویں آسمان کے اختتام کی نشاندہی کرتا ہے، وہ سرحد جہاں سے اسلامی عقائد کے مطابق کوئی مخلوق گزر نہیں سکتی) میں اپنی اصل شکل میں ظاہر ہوئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دیکھا۔ عام طور پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں انسانی شکل میں دیکھا ہے۔ جبرائیل علیہ السلام اکثر دحیٰ کلبی رضی اللہ عنہ کی شکل میں آتے تھے جو اپنی خوبصورتی کے لیے مشہور ہوتے *تھے*۔

زیادہ تر دل کے لوگوں میں *مکاشفہ* (روحانیت) اس طرح ہوتی ہے کہ ان کی اصل صورت کی مثال ان کے سامنے آجاتی ہے۔ چنانچہ شیطان جاگتی حالت میں ان کے سامنے آتا ہے۔ وہ اسے دیکھتے اور سنتے ہیں۔ حقیقی شکل کی یہ مثال اصل شکل کا متبادل بن جاتی ہے۔ بہت سے نیک لوگ اپنے خوابوں میں اس صورتحال کا سامنا کرتے ہیں [جاگنے کی حالت کے برعکس]۔ روحانی نقاب *کشائی* کرنے والا شخص وہ ہے جس کے خارجی حواس کا استعمال روحانی نقاب کشائی میں رکاوٹ نہیں بنتا۔ دوسرے لفظوں میں ، جو کچھ دوسروں کو خوابوں کے ذریعے معلوم ہوتا ہے وہ وہ جاگتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے خدا سے دعا کی کہ وہ اسے انسانی دل کے اندر وہ جگہ دکھائے جہاں شیطان رہتا ہے۔ اس کے بعد اس نے خواب میں انسانی جسم کو ایک شفاف شیشے کی طرح دیکھا جس کے ذریعے وہاں جو کچھ ہے اسے باہر سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اس نے شیطان کو ایک مینڈک کی شکل میں دیکھا جو کندھے کے جوڑ اور کان کے درمیان بائیں کندھے پر بیٹھا تھا۔ اس کے پاس ایک پتلا اور لمبا ٹرنک تھا جسے اس نے انسان کے دل میں ڈال دیا تھا اور اس کے ذریعے اشارہ کر رہا تھا۔ جب وہ شخص خدا کو یاد کرتا تھا تو شیطان اس کی ٹرک کو دل سے ہٹا دیتا تھا۔ بعض اوقات یہ مشاہدہ بیداری کے دوران ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روحانی نقاب کشائی کرنے والے کچھ لوگوں نے شیطان کو کتے کی شکل میں دیکھا ہے جو لاش پر لیٹا ہوا ہے اور لوگوں کو اس کی طرف مدعو کرتا ہے۔ لاش دنیا کی ایک مثال ہے۔ اس قسم کی گواہی اصل شکل کا متبادل ہے۔ یہ بات پہلے بھی بیان کی جا چکی ہے کہ دل کے دو رخ ہیں۔ ایک طرف کا رخ *عالم الملاکوٹ* یا فرشتوں کے دائرے کی طرف ہے - یہ طرف وحی الہامی (*وہی*)، الہام الہامی (*الہام*) اور روحانی نشانات اور اشارات (*اشعارات*) کا داخلی راستہ ہے۔ دل کا دوسرا رخ *عالم ظہیر* یا عالم ظاہری کی طرف ہے۔ تاہم ، چونکہ دونوں اطراف ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں ، لہذا فرشتہ کے دائرے کا سامنا کرنے والے پہلو کا اثر نظر آنے والے دائرے کا سامنا کرنے والی طرف دیکھا جاتا ہے۔

مرئی دائرے میں چیزیں ان کی سمجھے جانے والی شکلوں اور ظاہری شکل میں دیکھی جاتی ہیں کیونکہ پورا مرئی دائرہ قابل فہم ہے۔ ادراک میں یہ ممکن ہے کہ بیرونی حواس کے ذریعے سے کسی کے دل میں آنے والی شکل ان کی حقیقی فطرت کے مطابق نہ ہو۔ لہٰذا انسان بظاہر خوبصورت نظر آتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس کی ظاہری خوبصورتی باطنی خوبصورتی کے مطابق ہو۔ اندر سے کوئی بدصورت شخص ہو سکتا ہے۔ مرئی دائرہ صرف حقیقت کا ادراک ہے [حقیقت کے برعکس]۔ تاہم ، وہ شکل اور ظہور جو فرشتوں کے دائرے کی چمک اور چمک کے ذریعے فکر میں خود کو ظاہر کرتا ہے ، [ہمیشہ] اس کی حقیقی اندرونی فطرت کے تابع اور اس کے مطابق ہے۔ لہٰذا ، جو اندر بدصورت ہے وہ باہر سے برا نظر آئے گا۔ یہی وجہ ہے کہ شیطان کتے ، مینڈک اور سور کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے جبکہ فرشتے اچھی شکلوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ [خوبصورت] شکل [باطنی] معنی کی وجہ سے ہے اور باطنی کی حقیقی تصویر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خواب میں کسی کو کتے یا بندر کی طرح دیکھنا کسی کی اندرونی برائی کے بارے میں بحث کرتا ہے اور اسے بکری کے طور پر دیکھنا اس کے اچھے مزاج کے بارے میں بحث کرتا ہے۔ خوابوں کی تعبیر کے ساتھ ایسی ہی صورت حال ہے۔ یہ معاملہ دل کے رازوں سے متعلق ہے اور عملی روحانیت کے علم میں اس کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس موضوع کو یہاں لانے کی واحد وجہ یہ ہے کہ شیطان اور فرشتے کبھی دل کے لوگوں کو نیند میں ایک مثال اور تشبیہ کے طور پر ظاہر کرتے ہیں اور کبھی ان کی حقیقی حقیقت کے طور پر۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک مثال یا مماثل شکل دیکھی جاتی ہے جو داخلی حقیقت سے ملتی جلتی ہے۔ اگرچہ صورت ایک مثال یا تشبیہ ہے لیکن آنکھ سے اس کی گواہی حقیقی ہے لیکن اسے صرف روحانی نقاب کشائی کرنے والے لوگ ہی دیکھ سکتے ہیں جبکہ آس پاس کے لوگ اسے دیکھ نہیں سکتے۔ بالکل اسی طرح جیسے سونے والا شخص خواب دیکھ سکتا ہے جبکہ اس کے آس پاس کے لوگ [جو سو نہیں رہے ہیں] اسے دیکھ نہیں سکتے۔

دل کے اشارے ، توہم پرستی ، خطرات اور ارادے

دل کے اعمال جسمانی اعضاء کے ذریعہ عمل کرنے سے پہلے کئی مراحل سے گزرتے ہیں۔ دل میں سب سے پہلے جو چیز پیدا ہوتی ہے اسے "*خطیر*" یا فکر کہا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر، دل کسی ایسے شخص کے خیال کا تصور کرتا ہے جسے اگر کوئی دیکھنا چاہتا ہے تو مڑ کر دیکھا جا سکتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ دیکھنے کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے، یعنی اس کے مزاج میں ہوس متحرک ہو جاتی ہے۔ یہ خواہش سب سے پہلے اس خیال سے پیدا ہوتی ہے جسے جھکاؤ کہا جاتا ہے اور پہلے خیال کو "ادنیٰ نفس کی روایت" کہا جاتا ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ اس جھکاؤ کے لیے دل کی اجازت، مثال کے طور پر، اس شخص کو دیکھنے کے لیے دل کا حکم۔ کبھی کبھی دل کا جھکاؤ ہوتا ہے لیکن شرم اور خوف جیسی کچھ رکاوٹیں دل کو دیکھنے نہیں دیتیں۔ ان رکاوٹوں کو ہچکچاہٹ سے دور کیا جاتا ہے اور عقل فیصلہ کرتی ہے۔ اس عمل کو ایمان کہا جاتا ہے۔ چوتھی بات یہ ہے کہ کسی میں یہ دیکھنے کا پختہ عزم ہوتا ہے کہ کس کو عزم یا نیت کہا جاتا ہے۔ اس نیت کی بنیاد کبھی کمزور ہوتی ہے لیکن جب دل کی پہلی سوچ پر پوری طرح توجہ مرکوز ہو جاتی ہے تو یہ عزم پختہ ہو جاتا ہے، ارادہ مضبوط ہو جاتا ہے اور عزم غیر متزلزل ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات ارادے کی پختگی کے باوجود پچھتاوے کی وجہ سے عمل کرنے سے قاصر رہتا ہے، کبھی غفلت کی وجہ سے عمل پر توجہ نہیں پاتی، کبھی کوئی رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے جو کسی ارادے کے باوجود کسی ارادے کے عملی نفاذ سے روکتی ہے۔

عمل کرنے سے پہلے دل کی چار حالتیں: نتیجہ یہ ہے کہ عمل کرنے سے پہلے دل کی چار حالتیں ہوتی ہیں: ادنیٰ نفس کی روایت، دل کا میلان ، ایمان اور عزم۔ جہاں تک [پہلے] خیال یا "ادنیٰ نفس کی روایت" کا تعلق ہے، اس کا کوئی

احتساب نہیں ہے کیونکہ یہ انسان کے اختیار سے باہر ہے۔ یہی بات دل کے جھکاؤ پر بھی لاگو ہوتی ہے کیونکہ یہ حالت بھی کسی کے قابو میں نہیں ہوتی۔ ان دونوں حالتوں کا مطلب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد میں ہے کہ میری قوم کے لیے دل کے معاملات معاف کر دیے گئے ہیں۔ "نچلے نفس سے بیان" سے مراد وہ خیالات ہیں جو دل میں پیش آتے ہیں جن پر عمل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ ارادہ اور عزم وہ نہیں ہے جسے "نچلے نفس سے بیان" کہا جاتا ہے۔

دل کی تیسری کیفیت کو "یقین" کہا جاتا ہے، دوسرے لفظوں میں دل اس بات کا تعین کرتا ہے کہ کسی خاص عمل کو انجام دینا قابل قبول ہے۔ یہ عقیدہ یا تو شعوری (جان بوجھ کر اپنایا گیا) یا لاشعوری ہوسکتا ہے (کسی کی اپنی خواہش کے بغیر لاشعوری طور پر دل میں داخل ہونا)۔ [الہامی] حساب کتاب اور جوابدہی باشعور کے لیے ہے لیکن لاشعور کے لیے نہیں۔ دل کی چوتھی شرط یہ ہے کہ وہ کسی ایسے عمل کو انجام دینے کا ارادہ اور عزم ہے جو احتساب اور حساب کتاب کا ذمہ دار ہو۔ اگر کسی وجہ سے کوئی عمل کرنے سے قاصر ہے تو معلوم ہو جائے گا کہ اس عمل سے باز رہنا شرمندگی کی وجہ سے تھا یا خدا کے خوف کی وجہ سے۔ اگر شرم یا خوف خدا نے کسی کو اپنے ارادے کے عمل کو انجام دینے سے روکا تو اس کے لیے ایک نیک عمل لکھا جائے گا کیونکہ گناہ کرنے کا عزم گناہ ہے اور گناہ کی نیت پر عمل کرنے سے باز آنا اور اپنے نچلے نفس کی خواہشات کے خلاف جدوجہد کرنا ایک نیک عمل ہے۔ اگر کوئی شخص کسی گناہ کا ارتکاب کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، جو نچلے نفس کے اصرار سے زیر ہو جاتا ہے، تو یہ خدا کی پرہیز اور غفلت کی نمائندگی نہیں کرتا بلکہ [اس کے بجائے] اپنے نچلے نفس کے خلاف جدوجہد کرکے گناہ کے ارادے کو ترک کرنا یقینا ایک بہت بڑی بات ہے۔ اگر کوئی شخص شیطان کی پیروی کر کے گناہ کا ارادہ رکھتا ہے تو پھر اپنے [باطنی] رجحان کی مخالفت کر کے اس سے باز رہنا [اس طرح برائی اور برائی کے خلاف اندرونی روحانی کشمکش کرنا] وہ نیک عمل کا مستحق بناتا ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص کسی رکاوٹ کی وجہ سے برائی کا ارادہ نہ کر سکا تو اس کے لیے ایک برا کام لکھا جائے گا کیونکہ دل کی نیت اس کے قابو میں ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت جو اس بارے میں دلیل دیتی ہے وہ درج ذیل ہے:

قالت الملائكة عليهم السلام، رب ذاك عبدك يريد ان يعمل سيئة و هو ابصر به فقال: ارقبوه فان هو عملها فاكتبوها له بمثلها و ان تركها فاكتبوها له حسنة و انما تركها من جرائي

فرشتے خدا سے یہ کہتے ہیں: اے خدا! تمہارا یہ بندہ گناہ کرنا چاہتا ہے۔ [اگرچہ خدا کسی کے حالات کو کسی اور سے زیادہ جانتا ہے۔] وہ کہتا ہے: 'ایک پر نظر رکھو۔ اگر کوئی اپنی نیت پر عمل کرے تو اس کے اعمال کے برابر برے کام لکھے۔ اگر کوئی شخص اپنی نیت پر عمل کرنے سے باز رہتا ہے تو اپنے حساب کتاب میں ایک نیکی لکھ دے کیونکہ اس نے میری وجہ سے یہ گناہ چھوڑ دیا ہے۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *صحیح مسلم* حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے قول سے

ایک اور نبی روایت میں ہے:

انما يحشر الناس على نياتهم

"لوگ قیامت کے دن ان کے ارادے پر اٹھائے جائیں گے۔" (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *صحیح مسلم* ام سلمہ اور عائشہ رضی اللہ عنہا پر

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی چیز کی نیت کرتا ہے اور اس پر عمل کرنے سے پہلے مر جاتا ہے تو وہ اسی نیت پر مر جاتا ہے اور اس نیت پر جی اٹھے گا حالانکہ اس نے وہ گناہ نہ کیا ہو۔ اس بات کی وضاحت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مندرجہ ذیل روایت سے ہوتی ہے:

اذا التقى المسلمان بسيفيهما فالقاتل والمقتول في النار، فقيل يا رسول الله هذا القاتل فما بال المقتول، قال لانه اراد قتل صاحبه

"جب دو مسلمان تلواریں پھیلا کر ایک دوسرے کا مقابلہ کریں گے تو قاتل اور مقتول دونوں جہنم میں چلے جائیں گے۔" نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: یا رسول اللہ! قاتل کا جہنم میں جانا سمجھ میں آتا ہے لیکن مقتول (مقتول) جہنم میں کیوں جائے گا؟' اس نے جواب دیا: 'اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا ارادہ بھی دوسرے کو مارنا تھا'۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *احادیث* کا مجموعہ *صحیح بخاری* اور *صحیح مسلم* حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے ہے

اس وضاحت کے بعد کوئی یہ فرض نہیں کر سکتا کہ خدا دل کی نیت کا حساب نہیں رکھتا۔ اس سلسلے میں ، یاد رکھنے کا اصول یہ ہے کہ ہر ارادی ارادہ اور عزم حساب کتاب سے مشروط ہے۔ اس وضاحت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ایسے معاملات پر کوئی حساب کتاب اور احتساب نہیں ہے جو انسانی کنٹرول اور صلاحیت سے باہر ہیں۔ کچھ لوگ دل کے مختلف اعمال میں فرق نہیں کرتے اور دل میں آنے والی ہر چیز کو "نچلے نفس سے بیان" یا "خیال" کہتے ہیں۔ ان کی یہ رائے درست نہیں ہے۔ جب کہ تکبر، خود پرستی، دکھاوا، حسد وغیرہ دل کے اعمال دل کے اعمال ہیں اور آیات اور نبوی سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کا حساب کتاب اور احتساب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تمام اعمال جو بندے (یعنی انسان) کی استطاعت کے اندر ہوں گے ان کا حساب کتاب اور احتساب کا نشانہ بنایا جائے گا۔ لہٰذا اگر کسی غیر محرم عورت پر غیر ارادی طور پر نظر ڈالی جائے تو اس کا کوئی حساب نہیں ہے لیکن اگر دوسری نظر جان بوجھ کر اور جان بوجھ کر ڈالی جائے تو اس کا حساب کتاب کیا جائے گا۔ دل کے خیالات کی یہ حالت ہے۔ بلکہ یہ حساب اول دل کا ہونا چاہیے کیونکہ دل ہی اصل چیز ہے (یعنی دل انسان کی بنیاد اور حقیقت ہے)۔

اشاروں کی اقسام: اشاروں کی کئی قسمیں ہیں:

پہلی قسم – حق و حق کی طرف دعوت: ایک قسم یہ ہے کہ شیطان اسے [دلوں میں] داخل کرتا ہے تاکہ سچائی کو شک میں ڈال دے۔ مثال کے طور پر وہ کسی سے کہے گا کہ کسی کو دنیاوی لذتوں کو نہیں چھوڑنا چاہیے کیونکہ زندگی لمبی ہے اور طویل عرصے تک خواہشات پر قابو رکھنا ایک مشکل کام ہے جس میں بہت صبر کی ضرورت ہے۔ اس موقع پر اگر بندہ اللہ تعالیٰ کے بے پناہ حقوق، احکام اور دردناک سزاؤں پر غور کرے اور دل کو یہ سمجھاتا ہو کہ زندگی لمبی ہو سکتی ہے لیکن آخرت کے مقابلے میں یہ واقعی معمولی ہے اور تمام دنیاوی لذتیں عارضی اور عارضی ہیں اگرچہ بظاہر ان پر صبر کرنا مشکل ہے لیکن جہنم کی آگ کے مقابلے میں یہ بالکل بھی مشکل نہیں ہے۔ ان دونوں میں سے ایک یہ ضروری ہے کہ اگر کوئی شخص دنیاوی لذتوں پر صبر کرنے کی سختی کو برداشت کرے تو اسے جہنم کی سختی برداشت نہیں کرنی پڑے گی اور اگر دنیا پر صبر نہ کرے تو اسے آخرت کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس کے باوجود خدا کے وعدوں کی یاد اور یاد دہانی، تنبیہات اور ایمان اور یقین کی بحالی شیطان کو فرار ہونے پر مجبور کرتی ہے کیونکہ وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ گناہوں پر صبر کرنے سے جہنم کی آگ آسان ہے یا گناہوں کا ارتکاب جہنم کی طرف نہیں لے جاتا۔ اگر وہ اس طرح کے دعوے بھی کرے تو مومن بندہ اس طرح کے وعدوں پر [شیطان کی طرف سے] بھروسہ نہیں کرے گا کیونکہ اس کا خدا کی کتاب پر ایمان ہے۔ اسی طرح اگر وہ تکبر کرے کہ تم سے بڑھ کر خدا کی کوئی معرفت نہیں ہے اور نہ تمہاری عبادت کی کوئی مثال ہے اور یہ کہ تم اللہ کے ہاں بلند مقام رکھتے ہو۔ اس موقع پر خادم کو یہ سوچنا چاہیے کہ عرفان، عبادت، اعلیٰ روحانی مرتبہ، وہ تمام اعضاء جنہوں نے عمل کیا اور وہ تمام اعمال جن کے ذریعے اس نے عرفان حاصل کیا، یہ سب خدا کی مخلوقات ہیں اور اس کی دولت سے عطا کی گئی ہیں اور ان میں کسی کی کوئی ذاتی فضیلت نہیں ہے۔ اس سوچ کے بعد، خود راستبازی، تکبر، خود کی تعریف اور باطل کے لیے کوئی جگہ نہیں بچی ہے، اور شیطان کو ایک ذلت آمیز شکست

ملتی ہے کیونکہ وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ خدا کی تخلیقات نہیں ہیں۔ یہاں تک کہ اگر وہ یہ دعویٰ کرتا ہے تو ، ایک خادم کی گنوسس اور ایمان کبھی بھی کسی کو اس پر یقین کرنے کی اجازت نہیں دے گا۔ اس قسم کا الزام الٰہی یاد کے ذریعے نور ایمان اور عرفان اور خدا کے جاننے والوں کے دلوں سے مکمل طور پر مٹا دیا جاتا ہے۔

دوسری قسم – جذبات اور ہوس کو بھڑکانا: دوسری قسم کا اشارہ یہ ہے کہ شیطان ہوس کو بھڑکاتا ہے۔ یہ بھی دو طرح کی ہے۔ ایک یہ کہ بندہ ہوس کو یقین کے ساتھ گناہ ہونے کا احساس رکھتا ہے۔ دوسرا یہ کہ ایک غالب قیاس آرائی کے ذریعے اس کے بارے میں جانتا ہے۔ یقین کی صورت میں، شیطان ہوس کو بھڑکانے سے باز نہیں آئے گا، لیکن وہ اس اشتعال انگیزی کو موثر نہیں بنا سکے گا۔ اگر یہ یقینی نہیں ہے لیکن قیاس آرائی ہے، تو شیطان کا اشتعال مؤثر ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں ، اس کے خاتمے کے لئے روحانی جدوجہد کی ضرورت ہوگی۔ اس قسم کا اشارہ الہی یاد کے وقت مکمل طور پر ختم نہیں ہوتا ہے ، تاہم ، یہ بھی غالب نہیں ہوتا۔

تیسری قسم - گزرنے والے خیالات: تیسری قسم کا اشارہ صرف گزرنے والے خیالات اور پوشیدہ باتوں کی یاد ہے جو نماز کے دوران ہوتا ہے۔ چنانچہ جب کوئی ذکر الٰہی میں مشغول ہوتا ہے تو یہ گزرتے ہوئے خیالات تھوڑی دیر کے لیے ختم ہو جاتے ہیں پھر واپس آتے ہیں پھر ختم ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات گزرتے ہوئے خیالات کی آمد مسلسل اور مسلسل ہوتی ہے، اس طرح کہ ایسا لگتا ہے کہ خیالات اور الٰہی یاد ایک ہی زنجیر میں دو حلقے ہیں۔ یہ اس حد تک ہوتا ہے کہ بعض اوقات گزرتے ہوئے خیالات تلاوت کے معانی کے ساتھ بیک وقت آتے ہیں گویا دل میں دونوں کے لیے دو الگ الگ جگہیں ہوتی ہیں اور دونوں بیک وقت ایک ساتھ رہ سکتے ہیں۔ اس طرح کے اشارے کو مکمل طور پر کاٹنا مشکل ہے لیکن ناممکن نہیں کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من صلى ركعتين لم يحدث فيهما نفسه بشئ من امر الدنيا غفر له ما تقدم من ذنبه

"جو شخص دو چکر کی نمازیں اس طرح ادا کرے کہ نفس دنیاوی باتوں میں بات نہ کرے تو اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیے جائیں گے"۔

اگر دل میں کوئی اشارہ نہ ہونا ممکن نہ ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کا ذکر نہ کرتے۔ ہر دل کے ساتھ ایسا نہیں ہے کہ وہ کسی قسم کے اشارے سے پاک ہو بلکہ اس کا تصور صرف اس دل سے کیا جا سکتا ہے جس پر خدا کی محبت اس حد تک حاوی ہو کہ اس کے پاس کوئی دوسرا خیال نہیں آتا۔ جس طرح ایک سچے عاشق کے دل میں محبوب کے علاوہ کوئی اور خیال نہیں ہوتا، اسی طرح اگر کوئی دشمن کے بارے میں فکر مند ہو تو وہ اپنے خیال اور دشمن کو نقصان پہنچانے کے خیال میں اس قدر مگن ہو جاتا ہے کہ وہ نماز کے دوران بھی دور نہیں ہوتا اور نہ ہی اسے یاد ہوتا کہ اس نے نماز کے ہر چکر میں کتنی چکر پڑھی ہے اور کیا پڑھا ہے۔ یہ [اس طرح کے خیالات میں مشغولیت اور جذبہ] اس حد تک ہے کہ اگر کوئی وہاں سے گزرتا ہے تو اس پر بھی نظر نہیں آتا، حالانکہ آنکھیں کھلی ہوں اور راہگیر کی طرف دیکھ رہی ہوں۔ دنیاوی معاملات میں مشغولیت اس طرح ہو سکتی ہے کہ جہنم کا خوف اور جنت کی خواہش اس طرح کی مشغولیت کو فروغ دے گی [پھر ہم تصور کر سکتے ہیں کہ الٰہی محبت کتنی متوجہ ہو سکتی ہے]۔ تاہم ایمان کی کمزوری کی وجہ سے یہ حالت عام نہیں ہے۔

[اس بحث سے] نتیجہ یہ ہے کہ شیطان سے چند لمحوں کے لیے چھٹکارا حاصل کرنا ممکن ہے لیکن پوری زندگی کے لیے نہیں۔ اگر کوئی شیطان کے طعنے اور اشتعال انگیزیوں سے محفوظ اور محفوظ رہ سکتا تھا تو وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم شخصیت ہوتی، لیکن روایت ہے کہ نماز کے دوران جب اس کی نظر اس کے کپڑوں پر کچھ نمونوں اور نقشوں پر پڑی تو نماز پڑھنے کے بعد وہ کپڑے پھینک دیتے اور کہا:

شغلتني عن الصلاة اذهبوا بها الى ابي جهم

"اس [لباس] نے مجھے نماز سے مشغول کیا لہذا اسے ابو جہم (صحابی نبوی جنہوں نے لباس تحفے میں دیا تھا) کے پاس واپس لے جاؤ۔

اسی طرح کا واقعہ سونے کی انگوٹھی کے ساتھ پیش آیا جس کے نتیجے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پھینک دیا (*حدیث* نسائی نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے *روایت* کی ہے)۔ لباس اور سونے کی انگوٹھی پر ڈیزائن کے نمونوں کی وجہ سے [نمازوں کے دوران نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خدا پر پوری توجہ دینے سے روکنا] شیطان کے اشارے کا ایک عمل تھا۔ یاد رہے کہ سونے کی انگوٹھی کا واقعہ انسانوں کے لیے سونے کی ممانعت سے پہلے پیش آیا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے کی انگوٹھی اس لیے پہنی تھی کہ اس وقت اس کی ممانعت سے پہلے اس کی اجازت تھی۔ اس نے اسے اس لیے اتار دیا کیونکہ یہ دنیاوی جائیدادوں اور جائیدادوں سے متعلق اشاروں اور اشاروں کو خود سے ہٹا کر ہی ختم کیا جا سکتا ہے۔

جب تک کسی کے پاس ضرورت سے زیادہ جائیدادیں ہوں گی ، شیطان یقینا کسی کو الزام میں ڈالے گا حالانکہ وہ اضافی قبضہ صرف *ایک درہم* یا *دینار* (بالترتیب پرانی سونے اور چاندی کی کرنسی) ہے۔ اس صورت میں اشارے کی شکل یہ ہوگی کہ شیطان انسان کو ان کی حفاظت کے بارے میں پریشان اور پریشان رکھے گا اور اسے کہاں خرچ کرے گا اور اسے کیسے چھپانا ہے تاکہ دوسرے اس کی موجودگی کے بارے میں نہ جان سکیں یا اسے اس طرح ظاہر نہ کریں کہ لوگ کسی کی برتری کو قبول کر لیں۔ یہ اور ان جیسے دیگر اشارے کسی کو پریشان رکھیں گے۔ جو شخص لالچ کے پنجوں سے مادی مال کی لاش کو پکڑ کر شیطان سے بچنا چاہتا ہے وہ اس شخص کی مانند ہے جو شہد میں گر گیا ہے اور مکھیوں سے توقع کرتا ہے کہ وہ کسی پر نہ بیٹھے۔ یہ صرف ایک دروازہ نہیں بلکہ ان گنت دروازے ہیں جن سے شیطان کے لشکر جو اشاروں کے بوجھ سے لدے ہوئے ہیں، مسلسل اور مسلسل اندر آتے ہیں اور باہر جاتے ہیں۔ ایک حکیم نے کہا ہے کہ شیطان گناہ کے راستے سے انسان کے پاس آتا ہے۔ اگر یہ راستہ بند ہو جائے تو وہ نصیحت کا راستہ اختیار کرتا ہے اور اس کو ہدایت الٰہی سے انحراف کرنے والے کاموں میں ملوث کرتا ہے۔ اگر وہ راستہ بند ہو جائے تو شیطان انسان کو مصیبتوں، تنگدستی اور انتہا پسندی کی راہ پر لے جاتا ہے کہ وہ اپنے لیے ایسی چیزوں کو بھی حرام کر دیتا ہے جو حرام نہیں ہیں۔ اگر کوئی اس راستے کو بھی بند کر دیتا ہے تو شیطان وضو (*وضو*، یعنی رسمی دعاؤں کی روحانی حالت میں داخل ہونے کے لیے جسمانی تطہیر کی ضرورت ہے) اور دعاؤں کے بارے میں شکوک و شبہات میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی اس راستے کو بھی بند کر دیتا ہے تو شیطان نیک اعمال کو آسان بنا دیتا ہے۔ جب لوگ کسی کو پرہیزگار، بردبار، معصوم اور اخلاقی راستبازی کا مالک سمجھنے لگتے ہیں تو شیطان نفس پرستی، خود کی حمد، خود کی تعظیم اور فضول (عجوب) *میں ملوث ہو جاتا ہے* اور اس سے اسے تباہ کر دیتا ہے۔ یہاں شیطان اپنی طاقت اور طاقت میں اپنا سب کچھ خرچ کرتا ہے ، کیونکہ یہ اس کا آخری موقع ہے جسے وہ ضائع نہیں کرنا چاہتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر وہ اسے کھو دیتا ہے تو ، اس کا شکار اس کے [شکار] جال میں پھنس نہیں جائے گا اور اس کے بجائے ، سیدھے جنت میں جائے گا۔

اس سلسلے میں دل اور دل کی اقسام میں تیزی سے تبدیلیاں

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے ، دل مختلف متضاد خصوصیات سے گھرا ہوا ہے۔ یہ ایک ایسے ہدف کی طرح ہے جس پر چاروں طرف سے تیروں کا طوفان چلایا جاتا ہے۔ اگر کسی چیز کا اس پر اثر پڑتا ہے تو کچھ اور آتا ہے اور اس کا اثر ختم کر دیتا ہے۔ شیطان اسے نچلے نفس کی خواہشات کی طرف کھینچتا ہے۔ فرشتہ اسے مخالف سمت میں کھینچتا ہے۔ ایک شیطان اسے ایک برائی کی طرف کھینچتا ہے اور دوسرا شیطان اسے دوسری برائی کی طرف کھینچتا ہے۔ اسی طرح ایک فرشتہ اسے ایک نیکی کی طرف بلاتا ہے اور دوسرا فرشتہ اسے دوسرے کے لیے بلاتا

ہے۔ کبھی وہ دل دو فرشتوں کے درمیان اور کبھی دو شیطانوں کے درمیان اور کبھی فرشتہ اور شیطان کے درمیان کشمکش میں شامل ہوتا ہے۔ اس میں سکون کا کوئی لمحہ نہیں ہوتا ہے اور جب یہ پہلے سے مصروف نہیں ہوتا ہے۔ مندرجہ ذیل شلوک دل کی اسی کیفیت کی طرف اشارہ کرتا ہے:

وَنُقَلِّبُ أَفْئِدَتَهُمْ وَأَبْصَـٰرَهُمْ

"اور ہم ان کے دلوں اور آنکھوں کو پھیر دیں گے۔" (سورۃ البقرۃ القرآن آیت 6، آیت 110)

اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دل کے عجائبات میں خدا کی حیرت انگیز تخلیق سے واقف تھے اور اس بات سے آگاہ تھے کہ جسم کا یہ ٹکڑا ہمیشہ ایک عارضی اور فانی اور ہمیشہ بدلتی ہوئی حالت میں رہتا ہے۔ اسی لیے وہ قسمیں کھایا کرتے تھے:

ومقلب القلوب

"میں دل بدلنے والے کی قسم کھاتا ہوں۔" (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے صحیح بخاری عن صحابی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ

وہ مندرجہ ذیل دعائیں کثرت سے کرتے تھے:

يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوبِ ثَبِّتْ قَلْبِي عَلَى دِينِكَ

"اے دلوں کو بدلنے والے! میرے دل کو تیرے راستے پر ثابت قدم رکھے۔"

لوگوں نے ان سے پوچھا: یا رسول اللہ! کیا آپ کو بھی اپنے دل کے بارے میں خدشات ہیں؟" آپ نے فرمایا:

ومايومنني والقلب بين اصبعين من اصابع الرحمٰن يقلبه كيف يشاء

میں کس وجہ سے بے خوف ہو جاؤں جب کہ دل رحمان (خدا) کی دونوں انگلیوں کے درمیان ہے جو اسے جس طرح چاہتا ہے پلٹ سکتا ہے؟

دل کی تبدیلی اور اس میں خدا کے اسرار کا ادراک صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس پر ہمیشہ چوکس رہتے ہیں اور مسلسل غور و فکر کی حالت میں رہتے ہیں۔

دل کی تین قسمیں اس کی تبدیلی اور استحکام کے لحاظ سے: دل کی تین قسمیں ہیں جو نیکی یا برائی پر اس کے استحکام کے لحاظ سے ہیں یا ان دونوں کے درمیان ہچکچاہٹ کا شکار ہیں:

تقویٰ، تقدس اور خوف اللہ کے نور سے بھرا ہوا دل: ایک دل ایسا ہے جو تقویٰ، تقدس اور خوف کی روشنی سے بھرا ہوا ہو اور تمام گھٹیا اور گھناؤنی باطنی خصوصیات سے پاک ہو جائے۔ اس قسم کا دل غیب عالم کے خزانوں اور فرشتوں کے عالم سے اچھے خیالات حاصل کرتا ہے۔ عقل ان کی نزاکتوں ، پیچیدگیوں ، رازوں اور فوائد کو سمجھنے کے لئے ان پر غور کرتی ہے۔ جب بصیرت کی روشنی کسی چیز کو اچھی طرح ظاہر کرتی ہے تو عقل اس کی اہمیت کا فیصلہ کرتی ہے اور دل کو اس پر عمل کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ جب فرشتہ (دل میں نور الٰہی لانے کا ذمہ

دار) دیکھتا ہے کہ دل کا جوہر پاک اور پاک ہو گیا ہے تو عقل اور عقل کی روشنی نے اسے روشن کر دیا ہے، خدا کے خوف کی روشنی کی شعاعیں ہر جگہ گر رہی ہیں اور الٰہی کی شہوت کا چراغ جل رہا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسا دل فرشتوں کا ٹھکانہ ہے جہاں وہ اترتے ہیں اور رہتے ہیں، پھر فرشتہ غیب کے لشکروں کی مدد کرتا ہے اور بہت سے نیک اعمال پر عمل کرنے میں مدد کرتا ہے یہاں تک کہ صداقت اور اعمال جو اس کی پرورش کرتے ہیں، فطری دوسری فطرت بن جاتے ہیں جیسا کہ خدا فرماتا ہے:

فَأَمَّا مَنْ أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ ﴿٥﴾ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَىٰ ﴿٦﴾

فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرَىٰ ﴿٧﴾

"پس جس نے (اپنے رب کی رضامندی کے طلب) میں خرچ کیا اور پرہیزگاری کی اور پرہیزگاری کی اور سچائی پر ایمان لائے تو ہم اس کے لیے آسانی پیدا کریں گے۔" (سورۃ البقرۃ باب ۹۲، آیت ۵-۷)

ایسے دلوں میں ربوبیت کے دربار سے بے پناہ روشنی ہوتی ہے کہ پوشیدہ شرک جیسی لطیف برائیاں بھی آنکھوں سے پوشیدہ نہیں رہتیں، یہ ایک سیاہ سیاہ چیونٹی سے زیادہ لطیف ہے جو سیاہ رات میں رینگتی ہے [اس طرح کسی بھی چیز کے بارے میں حساسیت جو ذرا بھی حد تک گھناؤنی یا منفی ہے، اس کے خلاف ہراول دستے کے طور پر کام کرتی ہے]۔ شیطان کا فریب ایسے دلوں پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ وہ اپنی نفیس باتوں سے دھوکہ دینے اور دھوکہ دینے کی پوری کوشش کرتا ہے لیکن بندہ (خدا کا نیک شخص) اس پر ذرا بھی توجہ نہیں دیتا۔ ایسا دل *باطنی تخریبی صفات (مہلک* یا مہلک باطنی صفات جو کسی کے دل اور روح کو تباہ کرنے کا باعث بنتی ہیں) کو ختم کرنے کے بعد نجات بخش اور مبارک باطنی صفات (*منجیات*) سے مزین ہو جاتا ہے۔ ان نجات دہندہ باطنی خصوصیات میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا (اس کی بے شمار نعمتوں کے لیے جو بغیر کسی سوال کے سب کو عطا کی گئی ہے)، صبر [تمام مصیبتوں کے خلاف کیونکہ یہ کسی کو روحانی شعور کی اعلیٰ سطحوں پر لے جاتا ہے]، تقویٰ خوف، خدا سے تعظیم اور خوف (*تقویٰ*)، خدا کی طرف سے امید اور امید، روحانی غربت (ہر حال میں خدا کی حاجت)، مادہ پرستی سے پرہیز، خدا سے محبت، حکم الٰہی سے قناعت کرنا، خدا کی بے تابی اور محبت اور اس کے ساتھ رہنے کی خواہش (*شوق*)، خدا پر توکل *(توکل)*، خدائی تخلیق کردہ عجائبات اور اسرار پر گہری غور و فکر تاکہ الہی محبت کو ابحال کیا جا سکے۔) عبادت الٰہی میں اپنی کوتاہیوں پر اپنے آپ کو سزا دینا، اطاعت اور روحانی راہ میں اپنی زندگی کے اصل مقصد کے حصول کے لیے جدوجہد *کرنا*، وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ کی توجہ ایسے دل پر ہے اور یہی وہ دل ہے جس کا ذکر ذیل کی آیت میں کیا گیا ہے:

أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ

"بے شک دل اللہ کے ذکر میں سکون پاتے ہیں۔" (سورۃ البقرۃ ۱۳، آیت ۲۸)

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿٢٧﴾ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿٢٨﴾

"اے پرسکون روح جو ابدی سکون اور سکون میں قائم ہے! اپنے رب کی طرف لوٹ جاؤ اس حالت سے کہ تم اس سے راضی ہو جاؤ اور وہ تم سے راضی ہو جائے۔ (سورۃ البقرۃ سورۃ البقرۃ آیت نمبر 89 آیت 27 تا 28)

نچلے نفس کی خواہشات سے بھرا ہوا دل: دوسری قسم کا دل پہلی قسم کے برعکس ہے۔ دوسرے لفظوں میں ، یہ نچلے نچلے نفس کی خواہشات سے بھرا ہوا ہے اور قابل مذمت عادات [اور رجحانات] سے داغدار ہے۔ اس دل کے دروازے شیطان کے لیے کھلے ہیں اور فرشتوں کے لیے بند ہیں۔ اس قسم کے دل میں برائی کا آغاز نچلے نفس کی خواہش کا تصور کرنے کے ساتھ ہوتا ہے ، اس کے بعد گناہ اور برائی میں ملوث ہونے میں ہچکچاہٹ ہوتی ہے۔ دل حکمران سے مشورہ کرتا ہے جو عقل ہے۔ چونکہ عقل پہلے ہی ادنیٰ نفس کا غلام رہا ہے اور اس سے بہت متاثر اور

منسلک ہے، اس لیے وہ اپنے حق میں فیصلہ کرتا ہے اور جواز کے لیے ذرائع فراہم کرتا ہے [جس چیز پر غور کیا جا رہا ہے جو غلط، گھناؤنا اور نقصان دہ ہے]۔ اس طرح نچلی نفس (*نفس*) دل کو پکڑ لیتا ہے [اور اس پر مکمل کنٹرول حاصل کرتا ہے] جو اس کے گناہ میں مدد کرتا ہے۔ انسان کا دل نچلے نفس کی خواہشات کے سامنے کھل جاتا ہے اور لالچ کا اندھیرا ہر طرف پھیلنے لگتا ہے کیونکہ عقل کی فوج پہلے ہی اپنی مزاحمت کی طاقت کھو چکی ہے اور اپنا مکمل کنٹرول نچلے نفس کے حوالے کر چکی ہے [جو فطری طور پر غلط اور برائی کی طرف مائل ہے]۔ شیطان کی سلطنت کا دائرہ مزید پھیلا ہوا ہے، جو دل کو ظاہری اسراف، دھوکہ دہی اور دھوکہ دہی اور جھوٹی امیدوں میں الجھاتا ہے اور اس طرح کے دیگر معاملات میں پھنساتا ہے۔ اس کے نتیجے میں ایمان کی حاکمیت کمزور ہو جاتی ہے اور یقین کا روشن چراغ بجھ جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں خدا کے وعدوں، جنت اور جہنم اور آخرت پر ایمان اور یقین کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ادنیٰ نفس کی خواہشات دھوئیں کی مانند ہیں جو دل کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں اور ایمان اور یقین کا چراغ بجھا دیتے ہیں۔ عقل ایسی کیفیت میں آجاتی ہے جیسے کسی شخص کی آنکھ دھوئیں سے بھر جاتی ہے اور وہ دیکھنے کی صلاحیت کھو دیتی ہے۔ خواہشات کا غلبہ دل سے اس کی سوچنے اور غور و فکر کرنے کی صلاحیت اور اس کی بصیرت کو دور کر دیتا ہے اور وہ (دل) ہدایت سے اس قدر غافل ہو جاتا ہے کہ اگر کوئی نصیحت کرنے والا کسی اچھی چیز کے بارے میں نصیحت کرنا چاہتا ہے تو وہ اس کو سمجھنے سے قاصر بھی نہیں ہوتا۔ مندرجہ ذیل اشعار ایک ہی دل کی طرف اشارہ کر رہے ہیں:

أَرَءَيْتَ مَنِ ٱتَّخَذَ إِلَٰهَهُۥ هَوَىٰهُ أَفَأَنتَ تَكُونُ عَلَيْهِ وَكِيلًا ﴿٤٣﴾

أَمْ تَحْسَبُ أَنَّ أَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُونَ أَوْ يَعْقِلُونَ ۚ إِنْ هُمْ إِلَّا كَٱلْأَنْعَٰمِ ۖ بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيلًا ﴿٤٤﴾

"اے نبی! کیا تم نے اس شخص کا حال دیکھا ہے جس نے اپنی خواہشوں سے نیچی نفس سے معبود بنایا ہے (گویا وہ کسی معبود کو سجدہ کر رہا ہے)؟ تو کیا آپ ایسے شخص پر نظر رکھ سکتے ہیں [اپنے آپ کو نقصان پہنچانے سے بچانے کے لئے]؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ اکثر لوگ سنتے اور سمجھتے ہیں [نہیں، بلکہ] وہ بالکل چوپایوں کی طرح ہیں، بلکہ [صحیح] راستے سے زیادہ انحراف کرتے ہیں [کیونکہ وہ صحیح اور غلط، فائدہ مند اور نقصان دہ اور نقصان دہ کو دیکھنے کی صلاحیت سے بھی محروم ہیں]۔ (سورة البقرة باب 25، آیت 43-44)

لَقَدْ حَقَّ ٱلْقَوْلُ عَلَىٰٓ أَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ

"ان میں سے اکثر پر ثابت ہو چکا ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔" (سورة البقرة باب 36، آیت 7)

سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ

"اے پیغمبر! اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ انہیں (غلط کاموں کے بارے میں) خبردار کریں یا نہ کریں، وہ [حق پر] ایمان نہیں لائیں گے۔ (سورة البقرة باب 2 آیت 6)

بعض دلوں کی ہر قسم کی ہوس میں ایک ہی حالت ہوتی ہے، کچھ بعض خواہشات میں الجھ جاتے ہیں اور کچھ کسی ہوس کے قریب بھی نہیں جاتے۔ مثال کے طور پر کچھ لوگ عام گناہوں سے دور رہتے ہیں لیکن جب وہ ایک خوبصورت چہرہ دیکھتے ہیں تو وہ اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ پاتے اور عقل کو پیچھے چھوڑ کر اس سے متعلق برائیوں میں الجھ جاتے ہیں۔ کچھ لوگ طاقت، شہرت اور مقام کے لیے اتنے بھوکے ہوتے ہیں کہ جب اس کے حصول کا موقع ملتا ہے تو وہ اس کے پیچھے پاگل ہو کر بھاگ جاتے ہیں۔ کچھ لوگ اپنی غلطیوں کے بارے میں نہیں سن سکتے اور ان کی توہین کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اگر کوئی [ان کے خلاف] ایک لفظ بھی کہتا ہے تو وہ غصے سے غصے میں آجاتے ہیں۔ بعض لوگ تقویٰ اور طہارت کا خیال رکھتے ہیں لیکن جب پیسے کا معاملہ ہوتا ہے تو وہ خدا پرستی اور سربلندی کے تمام لباس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں اور مال و مال پر اس طرح گر پڑتے ہیں جیسے کتے کی ہڈی پر چھلانگ لگاتے ہیں۔ یہ تمام گناہ ان دلوں سے ہوتے ہیں جو نفس کی طرف سے ضدی غلط حماقت

کے دھوئیں میں لپٹے ہوئے ہیں، باطنی بصیرت کی چمک کم ہو جاتی ہے، شرمندگی [یا حیا جو ہر قسم کی بے حیائی اور مکروہ کے خلاف اخلاقی روک تھام کا کام کرتی ہے] اور ایمان ختم ہو جاتا ہے، اور یہ لوگ شیطان کے مقصد اور مقصد کی تکمیل میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

ہوس اور ایمان کے درمیان دل: تیسری قسم کے دل میں ایسے خیالات پیدا ہوتے ہیں جو ضدی غلط دماغ کی حماقت یا نچلے نفس کی خواہشات سے پیدا ہوتے ہیں جو اسے برائی کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی، ایمان [ابدی حقیقتوں میں] کے خیالات آتے ہیں اور اسے نیکی اور راستبازی کی دعوت دیتے ہیں۔ ادنیٰ نفس اپنی تمام تر خواہشات کے ساتھ برے خیالات کی طرف مائل ہوتا ہے، خواہشات کو بھڑکاتا ہے، اور لذت اور راحت کی فضیلت بیان کرتا ہے۔ عقل صداقت کے خیالات میں مدد کرتی ہے، خواہشات پر تنقید کرتی ہے اور نچلے نفس کو بتاتی ہے کہ یہ [غور و فکر کیا جا رہا ہے] جہالت کا کام ہے اور جانوروں اور جنگلی درندوں کے اعمال سے مشابہت رکھتا ہے کیونکہ وہ نتائج کی پرواہ کیے بغیر برائی پر گر پڑے۔ اگر نفس عقل کی نصیحت کی طرف مائل ہوتا ہے تو شیطان نچلے نفس کا تعاقب چھوڑ دیتا ہے اور عقل کے پیچھے چلا جاتا ہے اور اس طرح یہ ہوس سے جڑے عوامل کو تقویت دیتا ہے۔ شیطان عقل سے کہتا ہے: "تم اپنے نفس کو بے وجہ کیوں تنگ کرتے ہو؟ آپ نے اپنی خواہشات کو کیوں ایک طرف رکھ دیا؟ کیا آپ کے ہم عصروں میں کوئی ایسا شخص ہے جو کسی کی خواہشات کے خلاف ہو اور کسی کی ضروریات کو ترک کر دے؟ انہیں دنیاوی لذتوں میں ان کا حصہ مل رہا ہے اور تمہاری قسمت میں صرف تنگی ہے۔ وہ خوش قسمت ہیں جبکہ آپ محروم ہیں، بدقسمت ہیں، مصیبتوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ دنیا کے لوگ آپ کا مذاق اڑاتے ہیں اور دوسروں کی مثالیں دیتے ہیں جنہوں نے اس راستے پر چلتے ہیں جس پر میں نے چلنے کے لئے کہا تھا اور عظیم عہدوں کو حاصل کیا ہے۔ آپ ان کے نقش قدم پر کیوں نہیں چلتے؟ کیا تم نے فلاں علماء کو نہیں دیکھا کہ وہ فلاں کام کرتے ہیں اور اگر یہ برے کام تھے تو وہ (مقدس و دینی لوگ) ایسا کیوں کرتے؟ [اس زبردستی اور بظاہر منطقی اور قائل کرنے والے قائل کرنے کے نتیجے میں،] نچلے نفس شیطان کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اسی موقع پر فرشتہ نچلے نفس کا راستہ روکتا ہے اور اسے بتاتا ہے: "ایک شخص جو حال کی لذتیں حاصل کرنے کے لیے تمام معاملات کے حتمی نتائج اور انجام سے غافل ہو جاتا ہے، وہ تباہ ہو جاتا ہے۔ کیا آپ ان [عارضی دنیاوی] لذتوں پر بھروسہ کرنے کی وجہ سے جنت کی دائمی نعمتوں اور خوشیوں کو چھوڑنے کے لئے تیار ہیں جو صرف چند دنوں تک رہیں گے؟ کیا تم جہنم کے عذاب کو خواہشوں پر صبر کرنے سے آسان سمجھتے ہو؟ لوگوں کی پیروی نہ کریں اور شیطان سے دھوکہ نہ کھائیں۔ دوسرے لوگوں کے گناہ آپ کی سزا کے درد کو کم نہیں کر سکتے۔ اگر شدید گرمی اور گرمی کی لہر کے وقت آپ کو آرام دہ اور ٹھنڈا گھر مل جائے تو کیا آپ اب بھی ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے [جو عارضی دنیاوی لذتوں سے لطف اندوز ہونے میں مصروف ہیں] یا اس گھر کو ترجیح دیں گے جہاں جسم سورج کی گرمی کی شدت سے پگھلتے نہ ہوں اور جہاں ہوا کے گرم جھونکوں سے جسم کو سوزش نہ ہو؟ دنیا میں تمہاری حالت ایسی ہے کہ تم سورج کی گرمی برداشت نہیں کر سکتے۔ تم اس میں کھڑے نہیں ہو سکتے تو پھر یہ معلوم نہیں ہے کہ تمہیں جہنم سے ڈرنے سے کیا روکا جا رہا ہے؟ کیا جہنم کی گرمی سورج کی گرمی سے کم ہے؟" اس نصیحت سے نفس فرشتہ کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ فرشتہ اور شیطان کے درمیان کشمکش اور کشمکش جاری ہے اور اس کشمکش میں اپنی زندگی کے سنگ میل کا احاطہ کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات شیطانی صفات غالب ہو جاتی ہیں اور نچلے نفس کا مکمل طور پر شیطان کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور اس کا ساتھی اور مددگار بن جاتا ہے۔ یہ رحمان (خدا) کی جماعت سے بچتا ہے اور وہ تمام اعمال انسان کے جسمانی اعضاء کے ذریعے کیے جاتے ہیں جن پر پہلے سے طے شدہ مقدر میں مہر لگا دی گئی ہے اور یہ اعمال ایسے ہیں جو خدا سے دور ہو جاتے ہیں۔ جب فرشتوں کے عالم کی [شرافت] صفات غالب آجاتی ہیں تو نفس شیطان کے جال میں نہیں پھنستا اور اس کے فریب کو ختم نہیں کرتا۔ کوئی شخص آخرت کے معاملات میں سستی کا مظاہرہ نہیں کرتا بلکہ رحمان کی جماعت (خدا) کے سامنے سجدہ کرتا ہے اور اس طرح کے اعمال اس کے جسمانی اعضاء سے کیے جاتے ہیں جو خدا کی قبولیت اور قبولیت کا باعث بنتے ہیں۔ یہ بھی پہلے سے طے شدہ تقدیر کے مطابق ہوتا ہے۔ مذکورہ بالا نبوت کی روایت کہ "مومن کا دل رحمان (خدا) کی دو انگلیوں کے درمیان ہوتا ہے" اسی کشمکش کی طرف اشارہ کرتا ہے جو دونوں مخالفین کے درمیان جاری ہے۔ ایسے دل [دو] گروہوں میں سے کسی ایک کی طرف مستقل طور پر مائل نہیں ہوتے بلکہ اس کے بجائے ایسے دلوں میں انقلاب اور تبدیلی کا عمل جاری رہتا ہے [کیونکہ وہ نیکی اور برائی کی قوتوں کے درمیان ایک مشکل جدوجہد اور جنگ کے میدان ہیں]۔

اطاعت اور احکام کی خلاف ورزی سب غیب کے خزانوں سے مادی وجود کے دائرے میں ظاہر ہوتے ہیں اور دل ان کو لانے کا ذریعہ بن جاتا ہے کیونکہ دل غیب اور ماورائی فرشتوں کے خزانوں کا خزانہ ہے۔ دل کے لوگ اس ظاہری شکل کو تقدیر کی گہری تفہیم حاصل کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ جن لوگوں کو جنت کے لیے پیدا کیا گیا ہے انہیں اطاعت کے ذرائع فراہم کیے گئے ہیں اور جن کو جہنم کے لیے بنایا گیا ہے ان کو نافرمانی کے ذرائع فراہم کیے گئے ہیں اور برے دوستوں کی صحبت فراہم کی گئی ہے اور ان کے دلوں میں شیطانی اشارے پیدا کیے گئے ہیں۔

شیطان خدائی رحمت اور فیاضی کا حوالہ دے کر لوگوں کو بے وقوف بناتا ہے۔ وہ انہیں یہ بھی بتاتا ہے کہ بہت ساری زندگی باقی ہے اس لیے گناہ کرتے رہو پھر توبہ کرو [بعد میں لمبی عمر کے اختتام پر]۔ وہ ان سے یہ بھی بتاتا ہے کہ خدا ترس لوگوں کی کوئی کمی نہیں ہے اور اگر آپ ان کے راستے کی مخالفت کرتے ہیں تو کچھ برا نہیں ہوگا۔ قرآن مجید نے ان کے [جھوٹے اور گمراہ کن] وعدوں کی ایک درست تصویر پیش کی ہے:

يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيهِمْ ۖ وَمَا يَعِدُهُمُ ٱلشَّيْطَٰنُ إِلَّا غُرُورًا

"شیطان ان سے وعدے کرتا ہے اور ان کو لالچی بناتا ہے اور شیطان ان سے صرف جھوٹے وعدے کرتا ہے۔" (سورۃ البقرۃ سورۃ البقرۃ آیت 120)

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ توبہ کا وعدہ کرتا ہے اور معافی کی امیدیں بیدار کرتا ہے اور ایسے بہانے اور سازشوں سے لوگوں کو تباہ کر دیتا ہے۔ لوگ شیطان کے فریب سے متاثر ہو جاتے ہیں اور اس کے دلائل کو قبول کرتے ہیں اور اس کے نتیجے میں ان کے دل ابدی تقدیر کی ہدایات سے تنگ ہو جاتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

فَمَن يُرِدِ ٱللَّهُ أَن يَهْدِيَهُۥ يَشْرَحْ صَدْرَهُۥ لِلْإِسْلَٰمِ ۖ وَمَن يُرِدْ أَن يُضِلَّهُۥ

يَجْعَلْ صَدْرَهُۥ ضَيِّقًا حَرَجًا كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِى ٱلسَّمَآءِ

"پس جس کے لیے اللہ تعالیٰ ہدایت دینا چاہتا ہے اس کے دل کو خدا کی رضا کے تابع ہونے کی طرف کشا دیتا ہے اور جس کے لیے اللہ تعالیٰ گمراہ کرنا چاہتا ہے تو اس کے دل کو اس طرح تنگ کر دیتا ہے جیسے وہ آسمان پر چڑھ رہا ہو۔ (سورۃ البقرۃ باب 6 آیت 125)

إِن يَنصُرْكُمُ ٱللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۖ وَإِن يَخْذُلْكُمْ فَمَن ذَا ٱلَّذِى يَنصُرُكُم مِّنۢ بَعْدِهِۦ ۗ

"اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو تم پر کوئی غالب نہیں آ سکتا، اور اگر وہ تمہاری مدد نہ کرے تو اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کر سکے؟" اور مومنوں کو صرف اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ (سورۃ البقرۃ سورۃ 3 آیت 160)

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ ہی ہدایت دینے والا ہے اور وہی ہی گمراہ کرتا ہے (اس لیے ہر اس چیز سے پرہیز کرنے کی ضرورت ہے جو خدا کی ناراضگی کا باعث بنتی ہے اور اس کے اعمال سے):

يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ وَ يَحْكُمُ مَا يُرِيدُ

"اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جو چاہتا ہے فیصلہ کرتا ہے۔"

نہ کوئی اس کے حکم سے بچ سکتا اور نہ کوئی اس کے فیصلے سے انکار کر سکتا ہے۔ اس نے آسمان کو پیدا کیا اور ان لوگوں کو جو اس کے مستحق ہیں اور انہیں اطاعت کی راہ پر چلایا ہے۔ اس نے جہنم اور اس کے مستحق

لوگوں کو بھی پیدا کیا اور انہیں نافرمانی کی راہ پر گامزن کیا اور اپنے بندوں کو جنت اور جہنم کے مستحقین کی نشانیاں بتائیں اور یہ اعلان کیا:

إِنَّ ٱلْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ﴿١٣﴾ وَإِنَّ ٱلْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ ﴿١٤﴾

"پرہیزگار اور پرہیزگار برکتوں اور راحت میں ہوں گے اور بے شک جہنم میں ہوں گے۔" (سورۃ البقرۃ سورۃ البقرۃ آیت نمبر 82، آیہ 13-14)

اللہ بلند اور بلند ہے۔

لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُونَ

"جو کچھ وہ کرتا ہے اس سے نہیں پوچھا جا سکتا، اور دوسروں سے ان کے اعمال پر پوچھا جا سکتا ہے۔" (سورۃ البقرۃ باب 21، آیت 23)

دل کے عجائبات کا یہ مختصر بیان کافی ہے اور اس موضوع پر اس سے زیادہ کہنا خارجی علم (علم الظروف) کے سلسلے میں مناسب نہیں ہے۔ یہاں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کا مقصد یہ بھی ہے کہ ان لوگوں کو خارجی علم کے اسرار اور پیچیدگیوں سے آشنا کیا جائے جو خارجی چیزوں (اس علم کی ظاہری درآمد) سے مقابلہ نہیں کرنا چاہتے اور بیرونی خول پر باطنی جوہر کو ترجیح دیتے ہیں اور حقائق کی باطنی پیچیدگیوں کے لیے بے تاب ہیں۔ امید ہے کہ یہ مختصر بیان ان کی پیاس بجھائے گا اور ان کے لیے فائدہ مند ثابت ہوگا۔

باب 2 - روح کی تطہیر کے لیے روحانی جدوجہد، روشن باطنی صفات کا حصول اور روح کے اندرونی تاریکی اور بیماریوں کا علاج

غزالی کی دوسری کتاب *" احیئ العلوم الدین" یا "خدا کی راہ کی معرفت کا احیاء" کی تیسری جلد یا چوتھائی جلد میں* روح کی بیماریوں کے علاج اور اس مقصد کے حصول کے لیے روحانی سختی کے ذریعے کوشش کرنے سے متعلق ہے۔ اس کے نتیجے میں روح کو نفاست، شعور، روحانی عروج اور معرفت کی اعلیٰ سطحوں پر لے جاتا ہے جو ہر انسان کے لیے انفرادی اور اجتماعی سطح پر آفات سے بچنے اور انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر انسانیت کی ترقی کے لیے درکار تبدیلی لانے کے لیے ایک ذاتی ضرورت ہے۔ اس کتاب کو یہاں مختصر شکل میں اس طرح پیش کیا جا رہا ہے[8]:

واضح رہے کہ کردار کی خوبصورتی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فطری صفت اور خصوصیت ہے اور روحانی طور پر کامل شدگان، اولیاء کرام، عرفان اور صوفیاء کا سب سے افضل عمل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ آدھا مذہب ہے۔ یہ پرہیزگاروں اور عقیدت مندوں کی روحانی کوشش کا ثمر ہے۔ برے اخلاق، آداب اور کردار مہلک زہر ہیں اور ان میں ذلت، مایوسی اور بدنامی ہے۔ وہ کسی کو اللہ سے دور کرتے ہیں اور شیطان کے قریب کرتے ہیں۔ یہ جہنم میں داخلے کے راستے ہیں۔

خوبصورت اخلاق، آداب، باطنی طبیعت، مزاج، کیفیت اور کردار (*اخلاق الحسنہ*) جنت کے وسیع دروازے ہیں اور الٰہی قربت اور قربت کا ذریعہ ہیں۔ بد اخلاق، اخلاق اور کردار (*اخلاق الکبیثہ*) دل کی بیماریاں اور بیماریاں ہیں۔ جسمانی بیماریاں دنیا کی زندگی سے محروم کر دیتی ہیں اور دل و نفس کی بیماریاں آخرت کی زندگی کا خاتمہ کا سبب بنتی ہیں۔ جسم کی بیماریوں اور دل و روح کے امراض میں کوئی ظاہری تعلق نہیں ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ معالج جسمانی امراض کا علاج کرتے ہیں اور انہوں نے بے شمار قواعد و ضوابط وضع کیے ہیں اور ان کی روشنی میں تشخیص کی جاتی ہے اور ادویات تجویز کی جاتی ہیں۔ جب انسان اس فانی جسم کی بیماریوں کے علاج کے سلسلے میں کوشش کرے تو دل اور روح کی بیماریوں کے علاج کے سلسلے میں بھی کوشش کرنی چاہیے۔ اس طرح کی بیماریوں کا ایک طریقہ بھی ہوتا ہے جو ہر انسان کے لیے ضروری ہے کیونکہ ہر دل میں کچھ نہ کچھ بیماریاں ہوتی ہیں، اگر ان کا علاج نہ ہوتا ہے تو وہ تباہ کن ہو جاتے ہیں اور ان کے نتیجے میں ان سے اور بھی بہت سی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ لہٰذا ان بیماریوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا، ان کی وجوہات کا پتہ لگانا اور ان کے علاج کے طریقوں سے واقف ہونا ضروری ہے۔ قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت میں:

قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّىٰهَا

"بیشک وہ شخص سچا اور سچی کامیابی حاصل کرتا ہے جس نے اسے پاک کیا۔" (سورۃ البقرۃ باب 91، آیت 9)

اس کا مطلب دل کی شفا ہے:

وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّىٰهَا

"اور محروم اور ناکام وہ ہے جس نے روح کو برباد کر دیا [ہدایت الٰہی کی خلاف زیادتی، اخلاقی انحطاط ، باطنی فساد اور نفی اور مکروہ حرکتوں سے]۔ (سورۃ البقرۃ القرآن، باب 91، آیت 10)

اس آیت میں دل کی بیماریوں کے علاج میں غفلت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں دل کی بعض بیماریوں اور ان کے علاج کی کیفیات کو مختصرا بیان کیا جائے گا۔ ہر بیماری کی وضاحت اس [تیسری جلد] کی بقیہ کتابوں میں کی جائے گی [غزالی کی "*احیاء العلوم الدین*" یا "خدا کی راہ کا احیاء" جو خاص طور پر روح کی تباہ کن صفات سے متعلق ہے۔ یہاں کا مقصد اخلاقیات، آداب اور باطنی کردار کی فضیلت کا حصول اور اس کے حصول کے طریقوں پر روشنی ڈالنا ہے۔ لیکن سب سے پہلے، جسمانی بیماری کے علاج کا ذکر ایک مثال کے طور پر کیا جائے گا [یا روحانی بیماریوں کے علاج کے لیے ایک تشبیہ]۔ اس بحث کے ساتھ ساتھ خوبصورت اخلاق، آداب اور کردار کی خوبیوں کو اس کی حقیقت کے ساتھ بیان کیا جائے گا۔ مزید برآں، یہ وضاحت کی جائے گی کہ ایک پرعزم [روحانی] کوشش کے ذریعے اچھے اخلاق، آداب اور کردار کی خصوصیات کو اپنایا جا سکتا ہے (پیدا کیا جا سکتا ہے اور حاصل کیا جا سکتا ہے)۔ اچھے کردار کی خصوصیات حاصل کرنے کے طریقوں اور ذرائع کی وضاحت کی جائے گی۔ تہذیب اور کردار کی تطہیر اور روحانی کوششوں کے طریقوں کے ساتھ ساتھ ان نشانیوں اور اشاروں کا ذکر کیا جائے گا جن کے ذریعے دل کی بیماریوں کو پہچانا جاتا ہے۔

اچھے اخلاق کی فضیلت اور برے مکروہ کردار کے نقصانات

آیات اور نبوی احادیات: اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حمد و ثناء کرتے ہوئے فرمایا:

وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ

"بے شک تو ایک بلند مقام پر ہے (سورۃ البقرۃ سورۃ 68، آیت 4)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

هو ان تصل من قطعک و تعطی من حرمک و تعفو عمن ظلمک

"کردار کی خوبصورتی یہ ہے کہ آپ ان لوگوں سے رابطہ قائم کرتے ہیں جو آپ سے تعلقات منقطع کرتے ہیں ، آپ مہربان ، ہمدرد اور دینے والے کو دیتے ہیں جو آپ کو محروم کرتا ہے ، اور آپ اس کو معاف کرتے ہیں جو آپ پر ظلم کرتا ہے۔" (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *ابن مردویہ* رضی اللہ عنہ سے جابر، انس اور قیس بن سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے

انہوں نے یہ بھی کہا:

انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق

"مجھے [خدائی] اچھے اخلاق، اخلاق اور آداب کے کمال اور تکمیل کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔" (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *مسند احمد*, حکیم اور *بیہقی* حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے قول سے

اثقل ما یوضع فی المیزان یوم القیامة تقوی الله و حسن الخلق

"قیامت کے دن اعمال کے ترازو پر جو سب سے بھاری چیز رکھی جائے گی وہ خدا کا خوف اور نیک اخلاق، اخلاق، آداب، باطنی مزاج اور مزاج ہو گی۔" (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *ابو داؤد* اور *ترمذی* ابو الدردہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں

ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: یا رسول اللہ! برے شگون کیا ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بد اخلاق، اخلاق اور آداب۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *مسند احمد* رضی اللہ عنہا پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا

ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور ان سے مشورہ مانگا۔ اس نے جواب دیا:

اتق الله حیث کنت، قال: زدنی، قال اتبع السیئة الحسنة تمحها، قال: زدنی قال: خالق الناس بخلق حسن

"پرہیزگار رہو، تعظیم کرو اور خدا سے ڈرو چاہے تم کہیں بھی ہو۔" اس نے مزید مشورہ طلب کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تم کوئی برا کام کرو یا گناہ کرو تو اس کے بعد نیک اور نیک کام کرو کیونکہ نیکی گناہوں کو مٹا دیتی ہے۔ اس نے مزید مشورہ طلب کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگوں کے ساتھ اخلاق، اخلاق اور اخلاق سے پیش آؤ۔

ان سے پوچھا گیا: یا رسول اللہ! سب سے بہتر عمل کیا ہے؟" اس نے جواب دیا: خوبصورت اخلاق، آداب اور کردار۔

ابو الدردہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

اول ما یوضع فی المیزان حسن الخلق والسخاء، ولما خلق الله الایمان قال: اللهم قونی، فقواه بحسن الخلق والسخاء ولما خلق الله الکفر قال اللهم قونی، فقواه بالبخل وسوء الخلق

"اعمال کے ترازو میں حسن اخلاق، اخلاق اور اخلاق اور سخا کو سب سے اوپر رکھا جائے گا۔ جب اللہ تعالیٰ نے ایمان پیدا کیا تو اس نے پوچھا: اے اللہ! مجھے طاقت دے اور مضبوط کرو!" اللہ تعالیٰ نے اسے خوبصورت اخلاق، اخلاق اور کردار (*حسن الخلق*) اور سخا (*سخا*) سے مضبوط کیا۔ جب اس نے کفر اور کفر پیدا کیا تو اس نے کہا: اے اللہ! مجھے طاقت دے اور مضبوط کرو!" اللہ تعالیٰ نے اسے بخل (*بخل*) اور بد اخلاق، آداب اور کردار کی *طاقت عطا فرمائی*۔ (حافظ عراقی، ایک عظیم عالم *احادیث* یا نبوی احادیث جنہوں نے اس کتاب امام غزالی کی "راہ خدا کی معرفت کا احیاء" میں *احادیث* کی تحقیق کی اور ان کے حوالہ جات فراہم کیے، انہوں نے کہا کہ مجھے اس حدیث کا کوئی ماخذ نہیں مل *سکا*، تاہم *احادیث* کے مجموعے *ابوداؤد* اور *ترمذی* انہوں نے اسی راوی (ابو الدردہ رضی اللہ عنہما) سے ایک نبوی روایت نقل کی ہے: "اعمال کے ترازو میں خوبصورت اخلاق اور اخلاق اور کردار سے زیادہ کوئی چیز بھاری نہیں ہوگی")

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان اللہ استخلص هذا الدين لنفسه و لا يصلح لدينكم الا السخاء و حسن الخلق الا فزينوا دينكم بهما

"اللہ تعالیٰ نے اس دین کو اپنے لیے اور تمہارے دین کے لیے پاک کر دیا ہے ، سخاوت اور خوبصورت اخلاق، اخلاق اور اخلاق سے بڑھ کر کوئی چیز مناسب نہیں ہے۔ ہوشیار! ان دونوں صفات سے اپنے دین کو سنوارو۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حضرت *ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ* کی روایت سے دارقطنی *اور* خرعتی

ایک نبی روایت میں ہے:

حسن الخلق خلق اللہ الاعظم

"خوبصورت اخلاق، آداب اور کردار اللہ تعالیٰ کی صفت ہے"۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *طبرانی اوسط[ترمیم]* حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انكم لن تسعوا الناس باموالكم فسعوهم ببسط الوجه و حسن الخلق

"اگر تم اپنے مال و اموال کے ذریعے لوگوں کے ساتھ کشادگی حاصل نہیں کر سکتے (یعنی اگر آپ کے پاس لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے اپنی سخاوت کے ساتھ مدد کرنے کے لیے مالی وسائل نہیں ہیں) تو ان کے ساتھ مسکراتے چہرے اور خوبصورت اخلاق، اخلاق اور کردار کے ساتھ ان کے ساتھ کشادگی اختیار کرو۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حضرت *ابوہریرہ* رضی اللہ عنہ کے بارے میں احادیث کے مجموعے بزار، ابو یعلیہ *اور* طبرانی

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ خوبصورت، خوبصورت اور لوگوں کے ساتھ بہترین اخلاق، اخلاق، اخلاق اور اخلاق کے مالک تھے۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث کا مجموعہ *کھارا ایتی*)

حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مندرجہ ذیل دعا کرتے تھے:

اَللّٰهُمَّ حَسَّنْتَ خَلْقِيْ فَحَسِّنْ خُلُقِيْ

"اے خدا! آپ نے میری ظاہری شکل کو اچھا بنا دیا ہے، براہ کرم میرے باطنی کردار کو بھی اچھا بنائیں (دوسرے لفظوں میں صرف اچھی شکل اختیار کرنا کافی نہیں ہے کیونکہ برے اور بد باطن کے ساتھ مل کر اچھی شکل کا کوئی فائدہ نہیں ہے؛ جو چیز انسان کو واقعی خوبصورت بناتی ہے وہ خوبصورت اخلاق، آداب، کردار اور باطنی مزاج کے ساتھ ساتھ اچھی شکل ہے، یعنی ایک خوبصورت دل اور روح). (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث مجموعہ *کھارا ایٹی*)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مندرجہ ذیل دعائیں کثرت سے کرتے تھے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْاَلُكَ الصِّحَّةَ وَالْعَافِيَةَ وَحُسْنَ الْخُلُقِ

"اے خدا! میں تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ مجھے اچھی صحت، سکون اور سلامتی عطا فرمائے، اور خوبصورت اخلاق، آداب اور کردار عطا فرمائے (کیونکہ ان نعمتوں کا مجموعہ خدائی نعمتوں کا کمال ہے). (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث کا مجموعہ *کھارا ایتی*)

اسامہ بن شریک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا جب کچھ صحرائی عرب ان سے پوچھ رہے تھے کہ ایک بندے کو کس چیز سے عطا کیا گیا ہے. آپ نے جواب دیا: خوبصورت اخلاق، آداب، کردار اور باطنی مزاج (*حسن الخلق*)". (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث کا مجموعہ *ابن ماجہ)*

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان احبكم الي واقربكم مني مجلسا يوم القيامة احسنكم اخلاقا

"قیامت کے دن وہ لوگ مجھ سے سب سے زیادہ محبوب اور قریب ترین ہوں گے جن کے اخلاق، آداب، کردار اور باطنی مزاج اعلیٰ ہوں گے۔"

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ثلاث من لم تكن فيه او واحدة منهن فلا تعتدوا بشي من عمله تقوى تحجزه عن معاصي الله او حلم يكف به السفيه او خلق يعيش به بين الناس

"جس شخص کے پاس یہ تین چیزیں یا ان میں سے کوئی ایک چیز نہ ہو تو وہ اپنے کسی بھی عمل پر بھروسہ نہیں کرتا: پرہیزگاری، خوف، تنگی اور خدا سے ڈرنا جو اللہ کی نافرمانی سے روکتا ہے۔ صبر، بردباری، رحم اور تحمل جو کسی احمق سے لڑنے سے روکتی ہے۔ اور اچھے اخلاق، آداب، کردار اور باطنی مزاج (*خلق*) جس کے ساتھ انسان لوگوں کے درمیان اپنی زندگی گزارتا ہے"۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *ام سلمہ* رضی اللہ عنہا پر احادیث *کا* مجموعہ کھارعتی *اور* طبرانی کبیر

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خوبصورت اخلاق، آداب، کردار اور باطنی مزاج کی خوبی کو مزید بیان کیا ہے:

من سعادة المرء حسن الخلق

"خوبصورت اخلاق، آداب، کردار اور باطنی مزاج (*حسن الخلق*) ابدی خوشی اور لامتناہی کامیابی کے لئے تبدیلی کے ایجنٹ میں سے ایک ہے (*سعدہ*) ایک فرد کے لئے"۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث مجموعہ *کھارا ایڈی*)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان المسلم المسدد ليدرك درجة الصائم القائم بحسن خلقه و كرم مزيته

"ایک مسلمان جسے اللہ تعالیٰ نے نیکی کی توفیق عطا کی ہے، وہ اپنے خوبصورت اخلاق، اخلاق اور کردار اور اپنے مہربان باطنی مزاج سے رات بھر روزہ رکھنے اور خدا کی عبادت کرنے والے نمازی کا درجہ حاصل کرتا ہے"۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث کا مجموعہ *مسند احمد* عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان العبد ليبلغ خلقه عظيم درجات الاخرة و شرف المنازل واله لضعيف فى العبادة

"ایک بندہ [خدا کا] اچھے اخلاق، آداب، کردار اور باطنی مزاج کے ذریعے [خدا کے حضور میں] بڑے [روحانی] درجات اور درجات حاصل کرے گا اگرچہ وہ [الہامی] عبادت میں کمزور ہی کیوں نہ ہو۔" (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *انس بن مالک* رضی اللہ عنہ سے احادیث *کا* مجموعہ خرائطی *اور* طبرانی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

سوء الخلق ذنب لا يغفر و سوء الظن خطيئة تضوح

"بد اخلاق، اخلاق، اخلاق اور باطنی مزاج ایک ناقابل معافی گناہ ہے اور دوسروں کے بارے میں بری رائے رکھنا ایک ایسا گناہ ہے جو دوسرے گناہوں کو جنم دیتا ہے"۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حضرت *نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی* حضرت *عائشہ رضی اللہ عنہا کی* روایت سے مجموعہ حدیثی طبرانی صغیر

جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: علم اور اعمال کی کمی کے باوجود چار خوبیاں ہیں جو انسان کو روحانی درجات تک لے جاتی ہیں: پہلی بردباری، دوسری عاجزی، تیسری سخاوت اور چوتھی خوبصورتی اخلاق، آداب، کردار اور باطنی مزاج ہے۔ یہ چار صفات ایمان کا کمال ہیں۔ کٹانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: *"تصوف* اخلاق (خوبصورت *اخلاق، آداب، کردار اور باطنی طبیعت) کا نام ہے۔* اخلاق میں جو زیادہ ہے *وہ* تصوف *میں بھی زیادہ ہے۔* حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: خوبصورت اخلاق، آداب، کردار اور باطنی مزاج کے حامل لوگوں سے ملو اور اپنے اعمال سے ان سے دور رہو تاکہ ان کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ یحییٰ بن معاذ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: برے اخلاق، اخلاق اور اخلاق ایسی برائی ہے جس کی موجودگی میں نیک اعمال کی کثرت فائدہ مند نہیں ہے۔ اچھے اخلاق، اخلاق اور کردار ایک ایسی خوبی ہے جس کی موجودگی میں خامیوں کی کثرت نقصان دہ نہیں ہوتی۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا: شرافت کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: قرآن مجید میں شرافت کا ذکر اس طرح ہوا ہے:

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ ٱللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ

"بیشک تم میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو پرہیزگار اور پرہیزگار اور پرہیزگار ہو*تقویٰ[ترمیم]*)"۔ (سورۃ البقرۃ باب ۴۹، آیت ۱۳)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہر عمارت کی ایک بنیاد ہوتی ہے اور اسلام کی بنیاد خوبصورت اخلاق، آداب، کردار اور باطنی مزاج پر مشتمل ہے۔ عطا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: جس نے روحانی بلندیوں کو حاصل کیا وہ خوبصورت اخلاق، آداب، کردار اور باطنی مزاج کے ذریعے حاصل کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور نے خوبصورت اخلاق، آداب، کردار اور باطنی مزاج میں کمال حاصل نہیں کیا۔ وہ لوگ اللہ کے قریب ہیں جو خوبصورت اخلاق، آداب، کردار اور باطنی مزاج کی پرورش میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔

اچھے اخلاق اور برے مکروہ کردار کی حقیقت

خوبصورت اخلاق، آداب، کردار اور باطنی مزاج کی حقیقت: دو [متعلقہ] الفاظ ہیں - *خلق* (اچھا ظاہری ظہور) اور *خلق* (اچھا باطنی کردار اور طبیعت)۔ یہ دونوں الفاظ ایک ساتھ بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ، یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص خوبصورت بھی ہوتا ہے اور اچھا کردار بھی۔ الفاظ میں ، کسی کی شکل اچھی ہے اور اس کی اخلاقیات ، آداب ، طرز عمل ، کردار اور اندرونی مزاج بھی اچھا ہے۔ یہ شخص ظاہری خوبصورتی کے ساتھ ساتھ باطنی خوبصورتی کا بھی مالک ہے۔ اس طرح کے ایک بیان میں *خلق* کے معنی ظاہری ظاہری اور *خلیق* کے معنی باطنی ظاہری شکل ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان جسم اور روح کا مجموعہ ہے۔ جسم کو آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے اور روح کو بصیرت یا اندرونی آنکھ سے دیکھا جاتا ہے۔ جسم اور روح دونوں کی ایک حالت اور ظاہری شکل ہوتی ہے۔ یہ ظاہری شکل خوشگوار اور بدصورت دونوں ہوسکتی ہے۔ روح جو بصیرت (*بصیرت*) یا اندرونی آنکھ کے ذریعے محسوس کی جاتی ہے، آنکھ کے جسم سے افضل اور بلند ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے روح کو اپنے ساتھ منسوب کرتے ہوئے اس کی عظمت کا اظہار اس طرح کیا:

إِنِّي خَٰلِقُۢ بَشَرًا مِّن صَلْصَٰلٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ ﴿٢٨﴾

فَإِذَا سَوَّيْتُهُۥ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِى فَقَعُوا۟ لَهُۥ سَٰجِدِينَ ﴿٢٩﴾

"میں ایک آواز مٹی سے انسان کو پیدا کرنے والا ہوں۔ چنانچہ جب میں نے اس کی تخلیق کر لی اور اس میں میری طرف سے ایک روح ڈال دی تو تم سب (میرے حکم کے مطابق) اس کے سامنے سجدہ میں گر پڑے۔ الہی راز اور روحانی کامیابی کی چوٹی تک پہنچنے کی صلاحیت کی وجہ سے، اس میں فطری طور پر الہی گنوسس کی شکل میں)۔ (سورۃ البقرۃ باب 15، آیہ 28-29)

اس آیت میں جسم کو مٹی سے منسوب کیا گیا ہے اور روح کو خدا سے منسوب کیا گیا ہے۔ یہاں روح اور نفس ایک ہی چیز کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور اگر نفس کی بجائے نفس کا لفظ استعمال کیا جائے تو اس میں کوئی الجھن نہیں ہونی چاہیے۔ اب *چلو خلق (*باطنی کردار و طبیعت) کی وضاحت سنتے ہیں۔ *خلق* نفس کی ایک ایسی فطری کیفیت کا نام ہے جس کے ذریعے اعمال آسانی سے انجام دیے جاتے ہیں۔ اگر نفس کی اس حالت سے پیدا ہونے والے اعمال

شریعت اور عقل کے مطابق اچھے ہوں تو اسے خوبصورت اخلاق، آداب، کردار اور باطنی مزاج کہا جائے گا اور اگر اعمال برے ہوں تو اسے برے اخلاق، آداب، کردار اور باطنی مزاج کہا جائے گا۔

اس تعریف میں نفس کی فطری کیفیت کی شرط مقرر کی گئی تھی کہ اعمال آسانی سے اور آسانی سے انجام دیں، اس لیے کہ [صدقہ کاموں میں خرچ کرنے اور ضرورت میں لوگوں کی مدد کرنے]، غصے پر قابو پانے کی کوشش کرنا، زبردستی اور جدوجہد وغیرہ کے ذریعے قابو پانا برداشت نہیں ہے کیونکہ *خلق* (باطنی کردار و طبیعت) وہ چیز ہے جو بغیر کسی کوشش کے اعمال (اچھے یا برے) کے ذریعے ظاہر ہوتی ہے۔

یہاں چار باتیں ہیں: پہلی بات یہ ہے کہ کوئی عمل اچھا ہے یا برا، دوسری بات یہ کہ اچھے یا برے کام کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، تیسری بات ان کی حقیقت کو جاننا (یعنی اچھے یا برے اعمال)، چوتھی بات یہ ہے کہ نفس کے اندر ایک ایسی فطری کیفیت کا ہونا جو خوبصورتی یا بدصورتی کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور ان میں سے کوئی ایک اس کے لیے آسان ہو جاتا ہے۔ *خلق* کا تعلق چوتھے معنی سے ہے، دوسرے لفظوں میں یہ موروثی باطنی کیفیت ہے جس کے ذریعے انسان بخیل یا سخاوت جیسی منفی یا مثبت سرگرمی میں مصروف رہتا ہے۔

باطنی حسن کے چار اجزاء: جس طرح ظاہری حسن محض خوبصورت آنکھوں کا نام نہیں ہے بلکہ تمام اعضاء یعنی آنکھوں، ناکوں، کانوں، ہونٹوں، گالوں وغیرہ کا توازن اور تناسب خوبصورتی کہلاتا ہے اور ان سب کی خوبصورتی سے حسن کی تکمیل ہوتی ہے۔ اسی طرح باطنی حسن کے بھی چار اجزاء ہیں اور ان چاروں اجزا میں خوبصورتی کا ہونا ضروری ہے۔ اگر یہ چاروں اجزاء متوازن اور متناسب رہیں تو انسان کو باطنی حسن کے لحاظ سے مکمل کہا جائے گا۔ یہ چار اجزاء ہیں علم کی طاقت، غصے کی طاقت، خواہش کی طاقت اور عدل کی طاقت، یعنی پہلی تین قوتوں کو توازن اور اعتدال کی حالت میں رکھنے کی طاقت۔

علم کی قدرت کی فضیلت اور خوبصورتی یہ ہے کہ اس کے ذریعے انسان بیانات میں باطل اور حق میں، عقائد میں حق اور باطل اور اعمال میں خوبصورتی اور بدصورتی میں تمیز کرنے کی صلاحیت پیدا کر لیتا ہے۔ جب یہ طاقت اس درجے پر پہنچے گی تو اس کا ثمر حکمت کی صورت میں عطا کیا جائے گا۔ حسن اخلاق، آداب، کردار اور باطنی مزاج کی حقیقت حکمت ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَن يُؤْتَ ٱلْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِىَ خَيْرًا كَثِيرًا ۗ

"اور جس کو حکمت دی گئی اس کے لیے بہت بڑی بھلائی ملی ہے۔" (سورة البقرة باب 2، آیت 269)

غصے اور خواہش کی طاقتوں کی فضیلت یہ ہے کہ یہ دونوں حکمت کی سمت یعنی عقل اور قانون الٰہی پر عمل کرتے ہیں۔ توازن اور عدل کی طاقت کا مقصد غصے اور خواہش کی طاقتوں کو حکمت کے تابع اور محکوم بنانا ہے۔ عقل ایک مشیر اور مہربان مددگار کی طرح ہے اور توازن اور عدل کی طاقت عقل کی نصیحت کو نافذ کرنے والی ہے۔ غصہ وہ طاقت ہے جو عقل کی سمت کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس کی تشبیہ شکاری کتے کی طرح ہے جسے تربیت کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے بعد یہ ایسا ہو جاتا ہے کہ شکاری کے اشارے کے بغیر نہ تو آگے بڑھتا ہے اور نہ ہی پیچھے پیچھے ہٹتا ہے۔ خواہش ایک گھوڑے کی مانند ہے جو شکار پر سوار ہوتا ہے۔ گھوڑا کبھی تربیت یافتہ اور مہذب ہوتا ہے اور کبھی جنگلی اور باغی ہوتا ہے۔ توازن اور انصاف کی طاقت سے خواہش کو قابو میں رکھا جاتا ہے ورنہ شکار کے بجائے انسان خود شکار ہو جاتا ہے۔

جو شخص اعتدال کی سطح پر ان چار اجزا [باطنی خوبصورتی] کا مالک ہو وہ خوبصورت اخلاق، آداب، کردار اور باطنی مزاج کا حامل شخص ہوگا۔ جس شخص کے بعض اجزا اعتدال میں ہوں اور کچھ غیر متوازن اور غیر معتدل ہوں (یعنی انتہا پر کیونکہ ان اجزاءوں میں سے بہت کم یا بہت زیادہ ہو سکتا ہے) تو اعتدال پسندوں کے مقابلے میں اسے اچھا کردار کہا جائے گا۔ اس کی مثال ایک ایسے شخص کی طرح ہے جس کے چہرے پر خوبصورت آنکھیں ہوں لیکن دوسری چیزیں اچھی نہیں ہیں۔ اس صورت میں کسی کو آنکھوں کے لحاظ سے خوبصورت اور دوسرے اعضاء کے حوالے سے بدصورت کہا جاتا ہے۔ غصے کی طاقت کی خوبصورتی اور متوازن اعتدال کو بہادری کہا جاتا ہے۔ خواہش کی طاقت کی متوازن اعتدال اور خوبصورتی کو معصومیت کہا جاتا ہے۔ اگر غصے کی طاقت متوازن اعتدال کی سطح سے زیادہ ہے تو اسے ضرورت سے زیادہ غصہ (*طحور*) کہا جائے گا۔ اگر یہ متوازن اعتدال کی سطح سے نیچے ہے تو اسے بزدلی کہا جائے گا۔ اسی طرح متوازن اعتدال کی سطح سے اوپر کی خواہش کی طاقت کو برائی کو بھڑکانے والا اور متوازن اعتدال کی سطح سے نیچے جمود کہا جاتا ہے۔ دونوں [انتہائیوں] کے درمیان متوازن اعتدال کی سطح بہادری اور معصومیت کی ضرورت ہے۔ سپیکٹرم یا انتہا کے دونوں سروں پر جو کچھ ہے، دوسرے لفظوں میں، کمی یا زیادتی مقصد نہیں ہے، بلکہ ان (انتہائیوں) کی مذمت کی گئی ہے اور فضیلت (*فدا-ایل*) کہلانے کے بجائے انہیں خرابی (*رادھا ایل*) کہا گیا ہے۔ عدل کی طاقت میں کوئی کمی یا زیادتی نہیں ہے اور اس کا برعکس ظلم ہے۔ جب انصاف نہیں ہوتا تو ظلم ختم ہوجاتا ہے۔ علم کی متوازن اعتدال کی سطح کو حکمت کہا جاتا ہے اور اسے غلط مقاصد کے لیے استعمال کرنا اسے متوازن اعتدال کی سطح سے نکالنا ہے۔ اگر اس کا استعمال [غلط طریقوں سے] زیادتی کی طرف ہے تو اسے برائی اور فریب کہا جاتا ہے اور اگر اس کا استعمال کمی کی طرف ہے تو اسے حماقت کہا جاتا ہے۔ علم کی درمیانی سطح [متوازن اعتدال پسندی] [جو تمام انتہاؤں سے بچتی ہے] کو حکمت کہا جاتا ہے۔ ان تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ اخلاق کے بنیادی اصول اور اجزاء چار ہیں: حکمت، بہادری، معصومیت اور عدل۔

حکمت نفس کی وہ کیفیت ہے جس میں حق اور باطل میں فرق کیا جا سکتا ہے وہ تمام معاملات ہیں جو اس کی صلاحیت کے اندر ہیں۔ عدل سے مراد نفس کی وہ کیفیت ہے جس کے ذریعے انسان غصے اور خواہش پر حکمرانی کرتا ہے اور اسے حکمت کے تابع کر دیتا ہے۔ بہادری سے مراد وہ حالت ہے جس میں غصے کی طاقت عقل کی طاقت کے تابع اور فرمانبردار ہوتی ہے اور ان کی اجازت کے بغیر عمل نہیں کرتی اور نہ ہی عمل کرنے سے گریز کرتی ہے۔ معصومیت سے مراد وہ طاقت ہے جس کے ذریعے خواہش اور ہوس کو عقل اور قانون الٰہی کے تابع بنایا جا سکتا ہے۔ تمام اچھی خوبیوں اور کردار کی خصوصیات کی ابتدا اور سرچشمہ یہ چار اصول ہیں۔ مثال کے طور پر، مندرجہ ذیل قابل تعریف باطنی صفات عقل کی طاقت کے متوازن اعتدال سے پیدا ہوتی ہیں: معاملات کے ذریعے سوچ کر دانشمندانہ فیصلہ سازی، ذہن کی تیز، معاملات پر دانشمندانہ نقطہ نظر، ادنیٰ نفس کے پوشیدہ نقصانات اور معاملات اور اعمال کی نزاکتوں سے آگاہی۔ عقل کی اس طاقت کی زیادتی باطنی طور پر غلطیوں کے تئیں منفی رجحان پیدا کرتی ہے، دوسروں کو نقصان پہنچانے کے لیے، دھوکہ دہی اور مکاری کو جنم دیتی ہے۔ [عقل کی طاقت کی کمی] تجربے کی کمی (مہارت اور علم) ، حماقت ، حماقت ، آگاہی کی کمی [معاملات کی حقیقتوں کے بارے میں] اور جنون (جنونی رویے) جیسی بیماریوں کو جنم دیتی ہے۔ تجربے کی کمی سے مراد تخیل کے فکری عمل کی صداقت کے باوجود تجربہ نہ ہونا ہے کیونکہ کچھ افراد ایک معاملے میں تجربہ کار ہوتے ہیں لیکن دوسرے معاملے میں مکمل طور پر ناتجربہ کار ہوتے ہیں۔ حماقت اور جنون میں فرق یہ ہے کہ بے وقوف کا مقصد درست ہے لیکن مقصد کے حصول کا راستہ نہیں جانتا۔ جنون کسی ایسی چیز کو اپنانا ہے جو اپنانے کے قابل نہیں ہے کیونکہ یہ ایک اور دوسروں کے لئے مکمل طور پر نقصان دہ ہے۔ بہادری کی متوازن اعتدال ان خوبصورت اندرونی خصوصیات کو پروان چڑھاتی ہے: شرافت ، جرات ، اپنے آپ پر کڑی نظر رکھنا ، تحمل ، استقامت ، غصے پر قابو پانا ، وقار ، سنجیدگی وغیرہ۔ بہادری کی طاقت کی کمی توہین، ذلت، خوف، سستی، احساس کمتری، ہمت کی کمی اور پست حوصلے کو جنم دیتی ہے۔ معصومیت کی متوازن اعتدال سخاوت، حیا اور شرم، صبر، دوسروں کی عیبوں کو نظر

انداز کرنے، قناعت پسندی، خدا پرستی، لطافت، اعلیٰ ہمت اور حوصلے، کشادہ دل اور فراخدلی اور لالچ کی کمی کو پروان چڑھاتا ہے۔ معصومیت کی متوازن اعتدال کی حدود سے تجاوز کرنے سے اندرونی بیماریاں اور منفی تخریبی خصوصیات پیدا ہوتی ہیں جیسے لالچ، لالچ، بے شرمی، برائی کی طرف باطنی رجحان، فضول خرچی اور فضول خرچی، دکھاو، دوسروں کی توہین، بکواس کرنا، خوشامد کرنا، حسد، غریب اور عاجز کو ذلیل کرنا اور ذلیل کرنا۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خوبصورت کردار، خوبیوں اور اندرونی مزاج کے چار اصول ہیں: حکمت، بہادری، معصومیت اور انصاف۔ دیگر تمام اخلاق، آداب، باطنی کردار کی خصوصیات اور صفات ان چار اہم صفات کی شاخیں ہیں۔ ان چار اصولوں میں (اخلاق، آداب، باطنی صفات اور صفات) میں متوازن اعتدال کا کمال نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور کو عطا نہیں کیا گیا۔ ان کے بعد آنے والے لوگ اس فضیلت اور کمال میں ان کے قریب نہیں ہیں۔ ان صفات میں انسان جتنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مشابہت رکھتا ہے اور ان کی تقلید کرتا ہے، اس حد تک خدا کے قریب ہو گا اور جو ان صفات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دور ہو گا وہ اس حد تک اللہ سے دور ہو گا۔ ایک شخص جو ان تمام خوبصورت اخلاقیات، آداب، اندرونی کردار کی خصوصیات اور خصوصیات کا مجسمہ ہے وہ اس کی اطاعت کا مستحق ہے، اس کا حوالہ دیتے ہیں اور اپنے تمام اعمال میں دوسروں کی طرف سے اس کی پیروی کی جاتی ہے۔ وہ شخص جو ان سے بے نیاز ہے اور اس کے بجائے ان کے مخالفین کا مجسمہ ہے، وہ شہر سے جلاوطن ہونے اور لوگوں کی طرف سے بائیکاٹ کرنے کا مستحق ہے کیونکہ ایسے شخص کے پاس انسانیت نہیں بچی بلکہ شیطان کا نمائندہ بن گیا ہے۔ جس طرح شیطان سے دوری رکھی جاتی ہے اسی طرح ایسے شخص کو بھی دور رکھنا چاہیے۔ جس طرح ایک شخص جو اخلاق، آداب، باطنی صفات اور صفات کا مجسمہ ہے اور فرشتوں کی صفات سے قربت کا حامل ہے وہ قیادت اور تقلید کا مستحق ہے، اسی طرح شیطانی صفات سے وابستگی کی وجہ سے انسان رحمت الٰہی سے دور ہونے اور اس سے بچنے کا مستحق ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم *کو اخلاق* کی تکمیل اور کمال کے لیے بھیجا گیا ہے۔ یہ صفات وہ ہیں جن کا ذکر قرآن نے مومنین کی صفات کے طور پر کیا ہے:

إِنَّمَا ٱلْمُؤْمِنُونَ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ بِٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا۟ وَجَٰهَدُوا۟

بِأَمْوَٰلِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ ۚ أُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلصَّٰدِقُونَ

"کامل مومن وہی ہیں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لایا پھر اس پر شک نہیں کیا اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنے جانوں سے جہاد کیا۔ یہی لوگ سچے ہیں جو خدا کی معرفت اور دوستی اور قربت کے مستحق ہیں۔ (سورۃ البقرۃ باب 49 آیت 15)

اللہ اور اس کے رسول پر بلا شک و تردید ایمان لانا یقین کی طاقت کا عمل ہے اور یقین کی طاقت عقل کا ثمر اور حکمت کی کمال ہے۔ مادی اموال کے ساتھ جدوجہد کرنا سخاوت ہے اور یہ کوشش اس وقت ہو سکتی ہے جب خواہش اور ہوس پر قابو پایا جائے۔ اپنے نفس سے جدوجہد کرنا بہادری ہے اور یہ کوشش عقل کی شرائط اور غصے کی طاقت کو متوازن اعتدال کی حدود میں استعمال کرتے ہوئے کی جاتی ہے۔

روحانی جدوجہد اور جدوجہد کے ذریعے کردار اور اندرونی صفات میں تبدیلی

جو لوگ [غلط] عقائد کی گمراہ کن ہیں، وہ (دل و روح کو تمام منفی اور مضر رجحانات اور صفات سے نجات دلا کر بہتر انسان بننے کے لیے باطنی روحانی تبدیلی کے حصول کی روحانی کوشش) کو بوجھل اور مشکل [یا یہاں تک کہ ناممکن] سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے باطن کی تطہیر اور تبدیلی اور اپنے کردار کی تعمیر اور اسے مہذب بنانے میں مصروف ہونے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ وہ اپنے کردار کی کوتاہیوں اور نقصان پہنچانے والے رجحانات پر غور نہیں کرتے، یہ ان کی اپنی ذاتی ناکامیوں، خامیوں اور منفی رجحانات کی وجہ سے ہیں۔ اس کے بجائے ، وہ یہ برقرار رکھتے ہیں کہ کردار ، اخلاقیات اور آداب ویسے ہی رہتے ہیں ، اور ان میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں ہے کیونکہ کسی کی باطنی فطرت کو تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے اپنے دعوے کے حق میں دو دلائل پیش کیے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ *خلق* کسی کی باطنی شکل و صورت کا نام ہے اور *خلق* اس کی ظاہری شکل و صورت کا نام ہے۔ کسی کی ظاہری شکل و صورت میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں ہے۔ مثال کے طور پر ، ایک چھوٹا شخص لمبا ہونے کے لئے قد نہیں بڑھا سکتا اور نہ ہی لمبا شخص چھوٹا ہوسکتا ہے۔ بدصورت شخص خوبصورت نہیں بن سکتا اور خوبصورت نہیں بن سکتا۔ اندرونی شکل اور ظاہری شکل کو بیرونی شکل کے طور پر سمجھا جانا چاہئے۔ ان کی دوسری دلیل یہ ہے کہ خوبصورت کردار ہوس اور غصہ کو ختم کرنے کا ارادہ رکھتا ہے لیکن ہم نے تجربے اور آزمائشوں سے معلوم کیا ہے کہ ہوس اور غصہ فطری انسانی فطرت کا حصہ ہے اور وہ کبھی ختم نہیں ہوتے اور ان کا تعاقب کرنا بیکار کوشش ہے اور اپنی زندگی کو بیکار کوششوں میں ضائع کرنا ہے کیونکہ تزکیہ نفس کا مقصد یہ ہے کہ دل عارضی لذتوں کی طرف مائل نہ رہے اور وہ ہے ناممکن۔ اس کے بعد ، ان دونوں دلائل کا جواب فراہم کیا جائے گا۔

پہلی دلیل کا جواب: اگر کردار میں تبدیلی اور تبدیلی ممکن نہ ہوتی تو کسی تبلیغ، نصیحت، تربیت اور تعلیم کی ضرورت نہ ہوتی اور نہ ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہوتا:

"اپنے اخلاق، آداب، کردار اور صفات کو اچھا بنائیں"۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *احادیث* کا مجموعہ *ابوبکر بن لعل فی مکارم الاخلاق* عن معاذ رضی اللہ عنہ

اخلاقیات، آداب، کردار، باطنی مزاج اور صفات کی تبدیلی اور تبدیلی صرف انسان کے لیے مخصوص نہیں ہے، بلکہ جانوروں کی خوبیاں بھی بدل جاتی ہیں۔ باز کو دیکھیں کہ اگرچہ یہ جنگلی ہے ، لیکن وہ انسانوں کا عادی ہوجاتا ہے۔ تربیت کے بعد ایک شکاری کتا اپنے آقا کے حکم پر کسی شکار کے پیچھے بھاگنے اور اسے پکڑنے اور اسے کھانے کے بغیر اپنے مالک کے سامنے پیش کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جنگلی گھوڑا تربیت کے بعد فرمانبردار ہو جاتا ہے۔ کیا یہ سب کردار کی تبدیلی کی مثالیں نہیں ہیں؟ اس سلسلے میں حقیقت یہ ہے کہ وجود کی دو قسمیں ہیں: کامل اور ناقص ۔ کامل وجود وہ ہیں جو اپنے وجود کے لحاظ سے مکمل ہوتے ہیں، ان میں کوئی کمی یا اضافہ نہیں ہوتا کیونکہ انسان ان میں کمی یا اضافہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ مثال کے طور پر آسمان، ستارے، جسم کے بیرونی اور اندرونی اعضاء، جانور اور ان کے [اندرونی اور باہر] اعضاء وغیرہ۔ ناقص وجود وہ ہیں جن کا وجود ابھی مکمل نہیں ہوا ہے۔ وہ تکمیل تک پہنچ سکتے ہیں بشرطیکہ ان کے پاس کمال تک پہنچنے کی شرائط ہوں۔ مثال کے طور پر کھجور کا بیج نہ تو پھل ہوتا ہے اور نہ ہی درخت بلکہ اس کی ساخت ایسی ہے کہ اگر اسے لگایا جائے اور پانی دے کر پیش کیا جائے تو یہ بیج درخت بن سکتا ہے کیونکہ اس میں درخت بننے کی صلاحیت موجود ہے۔ لیکن اگر کوئی براہ راست اس بیج کو پھل میں تبدیل کرنا چاہتا ہے تو یہ ممکن نہیں ہے کیونکہ اس میں پھل بننے کی

صلاحیت نہیں ہے۔ جب بیج کی کیفیت ایسی ہو کہ وہ انسان کے استحقاق سے متاثر ہو اور ایک حالت سے دوسری حالت میں بدل جائے تو غصے اور خواہش کی قوتیں کیسے تبدیل نہیں ہو سکتیں؟ تاہم ان طاقتوں کا مکمل خاتمہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ روحانی سختیوں اور مشقوں اور روحانی کوششوں کے ذریعے ہم ان طاقتوں کو اپنے قابو میں لا سکتے ہیں لیکن ہم ان کو ختم نہیں کر سکتے۔ ہمیں ایسا ہی کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے بعد کی زندگی میں اور خدا تک پہنچنے کا وہی ذریعہ ہے۔ تاہم ، [انسانی] مزاج متنوع یا مختلف ہوتے ہیں - کچھ مزاج تبدیلی کو قبول کرتے ہیں اور تیزی سے تبدیل ہوتے ہیں اور کچھ اسے دیر سے قبول کرتے ہیں۔ مزاج میں فرق کی دو وجوہات ہیں: پہلی یہ کہ وہ صفت جس کی تبدیلی کی خواہش ہوتی ہے، جب تک زندہ ہے اس کی وجہ سے مزاج میں مضبوطی سے پیوست ہوتی ہے۔ ہوس ، غصے اور تکبر کی خصوصیات کی تبدیلی سب ممکن ہے لیکن تبدیل کرنا سب سے مشکل ہوس اور خواہش کی خصوصیت ہے جیسا کہ پیدائش سے ہی کسی کے ساتھ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چھوٹے بچے بھی اس سے خالی نہیں ہیں۔ غصہ عام طور پر سات سال کی عمر کے بعد پیدا ہوتا ہے اور اس کے بعد ہی عقل و فہم کی طاقت پیدا ہوتی ہے۔ دوسرا یہ کہ ایک خاص کردار کی خصوصیت اس پر اور اس کے مضمرات پر کثرت سے عمل کرنے اور اسے مسلسل اچھا سمجھنے کی وجہ سے دوسری فطرت بن گئی ہے۔

انسان کی چار درجے: اس سلسلے میں انسان کے چار درجات ہیں۔ پہلی ڈگری یہ ہے کہ انسان اسی حالت میں رہتا ہے جس میں وہ پیدا ہوتا ہے اور سچ اور باطل ، اچھے اور برے میں فرق نہیں کرتا اور اپنی حقیقی فطرت کے لحاظ سے ہر قسم کے عقائد سے عاری ہے۔ ایسے شخص کا علاج آسان ہے اور انسان بہت کم وقت میں صحت مند ہو سکتا ہے۔ ایسے مریض کو ایک روحانی مرشد (*مرشد*) اور ایک اندرونی محرک اور محرک کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ ایسا محرک روحانی جدوجہد کی طرف راغب ہو۔ ایسے شخص کے اخلاق، آداب، اندرونی مزاج اور کردار جلد ہی اچھے ہو سکتے ہیں۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ کوئی شخص برائی کو برائی سمجھتا ہے لیکن نیک اعمال کرنے کی عادت نہیں رکھتا ہے۔ اس کے بجائے شیطان نے انسان کو برے کاموں میں الجھا رکھا ہے اور ایسا شخص اپنی خواہشات اور خواہشات کے تابع ہے لیکن حق کی راہ سے انحراف کے باوجود اپنی خامیوں سے آگاہ ہے۔ ایسے شخص کی تبدیلی پہلی ڈگری سے زیادہ مشکل ہے کیونکہ اصلاح کے دو مراحل ہوں گے: سب سے پہلے ، کسی کی بری عادات کو توڑنے کی ضرورت ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ کسی کو اچھے کاموں کا عادی بنانے کی ضرورت ہے۔ کسی کی اصلاح اس شرط پر ممکن ہے کہ ایسا شخص روحانی سختی اور جدوجہد کے لیے فعال طور پر تیار ہو۔ تیسری درجہ یہ ہے کہ انسان برے اخلاق اور کردار کی خصوصیات کو اچھا سمجھتا ہے اور برے اور برے اعمال اس کے لیے ضروری ہیں اور وہ ایسے اخلاق اور اعمال کے ساتھ پرورش پایا ہے۔ ایسے شخص کا علاج ناممکن ہے اور ایسے شخص کی روحانی تبدیلی کی توقع نہیں کی جا سکتی کیونکہ اگر گمراہی کی ایک وجہ ہو تو اسے دور کیا جا سکتا ہے، اس کے بجائے یہاں بہت ساری وجوہات ہیں اور یہ دیکھنا حیران کن ہے کہ کون سی وجوہات دور کی جا سکتی ہیں۔ چوتھی ڈگری یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے آپ کو برائی میں ملوث ہے اور [اس کے اوپری حصے میں] دوسروں کو ایک کی طرح کرتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہے اور دوسروں کو تباہ کرنے پر فخر محسوس کرتا ہے [اخلاقی اور روحانی طور پر جو بالآخر ہر لحاظ سے مکمل تباہی کا باعث بنتا ہے]۔ ایسا شخص بہت مشکل سطح پر ہوتا ہے اور کسی کی گمراہ کن پرتوں پر پرتوں میں ہوتی ہے۔ ایسے شخص کی اصلاح ناممکن اور ناقابل تصور ہے۔

ان چار درجات میں پہلا شخص صرف جاہل ہے، دوسرا جاہل اور گمراہ ہے، تیسرا جاہل، گمراہ اور برائی کا شکار ہے، چوتھا جاہل، گمراہ اور برائی کا شکار ہے۔

دوسری دلیل کا جواب: مخالفین کا خیال ہے کہ روحانی مشقوں کا مقصد خواہش اور غصے کی طاقت کو ختم کرنا ہے، اگرچہ یہ ناممکن ہے۔ ہمارا موقف ہے کہ ان طاقتوں کا خاتمہ مقصد نہیں ہے، بلکہ خواہش کی طاقت کی تخلیق فائدہ مند ہے اور انسانوں میں اس کی موجودگی ضروری ہے۔ لہٰذا اگر کسی میں کھانے کی خواہش نہ ہو تو وہ ہلاک ہو جائے گا۔ اگر ہم آہنگی کی خواہش باقی نہیں رہی تو نسل انسانی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اگر غصہ ختم ہو جائے تو وہ نقصان دہ چیزوں سے اپنا دفاع نہیں کر سکے گا اور فنا ہو جائے گا۔ اس کا مقصد ان طاقتوں کو ختم کرنا نہیں ہے بلکہ صرف انہیں زیادتی اور قلت سے بچانا اور انہیں متوازن اعتدال کی سطح پر لانا ہے۔ مثال کے طور پر غصے کا مقصد یہ ہے کہ نہ تو غصہ کی حد سے زیادہ رہے جس سے لاپرواہی پیدا ہو اور نہ ہی کوئی بزدلی ہو بلکہ غصہ کی طاقت عقل اور شریعت الٰہی کے تابع ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَٱلْكَـٰظِمِينَ ٱلْغَيْظَ وَٱلْعَافِينَ عَنِ ٱلنَّاسِ ۗ

"اور یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے غصے کو روکتے ہیں اور لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں۔" (سورة البقرة سورة 3، آیت 134)

اس آیت میں ان لوگوں کی تعریف کی گئی ہے جو اپنے غصے کو روکتے ہیں۔ اس کا مطلب ان لوگوں سے نہیں ہے جو شروع میں غصے میں بھی نہیں آتے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غصہ اور خواہش کا خاتمہ ایک غیر فطری معاملہ ہے اور یہ شریعت الٰہی کا مقصد نہیں ہے۔ شریعت الٰہی کا مقصد یہ ہے کہ دونوں طاقتوں کو متوازن اعتدال کی اس حد تک پہنچایا جائے کہ عقل ان پر غالب اور غلبہ حاصل کرنا شروع کر دے نہ کہ اس حد تک جہاں وہ عقل پر غالب ہوں۔ یہ اندرونی کردار کی خصوصیات اور مزاج کی تبدیلی کا مقصد ہے۔ بعض اوقات ہوس انسان پر اس شدت سے حملہ آور ہو جاتی ہے کہ عقل اسے پسپا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ تاہم، روحانی کوششوں کے ساتھ، اسے متوازن اعتدال میں لانا ممکن ہے۔ ٹیسٹ اور تجربہ اس کو ثابت کرتا ہے اور اس میں کوئی شک باقی نہیں رہا۔ قرآن مجید سے اس بات کا ثبوت ہے کہ اخلاق، آداب اور باطنی صفات کے معاملے میں متوازن اعتدال کی ضرورت ہے نہ کہ زیادتی یا کمی کی انتہا پسندی، مندرجہ ذیل آیت ہے:

وَٱلَّذِينَ إِذَآ أَنفَقُوا۟ لَمْ يُسْرِفُوا۟ وَلَمْ يَقْتُرُوا۟ وَكَانَ بَيْنَ ذَٰلِكَ قَوَامًا

"اور جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ ہی بخل کرتے ہیں بلکہ ان کا خرچ دونوں انتہاؤں کے درمیان ہوتا ہے۔" (سورة البقرة باب 25 آیت 67)

اس آیت سے مراد سخاوت ہے جو لاپرواہی اور کنجوسی کی [انتہائی] سطحوں کے درمیان ایک سطح ہے [جو سپیکٹرم کے مخالف سروں پر ہیں]۔ مزید یہ کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ ٱلْبَسْطِ

"اپنے ہاتھوں کو اپنی گردن پر نہ باندھ دو اور نہ انہیں مکمل طور پر کھلا چھوڑ دو (یعنی نہ بخل اور فضول خرچی نہ کرو بلکہ دونوں انتہاؤں کے درمیان رہو)۔ (سورة البقرة باب ١٧، آیت ٢٩)

کھانے کی خواہش میں اعتدال پر بھی زور دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَكُلُوا۟ وَٱشْرَبُوا۟ وَلَا تُسْرِفُوٓا۟ ۚ إِنَّهُۥ لَا يُحِبُّ ٱلْمُسْرِفِينَ

"کھاؤ اور پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو۔ بیشک اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو حد سے تجاوز کرتے ہیں۔ (سورۃ البقرۃ سورۃ البقرۃ آیت 31)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"بہترین معاملات وسط میں ہیں [متوازن اعتدال کی شکل میں، ہر قسم کی انتہا پسندی اور انتہا پسندی سے گریز کریں]"۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث کا مجموعہ *بیہقی* مطراف بن عبداللہ رضی اللہ عنہ

متوازن اعتدال کی سطح پر معاملات کی تعریف، ترجیح اور تلاش کے پیچھے ایک راز ہے۔ اس راز کی تحقیق یہ ہے کہ آخرت کی ابدی خوشی اور نہ ختم ہونے والی کامیابی *کا* دارومدار اس بات پر ہے کہ دل کو دنیاداری کی تمام وابستگیوں اور نجاستوں سے پاک کیا جائے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِلَّا مَنْ أَتَى ٱللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ

"نجات اور ابدی خوشی اور کامیابی اس شخص کے لیے ہو گی جو خدا کے پاس صحت مند دل لے کر آئے گا (یعنی وہ دل جو دنیا پرستی کی تمام گندگیوں سے پاک ہو گا)۔ (سورۃ البقرۃ باب 26، آیت 89)

بخل اور لاپرواہی خرچ کرنا دونوں نجاستوں اور دنیاداری سے وابستگی کے ہیں۔ دل کو ان دونوں انتہاؤں سے خالی ہونا چاہیے۔ دوسرے لفظوں میں دل کو مادی مال جمع کرنے کی طرف مائل نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی وہ سب کچھ خرچ کرنے کی طرف مائل ہونا چاہیے، کیونکہ خرچ کرنے کا لالچ رکھنے والے کا دل اس کی طرف توجہ اور لگاؤ رہے گا، جیسے وہ (مادی اشیاء، جائیداد اور پیسہ) کہاں سے آئے گا اور کہاں خرچ کرے گا۔ دوسری طرف ، کنجوس کا دل صرف ذخیرہ اندوزی پر مرکوز ہوگا۔ دل کی حفاظت دونوں انتہاؤں سے خالی ہونا ہے کیونکہ ان کا خاتمہ ممکن نہیں ہے، اسی لیے ایک ایسی حالت طے کی گئی جہاں یہ دونوں [انتہائیں] نہ ہوں اور وہ ہے توازن اور اعتدال کی کیفیت۔ اس حالت میں ، یہ دونوں [منفی] خوبیاں موجود نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب گرمی گرم پانی چھوڑ دیتی ہے اور یہ ٹھنڈا بھی نہیں ہوتا تو اسے "نیم گرم" کہا جاتا ہے۔ یہ سخاوت ضرورت سے زیادہ خرچ کرنے اور بخل کی اعتدال ہے۔ بہادری حد سے زیادہ جارحیت (تشدد) اور غیر مردانہ (بزدلی) کے درمیان اعتدال پسندی کی خوبی ہے۔ معصومیت لالچ (ہوس) اور جمود کے درمیان اعتدال کا نقطہ ہے۔ اس [وضاحت] سے دیگر تمام داخلی خصوصیات اور کردار کی خصوصیات اخذ کی جانی چاہئیں۔

ہر کردار کی خصوصیت اور [انسانی] معیار میں ، زیادتی اور کمی دونوں کی مذمت کی جاتی ہے ، اور مقصد متوازن اعتدال پسندی ہے۔ استاد اور مرشد کو چاہیے کہ وہ اپنے طالب علموں کے سامنے غصے اور بخل کے نقصانات کو

سامنے لائیں اور کسی استثناء کی اجازت نہ دیں کیونکہ اگر وہ ان (تخریب) صفات میں سے تھوڑی سی بھی اجازت دیں تو وہ مزید کا بہانہ تلاش کریں گے۔ تاہم ، اگر وہ تھوڑی سی رقم کی بھی اجازت نہیں دیتے ہیں تو یہ ممکن ہے کہ وہ کم پر آباد ہوجائیں اور زیادہ کے لئے مائل نہ ہوں اور اس طرح وہ متوازن اعتدال کی سطح حاصل کریں گے۔ کم کی اجازت زیادہ کا بہانہ بن جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ طالب علموں اور روحانی راستے کے متلاشیوں سے کہا گیا ہے کہ ان دونوں طاقتوں کو باقی رہنے کی بھی اجازت نہ دیں، بلکہ انہیں مٹا دیں۔ یہ راز یہاں اس لیے نہیں لکھنا چاہیے تھا کہ کم ذہنی صلاحیت والے لوگ اس سے دھوکہ کھا جاتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ غصہ ان کا حق ہے اور کنجوسی بھی ان کا حق ہے۔ [اسی طرح، دیگر انسانی خصوصیات اور اندرونی کردار کی خصوصیات میں توازن اور اعتدال کی ضرورت کو اس بحث سے اخذ کیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ ایک وسیع بحث ہے جس میں انسانی باطنی کردار کی تمام خصوصیات اور خصوصیات شامل ہیں]

حسن باطنی کردار، مزاج اور صفات کا ذریعہ اور منبع (*حسن الخلق*) ہر طرح کی انتہا سے پرہیز کرنے والا اعتدال ہے

آپ اب تک اس بات کو اچھی طرح سمجھ چکے ہیں کہ خوبصورت باطنی صفات اور صفات کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ عقل کی قوت اعتدال پسندی ہونی چاہیے، عقل (عقل کی اعتدال پسندی) کو کامل کیا جانا چاہیے، خواہش اور غصے کی قوتیں اعتدال کی سطح پر ہونے کے ساتھ ساتھ الٰہی قانون اور عقل کے تابع اور فرمانبردار ہونی چاہئیں۔ اعتدال پسندی کی یہ سطح دو وجوہات کی بنا پر حاصل کی گئی ہے۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ انسان پر خدا کا فضل اور رحمت ہے اور اس بات کا ادراک ہے کہ وہ اپنی پیدائش کے دن سے ہی نیک کردار کا مالک ہے اور عقل کامل ہے۔ ہوس اور غصہ ایک پر غالب نہیں ہوتے، بلکہ وہ دونوں عقل اور الٰہی قانون کے تابع ہیں۔ ایسے شخص کو ایک مہذب اور خوش اخلاق شخص بننے کے لیے اسکالر بننے کے لیے بیرونی تعلیم اور بیرونی آداب کی تعلیمات کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ ایسا شخص عیسیٰ علیہ السلام ، یوحنا علیہ السلام اور آخری انبیاء نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جیسے فطری عالم اور خوش اخلاق شخص ہے۔ یہ کوئی بعید کی بات نہیں ہے کہ کسی کی فطرت اور مزاج میں وہ [اعلیٰ باطنی] صفات موجود ہوں جو سیکھنے اور کوشش سے حاصل ہوتی ہیں۔ کچھ بچے شروع سے ہی سچے ، بہادر اور دینے والے ہوتے ہیں۔ کچھ بچے شروع سے ہی جھوٹا، بزدل، دھوکہ باز اور کنجوس ہوتے ہیں۔ تاہم ، یہ خصلتیں ان میں بعض اوقات ان لوگوں کی صحبت رکھنے سے پیدا ہوتی ہیں جن کے پاس وہ ہیں اور بعض اوقات [سیکھنے کے مختلف ذرائع استعمال کرتے ہوئے دوسروں سے سیکھتے ہیں جس میں وہ اپنے آس پاس کے دوسروں میں جو کچھ دیکھتے ہیں اس کی تقلید کرتے ہیں]۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان روحانی سختیوں، کوششوں اور مشقوں کے ذریعے خوبصورت باطنی خصلتیں، مزاج اور صفات حاصل کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ، نچلے نفس سے کام حاصل کرکے تاکہ مطلوبہ داخلی کردار کی خصوصیت یا معیار حاصل ہو۔ مثال کے طور پر سخی ہونے کا خواہشمند شخص سخاوت کے لوگوں کی پیروی کرے اور ان کی طرح مال خرچ کرے، اگرچہ نفس نفس کے ساتھ صبر کرنے کی ضرورت ہے [کیونکہ یہ بہتری کے لیے تبدیلی کے لیے کھلا نہیں ہے]۔ یہ [جدوجہد] اس وقت تک جاری رہنا چاہیے جب تک کہ ادنیٰ نفس اسے عادت کے طور پر حاصل نہ کر لے اور اس وقت تک سخاوت اس کے مزاج اور باطنی مزاج کا حصہ نہ بن جائے۔

اسی طرح جو شخص تکبر کا غلبہ رکھتا ہے اور عاجزی کرنا چاہتا ہے اسے چاہیے کہ وہ عاجزی کے اہل کے اعمال پر عمل کرے اور جدوجہد اور روحانی جدوجہد جاری رکھے اور ادنیٰ نفس کو عاجزی کی طرف مائل کرنے کی کوشش کرے یہاں تک کہ یہ باطنی صفت عادت بن جائے اور جب تک کہ عاجزی ادنیٰ کے لیے آسان نہ ہو جائے۔ یہ

تمام اچھی اور قابل تعریف داخلی کردار کی خصوصیات اور خصوصیات کو حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جعلت قرة عيني في الصلاة

"میری آنکھوں کی ٹھنڈک دعاؤں میں ہے۔" (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث مجموعہ *نسائی* حضرت انس رضی اللہ عنہ پر

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک محسوس کی کیونکہ یہ نیک عمل ان کی عادت اور فطرت بن گیا۔ جب تک ادنیٰ نفس عبادت میں مشقت اور ممنوعات کو ترک کرنے میں دشواری محسوس نہیں کرے گا تب تک نقصان باقی رہے گا اور ابدی نعمت کا کمال حاصل نہیں ہوگا۔ البتہ نیک اعمال میں سختی اور درد کے جذبات کے ساتھ ثابت قدمی ان میں استقامت کی کمی سے بہتر ہے، لیکن یہ اس سے بہتر نہیں ہے کہ وہ ان کو خواہش اور باطنی رغبت کے ساتھ انجام دیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى ٱلْخَـٰشِعِينَ

"بیشک نماز مشکل ہے سوائے ان کے جو اپنے دلوں میں عاجزی رکھتے ہوں۔" (سورة البقرة باب 2، آیت 45)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اعبد الله في الرضا فان لم تستطع ففي الصبر على ما تكره خيرا كثيرا

"اللہ تعالیٰ کی بندگی کرو (اللہ کی رضا سے خوش ہو کرو کہ جو کچھ وہ تمہارے لیے پسند کرے اس سے راضی ہو جاؤ چاہے وہ اچھا ہو یا برا)۔ اگر یہ ممکن نہیں ہے [اس روحانی حالت کی بلندی کی وجہ سے] تو جو کچھ آپ ناپسند کرتے ہیں اس پر صبر کرنا اس میں بے پناہ بھلائی ہے [کیونکہ یہ روحانی خزانوں کا ذخیرہ ہے]۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث کا مجموعہ *طبرانی کبیر*)

یہ سعدہ کا *کمال نہیں* ہے کہ بعض اوقات کوئی عمل رضاء *(حکم الٰہی کو مکمل طور پر قبول کرنے اور اس پر خوش ہونے) اور باطنی رجحان کے ساتھ کیا جاتا* ہے اور اسے کرنے میں خوشی محسوس ہوتی ہے اور بعض اوقات اس کے برعکس ہوتا ہے۔ اس کے بجائے ، ہر لمحہ اور ہر موڑ پر ایک ہی حالت میں ہونا چاہئے۔ بلکہ جیسے جیسے انسان عمر میں ترقی کرتا ہے ، خواہش اور محبت ، باطنی میلان ، الہی محبت اور حسرت اور حکم الٰہی کی قبولیت میں اضافہ ہونا چاہئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب سعدہ کے *بارے میں پوچھا* گیا تو فرمایا:

طول العمر في طاعة الله

"[یہ] خدا کی اطاعت اور عبادت میں لمبی عمر رکھنا ہے۔" (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *احادیث* کا مجموعہ *ابو منصور الدیلمی* حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے

یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام موت کو ناپسند کرتے تھے کیونکہ ایک نبی روایت کے مطابق کہ دنیا آخرت کی کاشت ہے۔ جتنی زندگی ہے جتنی بھی خدا کی عبادت کی مقدار ہوگی اور اس حد تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجر و ثواب ملے گا۔ نفس صاف سے پاک ہو جائے گا، اندرونی کردار کی خصوصیات اور خوبیاں مضبوط سے مضبوط اور اچھے سے عمدہ کی طرف بڑھیں گی۔ اس کے علاوہ عبادت کا مقصد دل پر اثر انداز ہونا ہے [کیونکہ عبادت الٰہی صرف عبادت کے لیے نہیں بلکہ دل اور روح کی پرورش کے لیے ہے تاکہ وہ حقیقت کی دروازے تک پہنچ سکیں] اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب عبادت میں مسلسل استقامت اور استقامت ہو۔

ان خوبصورت اخلاق، آداب، باطنی کردار اور مزاج کا مقصد یہ ہے کہ دنیاداری کی محبت دل میں نہ رہے، خدا کی محبت دل میں جڑ جائے گی، کسی کے لیے خدا کی واپسی اور ملاقات کے سوا کوئی چیز محبوب نہیں رہتی، وہ مادی جائیدادوں کو ان طریقوں سے خرچ کرتا ہے جن کے ذریعے وہ خدا تک پہنچ سکتا ہے۔ غصہ اور خواہش دونوں کو انسانی اختیار میں ڈال دیا گیا ہے تاکہ وہ الٰہی قانون کے بیان کردہ طریقوں کے مطابق استعمال کیا جائے اور انہیں خدا تک پہنچنے کا ذریعہ بھی بنایا جا سکے۔ اس کے بعد انسان کو ایسے اعمال سے خوش ہونا چاہیے اور انہیں خوشگوار معلوم کرنا چاہیے۔ اگر کسی کو نماز میں سکون ملتا ہے یا اس میں آنکھوں کی ٹھنڈک نظر آتی ہے یا عبادات الٰہی اچھی لگتی ہیں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ نفس کی اچھی عادات اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب اور عجیب و غریب چیزوں کے ظہور کا سبب بن سکتی ہیں۔ ہم بادشاہوں اور خوشحال لوگوں کو ہمیشہ غم اور تکلیف میں مبتلا پاتے ہیں۔ دوسری طرف ، اس غریب جواری کو دیکھیں جو ہارنے کے بعد بھی خوش ہے اور اس میں خوشی محسوس کرتا ہے اور اس کے بغیر زندگی بہت مشکل ہو جاتی ہے۔ جوئے کی وجہ سے دولت کا نقصان ہوتا ہے ، گھر اور کنبہ تباہ ہوجاتا ہے ، زندگی کی آسائشیں چھین لی جاتی ہیں اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے سامنے احتساب کا خوف ان کے اوپر تلوار کی طرح لٹک جاتا ہے۔ اس کے باوجود وہ اس لت سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے کیونکہ تھوڑی دیر (جوا) کھیلنے کے بعد انسان اس کا عادی ہو جاتا ہے اور کوشش کرنے کے بعد بھی اسے چھوڑنے سے قاصر رہتا ہے۔ کبوتر اڑانے والا اس کھیل سے اتنا متاثر ہوتا ہے کہ وہ سارا دن دھوپ میں کھڑا ہوتا ہے اور سورج کی کرنوں کی سختی محسوس نہیں کرتا کیونکہ کبوتروں سے محبت ہوتی ہے اور انہیں کھلی جگہ پر اڑتے ہوئے دیکھنے میں دلچسپی ہوتی ہے اور ان پر شرط لگانا اس کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ یہی حال بد اخلاق لوگوں کا ہے جو دن رات خوفناک سزاؤں کی سزا پاتے ہیں اور قید کی مشکلات کا سامنا کرتے ہیں لیکن پھر بھی اپنے غلط اعمال سے باز نہیں آتے اور اپنے مشغلوں کو فخر کا لائق سمجھتے ہیں اور خوشی سے تمام سزاؤں کا سامنا کرتے ہیں۔ ان کی (ان کی مجرمانہ سرگرمیوں کے لیے جنون اور پاگل پن) اس حد تک ہے کہ اگر چور مارے بھی جائیں تو وہ یہ ظاہر نہیں کریں گے کہ انہوں نے چوری شدہ سامان کہاں چھپایا ہے اور [جرم میں] اپنے ساتھیوں کی شناخت نہیں کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے کام کو فضیلت اور کمال اور حد سے زیادہ تشدد کو بہادری سمجھتے ہیں اور ان کاموں کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ وہ گرفتاری، مقدمے اور سزاؤں کا سامنا کرنے سے باز نہیں آتے۔ یہ سزائیں ان کے لیے سکون کا باعث ہیں۔ ہر شخص اپنی ریاست میں مصروف اور مصروف رہتا ہے اور اپنی کوششوں اور پیشوں پر فخر کرتا ہے چاہے وہ حکمران ہو یا لیڈر ہو یا چوکیدار ہو یا حجام ہو۔ یہ تمام معاملات ایک ہی کام میں استقامت اور استقامت کے نتیجے میں سامنے آتے ہیں اور جب ایک ہی مزاج اور قائل لوگوں میں ایک ہی بات دیکھی جاتی ہے تو یہ معاملات اور بھی مضبوطی سے جڑ جاتے ہیں۔

ویسے بھی جب انسان کو باطل میں خوشی مل سکتی ہے اور برائی کی طرف مائل ہو جاتی ہے تو وہ حق میں لذت کیوں نہیں پا سکتا اور نیکی اور نیکی کی طرف کیوں نہیں مائل ہو سکتا؟ حقیقت یہ ہے کہ فطری فطرت بری چیزوں اور باطنی تخریبی صفات کی طرف مائل نہیں ہوتی۔ یہ ایک ایسے شخص کی طرح ہے جو مٹی کھانے کی خواہش اور جھکاؤ رکھتا ہے۔ کیا اس جھکاؤ کو فطری جھکاؤ کہا جا سکتا ہے؟ عقل کی طرف جھکاؤ، خدا سے محبت، الٰہی عرفان اور عبادت کی طرف جھکاؤ کھانے پینے کی طرف مائل ہونے کے مترادف ہے [جو کہ خالص قدرتی مظہر ہے]۔ جس طرح کھانا کھانے کی طرف میلان فطری فطرت کا حصہ ہے، اسی طرح خدا کی محبت کی طرف جھکاؤ اور عبادت دل کی فطری فطرت کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دل [یا روح] ایک خدائی حکم ہے، اس کا جھکاؤ خواہش اور ہوس کے مضمرات کی طرف عارضی ہو سکتا ہے لیکن دائمی اور فطری نہیں ہو سکتا۔ دل [یا روح] کی اصل پرورش حکمت ، الہی گنوسس اور الہی محبت ہے۔ اگر رکاوٹوں کی وجہ سے یہ اپنی حقیقی فطری فطرت کے مضمرات سے انحراف کر کے ہو تو یہ اس شخص کی طرح ہے جس کے معدے میں تکلیف پیدا ہو گئی ہو اور اس کے کھانے کی خواہش باقی نہ ہو حالانکہ معدے کی غذا خوراک کے ذریعے ہو اور انسانی زندگی کا دارومدار اس پر ہو۔ اس مثال سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس حد تک دل اللہ کے سوا کسی اور کی طرف مائل ہو گا اس حد تک وہ (دل یا روح) بیمار ہو جائے گا۔ لیکن اگر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی محبت اللہ کی خاطر ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں بلکہ ایسی محبت بھی حقیقی فطری فطرت کا حصہ ہو گی۔

یہ وضاحت کسی بھی شک کے سائے سے بالاتر ثابت کرتی ہے کہ روحانی جدوجہد اور جدوجہد کے ذریعے خوبصورت اخلاق، آداب، باطنی کردار کی خصوصیات اور مزاج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اگر کوئی ان کو جدوجہد اور کوشش سے حاصل کرتا ہے اور ان پر قائم رہتا ہے تو آخر کار یہ باطنی صفات اور کردار کی صفات فطری اور دوسری فطرت بن جاتی ہیں۔ دل اور جسم کے اعضاء کے درمیان یہ ایک عجیب تعلق ہے کیونکہ دل میں جو بھی خوبیاں پیدا ہوتی ہیں وہ لازمی طور پر اعضاء پر اثر انداز ہوتی ہیں اور وہ دل سے سگنل وصول کرتے ہی حرکت کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اسی طرح اعضاء کے ذریعہ کیے جانے والے اعمال دل کو متاثر کرتے ہیں۔ دل اور اعضاء کے [باہمی] اثر و رسوخ کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ اس سے ایک مثال کے ذریعے اس حقیقت کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ فرض کریں کہ کوئی خطاطی کے فن میں مہارت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ ماہر خطاطوں کی مثال کی تقلید کی جائے اور حروف اور الفاظ اسی طرح لکھیں جیسے وہ کرتے ہیں۔ اس مشق کو طویل عرصے تک جاری رکھنا چاہیے یہاں تک کہ خطاطی کی عادت بن جائے اور جس طرح پہلے خوبصورت حروف بڑی محنت سے بنتے تھے اسی طرح اب وہ آسانی سے بننا شروع ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی علمی الہیات بننا چاہتا ہے تو اسے علمی الہیات کی پیروی کرنی چاہیے۔ دوسرے لفظوں میں، فقہ سے متعلق مسائل (معاملات یا نکات علم) کو مسلسل دہرانا اور مشق کرنا چاہیے تاکہ وہ ان کو حفظ کر لے تاکہ ان کا اثر دل تک پہنچ جائے اور وہ صحیح معنوں میں ایک علمی الہیات بن جائے جو اس کی پیروی کرتا ہے۔ اسی طرح جو شخص سخی ، پرہیزگار ، بردبار ، بردباری اور عاجزی کا خواہاں ہے وہ ان لوگوں کے نقش قدم پر چلے جو حقیقی معنوں میں سخاوت ، خوف ، رواداری ، بردباری اور عاجزی کے زیور سے نوازے گئے ہیں۔ یہ پیروی شروع میں بڑی محنت سے کی جاتی ہے، لیکن بعد میں یہ اعمال جن پر عمل کیا جاتا ہے، وہ عادت بن جاتے ہیں اور انسان کے مزاج اور باطنی مزاج میں [مضبوطی] جڑ جاتے ہیں۔ خوبصورت اخلاقیات، آداب، اندرونی کردار کی خصوصیات، خصلتوں اور مزاج کے حصول کی یہی حکمت عملی ہے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جس طرح علمی الہیات کا طالب علم ایک دن کی چھٹی لینے کی وجہ سے اپنے مقصد میں ناکام نہیں ہوتا، اسی طرح ایک دن کے لیے [علمی الہیات کے علم کے نکات کو حفظ کرنے کے لئے] مطالعہ اور دہرانے سے علمی الہیات نہیں بنتا۔ اسی طرح پاکیزگی، کمال اور حسن اعمال کے ذریعے دل کی خوبصورتی کا طالب

ایک دن محنت کر کے اپنے مقصد کو حاصل نہیں کر سکتا اور نہ ہی گناہ کا ایک دن اس مقصد کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے۔ علماء کرام کا یہ بیان کہ ایک کبیرہ گناہ ابدی نقصان کا سبب نہیں ہے، اس کا مطلب وہی ہے [جیسا کہ پچھتاو، توبہ اور اصلاح کے ذریعے معافی الٰہی کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے]۔ تاہم ، ایک دن کا وقفہ دوسرے دن کے وقفے کی وجہ بن سکتا ہے اور اگر یہ جاری رہا تو ، یہ کسی کے مزاج میں کاہلی کا باعث بن سکتا ہے اور ادنیٰ نفس بے عملی کا عادی ہوسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے بچائے [کیونکہ ہماری روحانی حالت کو بہتر بنانے کے معاملے میں سستی کے نتائج ابدی نقصان، محرومی اور غم کا باعث بنتے ہیں]۔ یہ ان لوگوں کا حال ہے جو چھوٹے گناہوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور ان کو چھوٹا سمجھتے ہیں اور توبہ کے ساتھ اپنے نچلے نفس کو دھوکہ دیتے ہیں اور یہ اس حد تک چلتا ہے کہ انہیں توبہ کرنے کا موقع نہیں ملتا اور موت کی آہنی گرفت ان پر قبضہ کر لیتی ہے۔ ان کے گناہوں پر اصرار کرنے کی وجہ سے ان کے دل تاریک ہو چکے ہیں اور اب وہ توبہ کرنے کے قابل نہیں ہیں۔
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "دل میں ایمان کی ابتدا ایک سفید نقطے [نور الٰہی کا ذرہ] سے ہوتی ہے۔ جیسے جیسے ایمان بڑھتا ہے، اس نقطے کی روشنی اور جسامت بھی بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ پورا دل [نور الٰہی کی چمک سے] روشن ہو جاتا ہے۔ منافقت ایک سیاہ نقطے [دل پر سیاہ داغ] سے شروع ہوتی ہے۔ جیسے جیسے منافقت بڑھتی جاتی ہے، اس ذرے کی تاریکی اور اس کی موجودگی بھی اس وقت تک بڑھتی جاتی ہے جب تک کہ پورا دل [اور روح] تاریک ہو جاتا ہے"۔

اس تفصیلی وضاحت سے ثابت ہوتا ہے کہ خوبصورت آداب، اخلاق، باطنی کردار اور اخلاق (*اخلاق*) بعض اوقات فطری ہوتے ہیں اور فطری طور پر انسانی نفس میں پائے جاتے ہیں اور بعض اوقات ان کو کوششوں سے حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ حصول ابتدا میں محنت اور تکلیف سے کیا جاتا ہے لیکن بعد میں وہی خوبصورت آداب، اخلاق، اندرونی کردار اور مزاج عادت بن جاتے ہیں اور اس کے مزاج کا حصہ بن جاتے ہیں۔ یہ اچھے لوگوں کا مشاہدہ کرنے اور ان کے نقش قدم پر چلنے سے بھی حاصل ہوتے ہیں کیونکہ مزاج نقل کرنے میں اچھا ہوتا ہے اور تمام معاملات (مزاج) چاہے وہ اچھے ہوں یا برے ان میں جذب ہوجاتے ہیں۔ ایک فرد جس کے مزاج ، عادت اور تعلیم کا [اچھا کردار ہے] ، یہ تینوں ، بہت اعلی سطح پر ہوتا ہے۔ اور انسان خدا سے ذلت اور دوری کی انتہائی حد پر ہے جس کا مزاج ناقص ہے، باطنی مزاج اور اس کی طرف رجحان کی وجہ سے برائی کو پسند کرتا ہے اور اس کے برے دوست اور ساتھی بھی ہوتے ہیں۔ باقی تمام لوگ ان دو درجوں کے درمیان [روحانی] درجات میں ہیں [سپیکٹرم کے مخالف سروں پر]۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُۥ ﴿٧﴾

وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُۥ ﴿٨﴾

"جو شخص ذرہ کے برابر نیکی کرے گا وہ اسے آخرت میں دیکھے گا اور جو ذرہ کے برابر برائی کرے گا وہ اسے بھی دیکھے گا۔" (سورة البقرة سورة البقرة آیت 7-8)

وَمَا ظَلَمَهُمُ ٱللَّهُ وَلَٰكِن كَانُوٓا۟ أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ

"اور اللہ نے ان پر ذرا بھی ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا۔" (سورة البقرة باب 16، آیت 33)

اخلاقیات، آداب، اندرونی کردار اور مزاج کی تہذیب کے حصول کے طریقے کی تفصیلی وضاحت

جسم اور نفس: آپ پہلے بھی یہ سیکھ چکے ہیں کہ اندرونی کردار کی خصوصیات میں اعتدال صحت کا اشارہ ہے اور اعتدال سے انحراف بیماری کا اشارہ ہے۔ یہ جسم کے مزاج میں اعتدال اور توازن کی طرح ہے جو صحت کی علامت ہے اور اس سے انحراف بیماری کی علامت ہے۔ زیر بحث موضوع کے سلسلے میں ، ہم جسم کی مثال استعمال کرسکتے ہیں۔ جس طرح صحت اور جسمانی تندرستی کی حالت لانے کے لیے جسمانی بیماریوں کو دور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اسی طرح نفسیات کی روحانی، نفسیاتی، جذباتی اور فکری تندرستی کے لیے نقصان دہ باطنی تخریبی خصوصیات (کردار کی خصلتیں، اندرونی صفات اور طبیعت) کو نفس سے ہٹا دیا جاتا ہے اور اسے خوبصورت اخلاق، آداب، باطنی کردار کی خصوصیات اور مزاج سے مزین کیا جاتا ہے۔ جسمانی انسانی جسمانی نظام میں ، اصل مقصد توازن اور اعتدال ہے۔ کھانے پینے میں خرابی اور اس سے متعلق خواہشات معدے میں خرابی کا سبب بن سکتی ہیں۔ اسی طرح انسانی باطن کا اصل مقصد بھی توازن اور اعتدال ہے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک مشہور روایت (حدیث میں) باطن کے اس توازن اور اعتدال کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ہر بچہ اعتدال پسند مزاج اور سچی فطری فطرت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے لیکن بعد میں والدین اسے اپنے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں۔ حدیث کے الفاظ درج ذیل ہیں:

كل مولود يولد على الفطرة وانما ابواه يهوّدانه او ينصّرانه او يمجّسانه

"ہر بچہ حقیقی فطری فطرت پر پیدا ہوتا ہے [جس پر خدا نے پوری انسانیت کو اس طرح پیدا کیا ہے کہ وہ پہلے سے ہی خدا پر ایمان لانے ، سچائی اور راستبازی کے لئے وقف ہونے ، ہر اچھی اور مثبت چیز ، ہر ایک کے ساتھ امن اور ہم آہنگی ، اور گنوسس کی حالت کے ذریعے اپنی آسمانی اصلیت تک پہنچنے کی خواہش پیدا کرتا ہے جس کے نتیجے میں داخلی روشنی اور ابدی سچائیوں کا طلوع ہوتا ہے] لیکن اس کے والدین اسے یہودی میں تبدیل کرتے ہیں ، عیسائی اور میجیئن (دنیا میں موجود متنوع مذہبی اور نظریاتی روایات کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور اس طرح کسی کو اپنے مذہبی، نظریاتی، ثقافتی، جغرافیائی اور فکری سیاق و سباق کے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں)"۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *احادیث* کے مجموعے *میں صحیح بخاری* اور *صحیح مسلم* صحابہ کرام ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے

اگر جسم صحت مند ہے تو ، معالج صحت کو محفوظ رکھنے کے طریقوں پر غور کرتا ہے اور اگر وہ بیمار ہے تو ، معالج اسے صحت کی حالت میں واپس لانے کے لئے جدوجہد کرتا ہے۔ اسی طرح ایک پاکیزہ، شائستہ اور مہذب نفس کی حفاظت کی کوشش کرنی چاہیے اور نفس میں فضیلت اور پاکیزگی کی خصوصیات پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے جو اس سے خالی ہے۔ جس طرح جسم کے جسمانی نظام میں متوازن اعتدال کو کمزور اور تباہ کرنے والے عوامل کا علاج ان کے مخالف عوامل سے ہوتا ہے، اسی طرح نفس کی بیماریوں کا علاج بھی ان کے مخالفوں سے ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر جہالت کا علاج تعلیم سے ہوتا ہے، کنجوسی کی بیماری کا علاج سخاوت سے ہوتا ہے، تکبر عاجزی سے ہوتا ہے، خواہشات کے سیلاب کے سامنے رکاوٹیں کھڑا کر کے ہوس کا علاج ہوتا ہے اگرچہ اس سے تکلیف اور تکلیف ہو سکتی ہے۔ جس طرح جسم کی بیماریوں کا علاج دوا کی تلخی کو برداشت کرنا اور نفس کی خواہشات کو دبانے سے ہوتا ہے (جو علاج کے لیے سازگار نہیں ہیں) اسی طرح نفس (یا روح) کی بیماریاں روحانی کشمکش (مجاہد) کی تلخی اور سختی کو صبر سے برداشت کیے بغیر دور نہیں ہوتیں۔ اس کے بجائے دل کی بیماریاں اس کشمکش کو اس سے بھی زیادہ محتاج کرتی ہیں کیونکہ جسم کی بیماریوں کا خاتمہ موت کے وقت ہوتا ہے جب

انسان کی روح جسم سے نکل جاتی ہے لیکن روح کی بیماریاں موت کے بعد بھی ہمیشہ کے لیے رہتی ہیں [کیونکہ روح کبھی نہیں مرتی]۔ گرمی سے پیدا ہونے والی بیماریوں کا علاج ان ادویات سے نہیں کیا جا سکتا جو فطرت میں سرد ہوتی ہیں اور بیماری کی شدت اور کمزوری کو مناسب مقدار میں غور کرکے تجویز کی گئی ہیں۔ ڈاکٹروں نے مختلف ادویات کی مقدار کے بارے میں معیارات مرتب کیے ہیں ، اور وہ ان معیارات کی روشنی میں بیماری کے مطابق مناسب اور فائدہ مند مقدار میں تجویز کرتے ہیں۔ اگر ان معیارات پر عمل نہ کیا گیا تو بیماری کم ہونے کے بجائے بڑھے گی۔

روح (یا نفس) کی بیماریوں کی بھی یہی حالت ہے۔ روحانی مرشد کو اسی طرح کے معیارات پر عمل کرنا چاہیے جب روح کی بیماریوں کا علاج ان کے مخالف کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ طب کا معیار بیماری کی سطح اور نوعیت کے مطابق طے کیا جاتا ہے۔ روحانی مرشد کو اپنے روحانی مریضوں پر روحانی مشقوں اور سختیوں کا اتنا بوجھ نہ ڈالنا چاہیے کہ وہ برداشت نہ کر سکیں۔ مزید برآں ، ایک روحانی مرشد کو اس وقت تک علاج تجویز نہیں کرنا چاہئے جب تک کہ بیماری کی نوعیت کا صحیح تعین نہ کیا جائے۔ علاج کے سلسلے میں معالج پر لازم ہے کہ وہ بیماری کی تشخیص کے مطابق علاج اور دوا تجویز کرے۔ اگر کوئی ایک ہی دوا سے تمام بیماریوں کا علاج کرنے کی کوشش کرے تو اس کا نتیجہ مریض کی موت کے علاوہ کچھ نہیں ہوگا۔ اسی طرح ایک مرشد کو راہ روحانی راہ کے طالب علموں کی اصلاح کے لیے ایک ہی طریقہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ اگر کوئی ایسا کرے گا تو وہ اپنے روحانی مریضوں کے دلوں کی تباہی کا سبب بنے گا۔ ایک روحانی مرشد پر لازم ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنے طالب علم (روحانی کمال کی راہ میں طالب علم) کی بیماری کی تشخیص کرے، طالب علم کے مخصوص حالات کا جائزہ لے، اپنی عمر اور موجودہ حالت کو مدنظر رکھے اور دیکھے کہ وہ روحانی کشمکش کی سختی اور شدت کو کس حد تک برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ان تمام معاملات پر غور کرنے کے بعد، ایک روحانی مرشد کو روحانی مشق کا مشورہ دینا چاہیے۔

اگر طالب علم (روحانی کمال کی راہ میں طالب علم) مبتدی ہے اور شریعت الٰہی کی حدود سے بے خبر ہے تو سب سے پہلے اس شخص کو ظاہری صفائی (ذاتی حفظان صحت اور تطہیر)، نمازوں اور ظاہری عبادات کے صحیح طریقے سکھائے جائیں۔ اگر طالب علم ناجائز مادی اثاثوں کے حصول اور قبضے میں ملوث ہے اور گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ اسے [استاد یا مرشد کی طرف سے] روکا جائے اور گناہوں کی زندگی گزارنے سے منع کیا جائے [بشمول منفی اور نقصان دہ خیالات، احساسات اور میلانات کے اندرونی گناہوں]۔ جب کسی کا ظاہری وجود ظاہری گناہوں کی نجاستوں اور گناہوں سے پاک ہو جائے اور عبادت کے اعمال کی روشنی سے روشن ہو جائے تو مرشد کو چاہیے کہ وہ ظاہری حالتوں کے اشاروں سے طالب علم کے باطن کا جائزہ لے اور اس کے اخلاق، آداب، کردار، میلان، عادات اور امراض قلب کا تجزیہ کرے۔ اگر طالب علم کے پاس ضرورت سے زیادہ مادی اثاثے ہوں تو روحانی مرشد کو چاہیے کہ وہ اسے لے کر صدقہ میں تقسیم کرے تاکہ کسی کے دل میں مادی اموال کی طرف کوئی جھکاؤ باقی نہ رہے اور وہ صرف خدا کی طرف توجہ دے سکے۔ اسی طرح اگر طالب علم (روحانی کمال کی راہ میں طالب علم) تکبر، تکبر اور برتری کا احساس غالب ہو تو اسے بھیک مانگنے کے لیے بازار میں بھیجا جائے کیونکہ یہ [باطنی تخریبی خصوصیات] ذلت کے بغیر ختم نہیں ہوتیں، اور بھیک مانگنے سے بڑھ کر کوئی چیز ذلت آمیز نہیں ہے اور اس بیماری کو مکمل طور پر ختم ہونے تک جاری رکھنے کا پابند ہونا چاہیے۔ تکبر اور تکبر دل کی بدترین بیماریوں میں سے ہیں۔ اگر کسی طالب علم کے جسم اور لباس کی انتہائی صفائی (*نزفہ*) کا خیال ہے جیسا کہ وہ اس کی طرف زیادہ مائل ہو سکتا ہے تو اسے گھر کی صفائی اور گندی جگہوں پر جھاڑو دینے پر مجبور کیا جائے یا اسے باورچی خانے کا کوئی کام دیا جائے جہاں اسے دھوئیں سے نمٹنا پڑے اور اس کے نتیجے میں انتہائی صفائی کا غرور اور اس کے بارے میں نازک ہونا باقی نہیں رہتا۔ جو لوگ کپڑوں میں نمایاں طور پر

استعمال کرتے ہیں اور مسلسل خوبصورت لباس تلاش کرتے ہیں، ان میں اور جلد ہی دلہنوں میں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ وہ سارا دن اپنی خوبصورتی میں مصروف رہتے ہیں۔ مزید یہ کہ اپنی پوجا کرنے اور پتھر یا بت کی پوجا کرنے میں کوئی فرق نہیں ہے۔

جب کوئی بندہ اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کرتا ہے تو اس کا دل اللہ سے پردہ ڈال دیا جاتا ہے جو شخص کسی لباس کی فکر اس کی صفائی اور جائز ہونے سے زیادہ کی فکر کرتا ہے وہ اپنے نفس کا عبادت کرنے والا ہے۔
روحانی کشمکش کی نزاکتوں میں سے ایک یہ ہے کہ اگر کوئی طالب علم یا متلاشی (روحانی راہ کا طالب علم)
اندرونی تخریبی برائی میں سے کسی ایک سے باز نہ آئے تو اس کی توجہ اور سمت اس منفی صفت سے ہٹ کر ایک مختلف منفی صفت کی طرف موڑ دی جاتی ہے جو نچلی درجے کی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر، ایک بچہ پہلے کسی اسکول میں بیٹ اور گیند کے کھیل میں شامل ہوتا ہے پھر کھیلوں سے اچھے لباس کی طرف مائل ہوتا ہے، پھر اچھے لباس اور خود کی زینت پر فخر سے سیاسی عہدہ اور شہرت حاصل کرنے کی طرف مائل ہوتا ہے اور آخر میں آخرت کی زندگی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اگر کسی کا دل شہرت اور اقتدار کی خواہش کو اچانک ترک کرنے کی طرف مائل نہ ہو تو اسے شہرت اور طاقت کی نچلی سطح پر آمادہ کیا جائے اور بتدریج اس (اندرونی تخریب) صفت سے باز رکھا جائے۔ اسی طرح اگر کسی مرشد کو طالب علم میں کھانے کی لالچ نظر آتی ہے تو اسے روزہ رکھنے اور کم کھانے پر مجبور کرنا چاہیے، تو اس کو لذیذ کھانا تیار کرنے اور دوسروں کو کھلانے کی ذمہ داری دی جائے لیکن اپنے آپ کو اس حد تک نہ کھایا جائے کہ نفس اس کا عادی ہو جائے اور اس میں صبر کی طاقت پیدا ہو جائے اور لالچ ختم ہو جائے۔ اسی طرح اگر کوئی طالب علم جوان ہو اور وہ نکاح کرنے کی خواہش رکھتا ہو لیکن وہ اس کی مالی کفالت کرنے کے قابل نہ ہو (جیسا کہ شوہر اپنی بیوی کی کفالت کرنے کا واجب ہے) تو اسے روزہ رکھا جائے۔ بعض اوقات روزہ رکھنے سے شدید خواہش کم نہیں ہوتی۔ اس صورت میں طالب (روحانی مسافر) سے کہا جائے کہ وہ [مقررہ وقت پر] صرف پانی سے روزہ افطار کرے اور روٹی نہ کھے۔ دوسرے دن روٹی سے روزہ افطار کرنا چاہیے لیکن گوشت یا کوئی اور سالن یا پکوان اس حد تک استعمال نہ کریں کہ خواہش کی شدت ختم ہو جائے۔ ابتدا میں بھوک سے بہتر کوئی علاج نہیں ہے۔

اگر روحانی مرشد طالب میں غصے کا غلبہ دیکھتا ہے تو اسے بردباری، صبر اور خاموشی کا حکم دیا جائے اور ان سے کہا جائے کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ کام کرے جو بداخلاق ہیں اور ان کی خدمت کرنے کو کہا جائے تاکہ ان کی تکلیف پر صبر سے کام لے کر صبر کا عادی ہو جائے۔ ایک سنت (روحانی گرو) کے بارے میں نقل کیا گیا ہے جو زیادہ تر ایسے لوگوں کے لیے دستی مزدوری کا کام کرتا تھا جو بداخلاق اور سخت مزاج تھے اور ان کی عادت تھی۔ وہ ان کے تمام دکھ کو صبر کے ساتھ برداشت کرتا تھا اور اپنے غصے کو روکتا تھا۔ شروع میں ان کے لیے ایسا کرنا مشکل تھا لیکن بعد میں صبر ان کے اندر ایک دوسری فطرت کے طور پر جچ گیا اور ان کا نام عام لوگوں کے لیے صبر کا نمونہ بننے لگا۔ کچھ سنتوں نے اپنے آپ میں کمزوری اور بزدلی پائی۔ جب موسم سرد ہوتا تھا ، اور لہریں پریشان اور ہنگامہ خیز ہوتی تھیں تو انہوں نے سمندر کی سطح پر سفر کرکے [ان ناپسندیدہ خصوصیات] کا علاج کیا۔ کچھ مقدسین شروع میں سست تھے اور انہوں نے ساری رات سر جھکا کر اپنے آپ کو ٹھیک کیا یہاں تک کہ نفس اس کی شدت سے پریشان ہو گیا اور [عبادت میں] پیروں پر کھڑے ہونے پر راضی ہو گیا۔ کچھ لوگوں نے دریا میں پیسہ ڈال کر دولت اور مادی املاک سے محبت کو اپنے دلوں سے نکال دیا۔ انہوں نے انہیں صدقہ میں دینے کے بجائے دریا میں پیسہ ڈالنے کو ترجیح دی کیونکہ صدقہ میں دکھاوے کا خطرہ تھا۔

یہ مثالیں ہمیں دل کی بیماریوں کے علاج کے طریقے دکھاتی ہیں۔ یہاں مقصد ہر بیماری کے لئے دوا کی وضاحت کرنا نہیں ہے۔ اگلے صفحات میں ادویات اور علاج کے طریقوں کی وضاحت کی جائے گی۔ اس وقت، مقصد صرف یہ سمجھانا ہے کہ ہر [روحانی] بیماری کا علاج اس کے برعکس عمل کرنے سے ممکن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں علاج کے طریقہ کار کو صرف ایک جملے میں بیان کیا ہے:

وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِۦ وَنَهَى ٱلنَّفْسَ عَنِ ٱلْهَوَىٰ

فَإِنَّ ٱلْجَنَّةَ هِىَ ٱلْمَأْوَىٰ

"وہ شخص جو (اس دنیا میں) اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا تھا اور اپنے نفس کو سب سے کم نفس کی خواہشوں سے روکتا تھا*وا* یا ضدی غلط سر کی حماقتیں) [جو کسی کی مادی اور غیر مادی (روحانی) زندگیوں میں کسی کی انفرادی اور اجتماعی فلاح و بہبود کے لیے نقصان دہ ہیں]، جنت ایسے شخص کی [آخری] منزل ہو گی۔" (سورۃ البقرۃ باب 79، آیہ 40-41)

روحانی کشمکش میں اصل اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ جو کچھ کرنے کا ارادہ کیا ہے اسے مکمل کیا جائے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص تمام خواہشات کو ترک کرنے کا عزم کر لے اور راستے میں کچھ مشکلات کا سامنا کرے تو وہ ان مشکلات اور رکاوٹوں پر قابو پانے کی ہمت برقرار رکھتا ہے اور ان مشکلات کے خلاف جدوجہد کر کے اپنے عزم کو پورا کرنے کے لیے حقیقی روحانی جدوجہد ہے۔ اگر کوئی شخص (تمام مصیبتوں کے خلاف روحانی راستے پر آگے بڑھنے کے لیے) اپنے عزم کو پورا نہ کرے گا تو نفس اس کا عادی ہو جائے گا (یعنی اپنے ارادے سے انکار کر دے گا) اور وہ اپنی زندگی کے اصل مقصد کے حصول اور ابدی خوشی اور لامتناہی فتح کے حصول کے لحاظ سے تباہ ہو جائے گا اور اس کے بجائے، اس کی وجہ سے ابدی نقصان اور غم کا باعث بننے والی نیچے کی طرف بڑھنا ہے۔ اگر خدا نہ کرے، کوئی اپنے عزم سے انحراف کرتا ہے، تو اسے اپنے نفس کو سزا دینی چاہیے جیسا کہ "خود احتسابی اور اپنی تمام خامیوں اور برائیوں کے لیے اپنے آپ کو ذمہ دار بنانا" (باب 18) کے باب میں بیان کیا گیا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے نفس کو سزا دینے میں ناکام رہا [اس کی سستی اور روحانی طور پر آگے بڑھنے کے عزم سے انکار کرنے کی] تو نچلے نفس پر غلبہ حاصل کرے گا اور اب تک کی گئی تمام روحانی جدوجہد ضائع ہو جائے گی۔

روح کی بیماریاں اور صحت کی علامات

واضح رہے کہ جسمانی ہر عضو ایک خاص مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اگر وہ عمل جس کے لیے یہ تخلیق کیا گیا ہے وہ اس کے ذریعہ انجام نہیں دیا گیا ہے یا درد اور مشکل سے انجام دیا گیا ہے تو یہ کہا جائے گا کہ عضو اپنی صحت کھو چکا ہے۔ ہاتھ کی بیماری (یا خرابی) یہ ہے کہ وہ اپنی گرفت کی صلاحیت کھو دیتا ہے۔ آنکھ کی بیماری یہ ہے کہ وہ دیکھنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح دل (یا نفس) کی بیماری یہ ہے کہ وہ اس مخصوص کام کو انجام دینے سے قاصر ہو جاتا ہے جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے اور یہ کہ [دل کا مخصوص کام] علم الہامی، حکمت، معرفت الہامی، محبت الٰہی، عبادت الٰہی ہے، یاد الٰہی میں لذت حاصل کرنا، اس کو اپنی ہر ایک خواہش پر ترجیح دینا اور اس مقصد کے حصول کے لیے اپنی تمام خواہشات اور اعضاء سے مدد حاصل کرنا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَا خَلَقْتُ ٱلْجِنَّ وَٱلْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ

"میں نے پیدا نہیں کیا جن اور میری عبادت کے سوا انسان (سورۃ البقرۃ باب 51، آیت 56)

بہرحال ہر عضو کا کوئی نہ کوئی فائدہ ہوتا ہے۔ دل کا عجیب عمل حکمت اور خدا کی گنوسس ہے۔ انسان میں ایک خاص خوبی یہ ہے کہ اس کے ذریعے انسان کو جانوروں سے ممتاز کیا جاتا ہے کیونکہ جانوروں میں کھانے پینے، دیکھنے اور جماع کرنے کی طاقت بھی موجود ہے۔ انسان کی امتیازی خوبی یہ ہے کہ انسان چیزوں کی حقیقت کو ادراک کرتا ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ تمام چیزوں کی ابتدا، ان کا موجد اور خالق خدا ہے۔ اگر کسی کو کسی چیز کا علم ہو لیکن وہ اس کے موجد کو نہیں جانتا اور پہچانتا تو کہا جائے گا کہ وہ اس چیز کی حقیقت سے بھی واقف نہیں ہے۔ جاننے کی علامت محبت ہے۔ جو خدا کو جانتا ہے وہ بھی اس سے محبت کرے گا اور محبت کی نشانی یہ ہے کہ دنیا میں کسی بھی چیز کو اس پر ترجیح نہیں دی جاتی۔ جس کے دل میں خدا کے سوا کسی اور چیز کی محبت ہو، ایسے شخص کا دل بیمار ہے اور یہ پیٹ کی مانند ہے جو روٹی کھانے کے بجائے گندگی کھانے کی عادت ڈال دیتا ہے۔ ایسے معدے کو بیمار کہا جاتا ہے۔ یہ دل کی بیماریوں کی نشانیاں ہیں اور اس وضاحت سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام دل بیمار ہوتے ہیں سوائے ان کے جن کی اللہ تعالیٰ نے حفاظت کی ہے۔

کچھ بیماریاں اتنی سمجھدار ہوتی ہیں کہ مریض کو ان کا علم بھی نہیں ہوتا۔ دل کی بیماریوں کی صورت حال ایسے ہی ہے اور مریض کو ان بیماریوں کا علم بھی نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ساتھ لاپرواہی برتتی ہے۔ اگر کسی کو بیماری کی حالت کا پتہ چل جائے تو وہ اس کی دوا کی تلخی پر صبر کرنے کی ہمت کھو دے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دل کی بیماریوں کی دوا خواہشات اور خواہشات کی مخالفت کر رہی ہے اور ایسا کرنے کا درد موت کی تکلیف سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی صبر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے تو ، کوئی ماہر ڈاکٹر نہیں ملتا جو [روح کی بیماریوں کا صحیح طریقے سے علاج کرسکے]۔ امراض قلب کے معالج یا معالج (دین) عالم ہو سکتے ہیں لیکن ان کا اپنا دل اس طرح کی بیماریوں میں ملوث ہوتا ہے۔ جب وہ خود کو ٹھیک کرنے سے قاصر ہیں تو وہ دوسروں کا علاج کیسے کر سکتے ہیں؟ اس لحاظ سے دل کی بیماریاں بڑھ گئی ہیں اور لاعلاج ہو گئی ہیں۔ دل کی بیماریوں کے علاج کا علم معدوم ہو چکا ہے کیونکہ نہ تو وہ لوگ رہ گئے جو ان بیماریوں کو سمجھتے ہیں اور نہ ہی ان کا علاج کرنے والے ہیں۔ لوگ دنیاداری کی محبت میں مکمل طور پر ڈوبے ہوئے ہیں اور ایسے اعمال میں مشغول ہیں جن کی ظاہری شکل عبادت ہے اور باطنی (حقیقت) دکھاوا اور دکھاوا ہے۔ اب تک ، حقیقی بیماریوں کی علامات کا ذکر کیا جاتا تھا۔ اب علاج کے نتیجے میں حاصل ہونے والی صحت کی علامات کو سنیں۔

اس سلسلے میں جس بیماری کا علاج کرنے کی ضرورت ہے اسے نظر میں رکھنا چاہیے۔ مثال کے طور پر اگر وہ بیماری کنجوسی ہے جو تباہ کن ہے [اس کی روحانیت، روحانی راہ اور روحانی عزائم کو مٹانے کی داخلی صلاحیت کی وجہ سے] اور خدا سے دوری پیدا کرتی ہے تو اس کا علاج مال اور مادی املاک کو خرچ کرنے سے ہو سکتا ہے۔ لیکن بعض اوقات ، اخراجات میں حد کو عبور کیا جاتا ہے اور یہ فضول خرچی میں داخل ہوجاتا ہے جو ایک بیماری بھی ہے۔ مطلوبہ سطح اعتدال کی ہے [تمام انتہاؤں کے درمیان]۔ اخراجات میں ، درمیانی سطح وہ مقصد ہے جو فضول خرچی اور کنجوسی کی [دو انتہائیوں] کے وسط میں ہے۔ اگر آپ اعتدال پسندی کا نقطہ اور دو چیزوں کا وسط تلاش کرنا چاہتے ہیں تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ ان اعمال پر ایک نظر ڈالیں جو کسی باطنی صفت کے ذریعے وجود میں آئے ہیں۔ اگر یہ عمل آسان اور خوشگوار لگتا ہے تو یہ جان لینا چاہیے کہ باطنی صفت نفس پر غالب ہے۔ مثال کے طور پر اگر دولت جمع کرنے اور ذخیرہ کرنے سے زیادہ مکروہ ہے تو یہ جان لینا چاہیے کہ بخل کی باطنی

صفت نفس پر غالب ہے۔ اس صورت میں مستحق افراد کے حقوق پر خرچ کرنے اور ان کی واپسی کا انتظام کرنا چاہیے۔ اگر نفس کو غیر مستحق افراد پر خرچ کرنے میں خوشی ملتی ہے اور یہ خرچ بچت سے آسان معلوم ہوتا ہے تو اس سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ فضول خرچی نفس پر غالب ہے۔ اس صورت میں ، کسی کو بچت کرنے اور دولت کو فضول خرچی سے روکنے کا سہارا لینا چاہئے۔ نفس پر اسی طرح نظر رکھی جائے اور اس کی حفاظت کی جائے اور دیکھنا اور دیکھنا چاہیے کہ کون سے اعمال نفس کے لیے مشکل ہیں اور کون سا آسان ہے۔ یہ چوکسی اور حفاظت اس وقت تک جاری رہے جب تک کہ دولت اور مادی املاک کی طرف خواہش اور رجحان ختم نہ ہو جائے تاکہ نفس نہ خرچ کرنے میں دلچسپی رکھتا ہے اور نہ ہی ذخیرہ اندوزی کی طرف مائل ہے۔ اس کے بجائے ، یہ پانی کی طرح بن جاتا ہے جسے ضرورت پڑنے پر روکا جاتا ہے اور ضرورت پڑنے پر استعمال کیا جاتا ہے۔ مزید برآں ، بچت پر خرچ کرنے کو ترجیح نہیں دی جانی چاہئے [یا اس کے برعکس]۔ ایک دل جو اس درجے تک پہنچ جاتا ہے (تمام معاملات میں متوازن اعتدال پسندی کا درجہ) تمام تخریبی برائیوں اور منفی باطنی خصلتوں سے پاک اور پاک رہے گا۔

خدا تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ دل کو دنیا کے تمام جالوں اور الجھنوں سے الگ کر دیا جائے تاکہ جب اس دنیا (یعنی موت) کے سفر میں آگے بڑھنے کا حکم آتا ہے تو دل نہ تو کسی چیز کی طرف مائل ہوتا ہے اور نہ ہی اس کی توجہ کسی ذریعہ پر ہوتی ہے کیونکہ اس دنیا سے نکلنا غیر ضروری ہے۔ اس حالت میں نفس کی حضوری میں واپسی نفس کی لطیف (*نفس*) کی واپسی ہو گی جو اپنے رب سے راضی ہے اور رب بھی اس سے راضی ہے۔ یہ وہ نفس ہیں جو انبیاء، اولیاء و اولیاء (*صدیقین*)، شہداء (*شہدا*) اور صالحہ (صالحہ) کے طبقے میں شمار کیے جاتے ہیں [جو غیر مادی اور ماورائی روحانی دائرے میں اپنی کامیابیوں کے لحاظ سے اس ترتیب میں انسانوں کی چار اعلیٰ ترین اقسام میں شامل ہیں اور ابدی خوشی اور لامتناہی فتح کے اعلیٰ درجات حاصل کرنے والے ہیں]۔ خدا نے ایسے نفس کو ان الفاظ سے مخاطب کیا ہے:

يَٰٓأَيَّتُهَا ٱلنَّفْسُ ٱلْمُطْمَئِنَّةُ ﴿٢٧﴾ ٱرْجِعِىٓ إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿٢٨﴾

"اے امن والے! اپنے رب کی طرف لوٹ جاؤ اس حالت سے کہ تم راضی ہو کر اور وہ تم سے راضی ہو جاؤ۔
(سورة البقرة سورة البقرة آیت نمبر 89 آیت 27 تا 28)

دو انتہائی سطح کے درمیان درمیانی سطح انتہائی لطیف ہے۔ اس کے بجائے ، یہ کہنا بہتر ہوگا کہ یہ بالوں سے پتلا اور تلوار سے تیز ہے۔ وہ لوگ جو دنیا کی زندگی میں اس مشکل راستے پر قائم رہیں گے وہ پل *سیرت* (جس کے دوسرے سرے پر جہنم پر ایک تنگ پل ہے جس کے دوسرے سرے پر جنت ہے جو بالوں سے پتلا اور تلوار سے بھی تیز ہے اور ہر شخص کو قیامت کے دن اس پل سے حفاظت کے ساتھ گزرنا پڑے گا جیسا کہ نبوی کی تعلیمات میں بیان کیا گیا ہے)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان متوازن اعتدال (سیرت المستقیم) کے اس درمیانی راستے کے ایک یا دوسرے طرف جھکاؤ *رکھتا ہے* اور اسی وجہ سے دل اس طرف سے وابستہ ہوتا ہے جس کی طرف وہ جھکتا ہے۔ وہ لوگ جو خدا سے ڈرتے ہیں، تقدس اور خوف رکھتے ہیں وہ وہی ہیں جو اس سے دور ہونے کے بجائے متوازن اعتدال (سیرت المستقیم*) کے درمیانی راستے کے قریب رہے* ہیں۔ نظم و اعتدال کے درمیانی راستے میں استقامت برقرار رکھنے کی دشواری کے پیش *نظر قرآن* مجید کی ابتدائی *سورۃ* جو ہر روز سترہ مرتبہ واجب نمازوں میں پڑھی جاتی ہے، اس نماز کو واجب قرار دیا گیا ہے:

اَهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ

"[اے خدا!] ہمیں صراط مستقیم کی طرف رہنمائی فرما (متوازن اعتدال کا درمیانی راستہ) (*سیرت المستقیم*)." (سورۃ البقرۃ الباب 1 آیت 6)

اگرچہ متوازن اعتدال کے سیدھے راستے پر قدم رکھنا بہت مشکل ہے لیکن اس کے زیادہ سے زیادہ قریب رہنے میں کسی قسم کی غفلت نہیں برتنی چاہیے۔ اگر کوئی عین متوازن اعتدال حاصل کرنے سے قاصر ہے تو اسے یہ بات واضح طور پر سمجھ لینا چاہیے کہ ابدی نجات کا دارومدار صرف نیک اعمال پر ہے اور نیک اعمال خوبصورت اخلاق، آداب، باطنی صفات، کردار کی صفات اور مزاج سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہر غلام کو چاہیے کہ وہ اپنی صفات، اخلاق، آداب، باطنی کردار اور مزاج کا معائنہ کرے تاکہ اگر کوئی خامیاں ہوں تو ان کو دور کیا جا سکے۔

اپنی غلطیوں کو تلاش کرنے کا طریقہ

جس کے ساتھ خدا نیکی کرنا چاہتا ہے، وہ اپنی غلطیوں سے آگاہ کرتا ہے۔ گہری بصیرت رکھنے والے شخص میں اپنے اوپر کوئی عیب پوشیدہ نہیں ہوتے، اور جب عیب و نقص کا علم ہو جاتا ہے تو ان کا علاج آسان ہو جاتا ہے، لیکن اکثر لوگ اپنے عیبوں سے بے خبر ہوتے ہیں۔ حالات ایسے ہیں کہ دوسروں میں چھوٹی چھوٹی خامیاں نظر آتی ہیں لیکن اپنے اندر بڑی خامیاں نظر نہیں آتیں۔ اپنی غلطیوں کو پہچاننے کے چار طریقے ہیں:

پہلا طریقہ: ایک ایسے مرشد کے اجتماع میں شرکت کرنی چاہیے جو نفس کی خامیوں اور اس کی پوشیدہ تخریبی صلاحیتوں سے واقف ہو۔ کسی کو ایسے مرشد کی بات سننی چاہیے اور روحانی جدوجہد کے حوالے سے ہدایات پر عمل کرنا چاہیے۔ یہ حال ایک طالب (*مرید*) کی روحانی مرشد (*مرشد*) کے ساتھ اور ایک طالب علم کی استاد کے ساتھ ہے۔ ایک روحانی مرشد متلاشی کو آگاہ کرتا ہے اور ایک استاد طالب علم کو اپنے اندرونی عیبوں اور خامیوں سے آگاہ کرتا ہے اور ان سے چھٹکارا پانے کے طریقے تجویز کرتا ہے۔ اس دن اور عمر میں ، ان لوگوں کو تلاش کرنا نایاب ہے جو اس طریقہ کار پر عمل کرتے ہیں۔

دوسرا طریقہ: ایک مخلص، وفادار، ذہین اور خدا شناس دوست کی تلاش کرے اور اپنے نفس پر نگران مقرر کرے تاکہ ایسا دوست اپنے باطنی حالات اور اعمال پر نظر رکھے اور اس کے ظاہری یا باطنی وجود میں جو بھی عیب نظر آئے اسے اس کے بارے میں خبردار کرنا چاہیے۔ راہ خدا کے بڑے پیشرو علماء نے اسی طریقے پر عمل کیا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلیفہ دوم کے مددگار اور صحابی فرمایا کرتے تھے: اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم کرے جو مجھے میرے گناہوں سے آگاہ کرے۔ ایک مرتبہ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ان کے پاس آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ اگر تم نے میرے بارے میں کوئی بری بات سنی ہے تو

مجھے بتائیں تاکہ میں اپنے آپ کو درست کر سکوں۔ سلمان رضی اللہ عنہ نے جواب دینے سے عذر خواہ ہونے کی کوشش کی لیکن جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اصرار کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے سنا ہے کہ تمہارے کھانے کی چٹائی پر دو پکوان ہیں اور تمہارے پاس دو جوڑے کپڑے ہیں، ایک رات کے لیے اور ایک دن کے لیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیا تمہیں اس کے سوا اور کوئی اور علم ہو؟ سلمان رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ان دونوں باتوں سے مطمئن رہو (کیونکہ ان میں سے کوئی بھی بات درست نہیں ہے کیونکہ میں کھانے کے لیے صرف ایک ہی چیز کھاتا ہوں اور کپڑے کا صرف ایک جوڑا رکھتا ہوں]۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حذیفہ رضی اللہ عنہ سے ان کے عیبوں کے بارے میں پوچھتے تھے اور ان سے پوچھتے تھے کہ تم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس راز کا شریک ہو کہ منافق کون ہیں۔ کیا آپ کو بھی مجھ میں منافقت کی کوئی علامت نظر آتی ہے؟" غور کیجئے کہ کس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی عظمت کے باوجود اپنے آپ کو مورد الزام ٹھہراتے تھے اور لوگوں پر زور دیتے تھے کہ وہ انہیں اپنی غلطیوں کے بارے میں بتائیں۔

جس کی عقل زیادہ ہے اور [روحانی] مقام اعلیٰ ہے، وہ خود راستبازی یا خود تکبر کی بیماری سے متاثر نہیں ہوگا (عجب یا خود کو بڑھا چڑھا کر ہر چیز کے بارے میں صحیح سمجھنا) سوائے ایک چھوٹی سی حد تک [جسے روحانی جدوجہد کے ذریعے بھی دور کیا جا سکتا ہے]۔ ایسا شخص نفس کو نیکی اور پاک ہونے کے بجائے غلط اور اس کے برائیوں پر نظر رکھنے کے لائق سمجھتا رہتا ہے (اس کی مثال عمر رضی اللہ عنہ کی مثال ہے۔ آج کے دور میں ایسے دوست تلاش کرنا مشکل ہے جو بغیر کسی رعایت کے کسی کو اپنی غلطیوں سے آگاہ کریں۔ زیادہ تر دوست خوشامد کرنا پسند کرتے ہیں اور کسی غلطی کو مہارت (یا فخر کرنے کے لئے کوئی اچھی چیز) کہنے میں کوئی مسئلہ نہیں پاتے ہیں اور ایسا کرنے کے بارے میں سوچتے ہیں [اچھے دوست بن کر] دوستی کے حقوق کو پورا کرنا۔ کچھ دوست حسد کا مزاج رکھتے ہیں اور ان کو بتانے میں غلطیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ مخلص، بے لوث اور سچے دوست کا وجود شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گنوسٹک داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ نے ایسے لوگوں سے خود کو الگ کر لیا۔ کچھ لوگوں نے اس سے پوچھا: تم لوگوں سے کیوں نہیں ملتے؟ اس نے جواب دیا: "میں ان دوستوں سے مل کر کیا کروں گا جو مجھے میری غلطیوں سے آگاہ نہیں کریں گے؟"

جو لوگ دین سے محبت کرتے ہیں ان کی سب سے بڑی خواہش ہوتی ہے کہ دوسرے لوگ ان کے سامنے ان کی غلطیوں کی نشاندہی کریں۔ اس دنیا میں جو ذلت محسوس کی جاتی ہے وہ آخرت کی ذلت کے مقابلے میں بہت کم ہے [جس میں ان عیبوں کو اپنی روح کی گہرائیوں میں پناہ دینے کے نتائج ہوں گے]۔ لیکن اب عوام کے ساتھ صورتحال اس کے برعکس ہے۔ ایسے دوست دشمنوں کی فہرست میں خود کو سب سے اوپر پاتے ہیں جو ہمیں ہماری غلطیوں سے آگاہ کرتے ہیں اور ہمیں ان کے بارے میں مشورہ دیتے ہیں۔ یہ ہمارے ایمان کی کمزوری کی علامت ہے کہ جب ہماری غلطیوں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے تو ہم ناراض اور غصے میں آجاتے ہیں۔ بد اخلاق، آداب، باطنی کردار کی خصوصیات، صفات اور مزاج کی تشبیہ سانپ اور بچھو کی طرح ہے۔ اگر یہ مہلک مخلوق آپ کے کپڑوں میں داخل ہو جائے اور کوئی آپ کو ان کے نقصانات سے آگاہ کرے اور آپ کو ان سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کا مشورہ دے یا اس صورتحال میں آپ کو ان سے بچانے کا کوئی طریقہ بتا دے تو کیا وہ شخص آپ کا دشمن بن جائے گا؟ بالکل نہیں! ہمیں ایسے شخص کا شکر گزار ہونا چاہیے اور بچھو وغیرہ سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرنی چاہیے، اگرچہ بچھو کے زہر کا اثر ایک یا دو دن تک برقرار رہے گا، تاہم بد اخلاق، آداب، اندرونی کردار کی خصلت، صفات اور مزاج کا اثر موت کے بعد بھی برقرار رہے گا۔ پھر کیا بات ہے کہ ہم اپنے مشیر اور خیر خواہ کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں اور ایسے شخص کی طرف سے بتائی گئی خامیوں کو دور نہیں کرتے ہیں؟ اس کے بجائے ، ہم اس شخص میں خامیاں تلاش کرنا شروع کردیتے ہیں تاکہ ایسا شخص مستقبل میں ہمیں مشورہ دینے کی ہمت نہ

کرسکے۔ ہمارے خیر خواہ کو دشمن سمجھنا ان لوگوں کو کرتا ہے جن کے دل حد سے زیادہ گناہوں کی وجہ سے سیاہ اور سخت ہو گئے ہیں۔ یہ ایمان کی کمزوری کا کام ہے۔ اے اللہ! ہمیں راستی و ہدایت کا راستہ دکھائیں اور ہمیں ہماری عیبوں سے آگاہ فرما اور ہمیں ان کو مٹانے کی توفیق عطا فرما اور ہمیں ان لوگوں کا شکر ادا کرنے کی توفیق عطا فرما جو ہمیں ہمارے عیبوں سے آگاہ کرتے ہیں۔ *آمین*! (آمین!)

تیسرا طریقہ: دشمنوں کے وسیلے سے اپنے عیبوں کا علم حاصل کرنا چاہیے کیونکہ دشمنوں کی آنکھوں میں عیب کے سوا کچھ نظر نہیں آتا، اور ان کی زبانیں عیب کے سوا کچھ نہیں کہتیں۔ اس کے بارے میں میرا خیال یہ ہے کہ ان دوستوں کے مقابلے میں جو خوشامد کرنا پسند کرتے ہیں ، غلطی چننے ، غلطی دیکھنے اور غلطی بولنے والے دشمنوں سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دوست عام طور پر تعریف کرتے ہیں ، اور ان کی آنکھیں صرف اچھی چیزیں دیکھتی ہیں اور ان کی زبانیں صرف اچھی بولتی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ انسان اپنی فطری فطرت میں اپنے دشمنوں کو مسترد کرتا ہے اور ان کی طرف سے آنے والی ہر چیز کو حسد کی وجہ سے سمجھتا ہے۔ تاہم بصیرت رکھنے والے لوگ اپنے دشمنوں سے بھی فائدہ اٹھاتے ہیں۔

چوتھا طریقہ: انسان کو لوگوں کے ساتھ گھل مل جانا چاہیے اور ان میں جو بھی خامیاں نظر آئیں وہ ان کو سامنے رکھ دیں اور نفس (*نفس*) کو اگر وہ اپنے نفس میں پائے جائیں تو ان پر الزام لیں۔ مومن مومن کا آئینہ ہے [جس کی حدیث میں بیان اور تصدیق کی گئی ہے]۔ ہر شخص کو چاہیے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی (یا بہن) کے آئینے میں اپنی تصویر کو دیکھے اور اپنی عیبوں کے ذریعے اپنی خامیوں کا پتہ لگائے اور اس بات پر غور کرے کہ خواہشات کی پیروی کرنے کے معاملے میں عام طور پر مزاج ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں۔ جو چیز ایک میں موجود ہے، اس کا حصہ یا مکمل دوسرے میں بھی ہوگا۔ ان اصولوں کی روشنی میں انسان کو اپنے عیبوں کا پتہ لگانا چاہیے اور ان کے دل کو پاک کرنا چاہیے۔ اگر اچھے آداب اور اطراف کی تطہیر کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا جائے تو ہر شخص کی اصلاح خود بخود ہو گی کیونکہ آداب کے مرشد اور استاد کی ضرورت نہیں رہے گی۔ کسی نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھا: تمہیں اخلاق اور آداب کس نے سکھایا؟ آپ نے جواب دیا: "مجھے کسی نے ادب نہیں سکھایا ، جاہلوں کی جہالت مجھے بری لگتی تھی، اس لیے میں نے اپنے آپ کو اس سے الگ کر دیا"۔ یہ ان لوگوں کا طریقہ ہے جن کو کوئی ایسا استاد (روحانی رہنما) نہیں ملتا جو فضیلت ، بصیرت ، الہامی علم اور عقل جیسی صفات کا مالک ہو ، جو تہذیب اور اپنی ذات کی تطہیر کرنے کے بعد اب خدا کے بندوں (یعنی ساتھی انسانوں) کی تعلیم اور تہذیب میں مصروف ہے اور انہیں شفقت کے ساتھ نصیحت کرتا ہے اور انہیں نیک راہ پر گامزن کرتا ہے۔ جس کے پاس ایسے [روحانی] استاد کی صحبت ہے، وہ گویا ایک چلنے والے ہسپتال کے قبضے میں ہے جہاں [روح] کی ہر [باطنی] بیماری کا علاج دستیاب ہے۔ انسان کو ایسے استاد کے ساتھ منسلک رہنا چاہیے جو کسی کی [باطنی] بیماریوں کا علاج کرے گا اور اسے تباہی سے بچائے گا۔

خواہشات اور خواہشات اور اس کے منتقل ہونے والے ثبوتوں اور شریعت الٰہی سے دلوں کی شہادت کو رد کرنے کے ذریعے دل کی بیماریوں کا علاج

اگر آپ مندرجہ بالا تفصیلات پر غور کریں گے تو آپ کے لیے بصیرت کے دروازے کھل جائیں گے اور علم اور یقین کی روشنی سے روح کی بیماریاں اور علاج کا طریقہ واضح ہو جائے گا۔ البتہ اگر آپ غور و فکر سے بیماریوں اور

ان کا علاج جاننے سے قاصر ہیں تو پھر بھی اس راستے پر عمل کرنا اور غیب پر ایمان کے ذریعے ان کا پتہ لگانا چاہیے کیونکہ ایمان کی درجہی الگ ہے اور علم کی درجہی اس سے الگ ہے۔ ایمان کے بعد علم حاصل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَرْفَعِ ٱللَّهُ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ مِنكُمْ وَٱلَّذِينَ أُوتُوا۟ ٱلْعِلْمَ دَرَجَٰتٍ

"اللہ تعالیٰ تم میں سے ایمان والوں اور علم والوں کے درجات بلند کرے گا۔" (سورة البقرة باب ۵۸، آیت ۱۱)

چنانچہ جس نے بغیر کسی جواز کے اس بات کا ثبوت دیا کہ خدا تک پہنچنے کا واحد راستہ خواہشات کی مخالفت ہے، وہ ایمان والوں کا درجہ حاصل کر چکا ہے اور جس نے اس راز کی حقیقت کو حاصل کیا وہ ایمان کے ساتھ ساتھ علم سے نوازا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان اور اہل علم دونوں سے بھلائی کا وعدہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَكُلًّا وَعَدَ ٱللَّهُ ٱلْحُسْنَىٰ

"اور خدا نے دونوں سے بھلائی کا وعدہ کیا ہے۔" (سورة البقرة باب 4 آیت 95)

شریعت الٰہی کے شواہد: اس حقیقت کی تصدیق ہے کہ خواہشات کو ترک کرنا خدا تک پہنچنے کا واحد راستہ ہے اور علماء کرام کی آیات، احادیث نبوی اور اقوال سے ثابت ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِۦ وَنَهَى ٱلنَّفْسَ عَنِ ٱلْهَوَىٰ ﴿٤٠﴾

فَإِنَّ ٱلْجَنَّةَ هِىَ ٱلْمَأْوَىٰ ﴿٤١﴾

"وہ شخص جو اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا اور نفس کو حقارت کی خواہشات اور ضد کی بے وقوفی سے روکتا ہے۔"*حوا*)، ایسے شخص کا آخری ٹھکانہ جنت ہو گا۔" (سورة البقرة باب 79، آیہ 40-41)

أُو۟لَٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ ٱمْتَحَنَ ٱللَّهُ قُلُوبَهُمْ لِلتَّقْوَىٰ

"یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو خدا نے پاکیزگی سے پاک کر دیا ہے، خدا سے ڈرتے اور خوف کے لئے ہے۔"*تقویٰ[ترمیم]*)۔" (سورة البقرة باب ۴۹، آیت ۳)

اس کی وضاحت یہ ہے کہ خدا نے ان کے دلوں سے نچلے نفس سے خواہشات کی محبت کو نکال دیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

المؤمن بين خمس شدائد‘ مؤمن يحسده‘ ومنافق يبغضه‘ وكافر يقاتله‘ وشيطان يضله‘ ونفس تنازعه

"مومن پانچ مصیبتوں کے بیچ میں ہے: دوسرا مومن ایک سے حسد کرتا ہے، منافق کسی سے دشمنی کرتا ہے، کافر کسی سے لڑتا ہے، شیطان کسی کو گمراہ کرتا ہے اور نفس اس سے جھگڑتا ہے"۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث کا مجموعہ *مکارم الاخلاق* عن انس رضی اللہ عنہ

اس نبوت کی روایت بتاتی ہے کہ نفس ایک جھگڑا کرنے والا دشمن ہے اور اس کے خلاف [روحانی] جدوجہد ضروری ہے۔ ایک روایت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر وحی فرمائی: اے داؤد! اپنے ساتھیوں کو خوف زدہ کر دو کہ نچلی نفسوں کی خواہشات کو آسان بنا دیں کیونکہ ایسے دلوں کی عقل خواہشات سے جڑی ہوئی ہے اور وہ (دل) میرے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: "بشارت ہو اس شخص کے لیے جو مستقبل کے لیے وعدہ کردہ چیزوں کی خاطر موجودہ خواہشات اور خواہشات کو چھوڑ دیتا ہے"۔ انہوں نے مزید کہا:

المجاهد من جاهد نفسه في طاعة الله عز وجل

"[خدا کی راہ میں] سخت کوش وہ ہے جو خدا کی اطاعت میں ادنیٰ نفس [اور اس کی خواہشات] کے خلاف [روحانی] جدوجہد کرتا ہے۔" (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *فظلہ بن* سعید رضی اللہ عنہ سے حدیث کے مجموعے ترمذی *اور* ابن ماجہ

اولیاء کرام اور غنوسٹک کے اقوال: سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "میں نے نفس کو شفا دینے سے زیادہ مشکل کوئی علاج نہیں پایا۔ نفس کبھی فائدہ مند ہوتا ہے اور کبھی نقصان دہ ہوتا ہے۔ ابو العباس مسلی رحمۃ اللہ علیہ اپنے نفس سے یہ کہتے تھے: تم نہ تو شہزادوں کی طرح دنیا سے لطف اندوز ہوتے ہو اور نہ ہی نمازی کی طرح روحانی کشمکش کرتے ہو۔ کیا تم مجھے جنت اور جہنم کے درمیان جیل میں ڈال دو گے؟ تمہیں شرم نہیں آتی؟" حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جنگلی گھوڑے کے مقابلے میں نفس کو گھوڑے کی زیادہ محتاج ہوتی ہے کیونکہ وہ جنگلی گھوڑے سے زیادہ دوڑتا ہے۔ یحییٰ بن معاذ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: روحانی کشمکش کی تلوار سے نفس سے لڑو اور وہ تلوار یہ ہے کہ انسان کم کھائے، کم سوئے، ضرورت پڑنے پر ہی بات کرے اور لوگوں کی مشکلات پر صبر کرے۔ خواہشات اور خواہشات کم کھانے سے ختم ہو جاتی ہیں، کم نیند لینے سے اپنے ارادے میں پاکیزگی پیدا ہوتی ہے، کم بات کرنے سے آزمائشوں اور مصیبتوں سے بچا لیا جاتا ہے اور لوگوں کی تکلیف اور مصائب پر صبر کرنے سے اپنے مقصد اور منزل تک پہنچنے میں کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ کسی کے لیے سب سے مشکل معاملہ درد اور مصائب کے وقت صبر اور مصیبت کے وقت صبر کرنا ہے۔ چنانچہ جب نفس میں خواہشات اور خواہشات پیدا ہوتی ہیں یا بیکار باتوں کی لذت اور مٹھاس بڑھ جاتی ہے تو اس وقت کم نیند کی میان سے کم کھانے کی تلوار نکال کر خاموشی کے ہاتھوں سے جان لیوا وار کرے تاکہ نفس اپنے ظلم سے باز آجائے۔ اور اس سے آنے والی مصیبتیں ٹھنڈی ہو جائیں گی اور دل پاک ہو جاتا ہے اور خواہشات اور خواہشوں کی گندگی سے پاک ہو جاتا ہے۔ اگر نفس کے ساتھ ایسا سلوک کیا جائے تو وہ پاک ہو جائے گا، پاک ہو جائے گا، روشن اور ہلکا پھلکا ہو جائے گا، نیکی کے میدان اس کی راہیں ہوں گے، اطاعت کی وادیاں اس کے راستے ہوں گی اور وہ ان کھیتوں اور وادیوں میں اس طرح دوڑے گا جیسے گھوڑے میدانی علاقوں میں بلا روک ٹوک دوڑتا ہے یا کسی باغ میں بادشاہ کی طرح ٹہلتا رہے گا۔

یحییٰ بن معاذ رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے: انسان کے تین دشمن ہیں: دنیا، شیطان اور نفس۔ اپنے آپ کو دنیا (یا دنیاداری) سے پرہیز کے ذریعے محفوظ رکھو، شیطان کی مخالفت کر کے اس پر غلبہ حاصل کرو، اور خواہشات اور خواہشات کو ترک کر کے نفس کو محکوم کرو۔ ایک حکیم مرشد نے کہا: "جس شخص پر نفس غالب ہو وہ خواہشات کا قیدی ہے، اس کے پاؤں خواہشات کی زنجیروں میں جکڑ جاتے ہیں، عقل کی طرف سے رہنمائی نہیں ہوتی، وہ (خواہشات اور خواہشات) اسے پکڑ لیتے ہیں اور جہاں چاہیں لے جاتے ہیں، اور دل کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ علم و دانش کے تمام اہل اس بات پر متفق ہیں کہ آخرت کی (یعنی جنت) کی نعمتیں اس دنیا کی نعمتوں کو الوداع کیے بغیر حاصل نہیں ہوتیں [جبکہ اس دنیا کی غیر مادی (روحانی) نعمتیں اس دنیا سے نہیں ہیں)۔ حضرت ابویحییٰ وراق

رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "جس نے خواہشات اور خواہشات میں مبتلا ہو کر اعضاء کو خوش کیا تو اس نے دل کی سرزمین میں رسوائی کا بیج بویا ہے"۔ وہیب بن الورد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: روٹی کے سوا کوئی چیز ادنیٰ نفس کی خواہشات میں سے ہوتی ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ جو شخص دنیا کی خواہشات اور خواہشات سے محبت رکھتا ہے اسے آخرت کی ذلت کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ جب حضرت یوسف علیہ السلام کو مصر کے خزانوں کا ذمہ دار بنایا گیا اور آپ نے مصر کے بارہ ہزار اشرافیہ کے ایک شاندار جلوس کی قیادت کی تو ذلیخہ (مصر کے وزیر کی بیوی جو کم عمری میں حضرت یوسف علیہ السلام سے محبت کر گئی) نے کئی دہائیوں کی قید کے بعد ان سے شادی کر لی۔ رہائی اور مصر کے خزانوں کے نگران کے طور پر تقرری) اس سے کہا: "اے یوسف! لالچ اور خواہشات نے بادشاہوں کو غلام بنا دیا اور صبر اور پرہیزگاری نے خدا کی تقدس اور خوف (*تقویٰ*) غلاموں کو بادشاہ بنا دیا۔
حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق درست ہے:

إِنَّهُۥ مَن يَتَّقِ وَيَصۡبِرۡ فَإِنَّ ٱللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجۡرَ ٱلۡمُحۡسِنِينَ

"بیشک جو شخص پرہیزگاری اور پرہیزگاری اور پرہیزگاری کے ساتھ گناہوں سے باز رہتا ہے اور صبر کرتا ہے تو اللہ نیک کاروں کے لیے ان اعمال کو ضائع نہیں کرتا۔" (سورۃ البقرۃ القرآن، سورۃ البقرۃ آیت ۹۰)

جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک رات میں جاگ کر نماز پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میں وہ لذت حاصل نہ کر سکا جس کا میں عادی تھا۔ میں نے سونے کی کوشش کی لیکن نہیں سو سکا، اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی لیکن نہیں کر سکا۔ اس سے مجبور ہو کر میں باہر آیا اور دیکھا کہ ایک شخص کمبل میں لپٹا ہوا سڑک کے کنارے پڑا ہوا ہے۔ جب اس نے میرے قدموں کی آہٹ سنی تو اس نے مجھے اپنے پاس آنے کو کہا۔ میں نے اس سے کہا: تم نے مجھے اپنی آمد کی اطلاع نہیں دی! اس نے کہا: میں نے اللہ سے دعا کی ہے کہ وہ تیرا دل میری طرف مائل کرے۔ میں نے کہا: "خدا نے تمہاری دعا سنی ہے، اب مجھے اپنا مقصد بتاؤ [یہاں آنے] کا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابو القاسم! مجھے بتاؤ نفس کا علاج کیا ہے؟ میں نے کہا: 'جب کوئی شخص اپنی خواہشات کی مخالفت کرتا ہے تو نفس اس سے تکلیف اور اذیت محسوس کرتا ہے لیکن یہی اس کا علاج اور دوا ہے'۔ آپ نے فرمایا: اے نفس! سنو! میں نے آپ کو سات بار یہی جواب دیا، لیکن آپ نے میری بات نہیں سنی۔ اب جنید بھی یہی بات سمجھ رہے ہیں۔ کیا تم اس کی بات نہیں سنو گے؟" کسی نے عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ سے پوچھا: میں کب بولوں؟ آپ نے فرمایا: جب تم خاموش رہنے کی خواہش کرو۔ اس نے پوچھا: "میں کب خاموش رہوں؟" فرمایا جب تم بولنا چاہو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جو شخص جنت میں جانا چاہتا ہے اسے دنیا میں خواہشات سے دور رہنا چاہیے۔ مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ بازار جاتے تھے اور جب کوئی اچھی چیز دیکھتے تھے اور دل اس کو خریدنے کی طرف مائل ہوتا تھا تو اپنے نفس کو تسلی دیتے تھے اور صبر کی نصیحت کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اللہ کی قسم! میں آپ کو اس سے منع کرتا ہوں کیونکہ آپ کی عظمت اور عظمت [آپ کے پاس اعلیٰ روحانی بلندیوں کو چڑھنے کی صلاحیت ہے]"۔

علماء کرام کا متفقہ فیصلہ: تمام علماء اور اہل حکمت کا متفقہ فیصلہ ہے کہ آخرت میں ابدی سعادت اور لامتناہی فتح حاصل کرنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ نفس کو ضدی غلط حماقت سے دور رکھا جائے (*حوا* - ہر چیز میں حق ہونے کے بارے میں انا پرستی اور خود فریبی سے پیدا ہونے والے یقین سے پیدا ہوتا ہے) اور لالچ سے دور رہنا اور اسے خواہشات اور خواہشات کی پیروی کرنے سے روکنا ہے۔ خود کو کم کریں۔ اس سلسلے میں اس فیصلے پر ایمان لانا اور اس پر عمل کرنا واجب ہے۔ روحانی کشمکش کا نتیجہ اور خلاصہ یہ ہے کہ نفس صرف ضرورت کے مطابق ان چیزوں سے فائدہ اٹھاتا ہے جو قبر میں کسی کے ساتھ نہیں جائیں گی جیسے کپڑے، شادی، کھانا، پینا، رہائش وغیرہ، جو زندگی کے لیے ضروری ہیں۔ ان اشیاء کی مطلوبہ مقدار کی حد کو عبور کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ انسان ان چیزوں سے محبت کرتا ہے اور مرنے کے بعد دنیا میں واپس آنا چاہتا ہے اور صرف وہی شخص دنیا میں واپس آنے کی خواہش کر سکتا ہے جس کا آخرت کے جزا اور اجر میں کوئی حصہ نہ ہو۔ اس دنیا کا

رفاقت ایک بیماری ہے اور اس بیماری سے نجات کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کا دل خدا کی محبت، معرفت، ذکر اور غور و فکر میں مکمل طور پر مشغول ہو اور انسان دنیاوی چیزوں سے صرف اس حد تک مطمئن رہے کہ وہ اس عیش و عشرت میں رکاوٹ نہ بنیں۔ یہ صورت حال صرف اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اس کی عطا کردہ قدرت اور طاقت سے ہی ہوتی ہے۔

چار قسم کے لوگ: جو لوگ اس حقیقی روحانی ورزش تک پہنچنے کے قابل نہیں ہیں انہیں یقینا اس کے قریب درجوں تک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس لحاظ سے چار قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ بعض لوگ ایسے ہیں کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں مگن ہو جاتے ہیں۔ معاشی ضرورت کو چھوڑ کر ، ان کی توجہ دنیا پر نہیں ہے۔ یہ لوگ *صدیقین* کے زمرے میں شامل ہیں (انبیاء علیہم السلام کے بعد لوگوں کی دوسری سب سے بڑی قسم جنہیں گنوسٹک بھی کہا جاتا ہے یا وہ لوگ جو حق کے لیے وقف ہیں، اور روحانی جدوجہد کے نتیجے میں خدا کی معرفت، دوستی اور قربت حاصل کر چکے ہیں)۔ یہ اعلیٰ روحانی درجہ ایک بلند روحانی جدوجہد اور طویل عرصے تک خواہشات اور خواہشات کو ترک کرنے کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے۔ دوسری قسم میں وہ لوگ شامل ہیں جن کا دل دنیا میں ہر لمحہ ڈوب جاتا ہے (دنیاداری یا مادی وجود)۔ اگر وہ خدا کو یاد بھی کریں تو اس کا صرف زبان پر ہے اور دل کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ تباہی کی طرف جانے والوں کے زمرے میں شامل ہیں [اس کے بعد کی زندگی میں] [کیونکہ انہوں نے ابدی زندگی کے لئے کام نہیں کیا اور ان کی توجہ مکمل طور پر اس دنیا کی مادی زندگی پر تھی]۔ تیسری قسم کے لوگوں میں وہ لوگ شامل ہیں جو *دین* اور دنیا دونوں میں مصروف ہیں لیکن دین دل پر حاوی ہے۔ انہیں عذاب الٰہی ملے گا لیکن جلد ہی اس سے چھٹکارا حاصل کر لیں گے جو دل پر الٰہی خدشات کے غلبے کی حد کے مطابق ہے۔ چوتھی قسم کے لوگوں میں وہ لوگ شامل ہیں جو دین اور دنیا دونوں میں مصروف ہیں لیکن ان کے دل پر دنیاوی خدشات الٰہی کے خدشات غالب ہیں۔ ان لوگوں کو نسبتا طویل عرصہ تک عذاب الٰہی کا نشانہ بنایا جائے گا لیکن آخر میں اس کا سامنا کرنے کے بعد اس سے نکل آئیں گے کیونکہ اگرچہ دنیا ان کے دلوں پر حاوی تھی لیکن وہ *دین* سے بھی محروم نہیں تھے۔ الٰہی یاد کی طاقت ان کی نجات کا ذریعہ ہوگی۔

جائز چیزوں سے لذت: بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جائز چیزوں سے لذت حاصل کرنا قابل قبول ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ سے دوری کا سبب نہیں بنتی۔ ان کا یہ خیال غلط ہے۔ حقیقت ان لوگوں پر نازل ہوئی جنہوں نے دنیاداری کی محبت کو تمام گناہوں کی جڑ قرار دیا ہے اور جن کی رائے میں تمام نیک اعمال اس محبت میں ضائع ہو جاتے ہیں۔ اپنی ضرورت سے زائد جائز چیزوں کا ہونا اگرچہ جائز ہی کیوں نہ ہو، دنیاداری میں شامل ہے اور انسان کو خالق سے دور کر دیتا ہے۔ حضرت ابراہیم الخواص رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ایک مرتبہ میں کوہ لکم پر مقیم تھا تو میں نے ایک درخت پر انار دیکھا۔ میں اسے کھانا چاہتا تھا ، لہذا میں نے درخت سے ایک کھینچ لیا اور جب میں نے اسے کھایا تو یہ کھٹا تھا۔ میں نے اسے پھینک دیا اور اپنے راستے پر چل پڑا۔ میں نے راستے پر ایک آدمی کو دیکھا جو بار بار شہد کی مکھیوں کے ڈنک اٹھا رہا تھا۔ اس نے مجھے پکارا اے ابراہیم! میں نے حیرت سے جواب دیا: 'تم کون ہو اور مجھے کیسے جانتے ہو؟' آپ نے فرمایا: جو خدا کو جانتا ہے اس سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں ہے۔ میں نے کہا: "تم ایک خدا پرست سنت ہو۔ آپ اپنے لیے خدا سے دعا کیوں نہیں کرتے کہ وہ آپ کے لیے شہد کی مکھیوں اور ان کی تکلیف سے چھٹکارا حاصل کرے'۔ اس نے جواب دیا: آپ بھی ایک خدا پرست سنت ہیں۔ آپ نے خدا سے دعا کیوں نہیں کی کہ آپ کے دل سے انار کی خواہش کو دور کردے؟ شہد کی مکھیوں کا درد صرف اس دنیا میں ہے۔ خواہشات اور خواہشات کی وجہ سے پیدا ہونے والے مصائب مرنے کے بعد بھی آپ کو نہیں چھوڑیں گے۔ میں اس کا کوئی جواب نہیں دے سکا اور آگے بڑھتا رہا۔ ساری سقاطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: چالیس سال سے میرا دل چاہتا ہے کہ میں کھجور کے امرت میں روٹی ڈبو کر کھاؤں، لیکن میں نے اس تجویز کو دل سے قبول نہیں کیا۔

جائز امور سے پرہیز کرنا: نفس کی اصلاح اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ اسے جائز امور کی لذتوں سے روکا نہ جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان جائز امور کی لذتوں سے تجاوز کرنے اور ناجائز کاموں میں ملوث ہونے کا ذمہ دار ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی چاہتا ہے کہ اپنی زبان غیبت اور فضول باتوں میں الجھی نہ جائے تو اسے صرف ذکر الٰہی کے الفاظ اور روحانی ضروریات سے متعلق باتیں ادا کرنی چاہئیں۔ باقی معاملات میں خاموشی اختیار کرنی چاہیے، اگرچہ وہ جائز ہی کیوں نہ ہوں، یہاں تک کہ گفتگو کی ہوس ختم ہو جائے اور زبان حق کی عادت ڈال جائے۔ اس صورت میں بولنا بھی عبادت بن جائے گا اور خاموشی بھی عبادت بن جائے گی۔ آنکھ کی حالت بھی ایسی

ہی ہے۔ اگر اسے ہر اچھی چیز دیکھنے کا عادی ہے تو کسی دن وہ بھی کچھ بری نظر آئے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو چیز حلال اور حلال ہے اس کی ہوس کا سبب بنتی ہے، حرام اور باطل کی خواہش کو بھی جنم دیتی ہے۔ اس لحاظ سے شہوت ایک ہے اور اسے حرام سے روکنا واجب ہے۔ اگر کوئی شخص صرف ضروری چیزوں سے قناعت کی عادت نہ ڈالے تو شہوت اس پر غالب آجائے گی اور یہ ہوس جو ابتدا میں حلال سے متعلق تھی، اپنی حد سے تجاوز کر کے حرام تک پہنچ جائے گی۔ یہ حلال (مبح) کے کم سے کم نقصان میں سے ہے اور اس کے علاوہ اور بھی بہت سے نقصانات ہیں۔ ان نقصانات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ نفس دنیاوی لذتوں سے خوش ہو جاتا ہے اور اپنے لیے سکون اور سکون تلاش کرتا ہے اور ان کی (یعنی دنیاوی لذت) میں اس قدر مست ہو جاتا ہے کہ انسان اپنے آپ سے غافل ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو بھول جاتا ہے۔ یہ خوشی اور اس کے نتیجے میں نشہ ایک مہلک زہر ہے جو انسان کی تمام رگوں اور وجود میں پھیل جاتا ہے اور خدا کی یاد، آخرت کی زندگی کے احتساب کے خوف اور قیامت کے ہولناک واقعات کو دل سے دور کر دیتا ہے۔ اس حالت کو "دل کی موت" کہا جاتا ہے۔

نفس کو نظم و ضبط کرنا: بعض دلوں نے اپنے دلوں کو آزمایا اور پایا کہ دنیاوی لذتوں میں ان کی خوشی میں دل سرکش، نافرمانی اور یاد الٰہی سے منحرف ہوتے ہیں، جبکہ غم کی حالت میں وہ فرمانبردار، نرم اور الٰہی یاد سے متحرک ہوتے ہیں۔ انہوں نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ دائمی غم اور [دنیاوی ظاہری سعادت] کے ذرائع (جیسے کھانا، پینا، لباس، دولت، شہرت، معاشرتی زندگی، مادہ پرستی، نمایاں کھپت وغیرہ) سے دائمی غم اور دوری کی کیفیت نجات کا سبب ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے نفس کو ہر قسم کی خواہشات اور خواہشات کے ساتھ صبر کرنے کا عادی بنا دیا چاہے وہ حلال ہوں یا حرام ہوں۔ وہ جانتے تھے کہ حلال خواہشات کا احتساب بھی ہوگا اور ناجائز خواہشات کا بدلہ اور مشکوک خواہشات ملامت کا سبب ہوں گی۔ انتقام ایک ظاہری انتقام ہے جبکہ احتساب اور ملامت بھی انتقام کی شکلیں ہیں [جو پوشیدہ ہیں]۔ ان پاکیزہ روحوں نے حلال سے بھی دور رہ کر اپنے نفس کو احتساب کے عذاب سے بچانے کی کوشش کی اور اپنے نفس کو قید اور خواہشات کی گرفت سے آزاد کیا اور اس طرح اپنے آپ کو دونوں جہانوں (یہ اور اس کے بعد آنے والی) کی ابدی آزادی اور حاکمیت عطا کی۔ انہوں نے الٰہی کی یاد کے ساتھ اندرونی سکون ، اطمینان اور موافقت حاصل کی ، اور اپنے نفس کو [الہی] اطاعت کی عادت ڈالنے کے لئے ، انہوں نے اپنے نفس کے ساتھ اسی طرح سلوک کیا جیسے باز کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ یعنی باز کو ابتدا میں ایک اندھیرے کمرے میں رکھا جاتا ہے اور اس کی آنکھیں سلائی کی جاتی ہیں تاکہ وہ ہوا میں اڑنے کا عادی نہ رہے۔ اس کے بعد اسے گوشت کھلا کر اپنے آقا سے آشنا کیا جاتا ہے تاکہ وہ اپنے مالک کو پہچاننے لگتا ہے اور جب اسے بلایا جاتا ہے تو وہ کسی کی طرف دوڑتا ہے۔ نفس کی کیفیت بھی ایسی ہی ہے۔ نفس اپنے رب (خدا) کا عادی نہیں ہوتا جب تک کہ وہ تنہائی اور پرہیز کے ذریعے ان غلط عادات سے غافل نہ ہو جائے، جیسے کان بے ہودہ باتیں سننا، آنکھیں غیر ضروری باتیں دیکھنا، زبان غیر ضروری باتیں بولنا اور ان سے بچائے۔ اس مرحلے سے گزرنے کے بعد نفس کو یاد الٰہی اور تسبیح کی پرورش سے پروان چڑھایا جاتا ہے تاکہ وہ اپنے رب اور مالک سے مرعوب ہو جائے اور اس کا عادی ہو جائے اور تمام دنیاوی الجھنیں اور وابستگیاں ٹوٹ جائیں۔ یہ بات روحانی مسافر (مرید) کی نفس پر مشکل ہے لیکن جب وہ مسلسل روحانی کوششوں سے ان کی عادت ڈال لیتا ہے تو وہی تنہائی نفس کو اپنی لذت فراہم کرتی ہے اور وہی لاتعلقی اس کے لالچ اور افزودگی کا ذریعہ فراہم کرتی ہے۔ اس لحاظ سے روحانی مسافر اس بچے کی مانند ہے جسے دودھ چھڑایا گیا ہو۔ پہلے تو دودھ کی محرومی کی وجہ سے بچہ بہت روتا ہے کیونکہ دو سال تک دودھ ہی واحد غذا تھی اور اب اچانک بچہ اس سے محروم ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچہ روتا ہے، دورے پھینک دیتا ہے، کچھ نہیں کھاتا اور نہ پیتا بلکہ آہستہ آہستہ دوسری غذائیں لینا شروع کر دیتا ہے یہاں تک کہ دودھ کا خیال بھی ختم ہو جاتا ہے۔ بچے کو جس کھانے سے نفرت ہے وہ قابل قبول ہونا شروع ہوجاتا ہے۔

سواری والے جانور کی بھی یہی حالت ہے۔ ابتدائی طور پر ، کاٹھی کو باندھنا ، لگام کو سخت کرنا ، اور اس پر چڑھنا بہت مشکل ہے۔ سوار جانور اپنے سوار کو پریشان کرتا ہے لیکن اگر سوار اسے دانشمندی سے کرتا ہے اور اسے سواری کے گیئر کا عادی بناتا ہے تو اس کی بغاوت اطاعت میں بدل جاتی ہے۔ شروع میں اسے زنجیروں اور رسیوں میں باندھ دیا جاتا ہے لیکن آہستہ آہستہ یہ اس قدر نظم و ضبط میں آجاتا ہے کہ سوار جہاں بھی اسے چھوڑ دیتا ہے وہاں سے نہیں بڑھتا چاہے وہ بندھا ہوا ہو یا نہ ہو۔ جس طرح پرندوں اور پالتو جانوروں کو نظم و ضبط اور لگام دی جاتی ہے اسی طرح نفس بھی نظم و ضبط کا پابند ہوتا ہے۔ نفس کی نظم و ضبط یہ ہے کہ اسے دنیاوی نعمتوں اور لذتوں سے خوشی سے روکا جاتا ہے، ان کو دیکھنے اور استعمال کرنے سے منع کیا جاتا ہے، اور ہر اس چیز

سے روکا جاتا ہے جو مرنے کے بعد اس کی مدد نہیں کرسکتی، اور یہ کہا جاتا ہے کہ ایسی چیزوں سے محبت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے جو آخرت میں کسی کی مدد نہیں کر سکتیں اور راستے میں کسی مقام پر پھنسے ہوئے رہ جائیں۔ جب نفس اس حقیقت کا یقین پیدا کرتا ہے کہ اس دنیا کی کوئی چیز چاہے کتنی ہی محبوب کیوں نہ ہو، اس سے ضرور علیحدگی ہو جائے گی تو وہ ان عارضی اور عارضی چیزوں سے وابستہ ہونے کے بجائے الٰہی کی یاد جیسی ابدی اور دائمی چیزوں سے جڑ جاتا ہے جو قبر میں بھی انسان کے ساتھ رہے گی اور اس سے اس کی ہولناکیوں کو دور کر دے گی۔ تاہم ، نفس کچھ دن صبر کرنے کے بعد (یعنی مختصر دنیاوی وجود) کی مشق کرنے کے بعد اس یقین کو پیدا کرتا ہے۔ ابدی زندگی کے مقابلے میں دنیاوی زندگی صرف چند دنوں پر محیط ہے۔ ہمیں کوئی ذہین شخص نظر نہیں آتا جو ابدی راحت اور آرام کی خاطر چند دنوں کے لیے سفر کی مشکلات کو برداشت کرنے کو تیار نہ ہو یا برسوں تک پرسکون زندگی گزارنے کے لیے چند ماہ یا سالوں کے لیے کوئی نیا ہنر سیکھنے کو تیار نہ ہو۔ یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ ابدیت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی ایک دن کے برابر بھی نہیں ہے۔ جب اس زندگی کے لیے مصائبیں، تکلیف اور مصائب برداشت کیے جاتے ہیں جو چند دنوں کے برابر ہے [اس ابدی زندگی کے مقابلے میں جس کا کوئی انتہا نہیں ہے]، تو پھر وہ ابدی زندگی کے لیے کیوں برداشت نہیں کیے جا سکتے؟

روحانی کشمکش اور مشقوں کا طریقہ: یہ طریقہ ہر فرد کے لیے الگ الگ ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہے کہ ہر شخص کو روحانی کشمکش کے طریقے سے آگاہ کیا جاتا ہے اور اس کے مزاج (اس کے باطنی وجود کی کیفیت) کے مطابق ورزش کی جاتی ہے۔ لیکن یہ بات ہر انسان کے لیے یکساں ہے کہ جو کچھ بھی دنیاوی اسباب سے خوشی کا سبب بنتا ہے، اس سے الگ ہو جانا چاہیے (یعنی دل کی اندرونی لاتعلقی کے ذریعے)۔ مثال کے طور پر، جو لوگ مادی مال، دولت اور شہرت سے خوشی حاصل کرتے ہیں وہ اپنے دلوں سے اپنی محبت کو دور کریں، جو لوگ اپنی خوشگوار باتوں اور اپنی تقریروں کی متاثر کن باتوں سے خوشی حاصل کرتے ہیں وہ ایسے خیالات کو ختم کریں، جو لوگ سیاسی طاقت، کنٹرول، حکمرانی، ساکھ اور طلباء کی کثرت سے خوشی حاصل کرتے ہیں وہ اپنے دل کو ایسے خیالات سے الگ کر لیں۔ اگر وہ ان چیزوں سے محروم ہونے کی وجہ سے ناخوش ، غمگین اور پریشان ہیں تو سمجھ لیں کہ قرآن نے ایسے لوگوں کے بارے میں مندرجہ ذیل اعلان کیا ہے:

وَرَضُواْ بِٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا وَٱطْمَأَنُّواْ بِهَا

"اور وہ دنیا کی زندگی سے جھگڑا کرنے لگے اور اس میں مشغول ہو گئے [اس حد تک کہ وہ ان کی تسکین کا ذریعہ بن گئی ہے، حالانکہ یہ ان کے لیے نقصان دہ ہے]۔ (سورة البقرة باب ۱۰، آیت ۷)

دنیاداری کے یہ ذرائع روحانی مسافر (مرید) کے لیے مہلک زہر کا کام کرتے ہیں۔ انسان کو ان سے الگ ہونے اور لوگوں سے الگ ہونے کے بعد تنہائی اختیار کرنی چاہیے، اپنے دل کی حفاظت کرنی چاہیے تاکہ ہر لمحہ وہ اللہ تعالیٰ کی یاد و فکر میں مصروف ہو اور ان تمام خواہشات، خواہشات اور اشاروں پر نظر رکھے جو اس (الٰہی) کی یاد و غور و فکر میں مداخلت کرتی ہیں۔ اس طرح کی خواہشات، خواہشات اور اشاروں کو ان کی جڑوں سے چھٹکارا حاصل کر کے دور کرنا چاہیے یا ان ذرائع کو ختم کرنا چاہیے جس کے نتیجے میں ان اشاروں اور خواہشات کا ظہور ہوتا ہے۔ زندگی بھر اس خود احتسابی اور غور و فکر کو جاری رکھنا چاہیے اور ان کے خاتمے اور خاتمے کے اس عمل کو جاری رکھنا چاہیے۔ نفس کی تزکیہ کی [روحانی] جدوجہد اور جدوجہد صرف موت پر ختم ہوتی ہے [ایک سچے اور پرعزم روحانی مسافر کے لیے جو واقعی اس روحانی کشمکش کی پرواہ کرتا ہے جو اس زندگی کے حقیقی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ایک بہتر انسان بننے کے لیے ہے جو تمام منفی باتوں سے پاک اور تمام مثبتیت سے بھرا ہوا ہے جس کے نتیجے میں ابدی خوشی اور لامتناہی کامیابی حاصل ہوتی ہے]۔

اچھے اخلاق، آداب، کردار، باطنی مزاج اور صفات کی نشانیاں

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ وہ اپنی باطنی عیبوں سے بے خبر ہوتے ہیں اور اپنی معمولی روحانی کشمکش کو اپنے سفر کی آخری منزل سمجھتے ہیں اور فحاشی سے دور رہنے کو روحانی کشمکش کی معراج سمجھتے ہیں۔ وہ اس گمراہ کن تاثر میں مبتلا ہوجاتے ہیں کہ انہوں نے اپنے نفس کو نظم و ضبط میں لایا ہے اور اپنے اخلاق، آداب، باطنی کردار اور مزاج کو اچھا بنایا ہے اور انہیں کسی روحانی جدوجہد کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی انہیں روحانی راہ میں کسی جدوجہد کی ضرورت ہے۔ ایسے لوگوں کی تسکین کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اچھے اخلاق، آداب، باطنی کردار اور مزاج کی علامات درج کی جائیں۔ مختصرا یہ کہ انہیں یہ سمجھنا چاہیے کہ اچھے اخلاق، آداب، باطنی کردار اور مزاج ایمان ہیں اور برے اخلاق، آداب، باطنی کردار اور مزاج منافقت ہیں۔ قرآن مجید میں مومنوں اور منافقوں کی صفات درج کی گئی ہیں۔ یہ سب اچھے یا برے اخلاقیات، آداب، اندرونی کردار اور مزاج کے نتائج اور نتائج ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَعِبَادُ ٱلرَّحْمَٰنِ ٱلَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى ٱلْأَرْضِ هَوْنًا وَإِذَا خَاطَبَهُمُ ٱلْجَٰهِلُونَ قَالُوا۟ سَلَٰمًا ﴿٦٣﴾

وَٱلَّذِينَ يَبِيتُونَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَقِيَٰمًا ﴿٦٤﴾

"رحمان کے خاص بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ ان سے جہالت سے بات کرتے ہیں تو سلام کہتے ہیں! (جہالت اور برائی کو دور کرنے کے لیے جس میں وہ ملوث ہونے سے پرہیز کرتے ہیں اور اس طرح کے تمام عہدوں اور فتنوں کو پیچھے دھکیلتے ہیں] اور [اس کے علاوہ] وہ لوگ ہیں جو اپنی راتیں اپنے رب کے سامنے سجدہ اور کھڑے ہو کر گزارتے ہیں۔ (سورۃ البقرۃ باب 25، آیہ 63-64)

یہ آیات کسوٹی ہیں: جس شخص کے اندر کی کیفیت مشکوک ہو جاتی ہے اسے چاہیے کہ وہ ان آیات کی روشنی میں اپنے آپ کو جانچے۔ ان صفات کی موجودگی اچھے اخلاق، آداب، باطنی کردار اور مزاج کی نشانی ہے اور ان کی عدم موجودگی برے اخلاق، آداب، باطنی کردار اور مزاج کی نشانی ہے۔ اگر کسی میں ان میں سے کچھ خوبیاں ہیں اور کچھ غیر حاضر ہیں تو اسے ان کی حفاظت کرنی چاہیے جو موجود ہیں اور ان کو حاصل کرنے اور ان کو پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے جو غیر حاضر ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مومن بندوں کی بے شمار صفات کا ذکر کیا ہے اور ان کے ذریعے اخلاق و اخلاق، اخلاق، باطنی کردار اور مزاج کی فضیلت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ انہوں نے ایک بار کہا تھا:

لا يؤمن احدكم حتى يحب لاخيه ما يحب لنفسه

"کوئی بھی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی (یا بہن) کے لیے وہی پسند نہ کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرے۔" (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *حدیث* مجموعے *صحیح بخاری* اور *صحیح مسلم* حضرت انس رضی اللہ عنہ پر حضرت انس رضی اللہ عنہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے) [یہاں لفظ "بھائی" سے مراد ہر انسان ہے جو اس طرح پوری انسانیت کو اپنی فکر اور شفقت کا مستحق بناتا ہے۔]

من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فليكرم ضيفه

"جو شخص اللہ پر اور قیامت کے دن ایمان لائے، اسے چاہیے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے۔" (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *حدیث* مجموعے *صحیح بخاری* اور *صحیح مسلم* ابو شریعت الخزاعی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے

ایک اور روایت میں کہا گیا ہے کہ "جو شخص خدا پر اور قیامت کے دن ایمان رکھتا ہے] اپنے پڑوسی کی عزت کرے"۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *احادیث* کا مجموعہ *صحیح بخاری* اور *صحیح مسلم* ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے

ایک اور روایت میں ارشاد ہے:

فلیقل خیرا او لیصمت

"جو شخص خدا پر اور قیامت کے دن ایمان رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ اچھی بات کہے یا خاموش رہے۔" (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث مجموعے *صحیح بخاری* اور *صحیح مسلم* حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے

ایک جگہ انہوں نے اچھے اخلاق، اخلاق، باطنی کردار اور مزاج کے مالک *شخص* کو مومن قرار دیا۔ اس نے کہا:

أكمل المؤمنين ايمانا احسنهم اخلاقا

"مومنوں میں ایمان میں سب سے زیادہ کامل ہوتا ہے جو اچھے اخلاق، آداب، باطنی اخلاق اور مزاج میں سب سے بہتر ہوتا ہے۔"*اخلاق*)."

انہوں نے ایک بار کہا تھا:

اذا رأيتم المؤمن صموتا وقورا فادنوا منه فانه يلقى الحكمة

"اگر تم کسی مومن کو خاموش اور باوقار سمجھتے ہو تو ایسے مومن کے قریب ہو جاؤ کیونکہ اسے حکمت کی تعلیم دی جا رہی ہے۔" (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *ابی خالد رضی* اللہ عنہ سے حدیث *کا* مجموعہ ابن ماجہ

اس نے کہا:

من سرته حسنته وساءته سيئته فهو مؤمن

"جس نے اپنے اعمال کی نیکی کو نیکی اور برے کو برا پایا وہ مومن ہے۔" (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث مجموعے *مسند احمد الطبرانی* اور حکیم ابو موسیٰ اشعری رحمہ اللہ علیہ السلام

لا يحل لمؤمن ان ينظر الى اخيه بنظرة تؤذيه

"کسی مومن کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی کی طرف تکلیف دہ نگاہ سے دیکھے۔" (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث کا مجموعہ *ابن المبارک فی الزہد*

انہوں نے مزید کہا:

لا يحل لمسلم ان يروع مسلما

"کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ کسی مسلمان کو ڈانٹ دے"۔

انما یتجالس المتجالسان بامانۃ اللہ عزوجل فلا یحل لاحدھما ان یغشی علی

"دو لوگ خدا کی امانت کے ساتھ ایک ساتھ بیٹھے ہیں۔ اس لیے کسی کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی کے بارے میں دوسروں کے سامنے کوئی ایسی چیز ظاہر کرے جس کا انکشاف ناپسند نہ ہو۔

بعض دانشمندوں نے اچھے اخلاق، آداب، باطنی کردار اور مزاج کی نشانیاں درج کی ہیں کہ انسان شرم اور حیا کا شکار ہے، کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا، صادق اور پاک ہے، سچا ہے، کثرت سے نیکی کرنے والا ہے، کم غلطیاں کرتا ہے۔ بیکار باتوں سے دور رہتا ہے ، باوقار ، صبر کرنے والا ، شکر گزار ، روادار ، مہربان ، ہمدرد اور ہم آہنگ ہے۔ برا منہ نہیں کہتا، بری بات نہیں کرتا، پیٹھ کاٹتا ہے، لوگوں کی پیٹھ کے پیچھے شکایت کرتا ہے، بے تکلفی کرتا ہے، دشمنی کرتا ہے، بخل اور حسد کرتا ہے؛ صرف خدا کی خاطر ناپسند کرتا ہے اور محبت کرتا ہے۔ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مومن اور منافق کی نشانیوں کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا:

ان المؤمن ھمتہ فی الصلاۃ والصیام والعبادۃ والمنافق ھمتہ فی الطعام والشراب کالبھیمۃ

"مومن کی خواہشات اور کوششیں نماز، روزے اور عبادات میں ہیں اور کافر کی خواہشات اور کوششیں چوپایوں کی طرح کھانے پینے میں ہیں۔"

علماء کرام کے اقوال حاتم عاصم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "مومن غور و فکر اور سبق حاصل کرنے میں پوری طرح مصروف رہتا ہے اور منافق لالچ اور لمبی عمر کی امیدوں میں مصروف رہتا ہے۔ مومن اللہ کے سوا ہر ایک سے مایوسی ہے [کیونکہ اللہ ہی وہ ہے جو نفع اور نقصان پہنچا سکتا ہے، اور ہر کوئی اور ہر چیز خدا کی مرضی کے تابع ہے، اور ہماری زندگیوں اور ہمارے ارد گرد ہونے والے تمام واقعات خدا کی مرضی کے مطابق ہیں جس کی حکمت زیادہ تر یا تمام لوگ دیکھ سکتے ہیں یا نہیں] جبکہ ایک کافر اللہ کے سوا سب سے ڈرتا ہے۔ مومن اپنے ایمان کو [معمولی مادی اور دنیاوی فائدے کے بدلے] فروخت نہیں کرتا اور [اس کے بجائے] اپنے مادی مال اور جان کو [ابدی سعادت حاصل کرنے کے لئے] خرچ کرتا ہے جبکہ منافق مال کے سامنے اپنے ایمان کو اہمیت نہیں دیتا۔ مومن نیک اعمال کرنے کے بعد بھی روتا ہے جبکہ منافق گناہوں کے ارتکاب کے بعد بھی مسکراتا ہے [جیسا کہ ایسا شخص اس غلط گمان میں ہے کہ اس کے برے اعمال کے کوئی منفی نتائج نہیں ہیں جو اس کے لیے نقصان دہ ہیں اور خدا کے سامنے کھڑے ہونے کے لیے)۔ ایک مومن [نیکی کے بیج بوتا ہے] لیکن پھر بھی اس کے نتائج سے خوفزدہ رہتا ہے [اس کے اعمال میں خامیوں کی وجہ سے جو خدا کی قبولیت کا باعث نہیں بن سکتی] جبکہ کافر [نیکی کے بیج نہیں بوتا] بلکہ ان کو ضائع کرتا ہے اور پھر بھی اچھی توقعات رکھتا ہے۔ مومن حق کی نصیحت کرتا ہے اور برائی سے نصیحت کرتا ہے اور خدا کی مخلوقات کی اصلاح اور اصلاح کے لیے کام کرتا ہے جبکہ منافق برائی پھیلاتا ہے۔

اچھے اخلاق، آداب، باطنی کردار اور مزاج کا پہلا امتحان یہ ہے کہ دوسروں کے برے رویے، رویوں اور آداب پر صبر کرے۔ اگر کوئی شخص دوسروں سے برے اخلاق، آداب، باطنی کردار اور مزاج پر شک کر رہا ہے تو سمجھ لیں کہ وہ خود ان خصلتوں کا مالک ہے۔ اچھے اخلاق، آداب، اندرونی کردار اور مزاج دوسروں کی طرف سے ہونے والے درد کے سامنے صبر کرنے اور جب وہ ایک مشکل وقت دیتے ہیں تو بردباری کا نام ہے۔ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نجران سے موٹی شال پہن کر انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے ساتھ کہیں جا رہے تھے۔ وہ ایک بدو (ایک صحرائی عرب جسے عام طور پر بدتمیز ، کھردری اور غیر مہذب سمجھا جاتا تھا) سے ملا جس نے شال کا ایک سرا پکڑ لیا اور اسے اتنی زور سے کھینچا کہ پیغمبر کی گردن میں لگی شال سخت ہوگئی اور اس کا دم گھٹنے لگا۔ بدو نے پوچھا: اے محمد! جو کچھ خدا نے تمہیں دیا ہے اس میں سے کچھ مجھے دے دو!" نبی کریم صلی اللہ

علیہ وسلم نے ان کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے بدو کو کچھ دینے کی درخواست کی۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث میں انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے صحیح بخاری *اور* صحیح مسلم *کا* مجموعہ ہے۔ جب قبیلہ قریش (جن سے تعلق رکھنے والے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق رکھتے تھے) نے آپ کو ناراض کیا اور ان کی پٹائی کی تو آپ نے شکایت کرنے کے بجائے یہ دعا کی:

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِقَوْمِيْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ" اے

خدا! میری قوم کو معاف کر دے کیونکہ وہ نہیں جانتے۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث مجموعے *ابن حبان* اور *بیہقی* سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے

اسی شاندار اخلاق، آداب، باطنی کردار اور مزاج کی وجہ سے قرآن کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف اس طرح فرمائی:

وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ

"اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ بہترین اخلاق، آداب، اندرونی کردار اور مزاج کی عظمت پر ہیں"۔

یوسف بن عصبت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اچھے اخلاق، آداب، باطنی اخلاق اور مزاج کی دس نشانیاں ہیں: [دوسروں کو] کثرت سے مخالفت کرنا، عدل کی خوبصورتی کو بروئے کار لانا [لوگوں کے ساتھ معاملات میں] استعمال کرنا، انتقام نہ لینا، برائیوں سے نفرت کرنا، معافی اور بہانے قبول کرنا، نفس کی ملامت کرنا، دوسروں کے مقابلے میں اپنے عیبوں پر نظر رکھنا۔ نوجوان یا بوڑھے ہر ایک کے ساتھ گرمجوشی اور پیار کے ساتھ سلوک کرنا ، اور ہر ایک کے ساتھ نرم اور نرم گفتگو کرنا [معاشرتی میدان میں]۔ کسی نے سہل التستری رحمہ اللہ (ایک عظیم بزرگ اور گنوسٹک رحمت) سے پوچھا: "خوبصورت اخلاق، آداب، باطنی کردار اور مزاج کیا ہے؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کا سب سے نچلا درجہ، انتقام لینا اور دوسروں کی تکلیف کو صبر کے ساتھ برداشت کرنا، ظالم پر رحم کرنا اور اس سے معافی مانگنا ہے۔ اس طرح کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان بزرگوں کی نفسیں مسلسل روحانی سختی کے ذریعے اعتدال کی سطح پر پہنچی اور دھوکہ دہی، بے ایمانی، دشمنی اور حسد جیسی صفات سے پاک ہو گئے اور وہ ہر حال میں خدا کے مقدر پر مطمئن اور شکر گزار تھے۔ اس درجے پر کسی کی نفس کی آمد خوبصورت اخلاق، آداب، اندرونی کردار اور مزاج کا سب سے بڑا معیار ہے۔ برے اخلاق، آداب، باطنی کردار اور مزاج کی انتہا یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے حکم اور فیصلے سے ناراض ہو اور الٰہی کی مقرر کردہ تقدیر کے خلاف لڑ رہا ہو (یعنی اس بری صورت حال کو بدلنے کی کوشش کرنی چاہیے جس میں وہ صبر اور مسلسل جدوجہد کے ساتھ کوشش کرے اور اللہ کی مرضی کے ساتھ صبر اور شکر ادا کرے اور حکم الٰہی کے خلاف کسی قسم کی بے صبری اور شکایت نہ کرے)۔ بہرحال یہ خوبصورت اخلاق، آداب، باطنی کردار اور مزاج کی کچھ نشانیاں ہیں۔ جس شخص کا باطنی وجود ان نشانیوں سے عاری ہے اسے یہ یقین کرنے میں دھوکہ نہیں دینا چاہیے کہ وہ اچھے اخلاق، آداب، باطنی کردار اور مزاج کا مالک ہے۔ نفس بیمار ہوتا ہے اور اسے روحانی کوششوں اور سختی سے اس کا علاج کرنا چاہیے تاکہ وہ خوبصورت اخلاق، آداب، باطنی کردار اور مزاج کے اعلیٰ درجے تک پہنچ سکے جو خدا کے مقرب (*مقربین*) اور سچائی کے لیے مکمل طور پر وقف ہونے والوں کے پاس ہے جس کے نتیجے میں الہی عرفان *(صدقین)* پیدا ہوتے ہیں۔

بچوں کی تعلیم اور پرورش اور ان کے اخلاق، آداب، کردار، باطنی مزاج اور خوبیوں کو مہذب اور خوبصورت بنانا

بچوں کی تربیت کے لیے موثر طریقہ اختیار کرنا انتہائی ضروری اور ضروری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بچہ والدین کے ہاتھوں پر خدا کا امانت ہے اور بچے کا دل ایک اچھا، صاف ستھرا اور سادہ آئینے کی مانند ہے جو اگرچہ

کسی بھی قسم کے نقوش اور شکلوں سے عاری ہے، لیکن ہر قسم کے تاثرات اور اثرات کے اثر کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اسے کسی بھی چیز کی طرف مائل کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اگر بچے میں اچھی عادتیں پیدا کی جائیں اور اگر کسی کو علم کی تعلیم دی جائے تو بچہ اس طرح کی عمدہ پرورش (پرورش) حاصل کرنے کے بعد دنیا اور آخرت کی حقیقی کامیابی حاصل کرتا ہے۔ اس کامیابی میں بچے کے والدین اور اساتذہ (بچے کی اچھی پرورش کے بدلے) ثواب میں حصہ لینے کے حقدار ہو جاتے ہیں۔ اور اگر کسی بچے میں بری عادتیں پیدا کی جائیں اور [اگر] بچے کو جانوروں کی طرح بلا روک ٹوک (بے پرواہ / آزاد) چھوڑ دیا جائے تو بچہ بدتمیزی کے بعد تباہ ہو جاتا ہے۔ گناہ کا بوجھ (اس طرح کی غفلت) کا بوجھ کسی کے (بچے) سرپرست اور نگہبان پر پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ قُوٓاْ أَنفُسَكُمۡ وَأَهۡلِيكُمۡ نَارٗا

"اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔ (سورۃ البقرۃ سورۃ 66، آیت 6)

اور جب باپ اپنے بچے کو دنیا کی آگ سے بچا لیتا ہے تو پہلی ترجیح کے طور پر اس پر لازم ہوتا ہے کہ وہ اپنے بچے کو آخرت کی آگ سے بچائے اور اس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ وہ بچے کو آداب اور تہذیب کی تعلیم دے اور اسے بہترین اخلاق کی تعلیم دے اور اسے برے ساتھیوں اور دوستوں سے بچائے اور خواہش کو نہ چھوڑے جسمانی خوبصورتی، عمدہ کپڑے، آرائش، جسمانی آرام اور راحت کے لیے اس کے دل میں بیٹھ جاتا ہے، ورنہ بچہ بڑے ہونے کے بعد ان ادنیٰ چیزوں کی خواہش اور تلاش میں اپنی قیمتی جان ضائع کر دے گا اور ان سے ہمیشہ کے لیے تباہ ہو جائے گا۔ اس کے بجائے، یہ باپ پر لازم ہے کہ وہ بہت کم عمر سے ہی [اپنے بچے کی] سخت نگرانی اور دیکھ بھال کرے۔

حلال کھانے کی ضرورت اور اہمیت: بچے کی پرورش اور دودھ پلانے کے لیے (ماں کی عدم موجودگی میں یا ثقافتوں میں جہاں اس مقصد کے لیے الگ انتظام کیا جاتا ہے) ایک اچھے اخلاق اور دیندار عورت کا تقرر کیا جائے جو حلال کھانا کھائے کیونکہ جو دودھ حرام کھانے سے آتا ہے، اس میں کوئی بہتری یا برکت نہیں ہے، بلکہ اگر بچے کی پرورش ناجائز (*حرام*) سے آنے والے دودھ سے کی جائے تو برائی بچے کے ریشے (شعور/نفسیات/باطنی) میں سرایت کر جاتی ہے، اور اسی کی وجہ سے بچے کا مزاج شیطانی (برائی) اعمال کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اور جب [والدین کو لگتا ہے] کہ بچہ اچھے اور برے میں تمیز کرنے کے قابل ہے تو بچے کی مکمل پرورش شروع کرنی چاہیے۔ بچے کی زندگی کا یہ مرحلہ شرم کی ابتدائی علامات (*حیا* / حیا) کے ظہور سے ظاہر ہوتا ہے، کیونکہ جب بچہ اپنی عزت اور عزت کا احساس کرتے ہوئے شرمندہ ہونے لگتا ہے اور شرم کی وجہ سے کچھ کام کرنے سے نکلنا شروع کر دیتا ہے تو یہ صرف عقل کی روشنی کا نتیجہ ہوتا ہے جو کسی میں ابھرتا ہے۔ یہ [عقل کے نور کا ظہور] اس حد تک ہوتا ہے کہ انسان بعض چیزوں کو اچھی اور کچھ چیزوں کو بری سمجھنے لگتا ہے اور بعض اعمال پر شرمندگی محسوس کرنے لگتا ہے اور شرم کا یہ احساس اللہ تعالیٰ کی طرف سے بچے پر ایک بہت بڑا احسان ہے۔ اور یہ ایک واضح علامت ہے جو اخلاقی اقدار اور دل کی پاکیزگی کے اعتدال پسندی کے لئے دلیل دیتی ہے۔ اس کے بجائے ہمیں اس کے بارے میں اس طرح سوچنا چاہیے کہ [بچے میں] اچھائی اور برے کے ادراک کا یہ شعور، فطرت (یعنی خدا) کی طرف سے ایک خوشخبری ہے کہ یہ بچہ بلوغت کو پہنچنے کے بعد کامل عقل کا مالک ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ شرم کے شکار بچے کو کبھی بھی آزاد نہیں کیا جانا چاہیے، بلکہ اس کے بجائے اپنی شرمندگی (*حیا*) اور تمیز (اچھے اور برے کے درمیان) سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مکمل تربیت فراہم کی جائے۔

کھانے کے آداب کی وضاحت: پہلی بری خواہش جو بچے پر حاوی ہوتی ہے، وہ زیادہ کھانے کا لالچ ہے، اس لیے کھانے کے آداب سکھانا انتہائی ضروری ہے۔ مثال کے طور پر، [آداب ہیں] صرف دائیں ہاتھ سے کھانا، شروع میں "*بسم اللہ*" پڑھنا، سامنے سے [تھالی میں] کھانا، دوسروں کے شروع ہونے کا انتظار کرنا، کھانے کو گھورنا شروع نہ کرنا، کھانے کو گھورنا شروع نہ کرنا، یہاں تک کہ دوسروں کو گھورنا بھی نہ جو کھا رہے ہیں، غیر ضروری جلدی میں کھانا نہ کھانا، کھانے کو صحیح طریقے سے چبانا، اپنے منہ میں مسلسل [یا جلدی سے] کھانے کے ٹکڑے نہ ڈالنا [بلکہ آہستہ آہستہ ایسا کرنا]، کھانے سے اپنے ہاتھ اور کپڑوں کو گندا نہ کرنا۔ بعض اوقات بچے کو صرف روٹی کھلائی جائے تاکہ کوئی سالن کو ضرورت نہ سمجھے تاکہ اس کے بغیر بھی نہ رہ سکے۔ اسی طرح ایک (والدین یا

سرپرست) کو بچے کے سامنے بہت زیادہ کھانے کی ناپسندیدگی بیان کرنی چاہیے۔ بچے سے کہا جائے کہ وہ ان بچوں کی پیروی نہ کریں جو بہت زیادہ کھاتے ہیں اور جو بچے کم کھاتے ہیں اور تربیت یافتہ ہیں ان کی بچے کے سامنے تعریف کی جانی چاہیے۔ بچے کی توجہ دوسروں کی خاطر خوراک کی قربانی کی طرف مبذول کرائی جانی چاہیے [جو کم خوش قسمت ہیں] اپنے دوستوں کی ضروریات کا خیال رکھتے ہوئے [جو زندگی کی بنیادی ضروریات کی زیادہ ضرورت مند ہو سکتے ہیں]۔ بچے میں یہ عادت پیدا ہونی چاہیے کہ وہ [عمدہ] کھانے کی زیادہ پرواہ نہ کرے اور سادہ کھانے سے مطمئن رہے۔

لباس پہننے کے آداب کی وضاحت: اسی طرح رنگین اور ریشمی کپڑوں کی بجائے بچے کے دل میں سادہ اور سادہ کپڑوں کی محبت اور خواہش پیدا ہونی چاہیے۔ یہ بات کسی کے ذہن پر مضبوطی سے اثر انداز ہونی چاہیے کہ اس طرح کے کپڑے پہننا مناسب نہیں ہے اور متقی لوگ اس طرح کے لباس پہننے سے نفرت کرتے ہیں۔ ایسی باتیں (نصیحتیں) بچے کو وقتا فوقتا عمومی انداز میں بتائی جانی چاہئیں۔ اور والدین پر فرض ہے کہ جب وہ کسی بچے کو ریشمی یا چمکدار رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے دیکھیں تو وہ بچے کے سامنے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کریں اور بچے کے دل میں اپنی ناپسندیدگی پیدا کریں۔ والدین کو چاہیے کہ وہ اپنے بچے کو ان تمام بچوں سے ملنے سے بچائیں جو خوشحالی کے عادی ہوں، آرام دہ اور پرسکون طرز زندگی کی تلاش میں ہوں اور فخر سے کپڑے پہنیں۔ انہیں (والدین) بھی بچے کو ان تمام لوگوں کی صحبت سے بچانا چاہیے جو بچے کو اس طرح کے عیش و عشرت کے طریقوں کے بارے میں کہانیاں سناتے ہیں [جیسے آرام کی تلاش ، فخر سے کپڑے پہننا وغیرہ]۔ کوئی بھی بچہ جو اپنی ابتدائی نشوونما (پرورش) کے دوران [اس طرح کی چیزوں میں] بے پرواہ رہ جاتا ہے، وہ بڑے ہونے کے بعد عام طور پر بداخلاق، جھوٹا، چور، قصہ بردار، ضد کرنے والا، بد زبان، طنز، مکار، دھوکہ باز اور بے وقوف بن جاتا ہے۔ بچے کو ان تمام برائیوں سے بچانے کا واحد ذریعہ اچھی تعلیم و تربیت ہے، اس کے بعد بچے کو ایک اسکول میں داخل کرایا جائے تاکہ وہ قرآن و حدیث کا مطالعہ کرے ، خدا کے صالحین بندوں کے حالات، سوانح اور روایات کا علم حاصل کرے تاکہ بچپن سے ہی وہ اولیاء کرام کی محبت (اللہ ان سب پر رحم کرے) کسی کے دل میں قائم ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بچے کو رومانوی شاعری اور رومانوی شاعروں سے محفوظ رکھیں اور ان ادیبوں سے بھی دور رہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ ایسی شاعری دل کی زندگی کی نشانی ہے اور ادراک کی نزاکت ہے کیونکہ ایسی چیزیں بچوں کے ذہنوں میں فساد اور برائی کے بیج بوتے ہیں۔

نیکی پر آمادہ کرنے اور برائی سے نصیحت کرنے کا طریقہ: جب بھی بچہ کوئی اچھی خوبی کا مظاہرہ کرے یا کوئی قابل تعریف عمل ظاہر کرے تو باپ کو چاہیے کہ وہ بچے کی تعریف کرے اور ایسا تحفہ دے جس سے بچہ خوش ہو اور دوسروں کے سامنے بچے کی تعریف کرے۔ اگر بچہ اس کے برعکس کوئی کام کرے تو اس سے لاعلمی ظاہر کرنا مناسب ہے اور باپ کو بچے کی توہین یا تذلیل نہیں کرنی چاہیے اور نہ ہی اس کی غلطی کو اجاگر کرنا چاہیے۔ اس کے بجائے ، باپ [یا والدین] کو بچے کو یہ بھی نہیں بتانا چاہئے کہ وہ یہ بھی سوچتا ہے کہ بچہ اس کے سامنے ایسا کام کرنے کی ہمت رکھتا ہے ، خاص طور پر ، اس صورت میں جب بچہ خود غلطی کو چھپانے اور چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض اوقات [بچے کی] غلطیوں کو ظاہر کرنا بچے کے لئے اس حد تک زیادہ جرات کرنے کا سبب بنتا ہے کہ آہستہ آہستہ بچہ اپنے عیبوں کے سامنے آنے کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ اس طرح کی دانشمندانہ احتیاط برتنے کے بعد بھی اگر بچہ دوبارہ وہی [برائی] کام کرے تو اس کے لیے تنہائی میں ملامت کرنا مناسب ہے اور اس پر برے عمل کا قصور ظاہر کیا جائے اور کہا جائے کہ ہوشیار رہو! یہ بری چیز دوبارہ کبھی نہ کرو۔ خدا نہ کرے، اگر یہ کسی کو مل گیا تو تم لوگوں کے سامنے ذلیل ہو جاؤ گے"، [وغیرہ، اور اس سے دیگر باتیں اخذ کی جا سکتی ہیں]۔

ضرورت سے زیادہ ڈانٹنے کے نقصانات: لیکن یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ بچے کو ضرورت سے زیادہ سرزنش نہ کی جائے کیونکہ اس سے بچے میں مذمت اور ڈانٹ سننے کی عادت پیدا ہو جاتی ہے اور اس میں ظلم کرنے کا حوصلہ بڑھ جاتا ہے۔ اور آہستہ آہستہ ، نصیحتوں کی قدر بچے کے دل سے کم ہوتی جاتی ہے۔ اسی طرح باپ کے لیے ضروری ہے کہ جب وہ بچے سے بات کرے تو وہ بچے کے دل میں اپنی خوف و تعظیم برقرار رکھے اور شاذ و نادر ہی کسی کو ڈانٹے اور ماں کو چاہیے کہ وہ بچے کی ضد کے وقت اسے باپ سے ڈرائے اور بچے کو برے کاموں سے سختی سے روکے۔

سونے کے آداب: بچے کو یہ کہا جائے کہ وہ دن میں نہ سوئے کیونکہ اس سے سستی پیدا ہوتی ہے لیکن رات کو سونے سے نہیں روکنا چاہیے۔ تاہم بچے کو پھر بھی نرم بستر پر سونے سے روکنا چاہیے تاکہ بچے کے جسمانی اعضاء مضبوط ہو جائیں اور جسم مسخ نہ ہو جس کی وجہ سے بچہ آرام و آرام کے بغیر نہیں رہ سکے گا۔ اس کے بجائے سخت بستروں پر سونے، سادہ کپڑے پہننے، سادہ کھانا کھانے کی عادات بچے میں ڈالنی چاہئیں۔ بچے کو خفیہ طریقے سے کام کرنے سے روکنا چاہیے کیونکہ کوئی جانتا ہے کہ یہ برا ہے، اسی لیے بچہ اسے چھپاتا ہے۔ اگر اسے نظر انداز کر دیا جائے تو بچہ برے کام کرنے کی عادت ڈال دے گا۔

اسی طرح بچے میں دن میں چہل قدمی اور ورزش کی عادت ڈالنی چاہیے تاکہ وہ سست اور سست نہ ہو۔ تاہم، اس بات کو یقینی بنانے کے لیے انتہائی احتیاط برتی جانی چاہیے کہ بچہ کسی کے سر، گھٹنوں، رانوں وغیرہ کو بے نقاب نہ کرے۔ مزید یہ کہ بچے کو زیادہ تیز چلنا نہیں چاہیے اور نہ ہی اپنے ہاتھوں کو ڈھیلا رکھنا چاہیے [جو کہ سستی کی علامت ہے] بلکہ بچے کو چاہیے کہ وہ اپنے ہاتھوں کو جسم کے قریب رکھیں اور متحرک رہیں۔

تکبر اور تکبر کی ممانعت: بچے کو اپنے والدین کی جائیداد، کھانے پینے کی اشیاء، کپڑوں، حتیٰ کہ کسی کی لکھنے کی تختی اور سیاہی جیسی کسی چیز پر فخر کرنے سے منع کیا جائے۔ اس کے بجائے ، اپنے تمام ساتھی بچوں کے ساتھ عاجزی ، احترام ، عزت ، اور خالص (صاف / مہذب) گفتگو کرنے کی عادت ، ایک میں پیدا کی جانی چاہئے اور دوسرے بچوں سے کچھ بھی لینے کی اجازت نہیں ہونی چاہئے۔ اگر یہ امیر والدین کا بچہ ہے تو اس بات کی وضاحت کرنی چاہیے کہ عزت اور مرتبہ دینے میں ہے نہ کہ لینے میں، بلکہ دوسروں سے لینے میں نیچائی، ذلت اور ذلت کی خصوصیات موجود ہیں۔ اگر یہ غریب ماں باپ کا بچہ ہے تو اسے یہ سکھایا جانا چاہیے کہ لالچ رکھنا اور دوسروں سے کچھ لینا اپنی بے عزتی اور ذلت کا سبب بنتا ہے اور یہ کتے کی خصوصیت ہے کہ وہ اپنی دم ہلاتے رہتا ہے اور ایک لقمہ کا لالچ کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح بچے کو سونے اور چاندی سے نفرت کرنے پر مجبور کیا جائے اور سانپوں اور بچھوؤں کی محبت سے بھی بدتر ان چیزوں کی محبت سے ڈرایا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سونے اور چاندی کی محبت اور لالچ [سانپ اور بچھوؤں] سے ہونے والے نقصانات سے کہیں زیادہ بچوں اور بڑوں کو نقصان پہنچاتی ہے۔

لوگوں سے ملنے اور گفتگو کرنے کے آداب: بچے کو سکھایا جائے کہ وہ کھلے عام تھوکنا، ناک نہ کاٹنا، کسی کے سامنے جمائی نہ لینا، کسی کی طرف پیٹھ نہ موڑنا، پیروں کو پار کر نہ بیٹھنا، اپنی ہتھیلی کو ٹھوڑی کے نیچے رکھ کر یا سر کو ہاتھوں سے سہارا دیتے ہوئے نہ بیٹھنا کیونکہ یہ سب سستی اور کاہلی کی علامت ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ، بچے کو بیٹھنے کے مناسب آداب بھی سکھائے جانے چاہئیں۔ بچے کو ضرورت سے زیادہ بات کرنے سے روکنا چاہیے اور اس کے ذہن پر واضح طور پر اثر انداز ہونا چاہیے کہ یہ سب شرمناک باتیں ہیں اور خوش اخلاق بچوں کے کام نہیں ہیں۔ مزید برآں بچے کو سچ یا جھوٹ کی قسم کھانے سے مکمل طور پر منع کیا جائے تاکہ بچپن سے ہی گالیاں دینے کی عادت نہ پڑے۔ اسی طرح بچے کو پہلے گفتگو شروع کرنے سے روکنا چاہیے اور اس میں یہ عادت ڈالنی چاہیے کہ اسے صرف [سوالات] کے جواب دینے کے لیے بولنا چاہیے اور وہ بھی پوچھے گئے سوال کے متناسب ہونا چاہیے۔ جب کوئی بچے سے بات کر رہا ہو تو اسے بہت غور سے سننا چاہیے اور بڑے لوگوں کے لیے زیادہ جگہ بنانے کے لیے اٹھنا چاہیے اور پھر اس کے سامنے مناسب اخلاق کے ساتھ بیٹھنا چاہیے۔ بچے کو فضول باتوں، گندی باتوں، گالی دینے، الزامات اور زبانی گالی دینے سے روکا جانا چاہیے اور ان لوگوں سے ملنے سے منع کیا جانا چاہیے جو یہ کام کرتے ہیں کیونکہ ساتھی بچوں کی بری خوبیاں لازمی طور پر بچے پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اور بچوں کی تربیت کا اصل راز بچوں کو برے ساتھیوں سے بچانے میں مضمر ہے۔

صبر اور بردباری: یہ بھی ضروری ہے کہ جب استاد بچے کو نظم و ضبط کرے تو بچہ نہ چیخے، نہ چیخے اور نہ ہی کسی کا سہارا لے بلکہ [بچے] صبر اور بردباری سے کام لے۔ بچے کو یہ سمجھانے کے لیے یہ بتانا چاہیے کہ صبر سے کام لینا بہادروں کا طریقہ ہے اور چیخنا، چیخنا اور رونا ان لوگوں کا کام ہے جو وقار سے محروم ہیں۔

جسمانی ورزش کی اہمیت اور فوائد: اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد بچے کو کوئی اچھا کھیل کھیلنے کی اجازت دی جائے جس کی مدد سے سکول سے ہونے والی تھکاوٹ سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکے اور آرام حاصل کیا جا سکے۔ لیکن بچے کو اتنا کھیلنے کی اجازت نہیں دی جانی چاہیے کہ وہ کھیل کی وجہ سے تھک جائے۔ کیونکہ بچے کو کھیلنے سے مکمل طور پر روکنا اور صرف پڑھائی کے دباؤ میں رکھنا، دل کو مردہ بنا دیتا ہے، اس کی ذہانت کو باطل اور بیکار بنا دیتا ہے اور زندگی اجیرن بنا دیتا ہے، اس کی وجہ سے بچہ پڑھائی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بہانے تلاش کرنے لگتا ہے۔

بزرگوں کا احترام کرنے کے آداب: یہ انتہائی ضروری ہے کہ بچے کو والدین، اساتذہ اور ہر اس شخص کی اطاعت سکھایا جائے جو اس سے بڑی عمر کا ہے، چاہے وہ شخص رشتہ دار ہو یا نہیں۔ اور کسی سے کہا جانا چاہئے کہ وہ ان کو احترام کی نگاہوں سے دیکھیں اور ان کے سامنے کھیلنا چھوڑ دیں۔ جب بچہ بلوغت کو پہنچ جائے تو اسے صفائی اور طہارت میں سستی کی اجازت نہیں دی جائے اور نمازوں کی کمی پر اسے نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ *رمضان* (روزے کے مہینہ) کے بعض ایام میں بچے کو [بلوغت سے پہلے] کچھ دنوں میں روزہ رکھا جائے اور اسے ریشم سے دور رکھا جائے اور سونا چاندی پہنا جائے۔ ضرورت کے مطابق بچے کو حدود الٰہی اور الٰہی قوانین کی وضاحت کی جائے اور اسے چوری، ناجائز کمائی اور خوراک، امانت شکنی ، بے ایمانی ، بے دینی اور ان تمام برائیوں سے ڈرایا جائے جو جوانی کے دوران بچے کے مزاج (شخصیت) میں پیدا ہوتی ہیں۔ جب بچپن سے ہی بچے کی پرورش اس طرح ہو گی، جب تک بچہ بلوغت کو پہنچے گا، وہ ان معاملات کے راز اور حکمت کو واضح طور پر سمجھ سکے گا۔ بچپن یا نوجوانی کے اس مرحلے میں یہ سمجھانا ضروری ہے کہ جو بھی حلال غذا ہے وہ بھی دوائیوں کی طرح ہے اور ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ انسان ان کو کھانے کے بعد اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے۔

دنیا کی عدم پایداری: [بچے کے] ذہن پر یہ بھی واضح طور پر اثر انداز ہونا چاہیے کہ دنیا خود [ہماری زندگیوں کا] مقصد نہیں ہے، اور [دنیا] غیر حقیقی ہے، بغیر دائمی ہے، اور اس کا اختتام ہے۔ موت ان [مادی] نعمتوں کو ختم کر دیتی ہے اور دنیا صرف ایک ایسی جگہ ہے جس سے ہم [ابدی زندگی کی طرف] گزر رہے ہیں۔ یہ اطمینان کی جگہ نہیں ہے اور آباد ہونے کی جگہ نہیں ہے۔ لیکن آخرت کی دنیا سکون اور سکون کا حقیقی مقام اور سکون اور اطمینان کی جگہ ہے اور موت ہر وقت گھات لگا کر دنیا کی زندگی کو ختم کرنے کے لیے گھات لگا کر پڑی رہتی ہے۔

ذہین کون ہے؟ حقیقت میں عقل وہ ہے جو آخرت کی ابدی زندگی کے لیے اس فانی دنیا سے توکل اور نیک اعمال کا سرمایہ فراہم کرتا ہے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے قبولیت کا بلند مقام حاصل کر سکے اور جنت کی لامحدود نعمتوں کو حاصل کرے۔ اگر بچے کی ابتدائی پرورش اچھی ہوتی تو جوانی کے دوران یہ بحث نفس کو خوش کن اور موثر ثابت ہوتی اور دل پر پتھر پر کتبے کی طرح کندہ ہو جائے گی اور اس طرح بچے کے لیے خیر مقدم ہو گی۔

اس کے برعکس اگر بچے کی ذہنی نشوونما غلط خطوط پر ہوتی تو اس میں برائی، بے شرمی، بہت زیادہ کھانے کی خواہش، عمدہ لباس کی لالچ، دکھاوے اور آرائش، غرور، تکبر اور تکبر کی صفات پیدا ہوتیں اور اس کا دل اس حقیقت (یعنی دنیا کی زندگی کی عدم استحکام اور آخرت کی زندگی کے لیے کام کرنے کی ضرورت) کو خشک دیوار کی طرح قبول کرنے سے انکار کر دے گا خشک مٹی کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے (یعنی اس طرح کی تعلیمات بچے کے دل سے چپک نہیں جائیں گی)۔ خلاصہ یہ ہے کہ ، یہ ابتدائی معاملات ہیں جن کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھنے کی ضرورت ہے۔

بچے کی فطرت اور والدین کی ذمہ داری: چونکہ بچے کے دل کی ساخت ایسی ہے کہ وہ اچھے اور برے، صالح اور بدی دونوں کے اثرات کو قبول کر سکتا ہے، اس لیے یہ باپ اور ماں کی ذمہ داری ہے کہ وہ بچے کو اچھائی یا برائی کی طرف مائل کریں (غزالی اس معاملے میں کوئی انتخاب نہیں دے رہے، لیکن اس کے بجائے والدین کو بچے

کو اچھائی کی طرف مائل کرنے کی تاکید کریں ورنہ والدین کی غفلت کی وجہ سے بچہ خود بخود برائی کی طرف مائل ہو جائے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ یہودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ

"ہر بچہ سچی فطری فطرت پر پیدا ہوتا ہے [جس پر خدا نے پوری انسانیت کو پیدا کیا ہے، اس طرح کہ وہ خدا پر ایمان لانے کی حالت میں پیدا ہوتا ہے، سچائی اور راستبازی کے لیے وقف ہوتا ہے، ہر اچھی اور مثبت، سب کے ساتھ امن اور ہم آہنگی، اور کسی کی آسمانی ابتدا تک پہنچنے کی خواہش ہے جس کی وجہ سے باطنی روشنی اور ابدی سچائیوں کا طلوع ہوتا ہے] لیکن اس کے والدین کسی کو تبدیل کرتے ہیں یہودی ، عیسائی یا میجیئن میں (دنیا میں موجود متنوع مذہبی اور نظریاتی روایات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ، اس طرح کسی کو اپنے مذہبی، نظریاتی، ثقافتی، جغرافیائی اور فکری سیاق و سباق کے سانچے میں ڈھال دیا جاتا ہے)۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *احادیث* کے مجموعے *میں صحیح بخاری* اور *صحیح مسلم* صحابہ کرام ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے

اچھی تربیت کی وجہ سے بہترین نتائج حاصل کرنے کا ایک تاریخی ثبوت: شیخ سہل بن عبداللہ تستاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: جب میں تین سال کا تھا تو میں رات کو اٹھ کر اپنے چچا محمد بن سوار کی *نماز تہجد* کی روحانیت کو دیکھنے کے لیے کرتا تھا اس پر)۔ ایک بار اس نے مجھ سے کہا: کیا تو اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول نہیں ہے جس نے تجھے پیدا کیا ہے؟ میں نے پوچھا، "میں خدا کو کیسے یاد رکھوں؟" آپ نے فرمایا: "رات کو جب تم سونے سے پہلے اپنے پہلو بدل لو تو اپنے دل میں تین مرتبہ اپنی زبان کو حرکت کیے بغیر صرف یہ پڑھو:

اللہ مئیہ، اللہ نذرون الائیہ، اللہ شہیدی

خدا میرے ساتھ ہے، خدا مجھے دیکھ رہا ہے، خدا میرے سامنے ہے۔

میں نے کچھ راتوں کے لئے ایسا کیا ، اور پھر میں نے اسے اس کے بارے میں آگاہ کیا جس پر اس نے کہا ، 'اب ہر رات ، ایک ہی کام سات بار کرو۔' میں نے ایسا کیا اور اسے اس کے بارے میں آگاہ کیا جس پر اس نے کہا، 'اب یہ گیارہ بار کرو'۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا اور اس کے نتیجے میں میں نے اپنے دل میں اس کا ذائقہ اور مٹھاس محسوس کرنے لگی۔ جب ایک سال گزر گیا تو اس نے فرمایا: جو یاد میں نے تمہیں سکھایا ہے، تم اسے اچھی طرح یاد رکھو اور مرنے تک اس پر عمل کرتے رہو۔ یہ دنیا اور آخرت میں آپ کے لیے فائدہ کا ذریعہ بنے گا۔ میں نے کچھ سالوں تک ایسا کرنا شروع کیا ، یہاں تک کہ میں نے اپنے اندرونی وجود کی گہرائی میں اس کا ذائقہ (گہرا اثر) محسوس کرنا شروع کردیا۔ پھر ایک دن اس نے کہا: اے سہل! خدا، جب وہ کسی ایسے شخص کے ساتھ ہوتا ہے، جسے وہ ہر لمحہ دیکھتا ہے، جس کے سامنے ہے، کیا وہ شخص کبھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر سکتا ہے؟ ہوشیار! اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ کرو اور اس کی نافرمانی نہ کرو۔ اس لیے میں نے تنہائی میں رہنے لگا۔ پھر اس نے مجھے ایک اسکول بھیجنے کی کوشش کی، لیکن میں نے کہا، 'مجھے خطرہ ہے کہ [خدا کی طرف] میری توجہ منقسم ہو جائے گی۔ لیکن بہتر ہو گا، اگر آپ کو استاد سے یہ وعدہ مل جائے کہ میں کچھ دیر ان کے ساتھ پڑھوں گا تو میں جلدی سے خدا کی یاد میں مشغول ہو جاؤں گا۔'

اس کے بعد میں استاد کے پاس گیا اور جب میں چھ سات سال کا ہوا تو میں نے پورا قرآن حفظ کر لیا۔ میں ہمیشہ روزہ رکھتا تھا اور جب تک میں بارہ سال کا نہیں تھا ، جو کی روٹی میرا بنیادی غذا (غذا) تھی۔ اس دوران جب میں تیرہ سال کا تھا تو مجھے کسی خاص دینی موضوع کے بارے میں جاننے کی ضرورت تھی اور پھر میں نے اپنے اہل خانہ سے درخواست کی کہ وہ مجھے بصرہ جانے کی اجازت دیں تاکہ میں وہاں کے علماء سے اس معاملے کے بارے میں پوچھ سکوں۔ چنانچہ میں بصرہ کے پاس آیا اور وہاں کے علماء سے اس معاملے کے بارے میں پوچھا لیکن ان میں سے کسی نے بھی مجھے مطمئن نہیں کیا۔ اس کے بعد میں شیخ حبیب حمزہ بن عبداللہ عبادانی رحمہ اللہ کی

موجودگی میں آبادان گیا اور ان سے اسی دینی معاملے کے بارے میں پوچھا جس کا آپ نے مجھے تسلی بخش جواب دیا۔ اس کے بعد میں ان کی کتاب "*مفوزۃ القدسیہ*" سے روحانی فوائد حاصل کرنے کے لیے کافی عرصہ ان کی موجودگی میں رہا اور ان سے آداب سیکھتا رہا۔ پھر میں اپنے آبائی شہر تستر واپس آیا اور اپنی خوراک تقسیم کی تاکہ میرے لیے ایک *درہم* (ایک پرانی کرنسی) کا جو پیس لیا جاتا اور اس سے میرے لیے روٹی تیار کی جاتی۔ ہر رات ، *سحری* کے وقت (روزہ شروع کرنے سے پہلے صبح سے پہلے کا کھانا) میں روٹی سے ایک *عوقیہ* (آج ایک اونس کے برابر پیمائش کی ایک پرانی اکائی) کھاتا تھا ، اس کے ساتھ کوئی سالن استعمال کیے بغیر کھاتا تھا۔ اس لیے ایک *درہم* (جو کہ بہت کم رقم) میرے لیے پورے سال کے کھانے کے لیے کافی ہوتا تھا۔

میں نے اس معاملے میں اس حد تک پیش رفت کی کہ میں تین راتوں کے بعد روزہ افطار کرلیتا تھا (یعنی تین دن اور تین راتوں تک مسلسل روزہ رکھتے تھے)، پھر پانچ راتوں کے بعد، پھر سات راتوں کے بعد، پھر میں رفتہ رفتہ پچیس راتوں تک پہنچ گیا۔ میں مسلسل بیس سال تک اسی طرح چلتا رہا۔ پھر میں نے کئی سالوں تک دنیا کا دورہ کیا اور ٹسٹر واپس آگیا۔ میں تقریبا ساری رات عبادت کرتا تھا اور دعا کرتا تھا۔

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مجھے اس بات کی کوئی دلیل نہیں ملی کہ آپ (یعنی شیخ سہل تستاری) نے کبھی سالن کا استعمال کیا ہو۔ غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ ہم بھی اپنے بچوں کی پرورش اس طرح کریں جو شدید روحانی مشقوں اور جسمانی استقامت کے غیر معمولی کارناموں کے لحاظ سے شیخ سہل رحمۃ اللہ علیہ نے بچپن سے ہی انجام دیے۔ غزالی کا اس بات کا ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر والدین کی طرف سے بچے کی مناسب پرورش کے لیے مناسب انتظامات کیے جائیں تو بچہ انسانی صلاحیتوں کی انتہا تک پہنچ سکتا ہے، ورنہ اس طرح کی شدید روحانی اور جسمانی ورزشیں اور سختی سب کے لیے ضروری اور ضروری نہیں ہے۔

روحانی سفر کا آغاز کرنے کے حالات، روحانی جدوجہد کے آغاز، اور روحانی راستے پر متلاشی کے بتدریج ارتقاء کے بارے میں تفصیلات

واضح رہے کہ جو شخص آخرت کو یقین کے ساتھ دل سے دیکھتا ہے، وہ آخرت کا بن جاتا ہے، اس کے لیے جدوجہد کرتا ہے، اس پر بھروسہ کرتا ہے، اس کی طرف جانے والی راہ پر چلتا ہے اور اس کے دل میں دنیاوی لذتوں اور نعمتوں کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ اگر کسی کے پاس موتی ہو اور اس کی نظر کسی قیمتی جواہرات پر پڑی ہو تو موتی دل سے نکل جاتا ہے اور وہ موتی کی جگہ زیور حاصل کرنے کی خواہش کرتا ہے۔ جو نہ آخرت کا خواہاں ہے اور نہ خدا کی ملاقات کا خواہاں ہے وہ اس شخص کی مانند ہے جو خدا اور قیامت کے دن پر ایمان نہ رکھنے کی وجہ سے چھوٹے موتی کو قیمتی جوہر سے برتر قرار دیتا ہے۔ یہ حماقت صرف وہی کر سکتا ہے جس کی نظر صرف جواہرات پر ہے نہ کہ جواہرات کی حقیقت پر۔ ایسا شخص ظاہر ہے کہ ایک چھوٹا سا موتی انمول سمجھے گا اور اس زیور کی کوئی اہمیت نہیں دیکھے گا۔ بہرحال روحانی کشمکش اور روحانی راستے پر چلنے کے بغیر خدا تک پہنچنا ممکن نہیں ہے جو ارادے کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ ارادے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ایمان سے محروم ہونا ہے۔ جس (خدا) کو یاد کیا جاتا ہے اس پر ایمان غائب ہے۔ روحانی مرشد اور علماء کو چاہیے کہ وہ حق کی راہ دکھائیں اور اپنے ساتھیوں کو بتائیں کہ یہ دنیا کم قیمت کی ہے، اس کی کوئی دائمی نہیں ہے اور آخرت کی زندگی یقینا اہم ہے، صرف اس میں دائمی، دائمی اور ابدیت ہے، اور یہ کہ لوگ اپنی زندگی کے حقیقی مقصد اور معنی اور اس کے حصول کے راستے سے غفلت میں مبتلا ہیں۔ خواہشات اور خواہشات میں ڈوبے ہوئے ، ان کے حقیقی فائدے اور نقصان سے غافل اور خواب دیکھنے کی حالت میں مکمل طور پر نشے میں ہیں۔ ایسے فاضل علماء نہیں ملتے جو انہیں ان کی نیند سے جگا سکیں، ان کی خواہشات اور خواہشات سے دور کر سکیں، اور ان کی غفلت اور غفلت سے خبردار کر سکیں۔

اگر کوئی شخص غفلت کی نیند سے بیدار ہو جائے تو ایسا شخص کفر اور منافقت کے اندھیروں سے نکلنے کا راستہ نہیں نکالتا اور ہر موڑ اور جگہ پر اپنی جہالت کی وجہ سے ٹھوکر کھاتا ہے اور گر جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص علماء سے اس راستے کے بارے میں پوچھے کہ وہ اس کا جواب دینے کے قابل نہیں ہے کیونکہ وہ خود حقیر خواہشات اور خواہشات کے غلام ہیں اور نفس کی خواہشات کے قیدی ہیں۔ نیت کی کمزوری، راہ سے ناواقفیت اور نام نہاد علماء کی گمراہی وہ اسباب ہیں جن کی وجہ سے راہ خدا کو راہ دینے والوں اور روحانی مسافروں اور مجادد کرنے والوں سے خالی ہے۔ جب معروضیت [اور اس کے حصول کا راستہ] نظروں سے اوجھل ہو جائے تو اپنے [حقیقی] مقصد کی طرف رہنمائی کرنے والا غائب ہو جاتا ہے، نفس پر ضدی غلط حماقتوں اور خواہشات کا غلبہ ہو جاتا ہے اور طالب [حق و ہدایت اور باطنی روشنی] غفلت میں مبتلا ہو جاتا ہے تو پھر راستہ کیسے مل سکتا ہے؟ اگر وہ کسی بھی اتفاق سے مل جائے اور کوئی اس کی طرف قدم بڑھا دے تو وہ منزل تک کیسے پہنچے گا جب کہ اسے راستے پر چلنا بھی نہیں آتا؟

روحانی سفر کے آغاز کے شرائط: اگر کوئی شخص ذہین ہو اور اپنے آپ سے یا کسی کے قائل کرنے پر آخرت کی نیت کرے تو اس کی طرف قدم اٹھانے سے پہلے ہی روحانی سفر کے آغاز کے لیے شرائط کا پتہ لگانا چاہیے۔
روحانی سفر کا آغاز کرنے سے پہلے درج ذیل شرائط کو پورا کرنا ضروری ہے:

سب سے پہلے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ روحانی سفر پر جانے کی شرط یہ ہے کہ وہ اپنے اور سچائی کے درمیان جو بھی پردے (چھپنے اور دھندلا دینے والی چیزیں) پائے جاتے ہیں اسے ہٹا دے۔ لوگ [اپنے اور سچائی] کے درمیان بہت سے پردے کی وجہ سے سچائی کا تجربہ کرنے سے محروم ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ

"اور ہم نے ان کے سامنے ایک دیوار بنا دی ہے اور ان کے پیچھے ایک دیوار ہے اور ہم نے انہیں ہر طرف سے گھیر لیا ہے اس لیے وہ دیکھ نہیں سکتے۔" (سورۃ البقرۃ باب 36، آیت 9)

پردوں کی اقسام: متلاشی اور حق کے درمیان چار پردے ہیں (سچائی کی راہ میں حائل رکاوٹیں اور زندگی کے صحیح راستے کو دھندلا دینے والی رکاوٹیں جو زندگی کے حقیقی مقصد کے حصول کا باعث بنتی ہیں، باطنی روشنی، ابدی خوشی اور لامتناہی کامیابی کا باعث بنتی ہیں): دولت، شہرت کی خواہش، اندھی پیروی [مختلف نظریات کی] اور گناہ۔ دولت کا پردہ اس وقت ختم ہو جاتا ہے جب وہ طالب کے قبضے سے نکل جاتا ہے اور صرف اس کی ضروریات کی حد تک رہتا ہے۔ اگر طالب کے پاس ایک *درہم* باقی رہے جو اس کی ضرورت سے باہر ہے تو اس کا دل اس کی طرف توجہ دے گا، *درہم* دل پر حکومت کرے گا اور وہ اللہ کی طرف مائل نہیں ہو سکتا۔ شہرت کا پردہ اس وقت اٹھا لیتا ہے جب طالب شہرت اور اقتدار کے مقامات سے دور رہتا ہے، عاجزی اور عاجزی کو اپنی عادت بناتا ہے، گمنامی کی زندگی کو ترجیح دیتا ہے، شہرت کے اسباب سے بے نیاز رہتا ہے، اور اس قسم کے اعمال کرتا ہے جو لوگوں میں کسی کے خلاف بغض پیدا کرتا ہے۔ اندھی پیروی کا پردہ شریعت الٰہی کے مختلف مکاتب فکر اور دلائل کے خلاف تعصب کی ذہنیت کو ایک طرف رکھ کر اتار دیا جاتا ہے اور صرف اس بات کا یقین کر لیا جاتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ ان الفاظ کی سچائی اور صداقت کے عملی اظہار کے لیے ضروری ہے کہ اللہ کے سوا عبادت کے لائق سمجھے جانے والے ہر چیز اور ہر وجود سے تمام رشتوں کو منقطع کر دیا جائے، خاص طور پر نفس کے معبود سے تمام تعلقات منقطع کر دیے جائیں کیونکہ اس "خدا" کو بہت اہمیت دی جاتی ہے اور اس کے ہر حکم کی تعمیل کی جاتی ہے اور اس کے سامنے سر جھکا کر اس کے ہر اشارے کے تابع کیا جاتا ہے۔ اگر خدا کی وحدانیت اور وحدانیت کے اس بیان کی تصدیق کی جائے تو اندھی پیروی سے پیدا ہونے والے تمام عقائد کو کالعدم قرار دیا جائے گا۔ یہ بات روحانی جدوجہد اور جدوجہد (*مجاہدہ*) سے حاصل ہوتی ہے نہ کہ لوگوں کے ساتھ بحث و مباحثہ سے۔ اگر تعصب اور عدم رواداری کا غلبہ ہے اور [اس کے نتیجے میں] کسی کے [دیرینہ اور پسندیدہ] عقائد کے خلاف کچھ بھی سننے کو تیار نہیں ہے تو یہ اندھے پیروکاروں کا گلا

گھونٹتا ہے اور اس گلے سے نکلنا بہت مشکل ہے۔ متلاشی ہونے کی شرط یہ نہیں ہے کہ کوئی شخص کسی خاص مکتبہ فکر کا سخت گیر پیروکار ہو بلکہ اس کے بجائے کسی بھی مکتبہ فکر کا مداح اور پیروکار روحانی سفر کا آغاز کرنے کا راستہ طے کر سکتا ہے۔ گناہ کا پردہ اس وقت تک نہیں ہٹایا جاتا جب تک کہ کوئی شخص توبہ نہ کرے، ماضی کے تمام گناہوں پر افسوس اور پشیمانی کا اظہار نہ کرے اور ہر اس شخص کے حقوق واپس نہ کرے جس پر اس نے ظلم کیا ہے۔ جو شخص اپنے گناہوں سے توبہ کیے بغیر روحانی روشنیوں اور *مکاشفے* کے ذریعے خدا کی راہ کے رازوں اور باطنی حکمت سے آگاہ ہونا چاہتا ہے، وہ اس شخص کی طرح ہے جو عربی سیکھے بغیر قرآن کے معانی اور ارادے کو سمجھنا چاہتا ہے جبکہ قرآن عربی میں ہے۔ قرآن مجید کی ایک آیت کا مفہوم عربی سیکھے بغیر بھی نہیں سمجھا جا سکتا اور اس کی راز، نزاکت اور حکمت کو سمجھنا اس کی وجہ سے اور بھی مشکل ہے۔ اسی طرح روحانی جدوجہد کی وادی میں قدم رکھنے سے پہلے شریعت الٰہی کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے [خدائی عبادت کے اعمال اور تمام انسانوں کے ساتھ معاشرتی معاملات کے ذریعے اپنی ظاہری زندگی کو انجام دینا]۔ ظاہری زندگی کو چلانے کے لیے الٰہی قانون کی مکمل پابندی الٰہی رازوں کے دروازے کھولنے کا باعث بنتی ہے اور ابدی سچائیوں کے چشمے پھوٹتے ہیں۔

کامل مرشد کی ضرورت: ان چاروں شرائط کا پابند اور مال و شہرت کی خواہشات سے بچنے والا اس شخص کی مانند ہے جو گندگی سے آلودہ ہونے کے بعد اور وضو کرنے کے بعد پاک ہو جاتا ہے (*وضو* - جسمانی تطہیر کا عمل جو نماز کی ادائیگی کے لیے ضروری شرط ہے) نماز پڑھنے کا اہل ہو جاتا ہے۔ تاہم یہ اہلیت نماز پڑھنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ اس کے بجائے بعض اوقات کسی کو امام جماعت (*امام*) کی ضرورت ہوتی ہے جس کی قیادت میں نماز پڑھی جا سکے۔ اسی طرح ان چار شرائط کو پورا کرنا اور ان پر عمل کرنا کافی نہیں ہے بلکہ ایک ایسے استاد یا مرشد (*سکائخ*) کی بھی ضرورت ہے جو ہدایت کی راہ ہموار کر سکے اور ہدایت کی راہ پر گامزن ہو [جس میں کوئی ٹیڑھاؤ، انحراف اور خرابی نہ ہو]۔ خدا کی طرف جانے کا راستہ انتہائی پیچیدہ اور دشوار گزار ہے اور چاروں طرف سے شیطانی راستوں کی بہتات سے گھرا ہوا ہے۔ اگر کوئی (روحانی مرشد نہ ملے) تو ممکن ہے کہ شیطان قیادت اور ہدایت کے لیے آگے آئے، جو کسی کو ہدایت کے مستقیم راستے سے ہٹانے کی کوشش کرے اور اسے اپنی راہ پر گامزن کرے۔ [روحانی] رہنما کے بغیر خطرناک راستوں پر چلنا [روحانی] موت کا سفر کرنے کے مترادف ہے۔ جن لوگوں کو اپنے آپ پر اتنا اعتماد ہوتا ہے اور وہ لوگ خود ہی راستے پر چلنے لگتے ہیں، وہ ایسے ہی ہوتے ہیں جیسے کسی راستے پر اگتے پودے ہوں۔ ان کی زندگی مختصر ہوسکتی ہے ، اور ان کی زندگی کسی بھی وقت ختم ہوسکتی ہے [زندگی میں غلط راستے اختیار کرنے کی وجہ سے جو ممکنہ طور پر نقصان دہ ہیں]۔ اگر وہ زندہ رہے تو وہ پھل نہیں دے سکیں گے [اس روحانی راستے میں جس کے نتیجے میں، کسی کی ظاہری زندگی میں مثبت اور فائدہ مند اعمال کے اثرات مرتب ہوتے ہیں]۔

ان چار شرائط کی تکمیل کے بعد سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ایک کامل مرشد (*شیخ کامل*) کا وجود ہے جس کا وجود ایک اندھے شخص کی طرح اعتماد کا حکم دیتا ہے جسے اپنے ساتھی پر پورا اعتماد ہوتا ہے اور وہ راستے کی خرابیوں کی پرواہ کیے بغیر اس کی پیروی کرتا ہے۔ یہ اس روحانی متلاشی (مرید) کی حالت ہونی چاہیے جو اپنے آپ کو مرشد کے حوالے کر دیتا ہے اور وہی کرتا ہے جو مرشد کہتا ہے [شریعت الٰہی کی حدود میں رہتے ہوئے، ایک سچا مرشد کبھی بھی خوفزدہ قانون کے احکام کے خلاف نہیں جائے گا اور اس کی اعلیٰ قدر کرے گا] اور اس کی یہ تصدیق ہے کہ اگر مرشد غلطی بھی کر لے، اس سے کسی کو نقصان نہیں پہنچے گا اور یہ کسی کے لئے فائدہ مند ثابت ہوگا۔ مرشد کی غلطی اکیلے روحانی راستے پر چلنے سے بہتر ہے [بغیر کسی روحانی مرشد کے اپنے قیاس آرائیوں اور خیالات کو بطور رہنما استعمال کریں] اور صحیح [روحانی] راستے کا انتخاب کرنے کا موقع لیں [کیونکہ ایک کامل روحانی مرشد ہونے سے روحانی راہ میں ایک قدم آگے بڑھنے سے روکتا ہے]۔

مرشد کے فرائض: جب کوئی متلاشی کسی کو [روحانی راہ میں] اپنا رہنما اور رہنما بناتا ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ [روحانی طالب] کو محفوظ حرم فراہم کرے اور ایسے مضبوط قلعے میں روحانی متلاشی کی حفاظت کے انتظامات کرے جہاں شاہراہ کے ڈاکوؤں اور لٹیروں کی قدمیاں نہیں پہنچتیں۔ اس طرح کے محفوظ حرم اور قلعے کے ارد گرد چار دیواریں ہیں: تنہائی ، سکون ، بھوک اور جاگنا [لوگوں کی صحبت کے برعکس ، مسلسل جلدی اور حرکت کی حالت میں ، مطمئن اور بھرے ہوئے ، اور لمبے عرصے تک سونا کیونکہ یہ روحانی راہ کی بڑی رکاوٹیں ہیں]۔

روحانی طالب کا مقصد قلب کی اصلاح ہے [جسے روح کی تطہیر اور تطہیر بھی کہا جاتا ہے، اس لیے وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ بیڑیوں کو توڑ دے جو اسے جکڑتی ہیں اور اسے وجود کے اعلیٰ دائروں میں، گندگی سے لنگڑی میں، ابدی خوشی اور مادی دنیا میں دنیاوی اور محسوس کی جانے والی ناکامیوں کے دباؤ سے لامتناہی فتح میں لے جاتی ہیں] تاکہ الٰہی بصیرت [آنکھ کے ساتھ] روح] ممکن ہو جاتا ہے اور انسان الٰہی قربت تک پہنچ جاتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے مذکورہ بالا چار چیزیں ضروری ہیں۔ بھوک دل میں خون کے بہاؤ کو کم کرتی ہے جس کے نتیجے میں اس میں وضاحت میں اضافہ ہوتا ہے اور یہ وضاحت دل کی روشنی ہے۔ بھوک دل کی سختی کو کم کرتی ہے اور اس میں عاجزی، ہمدردی اور نرمی پیدا ہوتی ہے جو روحانی نقاب کشائی کی کلید ہے جبکہ سختی اس کی طرف پردہ ہے۔ خون کے کم بہاؤ سے [حقیقی] دشمن [انسانی نسل یعنی شیطان] کے راستوں کو تنگ کر دیتا ہے کیونکہ خواہشات اور خواہشات سے بھری رگیں اس کے راستے ہیں اور ان رگوں میں خون کے ذریعے یہ پورے جسم میں گردش کرتی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے صحابہ کرام سے کہا: اپنے دلوں کو بھوکا رکھو شاید تم اپنے رب کا خواب دیکھ پاؤ گے۔ سہل بن عبداللہ تستاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: *ابدال* چار چیزوں سے پیدا ہوتا ہے: بھوک، جاگ، خاموشی اور تنہائی روشن خیالی اور دل کی روشنی پر بھوک کا اثر ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔ تجربہ اس بات کی تصدیق کرتا ہے۔ تفصیلات باب "دو خواہشات کو توڑنا" (باب 3) میں فراہم کی جائیں گی۔

جاگنے کے نتیجے میں دل میں لطیف پن ، چمک اور روشنی بھی پیدا ہوتی ہے۔ جب یہ روشنی بھوک سے پیدا ہونے والی روشنی میں اضافہ کرتی ہے تو دل ایک روشن ستارے یا چمکدار آئینے کی مانند بن جاتا ہے جو الٰہی حسن کی عکاسی کرتا ہے اور اس میں آخرت کے بلند درجات کی گواہی اور دنیاوی وجود کی بے قدری اور ذلت اور نقصانات پیدا ہوتے ہیں۔ اس گواہی کے بعد متلاشی کی نظر میں دنیاداری کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی اور انسان پوری طرح آخرت پر توجہ مرکوز کر لیتا ہے (جو انسانی روح کے سفر میں دائمیت اور ابدیت کی آخری منزل ہے کیونکہ یہ وجود کی ایک سطح سے دوسری سطح تک چلتی ہے)۔ نیند دل کو سخت اور مردہ بنا دیتی ہے لیکن اگر ضرورت کے مطابق ہو تو اس میں پوشیدہ عالم کے راز کھل جاتے ہیں۔ *ابدال* کی صفات میں لکھا ہے کہ ان کی غذا بھوک ہے، وہ صرف اس وقت سوتے ہیں جب سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے، اور صرف اس ضرورت کے مطابق بات کرتے ہیں جس سے الٰہی کی یاد اور غور و فکر سے ہونے والی تھکاوٹ کو دور کرنے میں مدد ملتی ہے۔ سکون اور خاموشی دل کو مضبوط کرتی ہے اور استقامت اور *تقویٰ کا باعث بنتی ہے*۔

تنہائی کا بھرپور فائدہ اس وقت حاصل ہوتا ہے جب آنکھیں اور کان جو دل کے دروازے ہیں، بند ہو جائیں اور دل کی مصروفیت میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ جسم میں دل کی تشبیہ پانی کے ذخیرے کی مانند ہے جس میں ہر طرف سے گندا پانی اس میں گر جاتا ہے۔ روحانی جدوجہد اور جدوجہد کا مقصد یہ ہے کہ ان تمام نہروں کو بند کر دیا جائے جو گندے پانی کو [آبی ذخیرے یعنی دل] میں لے جاتے ہیں اور پانی کے ذخیرے کو گہرائی میں کھودتے ہیں تاکہ اسے [پانی کے لیے] کسی بیرونی منبع کی ضرورت نہ پڑے، بلکہ پانی خود ہی حوض کی تہہ سے نکلتا ہے۔ آبی ذخائر کو پانی میں خود کفیل بنانے کے لیے ضروری ہے کہ گندے پانی کے ذخائر کو مکمل طور پر خالی کر دیا جائے اور یہ تبھی ہو سکتا ہے جب آبی ذخائر کی طرف جانے والے تمام چینلز بند ہو جائیں۔ اگر کوئی [آبی ذخائر میں گندے پانی کے بہاؤ کے لیے] نہروں کو کھلا رکھنا چاہتا ہے اور آبی ذخائر میں صاف اور تازہ پانی ذخیرہ کرنا چاہتا ہے تو یہ بالکل ناممکن ہے۔ دل کی نہریں [جو اس میں نجاست اور گندگی کا باعث بنتی ہیں] حواس ہیں۔ حواس کو روکنے کا طریقہ یہ ہے کہ کسی تاریک گھر میں تنہائی اختیار کی جائے اور اگر کوئی اندھیرا کمرہ دستیاب نہ ہو تو اپنے سر پر کپڑا رکھ کر وہاں بیٹھ جائے۔ کوئی تنہائی میں سچائی کی آواز سنتا ہے اور خدا کی عظمت کا مشاہدہ کرتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اسی حالت میں (تنہائی اور روحانی غور و فکر) کی اس آواز سے مخاطب کیا گیا۔ اس وضاحت کا نتیجہ یہ ہے کہ بھوک، جاگ، سکون اور تنہائی کی یہ چار خوبیاں ایک روحانی مسافر کی پناہ گاہ ہیں۔ ان [چار] ذرائع سے انسان اپنے آپ کو [روحانی] راہ [خدا] کی طرف جانے والے [روحانی] ڈاکوؤں اور ڈاکوؤں سے بچا سکتا ہے۔

روحانی راہ میں جدوجہد کا آغاز: ان تمام شرائط کو پورا کرنے کے بعد انسان کو راہ روحانی (*سلوک*) میں جدوجہد کی راہ پر قدم رکھنا چاہیے اور اس بات سے آگاہ ہونا چاہیے کہ راستے میں بہت سی مشکل گھاٹیاں ہیں جن کو آگے بڑھنے کے لیے عبور کرنا ضروری ہے۔ خدا کی طرف جانے کی راہ کی وادی کچھ اور نہیں بلکہ دل کی وہ صفات ہیں جو دنیاوی خواہشات کو جنم دیتی ہیں۔ ان میں سے کچھ گھاٹیاں بہت بڑی ہیں جن کو عبور کرنا مشکل ہے اور کچھ چھوٹے ہیں جن کو عبور کرنا آسان ہے۔ ان گھاٹیوں کو عبور کرنے کے لئے [درست] ترتیب ایک آسان وادی کو عبور کرنا ہے ، پھر ایک جو پہلے سے تھوڑا سا مشکل ہے ، پھر زیادہ مشکل [وغیرہ]۔ یہ صفات انہی رکاوٹوں کے راز اور اشارے ہیں جو روحانی کشمکش کے آغاز میں عبور کی گئی تھیں جیسے دولت کی طرف جھکاؤ ، شہرت ، تخلیقات [خالق کے برعکس] ، اور گناہ۔ جس طرح ان رکاوٹوں کی نشانیاں ظاہری وجود سے کاٹ دی گئی تھیں، اسی طرح انہیں باطنی وجود سے مٹا دیا جانا چاہیے۔ لیکن اس کے لیے ایک طویل روحانی جدوجہد کی ضرورت ہے۔ میں نے یہ پہلے بھی لکھا ہے کہ حقیقی روحانی کشمکش خواہشات اور خواہشات کی مخالفت ہے۔

جب روحانی مسافر کا دل خواہشات اور خواہشات سے خالی ہو جائے اور دل میں کوئی ایسی چیز باقی نہ رہے جو روحانی کاوشوں کی مخالفت کرے تو مرشد (*مرشد* یا *شیخ*) کو چاہیے کہ وہ روحانی مسافر کے دل پر مسلسل نظر رکھے اور اسے حد سے زیادہ ظاہری عبادتوں اور عبادتوں سے روکے۔). اس کے بجائے اس بات کی نصیحت کی جائے کہ وہ دینی فرائض (*فرید*) اور نبوت کے اعمال (*سنان*) پر راضی رہیں [جو دینی فرائض کی سطح سے نیچے ہیں اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعمال پاکیزہ اور عبادتوں کی تقلید سمجھی جاتی ہیں جو فرض عبادات سے بالاتر اور ماورا ہیں]۔ زیادہ سے زیادہ، مرشد کو وہ یاد بتانا چاہیے جو تمام یادوں اور عبادتوں کا خلاصہ ہے، یعنی جب دل خدا کے سوا ہر چیز سے خالی ہو جائے تو روحانی مسافر سے کہا جائے کہ وہ "اللہ" کے نام کا ذکر کرے۔ وہ پیدا کرنے والا اور رزق دینے والا اور ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے البتہ جب تک دل راہ روحانی راہ کی دوسری رکاوٹوں کی طرف مائل ہو اس وقت تک اس یاد پر عمل نہیں کرنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایک طالب علم سے کہا کرتے تھے کہ اگر تمہارے دل میں اس جمعہ اور اگلے جمعہ کے درمیان خدا کے سوا کوئی اور چیز ہو جائے تو اگلے جمعہ کو مجھ سے ملنے نہ آؤ۔ اس قسم کی سختی روحانی راہ پر چلنے اور الٰہی محبت حاصل کرنے کے حقیقی ارادے کے غلبے کے بغیر حاصل نہیں کی جاتی۔ دل اللہ کے سوا کسی اور سے خالی ہوتا ہے جب دل میں خدا کے سوا کسی اور کا خیال بھی نہیں آتا اور وہ ایسا سچا عاشق بن جاتا ہے کہ ایک غور و فکر کے سوا کوئی اور غور و فکر باقی نہیں رہتا۔ اگر کوئی روحانی مسافر اس طرح کی باطنی کیفیت حاصل کر لے تو روحانی مرشد کو چاہیے کہ وہ ایسے شخص کو تنہائی میں کسی کونے میں بیٹھنے کی اجازت دے اور کسی کو حلال کھانا لانے کے لیے مقرر کرے۔ کھانے پینے کا جائز ہونا ضروری ہے کیونکہ خدا (دین) کی راہ کی بنیاد حلال غذا کھانا ہے [جیسا کہ ناجائز اور غیر اخلاقی طریقوں سے حاصل کیا گیا ہے، جیسے رشوت، بھتہ گیری، چوری، دھوکہ دہی وغیرہ، یا ناجائز کمائی گئی رقم یا ایسی قسم کے ذریعے جو شریعت میں حرام ہے]۔

کسی کو تنہائی کی اجازت دینے کے بعد ایک مرشد کو چاہیے کہ وہ ایک ذکر الٰہی کرے جس میں اس کا دل اور زبان دونوں مکمل طور پر مشغول رہیں، جیسے، "*اللہ، اللہ*" ("*اللہ*" اللہ کا واحد اور واحد ذاتی نام ہے)، "*سبحان اللہ*" (اللہ تعالیٰ کا نام ہے جو تمام عیبوں، خامیوں اور غلطیوں اور ہر ناقص اور ناقص چیز سے بالاتر ہے) وغیرہ۔ اس یاد میں اس حد تک استقامت سے کام لینا چاہیے کہ زبان کی حرکت رک جائے اور ایسا معلوم ہو گا کہ زبان پر بغیر کسی جان بوجھ کر حرکت کے جاری رہتی ہے۔ یہ سلسلہ اس حد تک جاری رہنا چاہیے کہ [اس الٰہی یاد پر] زبان کا کوئی باقی اثر ختم ہو جائے اور دل میں صرف کلام کی شکل باقی رہے۔ اس کے بعد ایک ایسا مرحلہ آئے گا جہاں لفظ کی شکل بھی دل سے مٹ جائے گی اور صرف اس کے معنی کی حقیقت باقی رہ جائے گی۔ یہ اس طرح ہوتا ہے کہ معنی ہر وقت دل کے ساتھ رہتا ہے اور کبھی غائب نہیں ہوتا اور اس کی موجودگی میں دل میں کسی اور معنی کا خیال بھی پیدا نہیں ہوتا۔

جب دل کسی چیز میں مگن ہو تو وہ کچھ بھی کیوں نہ ہو، اس میں اس کے علاوہ کسی اور چیز کی گنجائش نہیں بچتی۔ لہٰذا اگر دل اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مصروف ہو اور وہ وہ ہے جس کی تلاش کی جا رہی ہے اور اس کا مقصد بھی ہے تو دل اللہ کے سوا ہر چیز سے محروم ہو جائے گا۔ اس مقام پر پہنچنے کے بعد ایک روحانی مسافر (*سالک* یا

مرید) کو چاہیے کہ وہ اپنے دل پر کڑی نظر رکھے اور کوشش کرے کہ وہ دل میں کسی اور چیز کے تخیل کو بھی نہ ہونے دے، نہ اس کا تعلق اپنے وجود سے ہو اور نہ ہی کسی اور سے تعلق رکھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر دل کسی طرف مائل ہو جائے تو وہ یاد الٰہی سے محروم ہو جائے گا، اگرچہ یہ ایک لمحے کے لیے ہو جائے گا، لیکن یہ ایک بہت بڑا نقصان ہے۔ اس قسم کے نقصان سے بچنا چاہئے۔ اشاروں کے بارے میں دل کی حالت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ظاہری اشاروں سے چھٹکارا حاصل کر لے اور دل کو ایک قول پر مرکوز کر دے تو وہ بھی اشاروں کا ذریعہ بن جائے گا، "یہ قول کیا ہے؟"، "اس کا کیا مطلب ہے؟"، "یہ [خدا] کی عبادت کیوں ہے؟" یہ اشارہ دروازے یا پریشانیوں کو کھول دے گا اور شیطان نئے ایجاد کردہ اشاروں کے ساتھ [دل میں] داخل ہو جائے گا۔ ان میں ایسے اشارے شامل ہوں گے جو ایمان کی حفاظت سے کفر کی تباہی تک، راہ نبوت کے نور سے لے کر نئے ساختہ معاملات اور ایمان کی بدعات کی تاریکی تک لے جائیں گے (*بدعت*، یعنی وہ معاملات جو کسی کے ایمان کے لیے نقصان دہ ہیں کیونکہ وہ ایمان کی پاکیزہ، اصل اور سچی تعلیمات سے انحراف ہیں)۔ اگر روحانی مسافر (اپنے ایمان پر اس طرح کی تجاوزات سے بچنے میں) سرگرم ہے اور ان راستوں پر کڑی نظر رکھے جو اس طرح کے اشارے لاتے ہیں تو کسی نقصان کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔

اشارے کی دو قسمیں: ایک روحانی مسافر کے سامنے آنے والے اشارے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ بعض اشارے وہ ہیں جن کے بارے میں یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے مکمل طور پر پاک ہے [کیونکہ وہ خدا کی عظمت و حسن سے مطابقت نہیں رکھتے] لیکن شیطان اب بھی ان کو دل میں ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ شیطان کی ایسی چالوں سے اپنے آپ کو بچانے کا طریقہ یہ ہے کہ خدا کی یاد میں مشغول رہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَإِمَّا يَنزَغَنَّكَ مِنَ ٱلشَّيْطَٰنِ نَزْغٌ فَٱسْتَعِذْ بِٱللَّهِ ۚ إِنَّهُۥ سَمِيعٌ عَلِيمٌ

"اگر تمہیں شیطان کی طرف سے کوئی برا خیال آنے لگے تو خدا کی پناہ مانگو۔ بے شک وہ سننے والا جاننے والا ہے۔" (سورة البقرة باب 7 آیت 200)

انہوں نے مزید کہا:

إِنَّ ٱلَّذِينَ ٱتَّقَوْا۟ إِذَا مَسَّهُمْ طَٰٓئِفٌ مِّنَ ٱلشَّيْطَٰنِ تَذَكَّرُوا۟ فَإِذَا هُم مُّبْصِرُونَ

"بے شک وہ لوگ جو خدا سے خوف و ہراس رکھتے ہیں، جب شیطان کی طرف سے کسی خطرے کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ فورا یاد الٰہی میں مشغول ہو جاتے ہیں اور ان کی آنکھیں اچانک کھل جاتی ہیں (باطنی روحانی ادراک کی حالت میں جو کسی کے لیے نقصان دہ تمام چیزوں سے رکاوٹ اور تحفظ کا کام بھی کرتی ہے)۔ (سورة البقرة سورة البقرة آیت 201)

دوسری قسم میں ایسے اشارے شامل ہیں جن میں ہچکچاہٹ اور شکوک و شبہات موجود ہیں۔ ان کے بارے میں پورے اعتماد کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ خدا ان سے آزاد ہے۔ جب اس طرح کے اشاروں کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو ، خود فیصلہ کرنے کے بجائے ، روحانی مسافر کو روحانی رہنما کی رائے دریافت کرنی چاہئے۔ صرف یہی نہیں بلکہ انسان کو اپنے دل کی کیفیت کو مرشد کے ساتھ بانٹنا چاہیے چاہے وہ سستی ہو یا حوصلہ افزائی، کسی چیز کی طرف جھکاؤ ہو یا ارادے کی سچائی [روحانی راہ پر چلنے کی]، مختصرا یہ کہ [دل کی] ہر [باطنی] کیفیت کو مرشد کے ساتھ شیئر کیا جائے تاکہ وہ [دل کی اندرونی حالتوں کے لیے جن کے علاج کی ضرورت ہے] تجویز کر سکے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ان کو روحانی مرشد کے علاوہ کسی اور کے ساتھ شیئر نہ کیا جائے جو روحانی مسافر (مرید یا کسی کے طالب علم) کی [باطنی] حالتوں پر گہری نظر رکھنی چاہیے اور [روحانی مسافر کی ذہانت اور دور اندیشی کے مطابق] [منفی اور نقصان پہنچانے والی داخلی حالتوں کے علاج کے لحاظ سے] فیصلہ کرنا چاہیے۔ اگر روحانی مرشد یہ دیکھتا ہے کہ غور و فکر اور اندرونی غور و فکر کی اجازت روحانی مسافر کو خود بخود حقیقت سے آگاہ کرنے کا سبب بنے گی تو اس راستے پر ڈال دیا جائے اور اس [روحانی] غور و فکر کو برقرار رکھنے کے لیے کہا جائے تاکہ خدا کی طرف سے وہ روشنی ظاہر ہو جو حقائق کو ظاہر کرتی ہے۔ لیکن اگر یہ سمجھا جائے کہ روحانی مسافر اپنے آپ کو راستہ نہیں ڈھونڈ سکے گا اور سچائی خود بخود کسی پر ظاہر نہیں ہوگی تو پھر مرشد کو چاہیے

کہ وہ اپنے شکوک و شبہات کو دور کرے اور ان حقیقتوں سے آگاہ کرے جو وہ برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، اسے نصیحت کرے اور اس کے معیار (ذہنی اور روحانی صلاحیتوں) کو مدنظر رکھے۔ کچھ دلائل پیش کریں۔ روحانی مرشد کو چاہیے کہ وہ [روحانی] معاملات کو سمجھانے کے لیے حد سے زیادہ زور نہ دے، بلکہ جو کچھ بھی کہنے یا نصیحت کرنے کی ضرورت ہو اسے نرمی اور آسانی سے کرنا چاہیے کیونکہ [روحانی معراج کی حضوری میں] یہ راستہ بہت مشکل اور مہلک خطرات سے بھرا ہوا ہے۔ بعض روحانی مسافر یاد الٰہی اور غور و فکر کی روحانی سرگرمی کے دوران مضر خیالات میں گھرے رہتے ہیں اور اس کے نتیجے میں حقائق کی روحانی پردہ اٹھانے کی صلاحیت کھو دیتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں وہ ایک بیکار راستے پر چلنا شروع کر دیتے ہیں [جہاں ان کا وقت اور کوششیں ضائع ہو جاتی ہیں] اور تباہی کے قریب پہنچ جاتی ہیں۔ یہ ایک بہت بڑا نقصان ہے۔ جس کا دل یاد الٰہی میں مشغول ہونے کے لیے آزاد ہو اور اس میں رکاوٹیں بھی موجود نہ ہوں، پھر بھی بعض اوقات اسی طرح کے مضر خیالات میں الجھ جاتا ہے۔ ایک روحانی مسافر خطرات سے گھرے ہوئے جہاز کے مسافر کی طرح ہے۔ اگر کوئی بچ جاتا ہے تو وہ [روحانی] راستے کا بادشاہ بن جاتا ہے۔ اگر کوئی فرار نہیں ہو سکتا تو وہ تباہ ہو جاتا ہے [اپنی زندگی کے مقصد کے حصول کے لیے روحانی عروج کی جدوجہد کھو دینے اور اس کے نتیجے میں ابدی خوشی اور لامتناہی فتح کے لحاظ سے]۔

ظاہری عبادات سے متعلق بنیادی ایمان اور عقائد کی پیروی کے ذریعے حاصل ہونے کے بعد (*تقلید* یا علم کے ساتھ دوسروں کی پیروی کرنے کے بعد) نیک اعمال میں مشغول ہونا چاہیے۔ کسی بھی دوسرے طریقے سے کام کرنے میں بہت سے خطرات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ لوگوں نے روحانی مرشد کے لیے یہ ضروری سمجھا ہے کہ وہ اپنے طالب علموں (روحانی مسافروں) کی [باطنی] حالت کو تلاش کرنے کے لیے اپنی بصیرت [اور وجدان] کو استعمال کرے۔ اگر کوئی شخص ذہین نہ ہو اور ظاہری امور کے بارے میں عقائد رکھتا ہو تو اسے یاد الٰہی میں شامل کرنے کے بجائے ظاہری عبادات اور *مسلسل عبادات* میں مشغول ہونا چاہیے یا ان لوگوں کی خدمت میں شامل ہونا چاہیے جنہوں نے اپنے آپ کو یاد الٰہی اور غور و فکر میں وقف کر دیا ہے تاکہ ان کی برکتیں بھی حاصل کر سکیں۔ یاد الٰہی میں مسلسل مشغول رہتے ہوئے، روحانی مسافر [جو محض ظاہری عبادت کی سطح سے اوپر اٹھ چکا ہے اور ظاہری اعمال میں دوسروں کی پیروی کرتا ہے] اچھی باطنی حالتوں کا تجربہ کرتا ہے اور [حتیٰ کہ] غیر معمولی کارنامے [معجزات کی طرح] ایک کے ذریعے ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ باطنی حالتیں اور غیر معمولی کارنامے نااہل روحانی مسافر کو [کسی کی کم روحانی قابلیت اور روحانی راہ پر مبتدی ہونے کی وجہ سے] خود نیکی، تکبر، دکھاوے اور خوشی میں مشغول ہونے کا سبب بنتے ہیں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ حالات اور حالات روحانی جدوجہد کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ اگر روحانی مسافر ان کی طرف توجہ دے اور ان حالات میں غرق ہو جائے تو اس سے روحانی راہ میں خلل پڑے گا، بلکہ یہ خدشہ ہے کہ روحانی مسافر روحانی راستے پر آگے بڑھنا چھوڑ دے گا۔ بہتر یہ ہے کہ انسان اپنی ساری زندگی میں ایک پیاسا شخص کی طرح رہے جو پورے سمندر کے پانی سے بھی سیر نہیں ہو سکتا [کیونکہ اطمینان نفس روحانی ترقی اور کمال میں رکاوٹ اور الٹ جاتا ہے]۔

روحانی مسافر کا سرمایہ مخلوقات کے ساتھ اپنے رشتے (یعنی دل کی وابستگی) کو ختم کرنا ہے [یعنی خدا کے سوا ہر چیز کے ساتھ کیونکہ ان سے وابستگی ان کی ناپائداری اور حقیقی طاقت کی کمی کی وجہ سے مایوسی اور مایوسی کا باعث بنتی ہے]، خدا (خالق سے) سے وابستگی اور تنہائی [اس کو ممکن بنانے کے لیے دل کی شان و شوکت کے طور پر، دنیا کی چمک اور شان تمام روحانی عزائم کو مار دیتی ہے]۔ ایک [روحانی] مسافر نے کہا: "میں نے ایک *ابدال* (بہت اعلی روحانی کامیابی کا حامل ایک گنوسٹک) سے تحقیق کے راستے کے بارے میں پوچھا۔ آپ نے جواب دیا: 'آپ دنیا میں اس طرح رہتے ہیں جیسے ایک مسافر کہیں رہتا ہے'۔ میں نے ان سے پوچھا: مجھے وہ کام بتاؤ جس کی وجہ سے میرا دل ہمیشہ خدا کے ساتھ رہتا ہے۔ آپ نے فرمایا: مخلوقات کو مت دیکھو کیونکہ ان کو دیکھنا اندھیرا ہے۔ میں نے جواب دیا: 'یہ ضروری ہے'۔ آپ نے فرمایا: ان کی باتوں کو مت سنو کیونکہ اس سے دل کی سختی ہوتی ہے۔ میں نے کہا: 'یہ بھی ضروری ہے'۔ آپ نے فرمایا: ان کے ساتھ کوئی لین دین نہ کرو کیونکہ اس سے خوف پیدا ہوتا ہے۔ میں نے کہا: 'یہ بھی ضروری ہے، کیونکہ میں اپنی زندگی ان کے درمیان گزارتا ہوں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ان کے ساتھ کوئی لین دین نہ ہو؟' اس نے جواب دیا: 'ان کے ساتھ مت رہو۔ ان کے ساتھ رہنا تباہی ہے۔' میں نے جواب دیا: 'یہ بیماری بھی ختم نہیں ہونے والی ہے'۔ آپ نے فرمایا: 'آپ ان غافل اور غافل لوگوں کو دیکھتے

ہیں، جاہلوں کی باتیں سنتے ہیں، بیکار لوگوں کے ساتھ معاملات کرتے ہیں (وہ لوگ جن کی صحبت کسی کے لیے مفید نہیں ہے) اور پھر بھی آپ کا دل خدا کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں؟ یہ کبھی ممکن نہیں ہوگا'۔

روحانی جدوجہد کی اعلیٰ ترین سطح: روحانی جدوجہد کی اعلیٰ ترین سطح یہ ہے کہ ایک روحانی مسافر (*مرید*) ہر لمحہ اور ہر لمحے خدا کے ساتھ اپنے دل کو موجود پاتا ہے اور یہ سطح اس وقت تک حاصل نہیں کی جا سکتی جب تک کہ اس کا دل خدا کے علاوہ ہر چیز سے خالی نہ ہو جائے اور یہ ایک طویل [اور پرعزم] روحانی جدوجہد کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ جب انسان کے دل میں خدا کے ذکر کے سوا کچھ نہیں رہتا تو اس پر خدا کی عظمت ظاہر ہوتی ہے، اس پر حق کا نور طلوع ہوتا ہے، اور اعلیٰ [روحانی] دائروں کی تمام باریکیوں سے پردہ اٹھایا جاتا ہے جن کی صفات کی وضاحت نہیں کی جا سکتی۔ بہرحال اگر کسی روحانی مسافر پر خاص فضل الٰہی ہو اور مذکورہ بالا بات سے کوئی بات ظاہر ہو جائے تو اس کی روحانی کیفیت کی حفاظت کرنی چاہیے کیونکہ یہ انمول ہے۔ روحانی حالت کی اتنی [اعلیٰ] ڈگری حاصل کرنے کے بعد، بہت سے ہائی وے ڈاکو کسی کے راستے (روحانی راستے پر ترقی اور عروج) میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔ سب سے بڑا شاہراہ ڈاکو یہ ہے کہ وہ اس طرح کی [باطنی روحانی] حالتوں کو نصیحت اور نصیحت کے طور پر بیان کرنا شروع کر دیتا ہے اور وعظ اور عوامی تقریر کا شدید شوق رکھتا ہے [جیسے جیسے کوئی یہ غلط مفروضہ اور فریب کی کیفیت پیدا کرتا ہے کہ روحانی راستے کی آخری منزل اب پہنچ چکی ہے اور وقت آگیا ہے کہ اپنے باطنی روحانی کارناموں کو اعلیٰ باطنی حالتوں کی شکل میں عام لوگوں کے ساتھ بانٹیں عوام. یہ کام اکثر ان کی مدد کرنے کے خیال سے کیا جاتا ہے لیکن حقیقت میں نفس (*نفس*) راحت ، شہرت ، وقار ، عزت اور اس کے نتیجے میں خوشی اور مادی فوائد کی تلاش میں ہے۔

یہ مشغلہ نچلے نفس کو ناقابل بیان لذت فراہم کرتا ہے۔ یہ [حقیقت میں] لذت نہیں ہے، یہ نشہ ہے۔ انسان اس تفریح میں مکمل طور پر مگن ہے اور اس حالت میں اپنے فائدے اور نقصان سے مکمل طور پر غافل ہے۔ صرف یہی نہیں خطبات کو زیادہ موثر اور قابل قبول بنانے کے لیے انسان (اچھے اور متاثر کن) الفاظ کے انتخاب، رنگین گفتگو کے فن میں مشغول ہو جاتا ہے اور علم کی نمائش کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے قرآن و حدیث سے کہانیہ، مثالیں اور دلائل تلاش کر کے سامعین کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ کبھی کبھی شیطان کسی کے ذہن میں یہ بات ڈال دیتا ہے: "آپ کا یہ کام عظیم اور عظیم ہے، تمہاری تقریریں مردہ دلوں کو زندہ کر رہی ہیں، غفلت کے پردے [زندگی کے حقیقی مقصد اور اس کے حصول کے لیے درکار روحانی کوششوں] دور ہو رہے ہیں۔ آپ اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان ثالث ہیں، آپ خدا کی مخلوقات کو کسی نفع یا خفیہ مقصد کے لیے نیکی کی طرف دعوت نہیں دے رہے ہیں بلکہ صرف سچائی اور خلوص کے جذبے کے ساتھ یہ کام کر رہے ہیں۔ شیطان کا یہ فریب اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب روحانی مسافر کے ہم عصروں میں سے کوئی اور دعوت اور تعلیم کی وہی فریضہ ادا کر رہا ہے جو خطابت کی صلاحیتوں کی وجہ سے لوگوں میں بھی مقبول ہے۔ اگر ایسے شخص سے حسد کا جذبہ روحانی مسافر کے دل میں پیدا ہوتا ہے تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس کی وعظ خالص لذت کے لیے ہے نہ کہ لوگوں کی بھلائی اور اللہ تعالیٰ کے اجر و ثواب کے لیے۔ اگر کسی کا مقصد پاکیزہ ہوتا تو وہ اپنے ہم عصر مبلغ سے حسد نہ کرتا۔ اس کے بجائے، کوئی خوش ہوتا کہ اسے ایک اضافی شخص کی حمایت حاصل ہو [لوگوں کو سچائی، راستبازی اور زندگی کے حقیقی مقصد کی طرف مدعو کرنے کے عظیم کام کے لیے]۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی نامعلوم میت کی لاش مل جائے اور تدفین کی ذمہ داری کسی کے کندھے پر آجائے۔ اگر کوئی ایسا شخص پاتا ہے جو اس نیک معاملے میں تعاون کرتا ہے تو کیا یہ خوشی یا حسد کی جگہ ہوگی؟ اسی طرح غافل اور غافل لوگ مردہ ہیں، اگرچہ ان کے جسم چلتے پھرتے اور چلتے نظر آتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ جان سے محروم ہیں۔ فاضل علماء اور [ابدی] سچائیوں کی دعوت دینے والے مردہ روحوں کو زندگی بخشتے ہیں۔ اگر سچائی کا داعی کرنے والے کو دوسرے داعی کی مدد اور رفاقت مل جائے تو یہ کسی کے لیے تسلی کا باعث ہے نہ کہ غم کا سبب لیکن عالم علماء اور مبلغین اسے تسلی نہیں سمجھتے بلکہ اسے ایک دوسرے کے علاقوں اور سلطنت کی حدود میں مداخلت سمجھتے ہیں۔ ایک روحانی مسافر کو اس سے بچنا چاہئے کیونکہ یہ شیطان کا پھنسا ہے جس کے ذریعے وہ ان لوگوں پر گھات لگا کر گھات لگا دیتا ہے جو وادی الٰہی کی وادی میں قدم رکھتے ہیں۔ لوگ اس جال میں پھنس جاتے ہیں کیونکہ دنیاداری کی محبت انسانی مزاج پر حاوی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

بَلۡ تُؤۡثِرُونَ ٱلۡحَيَوٰةَ ٱلدُّنۡيَا

"... اس کے بجائے، آپ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہیں (یعنی ابدی زندگی کے برعکس عارضی دنیاوی وجود)۔ (سورۃ البقرۃ باب 87، آیت 16)

اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ برائی [اور منفی رجحانات اور میلانات] پہلے سے ہی [انسانی] مزاج پر حاوی تھے کیونکہ اس کا ذکر الہامی نازل کردہ کتابوں اور سابقہ امتوں کے صحیفوں میں بھی ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّ هَٰذَا لَفِي ٱلصُّحُفِ ٱلۡأُولَىٰ ﴿١٨﴾ صُحُفِ إِبۡرَٰهِيمَ وَمُوسَىٰ ﴿١٩﴾

"یہ پچھلی الہامی کتابوں میں بھی موجود ہے، ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں۔" (سورۃ البقرۃ آیت 87، آیہ 18-19)

یہ روحانی مسافر کی روحانی جدوجہد، جدوجہد اور تربیت کا ایک مختصر خاکہ ہے۔ اس کے بعد کے ابواب میں اس بارے میں تفصیلی مراحل پیش کیے جائیں گے کہ کون سی منفی اور نقصان دہ باطنی خصلتوں کو ختم کیا جائے اور اس کو کیسے حاصل کیا جائے اور کون سی باطنی خصلتوں کو دل میں زینت دی جائے۔

تمام انسانی [اندرونی کردار] کی خصوصیات میں سب سے زیادہ غالب اور غالب پیٹ ، نجی اعضاء اور زبان کی ہوس ہیں۔ ان کے بعد، غصے کی خصلت ہے جو ان کی حمایت کرتی ہے۔ ان خواہشوں کے عادی اور عادی ہونے کے بعد انسان کے دل میں دنیاداری کی محبت بڑھ جاتی ہے اور دولت و شہرت کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ اس خواہش کی کوکھ میں تکبر، خود پرستی اور خود کو بڑھانے کے جراثیم پیدا ہوتے ہیں اور انسان ان میں اس طرح پھنس جاتا ہے کہ ان سے آزاد ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مذہب کے صرف وہی پہلو پسند کرتے ہیں جن میں غلب، وقار اور طاقت کے کچھ ذرائع موجود ہیں۔ اس معاملے کی سنگینی اور حساسیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم ان تخریبی منفی باطنی خصوصیات پر بحث کریں گے جو انسان کے دل و روح کی تباہی کا باعث بنتی ہیں۔ یہ بحث اگلی آٹھ کتابوں میں ہو گی [یا کتاب کی چار جلدوں میں سے تیسری سے *"احیاء العلوم الدین"* یا "خدا کی راہ کی معرفت احیاء" کے ابواب جو اس کام کے اگلے آٹھ ابواب سے مطابقت رکھتے ہیں]۔ سب سے پہلے، پیٹ اور نجی حصوں کی ہوس؛ دوسرا، زبان کے خطرات؛ تیسرا، غصہ، بغض اور حسد؛ چوتھا، دنیاداری کی مذمت اور اس کے دھوکہ دہی کی تفصیلات؛ پانچویں ، دولت ، مادی املاک اور بخل سے محبت۔ چھٹا ، دکھاوا [خود اور خود پر مرکوز خصلتوں کی نمائش سے متعلق] اور شہرت سے محبت؛ ساتواں ، تکبر اور خود تکبر۔ اور آٹھواں: خود فریب کی حالت۔ ان آٹھ کتابوں کے ذریعے ہمارا مقصد حاصل ہو جائے گا جو ہمارے سامنے ہے *"احیاء العلوم الدین"* یا "راہ خدا کی راہ کا احیاء" کی تیسری جلد [جو ان تباہ کن منفی باطنی خصوصیات کو واضح کرنے کے بارے میں ہے جو انسان کے دل اور روح کو تباہ و برباد کرتے ہیں تاکہ ان کے خلاف حفاظتی اقدامات اختیار کیے جا سکیں]۔ پچھلے دو ابواب میں سے پہلے میں (غزالی نے انہیں کتابیں کہا ہے) میں ہم نے دل کی باطنی صفات اور صفات یا تشریح کی وضاحت کی ہے، کیونکہ دل تمام تباہ کن باطنی صفات *(مہلیکت) کا منبع اور مسکن ہے* اور نجات دہندہ، مبارک، زندگی اور کامیابی کا ذریعہ ہے جو باطنی صفات کو عطا کرتا ہے *(منجیات)*) [جو انسان کو ابدی خوشی اور لامتناہی فتح کی طرف لے جاتے ہیں]۔ دوسری کتاب (یا باب جو یہ موجودہ باب ہے) میں کسی کے اندرونی کردار کی خصوصیات اور مزاج کو مہذب اور خوبصورت بنانے کا طریقہ کار فراہم کیا گیا ہے اور دل کی بیماریوں اور بیماریوں کے لیے مکمل صحت یابی کے لیے علاج تجویز کیا گیا ہے۔ یہ بحث مختصر ہے ، لیکن آنے والے ابواب میں تفصیلات ہوں گی۔

وَمَا تَوۡفِيقِيٓ إِلَّا بِٱللَّهِۚ عَلَيۡهِ تَوَكَّلۡتُ وَإِلَيۡهِ أُنِيبُ

"اللہ کے سوا کوئی نیک کام کرنے والا نہیں، اسی پر میں پورا توکل کرتا ہوں اور ہر چیز کی مدد کے لیے اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔"

باب 3 - نچلے نفس سے دو غالب بنیادی خواہشات کی گرفت کو توڑنا

غزالی کی تیسری کتاب " احیئ العلوم الدین" *یا "خدا کی راہ کے علم کا احیاء" کی تیسری جلد یا چوتھائی* میں خوراک میں لذت اور جسمانی لذتوں میں لذت کی دو زبردست خواہشات کو توڑنے سے متعلق ہے۔ یہ دونوں خواہشات اپنی جنونی فطرت ، صحت کو خطرے میں ڈالنے ، اور کسی کی زندگی کے حقیقی مقصد کے بارے میں غفلت اور غفلت کی وجہ سے زیادہ طاقتور ہیں ، جس سے روحانی کوششوں اور کوششوں کے لئے بہت کم یا کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی ہے۔ روحانی سفر جسمانی لذتوں اور جسمانی سرگرمیوں میں مشغول ہونے کی وجہ سے مکمل طور پر رک جاتا ہے جس سے غیر خود پر مرکوز مثبت کوششوں کے لیے بہت کم گنجائش رہ جاتی ہے۔ جسمانی خوشیوں کے لئے بے قابو خواہش ، مثبت پرہیزگاری کی کوششوں کے لئے بہت کم جگہ چھوڑتی ہے جو دوسروں کے لئے ہمدردی پر مبنی ہے۔ اس کے بجائے ، خود پر مرکوز جنون کسی کو خود غرضی اور اس کے تمام کمزور اثرات کی طرف لے جاتا ہے جو دیکھنے کے لئے سب واضح ہیں۔ دنیا کی مختلف روحانی روایات میں بھوک کو روحانی کاموں کے لیے ایک آلے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے، جس سے اس کے مسافروں کے لیے راستہ آسان ہو گیا ہے۔ غزالی ہماری اپنی روحانی کوششوں کو آسان بنانے کے لیے ایک آلے کے طور پر خوراک میں جزوی بھوک اور تحمل کی اولین ترجیح پر دوبارہ زور دیتی ہے جس کے نتیجے میں بدقسمتوں، بے گھر اور مصائب میں مبتلا لوگوں کے لیے مثبت پرہیزگاری کی کوششوں اور ہمدردی کو فروغ ملتا ہے۔ ایک بار جب روح کی وضاحت اور دل کی حساسیت بنیادی خواہشات پر قابو پانے کے ذریعے پیدا ہو جاتی ہے تو انسان اپنے وجود کے ہر اعصاب، ریشے اور ایٹم میں دوسروں کے درد اور تکلیف کو محسوس کرتا ہے۔ دوسروں کی بیماری اپنی بیماری بن جاتی ہے، دوسروں کا غم اپنا دکھ بن جاتا ہے، دوسروں کے مسائل اپنے مسائل بن جاتے ہیں اور دوسروں کے دکھ اور دکھ اس کا اپنا درد اور تکلیف بن جاتے ہیں۔ کوئی بھی شخص اب خود غرض، خود پر مرکوز اور سخت دل نہیں رہتا کیونکہ وہ اندر سے نکلنے والی ایک بے لگام طاقت کے ذریعے نیک کاموں کی طرف راغب ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں روحانی راستے پر کسی کے عروج کو آگے بڑھاتا ہے۔ غزالی کی یہ کتاب جس کا عنوان ہے "دو [غالب بنیاد] خواہشات کی گرفت کو توڑنا" یہاں مختصر شکل میں اس طرح پیش کیا جا رہا ہے:

جان لو کہ بنی آدم (یعنی تمام انسانیت) کے لیے سب سے زیادہ مہلک اور تباہ کن ہوس معدے کی ہوس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آدم اور حوا (بالترتیب پوری انسانیت کے باپ اور والد) (ان دونوں پر السلام) کو آسمان سے نکال کر اس دنیا میں بھیج دیا گیا تاکہ وہ ایک نئی زندگی کا آغاز کریں جو جہاد، کوشش، محنت، چیلنجز، ناخوشگوار حالات اور درد جیسی ناپسندیدہ چیزوں سے بھری ہوئی ہے۔ مصائب، غم، بھوک، بیماریاں اور سانحات جو متضاد طور پر موجود ہیں جو ہمیں خدائی حضور کے سائے میں اپنی حقیقی آسمانی اصلیت کی طرف واپسی کا راستہ تلاش کرنے میں مدد کرنے کے لیے موجود ہیں۔ ان کو کسی درخت کا پھل کھانے سے منع کیا گیا تھا لیکن ان پر خواہش غالب آ گئی اور وہ اس درخت سے کھا گئے۔ اس نافرمانی کے نتیجے میں وہ تمام عیب (شرم و شرم کے معاملات) جو اس وقت تک پوشیدہ تھیں، ظاہر ہو گئیں۔

پیٹ - تمام خواہشات ، خواہشات اور غالب خواہشات کا سرچشمہ: حقیقت یہ ہے کہ پیٹ تمام خواہشات کا سرچشمہ ہے اور تمام نقصانات کا منبع ہے۔ پیٹ کی ہوس جسمانی لذتوں کی ہوس کو بھڑکاتا ہے۔ جب کسی کا پیٹ بھرا ہوا ہوتا ہے تو وہ ضرورت سے زیادہ جسمانی لذتوں میں مبتلا ہونے کے بارے میں سوچتا ہے۔ کھانے اور ہم آہنگی کی ضرورت سے زیادہ خواہشات ، شہرت اور مادی املاک (دولت) کی خواہش کو جنم دیتی ہیں۔ شہرت اور دولت دو ایسی چیزیں ہیں جو شادیوں اور عمدہ کھانے کی تعداد میں اضافے کا ذریعہ ہیں۔ دولت کی کثرت اور شہرت میں زیادتی، تکبر ، مقابلہ میں دوسروں پر غلبہ حاصل کرنے کی خواہش پیدا کرتی ہے، اور ان لوگوں کے خلاف حسد کے جذبات پیدا کرتے ہیں جو [مادی اموال، شہرت اور طاقت میں] ایک سے برتر ہیں اور ان کے پیٹ سے دکھاو، فخر و غرور اور ان کی طرح کی برائیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں تلخی ، دشمنی اور بغض کا احساس اڑا دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد انسان بغاوت، نافرمانی اور بغاوت پر جھک جاتا ہے اور برائیوں اور فحاشی میں ڈوب جاتا ہے۔ یہ سب پیٹ خالی نہ رکھنے کے نتائج اور ثمرات ہیں کیونکہ یہ سب کھانا کھانے کا تکبر اور نشہ ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے نفس کو بھوک سے ذلیل کرتا اور شیطان کے راستوں پر سخت پہرہ دیتا اور اس کی حفاظت کرتا تو وہ کبھی بھی بغاوت کا سہارا نہ لیتا۔ اس کے بجائے، کوئی خدا کی اطاعت کرتا اور تکبر، دکھاوے (خود پر مرکوز، خود کو ظاہر کرنا)، نافرمانی [خدائی احکامات کے مطابق] اور بغاوت کی راہ پر نہ گامزن ہوتا۔ نہ کوئی دنیاوی لذتوں میں ڈوب جاتا اور نہ ہی دنیاوی (دنیا) کو ابدی (آخرت) پر ترجیح دینے کی غلطی کرتا اور نہ ہی دنیاوی اموال اور مال پر اس طرح چھلانگ لگاتا جیسے شکاری اپنے شکار پر چھلانگ لگاتے ہیں۔ بہرحال معدے کی ہوس کے نقصانات اس قدر خطرناک اور مہلک ہیں کہ خدا کے بندوں (تمام انسانوں) کو اس کے خطرات اور اس سے بچنے کے طریقوں سے آگاہ کرنا ضروری ہے۔ جنسی ہوس کے ساتھ بھی یہی صورتحال ہے کیونکہ یہ پیٹ کی ہوس کے تابع ہے۔ ہم اس بحث کو خدا کی طرف سے عطا کردہ مدد اور قابلیت کے ساتھ [اس باب کے چند حصوں میں] مکمل کریں گے۔ پہلے حصے میں بھوک کی فضیلت اور لالچ کی مذمت کی وضاحت کی جائے گی پھر بھوک کے فوائد کا ذکر کیا جائے گا۔ اس کے بعد کم کھانے اور کھانے میں تاخیر کے ذریعے معدے کی ہوس کو ختم کرنے کے لیے روحانی کوشش کا طریقہ واضح کیا جائے گا۔ بھوک کے فوائد کے سلسلے میں لوگوں کی حالتوں کے اختلافات کا ذکر کیا جائے گا۔ اس کے بعد ، نجی حصوں کی ہوس پر تبادلہ خیال کیا جائے گا۔ بعد میں اس بات کی وضاحت کی جائے گی کہ آیا کسی روحانی مسافر کے لیے شادی کرنا ضروری ہے یا نہیں۔ اس کے بعد ان لوگوں کی فضیلت کا ذکر کیا جائے گا جو معدے، شرم اور آنکھوں کی ہوس کے مخالف ہیں۔

بھوک کی فضیلت اور لالچ کی مذمت

بھوک کی فضیلت کے بارے میں [نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روایات درج ذیل ہیں:

جاهدوا انفسكم بالجوع والعطش فان الاجر فی ذالک کاجر للمجاهد فی سبیل اللّٰه فانه لیس من عمل احب الی اللّٰه من جوع وعطش

"روحانی جدوجہد کرو اور اپنے نفس سے بھوک اور پیاس سے جہاد کرو کیونکہ اس کا وہی ثواب الٰہی ہے جو خدا کی راہ میں اپنے دفاع میں مشغول ہونے کے لیے (جان، آزادی، مال اور امن کے تحفظ کے لیے بیرونی جارحیت کے خلاف) ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کو بھوک اور پیاس سے زیادہ محبوب کوئی عمل نہیں ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

لا يدخل ملكوت السموات من ملا بطنه

"آسمانی فرشتے اس شخص کے قریب نہیں آتے جو پیٹ بھرتا ہے [جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے مقصد سے غفلت کی کیفیت میں مبتلا ہے اور اس کے حصول کے لیے کوشش کرنا ضروری ہے]۔

البسوا وكلوا واشربوا في انصاف البطون فانه جزء من النبوة

"کپڑے پہنو [جس میں ڈھانپنے کی ضرورت ہے] اور پیٹ آدھا خالی کر کے کھاؤ پیو کیونکہ یہ نبوت کا حصہ ہے۔"

الفكر نصف العبادة وقلة الطعام هي العبادة

"غور و فکر آدھی عبادت ہے اور تھوڑی سی مقدار میں کھانا مکمل عبادت ہے۔"

افضلكم عند الله منزلة يوم القيامة اطولكم جوعا وتفكرا في الله سبحانه وابغضكم عند الله عز وجل يوم القيامة كل نوم اكول شروب

"قیامت کے دن سب سے اعلیٰ درجے کا شخص وہ ہوتا جو بہت بھوکا رہتا تھا اور خدا کے بارے میں بہت زیادہ غور و فکر کرتا تھا۔ قیامت کے دن وہ شخص خدا کی نظروں میں نیچا ہو جائے گا جو بہت سوتا تھا، کھاتا اور پیتا تھا۔

لا تميتوا القلب بكثرة الطعام والشراب فان القلب كالزرع يموت اذا اكثر عليه الماء

"کھانے پینے کی کثرت سے اپنے دلوں کو مردہ نہ بناؤ۔ یہ دل کے کھیت کی طرح ہونے کی وجہ سے ہے - جب اسے ضرورت سے زیادہ پانی سے سیراب کیا جاتا ہے تو یہ تباہ ہو جاتا ہے۔

ما ملا ابن آدم وعاء شرا من بطنه' حسب ابن آدم لقيمات يقمن صلبه' وان كان لابد فاعلا فثلث لطعامه' وثلث لشرابه وثلث لنفسه

"ابن آدم (یعنی انسان) نے پیٹ سے بدتر کوئی برتن نہیں بھرا ہے۔ آدم کے بیٹے کے لئے چند ٹکڑے کافی ہیں جو پیٹھ کو سیدھا رکھ سکتے ہیں۔ اگر بھرنا ضروری ہو تو پیٹ کو تین حصوں میں تقسیم کیا جائے - ایک حصہ (پیٹ کا ایک تہائی حصہ) کھانے کے لیے، ایک حصہ پانی کے لیے اور ایک حصہ سانس لینے کے لیے (یعنی پیٹ کا ایک تہائی حصہ آسانی سے سانس لینے اور ضرورت سے زیادہ کھانے پینے سے بچنے کے لیے خالی چھوڑ دیا جائے تاکہ جسمانی صحت پر مثبت طبی اثرات مرتب ہوں)۔ (یہ روایت حدیث کے مجموعہ *ترمذی* میں صحابی پیغمبر مقدم رضی اللہ عنہ سے نقل ہوئی ہے)

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک طویل روایت میں اسامہ بن زید اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرماتے ہیں:

ان اقرب الناس من اللّٰہ عزوجل یوم القیامۃ من طال جوعہ وعطشہ وحزنہ فی الدنیا الاحفیاء الاتقیاء الذین ان شھدوا لم یعرفوا وان غابوا لم یفتقدوا تعرفھم بقاع الارض وتحف بھم ملائکۃ السماء نعم الناس بالدنیا ونعموا بطاعۃ اللّٰہ عزوجل افترش الناس الفرش الوثیرۃ، وافترشوا الجباہ والرکب، ضیع الناس فعل النبیین واخلاقھم وحفظوھا ہم تبکی الارض اذا فقدتھم ویسخط الجبار علی کل بلدۃ لیس فیھا منھم احد لم یتکالبوا علی الدنیا تکالب الکلاب علی الجیف، اکلوا العلق ولبسوا الخرق شعثا غبرا یراھم الناس فیظنون ان بھم داء وما بھم داء، ویقال قد خولطوا فذھبت عقولھم وما ذھبت عقولھم، ولکن نظر القوم بقلوبھم الی امر اللّٰہ الذی اذھب عنھم الدنیا فھم عند اھل الدنیا یمشون بلا عقول عقلوا حین ذھبت عقول الناس، لھم الشرف فی الاخرۃ یا اسامۃ اذا رایتھم فی بلدۃ فاعلم انھم امان لاھل تلک البلدۃ،

ولا یعذب اللّٰہ قوما ھم فیھم الارض بھم فرحۃ والجبار عنھم راض اتخذھم لنفسک اخوانا عسی ان تنجوا بھم، وان استطعت ان یاتیک الموت وبطنک جائع وکبدک ظمان فافعل، فانک تدری بذلک شرف المنازل وتحل مع النبیین وتفرح بقدوم روحک الملائکۃ ویصلی علیک الجبار

"قیامت کے دن وہ لوگ اللہ کے قریب ہوں گے جو زیادہ بھوکے اور پیاسے اور پشیمان رہیں گے۔ یہ لوگ ایسے *پرہیزگار* ہیں کہ اگر وہ حاضر ہوں تو انہیں کوئی نہ دیکھے گا اور اگر وہ دور ہوں تو کوئی ان کی تلاش نہ کرے گا اگرچہ زمین کا ہر ذرہ ان سے واقف ہو اور فرشتے ان کو گھیرے ہوئے ہوں یہ لوگ دنیا کے سب سے بہتر لوگ ہیں۔ [دیگر] لوگ نرم اور آرام دہ بستروں پر لیٹ جاتے ہیں اور پیشانیاں سجدہ کرتے ہیں اور گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتے ہیں۔ [دیگر] لوگوں نے انبیاء علیہم السلام کے نیک طریقے اور اخلاق کو ضائع کر دیا ہے جبکہ انہوں نے ان کی حفاظت کی ہے۔ زمین ان کے لیے روتی ہے جب وہ (اپنے دنیاوی وجود سے) چلے جاتے ہیں اور اس شہر پر غضب نازل ہوتا ہے جس میں ان میں سے کوئی نہیں ہے [کیونکہ وہ جہاں وہ رہتے تھے] الٰہی نعمتوں کا ذریعہ تھے۔ وہ دنیاداری میں اس طرح نہیں گرتے جیسے کتے لاش کے لئے گر جاتے ہیں۔ وہ کم سے کم ضرورت کھاتے ہیں ، پرانے اور پھٹے ہوئے کپڑے پہنتے ہیں ، اور بکھرے ہوئے رہتے ہیں۔ لوگ ان کی طرف دیکھ کر یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ شاید وہ کسی بیماری میں مبتلا ہیں حالانکہ حقیقت میں انہیں کوئی بیماری نہیں ہے۔ بعض لوگ انہیں بے وقوف کہتے ہیں حالانکہ وہ عقل کے مالک ہیں۔ لیکن ان کے پاس ایسی عقل نہیں ہے جس کی طرف دنیا والوں کی آنکھیں ہیں اور جسے اللہ نے ان سے دور رکھا ہے۔ دنیاوی لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شاید وہ عقل کے بغیر گھوم رہے ہیں [اور دنیا میں آرام سے رہنے کے لئے درکار ذہانت کی ضرورت ہے]، حالانکہ وہ اپنی عقل کو اس وقت برقرار رکھتے ہیں جب وہ ہر ایک سے رخصت ہو جاتی ہے [ضرورت سے زیادہ ہوس یا جذباتی، نفسیاتی اور دیگر پریشانیوں کی وجہ سے]۔ اے اسامہ! آخرت میں ایسے لوگوں کے لیے عزت اور فضیلت ہے۔ جب آپ انہیں کسی شہر میں دیکھیں تو اسے اس شہر کے لئے امن کا حکم سمجھیں۔ خدا کسی ایسی قوم کو مصیبت میں نہیں ڈالتا جس میں ایسے لوگ موجود ہوں۔ زمین ان سے خوش ہے اور اللہ ان سے راضی ہے۔ انہیں اپنے بھائی بناؤ، شاید تم بھی ان کے ذریعے سے نجات

حاصل کرو اگر آپ ایسا کر سکتے ہیں کہ جب آپ کی موت کا وقت آئے تو آپ کا پیٹ بھوکا ہو اور آپ کا گردہ پیاسا ہو تو ایسا کریں۔ تم آخرت کے مراحل میں امتیاز حاصل کرو گے، تم انبیاء کے ساتھ رہو گے، فرشتے تمہاری روح کی آمد سے خوش ہوں گے اور اللہ تم پر اپنی رحمت نازل فرمائےگا۔ (یہ روایت کتاب *الزہد* میں خطیب اور *ابن الجوزی نے الموداعات میں صحابہ کرام اسامہ بن زید اور ابوہریرہ رضی* اللہ عنہ سے *روایت کی ہے* جس نے تمام *احادیث* کی تصدیق کی ہے غزالی کی کتاب "خدا کی راہ کا احیاء" میں مذکور ہے)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے شاگردوں اور معاونین (*حواریون*) سے کہا: "اپنے پیٹ کو بھوکا رکھو اور جسموں کو ننگا رکھو (سوائے ان اعضاء کو جو حیا سے ڈھانپنے کے لیے ضروری ہیں اور *شریعت* کی تعمیل میں) تاکہ تمہارے دلوں میں خدا کی گواہی کی توفیق پیدا ہو جائے۔ اسی طرح کی روایت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی روایت ہے جو طاووس نے روایت کی ہے۔ تورات (ایک اور الہامی کتاب جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی) کی روایت ہے کہ خدا موٹے عالم کو پسند نہیں کرتا کیونکہ موٹاپا خدا کی طرف سے غفلت اور کھانے میں حد سے زیادہ عیش و عشرت کا اشارہ ہے۔ یہ خاص طور پر علماء کے لیے ایک بری عادت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اور روایت میں یہ ہے کہ

ان الشيطان يجري من ابن آدم مجرى الدم فضيقوا مجاريه بالجوع والعطش

"شیطان بنی آدم کی رگوں میں دوڑتا ہے۔ بھوک اور پیاس سے اس کے راستوں کو تنگ کر دو۔" (یہ روایت حدیث کے مجموعہ ابن ابی دنیا *میں نقل ہوئی ہے*)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کھانا نہیں کھایا۔ کبھی کبھی میں ان پر بھوک کے نشانات دیکھتا اور روتا اور ان کے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر کہتا کہ میری زندگی تم ہی گزر جائے۔ آپ کو کم از کم اتنی مقدار کھانی چاہئے جو آپ کو طاقت دے، اور آپ کی بھوک کو دور کرے'. آپ جواب دیتے تھے: اے عائشہ! میرے ماضی کے انتہائی پرعزم بھائیوں [جیسے آدم ، نوح ، ابراہیم ، اسماعیل ، اسحاق ، یعقوب ، یوسف ، داؤد ، سلیمان ، موسیٰ ، یوحنا اور عیسیٰ علیہ السلام] نے اس سے کہیں زیادہ بڑی آزمائشوں ، مصیبتوں اور مصائب پر صبر کیا تھا۔ پھر جب وہ دنیا چھوڑ کر اپنے رب کے پاس آئے تو انہیں بڑا اجر اور بے پناہ عزت اور بلند مرتبہ دیا گیا مجھے شرم آتی ہے کہ کل میرے ساتھ ایسا ہو سکتا ہے کہ میں چند دنوں کی زندگی کی آسائشوں کی وجہ سے [خدا کے سامنے] ان سے کم درجے حاصل کر لوں۔ میرے لیے کل آخرت میں کم حصہ حاصل کرنے سے چند دن تک سختی برداشت کرنا بہتر ہے اور مجھے اپنے دوستوں اور بھائیوں (ماضی کے عظیم انبیاء) کے ساتھ رہنے کے سوا اور کچھ پسند نہیں ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس گفتگو کے ایک ہفتہ بعد بھی ان کی ملاقات اپنے رب سے ہوئی (کیونکہ وہ اس دنیاوی وجود سے انتقال کر کے اپنے ابدی گھر میں حاضر ہوگئے)۔

بھوک کے فوائد اور بھوک کے نقصانات

بھوک کی فضیلت کے بارے میں جو سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ کسی ایسے عمل کی اتنی خوبیاں کیوں ہوتی ہیں جس سے پیٹ میں درد ہوتا ہے؟ اگر اپنے آپ کو تکلیف اور تکلیف [جیسے بھوک] کا نشانہ بنانا ایک اچھی چیز ہوتی تو ایسا کرنے کی دوسری شکلیں بھی ہوسکتی تھیں جیسے لاٹھی سے اپنے آپ کو مارنا ، ناپسندیدہ چیزیں کھانا وغیرہ۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان چیزوں کی اجازت نہیں ہے، تو پھر معدے کی محرومی کو نیکی قرار دے کر تمام نیک اعمال کی بنیاد کیوں بنا دیا گیا ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ بھوک ایک دوا کی طرح ہے۔ اگر کوئی شخص دوا کے ذریعے صحت مند ہو جائے اور قیاس کرے کہ دوا کی تلخی اور ناپسندیدگی کی وجہ سے صحت حاصل ہو گئی ہے اور یہ نتیجہ اخذ کرے کہ ہر کڑوی اور ناگوار چیز فائدہ مند ہے اور اس لیے وہ ہر تلخ اور ناگوار چیز کھانا

شروع کر دے تو اسے بتایا جائے گا کہ دوا کی کڑوا صحت کے حصول میں کارگر نہیں ہے بلکہ اس کی ایک خاص خصوصیت ہے جس کا علم صرف طبیب کو ہی ہے۔ بھوک کا بھی یہی حال ہے۔ [مذہبی] علماء اس کے فوائد سے واقف ہیں۔ جو شخص بھوک کی فضیلت پر یقین رکھتے ہوئے بھوکا رہتا ہے، وہ بھوک کے فوائد سے واقف ہو یا نہ ہونے سے قطع نظر فوائد حاصل کرے گا۔ تاہم، ان افراد کی خاطر جو ایمان کی سطح سے علم کی سطح تک ترقی کرنا چاہتے ہیں، بھوک کے فوائد بیان کیے جائیں گے۔ بھوک کے دس فوائد ہیں جن کی تفصیل یہاں الگ الگ بیان کی گئی ہے:

پہلا فائدہ: طہارت، پاکیزگی اور دل کی پاکیزگی (*صفہ القلب*): طہارت، پاکیزگی اور دل کی پاکیزگی میں باطنی دور اندیشی کا کمال اور معاملات کی حقیقت کو دیکھنے کی صلاحیت شامل ہے۔ لالچ دماغ کی سست روی کو جنم دیتی ہے، دل کی روشنی کم ہو جاتی ہے، دماغ تاریک ہو جاتا ہے، نشہ آور چیزوں کی طرح بخارات نکل جاتے ہیں، دماغ میں پھیل جاتے ہیں اور اسے اس طرح گھیر لیتے ہیں کہ غور و فکر کی کوئی گنجائش نہیں بچتی، دل کسی چیز کو سمجھنے کے قابل نہیں ہوتا اور سوچنے اور سمجھنے کی تمام صلاحیتیں کم ہو جاتی ہیں۔ جو بچہ زیادہ کھاتا ہے، یادداشت کی طاقت میں کمی محسوس کرتا ہے، ذہن دھندلا پڑ جاتا ہے اور ذہانت کی جگہ سست روی کا شکار ہو جاتی ہے۔ ابو سلیمان دارانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "بھوک کو اختیار کرو کیونکہ یہ نفس کو ذلیل کرتی ہے [جو ہر نیچ، منفی، نقصان دہ اور گھٹیا رجحان، صفت اور باطنی خصوصیت کی طرف مائل ہے]، دل میں نرمی پیدا کرتی ہے [جیسا کہ سختی دل، بے رحمی، تکبر اور خود غرضی کے برعکس] اور آسمانی علوم کا وارث بننے کے قابل ہو جاتا ہے (علم جو الٰہی کی کیفیت کے ساتھ آتا ہے، یا *معارفہ*)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

احیوا قلوبکم بقلۃ الضحک وقلۃ الشبع وطہروھا بالجوع تصفو وترق

"اپنے دلوں کو کم ہنستے اور کم کھانے کے ساتھ زندہ رکھو اور انہیں بھوک سے پاک کرو۔ وہ صاف ستھرے اور نرم رہیں گے [جس کے نتیجے میں روحانی راستے پر چڑھنے میں مدد ملے گی]۔

شبلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب بھی میں کسی خاص دن خدا کی خاطر بھوکا رہتا تھا تو میرے دل میں حکمت اور علم کے نئے راستے کھل جاتے تھے جو پہلے مجھے نامعلوم تھے۔ واضح رہے کہ عبادت کا اصل مقصد غور و فکر کا حصول ہے جو انسان کو علم الٰہی اور معرفت *کی روحانی نقاب کشائی کی طرف لے جاتا ہے* اور روحانی حقیقتوں کی نقاب کشائی کی طرف لے جاتا ہے اور اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ بھوک علم الٰہی اور معرفت کے دروازے کھول دیتی ہے اور اس کے نتیجے میں جنت کا دروازہ ہے۔ اس لحاظ سے بھوک جنت کے دروازے پر دستک دینے کا کردار ادا کرتی ہے۔ لقمان رحمۃ اللہ علیہ (نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بنی اسرائیل کے ایک مشہور بزرگ) نے اپنے بیٹے سے کہا: اے بیٹے! جب پیٹ بھر جاتا ہے تو غور و فکر کی قوت سو جاتی ہے، حکمت گونگی ہو جاتی ہے اور اعضاء میں عبادت کی کوئی گنجائش اور توانائی باقی نہیں رہتی۔ بایزید البستمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب کوئی بندہ بھوکا ہوتا ہے تو عقل دل سے بارش کی طرح نکلتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

نور الحکمۃ الجوع والتباعد من اللّٰہ عزوجل الشبع والقربۃ الی اللّٰہ عزوجل حب المساکین والدنو منہم لا تشبعوا فتطفئوا نور الحکمۃ من قلوبکم ومن بات فی خفۃ من الطعام بات الحور حولہ حتّٰی یصبح

"حکمت کا نور بھوک ہے اور خدا سے دوری کی وجہ لالچ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قربت اور قرب غریبوں سے محبت کرنے اور ان کے قریب ہونے میں ہے۔ پیٹ بھر کر نہ کھاؤ، تو اپنے دل میں حکمت کی شمع بجھا دے گا۔ ایک

شخص جس کا پیٹ ہلکا ہوتا ہے ، صبح تک آسمانی ساتھیوں سے گھرا ہوا ہوتا ہے۔(یہ روایت حدیث کے مجموعہ *ابو منصور الدیلمی* میں صحابہ کرام ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل ہوئی ہے)

دوسرا فائدہ: دل کی نرمی اور نرمی: بھوک سے دل نرم ہو جاتا ہے اور اس میں الٰہی یاد سے لذت حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ کئی بار یاد الٰہی دل کی موجودگی کے ساتھ ہوتا ہے لیکن اس میں کوئی لذت نہیں ہوتی اور دل اس سے حرکت نہیں کرتا، گویا دل اور یاد الٰہی کے درمیان ایک پردہ ہے جسے *قصوے* یا دل کی سختی اور بے حس ہونا کہا جا سکتا ہے۔ کبھی کبھی دل میں اتنی نرمی اور نرمی پیدا ہوتی ہے کہ خدا کی یاد سے بے پناہ خوشی ملتی ہے۔ اس لذت کے حصول کی سب سے واضح وجہ [بھوک کی حالت میں] پیٹ کا خالی پن ہے۔ جنید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض لوگ کھانے پینے کے خواہاں ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے ساتھ مباشرت کی مٹھاس بھی چاہتے ہیں۔ ابو سلیمان دارانی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے: جب کوئی بھوکا اور پیاسا ہوتا ہے تو دل میں نرمی اور نرمی ہوتی ہے۔ جب پیٹ بھرا ہوا ہو تو دل میں اندھا پن اور گندگی ہو جاتی ہے۔ اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ غور و فکر میں آسانی اور علم و قربت الٰہی یا *معرفہ (معارفہ)* ایک چیز ہے اور اس میں لذت حاصل کرنا الگ چیز ہے۔

تیسری فائدہ: دل کی عاجزی اور نرمی: بھوک کا تیسرا فائدہ یہ ہے کہ اس سے عاجزی اور نرمی پیدا ہوتی ہے، اور تکبر اور خوشی کا خاتمہ ہوتا ہے، یہ دونوں ہی خدا کی طرف بغاوت اور غفلت کے سرچشمے ہیں۔ نفس نفس بھوک سے زیادہ کسی چیز سے نرم یا ذلیل نہیں ہوتا۔ جب کوئی بھوکا ہوتا ہے تو وہ اپنے رب کا نام لیتا ہے [الٰہی کی یاد کی حالت میں، انتہائی محتاج ہو کر خدا کی طرف لوٹ جاتا ہے]، اس کی اطاعت کرتا ہے اور عاجزی اور عاجزی سے روہتا ہے [جو بدلے میں اسے آس پاس کے ہر شخص کے ساتھ صحیح کام کرنے پر مجبور کرتا ہے]۔ بھوک کے وقت اس کی طاقت کمزور ہو جاتی ہے اور روٹی کا ایک ٹکڑا اور پانی کا ایک گھونٹ نہ ہونے کی وجہ سے زندگی تنگ ہو جاتی ہے۔ جب تک کوئی انسان اپنی ذلت اور کمزوری کا مشاہدہ نہیں کرتا، وہ اپنے رب کی عظمت، عظمت اور غالب رسائی کا اقرار نہیں کرتا۔ انسان کی لازوال خوشی اور نہ ختم ہونے والی کامیابی یہ ہے کہ وہ ذلت اور نااہلی کی نگاہ سے اپنے نفس کو دیکھے۔ اور خدا کی جلال اور قادر مطلق کی آنکھ سے خدا کی گواہی دینا، ہمیشہ خدا کے بھوکے اور محتاج رہنا، اس ضرورت اور پریشانی میں خوشی پانا۔ یہی وجہ ہے کہ جب دنیا کے خزانے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے رکھے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا بل اجوع یوما واشبع یوما فاذا جعت صبرت و تضرعت واذا شبعت شکرت

"نہیں (میں انہیں نہیں چاہتا)! اس کے بجائے، میں ایک دن [روزے کی حالت میں] بھوکا رہوں گی اور دوسرے دن کھانا کھاؤں گی۔ جب میں بھوکا رہوں گا تو صبر کروں گا اور تیرے سامنے رووں گا۔ [تیری انتہائی محتاج حالت میں، تیری عظمت اور قدرت کے سامنے جھکتے ہوئے] اور [جس دن] میں کھانا کھاؤں گا، میں تیری تہہ دل سے شکر ادا کروں گا!" (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث کا *مجموعہ ترمذی*)

پیٹ اور پرائیوٹ دونوں جہنم کے دروازے ہیں اور اس کی طرف جانے والا راستہ لالچ سے گزرتا ہے۔ عاجزی اور عاجزی جنت کے دروازے ہیں اور اس کی طرف جانے والا راستہ بھوک سے گزرتا ہے۔ جو شخص جہنم کا ایک دروازہ بند کرتا ہے وہ یقینا جنت کا دروازہ کھول دیتا ہے کیونکہ جنت اور جہنم مشرق اور مغرب کی طرح ایک دوسرے کے بالکل مخالف ہیں۔ ایک سے خود کو دور کرنا ، ایک دوسرے کے قریب کھینچتا ہے۔

چوتھی فائدہ: عذاب الٰہی کی یاد اور مصائب اور مصائب کا سامنا کرنے والے لوگوں کی حالت سے سبق حاصل کرنا: چوتھا فائدہ یہ ہے کہ انسان سزاؤں الٰہی کو نہیں بھولتا اور ان لوگوں کو یاد کرے جو کسی نہ کسی مصائب میں مبتلا ہوئے ہیں۔ ایسا ہوتا ہے کہ ایک مطمئن شخص بھوک کو بھول جاتا ہے۔ عقلمند شخص وہ ہے جو کسی کو مصیبت میں دیکھ کر آخرت کی مصیبتوں کو یاد کرتا ہے۔ پیاسا ہونے کی وجہ سے یہ تصور کرنا چاہیے کہ قیامت کے میدان میں لوگ پیاس سے دوچار ہوں گے۔ بھوکا ہونے کی وجہ سے جہنم کے باشندوں کی بھوک کا تصور کرنا چاہیے۔ جب انہیں بھوک اور پیاس لگے گی تو کانٹے دار درخت کھائیں گے اور پیپ اور خون پئیں گے۔ آخرت کی سزائیں اور اس

کے درد اور مصائب کسی بندے (یعنی انسان) کی آنکھوں سے کبھی ختم نہیں ہونی چاہئیں کیونکہ یہ خدا سے خوف پیدا کرتا ہے اور اپنے آپ کو گناہوں سے بچاتے ہوئے احتیاط سے قدم رکھتا ہے۔ جو شخص ذلت یا مالی تنگی یا کسی قسم کی تکلیف میں پھنسا نہ ہو یا کسی بیماری میں مبتلا نہ ہو وہ آخرت کے عذاب سے غافل اور غافل ہو جاتا ہے۔ نہ تو کسی کے ذہن میں یہ بات باقی رہتی ہے کہ کل قیامت کے دن حساب کتاب ہو گی اور نہ ہی خدا کا خوف دل پر حاوی ہو گا۔ اس لیے بندے کے لیے بہتر ہے کہ وہ کسی پریشانی یا آزمائش میں مبتلا ہو۔ اگر ایسا نہیں ہے تو ، کم از کم کچھ پریشانی اور مقدمہ کسی کے مشاہدے میں رہنا چاہئے۔ تمام آزمائش اور پریشانی میں سب سے بڑی آزمائش جو درد کا سبب بنتی ہے وہ بھوک کی فکر ہے۔ کوئی بھی سب کچھ برداشت کر سکتا ہے لیکن بھوک نہیں۔ بھوک کے بے شمار فوائد آخرت کے عذاب کے ذکر کے علاوہ ہیں۔ انبیاء اور اولیاء کرام کو درپیش آزمائشوں اور مصیبتوں کا راز یہ ہے کہ ان مصیبتوں کی وجہ سے آخرت ہمیشہ ان کے سامنے رہتی ہے اور آخرت کی مسلسل یاد اور تصور کے نتیجے میں ان کے روحانی درجات میں ترقی ہوتی ہے۔ کسی نے حضرت یوسف علیہ السلام سے پوچھا کہ تم بھوکے کیوں رہتے ہو جب کہ مصر کے خزانوں کی چابیاں تمہارے ہاتھ میں ہیں؟ آپ نے جواب دیا: "مجھے ڈر ہے کہ کھانا پیٹ بھر کر میں بھوکوں کو نظر انداز نہ کر دوں"۔ بھوک اور مسکینوں کو یاد کرنا (اور اس کے نتیجے میں ان کی مدد کرنے پر مجبور ہونا) بھی بھوک کے بے شمار فوائد میں سے ایک ہے کیونکہ اس سے لوگوں کے ساتھ مہربانی اور رحم کے جذبات کو فروغ ملتا ہے اور ان کو کھانا کھلانے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ ایک مطمئن شخص بھوکے کے درد کا احساس کیسے کرے گا؟

پانچواں فائدہ: شہوت کا خاتمہ اور ذلیل نفس کو محکوم بنانا جو انسان کو برائی پر اکساتا ہے *(نفس عمارہ)*: یہی سب سے اہم فائدہ ہے۔ تمام گناہوں [اور برائیوں کو] کی بنیاد ہوس اور انسانی صلاحیتیں (جسمانی اعضاء اور اندرونی صلاحیتیں دونوں) ہیں جو کھانے سے مدد حاصل کرتی ہیں۔ اگر کھانے کی مقدار کم ہو جاتی ہے، ہوس اور لالچ کمزور ہو جاتی ہے، جسمانی طاقت بھی کمزور ہو جاتی ہے۔ خوش قسمتی کا کمال یہ ہے کہ انسان ادنیٰ نفس پر غالب ہو اور بدقسمتی کا کمال یہ ہے کہ ادنیٰ نفس پر غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ جس طرح جنگلی باغی گھوڑے کو پانی اور چارے سے محروم کر کے قابو پایا جاتا ہے، اسی طرح باغی اور ہٹ دھرمی نچلی نفس کو بھوک کا نشانہ بنا کر محکوم کر دیا جاتا ہے۔ اگر گھوڑا باغی ہو اور بہت زیادہ کھاتا پیتا ہے تو اس کی بغاوت کم نہیں ہوتی بلکہ اس کی بغاوت بڑھ جاتی ہے۔ نفس نفس کی بھی یہی حالت ہے کیونکہ زیادہ [اور لذیذ] کھانا، خاص طور پر وہ جس کا وہ شوق اور خواہش رکھتا ہے، اسے زیادہ سرکش اور نافرمان بناتا ہے۔ کسی نے ایک رشی سے پوچھا: "آپ بہت کمزور ہیں اور اپنی زندگی کے ایک نازک مرحلے میں داخل ہو گئے ہیں۔ آپ [کھانے سے] اپنے جسم کی پرورش کیوں نہیں کرتے؟" اس نے جواب دیا: بھائی! یہ جسم بہت جلد فخر کرنے لگا اور اگر اس کی لگام ذرا بھی ڈھیلی ہو جائے تو وہ نئی شرارتیں کرنا شروع کر دیتا ہے۔ میں اس کی پرورش نہیں کرتا تاکہ وہ سرکشی نہ کرے اور مجھے تباہی میں ڈال دے۔ اس کی وجہ سے گناہوں میں ملوث ہونے سے بہتر ہے کہ اس سے سختی سے نمٹا جائے اور اس میں نرمی کا مظاہرہ کیا جائے۔ ذذون نون مصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب بھی میں پیٹ بھر کر کھاتا تھا تو کسی گناہ میں الجھ جاتا تھا یا اس کا خیال دل میں آتا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد پہلی بدعت (بدعہ یا کوئی نئی بات جو ایمان کے قائم اصولوں کے خلاف ہے اور اس طرح اس کی اجازت نہیں ہے) تسکین کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ جب لوگوں کا پیٹ بھر جاتا ہے تو ان کے نچلے نفس *(نفوس)* بغاوت اختیار کر لیتے ہیں اور ان کی لگام آخرت سے دنیا کی طرف کھینچ لی جاتی ہے۔ یہ واحد فائدہ نہیں ہے، بلکہ اس ایک فائدہ میں بے شمار پوشیدہ فوائد شامل ہیں، بلکہ بہتر ہوگا کہ اسے "فوائد کا خزانہ" کہا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بھوک کو خدا کے خزانوں سے خزانہ قرار دیا گیا ہے۔ بھوک کا کم سے کم فائدہ یہ ہے کہ نہ تو جنسی اعضاء کی ہوس باقی رہتی ہے اور نہ ہی بات کرنے کی ہوس ہے۔ بھوکے کا دل زیادہ بات کرنے کی خواہش نہیں کرتا۔ اس طرح انسان کو جھوٹ بولنا، غیبت کرنا، فحاشی اور لوگوں کی پیٹھ کے پیچھے شکایت جیسے الفاظ کے نقصانات سے محفوظ رکھا جاتا ہے۔ جس کا پیٹ بھرا ہوا ہو وہ مزاح کے بارے میں سوچتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ کوئی شخص لوگوں کی توہین کرکے (یعنی ان کے وقار میں چھیڑ چھاڑ کرکے) اپنے حس مزاح کو پورا کرے گا۔ لوگ اپنی زبانوں کی فصل کاٹ کر جہنم میں جائیں گے۔ کی برائیاں واضح ہیں۔ بھوکا شخص اس کی برائیوں سے بھی محفوظ رہتا ہے۔

اگر پیٹ بھرا ہوا ہے تو ، ان کے سر پر ہوس پیدا ہوتی ہے اور کوئی نجی حصوں کو کنٹرول کرنے کے قابل نہیں ہوتا ہے۔ اگر خدا کا خوف ان کی خواہشات کی تکمیل میں رکاوٹ بن جائے تو آنکھوں کے سے بچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی آنکھیں بند کرے تو دل پر کوئی کنٹرول نہیں ہوتا۔ [شہوت انگیز] اشاروں کی بہت سی مختلف شکلیں اسے

پریشان رکھیں گی اور فحش اور فحش خیالات سے چھٹکارا حاصل کرنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ بعض اوقات یہ خیالات دعاؤں اور دعاؤں کے سکون اور سکون کو تباہ کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہاں زبان اور شرم کے اعضاء کے نقصانات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ورنہ ساتوں اعضاء کے گناہوں کا سبب وہی طاقت ہے جو لالچ کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔

چھٹا فائدہ - جاگنے کی طاقت اور صلاحیت: کم کھانے سے جاگنے کی طاقت پیدا ہوتی ہے۔ جو زیادہ کھاتا ہے وہ زیادہ پانی پیتا ہے اور اس کے نتیجے میں نیند آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض روحانی مرشد اپنے شاگردوں سے کہا کرتے تھے: "اے حق کے متلاشیوں کی گروہ ! زیادہ نہ کھائیں! اگر آپ زیادہ کھائیں گے تو آپ زیادہ پئیں گے اور جب آپ زیادہ پئیں گے تو آپ کو زیادہ نیند آئے گی اور جب آپ زیادہ سوتے ہیں تو آپ کو زیادہ نقصان کا سامنا کرنا پڑے گا [اپنے آپ کو روحانی فوائد سے محروم کرنے کے لحاظ سے جو آپ صبح سویرے کی عبادت سے حاصل کر سکتے تھے]۔ ستر گنوسٹک اس بات پر متفق ہیں کہ جب زیادہ پانی پیتا ہے تو زیادہ سوتا ہے اور زیادہ سونے پر اس کی زندگی زیادہ ضائع ہوتی ہے، صبح سویرے کی نمازیں (تہجد کی نمازیں جو روحانی ترقی کے لیے ثواب یافتہ ہیں) پوری نہیں ہوتیں، جس سے اس کے مزاج میں سستی اور دل میں سختی پیدا ہوتی ہے۔ زندگی ایک انمول زیور ہے، انسان کا اصل اثاثہ (سرمایہ) یہی زندگی ہے اور اس کے ذریعے انسان آخرت کے لیے کاروبار اور تجارت کرتا ہے۔ نیند موت کے مترادف ہے۔ اس کی زیادتی زندگی کے سرمائے کو کم کرتی ہے۔ اگر کوئی شخص نیند پر حاوی ہونے کے باوجود صبح کی نماز پڑھ سکے گا تو اس کی مٹھاس کا ذائقہ نہیں چکھے گا۔ مختصرا یہ کہ [ضرورت سے زیادہ] نیند بہت سے نقصانات کا باعث بنتی ہے اور بھوک نیند کو جنم دیتی ہے اور بھوک اسے ختم کر دیتی ہے۔

ساتواں فائدہ: عبادت میں استقامت میں آسانی: ضرورت سے زیادہ عبادت کی راہ میں لالچ ایک رکاوٹ ہے کیونکہ اس میں کھانے میں وقت لگتا ہے۔ کبھی کبھی کھانے پینے کی چیزیں خریدنے کے لیے باہر جانا پڑتا ہے اور ضرورت کے مطابق انہیں پکانا پڑتا ہے۔ کھانے کے بعد کھانے کے دوران اور بعد میں ہاتھ دھونے، پانی پینے میں وقت لگتا ہے۔ اگر اس سارے وقت کو یاد الٰہی اور دعاؤں اور دیگر عبادات کے لیے استعمال کیا جا سکے تو یہ بے پناہ فوائد کا ذریعہ ہو گا۔ زندگی کا ہر لمحہ ایسا شاندار زیور ہوتا ہے کہ اس کی قیمت وقت کے بازار میں طے نہیں کی جا سکتی۔ اسے ضائع کرنے کے بجائے اس سے بہتر ہے کہ اس کے ساتھ ایک ایسا خزانہ خرید لیا جائے جو آخرت میں باقی رہے گا۔ اس کاروباری لین دین کو خدا کی یاد اور اطاعت میں اپنا وقت استعمال کرکے حتمی شکل دی جاتی ہے۔ لالچ کا عادی شخص پاکیزگی کی کیفیت میں نہ رہنے کی فکر میں مبتلا ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی اپنا سارا وقت عبادت میں گزار سکتا ہے کیونکہ اسے بار بار پانی پینے اور آرام کرنے کے لیے اس سے باہر نکلنا پڑتا ہے۔ بھوک کا عادی آسانی سے روزہ نہیں رکھ سکتا کیونکہ بھوک کا عادی شخص آسانی سے روزہ رکھ سکتا ہے۔ روزہ، عبادت الٰہی کے لیے مستقل تنہائی اور دائمی طہارت (یا وضو کی حالت جو بہت سی عبادات کے لیے شرط ہے)، خوراک کے حصول میں صرف ہونے والے وقت کو عبادت کے لیے استعمال کرنا وہ عظیم فوائد ہیں جن کو صرف غافل ہی نظر انداز کر سکتے ہیں۔ قرآن مجید ایسے لوگوں کے بارے میں فرماتا ہے:

وَرَضُواْ بِٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا وَٱطْمَأَنُّواْ بِهَا

"وہ اس دنیا کی زندگی سے مطمئن ہو چکے ہیں اور اس سے مطمئن ہو گئے ہیں [گویا مادیت پرست، لذت پرست زندگی وہ سب کچھ ہے جو وہاں ہے اور اس سے اوپر اور اس سے آگے کچھ بھی نہیں ہے، خاص طور پر غیر مادی، اعلیٰ، روحانی دائرے میں]۔" (سورۃ البقرۃ باب ١٠، آیت ٧)

يَعْلَمُونَ ظَٰهِرًا مِّنَ ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ ٱلْءَاخِرَةِ هُمْ غَٰفِلُونَ

"وہ صرف دنیا کی زندگی کے ظاہری پہلوؤں کو جانتے ہیں اور وہ آخرت سے غافل ہیں۔" (سورۃ البقرۃ باب 30، آیت 7)

ابو سلیمان دارانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لالچ کے چھ نقصانات بیان کیے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو شخص پیٹ بھر کر کھاتا ہے وہ چھ آزمائشوں اور مصیبتوں میں پھنس جاتا ہے: وہ الٰہی گفتگو کی مٹھاس کھو دیتا ہے،

حکمت کے نکات کو یاد نہیں کرتا، دوسروں کے ساتھ اپنے دل میں کوئی مہربانی نہیں رکھتا کیونکہ جب اس کا اپنا پیٹ بھر جاتا ہے تو دوسروں کے بارے میں بھی یہی قیاس کرتا ہے کہ اس کا پیٹ بھی بھرا ہوا ہے۔ ایسے شخص کے لیے عبادت مشکل ہو جاتی ہے، خواہشات بڑھ جاتی ہیں اور سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ تمام مومنین عبادت گاہوں کی طرف مائل ہو جاتے ہیں اور ایسا ریستورانوں کی طرف راغب ہوتا ہے۔

آٹھواں فائدہ: صحت: کم کھانے والا شخص صحت مند رہتا ہے۔ زیادہ تر بیماریاں لالچ کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہیں کیونکہ زیادہ کھانے کی وجہ سے معدے اور رگوں میں خراب مواد جمع ہوتا ہے اور مختلف قسم کی بیماریوں کا سبب بنتا ہے۔ اگر کوئی بیمار ہو تو نہ تو عبادت کر سکتا ہے اور نہ ہی سکون سے الٰہی یاد کر سکتا ہے کیونکہ وہ ہر وقت بے چین اور پریشان رہتا ہے جس کی وجہ سے زندگی کی لذت (امن، سکون اور بامقصد زندگی) برباد ہو جاتی ہے۔ بیمار شخص کو سرجری کے طریقہ کار، ادویات اور ڈاکٹروں کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ ضرورت پیسے کے بغیر پوری نہیں ہوتی۔ لالچ جسم اور دماغ دونوں کو پریشان ، کمزور اور سست رہنے کا سبب بنتی ہے۔ ایک اور پریشانی یہ ہے کہ طبی علاج کے لیے پیسہ کہاں سے حاصل کیا جائے [زیادہ کھانے پینے کی وجہ سے ہونے والے خود کو پہنچنے والے نقصانات اور بیماریوں کے لیے] جو پیسے کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اگر کوئی صبر سے کام لیتا اور کم مقدار میں کھانے پر قناعت کرتا، تو اتنی پریشانیوں کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ ایک حکیم نے کہا: "جس دوا کی موجودگی میں بیماری کا کوئی امکان نہیں ہے وہ یہ ہے کہ جب تک کہ تمہیں سچی خواہش نہ ہو جب تک کہ تمہیں کھانے کی خواہش نہ ہو جائے اور جب کچھ خواہش باقی رہ جائے تو اپنا ہاتھ [کھانے سے] اٹھا لیں"۔ جب ذیل میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نصیحت اہل کتاب (یعنی یہودی یا عیسائی روایت سے) کے ایک فلسفی سے کی گئی ہے:

ثلث طعام وثلث شراب وثلث النفس

"جب آپ کھاتے ہیں، تو آپ کے کھانے کی مقدار اتنی ہونی چاہیے کہ پیٹ میں لگنے والی جگہ کو اس طرح تقسیم کیا جائے کہ ایک تہائی کھانے کے لیے، ایک تہائی پانی کے لیے اور ایک تہائی آسانی سے سانس لینے کے لیے خالی رہ جائے۔

فلسفی اس بات سے بالکل حیران رہ گیا اور کہنے لگا: "کھانے کے بارے میں اس سے زیادہ درست اور فائدہ مند کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ بے شک یہ حکمت والے کا قول ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

البطنة اصل الداء والحمية اصل الدواء وعودوا كل جسم ما اعتاد

"بیماری کی اصل [ابتدا] لالچ ہے اور اصلی دوا روک تھام ہے۔ جسم کے ساتھ معاملہ کرو کہ وہ اس کے لئے موزوں ہے (یعنی جسم کو ایسی چیزوں کا نشانہ نہیں بنایا جانا چاہئے جو اس کے لئے نقصان دہ ہیں جیسے زیادہ کھانا کھانا ، غیر صحت بخش کھانے اور مشروبات ، منشیات ، نشہ آور اشیاء وغیرہ)۔

میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ وہ فلسفی مذکورہ بالا نبوت کی روایت سے زیادہ حیران رہ گیا ہوگا۔ ابن سلیم کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص مناسب آداب کے ساتھ گندم کی روٹی کھائے تو وہ کبھی بیمار نہیں ہوگا۔ ان سے پوچھا گیا کہ آداب کے ساتھ کھانے کا کیا مطلب ہے؟ اس نے جواب دیا: "بھوک محسوس کرنے کے بعد کھانا کھانا اور پیٹ بھرنے سے پہلے کھانا چھوڑ دینا"۔ بعض ماہر ڈاکٹروں نے لالچ کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ معدے میں داخل ہونے والی سب سے زیادہ فائدہ مند چیز انار ہے اور معدے میں داخل ہونے والی سب سے زیادہ نقصان دہ چیز نمک ہے لیکن انار کی زیادہ مقدار کھانے کے مقابلے میں نمک کا تھوڑا سا استعمال فائدہ مند ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک روایت میں کہا گیا ہے:

تصوموا تصحوا

"روزہ رکھو اور تم صحت مند ہو جاؤ گے۔" (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث مجموعہ *طبرانی اوسط[ترمیم]* صحابہ کرام ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے اسلام میں روزے کا مطلب یہ ہے کہ فجر (طلوع آفتاب سے بہت پہلے کا وقت جب اندھیرا ہوتا ہے) اور غروب آفتاب کے درمیان تمام کھانے پینے، مشروبات اور ازدواجی تعلقات سے مکمل طور پر پرہیز کیا جائے اور اعلیٰ سطح پر تمام اخلاقی برائیوں سے بھی پرہیز کیا جائے [جیسے جھوٹ بولنا، دھوکہ دہی، جھگڑا، فحاشی، بے ایمانی اور خیالات میں ہر قسم کے مضر اور نقصان دہ رویے، احساسات ، الفاظ اور اعمال]۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روزے رکھنے، بھوکے رہنے اور کم کھانے میں جسم کے لیے شفا کے ساتھ ساتھ دلوں کے لیے دوا بھی ہے۔ اگر جسموں کو روکا جائے (روزے رکھنے اور کم کھانے سے) تو دل بھی بغاوت (ہر قسم کے منفی، نقصان دہ اور نقصان دہ رویے) اور نافرمانی کی طرف مائل نہیں ہوتے۔

نواں فائدہ: اخراجات میں کمی: جو شخص کم کھاتا ہے، اس کے لیے تھوڑی سی دولت اور جائیداد کافی ہوگی۔ پیٹ لالچ کی تمام جدوجہد کا مرکز اور مرکز ہے اور پیٹ کے جہنم کو بھرنے کے لیے ہر قسم کی تدبیر اور منصوبہ بندی کی جاتی ہے، ہر قسم کی ذلت جمع کرتا ہے، ناجائز اور *حرام* ذرائع اختیار کرتا ہے جب حلال ذرائع کمانے اور معاش کمانے کے لیے کافی نہ ہوں۔ ناجائز ذرائع سے کمانے میں گناہ ہے اور جائز طریقوں سے کمانے میں ذلت، پریشانی اور مشکلات ہو سکتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کمائی لالچ کے بغیر نہیں آتی، جہاں بھی کوئی [آمدنی کے ذرائع کے لیے] دیکھتا ہے، اس میں لالچ پائے جاتے ہیں۔ لالچ انتہائی ذلت ہے۔ مومن وہ ہے جس کے اخراجات کم ہو جائیں گے۔ ایک عقلمند نے کہا: "میں اکثر اپنی ضروریات کو چھوڑ کر پوری کرتا ہوں۔ اس سے دل کو بہت اطمینان ملتا ہے۔ ایک حکیم نے کہا: جب مجھے اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے قرض لینے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو میں اس خواہش کو ترک کرنے پر راضی ہو کر اپنے نفس سے قرض لیتا ہوں اور میری ذات مجھے بہت بڑا قرض دیتی ہے۔ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ اپنے صحابہ کرام سے مختلف اشیائے خوردونوش کی قیمت پوچھتے تھے اور اگر وہ کسی چیز کو مہنگی ہونے کا ذکر کرتے تو آپ ان سے کہتے تھے کہ اسے چھوڑ کر اسے سستا کر دیں۔ سہل بن عبداللہ تستاری رحمہ اللہ کہتے ہیں: جو شخص بہت زیادہ کھاتا ہے وہ تین صورتوں میں برا ہے: اگر کوئی نمازیوں میں سے ہو تو زیادہ کھانے کے بعد سستی ہو جائے گی۔ اگر کوئی شخص کسی خاص پیشے میں مہارت رکھنے والوں میں سے ہو تو وہ مشکلات سے بچ نہیں سکے گا۔ اگر کسی کو کچھ آمدنی ملے گی تو وہ اپنے دل سے انصاف نہیں کر سکے گا [اس کی روحانی امنگوں اور ریاستوں کی حفاظت کرکے]۔ بہرحال دنیا کا لالچ (مال و مال و مال) اس کی تباہی کا اصل سبب ہے اور یہ لالچ معدے اور شرم کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور عضو تناسل کی ہوس کی اصل وجہ معدہ ہے۔ اگر کوئی کم کھائے گا تو نہ شرم کی ہوس باقی رہے گی اور نہ ہی دنیا کا لالچ۔ دنیا کا لالچ (دولت اور مادی مال) جہنم کا دروازہ ہے۔ اگر یہ دروازہ بند ہو جائے تو جنت کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اديموا قرع باب الجنة بالجوع

"بھوک سے جنت کا دروازہ کھٹکھٹاتے رہو"۔

جس میں ایک روٹی (ایک پتلی پیٹا روٹی کی طرح) پر قناعت کرنے کی ہمت ہوتی ہے وہ تمام خواہشات سے بچ سکتا ہے۔ اس قناعت میں نفس اور شعور کی آزادی اور آزادی، لوگوں کے پاس جو کچھ ہے اس سے غافل رہنا، باطنی سکون (دل کا سکون اور سکون دل)، خدا کی عبادت کی صلاحیت اور آخرت کے لیے تجارت میں مشغول ہونا ہے۔ مندرجہ ذیل آیت میں ایسے لوگوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

لَّا تُلۡهِيهِمۡ تِجَٰرَةٞ وَلَا بَيۡعٌ عَن ذِكۡرِ ٱللَّهِ

"وہ دنیاوی تجارتوں (خرید و فروخت اور دیگر دنیاوی مصروفیات کی وجہ سے خدا کی یاد سے دور نہیں ہٹتے ہیں جو کسی کے دنیاوی قیام اور عارضی وجود میں زندہ رہنے کے لیے ضروری ہیں)۔ (سورۃ البقرۃ البقرۃ آیت 37)

یہ لوگ اللہ کی یاد سے غافل اور غافل نہیں ہیں کیونکہ وہ دنیاوی معاملات سے بے نیاز ہیں (یعنی دنیاوی الجھنوں اور بستروں سے دل کا لگاؤ نہیں ہے، حالانکہ وہ دنیا کی زندگی میں ہر چیز کے لیے اپنا حق ادا کرتے ہیں)۔ وہ لوگ جو دنیا کے محتاج ہیں (یعنی وہ لوگ جو اپنے دلوں کو دنیاوی معاملات سے وابستہ رکھتے ہیں اور اپنی جانوں کی قیمت پر اس میں مکمل طور پر ڈوبے ہوئے ہیں) یقینا غافل اور غافل ہیں [ان کی زندگی کے اصل مقصد سے جو ابدی خوشی اور لامتناہی فتح کا باعث بنتا ہے]۔

دسواں فائدہ: صدقہ اور ضرورت مندوں پر خرچ کرنا: کم کھانے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ کوئی بھی کھانا جو استعمال نہ کیا جائے وہ یتیموں اور مسکینوں کو صدقہ کی شکل میں دیا جا سکتا ہے۔ جو شخص صدقہ و خیرات اور ضرورت مندوں پر خرچ کرنے کا عادی ہو گا وہ اپنے صدقے کے سائے میں رہے گا جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مختلف احادیث میں بیان کیا گیا ہے۔ زیادہ کھانے سے کیا حاصل ہوتا ہے؟ [زیادہ] کھانے کے بعد کھانا انسانی فضلہ بن جاتا ہے اور فضلے کے خزانے میں جمع ہو جاتا ہے جبکہ صدقہ میں دیا جانے والا کھانا خدا کے خزانے میں جمع ہو جاتا ہے۔ انسانی مال اور مال جو باقی ہے وہ وہی ہیں جو اللہ کی راہ میں خرچ کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ جو کچھ بھی خرچ کیا جائے گا وہ معدوم ہو جائے گا (ختم ہو جائے گا)، چاہے وہ [کھانے کی شکل میں] کھایا گیا ہو یا پہنا گیا ہو۔ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن مجید سے مندرجہ ذیل آیت پڑھی:

إِنَّا عَرَضۡنَا ٱلۡأَمَانَةَ عَلَى ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضِ وَٱلۡجِبَالِ فَأَبَيۡنَ أَن يَحۡمِلۡنَهَا

وَأَشۡفَقۡنَ مِنۡهَا وَحَمَلَهَا ٱلۡإِنسَٰنُۖ إِنَّهُۥ كَانَ ظَلُومٗا جَهُولٗا

"ہم نے یہ امانت آسمانوں اور زمین کے سامنے پیش کی لیکن انہوں نے اس کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈرنے لگے لیکن انسان نے یہ ذمہ داری اپنے اوپر لے لی۔ ایک (یعنی انسان) ظالم اور جاہل ہے۔ (سورۃ البقرۃ 33، آیت 72)

پھر فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ستاروں سے مزین سات آسمانوں سے کہا کہ وہ اس امانت کا بوجھ اٹھائیں اور فرمایا: کیا تم اس امانت کو اور اس میں جو کچھ ہے اسے اٹھانے کے لیے تیار ہو؟ انہوں نے پوچھا: اس امانت میں کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: اگر کوئی برائی کرے گا تو اسے عذاب ملے گا اور اگر نیکی کرے گا تو اسے اچھا بدلہ ملے گا۔ آسمانوں نے جواب دیا: ہم اس امانت کو پورا کرنے سے قاصر ہیں۔ پھر یہ امانت زمین پر پیش کی گئی لیکن اس نے بھی انکار کردیا۔ اونچے پہاڑوں سے پوچھا گیا ، اور انہوں نے بھی اس امانت کو برداشت کرنے میں اپنی نااہلی اور کوتاہیوں کا اظہار کرنے میں اپنا سکون سمجھا۔ جب انسان سے اس کے بارے میں پوچھا جاتا تھا [اس دنیا میں آنے سے پہلے] تو اس نے یہ ذمہ داری قبول کی کیونکہ وہ اپنے نفس پر ظلم کرتا تھا اور اس حکم الٰہی کے پیچھے کی حکمت سے بے خبر تھا۔ خدا کی قسم! اب ہم انسانوں کے ظلم اور جہالت کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ لوگ اپنے ایمان کو دولت کے بدلے بیچ دیتے ہیں، اپنی قبروں کو تنگ کرنے اور تنگ کرنے کے بجائے (یعنی آخرت میں ان کی زندگیوں کو برباد کرنے) کے بدلے اپنے گھروں کی وسعت [اور شان] میں اضافہ کرنے کے لیے وافر مقدار میں کماتے ہیں، اپنے جانوروں کو (ان پہاڑوں پر سوار ہوتے ہیں جو روایتی طور پر غرور، وقار اور معاشرتی حیثیت کا ذریعہ رہے ہیں) اپنے *دین* بنانے کے بجائے موٹا بناتے ہیں (خدا کا راستہ اور اس کے ساتھ تعلق) پتلا ہے۔ ایسے لوگ صبح شام بادشاہوں کے پاس جاتے ہیں اور اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔ کسی کے دل میں ، مادی املاک اور دولت کی خواہش لات مار رہی ہے ، کسی اور کے دل میں ، شہرت کی خواہش ہے۔ کوئی شخص [شریعت الٰہی] میں جائز کی کسی تفریق یا حرام کے ادراک پر غور کیے بغیر [لذیذ اور متنوع کھانوں] کی خواہش کے ساتھ گھومتا ہے۔ جب یہ بدہضمی اور ٹائیفائیڈ کا

سبب بنتا ہے تو ، نوکروں سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ ایسی دوائیں لائیں جو اس طرح کے حالات کو کم کریں۔ کوئی اس احمق سے پوچھے: 'ان یتیم بچوں، بیواؤں اور مسکینوں کا کیا ہوا جن کی دیکھ بھال آپ کی ذمہ داری ہے جنہیں آپ کھانے اور ذائقے کی خواہش کی وجہ سے بھول گئے ہیں؟'

اس تفصیل کا مقصد یہ ہے کہ صرف ضرورت کی مقدار میں کھانا کھایا جائے اور باقی صدقہ کی صورت میں دیا جائے تاکہ وہ آخرت کے ذخیرے میں جمع ہو جائے۔ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موٹے شخص کو دیکھا تو آپ نے اس کے پیٹ پر انگلی رکھی اور فرمایا: اگر یہ غذا آپ کے پیٹ کی بجائے کسی اور کے پیٹ میں ہوتی تو بہتر ہوتا تو بہتر ہوتا کہ یہ کھانا آپ کے پیٹ کی بجائے کسی اور کے پیٹ میں ہوتا تو بہتر ہوتا آپ کے لئے [جسمانی اور روحانی دونوں]"۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *احادیث* کے مجموعے *میں مسند احمد*، *حکیم اور بیہقی* صحابی نبوی جعدہ الہثمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے

حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: خدا کی قسم! ہم نے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جن کے پاس کھانے کے لیے بہت کم تھا اور اگر وہ کھا جاتے تو یہ ان کے لیے ناکافی ہوتا۔ وہ پھر بھی کہتے تھے کہ وہ اتنی معمولی مقدار بھی خود نہیں کھائیں گے بلکہ خدا کی خاطر دوسروں کو اس میں شامل کریں گے۔

بھوک کے دس فوائد یہ ہیں جن میں ہر فائدہ بے شمار فوائد پر مشتمل ہے۔ ان تمام فوائد کا نتیجہ یہ ہے کہ بھوک آخرت کا خزانہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے دانشمندوں نے کہا ہے کہ بھوک آخرت کی کنجی اور دنیاداری سے پرہیز کا دروازہ ہے اور لالچ کی کنجی ہے۔ اس موضوع کو بھوک کی فضیلت اور تسکین کی مذمت کے لیے مذکور روایات اور روایات سے بھی ثابت کیا گیا ہے۔ ان فوائد سے آگاہی حاصل کرنے کے بعد اس مضمون کی تفصیلات اور اس کے حقیقی معانی کا علم یقین (*یقان*) اور گہری بصیرت (*بصیرت*) پر مبنی ہوگا۔ اگر کوئی شخص ان فوائد کا علم نہ رکھتا ہے لیکن پھر بھی بھوک کو برتر سمجھتا ہے تو وہ ایمان کی سطح پر پہنچے گا (حقیقت کو سمجھے بغیر) (*تقلید*)۔

بھوک سے متعلق احکام ، فضیلت اور انسانی حالتوں میں فرق

واضح رہے کہ اعتدال یا درمیانی راہ تک پہنچنا تمام معاملات میں اور *اخلاق* (خوبصورت اخلاق، آداب، باطنی صفات اور مزاج اور صفات) میں مقصد ہے جیسا کہ ذیل *میں* حدیث (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روایت ہے) میں بیان کیا گیا ہے:

خیر الامور اوساطها

"سب سے بہتر معاملات وہ ہیں جن میں اعتدال کا مظاہرہ کیا جاتا ہے یا درمیانی راستہ اختیار کیا جاتا ہے"۔

دونوں اطراف [یا سپیکٹرم کے دو سرے] یا انتہائی، دوسرے لفظوں میں، [تمام معاملات میں کسی بھی چیز کی زیادتی] دونوں کی مذمت کی جاتی ہے۔ بھوک کی فضیلت میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ بھوک کی زیادتی مقصد ہے، حالانکہ واقعی ایسا نہیں ہے۔ بلکہ شریعت الٰہی کے اسرار جو حکمت سے بھرے ہوئے ہیں وہ اس نوعیت کے ہیں کہ جن معاملات میں انسانی مزاج انتہا کی طرف مائل ہوتا ہے اور ان میں باطنی اور ظاہری انتشار کے بیج موجود ہوتے ہیں تو ان معاملات کو بڑی مبالغہ آرائی کے ساتھ اس طرح حرام کیا جاتا ہے کہ جاہل بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ شریعت الٰہی کا مقصد مزاج کے خلاف عمل کرنا ہے۔ صرف ایک عالم (جو دینی علم و فہم سے بخوبی واقف ہو) یہ سمجھتا ہے کہ ضرر رساں معاملات سے منع کرنے میں مبالغہ آرائی کا مقصد اعتدال پسندی یا درمیانی راستے کی سطح پر لانا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صرف ایک عالم جانتا ہے کہ انسان کے مزاج پر لالچ غالب ہے اور لوگ انتہائی حد تک پہنچ چکے ہیں اور بھوک کی زیادہ سے زیادہ فضیلت کا ذکر کرنا زیادہ مناسب ہے اور لوگوں کو مبالغہ آرائی کے ساتھ لالچ سے روکا جائے تاکہ [انسانی] مزاج اعتدال کی سطح تک پہنچ جائے۔

[انسانی] مزاج کو ختم کرنا ممکن نہیں ہے لیکن اسے اعتدال پسندی یا درمیانی راستے پر لانا ممکن ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص مزاج کے خلاف جاتا ہے اور ضرورت سے زیادہ خرچ کرتا ہے تو شریعت الٰہی اس عمل کی مذمت کرتا ہے۔ مثال کے طور پر رات کو اللہ کی عبادت کے لیے جاگنے اور روزہ رکھنے کی بے شمار فضیلت حدیث میں آئی ہے لیکن جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ بعض لوگ دائمی روزے رکھتے ہیں اور رات بھر جاگتے ہیں تو آپ نے انہیں اس سے منع کر دیا۔ اصولوں پر اس بحث کے بعد یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ کھانے کا افضل اور اعتدال پسند طریقہ یہ ہے کہ صرف اتنا کھایا جائے جس سے نہ تو معدے میں بوجھل ہو اور نہ ہی بھوک کی تکلیف پیدا ہو۔ کھانے کا مقصد زندگی کو برقرار رکھنا اور عبادت کے لیے جسمانی قوت حاصل کرنا ہے۔ معدے کا بوجھل پن بھی عبادت کی راہ میں رکاوٹ ہے اور پیٹ کا خالی پن بھی دل کو مصروف رکھتا ہے۔ اس حد تک کھانا چاہیے کہ بھوک کی تکلیف مٹا دے جبکہ کھانے کا اثر بھی معلوم نہ ہو۔ اس طرح کھانے سے انسان فرشتوں سے مشابہت پیدا کرتا ہے کیونکہ وہ بھوک اور کھانے کے بوجھل ہونے سے بالاتر ہیں۔ ان پر عمل کرنے سے انسان کو کمال اور کمال کی سطح پر لے جایا جا سکتا ہے جو اس کی تخلیق کا مقصد ہے۔ اعتدال پسندی کی اس سطح کے ایک طرف بھوک ہے اور دوسری طرف بھوک ہے۔ یہ دونوں مہلک ہیں۔ اعتدال پسندی کا راستہ اختیار کرنے کے لیے ان دونوں سے اپنے آپ کو بچانے میں زندگی کا رزق مضمر ہے۔ اس کی تشبیہ ایک چیونٹی کی طرح ہے جو آگ کے دائرے کے بیچ میں رہ جاتی ہے۔ یہ جس طرف بھی مڑتا ہے ، وہاں موت ہے کیونکہ دائرہ چاروں طرف سے گرم ہے اور اس کا چھوٹا سا شعلہ اس کی چھوٹی سی زندگی کو ختم کرسکتا ہے۔ تاہم اگر چیونٹی مرکز میں رہتی ہے اور کسی بھی سمت میں نہیں جاتی ہے تو وہ آگ سے دور رہے گی اور اپنی جان محفوظ رکھ سکے گی۔ انسان کی ایسی حالت ہے جیسے ہوس نے ہر طرف سے اسے گھیر لیا ہے۔ فرشتے خواہشات سے بہت دور ہیں۔ ان کی مشابہت حاصل کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو خواہشات سے دور رکھا جائے کیونکہ اعتدال پسندی کی سطح ہر طرف سے برابر فاصلے پر ہے [دائرے کے حقیقی مرکز میں رہنے کے لیے]۔ چنانچہ اس کی کوشش کی جا رہی ہے اور چونکہ اعتدال کی سطح ہر طرف سے برابر کے فاصلے پر ہے اور اس کی شہادت حدیث (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت ہے) میں ملتی ہے، "سب سے بہتر معاملات وہ ہیں جن میں اعتدال اختیار کیا جائے یا درمیانی راستہ اختیار کیا جائے" اور قرآن مجید کی اس آیت سے اس کی تصدیق ہوتی ہے:

وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا

"کھاؤ اور پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو (سورة البقرة سورة البقرة آیت 31)

بھوک اور تسکین میں اعتدال پسندی: جب تک انسان بھوک اور بھوک کی تکلیف کو محسوس نہیں کرتا، عبادت پر توجہ مرکوز نہیں کی جا سکتی۔ عبادت اور غور و فکر کو آسان بنانے کے لیے ضروری ہے کہ انسان نہ بھوکا رہے اور نہ ہی سیر ہو۔ چونکہ انسانی نفس ابتدا میں سرکش اور ہوس کا شوقین اور اعتدال پسندی کی حدود سے دور ہوتا ہے، اس لیے اسے زیادتی اور کمی کے مرکز تک لانے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ابتدا میں اسے چیزوں سے منع کرنے میں مبالغہ آرائی ہے۔ مثال کے طور پر ، اسے بھوک اور لالچ کی انتہا کے درمیان درمیانی سطح پر لانے کے لئے ، سب سے پہلے نفس کو بھوکا رکھ کر مشکلات پیدا کرنا ہے جیسے جنگلی باغی گھوڑے کو ابتدائی طور پر بھوکا ، پیاسا اور یہاں تک کہ مارا پیٹا جاتا ہے تاکہ اسے قابو میں لایا جاسکے۔ اس مرحلے سے گزرنے کے بعد گھوڑا قابو میں ہو جاتا ہے اور اپنے مالک کی خواہشات کے تابع ہو جاتا ہے۔ ایک بار جب گھوڑا اپنی سرکشی کو چھوڑ کر فرمانبردار ہو جاتا ہے تو اسے بھوکا، پیاسا اور جسمانی مصائب کا شکار رکھنے کی ضرورت نہیں بچتی۔ ایک روحانی مرشد شاگردوں (روحانی راستے کے خواہشمندوں اور مسافروں) کے ساتھ وہی سلوک کرتا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ وہ وہ کام کریں جو خود راہبر نہیں کرتا۔ مثال کے طور پر ، ایک ان سے کہتا ہے کہ وہ بھوکا رہیں اور تمام خواہشات کو ترک کردیں ، حالانکہ رہنما خود بھوکا نہیں رہتا ہے اور نہ ہی تمام خواہشات سے مکمل طور پر الگ ہوتا ہے (بہت سی خواہشات الہی قانون کی حدود میں جائز ہیں)۔ بعض اوقات ، مرشد کھانے کے بعد پھلوں میں مشغول ہوتا ہے اور دوسرے ذوق اور خواہشات سے لطف اندوز ہوتا ہے کیونکہ انسان کی نفس فرمانبردار ہے [اور احکام الٰہی کے تابع ہے] اور اسے مزید روحانی مشقوں اور تربیت کے تابع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن چونکہ نفس پر عبادت الٰہی میں لالچ، ہوس، سرکشی اور سستی کا غلبہ ہے، اس لیے اس کے لیے بھوک بہتر ہے تاکہ

وہ اپنے درد کو محسوس کرتا رہے اور عاجزی کا شکار ہو جائے اور اس کے ذریعے اعتدال کی سطح تک پہنچ جائے، یعنی کھانے پینے میں اعتدال پسندی۔ روحانی راستے کے مسافروں میں ، صرف دو [اقسام] لوگ بھوکے رہنے سے گریز کرتے ہیں - ایک گنوسٹک اور ایک خود فریب کا احمق۔ ایک گنوسٹک کو بھوکا رہنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ نفس ہدایت کے سیدھے راستے پر ہے اور حق کی راہ پر چلنے میں اسے بھوک سے دوچار ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک بیوقوف بھوکا نہیں رہتا کیونکہ اس کے پاس اپنے بارے میں یہ قیاس ہے کہ وہ ایک گنوسٹک ہے اور نفس کو روحانی جدوجہد اور نظم و ضبط کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ایک بہت بڑا دھوکہ ہے اور زیادہ تر لوگ آنکھوں کے اس دھوکہ دہی میں ملوث ہیں۔ نفس کو مکمل نظم و ضبط کرنے میں بہت مشکل ہے۔ عام طور پر لوگ گنوسٹکس کی روحانی حالتوں کو لیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی اپنی حالتیں ایسی ہی ہیں، چاہے یہ صحیح ہو یا نہ ہو، اور [صرف] گنوسٹک کی طرح، [اس طرح کی اعلیٰ روحانی حالتوں کے حصول کے ذرائع سے غافل ہو جاتے ہیں اور ان ذرائع کو اختیار نہیں کرتے]۔

ایک روحانی مرشد کو شاگردوں (روحانی راہ کے آغاز میں ہونے والے روحانی مسافروں کے سامنے [روحانی معاملات اور مختلف روحانی تعلیمات کے پیچھے باطنی حکمت سے متعلق] رازوں کا ذکر نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے بجائے ، انہیں زیادہ سے زیادہ بھوکا رہنے کی ہدایت کی جانی چاہئے۔ انہیں اعتدال پسندی کی سطح کے بارے میں تعلیم دینا مناسب نہیں ہے کیونکہ وہ ایک خاص حد تک اعتدال سے انحراف کریں گے [کیونکہ وہ ابتدائی طالب علم ہیں]۔ ان کو بہت زیادہ بھوک کا استعمال کرنے کی تعلیم دی جائے تاکہ ان کے لیے اعتدال کی سطح کو حاصل کرنا آسان ہو جائے (جیسا کہ شاگرد ان سے کم کرتے ہیں جو ان سے کہا جاتا ہے)۔ شاگردوں (روحانی مسافروں) کو یہ نہیں بتایا جانا چاہیے کہ روحانی طور پر کامل شخص (گنوسٹک) کو روحانی سختی اور نفس کی نظم و ضبط کی ضرورت نہیں ہے [جیسا کہ ایسا شخص پہلے ہی اس سے گزر چکا ہے اور اعلیٰ روحانی ڈگریاں حاصل کر چکا ہے]۔ اگر انہیں یہ بتایا جائے تو شیطان ان کے دلوں میں یہ بتانے لگے گا کہ انہوں نے عرفان اور روحانی کمال کی ایک بہت ہی اعلیٰ سطح حاصل کر لی ہے اور انہیں اب کسی روحانی سختی کی ضرورت نہیں ہے جیسا کہ روحانی مرشد (شیخ) نے بتایا ہے۔ ابراہیم الخواص رحمۃ اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ معمول تھا کہ وہ اپنے شاگردوں کو جو بھی روحانی سختی کا حکم دیتے تھے، وہ خود ہی ان پر عمل کرتے تھے (اگرچہ وہ خود ان کی ضرورت نہیں تھے لیکن انہوں نے ان کو اس لیے کیا کہ شاگردوں کو گمراہ کن تاثر نہ دیا جائے کہ انہیں ان کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ انہیں ان کی ضرورت نہیں ہے] تاکہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ انہیں ہدایت دی گئی ہے وہ کام کرنا جو روحانی مرشد خود نہیں کرتا۔ یہ خیال شاگردوں (روحانی مسافروں) کو روحانی کوششوں سے بیزار ہونے کا باعث بن سکتا ہے [روحانی مرشد میں منافقت کو گمراہ کن طور پر سمجھ کر کیونکہ شیطان وہاں موجود ہے اور ہر قدم پر لوگوں کو رہنمائی کے صحیح راستے سے روکنے کی کوشش کر رہا ہے]۔ روحانی مرشد (شیخ یا مرشد) کو بعض اوقات کسی کے [روحانی] درجے سے نیچے آنے کی ضرورت ہوتی ہے جیسے پہلوان کمزور کام کرتے ہیں اور یہاں تک کہ اپنے طالب علموں کو ورزش کرنے اور تربیت دینے کی خاطر دستک بھی دیتے ہیں۔ نفس کی تربیت کی خاطر جسمانی ورزشوں کے مقابلے میں نرمی اور لطافت کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ روحانی کوششیں اور سختی [روحانی مسافروں کے لیے] عظیم آزمائش کی بنیاد ہیں۔ انبیاء اور اولیاء اس طرح کی آزمائشوں اور مصیبتوں سے گزرے ہیں۔ اس لیے اس معاملے میں احتیاط اور احتیاط برتنی چاہیے۔ جب عمر رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا کہ ان کا بیٹا عبداللہ ہر روز روٹی کے ساتھ گوشت کھاتا ہے تو آپ غصے میں آگئے اور کہا: اے نالائق! ایک دن گوشت کے ساتھ روٹی کھاؤ، ایک دن دودھ کے ساتھ روٹی کھائیں، ایک دن گھی (دودھ پر مبنی چربی) کے ساتھ روٹی کھائیں، ایک دن تیل سے روٹی کھائیں، ایک دن نمک کے ساتھ روٹی کھائیں اور کچھ دن صرف روٹی کھائیں اور کچھ نہ کھائیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اعتدال پسندی کا مطلب یہی ہے۔ گوشت کھانے اور شہوت میں مشغول ہونے میں مستقل اور باقاعدگی پر عمل کرنا [اور اس طرح کھانے سے متعلق معاملات میں انتہا پسندی] کے مترادف ہے۔ ان کو مکمل طور پر ترک کرنا کمی ہے اور کبھی کبھی کھانا اور کبھی نہ کھانا اعتدال پسندی ہے۔

کم کھانے اور خواہشات کو ترک کرنے کے نقصانات

واضح رہے کہ جو شخص ہوس کو ترک کرنے کا ارادہ رکھتا ہے وہ دو نقصانات کا نشانہ بن جاتا ہے۔ یہ نقصانات کسی کے پسندیدہ کھانے کھانے سے زیادہ خطرناک ہیں۔ ایک نقصان یہ ہے کہ نفس کچھ خواہشات کو نہیں چھوڑ سکتا۔ روحانی مسافر ان کو چھوڑنا چاہتا ہے لیکن نفس اس کی اجازت نہیں دیتا۔ نچلے نفس کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے روحانی مسافر اپنی پسندیدہ چیز کو لوگوں سے چھپا کر خفیہ طور پر کھاتا ہے۔ یہ پوشیدہ شرک (*سکرک الخفی*) ہے۔ اگر یہ صورتحال پیدا ہو تو اپنی خواہش کو ظاہر کرنا چاہیے۔ یہ انکشاف کسی کی [باطنی] حالت کی سچائی کے بارے میں ہے۔ اپنے عیبوں کو پوشیدہ رکھنا اور اپنی فضیلت [دوسروں کے سامنے دکھانا] ان میں دو نقصانات ہیں۔ جب تک کوئی اس سے خلوص دل سے توبہ نہیں کرتا، خدا کی ناراضگی دور نہیں ہوتی۔ یہ عرفہ کا کمال ہے کہ وہ خدا کی خاطر خواہشات کو ترک کر کے ظاہر کرتا رہے کہ وہ ان میں ملوث ہے۔ ایسا اس لیے کیا جاتا ہے کہ انسان لوگوں کی نظروں میں نیچا ہو جائے۔ ایک سنت اچھی اشیائے خوردونوش خریدتے تھے اور انہیں اپنے گھر میں نمایاں مقامات پر رکھ دیتے تھے تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ میں وہ چیزیں کھاتا ہوں حالانکہ وہ بہت سادہ کھانا کھاتے تھے۔ ڈسپلے لوگوں کو اس کے بارے میں سنت کے طور پر نہ سوچنے کی اجازت دینے کے لئے تھا ، لہذا وہ اسے سنت کے طور پر سوچ کر اس سے رجوع نہیں کریں گے۔ *زہد* کا کمال یہ ہے کہ انسان اس کے خلاف کام کرتا ہے تاکہ یہ ظاہر کیا جا سکے کہ وہ پرہیز نہیں کرتا بلکہ ہوس میں ملوث ہے۔ یہ عرفان یا روحانی طور پر کامل افراد (*صدیقین*) کا عمل ہے کیونکہ انہوں نے اپنی ذات پر دو بوجھ ڈال کر دو حقیقتوں کو یکجا کیا ہے اور دو بار صبر کیا ہے، ایک بار جب انہوں نے اپنی پسندیدہ چیزوں کو الوداع کہا اور دوسری بار جب لوگوں نے ان کی ظاہری حالتوں کو دیکھ کر ان کی مذمت کی اور تنقید کی۔ دنیاداری اور غیر پرہیز کے اعمال کیونکہ انہوں نے جان بوجھ کر یہ تاثر پیدا کیا تاکہ اس شہرت اور تعظیم سے بچا جا سکے جو سنت یا گنوسٹک ہونے کے ساتھ آتا ہے]۔ ایسے لوگوں کے بارے میں کہا گیا ہے:

أُوْلَٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُم مَّرَّتَيْنِ

"ایسے لوگوں کو خدا کا دوگنا اجر ملے گا۔" (سورة البقرة البقرة آیت 54)

ان کی حالت اس کی طرح ہے جو سب کے سامنے پیش کرنے پر تحفہ قبول کرتا ہے لیکن بعد میں اسے خفیہ طور پر واپس کر دیتا ہے۔ ایسے شخص کو دو چیزوں کی وجہ سے تکلیف پہنچے گی: ایک یہ کہ سب کے سامنے کسی کو کچھ دے کر ذلیل ہونے کی وجہ سے [جیسا کہ دوسروں سے چیزیں لینے میں کالت ہوتی ہے]۔ دوسری بات یہ کہ ایک ہی چیز کو خفیہ طور پر واپس کرنے کی وجہ سے اگرچہ کسی کو اس کی ضرورت تھی۔ اگر کوئی روحانی مسافر (*سالک*) اس مقام تک نہ پہنچ سکے تو اسے اپنی عیبوں کا اعلان کرنے اور خواہشات سے دور رہنے کی نااہلی کا اظہار کرنے سے باز نہیں آنا چاہیے اور شیطان کے اس فریب سے بے وقوف نہ بنے کہ اگر کوئی اپنے عیبوں کو ظاہر کرے گا تو لوگ ان عیبوں میں ایسے شخص کی پیروی کریں گے اور بہتر یہ ہے کہ لوگوں کی اصلاح کے لیے اپنے عیبوں کو چھپایا جائے۔ روحانی مسافر یا متلاشی کو یہ سمجھنا چاہیے کہ کسی کی اپنی [اندرونی روحانی] اصلاح لوگوں کی اصلاح سے زیادہ اہم ہے۔ اپنی غلطیوں کو اصلاح کرنے کے نقطہ نظر سے چھپانے کا مقصد دکھاوا یا دکھاوا (*ریا*) ہے۔ ایسا شخص دوسروں کی اصلاح کے بہانے شیطان کی پیروی کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسا شخص اپنے عیبات کو ظاہر نہیں کرنا چاہتا کیونکہ لوگ اس سے بچنے کے خوف سے بچ جائیں گے۔ ایسا شخص نہ تو اپنی اصلاح چاہتا ہے اور نہ ہی دوسروں کی اصلاح چاہتا ہے۔

دوسرا نقصان یہ ہے کہ روحانی مسافر یا طالب عملی طور پر ہوس کو ترک کرنے پر قادر ہے، لیکن وہ پرہیز کرنے والا (*زاہد*) کے طور پر مشہور ہونے کا شوق رکھتا ہے اور جب لوگ کسی کو "بے گناہ کہتے ہیں" تو خوش ہوتا ہے۔ اس سالک نے ایک کمزور ہوس کو ترک کر دیا ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ ہوس میں مبتلا ہے اور وہ ہے شہرت کی تلاش اور عزت و عزت کی خواہش ۔ یہ ایک خفیہ ہوس ہے اور جو اس میں ملوث ہے اسے اس میں ملوث ہونے کے بارے میں بہت دیر سے پتہ چلتا ہے۔ کھانے کی ہوس کو ختم کرنے کے مقابلے میں اس ہوس کا خاتمہ زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ جو دکھاوے سے دور ہے لیکن کھانے کی ہوس میں ملوث ہے وہ اس سے بہتر ہے جس نے کھانے کی ہوس چھوڑ دی ہے لیکن شہرت کی محبت میں مبتلا ہو۔ ابو سلیمان رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جب تمہارے سامنے کوئی کھانا آجائے جسے تم چھوڑ چکے ہو تو اس میں سے تھوڑی سی مقدار کھاؤ، لیکن نفس کی خواہش پوری نہ کرو۔ اس

طرح نفس کی دونوں خواہشات ختم ہو جائیں گی، کھانے کی ہوس اور شہرت اور وقار کی ہوس [دنیاداری سے پرہیز کرنے کا]۔ کھانے کی ہوس کو ترک کرنے والا اور دکھاوے کی ہوس میں مبتلا ہونے والا اس شخص کی طرح ہے جو سانپ کے پہلو میں پناہ لینے کے لئے بچھو سے بھاگ جاتا ہے ، حالانکہ سانپ ایک کے لئے [بچھو سے زیادہ] مہلک ہے۔ اسی طرح دکھاوے کھانے کی خواہش سے زیادہ نقصان دہ ہے۔

نجی حصوں کی ہوس

یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ انسان میں دو فوائد کے لیے جماع کی خواہش پیدا کی گئی ہے۔ ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ انسان آخرت کی لذت کو جماع کی لذت سے اخذ کر سکتا ہے۔ اگر یہ لذت طویل عرصے تک جاری رہتی تو یہ تمام جسمانی لذتوں میں سب سے مضبوط ہوتی۔ ابدی خوشی کے حصول کے لیے لوگوں کو ترغیب اور قائل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ ضرورت اس وقت پوری ہوتی ہے جب کوئی ایسا درد جو محسوس کیا جا سکتا ہے یا کوئی خوشی جو محسوس کی جا سکتی ہے اور محسوس کی جا سکتی ہے، ابدی خوشی کے ذریعہ کے طور پر استعمال کی جاتی ہے۔

جماع کا دوسرا فائدہ نسل انسانی کا تسلسل ہے۔ یہ دو فوائد ہیں، لیکن اس میں بہت سے نقصانات بھی شامل ہیں، اگر کوئی شخص اپنے آپ پر قابو نہ رکھے اور اس ہوس کو اعتدال کی سطح پر نہ لائے، کیونکہ وہ دنیاوی کامیابی کے ساتھ ساتھ ایمان دونوں سے محروم ہو سکتا ہے۔ ایک روایت میں منقول ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک اجتماع میں بیٹھے ہوئے تھے کہ شیطان (انسانی شکل میں) آیا۔ اس کے سر پر ایک ٹوپی تھی جس میں بہت سے رنگ چمک رہے تھے۔ اس محفل میں پہنچنے کے بعد ، اس نے اپنی ٹوپی اتار دی اور اس کا استقبال کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا: تم کون ہو؟ اس نے کہا: میں *ابلیس* ہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اللہ تمہیں موت دے! تم یہاں کیوں آئے ہو؟" کہا تم اللہ کے ہاں درجے اور درجے میں ہو اس لیے میں تجھے سلام کرنے آیا ہوں۔
حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا: تم نے مختلف رنگوں کی ٹوپی کیوں پہنی تھی؟ اس نے جواب دیا: میں اس ٹوپی کے ذریعے انسانوں کے دلوں کو چھین لیتا ہوں اور انہیں دھوکہ دیتا ہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا: تم کن انسانی اعمال کے ذریعے ان کو محکوم کر سکتے ہو؟ آپ نے فرمایا: جب انسان کے دل میں تکبر پیدا ہوتا ہے اور وہ اپنے چھوٹے چھوٹے اعمال کو بڑا سمجھتا ہے اور اپنے گناہوں کو بھول جاتا ہے۔ میں آپ کو تین معاملات کے بارے میں خبردار کرتا ہوں: ایک یہ ہے کہ کسی اجنبی (ممکنہ طور پر شادی کے قابل) عورت کے ساتھ تنہا نہ رہیں کیونکہ جب ایسا ہوتا ہے تو میں ذاتی طور پر اپنے کسی بھی شاگرد کو *فتنہ* (نامناسب اعمال کی وجہ سے آزمائش اور مصیبت) میں شامل کیے بغیر ان کے درمیان آتا ہوں۔ دوسرا یہ ہے کہ آپ جو بھی وعدے کرتے ہیں اسے پورا کریں۔ تیسری بات یہ ہے کہ جو رقم آپ لازمی اور رضاکارانہ صدقہ کے لیے مختص کرتے ہیں، اسے فوری طور پر تقسیم کر دیں۔ میں بھی ایسے مواقع پر پہنچنے میں جلدی کرتا ہوں اور ایسے بہانے اختیار کرتا ہوں کہ کوئی اس نیت کو بدل دے جو صدقہ دینے سے روکتا ہے۔ اس کے بعد شیطان یہ کہتے ہوئے چلا گیا: ہائے ! موسیٰ اب جانتا ہے کہ انسانوں کو کس نقصان میں مبتلا کیا جاتا ہے۔ شیطان کی آدھی فوج ہوس میں ہے اور آدھا غصہ ہے۔ اسی لشکر کے ذریعے شیطان دلوں پر فتح حاصل کرتا ہے۔ مخالف جنس کی ہوس میں سب سے بڑی خواہش۔

نجی حصوں کی ہوس کی تین سطحیں: کھانے کی ہوس کی طرح ، اس ہوس کی بھی تین سطحیں ہیں: زیادتی ، کمی اور اعتدال پسندی۔ زیادتی یہ ہے کہ یہ ہوس عقل پر غالب آجاتی ہے اور کسی کے پاس جنسی تسکین کے سوا کوئی مقصد نہیں بچتا۔ انسان اس میں غرق ہو جاتا ہے اور آخرت کا راستہ بھول جاتا ہے اور وہ اپنے ایمان پر غالب ہو جاتا ہے اور برائیوں میں پھنس جاتا ہے۔ اس ہوس کی زیادتی بہت سی برائیوں کو جنم دیتی ہے۔ مثال کے طور پر ، کوئی ان دوائیوں کے بارے میں فکر مند ہے جو اس صلاحیت کو بڑھاتی ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی جنگلی درندوں اور سانپوں سے گھرا ہوا ہو اور جب وہ لاپرواہی کا شکار ہو جاتا ہے جس سے وہ فرار ہونے دیتا ہے، تو وہ اسے اپنی فطری جبلت کے مطابق خود پر حملہ کرنے کے لیے بیدار کرتا ہے۔ اس ہوس کی زیادتی کو پورا کرنے کے لیے ہر طرح کی ذلت برداشت کی جاتی ہے یہاں تک کہ اس کی غلامی کو قبول کرنے کی حد تک۔ انسان اپنی عقل اور روشن خیالی کے جسم کو اس ہوس کے قدموں میں ڈال دیتا ہے حالانکہ انسان کو اس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ باقی تمام مخلوقات ان کی اطاعت کریں۔ انسان کو اس لیے پیدا نہیں کیا گیا کہ وہ اپنے خواہشات اور خواہشات کا غلام بن جائے اور ان کی خدمت میں کوئی کسر نہ چھوڑے۔ یہ دل کی بیماری ہے جس کا کوئی دوسرا مقصد نہیں ہے۔ اس کے ابتدائی مراحل میں ہوس سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ ایک بار جب یہ مضبوط ہو جاتا ہے اور [کسی کے ذہن، دل اور روح میں] مکمل طور پر جڑ جاتا ہے تو اسے ختم کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ یہی حال دولت، شہرت، جائیداد اور اولاد کی محبت کی ہے کیونکہ ان کی محبت مکمل طور پر جڑ جانے کے بعد ختم نہیں ہوتی۔ یہ اس حد تک ہوتا ہے کہ کسی کی مختلف کھیلوں میں دلچسپی، آرام دہ اور پرسکون تعاقب [اور دیگر تعاقب، جنون اور لتیں] کہ کوئی دنیا کی کسی بھی چیز اور ان کے سامنے ایمان کو اہمیت نہیں دیتا۔ یہ چیزیں انسان کو ہر وقت پریشان اور بے چین رکھتی ہیں۔ جو شخص ابتدائی مراحل میں ہوس کی آگ کو بجھا دیتا ہے (جنون اور لت جو حق کی راہ سے انحراف کرتی ہے اور کسی بھی روحانی خواہشات کو ختم کرتی ہے) وہ اس شخص کی مانند ہے جو چاہتا ہے کہ گھوڑا دروازے سے داخل نہ ہو۔ چنانچہ جب بھی وہ دروازے کی طرف اپنا چہرہ موڑتا ہے تو اس کی لگام پکڑ کر اسے کھینچ لیتا ہے۔ جو آگ بھڑکنے کے بعد بجھانے کی کوشش کرتا ہے وہ اس کی طرح ہے جو پہلے گھوڑے کو دروازے سے اندر جانے دیتا ہے اور جب وہ اندر داخل ہوتا ہے تو اس کی دم پکڑ کر اسے باہر نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ کیا گھوڑا مزاحمت نہیں کرے گا اور باغی نہیں ہوگا؟ دونوں حالات میں کتنا بڑا فرق ہے؟ اس لیے ابتدائی مراحل میں احتیاط اور احتیاط سے کام لینا بہتر ہے۔ جب کوئی بیماری شدید ہوجاتی ہے تو ، اس کا علاج کرنے کے لئے بہت زیادہ کوشش اور جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ بھی قابل مذمت ہے کہ کوئی شخص غیر مردانہ بننے کی اس صلاحیت کو کھو دیتا ہے۔ اعتدال کی سطح یہ ہے کہ کوئی شخص ہوس کے تابع نہیں ہوتا بلکہ اس کے بجائے ہوس عقل اور قانون الٰہی کے تابع ہوتی ہے اور ان کی ہدایات پر عمل کرتی ہے۔ اس ہوس کی زیادتی بھوک اور شادی کے ذریعے سے دور کی جا سکتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

يامعشر الشباب من استطاع منكم النكاح فليتزوج فمن لم يستطع فعليه الصيام فانه له وجاء

"اے نوجوانو! تم میں سے جو شخص نکاح کرنے کی توفیق رکھتا ہے اسے روزہ رکھنا چاہیے اور جو شخص نکاح کرنے کے قابل نہ ہو [زندگی کے حالات کی وجہ سے ازدواجی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے قابل نہ ہونے کی وجہ سے] روزہ رکھے، کیونکہ روزہ ایسے شخص کے لیے سونے کا ایک طریقہ ہے [کیونکہ روزہ جسمانی قربت کی خواہش کے لحاظ سے کسی کے جذبات اور خواہشات کو قابو میں رکھنے میں مدد کرتا ہے]۔

آنکھوں کی سے حفاظت کی فضیلت: موقع ملنے کے باوجود سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے والے کے قریب وہی ہے جو اپنے آپ کو آنکھوں کے سے محفوظ رکھتا ہے۔ یہ جان لینا چاہیے کہ کا نقطہ آغاز آنکھ ہے۔ اس کا تحفظ زیادہ اہم ہے۔ چونکہ آنکھوں کو دیکھنے سے روکنا زیادہ مشکل ہے [جس کو انہیں نہیں دیکھنا چاہئے]، اس لیے لوگ

اس کے بارے میں غفلت برتنے لگے ہیں (اپنی آنکھوں کو دیکھنے سے بچانا جو غیر اخلاقی اور نامناسب سمجھا جاتا ہے)، اور یہ سوچنا شروع کر دیا ہے کہ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے، اور اس کے گناہ کو اہم نہیں سمجھتے [اس سے بچا جا سکتا ہے] حالانکہ تمام نقصانات کا نقطہ آغاز آنکھیں ہیں۔ پہلی نظر، اگر کسی مقصد یا ارادے میں کوئی تعلق نہ ہو، [الہامی] معاف کر دیا جاتا ہے، لیکن دوسری نظر کے لیے حساب کتاب اور احتساب ہے [جو عام طور پر ارادے اور مقصد کے ساتھ کیا جاتا ہے]۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نگاہ دل میں ہوس کا بیج بوتی ہے۔ لیکن اگر آنکھوں کو محفوظ رکھا جائے اور ہر قسم کی نامناسب چیزوں کو دیکھنے سے روکا جائے تو دل بہت سے نقصانات سے محفوظ رہتا ہے۔

باب 4 - بے لگام تقریر کے ناقابل تلافی نقصانات

غزالی کی چوتھی کتاب *" احیئ العلوم الدین" یا "خدا کی راہ کے علم کا احیاء" کی تیسری جلد یا چوتھائی* کتاب میں بے لگام تقریر اور اس صلاحیت کے بے ایمان استعمال کی وجہ سے پیدا ہونے والی آفتوں سے متعلق ہے۔ افراد ، معاشروں اور پوری قوموں کے مابین نقصانات ہوتے ہیں اور تنازعات کے بوئے جاتے ہیں ، جس کی وجہ سے دشمنی اور یہاں تک کہ جنگیں بھی ہوتی ہیں جب اقتدار کے لوگ سمجھے جانے والے مخالفین کے خلاف اپنی زبانیں کھول دیتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں پوری قومیں لامتناہی تنازعات میں الجھ جاتی ہیں۔ انفرادی سطح پر ، بے لگام اور غیر دانشمندانہ گفتگو لوگوں کے مابین تعلقات کو خراب اور منقطع کرنے کا باعث بن سکتی ہے ، اور دوستی دشمنیوں میں تبدیل ہوسکتی ہے جس سے باہمی نفرت پیدا ہوسکتی ہے جو قابو سے باہر ہوسکتی ہے۔ بے لگام تقریر صرف بولے جانے والے الفاظ تک محدود نہیں ہے۔ شائع شدہ مواد کی شکل میں تحریری الفاظ نقصان پہنچانے اور تنازعات کے بیج بونے میں زیادہ طاقتور ہوتے ہیں جو اندرونی اور بیرونی امن کو تباہ کرتے ہیں۔ لہذا، زبان کی کٹائی ہر سطح پر مہلک اور تباہ کن ہو سکتی ہے۔ غزالی بے لگام تقریر کے نقصانات، بے لگام تقریر پر مجبور ہونے کی وجوہات اور لوگوں اور قوموں کے درمیان امن، احترام اور ہم آہنگی کو فروغ دینے کے لیے اس بیماری کا علاج کرتی ہے۔ کسی کی روح میں مثبتیت ، ہم آہنگی اور سکون پیدا کرنے اور روحانی کمال حاصل کرنے کا کوئی بھی اقدام اس انسانی فیکلٹی کو روکنے پر بہت زیادہ انحصار کرتا ہے جو ایک ممکنہ خراب کرنے والا ہے۔ غزالی نے "زبان کے غلط استعمال" کے عنوان سے کتاب میں اس موضوع پر انتہائی اہمیت کا حامل علاج یہاں مختصر شکل میں اس طرح پیش کیا ہے:

زبان - ایک بڑی نعمت: زبان خدا کی نعمتوں سے ایک عظیم نعمت ہے اور [الہی] مخلوقات کی نزاکتوں سے ایک لطافت ہے۔ اس کا جسامت چھوٹا ہو سکتا ہے لیکن اس کی اطاعت بہت بڑی ہے اور گناہ بھی بہت بڑا ہے۔ ایمان اور کفر دونوں کی حقیقتیں زبان سے ظاہر ہوتی ہیں۔ پہلی بات (ایمان) اطاعت کی معراج ہے اور دوسری چیز (کفر) نافرمانی کی انتہا ہے۔ ہر چیز خواہ موجود ہو یا نہ ہو، خالق ہو یا تخلیق، خیالی ہو یا حقیقی، قیاس آرائی یا توہم پرستی، زبان پر آتی ہے [اور اس سے ظاہر ہوتی ہے] اور یہ یا تو اس کی تصدیق یا انکار کرتی ہے۔ ہر وہ چیز جو علم کے

دائرے میں ہے، چاہے وہ حق ہو یا باطل، زبان کے ذریعے بیان کی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو زبان کو دوسرے تمام [جسمانی] اعضاء پر ممتاز کرتی ہے۔ آنکھ کی رسائی رنگوں اور شکلوں تک محدود ہے، کانوں کے دائرہ اختیار کا دائرہ صرف آوازیں ہیں، ہاتھ صرف ان چیزوں تک پھیلائے جا سکتے ہیں جو جسمانی وجود رکھتے ہیں، اور یہی تمام [جسمانی] اعضاء کی حالت ہے۔ زبان ان میں سے واحد ہے جس کے دائرہ اختیار کا ایک وسیع اور وسیع علاقہ ہے۔ جس طرح زبان نیکی کے میدان میں دوڑنے کی صلاحیت رکھتی ہے، اسی طرح برائی کے میدان میں اسے شکست دینے والا کوئی نہیں ہے۔ اس لیے اسے قابو میں رکھنا ضروری ہے۔ جو شخص اپنی زبان پر قابو نہیں رکھتا ، شیطان اسے جو چاہتا ہے کہہ دیتا ہے اور اسے برے انجام پر لے جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ولا یکب الناس فی النار علی مناخرہم الا حصائد السنتہم

"لوگ اپنی زبانوں سے بوئے ہوئے فصل کاٹنے کے لیے ان کی ناک سے جہنم میں پھینک دیے جائیں گے۔"

صرف وہی شخص زبان کی برائیوں سے اپنے آپ کو بچا سکتا ہے جو شریعت کی باگ ڈور اس پر ڈالتا ہے اور سنت کی زنجیروں کو باندھتا ہے اور اسے اسی وقت آزاد کرتا ہے جب اسے کسی ایسی چیز کے بارے میں بات کرنے کی ضرورت ہو جو دنیاوی معاملات کے ساتھ ساتھ آخرت کے لیے بھی فائدہ مند ہو۔ مزید برآں ، کوئی اسے ہر اس چیز سے روکتا ہے جس کے آغاز اور اختتام کے برے نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔

تاہم یہ جاننا کہ کس چیز کے بارے میں بات کرنا اچھا ہے اور کیا برا ہے یا برائی، کہاں زبان کو بولنے کے لیے آزاد کرنا بہتر ہے اور کہاں برا ہے، یہ جاننا انتہائی مشکل ہے۔ یہاں تک کہ اگر یہ معلوم ہے تو ، اس پر عمل کرنا اور بھی مشکل ہے۔ تمام انسانی اعضاء میں سے سب سے زیادہ نافرمانیاں [الٰہی احکام کے جو عام عالمگیر انسانی شائستگی سے متعلق ہیں] زبان کے ساتھ ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے منتقل کرنے میں نہ تو دشواری ہوتی ہے اور نہ ہی ایسا کرنے میں کوئی تھکاوٹ اور سستی ہوتی ہے۔ لوگ زبان کے نقصانات سے اپنے آپ کو بچانے میں سستی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور اس کی برائی کو غیر اہم سمجھتے ہوئے نظر انداز کرتے ہیں، حالانکہ یہ شیطان کے اسلحہ خانے میں سب سے موثر ہتھیار ہے [افراد، برادریوں اور قوموں کے درمیان اختلاف، انتشار، انتشار اور کھلی جنگ کے بیج بونے کے لیے]۔ شیطان زبان کے وسیلہ سے خدا کے بندوں کو شکست دینے پر قادر ہے اور انہیں گمراہی کی راہ پر چلنے پر مجبور کرتا ہے۔ آنے والے صفحات میں اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ قابلیت سے ہم زبان کے نقصانات کو الگ الگ اور بڑی تفصیل کے ساتھ درج کریں گے، تمام نقصانات کی حدود اور نتائج کا ذکر کریں گے، اور ان سے اپنے آپ کو بچانے کی حکمت عملی بیان کریں گے۔ زبان کے کل بیس نقصانات ہیں۔ ان کی وضاحت کرنے سے پہلے سب سے پہلے زبان کے غلط استعمال اور خاموشی کی فضیلت کے خطرات کا ذکر کیا جائے گا۔

زبان کا بڑا خطرہ اور خاموشی کی فضیلت

واضح رہے کہ زبان کا خطرہ بہت زیادہ ہے اور اس سے بچانے کا واحد راستہ خاموشی ہے۔ چنانچہ شریعت الٰہی نے خاموشی کی تعریف کی ہے اور اس کے پیروکاروں کو خاموش رہنے پر آمادہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من صمت نجا

"جو خاموش رہا اس نے نجات حاصل کی (بہت سے نقصانات اور خطرات سے نجات اور حفاظت بشمول خدا کے سامنے کھڑا ہونا جو اللہ کی مغفرت اور قبولیت کے حصول کے لیے ضروری ہے)۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث مجموعہ *ترمذی* صحابہ کرام عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے حکم پر

الصمت حكم وفاعله قليل

"خاموشی حکمت ہے لیکن صرف چند لوگ ہیں جو اس پر عمل کرتے ہیں۔" (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث مجموعہ *ابو منصور الدیلمی* صحابہ کرام عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے حکم پر

عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ نجات کا راستہ کیا ہے؟ اس نے کہا:

امسک علیک لسانک ویسعک بیتک وابک علی خطیئتک

اپنی زبان پر قابو رکھو، آپ کا گھر آپ کے لیے کافی ہو اور اپنی غلطیوں اور غلط کاموں پر آنسو بہائے۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث کا مجموعہ *ترمذی*)

سہل بن سعد سعدی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

من یتکفل لی بما بین لحیتیه ورجلیه اتکفل له الجن

"جو شخص مجھے دو کان (یعنی زبان) اور دو ٹانگوں کے درمیان جو کچھ ہے اس کی عفت کی ضمانت دے تو میں ایسے شخص کو جنت کی ضمانت دوں گا۔" (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث کا مجموعہ *صحیح بخاری*)

من وقی شر قبقبه وذبذبه ولقلقه فقد وقی الشر کله

"جس نے اپنے آپ کو پیٹ، شرم اور زبان کی برائیوں سے بچایا وہ ہر قسم کی برائیوں سے محفوظ رہا۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *احادیث* کا مجموعہ *ابو منصور الدیلمی* صحابی حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کرتا ہے

یہ تین اعضاء ہیں۔ اس کی ہوس لوگوں کی تباہی کا سبب بنتی ہے۔ چنانچہ معدے اور جنسی اعضاء کی ہوس کی وضاحت کرنے کے بعد میں نے زبان کے غلط استعمال کے نقصانات کی وضاحت کرنا ضروری سمجھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس چیز کے بارے میں پوچھا گیا جس کی وجہ سے لوگ جنت میں جائیں گے۔ اس نے جواب دیا:

تقوی اللّٰہ وحسن الخلق

"خدا کا خوف اور خوبصورت اخلاق، آداب، کردار اور باطنی مزاج (*اخلاق*)

ان سے پوچھا گیا کہ براہ کرم ہمیں یہ بھی بتائیں کہ لوگوں کو جہنم کی طرف کیا لے جائے گا؟ اس نے جواب دیا:

الاجوفان الفم والفرج

"دو کھوکھلی چیزوں کی وجہ سے: منہ اور نجی اعضاء۔" (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *صحابہ* کرام ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے بارے *میں حدیث* کے *مجموعے* ترمذی *اور* ابن ماجہ

اس حدیث میں "منہ" کو زبان کے نقصانات بھی کہا جا سکتا ہے کیونکہ منہ زبان کا مسکن ہے اور یہ معدے کو منہ کے طور پر بھی کہا جا سکتا ہے جو پیٹ کو بھرنے کا راستہ ہے۔ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: یا رسول اللہ! کیا ہم جو کچھ کہتے ہیں ان کا بھی احتساب ہوگا [جیسا کہ صرف کچھ کہنا ، چاہے وہ کچھ بھی ہو ، کوئی بڑی بات بھی نہیں ہونی چاہئے]؟ اس پر آپ نے جواب دیا:

تکلتک امک یا ابن جبل؛ وھل یکب الناس فی النار علی مناخرھم الاحصائد السنتھم

"اے ابن جبل! تمہاری ماں تیرے لئے روئے! لوگوں کو ان کی زبانوں کی فصل کاٹنے کے لیے الٹا جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *احادیث* کے مجموعے *ترمذی*، حکیم اور *ابن ماجہ* سے صحابی نبوی معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:

من کف لسانہ ستر اللّٰہ عورتہ ومن ملک غضبہ وقاہ اللّٰہ عذابہ ومن اعتذر الی اللّٰہ قبل اللّٰہ عذرہ

"جو شخص اپنی زبان (فضول اور بری باتوں سے) روکتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے عیبوں کو چھپاتا ہے، اور جو شخص اپنے غضب پر قابو پاتا ہے [جب وہ حق اور حق محسوس کرتا ہے] تو اللہ تعالیٰ اس کو اپنے عذاب سے بچاتا ہے، اور جو کوئی اللہ کے سامنے عذر پیش کرتا ہے، وہ عذر قبول کرتا ہے۔" (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *احادیث* کا مجموعہ *ابن ابی الدنیا* صحابی نبوی عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے

یسوع مسیح (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اللہ علیہا السلام) سے کہا گیا تھا کہ وہ کسی ایسے عمل کے بارے میں آگاہ کریں جو انسان کو جنت کی طرف لے جائے۔ اس نے جواب دیا: کبھی نہ بولنا۔ سوال کرنے والے نے کہا: یہ ممکن نہیں ہے۔ پھر فرمایا: اگر بولنا ضروری ہے تو نیکی کے سوا کچھ نہ کہو۔ ایک بدو (خانہ بدوش صحرائی عرب) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور جنت کی طرف جانے والے عمل کے بارے میں پوچھا۔ اس نے جواب دیا:

اطعم الجائع واسق الظمان وامر بالمعروف وانہ عن المنکر فان لم تطق فکف لسانک الا من خیر

"بھوکوں کو کھانا کھلو، پیاسے کو پانی پلاؤ، نیکی کا حکم دیجئے، برائی سے نصیحت کرو، اگر تم ایسا نہ کر سکو تو زبان کو نیکی کے سوا اور کچھ کہنے سے روکو۔" (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے احادیث کا مجموعہ *ابن ابی الدنیٰ*)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اذا رأيتم المؤمن صموتا وقورا فادنوا منه فانه يلقن الحكمة

"جب تم کسی مومن کو خاموش اور باوقار دیکھو تو اس کے قریب ہو جاؤ جیسے اس کو حکمت کی تعلیم دی جا رہی ہے۔" (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *صحابی نبوی ابو خالد رضی اللہ عنہ* سے حدیث *کا مجموعہ* ابن ماجہ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: عبادت کے دس حصے ہیں۔ نو کا تعلق خاموشی سے ہے اور ایک حصہ لوگوں سے فرار ہونے سے متعلق ہے۔

خاموشی کی برتری کی وجہ: بولنے میں بہت سارے نقصانات ہیں۔ غلطیاں، جھوٹ، غیبت کرنا، قصے بازی کرنا، دکھاوا کرنا، فحاشی، جھگڑا کرنا، فضول باتیں، خود تعریف کرنا، مبالغہ آرائی کرنا، نقصان پہنچانا، لوگوں کے عیبوں کو سامنے لانا اور اس طرح کے دیگر نقصانات کا تعلق زبان سے نہیں بلکہ کسی اور سے ہے۔ زبان کو حرکت دینے میں کوئی درد، کوشش اور تھکاوٹ نہیں ہوتی۔ اس کے بجائے ، بولنے میں لطف آتا ہے۔ انسان کا اپنا مزاج کسی کو بات کرنے پر آمادہ کرتا ہے اور شیطان بھی اس کے لیے دباؤ ڈالتا ہے [دل میں اپنے اشاروں کے ذریعے]۔ وہ لوگ جو [غیر ضروری اور ضرورت سے زیادہ] بات کرنے کے عادی ہیں ، وہ شاذ و نادر ہی اپنی زبانوں کو بولنے سے روک سکتے ہیں چاہے موقع ہو یا نہ ہو۔ اس کے بجائے ، وہ نتائج سے قطع نظر بات کرتے رہتے ہیں۔ بہرحال بولنے میں بہت سے خطرات ہیں اور خاموشی سے تمام خطرات سے محفوظ رہتا ہے۔ لہٰذا اس کی برتری اور فضیلت کہیں زیادہ ہے۔ خاموشی کے بے شمار فوائد ہیں۔ کسی کی ہمت جمع رہتی ہے اور خیالات منتشر نہیں ہوتے ہیں، وہ [خاموشی کے نتیجے میں] باوقار رہتا ہے۔ کسی کے پاس غور و فکر، الٰہی یاد اور عبادت کا وقت ہوتا ہے۔ دنیا میں بولنے کے غلط نتائج اور اس کے بعد کی زندگی میں اس کی جوابدہی سے چھٹکارا حاصل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَّا يَلْفِظُ مِن قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ

"کوئی ایک لفظ بھی نہیں بولتا جس کے لیے آس پاس کا کوئی چوکیدار اس کے لیے تیار ہو (اس سے مراد ان دو فرشتوں کی طرف ہے جو ہر انسان کے قریب ہیں، ایک تمام نیک اعمال لکھتا ہے اور ایک اس شخص کے لیے اپنے تمام برے اعمال کو اپنے اپنے اعمال کے اپنے رجسٹر میں لکھتا ہے۔ یہ رجسٹر قیامت کے دن خدا کے سامنے پیش کیے جائیں گے تاکہ اس شخص کے لیے حتمی فیصلہ کیا جا سکے۔ (سورة البقرة باب 50، آیت 18)

یہاں خاموش رہنے کی فضیلت کے بارے میں ایک عمدہ دلیل ہے۔ تقریر کی چار قسمیں ہیں۔ پہلی قسم میں صرف نقصان ہوتا ہے۔ دوسری قسم میں صرف فوائد ہیں۔ تیسری قسم کے فوائد اور نقصانات دونوں ہیں۔ چوتھی قسم کا نہ تو کوئی فائدہ ہے اور نہ ہی نقصان۔ جہاں تک اس قسم کی تقریر کا تعلق ہے جس میں صرف نقصان ہوتا ہے، اس سے دور رہنا اور خاموش رہنا ضروری ہے۔ اسی ہدایت کا اطلاق تقریر پر ہوتا ہے جس میں فوائد اور نقصانات دونوں ہوتے ہیں بشرطیکہ نقصان فائدہ سے زیادہ ہو۔ جس قسم کا نہ تو نفع ہے اور نہ نقصان بیکار ہے اور اس سے خاموش رہنا بہتر ہے کیونکہ اس میں عیش و عشرت انسان کا وقت ضائع کرنا ہے اور یہ بہت بڑا نقصان ہے۔ اب صرف چوتھی قسم باقی ہے [جو وہ قسم ہے جس میں صرف فوائد ہیں]۔ اس طرح تقریر کے چار میں سے تین حصے ختم ہو جاتے ہیں اور صرف ایک حصہ باقی رہ جاتا ہے اور اس میں نقصانات کے خطرات اور امکانات موجود ہیں۔

کبھی کبھی دکھاوا، مصنوعیت، آرائش، غیبت، خود غرضی اور دیگر برائیاں اس طرح تقریر میں داخل ہو جاتی ہیں کہ مخاطب کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ فائدہ مند گفتگو کرنے والا بھی خطرات سے کھیلنے والا ہے۔ جو شخص زبان سے متعلق نقصانات کی باریکیوں کو سمجھتا ہے وہ یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گا کہ اس سلسلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مندرجہ ذیل قول اس موضوع پر آخری کلام کی حیثیت برقرار رکھتا ہے:

من صمت نجا

"جو خاموش رہا اس نے نجات حاصل کی (بہت سے نقصانات اور خطرات سے نجات اور حفاظت بشمول خدا کے سامنے کھڑا ہونا جو الٰہی کی مغفرت، قبولیت اور قربت کے حصول کے لیے ضروری ہے)۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *حدیث* مجموعہ *ترمذی* صحابہ کرام عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے حکم پر

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو چند الفاظ میں انتہائی معنی خیز باتیں کہنے کی صلاحیت عطا فرمائی گئی اور انہیں حکمت کا انمول زیور عطا کیا گیا۔ اس کی بابرکت زبان سے نکالا جانے والا ہر لفظ اس میں معانی اور حکمت کا ایک بے پناہ سمندر ہے۔ اس بے پناہ سمندر کی تہہ سے غوطہ لگانا اور موتیوں کو چننا صرف منتخب علماء کا کام ہے (جو اپنے خدا پرستی، سچائی کے لیے مکمل لگن اور اپنی روح کی انتہائی پاکیزگی کے ساتھ اس پر عمل کرنے میں خلوص کی وجہ سے علم میں مضبوطی سے پیوست ہیں)۔ نبوت کی تقریر کی گہری باطنی حکمت کو سمجھنا ہر ایک کے دائرے میں نہیں ہے۔

زبان یا بول چال کے غلط استعمال کے نقصانات

زبان کا پہلا نقصان – فضول بات: بہتر یہ ہے کہ اپنی بات کو ان تمام نقصانات سے محفوظ رکھا جائے جن کا ابھی ابھی ذکر کیا گیا ہے مثلا غیبت، قصیدہ، جھوٹ بولنا اور جھگڑا وغیرہ، اور صرف ایسی باتیں کہیں جو جائز ہیں اور ان کے کہنے سے بولنے والے یا سننے والے کو نقصان نہیں پہنچاتا۔ زبان سے کہے جانے والی کچھ جائز اور بے ضرر باتیں ایسی ہیں کہ ان کے کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بیکار اور غیر فائدہ مند چیزیں ہیں۔ ان میں وقت کا ضیاع بھی ہوتا ہے اور آخرت کا احتساب بھی ہوتا ہے اور کسی برتر چیز کو چھوڑ کر اس کا بدلہ کسی کمتر چیز سے بدل دیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر بولنے والا بولنے کے بجائے اپنے دل و دماغ کو خدا کی صفات (نحت) اور صفات الہامی (*صفات*) پر غور و فکر کی طرف مائل کرتا تو اس کے لیے بہتر ہوتا۔ یہ بہت ممکن تھا کہ اس غور و فکر کے نتیجے میں کسی کے لیے برکتوں کے دروازے کھل گئے ہوں گے اور دل کو وسعت مل گئی ہوگی (وضاحت، روشنی، لنگداری)۔ بولنے کے بجائے اگر کوئی خدا کی تسبیح کرتا اور اس کی تقدیس اور وحدانیت کو یاد الٰہی میں ظاہر کرتا تو اس کے لیے بہتر ہوتا۔ کتنے الفاظ ایسے ہیں کہ اگر ایسا ایک لفظ بھی بولا جائے تو اس کے نتیجے میں آسمان میں ایک محل تعمیر کیا جاتا ہے جس کے نتیجے میں وہ بولنے والے کے لیے۔ جو کوئی خزانہ حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن اس کے بجائے پتھر جمع کرنا شروع کر دیتا ہے، اسے بدقسمتی کے علاوہ اور کیا کہا جائے گا؟ یہ ایک ایسے شخص کی مثال ہے جو یاد الٰہی کو ترک کر کے کسی بیکار اور بے فائدہ کام میں مصروف ہو جاتا ہے۔ اگرچہ کوئی ایسا کرنے پر گناہ نہیں کر رہا ہے، لیکن کیا یہ کم نقصان ہے کہ اس نے بہت زیادہ منافع کمایا اور جس کام میں وہ مصروف ہے اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

فان المؤمن لا یکون صمته الا فکرا ونظره الا عبرة ونطقه الا ذکرا

"مومن کی خاموشی غور و فکر ہے، بینائی سبق حاصل کرتی ہے، اور تقریر الٰہی یاد ہے۔"

کسی فرد کا اصل اثاثہ وقت ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص وقت کو فضول کوششوں میں استعمال کرے اور اس اثاثے کو آخرت کے لیے ذخیرہ کے طور پر نہ بچائے تو نقصان کے سوا اور کیا حاصل ہو سکتا ہے؟ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من حُسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ

"یہ اپنے اسلام کی خوبصورتی کا اشارہ ہے کہ بیکار چیز کو ترک کر دیا جائے۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *صحابہ* کرام ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے بارے *میں حدیث* کے مجموعے ترمذی *اور* ابن ماجہ

جو شخص بیکار کام کرتا ہے وہ قیامت کے دن احتساب سے بچ نہیں سکے گا جو کہ سزا کی ایک شکل ہے۔ سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا: کیا میں تمہیں ایسے کام کے بارے میں نہیں بتاؤں جو جسم پر ہلکا اور قیامت کے ترازو میں بھاری ہو؟ آپ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! جی ہاں، براہ مہربانی ہمیں بتائیں"۔ اس نے جواب دیا:

ھو الصمتُ وحسن الخلق وترکہ مالا یعنیک

"یہ [عمل] خاموشی، اچھے اخلاق، آداب اور باطنی مزاج ہے، اور فضول [عمل یا تقریر] کو ترک کرنا ہے۔" (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے احادیث کا مجموعہ *ابن ابی الدنیٰ*)

نبی کریم ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: پانچ چیزیں ایسی ہیں جن سے مجھے سب سے زیادہ محبت ہے: ایک یہ کہ بیکار اور بے فائدہ باتیں نہ کریں کیونکہ یہ غیر ضروری اور زائد ہے اور اس میں ہمیشہ گناہ کا خطرہ رہتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر کوئی فائدہ مند گفتگو بھی کرتا ہے تو پہلے دیکھنا چاہیے کہ فائدہ مند گفتگو کا بھی کوئی موقع ہے یا نہیں، کیونکہ بعض اوقات موقع اور موقع کے بغیر کی جانے والی مفید گفتگو بھی تکلیف کا باعث بن سکتی ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ کسی روادار یا احمق سے بحث نہیں کرنی چاہیے، کیونکہ کسی رواداد شخص سے بحث کرنا غصہ پیدا کرنا ہے اور احمق سے بحث کرنا اپنے آپ کو تکلیف کا نشانہ بنانا ہے۔ چوتھی بات یہ ہے کہ اپنے بھائی کا تذکرہ اس طرح کرنا چاہیے جس طرح وہ خود ذکر کرنا چاہتا ہے۔ پانچویں بات یہ ہے کہ کوئی کچھ بھی کرے اس یقین کے ساتھ کیا جائے کہ اگر یہ عمل اچھا ہے تو اس کا ثواب ملے گا اور اگر برا اور برا ہے تو اس کا اجر ہے۔ بیکار باتیں کئی وجوہات کی بنا پر کی جاتی ہیں۔ کبھی اسپیکر کو غیر ضروری باتیں پوچھنے کا لالچ ہوتا ہے، کبھی کسی کو چیزیں پھیلانے کی عادت ہوتی ہے یا سننے والے کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے۔ بعض اوقات کوئی سننے والے سے محبت کرتا ہے اور گفتگو کو طول دینا سننے والے کو طویل عرصے تک اپنی طرف مائل رکھنے کے لئے کیا جاتا ہے۔ کبھی کبھی، [مختلف لوگوں کے بارے میں] کہانیاں تفریح کے طور پر سنائی جاتی ہیں۔ اس سب کا علاج یہ ہے کہ میں موت کو ایک کے سامنے سمجھیں اور یہ سوچیں کہ میں ہر بولے ہوئے لفظ کا ذمہ دار ہوں گا۔ میری سانسیں میرا اثاثہ ہیں اور زبان میرا جال ہے [دوسرے دنیاوی فوائد کے لحاظ سے کسی قیمتی چیز کو پکڑنے کے لیے]۔ کسی کے اثاثے کو ضائع کرنا اور نیٹ کو غیر استعمال شدہ چھوڑنا [یا غلط چیزوں میں استعمال ہونا] عقلمند نہیں ہے۔ یہ بیکار باتوں کا علم پر مبنی علاج ہے۔ اس کا عملی علاج یہ ہے کہ تنہائی اختیار کی جائے یا کبھی کبھی فائدہ مند معاملات سے بھی اپنی زبان کو روکا جائے تاکہ اسے بیکار باتیں نہ کہنے کی عادت پڑ جائے۔

دوسرا نقصان - ضرورت سے زیادہ بات: ضرورت سے زیادہ بات کرنا بھی ایک ناپسندیدہ عمل ہے۔ اس میں بیکار باتوں کے ساتھ ساتھ ضرورت کی حدود سے تجاوز کرنے والی فائدہ مند گفتگو بھی شامل ہے۔ فائدہ مند تقریر مختصر ہوسکتی ہے۔ جو شخص مختصر ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن پھر بھی ایک کے بجائے دو الفاظ استعمال کرتا ہے، اسے ضرورت سے زیادہ بولنے والا سمجھا جائے گا اگرچہ اس کا مطلب [عوامی] تقریر یا تاکید کے طور پر

ہے، اگرچہ اس میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تم سے پہلے ایسے لوگ بھی گزر چکے ہیں جو فضول باتوں سے نفرت کرتے تھے۔ ان کے نزدیک اللہ کی کتاب اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی راہ سے متعلق ایک گفتگو کے علاوہ جو نصیحت کی نصیحت کرتی تھی اور برائی سے روکتی تھی اور سب سے اہم دنیاوی ضروریات کے لیے وہ ہر دوسری بات کو حد سے تجاوز سمجھتے تھے۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ کون سی بات چیت یا گفتگو ضرورت سے زیادہ ہے اور کون سی غیر ضروری ہے کیونکہ اس کی کوئی حد نہیں ہے۔ لیکن قرآن مجید نے مفید اور ضروری گفتگو کی حد مقرر کی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَّا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّن نَّجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ

انہوں نے کہا کہ عام لوگوں کی زیادہ تر بحثوں میں کوئی بھلائی نہیں ہوتی۔ لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جو دوسروں کو صدقہ دینے یا کچھ نیک اعمال کرنے یا لوگوں کے درمیان باہمی صلح اور اصلاح لانے پر آمادہ کرتے ہیں۔ (سورۃ البقرۃ باب 4 آیت 114)

ہزار احتیاطی تدابیر کے ساتھ کسی کی تعریف کرتے وقت بھی کچھ ایسے الفاظ منہ سے نکلتے ہیں جو حقائق کے خلاف ہوتے ہیں اور مبالغہ آرائی پر مبنی ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر تعریف حقیقت پر مبنی ہے، تو اس بات کا خطرہ ہے کہ شیطان کسی کو غیر ضروری باتیں کہنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ ذبیح اللہ مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: انسان کا ہر لفظ اس حد تک لکھ کر لکھا جاتا ہے کہ باپ اپنے بیٹے سے کہتا ہے کہ وہ اس کے لیے کوئی چیز خرید لے گا اور ایسا کرنے کا اس کا ارادہ نہیں تھا، یہ اس کے لیے جھوٹ کے طور پر درج کیا جائے گا۔ حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اے انسان! تمہارا اعمال نامہ کھول دیا گیا ہے اور دو فرشتے مقرر کیے گئے ہیں جو تمہارے اعمال لکھتے ہیں اب یہ آپ کی خواہش پر منحصر ہے کہ آپ کیا کرنا چاہتے ہیں، چاہے آپ کم یا زیادہ کریں، آپ کا ہر عمل درج کیا جائے گا اور قیامت کے دن اعمال کا یہ رجسٹر آپ کے حق میں یا آپ کے خلاف ایک بہت بڑا ثبوت ہوگا۔ ایک روایت کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے ایک *جنوں* کو کہیں بھیجا اور اس کے پیچھے چند *اور جنوں* کو بھیجا تاکہ وہ اسے بتا سکیں کہ وہ کہاں گیا اور کیا کیا۔ وہ واپس آئے اور اسے بتایا کہ وہ ایک بازار میں گیا ہے اور وہاں پہنچنے کے بعد اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور پھر نیچے انسانوں کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد اس نے سر ہلایا اور آگے بڑھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام اس بات پر حیران ہوئے اور ان سے اس بارے میں پوچھا۔ آپ نے فرمایا: میں فرشتوں کو دیکھ کر حیران ہوا کہ وہ کتنی جلدی اپنے سروں کے بل بیٹھے انسانوں کے اعمال لکھ رہے تھے اور پھر میں حیران ہوا کہ انسان کتنی جلدی گمراہ ہو جاتے ہیں۔ حضرت ابراہیم تیمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "مومن بولنے سے پہلے دیکھتا ہے کہ آیا یہ کسی کے لیے فائدہ مند ہے یا نقصان۔ کوئی شخص صرف اس صورت میں بولتا ہے جب یہ فائدہ مند ہو ورنہ خاموش رہتا ہے، اور برائی اور گناہ کی طرف مائل شخص بغیر سوچے سمجھے بولتا ہے"۔ ایک دانشمند نے کہا: "اگر کسی کو کسی اجتماع میں بات کرنا پسند ہے تو اسے خاموشی اختیار کرنی چاہیے اور اگر خاموش رہنا پسند ہے تو اسے بات کرنی چاہیے"۔ زید بن ابی حبیب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "عالم کے لیے آزمائش سننے کے مقابلے میں بولنے میں ہے کیونکہ وہ حق کی فراہمی، قائل کرنے اور اپنی گفتگو کی زینت کے خطرات کا شکار ہے"۔ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ انسان مال و کلام کی زیادتی سے ہلاک ہو جاتا ہے۔

تیسرا نقصان - غلط کا تذکرہ: غلط کو ایک ایسی گفتگو کہا جاتا ہے جو گناہ سے متعلق ہو۔ مثال کے طور پر مخالف جنس کی خوبصورتی اور جسمانی خصوصیات کے بارے میں گفتگو کرنا، رومانوی کہانیاں سنانا، گناہوں کے اجتماعات، دولت مندوں کی زیادتی، حکمرانوں کے برے اعمال کو بیان کرنا، یہ سب معاملات غلط ہیں اور ان میں عیش و عشرت حرام ہے۔ غیر ضروری باتیں حرام نہیں ہیں، صرف ناپسند کی جاتی ہیں اور مستحب نہیں، اسی طرح ضرورت سے زیادہ باتیں بھی حرام نہیں ہیں، ناپسند کی جاتی ہیں، البتہ بری باتیں حرام کے دائرے میں آتی ہیں۔ تاہم ، یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو غیر ضروری موضوعات پر بہت کچھ بولتا ہے وہ غلط گفتگو میں الجھنے کے قریب ہے [لہٰذا ، اس سے بچنا بہتر ہے]۔ آج کل تفریحی گفتگو ایک خاص مشغلہ ہے اور لوگ اس کے لیے خصوصی اجتماعات کا اہتمام کرتے ہیں۔ کسی کی غلطی ہوتی ہے، کسی کا مذاق اڑایا جاتا ہے، کسی کی غلطی ظاہر ہوتی ہے، کسی کی

غلطیوں کی تلاش کی جاتی ہے، کسی کے خلاف سازش ہوتی ہے، وغیرہ۔ درحقیقت، ایسا کوئی اجتماع گناہ سے خالی نہیں ہے۔ یہ بہت سے مختلف قسم کے گناہ ہیں کہ ان کا شمار کرنا آسان نہیں ہے۔ ان سے چھٹکارا پانے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو اپنی گفتگو اور گفتگو میں دینی [اور روحانی کشمکش] معاملات اور ضروری دنیاوی ضروریات تک محدود رکھیں۔ برائیوں کا ذکر کرنا ایک خطرناک تجویز ہے اور اس کا عادی ہو کر وہ تباہ ہو جاتا ہے [روحانی طور پر اس کے مادی اور ظاہری زندگی پر بھی اثرات مرتب ہوتے ہیں]، اگرچہ کوئی اسے معمولی سمجھ سکتا ہے اور اس کے خطرات کا ادراک اور ادراک نہیں کرتا۔ لیکن قیامت کے دن یہ بات ظاہر ہو جائے گی کہ جس گناہ کو معمولی سمجھا جاتا ہے، اس نے انسان کے لیے اتنی تباہی پیدا کی ہے۔ بلال بن الحارث رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

ان الرّجل یتکلم بالکلمة من رضوان اللّٰه ما یظن ان تبلغ به ما بلغت فیکتب اللّٰه بها رضوانه الی یوم القیامة وان الرجل یتکلم بالکلمة من سخط اللّٰه ما یظن ان تبلغ بها ما بلغت فیکتب اللّٰه علیه بها سخطه الی یوم القیامة

"ایک آدمی ایک ایسا لفظ کہتا ہے جو خدا کو پسند کرتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ وہاں اسے اس سے کوئی خاص خدائی منظوری نہیں ملی ہے۔ تاہم، خدا نے قیامت تک اس کلام کے لیے اپنی الٰہی منظوری لکھی ہے۔ بعض اوقات انسان کوئی ایسا لفظ کہتا ہے جو خدا کو ناپسند کرتا ہے اور سوچتا ہے کہ وہ اس سے ناراض نہیں ہوگا لیکن اس ایک لفظ کی وجہ سے خدا قیامت تک اپنی ناراضگی لکھ دیتا ہے۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث کا مجموعہ *ابن ماجہ* اور *ترمذی*

بری اور غلط باتیں غیبت، قصے اور عیب تلاش سے الگ قسم کی ہیں اور اس میں ممنوعہ باتوں کا ذکر کرنے سے متعلق ہے اور ایسا کرنے کی کوئی دینی ضرورت نہیں ہے۔ اس میں [دینی معاملات میں] بدعات کا تذکرہ، انحراف نظریات کا تذکرہ اور یہاں تک کہ صحابہ کرام کے درمیان باہمی اختلافات کا ذکر بھی شامل ہے [جو نفاق کے بیج بونے اور فرقہ واریت کو فروغ دینے کے لیے کیا جاتا ہے]۔

چوتھا نقصان - لوگوں کی گفتگو اور جھگڑا کاٹنا: لوگوں کی بات کرتے وقت ان کا رابطہ کاٹنا ممنوع ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا تمار اخاک ولا تمازحه ولا تعده موعدا فتخلفه

"اپنے بھائی کو [جب وہ بات کر رہا ہے] کف نہ کرو، اس کے ساتھ غیر مہذب مذاق نہ کرو اور ایسا وعدہ نہ کرو جو تم پورا نہیں کر سکتے۔" (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *صحابہ کرام عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ* کی حدیث *کا* مجموعہ ترمذی

ذروا المراء فانه لا تفهم حکمته ولا تؤمن فتنته

"گفتگو کو کاٹنا بند کریں کیونکہ اس میں کوئی حکمت نہیں ہے جسے سمجھا جا سکتا ہے ، اور نہ ہی کوئی اس کے نقصانات سے دور رہ سکتا ہے۔" (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *صحابہ کرام ابو دردہ رضی اللہ عنہ* سے حدیث *کا* مجموعہ طبرانی

من ترك المراء وهو بنى له بيت في اعلى الجنة ومن ترك المراء وهو مبطل بنى له بيت في ربض الجنة

"جو شخص صحیح (یا سچائی کی طرف) رہتے ہوئے لوگوں کی گفتگو کو کاٹنے کو چھوڑ دیتا ہے، تو ایسے شخص کے لیے جنت کی بلند ترین سطح پر ایک گھر تعمیر کیا جائے گا۔ اور جو شخص غلط ہو کر لوگوں کی گفتگو کو کاٹ دیتا ہے تو ایسے شخص کے لیے جنت کے وسط میں گھر بنایا جائے گا۔

کہا جاتا ہے کہ جھگڑنے کی وجہ سے قومیں ہدایت کی روشنی حاصل کرنے کے بعد گمراہ ہو گئی ہیں۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا: لوگوں سے گفتگو اور جھگڑا منقطع کرنے سے دل کی سختی ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے دلوں میں دشمنی کے بیج ڈالے جاتے ہیں۔ بلال بن سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "جب تم کسی کو خود غرضی، جھگڑنے والا اور اپنی رائے پر اصرار کرتے ہوئے دیکھو تو جان لو کہ ایسا شخص آخرت کے نقصان کا مقدر ہے"۔ ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: "ہمیشہ لوگوں سے جھگڑا کرنا یا جھگڑا کرنا ایسے شخص کے لیے گنہگار ہونے کے لیے کافی ہے"۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تین چیزوں کے لیے علم حاصل نہ کرو اور نہ ہی تین چیزوں کی وجہ سے اپنے آپ کو علم حاصل کرنے سے روکو۔ جن تین چیزوں کے لیے علم حاصل نہیں کرنا چاہیے وہ ہیں جھگڑا (اور لوگوں کے ساتھ دلائل)، تکبر اور دکھاو۔ تین چیزیں جن کے لیے علم کے حصول سے باز نہیں آنا چاہیے وہ ہیں علم حاصل کرنے میں شرم، علم کے حصول سے پرہیز اور جہالت سے مطمئن ہونا۔
حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: "جو شخص بہت جھوٹ بولتا ہے، اس کی خوبصورتی ختم ہوتی ہے، جو لوگوں سے بہت جھگڑا کرتا ہے تو اس کی عزت مجروح ہوتی ہے، جو بہت پریشان ہوتا ہے وہ بیمار ہو جاتا ہے، جس کے اخلاق اور اخلاق خراب ہوتے ہیں وہ اپنے آپ کو عذاب الٰہی میں شامل کر دیتا ہے"۔

لوگوں کو کاٹنے کی تعریف: اس کی تعریف یہ ہے کہ کسی کی گفتگو میں عیب تلاش کیا جائے اور اس بنیاد پر اس پر اعتراض کیا جائے، چاہے یہ عیب الفاظ میں ہو، معنی میں ہو یا ارادے کا۔ اس ضمن میں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ آپ جو بھی گفتگو سنتے ہیں، اگر وہ سچ ہے تو اس کی سچائی کی تصدیق کریں اور اگر غلط ہے تو خاموش رہیں، بشرطیکہ وہ مذہبی معاملات کے بارے میں نہ ہو۔ الفاظ میں غلطیاں اسپیکر کو یہ بتا کر پائی جاتی ہیں کہ الفاظ گرامر کے اصولوں کے خلاف ہیں اور الفاظ کی ترسیل میں الفاظ کی صحیح ترتیب پر عمل نہیں کیا جاتا ہے۔ الفاظ میں اس طرح کی غلطیاں مختلف وجوہات کی بنا پر ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی لوگ زبان سے اچھی طرح واقف نہیں ہوتے، کبھی لوگ ایک بات کہنا چاہتے ہیں لیکن منہ سے کچھ اور نکل جاتا ہے۔ الفاظ میں غلطی کی وجہ جو بھی ہو، تنقید کا کوئی جواز نہیں ہے۔ الفاظ کے معنی یہ کہہ کر اعتراض کا نشانہ بن جاتے ہیں: "تم نے فلاں غلط بات کہی ہے، تم نے فلاں رائے میں غلطی کی ہے، تمہاری سوچ یا رائے درست نہیں ہے"، وغیرہ۔ نیت پر یہ کہہ کر تنقید کی جاتی ہے: "یہ بات جو آپ کہہ رہی ہے، اگرچہ حقائق پر مبنی ہے، لیکن آپ کی نیت حقائق کا اظہار نہیں ہے، بلکہ یہ کچھ اور ہے"۔ ایسے تمام مواقع پر ، خاموش رہنا لازمی ہے۔ لیکن اگر سوال کرنے کا مقصد علم اور فائدہ حاصل کرنا ہے نہ کہ دشمنی اور تنقید کا موقع تلاش کرنا تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ دلیل کا مقصد مخالف کو خاموش کرانا، اس کی جہالت، عیبوں اور خامیوں کا اعلان کرنا ہے تاکہ کوئی ذلیل ہو جائے اور لوگ ایسے شخص کا مذاق اڑائیں۔ اس طرح کے مذموم مقصد کا اشارہ یہ ہے کہ اگر اعتراض حق کی خاطر ہو تو کوئی اور مناسب طریقہ اختیار کرنے کے بجائے کوئی ایسا طریقہ اختیار کرتا ہے جو مخالف کی توہین کرتا ہے اور اس کی اپنی برتری کا اظہار اس پر ہوتا ہے۔

جھگڑوں سے دور رہنے اور گفتگو کو منقطع کرنے کا طریقہ: دونوں سے اپنے آپ کو بچانے کا طریقہ یہ ہے کہ جائز معاملات میں بھی خاموش رہے۔ یہ دونوں برائیاں کسی کے مخالف کو بدنام کرنے اور اپنی برتری قائم کرنے کے مقصد سے پیدا ہوتی ہیں۔ یہ نچلے نفس کی دو ایسی ہوس ہیں جن پر قابو پانا مشکل ہے۔ کسی کی برتری کا اظہار خود راستبازی کے زمرے سے تعلق رکھتا ہے جو بدلے میں اپنے آپ کو بلند اور عظیم سمجھنے کا رد عمل ہے۔ لیکن عظمت اور عظمت صرف اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں اور صرف اسی کے لیے موزوں ہیں۔ اسی طرح ، کسی کو ناقص اور پست سمجھنا [ایک کے ساتھ] حیوانی مزاج کا اشارہ ہے کیونکہ ایک جنگلی جانور دوسرے کو پھاڑنا

اور زخمی کرنا پسند کرتا ہے۔ یہ دونوں برائیاں انتہائی قابل مذمت اور نقصان دہ ہیں۔ جھگڑا کرنا اور گفتگو کو کاٹنا ان [گھناؤنی اور منفی] خصوصیات کو ہوا دیتا ہے [دوسروں کو ناقص اور حقیر سمجھنے]۔ جو شخص متنازعہ دلائل اور تنقیدوں میں ملوث رہتا ہے وہ ان دو تباہ کن داخلی خصوصیات کی نشوونما کے لیے پرورش فراہم کرتا رہے گا۔ جھگڑا اور لوگوں کی گفتگو کو کاٹنا دونوں ہی مکروہ حرکتوں کی حدود سے تجاوز کرتے ہیں، بلکہ اگر اس کی وجہ سے دوسروں کو تکلیف پہنچتی ہے تو یہ دونوں گناہ ہیں۔ جہاں تک متنازعہ دلائل اور تنقید کا تعلق ہے، کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ تکلیف کا باعث نہیں بنتے۔ جس کے ساتھ بحث کی جاتی ہے ، غصے میں آجاتا ہے اور اس طرح کا جواب دینے کی کوشش کرتا ہے اور وہ دونوں کتوں کی طرح لڑنا شروع کردیتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک دوسرے کو اس حد تک نقصان پہنچانا اور ذلیل کرنا چاہتا ہے کہ کوئی سر بھی نہیں اٹھا سکے گا اور نہ ہی ایسا جواب دے سکے گا کہ لوگ مخالف میں عقل کی کمی کا قائل ہو جائیں۔ یہ ایک بیماری ہے اور اس کا علاج اس تکبر کو ختم کرنا ہے جو کسی کو برتری کا احساس پیدا کرنے کی طرف لے جاتا ہے ، اور اس کے اظہار کی جرات بھی ہے اور اسی طرح ، اس وحشی جذبات کو کچل دیا جاسکتا ہے جو کسی کو دوسروں کی طرف دیکھنے پر اکساتا ہے۔

اس کے علاج کی تفصیلات تکبر اور خود تکبر کی مذمت کے باب (باب 10) میں بیان کی جائیں گی۔ یہاں صرف اتنا ہی کہا جائے گا کہ کسی بھی بیماری کا علاج اس بیماری کی وجوہات کو دور کرنے سے ہوگا۔ لوگوں کی گفتگو اور جھگڑا منقطع کرنے کی وجوہات تکبر، تکبر اور وحشی صفات ہیں۔ جب تک ان وجوہات کو دور نہیں کیا جاتا ، بیماری دور نہیں ہوگی۔ جب کوئی کام مسلسل کیا جاتا ہے تو وہ عادت اور دوسری فطرت بن جاتی ہے اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے داؤد طائی رحمہ اللہ سے خلوت اور تنہائی کی وجہ پوچھی۔ اس نے جواب دیا: "میں تنہائی میں رہتا ہوں تاکہ میں دوسروں سے نہ لڑنے کی جدوجہد کر سکوں"۔ امام ابو حنیفہ نے فرمایا: یہ روحانی جدوجہد نہیں ہے، بلکہ یہ لوگوں کے اجتماعات میں جانا، ان کی بات سننا اور خاموش رہنا ہے۔ داؤد الطائی نے کہا کہ انہوں نے اس پر عمل کیا اور محسوس کیا کہ اس سے زیادہ کوئی روحانی جدوجہد نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی حقیقت ہے کیونکہ کسی کو غلط بات سننا اور خاموش رہنا بہت مشکل ہے ، خاص طور پر اس صورت میں جب کوئی اپنی غلطی کو درست کرنے کے قابل ہو۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو جنت کی بشارت دی ہے جو حق و حق پر ہونے کی وجہ سے اب بھی لوگوں کی گفتگو میں خلل نہیں ڈالتا کیونکہ حق و حق کو جاننا، کسی غلط چیز پر خاموش رہنا نفس پر بہت مشکل ہے۔ خاص طور پر مذاہب اور عقائد سے متعلق معاملات میں صحیح بات کے اظہار کی خواہش غالب ہے۔ دلائل پہلے ہی انسان کے مزاج کا حصہ ہیں اور جب کوئی یہ سوچتا ہے کہ صحیح عقائد کو ظاہر کرنے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجر ہے تو دل اس الٰہی انعام اور ثواب کا لالچ ہو جاتا ہے۔ اس طرح، شریعت الٰہی اور کسی کا مزاج دونوں ہی ان متنازعہ دلائل میں مدد کرتے ہیں۔ تاہم یہ سوچنا کہ یہ بحث و مباحثہ خدائی ثواب کا ذریعہ ہے یہ اپنے آپ میں ایک غلطی ہے۔

انسان کے لیے بہتر ہے کہ وہ اپنے ہم مذہبوں سے کچھ بھی کہنے سے باز رہے، اگر کوئی شخص بدعت میں ملوث پائے، تو وہ ایسے شخص کو تنہائی میں نصیحت کرے [جیسا کہ عوامی طور پر ایسا کرنے سے غصہ اور ضد کا باعث بنتا ہے]۔ عوامی مباحثوں کو یہ سوچ کر ایک معمول کے طور پر لیا جائے گا کہ تمام مذاہب اور عقائد کے لوگ اپنے اپنے عقائد کی صداقت کو ثابت کرنے اور اپنے مخالفین کو خاموش کرنے میں ان کی کامیابی پر غور کرنے کے لیے ایسا کرتے ہیں۔ اس سے [مذہبی معاملات میں] بدعت کو کسی کے دل میں مضبوطی سے جڑ جائے گا [اس کو ترک کرنے کے بجائے]۔ اگر کوئی یہ دیکھے کہ نصیحت کا ایمان کے معاملات میں ملوث شخص کے دل پر مطلوبہ اثر نہیں پڑتا اور ایسے شخص میں حق کو قبول کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی تو اسے اپنے نفس کی اصلاح میں مشغول ہونا چاہیے اور دوسرے شخص کو تنہا چھوڑ دینا چاہیے۔ جو شخص بحث و مباحثہ کا عادی ہو اور لوگ ایسے شخص کی تعریف کرتے ہیں اور عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو پھر یہ تخریبی باطنی خوبیاں اس کے دل میں مضبوط اور مضبوط ہو جاتی ہیں اور ان سے چھٹکارا حاصل کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اگر کسی کے دل میں غصہ، تکبر، دکھاو، راستبازی اور تسلط کی خواہش جیسی اندرونی برائیاں جمع ہو جائیں تو ان کے خلاف جدوجہد کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسی ہی ایک خوبی کے خلاف جدوجہد کرنا مشکل ہے، یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ ان سب کے خلاف مل کر جدوجہد کرنا کتنا مشکل ہوگا۔

پانچواں نقصان - دشمنی اور دشمنی: یہ بھی ایک قابل مذمت [باطنی] صفت ہے۔ دشمنی اور عداوت کا بھی اختلاف ہے لیکن اس کا مقصد کسی کی جائیداد یا حق غصب کرنا ہے۔ روایات نے اس گھناؤنی باطنی خصلت یا خوبی کی مذمت کا اظہار کیا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں:

ان ابغض الرجال الی اللہ الالد الخصام

"اللہ تعالیٰ کے نزدیک انسانوں میں بدترین وہ شخص ہے جو جھگڑا کرنے والا اور دشمنی کا شکار ہو۔" (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث کا مجموعہ *صحیح بخاری*)

ایک رشی نے کہا: دشمنی اور دشمنی سے پرہیز کرو کیونکہ وہ خدا کی طرف جانے کا راستہ تباہ کر دیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ پرہیزگار اور پرہیزگار دوسروں سے جھگڑا نہیں کرتے۔ بشار بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ دشمنی اور دشمنی سے بدتر کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ کسی کے ایمان اور خدا کی طرف جانے کا راستہ تباہ کر دیتی ہے، اس کی شرافت اور وقار کو داغدار کرتی ہے، زندگی کی خوشیوں کو ختم کر دیتی ہے، اور دل کو خدائی یاد اور غور و فکر میں مشغول ہونے کے بجائے، دشمنی اور دشمنی کی پریشانیوں میں پھنس جاتا ہے۔ یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر کسی کا حق کسی دوسرے کے حق ہے جو دینے کو تیار نہیں ہے تو اسے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ قابل مذمت تنازعہ یا دشمنی وہ ہے جو جھوٹ پر مبنی ہے یا علم کے بغیر کیا جاتا ہے ، مثال کے طور پر ، ایک وکیل یہ جانے بغیر کسی فریق کی حمایت کرنا شروع کردیتا ہے کہ سچ کہاں ہے۔ اسی طرح وہ جھگڑا یا دشمنی بھی قابل مذمت ہے جس میں کسی کے جائز حق کا مطالبہ کیا جاتا ہے لیکن وہ اس پر متفق نہیں ہوتا بلکہ زیادہ سے زیادہ دشمنی اور دشمنی کا مظاہرہ کرتا ہے کیونکہ اس کا مقصد اپنے حق کا حصول نہیں بلکہ مخالف کو نقصان پہنچانا ہے۔ یہ تنازعہ یا دشمنی بھی قابل مذمت ہے جس میں تکلیف دہ الفاظ کا استعمال شامل ہے حالانکہ کسی کے حق کے اظہار اور کسی کی دلیل کو مضبوط بنانے کے لئے ان کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ جھگڑا یا دشمنی بھی قابل مذمت ہے جو بظاہر حق حاصل کرنے کے لیے ہے لیکن حقیقت میں اس کا مقصد مخالف کی تذلیل اور توہین ہے اور اس کی محرک قوت بغض اور دشمنی ہے۔ اس طرح کے تنازعہ یا دشمنی کی تمام کارروائیاں قابل مذمت ہیں۔ اگر مظلوم کسی دشمنی، مبالغہ آرائی، بغض اور نقصان پہنچانے کی خواہش کے بغیر اپنے دعوے کو شریعت الٰہی کے مطابق بیان کرتا ہے تو اگر حق کے حصول کا کوئی دوسرا راستہ نہ ہو تو یہ حرام نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص بغیر کسی اختلاف کے اپنے حقوق حاصل کرنے کے قابل ہے تو بہتر ہے کہ وہ اس راستے پر نہ جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جھگڑا کرنے میں زبان کو اعتدال کی حدود میں رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ مزید برآں، جھگڑا دل میں بغض پیدا کرتا ہے اور غصے کی آگ تیز ہو جاتی ہے اور جب کوئی غصہ کرتا ہے تو اس سے خدا کے قانون پر عمل کرنے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ تنازعہ کے دوران ایک مرحلہ آتا ہے جب اس کی عقل دل سے غائب ہو جاتی ہے اور دعویدار کے دل میں صرف ایک ہی مقصد باقی رہ جاتا ہے کہ وہ مخالف کو شکست دے اور اس کے حصول کے لیے ہر ممکن طریقے اور حربے استعمال کرے۔ وہ ایک دوسرے کو تکلیف پہنچانے اور ایک دوسرے کے وقار کو توڑنے میں خوش ہیں۔ جو جھگڑا شروع کرتا ہے وہ وہی ہے جو ان تمام جرائم کا ارتکاب کرتا ہے۔ اگر کوئی بہت احتیاط برتتا ہے تو ، ان جرائم سے دور رہنا ممکن ہے ، تاہم ، دل کو پرسکون رکھنا بہت مشکل ہوگا۔ جب تک یہ جھگڑا جاری رہے گا دل اس حد تک پریشان رہے گا کہ دعا کے دوران بھی کسی نہ کسی طرح مخالف کو محکوم کرنے کا خیال رہے گا۔ تنازعہ ہنگامہ آرائی اور برائی کو ہوا دیتا ہے۔ یہی حال بحث و مباحثہ ہے کیونکہ دونوں ہی برائی کو جنم دیتے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ برائی کے دروازے بند کر دیں تاکہ زبان اور دل دونوں جھگڑوں کے اثرات اور اثرات سے محفوظ رہیں اور یہ ایک مشکل معاملہ ہے۔

جھگڑوں، جھگڑوں اور دلائل کی کم سے کم برائی یہ ہے کہ ایک دوسرے سے اچھی طرح سے باتیں کرنے کی روایت ختم ہو جاتی ہے، حالانکہ ایک دوسرے سے گفتگو کرنے کی خوبصورتی خوبصورت بقائے باہمی کا ایک اہم عنصر ہے اور الٰہی اجر کے مستحق ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا

"اور [تمام] لوگوں سے خوبصورت انداز میں بات کریں۔" (سورۃ البقرۃ باب 2 آیت 83)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں سے کوئی آپ کو سلام اور سلام پیش کرے تو آپ کو بھی اس کے بدلے میں سلام اور سلام کہنا چاہیے چاہے وہ مجوس کیوں نہ ہو۔ یہ اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے:

وَإِذَا حُيِّيتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَآ

'جب کوئی آپ کو سلام اور سلام کے ساتھ سلام کرتا ہے تو آپ کو سلام اور سلام کو اس سے بھی بہتر الفاظ میں جواب دینا چاہیے۔' (سورۃ البقرۃ سورۃ البقرۃ آیت 86)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر فرعون مجھ سے کوئی اچھی بات کہہ بھی تو میں بھی اس کا جواب اچھا دوں گا۔

انس بن مالک رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:

ان فی الجنۃ لغرفا یری ظاهرها من باطنها وباطنها من ظاهرها اعدها اللہ تعالیٰ لمن اطعم الطعام والان الکلام

"جنت میں ایسی رہائش گاہیں ہیں جن میں اندر سے باہر کا نظارہ اور اندر سے باہر کا نظارہ بہت واضح طور پر نظر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لیے ایسے گھر تیار کیے ہیں جو [سب کو خاص طور پر ضرورت مندوں] کھانا پیش کرتے ہیں اور [تمام لوگوں کے ساتھ] اپنی گفتگو میں نرمی اختیار کرتے ہیں۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث کا مجموعہ *ترمذی*)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا:

الکلمۃ الطیبۃ صدقۃ

"اچھا کلام صدقہ ہے۔" (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث مجموعہ *صحیح مسلم* صحابہ کرام ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے حکم سے

[دوسروں کے ساتھ] اچھی گفتگو کرنے میں کنجوسی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ شاید، خدا ایسا کرنے کا اجر الٰہی عطا فرمائے۔ یہ ساری بحث [تمام لوگوں کے ساتھ] ایک خوبصورت تقریر اور گفتگو کے بارے میں رہی ہے جو جھگڑے، جھگڑے اور بحث کے برعکس ہے اور ان تینوں کے زمرے میں تمام باتیں ناپسندیدہ، تکلیف دہ اور اشتعال انگیز ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں لوگوں کے ساتھ اچھی گفتگو اور بری گفتگو سے دور رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔

چھٹا نقصان - تقریر میں آرائش اور مصنوعیت: عوامی تقریر کے بہت سے خواہشمندوں کو اپنی گفتگو کو سجانے کی عادت ہوتی ہے۔ وہ طویل تعارف اور آغاز کو انجینئر کرتے ہیں اور انہیں نظموں اور بڑے الفاظ سے سجاتے ہیں۔ یہ مصنوعی پن اور آرائش قابل مذمت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک نبی روایت میں ارشاد ہے:

انا واتقیاء امتی براء من التکلف

"میں اور میری قوم کے پرہیزگار مصنوعی اور آرائش سے دور ہیں۔"

ایک اور روایت میں فرمایا ہے:

ان ابغضكم الى و ابعدكم مني مجلسا الثرثارون المتفيهقون المتشدقون في الكلام

"تم میں سے مجھ سے بدترین اور دور دراز وہ لوگ ہیں جو فضول باتیں کرنے والے، حد سے زیادہ بولنے والے اور گفتگو میں زینت اختیار کرنے والے ہیں۔" (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث مجموعے مسند *احمد* اور *ترمذی* صحابہ کرام ابو ثعلبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

شرار امتي الذين غذو بالنعيم ياكلون الوان الطعام ويلبسون الوان الثياب و يتشدقون في الكلام

"میری امت میں سب سے بدترین لوگ وہ لوگ ہیں جو آسائش و عیش و عشرت میں پرورش پاتے ہیں، ہر قسم کے کھانے پیتے ہیں، ہر قسم کے کپڑے پہنتے ہیں اور گفتگو میں آرائش اور مصنوعی پن اختیار کرتے ہیں"۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *احادیث* کے مجموعے *ابن ابی الدنیا* اور *بیہقی فی الشعب*)

ایک بار اس نے کہا اور اسے تین بار دہرایا:

واهلك المتنطعون

"ہوشیار رہو! مبالغہ آرائی کرنے والے برباد ہو جاتے ہیں۔" (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث مجموعہ *صحیح مسلم* صحابہ کرام عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول پر

گفتگو ایسی ہونی چاہیے کہ سننے والا اسے سمجھ سکے۔ گفتگو اور گفتگو کا مقصد دوسروں کو سمجھانا ہے، کوئی اور چیز بیکار ہے اور مصنوعی اور غیر فطری پن میں شامل ہے جس کی شریعت الٰہی نے مذمت کی ہے اور اس جیسی چیزیں۔ البتہ دینی خطبات میں جو قافیہ عام ہے وہ اس شرط سے مستثنیٰ ہے کہ اس میں کوئی زیادتی اور مبالغہ آرائی نہ ہو۔ واعظ اور نصیحت سے تبلیغ کرنے کا مقصد یہ ہے کہ سننے والے ان کے دلوں میں بھڑک اٹھیں، نیک اعمال کرنے کی ترغیب اور خواہش۔ اس سلسلے میں الفاظ کے اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم ، عام گفتگو میں ، وزن [الفاظ میں] ، قافیہ ، اشارے یا مفہوم کی ضرورت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روز مرہ کی گفتگو میں واعظ کے انداز کو اپنانا سراسر جہالت ہے۔ اس مصنوعیت اور غیر فطری پن کا محرک دکھاوے (*ریا*) ہے اور اس آفت میں ملوث شخص چاہتا ہے کہ لوگ کسی کی تقریر اور فصاحت و بلاغت سے متاثر ہوں اور ایسے شخص کے لیے اپنی تعریف کا اظہار کریں۔

ساتواں نقصان – فحاشی، فحاشی اور فحاشی اور فحش لعنت: یہ بھی [شریعت الٰہی] میں مذمت اور حرام ہے۔ فحاشی اور فحاشی کی ابتدا باطنی برائی اور ذلت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اياكم والفحش فان الله تعالى لا يحب الفحش ولا التفحش

"اپنے آپ کو فحاشی اور فحاشی سے بچاؤ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خدا فحاشی، فحاشی اور فحاشی کو پسند نہیں کرتا۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *صحابہ کرام عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے بارے* میں احادیث کے مجموعے نسائی *اور* حکیم

ایک اور روایت میں فرمایا ہے:

ليس المؤمن بالطعان ولا اللعان ولا الفاحش ولا البذي

"عیب تلاش کرنے والا، لعنت کرنے والا، فحش اور فحش باتیں کرنے والا، اور ضرورت سے زیادہ بات کرنے والا مومن نہیں ہو سکتا۔" (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *صحابہ کرام عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ* سے حدیث *کا* مجموعہ ترمذی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا:

الجنة حرام على كل فاحش يدخلها

"ہر فحش بولنے والے کو جنت میں داخل ہونے سے منع کر دیا گیا ہے"۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث مجموعہ *ابن ابی دنیا* صحابہ کرام عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے حکم پر

احنف بن قیس رحمہ اللہ نے فرمایا: کیا میں تمہیں کسی مہلک بیماری کے بارے میں نہ بتاؤں؟ یہ فحاشی اور بد اخلاق، اخلاق اور باطنی مزاج ہے"۔

شرمناک باتوں کا واضح الفاظ میں ذکر کرنا فحاشی اور فحاشی ہے۔ مثال کے طور پر ، نجی حصوں کے نام لینا اور جماع سے متعلق معاملات کو بیان کرنا۔ جو لوگ بد اخلاق کے مالک ہیں اور فساد کے بیج بونے کی طرف مائل ہیں [خواہ وہ اخلاق، شائستگی اور عام انسانی آداب سے متعلق معاملات میں ہی کیوں نہ ہو]، انہوں نے اس سے متعلق واضح اور فحش تاثرات پیدا کیے ہیں اور انہیں بغیر کسی ہچکچاہٹ اور شرمندگی کے استعمال کرتے ہیں، جبکہ نیک اور نیک خلق لوگ اس طرح کے الفاظ استعمال کرنے سے بچتے ہیں۔ اس کے بجائے، ایسے معاملات میں [جن کا ذکر ایک جائز ضرورت کی وجہ سے ضروری ہے]، وہ بے معنی اور مبہم الفاظ میں بات کرتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ شرم کا مالک ہے۔ وہ مہربان ہے، وہ گناہوں کو معاف کرتا ہے اور [واضح چیزیں] کا ذکر کرتا ہے۔ لہٰذا قرآن مجید کو جماع کے ساتھ چھونے کا مطلب ہے۔ "آنا"، "چھونا" اور "رفاقت" جیسے الفاظ جماع کے لیے مفہوم ہیں [جو قرآن مجید میں ازدواجی تعلقات سے متعلق قواعد بیان کرتے ہوئے استعمال کیے گئے ہیں]۔ ان میں فحاشی اور فحاشی نہیں ہے۔

لوگوں نے اپنے آپ کو "جماعت" سے روکا نہیں ہے ، اس کے بجائے ، اس کی تشریح اور معنی کے لئے ، انہوں نے ایسے تاثرات اور الفاظ ایجاد کیے ہیں جو صرف ان کو سن کر شرمندہ ہوجاتے ہیں اور نفرت کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ الفاظ دوسروں کے مقابلے میں کم فحش ہیں۔ اس سلسلے میں ، عادات ہر ملک اور علاقے کے لئے مختلف ہیں۔ بہرحال فحش اور فحش الفاظ کو کم حد تک ناپسند کیا جاتا ہے اور انتہائی حد تک حرام ہے۔ دونوں درجات کے درمیان کے الفاظ شک و شبہ سے خالی نہیں ہیں [اس لحاظ سے کہ ان کو ناپسند کیا گیا ہے یا شریعت میں حرام کیا گیا ہے]۔ یہ الفاظ صرف جماع سے متعلق نہیں ہیں بلکہ بد فطرت لوگ ایسے الفاظ میں بھی فحاشی کرتے ہیں جن کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ انسانی فضلہ سے متعلق الفاظ اس نوعیت کے ہیں اور واضح طور پر استعمال نہیں کیا جانا چاہئے۔ اسی طرح اگر کسی شخص میں کوئی عیب ہے، مثلا کوڑھ، جلد کی خرابی وغیرہ یا کوئی بیماری ہے تو اس کا ذکر واضح طور پر نہیں بلکہ بے ہودگی سے کیا جانا چاہیے، مثال کے طور پر، فلاں شخص کو کوئی سنگین بیماری یا بیماری لاحق ہے۔ اس بیماری کا واضح تذکرہ فحش ہے [خاص طور پر جب اس میں مبتلا شخص اس کا انکشاف یا ذکر کرنا پسند نہ کرے] اور زبان کے نقصانات میں شامل ہے۔ فحش اور فحش باتوں کا محرک وہ عادت ہے جو طویل عرصے تک اس پر عمل کرنے کے بعد اپنے دل میں پیوست ہے اور گناہ اور فحاشی کے عادی لوگوں کی صحبت ہے۔ ایک مرتبہ ایک بدو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کچھ نصیحت طلب کی تو اس نے فرمایا:

عليك بتقوى الله وان امرو عير ك بشي تعلمه فيه ويكن وباله عليه واجره
لك ولا تسبن شيئا

"خدا سے پرہیزگاری ، تعظیم اور خوف رکھنا جاری رکھیں۔ اگر کوئی آپ میں کوئی چیز [برائی] محسوس کرتا ہے اور آپ کو ناراض کرتا ہے تو آپ کو اس طرح کی کوئی چیز [برائی] دیکھنے کے بعد اس کے بدلے میں کسی کو مذمت نہیں کرنی چاہیے۔ [اگر آپ اس طرح کام کرتے ہیں] یہ ذمہ داری ایسے شخص پر رہے گی اور تمہیں اجر الٰہی ملے گا اور نہ ہی کسی چیز پر لعنت کرو گے۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *احادیث* کے مجموعے *ابن احمد* اور *طبرانی* صحابہ کرام ابو جری نجمی رضی اللہ عنہ کے بارے میں

بدو نے کہا: "اس نصیحت کے بعد میں نے کبھی کسی چیز کو برا نہیں کہا"۔ عیاد بن حمار رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! جو شخص مجھ سے کم درجے کا ہو اور مجھ پر لعنت بھیجے، کیا میں ایسے شخص سے انتقام لے تو کیا کوئی حرج ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

المتسابان شيطانان يتكاذبان ويتهاتران

"دونوں بدسلوکی کرنے والے [ایک جو بدسلوکی کا آغاز کرتا ہے اور دوسرا جو اس طرح کا انتقام لیتا ہے] دو شیطان ہیں جو ایک دوسرے کو جھوٹا اور تردید کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے خلاف بہتان چلاتے ہیں۔" (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *احادیث* کے مجموعے *ابو داؤد طیالسی* اور *مسند احمد*)

آٹھواں نقصان - اللہ *تعالیٰ کی رحمتوں سے علیحدگی کی خواہش کرنا*: رحمت الٰہی سے علیحدگی کی خواہش کرنا [جس کا نتیجہ ہر طرف سے آفتوں کا بارش ہے] چاہے وہ انسان کے لیے ہو، جانور کے لیے ہو یا پتھر کے لیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا يكون المؤمن لعانا

"مومن وہ نہیں ہے جو *لانا* پر عمل پیرا ہو (رحمت الٰہی سے علیحدگی کا خواہاں)۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *صحابی نبوی عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ* پر احادیث *کا* مجموعہ ترمذی

حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "وہ قوم جو ایک دوسرے کی رحمت سے علیحدگی چاہتی تھی وہ عذاب الٰہی کی مستحق ہوگئی۔ ایک روایت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان اللعانين لا يكونون شفعاء ولا شهداء يوم القيامة

"جو لوگ اللہ کی رحمت سے کفر کرنا چاہتے ہیں وہ قیامت کے دن نہ تو شفاعت کرنے والے ہوں گے اور نہ گواہ ہوں"۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *صحابہ کرام ابو الدردہ رضی اللہ عنہ* سے حدیث *کا* مجموعہ صحیح مسلم

لانا *کا مفہوم* اللہ تعالیٰ سے دور کرنا اور دور کرنا ہے۔ اس لفظ کا استعمال کسی ایسے شخص کے ساتھ صحیح ہوگا جس میں وہ خصوصیات ہوں جو کسی کو خدا سے دور کرتی ہیں جیسے کفر اور ظلم۔ اس صورت میں یہ کہنا جائز ہے کہ ظالموں پر اللہ کی لعنت ہو، کافروں پر اللہ کی لعنت ہو، وغیرہ وغیرہ۔ کسی کو خدا کی رحمت سے دور کرنے یا دور کرنے کی خواہش کرنے میں خطرہ ہے۔ یہ ایک حساس کیفیت ہے اور یہ دعویٰ کرنا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو

اپنی قربت سے محروم کر دیا ہے، یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی علم نہیں ہے، یا اگر اللہ تعالیٰ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو آگاہ کر دے تو وہ بھی آگاہ ہو سکتا ہے۔ وہ صفات جو خدا کی رحمت سے دوری اور محرومی کو جنم دیتی ہیں وہ تین ہیں: کفر، قائم شدہ دینی اصولوں اور تعلیمات میں بدعت (انحراف) اور صریح گناہ۔ کسی خاص گنہگار کو رحمت الٰہی سے محروم کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ اس میں بہت بڑا انتشار اور خطرہ ہے۔ بہتر یہ ہے کہ کسی کو گناہ میں ملوث دیکھ کر شیطان کو خدا کی رحمت سے محروم کر دیا جائے کیونکہ شیطان ہی ہے جو لوگوں کو برائی پر اکساتا ہے اور اس پر لعنت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کفر اور کھلے گناہ کو کسی مسلمان سے منسوب کرنا غلط ہے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا یرمی رجل رجلا بالکفر ولا یرمیہ بالفسق الا ارتدت علیہ ان لم یکن صاحبہ کذلک

"اگر کوئی شخص کسی پر کفر کا الزام لگاتا ہے اور وہ شخص ایسا نہیں ہے تو پھر کفر اور گناہ کا یہ الزام الزام لگانے والے پر واپس آجائے گا"۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *صحابی* حضرت *ابوذر رضی اللہ عنہ* کے *مطابق* صحیح بخاری *اور* صحیح مسلم کے مجموعے *میں* احادیث کا مجموعہ ہے

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو سخت ناپسند کرتا ہے جو لوگوں پر کثرت سے لعنت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو نقصان پہنچانے کے لیے *دعا کرنا اور دعا کرنا اللہ کی رحمت کی منحرف ہونے کی خواہش کے قریب* ہے۔ کسی ظالم کے بارے میں یہ کہنا بھی اچھا نہیں کہ خدا ایسے شخص کو بیمار کرتا ہے یا بیماری سے صحت مند نہیں کرتا ہے یا ایسے شخص کو موت کا سبب نہیں بناتا وغیرہ وغیرہ۔ ایک حدیث (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت ہے) کہتی ہے:

ان المظلوم لیدعو علی الظالم حتیٰ یکافئہ ثم یبقی للظالم عندہ فضلۃ یوم القیامۃ

"مظلوم شخص ظالم کو نقصان پہنچانے کی دعا کر کے اپنا انتقام لیتا ہے۔ تب قیامت کے دن ظالم کے لیے جو نقصان ہوتا ہے وہ قیامت کے دن ظالم کے لیے باقی رہ جاتا ہے۔

نویں نقصان - موسیقی اور شاعری: *غزالی کی آٹھویں کتاب "* احیاء العلوم الدین" *یا "خدا کی راہ کی معرفت کا احیاء" کی دوسری جلد یا چوتھائی کتاب میں اس موضوع پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے*۔ غزالی کی عظیم تصنیف کی پہلی جلد [ان کے پیچھے الہی عبادات اور باطنی حکمت کے بارے میں] اور دوسری جلد [ساتھیوں کے ساتھ معاشرتی معاملات کے بارے میں] اس کتاب میں شامل نہیں کی گئی ہے کہ کون سی موسیقی جائز ہے اور کون سا نہیں۔ یہاں اس بحث کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے تو اچھی شاعری اچھی ہے اور بری شاعری بری شاعری ہے۔ تاہم شاعری کے لیے خود کو وقف کرنا اور اسے مشغلہ بنانا اچھا نہیں ہے۔ ایک گنوسٹک سے شاعری کی ایک آیت کے بارے میں پوچھا گیا جس پر اس نے جواب دیا: "شاعری چھوڑ دو اور الٰہی ذکر (ذکر) میں مشغول ہوجاؤ"۔ بہرحال شعر کہنا یا شعر بنانا حرام نہیں ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اس میں ایسی کوئی چیز نہ ہو جو شریعت الٰہی کی حدود سے تجاوز کرے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان من الشعر لحکمۃ

"اس میں کوئی شک نہیں کہ شاعری کے کچھ اشعار حکمت سے بھرے ہوئے ہیں"۔

شاعری کے اشعار عام طور پر تعریف اور مذمت کے موضوعات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ان میں جھوٹ بولنے کے لئے ایک بہت بڑی گنجائش ہے۔ تاہم ، نہ تو صریح مذمت ناپسند کی جاتی ہے اور نہ ہی صریح تعریف۔ تعریف میں کچھ مبالغہ آرائی کی جاسکتی ہے کیونکہ اس میں کچھ سستی ہے۔ مثال کے طور پر ان قسم کی اشعار میں جھوٹ کے *اختلاط* کی وجہ سے حرام کہا جا سکتا ہے:

ولولم يكن في كفه غير روحه لجاد بها فليتق الله سائله

"اگر اس کے پاس روح کے علاوہ کچھ اور نہ ہوتا تو وہ یہ بھی خرچ کرتا۔ جو مانگتا ہے اسے بھی خدا سے ڈرنا چاہیے۔

اگر اس شعر میں جس کی تعریف کی گئی ہے، وہ سخی نہیں ہے تو یہ آیت محض جھوٹ ہے [جسے شریعت الٰہی میں ممنوع قرار دیا گیا ہے]۔ البتہ اگر تعریف کرنے والا حقیقت میں سخی ہو تو اس مبالغہ آرائی کو جائز قرار دیا جائے گا اور شعری شعر کی خوبصورتی کہا جائے گا کیونکہ اس مبالغہ آرائی کا مقصد حقیقت نہیں بلکہ تعریف کرنے والوں کی انتہائی سخاوت کا اظہار کرنا ہے۔ ایسی اشعار کی آیات جن میں اس حد تک مبالغہ آرائی ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کئی بار پڑھی گئی لیکن انہوں نے ان سے منع نہیں کی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ وہ پہیہ گھما رہی تھیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے جوتے سلائی کر رہے تھے کیونکہ وہ انتہائی غربت کا مظہر تھے۔ میں نے اپنی آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو دیکھا کہ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے سورج کی روشنی میں ستاروں کی طرح چمک رہے تھے۔ میں اس طرح کے خوبصورت منظر سے حیران اور حیران رہ گیا۔ اس نے مجھے حیرت سے دیکھا تو اس نے پوچھا: اے عائشہ! تم اتنی حیران کیوں ہو رہی ہو؟" میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ کی پیشانی پر پسینے کے قطرے ستاروں کی طرح چمک رہے ہیں۔ اگر بو کبیر ہذلی (نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے کے زمانے کے مشہور عرب شاعر) نے آپ کو دیکھا ہوتا تو آپ کو اپنے اشعار کا مظہر قرار دیتے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرض کیا: بوکبیر ہذلی کیا کہتے ہیں؟ میں نے انہیں (بوکبیر ہذلی کی شاعری) کے مندرجہ ذیل دو اشعار سنائے ہیں:

ومبرأ من كل غبر حيضة وفساد مرضع وداء مغيل
واذا نظرت الى اسرة وجهه برقت كبرق العارض المتهلل

قابل تعریف حیض کی ناپاکی، نرسنگ کی کمزوری اور تمام بیماریوں سے پاک ہے۔

جب میں ایسے کے چہرے پر باریک تفصیلات دیکھتا ہوں تو وہ بادلوں میں بجلی کی طرح چمک اٹھتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ شعری اشعار سنے تو آپ نے اپنا کام چھوڑ دیا اور میری پیشانی کو چوم لیا اور فرمایا:

جزاك الله خيرا يا عائشة ما سررت مني كسروري منك

اللہ تعالیٰ تمہیں اچھا اجر عطا فرمائے اے عائشہ! آپ شاید مجھ سے کبھی اتنے خوش نہیں ہوئے ہوں جتنا میں اس وقت آپ سے خوش ہوں۔" (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث کا مجموعہ *بیہقی دلیل النبوۃ*

دسواں نقصان - مزاح: یہ بھی حرام اور ناپسند ہے لیکن اگر یہ تھوڑی مقدار میں ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لاتمار اخاک ولا تمازحه

"اپنے بھائی کی گفتگو کو کاٹ نہ دو اور اس سے مذاق نہ کرو"۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث کا *مجموعہ ترمذی*)

اس ضمن میں یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ گفتگو منقطع کرنے اور مداخلت کرنے کی ممانعت کی وجہ سمجھ میں آتی ہے کیونکہ اس میں گفتگو کرنے والے کی توہین اور بے چینی شامل ہے، تاہم مزاح میں کسی کی توہین اور تکلیف نہیں ہوتی اور یہ نیک دل اور اچھے تفریح کا اشارہ ہے۔ پھر اس کی ممانعت کیوں کی جا رہی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ تفریح میں زیادتی اور ان پر استقامت کرنا بھی حرام ہے [کیونکہ اس سے زندگی کے مقصد سے غافل رہنا اور اس سے باز آتا ہے]۔ استقامت کا مطلب یہ ہے کہ دل ہمیشہ کھیل اور مزاح میں مگن رہتا ہے۔ کھیل روا ہے لیکن اس پر ثابت قدم رہنا حرام ہے۔ اس میں زیادتی اور مبالغہ آرائی ہنسی میں اضافہ کا سبب بنتی ہے اور ضرورت سے ہنسی دل کی موت کا سبب بنتی ہے اور اس کے نتیجے میں انسان کا باوقار خوف ختم ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات اس کی وجہ سے دلوں میں دشمنی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر ہنسی ان داغوں سے خالی ہے تو یہ کوئی بری بات نہیں ہے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انی لا مازح ولا اقول الا حقا

"میرے پاس مزاح ہے ، تاہم ، اس میں سچائی کے سوا کچھ نہیں ہے۔"

یہ ان کا امتیاز تھا کہ اچھے مزاح اور تفریح کے مواقع پر بھی وہ اپنی زبان سے صرف سچ بولتے تھے۔ دوسرے لوگ چاہے ان کی دنیاداری سے پرہیز کی کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو، جب وہ مزاح میں قدم رکھتے ہیں تو جھوٹ سے خود کو بچانے سے قاصر ہوتے ہیں۔ ان کا مقصد لوگوں کو ہنسانا ہے ، چاہے یہ کیسے کیا جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جو شخص زیادہ ہنستا ہے وہ اپنی عزت کا خوف کھو دیتا ہے۔ جو مزاح میں مشغول ہوتا ہے ، لوگوں کے دلوں میں اپنی عزت کھو دیتا ہے۔ جو بہت کچھ کرتا ہے ، اس سے پہچانا جاتا ہے۔ جو بہت زیادہ بات کرتا ہے ، وہ اکثر غلطیاں کرتا ہے۔ جو زیادہ غلطیاں کرتا ہے، شرم اور حیا کھو دیتا ہے (*حیا*)؛ جو شرم اور حیا کھو دیتا ہے، وہ اپنے دل کی موت کا سبب بناتا ہے۔ اس کے علاوہ ضرورت سے زیادہ ہنسی آخرت سے غفلت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لو تعلمون ما اعلم لبکیتم کثیرا ولضحکتم قلیلا

"اگر تم جانتے ہو کہ میں کیا جانتا ہوں تو تم زیادہ روئو گے اور کم ہنسو گے۔" (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *صحابہ کرام انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت سے* صحیح بخاری *اور* صحیح مسلم کے *مجموعے* میں احادیث کا مجموعہ ہے [آپ نے یہ بات اس لیے کہی ہے کہ خدا کے ایک مکمل قربت کی حیثیت سے الہی معرفت، حضور الٰہی اور اس سے متعلق الہامی امور نے ان کی روح پر بوجھ ڈالا اور مزاح کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی۔ تاہم ، یہ اس کا امتیاز تھا کہ یہاں تک کہ اس کے باطنی وجود پر بھاری اہم معاملات کے باوجود ، وہ بعض اوقات ہنسنے میں کامیاب ہوجاتا تھا اور ظاہری طور پر انسانی معمول کا احساس برقرار رکھنے میں کامیاب ہوجاتا تھا تاکہ ساتھی انسانوں کے فائدے کے لئے ان کے لئے الہی راستہ روشن کیا جاسکے۔

عطاء السلمی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی زندگی کے چالیس سال بغیر کسی ہنستے ہوئے گزارے۔ وہیب بن الورد رحمہ اللہ نے بعض لوگوں کو عید کے موقع پر ہنستے ہوئے دیکھا اور فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف کر دیا ہے تو یہ ان

لوگوں کا طریقہ نہیں ہے جو اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں اور اگر انہیں الٰہی معاف نہیں کیا گیا تو یہ پرہیزگاروں کا طریقہ نہیں ہے۔ خدا سے ڈرنا اور ڈرنا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "جو شخص گناہ کرنے کے بعد ہنستا ہے وہ روتے ہوئے جہنم میں داخل ہوگا۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ جو ہنسی ناپسندیدہ ہے اس میں آواز آتی ہے۔ مسکراہٹ [جو آواز کے ساتھ نہیں ہے] ناپسندیدہ یا ممنوع نہیں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح مسکراتے تھے۔ قاسم مولا معاویہ سے روایت ہے کہ ایک بدو (صحرائی عرب) سرخ اونٹ پر سوار ہو کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ کو سلام کیا۔ جب بھی وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ پوچھنے کے لیے اس کے قریب جانے کی کوشش کرتے تو اونٹ مشتعل ہو کر اسے لے جاتا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یہ دیکھ کر ہنستے رہے۔ آخر میں بدو اونٹ پر قابو نہ رکھ سکا اور اس سے گر کر مر گیا۔ صحابہ کرام نے کہا: اونٹ نے اپنے سوار کو گرا دیا ہے اور مار ڈالا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ مر گئے لیکن تمہارے منہ اس کے خون سے بھرے ہوئے ہیں۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث کا مجموعہ *ابن المبارک فی الزہد*

ایسی ہنسی جو کسی کی باوقار چمک اور خوف کو نقصان پہنچاتی ہے ممنوع ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جو شخص بہت ہنستا ہے وہ ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے۔ سعد بن العاص رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا: اے بیٹے! کسی باوقار آدمی سے مذاق مت کرو، وہ تم سے نفرت کرے گا۔ اور نہ ہی آپ کو ایک پست [کردار کی خصوصیات میں] اور گھٹیا آدمی کے ساتھ مذاق اڑانا چاہئے کیونکہ وہ آپ پر حوصلہ افزائی اور بہادر ہو جائے گا"۔ عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ سے ڈرو اور مزاح سے پرہیز کرو کیونکہ مزاح دلوں میں برا پیدا کرتا ہے اور برائی کی طرف لے جاتا ہے۔ قرآن مجید کو اپنی بحث کا موضوع بنائیں اور اس کے لیے اجتماعات قائم کریں۔ اگر اس کا آپ پر بہت زیادہ بوجھ ہے تو اچھی بات چیت کریں اور اچھے لوگوں کا ذکر کریں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے پوچھا: کیا تم جانتے ہو کہ مزاح کو مزاح کیوں کہا جاتا ہے؟ انہوں نے نفی میں جواب دیا۔ آپ نے فرمایا: "یہ [اصل لفظ]*'عزہ' سے آیا* ہے جس کا مطلب ہے 'الگ ہوجانا اور دور ہونا' کیونکہ اس کی وجہ سے انسان حق سے دور ہو جاتا ہے، اس لیے اسے 'مزاح' (میزہ) کا نام دیا گیا ہے۔ کچھ گنوسٹکس نے کہا ہے کہ ہر چیز میں کچھ پھل ہوتے ہیں اور مزاح کا پھل دشمنی ہوتا ہے۔ کچھ گنوسٹکس نے کہا ہے: "عقل مزاح کی وجہ سے ختم ہو جاتی ہے اور کوئی اپنے دوستوں سے الگ ہو جاتا ہے"۔

گیارہواں نقصان - تضحیک : کسی کا مذاق اڑانا بھی پسندیدہ عمل نہیں ہے کیونکہ اس سے دوسروں کو تکلیف ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسَىٰٓ أَن يَكُونُوا۟ خَيْرًا مِّنْهُمْ

وَلَا نِسَآءٌ مِّن نِّسَآءٍ عَسَىٰٓ أَن يَكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۖ

"اے ایمان والو! ایک قوم (یا برادری یا لوگوں کے ایک گروپ) کو دوسری قوم پر ہنسنا نہیں چاہیے۔ یہ اچھی طرح سے ہوسکتا ہے کہ جن لوگوں پر ہنسنے والے ہنستے ہیں وہ ان لوگوں سے بہتر ہوسکتے ہیں جو ہنستے ہیں۔ اور نہ ہی عورتوں کو دوسری عورتوں پر ہنسنا چاہیے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ (جن پر ہنستے ہیں) ان سے بہتر ہوں (جو ہنستے ہیں)۔ (سورۃ البقرۃ باب ۴۹، آیت ۱۱)

تضحیک کا مطلب یہ ہے کہ کسی کی غلطیوں کا تذکرہ کیا جائے، جس کا مقصد کسی کی توہین اور تذلیل کرنا ہے، اس طرح کہ سننے والے اس کا مذاق اڑانے پر ہنسیں گے۔ تضحیک الفاظ ، اشاروں ، بدتمیزی اور کسی کے اعمال کی نقل سے کی جاسکتی ہے۔ اگر یہ پیٹھ کے پیچھے کیا جاتا ہے تو یہ غیبت ہے اور اگر کسی کے سامنے کیا جاتا ہے تو یہ طنز اور طنز ہے جو غیبت نہیں ہے لیکن یہ بھی اس سے کم نہیں ہے [جرم کی سنگینی کے لحاظ سے]۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ اس نے کسی کا مذاق اڑایا جس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

والله ما احب اني حاكيت انسانا ولي كذا وكذا

"خدا کی قسم! میں کسی دوسرے انسان کا مذاق اڑانا پسند نہیں کرتا۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *احادیث* کے مجموعے *ابو داؤد* اور *ترمذی*)

مومن کا مذاق اڑانا اور اپنی غلطی یا خرابی پر ہنسنا گناہوں میں سے ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک روایت میں ہمیں ان لوگوں کے آخرت کے انجام کے بارے میں بتایا گیا ہے جو دوسروں کا مذاق اڑاتے ہیں:

ان المستهزئين بالناس يفتح لا حدهم باب من الجنة فيقال لهم هلم
فيجيئ بكربه وغمه فاذا جاء اغلق دونه ثم ليفتح له باب آخر، فيقال له هلم
هلم فيجيئ بكربه وغمه فاذا اتاه اغلق دونه، فما يزال كذلك حتى ان الرجل
ليفتح له الباب فيقال له هلم هلم فلا ياتيه

"(قیامت کے دن) ان لوگوں کے لیے جنت کا دروازہ کھول دیا جائے گا جو ٹھٹھا کرتے ہیں اور ان سے کہا جائے گا کہ اندر آؤ۔ جب وہ اپنی دکھ اور تکلیف کی حالت کے ساتھ دروازے پر پہنچیں گے تو ان کے لیے دروازہ بند ہو جائے گا۔ پھر دوسرا دروازہ کھولا جائے گا ، اور انہیں اندر آنے کے لئے کہا جائے گا۔ وہ اپنے دکھ اور درد کے ساتھ اس دروازے تک پہنچیں گے ، لیکن یہ ان کے لئے بند ہوجائے گا۔ یہ اس وقت تک ہوتا رہے گا جب تک کہ کوئی مرحلہ نہیں آجائے گا جب انہیں اندر آنے کے لئے کہا جائے گا لیکن وہ نہیں آئیں گے [ان کے چہروں پر بار بار دروازے بند ہونے کے بعد اندر آنے کی اجازت دینے سے ان کی مایوسی کی وجہ سے]۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے احادیث کا مجموعہ *ابن ابی الدنیٰ*)

معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت کرتے ہیں:

من عير اخاه بذنب قد تاب منه لم يمت حتى يعمله

"جو شخص اپنے بھائی کو اس گناہ کے بارے میں طعنہ دیتا ہے جس سے اس نے توبہ کی ہے وہ اسی گناہ پر عمل کرنے سے پہلے نہیں مرے گا"۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *حدیث* کا مجموعہ *ترمذی*)

ان تمام روایات کا نتیجہ یہ ہے کہ دوسروں کی توہین، تذلیل اور تضحیک کرنا [شریعت الٰہی] میں جائز نہیں ہے۔ اس آیت نے یہاں تک کہ ایک وجہ بھی پیش کی ہے کہ جن کو آپ برا سمجھتے ہیں، وہ آپ سے بہتر ہو سکتے ہیں۔ کسی پر ہنسنا اس صورت حال میں ممنوع ہے جب اس سے کسی کو تکلیف پہنچے گی ، لیکن اگر کوئی ہنسنے پر خوش ہو تو اسے مزاح میں شامل کیا جاتا ہے۔ مزاح کے بارے میں تفصیلات پچھلے صفحات میں بیان کی گئی ہیں۔ یہاں صرف اتنا ذکر کرنے کی ضرورت ہے کہ جس کا مذاق حرام ہے وہ وہی ہے جو کسی کو تکلیف پہنچاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی گفتگو کے دوران کوئی غلط جملہ یا لفظ کسی کی طرف سے بولا جائے اور کوئی اس پر ہنستا ہو، یا کسی کے لہجے یا انداز گفتگو کا مذاق اڑانے کے لیے، یا کسی غلط ہاتھ سے لکھنے والے شخص کو یہ بتانا کہ ایسا شخص بہت اچھا لکھتا ہے [طنزیہ انداز میں]، یا کوئی لمبا شخص کسی مختصر پر ہنستا ہے، یا کوئی بڑا شخص کسی دبلی پتلی پر ہنستا ہو، یا کسی کے نقصان پر ہنستا ہو، اس طرح کے تمام تضحیک اور طنز [مقدس شریعت میں] حرام ہیں۔

بارہواں نقصان - راز و راز اور خفیہ معاملات کو ظاہر کرنا: کسی کے رازوں اور رازوں کو ظاہر کرنا بھی حرام ہے کیونکہ اس سے دوستوں اور جاننے والوں کے حقوق کی خلاف ورزی بھی ہوتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اذا حدث الرجل الحديث ثم التفت فهي امانة

"اگر کوئی شخص کچھ کہہ کر چلا جاتا ہے تو یہ امانت ہے [جب تک کہ وہ اس کے اشتراک پر راضی نہ ہوجائے]۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *صحابی حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے بارے* میں احادیث *ابوداؤد* اور *ترمذی* کے مجموعے میں

ایک اور نبی روایت میں کہا گیا ہے:

الحديث بينكم امانة

"آپ کی باہمی گفتگو اور معاملات [جو اعتماد میں ہوتے ہیں] ایک امانت ہیں [خفیہ رکھنا]۔" (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے احادیث کا مجموعہ *ابن ابی الدنیٰ*)

حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "کسی بھائی (یا بہن) کی کوئی بات جسے وہ چھپانا چاہتا ہے اسے ظاہر کرنا بے ایمانی اور غبن ہے۔ کسی کے راز کو ظاہر کرنا بے ایمانی ہے اور اگر اس سے کسی کو نقصان پہنچے تو ممنوع ہے اور اگر کسی کو نقصان نہ پہنچے تو بھی یہ کمزوری کی علامت ہے۔

تیرہواں نقصان – جھوٹے وعدے: یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ وعدے کرنے میں زبان سب سے آگے ہے، لیکن نفس ان پر قائم نہیں رہتا اور ان کی تکمیل کے لیے مائل نہیں ہوتا، جس سے وعدہ شکنی ہوتی ہے۔ یہ منافقت کا اشارہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ أَوْفُوا۟ بِٱلْعُقُودِ ۚ

"اے ایمان والو! اپنے وعدے پوری کرو۔" (سورة البقرة آیت ۵)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وعدہ کو تحفہ قرار دیا ہے۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے صحابہ کرام نبی قابث بن عتیم رضی اللہ *عنہ کے بارے میں احادیث* کا مجموعہ طبرانی اوسط اس کے علاوہ بعض دیگر مجموعوں میں بھی ذکر کیا گیا ہے۔ جس طرح تحفہ واپس نہیں لیا جاتا ہے، اسی طرح وعدے سے توڑنا بھی صحیح نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی خصوصیت کا ذکر کیا ہے کہ وہ اپنے وعدوں اور وعدوں پر قائم رہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ثلاث من كن فيه فهو منافق وان صام وصلى وزعم انه مسلم اذا حدث كذب و اذا وعد اخلف، واذا ائتمن خان

"اگر تین چیزیں ہوں تو کوئی منافق ہو جاتا ہے حالانکہ وہ روزہ رکھتا ہے، نماز پڑھتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ وہ مسلمان ہے۔ [سب سے پہلے یہ ہے] بات کرتے ہوئے جھوٹ بولتا ہے، وعدے پورے کیے بغیر کرتا ہے، جب کسی کو امانت سونپی جاتی ہے تو غداری اور بے ایمانی ہوتی ہے۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *احادیث* کے مجموعے *صحیح بوبکاری* اور *صحیح مسلم*)

یہ خصوصیت اس شخص کے لئے ہے جو وعدے کرنے کے بعد ان کو پورا نہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ جو شخص اپنے وعدوں کو پورا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے لیکن بعد میں کوئی رکاوٹ آ جاتی ہے اور اس کے نتیجے میں وہ ان کو پورا کرنے سے قاصر ہے، وہ اس خصوصیت میں داخل نہیں ہوگا اور منافق نہیں کہا جائے گا اگرچہ اس میں منافقت کی شکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس طرح اپنے آپ کو حقیقی منافقت سے بچانا ضروری ہے، اسی طرح منافقت کی مشابہت اور سراغ سے بھی گریز کرنا ضروری ہے۔ کسی بھی ضرورت کے بغیر، کسی کو اپنے نفس کو وعدوں کو پورا کرنے سے معذرت نہیں کرنی چاہیے۔

چودہواں نقصان - جھوٹ بولنا اور قسم کھانا: یہ بھی بدترین خطا اور کبیرہ گناہ ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:

ایاکم والکذب فانہ مع الفجور وھما فی النار وعلیکم بالصدق فانہ مع البر وھما فی الجنة

"اپنے آپ کو جھوٹ بولنے سے بچاؤ جیسا کہ یہ برائیوں کے ساتھ ہوتا ہے اور جھوٹ بولنے والے اور دونوں ہی جہنم میں ہیں۔ اس کے بجائے سچائی کو اختیار کرو جیسا کہ وہ نیک اعمال کے ساتھ ہے اور وہ دونوں جنت میں ہیں۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *احادیث* کے مجموعے *ابن ماجہ* اور *نسائی*)

حسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ظاہری اور باطنی، قول و فعل اور دل میں جو کچھ داخل ہوتا ہے اور جو کچھ نکلتا ہے اسے نفاق کہا جاتا ہے اور اس اختلاف اور نفاق کی بنیاد جھوٹ پر ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

کبرت خیانة ان تحدث اخاک حدیثا ولک بہ مصدق وانت لہ بہ کاذب

انہوں نے کہا کہ اعتماد کی بہت بڑی خلاف ورزی اور بے ایمانی یہ ہے کہ تم اپنے بھائی سے ایسی بات کہتے ہو جسے وہ سچ سمجھتا ہے لیکن حقیقت میں تم اس سے جھوٹ بول رہے ہو۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث کے مجموعے *بخاری فی الادب المفرد* اور *ابو داؤد* رضی اللہ عنہ سفیان بن سعید رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

لا یزال العبد یکذب ویتحری الکذب حتی یکتب عند اللہ کذابا

"بندہ ہمیشہ جھوٹ بولتا ہے اور جھوٹ پھیلانے کی کوشش کرتا ہے یہاں تک کہ اللہ کی طرف سے کسی کو جھوٹا قرار دیا جاتا ہے"۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *احادیث* کے مجموعے *صحیح بوبکاری* اور *صحیح مسلم*)

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّمَا يَفْتَرِي ٱلْكَذِبَ ٱلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِـَٔايَٰتِ ٱللَّهِ ۖ

"جھوٹ باندھنے والے وہی لوگ ہیں جو اللہ کی آیتوں پر ایمان نہیں لاتے (سورة البقرة باب 16 آیت 105)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھ سے چھ باتیں قبول کرو، میں تم سے جنت کا وعدہ کروں گا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: وہ چھ چیزیں کیا ہیں؟ اس نے جواب دیا: "جب تم بولتے ہو تو جھوٹ نہ بولو۔ جب تم وعدہ کرو تو اس سے پیچھے نہ ہٹنا۔ امانت کی خلاف ورزی نہ کریں۔ اپنی نگاہیں (نامناسب چیزوں کو دیکھنے سے) نیچی کرو؛ اپنے پرائیوٹ کی حفاظت کریں۔ اور اپنے ہاتھوں کو [دوسروں کو نقصان پہنچانے سے روکیں]۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے مجموعہ حدیث مستدرک حکیم *اور* خرہ عتی اعلیٰ مکارم الاخلاق)

ایک روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جھوٹ بولنے والے گواہ کی گواہی قبول کرنے سے انکار کر دیا (یہ روایت *حدیث* کے مجموعہ *ابن ابی الدنیا* میں حضرت موسی بن شبیح رضی اللہ عنہ سے نقل ہوئی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جھوٹ اور جھوٹ سے زیادہ کسی صفت کو پسند نہیں کیا۔ چنانچہ جب اسے کسی صحابی کے بارے میں معلوم ہوتا ہے جس میں وہ مبالغہ آرائی کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک ابر آلود ہو جاتا ہے جو اس وقت تک صاف نہیں ہوتا جب تک کہ اسے معلوم نہ ہو کہ اس نے اپنے گناہ کی وجہ سے خدا سے نئے سرے سے توبہ کر لی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی: اے پروردگار! تمہارے بندوں میں سے نیک اعمال کے لحاظ سے کون بہتر ہے؟ جواب آیا: وہ غلام جس کی زبان جھوٹ نہیں بولتی، جس کے دل میں برائی کا خیال نہ آتا اور جس کے شرم میں یا نہیں ہوتا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں بنی اسرائیل کے ایک حکیم لقمان رحمہ اللہ نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: جھوٹ نہ بولو اگرچہ جھوٹ پرندوں کے گوشت کی طرح لذیذ ہے لیکن ایک چھوٹا سا جھوٹ اس کے بولنے والے کو تباہ کر دیتا ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے حق کی حمد میں منقول ہے:

اربع اذا کن فیک فلا یضرک مافاتک من الدنیا صدق الحدیث' وحفظ الامان' وحسن خلق وعفة طعمة

"اگر تمہارے پاس چار خصلتیں ہیں تو جو تمہیں دنیاوی اموال سے نہیں ہے، وہ تمہیں نقصان نہ پہنچائیں گی (یعنی یہ صفات تمہارے لیے دنیا و آخرت میں بلندیوں پر چڑھنے کے لیے کافی ہوں گی]: گفتگو میں سچائی، امانت کی حفاظت کرنا، حسن اخلاق اور طبیعت، اور صرف حلال کھاتے ہیں۔" (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ* پر احادیث *کا* مجموعہ نگاری

جھوٹ بولنے میں ایک علمی ماہر کی طرف سے مذہبی *فتویٰ (فتویٰ* یا غیر پابند مذہبی رائے یا فرمان) بھی شامل ہے جس نے معاملات کی مکمل تحقیقات نہیں کی ہیں۔ اس میں ایک ایسی نبوت روایت بھی شامل ہے جس کی صداقت کی تصدیق نہیں کی گئی ہے کیونکہ [حوالہ] کا مقصد کسی کے علم، فضیلت اور برتری کا اظہار کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "*لا ادری*" یا "میں نہیں جانتا" کہنے میں اسے ذاتی توہین سمجھا جاتا ہے۔ فرامین جاری کرنا اور بغیر کسی تحقیق کے نبوی کی روایات نقل کرنا حرام ہے۔

پندرہواں نقصان - غیبت: اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں غیبت کی مذمت کی ہے اور اسے اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانے کے مترادف قرار دیا ہے [کیونکہ آدم خوری پہلے ہی مکروہ اور حرام ہے اور جب اس میں اپنے مرحوم بھائی کا تعلق ہوتا ہے تو نفرت اور نفرت بہت بڑھ جاتی ہے۔ اس طرح غیبت کی تصویر کشی اس عمل کی نفرت ، نفرت اور ممانعت کو گھر بھیجنے کا ایک الہی طریقہ ہے جو انسانی تعامل میں مقامی معلوم ہوتا ہے]۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَا يَغْتَب بَّعْضُكُم بَعْضًا ۚ أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَن يَأْكُلَ لَحْمَ

أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ

"اور کسی کو دوسرے کی غیبت نہیں کرنی چاہئے۔ کیا تم میں سے کوئی اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا پسند کرتا ہے؟ [نہیں] تم اس سے نفرت کرتے ہو!" (سورۃ البقرۃ باب ۴۹، آیت ۱۲)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

كل المسلم على المسلم حرام دمه وماله وعرضه

"ایک مسلمان کا خون، مال اور عزت سب دوسرے مسلمان پر حرام ہے (کیونکہ یہ مقدس قانون میں مقدس اور ناقابل تسخیر ہیں)۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث کا مجموعہ *صحیح مسلم* ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے

غیبت کسی دوسرے مسلمان یا کسی دوسرے انسان کی عزت کی خلاف ورزی ہے۔ ایک اور نبی روایت میں کہا گیا ہے:

لا تحاسدوا ولا تباغضوا ولا يغتب بعضكم بعضا وكونوا عباد الله اخوانا

"ایک دوسرے میں حسد اور آپس میں دشمنی نہ کرو اور نہ تم میں سے بعض دوسرے کی غیبت کرو۔ [اس کے بجائے] اللہ تعالیٰ کے سچے بندے اور ایک دوسرے کے بھائی بن جاؤ (کیونکہ خدا کے سچے بندوں کے لیے مناسب نہیں کہ وہ اپنی توجہ خدا سے ہٹا کر ادنیٰ نفس کی پست اور گھناؤنی صفات کی طرف ہٹا دیں جو باہمی حسد، عداوت، غیبت اور اسی طرح کے دیگر منفی خصلتوں سے ظاہر ہوتی ہیں)۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *احادیث* کا مجموعہ *صحیح بخاری* اور *صحیح مسلم* ابو ہریرہ اور انس رضی اللہ عنہ سے ہے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا تحقرن من المعروف شيئا ولو ان تصب من دلوك في اناء المستقي، وان تلقى اخاك ببشر حسن، وان ادبر فلا تغتابنه

"دنیا میں کسی بھی اچھی چیز کو حقیر نہ سمجھو، چاہے وہ کوئی ایسی چیز کیوں نہ ہو جیسے کسی پیاسے شخص کے برتن میں پانی ڈالنا جو تم نے کنویں سے نکالا ہے] اور اپنے بھائی (یا کسی اور انسان) سے مسکراتے چہرے سے ملنا اور غیبت نہ کرنا جب وہ غیر حاضر ہو یا تم سے دور ہو کیونکہ اس صورت میں تم اچھی بات ہو کیا آپ کو اپنے آپ کو کسی دوسرے انسان کے لئے کوئی غلط یا نقصان دہ کام کرنے سے روکنا ہے]"۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے احادیث *کا مجموعہ* ابن عبد الدنیا

ایک روایت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی فرمائی: "جو شخص غیبت سے توبہ کرنے کے بعد مر جائے گا وہ سب کے بعد جنت میں داخل ہو جائے گا اور جو کوئی توبہ کیے بغیر مر جائے وہ سب سے پہلے جہنم میں داخل ہوگا۔ صحابہ کرام ایک دوسرے سے شفقت سے ملتے تھے اس کے برعکس منافق بظاہر ایک دوسرے سے ملتے تھے لیکن ان کی پیٹھ کے پیچھے غیبت کرتے تھے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَيۡلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ

"افسوس ہے اس شخص پر جو اپنی پیٹھ کے پیچھے (لوگوں) کی عیبوں کو اٹھاتا ہے۔" (سورۃ البقرۃ باب 104 آیت 1)

ایک بزرگ نے کہا: "ہم نے پاکیزہ پیشروؤں میں سے ان بزرگوں کو دیکھا ہے جنہوں نے نماز اور روزے کو عبادت نہیں سمجھا بلکہ لوگوں کی بے عزتی سے پرہیز کو عبادت سمجھا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب تم کسی دوست کے عیبوں کو بیان کرنے کا ارادہ کرو تو اپنی غلطیوں کو یاد رکھو [پہلے اس سے تمہیں اپنے دوست کی غیبت کرنے سے روکا جائے گا]۔ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ انسانیت کو مخاطب کرتے تھے کہ اے بنی آدم ! آپ ایمان کی حقیقت کو اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے اور سمجھ نہیں سکتے جب تک کہ آپ لوگوں کو اپنے اندر موجود عیب کے لیے برا کہنا چھوڑ دیں اور پہلے اپنے اندر اس کی اصلاح نہ کریں۔ جب آپ اپنے [نچلے نفس] کی اصلاح میں مصروف ہو جائیں گے تو صرف یہی آپ کے لیے کافی مصروفیت ہو گی، اور آپ کو دوسروں کی غلطیوں پر ایک نظر ڈالنے کے لیے کوئی فارغ وقت نہیں ملے گا۔ اللہ تعالیٰ کے سب سے پیارے بندے ایسے ہی لوگ ہیں۔ مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے شاگردوں اور اصحاب کے ساتھ ایک مردہ کتے کے پاس سے گزرے۔ کسی نے کہا: 'اس [مردہ] کتے میں بہت بدبو ہے'۔ اس نے کہا: اس کے دانت کتنے سفید ہیں! چنانچہ انہوں نے ان کو کتے کی غیبت کرنے سے منع فرمایا اور انہیں نصیحت کی کہ وہ خدا کی مخلوقات کی خوبیوں کا ذکر کریں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: خدا کے ذکر میں مشغول رہو، اس میں شفا ہے۔ لوگوں کا ذکر نہ کرو، اس میں [باطنی روحانی] بیماری ہے [کیونکہ لوگ غیبت، بہتان بازی، تضحیک اور ان سے ملتے جلتے دیگر باطنی امراض کا شکار ہو جاتے ہیں]۔

غیبت کا مفہوم اور اس کی حدود: غیبت کی تعریف یہ ہے کہ غیبت کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ اگر کوئی اسے سنتا ہے تو اسے برا سمجھتا ہے [اور اس طرح کی بات کرنا پسند نہیں کرے گا]۔ چاہے یہ ذکر کسی جسمانی خرابی سے متعلق ہو یا اخلاقی برائیوں سے، چاہے کسی کی بات کو نشانہ بنایا جائے یا کسی کے اعمال سے، چاہے کسی کے نام پر یا کسی کے نسب [یا نسل] میں غلطیاں اٹھائی جائیں، چاہے کسی کے ایمان سے متعلق معاملات میں ہوں یا کسی کے دنیاوی معاملات میں۔ جسم کی خرابی یہ ہے کہ کسی کو اندھے ، ٹیڑھی آنکھوں والا ، گنجا ، چھوٹا ، لمبا ، سیاہ یا پیلا کہا جائے یا کسی کو کسی اندرونی خصوصیت سے جوڑا جائے ، جس کی موجودگی کو برا سمجھا جاتا ہے۔ اپنے نسب میں خامیاں تلاش کرنا اپنے والد کو غلام، گنہگار، حقیر، جوتا مرمت کرنے والا، یا کسی ناپسندیدہ پیشے سے تعلق رکھنے والا کہہ کر کیا جاتا ہے۔ کسی کو بد مزاج ، کنجوس ، مغرور ، دکھاوے ، کم مزاج ، بزدل ، کمزور ، عاجز ، مسترد یا اس طرح کی کسی اخلاقی برائی میں ملوث کہہ کر اخلاقی خامیاں ۔ اپنے ایمان اور دین میں عیب تلاش کرنے کا عمل چور، جھوٹا، شرابی، بددیانت، ظالم، عبادت اور روزے جیسے عبادات الٰہی کے کاموں میں سستی کرنے والا، رکوع اور سجدہ کرنے والا (رسمی نمازوں میں) اچھا نہیں کہتا، یا وہ شخص جو غیبت اور بری باتوں سے پرہیز کر اپنے روزے کی حفاظت نہیں کرتا ہے [کیونکہ یہ برائیاں کسی کے روزے کو نقصان پہنچاتی ہیں جو حاصل کرنے کا عمل سمجھا جاتا ہے روحانی تطہیر)۔ کسی کے دنیاوی معاملات میں غلطی تلاش کرنے کا کام اس طرح کی ہوتی ہے جیسے کسی کو بداخلاق، بدتمیز، لوگوں کے حقوق سے انکار کرنے والا، قبضہ کرنے والا، باتچی، لالچی، سونے والا، عجیب و غریب اوقات میں سونے والا، جہاں بیٹھنا نہیں چاہیے۔ کپڑوں میں غلطی تلاش کرنا یہ کہہ کر کیا جاتا ہے کہ آستین بہت چوڑی ہے ، قمیض بہت چوڑی ہے ، کپڑے گندے اور گندے ہیں۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ مذہبی معاملات کے بارے میں لوگوں سے کچھ کہنا [جیسے ملامت اور مذمت] غیبت کے مترادف نہیں ہے کیونکہ یہ کسی ایسی چیز کی مذمت ہے جسے خدا ناپسند کرتا ہے۔ اگر کوئی گنہگار ہے اور اپنے گناہوں کی وجہ سے اسے اس کے گناہوں کی وجہ سے بلایا جاتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہ دلیل غلط ہے کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی برائیوں کا تذکرہ عیب تلاش کرنے یا توہین کرنے کے مقصد سے نہیں کیا بلکہ ان کا مقصد دینی امور اور احکام سے واقفیت حاصل کرنا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اجتماع کے علاوہ کسی اور اجتماع میں ان کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ایک علمی اتفاق رائے ہے کہ غیبت کا نتیجہ یہ ہے کہ کسی کے بارے میں کچھ کہنا ہے جو اگر کوئی سنتا ہے تو اس کے

بارے میں برا محسوس ہوتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیبت کی تعریف اس طرح کی ہے اور اگر کوئی دوسرے کا اس طرح ذکر کرے تو وہ غیبت کا مرتکب ہو گا، اپنے رب کی نافرمانی کر دیا جائے گا اور اپنے بھائی کا گوشت خور ہو گا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کرام سے پوچھا: کیا تم جانتے ہو کہ غیبت کس چیز کو کہا جاتا ہے؟ انہوں نے کہا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جاننے والے ہیں۔ آپ نے فرمایا: اپنے بھائی کے معاملات کا ذکر کرنا جس کا ذکر کرنا ناپسند کرتا ہے (غیبت ہے)۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: اگر مذکورہ چیز (جو طبیعت میں بری ہے اور اسے اس کا ذکر کرنا ناپسند ہے) واقعی اس میں موجود ہو تو کیا ہوگا؟ آپ نے جواب دیا: "اگر یہ [درحقیقت] اس میں موجود ہے تو یہ [بالکل وہی ہے] جو غیبت کے بارے میں ہے ورنہ [اگر یہ اس میں موجود نہیں ہے] تو یہ [بے بنیاد] الزام ہے [جو اس سے بھی بدتر ہے]"۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث کا مجموعہ *صحیح مسلم* ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے

غیبت صرف زبانی طور پر نہیں کی جاتی ہے ، بلکہ ہر عمل غیبت پر مشتمل ہوتا ہے جو کسی دوسرے شخص کی غلطی کو ظاہر کرتا ہے ، چاہے وہ اشارے سے ہو ، بے ہودہ ہو یا کسی واضح یا غیر واضح [جسمانی] حرکت کے ذریعے۔ غیبت کے سلسلے میں ہر وہ چیز حرام اور ناجائز ہے جو واضح طور پر بیان کی گئی ہے، مبہم طور پر بیان کی گئی ہے، لفظ، عمل، بے معنی اور اشارے کی گئی ہے۔ وہی [غیبت کی ممانعت کے بارے میں] کسی کی نقل پر لاگو ہوتا ہے، مثال کے طور پر، کسی ایسے شخص کی نقل کرنا جو [کسی کی ٹانگ میں معذوری کی وجہ سے] لنگڑاتا ہے، غیبت سے بھی بدتر ہے۔ غیبت تحریری طور پر بھی کی جا سکتی ہے کیونکہ لکھنا بھی تقریر کی طرح اظہار کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ اگر کوئی مصنف (یا مصنف کسی بھی شکل یا شکل میں کسی بھی صورت میں لکھنے) اپنی تحریر میں کسی کا نام لے کر اس کے عیبوں کا ذکر کرے [یہ اب بھی غیبت ہے] سوائے اس کے کہ وہ کسی معقول وجہ سے کیا گیا ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی دوسرے شخص کے کسی کام کو ناپسند کرتے تھے تو وہ یہ نہیں کہتے تھے کہ فلاں فلاں کام کرتا ہے، بلکہ فرماتے تھے کہ لوگوں کو کیا ہوا ہے کہ وہ فلاں کام کرتے ہیں؟ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *احادیث* کا مجموعہ *ابو داؤد* حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا

علماء اور علماء کی طرف سے غیبت: بدترین غیبت علماء اور علماء کی طرف سے غیبت ہے جو دکھاوے کی طرف مائل ہیں، کیونکہ وہ نیک لوگوں کی حیثیت سے اپنے مقصد کا اظہار کرتے ہیں [لیکن اس کے باوجود خدا اور دین کے نام پر دوسرے لوگوں کو خود راستباز طریقے سے طنز کرتے ہیں] اور لوگ (عام اور عام لوگ) یہ سمجھتے ہیں کہ وہ (یعنی، علماء کرام اپنی جہالت کی وجہ سے غیبت نہیں کرتے، کیونکہ وہ نہیں جانتے کہ ایسے علماء بیک وقت دو گناہ کر رہے ہیں، ایک غیبت کا اور دوسرا (دوسروں کو ان کے گناہوں اور غلطیوں کی وجہ سے دوسروں کو دکھا کر) ظاہر کرنا۔ چنانچہ جب ان کے سامنے کسی شخص کا ذکر کیا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں: اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہم پر اس کی نعمتوں کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں بادشاہوں کی زیارت کی آزمائش میں نہیں ڈالا اور ہمیں دنیا کی تلاش کی ذلت سے بچا لیا۔ یا پھر دعا کی شکل میں کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ایسی بے عزتی اور ذلت سے بچائے۔ ان کا مقصد دوسروں کے عیبوں کو ظاہر کرنا ہے لیکن اس کے لیے بعض اوقات وہ شکر گزاری کے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور کبھی دعا و دعا کی صورت اختیار کرتے ہیں لیکن ان کا مقصد نہ تو دعا ہے اور نہ ہی الٰہی شکر گزاری۔ کبھی کبھی غیبت کرنے سے پہلے کسی کی تعریف کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ کہیں گے: فلاں شخص بہت اچھا ہے، ایسا شخص کتنی ہی عبادت کرتا ہے لیکن اس کی ایک بری صفت ہے اور صرف وہ شخص ہی نہیں، ہم سب اس بری صفت میں ملوث ہیں جو صبر اور اطمینان کی کمی ہے۔ بظاہر ، اس میں ان کی اپنی مذمت ہے ، لیکن یہاں مقصد ان کے اپنے نچلے نفس کی مذمت نہیں ہے ، بلکہ کسی اور کی غلطی کو ظاہر کرنا ہے۔ تاہم، اس کے لیے یہاں جو انداز اپنایا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ سامعین کو ان کی عاجزی اور خلوص پر قائل کیا جائے تاکہ انہیں راستبازوں میں شمار کیا جا سکے۔ اس طرح کے 'عالم' نے [ایسا کرنے میں] تین گناہوں کو یکجا کیا ہے - غیبت کرنا، دکھاوا اور نفس کی تطہیر کا دعویٰ کرنا- دوسرے لفظوں میں، اپنے آپ کو راستبازوں میں شمار کرنا [اپنے آپ کو پرہیزگاری سے منسوب کر کے اپنے آپ کو غرور کی خود فریب کی حالت میں منسوب کرنا جو بدلے میں اندرونی روحانی کشمکش اور تبدیلی میں رکاوٹ بنتا ہے] اور حماقت کی وجہ سے، اپنے آپ کو غیبت سے پاک سمجھتا ہے۔

شیطان ایسے لوگوں کا بہت آسانی سے شکار کرتا ہے۔ یہ لوگ صحیح علم سے عاری ہیں اور نفسیں ان کو مسلسل دھوکہ دیتی ہیں۔ بعض اوقات وہ اپنے ساتھی کے بارے میں غیبت سننے پر توجہ دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے لیے تمام کمال ہے (کیونکہ وہ کسی بھی غلطی اور عیب سے پاک ہے)! یہ بہت عجیب ہے!" یہاں خدا کا نام خدائی عظمت اور جلال کے اظہار اور اعتراف کے طور پر نہیں لیا جاتا بلکہ ان کی اپنی اندرونی برائی کے اظہار کے طور پر لیا جاتا ہے۔ بعض اوقات غیبت کے لیے استعمال ہونے والا جملہ یہ ہوتا ہے: "ہم اپنے دوست کی فلاں حالت سے بہت غمگین اور غمگین ہیں۔ خدا انہیں سکون عطا فرمائے"۔ [خدا سے] غم اور التجا کا یہ اشتراک رحم کے [سچے] جذبات کے ساتھ نہیں کیا جاتا ہے، بلکہ کسی کی اپنی برتری کے اظہار کا مقصد ہوتا ہے۔ اگر واقعی دعا کا ارادہ تھا تو وہ اسے عوامی اجتماع میں کرنے کے بجائے اپنی نماز کے بعد تنہائی میں کرتے۔ اسی طرح ، اگر وہ واقعی دکھی ہوتے تو ، وہ ان لوگوں کے سامنے اس کا اظہار نہیں کرتے جو اس سے ناواقف تھے۔ کبھی کبھی وہ کہتے ہیں: "کیا افسوس ہے! فلاں شخص بڑی مصیبت میں مبتلا ہے خدا ہمیں اور اسے توبہ کرنے کی صلاحیت عطا فرمائے!" ظاہر ہے کہ یہ ایک دعا ہے لیکن اللہ ان کی برائیوں سے خوب جانتا ہے اور جانتا ہے کہ ان کے دلوں میں کیا ہے اور وہ اپنی نادانی سے نہیں جانتے وہ ثواب کے *بجائے* عذاب کے مستحق ہو گئے ہیں۔ غیبت سننا اور اس پر حیرت کا اظہار کرنا بھی غیبت ہے کیونکہ غیبت کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ غیبت کا سننے والا غیبت کے گناہ میں شریک ہے یہاں تک کہ اسے زبان سے روک دے۔ اگر کسی میں اس کو روکنے کی ہمت اور طاقت نہ ہو تو اسے دل میں برا سمجھنا چاہیے یا اٹھ کر اس اجتماع کو چھوڑ دینا چاہیے یا موضوع بدلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ان حالات میں سننے والے کی طرف سے کوئی حساب کتاب نہیں ہوگا۔ اگر کوئی شخص اسے زبان سے روکتا ہے اور دل میں اسے سننے کی خواہش رکھتا ہے تو یہ نفاق ہے۔ فیصلہ کا معیار دل ہے۔ جب وہ گناہ کو دل میں برا سمجھتا ہے تو وہ گناہ سے محفوظ رہے گا۔ جہاں تک دل میں اس کی ممانعت کا تعلق ہے، اس کی واضح طور پر ممانعت کرنا اور مذکور کا دفاع کرنا ضروری ہے۔

غیبت کی وجوہات: غیبت کی بے شمار وجوہات ہیں، لیکن یہ سب گیارہ وجوہات کے دائرے میں آتے ہیں۔ ان میں سے [پہلے] آٹھ کا تعلق عام لوگوں سے ہے اور [آخری] تین کا تعلق ممتاز (غیر معمولی) لوگوں سے ہے۔

پہلا سبب - دشمنی اور بغض : ایک ایسا واقعہ پیش آتا ہے جس سے دل میں غصے کی آگ بھڑک اٹھتی ہے اور جب ایسا ہوتا ہے تو یہ صرف غصے کا سبب بننے والے کے عیبوں کا ذکر کرنے سے ہی بجھ جاتا ہے، چاہے یہ تذکرہ غصے میں مبتلا شخص نے کیا ہو یا کسی اور۔ بعض اوقات غصے پر قابو پانے میں کامیاب ہو جاتا ہے، لیکن دل میں بغض رہتا ہے جو غصے سے بھی بدتر ہوتا ہے، کیونکہ دل میں بغض اور دشمنی باقی رہ جاتی ہے، غیبت کی مستقل بنیاد رکھتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دشمنی اور بغض دونوں ہی غیبت کی وجوہات ہیں۔

دوسرا سبب - دوسروں سے متفق ہونا: دوسرے لفظوں میں، دوستوں اور ساتھیوں کے دعووں سے متفق ہونا اور ان کی تصدیق کرنا اور ان کو کرتے ہوئے دیکھ کر خود اس میں مشغول ہونا اور ان کی مدد کرنے اور ان سے متفق ہونے کی ضرورت محسوس کرنا۔ چنانچہ جب کسی محفل میں لوگ کسی کی عزت اور تضحیک کا مذاق اڑاتے ہیں تو یہ سوچتا ہے کہ اگر کوئی اس میں شرکت سے انکار کرے گا، اس سے اختلاف کرے گا، موضوع بدل دے گا یا چلا جائے گا تو وہ پریشان ہو جائے گا اور ایسے شخص سے نفرت کرنے لگے گا۔ اس سوچ کے ساتھ ، کوئی بھی ان سے متفق ہے اور اسے معاشرتی معاملات اور یکسانیت کی ایک اہم بنیاد سمجھتا ہے۔ بعض اوقات کسی کے ساتھی غصے سے کسی کی غیبت کرتے ہیں۔ کوئی شخص ان کی طرح غصے کا بہانہ کرتا ہے اور غیبت میں الجھ جاتا ہے اور اس عمل سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہر حالت میں اپنے دوستوں کے ساتھ ہے، چاہے وہ خوشی ہو، غم ہو، پریشانی ہو یا سکون۔

تیسرا سبب: احتیاط اور پیشگی حرکت: بعض اوقات یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ کوئی شخص اس پر نظر رکھے ہوئے ہے اور ایسا شخص کسی اہم شخص کے سامنے غیبت کرے گا یا بعض معاملات میں کسی کے خلاف گواہی دے گا۔ ان غلط فہمیوں اور خدشات کی وجہ سے ، کوئی بھی ایسے شخص کو بے نقاب کرنا اور نشانہ بنانا شروع کردیتا ہے تاکہ ایسے شخص سے کیا توقع کی جاتی ہے اس کو کم کیا جائے اور [فعال طور پر] [ایسے فرد] کو بدنام کیا جائے۔ پہلے

تو کسی دوسرے شخص کے بارے میں بھی صحیح باتیں کہہ سکتے ہیں، تاکہ وہ ایسے شخص کے بارے میں صحیح معلومات فراہم کرنے کی شہرت پیدا کر سکے، اس لیے بعد میں وہ اس شخص کے خلاف جھوٹ اور افواہیں پھیلا سکتا ہے [جھوٹ پھیلانے کا شبہ کیے بغیر] اور دعویٰ کر سکتا ہے کہ "جھوٹ میری فطرت میں نہیں ہے اور جو میں نے اس شخص کے بارے میں پہلے کہا ہے، یہ سچ ثابت ہوا اور اب جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ بھی سچ ہے۔ کوئی سوچتا ہے کہ اس طرح کی پیشگی منصوبہ بندی اور احتیاط کی وجہ سے انسان محفوظ ہو جائے گا کیونکہ جس شخص سے ڈر دیا جا رہا ہے وہ اس کے خلاف بولنے کی ہمت نہیں کرے گا اور اگر کوئی ایسا کرے گا تو اسے اہمیت نہیں دی جائے گی اور نہ ہی اس پر یقین کیا جائے گا۔

چوتھی وجہ - غلط کاموں سے استثنیٰ: بعض اوقات غیبت کا مقصد گناہوں سے استثنیٰ ظاہر کرنا ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ، کوئی دعویٰ کرتا ہے کہ غلط کام کرنے میں کوئی تنہا نہیں ہے۔ اگر کسی کی استثنیٰ کا ارادہ تھا تو ، کسی اور کا حوالہ دیئے بغیر [غلط کام کرنے کے لئے] اپنی وجوہات کا ذکر کرنا چاہئے۔ چونکہ کسی دوسرے شخص کو شامل کرنے سے کسی کی دلیل مضبوط ہو جاتی ہے، اس لیے اس میں دوسرا شخص شامل ہو جاتا ہے۔

پانچواں سبب - تکبر اور تکبر کا اظہار: یہ دوسروں میں عیب تلاش کرکے اپنی برتری ظاہر کرکے کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ بیان دینا کہ فلاں شخص جاہل ہے، اس کی سمجھ ناقص ہے اور اس کی زبان کمزور اور بیکار ہے۔ اس طرح کی تنقید کا مقصد یہ ہے کہ کسی کے پاس دوسرے پر اپنی برتری ظاہر کرنا اور یہ ثابت کرنا ہے کہ کسی کے پاس دوسرے سے زیادہ علم ہے، اس میں فہم کی طاقت ہے اور اس کی تقریر اچھی ہے۔ یہ تنقید لوگوں کو اپنی طرح کسی اور کی عزت کرنے سے روکنا اور دوسرے کو معاشرے میں نمایاں مقام حاصل کرنے سے روکنا ہے۔

چھٹا وجہ - حسد: بعض اوقات حسد کسی کو غیبت پر اکساتا ہے کہ لوگ حسد کرنے والوں کی تعریف کر رہے ہیں، محبت کر رہے ہیں اور ان کی عزت کر رہے ہیں۔ کوئی بھی اسے برداشت نہیں کر سکتا اور چاہتا ہے کہ یہ نعمتیں حسد کرنے والوں سے چھین لی جائیں اور لوگ حسد کرنے والوں سے نفرت اور بے عزتی کرنے لگیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے رشک کرنے والوں کی خامیوں کی نشاندہی کرنا شروع کر دیتا ہے۔ حسد دشمنی اور بغض کے علاوہ ایک اور حالت ہے ، جو اس وقت سامنے آتی ہے جب دوسرا شخص کسی کے خلاف کچھ زیادتی کا ارتکاب کرتا ہے اور وہ انتقام کا مظہر ہوتا ہے۔ حسد میں [انتقام کا] عنصر نہیں ہے۔ کبھی کبھی کوئی اپنے مہربان دوست اور قریبی ساتھی پر بھی رشک کرنے لگتا ہے۔

ساتویں وجہ - مذاق اڑانے والا: دوسرے لفظوں میں ، کسی کی غلطیاں [سماجی] اجتماع میں دلچسپی پیدا کرنے اور اچھا وقت گزارنے کے لئے شرکاء سے ہنسنے کے لئے سامنے لائی جاتی ہیں۔

آٹھواں وجہ - توہین کاری: بعض اوقات غیبت کسی دوسرے شخص کی تذلیل اور تذلیل کے طور پر کی جاتی ہے۔ یہ مغرور لوگوں کی پہچان ہے۔ اس میں دوسرے شخص کے موجود ہونے یا نہ ہونے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ کچھ لوگ اپنے سامنے بیٹھے ہوئے شخص پر تنقید کرتے ہیں اور اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور یہ سوچے بغیر کہ وہ کتنی ذلت کا باعث بن رہے ہیں اور اگر وہ دوسرے شخص کی جگہ ہوتے تو ان کا کیا ہوتا۔

ممتاز لوگوں سے متعلق غیبت کے اسباب: یہ تینوں بہت لطیف اور پیچیدہ ہیں۔ یہ خالص برائی ہیں، لیکن شیطان ان میں لالچ پیدا کرتا ہے کہ یہ سب اچھے ہیں یا ان میں کچھ اچھائی ہے لیکن شیطان ان میں برائی کو ملا دیتا ہے۔

پہلا وجہ - حیرت: بعض اوقات کوئی مذہبی شخص غلطی کرتا ہے تو حیرت کے اظہار کے طور پر کہتا ہے: "ہم اس شخص کے اس طرح کے عمل پر حیران ہیں۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا"۔ یہ درست ہے کہ کسی مذہبی شخص کی غلطی حیرت کا باعث ہوتی ہے لیکن یہ بیان دینے والے کو حیرت کے اظہار میں کسی کا نام نہیں لینا چاہیے۔ شیطان نے اس مذہبی جذبات کو غیبت میں بدل دیا اور کسی کو نام لینے پر اکسایا اور کسی کو گناہ میں ڈال دیا۔ اسی طرح غیبت میں بھی یہ کہنا شامل ہے: "فلاں شخص کے لیے یہ حیرت کی بات ہے کہ کوئی شخص ایسے بدصورت شخص سے محبت کرتا ہے یا پڑھا لکھا شخص ہونے کی وجہ سے فلاں جاہل کے پاس جاتا ہے"۔

دوسرا وجہ – ہمدردی اور ہمدردی کے احساسات: دوسرے لفظوں میں انسان کسی کی کیفیت پر غمگین ہو جاتا ہے اور اس شخص کو کسی بری چیز میں ملوث دیکھ کر کہتا ہے: "ایسے شخص کی موجودہ حالت نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔ مجھے اس شخص کی حالت پر افسوس ہے۔" پچھتاوے کا دعویٰ درست اور قابل ستائش ہے، لیکن نام لینے سے یہ برا بنا دیا گیا تھا اور ایک اچھا جذبہ غیبت کا سبب بن گیا تھا۔ کسی مسلمان کی غلطیوں پر پچھتاوا کرنا اور کسی کے لیے ہمدردی کا احساس کرنا اچھی بات ہے لیکن شیطان انسان کو نام لینے پر اکساتا ہے اور اس لیے برائی کو کسی چیز میں اچھائی میں ملا دیتا ہے۔

تیسرا سبب - خدا کی خاطر غصہ: کسی کو کسی بے حیائی میں ملوث دیکھنا یا کسی کے بارے میں کچھ برا سننا، ایمان کے محرک کی وجہ سے غصے کا سبب بن سکتا ہے۔ اگر غصہ آ گیا اور نام لے کر اظہار کیا گیا تو یہ عمل نہ صرف خدا کے جزا سے محروم ہو جائے گا بلکہ اس کے برعکس غیبت کا سبب بھی بنے گا۔ نیکی پر آمادہ کرنے اور برائی سے نصیحت کرنے کا غصہ اچھا ہے لیکن اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ اگر کسی شخص کے ساتھ اس کا اظہار کرنے کی ضرورت ہو تو یہ اس طرح کیا جائے کہ کسی اور کو اس بات کا علم نہ ہو کہ یہ کس کے لیے ہے۔ اگر نام لینا ضروری ہو تو غصے کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔ یہ وہ باریکیوں ہیں جن سے نہ صرف عام لوگ بلکہ علماء بھی اس سے واقف نہیں ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اگر حیرت، احسان اور غضب اللہ کی خاطر ہے تو نام لینے میں کوئی حرج نہیں ہے جو کہ ایک غلط قیاس ہے۔

غیبت کا علاج: تمام مضر باطنی رجحانات، صفات اور گھناؤنی عادات کا علاج علم اور اعمال کے امتزاج سے کیا جا سکتا ہے۔ ان بیماریوں کے علاج کے لیے صرف علم ہی کافی نہیں ہے اور نہ ہی صرف اعمال۔ ہر بیماری کی دوا اس بیماری کی وجہ کے برعکس ہوتی ہے۔ سب سے پہلے ہمیں غیبت کی وجوہات تلاش کرنی چاہئیں اور پچھلے صفحات میں اس کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ زبان کو غیبت سے روکنے کے دو طریقے ہیں: ایک مختصر اور دوسرا تفصیلی طریقہ۔

غیبت کے علاج کا مختصر طریقہ: وہ یہ ہے کہ انسان کا یہ پختہ یقین ہے کہ وہ غیبت سے خدا کی ناراضگی حاصل کر لیتا ہے اور قیامت کے دن اس کے نتیجے میں نیک اعمال ضائع ہو جائیں گے، کیونکہ غیبت کرنے سے غیبت کرنے والے کی نیک اعمال اس شخص پر منتقل ہو جاتی ہیں جس پر بہتان لگایا گیا ہو۔ اگر کسی کے پاس کافی نیک اعمال نہ ہوں تو مظلوم کے گناہ غیبت کرنے والے کے اکاؤنٹ میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ مزید برآں، کوئی شخص اپنے بھائی کے خلاف غیبت کر کے اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانے کے مترادف ہو جاتا ہے، [رشتہ میں، ایمان میں یا انسانیت میں، یعنی کسی بھی فرد]۔ یہ ذلت کتنی بڑی ہے؟ اگر کسی کے اعمال کے حساب میں نیک اور برے دونوں ہوں لیکن برے اعمال کا ترازو زیادہ ہو تو یہ شخص جہنم میں جائے گا۔ فرض کیجئے کہ ایک شخص کے دو ترازو برابر ہیں۔ واقعات کے افسوسناک موڑ میں ، اس شخص کے ایک گناہ نے غیبت کی وجہ سے برے اعمال کا ترازو جھکا دیا اور اسے جہنم کا مستحق بنا دیا۔

جب کوئی شخص خوف سے غیبت کے بارے میں جو تنبیہات دی گئی ہیں ان پر نظر ڈالے جائیں تو زبان غیبت کرنے پر راضی بھی نہیں ہوتی۔ یہ حکمت عملی بھی مفید ثابت ہوسکتی ہے کہ غیبت کرنے سے پہلے خود پر ایک نظر ڈالے۔ شاید کوئی شخص اپنے اندر کوئی عیب ڈھونڈ سکتا ہے اور پھر اس کو کم کرنے کی فکر کر سکتا ہے، بجائے اس کے کہ کسی اور کی غلطیاں اٹھا کر اس کے نتیجے میں گناہ کماتا ہو۔ اگر کسی شخص کو اپنے اندر کوئی عیب نظر آتا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ اپنے نفس کی مذمت کرے اور اس کی مذمت کرے۔ دوسروں کو ملامت کرنے کی کیا ضرورت ہے [اگر کسی کے اندر عیب و نقص ہو اور شاذ و نادر ہی کوئی اس سے محروم ہو]؟ یہ سوچنا چاہیے کہ جس طرح کوئی اپنے اندر کی خامیوں کو دور کرنے کے قابل نہیں ہے، ویسے ہی دوسرے بھی ایسا نہیں کر سکتے۔ یہ اس صورت میں ہے کہ غلطی کسی کی اپنی مرضی سے ہے [اس کو برقرار رکھنے کی اجازت دینے کے لحاظ سے] اور اگر یہ پیدائشی طور پر موجود ہے [اور اس وجہ سے کسی کی اپنی مرضی سے نہیں ہے] تو اس کی مذمت کرنا خالق کی مذمت کرنے کے مترادف ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی شخص نے ایک رشی کو پکارا: "اے بدصورت آدمی!"، اس نے جواب دیا: "اے بھائی! اگر خوبصورتی یا بدصورتی میرے اختیار میں ہوتی تو میں اپنا چہرہ

اچھا کر دیتا۔ اگر کسی کو اپنی نفس میں کوئی عیب نظر نہ آئے تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے کہ اس نے گناہوں سے بچنے کی توفیق عطا فرمائی اور غیبت میں ملوث نہ ہو جو کہ عیبوں میں بہت بڑا قصور ہے، تو لاش کا گوشت کھانے سے بدتر کیا فعل ہے؟ اگر کوئی اس معاملے پر گہرائی سے نظر ڈالے تو کوئی بھی عیب و نقص سے خالی نہیں ہے۔ صرف خدا کی ہستی کسی عیب و عیب سے خالی ہے۔ اپنے آپ کو تمام خامیوں سے پاک سمجھنا خالص جہالت اور احمقانہ خیال ہے اور یہ بذات خود ایک بہت بڑی غلطی ہے۔ جہاں تک غیبت سے اپنے آپ کو بچانے کے بارے میں ایک بات مفید ثابت ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو دوسروں کی طرح اخذ کرتا ہے، دوسرے لفظوں میں یہ سوچنا چاہیے کہ جس طرح میں اپنے خلاف غیبت کرنے سے غمگین ہوں اسی طرح دوسرے بھی ان کے خلاف میری غیبت سے غمگین ہوں گے۔ جس طرح میں اپنے خلاف غیبت کرنے سے خوش نہیں ہوں ، کیا دوسرے ان کے خلاف غیبت کرنے سے خوش ہوں گے؟

علاج کا تفصیلی طریقہ: علاج کا تفصیلی طریقہ ان وجوہات کو دیکھنا ہے جو غیبت کو اکساتے ہیں۔ ہر بیماری کا علاج اس کی بنیادی وجہ کو ختم کرنے سے ممکن ہے۔ غیبت کی وجوہات اور اشتعال انگیزی کے عوامل کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ لہٰذا اگر غیبت کی وجہ غصہ ہے تو اس کا ازالہ اس بات سے کیا جائے کہ اگر میں غصہ کر لوں اور اس پر قابو نہ رکھ سکوں تو اللہ تعالیٰ میری غیبت کی وجہ سے مجھ سے ناراض ہو جائے گا کیونکہ اس نے غیبت سے منع کیا ہے اور میں نے اس کی نافرمانی کی اور اس کے حکم کو غیر اہم سمجھا۔ غیبت کی دوسری وجہ ہم آہنگی ہے (یا اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہم آہنگی رکھنا) یعنی غیبت کرنا اپنے دوستوں کے ساتھ اچھا کھیل ہونا ہے [جب وہ غیبت کر رہے ہوں]۔ انسان کو یہ سوچنا چاہیے کہ اگر کسی کو مخلوقات کی رضامندی مل جائے تو اس کا کیا فائدہ ہے، جب کہ اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی پیدا ہوتی ہے؟ کون اتنا بے وقوف ہے کہ خدا کے سوا کسی اور کی رضا کی تلاش میں خداوند کو ناراض کرے؟

غیبت کی تیسری وجہ پاکیزگی کو اپنے نفس سے منسوب کرنا ہے، دوسرے لفظوں میں گناہوں اور گناہوں کو دوسروں سے منسوب کرنا، ان سے اپنی بری کا اظہار کرنا اور اپنے نفس کی پاکیزگی کو شمار کرنا ہے۔ یہ سوچنا چاہیے کہ خدا کی ناراضگی کے سامنے لوگوں کی ناراضگی کا کوئی مطلب نہیں ہے۔ پھر غیبت کی وجہ سے خدا کی ناراضگی یقینی ہے لیکن لوگوں کی رضامندی ، جن کے سامنے اپنی ذات کی بری خواہش ہوتی ہے ، اس کے ذریعے ضمانت نہیں دی جاتی ہے۔ اس دنیا کی عظمت کو صرف اس طرح سمجھا جا سکتا ہے (مطلوبہ) جس طرح انسان اسے حاصل کر سکتا ہے یا نہ ملے، لیکن آخرت کی ذلت اور نقصان یقینی ہے کہ غیبت کے نتیجے میں انسان کو ملنے کا پابند ہے۔ نقش قدم پر چلنے کی اجازت صرف ان لوگوں کو ہے جو خدا کی مرضی کے تابع ہوں اور اس کے احکام پر عمل کریں۔ جو لوگ احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں ان کے لیے جائز نہیں ہے، چاہے وہ دنیا کی زندگی میں کتنا ہی بلند مقام کیوں نہ ہوں۔ اگر غیبت کی وجہ دوسروں پر اپنی برتری کا اظہار کرنا ہے تو اس کا علاج یہ سوچ کر کیا جائے کہ خدا کے سامنے میرا جو مقام تھا وہ اس غیبت کی وجہ سے ختم ہو گیا۔ اگر پھر بھی کسی کو کوئی دنیاوی ثواب اور عزت مل جائے تو اس کی قیمت کیا ہے؟ اس کے علاوہ، یہ بھی یقینی نہیں ہے کہ کسی کو یہ بھی مل جائے گا کیونکہ لوگ اس بات پر یقین کر سکتے ہیں یا نہیں کر سکتے ہیں کہ وہ [دوسروں کی غیبت کے معاملے میں]۔ اگر وہ یقین بھی نہیں کرتے ہیں تو ، جو بھی باقی وقار چھوڑ گیا ہے ، نالی میں چلا جائے گا اور وہ کسی کو جھوٹا سمجھنا شروع کردیں گے۔

حسد کی وجہ سے غیبت کرنے کا عذاب الٰہی سے دوگنا ہوتا ہے، پہلا یہ کہ دنیاوی نعمتوں پر حسد کرنا جو زوال پذیر ہیں، اور دوسرا یہ کہ جس شخص سے حسد کیا جاتا ہے اس کی غیبت کرنے کی وجہ سے اس میں آخرت کا عذاب بھی شامل کیا جاتا ہے۔ اس سے دنیا اور ایمان دونوں کا نقصان ہوتا ہے۔ غیبت کا ایک اور نقصان یہ ہے کہ کسی کے نیک اعمال اس شخص کے پاس منتقل ہوجاتے ہیں جس کی غیبت کی گئی ہے اور اس کے برے اعمال غیبت کرنے والے کے پاس منتقل ہوجاتے ہیں۔ اگر غیبت کی ترغیب تضحیک ہے تو یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ دوسرے کو ذلیل کر کے خدا کے سامنے ذلت جمع کر رہا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے آخری انجام پر نظر ڈالے اور دیکھے کہ قیامت کے دن جہنم کی طرف قدم رکھتے ہوئے اسے کتنی شرمندگی اور ذلت برداشت کرنی پڑے گی اور ان کے گناہوں کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا لیا جائے گا۔ اگر کوئی اس طرح سوچے گا تو دل میں خدا کا خوف پیدا ہو جائے گا اور وہ

دوسرے کا مذاق اڑانے کی بھی ہمت نہیں کرے گا۔ ایک دوسرے سے زیادہ تضحیک کا مستحق ہے کیونکہ وہ دوسرے کا مذاق اڑانے میں اپنی حماقت کا مذاق اڑاتا ہے اور اس کے نتیجے میں اپنے آپ کو قیامت کی ذلت کے حوالے کر دیتا ہے۔

گناہوں کی وجہ سے کسی پر رحم کرنا قابل تعریف جذبہ ہے، تاہم شیطان اس نیک عمل سے حسد کرتا ہے اور کسی کو ایک ایسا لفظ بنا کر گمراہ کرنا چاہتا ہے جس سے اس کے نیک اعمال اس شخص پر منتقل ہو جائیں جس پر اس نے رحم کیا ہو۔ اس طرح کسی دوسرے کے نقصان کی تلافی کی جائے گی اور وہ خود ایک ایسے نقصان میں پھنس جائے گا جس کی تلافی نہیں کی جا سکتی اور اس طرح وہ خود رحم کا مستحق ہو جائے گا۔ خدا کی خاطر ناراضگی غیبت پر حاوی نہیں ہونی چاہیے۔ جب خدا کی خاطر کسی دوسرے سے ناراضگی پیدا ہوتی ہے تو شیطان چاہتا ہے کہ وہ غیبت میں ملوث ہونے سے الٰہی اجر سے محروم ہو جائے۔ حیرت کی کیفیت بھی یہی ہے۔ اگر کوئی دوسرے کی حالت پر حیرانی کا اظہار کرتا ہے تو وہ غیبت میں پھنس جاتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ کوئی بھی شخص حیرت کا مستحق نہیں ہے، بلکہ کسی دوسرے شخص کے ایمان یا دنیاوی معاملے پر حیرت کا اظہار کر کے اپنے مذہب کو کھو دینے پر اپنے نفس پر حیران ہونا چاہیے اور اس طرح وہ دنیاوی عذاب کا مستحق ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حیرت کا بہانہ بنا کر کسی دوسرے شخص کی پوشیدہ عیبوں سے پردہ اٹھا کر انہیں سرعام بے نقاب کیا جائے۔ اسی طرح ، کسی کی اپنی غلطیاں بے نقاب ہوجائیں گی جس کے نتیجے میں ذلت ہوگی۔ ان تمام بیماریوں کا علاج علم اور علم ہے۔ زبان اس شخص کے لیے غیبت سے محفوظ ہے جس کا ایمان مضبوط ہو اور خدا کی سچی سمجھ کا حامل ہو۔

دل سے غیبت کرنے کی ممانعت: سوذ ذون (اللہ تعالیٰ میں) ناپسندیدگی یا دوسروں کے بارے میں کم رائے رکھنا برے اور برے اور بدتمیزی کی طرح حرام ہے۔ دوسرے لفظوں میں، جس طرح آپ کو دوسروں کے خطا بیان کرنے کی اجازت نہیں ہے، اسی طرح آپ کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ آپ اپنے دل میں کسی دوسرے کے بارے میں غلط خیالات رکھتے ہیں اور دوسرے سے مایوس ہو جاتے ہیں۔ مایوسی کا مطلب ہے جان بوجھ کر کسی دوسرے شخص کو برا سمجھنا۔ لیکن اگر یہ غیر ارادی طور پر واقع ہو تو وہ معاف کر دیا جاتا ہے، بلکہ شک بھی معاف کر دیا جاتا ہے۔ جو چیز حرام ہے وہ دوسروں کے بارے میں بری اور پست رائے رکھنا ہے اور اس کا تعلق دل کے جھکاؤ اور نیت سے ہے۔ قرآن مجید میں اس انحطاط کی ممانعت ہے:

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱجْتَنِبُوا۟ كَثِيرًا مِّنَ ٱلظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ ٱلظَّنِّ إِثْمٌ

"اے ایمان والو! زیادہ تر قیاس آرائیوں سے پرہیز کریں کیونکہ کچھ قیاس آرائیاں گناہ ہیں [کیونکہ وہ آپ کو مایوسی، منفیت، نفرت اور ان کی پسند کی طرف لے جاتے ہیں، جس کے نتیجے میں آپ کو مادی اور روحانی طور پر تباہ کن راستے پر لے جاتے ہیں]۔ (سورۃ البقرۃ باب ۴۹، آیت ۱۲)

دوسروں کے بارے میں مایوسی یا کم رائے رکھنا ممنوع ہے کیونکہ صرف غیب کے اسرار کا جاننے والا (یعنی خدا) دلوں کے رازوں سے واقف ہے۔ اس لیے کسی بندے کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی دوسرے بندے کے بارے میں اپنے دل میں غلط (منفی) خیالات رکھے۔ لیکن اگر غلط باتیں اس طرح ظاہر ہو جائیں کہ تردید یا مفہوم کی کوئی گنجائش باقی نہ رہ جائے تو اپنے براہ راست علم اور مشاہدے کی وجہ سے ایک غلط خیال آ کر دل میں بیٹھ سکتا ہے۔ تاہم، کسی برائی کا خیال جس کا کسی نے مشاہدہ نہیں کیا ہے اور نہ ہی دل میں آنے والے قابل اعتماد ذرائع سے سنا ہے، شیطان کی طرف سے ہے۔ شیطان وہ ہے جو اس طرح کے طعنے دل میں ڈالتا ہے، اور اس کی سختی سے تردید کی ضرورت ہے، کیونکہ گنہگار (یا برائی کی طرف مائل شخص) کی طرف سے دی جانے والی خبر قابل اعتبار نہیں ہے اور شیطان گنہگاروں کا سردار ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِن جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوٓا۟ أَن تُصِيبُوا۟ قَوْمًۢا بِجَهَـٰلَةٍ

"اے ایمان والو! اگر کوئی گنہگار (یا عادی ظالم یا برائی کی طرف مائل ہو) آپ کے پاس خبر لے کر آئے تو اس کی مکمل اور مکمل تحقیق کریں تاکہ غلطی سے کسی قوم (یا لوگوں کے گروہ) کو نقصان پہنچانے سے بچا جائے۔"
(سورة البقرة سورة البقرة آیت 6)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیطان کی طرف سے لائی جانے والی خبروں کا پتہ لگانا جائز نہیں ہے۔ اگر مایوسی یا دوسروں کے بارے میں بری رائے دل میں داخل ہو جائے تو اس کے خاتمے کا کوئی راستہ تلاش کرنا چاہیے اور نفس کو یہ سمجھانا چاہیے کہ دوسرے شخص کی باطنی کیفیت اس سے پوشیدہ ہے اور جو واقعہ مایوسی کا سبب بن رہا ہے، اس میں اچھائی اور برائی دونوں کے امکانات موجود ہو سکتے ہیں اور نیکی کے امکان کو چھوڑ کر برائی کو ترجیح دینا ضروری نہیں ہے۔ مایوسی اس کی نشانیوں سے پہچانا جاتا ہے اور نشانی یہ ہے کہ کوئی شخص کسی سے محبت کرتا تھا لیکن اب نفرت کرنے لگتا ہے، پہلے وہ اس شخص کے ساتھ مہمان نوازی اور احترام کرتا تھا لیکن اب [اس شخص کے ساتھ پیش آنے میں] خوشی باقی نہیں رہی۔ دل کی اس تبدیلی سے یہ سمجھنا چاہیے کہ ایک دوسرے سے مایوس ہو رہا ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ اگر دل میں کبھی بری قیاس آجائے تو اسے نہ رہنے دینا چاہیے اور نہ ہی جسمانی اعضاء کے ذریعے اس کا اظہار کرنا چاہیے۔ دل میں بیٹھ جانے والی مایوسی کا مظہر یہ ہے کہ انسان نفرت اور نفرت کا اظہار کرنا شروع کر دیتا ہے اور اعضاء کے ذریعے اظہار دل کی مایوسی کے مطابق کام کرنا شروع کر دیتا ہے۔ بہرحال شیطان ذرا سی بہانے سے دوسرے لوگوں کی طرف دل میں مایوسی پیدا کرنے کے لیے بہانہ بناتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ انسان کو یقین دلاتا ہے کہ برائی کو سمجھنے میں وہ کتنا عقلمند اور عقلمند ہے اور یہ کہ مومن خدا کے نور سے دیکھتا ہے حالانکہ حقیقت میں وہ نور الٰہی سے نہیں دیکھتا۔ اس کے بجائے شیطان کے فریب کے اندھیرے کے ساتھ کوئی ادراک کرتا ہے۔ لیکن اگر کوئی معتبر اور معتبر شخص آپ کو کسی چیز کے بارے میں آگاہ کرتا ہے اور آپ کا قیاس اس شخص کی شناخت کی طرف مائل ہے تو وہ (مایوسی کی اخلاقی ذمہ داری) سے مستثنیٰ ہے کیونکہ اگر کوئی شخص ایسے شخص کو مسترد کرتا ہے تو یہ ایک سچے شخص کے بارے میں مایوسی کا مظہر ہوگا جو باخبر ہے اور اس کا مستحق ہے نہ کہ سچائی کی وجہ سے انکار کرنا۔ یہ کسی بھی طرح سے مناسب نہیں ہے کہ کسی کے بارے میں اچھی رائے رکھنے کے لئے ، ایک دوسرے سے مایوس ہوجائے۔ لیکن یہ دیکھنا چاہیے کہ مخبر کی کوئی دشمنی نہیں ہے اور نہ ہی جس کی خبر پہنچائی جا رہی ہے اس سے حسد نہیں کرتا، ورنہ پہنچائی گئی خبر کو بہتان قرار دیا جا سکتا ہے جو گواہی کو رد کرنے کی ایک وجہ ہے۔ اگر کسی کو اس صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو اسے رکنا چاہیے اور نہ ہی ملزم کو جھوٹا یا سچا سمجھنا چاہیے، بلکہ اسے یہ سوچنا چاہیے کہ جس شخص کی باطنی کیفیت، جس کی خبر مخبر نے بتائی ہے، پہلے کسی سے چھپی ہوئی ہے اور اب بھی چھپی ہوئی ہے۔

اگر آپ کسی مسلمان سے مایوس ہو جائیں تو آپ کو چاہیے کہ آپ اپنی مہمان نوازی اور احترام میں اضافہ کریں اور خدا سے بھلائی کے لیے دعا کریں۔ اس طرح آپ کا دل (مایوسی سے) صاف ہو جائے گا اور شیطان آپ سے مایوس ہو جائے گا اور آپ سے اپنا ہاتھ اٹھا لے گا اور آپ کے دل میں دوسروں کے بارے میں بری رائے ڈالنے کی کوشش نہیں کرے گا اس خوف سے کہ آپ نیکی کی دعا کرنا شروع کر دیں گے اور اس شخص کی زیادہ عزت کرنا شروع کر دیں گے۔ اگر کسی معتبر گواہی یا ذاتی مشاہدے سے آپ کو کسی مسلمان میں کسی برائی کا پتہ چلے تو شیطان کے اثر میں آنے کے بجائے کسی مسلمان کے خلاف غیبت کرنے کے لیے کسی کو اس طرح نصیحت کرنی چاہیے کہ دوسروں کو اس کا علم نہ ہو۔ اگر تم نصیحت کرو تو اس بات پر خوش ہونے کی ضرورت نہیں کہ تمہیں کسی دوسرے کے عیبوں کا علم ہو گیا ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں نصیحت کرنے والا اور واعظ کرنے والا بنا کر بھیجا ہے اور تمہیں دوسروں کو راستہ دکھانے کی توفیق عطا فرمائی ہے اور نہ ہی تمہیں اپنے دل میں اپنی عظمت کا خیال رکھنا چاہیے اور نہ ہی دوسرے کی نیچی پن کا خیال رکھنا چاہیے۔ اس کے بجائے ، جس طرح آپ اپنے نقصان کے بارے میں جاننے کے بعد پریشان ہوجاتے ہیں ، اسی طرح آپ کو دوسرے کی حالت پر پچھتاوا ہونا چاہئے۔ ارادہ یہ ہونا چاہئے کہ غلطی دوسرے شخص میں نہ رہے۔ کسی کو کوشش کرنی چاہئے کہ دوسرا شخص آپ کے مشورے کی ضرورت کے بغیر خود ہی صحیح راستے پر آجائے یا کوئی اور مشورہ دے گا جس سے دوسرے کو فائدہ ہوگا۔ اگر تم نے اس طریقے پر عمل کیا تو ایک کے بجائے تمہیں تین اجر ملیں گے: پہلا نصیحت کرنے کے لیے، دوسرا

دوسرے کی حالت پر پشیمان ہونے کے لیے، اور تیسرا اس کے بدلے جو آپ نے دوسرے کے دین کے لیے مدد کی ہے۔

غیبت کے لیے استثناء: غیبت کی ممانعت میں چھ استثناء ہیں، یعنی ان چھ صورتوں میں ایسا کرنا جائز ہے:

1. سب سے پہلے ظلم کے ازالے کے لیے [ظالم کے ظلم کے بارے میں حکام سے شکایت کرنے کی صورت میں]،
2. دوسرا برائی کے خاتمے کے لیے اور گناہوں کو دور کرنے کے لیے [اور یہ اپنے گناہوں کے اپنے گناہوں سے ہو سکتا ہے] کی مدد حاصل کرنا،
3. تیسری بات یہ ہے کہ [متکلمین اور فقہاء سے دوسروں کے بارے میں اصل واقعات اور شکایات بیان کر کے ان سے قانونی رائے حاصل کریں]،
4. چوتھا یہ کہ مسلمانوں کو دوسروں کی برائی سے روکنا (اگر کوئی انہیں دین کی آڑ میں غلط نظریات کی طرف مائل دیکھے]۔
5. پانچویں اس نام کے لیے جو لوگوں میں رائج ہو چکا ہے [جو برا بھلے لگتا ہے لیکن جس کا نام مشہور ہو گیا ہے وہ اس سے کوئی اعتراض نہیں کرتا]۔
6. چھٹا دوسرے کے کھلے گناہوں کے لیے [جو ایک کھلم کھلا کرتا ہے اور اس پر فخر کرتا ہے]۔

سولہواں نقصان - قصہ بیئرنگ: کہانی کرنا یا دوسروں کی گپ شپ اور خفیہ معاملات پھیلانا جو نقصان یا پریشانی کا باعث بن سکتے ہیں، زبان کے نقصانات میں سے ایک ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

هَمَّازٍ مَّشَّآءٍ بِنَمِيمٍ ﴿١١﴾ وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ ﴿١٠﴾

"اور اس کی بات نہ سنو جو جھوٹی قسم کھانے کا عادی ہو، وہ سستا شخص ہے، اس کی کوئی قیمت نہیں ہے، جو بہت زیادہ طعنہ دیتا ہے اور وہ قصیدہ نگار ہے۔" (سورة البقرة باب 68، آیہ 10-11)

ایک آیت کے بعد خدا فرماتا ہے:

عُتُلٍّ بَعْدَ ذَٰلِكَ زَنِيمٍ

"وہ جو سخت مزاج اور بد مزاج ہے۔" (سورة البقرة سورة البقرة آیت ۱۳)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا يدخل الجنة نمّام

"ایک داستان نگار جنت میں نہیں جائے گا"۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *احادیث* میں ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ سے *صحیح بخاری* اور *صحیح مسلم* کا مجموعہ ہے

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

احبکم الی اللّٰہ احاسنکم اخلاقا الموطئون اکنافا یالفون ویؤلفون وان ابغضکم الی اللّٰہ الحشاؤن بالنمیمۃ المفرقون بین الاخوان الملتمسون للبراء العشرات

"تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب وہ لوگ ہیں جو تم اپنے اخلاق (اخلاق، آداب، باطنی اور ظاہری طبیعت) میں سب سے بہتر ہو، وہ نرم دل اور محبت کرنے والے جو دوسروں سے محبت کرتے ہیں۔ تم میں سب سے زیادہ ناپسند کرنے والے وہ لوگ ہیں جو قصہ بولنے والے ہیں، جو بھائیوں کے درمیان فتنہ پھوٹتے ہیں اور بے گناہ لوگوں کی عیب تلاش کرتے ہیں۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *احادیث* کا مجموعہ *طبرانی اوسط*: ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ

کہانی کی تعریف یہ ہے کہ کسی ایسی چیز کو ظاہر کیا جائے جس کا انکشاف برا ہے ، خاص طور پر اگر وہ شخص جس کے بارے میں کوئی چیز نازل ہوئی ہے وہ اس کا خیال رکھتا ہے ، یا جو سنتا ہے وہ اسے ناپسند کرتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ وحی زبان سے کی گئی ہو کیونکہ تحریر اور اشارے زبان کے متبادل ہیں۔ مزید برآں ، یہ ضروری نہیں ہے کہ کہانی کا تعلق [کسی کے برے] الفاظ یا اعمال یا غلطیوں سے ہو۔ ٹیل بیئرنگ کسی بھی چیز کا اظہار (یا انکشاف) ہے جسے ناپسند کیا جاتا ہے۔ جب کوئی شخص دوسرے لوگوں کے ناپسندیدہ معاملات یا بیانات (کسی کے ظاہر ہونے کے نتیجے میں) سامنے آتا ہے تو اسے خاموشی اختیار کرنی چاہیے۔ البتہ اگر نیت کسی مسلمان کو نفع پہنچانا ہو یا گناہ کو دور کرنا ہو تو اس کی بات کرنی چاہیے۔ مثال کے طور پر، اگر کوئی شخص کسی کو ناجائز طور پر کسی کا قبضہ یا جائیداد لے رہا ہے تو اسے مقتول کے حقوق کے تحفظ کے لیے گواہی دینی چاہیے اور یہ بتانا چاہیے کہ فلاں شخص نے کسی کی جائیداد لے لی ہے۔

کہانی کے پیچھے محرک قوت اس شخص کو نقصان پہنچانا ہے جس کی بات یا اس سے متعلق بات سامنے آتی ہے یا اس شخص سے محبت کا اظہار کرنا ہے جو خبریں لاتا ہے یا صرف اچھا وقت گزارنا ہے کیونکہ بیکار معاملات میں ملوث ہونا کسی کو کہانی بتانے پر اکساتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی کے سامنے قصہ نگاری کرے اور کہے کہ فلاں شخص تمہارے بارے میں یہ کہتا ہے، تیرے خلاف فلاں کر رہا ہے، تمہارے خلاف آپ کو نقصان پہنچانے کی سازش کر رہا ہے، تیرے دشمن کا دوست ہے، یا تمہیں تباہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے، اور اس طرح کی دوسری باتیں تو چھ باتوں پر عمل کرنا چاہیے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ایسے شخص پر یقین نہ کرنا چاہیے کیونکہ قصی نگار گنہگار ہے اور ایسے شخص کی گواہی بھی قابل قبول نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِن جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوٓاْ أَن تُصِيبُواْ قَوْمًۢا بِجَهَـٰلَةٍ

"اے ایمان والو! اگر کوئی شخص برائی کی طرف مائل ہو تو تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو اس کی اچھی طرح تحقیق کرو۔ ہو سکتا ہے کہ تم جہالت کی وجہ سے کسی قوم کو نقصان پہنچا سکتے ہو اور نہ ہی کسی قوم کو نقصان پہنچا سکتے۔ (سورۃ البقرۃ سورۃ البقرۃ آیت 6)

دوسری بات یہ کہ اس شخص کو کہنے سے روکنا چاہیے، نصیحت کرنی چاہیے اور اس کے برائی کو واضح کرنا چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَأْمُرْ بِٱلْمَعْرُوفِ وَٱنْهَ عَنِ ٱلْمُنكَرِ

"اور نیک کاموں کی نصیحت کرو اور برے کاموں سے نصیحت کرو۔" (سورۃ البقرۃ 31، آیت 17)

تیسری بات یہ کہ خدا کی خاطر کسی مبلغی سے ناپسندیدگی ہونی چاہیے کیونکہ ایسا شخص اللہ کی طرف سے ناپسند ہے اور اس شخص کو ناپسند کرنا واجب ہے جو خدا کی طرف سے ناپسند ہے۔ چوتھی بات یہ ہے کہ کسی کو اپنے

بھائی (یا بہن) سے مایوس نہیں ہونا چاہیے جو غیر حاضر ہے [جب اس کے خلاف قصہ کیا جاتا ہے]۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱجْتَنِبُوا۟ كَثِيرًا مِّنَ ٱلظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ ٱلظَّنِّ إِثْمٌ

"اے ایمان والو! زیادہ تر قیاس آرائیوں سے پرہیز کرو کیونکہ بعض قیاس آرائیاں گناہ ہیں [کیونکہ وہ آپ کو مایوسی، منفی، نفرت اور ان کی طرح کی طرف لے جاتے ہیں، جو آپ کو تباہ کن راہ پر لے جاتے ہیں]۔ (سورۃ البقرۃ باب ۴۹، آیت ۱۲)

پانچویں بات یہ ہے کہ اس سے پہلے جو کچھ پڑھا گیا تھا اسے سنتے وقت مزید معلومات حاصل کرنے کے بارے میں تجسس نہیں ہونا چاہیے کیونکہ خدا نے اس سے منع کیا ہے۔ اس نے کہا:

وَلَا تَجَسَّسُوا۟

"اور ایک دوسرے کی جاسوسی نہ کریں [یا دوسروں کے نجی یا ناپسندیدہ معاملات کی تحقیقات کرنے کا بیکار تجسس نہ رکھیں جن کا انکشاف کرنا لوگ پسند نہیں کرتے]۔" (سورۃ البقرۃ باب ۴۹، آیت ۱۲)

چھٹا یہ کہ کسی کو اس معاملے میں ملوث نہ ہونا چاہیے جس سے کوئی راوی کو منع کرتا ہے، مثال کے طور پر یہ کہنے سے منع کیا گیا ہے کہ فلاں شخص (جس کی ناپسندیدہ بات بے نقاب ہو رہی ہے) کے بارے میں مجھے یہ بات بتائی ہے۔

عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ایک شخص ان کے پاس آیا اور کسی دوسرے شخص کے بارے میں کچھ کہنا شروع کر دیا لیکن آپ نے ان سے کہا: اگر تم چاہو تو ہم تمہاری بات کی جانچ کر سکتے ہیں۔ اگر یہ جھوٹ ثابت ہوا تو تم وہی ہو گے جو اس آیت (قرآن) میں لکھی گئی ہے کہ اگر کوئی گنہگار تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو اس کی اچھی طرح تحقیق کرو، اور اگر وہ سچ ہے تو تم اس آیت کی طرح ہو گے جس میں کہا گیا ہے کہ ایسا شخص فضول شخص ہے جو طعنہ دیتا ہے اور قصے دیتا ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ میں تمہیں معاف کر دوں گا۔ اس شخص نے کہا: اے مومنوں کے سردار! مجھے معاف کردیں ، میں نے غلطی کی ہے اور دوبارہ یہ غلطی نہیں کروں گا۔ ایک روایت کے مطابق ایک حکیم کا دوست اس سے ملنے آیا اور اس نے اپنے دوسرے دوست کے بارے میں کچھ کہنا شروع کر دیا۔ اس حکیم نے کہا: تم اتنے دنوں کے بعد آئے اور آتے ہی تم نے تین جرائم کیے: ایک تو نے میرے اور میرے دوست کے درمیان دشمنی کا بیج بویا تھا۔ دوسری بات یہ کہ تو نے میرے پرسکون اور خالی دل و دماغ کو پریشانی اور بے چینی سے بھر دیا۔ تیسری بات یہ کہ آپ نے اپنی ایمانداری [اور ساکھ کو] کو نقصان پہنچایا۔ حسن رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے: "جو شخص کسی دوسرے شخص کے بارے میں بات کرتا ہے وہ یقینا کسی اور کے ساتھ تمہارے خلاف طعنہ کرے گا"۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایک محدث ایمان لانے اور سچ سمجھے جانے کے لائق نہیں ہے، کیونکہ ایسے شخص نے جھوٹ بولنا، غیبت کرنا، شرارت کا بیج بونا، بددیانتی، دھوکہ دہی، منافقت، حسد اور مسلمانوں کے درمیان فتنہ پھوٹنے جیسے بڑے گناہوں کا ارتکاب کیا ہے۔ ایسا شخص [محبت، دوستی، ہم آہنگی اور پرامن بقائے باہمی کے بندھن] کو ختم کرنے پر تلا ہوا ہے جن کو خدا کی طرف سے برقرار رکھنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس کے بجائے زمین (دنیا) میں انتشار اور انتشار پھیلاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَيَقْطَعُونَ مَآ أَمَرَ ٱللَّهُ بِهِۦٓ أَن يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِى ٱلْأَرْضِ

"وہ [باہمی محبت، دوستی، ہم آہنگی اور پرامن بقائے باہمی کے بندھن] کو توڑ دیتے ہیں جن کو خدا نے [برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے] اور [اس کے بجائے] دنیا میں افراتفری پھیلاتے ہیں۔" (سورۃ البقرۃ باب ۱۳ آیت ۲۵)

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّمَا ٱلسَّبِيلُ عَلَى ٱلَّذِينَ يَظْلِمُونَ ٱلنَّاسَ وَيَبْغُونَ فِي ٱلْأَرْضِ بِغَيْرِ ٱلْحَقِّ

الزام صرف ان لوگوں پر ہے جو لوگوں پر ظلم و ستم کرتے ہیں اور دنیا میں باغی ہیں جن کا کوئی حق یا جواز نہیں ہے۔ (سورة البقرة باب ۴۲، آیت ۴۲)

اگر کوئی مقص سچا بھی ہو تو وہ عاجزی سے خالی نہیں ہے کیونکہ ایسا شخص دوسروں کی عزت کا خیال نہیں رکھتا اور چھپانے کا کام نہیں کرتا ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ قصہ جھوٹ، حسد اور منافقت پر مشتمل ہے اور یہ تینوں خصلتیں ذلت کا جزو ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ ، داستان بردار کی برائی بہت بڑی ہے ، اور اس سے بچنا چاہئے۔

سترہواں نقصان - دو چہرے والا رویہ یا منافقت: زبان کی منافقت بھی بہت بڑا [گناہ] ہے۔ ایک دوہری بات کرنے والا دو دشمنوں کے مابین دشمنی کا بہت فائدہ اٹھاتا ہے۔ جو بھی ایسا شخص ملتا ہے، اسے اس کے خلوص اور حمایت کا یقین دلاتا ہے، اور دوسرے فریق کو برا بھلا کہتا ہے۔ شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی دو مخالفین سے ملتا ہے اور ان دونوں کے حق میں بولنے سے دور رہتا ہے۔ یہ حقیقی منافقت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

تجدون من شر عباد اللہ یوم القیامۃ ذالوجہین الذی یأتی ھؤلاء بحدیث وھؤلاء بحدیث

قیامت کے دن دو چہرے والا شخص بہت بری حالت میں پایا جائے گا جو ایک کو کچھ کہتا تھا اور دوسرے کو کچھ اور کہتا تھا۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *احادیث* کا مجموعہ *ابن ابی الدنیا* عن ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ دو چہرے والا اللہ کے نزدیک امانت دار نہیں ہے۔ ہر کوئی اس بات پر متفق ہے کہ دو مختلف لوگوں کے ساتھ دو چہرے پر ملاقات کرنا منافقت ہے۔ اگر کوئی دو مخالفین کی ایک دوسرے کے لیے مخالفت کی تعریف کرتا ہے اور ان دونوں کو (ان سے الگ الگ ملاقاتوں میں) ایک کی حمایت کا یقین دلاتا ہے تو یہ دو طرفہ رویہ ہے۔ اسی طرح اگر کوئی کسی کے چہرے پر تعریف کرتا ہے لیکن اس کی غیر موجودگی میں اس کی خامیوں کو درج کرنا شروع کر دیتا ہے تو یہ بھی دو مخی رویہ ہے۔ بہتر یہ ہے کہ خاموشی اختیار کی جائے یا صرف اس شخص کی تعریف کی جائے جو صحیح ہے اور یہ تعریف چہرے پر یا پیٹھ کے پیچھے ایک جیسی ہونی چاہیے، چاہے وہ کسی کے مخالف کے سامنے ہی کیوں نہ ہو۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو لوگوں نے بتایا کہ وہ اشرافیہ اور حکام کے سامنے ایسی باتیں کہتے ہیں جو وہ ان کے ساتھ نہ ہونے پر نہیں کہتے۔ آپ نے فرمایا: ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اسے منافقت سمجھتے تھے۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث کا مجموعہ *طبرانی*۔ اگر کسی میں ہمت ہے تو اسے ناجائز باتوں یا بری باتوں سے باز آنا چاہیے۔ اگر کسی میں صلاحیت نہیں ہے تو خاموش رہنا چاہیے لیکن دل میں اسے برا سمجھنا چاہیے۔

اٹھارہواں نقصان - حمد: بعض مواقع پر حمد و ثنا بھی جائز نہیں ہے۔ جہاں تک کسی کے خطا بیان کرنے کا تعلق ہے تو یہ غیبت کی ممانعت کے حکم کے تحت آتا ہے۔ تعریف کے چھ نقصانات ہیں۔ ان میں سے چار کا تعلق ایک تعریف سے ہے اور دو کا تعلق اس شخص سے ہے جس کی تعریف کی گئی ہے۔

ایک کی تعریف سے متعلق چار نقصانات: پہلا نقصان یہ ہے کہ تعریف کرنے والا اتنا مبالغہ آرائی کرتا ہے کہ وہ جھوٹ بن جاتا ہے۔ دوسرا نقصان یہ ہے کہ بعض اوقات دکھاوے کو حمد و ثناء میں شامل کیا جاتا ہے، دوسرے لفظوں میں، اگرچہ تعریف درست ہو سکتی ہے، لیکن تعریف کرنے والا شخص تعریف کرنے والوں سے اپنی محبت ظاہر کرنا چاہتا ہے حالانکہ دل میں محبت نہیں ہوتی، یا کسی کے دل میں تعریف کرنے والوں کی صفات کے بارے میں قائل نہیں ہوتا جس کے لیے وہ صرف دکھاوے کے طور پر محبت کا اظہار کر رہا ہے۔ اس طرح انسان منافق بن جاتا ہے۔ تیسرا نقصان یہ ہے کہ بعض اوقات کوئی ایسی باتیں کہتا ہے جن کی اس نے تحقیق نہیں کی ہے یا اس کے بارے میں کچھ علم اور معلومات نہیں ہیں۔ ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کسی شخص کی تعریف کی جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا:

ویحک قطعت عنق صاحبک، لو سمعها ما افلح ثم قال ان کان احدکم لا بد مادحا اخاہ، فلیقل احسب فلانا ولا ازکی علی اللہ احدا حسیبہ اللہ ان کان یری انہ کذلک

"آپ نے اپنے ساتھی کی گردن توڑ دی (مثال کے طور پر اس کا مطلب یہ ہے کہ چہرے پر تعریف کرنا بہت تباہ کن ہوسکتا ہے کیونکہ اس سے انسان کو خوش ہوتا ہے، مغرور اور تکبر ہوتا ہے، اور خود کو بڑھانا اور اسی طرح کی دیگر اندرونی تخریبی خصوصیات میں ملوث ہوتا ہے جو کسی کی روحانیت کو نقصان پہنچاتی ہیں کیونکہ یہ روح کی بیماریاں ہیں)! اگر کوئی اسے سنتا ہے تو وہ نجات حاصل نہیں کرے گا [جیسا کہ آپ کی حمد و ثنا کے نتیجے میں روح کی بیماریاں پیدا ہو جاتیں]۔ اگر آپ کے لیے اپنے بھائی کی حمد و ثنا ضروری ہو تو کہہ دو کہ میں فلاں (یقین کے برعکس قیاس کی طرف اشارہ) کو سمجھتا ہوں اور خدا کے حضور اس کی پاکیزگی کی تصدیق نہیں کرتا کیونکہ اللہ تعالیٰ اس کا جاننے والا ہے [اور اس کی باطنی حقیقت) کیونکہ خدا انسان کے باطنی ریشے کے ہر ریشے کا جاننے والا ہے۔ یہ [پانی کی قسم] حمد [جہاں اس معاملے کی سچائی کو خدا کی طرف منسوب کیا گیا ہے] اس وقت کی جانی چاہیے جب آپ کو معلوم ہو کہ وہ ایسا ہی ہے"۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *احادیث* کا مجموعہ *صحیح بخاری* اور *صحیح مسلم* ابوبکرا رضی اللہ عنہ سے ہے

اس نقصان کا تعلق ان واضح صفات سے ہے جو ثبوتوں کے ذریعے معلوم ہوتی ہیں، مثلا یہ کہنا کہ فلاں شخص پرہیزگار، راستباز، پرہیز کرنے والا اور صدقہ دینے والا ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ یہ خصلتیں پوشیدہ ہیں اور ان کا تعلق فرد کے باطنی وجود سے ہے اور ہمارے پاس ان کو جاننے کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔ لیکن یہ کہنا درست ہے کہ میں نے کسی کو صبح سویرے *تہجد* کی نماز پڑھتے دیکھا ہے یا کسی کو حج کرتے ہوئے اور صدقہ کرتے دیکھا ہے، کیونکہ یہ معاملات یقینی اور براہ راست مشاہدہ کیے جاتے ہیں۔ کسی کو عادل کہنا یا تقدیر الٰہی سے متفق ہونا بھی درست نہیں ہے، کیونکہ عدل اور خدا کی طرف سے مقرر کردہ تقدیر کو قبول کرنا اس کے باطن سے متعلق معاملات ہیں اور ان کا علم کسی کے باطن سے متعلق کسی آزمائش اور آزمائش کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو دوسرے شخص کی تعریف کرتے ہوئے سنا تو اس نے اس سے پوچھا: کیا تم اس کے ساتھ سفر کر رہے ہو؟ اس نے کہا: نہیں! اس نے پھر پوچھا: کیا تم صبح شام اس کے پڑوسی ہو؟ اس نے پھر جواب دیا: "نہیں!" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ کی قسم! میری رائے میں آپ اسے نہیں جانتے۔ آپ بغیر کسی علم اور تحقیق کے اس کی تعریف کر رہے ہیں۔ کسی کی باطنی خصوصیات ہر وقت سفر، لین دین اور قربت میں عیاں ہو جاتی ہیں، جب کہ آپ سفر کے دوران اس کے ساتھی نہیں ہیں، نہ پڑوسی ہیں اور نہ ہی اس کے ساتھ خرید و فروخت سے متعلق معاملات کر چکے ہیں۔ آپ کس بنیاد پر اس کی تعریف کر رہے ہیں؟" چوتھا نقصان یہ ہے کہ حمد و ثنا کے ساتھ تعریف کرنے والا ظالم یا کے لیے خوشی کا موقع فراہم کرتا ہے اگرچہ وہ حرام شریعت میں ناجائز ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان اللّٰہ تعالٰی یغضب اذا مدح الفاسق

"بے شک اللہ ناراض ہو جاتا ہے جب ظالم کی تعریف کی جاتی ہے۔" (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *احادیث* کے مجموعے *ابن ابی الدنیا* اور *بیہقی* انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے

حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جس نے کسی ظالم کی لمبی عمر کی دعا کی اس نے اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ دنیا میں نافرمانی کا سلسلہ طویل عرصے تک جاری رہے۔ ظالم اور مذمت اور نفی کے مستحق ہیں تاکہ ایسا شخص غمگین ہو اور اپنے ظلم و ستم اور برائی سے باز رہے۔ ایسا شخص تعریف کا مستحق نہیں ہے"۔

تعریف کرنے والے سے متعلق دو نقصانات: پہلا نقصان یہ ہے کہ حمد و ثنا دل میں تکبر اور تکبر کی پیدائش کا سبب بنتا ہے (عجوب یا اپنے بارے میں اعلیٰ رائے رکھنا، چاہے وہ غلط ہو یا نہ ہو، اور یہ عکسر کا بالکل برعکس ہے)۔ یہ دونوں اندرونی خصوصیات مہلک اور تباہ کن ہیں [کسی کے باطنی وجود اور روحانیت کے لئے جو اس کے نتیجے میں بیرونی جسمانی نقصان کا باعث بن سکتی ہے]۔ دوسرا نقصان یہ ہے کہ انسان تعریف سے خوش ہو جاتا ہے اور یہ غلط فہمی دل میں مضبوط ہو جاتی ہے کہ میں اچھا ہوں اس لیے لوگ میری تعریف کرتے ہیں۔ اپنے آپ کو یہ اعتقاد یا اپنے آپ کی بہت زیادہ عزت انسان کو اعمال کی انجام دہی میں سستی پیدا کر دے گی اور اسے نفس کی بیماری میں مبتلا کر دے گی اور دل میں یہ احساس پیدا کرے گا کہ اب کسی بھی عمل کی ضرورت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مندرجہ بالا روایت میں اس شخص کے بارے میں کہا گیا ہے کہ "تم نے اپنے دوست کے ساتھ اپنی حمد سے اچھا سلوک نہیں کیا اور گردن توڑ دی۔ اگر کوئی اسے سنے گا تو وہ نجات حاصل نہیں کرے گا۔"

مطراف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب بھی میں نے کسی دوسرے شخص کی زبان سے میری حمد و ثنا سنی تو اپنی آنکھوں میں ذلیل ہو گیا اور میری نفس مجھ پر ذلیل ہو گئی۔ زیاد بن ابی مسلم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "جو شخص اپنی حمد و ثنا سنتا ہے تو شیطان اس شخص کو تکبر اور تکبر میں مبتلا کر دیتا ہے، لیکن مومن اس سے بچ جاتا ہے"۔
ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: مطرف اور زیاد دونوں کے اقوال درست ہیں، لیکن زیاد نے جو کچھ کہا ہے وہ عام لوگوں کے دلوں کی تصویر ہے اور مطراف کا قول اشرافیہ کی حقیقت ہے ، یعنی عام لوگ ان کی تعریف کے نتیجے میں فخر کرتے ہیں اور اشرافیہ عاجز ہو جاتی ہے۔ جس کی تعریف کی جاتی ہے وہ نیک اعمال کرنے میں سستی کا شکار ہو جاتا ہے یا حمد و ثنا کے نتیجے میں نفس پرستی اور تکبر پیدا ہوتا ہے اور یہ دونوں مہلک بیماریاں ہیں جو روح کی موت کا سبب بنتی ہیں جس طرح قتل سے جسم کی موت واقع ہوتی ہے۔ اگر جس شخص کی تعریف کی گئی ہے وہ مذکورہ بالا نقصانات سے محفوظ ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، بلکہ اس قسم کی تعریف اچھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مختلف صحابہ کرام کی تعریف کی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اخلاق اتنی بلند تھی کہ اس طرح کی حمد و ثنا سے ان کے دلوں میں تکبر، تکبر، تکبر اور تکبر کے جذبات پیدا نہیں ہوئے۔ اس کے بجائے وہ خدا کے شکر گزار ہوتے تھے اور اس سے بھی زیادہ عاجزی اور ذلت اختیار کرتے تھے۔ اس لیے اپنی زبان سے اپنی تعریف کرنا اچھی بات نہیں ہے کیونکہ اس پر فخر ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انا سید ولد آدم ولا فخر

"میں آدم علیہ السلام کی تمام اولادوں کا سردار ہوں اور اس پر کوئی فخر نہیں ہے۔" (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *ابو سعید خدری* رضی اللہ عنہ کے بارے میں ترمذی *اور* ابن ماجہ کے *احادیث* کا مجموعہ ہے

یعنی وہ دوسرے لوگوں کی طرح فخر یا فخر سے نہیں کہہ رہے تھے، جو ان کی خوبیوں کو شمار کرتے تھے اور ان پر فخر کا اظہار کرتے تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا غرور (اس جملے میں "سعادت" کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے) خدا کے ساتھ قربت اور قربت کی وجہ سے تھا، یہ انسانیت کے پیشوا ہونے یا سب سے پہلے [خدا کے کسی شخص یا کسی چیز کو پیدا کرنے سے پہلے] پیدا ہونے کی وجہ سے نہیں تھا (یہ ان صوفیانہ تعلیمات میں سے ہے جو تخلیق کے راز کو کھول دیتی ہیں جب روح کی آنکھ سے سمجھا جاتا ہے جب یہ الہی روشنیوں سے روشن ہوتا ہے ، جیسا کہ ہر دور کے گنوسٹکس سمجھتے ہیں)۔ ذبیح اللہ مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: فرشتے آدم ؑ کی اولاد کے ساتھ ہیں۔ جب کوئی مسلمان اپنے بھائی کا ذکر اچھی طرح کرتا ہے تو فرشتے کہتے ہیں کہ اللہ تمہیں بھی ایسا ہی کرے، لیکن جب برا ذکر کیا جائے تو فرشتے کہتے ہیں: اے انسان! تمہاری غلطیاں پوشیدہ ہیں، بس اس پر رک جاؤ اور خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہاری عیبوں کو بے نقاب کر کے تمہیں ذلیل نہیں کیا۔

حمد و ثناء کی ذمہ داری: جس شخص کی تعریف کی جاتی ہے وہ اپنی حمد پر خوش نہ ہو اور تکبر اور تکبر کی گرد بھی اپنے دل کی سطح پر نہ پڑے۔ یہ تب ہی ہو سکتا ہے جب کوئی شخص اپنی تعریف کے وقت یہ سوچے کہ اس دنیا سے رخصت ہونے کا لمحہ بہت نازک اور خطرناک ہے، دکھاوا اور نیک اعمال کی دیگر تباہ کن خوبیاں گھات لگا کر پڑی ہیں۔ ایک لمحے میں، تمام نیک اعمال مکمل طور پر ضائع ہو سکتے ہیں۔ جس کی تعریف کی گئی ہے وہ اپنے اپنے عیبوں کا جائزہ لے جس سے تعریف کرنے والا اس سے واقف بھی نہیں ہوتا، ورنہ وہ کبھی تعریف نہیں کرتا۔

انیسواں نقصان - تقریر کی غلطیوں سے غفلت: گفتگو اور گفتگو کی لطیف غلطیوں سے غفلت بھی بہت بڑا نقصان ہے، خاص طور پر وہ لوگ جو خدا کی صفات اور صفات سے متعلق ہیں اور دین سے وابستہ ہیں، اور اس طرح کے الفاظ علماء اور فصیح لوگ صحیح طریقے سے ادا کر سکتے ہیں۔ علم اور فصاحت و بلاغت سے عاری لوگوں کی زبان غلطیوں سے خالی نہیں ہے۔ تاہم بولنے والے کی جہالت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ایسی غلطیوں کو معاف فرماتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ جو کچھ اللہ اور اس کا نبی چاہے وہ ہو جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اجعلتني لله عديلا بل ماشاء الله وحده

"کیا آپ مجھے خدا کا شریک بنا رہے ہیں [جیسا کہ آپ کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے]؟ (میں صرف اللہ کا بندہ اور رسول ہوں اور اس کا شریک نہیں ہوں۔] اس کے بجائے (آپ کو کہنا چاہئے) کہ جو خدا چاہتا ہے جس کا کوئی شریک نہیں ہے۔" (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے مجموعہ *احادیث نسائی* اور *ابن ماجہ*)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ تم میں سے بعض لوگ اللہ کے ساتھ اس طرح شریک قرار دیتے ہیں کہ تم کتے کو یہ کہہ کر شریک بناتے ہو کہ اگر کتا نہ ہوتا تو رات کو ہمارے گھر میں چوری ہو جاتی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان اللہ تعالی ینہاکم ان تحلفوا بآبائکم من کان حالفا فلیحلف باللہ او لیصمت

"خدا تمہیں اپنے آباؤ اجداد کے نام سے قسم کھانے سے منع کرتا ہے۔ جس کو قسم کھانے کی ضرورت ہے اسے یا تو خدا کی قسم کھانی چاہیے یا خاموش رہنا چاہیے۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *احادیث* کے مجموعے *صحیح بخاری* اور *صحیح مسلم*)

یہ کچھ مثالیں ہیں۔ تقریر میں ہونے والی غلطیوں کا اندازہ ان سے لگایا جا سکتا ہے جو عام لوگ نہیں دیکھتے، حالانکہ ان کے لیے احتساب بھی ہے۔ ان غلطیوں کا اندازہ لگانا ممکن نہیں ہے۔ اب تک بیان کی گئی زبان کے نقصانات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زبان کو آزاد چھوڑنے میں کوئی تحفظ نہیں ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول حکمت سے سرشار ہے:

من صمت نجا

"جو خاموش رہا اس نے نجات حاصل کی"۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *حدیث* کا مجموعہ *ترمذی*)

اس کی وجہ یہ ہے کہ زبان کے غلط استعمال کے یہ تمام نقصانات مہلک ہیں اور نفس کو خطرے میں ڈالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ کسی شخص کو خاموش رہ کر ان تباہی اور خطرات سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے کیونکہ بولنے میں صرف خطرات ہوتے ہیں، سوائے اس کے کہ جب اس میں فصاحت، علم، خوف خدا اور باطنی روحانی غور و فکر کی صلاحیتیں ہوں۔

بیسواں نقصان - عام لوگوں کے سوالات: یہ بھی ایک بہت بڑا نقصان ہے کیونکہ عام لوگ صفات الٰہی (خدا کی صفات) کے بارے میں ہر طرح کے سوالات پوچھتے ہیں، اور کلام الٰہی کے بارے میں پوچھتے ہیں، اور حروف اور الفاظ [سوالات کے ساتھ] جیسے "کیا یہ دنیاوی ہیں (جو کسی زمانے میں وجود میں آئے ہیں) یا قدیم (ابدی طور پر موجود)؟" اگرچہ عام لوگوں کا واحد حق یہ ہے کہ وہ قرآن کے الٰہی احکام پر عمل کریں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عمل اور عمل نفس پر مشکل ہے اور زبان اور دماغ بیکار دلائل کا ذائقہ محسوس کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگوں کو علم کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے دیکھا گیا ہے جن کے پاس اس کے ساتھ ذرا بھی موزونیت نہیں ہے (یعنی وہ لوگ علم کا ڈھونگ کرتے ہیں جو ذرا بھی علم نہیں رکھتے ہیں)۔ شیطان ان کو مشتعل کرتا ہے اور انہیں قائل کرتا ہے کہ "تم عالم ہو، برکتوں اور فضیلت کے مالک ہو، تمہاری ایک اچھی رائے ہے اور تم اس کا اظہار کرو۔ بعض اوقات شیطان کو ان خود ساختہ "عالموں" سے ایسے الفاظ ملتے ہیں جو خالص کفر ہیں اور کسی کو ان کی بکواس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ ایک عام آدمی کے لئے ، یہ فکری دلائل بڑے گناہوں سے بھی زیادہ خطرناک ہیں ، خاص طور پر وہ جو خدا کی ہستی (*ذات*) اور صفات (*صفت*) سے متعلق ہیں۔ ان کا کام صرف یہ ہے کہ قرآن مجید میں جو کچھ نازل ہوا ہے اس پر ایمان لائیں اور بغیر کسی بحث و جدل اور ہچکچاہٹ کے ایمان لائیں اور عبادت الٰہی میں مشغول رہیں۔ علم کے لطیف نکات کے بارے میں بات کرنے والا جو کسی کا ذہن سمجھنے سے قاصر ہے ، وہ بھی ایک عام

آدمی کی طرح ہے ، حالانکہ اس کے پاس دوسرے موضوعات پر اچھی بات کرنے کی مہارت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ذرونی ما ترکتکم فانما ھلک من کان قبلکم بکثرۃ سئوالھم
واختلافھم علی انبیاءھم مانھیتکم عنہ فاجتنبوہ وماامرتکم
بہ فاتوابہ ما استطعتم

"جس چیز کے بارے میں میں نے تمہیں نہیں بتایا، وہ مجھ پر چھوڑ دو کیونکہ تم سے پہلے لوگ تباہ ہو چکے تھے کیونکہ وہ بہت سے سوالات پوچھتے تھے اور اپنے نبیوں سے اختلاف کرتے تھے۔ میں نے تم سے جس چیز سے باز رہنے کو کہا ہے، اس سے دور رہو اور جو میں نے تمہیں کرنے کا حکم دیا ہے، جتنا تم کر سکتے ہو وہ کرو۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *احادیث* کا مجموعہ *صحیح بخاری* اور *صحیح مسلم* ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

یوشک الناس یتساءلون حتّٰی یقولوا قد خلق اللّٰہ الخلق،
فمن خلق اللّٰہ؟ فاذا قالوا ذلک فقولوا قل ھو اللّٰہ احد اللّٰہ الصمد
حتّٰی تختموا السورۃ ثم لیتفل احدکم عن یسارہ ثلاثا و
یستعذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم

"مجھے ایسا لگتا ہے کہ [زیادہ] سوال کے دوران لوگ یہ کہنا شروع کردیں گے کہ اگر خدا نے مخلوقات کو پیدا کیا ہے تو خدا کو کس نے پیدا کیا ہے؟ اگر لوگ اس سے پوچھیں تو ان سے کہہ دو کہ خدا ایک ہے، اللہ کسی چیز یا کسی کی محتاج نہیں ہے تو ان پر اخلاص کی پوری سورت پڑھ کر سناؤ، پھر تم میں سے کوئی ایک بائیں طرف تین بار تھوک دے اور شیطان سے خدا کی پناہ مانگے۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *احادیث* کا مجموعہ *صحیح بخاری* اور *صحیح مسلم* ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے

[غیر ضروری سوالات نہ پوچھنے کی اہمیت کو خضر اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کہانی سے بھی واضح کیا جاتا ہے (قرآن، باب 18، آیات 60-82)] خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے ساتھ لے جانے سے پہلے واضح کر دیا کہ جب تک وہ خود اس کا ذکر نہ کریں اس وقت تک ان سے کوئی سوال نہ پوچھیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب حیرت کی حالت میں کشتی کی بنیاد میں سوراخ کرنے کی وجہ پوچھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنا وعدہ یاد دلایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس پر معافی مانگی لیکن یہ تین بار ہوا۔ آخر میں خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے علیحدگی کا اعلان کیا۔

دین سے متعلق رازوں اور لطیف معاملات کے بارے میں پوچھنے والے عام لوگوں کا اس میں بہت نقصان ہوتا ہے کیونکہ اس سے مشکل حالات پیدا ہوسکتے ہیں۔ لہٰذا عام لوگوں کو اس قسم کے سوالات پوچھنے سے روکنا اور منع کرنا واجب ہے [کیونکہ اس سے انہیں وہ کام کرنے سے روکتا ہے جو انہیں کرنا چاہئے]۔ ان کا کام خدائی احکام پر

عمل کرنا ہے ، لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا اور اس کے بجائے ایسی چیزوں میں ملوث ہوگئے (بیکار سوالات اور دلائل جو خلفشار اور رکاوٹیں پیدا کیں) جن کی ان سے ضرورت نہیں تھی۔ ایسا شخص الٰہی حساب کا مستحق ہے۔

باب 5 - غصے ، غصے ، غصے اور حسد کی وجہ سے ہونے والی آفتیں

غزالی کی پانچویں کتاب" احیاء العلوم الدین" یا "*خدا کی راہ کی معرفت کا احیاء" کی تیسری جلد یا چوتھائی* جلد میں ہے جو انسانی فطرت میں گہرائی سے پیوست ہیں یعنی غصہ، غصہ، دشمنی اور حسد کی بیماریاں۔ روح کی ان اندرونی تباہ کن خصوصیات کی وجہ سے کسی فرد کے ساتھی انسانوں اور قوموں اور معاشروں کے درمیان تعلقات میں جو تباہی مچائی جاتی ہے، وہ سب خود واضح ہے۔ غزالی اپنے نفس کی گہرائیوں میں سرایت کرنے والی ان منفی قوتوں کے عروج کی وجوہات کی گہرائی میں جاتی ہے اور ان کی تباہ کن فطرت کے خاتمے کے لیے علاج تجویز کرتی ہے۔ غزالی کی اس کتاب کے مندرجات یہاں مختصر شکل میں اس طرح پیش کیے گئے ہیں:

غصہ آگ کی ایک چمکتی ہوئی چنگاری ہے۔ یہ ایک ایسی آگ ہے جس کے بارے میں قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی ہے:

نَارُ ٱللَّهِ ٱلۡمُوقَدَةُ ﴿٦﴾ ٱلَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى ٱلۡأَفۡـِٔدَةِ ﴿٧﴾

"یہ ایک ایسی آگ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے روشن کیا ہے تاکہ وہ اس کے نقصانات کو سمجھ سکیں اور پھر اپنے فائدے کے لیے اس پر قابو پانے کی کوشش کر سکیں] جو دلوں تک پہنچ جائے گی۔ (سورۃ البقرۃ باب 104، آیت 6-7)

یہ آگ دل کی گہرائی میں راکھ میں چنگاریوں کی طرح چھپی رہتی ہے۔ جس طرح آگ کے پتھر ایک دوسرے کے ساتھ رگڑتے ہیں تو آگ ظاہر ہوتی ہے، اسی طرح غصے کی آگ اس وقت بھڑکتی ہے جب تکبر کے پتھر تھوڑا سا بھی رگڑ جاتے ہیں۔ حکمت اور روحانی نقاب کشائی کرنے والوں نے اس حقیقت کو یقین کی روشنی سے دیکھا ہے کہ انسان کی ایک رگ شیطان تک پھیلی ہوئی ہے۔ جس شخص کو شدید غصہ آتا ہے وہ شیطان کے ساتھ قربت کا دعویدار ہے۔ دھول کی عظمت [جو عاجزی کی علامت ہے] پرسکون رہنے میں ہے ، اور آگ کی شان بھڑکانے اور فعال رہنے میں ہے [جو اس کے راستے میں آتی ہے اسے پھیلانے اور جلانے میں]۔ لہٰذا اگر انسان غصے میں مبتلا ہو تو سمجھ لیں کہ ایسے شخص کی ساخت میں گرد کم اور زیادہ آگ ہوتی ہے۔ دشمنی اور حسد دونوں غصے کا نتیجہ ہیں اور یہ دونوں انتہائی تباہ کن ہیں۔ وہ تباہی پھیلانے کا سبب ہیں، وہ ہنگامہ آرائی اور ہنگامہ آرائی کا سبب ہیں، اور دل ان کا مرکز اور مرکز ہے۔ دل [اپنی جسمانی شکل میں] گوشت کا ایک ٹکڑا ہے کہ جب یہ آواز ہوتی ہے تو [انسانی] جسم کا پورا انتظام صحیح طریقے سے کام کرتا ہے اور جب یہ ناقص ہوتا ہے تو جسم کا پورا نظام ناکام ہوجاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تینوں چیزیں تباہ کن ہیں۔ اس لیے میں نے مسافروں اور مجادد کرنے والوں کو ان کی فطری تباہی کی راہ پر گامزن کرنا مناسب اور مناسب سمجھا تاکہ وہ ان سے حفاظت کر کے آگے بڑھ سکیں، اگر یہ بری خصلتیں ان کے دلوں میں پیوست ہو جائیں تو وہ ان کو جڑ سے اکھاڑ پھینک دیں اور ان کا علاج کر سکیں۔ برائیوں کے بارے میں آگاہ کرنا بھی ضروری ہے کیونکہ جو شخص ان سے واقف نہیں ہے وہ ان میں

ملوث ہو جاتا ہے۔ صرف برائی سے آگاہ ہونا بھی اس وقت تک کافی نہیں ہے جب تک کہ کوئی ان کے خلاف روک تھام کی حکمت عملیوں سے واقف نہ ہو۔ اس کتاب کے آنے والے ابواب میں [جسے "غصہ، غصہ، غصہ اور حسد کے نقصانات" کہا جاتا ہے]، غصے، غصے، تلخی اور حسد کے نقصانات کی وضاحت کی جائے گی اور ان سے بچنے کی حکمت عملی پر تبادلہ خیال کیا جائے گا۔

غصے اور غصے کی مذمت

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِذْ جَعَلَ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ فِى قُلُوبِهِمُ ٱلْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ ٱلْجَٰهِلِيَّةِ فَأَنزَلَ ٱللَّهُ سَكِينَتَهُۥ عَلَىٰ رَسُولِهِۦ وَعَلَى ٱلْمُؤْمِنِينَ

"جب کافروں نے اپنے دلوں میں دشمنی اور غضب کو جگہ دے دی اور وہ دشمنی اور غضب بھی جہالت کی وجہ سے پیدا ہوا تو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنوں پر اپنے دل سے سکون اور صبر نازل فرمایا تاکہ دشمنی کو ٹھنڈا کیا جائے اور جہالت اور دشمنی سے جہالت اور دشمنی سے مقابلہ کرنے سے روکا جائے۔ یہ صرف تنازعات کو مزید بھڑکاتا ہے اور اس میں ملوث لوگوں اور قوموں کو نقصان پہنچانے کے لئے قابو سے باہر ہوجاتا ہے ، کیونکہ ٹھنڈے سر اور دل لوگوں اور قوموں کے مابین دشمنی کو کم کرنے کی زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں]۔ (سورۃ البقرۃ آیت ۴۸، آیت ۲۶)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم سب کس کو طاقتور اور طاقتور سمجھتے ہو؟ ہم نے جواب دیا: "وہ جسے کشتی میں شکست نہیں دی جا سکتی"۔ انہوں نے کہا: "ایسا نہیں ہے۔ طاقتور اور طاقتور وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے نفس کو قابو میں رکھتا ہے (یعنی اپنے غصے کو روکتا ہے اور اسے صبر سے برداشت کرتا ہے)۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث کا مجموعہ *صحیح مسلم*)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من كف غضبه ستر الله عورته

"جو شخص اپنے غصے کو روکتا ہے، اللہ تعالیٰ ایسے شخص کے عیبوں کو چھپاتا ہے جس سے ذلت و رسوائی ہوتی ہے)۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے احادیث کا مجموعہ *ابن ابی الدنیٰ*)

ایک گنوسٹک نے اپنے بیٹے سے کہا: "اے بیٹا! عقل (واضح عقلی سوچ اور صحت مند ذہنی حالت) غصے کے وقت [اپنی جگہ پر] نہیں رہتی۔ کم سے کم غصہ ان لوگوں کے پاس آتا ہے جو سب سے زیادہ ذہین ہوتے ہیں۔ اگر غضب دنیا کی خاطر ہے تو یہ دھوکہ اور فریب ہے اور اگر یہ آخرت کی خاطر ہے تو یہ بردباری اور حکمت ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ غصہ عقل کا دشمن ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے خطبوں میں فرمایا کرتے تھے: تم میں سے وہ شخص نجات حاصل کرے گا جو لالچ سے پرہیز کرے گا، نچلی نفس سے خواہشات اور غضب سے پرہیز کرے گا۔ ایک گنوسٹک نے کہا: "جو شخص [اپنی ہوس اور غصے] کے تابع ہوتا ہے، یہ دو بری اندرونی خصلتیں ایسے شخص کو جہنم کی طرف دھکیلتی ہیں"۔

غصے کی حقیقت: اللہ تعالیٰ نے حیوان اور تمام جانداروں کو اس طرح پیدا کیا ہے کہ اس کے داخلی اور خارجی اسباب کی وجہ سے اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حیوان کی جسمانی ساخت کے مطابق غذا پیدا کی ہے اور اس میں اس کی خواہش بھی پیدا کی ہے تاکہ وہ اپنی ضروریات کے مطابق کھائے اور اس طرح اپنے آپ کو معدوم ہونے سے بچاتا ہے۔ تلوار اور دیگر ہتھیاروں جیسے خطرات کے لحاظ سے بیرونی عوامل اور اسباب موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان میں ایک ایسی طاقت پیدا کی ہے جسے انسان کے دفاع اور ان نقصانات سے بچانے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آگ سے غضب کی طاقت پیدا کی ہے۔ جب بھی کوئی ایسی چیز سامنے آتی ہے جو کسی کی مرضی کے خلاف ہوتی ہے یا کسی کو اپنے مقصد سے روکا جاتا ہے تو وہ آگ بھڑک اٹھتی ہے اور شعلہ اس حد تک شدت اختیار کر جاتا ہے کہ دل کا خون توانائی حاصل کر کے دل کے اوپر کی تمام رگوں میں پھیل جاتا ہے۔ جس طرح آگ کے شعلے اوپر کی طرف اٹھتے ہیں یا برتن کا پھوڑا اوپر کی طرف اٹھتا ہے، اسی طرح کسی شخص کا چہرہ اور آنکھیں جلد کی نرمی اور لطیف ہونے کی وجہ سے سرخ ہو جاتی ہیں جو خون کی لالی کا اظہار کرتی ہے جیسے شیشے کے اندر کوئی چیز ظاہر ہوتی ہے۔ یہ وہ حالت ہے جب کوئی نچلے درجے کے کسی شخص پر غصہ کرتا ہے اور جانتا ہے کہ وہ انتقام لینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اگر کوئی اعلیٰ درجے کے کسی پر غصہ کرتا ہے اور انتقام لینے کے قابل نہیں ہوتا ہے تو خون پھیلنے کے بجائے بیرونی جلد سے دل میں جمع ہو جاتا ہے اور غم اور غم کا سبب بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس حالت میں چہرہ زرد پڑ جاتا ہے۔ اگر کوئی برابر کے درجے کے شخص پر غصہ کرتا ہے تو یہ دونوں حالتیں ظاہری طور پر ظاہر ہوتی ہیں - چہرہ کبھی سرخ اور کبھی زرد ہو جاتا ہے۔ یہ پریشانی کی کیفیت ہے۔

غصے کی واضح علامات: غصے کی علامات جو بیرونی جسم پر ظاہر ہوتی ہیں وہ یہ ہیں کہ چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے، جسم کانپنے لگتا ہے اور اعضاء کے اعمال میں کوئی نظم و ضبط اور توازن نہیں رہتا ہے یہاں تک کہ منہ سے جھاگ بہنا شروع ہو جاتا ہے، آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں، ناک پھول جاتی ہے اور سکڑ جاتی ہے اور چہرہ مسخ ہو جاتا ہے۔ غصے کے وقت اگر غصے میں کوئی شخص اپنے چہرے کی طرف دیکھے گا تو وہ اپنی آنکھوں میں ذلیل ہو جائے گا اور اپنی بدصورتی پر اس قدر شرمندہ ہو جائے گا کہ سارا غصہ ختم ہو جائے گا۔ یہ سوچنا چاہیے کہ جب غصہ جسم پر اتنا برا اثر ڈالتا ہے کہ چہرہ مسخ ہو جاتا ہے تو اس کا باطن پر کتنا برا اثر پڑے گا اور اس سے اس پر کتنا برا اثر پڑے گا۔ بیرونی وجود باطن کا عنوان اور آئینہ دار عکاس ہے۔ سب سے پہلے، اندرونی وجود خراب ہو جاتا ہے پھر یہ خرابی بیرونی ظاہری شکل کی طرف بڑھ جاتی ہے۔ بیرونی کی تبدیلی کا پھل اور اندرونی تبدیلی کا نتیجہ ہے۔ غصے کا زبان پر اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان کوسیوں اور اس طرح کے گندے الفاظ استعمال کرنے لگتا ہے کہ جب حساس اور مہذب لوگ ان کو سنتے ہیں تو وہ شرمندگی سے بھر جاتے ہیں۔ ان کو بولنے میں شرم آئے گی، بشرطیکہ وہ غصے کی حالت میں نہ ہو یا جب غصہ ختم ہو جائے اور وہ اپنے غصے اور بکواس اور فحاشی کی کیفیت کو یاد کرے، الفاظ کو فحاشی کے ساتھ صحیح طور پر ادا کرنے کے قابل نہ ہو، اور نہ ہی جملوں میں منطقی ترتیب برقرار رکھنے کے قابل ہو، اس کے بجائے وہ زیادہ تر الفاظ ادا کرے جن کا کوئی مطلب بھی نہیں تھا۔

غصے میں اعتدال کی ڈگری: بالکل بھی غصہ نہ ہونا مطلوب نہیں ہے۔ وہ غصہ مطلوبہ ہے جو عقل اور راہ الٰہی (دین) کے تابع ہو تاکہ یہ اس وقت آتا ہے جب استقامت کی ضرورت ہو [مثال کے طور پر ایسے حالات میں جہاں صریح گالیاں ، ظلم اور ظلم نظر آتے ہیں] اور جب تحمل کی ضرورت ہو تو نہیں آتا۔ اعتدال کی حدود میں رکھنا وہ استقامت ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے اور جس کی تعریف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں کی ہے:

خیر الامور اوساطها

"سب سے بہتر معاملات وہ ہیں جو اعتدال پسندی کی حدود میں ہیں [زندگی کے تمام معاملات میں انتہا پسندی اور انتہا پسندی سے گریز کرنا]۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث کا مجموعہ *بیہقی*)

جو شخص ایسے مواقع پر بھی غصہ نہیں کرتا جب بزدل بہادر ہو جاتے ہیں [اپنے اردگرد کی غلطیوں کے لیے باضمیر ہونے کی وجہ سے]، اسے خود کو ٹھیک کروانا چاہیے۔ اسی طرح جس کا غصہ حد سے تجاوز کر چکا ہے

وہ بھی اس وقت تک علاج کا محتاج ہے جب تک کہ وہ حد سے زیادہ اور اعتدال پسند غصے میں فرق نہ کر سکے۔ دوسرے لفظوں میں ، غصے کو غیر موجودگی (یا کمی) اور زیادتی دونوں میں ٹھیک کرنے کی ضرورت ہے۔ اچھی حالت اعتدال کی وہ حالت ہے جسے قرآن مجید نے "استقامت کا سیدھا راستہ" قرار دیا ہے (سورۃ البقرۃ باب 1، آیت 6) اگرچہ یہ "استقامت کا سیدھا راستہ" بال سے پتلا اور تلوار سے تیز ہے [جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمام انتہاؤں کے درمیان توازن اور اعتدال کا راستہ نازک ہے اور اس پر عمل کرنا مشکل ہے، جیسا کہ انسانی مزاج اعتدال پسندی کے درمیانی راستے سے انسانی وجود کے تمام معاملات میں انتہائی رجحانات اور عہدوں کی طرف مڑ جاتا ہے]۔ جو اعتدال پسندی کی حالت تک نہیں پہنچ پاتا اسے مایوسی کے سامنے جھکنے کی بجائے اس کے زیادہ سے زیادہ قریب جانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ جو سب کچھ اچھے طریقے سے کرنے کے قابل نہیں ہے وہ سب کچھ برا طریقے سے کرے۔ بعض برائیاں دوسری برائیوں کے مقابلے میں ہلکی ہوتی ہیں اور کچھ اچھی چیزیں دوسری اچھی چیزوں سے افضل ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے نیکی کرنے اور برائی سے بچنے کے قریب رہنا چاہیے۔ نیکی کرنے میں کامیابی اور استطاعت صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

کیا روحانی جدوجہد کے ذریعے غصے کو ختم یا کم کیا جا سکتا ہے؟

اگر کسی کی پیاری چیز چھین لی جاتی ہے، چوری کی جاتی ہے یا خراب ہو جاتی ہے، تو وہ اس پر غصہ کر لیتا ہے۔ تین طرح کی چیزیں ہیں جن سے کوئی محبت کرتا ہے۔ پہلی قسم میں ایسی چیزیں شامل ہیں جو سب کے لئے ضروری ہیں جیسے کھانا ، رہائش گاہ ، لباس ، اور صحت وغیرہ۔ اگر کوئی جسم کو نقصان پہنچانے یا زخمی کرنے کے لیے کسی کو مارتا ہے تو ایسے شخص کے خلاف غصہ ہونا چاہیے کیونکہ جسم (یا بیرونی وجود) کی حفاظت ضروری ہے۔ کوئی بھی ایسی چیزوں کو تباہ کرنا پسند نہیں کرتا جو کسی کی بقا کے لئے ضروری ہیں اور اس طرح کے نقصانات کے خلاف غصہ ہونا چاہئے۔ دوسری قسم کی چیزیں جن سے کوئی محبت کرتا ہے ان میں وہ چیزیں شامل ہیں جو کسی انسان کے لیے ضروری نہیں ہیں جیسے شہرت، طاقت، دولت کی کثرت، نوکر، سواری وغیرہ۔ لیکن لوگ اپنی عادات اور جہالت کی وجہ سے ان کو ضروری سمجھتے ہیں اور ان سے اس حد تک محبت کرتے ہیں کہ اگر وہ ان میں سے کسی کو کھو دیتے ہیں تو ان کے غم اور غم کی شدت بہت زیادہ ہوتی ہے اور اس کے نتیجے میں ان کے نقصان پر اور ان لوگوں پر غصہ آجاتا ہے جن کو وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس نقصان کا سبب بنے۔ تیسری قسم کی چیزیں جن سے کوئی محبت کرتا ہے ان میں وہ چیزیں شامل ہیں جو کچھ کے لئے ضروری ہیں لیکن دوسروں کے لئے نہیں۔ مثال کے طور پر ، کتابیں ایک عالم کے لئے ضروری ہیں ، اسی وجہ سے ، ایک عالم کتابوں کو پسند کرتا ہے [اس کی مہارت کے شعبوں کی وجہ سے] لہذا اگر کوئی ان کو پھاڑ دیتا ہے ، جلا دیتا ہے یا ڈبو دیتا ہے تو وہ غصے میں آجاتا ہے۔

ان تین قسم کی چیزوں پر روحانی جدوجہد کا کیا اثر پڑتا ہے جن سے کوئی محبت کرتا ہے؟ پہلی قسم کے لئے ، غصے کو ختم کرنے کے لئے روحانی جدوجہد نہیں کی جاتی ہے ، بلکہ یہ اس لئے کی جاتی ہے کہ دل اب اس کے تابع نہ رہے اور ظاہری طور پر اسے صرف اس حد تک استعمال کیا جائے جو الٰہی شریعت اور عقل کو پسند ہے۔ یہ روحانی جدوجہد (*مجاہدہ*) اور اس سے نمٹنے میں کچھ دیر صبر و تحمل سے کام لینے کی کوشش کے ذریعے ممکن ہے یہاں تک کہ رواداری اور بردباری انسان کی دوسری فطرت بن جائے۔ دل سے غصے کو مکمل طور پر دور کرنا انسانی مزاج کا تقاضا نہیں ہے اور نہ ہی یہ ممکن ہے، لیکن اس کی شدت کو ختم کرنا اور اس کی طاقت کو کم کرنا ممکن ہے تاکہ باطنی وجود میں کوئی خلل نہ پڑے اور اس کا بیرونی پہلو پر ایسا اثر ہو کہ غصے کی موجودہ کیفیت کو کوئی دیکھ کر نہ بتا سکے۔ اگرچہ یہ ایک مشکل روحانی جدوجہد ہے لیکن یہ ناممکن نہیں ہے۔ اگر کوئی مسلسل کوشش کرتا ہے تو [غصے پر قابو پانے کی حالت حاصل کرنے میں] ناکامی کی کوئی وجہ نہیں ہوگی۔ تیسری قسم کی چیزوں کے لئے بھی یہی بات لاگو ہوتی ہے کیونکہ کچھ چیزیں کچھ چیزوں کے لئے ضروری ہوتی ہیں جیسے پہلی قسم کی چیزیں [جو تمام انسانوں کے لئے عالمگیر طور پر ضروری ہیں]۔ روحانی جدوجہد کے نتیجے میں دونوں قسم کی چیزوں پر ایک ہی اثر نظر آئے گا۔

دوسری قسم کی چیزوں پر جو غصہ آتا ہے، اس کا مکمل خاتمہ روحانی کشمکش کے ذریعے ان چیزوں کی محبت کو دل سے نکال کر اپنے آپ کو یقین دلایا جا سکتا ہے کہ اس کا وطن قبر ہے اور آخرت کا گھر ہے اور یہ دنیا صرف ایک پل ہے جسے انسان آخرت کے گھر تک پہنچنے کے لیے گزرتا ہے۔ یا دنیا صرف ایک [اسٹاپ اوور] اسٹیشن ہے جہاں کوئی آنے والے سفر اور اگلے اسٹیشن پر جانے کے لئے درکار انحصار (فراہمات) کو جمع کرنے کے لئے کچھ لمحوں کے لئے ٹھہرتا ہے جو کسی کی مستقل منزل ہے۔ اس کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ اس پر بوجھ ہے جس پر قبر میں اور آخرت میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ بے حسی اور دنیاوی مالوں سے لاتعلقی اختیار کر کے اپنے دل سے اپنی محبت کو دور کر دے۔ اگر کسی کو اپنے کتے سے محبت نہیں ہے تو ، وہ کسی کو مارنے پر ناراض نہیں ہوگا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غصہ محبت [اور کسی چیز سے وابستگی] کے تابع ہے۔ اس قسم کی چیزوں کے لیے روحانی جدوجہد کا مقصد غصے کو مکمل طور پر ختم کرنا ہے۔ تاہم ، ایسا ہونا بہت مشکل ہے ، اس کے بجائے ، غصے کو کمزور کرنا یا اس کے مضمرات پر عمل نہ کرنا آسان ہے۔ اگر یہ حاصل ہو جائے تو بھی کوئی مطمئن ہو سکتا ہے۔ وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کی قادر مطلق اور *توحید* پر غالب ہے اور ہر چیز کو خدا کی طرف سے عطا سمجھتا ہے جو قدرت اور استحقاق کے اندر ہے، وہ [خدا] کی مخلوقات پر غصہ نہیں کرتا [کیونکہ وہ جانتا ہے کہ خدا تمام معاملات کا حتمی نذر کرنے والا ہے اور کچھ بھی کسی تک نہیں پہنچتا، چاہے وہ اچھا ہو یا برا۔ سوائے اللہ کے حکم کے کے]، کیونکہ کسی کا یہ عقیدہ ہے کہ مخلوقات کو خود کوئی استحقاق حاصل نہیں ہے اور وہ سب خدائی قدرت اور قادر مطلق کی طرف سے مغلوب اور مغلوب ہیں بالکل اسی طرح جیسے قلم کسی مصنف کے ہاتھ میں ہے [تاکہ یہ قلم نہیں بلکہ ادیب جو لکھ رہا ہے اور قلم صرف وہی کر رہا ہے جو مصنف چاہتا ہے]۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی وحدانیت اور توحید کے غلبے کے نتیجے میں غضب کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں اچھی رائے رکھنا بھی اس سلسلے میں موثر ہے کیونکہ انسان سمجھتا ہے کہ جو کچھ بھی ہو گا، خدا کی طرف سے آتا ہے اور خدا کسی کے ساتھ جو کچھ بھی کرتا ہے وہ ایک اچھی چیز ہے چاہے وہ کسی کو بھوکا اور پیاس رکھنا ہو ، کسی کو زخمی کرنا ہو ، یا یہاں تک کہ کسی کے ذریعے اپنی جان گنوا دینا ہو۔ اس عقیدے کے بعد غصے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی جس طرح خون نکالنے والے شخص پر کوئی غصہ نہیں کرتا۔

اس بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ غصے کی آگ سے بچانے کا ایک ہی راستہ ہے جو دنیا کو مکمل طور پر دل سے ہٹا رہا ہے (غزالی جہاں بھی لفظ "دنیا" استعمال کرتا ہے، وہ دل کی دنیاوی وابستگیوں اور الجھنوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو دل کو تباہ کر دیتے ہیں جو انسانی وجود کا جوہر ہے، اور وہ دنیا کی طرف اشارہ نہیں کر رہے ہیں جیسا کہ غزالی نے بار بار ذکر کیا ہے کہ دنیا ابدی خوشی اور لامتناہی فتح کے حصول کا ذریعہ ہے)۔ یہ تبھی ممکن ہے جب طالب (حق کی راہ پر) (روحانی سیاح) دنیا کے نقصانات (یعنی دنیاوی وابستگیوں اور دلوں کی الجھنوں) سے آگاہ ہو۔ دنیاداری کی مذمت کی وضاحت آنے والی ہے جہاں ان نقصانات کی وضاحت کی جائے گی۔ یہاں یہ بتانا کافی ہے کہ جس کا دل دنیا کی محبت سے خالی ہو جاتا ہے، وہ غصے کی زیادہ تر وجوہات سے محفوظ رہتا ہے۔ ایسی وجوہات جن کو مکمل طور پر ختم نہیں کیا جا سکتا، [پھر بھی] کمزور ہو سکتے ہیں، اور ان کو کمزور کرنے سے غصہ بھی کمزور ہو سکتا ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے اس کوشش میں صحیح اور نتیجہ خیز کامیابی (*توفیق*) کی خوبصورتی چاہتے ہیں۔

غصے کی وجوہات

یہ بات اب تک اچھی طرح معلوم ہو چکی ہے کہ کسی بیماری کے علاج کا طریقہ اس کے مادے اور اسباب کو ختم کرنا ہے۔ حضرت یوحنا علیہ السلام نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھا: کون سی چیز زیادہ مشکل ہے؟ اس نے جواب دیا: تمہارا غصہ۔ یوحنا نے پوچھا: "غصہ کیوں ہوتا ہے اور اس کی پرورش کی کیا وجوہات ہیں؟" یسوع نے کہا: تکبر، تکبر، عزت اور شہرت کی خواہش۔ غصے کی شدت کو بڑھانے والے عوامل یہ ہیں: تکبر ، تضحیک ، مبالغہ آرائی ، اشتعال انگیزی ، کسی کی گفتگو میں خلل ڈالنا ، سخت اصرار ، مادی املاک اور شہرت کا لالچ وغیرہ۔ یہ سب برے اور تباہ کن اخلاق، آداب، مزاج اور باطنی مزاج کے دائرے میں آتے ہیں، اور الٰہی قانون میں ان کی

مذمت کی جاتی ہے۔ ان وجوہات کی موجودگی غصے سے چھٹکارا حاصل کرنا ناممکن بنا دیتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ غصے کے اسباب میں سے اگر کسی کے پاس غصے کے اسباب میں سے ایک یا ایک سے زیادہ ہو تو ان سے نمٹا جائے اور ان کے مخالفین کے ذریعے ان کا مقابلہ کیا جائے۔ لہٰذا تکبر کو اپنے نچلے نفس کی مذمت کے ذریعے (حقیقی باطنی) عاجزی، راستبازی اور خود تکبر کو دور کیا جانا چاہیے، اور اس عقیدے سے تکبر کو دور کیا جانا چاہیے کہ دوسرا شخص بھی انسان ہے اور دوسرے بندوں کی طرح بھی خدا کا بندہ ہے، [تمام] لوگ درحقیقت ایک ہی باپ کے بیٹے اور بیٹیاں ہیں [اور ماں، یعنی آدم اور حوا] جو بعد میں جغرافیائی، ثقافتی، لسانی، نسلی، قبائلی، مذہبی اور نسلی خطوط پر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے اور اختلافات کی دیواریں ابھر کر سامنے آئیں [جس نے انضمام اور ہم آہنگی میں رکاوٹ ڈالی]، لیکن سب اپنی انسانیت میں برابر ہیں۔ غرور (اس تناظر میں استعمال ہونے والا لفظ کسی کی اندرونی خوشی اور خوشی کے معنی میں ہے، نہ کہ "غرور" کے معنی میں) باطنی فضیلت پر ہونا چاہیے [جو اچھے، صحت مند ، تعمیری اور مثبت اخلاقیات ، آداب ، مزاج اور اندرونی مزاج ہیں جو کسی کے باطنی وجود اور کسی کی حقیقی حقیقت - دل اور روح کی خصوصیات ہیں]۔ تکبر ، تکبر اور تکبر تباہ کن برائیاں ہیں جو بری اندرونی برائیوں کی جڑیں اور بنیاد ہیں اور اگر آپ ان سے خالی نہیں ہیں تو ، آپ دوسروں سے بالکل بہتر نہیں ہیں۔ فخر آپ کے لئے مناسب نہیں ہے۔ دوسرے لوگ ، جن کے مقابلے میں آپ فخر محسوس کرتے ہیں ، آپ سے کس طرح کمتر ہیں اور کن طریقوں سے؟ جس طرح تمہاری ناک، کان اور آنکھیں ہیں، اسی طرح ان کے اعضاء ایک ہی اعضاء ہیں، وہ ایک ہی باپ (آدم علیہ السلام) کی اولاد ہیں جس کی اولاد تم بھی ہو [اور اس لیے وہ تمہارے بھائی اور بہنیں ہیں]۔ ایمان پر عمل کرنے سے متعلق سنجیدہ معاملات میں شامل ہو کر مزاح کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے [جو اخلاقی صداقت اور روحانی جدوجہد کا مطالبہ کرتے ہیں تاکہ نیچے، گھٹیے، باطنی صفات، مزاج اور رجحانات کو ختم کیا جا سکے اور ان کی جگہ اعلیٰ اخلاق، آداب، صفات، مزاج اور مزاج استعمال کیے جائیں جن کے لیے زندگی بھر بہادری اور مستقل جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے] تاکہ کسی کو فضول کوششوں میں ملوث ہونے کا وقت بھی نہ مل سکے۔ انسان کو اپنے آپ کو باطنی فضیلتوں، اخلاق اچھے اخلاق، اخلاق اور باطنی مزاج اور دینی علوم کے حصول میں مشغول کر کے بیکار کاموں سے پرہیز کرنا چاہیے جو انسان کو ان عظیم مقاصد کی طرف لے جاتا ہے اور روح کی تطہیر اور تطہیر کا باعث بنتا ہے، پہلے انسان کو ہم آہنگ اور انسان بناتا ہے اور پھر انسانی کارنامے کی بلندی کی طرف لے جاتا ہے جو قربت اور معرفت ہے(الٰہی) کے اس عقیدے کے ساتھ کہ یہ چیزیں انسان کو آخرت کی ابدی خوشی اور لامتناہی کامیابی (*سعدہ*) کی طرف لے جاتی ہیں۔ مذاق اڑانے کے بارے میں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جس طرح مجھے دوسرے لوگوں کا مذاق اڑانے سے تکلیف ہوتی ہے، اسی طرح دوسروں کو بھی میری طرف سے مذاق اڑانے کی پریشانی ہوتی ہے، اسی لیے کسی کا مذاق نہیں اڑانا چاہیے۔ غلطی تلاش کرنے کی عادت کو اپنی زبان سے کوئی برا لفظ نہ بول کر ترک کیا جا سکتا ہے، ورنہ [غلط ڈھونڈنے والے انداز میں] مخاطب ہونے والا شخص بھی زبان برقرار رکھتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ جس شخص سے مخاطب کیا گیا ہو ، اس سے بھی زیادہ سخت بات کہہ دے۔ لالچ کی شدت کا خاتمہ صرف اس چیز کے ساتھ اطمینان کے ذریعے ممکن ہے جس کی ہمیں واقعی ضرورت ہے [جیسا کہ سمجھے جانے والے ضروریات کے برعکس جو حقیقت پسندانہ بھی نہیں ہوسکتے]۔ قناعت میں وقار اور غیر ضروری چیزوں سے غفلت میں ہے جبکہ کسی یا کسی چیز کی محتاج ہونے میں ذلت ہے۔

ان [منفی اور] قابل مذمت داخلی خصلتوں، مزاج، رجحانات، آداب اور مزاج میں سے کسی بھی صفت کا علاج آسان نہیں ہے۔ اس کے بجائے ، مشکلات اور شدید اندرونی روحانی جدوجہد کو برداشت کرنے کی ضرورت ہے۔ اس باطنی روحانی کشمکش کا مقصد سب سے پہلے ان تمام برے باطنی خصلتوں، طبیعتوں، رجحانات، آدابوں، مزاجوں اور مکروہ عادات کے نقصانات سے آشنا ہونا ہے تاکہ دل ان سے بیزار ہو جائے اور ان کی برائیاں واضح ہو جائیں۔ اس کے بعد انسان کو ان پست اور برے باطنی خصلتوں، مزاج، رجحانات، آداب اور مزاجوں کے مخالفوں پر عمل کرنے کی ضرورت ہے اور جب تک ان کی دوسری فطرت بننے میں وقت لگے گا اور جب تک وہ عادت بن جائیں اور ان پر عمل کرنا مشکل نہ رہے۔ غصے سے چھٹکارا *پانے کے لیے نفس کے لیے ضروری ہے* کہ وہ ان باطنی برائیوں سے پاک ہو کیونکہ وہ غصے کی پیدا ہونے والی اور پرورش کرنے والی [برائی] عادات کا منبع اور منبع ہیں۔

جاہلوں کو ایک اور وجہ سے غصہ آتا ہے۔ یہ قابل رحم لوگ اپنی جہالت اور عدم فہم کی وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ غصے کا اظہار کرنے میں مردانگی اور بہادری ہے اور جو لوگ غصے میں نہیں آتے وہ "مرد" کہلانے کے مستحق نہیں ہیں۔ ایسے لوگ غصے کو عزت نفس، اعلیٰ آرزو اور وقار سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کے نام اچھے

لیتے ہیں یہاں تک کہ نفس اس کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور اسے اچھا سمجھنا شروع کر دیتا ہے۔ غصے کو عزت نفس اور بہادری کہنا جہالت ہے بلکہ یہ دل کی بیماری ہے اور عقل کی خرابی کا اشارہ ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ایک بیمار شخص صحت مند شخص سے زیادہ غصہ کرتا ہے کیونکہ ایسا کمزور دل ہوتا ہے۔ ایک بد اخلاق اور بد اخلاق شخص ایک نیک اخلاق اور نیک شخص سے زیادہ غصے کا شکار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ایک لقمہ کی خاطر ایک حقیر اور ایک دانہ کی خاطر کنجوس غصہ آتا ہے۔ ان جاہلوں کے ساتھ سلوک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ انہیں صالحین کی رواداری، بردباری، درگزر و برفی اور فراخدلی کی روایات بتائیں اور کہا جائے کہ وہ اپنے غصے کو روکتے تھے۔ ایسی روایات انبیاء، سنتوں، گنوسٹکوں، دانشمندوں، علماء اور اچھے رہنماؤں سے بھی آئی ہیں جبکہ اس کے برعکس روایات جاہلوں اور احمقوں کی طرف سے آئی ہیں۔

اشتعال انگیزی کے بعد غصے کا علاج

اب تک کی بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ غصے کی وجوہات کو دور کر دیا جائے اور اس کی موروثی وجوہات کو ختم کیا جائے تاکہ غلط طریقے سے غصہ کبھی نہ ہو۔ یہاں مقصد یہ بتانا ہے کہ اگر کسی کو غصہ آتا ہے تو اسے کیا کرنا چاہئے۔ کیا اس کے مضمرات پر عمل کرنا چاہیے یا استقامت سے عمل کرنا چاہیے اور نفس کو غضب کے مضمرات پر عمل کرنے سے روکنا چاہیے؟ ظاہر ہے کہ مؤخر الذکر ذہانت کا اظہار ہے اور یہ ایک عظیم روحانی جدوجہد ہے اور اس کا اختتام علم اور عمل سے ہوتا ہے۔

علم کے ذریعے غصے کا خاتمہ: علم کے بنیادی اصول درج ذیل چھ معاملات ہیں: **سب سے پہلے** غصے، درگزر، بردباری اور بردباری پر قابو پانے کی برتری اور فضیلت کے بارے میں ماضی کے واقعات اور روایات پر غور و فکر کرنا چاہیے اور اس کا نتیجہ ان فضیلت کے حصول کی خواہش کو بیدار کرنا ہوگا۔ یہ خواہش انتقام لینے سے روکے گی اور غصے کی آگ بجھا دے گی۔ حضرت مالک بن اوس بن الحذان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ خلیفہ عمر رضی اللہ عنہ کسی پر غصہ کر کے اس نے اس کو سزا دینے کا حکم دیا۔ اس شخص نے کہا: اے مومنین کا سردار! براہ کرم اس آیت پر غور کریں:

خُذِ ٱلْعَفْوَ وَأْمُرْ بِٱلْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ ٱلْجَٰهِلِينَ

"معافی پر عمل کرو اور لوگوں کو نیک اعمال کرنے کی تلقین کرو اور جہالتوں سے پرہیز کرو۔" (سورۃ البقرۃ سورۃ البقرۃ آیت ۱۹۹)

اس روایت کے راوی کہتے ہیں کہ عمر رضی اللہ عنہ اس آیت کو بار بار پڑھتے تھے اور اس کے معنی پر غور و فکر کرتے تھے۔ یہ اس کا معمول تھا۔ قرآن کے معانی اور فہم پر زبردست عبور حاصل کرنے کے باوجود وہ قرآن پر غور و فکر کرتے رہے۔ چنانچہ اس آیت نے انہیں غور و فکر کی دعوت دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس شخص کو مہلت ملی اور وہ اس سے باہر نکل گیا۔

دوسری بات یہ کہ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرایا جائے اور اسے بتائے کہ اللہ تعالیٰ ایک پر دوسرے پر جو کچھ ہے اس سے کہیں زیادہ طاقت رکھتا ہے۔ اگر میں کسی دوسرے پر اپنا غصہ نکالنے کی کوشش کروں تو ممکن ہے کہ قیامت کے دن خدا کے غضب سے بچ نہ سکوں جب میں معافی اور رحمت کا زیادہ محتاج ہوں۔ بعض الہامی صحیفوں میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ وحی نازل فرمائی: "اے انسان! جب تم غصہ کرو تو مجھے یاد کرو میں تمہیں اس وقت یاد کروں گا جب تم پر اپنی ناراضگی ہو گی اور تمہیں ان لوگوں میں شامل نہیں کروں گا جو ہلاک ہو چکے ہیں۔ بیان کیا ہے کہ حکیم (داناء) لازمی طور پر بنی اسرائیل کے بادشاہوں کے ساتھ آتے تھے۔ جب بھی کوئی بادشاہ غصہ کرتا تھا تو اس کا دانا ساتھی اس کے سامنے ایک کاغذ پیش کرتا جس پر

لکھا ہوتا تھا کہ مسکینوں پر رحم کرو اور موت سے ڈرو اور آخرت کو یاد رکھو۔ کنگ اس تحریر کو پڑھتا تھا اور پرسکون ہوجاتا تھا۔

تیسری بات یہ کہ دشمنی اور انتقام کے نتائج اور دشمنی کے نتیجے میں آنے والے مصائب اور مشکلات سے اپنے آپ کو خوفزدہ رکھنا چاہیے کہ جس پر میں غصہ کروں گا وہ میرا مخالف بن جائے گا اور میرے لیے مصیبت پیدا کرنے کی کوشش کرے گا۔ لیکن دنیاوی خیالات، مصائب اور مشکلات کی خاطر غصہ نہ کرنا بھی خطرات سے خالی نہیں ہے، کیونکہ اس میں دنیاوی زندگی کو خوشگوار رکھنے کی ہوس اور خواہش مضمر ہے۔ یقینا یہ آخرت کا کام نہیں ہے بلکہ یہ غضب پر ہوس مسلط کرنے والا ہے۔ غصے کی طرح ہوس بھی ایک برائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی خاطر غصے کو دبانے سے خدا کی طرف سے ایک بھی اجر نہیں ملے گا۔ اگر کوئی دنیاوی پریشانی دل اور جسم کے سکون میں رکاوٹ ڈال رہی ہے تو اس کا خاتمہ یقینا اللہ تعالیٰ کا اجر ملے گا۔

چوتھی بات یہ ہے کہ جب کوئی غصہ آتا ہے تو اس کی ظاہری شکل و صورت کی بدصورتی کا تصور کرنا چاہیے کیونکہ غصے کی وجہ سے یہ بدصورت نظر آنے کا ایک اہم عنصر ہے۔ جس طرح غصے کے وقت لوگوں کے چہرے مسخ ہوجاتے ہیں ، اسی طرح میرا اپنا چہرہ مسخ ہوجاتا ہے۔ اس طرح دل میں غصے کی نفرت پیدا ہوگی۔ یہ بھی سوچنا چاہیے کہ غصے میں آنے والا شخص پاگل کتے اور خونخوار جنگلی جانور کی مشابہت رکھتا ہے جبکہ جو شخص بردبار، بردبار اور غصے کا شکار نہیں ہوتا ہے وہ اپنی خصوصیات میں انبیاء، اولیاء اور عقلمند سے مشابہت رکھتا ہے۔ اس موقع پر انسان کو یہ انتخاب کرنا چاہیے کہ وہ کتوں، درندوں اور برے لوگوں سے مشابہت رکھنا چاہتا ہے یا انبیاء اور علماء سے مشابہت رکھنا چاہتا ہے۔ اگر نفس میں ذرے برابر بھی شائستگی اور ایمان موجود ہو تو یقینا وہ علماء اور انبیاء کی پیروی کی طرف مائل ہو گا اور کبھی بھی کتوں کی مانند نہیں ہونا پسند کرے گا۔

پانچویں بات یہ کہ اس وجہ پر غور کرنا چاہیے جو انتقام کی دعوت دینا اور غصے پر قابو پانا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ ظاہر ہے ، یقینی طور پر اس کی ایک وجہ ہوگی کیونکہ غصہ بغیر کسی وجہ نہیں آتا ہے۔ مثال کے طور پر اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ شیطان انتقام لینے کے لیے اکساتا ہے اور دل میں ایسے خیالات پیدا کرتا ہے کہ اگر تم اپنے غصے پر قابو پاؤ اور انتقام نہ لے تو لوگ تمہیں نااہل اور شکست خوردہ قرار دیں گے، وہ تمہیں ذلیل اور توہین کریں گے اور تمہیں حقیر سمجھیں گے۔ اگر یہی وجہ ہے تو انسان اپنے نفس سے یہ کہنا چاہیے کہ تم دنیاوی زندگی کی ذلت اور ذلت کو پسند نہیں کرتے، اور اس سے بچنے کے لیے انتقام لینے کی طرف مائل ہو، لیکن تم قیامت کے دن اس عظیم رسوائی کا سامنا کرنے کے بارے میں نہیں سوچتے جب کوئی شخص تمہارا ہاتھ پکڑے گا اور تم سے انتقام لے گا اور تم ایسا نہیں کر سکے گا کچھ۔ آپ لوگوں کی نظروں میں کم ہونے سے ڈرتے ہیں لیکن نبیوں ، اولیاء اور فرشتوں کی نظر میں کم ہونے کا خوف نہیں رکھتے ہیں۔ اللہ کی خاطر غضب کو دور کیا جائے، تمہیں انسانوں سے کیا چاہیے (جیسا کہ یہ ان کی خاطر نہیں کیا جاتا)؟ کیا ذلت اور عزت ان کے ہاتھ میں ہے؟ اگر کوئی آپ پر ظلم بھی کرے تو آپ کو انتقام نہیں لینا چاہیے کیونکہ یہ ظلم قیامت کے دن ظالم کے لیے بڑی ذلت کا باعث بنے گا۔ کیا تم قیامت کے دن کھڑے ہونا پسند نہیں کرتے جب یہ اعلان کیا جائے گا کہ جس کا اللہ کی طرف سے اجر واجب ہے وہ کھڑے ہو جائے گا تو وہ لوگ کھڑے ہو جائیں گے جو ظالموں کو معاف کر دیں گے [اور اس طرح ان کی عظمت کی وجہ سے بے پناہ اجر کے مستحق ہو گئے ہیں]؟

چھٹا یہ کہ انسان کو یہ سوچنا چاہیے کہ میرا غصہ واقعی اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ میری خواہش اور خواہشات کے مطابق کچھ چیز کیوں نہیں ہوئی اور وہ خدا کی مرضی اور ارادے کے مطابق کیوں ہوا؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میرا مقصد خدا کے مقصد سے افضل ہے؟ خدا کی مرضی سے ایسا ہی ہو گا۔ میرے غصے اور غصے کا کوئی اور نتیجہ نہیں ہو سکتا کہ میں اس کی سزا کا سامنا کروں اور خدا کا عذاب لے جاؤں گا۔

اعمال کے ذریعے غصے کو بھڑکانے کا خاتمہ: اگر کسی کو غصہ آ جائے تو اسے زبان سے یہ کہنا چاہیے:

أعوذ بالله من الشيطان الرجيم

"میں شیطان سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غصے کے وقت ایسا ہی کہنے کی نصیحت کی ہے۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث میں سلیمان بن سرد *رضی اللہ عنہ سے صحیح بخاری* اور *صحیح مسلم* کا مجموعہ ہے

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو غصہ آتا تھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی ناک پکڑتے تھے اور فرماتے تھے: اے اویش! (اللہ سے دعا کرنے کے لئے) اس طرح کہو:

اَللّٰهُمَّ رَبَّ النَّبِيِّ مُحَمَّدٍ اغْفِرْ لِيْ ذَنْبِيْ وَاَذْهِبْ غَيْظَ قَلْبِيْ وَاَجِرْنِيْ مِنْ مُضِلَّاتِ الْفِتَنِ

اے اللہ! محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پروردگار! میرے گناہوں کو بخش دے، میرے دل سے غصہ دور کر اور مجھے آزمائشوں اور مصیبتوں سے محفوظ رکھ جو انسان کو گمراہی کی طرف لے جاتی ہیں۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث کا مجموعہ *ابن سنی فی الیوم و لیلیٰ*)

غصے کے وقت یہ دعا کرنا مستحب ہے۔ اگر اس کے بعد بھی غصہ برقرار رہے تو اس اجتماع کو تبدیل کر کے کھڑے ہونے کی صورت میں بیٹھ جائے، بیٹھنے کی صورت میں لیٹ جائے اور اس زمین کے قریب ہو جائے جہاں سے پیدا کیا گیا ہے، اس سے نفس میں عاجزی پیدا ہو جائے گی*نفس*)۔ بیٹھنے اور لیٹنے میں یہ مصلحت ہے کہ دل پرسکون ہو جاتا ہے کیونکہ غصے کا سبب گرمی ہے اور گرمی حرکت سے ہوتی ہے۔ اگر حرکت رک جائے تو گرمی ختم ہو جائے گی اور غصہ بھی ختم ہو جائے گا۔ اگر غصہ اس حکمت عملی سے ختم نہ ہو تو وضو کرنا چاہیے یا ٹھنڈے پانی سے غسل کرنا چاہیے کیونکہ آگ پانی سے بجھ جاتی ہے جیسا کہ ایک نبوی روایت میں بیان کیا گیا ہے:

ان الغضب من الشيطان وان الشيطان خلق من النار وانما تطفا النار بالماء فاذا غضب احدكم فليتوضا

"غضب شیطان کی طرف سے ہے اور شیطان آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور آگ پانی کے ذریعے بجھ جاتی ہے۔ اگر تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو وضو کرنا چاہیے۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *احادیث* کا مجموعہ *ابو داؤد* عطیہ سعدی رضی اللہ عنہ سے

ایک اور نبی روایت غضب کے وقت سجدہ کرنے کی طرف اشارہ کرتی ہے کیونکہ اس حالت میں انسان سب سے زیادہ عاجز جگہ (یعنی زمین) پر بہترین [جسمانی] اعضاء (پیشانی اور گال) رکھتا ہے۔ اس موقع پر سجدے کی حکمت یہ ہے کہ دل میں عاجزی اور عاجزی پیدا ہوتی ہے اور اس دل سے غرور، تکبر اور برتری کا احساس دور ہو جاتا ہے جو غصے کو بھڑکاتا ہے۔

تحمل کی عمدگی

برداشت، نرمی اور نرمی غصے پر قابو پانے سے بھی افضل ہے کیونکہ غصے پر قابو پانے کا مطلب زبردستی برداشت کرنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ، جو اپنے غصے کو روکتا ہے وہ وہی ہے جو پہلے ہی غصے میں آگیا ہے۔ یہ ایک مشکل مرحلہ ہے اور ایک سخت روحانی مشق ہے، لیکن [غصے پر قابو پانے میں] مسلسل کوششیں زبردستی برداشت کرنے کی ضرورت کو ختم کر دیں گی، اس کے بجائے انسان آہستہ آہستہ غصہ نہ کرنے کا عادی ہو جائے گا۔ اگر غصہ بھی آ جائے تو اسے چھوڑنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوگی۔ یہ فطری تحمل ہے اور اس تحمل کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی عقل کامل ہے، عقل پر حاوی ہے اور غصے کی قوت بھی عقل کے تابع ہے۔ اس سے معلوم ہوا ہے کہ غصے پر قابو پانا تحمل کا ابتدائی مرحلہ ہے اور فطری فطری تحمل اس کا اختتام ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انما العلم بالتعلم والحلم بالتحلم ومن يتخير الخير يعطه ومن يتوق الشر يلقه

"علم سیکھنے سے حاصل ہوتا ہے اور صبر جان بوجھ کر باضمیر کوششوں کے ذریعے برداشت کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ جو نیکی کا ارادہ کرے گا اسے بھلائی ملے گی اور جو برائی سے بچتا ہے وہ اس سے محفوظ رہے گا۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *احادیث* کا مجموعہ *طبرانی* اور *دارقطانی* ابو الدردہ رضی اللہ عنہ سے ہے

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

اطلبوا العلم واطلبوا مع العلم السكينة والحلم، لينوا لمن تعلمون ولمن تتعلمون منه، ولا تكونوا من جبابرة العلماء، فيغلب جهلكم علمكم

انہوں نے کہا کہ علم حاصل کریں اور علم کے ساتھ ساتھ باوقار سکون اور تحمل کی تلاش کریں۔ اپنے طالب علم اور استاد کے ساتھ نرم اور نرم انداز میں سلوک کریں۔ سخت گیر اور سخت گیر علماء میں شامل نہ ہو تاکہ تمہاری جہالت تمہارے علم پر غالب آجائے۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *احادیث* کا مجموعہ *ابن سنی فی ریاضۃ المتعلیمین*)

اس میں بتایا گیا ہے کہ تکبر اور احساس برتری غصے کو جنم دیتی ہے اور یہی باطنی خصوصیات انسان کو تحمل اور نرمی سے روکتی ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان الفاظ میں دعا کرتے تھے:

اَللّٰهُمَّ أَغْنِنِىْ بِالْعِلْمِ، وَزَيِّنِّىْ بِالْحِلْمِ، وَأَكْرِمْنِىْ بِالتَّقْوٰى، وَجَمِّلْنِىْ بِالْعَافِيَةِ

"اے خدا! مجھے علم سے مالا مال کر، مجھے بردباری اور نرمی سے آراستہ کر، مجھے پاکیزہ خوف اور احترام اور اپنے خوف سے نواز، اور مجھے صحت اور سلامتی سے نواز۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

ابتغوا الرفعة عند الله، قالوا وماهي يا رسول الله! قال تصل من قطعك، وتعطي من حرمك، وتحلم عمن جهل عليك

"خدا کے ساتھ عظمت کی تلاش کریں"۔ لوگوں نے پوچھا: کیا چیز ایسی ہے جو اللہ کے ہاں بلند مقام حاصل کرتی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اپنے رشتہ داری کو اس سے قائم رکھو جو ان کو توڑتا ہے، جو تمہیں محروم کرتا ہے اسے دے دو، اور جو تم کے ساتھ جہالت کا سلوک کرتا ہے اس کے ساتھ بردباری اور نرمی سے پیش آؤ۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیثی مجموعہ حکیم *اور* بیہقی)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک شخص نے دعا کی: اے اللہ! میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے جو میں صدقہ میں دے سکوں، لیکن میں اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ جس نے مجھے تکلیف پہنچائی ہے اسے معاف کر دوں اور وہ میرے حق میں صدقہ بن جائے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ وحی نازل فرمائی کہ اس دعا کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معاف کر دیا ہے۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے احادیث کے مجموعے ابو نعیم فی صحابہ *اور* بیہقی فی الشعب)

ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھا: کیا تم میں سے کوئی ابو دمدام جیسا نہیں بن سکتا؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: ابو دمدام کون ہے اور اس کی کیا خصوصیت ہے کہ ہم اس کی طرح نہیں ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ پہلے امتوں کا آدمی تھا جو صبح اٹھ کر یہ دعا کرتا تھا: اے اللہ! آج میں صدقہ میں ان لوگوں کو اپنی عزت اور عزت دیتا ہوں جو مجھ پر ظلم کرتے ہیں۔"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ثلاث من لم تکن فیہ واحدۃ منھن فلا تعتدوا بشئ من عملہ، تقوىٰ تحجزہ عن معاصی اللہ عزوجل وحلم یکف بہ السفیہ، وخلق یعیش بہ فی الناس

"تین چیزیں ایسی ہیں کہ اگر وہ کسی ایک میں موجود نہ ہوں تو اپنے اعمال کو اہم نہ سمجھیں: خدا کی نافرمانی سے روکنے، خدا کی نافرمانی سے روکنے والی *تقویٰ*، حماقت اور باطنی صفات *جن* کے ساتھ لوگوں کے درمیان اپنی زندگی گزارنے کے لیے وقف کیا جاتا ہے"۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *ام سلمہ* رضی اللہ عنہ سے حدیث *کا مجموعہ* طبرانی)

غصے کے لحاظ سے لوگوں کی مختلف حالتیں: غصے کے لحاظ سے لوگوں کی مختلف حالتیں ہوتی ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو اپنے غصے کو دبانے کی صلاحیت نہیں رکھتے لیکن جلد ہی اپنی اصل حالت میں واپس آ جاتے ہیں، کچھ غصہ ظاہر نہیں کرتے بلکہ اپنے دلوں میں دشمنی اور بغض کو ہمیشہ کے لیے برقرار رکھتے ہیں۔ اگر ہم غور کریں تو غصے کے لحاظ سے چار قسم کے لوگ ہوتے ہیں: ایک تو گھاس کی طرح جو جلدی آگ لگ جاتی ہے لیکن جلد ہی بجھ جاتی ہے۔ دوسرا ، کوئلے کی طرح جو دیر سے آگ پکڑتا ہے اور دیر سے بجھتا ہے۔ تیسری بات یہ کہ گیلی لکڑی کی طرح جو دیر سے آگ لگتی ہے اور جلد ہی بجھ جاتی ہے - یہ حالت بہت اچھی ہے بشرطیکہ یہ بے حسی سے باہر نہ ہو۔ چوتھی بات یہ کہ کسی ایسی چیز کی طرح جو جلدی آگ لگ جاتی ہے اور دیر سے بجھ جاتی ہے - ایسے لوگ کافی برے ہوتے ہیں۔ بالکل بھی غصہ نہ کرنا اچھی بات نہیں ہے۔ امام شافعی علیہ السلام نے فرمایا: جو شخص غصہ پیدا کرنے کی کوشش کرنے کے بعد بھی غصہ نہیں کرتا وہ گدھا ہے اور جو خوشامد کے بعد بھی راضی نہیں ہوتا وہ شیطان ہے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الا ان بنی آدم خلقوا علی طبقات شتی فمنهم بطی الغضب سریع الفی و منهم سریع اغضب سریع الفی فتلک بتلک ومنهم سریع الغضب بطی الفئ الا وان خیرهم البطی الغضب السریع الفی وشرهم السریع الغضب البطی الفی

"یاد رکھو کہ آدم علیہ السلام کی اولاد (یعنی تمام انسانوں) کو مختلف گروہوں میں پیدا کیا گیا ہے۔ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو دیر سے غصے میں آتے ہیں اور جلد ہی تسلی بخش ہوجاتے ہیں ، کچھ ایسے بھی ہیں جو جلدی غصے میں آجاتے ہیں اور جلد ہی تسکین دیتے ہیں ، اس طرح ایک [بری خوبی جیسے جلدی غصہ کرنا] دوسری [خوبی جو اچھی ہے ، جیسے جلدی تسکین دینا] سے تلافی کی جاتی ہے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو جلد ہی غصے میں آجاتے ہیں اور دیر سے تسلی دیتے ہیں۔ یاد رکھیں، ان میں سے بہتر شخص وہ ہے جو دیر سے غصہ کرتا ہے لیکن جلد ہی مطمئن ہو جاتا ہے اور ان میں سب سے بدتر وہ ہوتا ہے جو دیر سے غصہ کرتا ہے اور دیر سے تسلی دیتا ہے۔

چونکہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ غصہ انسان کے دل و دماغ پر اثر انداز ہوتا ہے، اس لیے حکمران حکام کے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ غصے کی حالت میں کسی کو سزا نہ دیں کیونکہ غصہ [جب غصہ ہوتا ہے] ضرورت کی حدود سے تجاوز کرتا ہے۔ مزید برآں ، اپنے غصے کو ختم کرنا بھی نچلے نفس کی تسکین اور خوشی کا ایک ذریعہ ہے کیونکہ غصے کی حالت میں ، جب تک کوئی کسی کو اپنے غصے کا نشانہ نہیں بناتا ، حالانکہ جو ہونا چاہئے تھا وہ یہ ہے کہ اس کا غضب اور انتقام دونوں صرف خدا کی خاطر ہونا چاہئے تھا [نہ کہ کسی کی ذاتی انا کے لئے]۔

رنجش کی حقیقت اور نتائج اور عفریت اور نرمی کی فضیلت

جب کوئی غصہ آتا ہے اور اپنی کمزوری کی وجہ سے انتقام لینے کے قابل نہیں ہوتا تو اسے روکنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے۔ یہی غصہ کسی کے دل میں بغض اور بغض میں بدل جاتا ہے۔ بغض کا مطلب یہ ہے کہ کسی کے دل میں ہمیشہ کے لیے نفرت اور دشمنی پیدا ہوتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

المؤمن لیس بحقود

"مومن بغض و بغض سے عاری ہے اور وہ پاک دل ہے جو کسی سے بغض اور بغض نہیں رکھتا)۔

غصے کے نتیجے میں بغض اور بغض ہوتا ہے جس کے نتیجے میں مندرجہ ذیل نتائج اور نتائج برآمد ہوتے ہیں:

پہلا نتیجہ حسد ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ بغض آپ کے دل میں یہ خواہش پیدا کرتا ہے کہ دوسرے کے پاس جو مال ہے، جو نعمت ہے وہ چھین لی جائے، اگر کسی دوسرے کو کوئی نعمت ملے تو آپ کو اس سے دکھ ہوتا ہے، دکھ ہوتا ہے اور اگر وہ شخص مشکل میں پڑ جاتا ہے تو آپ خوش ہو جاتے ہیں۔ یہ منافق کا عمل ہے اور اس کی مذمت جلد ہی واضح ہو جائے گی۔ **دوسرا** نتیجہ یہ ہے کہ حسد کی ضرورت سے زیادہ ہوتی ہے، یعنی آپ کسی دوسرے شخص کی مشکلات پر ہنستے ہیں اور ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ **تیسرا** نتیجہ یہ ہے کہ آپ کسی دوسرے شخص کو چھوڑ کر تمام رشتے توڑ دیتے ہیں، اگرچہ آپ سے ملنے کا خواہاں ہو اور اسی ارادے سے آپ کے پاس آ جائے۔ **چوتھا** نتیجہ یہ ہے کہ آپ کسی کی توہین اور تذلیل کرتے ہیں۔ **پانچواں** نتیجہ یہ ہے کہ آپ کسی ایسے شخص کے بارے میں ایسی باتیں کہتے ہیں جن کے کہنے بھی جائز نہیں ہیں، مثلا آپ جھوٹ بولتے ہیں، غیبت کرتے ہیں، اپنے رازوں کو ظاہر کرتے ہیں [یا نجی معاملات جو لوگوں کی نظروں سے چھپانا چاہتے ہیں]، اور عیب تلاش کرتے ہیں۔

چھٹا نتیجہ یہ ہے کہ آپ کسی کی توہین اور تضحیک کے خیال سے کسی کی نقل کرتے ہیں۔ **ساتواں** نتیجہ یہ ہے کہ آپ ایک جسمانی نقصان پہنچاتے ہیں، دوسرے لفظوں میں مار پیٹ (تشدد) اور جسمانی زیادتی کا سبب بنتے ہیں۔
آٹھواں نتیجہ یہ ہے کہ آپ اپنے حقوق واپس نہیں کرتے اور اگر آپ قرض کے مالک ہیں تو اسے کسی کو واپس نہیں کرتے اور قرابت داری کے حقوق پورے نہیں کرتے اور نہ ہی اپنی ضبط شدہ چیز واپس کرتے ہیں۔ یہ تمام نتائج اور نتائج حرام ہیں۔ بغض اور بغض کے بارے میں کم از کم آپ اپنے آپ کو ان آٹھ مذکور نقصانات سے محفوظ رکھنا ہے اور خدا کی نافرمانی کا ذمہ دار نہ بنیں [ان آٹھ نتائج میں سے کسی ایک یا سب میں ملوث ہوکر]، اس کے بجائے اسے غلط سمجھیں اور اسے [دل سے] برا سمجھیں۔ [اگر آپ اپنے دل میں بغض کو برا سمجھتے ہیں لیکن پھر بھی] تم کسی سے پہلے کی طرح خوشی سے بات نہیں کرتے، کسی کی ضروریات کا خیال نہ رکھتے، کسی کے ساتھ کسی محفل میں نہ بیٹھتے، کسی کے ساتھ خدا کی یاد نہ کرو، کسی کے فائدے کے لیے مدد نہ کرتے، کسی کے لیے دعا نہ کرو اور نہ ہی کسی کی تعریف کرو، نیک کاموں کی ترغیب نہ دیتے، کسی کے ساتھ ہمدردی نہ کرو اور نہ ہی غم میں شریک ہونا۔ پھر یہ چھوٹا سا بغض آپ کے دین میں درجات میں کمی کا سبب بنے گا اور ایک عظیم نعمت اور الٰہی ثواب کے حصول میں رکاوٹ بن جائے گا، حالانکہ آپ اس بدنیتی کے لیے عذاب الٰہی کے مستحق نہیں ہوں گے۔
چنانچہ جب ابوبکر رضی اللہ عنہ نے قسم کھائی کہ وہ اپنے رشتہ دار مصطح کو کچھ نہیں دیں گے کیونکہ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو اپنی بیٹی پر بہتان لگانے میں ملوث تھے [جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری بیوی بھی تھیں] عائشہ رضی اللہ عنہ، لیکن جب نیچے کی آیت نازل ہوئی:

وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنكُمْ
وَالسَّعَةِ أَن يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي
سَبِيلِ اللَّهِ ۖ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ۗ أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ

"اور تم میں سے جو لوگ امتیاز اور فضیلت کے حامل ہیں اور اسباب بھی رکھتے ہیں وہ قسم نہ کھائیں کہ وہ رشتہ داروں، مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو نہ دیں گے۔ انہیں چاہیے کہ وہ ان کو معاف کر دیں اور ان کی طرف سے ہونے والی کسی بھی تکلیف کو نظر انداز کریں۔ کیا تمہیں یہ پسند نہیں ہے کہ اللہ تمہاری گناہوں اور کوتاہیوں کو معاف کر دے؟ بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔" (سورۃ البقرۃ باب 24، آیت 22)

یہ آیت سن کر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم اللہ سے مغفرت چاہتے ہیں"۔ اس کے بعد انہوں نے مستہ کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرنا شروع کیا جس طرح وہ پہلے [ان کی مالی مدد کرکے] ان کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حضرت *عائشہ رضی اللہ عنہا پر* صحیح بخاری *اور* صحیح مسلم کے مجموعے میں حدیث کا مجموعہ ہے

بہتر یہ ہے کہ کسی کے ساتھ بغض اور بغض کی وجہ سے اپنے رویے کو تبدیل نہ کیا جائے، اس کے بجائے اگر ممکن ہو تو اپنے نفس کے خلاف روحانی جدوجہد اور شیطان کو شکست دینے کے لیے اپنے خوبصورت اخلاق اور سلوک کو بڑھانا چاہیے۔ اس طرح کا عمل اولیاء کرام اور گنوسٹک (*صدقین*) کا درجہ ہے [جو انسانیت کے لیے حاصل ہونے والا اعلیٰ ترین درجہ ہے] اور مومنین کے افضل اعمال میں سے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بغض رکھنے والے شخص کے پاس تین حالتوں میں سے ایک ہوسکتا ہے: پہلا ، اس شخص کے حقوق کو پورا کرتا ہے جس کے خلاف بغض ہے بغیر کسی کمی یا زیادتی کے - یہ انصاف ہے۔ دوسرا یہ کہ جس شخص کے خلاف بغض رکھتا ہے اس کے ساتھ معافی اور فضیلت اور قرابت داری کے ساتھ برتاؤ کیا جائے - یہ افضل ہے۔ تیسرا، کسی شخص سے کوئی چیز چھیننا ظلم کی وجہ سے بغض رکھتا ہے - یہ ظلم ہے۔ یہ آخری ریاست اور رتبہ حقیر اور برے لوگوں کی ہے، دوسری حیثیت سنتوں اور گنوسٹک کی ہے اور پہلی ریاست صادقوں کی ہے۔

معافی اور نیکی میں اوپر اور اس سے آگے بڑھنے کی فضیلت

معافی کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے جائز حقوق سے دستبردار ہو، دوسرے لفظوں میں انتقام یا جرمانہ نہیں لیتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَأَن تَعْفُوٓا۟ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۚ

"اور تمہاری بخشش [اور ان چیزوں کو چھوڑ دینا جن کے تم جائز حقدار ہو] تقویٰ کے خوف ، تعظیم اور خدا سے ڈرنے کے قریب ہے*تقویٰ[ترمیم]*)." (سورۃ البقرۃ باب 2، آیت 237)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ثلاث والذی نفسی بیده لو کنت حلافا لحلفت علیهن، ما نقص مال من صدق فتصدقوا ولا عفا رجل عن مظلمة یبتغی بها وجه الله الا زاده الله بها عزا یوم القیامة، ولا فتح رجل علی نفسه باب مسالة الا فتح الله علیه باب فقر

"تین چیزیں ایسی ہیں کہ اگر میں چیزوں کی قسم کھانے والا ہوتا تو میں ان کے بارے میں قسم کھاتا: ایک یہ کہ صدقہ سے جائیداد میں کمی نہیں آتی، اسی لیے صدقہ دے دو۔ دوسری بات یہ کہ اگر کوئی شخص خدا کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے اپنے حق کو چھوڑ دے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس شخص کو عزت عطا فرمائے گا۔ تیسری بات یہ کہ اگر کوئی شخص اپنے لیے دوسروں سے اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے مانگنے کا دروازہ کھول دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے غربت کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ (یہ روایت حدیث کے مجموعے *ترمذی*، *ابوداؤد* اور صحیح *مسلم* میں ابو کبشہ انصاری رضی اللہ عنہ سے نقل ہوئی ہے)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اور روایت میں مروی ہے:

التواضع لا یزید العبد الا رفعة فتواضعوا یرفعکم الله، والعفو لا یزید العبد الا عزا فاعفوا یعزکم الله، والصدقة لا تزید المال الا کثرة فتصدقوا یرحمکم الله

"عاجزی بندے کو اعلیٰ روحانی مرتبہ عطا کرتی ہے، اسی لیے عاجزی اختیار کرو، اللہ تعالیٰ تمہیں بلندی عطا فرمائے۔ معافی بندے کو عزت دیتی ہے، اسی لیے معاف کر دے اور اللہ تعالیٰ تمہیں عزت عطا فرمائے گا۔ صدقہ جائیداد میں اضافہ کرتا ہے، اسی لیے صدقہ کرو، اللہ تم پر رحم کرے گا۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *احادیث* کے مجموعے *میں انس رضی اللہ عنہ پر اصفہانی الترغیب و ابو منصور الدیلمی*

عقبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ میں نے پہلے اس کا ہاتھ پکڑا تھا یا اس نے میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا:

یا عقبة! الا اخبرک بافضل اخلاق اهل الدنیا والآخرة صل من قطعک وتعطی من حرمک وتعفو عمن ظلمک

"اے عقبہ! کیا میں آپ کو اس دنیا اور آخرت کے لوگوں کی سب سے اعلیٰ کردار کی خصوصیات کے بارے میں نہیں بتاؤں؟ جو آپ سے نہیں ملتا، آپ ایسے سے ملتے ہیں۔ جو تمہیں محروم کرتا ہے، تم ایسے کو دیتے ہو۔ جو تجھ پر ظلم کرے اور ظلم کرے تو تو اس کو معاف کر دو۔" (یہ روایت مجموعہ حدیثی *طبرانی*، *بیہقی* اور *ابن ابی الدنیا* میں *نقل ہوئی ہے*)

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

یارب ای عبادک اعزعلیک؛ قال الذی اذا قدرعفا الاخلاق

"اے میرے پروردگار! تمہارے بندوں میں سے کون تمہیں زیادہ محبوب ہے؟" اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا: "جو معاف کر دیتا ہے حالانکہ وہ انتقام لینے کی صلاحیت رکھتا ہے"۔ (یہ روایت *ابوہریرہ* رضی اللہ عنہا کے بارے میں حدیث کے مجموعہ *"خضرة المعارف الاخلاق"* میں نقل ہوئی ہے)

نرمی اور رحم کی عمدگی

نرمی یا نرمی ایک اچھی خصوصیت ہے اور اس کے برعکس جارحیت اور سختی ہے۔ دونوں خصوصیات غصے اور بد مزاجیوں سے پیدا ہوتی ہیں جبکہ نرمی خوبصورت اخلاق، آداب، مزاج، اندرونی مزاج اور پرسکون فطرت سے پیدا ہوتی ہے۔ کبھی جارحیت غصے سے پیدا ہوتی ہے اور کبھی لالچ کی شدت اور تسلط سے پیدا ہوتی ہے۔ لوگ لالچ کی شدت کے وقت سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتے ہیں اور مزاج کا توازن ختم ہو جاتا ہے۔ بہرحال نرمی حسن اخلاق، آداب، مزاج اور باطنی مزاج کا ثمر ہے اور یہ اس وقت حاصل ہوتی ہے جب غصہ اور ہوس کی قوتوں کو اعتدال کی حدود میں رکھا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ نبوت کے احادیث میں نرمی کی حد سے زیادہ تعریف کی گئی ہے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

یاعائشۃانہ من اعطی حظہ من الرفق فقداعطی حظہ من خیر الدنیا والآخرۃ ومن حرم حظہ من الرفق فقد حرم حظہ من خیر الدنیا والآخرۃ

"اے عائشہ! جس کو نرمی عطا کی گئی ہے اسے دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی عطا کی گئی ہے اور جو نرمی سے محروم ہے وہ دنیا اور آخرت کی بھلائی سے محروم ہے۔ (یہ روایت حدیث کے مجموعے *احمد* اور *عقیلی کتاب الدعافہ* میں عبد الرحمن بن ابی بکر مالیکی رضی اللہ عنہ سے نقل ہوئی ہے)

ان اللہ لیعطی علی الرفق مالا یعطی علی الخرق واذا احب اللہ عبدا اعطاہ الرفق مامن اھل بیت یحرمون الرفق الا حرموا محب اللہ تعالیٰ

"اللہ تعالیٰ نرمی اور شفقت کے ساتھ اتنا کچھ دیتا ہے کہ وہ جہالت اور سختی کے ساتھ نہیں دیتا۔ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو وہ ایسی نرمی عطا کرتا ہے۔ اور گھر کے لوگ جو نرمی سے عاری ہیں وہ بھی خدا کی

محبت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ (یہ روایت جریر رضی اللہ عنہ سے حدیث کے مجموعہ *طبرانی کبیر* میں نقل ہوئی ہے)

ان اللّٰہ رفیق یحب الرفق ویعطی علیہ مالا یعطی علی العنف

"خدا نرم اور مہربان ہے، وہ نرمی سے محبت کرتا ہے اور نرمی پر اتنا دیتا ہے کہ وہ سختی سے نہیں دیتا". (یہ روایت حدیث کے مجموعہ *صحیح مسلم* میں عائشہ رضی اللہ عنہا پر نقل ہوئی ہے)

یا عائشۃ ارفقی فان اللّٰہ اذا اراد باھل بیت کرامۃ دلھم علی باب الرفق

"اے عائشہ! نرمی اختیار کرو کیونکہ جب خدا کسی گھر (فرد یا خاندان) کی عزت کرنا چاہتا ہے تو وہ انہیں نرمی کا راستہ دکھاتا ہے۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *حدیث* مجموعہ *احمد* حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر

من یحرم الرفق یحرم الخیر کلہ

"جو شخص نرمی سے محروم ہے وہ ہر اچھی چیز سے محروم ہے". (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث کا مجموعہ *جریر* رضی اللہ عنہ سے مسلم

ایما والی ولی فرفق ولا رفق اللّٰہ تعالٰی بہ یوم القیمۃ

"جو شخص سیاسی اتھارٹی بن گیا اور عام لوگوں کے ساتھ شفقت سے پیش آئے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ایسے شخص کے ساتھ احسان سے پیش آئے گا". (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *حدیث* کا مجموعہ صحیح *مسلم* حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا

الرفق یمن والخرق شئو

"نرمی ایک بہت بڑی نعمت ہے اور سختی ایک برا شگون ہے [جو صرف برے نتائج لاتا ہے]". (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حضرت *عبداللہ بن* مسعود رضی اللہ عنہ سے حدیث *کا* مجموعہ طبرانی اوسط

حسد کی مذمت، اس کی حقیقت اور اس کے علاج کے ذرائع

حسد بغض اور دشمنی کا نتیجہ ہے اور اس کا تعلق اندرونی برائیوں (منفی خصلتوں، رجحانات اور رجحانات) کے ایک ہی خاندان سے ہے۔ اس کے بجائے ، یہ کہا جاسکتا ہے کہ حسد بغض کی ایک شاخ ہے جو خود غصے کا ایک جزو (نتیجہ) ہے۔ حسد سے نکلنے والی بہت سی شاخیں ہیں جن کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ حسد کی مذمت میں بہت سی [نبوت] روایات ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الحسد یاکل الحسنات کما تاکل النار الحطب

"حسد نیکی کو اسی طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے (یعنی کسی کے لیے حسد کرنے کے بعد عبادت الٰہی، صدقہ، لوگوں کی خدمت وغیرہ جیسے نیک اعمال سے کچھ نہیں بچتا). (یہ روایت حدیث کے مجموعوں *ابوہریرہ* رضی اللہ عنہ اور *ابن ماجہ* سے انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہوئی ہے)

ایک نبی روایت میں حسد اور اس کے نتائج اور اسباب کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے:

لا تحاسدوا ولا تقاطعوا ولا تباغضوا ولا تدابروا وكونوا عباد الله اخوانا

"آپس میں حسد نہ کرو، ایک دوسرے سے ملنا بند نہ کرو، ایک دوسرے سے دشمنی نہ کرو، ایک دوسرے سے منہ نہ پھیرو اور اے اللہ کے بندو! ایک دوسرے کے بھائی اور بہنیں بن جاؤ۔ "(یہ روایت حدیث کے مجموعے *صحیح بخاری* اور *صحیح مسلم میں نقل ہوئی ہے*)

ثلاث لا ينجو منهن احد الظن والطيرة والحسد وساحدثكم بالمخرج من ذلك اذا ظننت فلا تحقق واذا تطيرت فامض واذا حسدت فلا تبغ

"تین چیزیں ہیں جن سے کوئی بھی خالی نہیں ہے: قیاس آرائی، دوسروں کے بارے میں برا خیال اور حسد۔ میں آپ کو ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کا طریقہ بتاؤں گا۔ جب آپ کے دل میں کوئی قیاس آجائے تو اسے صحیح نہ سمجھو، جب آپ کے دل میں بری بات آجائے تو اپنے آپ کو اپنے کام میں مشغول رکھو، جب حسد پیدا ہو جائے تو اس کی خواہش نہ کرو۔ (یہ روایت *حدیث* کے مجموعہ *ابن ابی دنیا* میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل ہوئی ہے)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انه سيصيب امتي داء الامم قالوا وما داء الامم قال الاشر والبطر والتكاثر والتنافس في الدنيا والتباعد والتحاسد حتى يكون البغي ثم الهرج

انہوں نے کہا کہ میری امت جلد ہی دوسری قوموں کی بیماری سے متاثر ہو جائے گی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: قوموں کی بیماری کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: تکبر، آسودگی کا اظہار، دنیاوی اسباب (دولت) میں باہمی مقابلہ، باہمی دشمنی، باہمی حسد، [یہ سب کچھ] اس حد تک کہ پہلے بغاوت ہو جائے گی پھر فساد پھیل جائے گا"۔
(یہ روایت *احادیث* کے مجموعوں *ابن ابی الدنیا* اور *طبرانی* سے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل ہوئی ہے)

ستة يدخلون النار قبل الحساب بسنة قيل يا رسول الله من هم قال الامراء بالجور والعرب بالعصبية والدهاقين بالتكبر والتجار بالخيانة واهل الرستاق بالجهالة والعلماء بالحسد

"چھ قسم کے لوگ قیامت سے ایک سال پہلے جہنم میں داخل ہوں گے"۔ پوچھا گیا: یا رسول اللہ! یہ کون لوگ ہیں؟" نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دیا: "جبر کی وجہ سے سیاسی طور پر طاقتور عرب قوم پرستانہ تعصب نسل پرستی (*عسبیہ*) کی وجہ سے (اگرچہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے انسانیت کو پہنچانے والے **اس حکم الٰہی میں عربوں کو ایک مثال بنایا گیا ہے**)، اس روایت کا مفہوم ہر ایک پر لاگو ہوتا ہے، یعنی کسی بھی قسم کی نسل پرستی، جو کسی بھی نسلی، نسلی اور قومی گروہ کی طرف سے عمل میں آتی ہے، انہیں جہنم کی

طرف سے مجسم الٰہی ناپسندیدگی کی طرف لے جاتی ہے)، تکبر کی وجہ سے کسان، بے ایمانی کی وجہ سے تاجر، دیہاتی جہالت کی وجہ سے، اور مذہبی علماء حسد کی وجہ سے"۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث کا مجموعہ *ابو منصور الدیلمی* عن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ

ایک روایت میں منقول ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب خدا سے گفتگو کرنے کے لیے کوہ سینا پر گئے تو آپ نے ایک شخص کو عرش الٰہی کے سائے میں دیکھا۔ وہ اس شخص پر رشک کرتا تھا اور خدا سے التجا کرتا تھا کہ وہ اس کا نام بتائے ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم اس کے نام کے ساتھ کیا کرو گے اس کے بجائے ہم تمہیں اس کے اعمال بتائیں گے۔ وہ کسی سے حسد نہیں کرتا تھا ، اپنے والدین کی نافرمانی نہیں کرتا تھا ، اور کوئی کہانی نہیں کرتا تھا (لوگوں کے معاملات کو منتقل کرنا جس کے بارے میں وہ بات نہیں کرنا چاہتے ہیں یا جانا نہیں چاہتے ہیں ، چاہے وہ اچھا ہو یا برا ، دوسروں کو ، غیر ارادی طور پر یا جان بوجھ کر بدنیتی کے ساتھ پہنچانا)۔ حضرت زکریا رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: حاسد شخص میری نعمتوں کا دشمن ہے، میرے فیصلے پر غصہ کرتا ہے اور میری رحمت کی تقسیم سے ناخوش ہے جو تمام مخلوقات کا رب اور پالنے والا ہے۔ خدا کی تقسیم سے ناراضگی اور غصہ وہی ہے جو ساتھی انسانوں کے ساتھ حسد دراصل میں شامل ہوتا ہے]"۔

واضح رہے کہ حسد کا عمل الٰہی نعمتوں اور الٰہی عنایات کے لیے کیا جاتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو اجر دیتا ہے تو دوسرے شخص کے پاس اس کے بارے میں دو حالتیں ہوتی ہیں۔ سب سے پہلے، کوئی اس نعمت کو ناپسند کرتا ہے اور اس کے زوال کی خواہش کرتا ہے۔ یہ حسد کی کیفیت ہے۔ اس سے حسد کی تعریف یہ ہے کہ کسی نعمت کو ناپسند کرنا اور اس کے زوال کی خواہش کرنا۔ دوسری بات یہ کہ کوئی شخص نہ تو اس کے زوال کی خواہش رکھتا ہے اور نہ ہی اس کے تسلسل پر اعتراض کرتا ہے [کسی دوسرے شخص میں جو اس سے نوازا گیا ہے] بلکہ وہ اپنے لیے بھی اس کا حصول چاہتا ہے۔ اسے "*غبطہ*" کہا جاتا ہے یا اپنے لیے کسی نعمت کی خواہش کرنا جو دوسرے شخص کے پاس ہے [بغیر کسی دوسرے شخص سے اس کے زوال یا ہٹانے کی خواہش کے بغیر۔ یہ دراصل شریعت الٰہی میں جائز ہے]۔ حسد ہر حال میں ممنوع ہے، سوائے اس کے کہ وہ کسی برے شخص کو دیا جائے جو اسے انتشار اور فساد کے بیج بونے کے لیے استعمال کرتا ہے، لوگوں کے درمیان فتنہ کو فروغ دیتا ہے اور انہیں نقصان پہنچاتا ہے۔ اس طرح کی نعمت سے ناپسندیدگی کا اظہار کرنا اور اس کے زوال کی خواہش کرنا درست ہے کیونکہ اس صورت میں آپ کی اس کی ناپسندیدگی اور اس کے زوال کی خواہش اس لیے نہیں ہے کہ ایسی چیز نعمت ہے، بلکہ اس لیے ہے کہ اسے انتشار اور انتشار کے ذریعہ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اگر انارکی اور انتشار کا خوف نہ ہو تو کوئی ان سے غمگین نہیں ہوگا اور نہ ہی کوئی یہ چاہتا ہوگا کہ انہیں چھین لیا جائے۔ اس نعمت کو برا سمجھنے کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے فیصلے کو برا سمجھتا ہے کہ اس نے اپنے بندوں میں سے بعض کو بعض باتوں میں دوسروں پر فضیلت دی ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ اسے نفرت اور ناپسندیدگی کے بہانے کے طور پر استعمال نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی شریعت الٰہی اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ کوئی شخص احکام الٰہی میں مداخلت کرے اور ان کا فیصلہ اپنی خواہشات کے معیار پر کرے۔ اس سے بڑا گناہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ کسی دوسرے مومن کو راحت میں نہ دیکھ سکے جس کا مال تمہاری آنکھوں میں کانٹے کی مانند ہو اگرچہ اس سے تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچے۔ قرآن مجید میں حسد کی سخت مذمت کی گئی ہے:

إِن تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِن تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَفْرَحُوا بِهَا ۖ

"اگر تم اچھی حالت میں ہو تو یہ ان کے لیے غم کا باعث بن جاتا ہے اور اگر تم دکھ کی حالت میں ہو تو یہ ان کے لیے خوش ہوتا ہے۔" (سورۃ البقرۃ سورۃ البقرۃ آیت 120)

اگر کسی مسلمان کے پاس کوئی ایسی نعمت ہو جو اللہ تعالیٰ میں حاصل کرنا واجب ہے مثلاً خدا پر ایمان، نماز، *زکوٰۃ* وغیرہ تو ان نعمتوں کے حصول کی خواہش کرنا واجب ہے۔ ان کی خواہش نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ گناہ پر راضی ہو رہا ہے جو حرام ہے۔ اگر ان نعمتوں کا تعلق فضلات مثلاً صدقات پر مال خرچ کرنا، صدقہ وغیرہ پر کرنا ہے تو ان میں مقابلہ کرنا اور ان کی خواہش انتہائی قابل تعریف ہے۔ اگر کوئی نعمت ہے جس سے فائدہ اٹھانا جائز ہے تو اس میں مقابلہ اور اس کی خواہش بھی جائز ہے۔ جائز ہونے کا جواز یہ ہے کہ انسان نعمت کو برا سمجھے بغیر

مساوات اور اس نعمت میں حصہ لینا چاہتا ہے۔ لہٰذا یہاں دو چیزیں ہیں: اول، اس شخص کا احترام کرنا جس کے پاس یہ نعمت ہے [اور اس کے زوال کی خواہش نہ کرنا]؛ دوسری بات یہ کہ اس کا خواہشمند شخص اس میں پیچھے رہ گیا ہے۔ البتہ مساوات اور حلال چیزوں پر دوسروں کے ساتھ مقابلہ کرنے کی خواہش انسان کی فضیلت میں کمی کا سبب بنتی ہے کیونکہ اگرچہ یہ جائز ہے کہ اس قسم کی چیزیں توکل خدا پر توکل اور حکم الٰہی کو قبول کرنے کے خلاف ہیں اور اعلیٰ درجات کی راہ میں رکاوٹ ہیں، حالانکہ یہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے مترادف نہیں ہیں۔

حسد کی درجے: حسد کی درجات [ان کی شدت اور جرم کے لحاظ سے] ہوتے ہیں۔ پہلی درجہ یہ ہے کہ انسان کسی دوسرے شخص کی طرف سے کسی نعمت کے زوال کی خواہش رکھتا ہے اگرچہ وہ نعمت [اپنے لیے] حاصل نہ کرے۔ حسد کی اس سطح میں صرف برے لوگ ہی شامل ہوتے ہیں۔ حسد کی دوسری ڈگری یہ ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص سے برکت کے زوال کی خواہش کرتا ہے تاکہ وہ اپنے لئے وہ نعمت حاصل کرسکے ، مثال کے طور پر ، ایک خوبصورت شریک حیات ، ایک شاندار گھر ، عظیم شہرت ، اور معاشرتی حیثیت حاصل کرے۔ تیسری درجہہ یہ ہے کہ کوئی شخص کسی خاص نعمت کی خواہش نہیں کرتا بلکہ اسی طرح کی نعمت چاہتا ہے جو دوسرے شخص کو حاصل ہے۔ چنانچہ جب کوئی اس مقصد کو حاصل کرنے میں ناکام ہو جاتا ہے تو وہ دوسرے شخص سے اس کے زوال کی خواہش کرنے لگتا ہے تاکہ دونوں برابر ہو جائیں۔ چوتھی درجہہ یہ ہے کہ انسان کسی نعمت کی خواہش کرتا ہے جو دوسرے شخص کے پاس ہے لیکن اسے حاصل کرنے میں ناکام ہونے کی صورت میں وہ کسی دوسرے شخص سے اس کے زوال کی خواہش نہیں کرتا۔ یہ آخری درجہہ قابل معافی ہے اگر برکت کا تعلق دنیاوی معاملات سے ہے اور اگر اس کا تعلق روحانی معاملات سے ہے تو قابل تعریف ہے۔ تیسرے درجے میں اچھائی اور برائی دونوں پہلو ہیں۔ دوسری ڈگری تیسری سے ہلکی ہوتی ہے۔ فرسٹ ڈگری ہر حال میں قابل مذمت ہے۔ کسی دوسرے کی طرف سے کسی نعمت کے زوال کی خواہش نہ کرنا اچھا ہے لیکن یہ اچھا نہیں ہے کہ کوئی کسی دوسرے کی نعمت کا مالک بننا چاہتا ہے۔

حسد کی وجوہات

اگرچہ حسد کی بہت سی وجوہات ہیں لیکن مجموعی طور پر ان کو سات اسباب پر منحصر سمجھا جا سکتا ہے: اول، دشمنی؛ دوسرا ، عزت کی خواہش؛ تیسرا، تکبر؛ چوتھا ، حیرت؛ پانچواں ، اپنے مقاصد کو کھونے کا خوف۔ چھٹا ، طاقت (کنٹرول) اور شہرت سے محبت۔ ساتواں ، روح کی اندرونی برائی اور کنجوسی۔ بعض اوقات ، ایک دوسرے پر برکت نہیں دیکھنا چاہتا کیونکہ دوسرا شخص اس کا دشمن ہے اور کوئی بھی دشمن کو سکون سے دیکھنا پسند نہیں کرتا ہے۔ بعض اوقات تکبر اور تکبر کی وجہ سے نعمتوں سے مالا مال لوگوں کی خود تعظیم اور خود پرستی اس شخص کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتی ہے جو نہیں چاہتا کہ دوسرے کو کسی پر کوئی امتیاز حاصل ہو، اس لیے حسد ہونے لگتا ہے تاکہ دوسرے شخص سے برکت دور ہو جائے تاکہ وہ دونوں برابر بن جائیں۔ بعض اوقات حسد کرنے والے کے دل میں دوسرے شخص کے خلاف تکبر ہوتا ہے، لیکن کوئی شخص اس کا اظہار کسی امتیاز (نعمت) کی وجہ سے نہیں کر سکتا۔ بعض اوقات برکت اتنی بڑی ہوتی ہے اور درجہہ [کسی دوسرے شخص کے لیے] اتنا بلند ہوتا ہے کہ اس نعمت اور مرتبے کا مالک ہونا حیرت کا سبب بن جاتا ہے۔ کبھی کبھی یہ خدشہ بھی ہوتا ہے کہ کسی دوسرے شخص کو ملنے والی آشیرواد کی وجہ سے کوئی دوسرا شخص کسی کے مقاصد کی راہ میں رکاوٹ بن جائے گا۔ بعض اوقات ، کوئی کنٹرول اور طاقت کے حصول میں ناکامی کی وجہ سے دوسروں سے حسد کرتا ہے۔ بعض اوقات ان میں سے کوئی وجہ نہیں ہوتی، لیکن انسان اپنی باطنی برائی اور نفس کی کنجوسی کی وجہ سے دوسروں سے حسد کرتا ہے۔ اب ان اسباب میں سے ہر ایک کی تفصیل سنیں:

پہلا سبب - دشمنی اور بغض : حسد کا یہ سبب دیگر اسباب سے زیادہ سخت ہے۔ ہر وہ شخص جس کو اس کے مقاصد میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے یا رکاوٹیں کھڑی کی گئی ہیں، وہ اس شخص کا مخالف بن جاتا ہے جو تکلیف کا سبب بنتا ہے یا رکاوٹیں کھڑا کرتا ہے، ایسے شخص کو برا سمجھتا ہے، اور بغض اور غصہ انتقام لینے پر آمادہ کرتا ہے۔ اگر کوئی انتقام لینے کی صلاحیت نہیں رکھتا تو وہ چاہتا ہے کہ دوسرے لوگ انتقام لیں [اس شخص

سے جو کسی کو تکلیف پہنچاتا ہے یا اس کی راہ میں رکاوٹیں کھڑا کرتا ہے]۔ یہ اس حد تک ہے کہ اگر دشمن پریشانیوں اور پریشانیوں میں مبتلا ہو تو اسے اپنے اعلیٰ مقام اور خدا سے قرب کی علامت سمجھ لیتا ہے اور اگر دشمن اپنی مرضی کے خلاف کوئی نعمت یا کوئی اعلیٰ معاشرتی مقام حاصل کرتا ہے تو وہ اسے دربار الٰہی میں ناقابل قبول سمجھتا ہے جس کی وجہ سے اس کی ناکامی اور دشمن کی فتح ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ حسد اور دشمنی ایک دوسرے کے لئے ضروری ہیں اور ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ خدا کا خوف اور احتیاط کا تقاضا ہے کہ اس طرح کے حسد کو دل میں جگہ نہ ہونے دیں اور [ہمیشہ] اسے برا سمجھیں۔ حسد [روح کی] ایک مہلک [باطنی] بیماری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

إِن تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِن تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَفْرَحُوا بِهَا ۖ

"اگر آپ اچھی حالت میں ہیں تو ، یہ ان کے لئے دکھ کا باعث ہے۔ اور اگر تمہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اس سے خوش ہو جاتے ہیں۔ (سورۃ البقرۃ سورۃ البقرۃ آیت 120)

وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ

"وہ آپ کے لئے نقصان چاہتے ہیں۔ دشمنی ان کے منہ سے ظاہر ہے اور جو کچھ ان کے دلوں میں چھپا ہوا ہے وہ اس سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ (سورۃ البقرۃ سورۃ البقرۃ آیت 118)

حسد سے پیدا ہونے والی دشمنی عام طور پر خونریزی، جنگ اور قتل و غارت گری پر ختم ہوتی ہے۔ انسان کی پوری زندگی اس شخص کی نعمتوں کے زوال کی منصوبہ بندی کرنے میں گزر جاتی ہے جو حسد کا نشانہ ہوتا ہے کیونکہ وہ کہانی ، توہین ، غیبت وغیرہ جیسی برائیوں میں ملوث ہوتا ہے۔

دوسرا سبب - عزت یا وقار کی خواہش: بعض اوقات ، حسد کسی ایسے شخص کی عزت یا امتیاز کو قبول نہ کرنے کی وجہ سے ہوتا ہے [کسی مخصوص معیار ، قابلیت یا مہارت کی وجہ سے] جو کسی کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ، ایک حاسد شخص نہیں چاہتا کہ کوئی دوسرا شخص کسی نعمت کے حصول کے بعد کسی پر امتیاز کا اظہار کرے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص جس کے برابر ہو اسے اعلیٰ مرتبہ یا دولت یا علم مل جائے تو حسد کرنے والوں کو یہ خوف ہے کہ وہ شخص کسی پر تکبر اور تکبر کا اظہار کرنا شروع کر دے، اگرچہ وہ تکبر نہیں کرنا چاہتا، وہ بھی نہیں چاہتا کہ دوسرا شخص اس پر تکبر کرے۔ ایک شخص دوسرے شخص کی برابری پر راضی ہوتا ہے لیکن اپنی برتری سے متفق نہیں ہوتا۔

تیسری وجہ تکبر: بعض اوقات حسد کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ حسد کرنے والا دوسروں کو ذلیل اور کمتر سمجھتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ ایسا شخص خدمت کرتے ہوئے اس کے قابو میں رہے اور اپنے حکم کی تعمیل کے لیے فعال طور پر تیار رہے۔ اگر کسی اتفاق سے دوسرے شخص کو نعمت مل جائے تو حسد کرنے والا اس خوف سے پریشان ہو جاتا ہے کہ کہیں دوسرا شخص برکت کی وجہ سے بدل سکتا ہے، کسی کی مذمت کرنا شروع کر دیتا ہے، کسی کے احکامات کی تعمیل سے انکار کر دیتا ہے، کسی کے ساتھ برابری کا دعویٰ کرتا ہے، یا ایک سوچ پر اپنی برتری کا اعلان کرتا ہے، "ابھی میں دوسرے پر تکبر کرتا ہوں لیکن دوسرا اب مجھ پر تکبر کر سکتا ہے"۔ یہ خوف انسان کو

حسد کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہ ہی وجوہات تھیں کہ کافروں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حسد کیا یعنی عزت اور تکبر کی خواہش کی۔ یہ ان کا قول تھا کہ یہ یتیم لڑکا ہمارا رہنما کیسے بن سکتا ہے اور یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اس کے تابع ہو جائیں [خدا کے رسول کی حیثیت سے پوری انسانیت کے لیے اس کے روحانی اختیار میں، جس کی ابتدا یتیم اور غربت میں بہت عاجز ہے]۔ قرآن مجید نے ان کے خیالات کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

وَقَالُوا۟ لَوْلَا نُزِّلَ هَٰذَا ٱلْقُرْءَانُ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنَ ٱلْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ

"یہ قرآن ان دونوں بستیوں کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں نازل کیا گیا؟" (سورۃ البقرۃ باب 43، آیت 31)

دوسرے لفظوں میں ، "اگر آپ ایک ممتاز آدمی ہوتے تو ہمیں آپ کی پیروی کرنے میں کوئی اعتراض نہیں تھا"۔ اسی طرح قریش کا قبیلہ (جو عملی طور پر عرب پر حکومت کرتا تھا) بڑی حقارت سے یہ بات کہتا تھا:

أَهَٰٓؤُلَآءِ مَنَّ ٱللَّهُ عَلَيْهِم مِّنۢ بَيْنِنَآ ۗ أَلَيْسَ ٱللَّهُ بِأَعْلَمَ بِٱلشَّٰكِرِينَ

"کیا یہ وہ لوگ ہیں جو کافر مکہ میں اپنی بقا کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں) جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتیں عطا کی ہیں اور دوسروں پر فضیلت حاصل کی ہے؟" کیا ایسا نہیں ہے کہ اللہ جانتا ہے کہ اس کے شکر گزار بندے کون ہیں؟ (یعنی یہ خدا کا فیصلہ ہے کہ وہ کس کو اپنی روحانی نعمتیں عطا کرنے کے لیے منتخب کرتا ہے، اور خدا کی نعمتوں کا فیصلہ مادی معنوں میں دولت اور قدرت کی کثرت سے نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے بجائے، خدا جانتا ہے کہ اس کے شکر گزار بندے کون ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جن کو خدا نے اپنی روحانی برکتوں کے لیے الٰہی قربت، قربت، عبادت، سچائی کی رہنمائی اور اندرونی روحانی روشنی کا انتخاب کیا ہے چاہے ان کی بظاہر کم معاشرتی حیثیت، کسی بھی سیاسی طاقت کی کمی اور مادی غربت سے قطع نظر)۔ (سورۃ البقرۃ باب 6 آیت 53)

چوتھی وجہ - حیرت: کسی کو اعلی [معاشرتی اور / یا روحانی] درجہ اور حیثیت یا اچھی حالت میں دیکھ کر حیرت زدہ ہونا بھی حسد کا سبب بن سکتا ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

وَلَئِنْ أَطَعْتُم بَشَرًا مِّثْلَكُمْ إِنَّكُمْ إِذًا لَّخَٰسِرُونَ

"اگر تم اپنے جیسے انسان کی تعلیمات پر عمل کرنا شروع کرو گے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ تم خسارے میں پڑ جاؤ گے۔" (سورۃ البقرۃ البقرۃ آیت 34)

پانچواں وجہ - اپنے مقاصد کو کھونے کا خوف: یہ صرف ان لوگوں کے لئے مخصوص ہے جو ایک واحد مقصد کے لئے کوشش کر رہے ہیں۔ چنانچہ انسان اس طرح کی ہر نعمت پر دوسرے سے حسد کرتا ہے جو اس کے مقاصد کے حصول میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ [مثال کی] اس قسم کے حسد میں دو بھائی (یا بہن بھائی) اپنے والدین کے دلوں کو جیتنے کے لئے ایک دوسرے سے حسد کرتے ہیں ، کیونکہ جائیداد اور عزت کا حصول والدین کی رضامندی پر منحصر ہے اور ہر کوئی اس جائیداد کا واحد مالک بننے کے لئے ان کی رضامندی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ایک ہی استاد کے دو طالب علموں کا یہی حال ہے کیونکہ دونوں طالب علموں میں سے ہر ایک کی کوشش ہے کہ وہ استاد کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرکے [علم اور تعلیم کی شکل میں] زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل کریں۔ کسی بادشاہ (یا سیاسی

اختیار) کے ساتھیوں اور ساتھیوں کی باہمی نفرت اور دشمنی اس لیے ہے کہ ہر کوئی بادشاہ سے قربت حاصل کرنا چاہتا ہے، جو شہرت اور دولت کے حصول کا ذریعہ ہے۔ ایک ہی شہر کے مبلغین ایک دوسرے سے حسد کرتے ہیں کیونکہ ان میں سے ہر ایک اکیلے مقبول ہونا چاہتا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ دولت جمع کی جا سکے۔

چھٹا وجہ - شہرت اور طاقت کی خواہش: بعض اوقات ، حسد شہرت اور طاقت کی خواہش کی وجہ سے ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص کسی فن یا ہنر میں بے مثال ہو اور یہ چاہتا ہو کہ کوئی اور اس مہارت کو حاصل نہ کرے تاکہ وہ مقبول رہے، تو لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں اور اس کی خوشامد کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، اسے دنیا میں اپنی نوعیت کا ایک شخص سمجھتے ہیں اور بڑے القابات عطا کرتے ہیں۔ ایسے شخص کا لوگوں میں تعریف اور مقبولیت حاصل کرنے کے سوا کوئی مادی مقصد نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں کوئی شخص اپنے فن، ہنر یا مہارت کے ذریعے دولت جمع کرنا یا کوئی دوسرا مقصد حاصل کرنا نہیں چاہتا۔ اس طرح ، ایسا شخص ذاتی طور پر خوشامدی کو پسند کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ لوگ اس مہارت میں کسی پر انحصار کریں۔ اگر کوئی دوسرا شخص اسی ہنر میں کچھ مہارت پیدا کرتا ہے تو وہ حسد کرتا ہے اور دوسرے شخص کی شہرت اور مساوات [اسی ہنر میں] تکلیف دہ محسوس کرتا ہے اور دوسرے شخص کی موت کی خواہش کرتا ہے اور اس نعمت کے زوال کی خواہش کرتا ہے جس میں کسی اور نے حصہ لیا تھا اور اس میں اس کی انفرادیت کا خاتمہ کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر بہادری، علم، عبادت، ہنرمندی، خوبصورتی، دولت وغیرہ اگر کسی کے پاس ہو تو وہ فخر کا باعث ہے اور اگر کوئی ان کا واحد مالک ہے تو اس کے غرور کی کوئی حد نہیں ہے۔ حسد کی وجہ [اس معاملے میں] عزت کی خواہش ، تکبر ، یا کسی کے مقصد کو کھونے کا خوف شامل نہیں ہے ، اس کے بجائے ، یہ صرف خواہش ہے کہ کسی فن یا مہارت میں جو انفرادیت ہے وہ کسی کے پاس رہتی ہے [اس میں کسی اور کو اس میں حصہ نہیں ملتا]۔

ساتواں سبب - نفس کی باطنی برائی یا بگاڑ: نیکی کے کاموں کے بارے میں ادنیٰ نفس کی بستی اور دل کی کنجوسی حسد کی بڑی وجوہات ہیں۔ آپ کو آسانی سے ایسے لوگ ملیں گے جو اقتدار کے خواہشمند نہیں ہیں، تکبر نہیں رکھتے ہیں، دولت کے خواہاں نہیں ہیں، اپنے مقاصد کھونے کا خوف نہیں رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود اگر ان سے کسی دوسرے شخص کی کیفیت بیان کی جائے یا انہیں معلوم ہو جائے کہ کوئی دوسرا شخص کسی خاص نعمت سے لطف اندوز ہو رہا ہے تو سانپ ان کے دلوں پر گھوم جائیں گے (یعنی وہ اس سے بالکل نفرت کریں گے)۔ جب انہیں یہ بتایا جائے کہ آج کل کوئی شخص پریشانیوں میں گھرا ہوا ہے اور اپنے مقاصد کے حصول میں ناکام رہا ہے یا معاشی مشکلات کا سامنا کر رہا ہے تو یہ سن کر ایسے لوگ دل کی گہرائیوں سے خوش ہو جائیں گے۔ ایسے لوگ چاہتے ہیں کہ کوئی کامیاب نہ ہو اور وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے دوسروں پر برستے ہوئے دیکھ کر اس قدر پریشان اور پریشان ہوتے ہیں جیسے دوسروں کو ان کے خزانوں سے چھیننے کے بعد یہ انعامات ملے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ *بخیل* وہ شخص ہے جو اپنے مال میں کنجوس ہوتا ہے اور *شاہیح* وہ شخص ہے جو دوسروں کے مال میں کنجوس ہوتا ہے (یعنی ایسا شخص دوسروں کی بھلائی کی خواہش نہیں کرتا حالانکہ اس کی اپنی جیب سے کچھ بھی خرچ نہ ہوتا)۔ ایسے لوگ گویا اللہ کی نعمتوں میں کنجوس ہیں اور ان لوگوں سے حسد کرتے ہیں جن کی ان سے نہ کوئی دشمنی ہے اور نہ ہی کوئی رابطہ ہے۔ اس کی ظاہری وجہ نفس کی پستی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہ اندرونی بدحالی کا رد عمل ہے جو کسی کی دوسری فطرت بن گیا ہے۔ اس کا علاج بہت مشکل ہے کیونکہ حسد کی دیگر تمام وجوہات عارضی ہیں سوائے اس وجہ کے، جن کو ختم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ ایک موروثی فساد ہے۔ یہ کسی عارضی وجہ سے نہیں ہے، اس لیے اس کا خاتمہ مشکل ہے۔

یہ کچھ وجوہات ہیں جو حسد کو جنم دیتی ہیں۔ بعض اوقات یہ سب اسباب ایک شخص میں بیک وقت پائے جاتے ہیں اس صورت میں حسد بڑا ہوتا ہے اور اس قدر طاقت سے چلایا جاتا ہے کہ کوشش اور خواہش کے باوجود دل میں چھپا نہیں سکتا، بلکہ کھلی دشمنی کا سہارا لیتا ہے۔ اکثر، یہ ان لوگوں کی حالت ہوتی ہے جو اندرونی طور پر حسد کرتے ہیں۔

غور و فکر کرنے پر ، یہ واضح ہے کہ حسد کی یہ تمام وجوہات دنیا سے محبت کی وجہ سے ہیں (دنیاداری یا زندگی کے بارے میں مادی نقطہ نظر) کیونکہ دنیا ہی واحد چیز ہے جو ان لوگوں کے لئے کافی نہیں ہے جو اس سے محبت کرتے ہیں - چاہے وہ کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو ، وہ اس کی کمی کی شکایت کرتے ہیں۔ اس کے برعکس آخرت میں کوئی کمی نہیں ہے، آخرت سے متعلق چیزوں میں بڑی صلاحیت اور وسعت ہے۔ آخرت کی مشابہت علم کی طرح ہے کیونکہ اس کا دائرہ بے حد وسیع ہے۔ اگر لاکھوں لوگ کسی چیز کا علم حاصل کر لیں تو اس سے ذرا بھی کمی نہیں آتی کیونکہ ہر شخص اس سے بھرپور فائدہ اٹھاتا ہے اور اس سے بھرپور لطف اندوز ہوتا ہے۔ لہٰذا جو شخص اللہ تعالیٰ کی معرفت اور صفات الٰہی اور فرشتوں، انبیاء، آسمانوں اور زمین کی سلطنت کا علم حاصل کرتا ہے وہ اس علم اور گنوسس میں کسی اور سے حسد نہیں کرتا، اگر کوئی دوسرا وہی حاصل کرتا ہے تو اس میں کوئی کمی نہیں آتی، چاہے کتنے ہی لوگ گنوسٹک کیوں نہ ہوں۔ اس کے بجائے ، سچے گنوسٹکس کی حالت ایسی ہے کہ وہ وہاں موجود گنوسٹکس کی بڑھتی ہوئی تعداد کے ساتھ بڑھتی ہوئی روحانی خوشی کا تجربہ کرتے ہیں۔ چنانچہ راہ الٰہی کے سچے علماء میں کبھی بھی کوئی حسد نہیں ہوتا کیونکہ ان کا مقصد خدا کی معرفت ہے [اور اس کے ساتھ آنے والا علم الٰہی اور قربت جو اس کے نتیجے میں ان کے روحانی درجات میں اضافہ کرتی ہے] جو کہ ایک بے پناہ سمندر ہے جس میں ساحل نہیں ہے اور اس میں کوئی کمی نہیں ہے - ہر غوطہ خور اپنی کوشش کے مطابق اس کی تہہ سے موتی نکال سکتا ہے۔ وہ اپنے غنوسی کے ساتھ خدا کی قربت حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس میں بھی کوئی کمی نہیں ہے کیونکہ ایسا نہیں ہے کہ کچھ لوگ اسے حاصل کرتے ہیں اور باقی اس سے محروم رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ لطف اندوز ہونے والی نعمت بصیرت الٰہی کی برکت ہے [جیسا کہ اس دنیا یا آخرت کا کوئی دوسرا لطف اس سے موازنہ نہیں کیا جاتا]، اس میں کوئی رکاوٹ یا مزاحمت نہیں ہوگی، بلکہ تمام لوگ [جو اسے حاصل کرتے ہیں] یکساں طور پر خدا کی بصارت سے لطف اندوز ہوں گے، بلکہ لوگوں کی کثرت کی وجہ سے الٰہی بصارت کا لطف کئی گنا بڑھ جائے گا۔

لیکن اگر علماء کا مقصد علم کے ذریعے دولت اور شہرت حاصل کرنا ہو تو وہ لازمی طور پر ایک دوسرے سے حسد کریں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دولت ایک مادی اور جسمانی چیز ہے - اگر یہ ایک ہاتھ میں آجائے تو کسی اور کا ہاتھ اس سے محروم ہو جائے گا۔ شہرت کا مطلب دلوں کا مالک بننا ہے - جب کسی شخص کا دل ایک عالم کی عزت اور عقیدت سے بھرا ہوا ہو تو وہ لازمی طور پر دوسرے عالم کی عزت اور عقیدت سے منہ موڑ دیا جائے گا - یہاں تک کہ اگر کسی کے پاس [دوسرے عالم سے] عقیدت ہے تو بھی یہ زیادہ نہیں ہوگا۔ یہ یقینا حسد کا سبب بنے گا۔ علم اور دولت میں فرق یہ ہے کہ جب تک دولت ایک ہاتھ سے نہیں نکلتی، وہ دوسرے ہاتھ تک نہیں پہنچتی، جبکہ علم عالم کے دل میں مضبوطی سے رہتا ہے اور تعلیم و تدریس سے اس میں کمی نہیں ہوتی۔ اس کے بجائے ، یہ کم ہوئے بغیر طلباء کے دلوں میں منتقل ہوجاتا ہے۔ چونکہ دولت اور جائیداد جسمانی چیزیں ہیں ، لہذا وہ ایک خاص مقام پر ختم ہوجاتے ہیں۔ اگر کوئی انسان پوری زمین کا مالک بن جائے تو اس کے بعد ایسی کوئی چیز باقی نہیں رہے گی جس کا وہ اب بھی مالک ہو سکے۔ اس کے برعکس علم کی کوئی حد اور آخری نقطہ نہیں ہے اور نہ ہی اسے پابند اور محدود کرنا ممکن ہے۔

اس بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ جو شخص اپنے نفس کو اللہ تعالی، عظمت، عظمت اور ربوبیت اور آسمانوں اور زمین کی سلطنت میں غور و فکر اور غور و فکر کا عادی بناتا ہے تو یہ غور و فکر اس قدر لذت بخش اور لذیذ ہو جاتا ہے کہ اس سے کوئی دوسرا لذت نہیں موازنہ کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ کسی کو کسی سے کوئی حسد نہیں ہے اگرچہ دوسرا شخص الہی گنوسس کی ڈگری کے برابر ہے۔ ایسی کیا چیز ہے جو اس میں کسی کی اپنی خوشی سے کم ہوجائے گی؟ بالکل کچھ بھی نہیں! کسی کو اس سے بھی زیادہ لگاؤ ہوگا [غور و فکر اور غور و فکر جو بدلے میں خدا کی معرفت ، قربت اور قربت کا باعث بنتا ہے]۔ خدا کی سلطنت کے عجائبات اور شان و شوکت پر غور کرنے والوں کو جو خوشی محسوس ہوتی ہے وہ ان لوگوں کی خوشی سے زیادہ ہے جو جنت کے باغات، اس کے پھلوں اور پھولوں کو بیرونی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ گنوسٹک کی جنت خدا کی گنوسس ہے۔ یہ جنت کبھی معدوم نہیں ہوتی۔ ایک گنوسٹک ہمیشہ کے لئے اپنے سرسبز درختوں سے لذیذ پھل توڑتا ہے اور اس عظیم لذیذ غذائیت سے کسی کی روح کو پروان چڑھاتا ہے۔ یہ وہ پھل ہیں جو کلام الٰہی میں اس طرح بیان کیے گئے ہیں:

لَا مَقْطُوعَةٍ وَلَا مَمْنُوعَةٍ

"ایسے پھل جو اللہ تعالیٰ کے فضل و فضل سے عطا کیے جاتے ہیں] کبھی ختم نہیں ہوں گے اور نہ ہی ان سے کسی کو روکا جائے گا۔" (سورۃ البقرۃ باب 56، آیت 33)

قُطُوفُهَا دَانِيَةٌ

"اس کے پھل کم لٹکے ہوئے ہوں گے [کسی کے انتہائی اطمینان کے لئے پوری آسانی سے توڑنے کے لئے تیار]۔" (سورۃ البقرۃ باب 69، آیت 23)

اگر کوئی گنوسٹک اپنی بیرونی آنکھیں بند کرتا ہے تو پھر بھی روح کے ساتھ جنت کا مشاہدہ کرنے کے قابل ہوتا ہے اور اس کے باغات کا دورہ کرتا ہے۔ اگر ہم گنوسٹکس کی ایک بڑی تعداد کو فرض کریں تو ان کے درمیان باہمی حسد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دنیا کی زندگی میں ان کا یہی حال ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب آخرت میں پردہ اٹھا لیا جائے گا اور محبوب کو دیکھنے کا شرف حاصل ہوگا تو کیا ہوگا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں حسد نامی کوئی برائی نہیں ہوگی۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ جو لوگ جنت کے باشندے ہونے والے ہیں وہ یہاں بھی حسد نہیں کرتے کیونکہ جنت میں نہ تو کسی قسم کی کمی ہے اور نہ ہی کوئی رکاوٹ ہے۔ جنت خدا کی معرفت کے حصول کا ذریعہ ہو گی اور علم الٰہی کی راہ میں کوئی بھی دوسرے کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ لہٰذا اہل جنت کے لیے حسد کی ضرورت نہیں ہے، انہیں دنیا یا آخرت میں ایسا کرنے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ یہ ایک ایسی قابل مذمت صفت ہے جس کی وجہ سے انسان اعلیٰ ترین (*اعلیٰ* علین) سے نچلے درجے (*اسفال السفیلین*) تک گر جاتا ہے۔

ان تفصیلات سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ حسد کا تعلق ان مقاصد سے ہے جو محدود ہوتے ہیں، اگر کوئی ان کو حاصل کرتا ہے تو دوسرا ان سے محروم ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ دیکھتے ہیں کہ لوگ آسمان کی زینت سے لطف اندوز ہونے میں ایک دوسرے سے حسد نہیں کرتے بلکہ وہ باغات میں ٹہلنے میں ایک دوسرے سے حسد کرتے ہیں حالانکہ باغات اس وسیع و عریض زمین کا ایک چھوٹا سا حصہ ہیں اور زمین اپنی تمام وسعت کے ساتھ آسمان کے مقابلے میں بہت معمولی اور ادنیٰ ہے۔ چونکہ آسمان اتنا وسیع ہے کہ اگر دنیا کے تمام لوگ بیک وقت اس کی

طرف دیکھنا شروع کردیں تو یہ سب کے لیے کافی ہو جائے گا اور ہر شخص اپنی مشاہدے کی طاقت کے مطابق اس سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔

اگر آپ کے پاس سچی بصیرت ہے اور آپ اپنے نفس پر مہربان اور مہربان ہیں تو آپ کو اس نعمت کی تلاش کرنی چاہیے جس میں کوئی کوشش اور لذت نہ ہو جس کا خاتمہ نہ ہو، اور ایسی لذت خدا کے وجود یا ہستی (ذات)، صفات (*صفات*) اور اعمال (*عفال*) کی نعمتوں سے تعلق رکھتی ہے)۔ اگر تم نہ تو خدا کی معرفت چاہتے ہو اور نہ ہی اس کا ذائقہ چکھنا چاہتے ہو یا تمہاری خواہش کمزور ہو تو تمہیں اس سے معذرت کر دی جاتی ہے کیونکہ ایک غیر سمجھدار بچہ میں حاکمیت اور [سیاسی] اختیار کی خواہش نہیں ہوتی ہے - وہ صرف بڑے بالغ لوگ ہی سمجھتے ہیں اور ان کی تعریف کرتے ہیں۔ اسی طرح خدا کی معرفت کی بے پناہ خوشنودی صرف وہی لوگ سمجھتے ہیں جن کے لیے ذیل میں آیت نازل کی گئی ہے:

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَٰرَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ ٱللَّهِ

"یہ وہ لوگ ہیں جو خرید و فروخت کی وجہ سے یاد الٰہی سے باز نہیں آتے۔" (سورۃ البقرۃ البقرۃ آیت 37)

شدید خواہش (*شوق*) کا مرحلہ اس کا ذائقہ لینے کے بعد آتا ہے۔ جس نے (خدا کی معرفت) کا مزہ بھی نہیں چکھا وہ اس کا طالب بھی نہیں ہوگا اور نہ اسے سمجھ سکے گا۔ ایسا شخص آخر کار دنیا کی زندگی کے قیمتی موقع کو اس کے حقیقی مقصد اور اس کے نتیجے میں ابدی خوشی اور لازوال کامیابی کے حصول کے لیے استعمال کیے بغیر اپنے حقیقی اصل اور وطن کی طرف خالی ہاتھ لوٹنے کی وجہ سے بے پناہ محرومی اور نقصان کے گڑھے میں گر جائے گا۔

حسد کے علاج کے لئے دوا

حسد دل کی سب سے بڑی بیماریوں میں سے ایک ہے اور دل کی بیماریوں کا علاج علم اور عمل کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ آپ کے لیے حسد کی اس بیماری کے بارے میں فائدہ مند علم یہ ہے کہ حسد دنیا اور آخرت دونوں میں نقصان دہ ہے، لیکن یہ نقصان صرف حسد کرنے والے شخص کو ہوگا اور جس شخص [یا لوگوں کے ایک اجتماعی گروہ] کے ساتھ آپ حسد کر رہے ہیں اس کے ساتھ کچھ غلط نہیں ہوگا۔ نہ تو اس کی دنیا تباہ ہو گی اور نہ ہی مذہب، بلکہ ایسے شخص کو آپ کے حسد سے فائدہ ہوگا۔ اگر تم اس بات کو بصیرت سے جان لو گے تو نہ تو تم اپنی نفس کے دشمن ہو گے اور نہ ہی اس کے حقیقی دشمن کے دوست ہو گے اور یقینا حسد کے جال میں پھنسنے سے بچو گے۔

خدا کی طرف جانے کے راستے میں حسد کا نقصان: خدا کی طرف جانے کے راستے میں حسد کا نقصان یہ ہے کہ خدا کی ناراضگی اس وقت حاصل ہو جاتی ہے جب آپ خدا کی طرف سے اس کے بندوں پر اس کی نعمتوں کی تقسیم سے ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں اور آپ خدا کے اس عدل پر اپنی انگلی اٹھاتے ہیں جو اس نے اپنی پوشیدہ حکمت

کے ذریعے اپنی سلطنت میں قائم کی ہے۔ یہ ایک سنگین جرم ہے [تقسیم الٰہی پر اعتراض کرنا اور لوگوں کے پاس جو کچھ ہے اس پر حسد کرنا]؛ اللہ تعالیٰ کی *توحید* اور الٰہی ابدی حقایقیت (*ایمان*) کی حدود میں اس سے بڑا جرم کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ تم کسی مومن کے لیے برائی کی خواہش کرتے تھے اور تم بھلائی کی خواہش کرتے تھے۔ تم نے اللہ تعالیٰ کے انبیاء اور دوستوں اور مقربوں کے گروہ سے دوری اختیار کر لی ہے - یہ لوگ اللہ کے بندوں کے دوست اور مخلص ہیں۔ حسد دل کی برائی ہے کیونکہ یہ نیکی اور نیک اعمال کو کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے اور اسے رات کی طرح معدوم کر دیتی ہے جیسے رات دن کو کھا جاتی ہے۔

حسد کا دنیا کی زندگی کو نقصان پہنچانا: اس دنیا میں حسد کا نقصان یہ ہے کہ جب بھی آپ اس شخص پر کوئی نعمت نازل ہوتی ہے جس سے آپ حسد کرتے ہیں تو آپ مسلسل تکلیف میں مبتلا رہتے ہیں۔ سانپ آپ کے دل پر گھومتا ہے (نفرت کا ایک تمثیل) جب کسی کے حسد کا نشانہ بننے والا شخص سکون سے دیکھا جاتا ہے ، کیونکہ آپ کا خون ابلتا ہے اور آپ ان نعمتوں کے زوال کی حکمت عملی بنانا شروع کردیتے ہیں۔ جب آپ اس کے بارے میں کچھ کرنے میں بے بس محسوس کرتے ہیں تو ، آپ غم ، پچھتاوا ، پچھتاوا اور شرمندگی کا مجسمہ بن جاتے ہیں - اس طرح آپ اپنے لئے پریشانیوں اور مشکلات کو جمع کرنے کے سوا کچھ نہیں کرتے ہیں جبکہ اس شخص کے ساتھ کچھ بھی برا نہیں ہوتا جو آپ کے حسد کا نشانہ ہے۔ فرض کریں کہ آپ کو موت کے بعد قیامت کے بارے میں، قیامت کے دن جوابدہی، جزا اور سزا کے بارے میں یقین نہیں ہے، تب بھی آپ کی اپنی عقل کا تقاضا ہے کہ آپ حسد سے باز رہیں کیونکہ آپ اس سے دل کے غم اور درد کے سوا کچھ حاصل نہیں کرتے۔ اگر تم آخرت کے شدید عذاب کے بارے میں یقین رکھتے ہو تو اس سے بچنے کی پوری کوشش کرو۔ عقل مند شخص کے بارے میں یہ کچھ عجیب لگتا ہے کہ وہ خدا کی ناراضگی کو بغیر کسی مادی فائدے کے خریدتا ہے۔ حسد سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟ صرف اس کے برعکس نقصان ، نقصان اور دل کے لئے مسلسل عذاب اور درد جمع ہونے کی صورت میں ہوتا ہے - خدا کی طرف جانے کا راستہ اور دنیا (*دنیا*) دونوں تباہ ہوجاتے ہیں اور کوئی خالی ہاتھ رہتا ہے۔ جس پر آپ حسد کرتے ہیں اس پر ایک نظر ڈالیں اور اس کی حالت دیکھیں! کیا آپ کا حسد ایسے شخص کو کوئی نقصان پہنچا رہا ہے؟ اگر آپ غور کریں تو آپ کو اس کا جواب نفی میں ملے گا۔ نہ کسی کی دنیاوی زندگی کو نقصان پہنچے گا اور نہ ہی خدا کی راہ (*دین*) کیونکہ آپ کے حسد کی وجہ سے جو نعمتیں ہیں وہ کم نہیں ہوں گی، بلکہ وہ اس وقت تک قائم رہیں گی جب تک کہ اللہ نے ان کے لیے مقرر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَكُلُّ شَيْءٍ عِندَهُ بِمِقْدَارٍ

"ہر چیز کو خدا کی طرف سے ایک خاص پیمانہ کے ساتھ تقسیم اور مقرر کیا گیا ہے۔" (سورة البقرة سورة البقرة آیت 8)

ایک نبی نے خدا سے ایک ملکہ کے بارے میں التجا کی جو ظلم کے ساتھ ایک قوم پر حکومت کرتی تھی۔ اس پر وحی کی گئی ، "جو خدا نے ازل سے مقدر کیا ہے اس میں کسی تبدیلی کا کوئی امکان نہیں ہے ، اور وہ جو بلندی اور برکتیں اس کے لئے مقدر ہیں وہ یقینا اسے ملیں گی۔ صبر کرو تاکہ یہ دور گزر جائے جو اس کے لیے مقرر کیا گیا ہے [تاکہ اس عہد کے بعد ایک نیا دور طلوع ہو جو تمہارے صبر اور استقامت کے بدلے میں تمہارے لیے بہتر وقت کا پیش خیمہ ہو گا]۔ اس مثال سے معلوم ہوتا ہے کہ نعمت حسد سے ختم نہیں ہوتے، اور آپ کے حسد کا نشانہ بننے والے شخص کو کوئی نقصان نہیں ہوتا، اور اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کے حسد کی وجہ سے برکت ختم ہو سکتی ہے تو یہ جہالت کی انتہا ہے اور آپ کی نفس سے دشمنی کے مترادف ہے۔ اگر آپ کی خواہش ہے کہ آپ کے حسد کی وجہ سے تمام مخلوقات کی نعمتیں ختم ہو جائیں اور آپ کی اپنی نعمتیں آپ سے حسد کی وجہ سے ختم نہ ہوں تو

یہ خواہش بھی خالص جہالت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کے پاس کوئی خاص نہیں ہے جس کی وجہ سے آپ کو دوسروں پر ترجیح دی جاتی ہے۔ یہ ایک بہت بڑی نعمت ہے کہ حسد کسی کی نعمت کو ختم نہیں کرتا۔ آپ کو اس عظیم نعمت پر خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے لیکن افسوس کہ آپ اپنے اعمال سے اس کی تعریف نہیں کرتے۔

جہاں تک آپ کے حسد کا نشانہ بننے والے شخص کے نفع کا تعلق ہے تو یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس دنیا اور آخرت میں نفع حاصل کرتا ہے۔ راہ خدا یا دین کا فائدہ یہ ہے کہ جو شخص حسد کا نشانہ ہے وہ آپ کی وجہ سے مظلوم ہو جاتا ہے، خاص طور پر ایسے وقت میں جب آپ کا حسد آپ کے دل سے آپ کی زبان تک نکل آتا ہے یا آپ کے کسی عمل سے ظاہر ہوتا ہے، مثال کے طور پر، جب آپ غیبت کرتے ہیں تو اپنی عزت پر انگلی اٹھا لیں۔ لعنت کریں یا کسی کو ماریں (نقصان پہنچائیں)۔ یہ وہ تمام تحفے ہیں جو آپ اس شخص کو پیش کرتے ہیں جو آپ کے حسد کا نشانہ بنتا ہے، دوسرے لفظوں میں آپ اپنے نیک اعمال ایسے شخص کے حوالے کر دیتے ہیں جس حد تک آپ اپنے حسد کی حد تک اس شخص کے حوالے کر دیتے ہیں پھر جب آپ قیامت کے دن اس سے ملیں گے تو آپ کے حساب میں پچھتاوے اور محرومیوں کے سوا کچھ نہیں بچے گا، آپ وہاں کی نعمتوں سے محروم ہو جائیں گے جیسا کہ آپ اپنی دنیا کی زندگی میں تھے۔ آپ نے اس کی برکتوں کے زوال کی خواہش کی ، لیکن وہ برقرار رہے۔ مزید برآں ، آپ کے نیک اعمال کی برکتیں اس کے اعمال کے حساب کتاب میں منتقل ہوجائیں گی - اس شخص کو برکت ملے گی اور آپ کو بدقسمتی ملے گی۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے انسانیت کے دشمن شیطان کو خوش رہنے کا موقع دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شیطان کو ڈر ہے کہ تم ان لوگوں سے محبت کرنا شروع کر دو جنہیں تم اپنے دشمن سمجھتے ہو - وہ لوگ جن کے پاس علم، پرہیزگاری، تقدس اور خدا سے ڈرنے کی صفات ہیں - تاکہ تمہیں ان کے اجر میں حصہ ملے۔ شیطان چاہتا ہے کہ جس طرح تم نیکی سے محروم ہو جاؤ اسی طرح تم نیکی کی محبت سے محروم ہو جاؤ۔ ایک صحرائی عرب نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: یا رسول اللہ! ایک شخص نیک لوگوں کے گروہ سے محبت کرتا ہے اگرچہ وہ ان میں سے نہیں ہے۔" اس نے جواب دیا:

المرءمع من احب

"ایک شخص [یا لوگوں کے گروہ] کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبت کرتا ہے۔" (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *احادیث* میں عبداللہ بن مسعود *رضی اللہ عنہ پر صحیح بخاری* اور *صحیح مسلم* کا مجموعہ ہے

حسد اپنے آپ میں ایک گناہ ہے۔ کسی کو ان چیزوں پر غور کرنا چاہیے جو اس سے پیدا ہوتی ہیں جیسے اختلافات، سچائی کو قبول کرنے سے انکار کرنا، اور دشمن سے انتقام لینے کے لیے زبان اور ہاتھ کی فحاشی کا استعمال کرنے کی آزادی۔ یہ ایک ایسی بیماری ہے جس کی وجہ سے پچھلی قوموں کی تباہی ہوئی۔

حسد کا علم پر مبنی علاج یہ ہے کہ کوئی شخص حسد کے مقصد کے خلاف کام کرتا ہے، چاہے وہ بولی ہوئی چیز ہو یا عمل۔ لہذا ، اگر حسد کسی کو کسی کے حسد کا شکار ہونے کی مذمت کرنے پر آمادہ کرتا ہے تو ، اسے اس کی تعریف کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اگر حسد کسی کو اپنے دشمن کے خلاف تکبر کرنے پر آمادہ کرتا ہے تو اسے اپنے دشمن کے سامنے عاجز رہنا چاہیے اور ضرورت پڑنے پر معافی مانگنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اگر اس سے دشمن سمجھے جانے والے شخص کو دینے یا انعام دینے کی ترغیب دی جائے تو اس سے بھی زیادہ دینا چاہیے، چاہے اسے اپنے آپ کو زبردستی اور دل پر مجبور کرنا پڑے، کیونکہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ جب کسی کے حسد کا نشانہ بننے والا شخص ان چیزوں کو دیکھے گا تو اس سے خوشی آئے گی اور وہ محبت کرنے لگے گا اور جب ایسے

شخص کی طرف سے محبت ہوگی تو حسد کرنے والا بھی اس کے بدلے میں محبت کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ باہمی محبت ہم آہنگی کو جنم دے گی جس کے نتیجے میں حسد کا خاتمہ ہو جائے گا۔ عاجزی، حمد و ثناء، کسی اور کی نعمتوں پر خوشی کا اظہار کرنا، اس کی طرف مبہم ہو جاتا ہے اور اس کوشش کرنے والے شخص کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور بندہ کی مانند بن جاتا ہے اور اس کے ساتھ احسان کرنے اور اس کے ساتھ اچھا سلوک کرنے لگتا ہے۔ طرز عمل میں یہ فضیلت [اس شخص کی طرف سے جو کسی کے حسد کا نشانہ تھا] حسد کے ساتھ اس شخص کی طرف لوٹ جاتی ہے جس سے اس کا دل خوش ہوتا ہے جس نے پہلے فضیلت کے لیے کوشش کی لیکن بعد میں یہ اس کی عادت اور مزاج بن گئی (دوسری فطرت جو فطری اور آسانی سے کام کرتی ہے)۔ شیطان کا فریب آپ کو اس راہ سے باز نہیں رکھنا چاہیے کہ اگر آپ اپنے حسد کا نشانہ بننے والے کے ساتھ عاجزی اور حمد و ثناء کے ساتھ پیش آئیں گے تو آپ کو کمزور، نیچ، منافق اور خوفزدہ سمجھیں گے۔ شیطان انسانوں کو تباہ کرنے کے لیے اس طرح دھوکہ دیتا ہے۔ دشمن کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، چاہے وہ فطری ہو یا جبری طور پر، دشمنی کی بنیاد کو ختم کر دیتا ہے اور اس کی جگہ دونوں اطراف کی محبت سے بدل جاتا ہے اور وہ حسد کے درد اور سزا سے نجات حاصل کرتے ہیں۔

یہ حسد کی دوائیں ہیں اور ان کے فوائد سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم دلوں کو ان کا ذائقہ تلخ لگتا ہے لیکن کڑوی دوا وہ ہوتی ہے جو زیادہ فائدہ مند ہوتی ہے۔ جو دوا کی تلخی پر صبر نہیں کرتا، اسے علاج کی مٹھاس نہیں ملتی۔ اس تلخ دوا کو برداشت کرنا اس وقت آسان ہو جائے گا جب انسان علم پر مبنی اور علاج کے عملی طریقوں پر غور کرے اور یہ سمجھ جائے کہ احکام الٰہی کو قبول کرنا اور جزا کا طالب ہونا انسان کی ابدی خوشی اور لامتناہی کامیابی کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ سوچنا کہ دنیا میں میری خواہشات کے خلاف کچھ نہیں ہونا چاہیے اور کچھ [میری خواہشات] کے خلاف ہونا میری عزت نفس اور عزت نفس کے خلاف ہے، یہ محض جہالت ہے۔ اگر یہ [غلط] خیال دل میں جڑ جاتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ اپنے تمام دشمنوں کی موت کی خواہش کرے گا تاکہ [اپنے ذات] کی ذرا سی بھی مخالفت باقی نہ رہے۔ مزید یہ کہ یہ بھی چاہے گا کہ میری مرضی کے خلاف کچھ نہ ہو اور سب کچھ میری خواہشات کے مطابق ہو جائے، حالانکہ یہ ناممکن ہے اور انسان اپنی مرضی کے مطابق ہونے میں ناکامی پر دشمنوں سے حسد کرے گا اور اس کا حتمی نتیجہ اس کی سراسر ذلت اور ذلت ہو گا۔ اس ذلت سے بچنے کے دو طریقے ہیں: پہلا ، جو آپ چاہتے ہیں وہ ہوتا ہے ، اور دوسرا ، جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ آپ کی خواہش بن جاتا ہے۔ پہلا طریقہ کسی کے اختیار میں نہیں ہے اور اس میں جدوجہد کی کوئی گنجائش نہیں ہے، تاہم دوسرے طریقے کے لیے روحانی کوشش کام کرے گی۔ شدید روحانی کوشش کے ذریعے یہ ممکن ہے کہ کسی کا دل ارادے اور خواہش سے خالی ہو جائے اور اپنے آپ کو خدا کی مرضی کے تابع کر دے۔ ایک ذہین اور عقلمند شخص کے لیے یہ [دوسرا] طریقہ حاصل کرنا ضروری ہے [باطنی سکون، سکون، خوشی، ابدی خوشی اور لامتناہی فتح حاصل کرنے کے لیے]۔

باب 6 - دنیاوی زندگی، جائیدادوں اور قدرت سے لگاؤ اور اسے اپنی زندگی کا مقصد بنانا

دنیا کی زندگی سے دل کا لگاؤ اور اسے اصل چیز یا سب سے بڑی چیز یا واحد چیز سمجھنا تمام اخلاقی اور اخلاقی پابندیوں اور مصلحتوں کو ایک طرف رکھنے اور اس کے لیے ہر طرح سے لڑنے کی راہ ہموار کرتا ہے، ان معاملات کے لیے جو چیزوں کی مجموعی منصوبہ بندی میں معمولی اور غیر ضروری ہیں۔ یہ فکری عمل انفرادی سطح پر اور پوری قوموں کی اجتماعی سطح پر ہے۔ انفرادی سطح پر ، یہ کسی کی زندگی میں حقیقی اور اہم چیز کے بارے میں کسی کے نقطہ نظر کو بادل میں ڈال دیتا ہے ، جس سے کسی کے اندرونی اور بیرونی وجود پر شدید دباؤ پڑتا ہے۔ اس سے چوہوں کی دوڑ ، محدود وسائل کے لئے شدید مقابلہ اور ایک غیر ضروری جدوجہد کو یقینی بنایا جاتا ہے جو افراد کی پوری زندگی کو بیکار کوششوں میں کھا جاتا ہے جو کسی کے پاس موجود بہترین سرمایہ کو استعمال کرتا ہے جو وقت ہے۔ دوسری طرف دنیاوی زندگی سے لاتعلقی ہر چیز کو درست تناظر میں رکھنے کا باعث بنتی ہے اور اپنے ذہن، جسم، عقل اور روح کو بے سود کوششوں میں ضائع ہونے سے آزاد کرتا ہے جو اس کے پاس موجود سب سے بڑا سرمایہ کہا جاتا ہے، جو کہ اس کی زندگی کا محدود وقت ہے۔ دنیاوی زندگی سے وابستگی سے لاتعلقی اندرونی امن، سکون، اپنے ساتھ امن اور تمام انسانوں کے ساتھ امن کو فروغ دیتی ہے۔ ایک *صوفی* سنت نے کہا ہے کہ جب میں دنیا اور دنیاوی زندگی کو عظیم سمجھتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ میں کائنات کا محض ایک ایٹم ہوں۔ لیکن جب میں دنیاوی زندگی کو چھوٹا سمجھتا ہوں تو مجھے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کائنات میں ایک ایٹم ہے اور میں اس کائنات کا مالک ہوں!" یہ لاتعلقی ایک آزاد کرنے والی قوت ہے جو کسی کو شعور کی اعلیٰ سطح پر لے جاتی ہے جو اندر اور باہر سکون پیدا کرتی ہے۔ کوئی شخص کنجوسی کی مشق کرنے کے بجائے بانٹنا سیکھتا ہے ، غفلت کے برعکس دیکھ بھال ، اور خود غرضی کے برعکس بے لوثی ہے۔ غزالی نے دنیاوی زندگی سے وابستگی کے اسباب، اس سے ہونے والے نقصانات اور اس بیماری کا علاج بیان کیا ہے جو انسان کے دماغ، جسم، عقل اور روح کو اعلیٰ سطح کے شعور کے حصول کے لیے آزاد کرتا ہے۔ غزالی کی چھٹی کتاب "*احیاء العلوم الدین*" یا "خدا کی راہ کی معرفت کا احیاء" کی تیسری جلد یا چوتھائی میں اس کا تدارک بیان کرتی ہے۔ غزالی کی اس کتاب کے مندرجات یہاں مختصر شکل میں اس طرح پیش کیے گئے ہیں:

دنیاداری خدا کا دشمن ہے، خدا کے دوستوں کا دشمن ہے اور خدا کے منکر اور مخالفین کا دشمن بھی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے کیونکہ یہ اللہ کے بندوں (یعنی تمام انسانوں) کو سیدھی اور صحیح ہدایت کی راہ پر چلنے کی اجازت نہیں دیتا۔ یہ خدا کے دوستوں اور مقربوں (گنوسٹکس اور سنتوں) کا دشمن ہے جیسا کہ یہ ان کے سامنے بیڈ زین سے سجا ہوا ظاہر ہوتا ہے اور انہیں زندگی اور خوبصورتی سے بھرے ہوئے ہونے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتا ہے ، لہذا وہ اس کے دھوکہ دہی کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ اس کے پھنسے سے آزاد ہونے کے لیے انہیں صبر کے تلخ ڈرافٹ کو نگلنا پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے منکری اور مخالفین سے اس کی دشمنی یہ ہے کہ اس نے ان سے

دوستی کر کے انہیں اپنے فریب کے جال میں پھنسا دیا اور انہیں سبز چراگاہیں دکھا دیں یہاں تک کہ وہ اس کی گرفت میں آ جائیں اور جب وہ اس پر یقین کر لیں تو انہیں ذلت میں گھیر لیتا ہے اگر وہ دنیا کی رسوائی سے بچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں وہ آخرت کی ذلت اور رسوائی سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکیں گے۔ وہ ابدی خوشی اور ابدیت کی لامتناہی فتح سے محروم ہو جائیں گے جب وہ دنیا چھوڑ دیں گے، وہ اس کی جدائی کے درد سے غمگین ہوں گے۔ جب انہیں آخرت کا عذاب پہنچے گا تو وہ مدد کے لیے افسوس سے پکاریں گے لیکن دنیا (اس کتاب میں "دنیا" کا مطلب "دنیا" نہیں ہے بلکہ اس سے مراد دنیاداری یا دنیاوی وابستگی ہے؛ اس کے بعد بحث کے لیے اسے ہمیشہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے) ان کی مدد کے لیے نہیں آئے گا۔

جب دنیا کی برائی اور مصائب کی حالت ایسی ہو کہ وہ نہ تو خدا کا دوست ہے اور نہ ہی خدا کے دوستوں کا دوست ہے تو اس سے بھی زیادہ پریشان کن بات یہ ہے کہ وہ خدا کے مخالفین کا دوست بھی نہیں ہے، تو ہمارے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم اس کی حقیقت سے آگاہ ہوں اور اس کی تخلیق کے لیے حکمت کا پتہ لگائیں۔ اگرچہ یہ خالق اور مخلوق کا دشمن ہے۔ اس کے بعد ہمیں دیکھنا چاہیے کہ یہ کس طرح دھوکہ دہی کرتا ہے اور برائی پھیلانے کے لیے کون سے طریقے استعمال کرتا ہے (اضطراب، ہنگامہ آرائی اور انتشار) کیونکہ جب تک ہم برائی کے داخلی راستوں سے آگاہ نہیں ہوں گے، ہم اس سے خود کو بچا نہیں سکیں گے، بلکہ اگر ہم اس میں پھنس جائیں گے تو یہ حیرت کی بات نہیں ہوگی۔ اگلے ابواب میں سب سے پہلے آیات الٰہی، نبوت کی روایات اور روایات سے دنیاداری کے نقصانات کی وضاحت کی جائے گی اور مثالوں کے ذریعے ان کی حقیقت کو واضح کیا جائے گا، پھر دنیاوی اعمال کی تفصیل بیان کی جائے گی کہ جب لوگ ان میں مشغول ہو جاتے ہیں تو وہ یاد الٰہی سے غافل اور غافل کیوں ہو جاتے ہیں اور اس کے بعد دنیاوی وابستگیوں کے علاج کی وضاحت کی جائے گی۔

قرآن نے بے شمار مقامات پر دنیاداری کی مذمت کی ہے اور سامعین کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اس سے پرہیز کریں اور اپنے رب مہربان کی طرف رجوع کریں۔ پیغمبروں کو بھیجنے کا مقصد اللہ کے بندوں کو دنیاوی وابستگیوں سے روکنا ہے تاکہ وہ آخرت کی راہ پر گامزن ہوں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

حب الدنیا راس کل خطیئة

"دنیا سے محبت (دنیاوی وابستگیاں اور الجھنیں) تمام گناہوں کی جڑ ہے"۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث مجموعے *ابن ابی دنیا* اور *بیہقی*)

ان الدنیا حلوة خضرة وان اللہ مستخلفکم فیها فناظر کیف تعملون ان بنی اسرائیل لما بسطت لهم الدنیا و مهدت تاهوا فی الحلیة والنساء والطیب والثیاب

"دنیا میٹھی اور سرسبز ہے اور اللہ تعالیٰ تمہیں اس میں اپنا نائب بناتا ہے تاکہ دیکھے کہ تم کس قسم کے اعمال اور اعمال کرتے ہو۔ جب بنی اسرائیل کے لیے دنیا پھیلی تو وہ زیورات، عورتوں، خوشبو اور کپڑوں سے حیران رہ گئے۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث میں ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کے بارے میں ترمذی *اور* ابن ماجہ *کا* مجموعہ ہے۔ اس روایت میں بنی اسرائیل کے بارے میں وہ حصہ نہیں تھا جو *ابن ابی دنیا* نے حسن رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: دنیا کو اپنا مالک نہ بناؤ، وہ تمہیں اس کا غلام بنائے گی۔ اپنے خزانے کو کسی ایسے شخص کے ساتھ امانت کے طور پر رکھیں جو اسے ضائع نہیں کرے گا اور اس کی حفاظت کرے گا۔ دنیاوی خزانوں کا مالک ہر وقت چوری سے ڈرتا ہے۔ جس کے پاس اللہ کے پاس خزانے ہوں وہ کسی قسم کا خوف نہیں رکھتا۔ " ایک بار اس نے کہا: اے شاگردو! میں نے آپ کے لیے دنیا کو الٹ کر رکھ دیا ہے۔ میرے بعد اسے مت اٹھانا۔ دنیا کی برائیوں میں سے یہ ہے کہ انسان دنیا کی خاطر خدا کی نافرمانی کرتا ہے، حالانکہ جب تک کوئی دنیا

کو چھوڑ نہیں دیتا اس وقت تک آخرت نہیں ملتی۔ اگر تم آخرت چاہتے ہو تو اس طرح زندگی گزارو جیسے دنیا صرف ایک راستہ ہے اور اس میں بسنا نہیں اور جان لو کہ ہر گناہ کی جڑ دنیا کی محبت ہے۔ کبھی کبھی ہوس کا ایک لمحہ طویل عرصے تک غم کا سبب بن جاتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: دنیا طالب بھی ہے اور مطلوب بھی۔ آخرت کے طالب کو دنیا تلاش کرتی ہے تاکہ وہ اپنی رزق کو پورا کر سکیں [جو اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم سے ہر فرد کے لیے تقسیم کر دیا ہے]۔ دنیا کے متلاشی کو آخرت تلاش کرتی ہے یہاں تک کہ وہ مر جاتا ہے اور وہ اس کی گردن پر سوار ہونے لگتا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت حضرت داؤد علیہ السلام کے بیٹے حضرت سلیمان اپنے لشکر کے ہمراہ ایک نمازی کی عیادت کے لیے گئے تھے۔ اس کے دائیں اور بائیں طرف جنوں اور انسانوں نے قطاریں بنائی تھیں اور پرندے اس کے اوپر سے سایہ کر رہے تھے عبادت گزار نے کہا: اے بیٹے داؤد! اللہ نے تمہیں بڑی سلطنت عطا فرمائی ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا: ایک مومن کے اعمال سے ایک تسبیح کی قدر اس سے بہتر ہے جو بنی داؤد کو عطا کی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو کچھ داؤد کے بیٹے کے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا اور خدا کی یاد [ابد کے لئے] رہے گی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الهاكم التكاثر يقول ابن آدم مالي مالي وهل لك من مالك الا ما أكلت فافنيت اولبست فابليت او تصدقت فابقيت

"زیادتی کے لالچ نے تمہیں غفلت اور غفلت میں رکھا تھا۔ ابن آدم کہتے ہیں: میرے مال! میرے مال اگرچہ تمہارے پاس جو کچھ ہے وہ وہی ہے جو تم نے کھایا یا پہن کر بوڑھا کر دیا یا صدقہ میں دے دیا (اور اس کی حفاظت کرنے کے قابل ہو۔" (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث کا مجموعہ *صحیح مسلم* عن عبد اللہ بن الشخیر رضی اللہ عنہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا:

الدنيا دار من لا دار له، ومال من لا مال له ولها يجمع من لا عقل له، وعليها يعادي من لا علم له، وعليها يحسد من لا فقه له ولها يسعى من لا يقين له

"دنیا اس کا گھر ہے جس کے پاس گھر نہیں ہے۔ اس شخص کا مادی قبضہ جس کے پاس [روحانی فضیلت سے] کوئی قبضہ نہیں ہے۔ جو دنیا کو جمع کرتا ہے وہ وہی ہے جس کے پاس عقل نہیں ہے اور اس چیز پر جھگڑا کرتا ہے جس کا اسے علم نہیں ہے اور اس سے حسد کرتا ہے جس کے پاس عقل نہیں ہے اور اس کے لیے جدوجہد کرتا رہتا ہے کیونکہ اس کے پاس یقین نہیں ہے۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث کا مجموعہ *مسند احمد* عائشہ رضی اللہ عنہا پر

ایک نبوی روایت میں ہے:

من اصبح والدنیا اکبر همه فلیس من الله فی شئ والزم الله قلبه اربع خصال هما لا ینقطع عنه ابدا وشغلا لا یتفرغ منه ابدا وفقرا لا یبلغ غناه ابدا واملا لا یبلغ منتهاه ابدا

"جس کی باطنی کیفیت ایسی ہو کہ دنیا (دنیاوی مادہ پرستی کے عزائم اور مقاصد) اس کا سب سے بڑا مقصد بن جاتا ہے، ایسا انسان خدا پرستی سے عاری ہو جاتا ہے اور خدا اس شخص کے دل کے لیے چار خصلتیں ضروری بناتا ہے: غم جو کبھی الگ نہیں ہوتا، مسلسل مصروفیت جو کسی قسم کی مہلت نہیں دیت، غربت (ناکافی نہ ہونے کا احساس) جو کبھی بھی دولت تک نہیں پہنچتا [اس حد تک کہ انسان کافی ہونے سے مطمئن ہو جائے]. اور لمبی امیدیں جو کبھی پوری نہیں ہوتیں". (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *احادیث میں ابو ذر رضی الله عنہ اور* ابن ابی دنیا *رضی الله عنہ سے ابو ذر اور ابن ابی دنیا رضی الله عنہ سے روایت کی گئی ہے*

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بیٹے مریم علیہ السلام نے فرمایا: اس دنیا میں سے کسی شخص کے لیے حیرت کی بات ہے کہ وہ موت کے بارے میں یقین رکھتے ہوئے بھی اس سے دھوکہ کھا جاتا ہے اور سب کچھ چھوڑ کر مر جاتا ہے، دنیا انسان کو ذلیل کرتی ہے لیکن وہ اس سے بے خوف ہے اور اس پر بھروسہ کرتا ہے۔ بڑی بدقسمتی ان لوگوں کے لیے ہے جو دھوکہ کھا جاتے ہیں، جن کو دنیا انہیں وہ چیز دکھاتی ہے جو وہ دیکھنا ناپسند کرتے ہیں اور انہیں ان کی محبوب چیزوں سے الگ کر دیتے ہیں۔ افسوس ان لوگوں پر ہے جن کا مقصد دنیا ہے، جن کے اعمال گناہ ہیں، وہ اپنے گناہوں کی وجہ سے کس قدر ذلیل ہوں گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا کہ اے موسیٰ! ظالموں کے اس گھر سے تمہارا کیا تعلق ہے؟ یقینا یہ ٹھکانہ تمہارا نہیں ہے۔ اسے اپنے خیالات اور تخیل کا مرکز نہ بنائیں۔ اپنے دل کو اس سے ہٹا دو اور اپنی عقل کو اس سے دور کر دو کہ یہ تمہارا گھر ہے۔ لیکن اگر کوئی اس گھر میں نیکی کرے تو وہ ایسے شخص کے لیے اچھا گھر ہو گا۔ میں ظالموں کا انتظار کرتا ہوں یہاں تک کہ مظلوموں کا بدلہ لے لوں۔ ایک نبوی روایت میں منقول ہے کہ نبی اکرم صلی الله علیہ وسلم نے ابو عبیدہ بن الجراح رضی الله عنہ کو بحرین کے سفر پر بھیجا تھا۔ جب وہ واپس آیا تو وہ اپنے ساتھ کچھ رقم (سونے اور چاندی کے سکوں کی شکل میں جو اس وقت رائج تھے) لے کر آیا۔ انصاری اصحاب (مدینہ اور اس کے گردونواح کے اصل باشندے) نے ابو عبیدہ بن الجراح رضی الله عنہ کی واپسی کے بارے میں سنا اور آپ نے کچھ رقم واپس لے کر آئے۔ ان سب نے صبح کی نماز میں نبی کریم صلی الله علیہ وسلم کے ساتھ شرکت کی۔ جب وہ نماز کے بعد [گھر] لوٹ رہے تھے تو وہ اس کی راہ میں کھڑے ہو گئے۔ نبی کریم صلی الله علیہ وسلم نے انہیں دیکھ کر مسکرا دیا اور فرمایا:

انا اظنکم سمعتم ان ابا عبیدة قدم بشئ' قالوا اجل یا رسول الله! قال: فابشروا واملوا ما یسرکم فوالله ماالفقر اخشى علیکم ولکنی اخشى علیکم ان تنبسط علیکم الدنیا کما بسطت على ماکان قبلکم فتنافسوها کما تنافسوها فتهلککم کما اهلکتهم

"میرا خیال ہے کہ تم نے سنا ہے کہ ابو عبیدہ کچھ لے کر آئے ہیں". صحابہ کرام رضی الله عنہم نے عرض کیا: ہاں یا رسول الله! کہا تمہیں خوشخبری ہے کہ الله نے تم سے تکلیف دور کر دی ہے خدا کی قسم! میں تم سے بے فلسی ہونے کا خوف نہیں رکھتا لیکن مجھے ڈر ہے کہ دنیا تمہارے لیے اسی طرح پھیل جائے گی جس طرح تم سے پہلے لوگوں کے لیے تھی اور تم ایک دوسرے سے مقابلہ کرنا شروع کر دو گے اور دنیا تمہیں تباہ کر دے گی جس طرح

دنیا تمہیں تباہ کر دے گی۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *احادیث* کا مجموعہ *صحیح بخاری* اور صحیح *مسلم* عمرو بدری رضی اللہ عنہ پر ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: سمندر کی لہروں پر کوئی عمارت نہیں بنا سکتا۔ دنیا بھی سمندر کی لہروں کی طرح ہے، اسے اپنا مسکن نہ سمجھو"۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعض صحابہ کرام نے ان سے درخواست کی کہ وہ ان سے کوئی نصیحت دیں جس پر عمل کرنے کے بعد وہ خدا کی محبت کے مستحق بنیں۔ اس نے جواب دیا: دنیا سے محبت کرنا چھوڑ دو، خدا تم سے محبت کرنا شروع کر دے گا۔ حضرت ابودردہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لو تعلمون ما اعلم لضحكتم قليلا ولبكيتم كثيرا ولهانت عليكم الدنيا ولاثرتم الاخرة

"اگر تم جانتے کہ میں کیا جانتا ہوں تو تم کم ہنستے اور زیادہ روتے اور تمہارے لیے دنیا کم ہو جائے گی اور تم آخرت کو پسند کرو گے۔" (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *احادیث* کے مجموعے *ترمذی* اور *ابن ماجہ*)

اس کے بعد حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ صحابی نبی جو دنیاداری سے ترک کرنے کے لیے مشہور تھے، نے اپنے آپ سے فرمایا: اگر تم جانتے ہو جو میں جانتا ہوں تو تم روتے اور روتے ہوئے پہاڑوں کی طرف نکل جاتے، اور اپنا سارا مال اور مال چھوڑ کر بھاگ جاتے، اور انہیں بغیر کسی ضرورت کے استعمال نہ کرتے۔ لیکن تمہارے دلوں سے آخرت غائب ہو چکی ہے اور دنیاوی مالوں اور مالوں کا لالچ ہمیشہ موجود ہے۔ تم جو کچھ بھی کرتے ہو وہ دنیا کی خاطر ہے اور تم ان لوگوں کی مانند ہو گئے ہو جو کچھ نہیں جانتے۔ تم میں سے کچھ لوگ ان مویشیوں سے بھی بدتر ہیں جو برائی کرنے سے پہلے نتائج کے بارے میں نہیں سوچتے۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم ایک دوسرے کے ساتھ نہ تو باہمی محبت کرتے ہو اور نہ ہی ایک دوسرے کے ساتھ اخلاص کرتے حالانکہ تم سب خدا کی راہ میں بھائی چارے کے رشتے سے وابستہ ہو؟ آپ کی اندرونی برائی نے آپ کے مقاصد میں اختلافات پیدا کیے ہیں اور آپ کے راستوں کو الگ کر دیا ہے۔ اگر تم سب راستبازی پر متفق ہوتے، تو تم سب ایک دوسرے سے محبت کرتے۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم دنیا کے معاملات میں ایک دوسرے کے ساتھ مخلص ہو گئے اور آخرت کے معاملات میں آپس میں مخلص نہیں ہو تم جن لوگوں سے محبت کرتے ہو وہ آخرت کے معاملات میں ان کی مدد نہیں کرتے۔ یہ سب ایمان کی کمزوری کی نشانیاں ہیں۔ اگر تم آخرت کی بھلائی اور برائی پر یقین رکھتے جس طرح تم دنیا کی یقین رکھتے تو تم آخرت کے لیے جہاد کرتے جو تمہیں ہر چیز میں بھلائی فراہم کرتی ہے۔

اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ آپ اپنے قریب کی چیزوں (دنیا کی زندگی) سے زیادہ محبت کرتے ہیں (آخرت کی زندگی) کیونکہ دنیا آپ کی آنکھوں کے سامنے ہے جبکہ آخرت آپ کی آنکھوں سے پوشیدہ ہے، جو حاضر ہے اس سے محبت کی جاتی ہے اور جو موجود نہیں ہے اس سے محبت نہیں کی جاتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ان چیزوں کی خاطر جو دنیا کی چیزیں موجود ہیں ان کی خاطر چھوڑ دیتے ہیں جو ابھی آنے والی ہیں (متوقع ہیں) آپ سخت محنت کرتے ہیں اور جو چیزیں آپ کے سامنے نہیں ہیں لیکن امید کی ایک کرن ہے کہ آپ کو مل جائے گا، ان کے لیے آپ کو طرح طرح کی مشکلات اور پریشانیاں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ آپ اچھے لوگ نہیں ہیں کیونکہ آپ کو یقین نہیں ہے کہ ایمان کا کمال کیا ہے۔ اگر آپ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے لائی گئی شریعت کے بارے میں شک ہے تو ہمارے پاس آئیں، ہم آپ کو بتائیں گے اور ایمان کے نور سے ہم آپ کو وہ [روحانی] حقائق

دکھائیں گے جو آپ کے دلوں کو مطمئن کریں گی۔ اللہ کی قسم تم ناقص عقل والے لوگ نہیں ہو اس لیے ہم تمہیں مستثنیٰ سمجھتے ہیں۔ دنیاوی معاملات میں آپ کی رائے ٹھوس ہے اور اگر آپ کو دنیا کا تھوڑا سا حصہ مل جائے تو آپ کی خوشی کی کوئی حد نہیں ہے۔ جب دنیا سے ایک چھوٹی سی چیز کھو جاتی ہے تو ، آپ کی دکھ کی کیفیت دیکھنے کے قابل ہوتی ہے - آپ کے چہرے آپ کے دلوں کا عکس بن جاتے ہیں اور آپ کی زبانیں آپ کے دلوں میں جو کچھ ہے اس کا اظہار کرتی ہیں۔ آپ اسے مشکل کہتے ہیں۔ تم میں سے بہت سے ایسے بھی ہیں جنہوں نے اپنے دین کو الوداع کہا ہے لیکن تمہارے دل نہ تو پشیمان ہیں اور نہ تمہارے چہروں سے ظاہر ہیں۔ [آپ کے دلوں میں] ایک عجیب و غریب حساسیت ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ خدا تم سے ناراض ہے۔ جب آپ ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو ، آپ اپنے آپ کو خوشی کا اظہار کرنے پر مجبور کرتے ہیں صرف اس خوف کی وجہ سے کہ اگر آپ بدتمیزی کرتے ہیں تو دوسرا شخص آپ کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کرے گا۔ آپ اپنی موت (زندگی کا خاتمہ) بھول گئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے تم سے آسانی عطا فرمائے اور مجھے ان لوگوں کے ساتھ جوڑ دے جن کی ملاقات کا میں بے تاب ہوں۔ اگر وہ آج زندہ ہوتے تو تم سے یہ باتیں قبول نہ کرتے۔ اگر آپ کے اندر اچھائی کا کوئی عنصر ہے تو میں نے وضاحت کے ساتھ کیا ہے۔ اگر آپ یہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو خدا کے پاس ہے تو اس کا طریقہ مشکل نہیں ہے۔ میں اپنے اور اپنے لئے مدد اور مدد کے ساتھ خدا کی مدد چاہتا ہوں۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے شاگردوں سے فرمایا: اپنے دین کی حفاظت کے ساتھ چھوٹی سی دنیا سے مطمئن رہو، جس طرح دنیا کے لوگ دنیا کی حفاظت کے ساتھ کم سے کم دین سے لڑتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جس نے اپنے باطن میں چھ صفات پیدا کی ہیں اس نے جنت کے حصول اور جہنم سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی: پہلی خوبی یہ ہے کہ وہ خدا کو پہچاننے کے بعد اس کی اطاعت کرے۔ دوسرا یہ کہ شیطان کو پہچاننے کے بعد اس کی نافرمانی کرے، تیسری یہ کہ حق کو پہچاننے کے بعد اس کی پیروی کرے، چوتھی بات یہ کہ باطل کو پہچاننے کے بعد اس سے بچ جائے، پانچواں یہ کہ وہ دنیا پرستی کو پہچاننے کے بعد اس سے انکار کر دے، اور چھٹا یہ کہ وہ آخرت کو پہچاننے کے بعد اس کی تلاش کرے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے کے حکیم لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا: اے بیٹا! دنیا ایک گہرے سمندر کی طرح ہے جس میں بہت سے لوگ ڈوب چکے ہیں۔ خدا کے جہاز پر اس کے ذریعے سفر کرو، ایمان کو اپنا سفری ساتھی بناؤ، خدا پر بھروسہ کرو تو شاید اس طرح ڈوبنے سے بچ جاؤ، ورنہ مجھے تمہاری بقا کا کوئی دوسرا راستہ نظر نہیں آتا۔ حضرت ابو سلیمان دارانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "جو شخص محبت سے دنیا کی تلاش کرتا ہے وہ اپنی خواہش کے مطابق حاصل نہیں کرتا، اور جو شخص محبت کے ساتھ آخرت کا طالب ہے تو اسے اپنی نیت اور خواہش سے زیادہ حاصل ہوتا ہے تو اس کا نہ کوئی انت ہے اور نہ ہی کوئی حد ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہر انسان مہمان ہے اور جو کچھ بھی مال اور مال اس کے پاس ہے وہ امانت ہے۔ مہمان چلے جائیں گے اور امانت اس کے [سچے مالک کے وارث ہے] [خدا جو اس زمین اور اس میں اور اس سے آگے کی ہر چیز کا وارث ہے]۔ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ سے ان کی حالت کے بارے میں پوچھا گیا جس کا جواب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دو آیات سے دیا:

نرقع دنیانا بتمزیق دیننا   فلا دیننا یبقی ولا ما نرقع
فطوبی لعبد اثر اللہ ربہ   وجاد بدنیاہ لما یتوقع

"ہم اپنی دنیا کی تعمیر کے لیے خدا کا راستہ تباہ کر دیتے ہیں لیکن نہ تو راستہ باقی رہتا ہے اور نہ ہی دنیا۔ خوشخبری ان بندوں کے لیے ہے جنہوں نے رب کی راہ اختیار کی اور اپنی دنیا کی زندگی کو آخرت کی خاطر قربان کیا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے دنیا کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے، ایک حصہ مومن کے لیے، ایک حصہ منافق کے لیے اور ایک حصہ کافروں کے لیے۔ مومن دنیا سے آخرت کی راہ پر توکل کرتا ہے، منافق ظاہری زینت کی طرف توجہ دیتا ہے اور کافر دنیاوی کامیابی حاصل کرتا ہے۔

حسن بصری رحمہ اللہ نے خلیفہ عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کو خط لکھا کہ دنیا سفر کی منزل ہے اور یہ رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کو عذاب کے طور پر دنیا پر بھیجا گیا تھا، اسی لیے اپنے آپ کو اس کے فریب و فریب سے محفوظ رکھو۔ اے ایمان والوں کے امیر! اس کو ترک کرنا (یعنی دنیا پرستی کو اس کے تمام جالوں کے ساتھ) آخرت کا ہی رزق ہے اور اس میں زندگی کم سے کم گزارنا اور غیر ضروری حاجتوں کو ترک کرنا ہی انسان کے لیے نعمت ہے۔ یہ ہر لمحہ ہر وقت مارتا ہے۔ جو اس کا احترام کرتا ہے ، اس سے ذلیل ہوجاتا ہے۔ جو اسے جمع کرتا ہے وہ اس سے محتاج ہو جاتا ہے یہ ایک زہر کی طرح ہے جو نادانستہ طور پر کھا جاتا ہے جس کی وجہ سے انسان موت کی آغوش تک پہنچ جاتا ہے۔ اس دنیا میں اپنی زندگی اس شخص کی طرح گزارو جو اپنے زخموں کا علاج کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ، ان تمام احتیاطی تدابیر اور روک تھام پر عمل کریں جو علاج کے دوران مریض کے لئے ضروری ہیں اس خوف سے کہ لاپرواہی بیماری کی شدت کا باعث بن سکتی ہے۔ مریض کو چاہیے کہ وہ دوا کی تلخی اور شدت کو برداشت کرنے کی کوشش کرے تاکہ بیماری کی طوالت سے بچا جا سکے۔ اپنے آپ کو اس غیر دیرپا ، بے وفائی ، چالاکی اور دھوکہ دہی والی دنیا سے محفوظ رکھیں۔ اس نے اپنی زینت میں دھوکہ دہی کو چھپا رکھا ہے۔ یہ لوگوں کو اپنی خوبصورتی کے جال میں پھنساتا ہے اور ان میں اس کے حصول کی خواہش پیدا کرتا ہے، پھر اس کے عاشقوں کو اس کی افراتفری اور مشکلات میں شکار کیا جاتا ہے کہ وہ ہوش کھو دیتے ہیں اور اپنے آخری انجام کی پرواہ کیے بغیر مکمل طور پر اس سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک دلہن کی طرح ہے جس کی خوبصورتی مناظر کو حیرت زدہ کرتی ہے، دل اسے دیکھنے کے خواہشمند ہوتے ہیں، اور اس پر ایک نظر ڈالنے کے لیے پریشان ہوتے ہیں، لیکن یہ اس کے چاہنے والوں کے لیے آخری انجام کا پیغام رساں ہے۔ جس کو اس کی قربت ملتی ہے، تباہی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔ افسوس! اب لوگ نہ ماضی سے سبق لیتے ہیں اور نہ ہی حال سے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کو پہچانتے ہیں وہ دنیا سے متعلق کسی نصیحت پر بھی توجہ نہیں دیتے۔ اللہ کے بہت سے عاشق ہیں جو اس کا کچھ حصہ حاصل کرنے پر تکبر کرتے ہیں اور سرکشی پر جہنم بن جاتے ہیں، آخرت کو بھول جاتے ہیں اور اپنے آپ کو اس قدر مگن کر دیتے ہیں کہ وہ غلطیوں سے بچ نہیں سکتے۔ جب وہ ہوش میں آتے ہیں تو انہیں شرمندگی محسوس ہوتی ہے اور پچھتاوا دل کو کھینچتا ہے لیکن یہ آنے والی موت کا وقت ہے - ایک طرف موت کی شدت کا سامنا کر رہا ہے تو دوسری طرف شرم اور پچھتاوے کا درد برداشت کر رہا ہے۔ جو شخص دنیا کی طرف مائل ہوتا ہے وہ نہ تو اپنے مقصد کو حاصل کر سکتا ہے اور نہ ہی نفس کو کسی مشکل سے تسلی دے سکتا ہے اور بغیر کسی رزق اور تیاری کے اپنے آخری وطن میں پہنچ جاتا ہے۔ اے ایمان والوں کے امیر! اپنے آپ کو اس سے بچائیں. جب آپ اس سے زیادہ خوش ہوتے ہیں تو زیادہ محتاط رہیں کیونکہ جب دنیاوی لوگ کچھ خوشی سے مطمئن ہوجاتے ہیں تو وہ انہیں مشکلات میں گھیر لیتے ہیں۔ جو اس میں خوش رہتا ہے وہ دھوکہ کھا جاتا ہے۔ آج جو فائدہ اٹھا رہا ہے وہ کل نقصان برداشت کرے گا۔ دنیا کی زندگی کی وسعت مصائب کا پیش خیمہ ہے اور اس میں رزق کا خاتمہ ختم ہونے پر ہوتا ہے۔ اس کی ہر خوشی غم سے بھری ہوئی ہے۔ جو اس سے دور چلا جاتا ہے وہ اس کی طرف لوٹ کر نہیں آتا جو اس میں رہتا ہے وہ نہیں جانتا کہ آگے کیا ہوگا لہذا کوئی اس کا انتظار کر سکتا تھا۔ یہاں رہتے ہوئے انسان دو خطرات سے گھرا ہوا ہے، ایک خطرہ یہ ہے کہ نعمتیں ختم ہو جائیں گی اور دوسرا خطرہ مشکلات کا ہے۔ فرض کریں کہ اگر خدا نے ہمیں دنیا کے نقصانات سے آگاہ نہ کیا ہوتا اور اگر خدا نے مثالوں کے ذریعے حقیقت کو ظاہر نہ کیا ہوتا تو ایک غفلت کرنے والے شخص کو نیند سے بیدار کرنے کے لیے کافی ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں کسی مدد کے بغیر نہیں چھوڑا بلکہ ان کی طرف نصیحت کرنے والے بھیجے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا کے خزانوں کی کنجیاں پیش کی گئیں۔ اگر وہ ان کو قبول کرتے تو اس کا درجہ کم نہ ہوتا لیکن پھر

بھی اس نے ان کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ (اس روایت کو اس خط اور اس کے جواب کے ساتھ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے *:ابن ابی دنیا*)

اس میں شامل ہونے کے بعد دنیا کے نقصانات سے بچانا

دنیاداری کے نقصانات سے بچنا اس میں غرق ہونے کے بعد نہ صرف مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انما مثل صاحب الدنیا کالماشی فی الماء ھل یستطیع الذی یمشی فی الماء ان لا تبتل قدماہ

انہوں نے کہا کہ اس دنیا کے شخص کی مثال اس شخص کی طرح ہے جو پانی میں چلتا ہے۔ کیا پانی میں چلنے والے کے لیے یہ ممکن ہے کہ پاؤں گیلے نہ ہوں؟" (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے احادیث *میں ابن ابی الدنیا* اور حضرت *انس* رضی اللہ عنہ پر *احادیث* کا مجموعہ ہے

اس نبوت روایت کی روشنی میں ان لوگوں کی جہالت واضح ہو جاتی ہے جو کہتے ہیں: "ہمارے جسم صرف دنیاوی لذتوں میں مشغول ہوتے ہیں لیکن ہمارے دل نہیں کرتے، کیونکہ ہمارے دلوں کا بدن سے کوئی تعلق نہیں ہے"۔ یہ ایک شیطانی فریب ہے کیونکہ اگر وہ ان لذتوں سے دور ہو جائیں تو وہ ان سے جدائی پر غمگین ہو جاتے ہیں۔ اگر ان لذتوں کا ان کے دلوں سے کوئی تعلق نہیں ہے تو پھر اس غم کا کیا مطلب ہے؟ جس طرح پانی میں چلنے کا مطلب یہ ہے کہ پاؤں گیلے ہو جائیں گے، اسی طرح دنیاوی لذتوں میں مشغول ہونے کا مطلب یہ ہے کہ دل لازمی طور پر متاثر ہو جائے گا اور ان لذتوں سے آلودگیوں کا اثر یقینا دل تک پہنچے گا۔ بلکہ اگر دل میں اس دنیا کے بارے میں ذرا سا بھی خیال ہو تو بھی وہ عبادت الٰہی کی مٹھاس سے محروم ہو جائے گا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جس طرح ایک بیمار شخص کھانے سے لطف اندوز نہیں ہوتا اسی طرح دنیاوی شخص بھی عبادت کی مٹھاس کا مزہ نہیں چکھتا۔ میں آپ سے یہ بھی سچ کہتا ہوں کہ جس طرح ایک گھوڑے پر سوار نہیں ہوتا ہے وہ سرکش ہو جاتا ہے اور اس کا مزاج خراب ہو جاتا ہے، اسی طرح انسان کا دل ایسا ہی ہوتا ہے - اگر موت اور عبادت کی سختی کی یاد سے نرم نہ ہو تو اس میں سختی اور سختی پیدا ہوتی ہے۔ یہ بات بھی درست ہے کہ جب تک کوئی برتن گیلے پن سے الگ ہو کر خشک نہیں ہو جاتا، وہ شہد ذخیرہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، اسی طرح دل حکمت اور معرفت سے لبریز ہوتے ہیں جب تک کہ وہ خواہشات سے الگ نہ رہیں اور لالچ سے آلودہ نہ ہوں اور لذتوں سے سخت نہ رہیں۔

دنیا میں عیش و عشرت اور آخرت کی غفلت کی تمثیل: دنیا کے لوگوں کی آخرت کے بارے میں غفلت کی تمثیل لوگوں کے ایک گروہ کی ہے جو ایک جہاز پر سفر کرتے ہیں جو کسی دور دراز جزیرے پر پہنچ جاتا ہے اور جہاز کا کپتان ان سے کہتا ہے کہ وہ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے جہاز سے اتر جائیں۔ اس کے ساتھ ہی انہیں بتایا جاتا ہے کہ اس جگہ پر طویل عرصے تک رہنا مناسب نہیں ہے کیونکہ یہ خطرناک جگہ ہے اور اگر وہ جلدی نہ کریں تو جہاز اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جائے گا۔ اب لوگ جزیرے پر اترتے ہیں اور منتشر ہوجاتے ہیں۔ ان میں سے کچھ اپنی ضروریات پوری کرنے کے فورا بعد جہاز پر واپس آجاتے ہیں اور جہاز پر وسیع ، موزوں اور مطلوبہ

جگہیں تلاش کرتے ہیں۔ کچھ لوگ جزیرے میں رہتے ہیں۔ وہ شاندار مناظر، پرکشش پھولوں، شاندار باغات، پرندوں کے خوبصورت گیتوں، قیمتی پتھروں اور جزیرے سے تعلق رکھنے والے معدنیات سے متاثر ہوتے ہیں۔ تاہم ، جہاز کے سفر کا خوف انہیں زیادہ دیر تک وہاں رہنے کی اجازت نہیں دیتا ہے۔ ہچکچاہٹ کے ساتھ ، وہ جہاز پر واپس آجاتے ہیں ، تاہم ، جہاز پر پہلے ہی اچھی جگہیں لے لی گئی ہیں اور انہیں تنگ جگہیں مل جاتی ہیں جہاں ان کے پاس لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ کچھ لوگ واپس آگئے۔ تاہم ، انہیں جزیرے کے قیمتی پتھروں ، خوبصورت پھولوں اور لذیذ پھلوں کو اتنا پسند تھا کہ وہ ان کے بغیر واپس نہیں آ سکتے تھے۔ انہوں نے ان میں سے کچھ چیزیں جمع کیں اور اپنے ساتھ واپس لے آئیں۔ جہاز میں جگہ پہلے ہی تنگ تھی اور جو چیزیں وہ اپنے ساتھ لائے تھے ان کو ایڈجسٹ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ انہیں جہاز کے باقی تنگ مقامات پر بیٹھنے پر مجبور کیا گیا تھا اور ان کے جمع کردہ سامان کو ان کے سر پر رکھا گیا تھا۔ وہ اپنے دل میں شرمندہ ہوتے رہے کہ وہ غیر ضروری طور پر یہ چیزیں اپنے ساتھ لے کر آئے۔ کچھ لوگوں کی آنکھیں [مسافروں میں] چمک رہی تھیں اور دل جزیرے کے شاندار رنگین مناظر اور سابقہ جواہرات سے مسحور اور مسحور ہو گئے تھے کہ وہ جہاز کے بارے میں بالکل بھول گئے اور جزیرے میں اس قدر گہرائی میں چلے گئے کہ انہیں کپتان کی آواز بھی نہیں سنائی دے رہی تھی [انہیں جہاز کی روانگی سے پہلے واپس بلانا]۔ وہ پھل کھانے، پھولوں کی خوشبو سونگھنے اور لذیذ باغات کی سیر کرنے میں اس قدر مگن تھے کہ اگر کپتان کی آواز ان تک پہنچ بھی جاتی تو وہ پھر بھی اسے سن نہیں سکتے تھے، یا اگر انہوں نے اسے سنا ہوتا تو وہ اس پر توجہ نہیں دے سکتے تھے۔ اگرچہ ان کے دلوں میں خونخوار درندوں کا خوف تھا اور وہ سمجھ گئے تھے کہ جزیرے میں مصیبتیں ، پریشانیاں اور مشکلات ہوسکتی ہیں ، کانٹے جو کپڑے پھاڑ دیتے ہیں ، درخت جو جسم کو زخمی کرتے ہیں ، ہولناکی اور خوفناک آوازیں جو دلوں کو کانپ دیں گی اور اگر وہ واپس جانا چاہیں گے تو وہ واپس نہیں آسکیں گے۔ جب وہ ان خیالات میں پریشان تھے تو انہوں نے جہاز پر موجود لوگوں کی آوازیں سنیں۔ انہوں نے جلدی سے کھانے پینے اور جواہرات سے بھرے اور جہاز کی طرف بڑھے لیکن اس وقت تک جہاز اپنا لنگر اٹھا چکا تھا اور جہاز سے باہر نکل چکا تھا۔ یہ لوگ ساحل پر مایوس اور مایوس ہو کر کھڑے تھے اور خوف اور خوف سے مر گئے۔ کچھ لوگ [جو پیچھے رہ گئے] کپتان کی پکار بھی نہیں سن سکے - ان میں سے کچھ درندوں کا کھانا بن گئے اور کچھ پریشان اور پریشان ہو کر ادھر ادھر گھومتے مر گئے۔ کچھ دلدل میں ڈوبنے سے اپنی جان گنوا بیٹھے اور کچھ کو سانپوں نے کاٹ لیا۔

اب جہاز کے مسافروں کی حالت سنیں۔ کچھ لوگ جو جزیرے میں جمع کی گئی چیزوں کے ساتھ جہاز پر سوار ہوئے ، اپنے سروں پر اپنا سامان رکھ کر بیٹھے رہے۔ جہاز میں بیٹھنے کے لئے اتنی جگہ نہیں تھی ، اس کے اوپر ، غیر ضروری چیزوں کے لئے جگہ کی اور بھی کمی تھی۔ سفر طویل تھا۔ انہوں نے جو چیزیں جمع کیں ان کا آخری اختتام یہ تھا کہ پھول مرجھا گئے ، پھل سڑ گئے ، جواہرات نے اپنے رنگ بدل دیئے ، دماغ ان کی بدبو سے پھٹنے لگے ، اور یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ اس کے بارے میں کیا کیا جائے اور اس چیز کو اپنے ساتھ محفوظ طریقے سے کیسے لے جایا جائے۔ جب کچھ بھی نہیں سوچا جاسکتا تھا تو ، انہوں نے سب کچھ سمندر میں پھینک دیا ، لیکن بدبو نے اتنا اثر ڈالا تھا کہ گھر واپس آنا مشکل ہوگیا۔ جب وہ [آخرکار] گھر پہنچے، تو بہت سے لوگ بیمار ہو گئے۔ وہ لوگ جو جہاز میں دیر سے سوار ہوئے ، اگرچہ وہ جگہ کی کمی کی وجہ سے تھوڑا پریشان رہے لیکن پھر بھی بحفاظت گھر پہنچ گئے۔ جو لوگ جہاز پر وقت پر پہنچے اور آرام دہ مقامات تلاش کیے، سفر کے دوران پرسکون رہے اور بحفاظت گھر پہنچے۔ یہ دنیاوی لوگوں کی مثال ہے جو عارضی لذتوں میں مشغول ہیں اور وہ اپنی توجہ [اور زندگی کے مقصد] اور [اپنی آسمانی] ابتدا [جو ان کی اصل اور آخری منزل ہے] کے بارے میں کتنا بھول گئے ہیں۔ وہ نہ تو اپنے انجام سے واقف ہیں اور نہ ہی وہ اس بات سے واقف ہیں کہ کیا ہونے والا ہے۔ وہ لوگ کتنے برے ہیں جو مال و مال جمع کرنے کے بعد اپنے آپ کو عقلمند اور عقلمند سمجھتے ہیں، حالانکہ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ یہ دنیاوی زینت کی چیزیں ہیں اور ان میں سے کوئی چیز موت کے وقت ان کے ساتھ نہیں ہوگی، بلکہ وہ درد اور مصائب کا باعث بن جائیں گی۔ موت سے پہلے ان کی وجہ سے پیدا ہونے والی مصائب اس سے کم نہیں ہیں کہ انسان

ان کو کھونے کے خوف سے مسلسل پریشان رہتا ہے اور ان میں کسی بھی کمی کا غم دل رونے پر مجبور کرتا ہے سوائے ان لوگوں کے جو خدا کی پناہ اور حفاظت میں ہیں۔ زیادہ تر لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے فرمایا: مجھے، تم اور دنیا کی مثال کچھ لوگوں کی مثال ہے جو صحرا میں سفر کر رہے ہیں۔ وہ اتنی پیدل چل رہے تھے کہ انہیں یاد نہیں تھا کہ آیا انہوں نے جو فاصلہ طے کیا ہے وہ [باقی فاصلے سے] زیادہ ہے یا باقی فاصلہ طے کرنا زیادہ ہے۔ [سفر کے لیے] ان کا انتظام پورا ہو چکا ہے، اور ان کی ہمت ختم ہو گئی ہے۔ ان کے سامان اور بڑھتے ہوئے سواری سے محروم ، وہ بنجر صحرا میں رہے اور انہیں یہ یقین تھا کہ وہ مرنے کے قریب ہیں۔ اچانک انہوں نے دیکھا کہ اچھے لباس میں ملبوس ایک شخص ان کے پاس آ رہا ہے جبکہ اس کے بالوں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ شخص ایک زرخیز علاقے سے آیا ہے اور وہ جگہ یقینا ان کے قریب ہے۔ جب وہ ان کے قریب آیا تو اس نے ان کی حالت دریافت کی۔ انہوں نے جواب دیا: 'آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ہم کس مصائب کو برداشت کر رہے ہیں'۔ ابھی آنے والے شخص نے کہا: 'اگر میں آپ کو میٹھے پانی اور سرسبز باغات میں لے جاؤں تو آپ کیا کریں گے؟' انہوں نے جواب دیا: ہم تمہاری اطاعت کریں گے۔ آپ نے فرمایا: اللہ کی قسم کھا کر اپنے وعدوں کو قائم رکھو (کہ جیسا تم نے کہا تھا ویسا ہی کرو گے۔" انہوں نے اللہ کی قسمیں کھائی کہ اس کی نافرمانی نہیں کریں گے وعدے کے مطابق، وہ انہیں میٹھے پانی کے چشمے اور سرسبز و شاداب باغات میں لے گئے اور کچھ دن ان کے ساتھ رہے۔ اس کے بعد اس نے پوچھا: 'سفر کو آگے بڑھانے کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟' انہوں نے پوچھا: ہم کہاں جا رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ایسے پانی کی طرف جو اس پانی سے زیادہ میٹھا ہے اور ان باغات کی طرف جو ان باغات سے زیادہ سرسبز ہیں۔ زیادہ تر لوگوں نے جواب دیا: 'جو کچھ ہم نے یہاں پایا ہے، شاید ہمیں اس سے زیادہ کہیں اور نہیں مل سکتا اور یہاں جو سکون کی زندگی ہے، شاید ہمیں اس سے زیادہ نہیں مل سکتی۔ اس لیے ہم آپ کے ساتھ نہیں جائیں گے۔' بعض لوگوں نے کہا: کیا تم نے خدا کی قسم نہیں کھائی اور وعدہ نہیں کیا تھا کہ اللہ کی نافرمانی نہیں کریں گے؟ اب اپنا وعدہ جس طرح اس نے اپنا پہلا وعدہ پورا کیا تو وہ اپنا دوسرا وعدہ پورا کرے گا۔ کچھ لوگ اس کے ساتھ چلے گئے اور باقی رہ گئے اور پیچھے رہ گئے۔ صبح دشمن کی افواج نے گھات لگا کر حملہ کیا - انہوں نے کچھ کو ہلاک کیا اور کچھ قیدی بن گئے۔" (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *احادیث* کے مجموعے *ابن ابی الدنیا*، *احمد*، *بزاز* اور *طبرانی* رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہیں۔

انما مثلی و مثلکم و مثل الدنیا کمثل قوم سلکوا مغازة غبراء حتّٰی اذا لم
یدروا ماسلکوا منها اکثر او مابقی انفدوا الزاد و خسروا الظهر و بقوا بین ظهرا
فی المفازة ولا زاد ولا حولة فایقنوا بالهلکة فبینما هم کذلک اذ خرج علیهم
رجل فی حل تقطر راسه فقالوا هذا قریب عهد بریف فلما انتهی الیهم قال: یا
هؤلاء فقالوا: یا هذا فقال: علام انتم فقالوا علی ماتری فقال! ادائیتم ان
هدیتکم الی ماء رواء و ریاض خضر ما تعملون؟ قالوا الا نعصیک شیئا؟ قال:
عهودکم و مواثیقکم باللّٰہ فاعطوه عهودهم و مواثیقهم باللّٰہ لا یعصونه شیئا؟
قال: فاوردهم ماء رواء و ریاضا خضرا فمکث فیهم ماشاء اللّٰہ؟ ثم قال: یا هولاء
قالوا! یا هذا قال الرحیل؟ قالوا! والی این؟ قال الی ماء لیس کمائکم والی
ریاض لیست کریاضکم فقال اکثرهم واللّٰہ ماوجدنا هذا حتّٰی ظننا ان لن
نجده وما نضع بعیش خیر من هذا وقالت طائف وهم اقلهم الم تعطوا هذا
الرجل عهودکم ومواثیقکم باللّٰہ ان لا تعصوه شیئا وقد صدقکم فی اول
حدیثه فو اللّٰہ لیصدقنکم فی آخره فراح فیمن اتبعه و تخلف بقیتهم
فبدرهم عدو فاصبحوا بین اسیر وقتیل

اس نبوت روایت میں لوگوں کے دو گروہوں کا ذکر ہے۔ ایک احکام الٰہی کا پیروکار ہے اور دوسرا اس کے خلاف ہے۔ ان کے پاس آنے والا شخص خود حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، دنیا وہ بنجر صحرا ہے جہاں قافلے کے لوگ تھک کر لیٹ جاتے ہیں اور وہ میٹھے پانی کے چشمے اور سرسبز باغ آخرت کے چشمے اور باغ ہیں۔

دنیاوی لذتوں اور مصروفیات میں مشغول ہونے اور ان سے جدائی کے درد کی مثال: جن لوگوں کے پاس دنیاوی مال و مال ہیں ان کی مثال اس شخص کی ہے جو گھر بناتا ہے اور اسے بے معنی سجاوتا ہے پھر لوگوں کو گھر میں آنے کی دعوت دیتا ہے۔ لوگ ایک ایک کر کے آتے ہیں۔ جب کوئی گھر میں قدم رکھتا ہے تو میزبان مہمان کو پھولوں اور خوشبوؤں سے لدی سونے کی تھالی پیش کرتا تاکہ مہمان ان کو سونگھ کر آگے بڑھے اور اگلے شخص کے لیے پلیٹ چھوڑ کر آگے بڑھے۔ لیکن اگر مہمان غلطی سے یہ سمجھتا ہے کہ میزبان نے تھالی مہمان کو تحفے میں دی ہے اور مہمان اب اس پلیٹ کا مالک ہے اور تھالی اور اس کے عطروں سے دل کا لگاؤ پیدا کرتا ہے۔ جب تھالی مہمان سے چھین لی جاتی ہے تو مہمان کو احساس ہوتا ہے کہ پھول اور خوشبو صرف لطف اندوز ہونے کے لیے پیش کیے گئے تھے اور کسی کو ان کا مالک بنانے کے لیے پیش نہیں کیے گئے تھے۔ اس مقام پر ، مہمان کا درد ، غم اور مایوسی دیکھنے کے قابل ہے۔ یہ غلطی اس لیے ہوئی کیونکہ مہمان میزبان کے ان آداب اور روایات سے واقف نہیں تھا۔ اس کے برعکس ایک اور مہمان اندر آیا، جو میزبانی کی روایت اور آداب سے واقف تھا اور تھالی لے کر تھوڑی دیر اس سے لطف اندوز ہوا اور میزبان کا شکریہ ادا کیا اور خوشی اور کھلے دل سے اسے میزبان کو واپس کر دیا۔ یہ ان لوگوں کا حال ہے جو دنیا کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے اس قدیم طریقے سے واقف ہیں کہ یہ دنیا ایک گیسٹ ہاؤس ہے جو مسافروں کے لیے وقف ہے تاکہ وہ یہاں ایک مختصر قیام کر سکیں اور اپنی اگلی منزل کے لیے یہاں سے رزق جمع کر سکیں۔ دوسرے لفظوں میں جس طرح مسافر کسی گیسٹ ہاؤس (یا موٹل) سے فائدہ اٹھاتا ہے، اسی طرح وہ بھی دنیا سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اسے (یعنی اس گیسٹ ہاؤس جسے دنیا کہا جاتا ہے) اپنا دائمی مسکن نہیں سمجھتا، اور اپنے دل اس سے اس قدر وابستہ ہو جاتے ہیں کہ جب علیحدگی کا وقت آتا ہے، [اس سے الگ ہونا، اسے الوداع کہنا اور] چھوڑنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ دنیا کی مثال ہے، اس کے مصائب اور اس کے نقصانات کی مثال ہے۔ ہم اس معاملے میں اللہ تعالیٰ سے مدد چاہتے ہیں۔

انسان کے لئے دنیا کی حقیقت اور فطرت

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ دنیاداری کے نقصانات کا علم حاصل کرنا اس وقت تک کافی نہیں ہے جب تک کہ یہ معلوم نہ ہو جائے کہ دنیا کے کون سے پہلو مضر ہیں، دنیا کے کون سے پہلو سے گریز کیا جائے اور کس سے گریز نہ کیا جائے۔ اس سلسلے میں اس بات کا تعین کرنا ضروری ہے کہ یہ (دنیا کے مضر پہلو) حق کے متلاشیوں کا دشمن ہے اور حق کی راہ کا شاہراہ ڈاکو ہے۔ واضح رہے کہ دنیا اور آخرت آپ کے دل کی دو حالتیں ہیں، وہ حالت جو قریب ہے اور وہ حال جو دور ہے۔ پہلی حالت یعنی موت سے پہلے کی حالت کو دنیا کہا جاتا ہے اور دوسری حالت یعنی موت کے بعد کی حالت کو آخرت کہا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موت سے پہلے انسان کی ضرورت، خواہش اور لذت سے وابستہ چیزیں انسان کی دنیا ہوتی ہیں اور وہ تین قسمیں ہیں:

پہلی قسم: ان چیزوں کو شامل کرتی ہے جو آخرت میں تمہارے پاس رہیں گی اور ان کے پھل مرنے کے بعد تمہارے پر ظاہر کیے جائیں گے اور یہ صرف دو چیزیں ہیں علم اور نیک عمل۔ یہاں علم سے مراد خدا کی ہستی، صفات (صفات) اور اعمال اور فرشتوں، الہامی نازل کردہ کتابوں، [الہامی طور پر] پیغمبروں اور آسمان و زمین کی سلطنتوں کو جاننا ہے۔ اعمال سے مراد وہ عبادت ہے جو خالصتا خدا کی خوشنودی کے لیے کی جاتی ہے۔ بعض اوقات ایک عالم کسی علم سے اس قدر وابستہ ہو جاتا ہے کہ وہ سب سے زیادہ محبوب اور خوشگوار چیز بن جاتا ہے۔ کوئی اس پر دوسرے لذت کو ترجیح نہیں دیتا۔ علم کی خاطر کھانا، پینا، سونا، یہ سب کچھ بھول جاتا ہے۔ کوئی شخص اس لیے شادی نہیں کرتا کہ علم میں جو لذت ملتی ہے وہ ان چیزوں میں نہیں ملتی بلکہ جب ہم مذموم دنیاداری کا ذکر کرتے ہیں تو ہم اسے آخرت کی چیزوں میں شمار نہیں کرتے بلکہ اسے آخرت کی چیزوں میں شمار کرتے ہیں۔ اسی طرح عبادت کرنے والا عبادت سے اس قدر لگاؤ پیدا کر لیتا ہے اور اس میں اس قدر لطف اندوز ہوتا ہے کہ اگر کسی کو عبادت سے روکا جائے تو شاید یہ اس کے لیے بدترین عذاب ہو گا۔ ایک رشی دعا کرتے تھے: "اے خدا! مجھے اپنی قبر میں بھی تیرے سامنے نماز پڑھنے، سجدہ کرنے اور سجدہ کرنے کی توفیق عطا فرما۔ وہ اس لیے دعا مانگتے تھے کہ دعائیں ان کے لیے بے ساختہ لذت کا ذریعہ بن گئیں۔ اس قسم کی لذت کو دنیاوی بھی کہا جا سکتا ہے جیسا کہ اس دنیاوی زندگی میں حاصل ہوتا ہے، لیکن اسے قابل مذمت دنیاداری شمار نہیں کیا جا سکتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مشہور نبوی روایت میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نمازوں کو ان تین چیزوں میں شمار کیا ہے جن سے وہ دنیا سے محبت کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لذتوں کو محسوس کیا جا سکتا ہے اور ان کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، اور دعائیں بھی حسی اور قابل مشاہدہ ہیں۔ رکوع اور سجدے کی حرکات سے حاصل ہونے والی لذت بھی دنیاوی لذت ہے لیکن یہ قابل مذمت دنیاداری نہیں ہے، اس لیے ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔

دوسری قسم: اس میں ایسے ذوق اور لذتیں شامل ہیں جن کا آخرت میں کوئی فائدہ یا نتیجہ نہیں ہوتا، مثلا گناہوں سے لذت حاصل کرنا، ضرورت سے زیادہ جائز چیزوں سے لطف اندوز ہونا جو ضیاع اور تکبر کے زمرے میں آتے ہیں۔ مثال کے طور پر سونے چاندی کے ڈھیر، گھوڑے (نقل و حمل کے ذرائع جو فخر کا باعث بھی ہیں)، مویشی، نوکر، محلات، مہنگے کپڑے، لذیذ کھانے وغیرہ وغیرہ۔ ایک بندہ جو ان سے لطف اندوز ہوتا ہے وہ ملامت کن دنیاداری سے ہوتا ہے۔

تیسری قسم: اس میں وہ لذتیں شامل ہیں جو نہ تو خالص دنیاوی ہیں اور نہ ہی آخرت سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کے بجائے وہ آخرت سے متعلق اعمال میں مدد کرتے ہیں جیسے کہ اپنی ضروریات کے مطابق کھانا، اپنی ضروریات کے مطابق لباس، اور اس میں ہر وہ لذت شامل ہے جو انسان اپنی بقا یا علم و اعمال تک پہنچنے کے لیے درکار صحت حاصل کرنے کے لیے حاصل کرتا ہے۔ یہ لذتیں پہلی قسم کی طرح نہیں ہیں، لیکن وہ پہلی قسم کی مدد کرتی ہیں اور ان تک پہنچنے کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی شخص علم اور نیک اعمال کے ساتھ آگے بڑھنے کے لیے کھاتا ہے تو یہ [کھانے کا] کا عمل دنیا کا نہیں ہے اور نہ ہی وہ دنیاوی کہلانے کا مستحق ہے۔ لیکن اگر کھانے کا ڈرائیور عارضی لذتیں ہوں تو یہ لذت دنیاوی لذت ہوگی اور دوسری قسم میں شمار کی جائے گی۔

وہ چیزیں جو موت کے بعد انسان کے پاس رہ جاتی ہیں: موت کے بعد بندے کے پاس صرف تین چیزیں باقی رہتی ہیں: ایک دل جو دنیاداری سے پاک ہو [اور دنیاوی الجھنوں اور وابستگیوں سے پاک ہو جو اسے روحانی دائرے میں جانے سے روکتی ہے]، الٰہی کی یاد سے لگاؤ اور محبت اور تزکیہ دل کی پاکیزگی اور بے قراری۔ [سب] یہ الہامی یاد کی کثرت اور اس میں استقامت کے ذریعے حاصل ہوتے ہیں، اور خدا کی محبت عرفان کے ذریعے حاصل ہوتی ہے، اور گنوسس دائمی غور و فکر سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ تینوں خصلتیں موت کے بعد انسان کے لیے نجات اور ابدی خوشی کا ذریعہ ہیں۔

دنیاوی خواہشوں سے دل کی تطہیر نجات بخش ہے کیونکہ یہ خدائی عذاب اور انسان کے درمیان ایک رکاوٹ ہے۔ خدا کے ساتھ لگاؤ اور خدائی محبت ابدی خوشی کی کلید ہیں۔ یہ دونوں صفات خدا کی بصیرت اور معشوق سے ملاقات کی لذت حاصل کرتی ہیں اور یہ عظیم سعادت موت کے فورا بعد حاصل ہوتی ہے اور یہ حالت اس وقت تک برقرار رہتی ہے جب تک کہ انسان جنت میں خدا کی بصارت حاصل نہ کر لی۔ قبر جنت کا خوبصورت باغ بن جاتی ہے اور ایسا کیوں نہیں ہونا چاہیے جب قبر کے باشندے کے پاس صرف ایک ہی محبوب (یعنی خدا) ہو؟ جب ایسا شخص دنیا میں ہوتا تھا تو محبوب سے نہیں مل سکتا تھا کیونکہ کچھ رکاوٹیں تھیں۔ موت نے ان رکاوٹوں کو دور کیا اور اس دنیا کی قید خانے سے آزاد ہو گیا۔ ایک اور محبوب کے درمیان رکاوٹ کے طور پر کھڑی دیوار کو ہٹا دیا گیا۔ اب انسان ہر قسم کے نقصان اور خطرات سے محفوظ رہتے ہوئے آخرت میں خوشی سے قدم رکھ سکتا ہے۔ دنیا کے متلاشی کو قبر میں سزا کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ایسا کیوں نہیں ہونا چاہیے؟ کسی کا محبوب صرف ایک [شے] تھا اور وہ دنیا تھی۔ وہ محبوب ایک سے چھین لیا گیا اور قبر کی دیوار کسی کے اور اپنے محبوب (یعنی دنیا) کے درمیان رکاوٹ بن گئی۔ موت معدوم ہونے کا نام نہیں ہے، بلکہ موت کسی اور اپنی محبوب چیزوں کے درمیان جدائی کا سبب بنتی ہے اور اسے عدالت الٰہی میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آخرت کی راہ پر گامزن وہی ہے جو ہمیشہ الٰہی کی یاد و تدل میں مگن رہتا ہے اور دنیاوی خواہشات اور خواہشات کو مٹانے والے اعمال پر سختی سے عمل پیرا ہوتا ہے اور ان کو ترک کر دیتا ہے اور یہ سب کچھ صحت کے بغیر ممکن نہیں ہے جو کھانے کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ کپڑے اور رہائش [زندہ رہنے کے لیے]۔ ان میں سے ہر ایک کا حصول [دنیاوی] ذرائع پر منحصر ہے [جیسے تجارت یا روزگار]۔ لہٰذا جو شخص اپنی ضروریات کے مطابق کپڑے، خوراک اور رہائش گاہ حاصل کرے وہ دنیاوی کہلانے کا مستحق نہیں ہے، بلکہ ایسے شخص کے لیے دنیا آخرت کے لیے کھیت ہو گی۔ لیکن اگر کوئی شخص نفس کی رضا کے لیے یا فحاشی کی خاطر ان چیزوں کو حاصل کرے تو وہ دنیاوی شخص ہوگا اور دنیاوی لذتوں میں دلچسپی رکھنے والوں میں شمار کیا جائے گا۔

دنیاوی لذتوں میں لذت کی اقسام: دنیاوی لذتوں میں عیاشی کی دو قسمیں ہیں۔ جس کا عیش الٰہی عذاب کا شکار ہو جائے اور اسے کسی ایسی چیز میں عیش کرنا کہا جاتا ہے جو الٰہی حرام ہے۔ دوسری قسم کی عیش و عشرت کرنے والے کو کامیابی کے اعلیٰ درجات تک پہنچنے سے روکتی ہے [اور الٰہی قبولیت] ، اس کے بجائے ، وہ [قیامت کے دن] ایک طویل احتساب میں شامل ہوجاتے ہیں۔ اس عیش و عشرت کا نام حلال ہے۔ عقل اور بصیرت کے حامل لوگ جانتے ہیں کہ طویل عرصہ تک احتساب کے لیے ٹھہرنا بھی عذاب الٰہی کی ایک شکل ہے جو خواہشات کی نہیں بلکہ ضروریات کی تکمیل کی جگہ ہے۔ خواہشات کی تکمیل کی جگہ ابدی زندگی ہے۔ بھلے ہی کوئی احتساب نہ ہو بلکہ جنت میں اعلیٰ درجوں میں کمی اور ادنیٰ نفس کی عارضی، معدوم اور پست خواہشات کی وجہ سے اعلیٰ درجوں سے محروم ہونے پر دل کا غم بھی ہو تو یہ خود کسی عذاب سے کم نہیں ہے۔

تم اپنی اس حالت کو دنیا میں اپنی حالت سے اخذ کر سکتے ہو۔ جب آپ اپنے ہم عصروں اور ہم مرتبے کے لوگوں کو کسی بھی میدان میں کامیاب اور آگے بڑھتے ہوئے دیکھتے ہیں تو آپ کو کتنا محرومی محسوس ہوتی ہے اور دل آپ کے پیچھے رہ جانے پر کتنا پریشان ہو جاتا ہے (دوسروں کے مقابلے میں جو آپ سے بہتر کام کر رہے ہیں)، حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ یہ دنیاوی درجات اور نعمتیں عارضی ہیں۔ وہ پریشانیوں اور مشکلات کے ساتھ آتے ہیں۔ ان کے پاس مستقل اور رزق نہیں ہے۔ غور کیجئے جب آپ دنیاوی نعمتوں کو نہ ملنے پر اتنے غمگین اور غمگین ہوں گے تو آپ کا کیا حال ہوگا جب آپ کے ہم عصر آخرت کے میدان میں آپ سے آگے نکل جائیں گے اور آپ ایک عظیم ابدی خوشی اور لازوال کامیابی سے محروم رہیں گے جس کی عظمت کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ آخرت میں پوچھے گئے سوالات کا جواب ذلت، خوف، خطرہ، تنگی اور انتظار شامل ہے اور یہ سب معاملات آخرت کی تکمیل

کو کم کرتے ہیں۔ چنانچہ جب عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو پیاسا لگا اور پانی مانگا تو ان کے سامنے شہد ملا کر ٹھنڈا اور میٹھا پیالہ پیش کیا گیا۔ وہ کافی دیر تک کپ کو اپنے ہاتھوں میں گھماتا رہا [اس میں سے ایک گھونٹ بھی لیے بغیر]، پھر اسے واپس پریزنٹر کے پاس واپس کیا اور کہا:

اعزلوا عني حسابها

"مجھے اس کے احتساب سے دور رکھ دو۔"

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کمی، کثرت، حلال اور حرام سب غیر ضروری ہیں۔ صرف اس رقم کو اس سے خارج کیا جاتا ہے جو خدا سے پرہیزگاری ، تعظیم اور خوف میں مدد کرتا ہے۔ دنیاوی نعمتوں سے دور رہنا کسی کی معرفت کی طاقت کے متناسب ہے۔ ایک مرتبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سونے کی نیت سے زمین پر لیٹ گئے اور اپنا سر ایک چٹان پر رکھ دیا۔ شیطان انسان کی شکل میں نمودار ہوا اور کہنے لگا: "تم دنیا کی طرف مائل ہو گئے ہو"۔ یہ سن کر اس نے وہ پتھر لیا [جسے وہ زمین پر آرام کرنے کے لیے اپنا سر رکھنے کے لیے استعمال کر رہا تھا] لے کر پھینک دیا [شیطان کو اپنے اعمال سے ظاہر کیا کہ اسے دنیا سے اتنی ضرورت بھی نہیں ہے]۔ اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام اگرچہ ان کے پاس زمین اور دنیاوی سلطنت کے خزانوں کی کنجیاں تھیں وہ خود جو کی روٹی کھاتے تھے اور دوسروں کو عمدہ لذیذ کھانا کھلاتے تھے۔ اس طرح آپ نے اپنی نچلی نفس (نفس) کو زیر اور قابو میں رکھا، حالانکہ یہ ایک مشکل کام تھا کیونکہ [متنوع لذیذ] کھانا حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوئے صبر سے کام لینا شدید مشقت ہے اور روحانی کوشش ایک عام انسان کی صلاحیت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے دنیا کی نعمتوں کو خدا کی مرضی سے دور رکھا گیا تھا، یہی وجہ ہے کہ آپ مسلسل کئی دن تک بھوکے رہتے تھے۔ (اس حدیث کو بیان کیا گیا ہے *احادیث میں ترمذی* اور *ابن ماجہ* کو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی گئی ہے۔ کبھی کبھی بھوک کی شدت کی وجہ سے وہ اپنے پیٹ میں پتھر باندھتے تھے۔

انبیاء، دوستوں اور اللہ کے مقربوں کو مسلسل مصائب اور مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان کا آخرت میں زیادہ سے زیادہ حصہ ہوگا اور آخرت میں ان کا حصہ کسی دنیاوی لذت کی وجہ سے کم نہیں ہوگا۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک پیار کرنے والا باپ اپنے بیٹے کو لذیذ کھانا کھانے سے روکتا ہے اور اسے اپنی بیماری کا علاج کروانے پر مجبور کرتا ہے۔ وہ یہ کام کنجوسی یا سختی کی وجہ سے نہیں کرتا بلکہ یہ کام اپنی فلاح و بہبود کی خاطر اپنے بیٹے سے محبت اور محبت سے مجبور ہونے کی وجہ سے کرتا ہے۔ اب اس سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ جو چیز خدا کی خاطر ہے وہ دنیا نہیں ہے اور جو چیز اللہ کی راہ میں نہیں ہے وہ دنیا ہے۔

دنیا کی حقیقت اور عیاشی جو انسان کو اپنی ذات ، کائنات کے خالق ، اور اپنے انجام کو بھول جانے کا سبب بنتی ہے جب وہ ان میں ڈوب جاتا ہے

یہ جاننا چاہیے کہ دنیا ان چیزوں کا نام ہے جو موجود ہیں اور جن سے انسان لطف اندوز ہوتا ہے اور جن کی بہتری میں انسان مصروف ہے۔ یہ تین معاملات ہیں۔ بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان تین چیزوں میں سے کسی ایک کو دنیا (دنیاداری) کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى ٱلْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا

"ہم نے زمین میں بہت سی چیزیں اس کی زینت کے لیے بنائی ہیں تاکہ لوگوں کو آزمایا جائے کہ کون نیک کام کرتا ہے۔" (سورۃ البقرۃ آیت 18، آیت 7)

زمین ایک بستر ، ٹھکانہ ، اور ایک مقام (ایک عارضی آرام کی جگہ) کی مانند ہے اور اس پر جو کچھ بھی ہے اس میں اس کا لباس ، کھانا اور جماع شامل ہے۔ زمین پر موجود تمام چیزوں میں سے ، ان سب کو ان تین اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: معدنیات ، پودے اور جاندار۔ انسان پودوں سے خوراک اور ادویات حاصل کرتا ہے، تانبے اور اسٹیل جیسی معدنیات سے اوزار اور برتن بناتا ہے یا انہیں نقد رقم کے طور پر رکھتا ہے جیسے ان سے سونے اور چاندی کے سکے بنائے جاتے ہیں یا ان سے زیورات بنائے جاتے ہیں۔ جانداروں کی دو قسمیں ہوتی ہیں، انسان اور جانور۔ گوشت ، سواری اور آرائش کے لئے جانوروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسان کو ان کی خدمات کے لیے ضرورت ہوتی ہے [ان گنت معاملات میں اپنی ضروریات کے لیے کیونکہ انسان ہر چیز کے لیے ایک دوسرے پر انحصار کرتا ہے]، شریک حیات کی طرح رفاقت یا مقصد صرف اپنے دلوں کو اپنی طرف مائل کرنا ہے - دوسرے لفظوں میں، شہرت کی خواہش۔ یہ وہ چیزیں ہیں جنہیں "دنیا" کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سب کو ایک آیت میں اس طرح جمع کیا ہے:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ ٱلشَّهَوَٰتِ مِنَ ٱلنِّسَآءِ وَٱلْبَنِينَ وَٱلْقَنَٰطِيرِ ٱلْمُقَنطَرَةِ مِنَ ٱلذَّهَبِ وَٱلْفِضَّةِ وَٱلْخَيْلِ ٱلْمُسَوَّمَةِ وَٱلْأَنْعَٰمِ وَٱلْحَرْثِ ۗ

"لوگوں کو عورتوں، بیٹوں، سونے اور چاندی کے ذخیرے، نشان زد گھوڑوں، مویشیوں اور [کھیتوں اور دیگر مختلف پیشوں کی چیزوں کی محبت جس میں انسان ملوث ہیں] میں سے پیاری چیزوں کی محبت خوشگوار لگتی ہے۔" (سورۃ البقرۃ سورۃ البقرۃ آیت ۱۴)

اس آیت میں عورتوں اور بیٹوں سے مراد انسان، سونا اور چاندی سے مراد معدنیات اور جواہرات ہیں، گھوڑے اور مویشی سے مراد جانور ہیں اور کاشت کاری سے مراد پودوں سے ہیں۔

ایک بندے کا دنیاوی چیزوں کے ساتھ تعلق: ایک بندہ [خدا کا، یعنی انسان] کے دنیاوی چیزوں کے ساتھ [تعلق] کے دو شعبے ہوتے ہیں۔ پہلا علاقہ دل کے ساتھ ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان ان سے محبت کرتا ہے، ان سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اپنے خیالات کو ان کے حصول میں اس حد تک مشغول کرتا ہے کہ دل اس کا قیدی بن جاتا ہے، اور پھر اس علاقے میں دل کی وہ تمام (ناپسندیدہ اور منفی) صفات داخل ہو جاتی ہیں جن کا تعلق دنیا سے ہے جیسے تکبر۔ کنجوسی ، حسد ، دکھاوے ، شہرت سے محبت ، دوسروں کی بری رائے ، تلخی ، تعریف سے محبت ، گھمنڈ ، اور برتری پیچیدہ۔ اس علاقے کو اندرونی دنیا کہا جاتا ہے۔ دوسرے علاقے کو بیرونی دنیا کہا جاتا ہے جو طبعی نوعیت کا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ، جسم کو ان چیزوں کی بہتری میں مصروف رکھنا جو کسی کو لطف اندوز کرنے کے قابل بناتی ہیں۔ ان میں وہ تمام صنعتیں اور پیشے شامل ہیں جن میں لوگ شامل ہوتے ہیں اور مصروف ہوتے ہیں۔

ان دو شعبوں کی وجہ سے لوگوں نے اپنی ذات اور اپنی زندگی کے مقصد کو فراموش کر دیا ہے۔ اگر وہ اپنے آپ کو، اپنے رب کو پہچانیں اور پہچانیں اور دنیا کی تخلیق کے راز اور حکمت کو جان لیں تو وہ سمجھنے لگیں گے کہ جن چیزوں کو ہم نے دنیا کہا ہے (انسان، معدنیات، جانور اور پودے) اس پہاڑ کے چارے کے طور پر پیدا کی گئی ہیں جس پر آپ سوار ہیں اور آخرت کی راہ پر گامزن ہیں۔ یہ سواری ماؤنٹ آپ کا جسم ہے اور جسم خوراک، پانی، کپڑے اور [رہنے کے لیے] رہائش کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ بالکل اسی طرح جیسے اونٹ گھاس، اناج اور پانی کے بغیر حج کے سفر میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ انسان نے دنیا میں آنے کے بعد اپنی ذات اور زندگی کے مقصد کو فراموش کر دیا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی حاجی راستے میں کسی اسٹیشن پر رک جائے، اونٹ کو وافر مقدار میں کھانا کھلاتا ہے، اس کی اچھی طرح دیکھ بھال کرتا ہے، اسے نہلاتا ہے، اسے سجاتا ہے، اس کے لیے مختلف قسم کی گھاس جمع کرتا ہے، اس کے لیے ٹھنڈا پانی کا انتظام کرتا ہے، اور اس طرح قافلہ آگے بڑھتا ہے اور یہ اونٹ کا قیدی پیچھے رہ جاتا ہے۔ یہ تیرتھ یاتری اونٹ کی خدمت میں اتنا مصروف ہے کہ نہ تو اس سفر کے مقصد کی ادراک باقی رہی اور نہ ہی یہ احساس باقی رہ گیا کہ جب قافلہ آگے بڑھ کر آگے بڑھ گیا ہے تو یہ ہولناک جنگل قبر بن جائے گا۔ جنگلی جانور نہ کسی کو چھوڑیں گے اور نہ اونٹ کو چھوڑیں گے ایک ذہین حاجی صرف اپنے مقصد کو نظر میں رکھتا ہے اور اونٹ کو جتنی خدمت فراہم کرتا ہے وہ اسی مقصد کا حصہ ہوگا اور اس مقصد کے حصول کا

ذریعہ ہوگا۔ کوئی بھی سواری ماؤنٹ کی خدمت میں صرف اس حد تک مصروف رہے گا کہ اس کی طاقت باقی رہے اور سوار کو حتمی منزل تک پہنچانے کے قابل ہو۔ آخرت کی راہ پر چلنے والے ذہین مسافر کا بھی یہی حال ہے۔ جسم کی خدمت صرف اس حد تک ہوگی جس کی ضرورت ہوگی۔ جس طرح کوئی شخص غیر ضروری طور پر بیت الخلا میں نہیں جاتا، اسی طرح غیر ضروری طور پر جسم کی خدمت نہیں کرتا۔ میری رائے میں پیٹ میں کھانا ڈالنے اور وہاں سے باہر نکالنے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ دونوں جسم کی ضروریات ہیں۔ جس طرح کھانے کو غیر ضروری طور پر جسم سے باہر نہیں نکالا جاتا اسی طرح اسے غیر ضروری طور پر داخل نہیں کرنا چاہیے۔ جو چیز انسان کو اللہ اور قیامت کے دن سے روکتی ہے وہ پیٹ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کھانا زیادہ اہم ہے۔ کپڑے اور رہائش کا معاملہ پیٹ کے مقابلے میں اتنا مشکل نہیں ہے۔ کوئی کھلے آسمان کے نیچے کپڑوں کے بغیر رہ سکتا ہے لیکن بھوکا اور پیاسا نہیں رہ سکتا۔

اگر لوگوں کو ان چیزوں کی ضرورت کی وجہ معلوم ہو جائے تو وہ صرف مطلوبہ (ضروری) رقم پر مطمئن ہوں گے۔ وہ لوگ جو دنیاوی مصروفیات میں مگن ہیں، وہ ایسا اس لیے کر رہے ہیں کہ وہ دنیا کی حقیقت اور حکمت سے واقف نہیں ہیں۔ وہ دنیاوی مصروفیات میں اس قدر بری طرح پھنس گئے ہیں کہ وہ اپنے [سچے] مقاصد کو بھول گئے ہیں اور صرف ان کاموں کو یاد رکھتے ہیں جن میں وہ مصروف ہیں۔ اب دنیاوی مصروفیات کے بارے میں وضاحت کی جائے گی کہ لوگ ان کی ضرورت کیوں محسوس کرتے ہیں اور ان میں مشغول ہو کر اپنی زندگی کا مقصد کیسے بھول جاتے ہیں۔

تین انسانی ضروریات: دنیاوی مصروفیات میں وہ تمام صنعتیں اور پیشے شامل ہیں جن میں لوگ مصروف ہیں۔ ان مصروفیات کی کثرت کی وجہ یہ ہے کہ انسان کو تین چیزوں کی ضرورت ہے: خوراک، کپڑے اور رہائش گاہ۔ خوراک زندہ رہنے کے لیے، گرمی اور سردی کو دور کرنے کے لیے کپڑے اور گرمی، سردی، بارش سے بچانے اور بیوی، بچوں اور مال کو محفوظ رکھنے کے لیے رہائش گاہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان تین چیزوں میں سے کوئی ایسی چیز پیدا نہیں کی جس کا کسی صنعت یا پیشے سے کوئی تعلق نہ ہو۔ دوسری طرف، یہ جانوروں کے لئے ایک جیسا نہیں ہے۔ مثال کے طور پر وہ گھاس کھاتے ہیں اور انہیں کھانا پکانے کی ضرورت نہیں ہوتی، گرمی اور سردی ان کے جسم پر اثر انداز نہیں ہوتی، اسی لیے انہیں کپڑے اور رہائش کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کے کپڑے ان کی کھال اور بال ہیں ، اور ان کے مسکن جنگل اور صحرا ہیں۔ وہ کھلے آسمان کے نیچے اپنی زندگی گزار سکتے ہیں۔ انسان ایسا نہیں ہے کیونکہ زندگی کی ضروریات کے لیے پانچ بنیادی صنعتوں اور پیشوں کی ضرورت ہوتی ہے: کاشتکاری، چرا، شکار، بنائی اور تعمیر۔ تعمیر گھر بنانے، بنائی اور اس سے متعلقہ امور کے لیے کپڑے، گھوڑوں پر سوار ہونے کے لیے چرنے اور [مویشیوں سے] گوشت حاصل کرنے، کھانے کے لیے کھیتی باڑی اور کاشت کاری، اور شکار کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ نے جو کچھ شکار، معدنیات، گھاس، لکڑی، قدرتی وسائل وغیرہ کے لحاظ سے پیدا کیا ہے اسے حاصل کرنا ہے۔

پیشوں کی تقسیم: کسان فصلیں پیدا کرتا ہے ، چرواہا جانوروں کی حفاظت اور افزائش کرتا ہے ، ایک شکاری (یا قدرتی وسائل کی تلاش کرنے والا اور جمع کرنے والا) ایسی چیزیں حاصل کرتا ہے جو قدرتی طور پر موجود ہیں اور ان کو بنانے کے لئے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بہت سی صنعتیں اور مہارتیں ہیں جو اس میں شامل ہیں اور ان میں سے ہر ایک کو اپنے اپنے ٹولز کی ضرورت ہے۔ یہ اوزار یا تو پودوں (لکڑی) یا معدنیات (جیسے لوہا اور تانبا) یا جانوروں کی کھال سے بنائے جاتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں تین صنعتوں کی ضرورت ہوتی ہے: کاریگری ، لوہے کا کام ، اور چمڑے کا کام۔ یہ تمام پیشے ٹول بنانے سے متعلق ہیں۔ یہ بنیادی مہارتیں اور پیشے ہیں [اور باقی سبھی ان بنیادی پیشوں سے نکلے ہیں]۔

انسان کی تخلیق اور اجتماعی وجود: انسان کو اس طرح تخلیق کیا گیا ہے کہ انسان اکیلے زندگی نہیں گزار سکتا اور اپنی نوعیت کے دوسرے افراد کے ساتھ اجتماعی وجود قائم کرنے پر مجبور ہے۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ نسل انسانی کی بقا کی خاطر انسانی نسل کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے جو ازدواجی زندگی میں مرد اور عورت کے اتحاد کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان تمام کام خود کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ کھانا، پینا، کپڑے پہننا، بچوں کی پرورش اور اس طرح کے دیگر معاملات سے دوسروں کے ساتھ تعاون کی ضرورت کا احساس ہوتا ہے۔ بچے مرد اور عورت کے رشتے سے پیدا ہوتے ہیں اور ایک شخص

اپنی پرورش سے لے کر کھانے اور لباس کی فراہمی تک تمام ذمہ داریاں اکیلے ادا نہیں کر سکتا۔ مزید برآں، [صرف] شریک حیات اور بچوں کے ساتھ اجتماعی وجود رکھنا کافی نہیں ہے، بلکہ اپنی زندگی گزارنے کے لیے، بہت سے لوگوں کا ہونا ضروری ہے تاکہ ہر شخص مختلف پیشہ اختیار کرے۔ ایک شخص کھیتی سے جڑے تمام کام نہیں کر سکتا کیونکہ کھیتی باڑی کے لیے ایسے اوزار کی ضرورت ہوتی ہے جو لوہے کے مزدور اور کاریگر کے بغیر نہیں بن سکتے۔ فصل سے کھانا تیار کرنے کے لئے ، کسی کو اناج پیسنے اور روٹی پکانے کے لئے بیکر کی ضرورت ہے۔ اسی طرح کوئی بھی اکیلے کپڑے نہیں بنا سکتا، کیونکہ سب سے پہلے کپاس اگانے کی ضرورت ہوگی پھر بنائی اور سلائی کے اوزار بنانے کی ضرورت ہوگی۔ ٹولز بہت زیادہ ہیں ، اور ایک شخص اکیلے ہی ان تمام ٹولز کو خود تیار نہیں کرسکتا ہے۔ اسی طرح انسان کے لیے تنہا رہنا ممکن نہیں بلکہ اجتماعی وجود ناگزیر ہے۔ اگر یہ اجتماعیت صحرا میں ہے یا کھلے آسمان کے نیچے ننگی زمین پر ہے تو انہیں گرمی، سردی اور بارش کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ چوروں اور ڈاکوؤں کے ہاتھوں پریشان ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ گھر بنانا ضروری ہو گیا اور ہر خاندان کا اپنا گھر ہو جہاں وہ اپنی زندگی اپنے اثاثوں سے محفوظ طریقے سے گزاریں، گرمی، سردی اور بارش سے خود کو بچائیں اور اپنے ذرائع معاش کی حفاظت کریں۔ چونکہ چور اور ڈاکو ٹھوس تعمیر شدہ گھروں میں گھس سکتے ہیں اور اپنے باشندوں کو پریشان کر سکتے ہیں، ان کے اثاثوں اور ذرائع کو لوٹ سکتے ہیں، اس لیے گھروں کے ارد گرد اونچی چاردیواریں تعمیر کرنے کی ضرورت پیدا ہوئی۔ یہ ضرورت شہروں اور بستیوں کی بنیاد تھی۔ پھر جب لوگ گھروں اور شہروں میں اکٹھے ہوئے اور آپس میں سودے بازی کرتے تو اس سے ان کے درمیان جھگڑا ہوتا تھا۔ اسی طرح باہمی اختلافات بھی [اس اجتماعی زندگی سے] پیدا ہوئے۔ شوہر پر اپنی بیوی کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور باپ کی اولاد کی ذمہ داری ہوتی ہے کیونکہ اولاد کمزور ہوتی ہے اور انہیں اپنی زندگی گزارنے کے لیے اپنے والدین کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ ذمہ داری اور سرپرستی کے نتیجے میں تنازعات اور تنازعات پیدا ہوتے ہیں، اس کے برعکس جانوروں پر سرپرستی کے نتیجے میں جھگڑا نہیں ہوتا کیونکہ ان میں جھگڑا کرنے اور مزاحمت کرنے کی طاقت بھی نہیں ہوتی حالانکہ ان کے خلاف ظلم کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف عورت اپنے شوہر کے ساتھ جھگڑا کرے گی اور اس کے خلاف اٹھ کھڑی ہو جائے گی۔ بچے اپنے والدین سے جھگڑا کرتے ہیں۔ یہ گھر کی حالت ہے (یا ایک خاندان کے اندر)۔ کسی شہر میں لوگوں کے باہمی تعلقات ہوتے ہیں اور اس کے نتیجے میں اختلافات اور تنازعات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر انہیں تنہا چھوڑ دیا گیا تو وہ آپس میں لڑ کر ایک دوسرے کو مار ڈالیں گے۔ چرواہوں اور کسانوں کے ساتھ بھی یہی حال ہے۔ اگر وہ مشترکہ [قدرتی] وسائل جیسے چراگاہوں، کھیتوں، ندی نالوں اور کنوؤں سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور ان سے ان کے مقاصد پورے نہیں ہوتے ہیں تو ان کے درمیان باہمی اختلافات یقینی طور پر پیدا ہوں گے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو کمزوری، بیماری، بڑھاپے یا دیگر وجوہات کی وجہ سے کاشتکاری کرنے یا کسی صنعت میں کام کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ اگر یہ لوگ بے بس رہ گئے تو وہ ضائع ہو جائیں گے (یا تباہ ہو جائیں گے)۔ اگر ان کی دیکھ بھال کی ذمہ داری سب پر ڈال دی جائے تو اس سے معاملہ حل نہیں ہوگا یا اگر کسی ایک شخص پر خصوصی طور پر ڈال دیا جائے تو پھر وہ ذمہ داری کیوں اٹھائے گی۔ ان [مجبور] وجوہات اور رکاوٹوں کی وجہ سے ، بہت سی دوسری صنعتیں پیدا ہوئیں۔ ان میں سے ایک پیمائش کی مہارت ہے اور اس کے ذریعے زمین کی مقدار کی پیمائش کی جا سکتی ہے۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں کا پیشہ اس لیے پیدا ہوا کیونکہ تنازعات کے وقت معاملات کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے تاکہ ہر حقدار کو اپنے حقوق مل سکیں۔ جو لوگ اس پیشے سے بخوبی واقف ہیں وہ اپنے ہتھیاروں سے شہروں کی حفاظت کرتے ہیں اور شہر کے باشندوں کو چوروں اور ان کے دشمنوں سے بچاتے ہیں۔ ایک ہنر انتظامیہ اور حکمرانی ہے اور اس کی مدد سے شہر کے باشندوں کے باہمی تنازعات کو حل کیا جاتا ہے۔ ان ہی میں سے ایک ہنر الٰہی شریعت (*فقہ*) ہے، دوسرے لفظوں میں ان الہامی احکام اور احکام سے آشنا ہونا جو مخلوقات کی زندگیوں میں نظم و ضبط پیدا کرنے اور لوگوں کو خدا کی حدود سے آشنا کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں تاکہ وہ تمام معاملات میں شریعت الٰہی کی حدود میں رہیں اور جھگڑوں میں ملوث نہ ہوں۔ ان مہارتوں کا تعلق شہری انتظامیہ سے ہے اور ان کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ صرف وہی مخصوص لوگ ان مہارتوں میں مصروف ہوسکتے ہیں جو علم، فہم و فہم ، رہنمائی اور اس طرح کی دیگر خصوصیات کے حامل ہوں۔

ظاہر ہے کہ اگر یہ لوگ ان مہارتوں اور پیشوں میں شامل ہوں گے تو وہ کچھ اور نہیں کر پائیں گے۔ انہیں روزی روٹی کمانے کی ضرورت ہے اور شہر کے باشندوں کو [انتظامیہ کے لیے] ان کی ضرورت ہے۔ اگر ہم کہتے ہیں کہ شہر کے تمام لوگ جنگ میں مصروف ہوجاتے ہیں تو تمام صنعتوں کو روک دیا جائے گا۔ اسی طرح اگر تمام فوجی

روزی کمانے کے لیے صنعتوں اور پیشوں میں مشغول ہو جائیں تو شہر (اور ممالک) غیر محفوظ ہو جائیں گے [حملہ آور فوجوں کے خلاف کوئی دفاع نہ ہونے کی وجہ سے] اور باشندوں کی زندگیاں ہر وقت خطرے میں پڑ جائیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگوں کی آمدنی اور رزق کے لیے پیسہ خرچ کرنے کی ضرورت پیدا ہوئی، ایسے ذرائع سے جو کسی خاص شخص کی ملکیت نہیں ہیں (عوامی فنڈز جو عوامی بھلائی کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں)۔ کسی شہر کے باشندوں کو اپنے وسائل کے ساتھ ان کی مدد کرنے کی ضرورت ہوگی تاکہ وہ [بدلے میں] شہر کی حفاظت میں مدد کرسکیں۔ اس سے ٹیکسوں کی ضرورت پیدا ہوئی۔ ٹیکسوں سے متعلق معاملات سے اور بھی بہت سی ضروریات پیدا ہوئیں۔ مثال کے طور پر ، کسی ایسے شخص کی ضرورت تھی جو کسانوں اور دولت مندوں پر انصاف کے ساتھ ٹیکس مقرر کرے۔ اس کے ساتھ ساتھ جمع شدہ ٹیکسوں کو محفوظ رکھنے کے لیے ایک ٹیکس کلکٹر اور ایک خزانچی کی ضرورت تھی۔ ٹیکس تقسیم کرنے والا بھی ناگزیر تھا۔ ان تمام ضروریات کے نتیجے میں اہل افراد کو ذمہ داریاں تفویض کی گئیں۔ ایک ایسے لیڈر کی ضرورت تھی جو ٹیکس وصول کرنے، ان کی تقسیم [عوامی بھلائی کے لیے] کرنے، جنگ کی صورت میں فوجیوں کو استعمال کرنے، انہیں دفاع کے لیے اسلحہ دینے، فوج کا سربراہ مقرر کرنے، ریاست کے معاملات کو چلانے کے لیے بے شمار لوگوں کی تقرری میں انصاف کے ساتھ کام کرنے کی ضرورت تھی۔ یہ تمام لوگ (سرکاری عہدوں پر تعینات افراد) تنخواہوں کے محتاج ہیں کیونکہ وہ اپنی عوامی ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہوئے دوسرے پیشے اختیار نہیں کر سکتے۔ ان تمام کوششوں کو [انتظامیہ سے متعلق] وسائل کی ضرورت ہوتی ہے جو ٹیکس جیسے ذرائع سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

اس پر غور کیجئے! کھانے ، کپڑے اور رہنے کی جگہ کی ضرورت نے بہت سی دوسری ضروریات کو جنم دیا۔ باقی تمام دنیاوی معاملات کا یہی حال ہے۔ اگر ایک دروازہ کھول دیا جائے تو اس سے دوسرے بہت سے دروازے خود بخود کھل جاتے ہیں اور واقعات کا یہ سلسلہ اس طرح ختم نہیں ہوتا جیسے دنیا ایک گڑھے کی مانند ہے جس کی گہرائی کی کوئی حد نہیں ہے۔ جب کوئی انسان دنیا میں ایک کھائی میں گرتا ہے اور اس سے باہر نکلنے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہے تو دوسری کھائی میں اور وہاں سے تیسرے میں گر جاتا ہے۔ یہ تخلیقات کی مصروفیات ، [متنوع] کوششوں اور معاشی جدوجہد کی کچھ مثالیں ہیں۔ لوگ دن رات ان سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہیں۔ ہر شخص پیسہ کمانے کا جنون رکھتا ہے اور اس نے اسے اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا ہے۔ انسان اپنی سرگرمیوں اور مختلف دنیاوی مصروفیات میں اس قدر مگن ہو جاتا ہے کہ نہ تو اس کے وجود کا کوئی احساس باقی رہ جاتا ہے اور نہ ہی اس کے زندگی کے [حقیقی] مقصد کا ادراک اور نہ ہی موت کے بعد کی زندگی کا خیال رکھتا۔ تمام لوگ دنیا کے لیے مسلسل جدوجہد کر رہے ہیں اور [اس جدوجہد میں حیران ہو کر گھوم رہے ہیں تاکہ وہ اپنی روحوں کو بھول جائیں]۔ دنیاوی مصروفیات کی کیچڑ ان کی کمزور عقل اور نامکمل ذہنوں پر اس قدر حاوی ہو گئی ہے کہ ان کے خیالات کو بھی انتشار اور فساد سے نہیں بچایا گیا ہے!

دنیاداری میں مگن لوگوں کی اقسام: دنیا میں مگن لوگوں کے خیالات نہ تو ایک جیسے ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کا کوئی مشترکہ مقصد ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں کا ایک نقطہ نظر ہے ، کچھ کا دوسرا ہے۔ ایسے ہی ایک گروہ کی آنکھیں غفلت اور جہالت کے موٹے پردے سے ڈھکی ہوئی ہیں یہاں تک کہ ان کی آنکھوں (بصیرت) میں ان کے آخری انجام پر ایک نظر ڈالنے کی کوئی صلاحیت باقی نہیں رہی۔ ان کا کہنا ہے کہ دنیا میں رہنے کے لیے ہمارے پاس زندگی کے صرف چند دن (مختصر وقت) ہیں، اسی لیے ہمیں سخت محنت کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ہم اپنا رزق کما سکیں، کھا سکیں اور کھانے سے طاقت حاصل کر سکیں تاکہ ہم دوبارہ رزق حاصل کر سکیں۔ دوسرے لفظوں میں ، وہ کمانے کے لئے کھاتے ہیں۔ یہ کاشتکاروں، پیشہ ور افراد اور ان لوگوں کا نقطہ نظر ہے جن کے پاس نہ تو دنیاوی آسائشیں میسر ہیں اور نہ ہی ان کے پاس مذہب میں کوئی حیثیت (بہت زیادہ عمل) ہے۔ وہ دن کے وقت بہت محنت کرتے ہیں تاکہ وہ رات کو کھانا کھا سکیں اور رات کو کھانا کھاتے ہیں تاکہ وہ دن میں سخت محنت کرسکیں۔ یہ ایک ایسا سفر اور ایک ایسا دائرہ ہے جو صرف موت پر ختم ہوگا۔

کچھ لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اپنی تخلیق کا مقصد جانتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ شریعت الٰہی کا مقصد انسانوں کو نیک اعمال پر آمادہ کرنا نہیں ہے اور وہ دنیاوی لذتوں سے کسی قسم کی لذت حاصل نہیں کرتے، بلکہ انسانی کامیابی کا اختتام یہ ہے کہ انسان معدے اور شرم کی خواہشات کو پورا کرے۔ یہ لوگ اپنی نفسوں کو بھی فراموش کر چکے ہیں اور جسمانی لذتوں اور لذیذ کھانوں میں اس قدر مگن ہیں کہ کچھ بھی یاد نہیں رہا۔ انہوں نے اپنی زندگی جانوروں

کی طرح گزارنا شروع کر دی اور اس کے علاوہ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہوس (لذت اور جسمانی لذت) [زندگی کا اصل مقصد] ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کی یاد اور آخرت کے خیال سے غافل ہیں

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انسانی کارنامے کا اصل انجام دولت اور خزانوں کی کثرت ہے۔ چنانچہ انہوں نے لمبے سفر کر کے مال و مال جمع کرنے میں دن کی رات کی نیند اور سکون کو برباد کر دیا ہے اور راستے کی ہر تکلیف کو برداشت کیا ہے، دولت کے لیے ہر قسم کا کام کیا چاہے کتنی ہی مصیبت اور ذلت کیوں نہ ہو۔ وہ صرف کمانے اور جمع کرنے میں اس حد تک مصروف رہتے ہیں کہ وہ ضرورت سے زیادہ کھانا بھی پسند نہیں کرتے تھے، کیونکہ ان کی کنجوسی انہیں کچھ خرچ کرنے کی اجازت نہیں دیتی تھی اور ان کے سرمائے میں کمی کا سبب بنتی تھی۔ گویا دولت جمع کرنا ان کے لیے لذت کا ذریعہ بن گیا اور ان کی زندگی کی آخری سانس تک وہ اس لذت میں مگن رہے یہاں تک کہ موت آ گئی اور وہ سارا خزانہ زمین میں دفن ہو گیا [یا جہاں بھی انہوں نے اسے خفیہ طور پر ذخیرہ کیا] یا دوسرے لوگوں کے ہاتھ میں چلا گیا جنہوں نے ان سب کو ہوس اور لذت کی راہ میں خرچ کیا۔ انہوں نے خود (اپنی انتھک کوششوں سے) مصائب کے سوا کچھ حاصل نہیں کیا، آخرت کے نتائج اس سے اوپر تھے، لذت صرف دوسرے لوگوں کو حاصل ہوتی تھی جو ان کی کوششوں سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ یہ حیرت کی بات ہے کہ لوگ دیکھتے ہیں کہ کنجوس [اور ذخیرہ اندوز] کس طرح ختم ہوجاتے ہیں لیکن [پھر بھی] انہیں پرواہ نہیں ہے۔

بعض لوگوں کا خیال تھا کہ انسانی کارنامے کا اصل نتیجہ یہ ہے کہ ان کی تعریف کی جائے اور ان کی تعریف کی جائے اور ہر شخص کو ان کے خوبصورت لباس، ان کے بے داغ، خوبصورت اور آرائشی ظاہری شکل کی تعریف کرنی چاہیے۔ ایسے لوگ دن رات پیسے کمانے میں بھی مصروف رہتے ہیں لیکن کھانے پینے پر مجبور ہوتے ہیں اور اپنا سارا پیسہ اچھے کپڑے اور اچھی سواری کے حصول پر خرچ کرتے ہیں۔ وہ گھر کے دروازوں اور بیرونی دیواروں کو [خوبصورت] پینٹ سے چمکاتے ہیں تاکہ آنکھوں کو چمکایا جا سکے تاکہ ان کی طرف دیکھنے والے لوگ یہ سوچنے لگیں کہ گھر کا مالک اتنا امیر ہے۔ یہ تعریف ان کی لذت اور نشہ ہے اور اسی لذت کے لیے وہ دن رات کماتے ہیں اور اس بات پر غور کیے بغیر کہ ان کی محنت کی کمائی کہاں خرچ ہو رہی ہے۔

بعض لوگوں کا خیال تھا کہ انسانی کارنامے کا اصل مقصد شہرت اور مرتبہ حاصل کرنا ہے جس کا ہر کوئی احترام کرتا ہے اور عاجزی اور احترام کے ساتھ سجدہ کرتا ہے اور فرمانبردار ہو جاتا ہے۔ لوگوں کی پیروی حاصل کرنے کے لئے ، درجہ (اعلی معاشرتی حیثیت اور طاقت) اور وقار (شہرت) کی ضرورت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ، انہوں نے حکومت میں کردار ادا کرنے کی کوشش شروع کی تاکہ وہ فیصلے کرنے کی پوزیشن میں ہوں جو نافذ ہوں۔ چند لوگوں پر حکومت کرنا اور ان کی اطاعت حاصل کرنا ان کا مقصد ہے۔ یہ بات اکثر غفلت والوں میں موجود ہے کہ وہ لوگوں کی پیروی کو سب کچھ سمجھتے ہیں اور ان کی اطاعت (یا کسی بھی معاملے میں پیروکاری) نے انہیں خدا کی اطاعت، عبادت اور آخرت کے تصور سے غافل بنا دیا ہے۔

یہ کچھ قسم کے لوگ ہیں [جو دنیاداری میں مگن ہیں]۔ ان کے علاوہ کچھ اور فرقے ہیں جن کی تعداد ستر سے زیادہ ہے۔ یہ تمام گروہ فطری طور پر گمراہ ہیں اور دوسروں کو حق کی راہ سے گمراہ کرتے ہیں۔ اس گمراہی کی طرف ان کے جھکاؤ کی اصل وجہ یہ ہے کہ دنیاوی زندگی میں وہ اچھا کھانا، اچھا لباس اور اچھا گھر چاہتے ہیں۔ خوراک، کپڑے اور گھر کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ ان تینوں چیزوں میں سے ہر ایک میں سے کتنی رقم کافی ہے۔ ضرورت سے زیادہ رقم کی ضرورت اور خواہش نے انہیں اس قدر دھکیل دیا ہے کہ دنیا ان کی زندگی کا واحد مقصد بن گئی ہے اور وہ اس مقصد کی طرف اس طرح بھاگ گئے کہ وہ اپنا آخری انجام بھول گئے۔ وہ لوگ جو زندگی کے ذرائع یعنی خوراک، کپڑے اور رہائش گاہ کی ضرورت کو سمجھتے ہیں اور اپنے اصل مقصد سے واقف ہوتے ہیں، وہ کسی بھی کام میں اس طرح مشغول نہیں ہوتے کہ وہ اپنی تخلیق کے مقصد کو نظر انداز کر دیں۔ وہ جو بھی کام کرتے ہیں، اس کے مقصد اور اس میں ان کا حصہ ہوتا ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ معاشی جدوجہد کا مقصد خوراک اور لباس کے ذریعے جسم کی حفاظت کرنا ہے تاکہ جسم مر نہ جائے اور اس "عبادت" کے مقصد کے لیے جس کے لیے اسے تخلیق کیا گیا ہے اسے حاصل کیا جائے۔ وہ لوگ جو دنیا میں اپنے حصے کا کم حصہ حاصل کرتے ہیں، وہ آخرت کی طرف اپنی توجہ مبذول کرانے کے لیے دنیاوی مصروفیات سے غافل ہو جاتے ہیں۔ ان کے دلوں پر یاد الٰہی اور ان کی اپنی موت کا تذکرہ غالب ہے اور ہر لمحہ وہ آنے والی زندگی کے لیے تیار رہتے ہیں۔ وہ لوگ جو ضرورت کی حدود سے تجاوز کرتے ہیں، ان کے دنیاوی اعمال اور کوششیں

انہیں سکون سے نہیں رہنے دیتے۔ ایک [دنیاوی] مصروفیت دوسری کو جنم دیتی ہے اور یہ [مصروفیات] کا سلسلہ کبھی نہ ختم ہوتا ہے۔ دنیاوی مصروفیات کی زیادتی پریشانیوں میں اضافہ کرتی ہے اور دل و دماغ کو پریشانیوں میں قید کر دیتی ہے۔ ایسا شخص جس کا دل ہمیشہ دنیا میں مگن رہتا ہے اور جس کا ذہن اس سے چھایا ہوا ہے، ایسا شخص خدا کو کیسے یاد کر سکتا ہے؟ دنیا میں مگن لوگوں کا حال ایسا ہی ہے۔

جو لوگ اس حقیقت کو دیکھتے ہیں وہ دنیاداری سے بچتے ہیں اور شیطان ان سے حسد کرتا ہے اور انہیں گمراہ کرتا ہے حالانکہ وہ منہ موڑتے ہیں چنانچہ ایسے لوگوں کے بہت سے گروہ بن گئے ہیں جو دنیاداری سے بچتے ہیں۔ ایک گروہ کا خیال تھا کہ دنیا محنت اور مصائب کی جگہ ہے اور آخرت ابدی خوشی اور لامتناہی کامیابی کا ٹھکانہ ہے۔ چنانچہ جو شخص آخرت میں پہنچا اس نے ابدی خوشی اور لازوال کامیابی حاصل کی چاہے اس نے دنیا میں عبادت الٰہی کی ہو یا نہ ہو۔ اس وجہ سے انہوں نے سمجھا کہ [ہدایت کا] سیدھا راستہ یہ ہے کہ دنیاوی مصائب سے چھٹکارا پانے کے لیے انسان اپنے نفس کو تباہ کر دے۔ چنانچہ لوگوں کا ایک گروہ موت کو گلے لگانے کے لیے آگ میں گر جاتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ ایسا کرنے سے وہ دنیاوی دکھوں اور دکھوں سے چھٹکارا حاصل کر لیتے ہیں۔ لوگوں کا ایک گروہ یہ سمجھتا ہے کہ اپنی جان لینے کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ انسانی صفات (فطرت) کا خاتمہ ضروری ہے۔ آخرت میں انسانی کارنامے کا انتہا غضب اور ہوس کو نفس سے مکمل طور پر الگ کرنا ہے۔ اس گروہ نے ان کی انسانی فطرت کو ختم کرنے کے لیے شدید روحانی جدوجہد کی۔ کچھ لوگ اپنے آپ پر اتنے سخت تھے کہ وہ اپنی روحانی کشمکش کے دوران مر گئے اور کچھ اپنے دماغ اور حواس کھو بیٹھے اور بیمار ہو گئے اور اب اپنی روحانی جدوجہد جاری رکھنے کے قابل نہیں رہے۔ بعض لوگوں نے جب دیکھا کہ روحانی کشمکش کے باوجود اپنی انسانی فطرت کو ختم کرنے سے قاصر ہیں تو انہوں نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ شریعت الٰہی (اخلاقی، اخلاقی اور روحانی تعلیمات کے احکام) پر عمل کرنا ناممکن ہے اور یہ کہ قانون الٰہی محض ایک دھوکہ ہے اور اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ چنانچہ انہوں نے غیر مذہبیت اور خدا کے انکار کی راہ پر گامزن ہو گئے۔ ایک گروہ کا خیال تھا کہ تمام عبادتیں اللہ کی راہ میں کی جاتی ہیں جو ان کی محتاج نہیں ہے، کیونکہ نہ تو گنہگار کی نافرمانی اس کی عظمت کو کم کرتی ہے اور نہ ہی کسی راستباز کی عبادت اس کی عظمت اور تقدس میں اضافہ کرتی ہے۔ [اس غلط عقیدے کو برقرار رکھنے کے نتیجے میں] وہ اپنی خواہشات کی طرف لوٹ گئے اور ہر چیز کو جائز قرار دینے کی راہ پر چلنے لگے [قطع نظر اچھے یا برے، اخلاقی یا غیر اخلاقی، نیک یا برائی]۔ انہوں نے شریعت الٰہی اور اس کے احکام کو الٹ دیا اور اس بگڑے ہوئے قیاس میں الجھ گئے کہ ہر چیز کو جائز سمجھنا ان کے توحید پر ایمان کی وضاحت اور بے معنی ہونے کا ثبوت ہے کیونکہ یہ ان کا عقیدہ ہے کہ خدا کو اپنے بندوں کی عبادت کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک گروہ کا خیال تھا کہ عبادت الٰہی کا مقصد روحانی جدوجہد ہے تاکہ بندہ عبادت میں جدوجہد کے ذریعے الٰہی گنوسس تک پہنچ سکے۔ Gnosis کا حصول اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ مقصد حاصل ہو گیا ہے اور مزید روحانی جدوجہد کی ضرورت نہیں ہے۔ اس طرح ان لوگوں نے روحانی جدوجہد اور عبادت کو چھوڑ دیا اور یہ دعویٰ کرنا شروع کر دیا کہ خدا کی گنوسس نے انہیں جدوجہد کی حدود سے آزاد کر دیا ہے - صرف عام لوگوں کو ہی خدائی قانون کے احکامات پر عمل کرنے کا پابند ہے۔ اس طرح کے لوگوں کے بے شمار گمراہ گروہ ہیں اور ان کے غلط عقائد اتنے زیادہ ہیں کہ انہیں تحریری طور پر حاصل کرنا مشکل ہے۔ ان گروہوں میں سے واحد گروہ جو نجات حاصل کرے گا وہ وہ ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طریقے پر عمل پیرا ہو، دوسرے لفظوں میں وہ نہ تو دنیا کو مکمل طور پر چھوڑ دیں گے اور نہ ہی ہوسوں کو مکمل طور پر ختم کریں گے (یہاں لفظ "انسانی فطرت کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے") - وہ دنیا سے [صرف] ایک مطلوبہ حصہ لیں گے جو آخرت کی راہ میں ایک امانت یا رزق بن جائے گا اور ان خواہشات کو چھوڑ دے گا جو شریعت الٰہی کی پابندی کی حدود سے خارج ہیں۔

صحیح عقائد رکھنے والے مومن کو نہ تو ہر ہوس کی پیروی کرنی چاہیے اور نہ ہی ہر ہوس کو چھوڑنا چاہیے، بلکہ اعتدال کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ دوسرے لفظوں میں انسان کو نہ تو دنیا کی ہر چیز کو چھوڑنا چاہیے اور نہ ہی دنیا کی ہر چیز کو حاصل کرنا چاہیے، بلکہ اسے خدا کی تخلیق کردہ ہر چیز کے مقصد کو سمجھنا چاہیے اور اس مقصد کی حفاظت کرنی چاہیے۔ مثال کے طور پر عبادت الٰہی کے لیے قوت حاصل کرنے کے لیے درکار کھانے کی مقدار کو لے جانا چاہیے (عبادت کا دائرہ صرف نمازوں اور ذکر الٰہی تک محدود نہیں ہے، بلکہ ہر عمل چاہے وہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو، بشمول روزی کمانے اور تفریح کرنا، اللہ کی راہ میں آگے بڑھنے کے لیے کیا جاتا ہے۔

عبادت الٰہی کا ایک عمل ہے)، وہ گھر حاصل کریں جو چوروں اور گرمی اور سردی کے موسم کی سختی سے بچا سکے، وہ لباس جو جسم کو ڈھانپ سکے اور بدلتے موسم میں اس کی حفاظت کر سکے تاکہ جب دل جسمانی ذمہ داریوں سے آزاد ہو جائے تو وہ خدا کی طرف توجہ مرکوز کر سکے اور الٰہی کی یاد و فکر میں مشغول ہو سکے، اور اپنی خواہشوں پر کڑی نظر رکھی تاکہ وہ صداقت اور تقویٰ کی حدود سے تجاوز نہ کریں۔ یہ سب معاملات اصحاب کرام رضی اللہ عنہم صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے پر چلنے والے نجات پسند گروہ کی پیروی کرنے سے انسان کو معلوم ہوتا ہے جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک ان کی راہ پر ہیں اور جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی راہ پر گامزن ہیں۔ یہ لوگ اعتدال پسندی کی راہ پر گامزن تھے اور اس واضح اور روشن راستے کے پیروکار تھے جس کا تفصیل سے اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ وہ دنیا کی خاطر نہیں بلکہ خدا کی راہ کی خاطر دنیا حاصل کرتے تھے، وہ نہ تو راہب طرز زندگی اختیار کرتے تھے اور نہ ہی دنیا کی ضروریات سے غافل ہوتے تھے۔ ان کے معاملات میں نہ تو زیادتی تھی اور نہ ہی کمی، بلکہ یہ ایک ایسا راستہ تھا جس میں تمام انتہاؤں سے بچنے کا راستہ تھا جس میں کمی اور زیادتی کے درمیان بیچ میں تھا کیونکہ اعتدال اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے۔

باب 7 - کنجوسی کے نقصانات اور مادی املاک سے محبت

غزالی کی ساتویں کتاب *" احیئ العلوم الدین" یا "خدا کی راہ کی معرفت کا احیاء" کی تیسری جلد یا چوتھائی میں* روحانی راہ کی دو دیگر رکاوٹوں پر روشنی ڈالتی ہے - یہ دونوں لالچ، بخل اور مادی مالوں سے محبت اور وابستگی کی وجہ سے ہیں۔ زندگی کے بارے میں مادہ پرستانہ نقطہ نظر وسیع تر برادری کی مشترکہ بھلائی کے لیے سخاوت کو روکتا ہے جس کا کوئی حصہ ہے، اور لالچ کو فروغ دیتا ہے جو دوسروں کے جائز حقوق کو غصب کرنے کا باعث بنتا ہے۔ لالچ اور مادہ پرستی سے چلنے والی خود غرضی کا فروغ افراد، معاشروں اور برادریوں کو ان لوگوں کے مصائب سے محفوظ بناتا ہے جو سماجی نظام کے نچلے سرے پر ہیں اور اس کے نتیجے میں امیر اور غریب کے درمیان تنازعات، اختلافات اور تفرقہ پیدا ہوتا ہے۔ غزالی ان دونوں بیماریوں کی تشخیص کرتی ہے، روحانی راہ پر ان کے منفی اثرات کا تجزیہ کرتی ہے اور ان کا علاج تجویز کرتی ہے جو انسان کو آزادانہ طور پر باطنی روحانی فضیلت حاصل کرنے کے لیے آزاد کرتی ہے۔ غزالی کی اس کتاب کے مندرجات یہاں مختصر شکل میں اس طرح پیش کیے گئے ہیں:

دنیاوی زندگی کی آزمائشیں اور مصیبتیں: یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ دنیا کی آزمائشیں اور آزمائشیں شاخیں کے بعد شاخ کے ساتھ کافی وسیع ہیں اور بے شمار ہیں۔ ان میں سب سے بڑا مادی اثاثہ ہے اور کوئی بھی فرد اس سے غافل نہیں رہ سکتا اور اگر یہ حاصل ہو جائے تو اس کے نقصانات سے بچنا بہت مشکل ہے۔ اس سے محروم ہونا غربت ہے جو بعض اوقات کفر کی طرف لے جا سکتی ہے اور دولت مند ہونا بغاوت کا سبب ہے جس کا نتیجہ نقصان کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دولت کے فوائد اور نقصانات دونوں ہیں۔ اس کے فوائد نجات دہندہ صفات میں شامل ہیں اور اس کے نقصانات تباہ کن داخلی خصوصیات میں شامل ہیں۔ دولت کے دو پہلو ہیں - اچھائی اور برائی۔ ان دونوں میں فرق کرنا اتنا مشکل ہے کہ صرف وہی علماء ہی کر سکتے ہیں جو علم میں مضبوطی سے

پیوست ہوں اور خدا کی راہ میں گہری بصیرت رکھتے ہوں، اس کے برعکس جو روایتی علماء اور دھوکہ دہی کا شکار مذہبی اشرافیہ ہیں۔ اس لیے مال اور مادی مال کے نقصانات کا الگ الگ ذکر کرنا ضروری ہے کیونکہ جو کچھ پچھلے باب میں بیان کیا گیا ہے وہ دنیاداری سے متعلق تھا نہ کہ خاص طور پر دولت سے۔ ہر عارضی اور عارضی لذت کو "دنیا" کہا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے دولت بھی دنیا کا ایک جزو ہے، صرف دولت کو "دنیا" نہیں کہا جاتا۔ دنیا کا ایک جزو شہرت اور وقار ہے، ایک جزو پیٹ اور نجی اعضاء کی ہوس ہے، ایک جزو غصے سے دب جانا ہے، ایک جزو حسد ہے، ایک تکبر اور شان و شوکت ہے۔ اس طرح کے بہت سے اجزاء اور اجزاء ہیں جن سے انسان لطف اندوز ہوتا ہے۔

دولت کی آزمائشیں: اس کتاب میں صرف مادی املاک [اور دولت] کو بحث کا موضوع بنایا جائے گا کیونکہ اس میں انسانوں کے لیے زیادہ آزمائشیں اور نقصانات ہیں۔ اگر کسی کے پاس مادی املاک کی کمی ہے تو ، یہ کسی فرد میں غربت کی خوبی پیدا کرتا ہے (روحانی معنوں میں خدا کی محتاجی بھی مراد ہے) اور اگر یہ موجود ہے تو ، یہ کسی میں دولت کی خوبی پیدا کرتا ہے۔ یہ دونوں ریاستیں آزمائشوں اور آزمائشوں کی ریاستیں ہیں۔ پھر مادی اثاثوں سے محروم شخص میں دو خوبیاں پیدا ہوتی ہیں - اطمینان اور لالچ۔ ان میں سے ایک (لالچ) قابل مذمت ہے اور دوسرا (قناعت پسندیدہ) ہے۔ لالچی کی دو اور خوبیاں بھی ہوتی ہیں - ایک یہ کہ دوسرے شخص کے مال پر نظر رکھنا ہے جو ان پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ دوسرا مادی اثاثوں کو حاصل کرنے کی خواہش ہے جو کسی کو تجارت، ملازمت یا صنعت میں مصروف ہونے پر آمادہ کرتی ہے۔ لالچ بدترین خوبیوں میں سے ایک ہے۔ امیر شخص کی دو خوبیاں بھی ہوتی ہیں، کنجوسی اور دوسروں سے روکنا [چاہے وہ جائز چیز ہو جو دوسروں کو دی جانی چاہیے، اس کی بخل کی وجہ سے]، اور خرچ کرنا۔ ان میں سے ایک خوبیاں مطلوب ہیں اور دوسری قابل مذمت ہیں۔ خرچ کرنے والے میں بھی دو خوبیاں ہیں - فضول خرچی اور اعتدال پسندی۔ ان میں اعتدال پسندی قابل تعریف ہے۔ یہ تمام چیزیں مبہم اور لطیف ہیں ، اسی وجہ سے ، ان کی وضاحت کرنا ضروری ہے۔ ان معاملات کی وضاحت ذیل میں کی جائے گی۔ سب سے پہلے، دولت کے نقصانات کی وضاحت کی جائے گی اور اس کے بعد اس کے فوائد کی وضاحت کی جائے گی۔ اس کے بعد اس کے فوائد اور نقصانات کے بارے میں تفصیلات پیش کی جائیں گی۔ اس کے بعد لالچ کی مذمت کی جائے گی پھر اس کا علاج سمجھایا جائے گا۔ سخی لوگوں کی روایات سے سخاوت کی وضاحت کی جائے گی، اس کے بعد کنجوسی کی مذمت کی جائے گی اور کنجوس کے بارے میں روایات پیش کی جائیں گی۔ اس کے بعد دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دینے کی فضیلت اور برتری کی وضاحت کی جائے گی۔ بخل اور سخاوت کے بارے میں شریعت الٰہی کی حدود سے نمٹا جائے گا۔ کنجوسی کا علاج کیا جائے گا، پھر دولت کے بارے میں اجتماعی ذمہ داریوں کی وضاحت ہوگی۔

دولت کے نقصانات اور اس سے محبت کرنے کی ناپسندیدگی

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَٰلُكُمْ وَلَآ أَوْلَٰدُكُمْ عَن ذِكْرِ ٱللَّهِ ۚ

وَمَن يَفۡعَلۡ ذَٰلِكَ فَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلۡخَٰسِرُونَ

"اے ایمان والو! تمہیں تمہارے مال اور نسل اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دے جو ایسا کرے گا وہ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔ (سورۃ البقرۃ سورۃ البقرۃ آیت ۹)

إِنَّمَآ أَمۡوَٰلُكُمۡ وَأَوۡلَٰدُكُمۡ فِتۡنَةٞۚ وَٱللَّهُ عِندَهُۥٓ أَجۡرٌ عَظِيمٞ

"تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہارے لیے آزمائش اور آزمائش کا سبب ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت بڑا اجر ہے (کہ آپ اپنی ترجیحات کو درست کرتے ہیں اور اپنی زندگی کے حقیقی مقصد پر توجہ مرکوز رکھتے ہیں اور اپنی دنیاوی ذمہ داریوں کو بہترین طریقے سے ادا کرتے ہیں)۔ (سورۃ البقرۃ سورۃ البقرۃ المقدس آیت ۱۵)

مَن كَانَ يُرِيدُ ٱلۡحَيَوٰةَ ٱلدُّنۡيَا وَزِينَتَهَا نُوَفِّ إِلَيۡهِمۡ أَعۡمَٰلَهُمۡ فِيهَا وَهُمۡ فِيهَا لَا يُبۡخَسُونَ

"جو شخص صرف دنیا کی زندگی اور اس کی شان و شوکت کا طالب ہے تو ہم انہیں دنیا میں ان کے اعمال کا بدلہ دیتے ہیں اور ان کے لیے دنیا میں کوئی کمی نہیں ہے۔" (سورۃ البقرۃ القرآن باب 11 آیت 15)

كَلَّآ إِنَّ ٱلۡإِنسَٰنَ لَيَطۡغَىٰٓ ٦ أَن رَّءَاهُ ٱسۡتَغۡنَىٰٓ ٧

"انسان اپنے آپ کو خود کفیل اور دولت مند سمجھنے کی وجہ سے تمام حدود (شائستگی، اخلاق اور اچھے رویے) سے تجاوز کرتا ہے۔ (سورۃ البقرۃ سورۃ البقرۃ القرآن آیت 6-7)

أَلۡهَىٰكُمُ ٱلتَّكَاثُرُ

"دولت کی کثرت نے آپ کو [اپنی زندگی کے اصل مقصد اور اس کے لیے کام کرنے کے لیے درکار صحیح اعمال] سے غافل کر دیا ہے۔" (سورۃ البقرۃ باب 102 آیت 1)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ماذئبان ضاریان ارسلا فی زریبة غنم باکثرا فسادا فیها من حب الشرف
والمال والجاه فی دین الرجل المسلم

"اگر دو خونخوار بھیڑیے بکریوں کے ریوڑ میں گھس جائیں تو وہ اتنا فساد (نقصان) نہیں کرتے، جو کسی مسلمان کے عقیدے میں مال اور شہرت سے محبت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *کعب بن مالک* رضی اللہ عنہ سے احادیث *میں ترمذی* اور *نسائی* کا مجموعہ

یقول ابن ادم مالی مالی وهل لک من مالک الاما اکلت فافنیت اولبست
فابلیت اوتصدقت فامضیت

ابن آدم نے فرمایا: میرا مال اور مال ہے۔ کیا تمہارے مال میں سے کوئی ایسی چیز ہے جو تمہاری ہے جو سوائے اس کے جو تم نے اس میں سے کھایا اور اسے ختم کیا یا پہنا کر اسے بوڑھا کر دیا۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث کا مجموعہ *صحیح مسلم* ابو ہریرہ اور عبداللہ بن الشخیر رضی اللہ عنہ سے

اخلاء بنی آدم ثلاثة واحد يتبعه الى قبض روحه والثانى الى قبره والثالث الى محشره فالذى يتبعه الى قبض روحه فهو ماله فالذى يتبعه الى قبره فهو اهله والذى يتبعه الى محشره فهو عمله

"بنی آدم کے تین دوست ہیں۔ پہلے ان کے ساتھ رہتا ہے یہاں تک کہ روح پکڑ لی جائے۔ دوسرا قبر (تدفین) تک ایک کے ساتھ رہتا ہے۔ تیسرا قیامت تک ایک کے ساتھ رہتا ہے۔ ایک جو مدد کرتا ہے جب تک کہ روح پر قبضہ نہ ہو جائے۔ ایک جو قبر تک مدد کرتا ہے وہ دوست ، کنبہ اور رشتہ دار ہیں۔ جو قیامت تک مدد کرتا ہے وہ اس کا (نیک ، صالح ، نیک اور نیک) اعمال ہے۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *نعمان بن بشیر* رضی اللہ عنہ سے حدیث کے مجموعے طبرانی اوسط، طبرانی کبیر *اور* احمد رضی اللہ عنہ سے

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے شاگردوں نے ان سے کہا: تم پانی پر چلتے ہو، لیکن ہم اس کے قابل نہیں ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟" آپ نے جواب دیا: *درہم* اور *دینار* (پرانے زمانے میں کرنسی کے لیے استعمال ہونے والے سونے اور چاندی کے سکے) کی کیا اہمیت ہے؟ کہنے لگے: ہم انہیں اچھا نہیں سمجھتے۔ اس نے جواب دیا: "یہ دونوں میرے نزدیک چھوٹے کنکریوں کے برابر ہیں [اور اسی وجہ سے، میں مادیت سے لاتعلقی کی وجہ سے پانی پر چلنے کے قابل ہوں]"۔

ایک [عرب] شاعر نے [شعر میں] یہ فرمایا:

لا يغرنك من المرء قميص رقعه　　او ازار فوق عظيم الساق منه رفعه
او جبين لاح فيه اثر قد خلعه　　اره الدرهم تعرف حبه او ورعه

"تمہیں کسی کے کپڑوں سے دھوکہ نہیں دینا چاہیے جس میں پیچ [جو غربت کی نشانی ہے]، ٹخنوں کے اوپر پتلون (احکام کی پابندی کی نشانی) اور پیشانی پر سجدے کے نشانات (خدا کی عبادت کی نشانی) ہیں۔ کسی کو *درہم* (سونے کے سکے یا پیسہ) دکھائیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یا تو کسی کی دولت سے محبت ہے یا اس سے پرہیز کیا ہے [کیونکہ مادیت سے پرہیز کسی کی مذہبیت اور روحانیت کا حقیقی اشارہ ہے نہ کہ مذہب اور تقویٰ کی ظاہری شکلیں]۔

دولت کی تعریف اور تنقید کے درمیان تنازعہ کا حل

شریعت الٰہی بعض اوقات اس کی مذمت کرتی ہے اور اسے شیطان کا حربہ اور تمام گناہوں اور برائیوں کا سرچشمہ قرار دیتی ہے اور کبھی اس کی تعریف کرتی ہے اور اسے مختلف عبادات کے حصول کا ذریعہ قرار دیتی ہے۔ ان [بظاہر متضاد] آیات اور روایات کے درمیان تنازعہ کا حل کیسے ہو سکتا ہے؟ ایسا کرنے کا طریقہ (ظاہری تنازعہ کا حل) اس وقت تک سمجھنا مشکل ہے جب تک کہ دولت کی دانشمندی ، مقصد اور نقصانات کو نہ سمجھا جائے۔ اس کے بعد ہی یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ دولت ایک وجہ سے اچھی ہے اور دوسری وجہ سے برا۔ یہ اچھا ہونے کے لئے قابل تعریف ہے اور برا ہونے کے لئے قابل مذمت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دولت نہ تو خالص برائی ہے اور نہ ہی خالص اچھائی، بلکہ یہ نیکی اور برائی دونوں کا ذریعہ ہے اور دونوں کے حصول کا ذریعہ ہے۔ شکر الٰہی کے باب میں (غزالی کی کتاب "خدا کی راہ کا احیاء" کی چوتھی جلد اور اس کتاب کے باب بارہویں میں) ہم نے نیکی اور برکتوں کے درجات کی وضاحت کی ہے۔ یہاں اس کا ذکر کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ عقلمند اور صوفیانہ بصیرت رکھنے والوں کا مقصد آخرت کی ابدی خوشی اور لامتناہی کامیابی ہے جو ایک دائمی اور دائمی نعمت ہے۔ روحانی اور ذہین لوگ ہی اس نعمت کو حاصل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

ابدی خوشی اور لامتناہی فتح کے حصول کے ذرائع:

اس دنیا میں آخرت کی ابدی سعادت اور نہ ختم ہونے والی کامیابی تین ذرائع کے بغیر حاصل نہیں کی جا سکتی: پہلا نفس کی فضیلت جیسے علم اور حسن اخلاق، طبیعت، مزاج اور اخلاق۔ دوسرا، جسمانی فضیلت جیسے صحت اور ذاتی تندرستی۔ تیسری بات وہ فضیلت جو اپنی ذات اور جسم کے لیے خارجی ہیں مثلا دولت اور دنیاوی وسائل۔ ان میں سے سب سے افضل ذریعہ نفس کی فضیلت ہے، اس کے بعد جسمانی فضیلت اور آخر میں وہ فضیلت ہیں جو جسم اور نفس دونوں کے لیے خارجی ہیں اور ان میں دولت اور مال شامل ہیں جو سب سے کم مرتبہ رکھتے ہیں، کیونکہ وہ انسانوں کے خادم ہیں اور ان کی کوئی چیز کام نہیں کرتی۔ وہ دوسری چیزوں کو [ان کے ذریعے] حاصل کرنے کے لئے مطلوب ہیں اور وہ اپنے لئے مطلوب نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نفس ایک ایسا لطیف وجود ہے جس کی ابدی خوشی اور لامتناہی فتح کی خواہش ہوتی ہے اور یہ علم، الٰہی عرفیت اور اعلیٰ کردار کی خدمت کرتا ہے تاکہ یہ صفات نفس کی داخلی صفات بن جائیں۔ اس کے بعد نفس، جسم، حواس اور اعضاء کی خدمت ہوتی ہے۔ کھانا اور لباس جسم کی خدمت کرتے ہیں۔ پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ کھانا جسم کو محفوظ رکھنے کے لیے ہے اور شادی نسل انسانی کی حفاظت کے لیے ہے۔ جسم کا مقصد نفس کے کمال اور تکمیل کا سبب بننا ہے۔ نفس کی تطہیر، علم اور نیک کردار نفس کے باغ کو خوشبو دینے کے مقصد سے ہیں۔ جو شخص اس ترتیب یا ترتیب سے واقف ہے وہ دولت کی حقیقی حیثیت سے بخوبی واقف ہوگا [کہ یہ تمام فضیلت میں سے کم سے کم ہے اور انسانی وجود کے اعلیٰ مقصد اور مقاصد کی تکمیل کے لیے موجود ہے] اور اس بات سے واقف ہوگا کہ اسے کس چیز سے اچھا بناتا ہے۔ مادی اثاثے نفس کے لیے اہم ہیں، لیکن نفس وجود کا اصل دانا ہے۔ جو شخص کسی شے کے فائدے کو سمجھتا ہے اور اس کے اصل مقصد کو جاننے اور اس کے اصل مقصد کو مدنظر رکھنے کے بعد اسے استعمال کرتا ہے تو وہ استعمال بہتر اور فائدہ مند ہوگا۔ جس طرح دولت صحیح مقصد کا ذریعہ بن سکتی ہے اسی طرح یہ غلط مقاصد اور مقاصد کا ذریعہ بھی ہو سکتی ہے جو آخرت کی ابدی خوشی اور لامتناہی کامیابی سے ٹکرا جاتی ہے اور علم اور عمل کی راہوں کو روکتی ہے۔ اسی طرح دولت (مادی مال) قابل تعریف اور قابل مذمت دونوں ہو سکتی ہے - جب اسے قابل تعریف مقاصد سے منسوب کیا جائے تو قابل تعریف اور قابل مذمت جب اسے قابل مذمت مقاصد سے منسوب کیا جائے۔ حدیث میں یہ بیان ہے کہ جو شخص اپنی حقیقی ضروریات سے زیادہ مادی مال لیتا ہے وہ حقیقت میں غیر محسوس طور پر اپنی تباہی کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی مزاج ہوس کی طرف مائل ہوتا ہے اور ان کی پیروی کرنے میں خوشی حاصل کرتا ہے اور یہ خواہشات انسان کو حق کی راہ پر چلنے سے روکتی ہیں اور دولت ان خواہشات کے حصول کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ دولت لینا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ چنانچہ انبیاء نے مال و مال کی برائیوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگی ہے [کیونکہ اگر غلط مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے تو وہ غلط اور برے طریقوں کی طرف راغب کرتے ہیں]۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب دعا ہے:

اللّٰھم احینی مسکینا وامتنی مسکینا واحشرنی فی زمرۃ المساکین

"اے خدا! مجھے ایک فقیر کی طرح زندہ رکھ، مجھے غربت کی حالت میں موت دے اور مجھے مسکینوں کے گروہ میں پرورش دے - (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث کا مجموعہ *ترمذی* انس بن مالک رضی اللہ عنہ

دولت کے نقصانات اور فوائد

دولت میں سانپ کی طرح زہر اور تریاق دونوں ہوتے ہیں۔ تریاق اس کے فوائد سے ہوتا ہے اور زہر اس کے نقصانات سے ہوتا ہے۔ صرف وہی شخص جو اس کے نقصانات اور فوائد دونوں سے واقف ہو وہ اپنے آپ کو اس کے

زہر سے بچا سکے گا اور اس کے تریاق سے فائدہ اٹھا سکے گا۔ دولت کے فوائد مذہبی بھی ہیں اور دنیاوی بھی۔ دنیاوی فوائد کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ مشہور اور مشہور ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو لوگ دولت کی خاطر خود کو نقصان اور تباہی میں کیوں ڈالتے؟ تاہم دینی (روحانی) فوائد قابل ذکر ہیں۔

دولت کے مذہبی فوائد: یہ تین طرح کے ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ مال اپنے آپ پر خرچ کرنا ہو خواہ وہ عبادت کے لیے ہو یا حج جیسی عبادات میں مدد حاصل کرنے کے لیے کیونکہ یہ مال کے بغیر پورا نہیں ہو سکتا۔ یہ عبادات کے اصولوں میں سے ہے اور ایک غریب شخص یہ فضیلت حاصل کرنے سے قاصر ہے۔ عبادت میں مدد حاصل کرنا خوراک، کپڑے، رہائش گاہ اور نکاح پر خرچ کر کے کیا جاتا ہے کیونکہ یہ زندگی کی بنیادی ضروریات ہیں اور جب تک وہ پوری نہیں ہوتیں، دل ان میں مگن رہتا ہے اور راہ خدا (دین) سے متعلق معاملات سے آزاد نہیں ہوتا، اور یہ ایک اصول ہے کہ عبادت کی طاقت حاصل کرنے کے لیے درکار چیزیں بھی عبادت میں شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے دین کے لیے مدد حاصل کرنے کے لیے اپنی ضروریات کے مطابق دنیاوی وسائل حاصل کرنا بھی دنیا کے دینی فوائد میں سے ہے۔ تاہم، اس میں نمایاں کھپت، آسودگی، مادی لذتیں اور ایسی مقدار شامل نہیں ہے جو کسی کی حقیقی ضروریات سے باہر ہیں کیونکہ وہ دنیاوی (جسمانی) لذتوں میں شمار ہوتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ جو دولت دوسروں پر خرچ کی جاتی ہے وہ چار قسمیں ہوتی ہیں: صدقہ ، مہمان نوازی ، اپنی عزت کی حفاظت ، اور حاصل کردہ خدمات کی ادائیگی۔ جہاں تک صدقہ کا تعلق ہے تو اس کا الٰہی ثواب کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا نیک عمل ہے جو خدا کی ناراضگی کو مٹا دیتا ہے۔ پچھلے ابواب میں ، صدقہ کی فضیلت کا ذکر کیا گیا ہے۔ مہمان نوازی سے مراد دولت مندوں اور صالحوں کو دعوت دینے اور انہیں تحائف دینے پر خرچ کرنا ہے اور اسے صدقہ نہیں کہا جاتا کیونکہ صدقہ محتاجوں کو دیا جاتا ہے۔ مہمان نوازی کے ذریعے خرچ کرنا بھی مذہبی فوائد سے محروم نہیں ہے کیونکہ یہ دوست اور بھائی بنانے کا ذریعہ ہے۔ سخاوت کی صفت سے اپنے آپ کو آراستہ کر ، کوئی بھی سخی لوگوں میں شامل ہوجاتا ہے [کیونکہ سخاوت اور پرہیزگاری زبردست روحانی خوبیاں ہیں]۔ کوئی بھی شخص اس وقت تک فیاض کہلانے کا مستحق نہیں ہے جب تک کہ وہ لوگوں کے ساتھ عمدہ اور مہمان نوازی کا سلوک نہ کرے۔ یہ عمل عظیم الٰہی جزا کا ذریعہ بھی ہے۔

اپنی عزت کے تحفظ کے لیے خرچ کرنا بھی مذہبی فائدے سے خالی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر ، کسی شاعر کو کچھ دینا جو شاعری میں کسی کے بارے میں بری باتیں کرتا ہے یا محفلوں میں کسی کا مذاق اڑاتا ہے۔ اسی طرح عزت نفس اور عزت نفس سے محروم لوگوں کے منہ بند کرنے اور ان کی برائی سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے خرچ کرنا ہے۔ اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کے لیے خرچ کرنا بھی اللہ تعالیٰ کے مستحق ہے اس لحاظ سے کہ غیبت کرنے والا غیبت کے گناہ سے بچ جاتا ہے اور کسی کی گفتگو اور تحریر سے کوئی *فتنہ* پھیلایا جاتا ہے، مسلمان دشمنی کے جال میں پھنس جاتے ہیں اور جس کے خلاف غیبت کی جاتی ہے، انتقام کے جذبات سے مجبور ہونے پر اس طرح سے جواب نہیں دیتا جو خدائی قانون کی حدود کے خلاف ہے۔ دوسروں سے خدمات حاصل کرنے کا معاوضہ ادا کرنا بھی خدائی اجر سے محروم نہیں ہے کیونکہ انسان اپنی ضروریات کے لیے بے شمار چیزوں کے لیے دوسروں کا محتاج ہے۔ اگر کوئی شخص ان کو خود کرنا شروع کر دے تو بہت زیادہ وقت ضائع ہو جائے گا اور آخرت کی راہ پر چلنا مشکل ہو جائے گا اور یاد الٰہی کے لیے وقت نہیں بچے گا، حالانکہ روحانی مسافروں کے لیے اعلیٰ مقام یہی الٰہی یاد اور غور و فکر ہے۔ ظاہر ہے کہ جس کے پاس دولت نہیں ہے وہ اپنے تمام کام خود کرے گا۔ مثال کے طور پر، فصلیں (اناج) خریدنا، ان کو پیسنا، انہیں پکانا، گھر کی صفائی، یہاں تک کہ اپنی ضرورت کی کتابوں کی کاپیاں تیار کرنے کی حد تک جانا بھی ہے۔ وہ تمام کام جو دوسروں کے ذریعے انجام دیئے جاسکتے ہیں ، ان کو خود کرنے کی ضرورت ہوگی۔ یہ ایک بہت بڑا نقصان ہے۔ ایک امیر شخص اس سے محفوظ ہے۔ چاہے ایک امیر شخص جو سب کچھ خود کرنا شروع کر دے، وہ اعمال سے، علم، الٰہی یاد اور غور و فکر سے محروم رہے گا۔

تیسری بات یہ ہے کہ دولت خرچ کرنے کے مذہبی یا روحانی فوائد میں دولت مخصوص فرد پر نہیں بلکہ عام عوامی فائدے یا خدمت پر خرچ کرنا شامل ہے۔ مثال کے طور پر، مساجد (عبادت گاہیں)، پل، مسافروں کے لیے لاجز، میڈیکل کلینک، اسکول اور روحانی تعلیم کے مقامات (*مدارس*) کی تعمیر، عوامی امانت کے قیام کے لیے زمین اور جائیدادیں وقف کرنا۔ یہ وہ اخراجات ہیں جو مرنے کے بعد بھی فائدہ پہنچاتے ہیں۔ اللہ کے نیک اور نیک بندے ایسے لوگوں کے لیے طویل عرصے تک دعا کرتے ہیں اور اس سے بہتر نیک عمل کیا ہو سکتا ہے۔ دولت کے دینی فوائد

کے علاوہ ان کے بہت سے دنیاوی فوائد ہیں۔ مثال کے طور پر جس کے پاس یہ ہے وہ غربت کی ذلت اور محتاجی کے داغ سے بچ جاتا ہے۔ لوگ ایک کا احترام کرتے ہیں اور ایک کو اہمیت دیتے ہیں۔ اگر کوئی امیر شخص مہمان نوازی پر خرچ کرتا ہے تو اس سے دوستوں کا حلقہ بڑھ جاتا ہے، لوگ کسی کے ساتھ بھائی چارے قائم کرنے پر فخر محسوس کرتے ہیں اور ضرورت کے وقت اس کی مدد کرتے ہیں۔ دولت مند جو نیک اور راستباز ہیں، لوگ دل کی گہرائیوں سے ان کی عزت کرتے ہیں۔

دولت کے نقصانات: دولت کے نقصانات بھی دو طرح ہیں، دینی اور دنیاوی۔ مذہبی نقصانات کی تین قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ دولت اور مادی املاک انسانوں کو گناہ کی راہ پر ڈال دیتی ہیں کیونکہ ہوس دل پر مسلسل حملہ آور ہوتی ہے۔ مال کی بے دخلی اور عاجزی کے ذریعے انسان کو ہوس سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے کیونکہ جب کوئی شخص کسی گناہ کے ارتکاب سے مایوس ہو جاتا ہے تو اس کی ترغیب (اشتعال انگیزی) دل میں پیدا نہیں ہوتی۔ جب یہ احساس ہوتا ہے کہ اب کوئی گناہ کر سکتا ہے تو دل میں ایسا کرنے کی ترغیب پیدا ہوتی ہے۔ دولت کی موجودگی ایک ایسا محرک ہے جو کسی میں [گناہ کرنے ، انسانی اصولوں کی خلاف ورزیوں ، ظلم وغیرہ] کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔ اس خواہش پر عمل کرنے سے انسان تباہ ہو جائے گا اور اگر وہ صبر و تحمل سے کام لے تو اسے تکلیفیں برداشت ہوں گی کیونکہ برائی کرنے کی صلاحیت کی موجودگی میں صبر بہت مشکل ہے۔ دولت کا نقصان (*فتنہ*) غربت کے *نقصان سے زیادہ* ہے۔ دوسرا نقصان یہ ہے کہ دولت کی موجودگی جائز معاملات میں فضول خرچی اور فضول خرچی کا باعث بن سکتی ہے اور یہ دولت کے ناجائز استعمال کی پہلی درجہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک امیر شخص جو کی روٹی نہیں کھا سکتا، موٹے کپڑے پہن سکتا اور تمام لذیذ کھانوں کو ترک نہیں کر سکتا جیسا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنی سلطنت کی وسعت، سلطنت اور زمین کے خزانوں پر تسلط کے باوجود کیا تھا۔ لیکن ہر کوئی ایسا نہیں کر سکتا اور جس شخص کو دولت کی وجہ سے کشادگی حاصل ہو وہ یقینا فضول خرچی اور فضول خرچی اختیار کرے گا، یعنی اچھا کھائے گا، اچھے کپڑے پہنے گا اور نفس کو اس کا عادی بنا دے گا۔ جب کسی کو عیش و عشرت، اسراف اور فضول خرچی میں خوشی ملتی ہے تو اس سے باز آنا ناممکن ہو گا۔ اس کے بجائے یہ عادت اس حد تک بڑھ جائے گی کہ اگر کسی کی فضول خرچی اور فضول خرچی کو حلال ذرائع سے پورا نہ کیا جائے تو وہ ممنوعہ (ناجائز یا *حرام*) ذرائع استعمال کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ ضد ، جھوٹ ، منافقت اور دیگر برے اخلاق اور عادات کو دل میں جگہ بنانے کی اجازت دے گا ، تاکہ کسی کی اپنی دنیا کی تنظیم (ترتیب اور چلانا) اس کی مرضی کے مطابق رہے اور اس کی آسائش ، فضول خرچی اور فضول خرچی میں کوئی کمی نہ آئے۔ جس کے پاس زیادہ مال ہے، وہ لوگوں کی زیادہ محتاج ہے اور کام کرنے کے لیے منافقانہ طریقے استعمال کرتا ہے، اور ان کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے خدا کی نافرمانی سے بھی باز نہیں آتا۔ تخلیقات کی ضرورت اور ان پر انحصار دوستی اور دشمنی دونوں کو جنم دیتا ہے جس کے نتیجے میں حسد، بغض ، دکھاو، تکبر، جھوٹ بولنا، داستان، غیبت اور اس طرح کے تمام گناہوں کو پھلنے پھولنے کا موقع ملتا ہے جو دل اور زبان کے لیے مخصوص ہیں۔ اس بات کا بھی امکان موجود ہے کہ یہ گناہ دل اور زبان سے بالاتر ہو کر دوسرے [جسمانی] اعضاء میں منتقل ہو جائیں گے۔ یہ سب دولت اور مادی جائیدادوں کی بری پیش گوئی ہیں۔

تیسرا نقصان اور اس سے کوئی دولت مند اس سے محروم نہیں ہوتا، یہ کہ مال جمع کرنے اور اس کی حفاظت کرنے میں مشغول ہونے کے بعد انسان یاد الٰہی سے غافل ہو جاتا ہے اور اس کا سبب بننے والی کوئی چیز ایسی نقصان ہے جس کی تلافی نہیں کی جا سکتی۔ یاد الٰہی کی غفلت ایک لاعلاج اور مہلک بیماری ہے کیونکہ تمام عبادات کا بنیادی مقصد اس کے وجود اور صفات میں الہی ذکر اور غور و فکر ہے، جس کے نتیجے میں آزاد دل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر کسی کے پاس [زرعی] زمین ہے، تو وہ کھیتی سے متعلق کاموں میں دن رات مصروف رہتا ہے – کبھی حساب کتاب کرنے میں، کبھی شریک شراکت داروں سے جھگڑا کرنے میں، کبھی پانی [کھیت کی فراہمی] اور حدود کو لے کر اختلافات ہوتے ہیں، کبھی ٹیکس وصولی کے لیے مقرر اہلکاروں سے جھگڑا ہوتا ہے۔

کبھی کبھی کوئی بلڈروں اور مزدوروں سے متعلق مسائل سے نمٹتا ہے۔ ایک تاجر کو اس دکھ سے پریشان ہوتا ہے کہ کسی کا کاروباری شراکت دار نصف منافع کا حقدار ہے لیکن کام کرنے میں برابر حصہ نہیں لیتا۔ بعض اوقات کسی کو یہ الزام لگاتے ہوئے دیکھا جاتا ہے کہ کسی کا ساتھی چوری اور بے ایمانی میں ملوث ہے۔ مویشیوں کے مالکان کی بھی یہی حالت ہے۔ بلکہ ہر قسم کے مال و مال کے مالک تقریبا ایک ہی حالت میں ہیں کہ وہ خدا کے ذکر کے

بجائے اپنے مال میں مصروف ہیں اور ان کی افزائش اور حفاظت کے لیے پریشان اور پریشان ہیں۔ چنانچہ الٰہی کی یاد و غور و فکر میں توجہ نہیں ہوتی، بلکہ ہر لمحہ انسان ان کی حفاظت کے بارے میں فکر و فکر میں مبتلا رہتا ہے۔ دنیاوی پریشانیاں اور مصروفیات بے شمار ہیں اور ان کی کوئی حد نہیں ہے۔ جس کے پاس ایک دن کا کھانا ہے ، وہ ان تمام پریشانیوں سے محفوظ ہے اور ان تمام مصروفیات سے محفوظ ہے۔ یہ دولت کے مذہبی نقصانات ہیں۔ اس میں یہ بھی شامل کیا جا سکتا ہے کہ دولت مند دولت کے حصول کے لیے سب کچھ کرتے ہیں۔ ایک بار جب دولت حاصل ہوجاتی ہے تو ، وہ ان کی حفاظت کے لئے اپنے وجود کی بنیاد پر پریشان ہوجاتے ہیں۔ حسد کرنے والوں کے حسد سے خود کو بچانا اس کے اوپر ہے۔ ہر وقت یہ خدشہ رہتا ہے کہ اتنی محنت اور اتنی محنت سے حاصل کی گئی دولت برباد نہ ہو جائے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دولت ایک زہر ہے۔ یہ صرف اس صورت میں تریاق ہے جب اسے رزق کا ذریعہ سمجھا جائے اور کسی بھی اضافی مال کو خدا کی راہ میں صدقہ کے طور پر خرچ کیا جائے۔

لالچ کا علاج اور قناعت کو فروغ دینے کے لیے دوا

یہ دوا تین اجزاء پر مشتمل ہے: صبر، علم اور اعمال [صحیح علم کے مطابق]. وہ مل کر پانچ معاملات کو جنم دیتے ہیں: پہلا، اعمال؛ واضح طور پر یہ کہ معاشی معاملات میں اعتدال پسندی اور [غیر ضروری] اخراجات میں کمی شامل ہیں۔ جو شخص قناعت کی عزت کا خواہاں ہے وہ اپنے نفس پر خرچ کرنے کے دروازے بند کرنے کی کوشش کرے اور صرف اپنی ضروریات پر خرچ کرے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس کے اخراجات کا دائرہ بڑھتا رہتا ہے، وہ اطمینان حاصل کرنے کے قابل نہیں ہے۔ اگر کوئی فرد تنہا ہے (اکیلے زندگی گزار رہا ہے) تو اسے موٹے کپڑوں اور تھوڑے سے کھانے سے مطمئن ہونا چاہیے۔ اگر ممکن ہو تو، کسی کو اپنی غذا سے سالن کو ختم کرنا چاہیے اور اس کے بغیر [صرف روٹی کے ساتھ] کھانا کھانے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ اگر کسی کا خاندان ہو تو گھر کے تمام افراد کو عام کپڑے اور کھانا کھانے پر آمادہ کرنا چاہیے اور انہیں اپنے رنگ میں رنگنے کی کوشش کرنی چاہیے کیونکہ ہر چیز کی تھوڑی سی مقدار تھوڑی سی محنت سے حاصل کی جا سکتی ہے، کیونکہ اس طرح اس کی ضروریات کم ہو گئی ہیں اور اس کے نتیجے میں زندگی اعتدال کے ساتھ گزرے گی۔ یہ اطمینان کی حقیقت ہے۔ اخراجات میں نرمی کا ہونا ، ایک ہی چیز سے مراد ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان اللہ یحب الرفق فی الامر کلہ

"بیشک اللہ تعالیٰ ہر معاملے میں نرمی اور رحم کو پسند کرتا ہے۔" (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر صحیح بخاری *اور* صحیح مسلم کے مجموعے میں حدیث کا مجموعہ ہے

ما عال من اقتصد

"ایک اعتدال پسند شخص (جو زندگی کے ہر معاملے میں اعتدال پسندی پر عمل کرتا ہے اور ہر قسم کی انتہا پسندی اور انتہا پسندی سے گریز کرتا ہے) کبھی غریب نہیں ہوتا (یعنی ایسا فرد خوشحال ہوتا ہے اور کبھی مایوس نہیں ہوتا)۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حضرت *عبداللہ بن مسعود* رضی اللہ عنہ سے حدیث *کا* مجموعہ احمد *اور* طبرانی

ثلاث منجیات خشی اللہ فی السر والعلانیة والقصد فی الغنی والفقر
والعدل فی الرضا والغضب

"فطرت میں تین چیزیں نجات بخش ہیں: پرہیزگاری ، خدا سے تعظیم اور خوف (*تقویٰ*) نجی اور عوامی [زندگیوں میں] ، اعتدال پسندی چاہے وہ دولت میں ہو یا غربت میں ، اور عدل و انصاف چاہے وہ خوشی یا غصے میں ہو۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *انس بن مالک* رضی اللہ عنہ سے احادیث *میں* بزاز ، طبرانی *اور* ابو نعیم شامل ہیں۔

الاقتصاد و حسن السمت والهدى الصالح جزء من بضع وعشرين جزءا من النبوة

"اعتدال پسندی، جسمانی ساخت کی خوبصورتی اور صداقت [اجتماعی طور پر] نبوت کے بیس سے زیادہ اجزاء (حصوں) میں سے ایک جزو ہے"۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *احادیث* کا مجموعہ *ابو داؤد* حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے

دوسری بات یہ ہے کہ اگر فی الحال کسی کے پاس کم سے کم ضروریات کے لیے کافی ہے تو اسے مستقبل کے بارے میں زیادہ پریشان اور پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ اگر کوئی شخص اپنی امیدوں اور خواہشات کو مختصر کر کے اس یقین کو [دل میں] پختہ کر دے کہ اس کے لیے جو رزق مقدر ہے وہ لازمی طور پر ملے گا، چاہے وہ لالچ ہو یا نہ ہو، وہ مستقبل کے بارے میں فکر مند نہیں ہوگا۔ کسی کو لالچ یا امید کے ذریعے رزق نہیں ملتا۔ مومن کو چاہیے کہ وہ اپنے خالق تعالیٰ کے وعدے پر ایمان رکھے۔ الٰہی حکم یہ ہے:

وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي ٱلْأَرْضِ إِلَّا عَلَى ٱللَّهِ رِزْقُهَا

"زمین پر ایک بھی جاندار ایسا نہیں ہے جس کی رزق اللہ کی ذمہ داری نہ ہو۔" (سورۃ البقرۃ القرآن، باب 11، آیت 6)

لالچ شیطان کی بری سرگرمیوں کا نتیجہ ہے۔ وہ انسانوں کو غربت اور فاقہ کشی سے ڈراتا ہے اور انہیں غلط اور برے کاموں کی ترغیب دیتا ہے (*منکیرت*) [یا الٰہی احکام کی خلاف ورزیاں، جو غلط اور برے کاموں کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں جو انسانی شائستگی، شائستگی، انصاف اور انصاف کے اصولوں کے خلاف ہیں]۔ شیطان ایک سے کہتا ہے: "اگر تم مال جمع نہ کرو گے اور چیزیں جمع نہ کرو گے تو مستقبل میں تمہیں پریشانی ہو جائے گی، تم بیمار ہو جاؤ گے اور عاجز ہو سکتے ہو۔ اس صورت میں آپ کو لوگوں سے پوچھنے کی ذلت کا سامنا کرنا پڑے گا ، اور آپ کو ایک دروازے سے دوسرے دروازے تک بھیک مانگنے کے پیالے کے ساتھ گھومنا پڑے گا۔ اس طرح مستقبل میں [خاص طور پر بڑھاپے اور ضرورت کے وقت] مصیبت کا خوف انسان کو ساری زندگی دولت کے حصول کی مشقت برداشت کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ شیطان اس کشمکش میں مصروف ایسے شخص کو دیکھتا ہے اور ایک کہنے پر ہنستا ہے: "یہ احمق مستقبل کے خوف کی وجہ سے اپنے آپ کو بہت مشکل میں ڈال رہا ہے اور اس کے نتیجے میں اللہ کی یاد سے غافل ہے۔ کسی کو کیا پتہ چلے گا کہ وہ خدشات [اپنے مستقبل کے بارے میں] بھی ہوں گے؟"

انسان کے دل میں لالچ کو خدا کے منصوبے میں مکمل یقین کے ساتھ ختم کیا جا سکتا ہے۔ اگر کسی بندے کو یہ یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ نے رزق کی تقسیم میں جو تقدیر بنائی ہے اور جو منصوبہ بنایا ہے وہ سچا ہے اور اگر کوئی اپنی رزق کے حصول کے لیے جدوجہد کرے گا تو یقینا اسے وہی ملے گا جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے مقرر کیا ہے۔ اس تفہیم کے ساتھ ، کوئی وجہ نہیں ہے کہ لالچ کی برائی دل سے باہر نہ جائے۔ اس کے بجائے، ایک خادم کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے، کہ خدا ایک ایسی جگہ سے رزق فراہم کرتا ہے جس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

وَمَن يَتَّقِ ٱللَّهَ يَجْعَل لَّهُۥ مَخْرَجًا ﴿٢﴾ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ

"جو شخص خدا سے خوفزدگی، تقدس اور خوف رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ ایسے شخص کے لیے ایسے ذرائع سے نکلنے کا راستہ اور رزق فراہم کرتا ہے جس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ (سورة البقرة باب 65، آیت 2 تا 3)

ابو حازم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں دنیا کو دو چیزوں سے بنا سمجھتا ہوں: ایک وہ چیز جو میرے لیے ہے اور یہ ایسی چیز ہے جسے میں اپنے وقت سے پہلے حاصل نہیں کر سکتا، حالانکہ میں اس کے حصول کے لیے آسمانوں اور زمین کی تمام تر طاقت لگا سکتا ہوں۔ دوسرا کسی اور کے لئے ہے اور یہ ایسی چیز ہے جو مجھے ماضی میں نہ تو ملی ہے اور نہ ہی میں مستقبل میں اسے حاصل کرنے کی توقع کرتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو ہستی (یعنی خدا) میری چیز کو دوسروں تک پہنچنے سے بچاتا ہے وہی ہستی ہے جو کسی اور کی چیز کو مجھ تک پہنچنے سے روکتی ہے۔ پھر ان دو قسم کی چیزوں کے لئے اپنی جان دینے کا کیا فائدہ؟" یہ شیطان کے ان اشاروں کا علاج ہے جو وہ انسانوں کے دلوں میں غربت اور مفلسی کے بارے میں اکساتا ہے اور انہیں بیماری اور تنگدستی سے ڈراتا ہے۔ یہ [بیماری اور اس کا علاج] جاننے کی دوا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ قناعت کا یہ شرف حاصل ہے کہ کسی سے کسی کی ضرورت نہیں ہے اور لالچ میں مانگنے یا بھیک مانگنے کی ذلت ہے۔ اگر کوئی شخص اس عزت اور ذلت کا صحیح ادراک حاصل کر لے تو نفس کے لیے قناعت کی طرف مائل نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں رہے گی۔ اس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ زیادہ سے زیادہ کی خواہش میں سختی اور ذلت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس مصیبت سے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی واقف نہیں ہے۔ دوسری طرف لالچ انسانی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہتا کیونکہ ہر کوئی سمجھتا ہے کہ ایک شخص لالچی ہے۔ اس ذلت میں جو چیز اضافہ کرتی ہے وہ آخرت کی عذاب ہے جسے برداشت کرنا ضروری ہے، عزت نفس الگ سے ختم ہو جاتی ہے، اور اب حق کی پیروی کرنے کی صلاحیت نہیں رہتی۔ جس شخص کو زیادہ لالچ ہے وہ لوگوں کا زیادہ محتاج ہوتا ہے اور اس ضرورت کی وجہ سے نہ تو اسے حق کی طرف دعوت دے سکتا ہے اور نہ ہی غلطیوں پر ان کی سرزنش کر سکتا ہے، غلامی اس کا مزاج بن جاتی ہے، عیب اب عیب نہیں ہے، اگر کوئی عیب کو عیب سمجھتا ہے تو اسے کہنے کی ہمت نہیں کرتا۔ انسان کا ایمان بے وجہ تباہ ہو جاتا ہے اور آخرت بھی برباد ہو جاتی ہے۔ جو شخص معدے کی ہوس پر عزت نفس کو ترجیح نہیں دیتا وہ بہت احمق اور ایمان میں کمزور ہوتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

عز المؤمن استغناءه عن الناس

"مومن کی عظمت لوگوں کی طرف سے *استغنا* میں ہے (یعنی کسی سے نظر نہ رکھنا یا کسی سے کچھ نہ مانگنا، لوگوں کے پاس جو کچھ ہے اس سے غافل رہنا، اور اپنی تمام امیدوں اور خواہشات کو اپنی تمام ضروریات کے لیے صرف خدا پر رکھنا، اور ان کو باوقار اور عزت نفس کے ساتھ پورا کرنے کے لیے انسانی طور پر ہر ممکن کوشش کرنا)۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *سہل بن سعد* رضی اللہ عنہ سے حدیث *طبرانی* اور حکیم کو جمع کرتی ہے

قناعت میں آزادی اور عزت نفس ہوتی ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اگر آپ کسی سے غافل رہیں گے تو آپ ایک کے برابر ہو جائیں گے۔ اور اگر تمہیں کسی کی ضرورت ہو جائے تو تم اس کے قیدی بن جاؤ گے۔ اور اگر آپ کسی پر احسان کرتے ہیں تو ، آپ کسی کے رہنما اور رہنما بن جائیں گے۔

چوتھی بات یہ کہ اس حقیقت پر غور کرنا چاہیے کہ کتنے بے وقوف، جاہل اور بے دین لوگ دولت مند ہیں۔ دوسری طرف انبیاء، صادق اور ہدایت یافتہ خلفاء، صحابہ کرام اور ان کے قریبی پیروکاروں کی زندگی سادہ تھی۔ ان دونوں گروہوں کا موازنہ کیا جائے، ان کے واقعات سنیں، ان کی زندگیوں کا مطالعہ کیا جائے پھر عقل کو یہ انتخاب کرنا چاہیے کہ وہ کس گروہ کی تقلید کرنا چاہتا ہے اور کس سے مشابہت رکھنا چاہتا ہے، (دنیا کے) گندے یا انبیاء اور پرہیزگار۔ امید کی جاتی ہے کہ کمی پر صبر کرنے سے اطمینان آسان ہو جائے گا۔ ایک مومن کو چاہیے کہ وہ یہ سوچے کہ کھانے پینے میں فضول خرچی اختیار کرنا قابل تعریف نہیں ہے جس طرح گدھا انسان سے زیادہ کھاتا ہے۔ جماع میں کثرت بھی قابل تعریف نہیں ہے کیونکہ سور انسان سے کہیں زیادہ کرتا ہے۔ لباس اور سواری میں آرائش کو اپنانا بھی قابل تعریف نہیں ہے کیونکہ ایسے بہت سے غیر مذہبی لوگوں میں ہیں جو اچھے لباس پہنتے ہیں اور

سواری کرتے ہیں۔ اگر کوئی کم سے مطمئن ہو اور کم سے مطمئن ہو تو یہ بلاشبہ قابل تعریف ہے کیونکہ کم سے مطمئن ہونا اور کم سے امن رکھنا انبیاء اور اولیاء کرام کی پہچان ہے۔

پانچویں بات یہ ہے کہ دولت اور جائیدادیں جمع کرنے کے خطرات پر غور کرنا چاہیے جیسا کہ دولت اور مادی املاک کے نقصانات کے باب میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے اوپری حصے میں ، اس میں چوری اور نقصان کا خطرہ ہے۔ جب کسی کے پاس مال و مال ہو تو دل میں اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ ضائع ہو جائے اور جب وہ خالی ہاتھ ہو تو دل کو کسی قسم کا غم نہیں ہوتا۔ یہ بھی سوچنا چاہیے کہ مجھے پانچ سو سال تک جنت میں داخل ہونے سے روکا جائے گا اور اگر میں مال کی حدود سے تجاوز کر لوں گا تو میں امیر طبقے میں شمار ہو جاؤں گا اور فقرہ کی فہرست سے خارج ہو جاؤں گا) اور مسکین امیر لوگوں سے پانچ سو برس پہلے جنت میں داخل ہوں گے (جیسا کہ وہ اپنی مفلسی اور کمی اور مصیبت میں ایمان اور صداقت کے ساتھ صبر کرتے رہے]۔ انسان کو چاہیے کہ وہ ہمیشہ اپنے کمتر کو [مادی مال، دولت، معاشرتی حیثیت اور طاقت کے لحاظ سے دیکھے، اور اس کے نتیجے میں خدا کی نعمتوں کی قدر کرے اور ان کو اخلاقی صداقت کے ساتھ دانشمندی سے استعمال کرے، بجائے اس کے کہ کافی نہ ہونے کی شکایت کی جائے] اور اپنے آپ سے برتر کسی شخص کی طرف نہ دیکھنا چاہیے [جس معیار کا ابھی ذکر کیا گیا ہے]۔ شیطان اپنے برتر کو [دنیاوی شان و شوکت ، چمک ، دولت ، طاقت ، شہرت اور وقار کے لحاظ سے] ایک اعلیٰ نمونہ کے طور پر پیش کرتا ہے [اس کی پیروی کرنے اور اس کی تقلید کرنے کے لئے ، اور اس وجہ سے ، انہیں حسد ، نفرت ، دشمنی اور مادی چوہوں کی دوڑ کے شیطانی چکر میں پھنسا دیتا ہے] اور کہتا ہے (دلوں میں اشارہ کرتا ہے): "تم اتنے سست کیوں ہو؟ امیروں کو دیکھیں کہ وہ زندگی سے کس طرح لطف اندوز ہوتے ہیں! وہ لذیذ اور لذیذ کھانا کھاتے ہیں اور اچھے کپڑے پہنتے ہیں۔ دین کے معاملے میں شیطان معمولی بات کو ایک نمونہ کے طور پر پیش کرتا ہے اور کہتا ہے: "تم اپنے آپ کو پابندیوں اور مصیبتوں میں کیوں ڈالتے ہو؟ فلاں دیکھو کہ تم سے زیادہ علم رکھنے کے باوجود خدا سے نہ ڈرو اور تم ہمیشہ خدا کے خوف سے کانپتے رہو۔ تمام لوگ عیش و عشرت میں ہیں (اچھی زندگی سے لطف اندوز ہو رہے ہیں) ، آپ ان سے مختلف کیوں ہیں؟

یہ وہ پانچ معاملات ہیں جو قناعت کی صفت (دل کی صفت اور باطنی طبیعت) کو پیدا کرنے میں مدد دے سکتے ہیں۔ ان میں بنیادی اہمیت صبر اور امیدوں کو کم کرنے کی ہے۔ صبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ یقین ہونا چاہیے کہ اس دنیا کی زندگی میں جو چند دنوں کے قابل ہے، ابدی زندگی کی ابدی خوشی اور لامتناہی فتح حاصل کرنے کے لیے صبر سے کام لینا ہی مقصد ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک بیمار صحت اور جسمانی تندرستی حاصل کرنے کے لئے دوائیوں کی تلخی پر صبر کرتا ہے۔

سخاوت کی فضیلت: اگر کسی کے پاس مال و دولت اور مال نہیں ہے تو اسے مطمئن رہنا چاہیے اور لالچ سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اگر کسی کے پاس دولت ہے تو اسے پرہیزگاری (اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دینا) اور سخی ہونا چاہیے، دوسروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہیے اور بخل سے دور رہنا چاہیے۔ سخاوت انبیاء علیہم السلام کی صفات سے ایک خصوصیت ہے اور نجات کی بنیادوں میں سے ایک ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تعبیر ان الفاظ میں کی ہے:

السخاء شجرة من شجر الجنة اغصانها متدليته الى الارض' فمن اخذ بغصن منها قادهذلك الغصن الى الجنة

"سخاوت جنت کے درختوں میں سے ایک درخت ہے۔ اس کی شاخیں زمین تک لٹکی ہوئی ہیں۔ جو ان شاخوں میں سے کسی ایک شاخ کو پکڑتا ہے، وہ شاخ جنت میں کھینچتی ہے"۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا* پر ابن حبان *رضی اللہ عنہ اور* ابن عدی *اور* دارقطنی *رضی اللہ عنہ سے احادیث* کا مجموعہ ہے

قال جبرئیل علیہ السلام قال اللّٰہ تعالیٰ: ان ھذا دین ارتضیتہ لنفسی ولن یصلحہ الا السخاء وحسن الخلق فاکرموہ بھما ما استطعتم

جبرائیل علیہ السلام نے کہا کہ خدا نے فرمایا: یہ وہ راستہ ہے جو میں نے اپنے لیے منتخب کیا ہے۔ یہ صرف سخاوت اور خوبصورت اخلاق، آداب، کردار اور باطنی مزاج کے ذریعے ہی قائم رہ سکتا ہے۔ جہاں تک ممکن ہو سکے *ان دونوں* (اعلیٰ باطنی صفات) کے ذریعے [خدا یا دین] کے راستے کی تعظیم کرو۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *حدیث* کا مجموعہ *دارقطانی فی مستجد* جابر رضی اللہ عنہ

ماجبل اللّٰہ تعالیٰ ولیا لہ الا علی حسن الخلق والسخاء

"اللہ تعالیٰ نے اپنے دوستوں اور عزیزوں (*اولیاء*) کو خوبصورت اخلاق، آداب، کردار اور باطنی مزاج (*حسن الخلق*) اور سخاوت کی بنیاد پر پیدا کیا ہے"۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حضرت *عائشہ* رضی اللہ عنہا پر احادیث *کا* مجموعہ دارقطانی فی المستجد

خلقان یحبھما اللّٰہ عزوجل وخلقان یبغضھما اللّٰہ عزوجل، فاما اللذان یحبھما اللّٰہ تعالیٰ فحسن الخلق والسخاء واما اللذان یبغضھما اللّٰہ فسوء الخلق والبخل واذا اراد اللّٰہ بعبد خیر استعملہ فی قضاء حوائج الناس

"دو عادتیں ایسی ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں پسند کرتا ہے اور دو عادتیں ایسی ہیں کہ خدا ان کو ناپسند کرتا ہے۔ یہ خوبصورت اخلاق، آداب، کردار اور باطنی مزاج اور سخاوت ہیں اور جن کو وہ ناپسند کرتا ہے وہ بد اخلاق، آداب، کردار اور باطنی مزاج اور کنجوسی ہیں۔ جب خدا کسی بندے کے لیے بھلائی چاہتا ہے تو وہ اپنے بندے کے ذریعے لوگوں کی ضروریات پوری کرتا ہے۔ (بیان کردہ*احادیث* کا مجموعہ *ابو منصور الدیلمی* حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نبی روایت میں فرمایا: میری امت کے *ابدال* (اولیاء و غنوسٹکوں کا ایک اعلیٰ طبقہ) اپنی نماز اور روزے کی وجہ سے جنت میں داخل نہیں ہوگا بلکہ وہ اپنے دلوں کی پاکیزگی کی وجہ سے جنت میں داخل ہوں گے۔ دلوں میں نفرت، غصہ، حسد، دشمنی وغیرہ جیسے احساسات، مزاج اور جھکاؤ اور مسلمانوں کے تئیں اخلاص۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے انس رضی اللہ *عنہ سے حدیث* کا مجموعہ *دارقطانی فی مستجد*

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اپنے *بندوں کے لیے احسان کی بہت سی شکلیں بنائی* ہیں (*احسان* محض نیکی نہیں ہے بلکہ یہ اپنے بندوں کے لیے افکار، احساس، قول و فعل میں فضیلت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے)۔ پہلی بات یہ ہے کہ وہ *احسان سے محبت کرتے* ہیں۔ دوسری بات یہ کہ احسان کرنے والوں کی محبت اس کی مخلوقات کے دلوں میں ڈال دی گئی ہے۔ تیسری بات یہ کہ اللہ تعالیٰ نے احسان کے متلاشیوں کو احسان کے *مالکان کی طرف* ہدایت کی ہے۔ چوتھی بات یہ کہ اللہ نے احسان کرنے *والوں* (یعنی *محسنین* یا وہ لوگ جو خیالات، احساسات، قول و فعل میں کمال کے حامل ہیں) کے لیے دنیا [اور دنیاوی زندگی] کو اس قدر آسان بنا دیا ہے جو انتہائی خلوص کے ساتھ دوسروں کے ساتھ بھلائی کرنے کے لیے نکل جاتے ہیں اور اس کے بدلے میں شکر گزاری کی توقع بھی نہیں کرتے) جیسا کہ یہ ایک خشک اور بنجر زمین پر بادل برساتے ہیں۔ جو زمین اور اس کے باشندوں کو زندگی بخشتا ہے۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث کا مجموعہ *درقطانی فی مستجد*)

کنجوسی کی مذمت

الله تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِۦ فَأُو۟لَـٰٓئِكَ هُمُ ٱلْمُفْلِحُونَ

"جو شخص اپنی نفس کی بخیل سے نجات پایا ہے وہی نجات پائے گا." (سورة البقرة باب ۵۹، آیت ۹)

وَلَا يَحْسَبَنَّ ٱلَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَآ ءَاتَىٰهُمُ ٱللَّهُ مِن فَضْلِهِۦ هُوَ خَيْرًا لَّهُم ۖ
بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۖ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا۟ بِهِۦ يَوْمَ ٱلْقِيَـٰمَةِ ۗ

"اور جو لوگ الله نے اپنے فضل و کرم سے جو چیز انہیں دی ہے اس میں بخل کرتے ہیں وہ یہ نہ سوچیں کہ اس سے ان کے لیے کوئی فائدہ ہو گا بلکہ یہ ان کے لیے بہت برا ہوگا۔ قیامت کے دن انہیں ان چیزوں سے بنے ہوئے زنجیروں میں باندھ دیا جائے گا جن سے وہ بخل کرتے تھے۔ (سورة البقرة سورة البقرة آیت 180)

نبی کریم صلی الله علیہ وسلم نے فرمایا:

ایاکم والشح فانه اهلک من کان قبلکم حملهم علی ان یسفکوا دماء هم ویستحلوا محارمهم

"اپنے آپ کو بخل سے بچاؤ کیونکہ اس نے تم سے پہلے لوگوں کو تباہ کر دیا ہے کیونکہ اس نے انہیں خون خرابہ کرنے پر مجبور کیا ہے اور الله تعالیٰ نے جو کچھ حرام کیا ہے (جیسے چوری ، ڈکیتی ، لوٹ مار ، دھوکہ دہی ، دھوکہ دہی ، غصب ، ناانصافی ، امتیازی سلوک اور ظلم کے ذریعے لوگوں کے مال اور ان کے جائز حقوق کو ناجائز طور پر چھین لینا]۔ (بیان کردہحدیث میں عبدالله بن عمر *رضی الله عنہ* سے *صحیح مسلم* اور *ابو داؤد اور نسائی* رضی الله عنہ سے جمع کیا گیا ہے۔

لا یدخل الجنة بخیل ولا خب ولا خائن ولا سیئ الملکة

"کوئی کنجوس، کوئی مکار اور کوئی بداخلاق (بداخلاق) جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ (بیان کردہ*حادیث* کا مجموعہ *مسند احمد* ابوبکر رضی الله عنہ پر

ثلاث مهلكات شح مطاع وهوى متبع واعجاب المرء بنفسه

"تین چیزیں مہلک اور تباہ کن ہیں: کنجوسی جس کی پیروی کی جاتی ہے، نچلے درجے کی نفس (*نفس*) کی خواہش جس کی اطاعت کی جاتی ہے، اور خود غرور (خود کو بڑھا چڑھا کر اپنے بارے میں بہت زیادہ سوچنا اور ہمیشہ صحیح ہونے کے تصور)".

اياكم والظلم، فان الظلم ظلمات يوم القيامة، واياكم والفحش فان الله لا يحب الفاحش ولا المتفحش واياكم والشح فانما اهلك من كان قبلكم الشح، امرهم بالكذب فكذبوا، وامرهم بالظلم فظلموا، وامرهم بالقطيعة فقطعوا

"ظلم و ستم سے اپنے آپ کو محفوظ رکھو کیونکہ ظلم و ستم قیامت کے دن خود کو تاریکی میں بدل دے گا اور فحاشی اور بے حیائی سے پرہیز کرو کیونکہ خدا نہ فحاشی کو پسند کرتا ہے اور نہ ہی فحاشی کو پسند کرتا ہے اور بخل سے دور رہو کیونکہ یہ وہی چیز ہے جس نے تم سے پہلے لوگوں کو تباہ کر دیا ہے۔ اس نے لوگوں کو جھوٹ بولنے کا حکم دیا اور انہوں نے جھوٹ بولا، اس نے ان پر ظلم کرنے کا حکم دیا اور انہوں نے ظلم کیا، ان کو رشتہ توڑنے کا حکم دیا اور انہوں نے رشتہ توڑ دیا۔ (بیان کردہحدیث کا مجموعہ حکیم عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے

ایک روایت کے مطابق ایک وفد کے ارکان نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ ان کا سردار جد بن قیس ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آپ انہیں اپنی قیادت کے لیے کس بنیاد پر موزوں سمجھتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ وہ ہم میں سب سے امیر ہے لیکن وہ بخل کے الزام سے دور نہیں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ بہت بڑی بیماری ہے، کنجوسی سے بڑھ کر اور کون سی بیماری ہو سکتی ہے؟ وہ آپ کا قائد بننے کے اہل نہیں ہیں۔"
انہوں نے پوچھا: پھر ہم کس کو اپنا رہنما منتخب کریں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارا سردار بشار بن براء ہے۔ [اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی قبیلے کے قبیلے کے سردار کو ان کی بخل کی وجہ سے تبدیل کیا اور ان کی جگہ ایک ایسے شخص کو مقرر کیا جو سخی تھا، کیونکہ ایک کنجوس شخص کسی قائدانہ کردار کے قابل نہیں ہے۔] (بیان کردہابو *ہریرہ رضی اللہ عنہ* سے حدیث *کا* مجموعہ حکیم

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

خصلتان لا يجتمعان في مؤمن البخل وسوء الخلق

"ایک مومن میں دو خصلتیں جمع نہیں ہوتیں، بخل اور بد اخلاق، آداب، کردار کی خصوصیات اور باطنی طبیعت".
(بیان *کردہ ابو سعید رضی* اللہ عنہ پر احادیث *کا مجموعہ* ترمذی

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کنجوس عدل و انصاف نہیں کر سکتا کیونکہ ایسا شخص اپنے جائز حصے اور حق سے زیادہ لے گا یا اپنے حق سے زیادہ لینے کی کوشش کرے گا اس خوف سے کہ نقصان ہو سکتا ہے۔ جو اس حالت میں ہے اس پر ایماندار ہونے پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت یحییٰ بن زکریا (یوحنا بن زکریا - ان دونوں پر اللہ کی برکتیں) نے شیطان کو اس کی اصل شکل میں دیکھا۔ اس نے پوچھا: تم لوگوں میں کس کو سب سے زیادہ پسند کرتے ہو اور کس سے نفرت کرتے ہو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں ایک بخل مومن کو سب سے زیادہ پسند کرتا ہوں اور گنہگار کو سب سے زیادہ ناپسند کرتا ہوں لیکن سخی شخص کو سب سے زیادہ پسند کرتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے اس کی وجہ پوچھی جس پر آپ نے فرمایا: بخل مجھے اپنی بخل کی وجہ سے گمراہ کرنے کی تکلیف سے بچا لیتا ہے اور میں ایک گنہگار لیکن سخی شخص سے ڈرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کی سخاوت قبول فرمائے اور ایسے شخص کو ہدایت کی راہ پر گامزن فرمائے۔ الٰہی کی فیاضی اور ایسے شخص کے لیے احسان سے راستبازی اور اصلاح []". پھر شیطان چلا گیا اور کہتا ہے کہ اگر یوحنا کے سوا کسی اور نے مجھ سے یہ سوال پوچھا ہوتا تو میں اس کا جواب نہ دیتا۔

پرہیزگاری کی حقیقت اور اس کی فضیلت

سخاوت اور کنجوسی کی بہت سی سطحیں ہیں۔ اس میں ، پرہیزگاری کی ایک بہت اعلی ڈگری ہے۔ پرہیزگاری کا مطلب یہ ہے کہ اپنی ضرورت کے باوجود اپنا مال اور مال کسی اور کو دے دیا جائے اور سخاوت یہ ہے کہ اپنے مال و مال سے کسی ایسے شخص کو تحفہ دیا جائے چاہے وہ محتاج ہو یا نہ ہو۔ اپنی ضرورت کے باوجود [صدقہ یا دوسروں کی مدد کرنا] ایک مشکل مرحلہ ہے اور بہت کم لوگ اس مرحلے سے کامیابی سے گزرتے ہیں۔ جس طرح سب سے زیادہ سخاوت اپنی ضرورت کے باوجود دوسروں کو دی جاتی ہے، اسی طرح بخل کی انتہائی ڈگری یہ ہے کہ [اپنی جائز ضروریات کے لیے] اپنے آپ پر خرچ نہ کیا جائے حالانکہ اس کے پاس اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے ذرائع اور وسائل موجود ہوں۔ وہاں کتنے کنجوس ہیں جن کے خزانے دولت سے بھرے ہوئے ہیں ، لیکن وہ دکھ میں مر گئے کیونکہ وہ اپنے علاج پر خرچ کرنے کی ہمت جمع نہیں کرسکے۔ دل کھانے کا خواہشمند ہوتا ہے، لیکن ان میں خرچ کرنے کی ہمت نہیں ہوتی، حالانکہ اگر انہیں مفت میں مل جائے تو انہیں کھانے میں کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ ان دونوں افراد میں کتنا بڑا فرق ہے؟ حسن الخلق، اخلاق، باطنی خصلت، مزاج اور صفات الہی نعمتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ جس کو چاہے عطا فرماتا ہے اور جس کو چاہتا ہے اس سے محروم کرتا ہے۔ سخاوت میں پرہیزگاری سے زیادہ کوئی ڈگری نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ان الفاظ میں حمد و ثنا فرمایا:

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ

"وہ اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں، حالانکہ وہ بھوک سے دوچار ہیں [اور خود بھی ضرورت مند ہیں]۔ (سورۃ البقرۃ باب ۵۹، آیت ۹)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دن تک لگاتار تین دن تک اپنی موت کے بعد کبھی پیٹ بھر نہیں کھایا۔ اگر ہم چاہیں تو ، ہم اپنا پیٹ بھر کھا سکتے تھے ، لیکن ہم نے دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دی۔ (بیان کردہ حدیث کا مجموعہ *بیہقی*)

ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مہمان بن گیا۔ اس وقت ، اس کے گھر میں کچھ بھی نہیں تھا جو اس مہمان کی خدمت کے لئے استعمال کیا جاسکے۔ ایک *انصاری* (مدینہ شہر کا رہنے والا جو بہت سے دوسرے باشندوں کے ساتھ مل کر مکہ سے آنے والے مہاجرین کی میزبانی کرتا تھا جو ظلم و ستم سے بچنے کے لیے وہاں بھاگ گئے تھے) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لیے آئے جو اس مہمان کو اپنے گھر لے گئے اور اس وقت ان کے گھر میں جو کچھ کھانا تھا وہ لے کر آئے اور ان کی بیوی سے کہا کہ وہ چراغ بجھا دیں تاکہ مہمان کچھ نہ دیکھ سکے اور یہ سمجھے کہ میزبان [اور ان کی فیملی بھی کھانا کھا رہی ہے، کیوں کہ وہ [خالی] پلیٹ میں اپنا ہاتھ بڑھاتے اور کھانے کا بہانہ کرتے تھے۔ میزبان ساتھی نے ایسا ہی کیا اور مہمان نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ صبح کے وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مہمان کے ساتھ جو کچھ کیا وہ اللہ تعالیٰ کو پسند کرتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن مجید کی یہ آیت نازل فرمائی:

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ

"وہ اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں، حالانکہ وہ بھوک کا شکار ہو سکتے ہیں۔ (سورۃ البقرۃ باب ۵۹، آیت ۹)
(بیان کردہ حدیث مجموعے *صحیح بخاری اور صحیح مسلم*)

بہرحال سخاوت اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت ہے اور پرہیزگاری سخاوت کی سب سے اعلیٰ درجے ہے جس پر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حد تک قائم رہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی اور ان کی دیگر تمام صفات کی اس عظیم صفت کو ان الفاظ میں تعریف کیا:

وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ

"اور اس میں کوئی شک نہیں کہ تو (اے محمد!) ایک بلند اور اعلیٰ کردار [جس کی تمام انسانیت کو اپنی بھلائی اور فلاح و بہبود کے لیے وقت کے آخر تک تقلید کرنی چاہیے]۔ (سورۃ البقرۃ سورۃ 68، آیت 4)

سہل بن عبداللہ التستری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خدا سے دعا کی: اے اللہ! مجھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی قوم کے بعض درجات دکھاؤ۔ حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بہت سے عظیم انبیاء کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کے بارے میں پیشن گوئی کی گئی تھی جو وقتا فوقتا مختلف الہامی انبیاء کے لیے بھیجی گئی تھی تاکہ وہ اپنی قوموں کو ان کے زمانے میں پہنچا دیں تاکہ وہ الٰہی ہدایت اور اخلاقی راستبازی کی راہ پر گامزن رہیں۔ اس الٰہی ہدایت کا اختتام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے تمام بنی نوع انسان سے آخری زمانے تک فرمایا: اے موسیٰ! آپ اس خواب کو برداشت نہیں کر پائیں گے۔ لیکن میں تمہیں اس کی عظیم درجات (مجھ سے قربت) میں سے ایک عظیم درجہ دکھاؤں گا جس کی وجہ سے میں نے اسے اپنی تمام مخلوقات پر اعلیٰ مقام دیا ہے۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی آنکھوں سے پردہ اٹھا دیا گیا تاکہ وہ آسمانوں کے عجائبات کا نظارہ کریں اور انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بلند مقام اور ان کی قرب و قربت کی عظمت کا مشاہدہ کیا جس نے ان کی آنکھوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اے اللہ! محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس ڈگری تک کیسے پہنچے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "ایک صفت اور صفت کی وجہ سے جس کی وجہ سے میں نے اسے خاص طور پر بیان کیا ہے، اور وہ خوبی پرہیزگاری ہے [جس کی وہ ساری زندگی کا مالک تھا]۔ اے موسیٰ! اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں ایک بار بھی پرہیزگاری کا مظاہرہ کرے تو میں اپنی ذمہ داری ادا کرنے میں شرم محسوس کروں گا اور میں ایسے شخص کو بغیر کسی حساب کتاب کے جنت میں داخل ہونے دوں گا اور جہاں دل چاہے وہاں رہنے دوں گا۔ ایک روایت کے مطابق عبداللہ بن جعفر رحمہ اللہ اپنی دور دراز زمین کا معائنہ کرنے کے لیے سفر کرتے تھے۔ سفر کے دوران ، وہ رک گیا اور لوگوں کے ایک گروہ (قبیلے) کی ملکیت والے ایک آرکڈ میں رہا۔ اس آرکڈ میں ایک ایتھوپیا [مسلمان] غلام کام کر رہا تھا۔ ایسا کرتے ہوئے غلام کا کھانا آگیا۔ اسی وقت ، ایک کتا آرکڈ میں آیا اور اس کے قریب بیٹھ گیا۔ غلام نے اس کتے کے سامنے [اپنی تھالی سے] روٹی رکھی جو اسے کھاتا تھا۔ اس نے اپنی دوسری روٹی اس کتے کے سامنے رکھی جس نے اسے کھایا تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنی تیسری روٹی کتے کو کھلائی جس نے اسے بھی کھایا یہاں تک کہ اس کا اپنا کھانا ختم ہوگیا۔ عبداللہ بن جعفر جو سارا واقعہ دیکھ رہے تھے اس نے غلام سے پوچھا: تمہاری روزمرہ کی غذا کیا ہے؟ اس نے جواب دیا: "یہ وہی ہے جو تم نے ابھی دیکھا ہے۔" عبداللہ نے حیرت سے پوچھا: "تو پھر تم نے اپنا پورا کھانا کتے کو کیوں کھلایا تھا؟" غلام نے جواب دیا: "حقیقت یہ ہے کہ ہمارا یہ آرکڈ کتوں کے رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ یہ کتا کھانے کے لئے کھانا تلاش کرنے کی امید میں کسی دور دراز جگہ سے آتا ہے۔ مجھے یہ پسند نہیں تھا کہ جب تک یہ کتا بھوکا رہتا ہے تو میں کھاتا ہوں۔ عبداللہ نے پوچھا: پھر تم سارا دن کیا کرو گے؟ اس نے جواب دیا: میں بھوکا رہوں گا۔ عبداللہ نے دل میں سوچا کہ وہ اپنے دل میں غلام کو اس کی سخاوت (پرہیزگاری) پر تنقید کر رہا ہے حالانکہ وہ اس سے زیادہ سخی تھا۔ عبداللہ نے فورا اس آرکڈ کے مالک سے ملاقات کی اور اس سے وہ آرکڈ اور تمام اوزار [آرکڈ کی دیکھ بھال کے لیے استعمال ہونے والے] کے ساتھ خرید لیا اور اس غلام کو آزاد کر دیا۔ نہ صرف یہی ، اس نے اس سابق غلام کو یہ آرکڈ تحفے میں دیا [اس کی خود قربانی اور پرہیزگاری کی تعریف کے طور پر کیونکہ اس نے غلامی میں اپنی انتھک خدمت کے لئے خدا کے سامنے اپنی اعلی ڈگری کو تسلیم کیا ، جو اس کے اوپر پرہیزگاری کے کاموں کے ساتھ صبر کی استقامت کے ساتھ کیا گیا تھا]۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے کسی کو بکری کا سر تحفہ کے طور پر بھیجا (سر گوشت کے کھانے کے لیے استعمال ہونے والے چوپایوں کا سب سے معمولی اور سستا حصہ ہے- اسے تحفے کے طور پر بھیجنے والا شخص ابتدائی طور پر اپنے لیے صرف یہ حاصل کرنے کا استطاعت رکھتا تھا لیکن اس نے کسی اور کو تحفہ دینے کا فیصلہ کیا جس کے بارے میں اس کے خیال میں اس کی زیادہ ضرورت ہے)۔ وصول کرنے والے نے سوچا کہ اس کا بھائی (ایک ساتھی نبوی صحابی) اس کی زیادہ ضرورت ہے، اس لیے اس نے اسے تحفے میں دیا۔ تیسرے نے اسے چوتھے کو تحفے میں دیا اور اسی طرح یہاں تک کہ اسے سات لوگوں کے پاس بھیجا گیا ، پھر پہلے کے پاس واپس آگیا [جس نے اصل میں اسے تحفے میں دیا تھا ، اس طرح ہر وصول کرنے والا ساتھی دوسرے کو مکمل طور پر پرہیزگاری کے کاموں میں زیادہ محتاج وصول کنندہ سمجھتا تھا]۔

بخیل کا علاج

بخل دولت اور مادی املاک کی محبت سے پیدا ہوتا ہے اور اس محبت کی دو وجوہات ہیں۔

دولت سے محبت کی پہلی وجہ جو بخل کا باعث بنتی ہے: خواہشات اور خواہشات کی محبت ہے جس کا حصول دولت کے حصول کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس میں لمبی عمر کی امیدیں بھی شامل ہیں کیونکہ اگر انسان کو معلوم ہو کہ وہ ایک دن اس عارضی ٹھکانہ (دنیا) سے نکل جائے گا تو وہ کنجوس نہیں ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو رقم ایک دن، ایک مہینہ یا ایک سال کے لیے کافی ہے وہ بہت کم ہے اور اس کا اضافی سرمایہ [تمام نیک کاموں پر خرچ کر سکتا ہے، خاص طور پر وہ جو خدا کی راہ پر گامزن ہیں]۔ بعض اوقات کوئی لمبی امیدوں کا خواہاں نہیں ہوتا لیکن اس کے بچے لمبی امیدوں کا متبادل بن جاتے ہیں اور وہ اپنی روزی کے لیے اسی طرح جدوجہد کرتا ہے جیسے وہ اپنی گزر بسر کے لیے کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الولدمبخلةمجبنةمجهلة

"[خوف ، خدشہ ، اضطراب اور کسی کے مستقبل کے لئے منصوبہ بندی] بچوں کو بخل ، بزدلی اور جہالت کو جنم دیتا ہے۔" (بیان کردہ *حدیث* مجموعہ *ابن ماجہ* یعلی بن مرۃ رضی اللہ عنہ پر

اگر اس کے اوپر رزق کی آمد پر غربت اور اعتماد کی کمی کا خوف ہو تو بخل شدت اختیار کر لیتا ہے [جس سے انسان کو تمام قانونی، غیر قانونی، اخلاقی اور غیر اخلاقی ذرائع سے ذخیرہ اندوزی اور غصب کرنے کی طرف لے جاتا ہے چاہے وہ دوسروں کے جائز اور جائز حقوق پر اثر انداز ہو جائے]۔

دولت سے محبت کی دوسری وجہ جو بخل کا باعث بنتی ہے: یہ ہے کہ کوئی شخص دولت سے اپنے حق میں محبت کر سکتا ہے [اور کسی دوسرے مقصد کے لیے نہیں جیسے کسی کی اولاد کی حفاظت یا بڑھاپے کے مالی بحران سے بچنا]۔ بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے پاس اپنی باقی زندگی کے لیے کافی سرمایہ ہوتا ہے بشرطیکہ وہ معمول کے مطابق خرچ کریں، بلکہ ان کے پاس اتنا سرمایہ ہے کہ خرچ کرنے کے بعد بھی بہت کچھ بچ جائے گا۔ وہ اولاد سے محروم ہیں، ان کے پاس دولت کے ڈھیر ہیں لیکن انہیں *زکوٰۃ* (واجب صدقہ جو غریبوں کو اپنی نقد رقم اور سونے کی بچت سے دینا ضروری ہے جو ایک سال تک جاری رہے جو قیمت کے ڈھائی فیصد کی مقدار میں ہے؛ مویشی، زرعی پیداوار اور دیگر اثاثے بھی شریعت الٰہی کے مطابق لازمی صدقہ کے تابع ہیں) اس حد تک کہ وہ حاصل کرنے پر پیسہ خرچ کرنے پر بھی مائل نہیں ہیں اپنی بیماری کا طبی علاج۔ اس کے بجائے ، وہ *درہم* اور *دینار* (پرانے زمانے میں استعمال ہونے والی سونے اور چاندی کے سکے کی کرنسی) کے عاشق ہیں جو ان کے ساتھ اپنی

موجودگی اور ان پر ان کے کنٹرول سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ وہ [خفیہ طور پر] انہیں زیر زمین دفن کرتے ہیں حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ [جلد یا بدیر ایک دن] مر جائیں گے اور مرنے کے بعد ، یہ سارا خزانہ کھو جائے گا یا دشمنوں [یا اجنبیوں کے ہاتھوں میں چلا جائے گا جن کا ان سے کوئی تعلق بھی نہیں ہے]۔ اس کے باوجود، وہ خود کو اس سے کھانے یا اس سے تھوڑی سی رقم [اپنی جائز ضروریات پر] خرچ کرنے کی بھی اجازت نہیں دیتے۔ یہ دل کا ایک بہت بڑا اور مہلک مرض ہے اور اس کا علاج بہت مشکل ہے، خاص طور پر بڑھاپے میں یہ لاعلاج ہو جاتا ہے۔ ایسے شخص کی مثال اس عاشق کی ہے جو کسی کو اپنا سفیر بنا کر محبوب کے پاس بھیجتا ہے پھر اس کے بجائے ایلچی سے محبت کرنا شروع کر دیتا ہے اور محبوب کو بھول جاتا ہے۔ دولت ایک سفیر کی مانند ہے جس کے ذریعے وہ اپنی ضروریات پوری کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ دولت سے محبت کرتے ہیں اور اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور لذت کے ذرائع بھی دلکش ہوتے ہیں۔ پھر بعض اوقات ضروریات کو فراموش کر دیا جاتا ہے اور دولت حقیقی محبوب بن جاتی ہے۔ یہ انتہائی گمراہ کن ہے۔ جو شخص سونے اور پتھر کے درمیان فرق کو سمجھتا ہے وہ جاہل ہے، سوائے اس کے کہ وہ جانتا ہے کہ ضروریات سونے (دولت) کے ذریعے پوری ہوتی ہیں اور جو ضروریات پوری کرنے کے بعد باقی رہ جاتی ہے وہ پتھر کے برابر ہے۔

علاج کے مختلف طریقے: علاج کے مختلف طریقے درج ذیل ہیں۔ یہ معلوم ہے کہ ہر حالت کا علاج اس کے برعکس کیا جاتا ہے۔ لہٰذا شہوت کی محبت کا علاج کم سے کم اور صبر کے ذریعے قناعت کرنا ہے۔ لمبی عمر کی امیدوں کا علاج موت کی یاد (کسی کی اپنی موت اور اس دنیا کے سفر کا خاتمہ) اور اپنے ہم عصروں کی موت کی کثرت سے ہے۔ دولت جمع کرنے کی خواہش کو کم کرنا جمع شدہ دولت کے ضیاع کا مشاہدہ کرنے کے ذریعے ہے [جو لوگ مرنے کے بعد اپنے پیچھے چھوڑ دیتے ہیں جسے دوسروں نے فوری طور پر اپنے قبضے میں لے لیا ہے]۔ اپنی اولاد کی طرف دل کے جھکاؤ کا علاج اسی عقیدے سے ہے کہ جس طرح خالق نے ایک کو رزق عطا کیا ہے اسی طرح رزق بھی بچے کی پیدائش کے بعد پیدا ہوتا ہے (جیسا کہ ہر بچہ اپنے ساتھ وہ رزق لاتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے مقرر کیا ہے)۔ کتنے بچے ایسے ہیں جنہیں اپنے باپ کی میراث سے کچھ نہیں ملتا لیکن پھر بھی زیادہ خوشحال زندگی گزارتے ہیں؟ ایسے شخص کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ وہ اپنی اولاد کے لیے دولت چھوڑ کر جاتا ہے تاکہ وہ اچھی زندگی گزار سکیں، لیکن دولت حاصل کرنے کے بعد (خاص طور پر وراثت کے ذریعے) وہ برائی کی راہ پر چلنا شروع کر دیتے ہیں۔ اگر کسی کی اولاد پرہیزگار، نیک اور پرہیزگار ہو تو انہیں اللہ کافی ہے اور وہ اپنے باپ کی میراث کے محتاج نہیں ہوں گے۔ اگر وہ برے اور ظالم ہیں تو ان کے لیے میراث چھوڑنا صحیح نہیں ہے جو ان کی برائی میں ان کی مدد کرے گا۔ برائی کے ساتھ کسی کی مدد کرنا خود گناہ کرنے کے مترادف ہے۔ بخل کی مذمت اور سخاوت کی تعریف کرنے اور ان روایات پر نظر رکھنے سے دل کا علاج کیا جا سکتا ہے جو کنجوس کو دی جانے والی اذیت کے بارے میں منتقل کی گئی ہیں اور انہیں غور و فکر کا موضوع بنا دیتی ہیں۔ دل کو دولت اور مادی اثاثوں کے مقاصد تک غور و فکر کرنے اور یہ سوچ کر بھی ٹھیک کیا جا سکتا ہے کہ وہ کیوں پیدا ہوئے ہیں؟ اس سوال کا ایک ہی جواب ہے کہ زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے دولت اور مادی جائیدادیں پیدا کی گئی ہیں۔ لہٰذا صرف اتنی ہی دولت خرچ کی جائے جو کسی کی ضروریات کے لیے درکار ہو۔ باقی سب کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے اور اس طرح آخرت کے خزانے کے طور پر ذخیرہ کیا جائے [جیسا کہ انسانی، خیرات اور ضرورت مندوں کی مدد کے لیے نیک کوششوں میں خرچ کیا جاتا ہے، خدا کی راہ میں خرچ ہونے کے طور پر امر ہو جاتا ہے اور اس کی ابدی زندگی کا خزانہ بن جاتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ اس کا بے شمار بدلہ دیتا ہے، ناقابل تصور ، ابدی ، حیرت انگیز اور ابدی بدلہ]۔ یہ وہ دوائیں ہیں جو علم اور الٰہی معرفت سے تعلق رکھتی ہیں۔

بخل کو کم کرنا اپنے آپ کو [شرافت، انسانی اور خیراتی کاموں میں] خرچ کرنے پر مجبور کرنا: بخل کی صفت خرچ کیے بغیر ختم نہیں ہوتی۔ بالکل اسی طرح جس طرح محبت سفر کے ذریعے فاصلہ پیدا کیے بغیر ختم نہیں ہوتی، حالانکہ محبوب کو چھوڑنا اور جدائی نفس پر بہت مشکل ہے۔ لیکن اگر یہ تکلیف ایک بار برداشت کی جائے تو دور رہ کر دل کو تسلی دینے کا کوئی نہ کوئی ذریعہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جو شخص بخل کو کم کرنا چاہتا ہے اسے چاہیے کہ وہ اپنے مال و مال سے الگ ہونے پر مجبور کرے تاکہ وہ دوسروں کی مدد کے لیے صدقہ کے کاموں میں خرچ کرے۔ اپنے آپ کو بخل سے بچانے کی ایک اچھی حکمت عملی یہ ہے کہ اپنے نفس کو دھوکہ دیا جائے اور اسے شہرت اور [معاشرتی] عزت حاصل کرنے کے لئے فراخدلی سے خرچ کرنے پر راضی کیا جائے جیسا کہ لوگ

کسی کو سخی کہتے ہیں۔ شروع میں یہ عمل دکھاوا کیا جائے گا لیکن بعد میں یہ کسی کے مزاج کا حصہ بن جائے گا اور دل شہرت اور شہرت کی خواہش کے بغیر خرچ کرنے کی خواہش کرے گا۔ یہ درست ہے کہ اس حکمت عملی سے دل دکھاوے کی برائی سے آلودہ ہو جاتا ہے، لیکن دکھاوا کا خاتمہ اتنا مشکل نہیں جتنا بخل کا خاتمہ کرنا۔ شہرت اور شہرت دولت کے خاتمے کے بعد دل کو تسلی دینے کا ذریعہ ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے شیر خوار بچوں کو پرندوں سے پریشان کرکے دودھ چھڑایا جاتا ہے لہذا وہ کھیل میں مصروف ہوجاتے ہیں اور دودھ کے بارے میں بھول جاتے ہیں۔ ایک بار جب وہ دودھ سے بے پرواہ ہوجاتے ہیں تو ، انہیں ڈرامے سے بھی ہٹا دیا جاتا ہے۔ دوسری بری عادتیں بھی ایسی ہی حالت میں ہیں کہ ایک دوسرے پر مسلط کی جاتی ہے، مثال کے طور پر غصے کی شدت کو کم کرنے کے لیے شہوت پر مسلط کیا جاتا ہے اور غصہ اس کی شدت کو کم کرنے کے لیے ہوس پر مسلط کیا جاتا ہے، لیکن یہ حکمت عملی ایسے شخص کے لیے موثر ہے جس کے مزاج میں شہرت اور دکھاوے کی محبت پر کنجوسی کی صفت غالب ہو۔ اس طرح مضبوط کو کمزور [عادت یا معیار] سے بدل دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص بھی اتنا ہی شہرت پسند ہے جتنا کہ وہ کنجوس ہے تو دکھاوے سے بخل کو ختم کرنے کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ اس طرح ایک برائی کا خاتمہ ہو جائے گا لیکن اسی درجے کی دوسری برائی شروع ہو جائے گی۔ اس بات کا اشارہ ہے کہ آیا کسی میں کنجوسی یا دکھاوے کی غالب صفت ہے کہ اس شخص کو دکھاوے کی خاطر خرچ کرنا مشکل نہیں لگتا۔ اگر ایسا ہے تو یہ کہا جائے گا کہ دکھاوا غالب ہے کیونکہ کوئی شخص دکھاوا (شہرت اور شہرت) کی خاطر دولت جیسی محبوب چیز خرچ کرنے کو تیار ہے۔ اگر کسی کو دکھاوے کی خاطر خرچ کرنا مشکل لگتا ہے تو یہ کہا جائے گا کہ بخل اس پر غالب ہے کیونکہ وہ دکھاوے کی خاطر خرچ کرنے کو تیار نہیں ہے۔

دوسروں کے ذریعے ان منفی خصوصیات کو ختم کرنے کی مثال یہ ہے کہ ایک لاش کے اجزاء [قبر میں دفن] کیڑے مکوڑے بن جاتے ہیں۔ جب قبر میں ان کیڑوں کے کھانے کے لیے کچھ نہیں بچتا تو یہ کیڑے ایک دوسرے کو کھا جاتے ہیں یہاں تک کہ ان کی تعداد [مسلسل] کم ہو جاتی ہے یہاں تک کہ آخر میں صرف دو بڑے کیڑے باقی رہ جاتے ہیں۔ جب انہیں کھانے کے لئے کچھ نہیں ملتا ہے تو ، وہ ایک دوسرے پر حملہ کرتے ہیں اور غالب ایک دوسرے کو کھا جاتا ہے۔ بعد میں ، غالب کیڑا کھانے کے لئے کچھ نہ ملنے کی وجہ سے بھوک سے مر جاتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ بری صفات میں جو صفت کمزور ہے وہ اس خوبی کی غذا بننا بند کر دے جو مضبوط ہے۔ ان خصوصیات کے لئے کھانا بند کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے مطالبات پر عمل نہ کیا جائے۔ اس طرح وہ خوبی خود ہی کمزور ہو جائے گی اور آخر کار ختم ہو جائے گی۔ مثال کے طور پر ، کنجوس کا مقصد دولت کو روکنا ہے [خرچ کرنے میں جانے سے]۔ اگر کوئی شخص مال خرچ کر کے اس کے مطالبات کے خلاف کام کرے اگرچہ اس میں بہت مشکل ہو تو بخل کا معیار ختم ہو جائے گا اور دل خرچ کرنے کی خواہش کرنے لگے گا اور اس کے مزاج پر کوئی بوجھ نہیں پڑے گا۔

علم پر مبنی اور عمل پر مبنی بخیل کا علاج: علم پر مبنی بخیل کا علاج اس کے نقصانات اور سخاوت کے فوائد کا علم حاصل کرنا ہے ، اور عمل پر مبنی علاج یہ ہے کہ اپنے مزاج (نفس) کو خیراتی کاموں پر خرچ کرنے پر مجبور کیا جائے۔ بعض اوقات بخل کی صفت اس قدر غالب اور غالب ہو جاتی ہے کہ وہ انسان کو بہرا اور اندھا کر دیتی ہے اور کنجوسی میں کوئی برائی اور سخاوت میں کوئی نیکی دیکھنا چھوڑ دیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ، کسی کو وہ سمجھ اور فہم حاصل نہیں ہوتا جس کے بغیر سخاوت کی روح متحرک نہیں ہوتی ، جس کے نتیجے میں یہ [بخل کی] موت تک ہمیشہ کے لئے قائم رہتا ہے۔ جو دوا کو نہیں پہچانتا، وہ ٹھیک ہونے والا نہیں ہے۔

دنیا کی تمام دولت اور مادی املاک کی ایسی حالت ہے [جو کسی کی حقیقی ضروریات سے بالاتر ہے]۔ دنیا (اس کی سب سے بڑی علامت دنیا کا مال و مال ہے) خدا کے دشمنوں کی دشمن ہے کیونکہ وہ انہیں جہنم کی طرف دھکیل دیتی ہے، اور خدا کے دوستوں اور مقربوں کا دشمن بھی ہے کیونکہ انہیں اس پر صبر کرنے میں سختی برداشت کرنی پڑتی ہے۔ یہ بھی اللہ کا دشمن ہے کیونکہ وہ اپنے بندوں (انسانوں) کو اس کی راہ پر چلنے سے روکتا ہے۔ یہ اس کا اپنا دشمن ہے کیونکہ وہ اپنے آپ کو کھا جاتا ہے کیونکہ دولت کی حفاظت محافظوں کے ذریعے ہوتی ہے [اور اس کی حفاظت کے مختلف دیگر ذرائع] جس کے نتیجے میں [بدلے میں] دولت خرچ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا (مادی امکانی) دنیا کی حفاظت میں صرف ہوتی ہے یہاں تک کہ اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ ایک فرد جو مادی املاک کے نقصانات سے واقف ہوتا ہے، وہ ان کا عادی نہیں ہوتا اور نہ ہی اس

کے حصول کا جشن مناتے یا کوئی اپنی اصل ضروریات سے زیادہ لیتا ہے۔ جو شخص معمولی ضروریات پر مطمئن ہوتا ہے وہ بخل نہیں کرتا کیونکہ اپنی ضروریات کے مطابق مال اور مادی اثاثوں کو بچانا بخل نہیں ہے۔ اور جس چیز کی ضرورت نہیں ہوتی، اس کی حفاظت کرکے اپنے آپ کو تنگی میں نہیں ڈالتا، بلکہ اسے [ساتھی انسانوں کے نفع کے لیے خیراتی اور فائدہ مند کوششوں پر خرچ کرتا ہے، اور اس طرح اسے ابدی خوشی اور لامتناہی فتح کے حصول کے لیے استعمال کرتا ہے]۔

دولت اور مادی املاک کے حوالے سے انسانی ذمہ داریاں: جیسا کہ ذیل میں بیان کیا جا چکا ہے کہ دولت ایک لحاظ سے اچھی ہے اور ایک لحاظ سے برائی ہے۔ اس کی مماثلت سانپ کی طرح ہے جس میں زہر اور تریاق دونوں موجود ہیں اور اس کا زہر مہلک ہے [جبکہ اس کا تریاق زندگی بچانے والا ہے]۔ اسی طرح دولت میں زہر اور تریاق دونوں ہوتے ہیں۔ جو اس کے زہر سے بچ سکتا ہے وہ وہ ہے جو اپنی ذمہ داریوں پر نظر رکھتا ہے۔

پہلا فریضہ: یہ ہے کہ انسان اس کے مقصد کا علم حاصل کرے اور یہ جاننے کی کوشش کرے کہ خدا نے مال اور مادی مال کیوں پیدا کیا اور انسان کو اس کی ضرورت کیوں ہے۔ اس کو جاننے کے بعد ، کوئی اپنی ضروریات کے لئے کافی کمائے گا ، ضرورت سے زیادہ حفاظت نہیں کرے گا ، اور اپنا مال کسی ایسے شخص کو نہیں دے گا جو اس کا مستحق نہیں ہے (وہ اسے فضول کوششوں کے بجائے نیک قابل کوششوں پر خرچ کرے گا جو صرف دنیاوی زندگی کی شان و شوکت میں اضافہ کرتی ہے)۔

دوسرا فریضہ: آمدنی کے ذرائع پر نظر رکھنا ہے تاکہ آمدنی کے ان ذرائع سے بچنے کے لیے جو خالصتا ممنوع ہیں [جیسے بھتہ خوری، رشوت، سود خوری، چوری وغیرہ] یا زیادہ تر حراموں کے لیے حرام ہیں جیسے حکمرانوں سے حاصل کی گئی دولت۔ اسی طرح ، کسی کو ناپسندیدہ چیزوں سے پرہیز کرنا چاہئے جو کسی کے کردار کی پاکیزگی کو آلودہ کرتی ہیں جیسے تحائف جن میں رشوت کے نشانات ہوتے ہیں یا دوسروں سے پوچھنا (یا بھیک مانگنا) جس میں ذلت ہے۔

تیسری ذمہ داری: کسی کی ذاتی معیشت (مالی ضروریات) کے لئے درکار رقم پر غور کرنا ہے۔ کسی کو ضرورت سے زیادہ حاصل نہیں کرنا چاہئے [اندھا دھند مادہ پرست اور لالچی بننے سے بچنے کے لئے جو کسی کی روحانیت اور روحانی کوششوں کو فوری طور پر ختم کردیتی ہے] اور نہ ہی ایسی رقم حاصل کرنی چاہئے جو کسی کی ضروریات سے کم ہو۔ [انسان] ضروریات کا تعلق تین چیزوں سے ہے: کھانا، لباس اور رہائش۔ ان میں سے ہر ایک کے پاس تین ڈگریاں ہیں: عام ، عمدہ ، اور درمیانے درجے (ایک جو عام اور عمدہ کے وسط میں ہے)۔ جب تک انسان کم کی طرف مائل نہیں ہوتا تب تک انسان اپنی حقیقی ضروریات کی حدود کے قریب رہے گا اور جب اس سے تجاوز کرے گا تو وہ ایک گہرے گڑھے میں گر جائے گا جس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ ہم نے ان ڈگریوں کی تفصیل کتاب دنیاداری سے پرہیز (باب 14) میں فراہم کی ہے۔

چوتھی فریضہ: خرچ کرنے کے مواقع پر نظر رکھنا ہے۔ اخراجات میں اعتدال ہونا چاہیے، نہ تو حد سے زیادہ ہونا چاہیے اور نہ ہی حد سے زیادہ تنگ ہونا چاہیے۔ کسی کو حلال مقاصد پر خرچ کرنا چاہئے جیسا کہ اس نے حلال طریقوں سے کمایا ہے۔ جس طرح دوسروں سے ان کے مال و مال کو ناجائز طور پر چھین لینا گناہ ہے، اسی طرح ناجائز خرچ کرنا بھی گناہ ہے۔

پانچواں فریضہ: مال و مال اور مادی مال لینے ، دینے ، روکنے اور خرچ کرنے میں صحیح نیت کو برقرار رکھنا ہے۔ جب کوئی شخص مادی ملکیت (قانونی اور اخلاقی طریقوں سے) لیتا ہے تو اس کی نیت عبادت الٰہی میں اس سے مدد حاصل کرنے کی ہونی چاہیے۔ جب کوئی مادی مال چھوڑ کر جاتا ہے تو اس کا ارادہ دنیاداری سے پرہیز کرنا چاہیے۔ جب کوئی ایسا کرتا ہے تو ، دولت کی موجودگی نقصان دہ نہیں ہوگی۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر کوئی شخص دنیا کے تمام خزانوں کا مالک ہو جائے اور اس کا مقصد اللہ کی رضا حاصل کرنے کے سوا کچھ نہ ہو تو وہ پرہیز کرنے والا کہا جائے گا اور اگر کوئی سارا مال خرچ کر دے لیکن اللہ کی رضا مقصد نہ ہوتی۔ پھر کسی کو پرہیز نہیں کہا جائے گا"۔ تمہاری تمام حرکات و سکنات صرف اللہ کی خاطر ہونی چاہئیں، یا تو وہ عبادت (الٰہی) ہوں یا عبادت میں مددگار ہوں۔

کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو خدا کی طرف جانے کی راہ میں مددگار نہ ہو سکے مثلا قمیضیں، پاجامے، بستر، برتن وغیرہ۔ یہ سب چیزیں زندگی کے لیے ضروری ہیں۔ اپنی ضروریات سے بالاتر چیزوں کو رکھنے کے بجائے یہ سوچنا چاہیے کہ خدا کے دوسرے بندے ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی آپ کے پاس اپنی ضروریات لے کر آتا ہے اور آپ کے پاس وہ اضافی اور آپ کی ضرورت سے زیادہ ہے تو آپ کو [مدد کرنے سے] انکار نہیں کرنا چاہیے۔

جو ان اصولوں پر عمل کرتا ہے وہ اس شخص کی طرح ہے جو سانپ سے تریاق نکالتا ہے جو اس کی اصل قیمت ہے اور اس کے زہر سے بچاتا ہے۔ ایسے شخص کو دولت کی کثرت سے نقصان نہیں پہنچتا۔ یہ امتیاز وہ شخص حاصل کرتا ہے جو دین کی کامل سمجھ رکھتا ہو اور اس کا علم اعلیٰ ہو۔ جو شخص مال جمع کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ ایسا شخص بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرح ہے جو دولت کے مالک ہیں، وہ اس بچے کی مانند ہے جس میں عقل نہیں ہے اور سانپ کے مالک کو سانپ پر قابو پاتا دیکھ کر یہ سوچ کر سانپ پکڑنا شروع کر دیتا ہے کہ جس طرح سانپ جادوگر سانپ کو پکڑ سکتا ہے اسی طرح وہ بھی ایسا ہی کر سکتا ہے۔ ایسا بچہ ضرور مر جائے گا۔ ان دونوں میں یہی فرق ہے (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جن کے پاس کچھ مال تھا اور عام آدمی جو اپنے آپ کو ان کی مانند سمجھتا ہے) لیکن سانپ سے کاٹنا ظاہر ہے لیکن دولت سے کاٹنا ظاہر نہیں ہے۔

میں تمہیں بتاؤں گا کہ *سلف صالحین* کے پیشروء کیا تھے اور تم کیا ہو؟ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم (جن کی تعداد بہت کم تھی) کے پاس مال و دولت تھا تاکہ وہ بھیک مانگنے اور مانگنے کی محتاج نہ ہوں اور تاکہ وہ اللہ کی راہ میں خرچ کر سکیں۔ انہوں نے اپنی دولت قانونی ذرائع سے حاصل کی۔ انہوں نے حلال کھانا کھایا اور اعتدال سے خرچ کیا اور اسے آخرت میں کامیابی کا ذریعہ بنایا۔ انہوں نے کسی کے حقوق غصب نہیں کیے، نہ بخل کرتے تھے، انہوں نے اپنا زیادہ تر مال اور مال اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا اور ان میں سے بعض نے دوسروں کی ضروریات کو اپنے پر ترجیح دے کر اپنا سارا مال صدقہ میں خرچ کیا۔ میں تم سے پوچھتا ہوں، کیا تم بھی ایسے ہی ہو؟ یہ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ آپ کو پرہیزگار پیشروؤں سے ذرا سی بھی مماثلت نہیں ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کیسے تھے؟ صحابہ کرام ایسے تھے کہ وہ [مادی] غربت سے محبت کرتے تھے۔ وہ غربت اور بھوک کے خوف سے عاری تھے اور اپنی رزق کے بارے میں خدا پر بھروسہ رکھتے تھے۔ وہ اپنی قسمت کے بارے میں خوش تھے، ان مشکلات کو قبول کرتے تھے [جو انہیں برداشت کرنے پر مجبور تھے]۔ انہوں نے غربت میں اظہار تشکر کیا اور مشکلات میں صبر کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے آسانی اور سکون میں خدا کی تسبیح کی ، وہ خدا کی خاطر اپنے آپ کو عاجز کرتے تھے ، اور وہ تکبر ، برتری کے پیچیدہ ، اور مادی املاک کی کثرت پر فخر سے خوفزدہ تھے۔ انہوں نے دنیا سے صرف وہی حصہ لیا جو ان کے لیے جائز تھا، وہ اپنی حقیقی ضرورت کے مطابق رقم قبول کر رہے تھے، انہوں نے دنیا کو مسترد کیا، اس کی سختیوں کو صبر سے برداشت کیا، اس کی تلخی کا مزہ چکھا، اس کی آسائشوں اور نعمتوں کو مسترد کیا۔ کیا آپ قسم کھا سکتے ہیں کہ آپ ایسے ہیں؟ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ جب دنیا ان کا دروازہ کھٹکھٹاتی تھی تو وہ خوف سے کانپتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ انہوں نے کوئی ایسا گناہ کیا ہے جس کی فوری سزا دنیا کی شکل میں دی جا رہی ہے۔ جب غربت آتی تھی تو وہ اس کا استقبال کرتے تھے اور اسے نیک لوگوں کا راستہ سمجھ کر قبول کرتے تھے۔ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں ہمیں یہ روایت ملی ہے کہ اگر وہ صبح کے وقت اپنے گھروں میں کچھ دیکھتے تو بہت زیادہ غمگین ہو جاتے تھے اور اگر انہیں کچھ نہ ملتا تو دن کا آغاز مسکراہٹ سے کرتے تھے۔ اگر کسی نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا اور کہا کہ لوگ اپنے گھروں میں دولت دیکھ کر خوش ہوتے ہیں لیکن آپ غمگین ہو جاتے ہیں تو وہ جواب دیتے تھے کہ مجھے خاندان کے ساتھ کچھ دیکھ کر غمگین ہونے کی وجہ یہ ہے کہ میرا گھر والا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کے طریقے پر نہیں چل رہا۔ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں منقول ہے کہ جب انہیں خوشحالی کا سامنا کرنا پڑا تو ان کی غم کی کیفیت قابل دید تھی اور انہیں یہ کہتے ہوئے دیکھا گیا کہ دنیا کا ہم سے کیا تعلق ہے؟ اور اگر ان پر مصیبتیں آ جاتی تھیں اور تنگی ان کے گھروں میں قدم رکھتی تھی تو وہ خوش ہوتے تھے اور اسے اپنے لیے نبھائی سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ اب ہمارے رب نے ہم پر رحمت کی نگاہ ڈال دی ہے یہ *سلف صالحین (سلف صالحین) کی خوبیاں اور صفات ہیں۔* ان کی روشنی میں ، یہ اچھی طرح سے طے کیا

جاسکتا ہے کہ دولت بہتر ہے یا غربت۔ اب کیا آپ [خدا کی قسم] کہا سکتے ہیں اور اس بات کی تصدیق کر سکتے ہیں کہ آپ کے پاس وہی [اندرونی روحانی] حالتیں ہیں؟ آپ ان مقدس اور مقدس لوگوں سے ذرا بھی مماثلت نہیں رکھتے۔

آپ کیسے ہیں؟ اب میں آپ کی حالت بیان کروں گا اور آپ کی ان خصوصیات پر روشنی ڈالوں گا جو پاکیزہ پیشروؤں کے حالات اور صفات سے بالکل میل نہیں کھاتیں۔ آپ دولت میں باغی ہو جاتے ہیں، خوشحالی پر فخر کرتے ہیں، اور آسانی اور آرام سے خوشی سے ناچتے ہیں۔ تمہیں غربت سے نفرت ہے اگرچہ وہ نبیوں کے لیے فخر کا سرمایہ تھا۔ آپ ان کے فخر کے دارالحکومت سے نفرت کرتے ہیں۔ تم غربت کے خوف سے مال جمع کرتے ہو، حالانکہ یہ خدا کے بارے میں بری رائے ہے اور اس کے وعدے پر عدم اعتماد کا ثبوت ہے۔ یہ ایک بات آپ کے [آنے والے] منحوس انجام کی گواہی ہے کہ آپ صرف دنیاوی نعمتوں، خواہشات، آسائشوں اور خواہشوں کی تکمیل کے لیے مال جمع کرتے ہیں، حالانکہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

شرار امتی الذین غذوا بالنعیم فربت علیه اجسامهم

"میری امت کے بدترین لوگ وہ ہیں جو قیمتی کھانا کھاتے ہیں اور ان کے جسم اس سے پرورش پاتے ہیں (یعنی وہ دنیا کی آسائشوں، عیش و عشرت اور اچھی زندگی کے عادی ہیں اور خدا کی قبولیت اور رضامندی کی طرف جانے والے روحانی راستے میں سبقت حاصل کرنے کے لیے ان کوششوں اور کوششوں کی پرواہ نہیں کرتے)۔

ایک عالم کا قول ہے کہ جب لوگ قیامت کے دن اپنے نیک اعمال کی تلاش میں آئیں گے تو ان سے کہا جائے گا:

أَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُم بِهَا

"تم نے دنیا میں زندگی کی اچھی چیزیں حاصل کر لی ہیں [جیسا کہ تم نے عیش و آرام کی زندگی گزاری اور آخرت میں تمہارے لیے کچھ بھی نہیں بچا]۔" (سورۃ البقرۃ باب 46، آیت 20)

اپنی غفلت کی نیند سے اٹھ جاؤ! اگر آپ دنیا کی نعمتوں کی وجہ سے آخرت کی نعمتوں سے محروم ہو جائیں گے تو یہ بڑی محرومی، غم اور مشکلات کی جگہ ہوگی۔ تم دولت بھی جمع کرتے ہو تاکہ تم اس کی کثرت کی وجہ سے ایک دوسرے پر فخر کر سکو اور اپنے آپ کو برتر سمجھو۔ لیکن ہمیں یہ روایت ملی ہے کہ جو شخص دنیا کو زیادتی اور تکبر کے لیے جمع کرے گا وہ اللہ تعالیٰ سے اس حالت میں ملے گا کہ اللہ تعالیٰ کسی سے ناراض ہو جائے گا۔ لیکن افسوس، آپ کو خدا کی ناراضگی کی ذرا بھی پرواہ نہیں ہے۔ آپ اپنی حالت میں ڈوبے ہوئے ہیں اور اپنے آخری انجام سے غافل ہیں۔ آپ کو دنیا میں رہنا اپنے رب کی قربت کی طرف جانے سے زیادہ پیارا لگتا ہے۔ تم اللہ تعالیٰ سے ملنا پسند نہیں کرتے، اور اللہ تم سے ملنا پسند نہیں کرتا۔ اگر دنیا سے کچھ بھی آپ کے لئے دستیاب نہیں ہے تو آپ کا احساس محرومی دیکھنے کے قابل ہے۔ آپ کی حالت ایسی ہے کہ آپ دنیا کو جمع کرنے کے لیے اپنے آپ کو دین کی پابندیوں سے آزاد کرتے ہیں اور جب آپ اسے حاصل کرتے ہیں تو خوشی سے جھولتے ہیں حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من احب الدنیا وسر بها ذهب خوف الآخرة من قلبه

"جو دنیا سے محبت کرتا ہے اور اسے حاصل کرنے پر خوش ہوتا ہے، ایسے شخص کے دل سے آخرت کا خوف نکل جاتا ہے"۔

تم دنیاوی معاملات میں جتنی دلچسپی رکھتے ہو، تم آخرت کے معاملات میں اتنی ہی دلچسپی نہیں لیتے۔ گناہوں کا مصائب آپ کے لیے اتنا بڑا نہیں ہے جتنا دنیا کو نہ ملنے کا مصائب (شان و شوک، چمک، جلال ، دولت، اور مادی املاک)۔ تم گناہوں سے اس طرح نہیں ڈرتے جس طرح تم مال کے ضیاع سے ڈرتے ہو۔ آپ شہرت اور طاقت حاصل کرنے کے لیے اپنا پورا سرمایہ خرچ کر سکتے ہیں، لیکن آپ کسی ایسے شخص کی مدد کرنے سے قاصر ہیں جو دکھی ہے۔ آپ وقار اور عزت حاصل کرنے کے لیے مخلوقات کو خوش کر سکتے ہیں، لیکن آپ کے پاس خدائی منظوری حاصل کرنے کا وقت نہیں ہے۔ بیشک مال تمہارے گناہ چھپا دیتا ہے اور لوگ تم پر طعنہ نہیں دیتے لیکن اللہ

تمہارے حال سے خوب جانتا ہے۔ لیکن آپ کو خدا کے علم اور آگاہی کی پرواہ کب ہے [کہ آپ واقعی کیسے ہیں]؟ تم دنیا کی ذلت کو برداشت نہیں کرتے، لیکن تم آخرت میں جس ذلت کا سامنا کرنے والے ہو اس کے لیے تیار ہیں۔ یہ بندے تم پر اللہ سے زیادہ محبوب ہیں۔ اگر یہ جہالت نہیں ہے تو پھر یہ کیا ہے؟ تمہارا باطن بے شمار گندگی سے آلودہ ہے اور بے شمار عیبوں کا سرچشمہ ہے، لیکن تم اپنے مال کو اللہ کے نیک بندوں کے مال کی طرح سمجھتے ہو۔ افسوس! تم نیک پیشروؤں سے کتنے دور ہو! خدا کی قسم وہ حلال چیزوں میں اس حد تک پرہیز کرتے تھے کہ تم حرام چیزوں میں نہیں ہو۔ وہ آپ کے بڑے گناہوں کے مقابلے میں چھوٹی چھوٹی غلطیوں کا زیادہ خوف رکھتے تھے [خدا کے ساتھ ان کے کھڑے ہونے پر اس کے اثرات کی وجہ سے]۔ جن میں سے جن کی صفات ان کے ساتھ مماثلت نہیں رکھتی وہ دنیا میں ان کی مانند نہیں ہیں اور نہ آخرت میں ان کے ساتھی ہوں گے۔ لوگوں کے دونوں گروہوں کے درمیان فرق بالکل واضح ہے۔

اگر تم اپنے آپ کو نیکوکاروں کی مثال سمجھتے ہو تو تم کم سے مطمئن رہو، حلال اور حلال مالوں سے پرہیز کرو، اللہ کی راہ میں زیادہ سے زیادہ خرچ کرو، پرہیزگار ہو، مفلسی کا خوف نہ رکھو، مال کی لالچ سے نفرت کرو، کم مادہ پرستی اور اس کے نتیجے میں آنے والی مشکلات پر راضی ہو، کمی سے خوش ہوں، عاجزی کو اچھا سمجھیں، تکبر اور اعلیٰ مقام کی تلاش کو حقارت کے ساتھ دیکھیں، اپنے معاملات میں مضبوط ہوں۔ دل ہدایت کو ناپسند نہیں کرتا، آپ خدا کی ذمہ داریوں اور حقوق کے بارے میں اپنے آپ سے احتساب کرتے اور اپنی تمام حالتوں کو خدا کی رضامندی اور قبولیت کے سانچے میں ڈھال لیتے۔ اس صورت حال میں آپ کو احتساب کے لیے کھڑا نہیں کیا جائے گا اور آپ کو پرہیزگاروں کے زمرے میں شمار کیا جائے گا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی روایات سے دولت کے لالچ کی ایک مثال: جریر لیث رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صحبت اختیار کی۔ وہ دونوں کہیں چلے گئے یہاں تک کہ وہ ایک ندی تک پہنچ گئے۔ وہ دونوں کھانے کے لئے اس کے پاس بیٹھ گئے۔ ان کے پاس تین روٹیاں تھیں لہذا دونوں نے ایک ایک کھایا اور تیسرا باقی رہ گیا۔ یسوع پانی پینے ندی کے پاس گیا اور جب وہ واپس آیا تو تیسری روٹی ختم ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے سفر کے ساتھی سے اس بارے میں پوچھا جس نے اس کے بارے میں عدم علم کا اظہار کیا۔ یسوع خاموش رہا اور اپنا سفر دوبارہ شروع کیا۔ انہیں اپنے دو ہرن کے ساتھ ایک مادہ ہرن ملی۔ یسوع نے ہرن کے بچوں میں سے ایک کو آنے کو کہا، جو آیا اور اس نے اسے ذبح کیا، گوشت پکایا اور اس میں سے کھایا اور اپنے سفر کے ساتھی کو بھی پیش کیا۔ تب یسوع نے ہرن کے بچے سے کہا، "خدا کے حکم سے زندہ ہو جاؤ!" اور وہ دوبارہ زندہ ہو گیا۔ اس نے اپنے سفر کے ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ میں تم سے اس ہستی (خدا) کی قسم کھا کر پوچھتا ہوں جس نے تمہیں یہ معجزہ دکھایا ہے کہ تیسری روٹی کہاں گئی؟ اس نے جواب دیا: میں نہیں جانتا۔ اس کے بعد وہ دونوں ایک ایسی وادی میں پہنچے جو جہاں بھی آنکھیں دیکھ سکتی تھیں پانی سے بھری ہوئی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ پکڑا اور پانی پر چل کر اس وادی کو عبور کیا۔ جب وہ خشک زمین پر پہنچے تو اس نے پھر اس سے پوچھا کہ میں تم سے قسم کھا کر اس ہستی (خدا) سے پوچھتا ہوں جس نے تمہیں یہ معجزہ دکھایا ہے کہ وہ روٹی کس نے لی؟ اس نے پھر جواب دیا، "مجھے نہیں معلوم"۔ سفر دوبارہ شروع ہوا اور اس بار وہ ایک جنگل میں پہنچنے پر رک گیا۔ یسوع نے کچھ مٹی، اینٹیں اور پتھر جمع کیے اور کہا، "خدا کے حکم سے، سونا بن جاؤ!" جب مٹی، پتھروں اور اینٹوں کا ڈھیر سونے میں بدل گیا تو یسوع نے اسے تین حصوں میں تقسیم کیا اور کہا، "ایک حصہ میرا ہے، ایک تیرا ہے اور ایک اس شخص کے لیے ہے جس نے تیسری روٹی لی۔ اس کے سفر کے ساتھی نے فورا کہا کہ میں ہی ہوں جس نے تیسری روٹی لی۔ یسوع نے اسے سارا سونا دیا اور اپنے آپ کو اس سے الگ کر کے نکل گیا۔ وہ شخص سونے کے ڈھیر کے ساتھ جنگل میں بیٹھا رہا یہاں تک کہ دو آدمی آ گئے۔ یہ دولت دیکھ کر وہ لالچی ہو گئے اور اس شخص کو قتل کرنے اور ساری دولت چھین لینے کا ارادہ کیا۔ اس نے التجا کی، "مجھے قتل نہ کرو، ہم سب اس دولت میں برابر کے شریک ہو سکتے ہیں۔ سب سے پہلے، ہم میں سے کسی کو کھانا لینے کے لیے قریبی گاؤں جانا چاہیے۔ ایک بار جب ہم کھا لیں گے تو ہم یہ سب اپنے درمیان تقسیم کریں گے۔ ان دو لوگوں میں سے ایک جو آئے تھے، کچھ کھانا لینے گئے اور دل ہی دل میں سوچنے لگے، "اگر میں کھانے میں زہر ملا دوں تو یہ دونوں مر جائیں گے اور میں اس دولت کا اکلوتا مالک بن جاؤں گا"۔ دوسری طرف ، دونوں افراد [جنگل میں انتظار کر رہے تھے] نے کھانا لانے کے بعد اسے مارنے کی سازش تیار کی تاکہ وہ سونے کو آپس میں برابر کے طور پر دو حصوں میں تقسیم کرسکیں۔ تیسرا آدمی جب گاؤں سے کھانا لے کر آیا تو انہوں نے اسے مار ڈالا اور وہ خود زہریلا کھانا کھا

کر ہلاک ہو گئے۔ سونے کا ڈھیر وہیں موجود تھا جبکہ ان کی تین لاشیں گدھوں اور کتوں کے ذریعہ کھائے گئے سونے کے ارد گرد پڑی تھیں۔ چند دنوں کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس جگہ سے گزرے۔ جب اس نے یہ دیکھا تو اس نے اپنے سفر کرنے والوں سے کہا: دیکھو یہ دنیا کا حال ہے، پس تم اس سے ہوشیار رہو۔

باب 8 - شہرت اور تعریف کے حصول کے نقصانات

غزالی کی آٹھویں کتاب *"احیئ العلوم الدین"* یا "خدا کی راہ کے علم کا احیاء" کی تیسری جلد یا چوتھائی کتاب میں شہرت اور شہرت کے حصول کے نقصانات سے متعلق ہے۔ یہ بیماریاں اتنی خود کش ہوتی ہیں کہ وہ کسی کی زندگی پر قبضہ کر لیتی ہیں اور روحانی راستے سے ہٹ جاتی ہیں - جو پہلے ہی اس مقالے کے پہلے حصے میں بیان کی گئی ہے - اور کسی کو اندرونی سکون اور سکون سے محروم کر دیتی ہیں۔ غزالی ان برائیوں اور ان کی ابتدا کے بارے میں قیمتی بصیرت فراہم کرتی ہے اور ان کو اپنے دل سے مٹانے کے طریقے تجویز کرتی ہے ، جس کے نتیجے میں اسے اندرونی سکون اور سکون سے بھر دیا جاتا ہے۔ شہرت کی تلاش انا پرستی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے تکبر کو فروغ دیتی ہے ، اس کے ساتھ ساتھ نفس *(نفس)* کا جنون اور اس کی کوتاہیوں سے اندھا پن ، اس طرح خود اصلاح کے تمام امکانات کو مٹا دیتا ہے اور چیزوں کو بہتر بنانے کے لئے موڑ دیتا ہے۔ حمد و ثناء حاصل کرنا ایک اور نقصان دہ صفت ہے جو اچھے انسانی اعمال سے خلوص کو دور کر دیتی ہے اور انہیں خود غرضی، خود غرضی، خود غرض اور مذموم مقاصد سے داغدار کرتی ہے۔ اس سے حقیقی مادہ اور معنی سے عاری خالی دکھاوے کے لئے انسانی کوششوں کی قدر کم ہوجاتی ہے۔ غزالی ان اندرونی بیماریوں کا علاج فراہم کرتی ہے جو اندرونی سکون اور سکون میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ غزالی کی اس کتاب کے مندرجات یہاں مختصر شکل میں اس طرح پیش کیے گئے ہیں:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إنی أخوف ما أخاف علی امتی الرياء والشهوة الخفية التی هی اخفی من دبيب النملة السوداء علی الصخرة الصماء فی الليلة الظلماء

انہوں نے کہا کہ میں اپنی قوم میں شہرت، وقار اور مقبولیت کے حصول کی دو مضر اندرونی خصلتوں سے سب سے زیادہ خوفزدہ ہوں۔ وہ ایک تاریک سیاہ رات میں سیاہ سیاہ چیونٹی کے رینگنے سے کہیں زیادہ سمجھدار ہیں [کیونکہ اس کا پتہ لگانا انتہائی مشکل ہے ، لہذا روح کے ان دو نقصانات سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے انتہائی احتیاط برتنی چاہئے جو روح کے اندرونی حصوں میں دفن ہوسکتے ہیں جو روحانی راستے سے روکتے ہیں]۔ (بیان کردہحدیث کا مجموعہ *ابن ماجہ اور* حکیم شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے

یہی وجہ ہے کہ بڑے علماء (علمائے الہیات) کو بھی دکھاوے اور ہوس کے نقصانات کا علم معلوم نہیں ہوتا، لہٰذا ہم غیر علماء کے عبادت گزاروں (عام لوگوں) اور اہل خدا پرست سے اس کا علم کیسے رکھ سکتے ہیں۔ نفس کے آخری

باطنی نقصانات میں سے ایک ہے، اور اس کے دانشمندانہ فریب اور جو لوگ ان میں خاص طور پر ملوث ہیں، وہ علماء الدین، عبادت گزار اور وہ لوگ ہیں جو آخرت کی راہ پر چلنے کے لیے پرعزم ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ مشکل روحانی کشمکش کے بعد اپنے نفس کو محکوم بناتے ہیں، اپنے نفس کو مشکوک باتوں سے بچاتے ہیں [جو صرف حرام چیزوں اور واضح چیزوں سے نہیں بلکہ دیکھنا مشکل ہیں] اور انہیں عبادت الٰہی کی طرف مائل کرتے ہیں۔ اس حالت میں وہ جسمانی اعضاء سے کھلے گناہ کرنے سے قاصر ہو جاتے ہیں [اب تک کی روحانی کوششوں کی وجہ سے]۔

اس تکلیف سے کچھ سکون حاصل کرنے کے لیے وہ اپنے نیک اعمال کو ظاہر کرنے اور لوگوں میں مقبولیت اور عزت حاصل کرنے کے سوا کوئی اور راستہ تلاش نہیں کرتے۔ یہ مقبولیت انہیں خوشی دیتی ہے اور مشکلات کی شدت کو کم کرتی ہے، جس سے نکلنا مشکل ہے [ان کی روحانی کوششوں کی وجہ سے جو فطرت میں مشکل ہیں]۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے نیک اعمال کا اظہار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ مخلوق کو ان کی عبادت اور کوشش سے آگاہ کیا جائے۔ خالق کا علم کافی ہونا چاہیے تھا لیکن کافی نہیں ہے اور وہ لوگوں کی تعریف کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر ہم خواہشات اور خواہشات کا انکار کریں گے، شکوک و شبہات سے باز رہیں گے اور عبادت الٰہی کی سختیوں سے باز نہ آئیں گے تو لوگوں کی زبانیں ہماری حمد و ثنا میں مبالغہ آرائی کریں گی، ان کی نظروں میں ہمارے لیے احترام اور عزت ہو جائے گی، وہ ہم سے ملنے اور ہماری طرف دیکھنا بہت عزت اور فخر کا ذریعہ سمجھیں گے۔ وہ ہماری نمازوں سے فائدہ اٹھائیں گے، ہماری رائے پر عمل کریں گے، ہماری خدمت کریں گے، ہمیں سلام و سلام کرنے میں پیش رہیں گے، [سماجی] محفلوں میں ہماری عزت اور احترام کریں گے، ہمیں خرید و فروخت میں رعایت دیں گے، ہمیں اجتماعات میں [سب سے] آگے رکھیں گے، ہمیں کھانے پینے اور لباس میں اپنے آپ پر ترجیح دیں گے، وہ ہماری طرف عاجزی اور سر جھکائیں گے۔ اور ہمارے [پوشیدہ مقاصد اور] مقاصد کے تابع رہیں گے۔ نفس نفس کو اس سے اتنا لطف ملتا ہے کہ گناہوں کو چھوڑنا مشکل نہیں رہتا اور عبادت کی باقاعدگی آسان ہو جاتی ہے، کیونکہ ادنیٰ نفس نے جو لذت حاصل کی ہے وہ تمام لذتوں کا مرکز ہے۔ یہ شخص یہ سمجھتا ہے کہ میری زندگی خدا کی خاطر ہے اور میں خدا کی مرضی کے مطابق عبادت میں مصروف ہوں، اگرچہ ایسا شخص پوشیدہ ہوس میں مبتلا ہے جو مضبوط اور مضبوط عقل کے علاوہ کسی اور عقل کے ادراک سے باہر ہے۔ ایسا شخص یہ سمجھتا ہے کہ میں دل کی سچائی کے ساتھ اللہ کی اطاعت کرتا ہوں اور اللہ کی حرام چیزوں سے روکتا ہوں، لیکن نفس نفس نے اپنے آپ میں خواہشات اور خواہشات کو جگہ دے دی ہے تاکہ عبادت اللہ کے بندوں کے سامنے آراستہ ہو جائے اور وہ لوگوں کی جھوٹی حمد و ثنا میں خوش ہوں۔ اس سے ان کی اطاعت الٰہی کے اعمال کا بدلہ منسوخ ہو جاتا ہے اور وہ اپنے نیک اعمال کی نعمتوں سے محروم ہو جاتے ہیں اور منافقین کی فہرست میں ان کے نام لکھے جاتے ہیں حالانکہ وہ اپنے آپ کو اللہ کا مقرب سمجھتے ہیں۔

شہرت اور مقبولیت کے حصول کی مذمت

مقبولیت [شہرت اور پیروی کے حصول کی تلاش یا خواہش] کی مذمت کی جاتی ہے اور گمنامی کو پسند اور ترجیح دی جاتی ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

حب المرء من الشر الا من عصمہ اللّٰہ یشیر الناس الیہ بالا صابع فی دینہ و دنیاہ

"کسی میں برائی کافی ہے، سوائے اس کے جس کی اللہ تعالیٰ حفاظت کرتا ہے، لوگ اپنے مذہب یا دنیا (دنیاوی حیثیت، شہرت، کسی نہ کسی قابلیت، قابلیت، طاقت یا دولت کی وجہ سے مقبولیت) کے بارے میں انگلیوں سے ایک کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ (بیان کردحدیث کا مجموعہ *بیحقی فی الشعب*)

بشار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جس نے مقبولیت کو پسند کیا ہو اور اس کی وجہ سے اس کا ایمان (دین) تباہ اور ذلیل نہ ہوا۔ جو شہرت کا طالب ہے وہ آخرت کی لذتوں میں شریک نہیں ہوتا۔

گمنامی کی فضیلت: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

رب اشعث اغبر ذی طمرین لا یئوبہ لہ لو اقسم علی اللّٰہ لأ برہ منھم البراء بن مالک

"بہت سے ایسے ہیں جن کے بال بکھرے ہوئے ہیں اور دھول آلود شال ہیں جن کو کوئی اہمیت نہیں دیتا، کیونکہ وہ غریب ہیں، کم نظر آتے ہیں، عاجز اور پست معاشرتی حیثیت سے تعلق رکھتے ہیں، جن کے بارے میں لوگ کسی دنیاوی حیثیت اور مقام کی کمی کی وجہ سے زیادہ نہیں سوچتے، لیکن اگر وہ خدا کی قسم کھائیں تو اللہ یقینا وہ کچھ کر دے گا جس پر انہوں نے قسمیں کھائی تھیں، اللہ کے ہاں ان کی گنوس کی وجہ سے ان کا مقام بہت زیادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ سے قربت اور قربت اور بارہ بن مالک ان میں سے ایک ہے۔ (بیان کردہحدیث کا مجموعہ صحیح *مسلم* ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

رب ذی طمرین لا یئوبہ لہ لو اقسم علی اللّٰہ لابرہ' لو قال: اللّٰھم انی اسالک الجن لا عطاہ الجن ولم یعطہ من الدنیا شیئا

"بہت سے لوگ جن کے پاس دو شال ہیں [اور ان کے پاس صرف اتنا ہی ہے جو ان کی غربت کو ظاہر کرتا ہے] وہ ایسے ہیں کہ کوئی ان کو کوئی اہمیت نہیں دیتا، لیکن اگر وہ کسی چیز پر خدا کی قسم کھاتے ہیں تو اللہ یقینا ان کی قسمیں کو پورا کرتا ہے۔ اگر وہ یہ دعا کریں تو اے اللہ! میں تجھ سے اپنی جنت مانگتا ہوں، اللہ تعالیٰ انہیں جنت عطا فرمائے گا اگرچہ وہ انہیں دنیا میں کچھ نہ دے۔ (بیان کردہ احادیث کے مجموعے ابن ابی الدنیا *اور* ابو منصور الدیلمی

الا ادلکم علی اھل الجنۃ کل ضعیف مستضعف لو اقسم علی اللّٰہ لأ برہ واھل النار کل مستکبر جوّاظ

"کیا میں تمہیں یہ نہیں بتاؤں کہ اہل جنت کون ہیں؟ ہر کمزور اور عاجز جو اگر خدا کی قسم کھائے گا تو یقینا اللہ ان کی منت پوری کرے گا اور دوزخی ہر تکبر ، غیر مہذب ، بدتمیز اور نافرمان ہیں۔ (بیان کردہ*احادیث* کے مجموعے *صحیح بخاری* اور *صحیح مسلم*)

فذیل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگر تم نامعلوم رہ سکتے ہو تو ضرور ایسا کرو۔ کیا شہرت اور مقبولیت تلاش کرنا اور [ہر طرف سے لوگوں سے] تعریفیں جمع کرنا ضروری ہے؟ اگر آپ خدا کے پیارے اور پیارے ہیں تو لوگوں کی نظر میں ناپسند ہونے سے آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ یہ روایات شہرت کی مذمت (ناپسندیدگی اور حوصلہ شکنی) اور گمنامی کی فضیلت (نامعلوم ہونا) پر روشنی ڈالتی ہیں۔ شہرت اور مقبولیت اپنے آپ میں تلاش نہیں کی جاتی بلکہ اقتدار اور وقار کا حصول مقصد ہے اور طاقت اور وقار کو پسند کرنا تمام انتشار کی جڑ ہے۔ شہرت اور شہرت کی تلاش کی مذمت کی جاتی ہے لیکن اگر کوئی شخص اس کی خواہش ، تلاش اور کوشش کیے بغیر صرف خدا کے فضل سے حاصل کرتا ہے تو یہ قابل مذمت نہیں ہے۔ تاہم ، یہ [ذہنی ، جذباتی ، نفسیاتی اور روحانی طور پر] کمزوروں کے لئے پریشانی (فتنہ) کا سبب بن سکتا ہے۔ اس کے باوجود ، مضبوط کردار کے مالک اس کی پریشانی سے محفوظ رہیں گے۔ کمزور کی مثال اس شخص کی طرح ہے جو ہاتھ پاؤں حرکت کرنا جانتا ہے [لیکن پھر بھی تیرنا نہیں جانتا] اور ڈوبنے والے لوگوں میں شامل ہے۔ بہتر یہ ہے کہ ڈوبنے والے اس شخص کو نہ پہچانیں جو ہاتھ اور پاؤں حرکت کرنا جانتا ہے کیونکہ جب وہ کسی کو ہاتھ اور پاؤں حرکت کرتے ہوئے دیکھیں گے تو وہ ایسے شخص کو پکڑ لیں گے۔ [اس کے نتیجے میں،] وہ خود ڈوب جائیں گے اور کوشش کرنے والے کو بھی ڈوبنے کا سبب بنیں گے۔ تاہم طاقتور کے لیے شہرت کا کوئی نقصان نہیں بلکہ ڈوبنے والے ماہر تیراک سے بخوبی واقف ہوں تاکہ وہ ایسے تیراک کو پکڑ کر ساحل تک پہنچ کر نجات حاصل کر سکیں۔

طاقت اور وقار سے محبت کی مذمت: خدا فرماتا ہے:

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا

"ہم آخرت کا گھر ان لوگوں کو دیں گے جو زمین میں سرکشی اور فساد کے خواہاں بھی نہیں ہیں۔" (سورۃ البقرۃ البقرۃ آیت 83)

اس آیت میں فساد اور عظمت و جلال کی تلاش دونوں کی نیت اور خواہش دونوں کو ایک ہی جگہ پر بیان کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ آخرت صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو نیت اور خواہشات دونوں سے عاری ہیں کیونکہ یہ دونوں کسی بھی روحانی خواہشات کے لیے مہلک ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

حب المال والجاہ ینبتان النفاق فی القلب کما ینبت الماء البقل

"دولت اور شہرت سے محبت دل میں منافقت کو اسی طرح پیدا کرتی ہے جس طرح پانی پودوں کو بڑھاتا ہے"۔

شہرت اور اس کی حقیقت: شہرت اور دولت دنیا کے دو عناصر ہیں۔ دنیا کا مفہوم ان چیزوں کا مالک بننا ہے جن سے مادی طور پر فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اور شہرت کا مطلب ان دلوں کا مالک بننا ہے جن کی احترام، اطاعت اور پیروی مطلوب ہو۔ جس طرح ایک دولت مند مال کا مالک بن جاتا ہے اور اس طرح اپنے مقاصد کو حاصل کرتا ہے اور نفس

کی خواہشات اور لذتوں کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، اسی طرح ایک مشہور شخص دلوں کا مالک بننے کے بعد ان کو اپنے مفادات اور مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرتا ہے۔ جس طرح دولت مختلف صنعتوں اور پیشوں کے ذریعے حاصل کی جاتی ہے، اسی طرح معاملات میں خوبصورت طرز عمل اور احسان کے ذریعے دلوں کو بھی جیتا جاتا ہے۔ دلوں کو علم اور ایمان کے ذریعے فتح کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی دل کو یہ خیال آتا ہے کہ کسی کے پاس کوئی خاصیت یا قابلیت ہے تو وہ دل اس سے فتح یاب ہو جائے گا اور اس کے ایمان کی طاقت اور شدت کے مطابق (کسی دوسرے شخص کی صفت اور قابلیت پر) ہو جائے گا تو دل اس شخص کے تابع ہو جائے گا۔ [مطلوب یا سراہا] معیار یا قابلیت کو اپنے آپ میں کامل ہونے کی ضرورت نہیں ہے ، بلکہ مداح کے دل میں ایک کمال کے طور پر سمجھنے کے لئے یہ کافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ (مداح کا دل) بعض اوقات کسی چیز کو ایک کمال سمجھتا ہے جو حقیقت میں کمال نہیں ہے اور دل اس کے تابع ہو جاتا ہے جس کی تعریف کی جا رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دل کی تابعداری ایک حالت (حالت) ہے اور دل کی حالتیں اس کے عقائد، علم اور تخیل کے تابع ہیں۔ جس طرح دولت اور مادی املاک سے مرہب مزاج لوگوں پر قابو پانا چاہتے ہیں، اسی طرح شہرت کو پسند کرنے والے لوگ آزاد انسانوں کی گردن میں غلامی کی زنجیریں ڈالنا چاہتے ہیں تاکہ وہ اپنے دلوں پر مکمل تسلط حاصل کر لیں تاکہ وہ ان کو اپنے مفادات کے حصول کے لیے استعمال کر سکیں۔ شہرت کے متلاشی کی طرف سے مطلوب غلامی (کنٹرول) دولت کے متلاشی کی غلامی سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک امیر اور طاقتور شخص زبردستی ان لوگوں کا کنٹرولر بن جاتا ہے جن کو اگر انتخاب دیا جاتا ہے تو ایک لمحے کے لیے بھی اطاعت نہیں کرتا۔ شہرت کا طالب اپنی مرضی اور مرضی سے غلاموں کو آزاد بناتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ لوگ اپنی مرضی سے اور خوشی سے اس کی اطاعت کریں اور یہ اطاعت اور فرمانبرداری ان کی دوسری فطرت بن جائے۔ اس سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آتی ہے کہ شہرت کے متلاشی کا مقصد دولت کے متلاشی کے مقصد سے کہیں زیادہ ہے۔

بہرحال شہرت کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں جگہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں، فضیلت اور کمال کی صفات میں سے کسی صفت (صفت جو باطنی صفت ہو سکتی ہے) کی موجودگی کے بارے میں دل میں پختہ یقین رکھنا۔ کمال کے بارے میں اس عقیدے کی مضبوطی کے متناسب طور پر مندرجہ ذیل (لوگوں کی طرف سے) کی زیادتی ہو گی اور اس کے متناسب شہرت کا طالب علم اور دلوں کی تابعداری ہو گی اور دلوں پر اس قابو اور محکوم ہونے کے متناسب شہرت اور اس کے نتیجے میں ہونے والی خوشی سے محبت ہوگی۔ شہرت کے ثمرات اور نتائج ہیں ، مثال کے طور پر ، لوگوں کی تعریف اور اس میں حدود سے تجاوز کرنا۔ جو شخص کسی کے کمال کا قائل ہو وہ اس عقیدے کے اظہار سے خاموش نہیں رہتا اور کمال کی تعریف کرتا ہے۔ شہرت اور وقار کے ثمرات میں سے ، شہرت کے مالک کی خدمت ہے ، کیونکہ یہ عقیدہ رکھنے والا شخص اپنے آپ کو خدمت کے لئے وقف کرتا ہے اور شہرت کے مالک کے تابع رہتا ہے جو کسی کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرتا ہے۔ اسی طرح شہرت کے مالک کے ساتھ پرہیزگاری کرنا، اختلاف رائے کا مظاہرہ نہ کرنا، احترام کرنا، پہلے سلام کرنا اور سلام کرنا، محفلوں میں مہمان خصوصی بنانا، ہر معاملے میں کسی کو سرفہرست رکھنا، شہرت کے ثمرات میں سے ہیں جو اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب کسی کو دل میں جگہ دی جاتی ہے اور اس کے کمال پر یقین کیا جاتا ہے، چاہے وہ کسی کے علم کی وجہ سے ہو۔ عبادت، خوبصورت عادات، ظاہری خوبصورتی، نسب، سیاسی اختیار، طاقت یا کوئی اور پہلو جسے لوگ کمال سمجھتے ہیں۔ یہ تمام صفات دلوں میں جگہ بناتی ہیں اور ان کے مالکوں کو عزت ملتی ہے۔

شہرت کو اتنا پسند کیوں کیا جاتا ہے؟ جہاں تک سوال کا تعلق ہے کہ کچھ لوگ شہرت کو اتنا پسند کیوں کرتے ہیں تو شاید ہی کوئی دل ایسا ہو جو اس سے خالی ہو اور شدید روحانی جدوجہد کے بغیر اس سے چھٹکارا حاصل نہ کیا جا سکے۔ شہرت کا مطلب ہے لوگوں کے دلوں کا مالک بننا۔ جس طرح انسان سونے اور چاندی کا مالک ہو کر اپنے

تمام مقاصد کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، اسی طرح انسان لوگوں کے دلوں کا مالک ہو کر اپنے تمام مقاصد کو پورا کرنے کی صلاحیت حاصل کرتا ہے، کیونکہ دونوں چیزوں (دولت اور شہرت) کی محبت کا سبب ایک ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دلوں میں دولت اور شہرت دونوں کی محبت ہوتی ہے، لیکن شہرت دولت پر افضل ہے، اس لیے شہرت کی محبت دولت سے زیادہ ہے۔

دولت پر شہرت کو ترجیح کیوں دی جاتی ہے؟ تین وجوہات کی بناء پر دولت پر شہرت کو ترجیح دی جاتی ہے:

پہلی وجہ یہ ہے کہ دولت کے ذریعے شہرت حاصل کرنے کے مقابلے میں شہرت کے ذریعے دولت تک پہنچنا آسان ہے۔ لہٰذا اگر کوئی دنیاداری سے پرہیز کرنے والا (*زاہد*) ہو یا کوئی عالم دین (*علیم*) جس کی عزت دلوں میں رچ ہو گئی ہو اور وہ دولت کمانا چاہتا ہو تو وہ آسانی سے ایسا کر سکتا ہے کیونکہ محترم دل اپنا مال ایسے لوگوں پر خرچ کر سکتا ہے جن کی وہ عزت کرتے ہیں اور ان سے محبت کرتے ہیں۔ لیکن اگر جو شخص کمال کی کسی بھی خصلت سے محروم ہو، اسے کوئی خزانہ مل جائے اور وہ شہرت سے محروم ہو اور دولت کے ذریعے شہرت حاصل کرنا چاہتا ہو تو یہ مشکل ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص شہرت کے ذریعے دولت کما سکتا ہے لیکن دولت کے ذریعے شہرت حاصل نہیں کر سکتا۔ اس لحاظ سے ، شہرت زیادہ محبوب ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ دولت کو ضائع کیا جا سکتا ہے کیونکہ اسے چوری کیا جا سکتا ہے، چھین لیا جا سکتا ہے، [سرکاری] اہلکار اور ظالم اس کی خواہش کرتے ہیں۔ ان کو ذخیرہ کرنے کے لئے اسے تحفظ ، حفاظت اور محفوظ اسٹوریج کی ضرورت ہے۔ درحقیقت، دولت کے بہت سے نقصانات ہیں [اس سے وابستہ]۔ دوسری طرف اگر آپ دلوں کے مالک بن جاتے ہیں تو آپ کو کسی قسم کا نقصان نہیں اٹھانا پڑے گا کیونکہ دلوں میں چھپے ہوئے خزانے اتنے گہرے ہیں کہ وہ چوری نہیں کیے جا سکتے اور نہ ہی ڈاکوؤں اور لٹیروں کو ان تک رسائی حاصل ہے۔ دلوں کے خزانے اپنے آپ میں محفوظ ہیں اور اس لحاظ سے شہرت ضبطی اور چوری سے محفوظ ہے۔ لیکن دلوں کے خزانوں کے ساتھ یقینا ایک خطرہ موجود ہے کہ کوئی شخص ان کو گمراہ کرنے (مایوس) کرنے یا شہرت کے مالک کو بدنام کرنے میں کامیاب ہو جائے اور [شہرت کی شخصیت میں کمالات کے عقیدے کو مداحوں کے دلوں سے مٹانے کے قابل ہو جائے۔ تاہم اس خطرے کا شاذ و نادر ہی سامنا کرنا پڑتا ہے، دوسری بات یہ کہ اس کا دفاع (قابل تعریف شخص میں کمالات کا عقیدہ) بغیر کسی مشکل کے کیا جا سکتا ہے، پھر [تیسرا] یہ عقیدہ عام طور پر [دلوں میں] اس قدر مضبوطی سے پیوست ہو جاتا ہے کہ کی کوششیں [عام طور پر] کامیاب نہیں ہوتیں [کیونکہ لوگ اپنے عقائد کو ترک نہیں کرتے اگرچہ عقائد غلط یا بے بنیاد ہو سکتے ہیں]۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ دلوں کی ملکیت لامحدود ہے اور بغیر کسی پریشانی کے بڑھتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب دل احترام سے بھرے ہوتے ہیں اور اپنے علم و اعمال پر ایمان رکھتے ہیں تو زبانیں اس کی حمد و ثنا اور تسبیح کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ لوگ خود یہ عقیدہ رکھتے ہیں اور دوسروں کے سامنے اس کا اظہار کرتے ہیں جو بدلے میں اسی احترام کی طرف مائل ہوجاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ [انسانی] مزاج مقبولیت اور شہرت کو پسند کرتے ہیں کیونکہ جب کسی کا ذکر عام ہو جاتا ہے تو شہرت ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک ملک سے دوسرے ملک تک جاتی ہے جس کی وجہ سے دل عزت و احترام کے لیے خود کو مجبور کر لیتے ہیں۔ [کسی کی شہرت] کی ترسیل کا یہ سلسلہ پھیلتا رہتا ہے اور اس کی کوئی انتہا یا حد نہیں ہے۔ دولت کے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ دولت مند مشکلات اور محبت کے بغیر اپنی دولت میں اضافہ نہیں کر سکتے۔ شہرت مسلسل چلتی رہتی ہے اور کہیں نہیں رکتی۔ دولت ایک

ہی جگہ پر رہتی ہے اور [بڑھنے کی کوشش] کے ساتھ بڑھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دولت شہرت سے کمتر ہے۔ یہ دولت پر شہرت کو ترجیح دینے کی کچھ اعلیٰ سطحی وجوہات ہیں اور اگر ان کی مزید وضاحت کی جائے تو اس کی بے شمار وجوہات ہو سکتی ہیں۔

دولت اور شہرت سے محبت ہر فرد کے دل میں ہے۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک وجہ واضح ہے ، اور ہر کوئی جانتا ہے ، اور دوسری وجہ پوشیدہ ہے اور یہی بڑی وجہ ہے لیکن یہ بہت لطیف ہے۔ سست دماغ اور عقل سے عاری افراد سے یہ توقع نہیں کی جاتی کہ وہ جانیں لیکن سمجھدار لوگ بھی اس کی وجہ سے واقف نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ عقل نفس کی رگ اور انسانی مزاج کے خفیہ تقاضوں سے مدد لیتا ہے اور اس سے صرف وہی لوگ واقف ہیں جو اس سمندر میں گہری غوطہ لگاتے ہیں۔

پہلی وجہ - خوف کا خاتمہ: اس وجہ کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان مستقبل کے خوف کی وجہ سے دولت کا لالچ رکھتا ہے۔ بری رائے (اپنے مستقبل کے بارے میں) انسان کو لالچی بنا دیتی ہے، اگرچہ اس کے پاس اپنی ضروریات کے لیے کافی دولت ہو سکتی ہے۔ لیکن چونکہ انسان لمبی عمر کے خواہشمند اور امید رکھتا ہے، اس لیے کسی کی خواہشات کی کوئی حد نہیں ہے۔ اس کے دل میں یہ خوف باقی رہتا ہے کہ اس کی طبیعت میں جو مال ہے وہ ختم ہو جائے اور دوسروں کے سامنے محتاج ہو جائے۔ جب یہ خیال دل میں آتا ہے تو خوف اس کے دل کو گھیر لیتا ہے اور یہ خوف اس وقت تک دور نہیں ہوتا جب تک کہ کوئی دوسرا مال اس کے پاس نہ ہو جائے تاکہ اگر کسی حادثے کی وجہ سے پہلی دولت ضائع ہو جائے تو وہ پہلی دولت کا متبادل بن جائے۔ ہر لمحہ ، انسان ان خوف سے گھرا ہوا ہے۔ زندگی سے شدید محبت انسان کو یہ اندازہ لگانے پر مجبور کرتی ہے کہ وہ طویل عرصے تک زندہ رہے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ ، کوئی فرض کرتا ہے کہ کسی کی زندگی کی طوالت کے تناسب سے ، اس کی ضروریات میں بھی اضافہ ہوگا۔ یہ بھی فرض کیا جاتا ہے کہ "میری دولت نقصانات اور مشکلات سے گھری ہوئی ہے اور کسی بھی لمحے ضائع ہو سکتی ہے"۔ یہ خیال انسان کو خوفزدہ کر دیتا ہے جو زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کر کے اپنے آپ کو اس خوف سے بچانے کی کوشش کرتا ہے تاکہ اگر کچھ دولت ضائع ہو جائے تو دوسری دولت دوسروں کے سامنے بھیک مانگنے والے کا ہاتھ پھیلانے کی ضرورت کو ختم کر دے گی۔ یہ خوف کسی کو کسی بھی مقررہ دولت پر آباد ہونے کی اجازت نہیں دیتا، بلکہ وہ پوری دنیا کا مالک بننے کی خواہش رکھتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

منهومان لا يشبعان منهوم العلم ومنهوم المال

"دو لالچی کبھی مطمئن نہیں ہوتے، ایک علم کا لالچی اور دوسرا مال کا لالچی ہے"۔ (بیان *کردہابو مسعود رضی اللہ عنہ* سے حدیث *کا* مجموعہ طبرانی

شہرت سے محبت کی تقریبا یہی وجہ ہے۔ جو شخص دور دراز ممالک میں رہنے والے لوگوں کے دلوں میں اپنی اعلیٰ درجے کی عزت اور قدر قائم کرنا چاہتا ہے، وہ حقیقت میں اس خوف میں مبتلا ہے کہ کسی وقت کسی کو اپنے وطن سے الگ ہو کر کسی اور جگہ رہنے کی ضرورت پڑ سکتی ہے، یا وہ لوگ کسی نہ کسی وجہ سے آکر اپنے وطن میں رہنا شروع کر سکتے ہیں۔ اس صورت حال میں یقینا ان کی مدد کی ضرورت پڑے گی۔ اس کے باوجود ، یہ امکان موجود ہے ، اور دور دراز رہنے والے لوگوں سے مدد لینا ناممکن نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی کے دل میں اعلیٰ درجے کی عزت و قدر قائم ہو جائے تو یہ معاملہ انتہائی خوشگوار اور خوشگوار ہوتا ہے۔

دوسری وجہ: یہ ایک مضبوط وجہ ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ روح ایک حکم الٰہی ہے۔ قرآن مجید نے روح کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلرُّوحِ ۖ قُلِ ٱلرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّى

"وہ تم سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ جان میرے رب کے حکم سے ہے۔ (سورۃ البقرۃ سورۃ البقرۃ آیت 85)

روح کے "ربوبی" ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ روح کا تعلق روحانی طور پر بے نقاب علم (*علوم المکاشفہ*) کے رازوں سے ہے جس کے انکشاف کی اجازت نہیں ہے [کیونکہ علم الٰہی حکمت سے تعلق رکھنے والے لوگ اس کے تقدس کو عوام سے محفوظ رکھتے ہیں جو اس کی عدم فہم اور تعریف کی وجہ سے اس کے مستحق نہیں ہیں"۔ اور اسے بنی نوع انسان کی بہترین روحوں کے لیے محفوظ رکھنا ہے - روحانی طور پر روشن روحیں جو اس علم کے لیے کوشش کرتی ہیں جو تمام علموں میں سب سے اعلیٰ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر اس کے انکشاف کی اجازت دی جاتی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم روح کی حقیقت کو ظاہر کر دیتے۔ اس موضوع پر مزید بحث کرنے سے پہلے یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ روح چار قسم کی صفات (مزاج کی داخلی صفات اور مزاج کی طرف مائل ہوتی ہے)۔ [سب سے پہلے،] جانوروں کی خصوصیات جیسے کھانا اور جماعت۔ [دوسرا،] وحشیانہ خصوصیات جیسے قتل ، مار پیٹ ، درد [اور مصائب] کا سبب بننا۔ [تیسرا،] شیطانی صفات جیسے دھوکہ دہی، مکاری اور (لوگوں کو ہدایت اور راست راستی سے روکنا)۔ [چوتھا،] تکبر، عزت اور برتری جیسی الہامی صفات دل کے ان متنوع صفات کی طرف جھکاؤ کی وجہ یہ ہے کہ انسان کچھ اصولوں پر مشتمل ہے جن کی وضاحت کرنا بہت طویل ہے۔ یہاں یہ کہنا کافی ہے کہ انسان کو "رب کا حکم" حاصل ہے، اسی لیے انسان مزاج کے لحاظ سے ربوبیت کو پسند کرنے کی طرف مائل ہوتا ہے۔
ربوبیت کا مطلب کمال میں انفرادیت اور وجود میں استقامت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وجود میں شریک ہونا ناقص ہونے کی علامت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورج کا کمال اس کے وجود میں استقامت میں ہے۔ اگر کوئی اور سورج ہوتا تو یہ اس کے لیے ایک خامی ہوتی کیونکہ اس وقت یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ سورج اپنے کمال میں منفرد اور تنہا ہے۔ وجود میں بے گانا خدا ہے کیونکہ اس کے سوا کوئی دوسرا وجود نہیں ہے۔ اللہ کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ اس کی قادر مطلق کی طرف اشارہ ہے جو اپنے آپ میں موجود نہیں ہے، بلکہ ان کا وجود خدا کے وجود کے ذریعے سے ہے۔ بقائے باہمی کا تقاضہ درجے میں برابری اور درجے میں برابری کمال اور کمال میں ایک خامی ہے۔ کامل صرف وہی ہوتا ہے جس کے درجے میں کوئی مثال (شریک شراکت) نہ ہو۔ سورج کی روشنی پوری دنیا کو روشن کرتی ہے تو یہ اس کی ناقص نہیں بلکہ اس کے کمال کا اشارہ ہے۔ نامکمل اس وقت ہوگی جب اسی حیثیت اور درجے کا دوسرا سورج وہاں موجود ہوتا اور وہ دوسرے سورج سے غافل ہوتا۔ اللہ کے سوا تمام وجودوں کی یہی حالت ہے۔ یہ حقیقی سورج (خدا) سے زندگی کی روشنی تلاش کرنے کے بعد بھی اپنے وجود کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ یہ تمام وجود حقیقی وجود (خدا) کے تابع ہیں اور ان کے تابع نہیں ہیں۔ البتہ ربوبیت کا مطلب ہے وجود میں منفرد ہونا۔ ہر انسان مزاج کے لحاظ سے کمال میں منفرد ہونا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض روحانی مرشد (اولیاء اور گنوسٹکس) نے کہا ہے کہ کوئی انسان ایسا نہیں ہے جس کے باطن میں وہ نہ ہو جو فرعون نے اس وقت بیان کیا تھا:

أَنَا۠ رَبُّكُمُ ٱلْأَعْلَىٰ

"میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں۔" (سورۃ البقرۃ باب 79، آیت 24)

لیکن انسان کے پاس برتری اور برتری حاصل کرنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ کوئی کمال چاہتا ہے لیکن اس میں کامل بننے کی اتنی صلاحیت نہیں ہے۔ خدا کی غلامی (*عبادیہ*) کو نچلے نفس (نفس) پر زبردست طاقت حاصل ہے اور ربوبیت (*ربوبیا*) مزاج کے لحاظ سے پیاری اور محبوب ہے۔ اس تعلق کی وجہ سے روح کا اس ربوبیت سے ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ کے اس قول میں اشارہ کیا گیا ہے کہ "ان سے کہو کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے"، کمال کی محبت اور تمنا ختم نہیں ہوتی اور انسان اس کے تخیل سے لذت حاصل کرتا ہے، حالانکہ انسان کمال کی انتہا تک نہیں پہنچتا۔ ہر جاندار اپنے وجود اور وجود کے کمال سے محبت کرتا ہے، اور موت سے نفرت کرتا ہے جو کسی کے وجود کے خاتمے اور [سمجھا جاتا ہے] کمال کی صفت کا سبب بنتا ہے۔ اگر وجود کا خاتمہ نہیں ہوتا تو اسے کمال سمجھا جائے گا، کیونکہ [نتیجتا] کسی کو زیادہ تر مخلوقات پر برتری اور غلبہ حاصل ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ انسان اپنے مزاج میں اختیار، برتری اور غلبہ پسند کرتا ہے۔ تاہم ، یہ چیزوں پر غلبہ سمجھا جائے گا جب کسی فرد کے پاس اپنی نیت اور خواہش سے تبدیلی اور اثر ڈالنے کی طاقت ہوتی ہے ، اور وہ چیزیں کسی کے تابع ہوجاتی ہیں ، جو ان کے ساتھ وہی کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ اس طرح انسان کے لیے ان چیزوں پر غلبہ حاصل کرنا محبوب ہو گیا جو کسی کے ساتھ ہیں۔

مخلوقات کی اقسام: جو مخلوقات موجود ہیں ان کی کئی قسمیں ہیں۔ کچھ مخلوقات خدا کی ہستی اور صفات کی طرح کسی بھی تبدیلی یا اثر کو قبول نہیں کرتیں۔ کچھ مخلوقات اس تبدیلی کو قبول کرتی ہیں لیکن مخلوقات [انسانوں کی طرح] ان پر کوئی کنٹرول نہیں رکھ سکتیں جیسے آسمان، ستارے، آسمانی سلطنت، فرشتہ مخلوقات، جن (مافوق الفطرت غیر مرئی مخلوقات جو زمین پر موجود ہیں)، شیطان وغیرہ۔ تیسری قسم میں وہ مخلوق شامل ہیں جن میں انسان تبدیلی کا سبب بن سکتا ہے جیسے زمین کے اجزاء، معدنیات، پودے، جانور۔ ان مخلوقات میں ، لوگوں کے دل ہیں جو جسم کی طرح تبدیلی اور اثر کو قبول کرتے ہیں ، اور بالکل اسی طرح جیسے جانوروں کے جسموں میں موجود تبدیلی اور اثر کی صلاحیت۔

علم کی بنیاد پر تسلط کی خواہش: [جن کا وجود ہے] ان کی تقسیم یہ ہے کہ کچھ میں انسانی اثر کی صلاحیت ہوتی ہے جیسے زمین سے تعلق رکھنے والی چیزیں اور کچھ میں خدا کی ہستی ، فرشتوں اور آسمان (آسمان اور کائنات میں اس سے آگے اور اس سے بھی آگے کی چیز) کی طرح کوئی انسانی اثر نہیں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کی خواہش ہے کہ چونکہ وہ آسمانوں (کائنات اور اس سے ماورا چیز) پر غلبہ حاصل نہیں کر سکتا، اس لیے وہ علم کے ذریعے غلبہ حاصل کرے اور اس کے رازوں اور نزاکتوں کا ادراک حاصل کرے اور یہ بھی غلبہ کی ایک شکل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علم سے گھیرے ہوئے شے علم میں داخل ہو جاتی ہے اور عالم کو اس پر غالب قرار دیا جاتا ہے۔ غلبہ کی خواہش نے انسان کو خدا، فرشتوں، کائناتوں، ستاروں، پہاڑوں اور سمندروں کے عجائبات اور اسرار سے آشنا ہونے پر مجبور کیا کیونکہ علم بھی غلبہ کا ایک طریقہ ہے اور غلبہ بھی کمال کی ایک قسم ہے۔ علم کا کمال انسان کو خوشیوں سے بھر دیتا ہے۔

پہلی قسم [علم کی بنیاد پر غلبہ] کا تعلق زمین پر موجود چیزوں سے ہے۔ انسان کو [دنیاوی چیزوں کے بارے میں] کافی علم نہیں ملتا بلکہ وہ کنٹرول اور اثر کا غلبہ چاہتا ہے تاکہ وہ اثر اور تبدیلی کے عمل کو اپنی مرضی کے مطابق انجام دے سکے۔ زمین پر موجود چیزیں دو طرح کی ہیں - جسم اور روح۔ لاشوں میں سونا، چاندی، مادی سامان وغیرہ جیسی چیزیں شامل ہیں۔ ان چیزوں میں انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ عملی طور پر تبدیلی اور اثر انداز ہونے کے قابل ہو، انہیں جہاں چاہے رکھے، جسے چاہے دے اور کسی کو نہ دے جس کو وہ نہیں چاہتا۔ کسی چیز پر غلبہ اور طاقت رکھنے کو "قابلیت" کہا جاتا ہے اور قابلیت کمال ہے۔ کمال ربوبیت کی ایک خصوصیت ہے اور

ربوبیت انسانی مزاج کو محبوب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان مال سے محبت کرتا ہے، چاہے اسے اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو، لباس، کھانا، پینا اور خواہشات کی تکمیل جیسی خواہشات کی تکمیل میں۔ ایک جسم اور روحوں پر اثر انداز ہوتا ہے لیکن دلوں کو فتح کرنے سے قاصر ہوتا ہے کیونکہ کمال کے عقیدے کے بغیر دلوں کو فتح نہیں کیا جاتا (یا محکوم نہیں کیا جاتا ہے)۔ تاہم ، غصہ کمال کا متبادل بن جاتا ہے۔ غصے اور طاقت میں بھی خوشی ملتی ہے، کیونکہ ان میں بھی کنٹرول اور استحقاق کا اثر ہوتا ہے۔

دوسری قسم (علم کی بنیاد پر غلبہ) میں انسان کے نفس (*نفس*) اور دل (*قلب*) شامل ہیں۔ زمین پر ان سے بہتر اور قیمتی کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ انسان کی خواہش ہے کہ وہ نفس اور دل پر غلبہ حاصل کرے، ان پر فتح حاصل کرے اور جو بھی تبدیلی چاہے کرنے کے قابل ہو۔ اس خواہش کی وجہ یہ ہے کہ دلوں کو فتح کرنا اور ان کو تبدیل کرنا غلبہ کا کمال ہے اور اس کا مشابہت ربوبیت کی صفات سے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ محبت کے بغیر دل فتح نہیں ہوتے، اور محبت اپنے کمال کے یقین کے بغیر نہیں ہوتی، اور ہر کمال محبوب اور محبوب ہے کیونکہ اس کا تعلق صفات الٰہی سے ہے، اور صفات الٰہی انسان کے مزاج کے لیے محبوب ہیں کیونکہ وہ حکم الٰہی (روح) کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں۔ اور انسان کے پاس یہ حکم الٰہی ہے جو موت سے فنا نہیں ہو سکتا اور نہ ہی مٹی کھا سکتی ہے [جب جسم مرنے کے بعد زمین میں دفن ہو جاتا ہے]۔ یہ [الہامی حکم جو ہر انسان میں روح ہے] ایمان (وجود الٰہی، حقیقت، نور، ہدایت اور احکام پر) اور عرفان، الٰہی قربت اور قربت کا مسکن ہے۔ یہی چیز (روح) خدا کی طرف لے جانے کا ذریعہ ہے اور الٰہی بصارت کا سبب ہے۔

اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ شہرت کا مطلب دلوں کی محکومی ہے۔ جس کے لیے دل فتح ہو وہ ان پر غلبہ اور تسلط حاصل کرنے کی توفیق رکھتا ہے اور غلبہ کمال ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ [انسانی] مزاج علم اور طاقت سے محبت کرتا ہے۔ دولت اور شہرت اقتدار کی وجوہات ہیں۔ چونکہ علم کی کوئی حد نہیں ہے، اس لیے جب تک کوئی چیز علم اور اس پر اقتدار کی حدود سے باہر نہیں رہے گی اس وقت تک اس کی خواہش اور جوش و خروش پوری نہیں ہو سکے گا اور [انسانی کمال میں] کمی دور نہیں کی جا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کے لالچ اور مال کے لالچ والے شخص کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ کبھی سیر نہیں ہوتے۔ چنانچہ یہاں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جس چیز کی تلاش کی جاتی ہے وہ کمال ہے اور کمال علم اور قدرت کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ اس کی بے شمار ڈگریاں ہیں۔ ہر انسان کو کمال کی حد تک خوشی اور خوشی ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے شہرت اور دولت سے محبت جو خواہشات کی تکمیل کے باوجود قائم رہتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں شہرت اور دولت سے محبت کم نہیں ہوتی حالانکہ ضروریات پوری ہوجاتی ہیں۔ علم کے معاملے میں انسان اس سے محبت کرتا ہے اگرچہ یہ کسی مقصد کے حصول میں فائدہ مند نہ ہو اور بعض اوقات اپنے مقصد کے حصول کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ تاہم انسانی مزاج راہ کی مشکلات کو برداشت کرتا ہے، اس کی مشکلات پر قابو پاتا ہے اور دل کو علم کے عجائبات سے آراستہ کرتا ہے کیونکہ علم علم کے موضوع پر غلبہ کی ایک شکل ہے اور یہ غلبہ کمال ہے اور کمال ایک صفت الٰہی ہے جس کی وجہ سے اس سے فطری طور پر محبت اور خواہش کی جاتی ہے۔

حقیقی کمال

اللہ تعالیٰ کی ہستی اور صفات کا علم، اس کے اعمال، اس کی حکمت آسمانوں اور زمینوں، دنیا و آخرت اور ان سے تعلق رکھنے والے معاملات کی اہمیت کی صحیح ترتیب سے حقیقی کمال ہے۔ جس شخص کو یہ کمال عطا کیا جائے گا وہ اللہ کے قریب ہو گا اور نفس کا یہ کمال مرنے کے بعد بھی قائم رہے گا اور ایک روشن نور بن جائے گا جس کے بارے میں قرآن نے فرمایا ہے:

يَسْعَىٰ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَـٰنِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَآ أَتْمِمْ لَنَا نُورَنَا

"ان کا نور ان کے آگے ان کے سامنے اور دائیں طرف چلے گا اور وہ کہیں گے: اے ہمارے پروردگار! اس روشنی (روشنی) کو ہمارے لیے ابدی حالت میں کامل کرو۔' (سورۃ البقرۃ باب 66، آیت 8)

دوسرے لفظوں میں یہ گنوسس ایسا سرمایہ (اثاثہ) بن جائے گا کہ وہ علم بھی معلوم ہو جائے گا جو دنیا میں معلوم نہیں تھا۔ اس کی مثال اس شخص کی مانند ہے جس کے پاس ایک چھوٹا سا چراغ ہو جس میں ایک کمزور روشنی ہو اور وہ اسے دوسرے چراغ کو روشن کرنے کے لیے استعمال کرے جس میں زیادہ روشنی ہو۔ جس کے پاس چراغ بھی نہیں ہے وہ نہ تو دوسرا چراغ جلا سکتا ہے اور نہ ہی اصل روشنی کو کامل کر سکتا ہے۔ علم الٰہی (الٰہی علم، قربت اور الٰہی کے ساتھ قربت) سے محروم شخص اس شخص کی مانند ہے جو روشن چراغ سے محروم ہو۔ اس کی مثال اس طرح ہے:

كَمَن مَّثَلُهُۥ فِى ٱلظُّلُمَـٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا

"[جو شخص گنوسس کی حالت میں الٰہی نور سے منور ہے] کیا وہ اس شخص کی مانند ہو سکتا ہے جو تاریکی میں ڈوبا ہوا ہے اور اس سے باہر نہیں نکل سکتا؟" (سورۃ البقرۃ باب 6، آیت 122)

اس کے بجائے، جس تاریکی میں ہے اس کی تشبیہ اس طرح ہے:

أَوْ كَظُلُمَـٰتٍ فِى بَحْرٍ لُّجِّىٍّ يَغْشَىٰهُ مَوْجٌ مِّن فَوْقِهِۦ مَوْجٌ مِّن فَوْقِهِۦ سَحَابٌ ۚ ظُلُمَـٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ

"یا وہ گویا کسی گہرے سمندر کے اندھیرے میں ہیں، ایک بڑی لہر سے ڈھکا ہوا ہے اور پھر اس کے اوپر ایک اور لہر ہے، پھر [سمندر] پر سیاہ بادل ہوں گے اور اس کے اوپر زیادہ تاریکی ہے [لہٰذا، ایسا شخص اندھیرے پر تاریکی کی تہوں میں لپٹا ہوا ہے، کوئی روشنی دیکھنے سے قاصر ہے اور نہ ہی اس مطلق تاریکی سے باہر نکل سکتا ہے]۔" (سورۃ البقرۃ باب 24 آیت 40)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عرفہ (معارف یا الٰہی علم و قربت) تمام نیکیوں اور ابدی خوشی اور لامتناہی فتح کا سرچشمہ ہے۔ دوسری چیزوں کے علم کی صورت حال یہ ہے کہ ان میں سے کچھ شاعری اور علم نسب کی طرح بالکل بیکار ہیں۔ کچھ ایسے ہیں کہ وہ الہی عرفان میں مدد کرتے ہیں۔ روح کی تطہیر کا علم خدا کی معرفت کی طرف رہنمائی اور صلاحیت کا باعث بنتا ہے۔ یہ تمام علوم الہی معرفت کے حصول کے لیے وسائل کی طرح ہیں۔ کمال الٰہی عرفان میں ہے اور الٰہی صفات اور اعمال کو پہچاننے میں ہے اور اسی میں تمام وجودوں کا علم ہے کیونکہ تمام وجود حقیقت میں الہی اعمال ہیں۔ لہذا، جو کوئی بھی اس دنیا میں کسی بھی چیز کو اس نقطہ نظر سے دیکھتا ہے

کہ وہ خدا کا ایک عمل ہے جو اس کے ارادے، طاقت اور حکمت کے ساتھ مربوط ہے، وہ حقیقت میں [دیکھو اور سمجھنا] الٰہی عرفان کا ایک جزو ہے۔

یہ وضاحت [اب تک] علم کے بارے میں تھی۔ اب یہ طاقت کے بارے میں سنیں۔ کسی چیز پر طاقت کے لحاظ سے خدا کا بندہ حقیقی کمال نہیں رکھتا۔ حقیقی طاقت صرف خدا کی ہے۔ وہ اعمال جو خدا کے ارادے ، طاقت اور حرکت کے خادم سے وجود میں آتے ہیں ، حقیقت میں ، خدا کے وجود میں آنے کی وجہ سے وجود میں آتے ہیں۔ اس وضاحت کا خلاصہ یہ ہے کہ علم کا کمال مرنے کے بعد بھی بندے کے پاس رہتا ہے اور انسان کو خدا تک پہنچاتا ہے لیکن قدرت کے کمال میں ہمیں بندے میں قدرت کے لحاظ سے کوئی کمال نظر نہیں آتا۔ تاہم طاقت (جسمانی صلاحیتیں) علم کے کمال کا ایک ذریعہ ہے۔ جسمانی اعضاء، صلاحیتیں اور صلاحیتیں اپنی طاقت کے ذریعے انسان کو علم کے کمال کی حقیقت تک پہنچنے کا سبب بنتی ہیں۔ ان اعضاء اور صلاحیتوں کو طاقت دینے کے لیے دولت اور شہرت کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ ان کے ذریعے سے کوئی کھانا، لباس اور رہائش حاصل کر سکے۔ اگر کسی نے ان کو الٰہی معرفت حاصل کرنے کے لیے استعمال نہیں کیا تو ظاہر ہے کہ ایسے شخص میں کوئی اچھی بصیرت نہیں ہے۔ ان کا واحد فائدہ یہ ہے کہ وہ ان کو صرف کچھ لذتیں حاصل کرنے کے لیے استعمال کریں گے جو [ایک دن] ختم ہو جائیں گی۔ جو لوگ ان عارضی لذتوں کو کمال سمجھتے ہیں، وہ مکمل طور پر جاہل ہیں۔ زیادہ تر لوگ جہالت کے اس گہرے گڑھے میں گرنے سے تباہ ہو چکے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ طاقت کے ذریعے جسموں پر اختیار حاصل کرنا، دولت میں وسعت اور لوگوں کے دلوں میں شہرت کے ذریعے حاصل ہونے والی عظمت ہی کمال کے بارے میں ہے۔ جب یہ جہالت ایمان بن جاتی ہے تو وہ اسے محبوب سمجھتے ہیں اور اس کے حصول میں مشغول ہو جاتے ہیں اور اس کے تعاقب میں مر جاتے ہیں اور حقیقی کمال کو نظر انداز کرتے ہیں جو انسان کو خدا اور فرشتوں کے قریب لاتا ہے۔ وہ کمال علم اور آزادی کا کمال ہے۔ علم کی بحث پہلے بھی پیش کی جا چکی ہے۔ آزادی اور آزادی کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی خواہشات اور مصائب سے آزاد ہو جائے، اور ان پر قابو پایا جائے جیسا کہ فرشتوں نے ان پر قابو پایا ہے، جو نہ تو غصے سے بھڑکاتے ہوئے ہوس سے گمراہ ہوتے ہیں۔ نفس سے ہوس اور غضب کے اثرات کا خاتمہ کمال ہے اور یہ حقیقت میں فرشتوں کی صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کمال کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں نہ تو کوئی زوال یا تبدیلی ہوتی ہے اور نہ ہی ان پر کسی چیز کا کوئی اثر پڑتا ہے۔ اس لحاظ سے جس حد تک کوئی شخص اس اثر و رسوخ اور تبدیلی سے دور ہو گا جو [خلفشارات، الجھنوں، فریب وغیرہ] سے متاثر ہوتا ہے، وہ خدا کے قریب ہو گا اور اس حد تک فرشتوں سے مشابہت رکھتا ہے اور اس حد تک خدا کے سامنے اس کا مقام حاصل ہوگا۔ یہ تیسرا کمال ہے جو علم اور قدرت کے کمال سے الگ ہے۔

نچلے نفس میں تعریف سے محبت اور تنقید سے نفرت

ادنیٰ نفس میں حمد و ثنا کی محبت کی وجوہات: نفس کے اس لذت کی چار وجوہات ہیں:

پہلی وجہ: اس کی سب سے مضبوط وجہ یہ ہے کہ اس تعریف سے انسان کو یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ وہ کمال سے مالا مال ہے، اور یہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ کمال سے محبت کی جاتی ہے اور ہر وہ چیز حاصل کرنے میں خوشی حاصل ہوتی ہے جس سے محبت کی جاتی ہے۔ اس لیے جب بھی نفس کو اپنے کمال کا احساس ہوتا ہے تو وہ اس سے بے حد خوش ہوتا ہے اور ناقابل بیان خوشی حاصل کرتا ہے۔ کسی کے کمال کا ادراک اس وقت ہوتا ہے جب

دوسرا شخص کسی کی تعریف کرتا ہے۔ معیار یا خصوصیت جس کی تعریف کی جاتی ہے ، کبھی واضح ہوتی ہے اور کبھی کبھی یہ مشکوک ہوتی ہے۔ اگر یہ خصوصیت واضح ہے اور اس کا ادراک کیا جاتا ہے تو ، اس کی تعریف سے حاصل ہونے والی خوشی نسبتا کم ہے لیکن یہ یقینی طور پر موجود ہے۔ مثال کے طور پر کسی کی تعریف کرنا کہ "آپ لمبے قد اور خوبصورت رنگ کے مالک ہیں"، اگرچہ یہ واضح اور محسوس کیا جاتا ہے اور تعریف کرنے والا ان سے واقف ہے، لیکن کوئی ہمیشہ ان خصلتوں کو محسوس نہیں کرتا، بلکہ ان سے کسی حد تک غفلت برتتا ہے۔ جب کسی کو احساس ہوتا ہے [کہ کسی کی تعریف کی وجہ سے وہ صفات موجود ہیں]، تو اسے اس سے [باطنی] خوشی ملتی ہے۔ اگر کسی میں کوئی ایسی صفت یا صفت ہو جو مشکوک ہو تو اس صفت کی تعریف اس میں ایک ایسی لذت لاتا ہے جس کا موازنہ کسی اور لذت سے نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر، [کسی کی تعریف کرتے ہوئے] یہ کہہ کر کہ "آپ ایک عظیم عالم ہیں" یا "آپ بہت خدا ترس اور راستباز ہیں" یا "آپ بہت خوبصورت ہیں"۔ انسان کو اپنے علم، تقویٰ اور خوبصورتی کے کمال پر شک ہے اور وہ چاہتا ہے کہ وہ کسی طرح اس شک کو دور کرے تاکہ یہ صفات یقینی ہو جائیں (ان صفات میں کمال ہونے کا یقین ہو جاتا ہے) اور ان صفات میں کوئی دوسرا شخص اس کا موازنہ نہیں کر سکتا۔ جب کوئی اور ان خصلتوں کا ذکر کرتا ہے تو اسے اطمینان اور یقین ملتا ہے اور اس طرح یہ لذت اور شدت پیدا ہوتی ہے۔ یہ لذت اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب انسان کی تعریف ایک ذہین اور عقلمند کی طرف سے کی جاتی ہے جو علم کی خوبصورتی، تقویٰ اور دیانت داری کے رازوں سے واقف ہو اور بغیر تحقیق کے کچھ بھی کہنا پسند نہ کرے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی استاد اپنے طالب علم کی ذہانت اور فہم کی تعریف کرتا ہے تو طالب علم اس سے بہت خوش ہوتا ہے۔ اگر کوئی دوسرا شخص اس شخص کی تعریف کرتا ہے جس میں سوچے سمجھے اور سمجھ بوجھ کے باتیں کہنے کی عادت ہو اور جو ذہین اور باشعور نہیں ہو تو یہ لذت کم ہو جاتی ہے۔ کسی کی مذمت [یا تنقید] سے نفرت کرنے کی وجہ یہ ہے کہ کسی کی طرف اشارہ کرنے کی وجہ سے نفس کی عیبوں کا پتہ چل جاتا ہے۔ انسان کو اپنے عیبوں کا احساس ہونے کا درد محسوس ہوتا ہے اور یہ درد اس وقت شدت اختیار کرتا ہے جب کوئی ذہین اور عقلمند شخص اپنی غلطیوں کی نشاندہی کرتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ حمد و ثناء اس بات کی دلیل دیتی ہے کہ حمد کرنے والے کا دل مدح کے تابع ہے اور ایسا شخص مدح کی مرضی اور خواہش کے تابع ہے۔ دلوں کو مسحور کرنا اور محکوم کرنا انسانوں کو محبوب ہے۔ جب انسان کو احساس ہوتا ہے کہ اب وہ دلوں کا مالک ہے تو اسے خوشی محسوس ہوتی ہے اور یہ لذت اس وقت بڑھ جاتی ہے جب تعریف اس شخص کی زبان سے آتی ہے جس کے پاس طاقت اور کنٹرول کا وسیع جال ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے شخص کے دل کو پھنسا کر بادشاہوں، حکام یا ممتاز افراد کی طرح زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل کرنے کی توقع کی جاتی ہے۔ یہ لذت اس وقت بہت کم ہو جاتی ہے جب تعریف کرنے والا شخص معاشرے میں نہ تو کوئی اہمیت رکھتا ہے (اس کی کوئی معاشرتی اہمیت نہیں ہے) اور نہ ہی کسی کے اثر و رسوخ کے دائرے میں کوئی چیز ہے اور نہ ہی ذاتی طور پر کسی کو فائدہ پہنچانے کے قابل ہے۔ ایسے شخص کے دل پر قابو پانا ایک معمولی اور پست چیز پر قابو پانے کے مترادف ہے۔ مذمت کرنے والے یا تنقید کرنے والے شخص کا دل کسی کا مالک نہیں ہے۔ اس سے پیدا ہونے والا درد کم و بیش اس بات پر منحصر ہوگا کہ مجرم کی معاشرتی اہمیت زیادہ یا کم ہے۔

تیسری وجہ: کسی کی تعریف نہ صرف اس شخص کے دل کو اس شخص کے تابع کر دیتی ہے جس کی تعریف کی جاتی ہے بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ اس تعریف سے کچھ دوسرے لوگوں پر اثر پڑتا ہے جن کے دل اس کے بدلے میں تعریف کرنے والوں کے تابع ہو جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان لوگوں کی تعریف (حمد و ثناء) انتہائی موثر ہوتی ہے، جن کی باتوں کو غور سے سنا جاتا ہے اور جن کی تعریف اور مذمت پر یقین کیا جاتا ہے۔ پھر یہ تعریف ایک بڑے کھلے اجتماع میں کی جانی چاہیے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اسے سنیں۔ سامعین کی تعداد جتنی زیادہ ہوگی اور

تعریف کرنے والے کی شخصیت جتنی اہم ہوگی، اس تعریف سے اتنا ہی زیادہ لطف آئے گا اور اس حد تک مذمت کا درد بھی کم نفس کے لیے ناقابل برداشت ہوگا۔

چوتھی وجہ: اس تعریف سے معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص کی تعریف کی جا رہی ہے وہ ایک متاثر کن شخصیت کا مالک ہے، یہی وجہ ہے کہ لوگ ایسے شخص کی بے پناہ تعریف کرنے میں بے چین رہتے ہیں، چاہے وہ مرضی سے ہو یا جبری اندرونی مجبوری یا زبردستی سے۔ ایک متاثر کن شخصیت کا ہونا بھی کسی کے لئے ایک زینت ہے کیونکہ اس میں ایک قسم کا غلبہ اور طاقت ہے۔ یہ تعریف خوشی سے خالی نہیں ہے یہاں تک کہ جب تعریف کرنے والے شخص کے پاس تعریف کیے گئے شخص کے بارے میں اچھے خیالات نہ ہوں جو خوف کی وجہ سے تعریف کرنے پر مجبور ہو۔ اس صورت میں انسان کو دوسرے شخص کی پریشانی اور خوف کی وجہ سے اور دوسروں پر غلبہ اور غلبہ کی وجہ سے خوشی ملتی ہے۔ اس بات پر منحصر ہے کہ دوسرا کتنا کمزور اور پریشان ہے ، کسی کو اس کے تناسب سے خوشی ملے گی۔

بعض اوقات یہ چار وجوہات تعریف کرنے والے ایک ہی شخص میں جمع ہوجاتی ہیں۔ اس صورت میں ، [دوسروں کی تعریف سے ملنے والی خوشی] کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ اگر یہ تمام وجوہات ایک شخص میں [بیک وقت] جمع نہ ہوں تو تعریف سے حاصل ہونے والی لذت متناسب طور پر کم ہو جائے گی۔

محبت کی تعریف کی مذکورہ بالا وجوہات کا علاج: پہلی وجہ کا علاج تعریف کرنے والے سے یہ یقین ہو سکتا ہے کہ تعریف کرنے والا کسی کی بات میں سچا نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی نے یہ کہہ کر کسی کی تعریف کی کہ تم نیک نسب سے ہو، تم سخی ہو، تم عالم ہو، اور تم برائیوں سے پرہیز کرتے ہو"، اور جس سے مخاطب ہو یا تعریف کی جا رہی ہو وہ جانتا ہے کہ وہ ایسا نہیں ہے اور اس کے بجائے اس کے بالکل برعکس ہے، تو اس تعریف کے ساتھ دل میں پیدا ہونے والی لذت ختم ہو جائے گی۔ صرف وہی لذت باقی رہے گی جو اس وقت حاصل ہوتی ہے جب کسی کے دل یا زبان پر غلبہ اور کنٹرول حاصل ہوتا ہے۔ اگر کسی کو یہ احساس ہو جائے کہ جو تعریف کرنے والا کہہ رہا ہے اس کا دل اس عقیدے سے خالی ہے اور اس کے علاوہ میں بھی ان صفات سے محروم ہوں جن کا ذکر کرنے والے نے کیا ہے تو دوسری لذت بھی ختم ہو جائے گی۔ اس کے بعد صرف ایک ہی لذت باقی رہے گی [جو وہ لذت ہے جو اس بات کا احساس کرنے سے حاصل ہوتا ہے کہ لوگوں کی زبان پر اس کا اختیار ہے]۔ دوسرے لفظوں میں ، صرف ایک ہی خوشی باقی رہے گی جو اس احساس کا ہے کہ تعریف کرنے والا میرے خوف اور خوف کی وجہ سے میری تعریف میں اپنی زبان کھولنے پر مجبور ہے۔ جو شخص تعریف کرنے میں سنجیدہ نہیں ہے بلکہ اس کے بجائے محض مذاق کے طور پر اس کی تعریف کر رہا ہے، تو پھر تمام لذتیں ختم ہو جائیں گی [بشمول کسی کی زبان پر قابو پانے کی آخری لذت] ختم ہو جائے گی کیونکہ تین وجوہات میں سے کوئی وجہ باقی نہیں رہی۔ اس وضاحت سے آپ اب تک سمجھ چکے ہوں گے کہ نفس نفس حمد و ثناء سے لذت کیوں حاصل کرتا ہے اور مذمت میں درد کیوں پاتا ہے۔ ان وجوہات کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ شہرت سے محبت اور حمد و ثناء اور مذمت کے خوف کے علاج کا طریقہ سمجھ سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک کسی بیماری یا بیماری کی وجہ معلوم نہیں ہو جاتی اس کا علاج ممکن نہیں ہوگا کیونکہ علاج بیماری کی وجوہات کو ختم کرنے کا دوسرا نام ہے۔

شہرت کی محبت کا علاج

جس شخص کے دل پر شہرت کی محبت حاوی ہو، اپنی ساری توانائیاں مخلوقات کو خوش کرنے میں صرف کرے، اور ان کے ساتھ دوستی قائم کرنے میں مصروف رہتا ہے، اور لوگوں کے قول و فعل میں بہت محتاط ہوتا ہے، جو کسی کو سننے اور اس کے اعمال کو دیکھنے کے بعد زیادہ سے زیادہ احترام کرتے ہیں۔ یہ معاملہ منافقت کا سمندر اور افراتفری کا سرچشمہ ہے۔ اس سے عبادت میں کاہلی پیدا ہوتی ہے اور بعض اوقات دلوں کو پھنسانے کے لیے ممنوعہ اور غیر اخلاقی کاموں کا ارتکاب کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مال و جمال کی محبت اور ان کے ایمان کو تباہ کرنے کی مشابہت دو بھیڑیوں سے دی تھی۔ انہوں نے مزید کہا ہے کہ دولت اور شہرت سے محبت منافقت کو بڑھاتی ہے، بالکل اسی طرح جیسے پانی سے پودوں کو اگایا جاتا ہے۔ منافقت سے مراد ظاہری اور باطن میں فرق اور قول و فعل میں فرق ہے۔ ایک فرد جو تعریف اور تعظیم کی ڈگری کی تلاش میں ہے ، ایسی عمدہ عادات اور خصوصیات کا مظاہرہ کرتا ہے جو حقیقت میں اس سے محروم ہے۔ یہ خالص منافقت ہے۔ شہرت سے محبت ایک مہلک بیماری ہے۔ اس کا علاج اور اہل ایمان کے دلوں سے خاتمہ انتہائی ضروری ہے۔ یہ بیماری، دولت سے محبت کرنے کی بیماری کی طرح دل کے مرکز میں داخل ہو جاتی ہے [اور ایک باطنی خصلت بن جاتی ہے]۔ اس کا علاج بھی علم اور عمل کے امتزاج سے بنا ہے۔

شہرت سے محبت کا علم پر مبنی علاج: وہ وجہ تلاش کرنا ہے جس کی وجہ سے کسی کو شہرت سے محبت کرنے کی بیماری میں ملوث ہونا پڑا۔ اس کی وجہ لوگوں کی روح اور جسم پر قابو پانا ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی اسے حاصل کر لیتا ہے تو ، اس کا آخری انجام [اس فرد کی موت میں] ہے جو آخر کار آئے گا۔ یہ ان نیک اعمال میں شمار نہیں کیا جاتا جو ہمیشہ قائم رہیں۔ بلکہ اگر زمین کے تمام لوگ آپ کے سامنے سجدہ کرنا شروع کر دیں اور پچاس سال تک آپ کے قدموں میں پیشانی رکھیں گے تو نہ سجدہ کرنے والے باقی رہیں گے اور نہ ہی آپ زندہ رہیں گے اور آپ کا آخری انجام وہی ہوگا جو آپ کے سامنے بے شمار شان و شوکت اور شان و شوکت کے حامل لوگوں کو ہوا ہے۔ ایمان کی نعمتوں کو چھوڑنا [خدا اور اس کی طرف جانے والا عظیم روحانی راستہ] یہ وہ ابدی زندگی ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتی، کیونکہ اس طرح کی عارضی اور عارضی چیز [لوگوں کے دلوں میں مقبولیت اور تعظیم جیسی چیز] کسی بھی طرح مناسب نہیں ہے۔ جو شخص حقیقی کمال کے ساتھ ساتھ خیالی کمال کی حقیقت سے واقف ہو، وہ شہرت اور مقبولیت کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ بلکہ جو شخص آخرت پر نظر رکھتا ہے وہ اسے اتنی اہمیت بھی نہیں دیتا جتنی مٹی کے ذرے کو دی جاتی ہے۔ ایسا شخص موت کا تصور کسی کے سامنے کرتا ہے اور دنیا (دنیاداری) کو پست سمجھتا ہے۔ پرہیزگاروں نے آخرت پر اپنی پوری توجہ مرکوز کی اور اس کے لیے انہوں نے جو کام کیا وہ پرہیزگاری، تنگی اور خدا سے ڈرنا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ آخرت ان لوگوں کے لیے ہے جو پرہیزگاری کرتے ہیں اور پرہیزگاری کرتے ہیں اور ان کے لیے شہرت اور مال کے سوا اور کوئی چیز کم نہیں ہے زیادہ تر لوگوں کی بینائی کمزور ہوتی ہے اور صرف دنیا پر مرکوز ہوتی ہے۔ ان کی آنکھوں کی روشنی تمام چیزوں کی حقیقت اور آخری انجام کو دیکھنے تک وسعت نہیں دیتی جیسا کہ اس الہامی قول سے واضح ہوتا ہے:

بَلْ تُؤْثِرُونَ ٱلْحَيَوٰةَ ٱلدُّنْيَا ﴿١٦﴾ وَٱلْءَاخِرَةُ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰٓ ﴿١٧﴾

"اس کے بجائے تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو، حالانکہ آخرت دنیا سے کہیں زیادہ بہتر اور پائیدار ہے۔"
(سورة البقرة سورة البقرة آیت 16 تا 17)

جو شخص شہرت کی تلاش میں اس حد تک ملوث ہے، اسے دنیاوی نقصانات اور مشکلات کا تصور کرکے اپنے دل کا علاج کرنا چاہیے، دوسرے لفظوں میں دنیا کے مشہور لوگوں کو درپیش خطرات پر نظر رکھنی چاہیے، ہر شہرت، وقار اور اعلیٰ مقام رکھنے والے شخص کے پاس کچھ دوست ہونے کے باوجود دشمنوں کی کمی نہیں ہوتی۔ یہ لوگ ہمیشہ نقصان پہنچانے کے لیے ایک مناسب وقت کو نشانہ بناتے ہیں اور جب بھی انہیں موقع ملتا ہے تو وہ اپنی دشمنی کو کھول دیتے ہیں۔ خود اعلی مرتبہ کے لوگوں کو ہمیشہ یہ خوف رہتا ہے کہ وہ اپنی حیثیت سے محروم ہوجائیں گے یا ان کے دل بدل جائیں گے جو ان کے لئے وقار اور احترام رکھتے ہیں۔ دل [جسے وہ پسند کرتے ہیں اور اس کی تعریف کرتے ہیں] اور [جسے وہ ناپسند کرتے ہیں اور نفرت کرتے ہیں] سے دور کرنے کے درمیان لڑتے ہیں۔ دلوں میں اپنی بنیادوں کے ساتھ تعمیر کی گئی عمارت سمندر کی لہروں پر بنائے گئے محل سے زیادہ پائیدار نہیں ہے۔ دلوں کو رعایت، شہرت و وقار کی حفاظت، حسد کرنے والوں کی سازشیں، دشمنوں کی طرف سے ہونے والے نقصان کی مزاحمت وغیرہ وہ دنیاوی نقصانات اور مشکلات ہیں جو شہرت کی لذت کو تلخ کر دیتی ہیں۔ شہرت کے حصول کے لیے آخرت کی سزا اس سے الگ ہے۔ کسی کو [شہرت حاصل کرنے سے] اتنی دنیاوی فوائد نہیں ملتی جتنی توقع کی جاتی ہے، اس کے بجائے، شہرت کے حصول سے وابستہ مشکلات کا بہت زیادہ ڈھیر ہے۔ جو لوگ شہرت کو پسند کرتے ہیں، وہ اپنی دور اندیشی (صوفیانہ بصیرت یا *بصیرت*) کا علاج کریں۔ جو لوگ اپنی دور اندیشی (صوفیانہ بصیرت) میں گہرائی اور ایمان کی قوت رکھتے ہیں، وہ دنیا (دنیاداری) کی طرف ذرا بھی توجہ نہیں دیتے۔

شہرت کی محبت کا عملی علاج: اس بیماری کا عملی علاج یہ ہے کہ کسی کی شہرت کو ختم کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ کیا جائے اور دوسروں کے دلوں میں رکھا، تاکہ اس وقت تک سرزنش کی جائے جب تک کہ لوگ اپنی نظروں میں کسی کو ذلیل نہ کر دیں۔ اس کے نتیجے میں مقبولیت کا احساس ختم ہو جاتا ہے اور انسان تنہائی اور گمنامی کی زندگی کا عادی ہو جاتا ہے اور صرف خدا کے نزدیک اپنی مقبولیت کا مقابلہ کرتا ہے۔ صرف اتنا ہی جائز ہے کہ وہ ایسے اعمال کرے جس سے لوگوں میں کوئی عزت نہ رہے۔ ایک روایت ہے کہ ایک بادشاہ کا ارادہ ایک متقی عبادت گزار کے قریب ہونا تھا۔ جب نمازی کو معلوم ہوا کہ بادشاہ اس کے محفل میں آیا ہے تو اس نے اس کے لیے کھانا لانے کو مانگا اور بڑے ٹکڑے کھانے لگا۔ جب بادشاہ نے اسے اس طرح کھاتے ہوئے دیکھا تو وہ اس کے بارے میں اپنی اچھی رائے نہیں رکھ سکا اور وہ عبادت گزار اس کی آنکھوں میں ذلیل ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے قریب آنے اور [روحانی راستے میں] اس کا پیروکار بننے کا ارادہ ترک کر دیا۔ عبادت گزار نے سکون کا سانس لیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے اسے بادشاہ سے بچایا۔ روحانی حالتوں کے لوگ بعض اوقات ان طریقوں سے اپنے آپ کو شفا دیتے ہیں اور وہ اسے اپنے دلوں کے لیے مفید سمجھتے ہیں۔ اس طرح کے طریقوں پر عمل کرنے سے ، وہ اپنی اندرونی حالتوں کو درست کرتے ہیں اور کسی بھی زیادتی کو ختم کرتے ہیں [یا ان کے باطن میں اعتدال ، توازن اور ہم آہنگی سے انحراف]۔

شہرت کی محبت کو دور کرنے کا بہترین طریقہ: اس کا بہترین علاج یہ ہے کہ لوگوں سے [معاشرتی] تنہائی اختیار کی جائے [ہر شکل و شکل میں، چاہے وہ جدید ذرائع ہو یا روایت، سوائے ضروریات اور تقاضوں کے] اور نامعلوم ہو جائیں یا ایسی جگہ جائیں جہاں کوئی کسی کو نہ جانتا۔ گھر میں تنہائی اختیار کرنا بھی خطرے سے خالی نہیں ہے کیونکہ پورے گاؤں میں مشہور ہو جائے گا کہ فلاں روحانی مسافر نے خدا سے وابستہ ہونے کے لیے تمام لوگوں سے خلوت اختیار کر لی ہے، تاکہ تنہائی بھی لوگوں کے دل میں [تقویٰ، نیکی اور بلند روحانی حالت] کے بارے میں یقین کا باعث بن جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خلوت کرنے والا شخص یہ سوچے کہ دل میں شہرت کی محبت باقی نہیں ہے، اگرچہ یہ محبت دل کے کسی کونے میں چھپی ہوئی ہو لیکن ظاہر ہے کہ نفس اپنے مقصد کو حاصل کرنے سے مطمئن ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر کسی کو یہ یقین مل جائے کہ لوگ اب اس کے مداح اور مداح نہیں رہے یا وہ کسی کی غیبت کرتے ہیں یا کسی کو بری باتیں منسوب کرتے ہیں تو اس کا نفس نفس کا اطمینان ختم ہو جائے گا اور وہ اتنا

پریشان ہو جائے گا کہ لوگوں کے دل سے اپنے بارے میں غلط خیالات کو دور کرنے کے طریقے تلاش کر سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر کسی کو جھوٹ بولنا پڑے یا دھوکہ دہی کا سہارا لینا پڑے۔ اس معاملے میں یہ واضح ہو جائے گا کہ اس شخص نے تنہائی کو دکھاوے کے طور پر اپنایا ہے، حقیقت میں اب بھی دل میں شہرت اور وقار کی محبت موجود ہے۔ یہ محبت دولت کی محبت کی طرح ہے ، لیکن اس سے بھی زیادہ برائی پیدا کرتی ہے کیونکہ شہرت کی وجہ سے آزمائش زیادہ ہوتی ہے۔ جب تک اپنے جیسے لوگوں کی طرف سے لالچ رہے گا، وہ اپنے دلوں میں جگہ بنانے میں بے چین رہتا ہے۔ لیکن اگر کوئی اپنے ہاتھوں سے کماتا ہے اور کسی اور کے مال پر نظر نہیں رکھتا ہے تو تمام لوگ ایک کے لئے اپنی اہمیت کھو دیں گے۔ اب انسان ان لوگوں کے دلوں کی پرواہ نہیں کرے گا جو مشرق یا مغرب میں کسی سے دور رہتے ہیں، کیونکہ نہ تو ان کو دیکھ سکتا ہے اور نہ ہی ان سے کوئی لالچ [یا توقع] ہو سکتی ہے۔

لوگوں سے لالچ [اور توقعات] کا خاتمہ صرف اطمینان کے ذریعے ہی کیا جا سکتا ہے۔ جو شخص مطمئن ہو، لوگوں سے غافل ہو اور غافل ہو، اپنے دل کو لوگوں سے مصروف نہیں کرتا، اور اگر دوسرے دل میں اپنے لیے تعریف اور مرتبہ ہو تو اسے زیادہ اہمیت نہیں دیتی۔ شہرت کی تلاش کو ترک کرنا اطمینان اور لالچ کے خاتمے کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس کے علاوہ *سلف صالحین* کا یہ حال بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ انہوں نے عزت پر عاجزی کو ترجیح دی اور دنیاوی مال کے مقابلے میں آخرت کا اجر حاصل کیا۔

حمد کی محبت کا علاج

بہت سے لوگوں کو تکلیف اٹھانی پڑی تھی کیونکہ وہ دوسروں کے خوف سے گھرے ہوئے تھے اور ان کی تعریف اور تعریف کی خواہش میں مبتلا تھے۔ [اس کے نتیجے میں،] ان کی تمام حرکات و سکنات اور اعمال لوگوں کی مرضی کے مطابق تھے تاکہ وہ ان کی تعریف کریں۔ یہ معاملہ تخریبی صفات سے ہے اور اس لحاظ سے اس کا علاج واجب ہے۔ علاج کا طریقہ یہ ہے کہ ان وجوہات پر غور و فکر کیا جائے جو تعریف کی خواہش اور مذمت کے خوف کو جنم دیتی ہیں۔

پہلی وجہ (حمد و ثناء کی محبت) : جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے ، مداح کا بیان (تعریف کی) تعریف کرنے والوں کو یہ احساس دلاتا ہے کہ کسی میں کمال ہے۔ اس سلسلے میں شائقین کی تعریف پر یقین کرنے کے بجائے اپنی عقل کا سہارا لینا چاہیے اور اس سے دل سے سوال کرنا چاہیے کہ کیا وہ صفت جو کسی سے منسوب کی جا رہی ہے، وہ واقعی موجود ہے یا نہیں؟ پھر جو خوبی کسی سے منسوب کی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ کوئی بھی چیز جو واقعی تعریف کی مستحق ہے جیسے علم، خدا پرستی، یا یہ ایسی چیز ہے جس کی تعریف بھی نہیں کی جانی چاہیے جیسے دولت، شہرت اور دنیاوی مال؟ اگر کسی صفت کا تعلق دنیاوی ذرائع سے ہے تو اس سے خوش ہونا ایسا ہی ہے جیسے گھاس کو دیکھ کر خوش ہو جائے جو جلد ہی خشک ہو جائے گی اور بھوسے بن جائے گی جو ہوا لے جائے گی۔ اس طرح کی خوشی عقل کی کمی کا ماتم ہوگی۔ انسان کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ دنیاوی مال و مال سے راضی ہو۔ اگر کوئی اس پر خوش رہنا چاہتا ہے تو اسے اس کے وجود پر خوش ہونا چاہیے نہ کہ مداح کی طرف سے اس کی تعریف کے لیے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ تعریف کے بعد وجود میں آیا ، حالانکہ کسی کے پاس یہ پہلے سے تھا [لیکن کسی نے اس کی تعریف کرنے کے بعد ہی خوش ہوا]۔

مزید برآں، اگر وہ خوبی ایسی ہے کہ آپ کو علم اور خدا کی طرح خوش رہنے کا حق حاصل ہے، تو اس صورت میں بھی اس پر خوش رہنا درست نہیں ہے کیونکہ سب کا آخری انجام [ابدی نجات اور خوشی یا ابدی غم اور عذاب حاصل کرنے کے لحاظ سے] سب کے لیے نامعلوم ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ یہ خوبی قائم رہے گی یا نہیں۔ یہ بات درست ہے کہ علم اور پرہیز انسان کو خدا کے قریب لے جاتا ہے، لیکن اس کے خاتمے کا خطرہ ہر وقت موجود رہتا ہے۔ اگر کسی کو اپنی زندگی کے برے انجام کا خوف ہے تو وہ دنیا کی کسی بھی چیز سے خوش نہیں ہوگا۔ اس کے بجائے یہ سمجھ سکے گا کہ دنیا غم اور غم کی جگہ ہے اور خوشی اور اطمینان کی جگہ نہیں ہے۔ اگر آپ اپنی زندگی کے اچھے انجام کی امید رکھتے ہیں تو مداح کی حمد و ثنا پر خوش ہونے کے بجائے آپ کو علم اور پرہیز کی شکل میں آپ کو عطا ہونے والی الٰہی فضل و برکت سے خوش ہونا چاہیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لذت کمال اور کمال کے ادراک کا نتیجہ ہے [اگر وہ واقعی موجود ہے] اس کا وجود خدائی عنایات کا مرہون منت ہے نہ کہ مداح کی حمد کا۔ حمد اس الٰہی فضل کے تابع ہے۔ اس لیے تعریف سے خوش نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اس سے آپ کی فضیلت میں اضافہ نہیں ہوگا۔ اگر کوئی آپ کی تقویٰ اور دنیاداری سے پرہیز کی تعریف کرتا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ اس تعریف کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اگر آپ اس سے خوش ہو جائیں تو یہ سراسر حماقت ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے مزاج کی برائی اور آپ کے باطن کے کردار میں گندگی سے بخوبی واقف ہے اور یہ محض ایک جھوٹی تعریف ہے اور اس سے خوش ہونا جہالت کی انتہا ہے۔ اگر تعریف کرنے والا شخص سچا بھی ہو تو آپ کو تعریف سے خوش نہیں ہونا چاہیے، بلکہ آپ کو ان نعمتوں اور نعمتوں سے خوش ہونا چاہیے جو اللہ تعالیٰ نے آپ پر عطا کی ہیں۔ جھوٹی تعریف آپ کے لیے غم کا ذریعہ ہونی چاہیے نہ کہ خوشی کا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ حمد و ثناء کے ذریعے سے حمد و ثنا کرنے والے شخص کے دل کی فتح عیاں ہو جاتی ہے۔ اس کا مقصد وہی ہے جو شہرت کی محبت کا ہے اور شہرت کی محبت کا علاج مذکورہ بالا میں بیان کیا گیا ہے کہ انسان کو لوگوں سے کوئی لالچ نہیں ہونا چاہیے اور خدا کی طرف سے مرتبہ اور قدردانی کا طالب ہونا چاہیے اور اس حقیقت پر یقین رکھنا چاہیے کہ مخلوقات (تمام انسانوں) سے مرتبہ اور تعریف حاصل کرنا خدا سے دور کر دیتا ہے۔ لہٰذا کسی کو ان کی تعریف سے خوش نہیں ہونا چاہیے۔

تیسری وجہ: خوشی کی تیسری وجہ یہ ہے کہ حمد و ثنا کے ذریعے سے تعریف کیے جانے والے کی عظمت اور غالب شخصیت ظاہر ہو جاتی ہے۔ [حقیقت میں،] یہ بھی ایک عارضی خصوصیت ہے جس کی کوئی مستقل حیثیت نہیں ہے۔ اس طرح کی عارضی چیز سے خوش ہونے کا کوئی مطلب نہیں ہے۔ اس طرح کی تعریف غم کا سبب ہونی چاہیے اور تعریف کرنے والے کو برا سمجھنا چاہیے۔ اس طرح کی تعریف سے ناراض ہونا چاہئے کیونکہ یہ انسان کو مشکلات اور تباہی کے قریب لاتا ہے۔ ایک گنوسٹک نے کہا، "جو شخص کسی کی تعریف سے خوش ہوا اس نے شیطان کو اپنے باطن میں داخل ہونے کا موقع دیا"۔ ایک اور گنوسٹک کی رائے تھی کہ ، "اگر آپ کسی کی زبان سے یہ سننا پسند نہیں کرتے ہیں کہ آپ ایک برے شخص ہیں ، لیکن اس کے بجائے آپ یہ سننا پسند کرتے ہیں کہ آپ ایک اچھے شخص ہیں ، تو حقیقت میں ، آپ اچھے انسان نہیں ہیں۔" نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ألا لا تمادحوا وإذا رأيتم المادحين فاحثوا في وجوههم التراب

"ہوشیار رہو! ایک دوسرے کی تعریف نہ کریں اور جب آپ تعریف کرنے والوں کو دیکھیں تو ان کے چہروں پر خاک ڈال دیں (یعنی مثال کے طور پر اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو اعتبار نہیں دیا جانا چاہیے اور ان کی تعریف

کو نظر انداز کیا جانا چاہیے اور کھلے عام مسترد کر دیا جانا چاہیے کیونکہ یہ کسی کی انا اور راستبازی کو بڑھانے کے لحاظ سے کسی کی روحانیت کے لیے نقصان دہ ہے)۔

یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تعریف سے بہت خوفزدہ تھے اور اس کی فتنہ (*فتنہ* یا تباہ کن اثرات) اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی باطنی خوشی اور اطمینان سے خوفزدہ رہتے تھے۔ ان کی تعریف سن کر ایک نبی نے کہا: اے اللہ! تمہارا یہ بندہ کسی ایسی چیز کے ساتھ میرے قریب آنے کا خواہاں ہے جس سے تجھے ناراض کیا جائے۔ میں تجھے گواہ بناتا ہوں کہ میں اس سے ناراض ہوں۔ ان لوگوں نے حمد و ثنا سے دشمنی کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہے۔ مزید یہ کہ ان کے دلوں میں یہ دائمی احساس رہتا تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کی (حقیقی باطنی) حالتوں سے واقف ہے اور ان کی عیبوں سے مکمل طور پر آگاہ ہے۔ اس لیے کسی کی تعریف سے نہ تو اس کی اپنی خامیوں میں کمی آئے گی اور نہ ہی اس میں اضافہ ہوگا۔ اچھا انسان وہ ہے جو اللہ کے قریب ہو اور برا وہ ہے جو اس سے دور ہو۔ اگر جس شخص کی تعریف کی جا رہی ہے وہ اللہ کے نزدیک برا ہے اور جس کا ٹھکانہ جہنم ہے تو کسی کی حمد سے راضی ہونا انتہائی جہالت ہے۔ اگر وہ شخص جنت کا مستحق ہے تو اسے صرف اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور فضل و کرم پر خوش ہونا چاہیے کیونکہ دوسرے بندوں کی حمد و ثنا سے راضی ہونے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ کسی کا معاملہ بندوں کے ہاتھ میں نہیں ہوتا۔ رزق اور موت سب اللہ تعالیٰ کے اختیار اور استحقاق میں ہیں۔ اگر اس نکتے کو سمجھ لیا جائے تو کسی بھی مخلوق کی نہ تو تعریف کی پرواہ کرے گا اور نہ ہی کسی کی مذمت کی پرواہ کرے گا۔ تعریف کی محبت کسی کے دل سے نکلنا شروع ہو جائے گی اور روحانی راستے کی مشکل مہموں میں جسم و روح کو مکمل طور پر شامل کر دیا جائے گا۔

تنقید اور مذمت سے نفرت کا علاج

اس سے پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ انسان مذمت سے نفرت کرتا ہے اس وجہ سے جس کی برعکس وجہ یہ ہے کہ وہ تعریف سے محبت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا علاج تعریف کی محبت کے علاج سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں مختصر وضاحت یہ ہے کہ جو شخص آپ کی مذمت کرتا ہے وہ تینوں ریاستوں میں سے کسی ایک سے محروم نہیں ہے۔ یا تو ایسا شخص سچا ہے یا اس کا مقصد اخلاص اور محبت ہے، یا اس کی مذمت میں سچا ہے لیکن اس کا مقصد اخلاص نہیں بلکہ نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ جہاں تک پہلے کیس کا تعلق ہے، آپ کو اپنی مذمت سن کر نہ تو غصہ کرنا چاہیے اور نہ ہی کسی سے دشمنی کرنی چاہیے اور نہ ہی انتقامی کارروائی میں ایسے شخص کی مذمت کرنی چاہیے۔ اس کے بجائے بہتر یہ ہے کہ آپ اپنے اوپر کسی کا احسان قبول کریں کیونکہ جو شخص آپ کو آپ کی غلطیوں سے آگاہ کرتا ہے، وہ حقیقت میں، آپ کو اپنی تباہ کن داخلی خوبیوں کا مشاہدہ کرتا ہے اور آپ کو ان سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کا مشورہ دیتا ہے۔ آپ کو اپنے بارے میں کسی کی تنقید پر خوش ہونا چاہئے اور اپنی قابل مذمت [اندرونی خصلتوں یا] خصوصیات کو ختم کرنے کے لئے جدوجہد کرنی چاہئے۔ مذمت پر پچھتاوا ہونا یا اسے ناپسند کرنا یا مذمت کرنے والے کو برا کہنا جہالت ہے۔ اگر یہ دوسرا واقعہ ہے جس میں ناقد نے آپ کو محض دشمنی اور آپ کو نقصان پہنچانے کے لیے آپ پر تنقید کی ہے تو بھی آپ کو خوش ہونا چاہیے کیونکہ آپ ان کی وجہ سے اپنی غلطیوں سے واقف ہو گئے ہیں۔ آپ کو پہلے ان کا علم نہیں تھا، یا اس نے آپ کو اپنی غلطیوں کی یاد دلا دی جیسا کہ آپ اس سے پہلے غفلت کر چکے تھے، یا اس نے آپ کی (برے باطنی) صفات کو آپ کی نظر میں بری بنا دیا جیسا کہ آپ اس سے پہلے ان کو اچھا سمجھتے تھے۔ یہ تمام معاملات آپ کی ابدی خوشی اور دائمی کامیابی کا سبب ہیں اور جب آپ کو اس کا ذریعہ مل جائے تو اپنی ابدی خوشی اور لازوال کامیابی حاصل کرنے میں تاخیر نہ کریں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ آپ گندگی سے آلودہ کپڑے پہنتے ہیں اور کسی بادشاہ کے دربار میں جانے کا

ارادہ رکھتے ہیں اور آپ کو معلوم نہیں ہوتا کہ آپ کے کپڑوں پر گندگی ہے۔ مزید برآں ، آپ کو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ اگر آپ اس حالت میں داخل ہوں گے تو ، بادشاہ بہت ناراض ہوگا ، اور اگر وہ آپ کو اس توہین (طرز عمل کی خلاف ورزی) کی مثالی سزا دے تو یہ تعجب کی بات نہیں ہوگی۔ اگر [اس حالت میں] کوئی تم سے کہے ، "اے گندی! اے گندی! اپنے کپڑے صاف کریں"، آپ کو خوش ہونا چاہئے کیونکہ اس زبانی پیشگی انتباہ کی بہت قدر کی جاتی ہے۔ تمام برے اور مضر اخلاق، آداب، کردار اور باطنی مزاج آخرت میں تباہی کا سبب ہیں۔ انسان اپنے دشمنوں کے ذریعے ان کے تباہ کن اخلاقیات، آداب، کردار کی خصوصیات اور اندرونی مزاج کے بارے میں جانتا ہے جب وہ آپ کی مذمت کرتے ہیں اور آپ کو ان کی مذمت کا نشانہ بناتے ہیں۔ اگر آپ کے مقدر میں ایسا کوئی دشمن ہے تو آپ کو اس کی قدر کرنی چاہیے۔ اگر کوئی دشمن اپنی دشمنی پر جھکا ہوا ہے تو یہ خدا کی طرف جانے کا راستہ خطرناک ہے [اور اس کے ساتھ کھڑے ہونا جیسے کسی کی دشمنی اپنے اندر منفی سوچ کو فروغ دے سکتی ہے] لیکن یہ آپ کے لیے ایک نعمت ہے۔ آپ کو اس نعمت پر خوش ہونا چاہیے [کہ آپ کو اپنے عیبوں سے آگاہ کیا گیا ہے] اور اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اگر آپ کا دشمن اپنی مرضی سے جھکا ہوا ہے تو آپ کو کیا پرواہ ہے کہ وہ اپنی دشمنی کی آگ میں جل کر راکھ ہو جائے (استعاراتی طور پر)؟

تیسرا معاملہ یہ ہے کہ مجرم جھوٹا ہے اور تم پر کسی ایسی چیز کا الزام لگا رہا ہے جس سے تم خدا کی طرف سے بری ہو گئے ہو۔ آپ کو اس کے بارے میں ذرا بھی پرواہ نہیں کرنی چاہئے اور نہ ہی آپ کو انتقامی اقدام کے طور پر کسی کی مذمت کرنی چاہئے ، اس کے بجائے ، آپ کو تین چیزوں پر توجہ دینی چاہئے۔ سب سے پہلے یہ کہ آپ کو کسی ایسی غلطی سے بری الذمہ قرار دیا گیا ہے جس میں آپ کو ملوث قرار دیا جا رہا ہے۔ لیکن اس طرح کی اور بھی کتنی غلطیاں ہیں جن میں تم ملوث ہو، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان پر پردہ ڈال دیا ہے۔ آپ کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ لوگوں کو ان کے بارے میں آگاہ کرنے کے بجائے ایک ایسا عیب ان کے حوالے کر دیا گیا جس سے آپ بری ہو گئے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ لوگوں کی غلطیوں کی تلاش آپ کے اپنے گناہوں اور عیبوں کا کفارہ بن جائے گی۔ دوسرے لفظوں میں ، لوگ ایک ایسی غلطی کو منسوب کرتے ہیں جو آپ میں موجود نہیں ہے ، آپ کو بہت سے دوسرے لوگوں سے بری الذمہ قرار دیتے ہیں جن میں آپ واقعی ملوث ہیں۔ یاد رکھو کہ جو کوئی آپ کی غیبت کرتا ہے وہ آپ کو اپنے نیک اعمال کا تحفہ دیتا ہے جس کے خلاف غیبت کی گئی ہے اور جو آپ کی تعریف کرتا ہے وہ آپ کی پیٹھ پر مہلک وار وار کرتا ہے۔ یہ بات کتنی عجیب ہے کہ آپ اپنی پیٹھ پر لگنے والے زخم سے خوش ہیں اور مال کے اعمال کا تحفہ ملنے پر غمگین ہیں، حالانکہ یہ نیک اعمال آپ کو خدا کے قریب لے جائیں گے۔ تیسری بات یہ ہے کہ وہ غریب آپ کے خلاف غلطی تلاش کر کے اپنے آپ کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ ایسے شخص نے اپنے ایمان کو نقصان پہنچایا، اپنے آپ کو خدا کی نظر میں جھٹکا دیا اور جھوٹے الزامات کی وجہ سے دردناک عذاب کا مستحق بن گیا۔ کیا آپ کے لیے مناسب ہے کہ آپ ایسے مظلوم کے ساتھ ظلم کریں جس کا حساب پہلے ہی مقرر کیا گیا ہے اور اللہ کا غضب پہلے ہی ایسے شخص پر ہے؟ آپ شیطان کو اپنی تباہی اور غضب الٰہی کے لیے دعا کر کے خوش رہنے کا موقع کیوں دیتے ہیں؟ آپ کو ایسے شخص کے لیے دعا کرنی چاہیے: "اے اللہ! ایسے شخص کی اصلاح کرو، اپنی توبہ قبول کرو اور اس پر رحم کرو۔ یہ بات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غزوۂ احد میں ان لوگوں کے لیے مندرجہ ذیل دعا کی جنہوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے تمام ساتھیوں پر حملہ کرنے اور ان کے تمام پیروکاروں پر حملہ کرنے کے لیے آئے اور انہیں جماعت کا دفاع کرنے پر مجبور کیا گیا:

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِقَوْمِيْ اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِيْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ

"اے خدا! میری قوم کو معاف کر دو۔ اے اللہ! میری قوم کو اس طرح ہدایت دے کہ وہ نہیں جانتے (بیان کردہ حدیث کا مجموعہ *بیہقی دالا النبووہ*

ان لوگوں کو مذمت بری نہیں لگتی جو قناعت پر عمل کرتے ہیں اور لوگوں کے مال سے تمام لالچ کو ختم کرتے ہیں۔ اگر تم لوگوں سے غافل ہو جاؤ (اور ان کے پاس جو کچھ بھی ہے بشمول ان کی تعریف اور قدر) تو وہ چاہے وہ آپ کے خلاف کتنی ہی بکواس کیوں نہ کریں، اس کا آپ کے دل پر زیادہ اثر نہیں پڑے گا۔ ایمان یا خدا کی طرف جانے کی حقیقت وہ قناعت ہے جو دولت و شہرت کے لالچ کو ختم کر دیتی ہے۔ جب تک لالچ برقرار رہے گا ، آپ چاہیں گے کہ جس شخص سے آپ لالچ اور توقعات رکھتے ہیں ، آپ کی محبت اور اعلی مقام کسی کے دل میں رہے اور آپ کی تعریف کرے۔ آپ اپنے لئے کسی کے دل میں جگہ بنانے میں مصروف ہوں گے اور یہ آپ کے ایمان یا خدا (دین) کے راستے کو تباہ کیے بغیر نہیں ہوگا۔

کچھ لوگ تعریف اور شہرت کے خواہاں ہیں اور ان کے حصول کے لئے ہر ممکن کوشش کرتے ہیں جو وہ کر سکتے ہیں ، یہاں تک کہ عبادت میں دکھاوے کی حد تک۔ لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف مائل کرنے اور ان کی حمد و ثنا پر مجبور کرنے کے لیے وہ دینی حرام باتوں سے بھی باز نہیں ہوتے۔ ایسے لوگ تباہی کی راہ پر گامزن ہیں۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ شہرت اور حمد و ثنا حاصل کرنے کے لیے حلال چیزوں کا استعمال کرتے ہیں کیونکہ وہ نہ تو عبادت کو اس کا ذریعہ بناتے ہیں اور نہ ہی حرام کام کرتے ہیں۔ ایسے لوگ ایک پاتال کے کنارے پر ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تقریر یا اعمال پر کوئی حد عائد نہیں کی جا سکتی، یہی وجہ ہے کہ یہ ممکن ہے کہ وہ تعریف کی تلاش میں غیر محسوس طور پر تمام حدود کو عبور کر لیں اور خود کو تباہ کر دیں۔ اس لحاظ سے ، وہ ان لوگوں کے بہت قریب ہیں جو خود کو تباہ کرتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو نہ تعریف چاہتے ہیں اور نہ ہی اس کے لیے کوشش کرتے ہیں، لیکن جب ان کی تعریف کی جاتی ہے تو ان کے دل میں خوشی محسوس ہوتی ہے۔ اگر ایسے لوگ روحانی کشمکش سے گزر نہ جائیں اور حمد و ثناء پر نفرت کا اظہار کرنے پر مجبور نہ کریں تو ممکن ہے کہ وہ اپنے اندر کی خوشی کی وجہ سے لوگوں کے دوسرے گروہ میں شامل ہو جائیں۔ اگر وہ روحانی طور پر جدوجہد کریں اور حمد و ثناء پر اپنی نفرت کا اظہار کریں اور اس کی تباہی کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے دلوں کو اس سے خوش ہونے کا موقع نہ دیں تو ایسے لوگ روحانی جدوجہد کے خطرات میں گھرے ہوئے ہیں - کبھی وہ کامیاب ہوتے ہیں اور کبھی ان کا مقدر شکست ہوتا ہے۔

کچھ لوگ تعریف سن کر نہ تو خوش ہوتے ہیں اور نہ ہی انہیں اس سے تکلیف ہوتی ہے جیسے تعریف ان پر اپنے نقوش نہیں چھوڑتی۔ ایسے لوگوں کی قدر کی جاتی ہے حالانکہ وہ مکمل طور پر مخلص نہیں ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ وہ تعریف سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں لیکن اس حد تک نہیں کہ وہ تعریف کرنے والے شخص سے ناراض ہو جاتے ہیں یا کسی کو ایسا کرنے سے منع کرتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ درجہ، یہ ہے کہ تعریف کو برا سمجھا جائے، حقیقی نفرت کا مظاہرہ کیا جائے جو زبردستی نہ کی جائے (یعنی ظاہری ناپسندیدگی اور اس سے باطنی اطمینان)۔ دل کی تعریف سے خوش ہونے کے ساتھ ساتھ زبان سے سچائی اور سچائی سے ناراض ہونا خالص منافقت ہے۔ ایسا شخص اپنے خلوص اور سچائی کا اظہار کرتا ہے لیکن باطن میں نہ تو اخلاص ہے اور نہ ہی سچائی۔ ان مختلف درجات کی وجہ سے حمد کی مذمت کرنے والوں کی حالتوں میں فرق بھی واضح ہو گیا ہے۔ اس کی پہلی ڈگری یہ ہے کہ نفرت کا اظہار ہونا چاہئے اور آخری درجہہ یہ ہے کہ کوئی [اپنے آپ کو] مذمت پر خوشی کا اظہار کرتا ہے۔ البتہ صرف وہی شخص جو اپنے نفس پر تنقید کر کے خوش ہو سکتا ہے وہ وہی ہے جو اپنے نفس سے دشمنی رکھتا ہو۔ یہ ادنیٰ نفس بہت باغی ہے، اس میں بے شمار خامیاں ہیں، اس کے وعدوں کی خلاف ورزی مشہور ہے، اس کی دھوکہ دہی واضح ہے۔ یہ ایک ایسے سلوک کا مستحق ہے جو دشمنوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ دشمنوں کی غلطیوں کو سن کر خوش ہونا انسانی فطرت کی کمزوری ہے۔ جب کوئی شخص اپنے نچلے نفس کا دشمن بن جائے تو اس کے عیبوں کو سن کر خوش ہونا چاہیے اور اس شخص کا شکر گزار ہونا چاہیے جس نے اس کی مذمت

کی ہے، کیونکہ ایسے شخص نے اپنی فرقہ وارانہ ذمہ داری پوری کی ہے اور مجھے اپنی غلطیوں سے آگاہ کرنے کے لیے ہوشیاری اور ذہانت کا استعمال کیا ہے۔ اس مذمت کی قدر کی جاتی ہے کیونکہ لوگوں کی نظروں میں کوئی کم ہو جائے گا اور شہرت کے نقصانات سے محفوظ ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ انسان بہت سے نیک اعمال کرنے پر قادر نہیں ہے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہوگی کہ یہ مذمت [اپنے خلاف] کسی کے لیے نیک عمل بن جائے اور کسی کے عیبوں کا کفارہ بن جائے جن کو وہ ختم کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اگر کوئی روحانی مسافر (*مرید*) اپنی پوری زندگی اس کام کے لیے وقف کر دے کہ اس کی نظر میں تعریف اور مذمت برابر ہو جائے تو یہ مصروفیت کسی کو کسی اور چیز کے لیے مہلت یا وقفے کی اجازت نہیں دے گی۔ روحانی مسافر کی ابدی خوشی اور لازوال کامیابی (*سعدہ*) کی راہ میں بہت سی غدار اور مشکل گھاٹیاں ہیں اور یہ ان گھاٹیوں میں سے ایک ہے۔ ان گھاٹیوں کو مشکل ترین روحانی جدوجہد (*مجاہدہ) کیے بغیر عبور نہیں کیا* جا سکتا۔

باب 9 - دکھاوے اور دکھاوے کے نقصانات

غزالی کی نویں کتاب "*احیاء العلوم الدین*" یا "خدا کی راہ کی احیاء" کی تیسری جلد یا چوتھائی کتاب میں دکھاوے کے نقصانات اور کسی بھی اچھائی کو ظاہر کرنے کے نقصانات کا ذکر کیا گیا ہے جو مادی املاک یا نمایاں صفات، قابلیت اور مہارت کے لحاظ سے کسی کے پاس موجود ہے۔ یہ بیماریاں اتنی خود کش ہیں کہ وہ کسی کی زندگی پر قبضہ کر لیتی ہیں اور کسی کو روحانی راستے سے ہٹا دیتی ہیں، جس کا ذکر اس مقالے کے پہلے حصے میں کیا گیا ہے، اور کسی کو اندرونی سکون اور سکون سے محروم کر دیتے ہیں۔ غزالی ان برائیوں اور ان کی ابتدا کے بارے میں گہری بصیرت فراہم کرتی ہے اور ان کو دل سے مٹانے کے طریقے تجویز کرتی ہے جس کے نتیجے میں اسے اندرونی سکون اور سکون سے بھر دیا جاتا ہے۔ شہرت کی تلاش کی طرح ، دکھاوا انا پرستی اور اس کے نتیجے میں تکبر کو فروغ دیتا ہے ، اس کے ساتھ ساتھ نفس (*نفس) کا جنون* اور اس کی کوتاہیوں سے اندھا پن بھی پیدا کرتا ہے ، اس طرح خود اصلاح کے تمام امکانات کو ختم کردیتی ہے اور چیزوں کو بہتر بنانے کے لئے موڑ دیتی ہے۔ دکھانے سے تمام معاملات میں اخلاص ختم ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ نیک کاموں سے متعلق معاملات میں بھی، اس طرح دل کو کسی بھی روشنی سے خالی کر دیتا ہے جو اس میں کسی کے نیک اعمال اور اعمال کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ غزالی کی اس کتاب کے مندرجات یہاں مختصر شکل میں اس طرح پیش کیے گئے ہیں:

دکھاوے کی مذمت

دکھاوے [یا دکھاوے یا دکھاوے کی نمائش] [شریعت الٰہی میں] حرام ہے اور جو ایسا کرنا خدا کی ناراضگی کا مستحق ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے [ایسے مخلص بندوں کا حوالہ دیتے ہوئے جو خالی دکھاوے اور دکھاوے سے عاری ہیں]:

إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ ٱللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَآءً وَلَا شُكُورًا

"ہم تمہیں صرف اللہ کے چہرے کی خاطر کھانا پیش کرتے ہیں (اللہ کی قبولیت، قربت اور قربت کا استعارہ)، نہ اس کا بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکر گزاری چاہتے ہیں۔" (سورۃ البقرۃ سورۃ البقرۃ آیت ۹)

فَمَن كَانَ يَرْجُواْ لِقَآءَ رَبِّهِۦ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَٰلِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِۦٓ أَحَدًا

"جو شخص اپنے رب سے ملنے کی امید رکھتا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ نیک عمل کرے اور اللہ کی عبادت میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے (مخلوقات کی خوشنودی، رضامندی اور تعریف حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کرنا ان کو اللہ کی عبادت میں شامل کرنے اور انہیں اللہ کے درجے تک لانے کے مترادف ہے)۔ (سورۃ البقرۃ 18، آیت 110)

ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: یا رسول اللہ! کون سا عمل نجات دہندہ ہے؟" آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "کسی بندے کو خدا کی اطاعت میں کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جس کا مقصد لوگوں سے تعریف، قدر، شکر، تعریف، مالی یا مادی فائد، وقار، رعایت وغیرہ کے حوالے سے پیش کرنا ہو)۔ (بیان کردہحدیث کا مجموعہ حکیم عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: جب تم کسی دن روزہ رکھو تو اپنے سر اور داڑھی پر بالوں کا تیل لگاؤ اور اپنے چکنائی والے ہاتھ کو اپنے ہونٹوں پر ڈال دو تاکہ لوگ نہ جان لیں کہ تم روزہ رکھتے ہو۔ جب تم اپنے داہنے ہاتھ سے صدقہ کرو تو اس طرح دے دو کہ تمہارا بائیں ہاتھ اس کا علم نہ رکھتا ہے۔ جب آپ نماز پڑھتے ہیں تو اپنے دروازے پر پردہ ڈال دیں [تاکہ کسی کو یہ معلوم نہ ہو کہ آپ نماز پڑھ رہے ہیں کیونکہ دعا کا مقصد خدا کی عبادت کرنا ہے نہ کہ لوگوں کی تعریف اور تعریف حاصل کرنے کے لیے اس میں سے عوامی نمائش کرنا]۔ اللہ تعالیٰ تسبیح کرتا ہے جب وہ رزق تقسیم کرتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا يقبل اللّٰه عزّ وجلّ عملا فيه مثقال ذرّة من رياء

"خدا اس عمل کو قبول نہیں کرتا جس میں دکھاوے کے ذرے برابر ہو"۔

ایک نبوت میں ارشاد ہے کہ قیامت کے دن جس دن اللہ کے سائے کے سوا کوئی سایہ نہ ہو گا تو عرش الٰہی کے سائے میں جگہ پائے جانے والوں میں وہ شخص ہوگا جس نے دائیں ہاتھ سے صدقہ کیا تھا اور بائیں ہاتھ کو اس کا علم بھی نہیں تھا۔ (بیان کردہ*احادیث* میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے صحیح بخاری *اور* صحیح مسلم*کا* مجموعہ ہے۔ ایک اور حدیث کے مطابق ایک خفیہ عمل کا ظاہری طور پر کیے جانے والے عمل سے ستر گنا زیادہ فضیلت ہے۔ (بیان کردہابو دردہ رضی اللہ عنہ *سے* حدیث کا مجموعہ *بیحقی* نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن ایک دکھاوے دار کو بلایا جائے گا کہ تمہارا اعمال ضائع ہو گئے اور تمہارا اجر ختم ہو گیا۔ جاؤ اور ان لوگوں سے اپنے اعمال کا بدلہ لے لو جن کے لیے تم نے ان اعمال کو انجام دیا۔" (بیان کردہ*احادیث* کا مجموعہ *ابن ابی الدنیا* جبل الیحسبی رضی اللہ عنہ سے ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے زمین کو پیدا کیا، پھر وہ اس پر

موجود ہر چیز سے کانپنے لگی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے پہاڑ بنائے اور ان کو زمین پر کھونٹے کی طرح بنا دیا۔ فرشتوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ خدا نے پہاڑوں سے زیادہ کوئی چیز نہیں بنائی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے لوہا پیدا کیا جس نے پہاڑوں کو کاٹ دیا۔ پھر اس نے آگ پیدا کی جس نے لوہا کو پگھلایا اس کے بعد پانی کا حکم دیا گیا جس نے آگ کو بجھا دیا۔ اس کے بعد ہوا کا حکم دیا گیا ، اور اس نے پانی کو الٹا کردیا۔ اس کے بعد فرشتوں کی رائے بدل گئی، اور انہوں نے خدا سے پوچھنے کے بارے میں سوچا۔ انہوں نے پوچھا تم نے اپنی تخلیق میں سب سے مشکل کیا ہے آپ نے فرمایا: میں نے ابن آدم کے دل سے زیادہ سخت نہیں کیا۔ جب کوئی دائیں ہاتھ سے صدقہ کرتا ہے تو ، وہ اسے اپنے بائیں ہاتھ سے چھپاتا ہے (یعنی ، یہ دکھاوے کی ہر سطح سے بچنے کے لئے مکمل رازداری کے ساتھ کیا جاتا ہے اور اس کے لئے خدا کے لئے ایک اعلی سطح کے اخلاص کی ضرورت ہوتی ہے جو روحانی تبدیلی کے لئے بہادر کوشش کے ساتھ آتی ہے)۔ (بیان کردہحدیث کا مجموعہ *ترمذی* انس رضی اللہ عنہ پر

حضرت عبداللہ بن مبارک رضی اللہ عنہ نے خالد بن مدان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے درخواست کی کہ وہ ان کے سامنے ایک حدیث (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک روایت بیان کریں) جو آپ اس کی سختی اور سختی کی وجہ سے روزانہ یاد کرتے تھے اور تلاوت کرتے تھے۔ معاذ رضی اللہ عنہ اس پر راضی ہو گئے لیکن وہ کافی دیر تک روتے رہے۔ اس کے بعد فرمایا:

"میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے کی کتنی بے صبری سے آرزو کرتا ہوں! ایک مرتبہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا۔ وہ اونٹ پر سوار تھا اور وہ مجھے اپنے پیچھے بیٹھنے کے لئے لے گیا۔ جب ہم آگے بڑھے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آسمان کی طرف دیکھا اور فرمایا: تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو اپنے بندوں کو جو چاہے حکم دیتا ہے۔ پھر میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے: میں تمہیں ایک بات بتا رہا ہوں، اگر تم اسے یاد کرو گے تو اس سے تمہارا فائدہ ہوگا، لیکن اگر تم اسے بھول جاؤ گے تو اللہ تعالیٰ کے سامنے تمہاری کوئی دلیل نہیں ہوگی۔ اے معاذ! آسمانوں کی تخلیق سے پہلے، اللہ تعالیٰ نے سات فرشتے پیدا کیے، ہر آسمان کے لیے ایک اور دروازے کے طول و عرض کے مطابق آسمان کے ہر دروازے پر ایک فرشتہ کو پہرہ دینے والا مقرر کیا۔ جب دو فرشتے *کرمان کتیبین*' (دو فرشتے جو ہر انسان کے دو کندھوں پر ہوتے ہیں اور اچھے یا برے کے تمام اعمال لکھتے ہیں) بندوں کے اعمال کے ساتھ اٹھتے ہیں تو ان میں سورج کی روشنی کی طرح روشنی ہوتی ہے۔ جب وہ پہلے آسمان کے دروازے پر پہنچتے ہیں تو وہاں پہرہ دینے والا فرشتہ *کرمان کتیبین*' (ہر انسان کے محافظ فرشتے) سے کہتا ہے کہ وہ اس عمل کو بندے کے منہ پر ڈال دے۔ فرشتہ کہتا ہے: میں غیبت کا فرشتہ ہوں۔ اے میرے رب اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں غیبت کرنے والے کا کام بڑھنے نہ دوں

'*کیرمن کتیبین*' ایک بار پھر خادم کے کچھ اور اعمال کے ساتھ دوسری آسمان پر چڑھ جاتی ہے جو سورج کی روشنی کی طرح چمکتی ہے۔ فرشتہ انہیں وہاں روکتا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ وہ اس عمل کو نوکر کے منہ پر ڈال دیں، کیونکہ اس عمل سے کسی کا مقصد دنیاوی منافع کمانا تھا۔ [فرشتہ ان سے کہتا ہے:] میرے خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں کسی ایسے شخص کے کام کو قبول نہ کروں جس نے خدا کے سوا کسی اور کے لیے یہ کام کیا ہو۔ اس کے بعد فرشتے شام تک ایسے شخص پر اپنا'*لانا*' (عربی لفظ'*لانا*' کا مطلب ہے کہ خدا کو اس کے بندے سے رحم سے بچنے کی دعا کرنا) بھیج دیتے ہیں۔

پھر فرشتے بندے کے دوسرے اچھے اعمال جیسے خیرات ، روزے اور دیگر نیک اعمال کے ساتھ اٹھتے ہیں جنہیں وہ بہت نیک اور قیمتی سمجھتے ہیں۔ لیکن جب وہ تیسرے آسمان پر پہنچتے ہیں تو محافظ فرشتہ انہیں روکتا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ وہ اعمال کرنے والے کے چہرے پر ڈالیں۔ [محافظ] فرشتہ کہتا ہے کہ وہ 'فخر' کا فرشتہ ہے۔ اسے اپنے رب کی طرف سے حکم دیا گیا ہے کہ وہ اعمال کو اوپر نہ جانے دے، جیسا کہ کرنے والا چاہتا ہے، اعمال کے ذریعے، دوسروں پر اپنی فضیلت ظاہر کرنے کے لیے۔

'*کیرمن کاتبین*' ایک بار پھر اس بندے [خدا] کے کچھ اور [اچھے] کاموں کے ساتھ اٹھتا ہے جو ستاروں کی طرح چمکتا ہے۔ ان میں نماز، حج، *تسبیح*، روزے وغیرہ جیسے خوبصورت اعمال شامل ہیں۔ جب وہ چوتھے آسمان پر پہنچتے ہیں تو ، محافظ فرشتہ انہیں روکتا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ وہ اعمال کرنے والے کے چہرے پر پھینک دیں۔ فرشتہ ان سے کہتا ہے: میں 'تکبر' کا فرشتہ ہوں اور میرے رب کی طرف سے مجھے حکم دیا گیا ہے کہ اعمال [خدا کی طرف] بلند نہ ہوں جس طرح کرنے والے نے اپنے اعمال کو تکبر کے ساتھ ملاوٹ کی ہے۔

پھر فرشتے دلہن کی طرح اپنے دوسرے نیک اعمال کو سجاتے ہیں جن میں حج (یا حراج)، خدا کی راہ میں جہاد وغیرہ شامل ہیں، سورج کی طرح چمکتے ہیں۔ وہ انہیں پانچویں آسمان پر لے جاتے ہیں۔ محافظ فرشتہ [پانچویں آسمان کے دروازے پر] انہیں یہ کہتے ہوئے روکتا ہے: میں 'حسد' کا فرشتہ ہوں۔ عمل کرنے والا ان لوگوں سے حسد کرتا ہے جن کو خدا نے اپنی رحمت سے عطا کیا ہے۔ یہ شخص خدا کی طرف سے [اپنے ساتھی انسانوں کو] عطا کردہ نعمتوں سے خوش نہیں ہے۔ میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اپنے اعمال کو اوپر نہ جانے دوں

پھر فرشتے اپنے اعمال جیسے وضو، مکمل تطہیر، نماز، روزہ، حج وغیرہ کے ساتھ چھٹے آسمان پر چڑھتے ہیں۔ وہاں تعینات محافظ فرشتہ ، انہیں یہ کہتے ہوئے روکتا ہے: میں 'رحمت' کا فرشتہ ہوں۔ اعمال کو نوکر کے چہرے پر تھوپ دو کیونکہ اس شخص نے کبھی کسی پر رحم نہیں کیا۔ دوسروں کو مصیبت اور بدقسمتی میں دیکھ کر خوش ہوا۔ میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اپنے اعمال کو بلند نہ ہونے دوں

اس کے بعد '*کرامان کاتبین*' اس شخص کے کچھ اور اعمال کے ساتھ ساتویں آسمان پر چڑھتی ہے جن میں صدقہ، نماز، روزہ، خدا کی راہ میں جہاد، *تقویٰ* وغیرہ شامل ہیں۔ یہ اعمال گرج چمک اور بجلی کی طرح اونچی آوازیں نکلتے ہیں۔ ساتویں آسمان پر موجود فرشتہ کہتا ہے: میں 'شہرت اور دکھاو' کا فرشتہ ہوں۔ اس شخص نے علمائے کرام اور عہدے اور عزت کے حامل افراد کی صحبت اور مجالس میں نقل و حرکت کے ذریعے شہرت حاصل کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اس شخص کے اعمال کو اوپر نہ جانے دوں۔

چنانچہ وہ عمل جو خالصتا اللہ تعالیٰ کے لیے نہیں کیا گیا ہے وہ *ریہ* ہے اور وہ ایسے اعمال کو قبول نہیں کرتا۔ پھر فرشتے نماز ، روزے ، *زکوٰۃ* ، حج ، عمرہ ، خوش اخلاق ، خاموشی ، اللہ کا ذکر وغیرہ جیسے نیک اعمال لے کر اٹھتے ہیں۔ سات آسمانوں کے فرشتے ان کو دیکھنے کے لیے ان کے ساتھ چلتے ہیں یہاں تک کہ وہ عدالت الٰہی تک پہنچ جاتے ہیں جہاں تمام پردے ہٹا دیے جاتے ہیں، اور وہ خدا کے سامنے گواہی دیتے ہیں کہ اس بندے کے اعمال صرف اللہ کی خاطر ہیں۔

اس لمحے اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تم فرشتے بندوں کے اعمال کی دیکھ بھال کرتے ہو لیکن میں ان کے دلوں کا خیال رکھتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ ان اعمال سے کسی نے میری رضا حاصل کرنے کا ارادہ نہیں کیا اور نہ ہی کسی نے یہ کام صرف میری خاطر کیا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ کسی نے اپنے اعمال سے واقعی کیا ارادہ کیا تھا۔ میری *رحمتوں* سے محرومی ایسے شخص پر ہو جس طرح اس نے تمہیں اور لوگوں کو بھی دھوکہ دیا۔ لیکن کوئی مجھے دھوکہ نہیں دے سکتا کیونکہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ دلوں کے باطن کی چھپائی ہوئی چیزیں چھپتی ہیں۔ مجھ سے کوئی پوشیدہ نہیں رہ سکتا اور نہ میری گرفت سے بچ سکتا ہے چاہے وہ مجھ سے دور ہونے کی کتنی ہی کوشش کرے مجھے اس بات کا پورا علم ہے کہ ماضی میں کیا ہوا ہے اور مستقبل میں کیا ہونے والا ہے۔ میرا علم ان تمام لوگوں کا احاطہ کرتا ہے جو گزر چکے ہیں اور جو ابھی آنے والے ہیں۔ میں ان کی مکمل تفصیلات کے ساتھ تمام رازوں سے پوری طرح واقف ہوں۔ مجھے اپنے اعمال سے کوئی دھوکہ نہیں دے سکتا۔ میرا بندہ جاہلوں کو دھوکہ دے سکتا ہے اور مجھے دھوکہ نہیں دے سکتا ہے شک میں غیب کا جاننے والا ہوں اس لیے میں اپنی رحمت سے محرومی کو ایسے شخص پر بھیجتا ہوں۔ سات [محافظ] فرشتے [جو سات آسمانوں کے دروازوں کی حفاظت کرتے ہیں] اور تین ہزار فرشتے سب ایک پر اپنا*'لانا'* بھیجتے ہیں۔ پھر آسمانوں کے رہنے والے کہتے ہیں کہ ان پر *ان کا لانا* ہے اور ان میں سے جو *ایسے دھوکے باز پر* اپنا لانا بھیجتے ہیں۔

یہ تمام تفصیلات سن کر میں (معاذ رضی اللہ عنہا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کر رہے تھے) پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور کہا: یا رسول اللہ! اس آفت سے چھٹکارا پانے کا کیا طریقہ ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے معاذ! اپنے نبی کی پوری ایمان اور یقین کے ساتھ اطاعت کرو۔ معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا: تم اللہ کے رسول ہو اور میں معاذ بن جبل ہوں۔ میں نجات کیسے حاصل کر سکتا ہوں؟" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے معاذ! اور اگر تمہارے اعمال ٹھیک نہ ہوں تو اپنی زبان کو دوسروں کو برا بھلا کرنے اور دوسروں کو رسوا کرنے سے بچ لو خاص طور پر اپنے بھائیوں اور*حفاز*(جنہوں نے پورا قرآن دل سے لکھا ہے)۔ اپنے بھائیوں اور لوگوں کے معاملات میں مداخلت نہ کرو۔ اپنی برائی کو نیچا دکھانے دو (*نفس*)، دوسروں کی بے عزتی کرنے سے گریز کریں۔ اپنے مسلمان بھائیوں کے بارے میں برا کہہ کر اپنے نفس کی حمد نہ کرو۔ دوسروں کو نیچا دکھا کر اپنی برتری قائم کرنے کے بارے میں کبھی نہ سوچیں۔ شہرت کمانے کے لیے دکھاوے کا سہارا نہ لیں۔ دنیا کے معاملات میں اس قدر مشغول نہ ہو کہ آخرت کے معاملات سے مکمل طور پر غافل ہو جاؤ۔ اگر کوئی آپ کے ساتھ بیٹھا ہے تو تیسرے شخص سے خفیہ طور پر بات نہ کریں۔ اور لوگوں پر اپنی فضیلت کا اظہار نہ کرو ورنہ تمہارا اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو جائیں گے۔ اپنی مجلسوں میں بے حیائی اور فحاشی کے موضوعات پر بات کرنے سے پرہیز کرو ایسا نہ ہو کہ لوگ آپ کی بدتمیزی کی وجہ سے آپ سے بچ جائیں۔ اپنی زبان سے دوسروں کی عزت کو نقصان نہ پہنچائیں ورنہ جہنم کے کتے تمہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا:

وَٱلنَّٰشِطَٰتِ نَشۡطٗا ﴿٢﴾ اور جب وہ ہڈیوں کا گوشت پھاڑ دیتے ہیں (سورۃ البقرۃ سورۃ البقرۃ آیت 2)

میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ان تمام احکامات پر عمل کرنے کی صلاحیت کون رکھتا ہے؟' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس بندے کے لیے عمل آسان ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ سہولت فراہم کرتا ہے۔ دوسروں کے لئے ناپسند کرتے ہیں جو آپ اپنے لئے ناپسند کرتے ہیں [اور دوسروں کے لئے وہی پسند کرتے ہیں جو آپ اپنے لئے پسند کرتے ہیں۔ اس طرح انتہائی خلوص کے ساتھ کیے گئے اعمال آپ کو آپ کی نجات دلائے گا]"۔ (حافظ عراقی،

نبوی احادیث کے ایک بڑے ماہر ہیں جنہوں نے ایک لاکھ نبوی احادیث کو ان کی مکمل نقل کے ساتھ حفظ کیا ہے، انہوں نے ایسا کیا ہے *غزالی کی" احیاء علوم الدین" یا "علم الٰہی کی وصولی"* میں موجود تمام احادیث کی حدیث کی تصدیق ہے اور اس نبوی روایت کے مآخذ کو *"کتاب الزہد لی ابن المبارک"* یا "ابن المبارک کی حقیر خواہشات سے پرہیز کی کتاب" اور *"ابن الجوزی فی الموددات" قرار دیا* گیا ہے۔

خالد بن معدان رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ معاذ رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کی اتنی تلاوت نہیں کی جتنی اس حدیث کی تلاوت کی۔ وہ اپنی محفلوں میں اکثر اس حدیث کا تذکرہ کرتے تھے۔

احادیث: حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو اپنی گردن جھکاتے ہوئے دیکھا۔ اس نے کہا: اے جھکی ہوئی گردن والے! اپنی گردن کو اوپر اٹھائیں۔ عاجزی گلے میں نہیں بلکہ دل میں ہے۔ ابو امامہ بہیلی رضی اللہ عنہ نے مسجد میں کسی کو سجدہ کی حالت میں دیکھ کر فرمایا: کیسا اچھا ہوتا اگر تم اپنے گھر میں ایسا کرتے (جہاں تمہیں ایسا کرتے ہوئے کوئی نہیں دیکھتا۔ تم خدا کے سامنے سچا مخلص ہو گے]"۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: دکھاوے کی تین نشانیاں ہیں: جب وہ تنہا ہوتا ہے تو وہ سست ہو جاتا ہے۔ لوگوں کو دیکھنے کے بعد کوئی متحرک ہوجاتا ہے۔ جب کوئی کسی کی تعریف کرتا ہے تو وہ زیادہ [نیکی] اعمال کرتا ہے، اگر کوئی کسی کو برا برا دیتا ہے تو وہ نیک اعمال کو کم کرتا ہے"۔ ایک شخص نے سعید بن مسیاب رحمہ اللہ سے پوچھا: ہم میں سے کوئی شخص نیک کام کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کا اجر اور تعریف چاہتا ہے۔ کیا کسی کا عمل [اس طرح] درست ہے؟" اس نے اس سے پوچھا: کیا تم اپنے آپ پر خدا کی ناراضگی چاہتے ہو؟ اس شخص نے نفی میں جواب دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب تم کوئی نیکی کرو تو اللہ کی رضا میں کرو اور اس میں سچا رہو۔ قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب کوئی بندہ دکھاوے کا مظاہرہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میرے بندے کی طرف دیکھو! ایسا کوئی مجھ سے مذاق کر رہا ہے!' ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ شہرت کے طالب کو اللہ پر مکمل ایمان نہیں آتا۔

دکھاوے کی حقیقت اور اس کے وقوع پذیر ہونے کے معاملات

دکھاوے کا مطلب ہے اچھی عادات اور کاوشوں کا مظاہرہ کرنا، عبادت کے ذریعے لوگوں کے دلوں میں تعریف اور وقار حاصل کرنا۔ اس لحاظ سے چار چیزیں ہیں۔ ایک دکھاوے کرنے والا شخص یا عبادت کرنے والا ہے۔ دوسرا وہ شخص ہے جو متاثر ہو رہا ہے، یعنی وہ شخص جس کے لیے دکھاوا کیا جاتا ہے۔ تیسرا وہ خصلتیں ہیں جن میں دکھاوا کیا جاتا ہے۔ چوتھا دکھاوا خود ہے۔

جن چیزوں میں دکھاوا کیا جاتا ہے: ایک دکھاوا کرنے والا شخص پانچ چیزوں میں دکھاتا ہے اور ان کے ذریعے لوگوں میں شہرت حاصل کرتا ہے: جسم، ظاہری شکل، الفاظ، اعمال اور پیروکار اور بیرونی اشیاء۔ دنیاداری میں ڈوبے ہوئے لوگ ان پانچ چیزوں کے ذریعے شہرت اور درجہ تلاش کرتے ہیں۔

اپنے ایمان میں جسم کے ساتھ دکھاونا: جسم کے ساتھ دکھاوے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان جسم پر کمزوری اور زرد پن اختیار کرتا ہے تاکہ لوگ یہ سمجھ سکیں کہ یہ شخص دینی معاملات میں بے حد محنت کرتا ہے اور آخرت کا خوف اس پر غالب ہے۔ کمزوری کم کھانے کے لئے دلیل دیتی ہے اور پیلا پن خدا کی عبادت کے لئے رات کو جاگنے کی دلیل دیتا ہے۔ اسی طرح بکھرے ہوئے بال اس بات کی دلیل دیتے ہیں کہ انسان ہر وقت عبادت میں مصروف رہتا ہے اور اس لیے اس کے پاس بالوں کو کنگھی کرنے کا بھی وقت نہیں ہے۔ جب اس قسم کے اشارے [سرعام میں] نظر آتے ہیں تو لوگ کسی کی پاکیزگی کے بارے میں بحث کرتے ہیں اور اس سے نفس نفس خوش ہوتا ہے۔ اسی طرح آواز کو نیچا رکھنا، آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے ہونا، ہونٹوں کی خشکی وغیرہ شامل ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شخص ہر وقت روزہ رکھتا ہے، خدا کے خوف کی وجہ سے آواز دھیمی ہو گئی ہے یا بھوک اس کی وجہ سے ہو رہی ہے۔ اسی لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ جب تم میں سے کوئی روزہ رکھے تو بالوں پر تیل ڈال کر کنگھی کرو اور آنکھوں میں اینٹیمون ڈال دو اور ہونٹوں کو چکنائی والے ہاتھوں سے رگڑیں تاکہ لوگ تمہیں روزہ نہ سمجھیں [جیسا کہ خشک ہونٹ روزہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں]۔ اسی طرح کی نصیحت صحابہ کرام حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ ان مقدس شخصیات نے لوگوں کو دکھاوے کے گناہ سے بچنے کے لیے ان طریقوں کی طرف رہنمائی کی۔ شیطان انہی راستوں سے عبادت گزار بندوں کو نشانہ بناتا ہے۔ مذہبی اور روحانی لوگ اپنے جسم کے ذریعے اس طرح دکھاوا کرتے ہیں اور دنیاوی لوگ صحت مند جسم، ظاہری خوبصورتی، قد، متوازن اعضاء اور خوبصورت جلد کے ذریعے دکھاوا کرتے ہیں۔

ظاہری شکل اور لباس کے ساتھ دکھاونا: بالوں کو بکھرا رکھنا، مونچھیں مونڈنا [یا تراشنا] [حکم کے مطابق]، سر جھکا کر چلنا، آہستہ آہستہ چلنا، پیشانی پر سجدے کے نشان رکھنا، کھردری اور موٹے کپڑے پہننا، اونی لباس پہننا، ٹخنوں تک جانے والی لمبی قمیضیں پہننا، آستینوں کو چھوٹا رکھنا، کپڑوں کو گندے اور پھٹا رکھنا، یہ تمام اعمال دکھاوے کے لیے کیے جاتے ہیں تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ وہ سنت کا پیروکار ہے اور خدا کے صالح بندوں کا پیروکار ہے۔ اس میں صوفیاء (روحانی مسافروں) سے مشابہت رکھنے کے لئے پیچ اور نیلے رنگ کے کپڑے پہننا بھی شامل ہے حالانکہ کوئی اچھی طرح جانتا ہے کہ کوئی روحانی راہ کی حقیقتوں سے زیادہ نہیں جانتا۔ شال کو لمبی قمیض کے گرد لپیٹنا اور اس کا کنارہ آنکھ پر لٹکانا بھی دکھاوا میں شامل ہے کیونکہ اس ظاہری شکل سے انسان توجہ کا مرکز بن جائے گا اور لوگ اس کی احتیاط کو تعریف کی نگاہ سے دیکھیں گے کہ کوئی راستے کی گرد و غبار سے آنکھوں کو بچا کر راستے پر چلتا ہے۔ یہ بھی دکھاوا ہے کہ ایک جاہل علمائے الہیات کا لباس پہنتا ہے، ان کی شکل اختیار کرتا ہے تاکہ لوگ کسی کو عالم سمجھیں اور اس کے ساتھ عزت و احترام سے پیش آئیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان میں سے ہر گروہ (جو لباس پہن کر دکھاتا ہے) اس سے کم یا زیادہ مطمئن نہیں ہوتا جس کے ساتھ وہ اپنی مقبولیت اور شہرت کو سمجھتا ہے، اگرچہ یہ [شریعت الٰہی میں] جائز ہو۔ یہ مذہبی لوگوں کا حال ہے۔ دنیاوی لوگ مہنگے کپڑے، اچھی سواری، عمدہ شال، قمیضیں، گاؤن اور مہنگی اشیاء کے ذریعے دکھاوا کرتے ہیں۔ یعنی گھر میں رہتے ہوئے عام کپڑے پہنتے ہیں لیکن جب گھر سے باہر نکلتے ہیں تو عمدہ کپڑے پہن کر دھوم دھام سے باہر نکلتے ہیں تاکہ لوگ انہیں امیر سمجھیں۔

گفتگو کے ساتھ دکھاو: مذہب یا روحانی راستے کے لوگ نصیحت اور واعظ کو اپنے شوق کے طور پر اپنا کر دکھاوا کرتے ہیں۔ وہ حکمت اور دانشمندی کی باتیں گھڑتے ہیں، [اولیاء اور مذہبی لوگوں] کی روایات کو حفظ کرتے ہیں تاکہ انہیں روزمرہ کی گفتگو میں استعمال کیا جا سکے تاکہ مخاطب اپنے وسیع علم اور نیک پیشرووں (*سلف صالحین*) کی ریاستوں اور روایات سے ان کی وسیع وابستگی کا اقرار کرے۔ وہ عام اجتماعات میں خدا کا ذکر کرتے ہیں اور اپنے ہونٹوں کو ہلاتے ہیں تاکہ لوگ یہ سمجھ سکیں کہ وہ بہت متقی ہیں اور ہر لمحہ عبادت الٰہی میں مصروف ہیں۔ وہ نیکی کی نصیحت کرتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں اور برائی پر غضب کا اظہار کرتے ہیں، لوگوں کو گناہ میں

ملوث دیکھ کر بے حد تکلیف کا اظہار کرتے ہیں، بات کرتے وقت اپنی آواز بہت کم کرتے ہیں، قرآن مجید کو چھونے والے انداز میں پڑھتے ہیں تاکہ ان کا خوف اور غم ظاہر ہو جائے، نبوی کی احادیث حفظ کرنے اور اس کے علماء سے ملنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ پیغمبری روایات کے راویوں کے دروازے پر دستک دیں اور اگر کوئی ان کو بیان کرے تو وہ اس میں خامیاں تلاش کرتے ہیں اور فورا اس کی صداقت یا عدم موجودگی کے بارے میں رائے قائم کرتے ہیں، تاکہ لوگ اس میدان کے بارے میں اپنے علم سے متاثر ہوجائیں، مخالف کو محکوم کرنے کے لیے لمبی تقریریں کریں اور اپنے علم کے اظہار کے لیے قرآن اور نبوی کے حوالہ جات دیں۔ مذہبی لوگوں کے لیے گفتگو کے ذریعے دکھاوے کی بے شمار قسمیں ہیں۔ دنیاوی لوگ شاعری اور مثالیں حفظ کر کے دکھاوا کرتے ہیں، الفاظ میں روانی اور فصاحت و بلاغت کا خاص خیال رکھتے ہیں، متمول لوگوں کو متاثر کرنے کے لیے انوکھے جملے اور حیرت انگیز الفاظ حفظ کرتے ہیں اور لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے دوستی کا اظہار کرتے ہیں۔

اعمال کے ساتھ دکھاوا کرنا: [اعمال میں دکھاوا بہت سے طریقوں سے ہوتا ہے، اگر جان بوجھ کر کیا جاتا ہے، جیسے] نماز میں زیادہ دیر تک کھڑے رہنا، رکوع اور سجدہ کرنا لمبا کرنا، گردن جھکنا، [عبادت کے علاوہ دیگر چیزوں کی طرف توجہ دینا]، سکون اور وقار کا مظاہرہ کرنا، ہاتھ اور پاؤں جوڑ رکھنا اور ایسے اعمال جو نمازوں میں عاجزی اور عیش و عشرت کا اظہار کرتے ہیں، وغیرہ۔ یہ ظاہری اعمال روزے، زیارت، *زکوٰۃ* اور نماز کے علاوہ جہادت (اندرونی اور ظاہری طور پر) ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح چلنے پھرنے اور سر جھکا رکھنے میں عاجزی کا عمل، گفتگو میں سکون اور وقار اور ان جیسے اعمال میں دکھاوا ہو سکتا ہے۔ یہ اس حد تک ہے کہ ایک دکھاوے والا شخص اپنی ضروریات کے لیے تیزی سے آگے بڑھتا ہے لیکن جب کوئی مذہبی شخص آتا ہے تو وہ اپنی رفتار بدل کر آہستہ آہستہ چلنا شروع کر دیتا ہے، سر جھکا کر اس وقت تک کہ ٹھوڑی سینے کو چھو نہ لے، آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہے تاکہ لوگ کسی کو جلد بازی اور غیر مہذب نہ کہیں۔ چنانچہ جب وہ شخص نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے تو پھر جلدی سے چلنا شروع ہو جاتا ہے اور جب کسی کو دیکھتا ہے تو پھر عاجزی کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایسا شخص خدا کو یاد کر کے عاجزی اختیار نہیں کرتا بلکہ صرف اپنے ساتھی انسانوں کو متاثر کرنے کے لیے کرتا ہے، تاکہ وہ خدا کے نیک بندوں میں سے ایک کو شامل کر لیں۔ کچھ نسبتا محتاط لوگ تنہائی میں چلتے ہیں جیسے وہ دوسروں کے سامنے چلتے ہیں۔ وہ شرمندہ محسوس کرتے ہیں کہ جب وہ اکیلے ہوتے ہیں تو عوام میں ان کی رفتار رفتار کے برعکس ہوتی ہے تاکہ انہیں دوسروں کے سامنے اپنی رفتار تبدیل کرنے کی ضرورت نہ پڑے۔ وہ سوچتے ہیں کہ ایسا کرنے سے وہ دکھاوے سے بچ جائیں گے لیکن انہیں یہ احساس نہیں ہے کہ ان کی دکھاوے میں اس طرح اضافہ ہوگا۔ [اس کی وجہ یہ ہے کہ،] پہلے وہ صرف لوگوں کے سامنے دکھاوا کر رہے تھے، اب وہ نجی طور پر بھی کر رہے ہیں۔ دنیاوی لوگوں کی اعمال سے دکھاوا یہ ہے کہ وہ تکبر کے ساتھ چلتے ہیں، چلتے وقت مسلسل ہاتھ ہلاتے ہیں اور کندھوں کو چھلانگ لگاتے ہیں۔ وہ اپنے وقار اور شان و شوکت کو ظاہر کرنے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔

دوستوں اور جاننے والوں کے ساتھ دکھاوا: کسی عالم کی کسی سے ملنے کی خواہش کرنا تاکہ لوگ کہیں کہ یہ شخص اتنا اہم ہے کہ فلاں عالم یا فلاں عبادت گزار کسی کو جانتا ہے اور ملنے آتا ہے یا مذہب میں کسی کا مقام بلند ہوتا ہے، اسی لیے لوگ آتے ہیں اور کسی سے ملنے کا شرف حاصل کرتے ہیں۔ کچھ لوگ کسی بادشاہ (ریاستی اتھارٹی) یا کسی اعلیٰ شاہی (سرکاری) عہدیدار سے ملنے کے خواہاں ہوتے ہیں تاکہ عام لوگ مذہب میں کسی کی عظمت کا اعتراف کریں۔ کچھ لوگ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ انہوں نے ان میں سے بہت سے لوگوں سے ملاقات کی ہے اور ان سے روحانی فوائد حاصل کیے ہیں۔ وہ ان کے ساتھ اپنی ملاقاتوں اور ان سے روحانی فوائد حاصل کرنے پر فخر کا اظہار کرتے ہیں، خاص طور پر جب کوئی بحث ہو یا کسی مخالف کو دبانے کی ضرورت ہو۔ ان مواقع پر لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ میں نے فلاں عالم کو دیکھا ہے، فلاں عالم سے سنا ہے، فلاں ممالک کا سفر کیا ہے اور بہت سے روحانی مرشد اور اساتذہ کی خدمت سے فائدہ اٹھایا ہے۔

یہ وہ پانچ چیزیں ہیں جن سے دکھاوے کرنے والے دکھاوا کرتے ہیں اور ایسا کرنے کا مقصد [خدا] کی مخلوقات میں عزت اور مقام حاصل کرنا ہے۔ کچھ لوگ اپنے بارے میں تخلیقات کے بارے میں اچھی رائے سے مطمئن ہوجاتے ہیں۔ اس لیے بہت سے راہب اپنی عبادت گاہوں میں جاتے ہیں اور برسوں تک باہر نہیں آتے۔ بہت سے نمازی پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھتے ہیں اور وہاں لمبے عرصے تک قیام کرتے ہیں اور نیچے نہیں آتے۔ ان کی گمشدگی اس یقین پر ہے کہ لوگ ان کے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہیں۔ اگر انہیں معلوم ہو جائے کہ اب لوگوں کے پاس ان کے بارے میں اچھی رائے نہیں ہے یا ان پر کوئی جرم عائد کیا گیا ہے تو ان کا سارا اندرونی سکون تباہ ہو جاتا ہے اور وہ اب اپنے بارے میں اس اچھی رائے سے مطمئن نہیں رہتے جس پر انہوں نے تنہائی اختیار کرنے پر انحصار کیا تھا۔ مزید برآں، ان کی اندرونی پریشانی یہ جاننے کے بعد بھی ختم نہیں ہوتی کہ وہ خدا کے سامنے [ان چیزوں سے بری ہو چکے ہیں] بلکہ ان کے اندر کی ہنگامہ آرائی اور غم دیکھنے کے قابل ہے۔ وہ لوگوں کے دلوں میں اپنے وقار اور مقام کی واپسی کے لیے ہزاروں بہانے بناتے۔ اگرچہ ان میں دولت کا لالچ نہیں ہے لیکن شہرت سے کوئی بچ نہیں سکتا کیونکہ یہ ایک بڑا نقصان ہے۔ شہرت وہ کمال ہے جو اب حاصل ہوتی ہے، اگرچہ یہ زیادہ دیر تک نہیں ہوتی لیکن چونکہ زیادہ تر لوگ جاہل ہیں، اس لیے شہرت کے لاتعداد متلاشی نظر آتے ہیں۔

بہت سے لوگ دلوں میں اپنے مرتبے سے مطمئن نہیں ہوتے، بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ دلوں کے ساتھ ساتھ زبانیں بھی ان کی تعریف اور تعظیم کریں۔ کچھ لوگ چاہتے ہیں کہ انہیں دور دراز مقامات پر شہرت ملے تاکہ لوگ ان سے ملنے کے لیے لمبے فاصلے طے کریں۔ کچھ بادشاہوں کے ساتھ شہرت چاہتے ہیں تاکہ ان کی شفاعت قبول کی جائے، ان کی ضروریات پوری ہوں اور عام لوگوں میں ان کی عزت اور ساکھ ہو۔ بعض لوگ اس سے دولت کمانا اور جمع کرنا چاہتے ہیں، اگرچہ یہ یتیموں، مسکینوں، اوقاف یا کسی اور کی ذاتی ملکیت ہو۔ دکھاوے کرنے والے لوگوں کے تمام گروہوں میں سے ، یہ [پانچ] بدترین گروہ ہیں جو ان پانچ طریقوں سے دکھاوا کرتے ہیں۔

دکھاوے اور اس بیماری کے ساتھ دل کا علاج کرنے کی دوا

اب تک یہ واضح ہو چکا ہے کہ دکھاوا نیک اعمال کو باطل کر دیتا ہے اور ایک دکھاوے کو خدا کی ناراضگی کا مستحق بناتا ہے۔ یہ ایک مہلک بیماری ہے، اسی لیے اگر کسی کو یہ بیماری ہو جائے تو اس کے خاتمے کے لیے دوا اور علاج کی ضرورت پڑتی ہے، چاہے اس کے حصول کے لیے کتنی ہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے اور اس کے حصول کے لیے روحانی جدوجہد کی ضرورت کیوں نہ ہو۔ دوا کی تلخی اور تلخی صحت یابی کی ضمانت ہے۔ یہ ایک روحانی جدوجہد ہے جس کی ہر فرد کو ضرورت ہے چاہے وہ بچہ ہی کیوں نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بچہ عقل اور فہم سے محروم ہے اور وہی کرتا ہے جو وہ لوگوں کو کرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ جب کوئی بچہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ساتھ معاشقہ، دکھاوے اور مصنوعی کام کرتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس کے دل میں جذبات، دکھاوے اور مصنوعی پن کی محبت پیدا ہوتی ہے [جو سب دکھاوا کا حصہ ہیں] اور تمام حواس کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ اس عادت کی تخریبی کیفیت اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب انسان عقل و فہم حاصل کرلیتا ہے لیکن اس وقت تک یہ عادت اس قدر پختہ ہو جاتی ہے کہ شدید روحانی کشمکش (*مجاہدہ*) اور انتہائی مشکلات کے بغیر اس کا خاتمہ ناممکن ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر ایک کو اس روحانی جدوجہد کی ضرورت ہے۔ شروع میں مشکلات ہیں لیکن حال ہی میں آسانی آتی ہے۔ اس بیماری کے علاج کے دو طریقے ہیں۔ پہلا یہ کہ اس کے اصول اور اسباب جو دکھاوے کے

درخت کو پروان چڑھاتے ہیں ختم ہو جاتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ دکھاوے کے خطرات (جارحانہ خیالات) کو دور کردیا جاتا ہے۔

علاج کا پہلا طریقہ - اصولوں اور اسباب کا خاتمہ: یہ طریقہ [دکھاوے کی روحانی بیماری کا علاج] اس وقت عملی ہو جاتا ہے جب [دکھاوے کے روحانی مرض کا علاج] عملی ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ دکھاوے کی بنیاد شہرت اور وقار کی محبت ہے۔ اگر اس کی تفصیل سے وضاحت کی جائے تو دکھاوے کی تین بنیادیں ہیں: پہلا حمد کی لذت، دوسرا اس غم سے نفرت جو کسی کو مذمت سے محسوس ہوتا ہے، تیسرا لوگوں کے مال کی لالچ ہے۔ یہ چیزیں دکھاوے کی وجوہات ہیں اور دکھاوا کو دوبارہ زندہ کرتی ہیں۔ بعض اوقات تعریف کی خواہش نہیں ہوتی، لیکن مذمت کے غم سے بچنا چاہتا ہے۔ مثال کے طور پر، ایک کنجوس شخص کچھ سخی لوگوں کے درمیان پھنس جاتا ہے جو خدا کی راہ میں بڑھتی ہوئی رقم خرچ کر رہے ہیں۔ ایسا کنجوس کچھ پیسے صدقہ میں خرچ کرتا تھا تاکہ کنجوس نہ کہا جائے۔ ایسے شخص میں تعریف کی خواہش نہیں تھی بلکہ صرف بخل کی بدنامی سے بچنے کی خواہش تھی۔ ایک اور مثال ایک بزدل کی ہوگی جو کچھ بہادر لوگوں کے درمیان پھنس جاتا ہے اور بہادر کہلانے کی خواہش کے بغیر بزدل قرار دیئے جانے سے بچنا چاہتا ہے۔ اسی طرح یہ وہ شخص ہے جو بعض نمازیوں میں ہوتا ہے جو رات کو عبادت کے لیے جاگ کر نماز پڑھتا ہے اور رات کو چند چکر نمازیں کرتا ہے تاکہ لوگ کسی کو سست نہ کر سکیں۔ ایسا شخص مذمت سے محتاط ہے اور تعریف کا خواہاں نہیں ہے۔ بعض اوقات انسان حمد و ثناء کی لذت کے ساتھ صبر کر سکتا ہے لیکن مذمت کے درد پر صبر نہیں کر سکتا۔ چنانچہ کوئی شخص ضرورت کے بغیر بھی سوال نہیں پوچھتا یا کوئی *فتویٰ* جاری کرتا ہے یا نبوی کی احادیث کے علم کا دعویٰ کرتا ہے حالانکہ وہ کچھ نہیں جانتا ہے، صرف اس کے لیے کہ مذمت سے بچ جائے۔ یہ وہ معاملات ہیں جو ایک دکھاوے والے شخص کو دکھاوے میں ملوث ہونے پر آمادہ کرتے ہیں۔

دکھاوے کا مخصوص علاج: یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ انسان کسی چیز کی خواہش صرف اس وقت کرتا ہے جب وہ اسے منافع بخش اور خوشگوار سمجھتا ہے ، چاہیے منافع یا خوشی فوری طور پر ظاہر ہو یا بعد میں متوقع ہو۔ لیکن اگر کسی کو علم ہو کہ اس چیز کا نفع یا لذت عارضی ہے اور بعد میں نقصان دہ ہو گا تو اس چیز کی خواہش ختم کرنا یا اس سے بچنا مشکل نہیں رہتا۔ مثال کے طور پر شہد کے ذائقے سے واقف ہے لیکن اگر کسی پر یہ بات ظاہر ہو جائے کہ اسے زہر میں ملا دیا گیا ہے تو وہ اسے کبھی استعمال نہیں کرے گا۔ خواہشات اور میلانات کو مٹانے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ عارضی فوائد کو نظر انداز کیا جائے اور اس کے مستقبل کے نقصانات کو سامنے رکھیں۔ اگر کسی بندے کی طرف سے دکھاوے کے نقصانات کا علم ہو اور اسے معلوم ہو جائے کہ ایک دکھاوے والا شخص دنیا میں نیک اعمال کرنے کی صلاحیت سے محروم ہے اور وہ آخرت میں خدا کی قربت سے محروم ہے۔ کیا قیامت کے دن دردناک عذاب ملے گا، خدا کی ناراضگی کا مستحق قرار دیا جائے گا، "گنہگار" اور "دھوکہ باز" کے لقاب سے پکارا جائے گا، اور یہ کہہ کر شرمندہ کیا جائے گا، "کیا تم اللہ کی اطاعت کے بدلے دنیاوی مال اور مال کمانے میں شرمندہ نہیں تھے؟ تم بندوں کو سمجھتے تھے اور خدا کی عبادت سے مذاق اڑاتے تھے۔ آپ خدا سے دور ہو کر [خدا کے] بندوں (یعنی ساتھی انسانوں) کے محبوب بن گئے۔ تو نے ان کے لیے اپنے آپ کو سجایا اور اپنے آپ کو گندگی سے گندا کر دیا۔ آپ نے اپنے آپ کو خدا سے دور کر کے ان کی قربت پایی۔ تم نے بندوں کی حمد و ثنا کے لیے خدا کی لعنت کو حقیر سمجھا۔ جب کوئی بندہ اس ذلت کے بارے میں سوچتا ہے اور آخرت میں ہونے والے نقصانات سے دنیا کے فوائد کا موازنہ کرتا ہے تو وہ ذرا بھی دکھاوے کی طرف مائل نہیں ہوگا۔ دکھاوے کی وجہ سے [نیکی] اعمال کا نقصان کوئی چھوٹا نقصان نہیں ہے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ اخلاص کا عمل نیک اعمال کے ترازو میں بھاری ہوتا ہے لیکن جب اسے دکھاوے کے ساتھ ملایا جاتا ہے تو وہ گناہوں میں شامل ہوجاتا ہے اور گناہوں کا ترازو بھاری بنا دیتا ہے۔ اگر دکھاوے سے صرف ایک ہی عبادت ضائع ہو جائے تو بھی اس سے کم نقصان نہیں ہوتا۔ اگر

فرض کریں کہ ترازو کا ترازو نیک اعمال کے ساتھ بھاری ہے، تو پھر بھی، ایک دکھاوے کا عمل دوسرے تمام نیک اعمال سے قطع نظر کسی کو انبیاء، اولیاء اور گنوسٹکس کے زمرے میں شامل کرنے کی اجازت نہیں دے گا۔

یہ دین یا خدا کے راستے میں نقصان کی وضاحت تھی، دنیاوی نقصان بھی کم نہیں ہے۔ لوگوں کے دلوں کا خیال [ان کے خیال کے لحاظ سے] کسی بھی صورت میں پریشانی اور پریشانی کا سبب ہے۔ عوام کی منظوری ایک ایسی حد ہے جس تک پہنچنا آسان نہیں ہے۔ اگر کوئی آپ کے کسی عمل سے خوش ہے تو ، کوئی اور ہے جو اسی عمل کے لئے آپ سے ناراض ہے۔ کچھ لوگ دوسروں کو پریشان کرکے خوش ہوسکتے ہیں۔ جو شخص مخلوقات کی ناپسندیدگی کو خدا کی ناپسندیدگی پر ترجیح دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کسی سے ناراض ہو جاتا ہے اور دوسروں کو اس سے ناراض کر دیتا ہے۔ پھر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ مخلوقات سے حمد و ثناء کا کیا فائدہ؟ لوگ بندوں کی حمد و ثنا کو اللہ کی ناپسندیدگی پر کیوں ترجیح دیتے ہیں حالانکہ ان کی تعریف نہ کسی کی رزق میں اضافہ کرتی ہے اور نہ اس میں کمی کرتی ہے۔

جہاں تک لوگوں کے مال و مال میں لالچ کا تعلق ہے تو یہ سوچنا چاہیے کہ تمام دلوں کو اللہ تعالیٰ نے فتح اور محکوم کر دیا ہے۔ وہ کسی بھی دل کو دینے کے لئے مائل کرنے اور کسی بھی دل کو دینے سے روکنے کی طاقت رکھتا ہے۔ تمام مخلوقات خدا کی قدرت کے تابع ہیں اور رزق صرف خدا کے ہاتھ میں ہے۔ مخلوق سے رزق کا لالچ رکھنے والا ذلت سے محفوظ نہیں رہتا۔ یہاں تک کہ اگر کوئی مقاصد حاصل کر لیتا ہے تو وہ احسان کے بوجھ سے محفوظ نہیں رہتا۔ جھوٹی امیدوں اور کھوکھلے خیالات کی وجہ سے خدا کی قربت اور خدائی عزت کو مسترد کرنا حماقت ہے۔ مزید یہ کہ یہ ضروری نہیں کہ کوئی شخص اپنے لالچ کے مطابق حاصل کرنے کے قابل ہو۔ زیادہ تر وقت ، کسی کو ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر کوئی کامیاب بھی ہو جائے تو کامیابی کا لطف بہت زیادہ خوشیاں نہیں لائے گا، اس احسان کے نتیجے میں ذلت کے درد کے مقابلے میں جو اس سے کہیں زیادہ ہو گا۔

لوگوں کی مذمت کا خوف بھی حماقت ہے۔ کیا ان کی مذمت کی وجہ سے نقصان میں اضافہ ہوا ہے؟ تقدیر کے خالق نے جو کچھ لکھا ہے، وہ ضرور ہونے والا ہے۔ سزا موت کو نہ جلدی کرے گی اور نہ رزق میں تاخیر کرے گی۔ اگر وہ جنت کا مستحق ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی شخص ناپسند نہیں کرے گا۔ اگر کوئی شخص اللہ کا محبوب ہے تو وہ اس کے سامنے سب انسان اس کے سامنے اس سے قاصر ہیں کیونکہ وہ نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ وہ زندگی اور موت پر اختیار رکھتے ہیں اور نہ وہ موت کے بعد کی زندگی پر اختیار رکھتے ہیں۔ اگر کوئی اس طرف غور و فکر کرے اور دل و دماغ غور و فکر کی اس لائن کی طرف متوجہ ہو جائے تو اس کی کوئی وجہ نہیں کہ دل کا دکھاوے کی طرف کوئی جھکاؤ باقی رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ذہین شخص ان چیزوں کی طرف کوئی جھکاؤ نہیں رکھتا جن کا فائدہ سے زیادہ نقصان ہوتا ہے۔ یہ بات بھی ضروری ہے کہ اگر لوگوں کو کسی دکھاوے والے شخص کی باطنی کیفیت کا پتہ چل جائے جسے وہ دل میں دکھانا پسند کرتا ہے لیکن زبان سے خلوص کا اظہار کرتا ہے تو وہ ایسے شخص سے نفرت کرنے لگیں گے۔ اللہ تعالیٰ ایک دن اس راز کو کھول دے گا تاکہ انسان لوگوں کی نظروں میں نفرت کا شکار ہو جائے اور وہ خدا کے سامنے اپنے دکھاوے اور ذلت سے آگاہ ہو جائے۔ ایسا نہیں ہے کہ لوگوں پر صرف دکھاوا ظاہر ہو جائے بلکہ اس کا خلوص بھی ظاہر ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے اخلاص کی وجہ سے انسان کو لوگوں میں محبوب بناتا ہے، اس کے لیے ان کے دلوں کو فتح کرتا ہے اور ان کی زبانوں کو اس کی حمد و ثنا کرنے کی طاقت عطا کرتا ہے، حالانکہ لوگوں کی تعریف میں نہ تو کمال ہے اور نہ ہی ان کی مذمت میں کوئی عیب [کیونکہ ان کی مجموعی منصوبہ بندی میں بھی کوئی فرق نہیں ہے]۔ لوگوں کی تعریف یا مذمت کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

جو شخص آخرت کی زندگی اور اس زندگی میں حاصل ہونے والی نہ ختم ہونے والی نعمتوں اور بلندیوں کو ہمیشہ اپنے شعور میں رکھتا ہے وہ دنیاوی زندگی کی نعمتوں کو غیر اہم سمجھے گا جو مشکلات اور گستاخیوں سے ملی ہوئی ہیں اور اپنی تمام تر فکر و فکر اور عمل کی قوت اللہ تعالیٰ کی طرف مرکوز کرے گا۔ دکھاوے کی ذلت اور لوگوں کے دلوں کو تکلیف دینے سے کوئی اپنے آپ کو محفوظ رکھے گا۔ کسی کے خلوص کی روشنی کا عکس کسی کے دل پر پڑے گا، جو اس کی وسعت کا سبب بنے گا۔ دل کی وسعت لطیف روحانی نقاب کشائی (*مکاشفہ*) کا دروازہ کھول دے گی جس سے خدا سے لگاؤ اور مخلوقات سے دوری میں اضافہ ہوگا۔ دنیا پرستی سے نفرت اور آخرت کی عظمت [کے دل میں] بڑھے گی کیونکہ دل میں مخلوقات کے لیے کوئی جگہ نہیں بچے گی۔ [نتیجتا] دکھاوے کا محرک دل میں بھی پیدا نہیں ہوگا اور خلوص کا راستہ خود بخود کھل جائے گا۔

اعمال کے ذریعے دکھاوے کا علاج

دکھاوے کا عملی علاج یہ ہے کہ عبادتوں کو چھپانے کی عادت ڈال دی جائے اور ان کو اس طرح چھپایا جائے جیسے گناہوں کو چھپایا جاتا ہے، یہاں تک کہ دل اللہ تعالیٰ کے علم اور عبادت سے مطمئن ہو جاتا ہے، اور نفس نفس اللہ کے سوا کسی اور کے علم اور شعور کی ضرورت محسوس نہ کرے۔ ایک روایت کے مطابق ابو حفص حداد رحمہ اللہ کے ایک صحابی نے *دنیاداری* اور اہل دنیا کی مذمت کی جس پر انہوں نے فرمایا کہ تم نے ایسی چیز ظاہر کی جسے چھپانا چاہیے تھا۔ آج کے بعد میرے ساتھ مت بیٹھو۔" اس پر غور کیجئے کہ ابو حفص نے انہیں ایک چھوٹی سی بات ظاہر کرنے سے منع کیا ہے کیونکہ دنیاداری کی مذمت کا دعویٰ کرنا دنیا پرستی سے پرہیز اور خدا سے پرہیز کا اعلان ہے۔ دکھاوے کو چھپانے کے لئے اس سے زیادہ موثر اور کامیاب کوئی اور دوا نہیں ہے۔ روحانی جدوجہد (*مجاہدہ*) کے ابتدائی مرحلے میں [عبادت] کو چھپانا بہت مشکل ہے۔ لیکن اگر کچھ عرصہ صبر سے کام لیا جائے اور زبردستی کرنے کے باوجود اس کو چھپانے کی عادت بنا دیا جائے تو اس عمل کا بوجھ ختم ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ کے نہ ہونے والے نعمتوں، برکتوں، قابلیت اور تائید کی وجہ سے آسانی پیدا ہو جائے گی۔ لیکن یہاں [عمل کے معاملے میں] کوششوں کا پھل ملتا ہے۔ کوششوں کی کمی سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّ ٱللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُواْ مَا بِأَنفُسِهِمۡۗ

"بیشک اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ لوگ خود اپنی حالتیں بدل نہ دیں۔" (سورة البقرة ۱۳، آیت ۱۱)

إِنَّ ٱللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجۡرَ ٱلۡمُحۡسِنِينَ

"بے شک اللہ نیک کاموں میں سبقت کو ضائع نہیں کرنے گا۔" (سورة البقرة القرآن، آیت ۹، آیت ۱۲۰)

دوسرا طریقہ: خطرات اور رکاوٹوں کا خاتمہ: دوسرے لفظوں میں ان اشاروں (*وسوا*) اور پریشان کن خیالات (*خواطر*) کو مٹانا جو عبادت کے دوران دل میں آتے ہیں اور خدا کے سوا کسی اور میں مشغول ہوتے ہیں۔ اس کے خاتمے کا طریقہ سیکھا جانا چاہیے۔ وہ لوگ جو اپنے نفسوں کے خلاف جدوجہد کرتے ہیں، قناعت کے کاموں کو بروئے کار لاتے ہیں، لالچ کو ختم کرتے ہیں، مخلوقات کی نظروں میں اپنے آپ کو ذلیل بناتے ہیں، ان کی تعریف و مذمت سے

غافل ہو جاتے ہیں، وہ اپنے دلوں سے دکھاوے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتے ہیں۔ شیطان عبادت کے دوران ان کی پیروی کرنا بند نہیں کرتا، بلکہ وہ انہیں دکھاوے کے خیالات سے پریشان کرتا ہے۔ ان کے ادنیٰ نفس کی طرف سے ان کے مضحکہ خیز خیالات اور خواہشات مکمل طور پر ختم نہیں ہوتیں، بلکہ وہ روحانی کشمکش کے ذریعے زیر ہو جاتے ہیں۔ جب بیرونی عوامل انہیں دوبارہ توانائی بخشتے ہیں تو ، وہ دوبارہ زندہ ہونا شروع ہوجاتے ہیں۔ اس لیے دکھاوے کے خطرات اور اسباب کو دور کرنا اور اس کے طریقہ کار کو جاننا ضروری ہے۔

دکھاوے کے خطرات: دکھاوے کے تین خطرات ہیں (لفظ "خطرہ" یہاں جارحانہ پریشان کن خیالات سے مراد ہے)۔ کبھی کبھی یہ تینوں ایک ہی وقت میں ظاہر ہوتے ہیں اور وہ [اجتماعی طور پر] ایک خطرے کی طرح لگتے ہیں ، کبھی کبھی وہ آہستہ آہستہ آتے ہیں - پہلے پہلا ، پھر دوسرا ، پھر تیسرا۔ پہلا خطرہ یہ ہے کہ انسان یہ خواہش کرے کہ عبادت کرنے والے [اپنی عبادت سے] آگاہ ہوں اور اس کی خواہش کرے کہ وہ اس بات سے آگاہ ہو کہ وہ اس سے واقف ہیں۔ اس کے بعد ادنیٰ نفس لوگوں کی تعریف، تعریف، مرتبہ اور وقار کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ادنیٰ نفس اس کو قبول کرتا ہے اور اس پر یقین رکھتا ہے۔ پہلے خطرے کو "جاننا" کہا جاتا ہے، دوسرے کو "ریاست" کہا جاتا ہے جسے "ہوس اور میلان" بھی کہا جا سکتا ہے اور تیسرے کو "عزم اور ارادہ" بھی کہا جا سکتا ہے۔ پہلے خطرے کے خاتمے کے لیے زیادہ طاقت (طاقت اور کوشش) درکار ہوتی ہے تاکہ دوسرے خطرے کی آمد کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔ لہٰذا اگر کسی کے دل میں مخلوق کے علم کی اہمیت اور ضرورت کا خیال ہو جائے اور انہیں اس علم سے آگاہ کیا جائے تو اسے اپنے آپ سے پوچھ کر اسے دور کر دینا چاہیے کہ تمہیں مخلوقات سے کس چیز کی ضرورت ہے؟ چاہے وہ آپ کی عبادت سے واقف ہوں یا نہ ہوں، آپ کی عبادت کی قبولیت یا عدم قبول پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے؟ اللہ جانتا ہے، وہی ہے جو قبول کرنے یا انکار کرنے پر قادر ہے، اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کرنے سے کیا فائدہ؟ اگر دل میں حمد و ثناء کی خواہش پیدا ہو تو دکھاوے کے نقصانات پر غور کر کے اس خواہش کو ختم کر دینا چاہیے اور یہ سوچنا چاہیے کہ اگر میں دل کے خلوص کے ساتھ یہ عمل نہ کروں گا تو قیامت کے دن میں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور غضب کا مستحق ہو جاؤں گا اور ان اعمال سے محروم ہو جاؤں گا جو اللہ کی رضا اور قبولیت حاصل کریں گے سب سے زیادہ ضرورت ہے"۔ بالکل اسی طرح جیسے یہ جاننا کہ لوگ ہماری عبادت سے واقف ہیں، دکھاوے کا جھکاؤ اور ہوس پیدا کرتا ہے، اسی طرح، دکھاوے کے نقصانات کا ذکر کرنا [دکھاوے کے کاموں کی طرف] نفرت اور نفرت کو جنم دیتا ہے۔ جھکاؤ کسی کو قبولیت کی دعوت دیتا ہے ، اور بغض انکار کا باعث بنتا ہے۔ نفس نفس اس دعوت کو قبول کرتا ہے جو مضبوط اور غالب ہے۔

دکھاوے کے خطرات کا خاتمہ: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دکھاوے کے خطرات (جارحانہ خیالات) کو دور کرنے کے لیے تین معاملات ضروری ہیں - علم، بغض اور انکار۔ بندہ (خدا کا انسان) عبادت کا آغاز عزم اور خلوص کے ساتھ کرتا ہے، پھر دکھاوے کا خطرہ [دل میں] پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اسے قبول کر لیتا ہے۔ اس زمانے میں وہ علم اور نفرت یاد نہیں ہے جو پہلے دل میں تھی۔ آخرت کی بربادی کے دکھاوے اور سمجھ بوجھ کے نقصانات جو پہلے موجود تھیں، دب جاتی ہیں۔ اس کی تمثیل ایک ایسے شخص کی ہے جو صبر کا خیال دل میں رکھتا ہو، غصے کو برا سمجھتا ہے اور اس عزم کو برقرار رکھتا ہے کہ اگر غصے کی وجوہات ظاہر ہوں تو صبر سے کام لیتا ہے، لیکن پھر کچھ ایسے اسباب سامنے آتے ہیں جن کی وجہ سے غصے کی آگ بھڑک اٹھتی ہے اور سابقہ عزم کا خیال دل کو چھوڑ دیتا ہے اور غصے کے نقصانات نظروں سے غائب ہو جاتے ہیں۔ ہوس کی مٹھاس کے ساتھ بالکل یہی صورتحال ہے۔ جب دل اپنی مٹھاس سے بھر جاتا ہے تو گنوسس کی روشنی چھپ جاتی ہے۔ یہی حال ان تمام خواہشوں کی ہے جو اچانک توانائی حاصل کر لیتی ہیں اور ان سے کسی کے ایمان اور روحانی راہ (ایمان) کو جو نقصان پہنچتا ہے وہ یاد نہیں رہتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر گنوسس باقی نہیں رہتا تو [برائی سے] نفرت کا اظہار نہیں کیا جاتا کیونکہ نفرت گنوسس اور گہری فہم سے پیدا ہوتی ہے۔

بعض اوقات انسان کو یاد آتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دل میں پیدا ہونے والا خطرہ (خطرناک اور جارحانہ پریشان کن خیال) دکھاوے کا خطرہ ہے جو الٰہی کی ناراضگی کا باعث بنتا ہے۔ لیکن شہوت انسان پر اس قدر غالب ہے کہ گہری فہم کے باوجود اس پر اصرار کر لیتا ہے، نفس کی طرف سے ہوش اور ضدی حماقت (حوا) کر دیتی ہے، عقل کو بادل سے دور کر دیتی ہے، وہ جو لذت حاصل کرتا ہے اسے چھوڑنے کے قابل نہیں ہے، دل کو تسلی دینے کے لیے توبہ کرنے کا بہانہ بناتا ہے، یا ایسے کام کرتا ہے جس سے لذتوں کی عیبوں پر غور کرنے کا موقع نہ ملے۔ بعض علماء یا علماء کوئی ایسا لفظ نہیں بولتے جو دکھاوے سے خالی ہو اور وہ بھی اس سے واقف ہوں لیکن اس کے باوجود وہ اس سے گریز نہیں کرتے، بلکہ اس پر اصرار کرتے ہیں۔ یہ اصرار ان کے خلاف (قیامت کے دن) ایک عظیم دلیل ہو گا کیونکہ وہ اس کی تباہی کو جانتے ہوئے بھی دکھاوا کرتے ہیں۔ صرف علم اور فہم کافی نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ ہی [دکھاوے سے] نفرت بھی ضروری ہے۔ بعض اوقات انسان میں فہم اور بغض دونوں ہی ہوتے ہیں، اس کے باوجود وہ دکھاوے کے محرکات کو قبول کرتا ہے اور ان کے مطابق عمل کرتا ہے کیونکہ [دکھاوے کی طرف] نفرت ہوس کی طاقت کے مقابلے میں کمزور ہوتی ہے۔ اس طرح کی بغاوت کا کوئی فائدہ نہیں ہے کیونکہ نفرت کا سارا مقصد اس طرح کی حرکتوں سے باز رہنا ہے۔ فائدہ صرف تین معاملات کے مشترکہ اثر میں ہوتا ہے: سمجھ بوجھ ، نفرت اور انکار۔ انکار بغاوت کا پھل (نتیجہ) ہے اور نفرت گہری تفہیم کا رد عمل ہے۔ ایمان اور علم کی روشنی (اندرونی نور) کی طاقت کی حد تک، گنوسس اور روحانی نور (*معرفہ*) [حضوری الٰہی کی طرف لے جانے والا] مضبوط ہو گا۔ جس حد تک دل میں دنیا کی محبت (دنیاداری) موجود ہے وہ آخرت سے غافل رہے گا۔ جس حد تک کوئی اپنی نعمتوں سے منہ پھیر لے گا اور دنیا کی زندگی کے نقصانات سے غافل رہے گا، وہ ابدی زندگی کی ابدی نعمتوں سے بچ جائے گا اور اس حد تک اس کی معرفت اور روحانی نور کمزور ہو جائے گا۔ یہ ایک ایسی زنجیر ہے جس کی کڑیاں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں۔ کچھ پھل اور دوسروں کے نتائج ہیں۔ ان سب کی ابتدا دنیاداری کی محبت اور خواہشات پر غلبہ ہے۔ یہی ہر گناہ اور غلطی کی بنیاد ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شہرت اور مقام کی لذتیں اور دنیاوی نعمتوں سے محبت انسانی دل کو لوٹ لیتی ہے اور ایمان کی باطنی روشنی کی طاقت کو ختم کر دیتی ہے۔ انسان اس لذت میں اس قدر مگن ہے کہ وہ نہ تو آخرت کو اپنے غور و فکر کا موضوع بنا سکتا ہے اور نہ ہی وہ کتاب الٰہی (*قرآن*) اور طریقہ نبوت *(سنت)* *کی روشنیوں میں حصہ لینے کے قابل ہے۔*

سچائی اور اخلاص کی نشانیاں

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ علماء اور واعظوں میں اخلاص، سچائی اور دکھاوے سے دوری کی کیا نشانیاں ہیں اور یہ کہ وہ اپنے علم اور خطبات سے ظاہر نہیں کر رہے؟ یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اس کی کچھ علامات ہیں۔ ایک نشانی یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کے سامنے آئے جو ایک سے بہتر خطبہ دیتا ہے، ایک سے بہتر عالم ہے، اور لوگوں میں ایک سے زیادہ مقبول ہے تو اسے خوش ہونا چاہیے اور حسد نہیں کرنا چاہیے، لیکن حیرت زدہ تعریف کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ حیرت انگیز تعریف یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے لئے اسی طرح کے علم کا خواہاں ہے۔ ایک اور نشانی یہ ہے کہ اگر کسی کی محفل میں ممتاز لوگ آتے ہیں تو اس کے انداز تشریح میں کوئی تبدیلی نہیں لیتا بلکہ اس کے بجائے پہلے کی طرح بولتا رہنا چاہیے۔ سب لوگ اپنی نظر میں برابر ہونے چاہئیں۔ ایک اور نشانی یہ ہے کہ لوگوں کی طرف سے یہ خواہش نہیں ہوتی کہ وہ بازاروں اور راستوں میں اس کے پیچھے چلتے پھرتے ہیں۔ کسی کے خلوص اور دکھاوے کو جاننے کی نشانیاں بے شمار ہیں اور ان کا شمار کرنا مشکل ہے۔ یہ چند نشانیاں اور اشارے ہیں جن کے ذریعے بندے کی باطنی کیفیت کا پتہ چلتا ہے۔ جب آپ علماء کو ایک دوسرے

سے حسد کرتے اور ایک دوسرے سے دشمنی کرتے ہوئے دیکھیں تو جان لو کہ انہوں نے آخرت کے بدلے دنیاوی زندگی خرید لی ہے۔

شیطان اور نفس کے اشاروں کا علاج: یہ سب شیطان اور نفس نفس کی طرف سے اشارے ہیں۔ ان کا علاج یہ ہے کہ ان حالات میں اپنے خیالات اور غور و فکر کو ایک مختلف سمت دی جائے اور یہ سوچنا چاہیے کہ اگر لوگ کسی کی منافقت سے آگاہ ہو جائیں اور کسی کے شعور کی کیفیت سے آگاہ ہو جائیں تو وہ اس سے کتنی نفرت کریں گے۔ جب بندوں کا یہ حال ہے تو اللہ تعالیٰ کا کیا حال ہو گا جو سب سے باخبر اور جاننے والا ہے اور اپنے باطن کی ہر کیفیت سے واقف ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

تَعَوَّذُوا بِاللّٰهِ مِنْ خُشُوْعِ النِّفَاقِ

"نفاق سے عاجزی سے خدا کی پناہ مانگو"۔ (بیان *کردہابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ* سے حدیث *کا مجموعہ* بیحقی

منافقت سے پیدا ہونے والی عاجزی یہ ہے کہ جسمانی اعضاء کانپ رہے ہیں لیکن دل میں ذرا سا بھی اثر نہیں ہوتا ہے [کیونکہ یہ کسی حقیقی عاجزی سے خالی ہے]۔ یہ نصیحت اللہ تعالیٰ کے عذاب اور غضب سے پناہ مانگنے اور توبہ کرنے کے بارے میں ہے کیونکہ یہ عمل بعض اوقات خدا سے ڈرنے اور اپنے گناہوں کی یاد اور اس پر پچھتاوے کی وجہ سے ہوتا ہے اور کبھی دکھاوے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یہ مختلف مضحکہ خیز خیالات دل پر اترتے ہیں اور وہ ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ کے دل پر ایسا خیال آتا ہے تو دیکھو کہ وہ خیال یا اشارہ کیوں ہے اور اس کی ابتدا کہاں سے ہوئی ہے۔ اگر خدا کی طرف سے کوئی خیال آیا ہے تو اسے ہونے دیں لیکن خوفزدہ بھی رہیں کیونکہ دکھاوا اتنی خاموشی سے حملہ کرتا ہے کہ اکثر اوقات کسی کو احساس بھی نہیں ہوتا۔ یہ ممکن ہے کہ آپ نے جو عمل (عمل یا عمل یا کوشش، خاص طور پر خدا کی رضا اور رضامندی کے خواہاں نیک شخص) کو خلوص نیت سے شروع کیا ہو وہ دکھاوے سے آلودہ ہو گیا ہو۔ لہٰذا یہ سوچ کر خوفزدہ رہو کہ اللہ تعالیٰ آپ کی ہر حالت اور ہر حالت سے واقف ہے۔ اگر آپ کا عمل ذرا سی بھی دکھاوے کے ساتھ مل جائے تو آپ غضب الٰہی اور غضب کا نشانہ بن جائیں گے [کیونکہ خدا صرف رحمت ، مہربانی ، مغفرت اور سخاوت کا مجسمہ نہیں ہے بلکہ وہ اپنی جان بوجھ کر زیادتیوں ، زیادتیوں ، ظلم و ستم اور نقصان دہ طرز عمل پر بھی الزام لگاتا ہے جو انفرادی اور اجتماعی فلاح و بہبود کے لئے نقصان دہ ہے۔ اور وہ بھی الٰہی رحمت اور عدل کی وجہ سے]۔ حضرت علی بن الحسین رحمۃ اللہ علیہ نے یہ دعا فرمائی: "اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس چیز سے جہاں میرا ظاہری حصہ لوگوں کی نظر میں اچھا ہے اور جب میں تنہائی میں ان سے دور ہوتا ہوں تو میرا باطن تیرے سامنے برا ہوتا ہے۔ میں اس صورت حال سے تیری پناہ مانگتا ہوں جس میں میں اپنے اعمال کی حفاظت کرتا ہوں جو لوگوں کے سامنے دکھاونے کے لیے ہیں اور ان اعمال کو برباد کر دیتا ہوں جو صرف تیرے لیے ہیں اور میں اپنے بدترین اعمال لے کر تیرے سامنے آتا ہوں، نیک اعمال کے ذریعے لوگوں سے قربت حاصل کرتا ہوں اور برے اعمال کے ساتھ تمہارے سامنے آتا ہوں اور تمہارے غضب کو حاصل کرتا ہوں۔ اے اللہ! مجھے اس دکھاوے اور منافقت سے محفوظ رکھو"۔

یہ دکھاوا کے نقصانات ہیں۔ بندے کو چاہیے کہ وہ ان نقصانات پر نظر رکھے اور ان سے واقف رہے۔ ایک نبوی روایت کے مطابق دکھاوے کے ستر دروازے ہیں اور آپ نے پڑھا ہے کہ ان میں سے بعض دوسروں کے مقابلے میں زیادہ لطیف اور سمجھدار ہیں یہاں تک کہ دکھاوے کی بعض شکلیں چیونٹی کی حرکت کی طرح بہت محتاط ہوتی ہیں اور کچھ چیونٹی کی حرکت سے بھی زیادہ سمجھدار ہوتی ہیں۔ کوئی اس کا ادراک کیسے کر سکتا ہے؟ اس کے لئے

مسلسل چوکسی اور شدید توجہ کی ضرورت ہے۔ نچلے نفس کی مسلسل جانچ پڑتال اور جانچ پڑتال کے بغیر دکھاوے کے نقصانات سے آگاہ ہونا بہت مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان نقصانات سے محفوظ رکھے۔

جہاں تک دکھاوے کا تعلق ہے تو شیطان کی طرف سے اتنے اشارے اور فریب ہیں کہ انہیں تحریری طور پر شامل نہیں کیا جا سکتا۔ ان اشاروں سے چھٹکارا پانے کا کوئی طریقہ نہیں سوائے اس کے کہ تم اللہ کے سوا ہر چیز کو دل سے نکال دو اور ساری زندگی اپنی نفس کو عذاب الٰہی میں پھنسنا پسند نہ کرو۔ اس کے بجائے آپ کو ایک ایسے بادشاہ کی طرح زندگی گزارنی چاہیے جس کے لیے تمام دنیاوی نعمتیں اور لذتیں میسر ہوں لیکن وہ ان سے لطف اندوز نہیں ہو کیونکہ اس کا جسم بیماریوں میں مبتلا ہے، اور وہ ہر وقت اس بات کا خدشہ رکھتا ہے کہ ان [دنیاوی] لذتوں میں مشغول ہونے سے اس کی تباہی ہو جائے گی۔ اگر [دوسری طرف] کسی نے احتیاط کا مظاہرہ کیا اور نچلے نفس کے خلاف روحانی جدوجہد کی [اس کی خواہشات پر قابو پانے کے لیے] ، تو وہ طویل عرصے تک زندہ رہے گا اور اس کی بادشاہی طویل عرصے تک قائم رہے گی۔ اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے انسان معالجین اور خوشبو فروشوں کی صحبت کو اپناتا ہے اور نچلے نفس کو کڑوی ادویات کھانے کا عادی بناتا ہے، اگرچہ خوراک کی کمی کی وجہ سے جسم کمزور ہو جاتا ہے، لیکن ادویات کی روک تھام اور مسلسل استعمال کے بارے میں نظم و ضبط کی وجہ سے اس بیماری سے مکمل نجات مل جاتی ہے جس سے وہ متاثر ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر نچلی نفس کبھی خواہشات کا مطالبہ کرتی ہے تو ، وہ تمام بیماریاں جن کا آخری انجام موت ہے ، مجسم شکل میں ایک کے سامنے آئیں گے۔ جب بھی کڑوی دوا کا استعمال نفس پر مشکل ہوتا ہے تو وہ ضرور اس صحت کے بارے میں سوچے گا جو اس دوا کے نتیجے میں اسے ملے گی اور وہ زندگی بھی جو سکون اور خوشحالی کی زندگی ہوگی جس میں جسم بیماریوں سے آزاد ہو گا اور دل پریشانیوں سے آزاد ہو جائے گا۔ یہ ایک مومن کا بھی حال ہے جو آخرت کی خواہش کرتا ہے اور ہر اس چیز سے پرہیز کرتا ہے جو آخرت کی تباہی کا سبب بن سکتی ہے اور آخرت میں دنیاوی (دنیاوی یا نفسانی) لذتوں اور خواہشات سے زیادہ تباہ کن اور کیا ہو سکتی ہے۔ مومن دنیاوی لذتوں سے پرہیز کرتا ہے اور تھوڑی سی چیز پر مطمئن ہوتا ہے۔ کمزوری ، غم ، تنہائی ، غم ، خوف اور مخلوقات سے وابستگی ترک کرنا پسند کرتا ہے تاکہ غضب الٰہی کسی پر نازل نہ ہو اور تباہی کسی کا مقدر نہ بن جائے۔ ایسا شخص دنیاوی (دنیاوی یا جسمانی) لذتوں سے غافل ہو کر نجات حاصل کرنے کی توقع رکھتا ہے۔ یہ خوف اور توقع انسان کو دنیاوی لذتوں سے بچنے میں صبر کرنے کی طاقت دیتی ہے اور انسان جانتا ہے کہ جو مال اس کے پاس رہے گا وہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور رضامندی ہے۔ پھر انسان یہ بھی جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ رحم کرنے والا اور مہربان ہے اور وہ ان بندوں کی مدد کرتا ہے جو اللہ کے احکام پر عمل کرتے ہیں اور ان کے ساتھ رحم اور محبت سے پیش آتے ہیں۔ اگر وہ چاہے تو انہیں تمام دکھوں اور مصائب سے غافل کر سکتا ہے لیکن وہ (حکمت الٰہی اور انہیں ابدی خوشی اور ابدی کامیابی کی راہ پر گامزن کرنے کے لئے) [انسانوں کو آزمائشوں، مصیبتوں اور مصیبتوں کے ساتھ] آزماتا ہے اور اپنی حکمت الہامی اور عدل سے ان کی نیت اور سچائی کو آزماتا ہے۔

جب انسان (روحانی راہ کی طرف سے) مشکلات اختیار کرتا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مکمل مدد ملتی ہے اور وہ سختی آسان ہو جاتی ہے، صبر کی قوت میسر ہو جاتی ہے، اور [الہامی] اطاعت ایک محبوب عمل بن جاتی ہے یہاں تک کہ وہ [خدا] کی التجا اور [الہامی] اطاعت کے کاموں میں وہ ایک لذت حاصل کر لیتا ہے، جس سے باقی تمام [دنیاوی اور نفسانی] لذتیں غیر اہم نظر آتی ہیں۔ اور جسم کو وہ طاقت مل جاتی ہے جو تمام دنیاوی لذتوں کو مٹا دیتی ہے۔ رحمان اپنے طالب کی محنت کو رائیگاں نہیں جانے دیتا اور نہ ہی کسی طالب کو اپنے دروازے سے خالی ہاتھ جانے دیتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جو شخص ایک ہاتھ میری طرف بڑھتا ہے تو میں ایک بازو کی طرف بڑھتا ہوں۔ جو میرے پاس چلتے ہوئے آتا ہے ، میں ایک دوڑتا ہوا جاتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لوگ مجھ سے ملنے کے خواہشمند ہیں اور میں ان سے ملنے کا زیادہ خواہاں ہوں۔ ابتدا میں، ایک بندے کو اپنی [روحانی] کشمکش میں سچائی

اور اخلاص کا مظاہرہ کرنا چاہیے، پھر وہ دیکھے گا کہ مہربان رب کسی کو اپنی قربت، محبت اور رحمت سے کتنا برسائے گا۔

باب 10 - تکبر اور تکبر کے نقصانات

غزالی کی دسویں اور آخری کتاب *"احیاء العلوم الدین"* یا "خدا کی راہ کی احیاء" کی تیسری جلد یا چوتھائی کتاب میں افراد، برادریوں اور پوری قوموں کو متاثر کرنے والی تمام روحانی بیماریوں میں سے دو سب سے زیادہ تباہ کن بیماریوں کا ذکر کیا گیا ہے: تکبر اور تکبر (یا خود راستبازی)۔ تکبر کسی کو دوسروں پر اپنی سمجھی جانے والی جھوٹی برتری پر قائل کرتا ہے اور اس طرح اس کے مالک اور ان لوگوں کے درمیان ایک رکاوٹ پیدا ہوتی ہے جو ان کی نسل، نسل، مذہب، قومیت، نظریہ، مادی جائیداد، خرابی، غلطی، نقصان اور معاشرتی حیثیت کی وجہ سے حقارت سے دیکھے جاتے ہیں۔ تکبر کسی دوسرے شخص یا لوگوں کے گروہ کے نقطہ نظر کو جاننے کی کسی بھی کوشش کا دروازہ مکمل طور پر بند کر دیتا ہے ، اور یہ سخت جذبات ، دشمنیوں ، کھلے تنازعات اور اس کے نتیجے میں انارکی کا باعث بنتا ہے جو آخر میں ہر چیز کو تباہ کر دیتا ہے۔ خود راستبازی یا اپنے آپ کو ہر چیز کے بارے میں درست سمجھنا ، تکبر کی ایک اور شاخ ہے جو ایک بار اور ہمیشہ کے لئے سچائی کی تلاش کا دروازہ بند کر دیتی ہے ، جس کے نتیجے میں انسان کو جھوٹ کی حالت میں ڈبو دیا جاتا ہے جس کا خاتمہ کرنا مشکل ہوتا جاتا ہے ، جب یہ پورے وجود کو گھیر لیتا ہے۔ تکبر اور خود راستبازی کی یہ برائیاں عاجزی کی اعلیٰ باطنی خوبی کے لئے ناپسندیدہ ہیں جو سچائی کو تلاش کرنے کے لئے ضروری ہے۔ غزالی کا ان منفی رجحانات کا ماہرانہ علاج اور ان کا علاج جو عاجزی، خود اصلاح اور اپنی زندگی کو بہتر بنانے کی صحت مند حالت کو جنم دیتا ہے، اس کو مختصر شکل میں اس طرح پیش کیا گیا ہے:

تکبر اور تکبر دو مہلک بیماریاں ہیں [کیونکہ یہ باطن اور کسی بھی روحانی خواہشات کے لیے تباہ کن ہیں]۔ مغرور اور خود راستباز بیمار مریض ہیں جو خدا کے دشمن اور اس کے غضب کا شکار ہیں۔ چونکہ [کتاب "خدا کی راہ کی احیاء" کی اس [تیسری جلد] میں باطنی تخریبی کردار کی خصوصیات، صفات، مزاج اور مزاج کی وضاحت کی جا رہی ہے، اس لیے تکبر اور تکبر پر روشنی ڈالنا ضروری ہے۔ یہ دونوں [انسان کے باطن اور روح کی] بدترین تخریبی صفات میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ کتاب (غزالی کی چار جلدوں پر مشتمل *عظیم تصنیف* "خدا کی راہ کا احیاء" کی چالیس کتابوں میں سے ایک) کو دو ابواب میں تقسیم کیا جا رہا ہے۔

تکبر کے نقصانات

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

سَأَصْرِفُ عَنْ ءَايَٰتِيَ ٱلَّذِينَ يَتَكَبَّرُونَ فِي ٱلْأَرْضِ بِغَيْرِ ٱلْحَقِّ

"میں ان لوگوں کو جو دنیا میں ناحق تکبر کرتے ہیں (یعنی تکبر کی وجہ سے اندرونی اندھا پن اور ایک شدید ذہنی رکاوٹ پیدا ہوتا ہے جو اس کے عمل کرنے والوں کو حق کا نور دیکھنے سے روکتا ہے، اور اس کے نتیجے میں وہ باطل کے اندھیرے میں ڈوب جاتے ہیں جو ان کے پورے وجود کو گھیرے ہوئے ہیں)۔ (سورة البقرة سورة البقرة آیت ۱۴۶)

كَذَٰلِكَ يَطْبَعُ ٱللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ

"اور اس طرح اللہ تعالیٰ ہر متکبر اور ظالم کے دل پر مہر لگا دیتا ہے [تاکہ اس کا دل ہدایت اور حق کی سیدھی راہ کو سمجھنے سے قاصر ہو جائے]۔ (سورة البقرة باب 40 آیت 35)

إِنَّهُۥ لَا يُحِبُّ ٱلْمُسْتَكْبِرِينَ

"بے شک اللہ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔" (سورة البقرة باب 16، آیت 23)

لَقَدِ ٱسْتَكْبَرُوا۟ فِيٓ أَنفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيرًا

"یہ لوگ اپنے دلوں میں تکبر کر رہے ہیں [عظمت اور خود کو بڑھا چڑھا کر اور دوسروں کی طرف دیکھتے ہوئے] اور [انسانی شائستگی اور خدا کی حدود کی حدود سے تجاوز کر چکے ہیں جو لوگوں کو تکبر سے دور رہنے اور عاجزی اختیار کرنے کی تلقین کرتی ہیں]۔" (سورة البقرة باب 25، آیت 21)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ مِنْ كِبْرٍ وَلَا يَدْخُلُ النَّارَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ مِنْ إِيمَانٍ

"وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں سرسوں کے بیج کے برابر تکبر بھی ہو۔ وہ شخص جہنم میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں سرسوں کے ایک بیج کے برابر ایمان ہو۔ (بیان کردہ *عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ* سے حدیث *کا* مجموعہ صحیح مسلم

لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ بَخِيلٌ وَلَا جَبَّارٌ وَلَا سَيِّئُ الْمَلَكَةِ

"جنت میں کوئی داخل نہیں ہوگا جو کنجوس ہو، تکبر کرے یا اپنی رعایا کے ساتھ ظلم کرے"۔

"بدترین بندہ وہ ہے جو ظلم و ستم کا شکار ہو اور غالب اور غالب حاکم (خدا) کو بھول جائے۔ بدترین بندہ وہ ہے جو ظلم کرے اور تکبر کرے اور نگہبان کو بھول جائے۔ بدترین خادم وہ ہے جو غفلت اور بیکار وقت ضائع کرنے والے کاموں میں ملوث رہے اور قبر کی مٹی میں سڑنے کی حقیقت کو بھول جائے۔ بدترین بندہ وہ ہے جو بغاوت، بغض و عداوت اور عداوت میں حدود کو عبور کرے اور [زمین پر انسان کے وجود کو] کے آغاز و انجام کو بھول جائے۔ (بیان کردہ*اسماء بنت عمیش* رضی اللہ عنہا پر حدیث *کا* مجموعہ ترمذی

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: بشارت اس شخص کے لیے ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب کا علم دیا اور وہ تکبر سے محفوظ رہا۔ محمد بن حسین بن علی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دل میں تکبر کی مقدار کے تناسب سے عقل کم ہو جاتی ہے۔ کسی نے سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے ایک ایسی برائی کے بارے میں پوچھا جس کی موجودگی میں کوئی نیکی اور نیک عمل فائدہ مند نہیں ہے۔ اس نے جواب دیا، "یہ تکبر ہے"۔ ایک مرتبہ حسن رضی اللہ عنہ سے ایک نوجوان حسن رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزرا۔ اس نے اس نوجوان کو اپنے پاس آنے کے لیے بلایا اور فرمایا: ایک آدمی اپنی جوانی اور خوبصورتی پر فخر کرتا ہے، اگرچہ تم یہ سوچو کہ تمہارے جسم نے قبر کو چھپا لیا ہے اور تمہارے اعمال تمہارے سامنے آ گئے ہیں۔ جاؤ اور اپنے دل کا علاج کرو۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے صرف یہ چاہتا ہے کہ ان کے دل اصلاح ہوں۔ ایک روایت کے مطابق مطرف بن عبداللہ الشخیر رحمۃ اللہ علیہ نے محبوب (ایک اعلیٰ سرکاری افسر) کو دیکھا جو ریشمی کپڑے پہنے ہوئے تھے اور فخر سے چل رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابو عبداللہ! یہ قدم اللہ اور اس کے رسول کو ناراض کرتا ہے۔ محب نے اس سے کہا، "شاید تم نہیں جانتے کہ میں کون ہوں"۔ اس نے کہا: کیوں نہیں؟ میں جانتا ہوں [تم کون ہو]۔ ابتدا میں تو صرف نطفہ کا ایک گندے قطرہ تھا اور آخر میں تو ایک گندی لاش بن جائے گا۔ اور اب [آپ کے آغاز اور اختتام کی دو حالتوں کے درمیان]، آپ [اپنے پیٹ میں] گندگی لے کر گھوم رہے ہیں۔ لہٰذا اپنی حقیقت کو جان کر انسان کو عاجزی کے سوا کچھ حاصل کرنا مناسب نہیں ہے۔ یہ سن کر محب چلے گئے اور اس [تکبر اور مغرور انداز] کی سیر چھوڑ دی۔

عاجزی کی فضیلت

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَا زَادَ اللّٰهُ عَبْدًا بِعَفْوٍ اِلَّا عِزًّا وَمَا تَوَاضَعَ اَحَدٌ لِلّٰهِ اِلَّا رَفَعَهُ اللّٰهُ

"خدا کسی بندے کی بخشش کی وجہ سے اس کی عزت اور عزت میں اضافہ کرتا ہے۔ جو شخص اللہ کی راہ میں عاجزی اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو اعلیٰ درجے پر بلند کرتا ہے۔ (بیان کردہحدیث کا مجموعہ صحیح *مسلم* ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے

مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ وَمَنْ تَكَبَّرَ وَضَعَهُ اللّٰهُ وَمَنِ اقْتَصَدَ اَغْنَاهُ اللّٰهُ وَمَنْ بَذَّرَ اَفْقَرَهُ اللّٰهُ وَمَنْ اَكْثَرَ ذِكْرَ اللّٰهِ اَحَبَّهُ اللّٰهُ

"جو شخص اللہ کی راہ میں عاجزی اختیار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو بلند درجات پر بلند کرتا ہے اور جو تکبر کرتا ہے، اللہ تعالیٰ (عاجزی کے تجربات سے) نازل کرتا ہے اور جو فضول خرچی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو مفلس بناتا

ہے اور جو اللہ کو بہت یاد کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا محبوب بناتا ہے۔ (بیان کردہ*طلحہ بن یحییٰ رضی اللہ عنہ* پر حدیث جمع کرنے والا بازار

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے خدا کی طرف سے یہ اختیار دیا گیا تھا کہ یا تو بندہ اور نبی یا بادشاہ اور نبی بنوں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ کیا انتخاب کروں۔ فرشتوں میں سے جبرائیل علیہ السلام میرا دوست ہے (جیسا کہ پیغمبر جبرائیل اکثر اس سے ملتا تھا جو 23 سال پر محیط قرآن مجید کے وحی کا بنیادی ذریعہ تھا) اور میں نے ان کی طرف دیکھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اپنے رب کے لیے عاجزی اختیار کر۔ پھر میں نے کہا، 'میں [خدا کا] غلام اور نبی بننا پسند کرتا ہوں (خدا کے لیے غلامی روحانیت کا مظہر ہے اور غلامی کا درجہ خدا کے سامنے سب سے بڑا درجہ ہے جو غلامی میں مجسم عاجزی سے حاصل ہوتا ہے)۔ (بیان کردہ*حضرت ابوعیشہ* رضی اللہ عنہا اور *طبرانی* حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہا پر نازل فرمایا کہ میں صرف اس شخص کی دعاؤں کو قبول کرتا ہوں جو میری عظمت کے سامنے سجدہ کرے۔ جو میرے بندوں پر فضیلت نہیں دیتا، میرے دل میں میرا خوف رکھتا ہے، میری یاد میں اپنا دن گزارتا ہے، اور میری خاطر نیچی نفس کی خواہشات سے باز رہتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلْكَرَمُ التَّقْوىٰ وَالشَّرَفُ التَّوَاضُعُ وَالْيَقِيْنُ الْغِنٰى

"شرافت (اور عظمت) پرہیزگاری، تقدس اور خدا سے ڈرنے میں ہے، عزت عاجزی (*تواضو*) میں ہے، اور دولت یقین میں ہے (*یقان*) [خدا اور الٰہی ابدی حقیقتوں میں]۔ (بیان کردہ*احادیث میں ابن ابی الدنیا* اور حکیم رضی اللہ عنہ سے مجموعہ ہے

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: عاجزوں کے لیے بشارت ہے کہ وہ قیامت کے دن منبروں پر بیٹھیں گے، لوگوں کے درمیان صلح کرنے والوں کے لیے بشارت ہے کیونکہ وہ قیامت کے دن جنت کے وارث ہوں گے، ان لوگوں کے لیے خوشخبری ہے جو اپنے دلوں کو تمام دنیاوی گندگیوں سے پاک رکھتے ہیں کیونکہ وہ خدا کے خواب کو حاصل کریں گے۔ قیامت کا دن"۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: چار چیزیں صرف ان لوگوں کو حاصل ہوتی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنا دوست بناتا ہے: پہلی خاموشی جو عبادت کا آغاز ہے، دوسری توکل خدا پر، تیسری انکساری اور چوتھی دنیا سے بے وابستگی ہے۔ لذتیں اور الجهنیں)۔ (بیان کردہ*احادیث* میں*طبرانی* اور حکیم انس رضی اللہ عنہ پر جمع کیے گئے ہیں

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: تم لوگ سب سے اچھے عبادت سے غافل ہو جو کہ عاجزی ہے۔ حضرت یوسف بن اسباط رضی اللہ عنہ نے فرماتے ہیں کہ بہت سے نیک اعمال کرنے کے مقابلے میں خدا سے تھوڑا سا خوف کافی ہے اور روحانی جدوجہد کے مقابلے میں تھوڑی سی عاجزی کافی ہے۔ کسی نے فذیل بن عیاد رحمہ اللہ سے عاجزی کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا: عاجزی یہ ہے کہ تم حق کے سامنے جھکیں اور حق کے تابع رہو اور اس حد تک فرمانبردار رہو کہ اگر تمہیں بچپن سے بھی حق مل جائے تو اسے قبول کر لو اور اگر تم اسے کسی جاہل سے بھی سنتے ہو۔ آپ اسے قبول کرتے ہیں"۔ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اصل عاجزی یہ ہے کہ تم دنیاوی نعمتوں میں اپنے مقابلے میں اپنے آپ پر اس شخص کو ترجیح دے دو جو تم سے کم خوش قسمت ہو یہاں تک کہ ایسے شخص کو یہ یقین مل جائے کہ دنیا کی وجہ سے تمہاری کسی پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ [مزید

برآں،] عاجزی یہ ہے کہ آپ اپنے آپ کو اس شخص سے بدتر سمجھتے ہیں جو دنیاوی نعمتوں میں تم سے زیادہ ہے یہاں تک کہ وہ سمجھ لے کہ دنیاوی ذرائع کی وجہ سے اس کی کوئی برتری نہیں ہے۔

ایک روایت کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر وحی الٰہی نے فرمایا: جب میں تم پر برکت بھیجوں تو اسے عاجزی کے ساتھ قبول کرو تو میں تم پر اس نعمت کو پورا کروں گا۔ کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص کو نعمت ملی اور اس پر خدا کا شکر ادا کیا جائے اور عاجز انسان کی حیثیت سے زندگی گزارے تو اللہ تعالیٰ اس نعمت کا فائدہ دنیا میں بھی حاصل کرے گا اور آخرت میں درجات بلند کرے گا۔ اور اگر کسی شخص کو کوئی نعمت ملی لیکن اس نے [خدا کا شکر] ادا نہیں کیا بلکہ اس کی بنیاد پر لوگوں پر برتری کا اظہار کیا تو وہ شخص اس نعمت کے فوائد سے محروم رہے گا اور اسے آخرت میں عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کا معمول تھا کہ وہ ہر صبح امیر اور اشرافیہ سے سرسری ملاقات کرتے تھے اور ان سے فارغ ہونے کے بعد مسکینوں کے اجتماع میں آتے اور بیٹھتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ ایک غریب غریب اپنی زندگی صرف مسکینوں کے ساتھ گزار سکتا ہے ایسی بادشاہی جس کا خدا کی سلطنت سے کوئی موازنہ نہیں ہے]"۔ زیاد نمیری کہتے ہیں کہ عاجزی کے بغیر پرہیز کرنے والا اس درخت کی مانند ہے جس میں پھل نہ ہو۔

مستکبر لوگوں کے جنت میں داخلے پر پابندی عائد کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اخلاق، اخلاق، کردار، باطنی مزاج اور صفات جنت میں داخل ہونے کے دروازے ہیں جو تکبر اور عزت نفس کی وجہ سے بند ہو جاتے ہیں۔ ایک بندہ تکبر کی وجہ سے روشن اخلاق، آداب، کردار، باطنی مزاج اور صفات سے محروم رہتا ہے، خاص طور پر عاجزی سے محروم ہوتا ہے جو پرہیزگاروں کے لیے زندگی کا سرچشمہ اور سرچشمہ ہے اور ان کی صفات کی بنیاد ہے۔ انسان عاجزی کے علاوہ دیگر اچھے اخلاق، آداب، کردار، باطنی مزاج اور صفات سے محروم رہتا ہے۔ مثال کے طور پر کوئی شخص تکبر کے ساتھ ساتھ دشمنی کو ترک نہیں کر سکے گا، کسی کی نصیحت پر توجہ نہیں دے سکے گا، کسی کے ساتھ خلوص نہیں کر سکے گا، لوگوں کو ذلیل اور ذلیل کرنے سے بچ نہیں سکے گا، غیبت اور عیب تلاش سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکے گا۔ درحقیقت تمام اچھے اخلاق، آداب، کردار، باطنی مزاج اور صفات ختم ہو جائیں گی اور برے اخلاق، آداب، کردار، باطنی مزاج اور صفات پیدا ہوں گی۔ کوئی بد اخلاق، آداب، کردار، باطنی مزاج اور صفات ایسی نہیں ہیں جو مغرور لوگوں میں موجود نہ ہوں، بلکہ ایک مغرور شخص ہر برائی اور ہر برے کردار کی صفت کا سہارا لینے پر مجبور ہوتا ہے کیونکہ ایسا کیے بغیر انسان اپنی جھوٹی عزت نفس کو برقرار رکھنے سے قاصر ہے۔ ایک بھی اچھی خوبی ایسی نہیں ہے جس سے ایک مغرور شخص محروم نہ ہو کیونکہ ایسا سمجھتا ہے کہ اچھے اخلاق، آداب، کردار، باطنی مزاج اور صفات کسی کو اس عزت اور احترام سے محروم کر دیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مغرور شخص جنت میں داخل ہونے سے قاصر ہے کہ بہت سے برے اور برے اخلاق، آداب، کردار، باطنی مزاج اور صفات تکبر کے ساتھ ناگزیر ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ، ایک بری خوبی بہت سی دوسری بری خصوصیات اور کردار کی خصوصیات کا پیش خیمہ ہے۔

تکبر کی بدترین قسم وہ ہے جو انسان کو علم سے فائدہ اٹھانے سے روکتی ہے اور حق کو قبول کرنے میں رکاوٹ بنتی ہے اور حق کی پیروی کرنے سے محروم کر دیتی ہے۔ اس قسم کے تکبر کے بارے میں بہت سی آیات ہیں:

وَٱلْمَلَـٰٓئِكَةُ بَاسِطُوٓا۟ أَيْدِيهِمْ أَخْرِجُوٓا۟ أَنفُسَكُمُ ۖ ٱلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ ٱلْهُونِ بِمَا كُنتُمْ تَقُولُونَ عَلَى ٱللَّهِ غَيْرَ ٱلْحَقِّ وَكُنتُمْ عَنْ ءَايَـٰتِهِۦ تَسْتَكْبِرُونَ

"(مغرور لوگوں کی موت کے وقت) فرشتے اپنے ہاتھ آگے بڑھا رہے ہوتے کہ اپنی روحوں کو باہر نکال دو! آج تمہیں ذلت کا عذاب دیا جائے گا اس لیے کہ تم اللہ پر جھوٹ بولتے تھے اور اللہ کی آیتوں پر تکبر کرتے تھے۔ (سورۃ البقرۃ القرآن آیت 6، آیت 93)

سَأَصْرِفُ عَنْ ءَايَـٰتِىَ ٱلَّذِينَ يَتَكَبَّرُونَ فِى ٱلْأَرْضِ بِغَيْرِ ٱلْحَقِّ

"میں ایسے لوگوں کو اپنی آیتوں کی سمجھ سے دور رکھوں گا جو زمین پر ناحق تکبر کرتے ہیں (جس طرح تکبر اس دل پر مہر لگا دیتا ہے جو اللہ کی ہدایت اور حق کو سمجھنے سے قاصر ہوجاتا ہے)۔ (سورۃ البقرۃ سورۃ البقرۃ آیت ۱۴۶)

قرآنی تفسیر کے علماء نے لکھا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کی تفہیم دلوں سے اٹھ جائے گی۔ بعض تفسیروں میں لکھا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دلوں کو آسمانی سلطنت دیکھنے سے روکا جائے گا۔ ابن جاریح رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ وہ آیات پر غور و فکر و فکر نہیں کر سکیں گے اور ان سے سبق حاصل نہیں کر سکیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرمایا کرتے تھے کہ کھیتی چٹانوں پر نہیں بلکہ نرم زمین پر لگائی جاتی ہے۔ اسی طرح عقل عاجز دلوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ مغرور دلوں کو اس سے ذرا سا بھی اثر نہیں ملتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تکبر کو انکار حق سے جوڑا ہے اور فرمایا ہے:

اَلْكِبْرُ مَنْ سَفِهَ الْحَقَّ وَغَمَصَ النَّاسَ

"تکبر وہ ہے جو حق کا انکار کرتا ہے اور لوگوں میں عیب تلاش کرتا ہے"۔ (بیان کردمحدیث کا مجموعہ صحیح *مسلم* عن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

جن چیزوں کے ساتھ تکبر کا مظاہرہ کیا جاتا ہے

صرف وہی مغرور ہوتا ہے جو اپنے بارے میں بہت زیادہ سوچتا ہے اور جو اپنے بارے میں بہت زیادہ سوچتا ہے وہ کمال کی صفات میں سے ایک صفت کا دعویدار ہے۔ پھر یہ کمال دنیاوی بھی ہے اور دینی بھی۔ دین سے متعلق کمال کی صفات علم اور عمل ہیں۔ کمال کی دنیاوی خوبیاں نسب، خوبصورتی، طاقت، دولت اور حامیوں کی کثرت ہیں۔ پھر تکبر کی سات قسمیں اور اسباب یہ ہیں:

تکبر کی پہلی وجہ - علم: تکبر کی پہلی وجہ علم ہے۔ علماء (علمی الہیات دان) جلدی سے تکبر میں ملوث ہوجاتے ہیں۔ سب سے پہلے عالم کو دل میں اپنے علم کے کمال اور خوبصورتی کا احساس ہوتا ہے۔ پھر وہ اپنے آپ کو برتر اور دوسروں کو کمتر سمجھتا ہے۔ کوئی دوسروں کو لائق نہیں سمجھتا اور انہیں مویشیوں کی طرح دیکھتا ہے۔ کوئی انہیں جاہل سمجھتا ہے اور توقع کرتا ہے کہ وہ سب سے پہلے کسی کو سلام کریں گے۔ اگر کسی اتفاق سے کوئی دوسروں کو سلام کرنے میں پیشگی ہو یا ان کے سلام و سلام کا اچھے انداز میں جواب دے یا ان کا استقبال کرنے کے لیے اٹھ جائے یا ان کی دعوت قبول کر لے تو وہ اسے ان پر احسان سمجھتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اس سلوک کے ذریعے دوسروں کی عزت کی ہے، حالانکہ وہ اس کے لائق نہیں تھے۔ اس لیے ضروری ہے کہ وہ ان پر احسان کی وجہ سے کسی کی خدمت کریں۔ مغرور علماء کی یہ عادت ہے کہ لوگ ان سے ملنے کے لیے ان کے پاس جاتے ہیں، لیکن وہ کسی سے ملنے کے لیے نہیں جاتے، لوگ بیمار ہونے پر ان سے ملنے آتے ہیں، لیکن وہ کسی بیمار کی عیادت نہیں کرتے۔ ان کے پاس ان لوگوں کے ساتھ بھی اچھا رویہ نہیں ہے جو ان کے قریب ہیں۔ وہ ان کی خدمت کرنے پر مجبور کرتے ہیں اور ان کی غلطیوں کو معاف نہیں کرتے۔ وہ لوگوں کو تعلیم دینا اپنا احسان سمجھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ چونکہ انہوں نے انہیں علم دیا ہے اس لیے ان کی خدمت کرنا ان کا حق ہے۔ دنیاوی معاملات میں ان کا رواج ایسا ہی ہے، آخرت سے متعلق معاملات میں ان کے مزاج کی خرابی عروج پر ہے۔ یہ نام نہاد علماء یہ سمجھتے ہیں کہ علم نے انہیں اللہ تعالیٰ کے حضور اعلیٰ مقام پر پہنچا دیا ہے، اس لیے اب انہیں کسی بھی عذاب اور احتساب سے بے خوف ہونا چاہیے۔ وہ اپنے آپ سے خوفزدہ نہیں ہیں بلکہ عام لوگوں سے ڈرتے ہیں۔ انہیں اپنی اصلاح کی کوئی فکر نہیں ہے، لیکن وہ عام لوگوں کی اصلاح کے بارے میں پریشان ہیں۔ ایسے لوگ عالم نہیں بلکہ جاہل ہیں۔ ان کا علم سے کیا تعلق ہے؟ حقیقی علم وہ ہے جس کے ذریعے انسان خدا کو پہچانتا ہے، اپنے نچلے نفس کی گہری روحانی بصیرت حاصل کرتا ہے، اپنے انجام کے خطرات کو سمجھتا ہے، اور یہ یقین رکھتا ہے کہ خدا کی شدید جوابدہی علماء کے ساتھ ہوگی۔ حقیقی علم خدا کے خوف ، عاجزی اور خدا کی اطاعت کو اور بھی زیادہ بڑھاتا ہے۔ جو شخص یہ علم حاصل کرتا ہے وہ کبھی بھی اپنے نفس کو برتر نہیں سمجھتا بلکہ ہر ایک کو اپنے آپ سے برتر سمجھتا ہے کیونکہ دوسروں سے زیادہ سوال کا نشانہ بنایا جائے گا۔ علم ایک بہت بڑی نعمت ہے اور اہل علم اس کا شکر ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ ابودردہ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ جس کے پاس زیادہ علم ہے اس کو زیادہ تکلیف ہوتی ہے (اس کی عظیم نعمتوں اور نعمتوں کا شکر ادا نہ کرنے کی وجہ سے)۔

علم تکبر کا ذریعہ بننے کی ایک وجہ یہ ہے کہ [خدا کا بندہ یعنی انسان] علم حاصل کرنا کیوں شروع کرتا ہے۔ اس صورت میں انسان کا باطنی وجود برائی کا مرکز رہا ہے اور نچلی نفس (*نفس*) گندگی کا ٹھکانہ ہے اور اس کے اخلاق، آداب، کردار اور باطنی مزاج (*اخلاق*) کے مالک ہیں۔ علم کی وادی میں قدم رکھنے سے پہلے اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ نفس کو مہذب بنانے اور دل و نفس کو پاک کرنے کے لیے مختلف روحانی کشمکش سے گزرے اور ادنیٰ نفس کو اپنے رب کی عبادت کی تربیت دے۔ اس طرح کی صورت حال کے لیے [جس میں انسان کو ضروری پہلا قدم کے طور پر دل اور روح کو مہذب بنانے کی اشد ضرورت ہے] کے لیے علم فائدہ مند نہیں ہو سکتا کیونکہ اعمال کا دل میں کوئی باوقار مقام نہیں ہوتا۔ یہ (علم) گندگی کے درمیان رہنے پر مجبور ہے، نہ تو اس کے پھل فائدہ مند ہو سکتے ہیں، اور نہ ہی ان پر اچھائی کے آثار نظر آ سکتے ہیں۔ وہاب بن منبہ رحمہ اللہ نے اس کی بہترین مثال دی ہے۔ انہوں نے کہا، "علم بادلوں کے پانی کی طرح ہے جو ذاتی طور پر پاکیزہ، صاف اور میٹھا ہے۔ درخت اسے اپنی رگوں میں جذب کرتے ہیں اور اسے اس طرح تبدیل کرتے ہیں جس طرح وہ ہیں۔ اگر درخت کے پتے اور پھل کڑوا ہوں تو پانی کا ذائقہ بھی کڑوا ہو جاتا ہے اور اگر وہ میٹھا ہوں تو پانی کا ذائقہ بھی میٹھا رہتا ہے بلکہ وہ میٹھا ہو جاتا ہے۔ علم کی بھی یہی حالت ہے، لوگ اسے جذب کر کے ڈرافٹ کے ذریعے پیتے ہیں اور اسے اپنی نیت اور ارادے کے مطابق بناتے ہیں۔ ایک مغرور زیادہ مغرور ہو جاتا ہے، ایک عاجز عاجز ہو جاتا ہے۔ جس کی نیت تکبر کرنا تھا اور وہ جاہل تھا اس نے پھر علم حاصل کیا اور اب وہ حاصل کر لیا ہے جو تکبر کا ذریعہ بن

سکتا ہے۔ چنانچہ ایسے شخص کے لیے تکبر اور بھی بڑھ گیا۔ اسی طرح جس نے خدا سے ڈرایا تھا اس نے علم حاصل کیا تو یہ خوف، اعمال الٰہی کے بارے میں شدید اندیشہ، عاجزی اور عاجزی اور بڑھ گئی کیونکہ علم نے خوف کا پتہ لگایا۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہ تکبر کی سب سے بڑی وجوہات میں سے ایک ہے۔

تکبر کی دوسری وجہ - اعمال پاکیزہ اور عبادت الٰہی: عبادت اور اعمال تکبر کی دوسری وجہ ہیں۔ پرہیز کرنے والا اور عبادت گزار بھی عزت، شہرت، تکبر اور لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف مائل کرنے جیسی برائیوں سے خالی نہیں ہوتا۔ وہ ان برائیوں کا اظہار دنیاوی اور دینی دونوں معاملات میں بھی کرتے ہیں۔ دنیاوی معاملات میں اس کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ وہ ان کی زیارت کے لیے آنے والے لوگوں کو ان کی زیارت سے بہتر سمجھتے ہیں۔ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ لوگ ان کی ضروریات پوری کریں، ان کا احترام کریں، محفلوں میں ان کے لیے جگہ بنائیں۔ گویا وہ اپنی عبادت اور روحانی جدوجہد کو مخلوقات پر احسان سمجھتے ہیں۔ دینی معاملات میں ان کی حالت ایسی ہے کہ وہ اپنے سوا سب کو بدبخت سمجھتے ہیں، حالانکہ وہ خود بدبخت ہیں کیونکہ وہی ہیں جن میں یہ غلط فہمی ہے۔ لوگوں کی بدبختی کا دعویٰ کرنا ان کی ذلت کا عکاس ہے۔ اس شخص نے نہ صرف اپنی باتوں سے لوگوں کو ذلیل کیا ہے بلکہ وہ خدا پر فخر بھی کرتا ہے اور خدا کے عذاب اور عظمت سے بے خوف ہے۔ عبادت کرنے والے میں کتنا بڑا فرق ہے جو اس کو فضل سمجھ کر عبادت کرتا ہے اور مخلوقات کو ذلیل کرتا ہے اور وہ شخص جو مخلوقات کو ان کی عبادت اور اطاعت کی وجہ سے محبت کرتا ہے اور ان کی عزت کرتا ہے اور ان کے لیے خدا کے حضور ایسے درجات کی توقع رکھتا ہے جس کی کوئی اپنے لیے توقع نہیں کرتا۔

ایک روایت کے مطابق۔ بنی اسرائیل میں دو آدمی تھے ان میں سے ایک اپنی ہنگامہ خیز فطرت اور برے اعمال کی وجہ سے باغی کے طور پر مشہور ہوا اور دوسرا شخص اپنی بے پناہ عبادت کی وجہ سے عبادت گزار کے طور پر مشہور ہوا۔ اس نے اتنی پوجا کی تھی اور خدا کے سامنے اس قدر بلند مقام حاصل کیا تھا کہ ہمیشہ بادل اس پر سایہ کرتا رہتا تھا۔ سرکش شخص نے سوچا، "میں بہت بدنام ہوں اور یہ عبادت گزار بہت ہی خدا پرست اور عبادت گزار انسان ہے۔ اگر میں ان کے قریب بیٹھ جاؤں تو ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھ پر اپنی رحمت نازل فرمائے۔ عبادت گزار نے سوچا، "میں ایک عبادت گزار ہوں۔ یہ برا آدمی میرے قریب کیسے بیٹھ سکتا ہے"؟ چنانچہ جب سرکش آدمی نمازی کے قریب بیٹھنا چاہتا تو اس نے اس سے نفرت کا اظہار کیا اور اسے اپنے قریب بیٹھنے کی اجازت نہیں دی۔ اللہ تعالیٰ نے اس وقت کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل کی کہ وہ دونوں سے کہہ کہ وہ دوبارہ نیک اعمال شروع کردیں کیونکہ اس نے سرکش کے تمام گناہ معاف کر دیے ہیں اور عبادت گزار کے تمام اعمال کو باطل کر دیا ہے۔ اس کے بعد بادل نے [پہلے] باغی آدمی کو سایہ دینے لگا۔

اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا اپنے بندوں کے دل تلاش کر رہا ہے۔ اگر کوئی جاہل گنہگار شخص خدا کے خوف سے عاجزی کا شکار ہونا شروع کر دیتا ہے اور خدا کی عظمت کے سامنے جھکنا شروع کر دیتا ہے، تو یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ کسی نے دل سے خدا کی اطاعت کی ہے۔ اس کے بجائے ایک مغرور عالم دین اور ایک مغرور عبادت گزار سے زیادہ عبادت گزار ہو رہا ہے۔ ایک اور نقصان یہ ہے کہ بہت کم عبادت گزار اور پرہیز کرنے والے لوگ اپنے آپ کو بچا لیتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ اگر کوئی ان کی طرف حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے یا ان کو تکلیف دیتا ہے تو وہ اسے ناقابل معافی جرم سمجھتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جو شخص ایسا کرتا ہے اسے خدا معاف نہیں کرے گا اور وہ خدا کے غضب کا مستحق ہو گیا ہے۔ اگر کسی اور کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا ہے تو ، ان کا یہ ناپسندیدہ رد عمل نہیں ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے اعلیٰ مقام اور مرتبے کے دعویدار ہیں، حالانکہ یہ دعویٰ صرف جہالت پر مبنی ہے۔ کچھ لوگوں کی حماقت انہیں "فلاں کا برا انجام ہوگا" یا "فلاں کو اس کی سزا ملے

گی" وغیرہ جیسے دعوے کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اگر کسی بھی اتفاق سے مجرم کسی مہلک بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے تو وہ اسے اپنا معجزہ سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ خدا نے اس کا بدلہ لیا ہے۔ کوئی نہیں دیکھتا کہ کافروں نے اللہ اور اس کے رسولوں پر لعنت کی ہے اور یہاں تک کہ رسولوں کو بھی ایذا دیا ہے اور ان کو قتل بھی کیا ہے۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان میں سے اکثر مجرموں کو مہلت دی اور انہیں دنیا میں کوئی سزا نہیں دی۔ بلکہ ان میں سے بہت سے لوگ حق کی طرف ہدایت کیے گئے اور انہیں نہ دنیا میں عذاب دیا گیا اور نہ انہیں آخرت میں عذاب دیا جائے گا کیا یہ جاہل، مغرور، خود فریبی عبادت گزار یہ سمجھتا ہے کہ خدا کے نزدیک اس کا مرتبہ اتنا بلند ہے کہ اس نے اس کا بدلہ لیا جبکہ یہ انبیاء کے لیے بھی نہیں کیا گیا؟ شاید کوئی شخص یہ بھی نہیں جانتا کہ اس تکبر اور خود راستبازی کی وجہ سے خدا کی طرف سے ناپسندیدہ ہے اور وہ اپنی [روحانی] تباہی سے بے خبر ہے۔ یہ عقیدہ ان مغرور لوگوں کا ہے جو عقل سے محروم ہیں۔ دو لوگوں میں کتنا فرق ہے؟ ایک شخص اپنے باطن اور بیرونی وجود میں خدا سے پرہیزگاری اور خوف رکھتا ہے اور اپنے نیچی نفس سے خوفزدہ رہتا ہے اور اپنے اعمال کو حقیر سمجھتا ہے اور اس کی اصلاح کی جدوجہد میں مسلسل مصروف رہتا ہے۔ دوسرے شخص نے دکھاوے، تکبر، حسد اور فریب کی گندگی کو چھپایا ہے اور اس طرح شیطان کا کھلونا بن گیا ہے اور اس کے علاوہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنے اعمال کے ذریعے خدا پر احسان کر رہا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کوئی بھی شخص جو یہ یقین رکھتا ہے کہ وہ خدا کے کسی بندے سے برتر ہے، اس نے اس جہالت کی وجہ سے اپنی پوری کاوشوں کا سرمایہ ضائع کر دیا ہے۔ جہالت سب سے بڑا گناہ ہے اور اس سے بڑا کوئی اور چیز نہیں ہے جو خدا سے دور ہو جائے۔ اپنے بارے میں یہ فیصلہ کرنا کہ کوئی دوسروں سے بہتر ہے، محض حماقت اور جہالت ہے اور خدا کی احتساب سے بے خوفی کا اشارہ ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

فَلَا يَأْمَنُ مَكْرَ ٱللَّهِ إِلَّا ٱلْقَوْمُ ٱلْخَـٰسِرُونَ

"کوئی بھی خدا کی تدبیر اور حکمت عملی سے بے خوف نہیں ہےمکر) سوائے لوگوں کے گروہ کے جو حیرت انگیز نقصان کے دہانے پر ہیں۔" (سورۃ البقرۃ آیت ۷، آیت ۹۹)

مختصر یہ کہ تکبر ایک ایسی آفت ہے کہ صرف وہی خدا کے بندے محفوظ رہتے ہیں جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ اپنی حفاظت کرتا ہے، ورنہ عام طور پر لوگ اس آفت سے دوچار ہوتے ہیں۔

تکبر کی تیسری وجہ - نسب (نسل، نسل، قوم، قبیلہ، برادری): ایک شخص جو اعلیٰ نسب کا مالک ہے [ایک اچھے، معزز، نمایاں اور معروف خاندان سے تعلق رکھنے کے لحاظ سے]، ان لوگوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے جو اس اعلیٰ نسب سے محروم ہیں [حقیر خاندانی اصلیت کے لحاظ سے] اگرچہ وہ علم اور نیک اعمال میں ایک سے بہتر ہو سکتے ہیں۔ [اس بحث کا اطلاق نسلی ، نسلی، مذہبی، فرقہ وارانہ، قبائلی، برادری، لسانی، سیاسی، نظریاتی اور قوم پرستی کے غرور، تکبر، برتری کے پیچیدگیوں اور اس کے نتیجے میں نفرت یا ان لوگوں کو حقارت سے دیکھنا ہے جو ان خصوصیات کا اشتراک نہیں کرتے اور انہیں کمتر سمجھتے ہیں۔ خدا کا سچا بندہ اور مقرب وہ ہے جس کا اپنا رنگ نہ ہو، اس کے بجائے وہ خدائی صفات سے سرشار ہو کر خدا کا رنگ اختیار کرتا ہے، جس کی نمائندگی الٰہی اسماء کی کثرت سے ہوتی ہے، جیسے محبت، رحمت، رحمت، عدل، مساوات، اخلاص، پرہیزگاری، بے لوث خدمت، دوسروں کو فائدہ پہنچانا، لوگوں کے مصائب کو اپنا سمجھنا، وغیرہ۔ بعض اوقات اس شخص کے تکبر کی کیفیت ایسی ہوتی ہے کہ کوئی حقیر نسل اور پس منظر کے حامل افراد کو غلام اور نوکر سمجھتا ہے اور ان کے ساتھ گھل مل کر کھانا پینا ناگوار سمجھتا ہے۔ کوئی شخص دوسروں کو ناگوار ناموں سے پکارہ کر اپنے نسب پر فخر کا اظہار کرتا ہے یا کہتا ہے، "تم کون ہو؟"، "تمہارا باپ کیا تھا؟"، "میں فلاں [عظیم شخص] کا بچہ یا پوتا ہوں۔ آپ جیسا ایک معمولی شخص مجھ سے بات کیسے کر سکتا ہے یا میری طرف دیکھ سکتا ہے؟" ہر نسبی غرور کے مالک کے پاس

نچلے حصے میں یہ خفیہ اعصاب ہوتا ہے [جو لطیف یا کھلم کھلا طریقوں سے ظاہر ہوتا ہے] لیکن جب غصے کی آگ بھڑک اٹھتی ہے، اس اعصاب کا منجمد خون پگھل جاتا ہے، اندرونی روشنی کی روشنی بجھ جاتی ہے تو وہ اپنے نسب اور نسب کے حوالے سے [ذلت آمیز اور ذلت آمیز انداز میں] بات کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اس [توہین آمیز اور ذلت آمیز رویے] کا تصور [خدا کا] ایک عاجز غلام سے بھی نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس موجود تھے تو میرا ایک شخص سے جھگڑا ہوا اور میں نے غصے میں اسے سیاہ فام عورت کا بیٹا کہا۔ [مجھ سے یہ سن کر] نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

طَفُّ الصَّاعِ طَفُّ الصَّاعِ لَيْسَ لِابْنِ الْبَيْضَاءِ عَلَى ابْنِ السَّوْدَاءِ فَضْلٌ

"دونوں ترازو برابر ہیں۔ سفید فام کے بیٹے کو سیاہ فام کے بیٹے پر کوئی برتری حاصل نہیں ہے [کیونکہ خدا کی نظر میں تمام انسان برابر ہیں اور اس لیے نسلی تکبر اور تکبر کا اظہار کرنا کسی کو مناسب نہیں ہے]۔

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے یہ سن کر میں نے زمین پر لیٹ کر اس شخص سے کہا کہ وہ کھڑے ہو کر میرے گال پر قدم رکھے [تاکہ اس تنازعہ کی صورت حال میں میرے نسلی تکبر اور تکبر کو ختم کیا جا سکے اور میں نے توبہ کر خدا کی طرف رجوع کیا اور اس شخص کے ساتھ صلح کر کے اس گناہ کا کفارہ ادا کیا جس کو میں نے اس طرح ناراض کیا تھا]۔ (بیان کردہ*احادیث* کے مجموعے *صحیح بخاری، صحیح مسلم* اور *مسند احمد*)

ملاحظہ کیجیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوذرؓ کو اپنی اس غلطی سے آگاہ کیا کیونکہ وہ اپنی سفیدی کو اپنی برتری کا سبب سمجھتے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ سے فرمایا کہ اسلام میں سفید اور سیاہ دونوں برابر ہیں (کیونکہ نسل اور جلد کی رنگت کی بنیاد پر کسی کو دوسرے پر کوئی فضیلت نہیں ہے]، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو بتایا کہ اس طرح کا خیال یا تخیل رکھنا بھی گناہ اور جہالت ہے۔ یہ بھی دیکھیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تنبیہ کا ابو ذر رضی اللہ عنہ پر کتنا فوری اثر پڑا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی نگرانی اور تربیت میں تھا اور اس تربیت کے نتیجے میں خود کو سیکھ رہا تھا اور اپنی اصلاح کر رہا تھا، کہ اسی لمحے وہ اپنی غلطی پر شرمندہ ہو گیا، [فورا] توبہ کی اور اس درخت کو جڑوں سے نکال دیا جسے اس شخص کے پاؤں کے تلوؤں کے ذریعے اس کے دل کی سطح سے نکال دیا گیا تھا۔ انہوں نے اسی لمحے یہ سیکھا تھا کہ عزت کا خاتمہ (اس معاملے میں تکبر اور تکبر) صرف ذلت کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے۔ اسی روایت کے مطابق دو لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تکبر کا اظہار کیا۔ ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا، "میں فلاں ہوں فلاں کا بیٹا۔ تمہاری ماں ہلاک ہو جائے، تم کون ہو؟" نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دو آدمیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے فخر کیا۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ میں فلاں ہوں فلاں کا بیٹا یہاں تک کہ اس نے اپنے نو آباؤ اجداد کے نام گنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ وہ نو باپ دادا جہنم کے باشندے ہیں اور تم دسواں ساکن ہو۔ (بیان کردہ حدیث کا مجموعہ *مسند احمد*)

تکبر کی چوتھی وجہ خوبصورتی اور شکل: حسن و جمال کے ذریعے تکبر عام طور پر عورتوں کی طرف سے کی جاتی ہے اور اس کی وجہ سے وہ دوسری عورتوں کے عصور کا اظہار کرنے اور ان کے خلاف غیبت کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک عورت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لیے آئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد ، میں نے اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ وہ کتنی چھوٹی ہے۔ نبی

کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے کہا: تم نے اس کے خلاف غیبت کی ہے۔ اس کی تنقید کا مقصد خفیہ تکبر تھا [اس کے دل میں پوشیدہ اور پوشیدہ تھا جس کا اسے خود احساس نہیں تھا] کیونکہ اگر وہ خود چھوٹی ہوتی تو وہ دوسری عورت کو چھوٹا نہ کہتی۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے وہ اپنے قد کو پسند کرتی تھی اور دوسری عورت کو چھوٹا سمجھتی تھی ، اسے "بونا" کہتی تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پیاری بیوی کے اس منفی خیال کو فوری طور پر درست کرنے سے باز نہیں آیا، جس نے بھی فورا اس حماقت کو سمجھ لیا اور اس غلط خیال کو اپنے دل سے نکال دیا اور آنے والے زمانے میں لوگوں کی اصلاح کے لیے اپنی قیمت پر اس نبوت کی تعلیم کو ایمانداری سے بیان کیا۔ ان کی اپنی روحانی ترقی ، اصلاح اور تبدیلی کے لئے]۔

تکبر کی پانچواں وجہ - دولت: یہ تکبر بادشاہ اپنے خزانوں کی وجہ سے، کاروباری افراد اپنے کاروباری سامان اور اثاثوں میں، کسانوں کو اپنے کھیتوں میں اور اپنے لباس اور سواریوں میں خوشحال کرنے کی وجہ سے کرتے ہیں۔ دولت مند غریب کو حقیر سمجھتا ہے اور ان پر تکبر کرتا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ تم بھکاری ہو، فقیر ہو اور محتاج ہو۔ اگر میں چاہوں تو میں تم جیسے لوگوں کو خرید سکتا ہوں اور تمہیں اپنا خادم بنا سکتا ہوں۔ آپ کون ہیں اور آپ کے پاس کیا ہے؟ میرے گھر میں تمہارے پاس جو سامان تھا اس سے کہیں زیادہ سامان ہے۔ میں ایک دن میں اتنا خرچ کرتا ہوں جو آپ ایک سال میں خرچ نہیں کر سکتے۔ امیر یہ سب باتیں اس لیے کہتا ہے کہ یہ شخص کسی کی نظر میں دولت کے لیے بے پناہ اہمیت اور عظمت رکھتا ہے اور غربت کو ناپسند کرتا ہے، حالانکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ غربت کی فضیلت اور دولت کے نقصانات سے واقف نہیں ہے۔ اگر کوئی جانتا تو اس طرح کی بات نہ کرتا۔

تکبر کی چھٹی وجہ - طاقت: یہ تکبر ایک طاقتور شخص کمزور پر کرتا ہے۔ [یہ طاقت جو تکبر کی بنیاد ہے، جسمانی، سیاسی، مادی، روحانی اور فکری طاقتیں ہو سکتی ہیں، اور الٰہی قانون میں بھی اتنی ہی قابل مذمت ہے]۔

تکبر کی ساتویں وجہ - مددگاروں، حامیوں اور رشتہ داروں کی کثرت: بعض لوگوں میں طلباء، مددگاروں، رشتہ داروں، پیروکاروں، حامیوں اور مداحوں کی کثرت کی وجہ سے تکبر ہوتا ہے۔ بادشاہوں کو اپنی فوجوں کے سائز کی وجہ سے تکبر ہوتا ہے اور اساتذہ اپنے شاگردوں کی کثرت کی وجہ سے تکبر کرتے ہیں۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ تکبر کا سبب ایک نعمت ہے جسے کمال کہا جا سکتا ہے، چاہے وہ حقیقت میں کمال ہو یا نہ ہو۔ کچھ لوگ شراب نوشی اور جماع کی کثرت پر اپنے ہم عصروں پر فخر کا اظہار کرتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے اعمال [کسی قسم] کے کمال کے مترادف ہیں جو ان کے پاس ہے ، حالانکہ یہ عقیدہ جہالت پر مبنی ہے۔ یہ ایسی قسمیں ہیں جو تکبر کا سبب ہیں اور یہ ان لوگوں کے خلاف کی جاتی ہے جو ان صفات سے عاری ہیں یا ان کے پاس نسبتا کم درجے تک ہوتا ہے۔

اخلاق، آداب، کردار اور عاجز لوگوں کے باطنی مزاج اور تکبر یا عاجزی کے اثرات کو ظاہر کرنے والے اعمال کی تشریح: یہ معلوم ہونا چاہیے کہ تکبر کسی فرد کی عادات اور طرز عمل میں ہے جیسے حقارت یا غصے سے چہرہ بنانا، آنکھوں کے کونے سے دیکھنا، اپنے سینے پر سر رکھنا، تکیے کے ساتھ بیٹھنا ، یا یہ کسی کے الفاظ میں ہے

جس میں آواز کا لہجہ ، خطوط اور الفاظ کی ترسیل ، اور [لوگوں کو واپس] جواب دینے کا انداز شامل ہے۔ تکبر چلنے، اٹھنے، بیٹھنے اور جسمانی حرکات و سکنات اور اشاروں میں بھی ہوتا ہے۔ کسی کی حالت [وجود یا تاثرات] کو تبدیل کرنا بھی تکبر کا اظہار بن سکتا ہے۔ تکبر کرنے والوں میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو اپنے تمام اعمال اور قول و فعل میں تکبر کا اظہار کرتے ہیں اور بعض مغرور لوگ بعض معاملات میں تکبر کرتے ہیں اور بعض میں عاجزی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ذیل میں کچھ عادات [اور تکبر کے اظہار] کی وضاحت کی جا رہی ہے۔

مثال کے طور پر ، کچھ لوگ چاہتے ہیں کہ دوسروں کو سامنے ہاتھ باندھ کر ان کے سامنے کھڑے ہوں [کسی اتھارٹی شخصیت کے احترام ، عزت ، یا تابعداری کے اشارے کے طور پر] یا دوسروں کو پہنچنے پر کھڑا ہونا چاہئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر تم کسی جہنم کے آدمی کو دیکھنا چاہتے ہو تو اس شخص کو دیکھو جو بیٹھا ہوا ہے لیکن بہت سے لوگ احترام کے ساتھ ایک کے سامنے کھڑے ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قدر محبت رکھتے تھے کہ ان میں کسی اور سے محبت نہیں تھی۔ جب وہ اسے دیکھتے تھے تو ، وہ [اس کے لئے اپنی محبت اور احترام کی وجہ سے اس کے لئے کھڑے نہیں ہوتے تھے] حالانکہ وہ چاہتے تھے] کیونکہ وہ جانتے تھے کہ وہ ان کو اس کے لئے کھڑے ہونا پسند نہیں کرتے تھے۔

کچھ مغرور لوگ اس وقت تک چلنا شروع کرنا پسند نہیں کرتے جب تک کہ ان کے پیچھے آنے والا کوئی نہ ہو۔ حضرت ابودردا رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ بندہ اللہ سے اس وقت تک دور ہے جب تک کہ اس کے پیچھے کوئی چلتا ہے۔ بعض اوقات جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کرام کے ساتھ چلتے تو آپ ان سے آگے نکلنے کو کہتے تھے اور وہ خود ان کے پیچھے چلتے تھے۔ (بیان کردہ*حادیث* کے مجموعے *ابو منصور دیلمی* اور *مسند الفردوس*

اس کا مقصد یا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تعلیم دینا تھا یا اس طرح وہ اپنے نفس سے تکبر اور خود کو بڑھانے کے شیطانی اشاروں کو دور کرنا چاہتے تھے۔ مغروروں کی بھی یہ عادت ہے کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ نہیں بیٹھنا چاہتے جو ان کے مقابلے میں سماجی حیثیت میں کم ہیں بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ انہیں ان کے سامنے احترام کے ساتھ بٹھایا جائے۔ یہ بھی عاجزی کے خلاف ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اگر مدینہ منورہ کی کوئی چھوٹی سی لڑکی آ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ پکڑ کر راستے پر چلتے ہوئے وہیں کھڑی ہو جاتی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کا ہاتھ اس وقت تک نہیں چھوڑتے جب تک کہ وہ خود اس سے دور نہ ہو جائیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بچوں سے محبت کی۔ یہ بھی تکبر کی عادت ہے کہ وہ مریضوں کے قریب بیٹھنے سے گریز کرتے ہیں اور ان سے دور رہتے ہیں۔ یہ بھی تکبر ہے۔ ایک مرتبہ ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا جس کا چہرہ مرغی کے ڈبے کے دانے سے بھرا ہوا تھا جن میں سے پانی نکل رہا تھا۔ اس وقت کچھ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ بیٹھے اور ان کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ جب وہ آئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اٹھ کر ان کے پاس بٹھایا [اور ان کی بیماری کی کیفیت پر کوئی نفرت کا اظہار نہیں کیا اور اس کے بجائے ان کی روح کے لیے شفا اور ان کے دل کو سکون دینے کے طور پر اپنی محبت اور ہمدردی کا اظہار کیا]۔ کچھ لوگ اپنے گھر کا کوئی بھی کام اپنے ہاتھ سے کرنا پسند نہیں کرتے۔ یہ بھی عاجزی کے خلاف ہے۔ کچھ مغرور لوگ اپنے سامان کے ساتھ چلنا پسند نہیں کرتے۔ یہ طریقہ بھی عاجزوں کی عادات کے خلاف ہے۔ کپڑے پہننا اور کپڑے پہننا عاجزی اور تکبر دونوں کا اظہار کر سکتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: کپڑوں کی زینت دل میں غرور پیدا کرتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ تَرَكَ زِينَةً لِلّٰهِ وَوَضَعَ ثِيَابًا حَسَنَةً تَوَاضُعًا لِلّٰهِ وَابْتِغَاءً لِمَرْضَاتِهِ كَانَ حَقًّا
عَلَى اللّٰهِ أَنْ يَدَّخِرَ لَهُ عَبْقَرِيَّ الْجَنَّةِ

"جو شخص اللہ کی راہ میں آرائش، آرائش اور زینت و آرائش چھوڑ دیتا ہے اور اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے عمدہ لباس چھوڑ دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ پر لازم ہے کہ وہ ایسے شخص کے لیے جنت کا بہترین لباس محفوظ کرے"۔ (بیان کردہحدیث کا مجموعہ *ابو نعیم* عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے

كُلُوا وَاشْرَبُوا وَالْبَسُوا وَتَصَدَّقُوا فِي غَيْرِ سَرَفٍ وَلَا مَخِيلَةٍ

"کھاؤ پیو اور لباس پہنو اور زکواۃ دو نہ فضول خرچی سے اور نہ تکبر کریں۔" (بیان کردہ*عمرو بن شعیب رضی اللہ عنہ سے اپنے دادا سے* حدیث *کا* مجموعہ ترمذی)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے صحابہ کرام سے کہا: تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم لوگ راہبوں کا لباس پہنتے ہو اور اپنے سینے میں درندوں کے دل رکھتے ہو! بادشاہوں کا لباس پہن لو اور اپنے دلوں کو خدا کے خوف سے قتل کرو۔ عاجزی کی ایک عادت یہ ہے کہ جب کوئی شخص لعنت بھیجتا ہے یا تکلیف دیتا ہے یا اس کے حقوق غصب کرتا ہے تو وہ بردبار اور بردبار ہوتا ہے اور عاجزی کا اظہار کرتا ہے۔ یہ حقیقی عاجزی ہے۔ ہم اس بات کا خلاصہ اس بات کا ذکر کرتے ہیں کہ خوبصورت اخلاق، آداب، خصوصیات، باطنی صفات اور اخلاق (اخلاق) اور عاجزی (آنے والے زمانے کے لیے پوری انسانیت کے لیے) نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طرز عمل کا خوبصورت نمونہ ہے۔ اس طرح ان کی خوبصورت مثال پر عمل کرنا ضروری ہے اور ان کو اپنا استاد اور راہبر بنایا جائے۔

تکبر کا علاج اور عاجزی حاصل کرنے کا طریقہ

پچھلے صفحات میں جو کچھ ذکر کیا گیا ہے اس سے ہم جانتے ہیں کہ تکبر ایک مہلک بیماری ہے اور مخلوق میں شاذ و نادر ہی کوئی ایسا ہوتا ہے جو اس بیماری سے محفوظ ہو۔ پھر اس بیماری کو محض ارادے اور خواہش سے ختم نہیں کیا جاتا، بلکہ اس کا علاج اور ایسی دوائیوں کے استعمال کی ضرورت ہے جو اس کا خاتمہ کر سکیں۔ تکبر کا علاج دو طریقوں سے کیا جاتا ہے۔ ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اس بیماری کی جڑیں دل سے نکال دی جائیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ان اسباب کو دور کیا جائے جن سے تکبر کا ارتکاب ہوتا ہے۔

تکبر کے علاج کا پہلا طریقہ: علاج کے اس طریقہ کی دو شکلیں ہیں: علم پر مبنی اور عملی۔ اس علاج کی دونوں شکلوں کو استعمال کیے بغیر ، مکمل علاج (بازیافت اور اس کے نتیجے میں صحت) حاصل نہیں ہوتا۔

علم پر مبنی علاج: یہ ہے کہ انسان اپنے نفس (نفس) اور خالق نفس (یعنی خدا) کی *مکمل تفہیم اور پہچان حاصل* کرے۔ اگر کوئی حقیقی معرفت حاصل کر لے تو امید ہے کہ تکبر کی بیماری دور ہو جائے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر انسان اپنی ذات کی گہری سمجھ حاصل کر لے تو یقینا اس نتیجے پر پہنچے گا کہ نفس ایک انتہائی ذلیل اور ذلیل چیز ہے۔ صرف ایک چیز جو اس کے لئے موزوں ہے وہ عاجزی ، ذلت اور نرمی ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے رب کی گنوسس کو حاصل کرے گا تو یقینا یہ یقین [دل میں] پیدا ہو جائے گا کہ عظمت اور عظمت جیسی خصوصیات صرف خدا کے جلال کے مطابق ہیں [نہ کہ کسی انسان کے لیے، لہذا انسان کے لیے بہترین عمل اور کیفیت یہ ہے کہ وہ خدا کی عظمت کے سامنے عاجزی اور فرمانبردار رہے)۔ خداوند کی گنوسس اور اس کی عظمت اور بلندی پر تفصیلی بحث ہے [غزالی کے حکمت کے مجموعے "خدا کی راہ کی معرفت کا احیاء" میں]۔ اگرچہ نفس کو جاننے کا موضوع کم تفصیل پر مبنی نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود، ہم یہاں صرف اتنا ہی لکھتے ہیں جو عاجزی اور عاجزی کی خصوصیات کو پیدا کرنے کے لیے کافی ہے [خدا کے جلال اور عظمت کے سامنے]۔ اس کے لیے ہم طویل بحث کے بجائے قرآن مجید کی صرف ایک آیت کو اپنے غور و فکر کا موضوع بنائیں گے:

قُتِلَ ٱلْإِنسَٰنُ

مَآ أَكْفَرَهُۥ ﴿١٧﴾ مِنْ أَىِّ شَىْءٍ خَلَقَهُۥ ﴿١٨﴾ مِن نُّطْفَةٍ خَلَقَهُۥ فَقَدَّرَهُۥ ﴿١٩﴾ ثُمَّ

ٱلسَّبِيلَ يَسَّرَهُۥ ﴿٢٠﴾ ثُمَّ أَمَاتَهُۥ فَأَقْبَرَهُۥ ﴿٢١﴾ ثُمَّ إِذَا شَآءَ أَنشَرَهُۥ ﴿٢٢﴾

"انسان پر افسوس ہے کہ اس نے اس قدر ناشکرا کیا! اللہ تعالیٰ نے انسان کو کس چیز سے پیدا کیا؟ نطفہ کے قطرے سے پیدا کیا پھر اس کی شکل پیدا کی پھر اعضاء کو ناپ کے ساتھ پیدا کیا پھر اس کے لیے راستہ آسان کر دیا پھر ایک کو موت دی پھر قبر میں لے گیا پھر جب اللہ چاہے گا تو اسے زندہ کرے گا۔ (سورة البقرة باب 80، آیہ 17-22)

اس آیت میں انسان کی ابتدا، اختتام اور ان کے درمیان کی حالتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اگر انسان اپنے ابتدا، اختتام اور اس کے درمیان زندگی کے حالات پر ایک نظر ڈالے تو وہ اس آیت الٰہی کا مفہوم سمجھ جائے گا۔ انسان کی ابتدا یہ ہے کہ [پیدائش سے پہلے] کسی کا کوئی ذکر بھی نہیں تھا کیونکہ وہ معدوم ہو چکا تھا اور ایک طویل عرصے تک معدوم ہونے کے پردے میں اس حد تک رہا کہ اس کے معدوم ہونے کا آغاز بھی معلوم نہیں ہے۔ معدوم ہونے اور آس پاس نہ ہونے سے زیادہ ذلت آمیز اور نیچا اور کیا ہو سکتا ہے؟ پھر خدا نے ایک انتہائی حقیر اور ناپاک چیز کے ساتھ پیدا کیا۔ دوسرے لفظوں میں، اللہ تعالیٰ نے پہلے زمین سے ایک کو پیدا کیا، پھر نطفہ سے، پھر خون سے پیدا کیا، پھر خون سے ایک منجمد شکل بنائی، پھر ہڈیوں پر گوشت ڈالا۔ یہ انسانی تخلیق کا آغاز ہے۔ [ابتدائی] تخلیق کے بعد بھی ، ایک خراب ترکیب پر رہا کیونکہ وہ شروع میں مکمل طور پر پیدا نہیں ہوا تھا ، بلکہ وہ ایک بے جان پتھر کی طرح تھا کیونکہ اس میں سننے ، دیکھنے ، حرکت کرنے ، سمجھنے ، جاننے اور سمجھنے کی طاقت اور صلاحیت نہیں تھی۔ انسان نے زندگی سے پہلے موت (معدوم) سے، کمزوری سے پہلے قابلیت اور طاقت سے، علم سے پہلے جہالت، دیکھنے سے پہلے اندھا پن، سننے سے پہلے بہرا پن، بولنے سے پہلے گونگا پن، ہدایت سے پہلے گمراہ ہونا، دولت سے پہلے غربت اور طاقت اور قابلیت سے پہلے بے بسی اور نااہلی کا آغاز کیا۔

اس کے بعد خدا نے جسمانی اعضاء پیدا کیے جو خدا کی نشانیوں اور عجائبات کا مظہر ہیں۔ جب انسان ان اعضاء سے محروم ہو جاتا تھا تو اس کی سخت ضرورت ہوتی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو دولت مند بنا دیا [اس سے پہلے کہ وہ ان کو مانگنے کی صلاحیت حاصل کر سکے]، وہ بھوکا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے پیٹ کے لیے رزق عطا کیا، وہ

ننگا تھا لیکن خدا نے اس کے جسم کو ڈھانپ لیا، وہ گمراہ تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی۔ دیکھو اور دیکھو اللہ نے انسان کو کس تدبیر سے پیدا کیا اور اس کی ہدایت کی پھر انسان کی سرکشی کو دیکھو۔ انسان کتنا ناشکرا ہے اور کتنا بڑا جاہل ہے! اللہ تعالیٰ کی نعمت اور فضل پر ایک نظر ڈالیں! کس طرح اس نے انسان کو ذلت و خواری اور گندگی سے نکال کر بلندی اور عظمت کی طرف چڑھایا [روح کی بلندی کے وسیلہ سے جو انسانی وجود کا بنیادی مرکز ہے اور معرفت کے حصول اور حق کو حاصل کرنے اور خدا تک پہنچنے کا سب سے بڑا آلہ ہے]۔ اور معدوم ہونے سے وجود عطا کیا۔ کیا کچھ بھی نہیں اور عدم سے زیادہ کوئی چیز ہو سکتی ہے؟ کیا مطلق معدومیت (عدم وجود) سے کم ڈگری ہے؟ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک وجود بنایا [زندگی کی نعمت کے ساتھ جو تمام انسانوں پر اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا فضل ہے]، پہلے اس پست زمین سے جو پاؤں تلے روند دی جاتی ہے تاکہ انسان اپنے وجود کی نیچی پن سے آگاہ رہے اور اپنے نفس کے علم و فہم کو برقرار رکھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انسان پر اپنی نعمتیں مکمل کیں تاکہ وہ ان نعمتوں کی روشنی میں اپنے رب کو پہچان سکے اور اسے پہچان سکے، خدا کے جلال و جلال کی شناخت حاصل کر سکے تاکہ وہ جان سکے کہ عظمت اور عظمت صرف اس کے لیے موزوں ہے اور کسی اور کے لیے نہیں۔

میاں بیوی اس لیے بنائے گئے تھے تاکہ انسانی نسلیں مسلسل جاری رہ سکیں۔ جس کی ابتدا کی حالت یہ ہے اور جس کے حالات ایسے ہیں تو ایسے شخص کو کیا حق ہے کہ وہ مغرور ہو، مغرور ہو، مغرور ہو؟ یقینا کمزوروں میں ایک انتہائی ادنیٰ اور کمزوروں میں انتہائی کمزور ہے۔ تاہم یہ ایک معمولی اور ادنیٰ شخص کی عادت ہے کہ جب کوئی شخص شہرت، دولت، طاقت وغیرہ جیسی چیزوں کی وجہ سے دنیا میں بظاہر اعلیٰ مقام حاصل کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو عظیم سمجھنے لگتا ہے، حالانکہ اپنے آپ کو عظیم سمجھنا اپنے آپ میں ایک ذلت ہے۔ طاقت، طاقت، عزت اور عظمت سب صرف خدا کے لیے ہیں۔ لیکن اگر انسان کو مکمل طور پر تخلیق کیا گیا ہو اور اس کے تمام معاملات اس کے سپرد ہو جائیں اور وہ اپنے وجود کو برقرار رکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو تو اسے سرکشی کرنے اور اپنے آغاز و انجام کو نظر انداز کرنے کا حق حاصل ہو گا۔

انسان اپنے نقصان پر راضی ہو یا نہ ہو، وہ بھوکا اور پیاسا رہنے پر مجبور ہوتا ہے، بیمار ہونے پر مجبور ہوتا ہے اور [اس دنیاوی وجود میں] مرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ کوئی شخص اپنے نفع و نقصان کا مالک بننے سے قاصر ہے۔ کوئی نہ تو اپنے اچھے کا مالک ہے اور نہ ہی کسی کے برے کا۔ انسان کسی چیز کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن جہالت کے سوا کچھ حاصل نہیں کرتا، وہ کچھ یاد رکھنا چاہتا ہے لیکن اسے بھول جاتا ہے، وہ اپنے دل کو کسی اہم بات میں مصروف رکھنا چاہتا ہے، لیکن اشارے اس کو پکڑ لیتے ہیں اور پریشانیوں اور پریشانیوں کے لامحدود سمندر میں گہری غوطہ لگانے پر مجبور کرتے ہیں۔ نہ کسی کو اپنے دل پر قابو پایا جاتا ہے اور نہ ہی اپنے نفس پر اختیار ہے۔ یہ دل ہی ہے جو ہمیشہ ان چیزوں کی خواہش کرتا ہے جن کے اندر کسی کی تباہی خفیہ طور پر سرایت کرتی ہے ، اور ان چیزوں سے نفرت کرتا ہے جن کے ساتھ کسی کی زندگی وابستہ ہوتی ہے۔ ایک شخص مختلف قسم کے کھانے سے لطف اندوز ہوتا ہے ، اگرچہ یہ غذائیں کسی کے لئے مہلک ہیں ، لیکن وہ دوائیوں سے نفرت کرتا ہے حالانکہ وہ جسم کو بیماری اور صحت سے نجات دلاتے ہیں۔ کیا کسی دن اور رات کے کسی بھی لمحے میں اس خطرے سے محفوظ رہتا ہے کہ اس کی سماعت چھین لی جائے یا اس کی بینائی چھین لی جائے یا اعضاء مفلوج ہو جائیں یا عقل تباہ ہو جائے یا روح چلی جائے اور دنیا میں جو پسند ہے اس سے سب کچھ چھین لیا جاتا ہے؟ رحم دل انسان انتہائی بے بسی کا مجسمہ ہے! اگر خالق تعالیٰ کسی کو چھوڑ دے تو وہ رہتا ہے اور اگر اس کی جان چھین لے تو وہ نابود ہو جاتا ہے۔ ایک خریدار غلام کی مانند ہے جس کے قابو میں کچھ نہیں ہے اور نہ ہی دوسرے شخص کے اعمال پر اس کا کوئی اختیار ہے۔ اس سے زیادہ عاجزانہ چیز اور کیا ہو سکتی ہے؟ تکبر کہاں ہے جو ایسے کے لئے موزوں ہے؟ انسان کا انجام موت ہے۔ دوسرے لفظوں میں ، روح انسان سے چھین لی جائے گی۔ سننے، دیکھنے کی طاقت، علم، طاقت، حواس، ادراک، حرکت وغیرہ کی طاقت، تمام طاقتیں اور صلاحیتیں چھین لی جائیں گی۔ ایک

پتھر کی مانند ہو جائے گا اور بالکل ویسا ہی ہو جائے گا جیسا کہ وہ پہلے تھا [یعنی بے جان اور معدوم ہونے کی حالت میں]. اعضاء کی شکل [ابتدائی طور پر] رہے گی لیکن کوئی حرکت اور احساس نہیں ہوگا. اس کے بعد اسے [قبر کی] مٹی میں ڈال دیا جائے گا. اس کے بعد یہ گندے ، بدبودار لاش بن جائے گا جیسا کہ پیدائش سے پہلے گندے گوشت کی شکل میں تھا. اس کے بعد اعضاء سڑ جائیں گے ، اور ان کے اجزاء الگ ہوجائیں گے ، ہڈیاں ذرات میں بکھر جائیں گی. کیڑے مکوڑے جسم کا سارا گوشت کھا جائیں گے. وہ پہلے آنکھوں کے ساکٹ میں داخل ہوں گے اور انہیں ختم کریں گے ، پھر وہ گالوں پر حملہ کریں گے اور انہیں صاف کریں گے. جسم کا کوئی ایسا حصہ باقی نہیں رہے گا جو ان کیڑوں کے پیٹ میں جانے کے بعد گندگی کا شکار نہ ہو. انسان کی بہتر حالت یہ ہے کہ وہ ویسا ہی ہو جیسا پہلے ہوا کرتا تھا، یعنی سڑنے اور سڑنے کے بعد دوبارہ گندگی بن جائے. وجود میں آنے کے بعد ، ایک بار پھر معدوم ہوجاتا ہے جیسے اس کا کبھی وجود ہی نہیں تھا.

زمین کا ٹکڑا بننے کے بعد انسان اس حالت میں رہتا ہے لیکن قیامت کے دن قیامت کی صورت میں ایک اور انقلاب اس کا انتظار کر رہا ہے. جسم کے تمام منتشر ذرات دوبارہ جسم میں متحد ہو جائیں گے اور قیامت کی ہولناکیوں کا سامنا کرنے کے لیے قبر سے اٹھا لیا جائے گا. ایک کے ارد گرد کے مناظر دیکھ کر کوئی خوفزدہ ہو جائے گا - قیامت کا دن چل رہا ہے، کائنات فضا میں روئی کے گیندوں کی طرح بکھری ہوئی ہے، زمین سب بدل چکی ہے، پہاڑ ادھر ادھر اڑ رہے ہیں، چاند، سورج اور ستارے اس روشنیوں کو کھو چکے ہیں، چاروں طرف اندھیرا ہے، ہر جگہ سخت فرشتوں کے پروں کو نظر آئے گا، جہنم اپنے تمام باشندوں کو پکارے گی، مجرم (جنہوں نے گناہوں اور زیادتیوں اور برائیوں کا ارتکاب کیا ہے) آسمان کی طرف افسوسناک نظروں سے دیکھیں گے، اعمال کا دفتر کھول دیا جائے گا، اور مجرموں سے کہا جائے گا کہ وہ اپنے اعمال کا نامہ پڑھیں [جس میں ہر اچھا یا برا عمل لکھا ہوا ہے." انسانوں نے اپنے زمینی وجود کے دوران کیا ہے]. وہ پوچھیں گے ان اعمال میں کیا ہے ان سے کہا جائے گا کہ تمہاری دنیا کی زندگی میں جب تم بہت خوش اور تکبر کرتے تھے تم پر دو فرشتے مقرر کیے گئے تھے جو تمہاری باتیں چھوٹی ہوں یا بڑا، تمہارے کھانے پینے اور اٹھنے اور بیٹھنے کا سب کچھ ان اعمال میں لکھ ہوا ہے. تم بھول گئے ہو لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہاری ہر حرکت اور تمہاری ہر بات پر قبضہ کر لیا ہے. آؤ اور احتساب کرو اور جواب دینے کے لیے تیار رہو، ورنہ عذاب کے لیے تیار رہو. یہ سن کر جلد ہی دل خوف سے کانپ جائیں گے حالانکہ ابھی تک اعمال کا دفتر نہیں کھولا گیا ہے. جب وہ ان کی طرف دیکھیں گے تو کہیں گے ہائے ! اعمال کے ان رجسٹروں میں ہر چیز موجود ہے! چھوٹے ہوں یا بڑے، سب گناہ یہاں شمار کیے گئے ہیں!"

یہ انسان کا آخری انجام ہے! کیا اس ریاست میں کسی شخص کے لیے تکبر اور برتری حاصل کرنا قابل قبول ہے؟ وجود کے ابتدائی اور درمیانی دور میں انسان کی حالت معلوم ہے. اگر کسی کو بھی ختم ہونے کی حالت معلوم ہو تو وہ انسان کی بجائے سور یا کتا بننا چاہے گا، تاکہ وہ خطاب بھی نہ سنے اور نہ ہی قیامت کا سامنا کرنا پڑے. حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی انسان خدا کے فیصلے میں جہنم کا مستحق ہے تو سور ایک سے کہیں زیادہ بہتر ہے، وہ پہلے خاک تھی اور پھر خاک بن جائے گی، وہ نہ احتساب کے مرحلے سے گزرے گا اور نہ ہی کسی سزا کا سامنا کرے گا. جس کا انجام ایسا ہے تو اس کو تکبر کرنے کا کیا حق ہے؟ کوئی فخر اور فخر کیسے کر سکتا ہے؟ ہاں ، اگر خدا کسی کو معاف کرتا ہے تو یہ ایک الگ بات ہے [کیونکہ اس وقت کوئی خوش اور فخر کر سکتا ہے]. کوئی شخص اپنے نفس میں کیا دیکھتا ہے جو اسے اپنی برتری اور فضیلت کا اتنا قائل بناتا ہے؟ (اللہ تعالیٰ) کوئی بندہ ایسا نہیں جس نے گناہ نہ کیا ہو اور وہ عذاب الٰہی کا مستحق ہو سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے کسی کو معاف کر دے. اس کی رحمت سے امید ہے کہ وہ معاف فرما دے گا. کوئی نہیں جانتا کہ اس کا آخری انجام کیا ہوگا. قیامت کے احتساب کے بارے میں خوف اور غم کی حالت میں رہنے اور اس دن کی ذلت و رسوائی کا انتظار کرنے کے لیے کافی ہے. یہ تکبر کے علم پر مبنی علاج کی تفصیل تھی.

تکبر کا عملی علاج: تکبر کا عملی علاج یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خاطر عاجز لوگوں کے اعمال کو اللہ تعالیٰ کی مخلوقات کے ساتھ اپنانا چاہیے اور ان پر ثابت قدم رہنا چاہیے جیسا کہ صالحین کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے عاجزی کی اس صفت پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ کسی نے سلمان رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ آپ نئے کپڑے کیوں نہیں پہنتے؟ آپ نے فرمایا: میں (اللہ کا) بندہ ہوں۔ جس دن مجھے [خدا کی طرف سے] آزادی (آزادی) کا اعلان ملے گا، میں نئے کپڑے پہنوں گا۔" انہوں نے آخرت کی آزادی کی طرف اشارہ کیا جو انسان کو زندگی کی آزمائشوں اور امتحانات سے گزر کر حاصل ہوتا ہے اور قیامت کے دن جوابدہی کے اختتام پر کامیاب قرار دیا جاتا ہے۔ عاجزی اعمال کے ذریعے مکمل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغرور عربوں کو (جو پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جہالت کے دور سے نکل رہے تھے) کو حکم دیا گیا کہ وہ بیک وقت ایمان لائیں اور خدا سے دعا کریں اور کہا گیا کہ دعا خدا کی راہ کی بنیاد ہے (*دین*). دعاؤں میں کچھ راز اور اسرار ہیں اور اسی بنیاد پر نماز کو ایمان کی بنیاد قرار دینا درست ہے۔ ان رازوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ دعا عاجزی کا بہترین مظہر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا، رکوع کرنا اور سجدہ کرنا وہ تمام اعمال ہیں جو عاجزی کا اظہار کرتے ہیں بشرطیکہ نماز کے دوران دل بھی موجود ہو۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے عربوں کا یہ مزاج تھا کہ وہ کسی کے سامنے سر جھکانا پسند نہیں کرتے تھے اور ان کے نزدیک نماز کے تمام اعمال ذلت اور ذلت کی علامت تھے۔ [کافر] عربوں نے [نماز کی حالت میں] سجدہ کرنے کے عمل کو ذلت (عاجزی) اور حقارت کی انتہا سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو سب سے پہلے ایمان کے بعد نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا تاکہ ان کے غرور اور تکبر کو توڑ دے اور دلوں میں عاجزی پیدا ہو۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو شخص خدا کی راہ کا علم اور فہم حاصل کرتا ہے اسے ان تمام معاملات اور اسباب پر نظر رکھنی چاہیے جن سے تکبر کا اشارہ ہوتا ہے، پھر ان کے ضد پر عمل کرنا چاہیے اور ان اعمال پر ثابت قدم رہنا چاہیے تاکہ وہ عاجزی کا عادی ہو جائے۔

دل اس وقت تک حسن اخلاق، اخلاق، اخلاق، کردار اور باطنی مزاج کا باغ نہیں بنتا جب تک کہ وہ علم اور عمل دونوں کے چشموں سے سیراب نہ ہو جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اعضاء کا تعلق عالم ظاہری سے ہے اور دل کا تعلق فرشتوں کے دائرے سے ہے۔ دونوں دائروں کے درمیان ایک خفیہ علاقہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اعضاء کے اعمال یقینا دل سے متاثر ہوتے ہیں [کیونکہ دل انسانی وجود کا غالب حکمران ہے]۔

تکبر کے علاج کا دوسرا طریقہ: اس کا تعلق اس تکبر سے ہے جس کا تعلق مذکورہ بالا سات اسباب سے ہے۔ حقیقی کمال علم اور [اچھے، پاکیزہ اور راستباز] اعمال پر مشتمل ہے اور ان کے علاوہ کوئی بھی چیز فنا ہونے کا پابند ہے اگرچہ یہ بظاہر ایک کمال کی طرح معلوم ہو۔ علم اور عمل کے علاوہ ہر کمال ایک خیالی کمال ہے۔ تکبر کی سات وجوہات کا علم پر مبنی اور عملی علاج ذیل میں بیان کیا گیا ہے۔

تکبر کی پہلی وجہ - نسب: جو شخص اپنے نسب یا شجرہ نسب کی وجہ سے مغرور ہو جاتا ہے اسے دو معاملات کی گہرائی سے سمجھ کر اپنے دل کا علاج کرنا چاہیے۔ اس قسم کے تکبر اور تکبر کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کسی دوسرے کے کمال سے عزت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر نسب کی وجہ سے مغرور شخص اپنی ذاتی صفات میں کمی رکھتا ہے تو اپنے آباؤ اجداد کے کمال اور عظمت کی وجہ سے اپنی کمی کو کیسے پورا کر سکتا

ہے؟ دوسری بات یہ کہ کسی کو اپنے اصل نسب کو جاننا چاہیے، دوسرے لفظوں میں، اسے اپنے والد اور دادا کے حقیقی تعارف کو جاننا چاہیے۔ کسی کا باپ بھی نطفہ کے گندے قطرے سے بنا ہے اور کسی کے دادا (یا پردادا) اب خاک بن چکے ہیں۔ انسان کی ابتدا وہ گندگی ہے جسے پاؤں تلے روند دیا جاتا ہے۔ کیا مٹی سے بنا انسان کو تکبر کرنا چاہیے؟ اگر یہ کہا جائے کہ انسان کو مٹی سے منسوب کرنا بہت دور ہے تو ہم کہیں گے کہ پھر تم اس چیز کو بہت قریب سے دیکھو جس سے تمہیں منسوب کیا گیا ہے وہ نطفہ قطرہ ہے۔ اس لحاظ سے ، کسی کو اپنے آپ کو نیچا سمجھنا چاہئے۔ اس پر غور کیجئے! نہ تو باپ کے پاس اصل کی کوئی شرافت ہے اور نہ ہی دادا! ان کی اولاد میں شرافت کہاں سے آئی ہے؟ کسی کی اصل گندگی ہے اور ایک نطفہ سے آیا ہے۔ اگر یہ کسی کا اصل نسب ہے تو یہ انتہائی برا ہے - ایک (گندگی) کو پیروں کے نیچے روند دیا جاتا ہے اور دوسرا (نطفہ) اگر جسم کو چھوتا ہے تو اسے دھونے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو شخص نسب کی اس حقیقت سے واقف ہے وہ کبھی تکبر نہیں کرے گا۔ اس حقیقت سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ انسان گندگی اور خون سے بنا ہوا ہے؟

تکبر کی دوسری وجہ - خوبصورتی: تکبر کی دوسری وجہ خوبصورتی ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ کسی کے باطن پر ایک ذہین نظر ڈالیں اور اپنے بیرونی وجود کو اس طرح نہ دیکھیں جیسے جانور نظر آتے ہیں۔ جو شخص باطن کی طرف دیکھتا ہے وہ اپنی عیبوں، قابل مذمت صفات اور خامیوں سے واقف ہوتا ہے جو اس کی خوبصورتی پر داغ ڈالتے ہیں۔ مزید یہ کہ انسانی اعضاء گندگی سے بھرے ہوئے ہیں۔ یہ انسان کے وجود کے درمیانی حصے کی حالت ہے [جو پیدائش کے بعد کی یہ دنیاوی زندگی ہے]۔ کسی کے آغاز کی وضاحت پہلے ہی کی گئی ہے جیسا کہ نطفہ اور ماہواری کے خون کے امتزاج سے شروع ہوا تھا۔ [اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انسان اپنی اصل میں بہت عاجز ہے]۔ بہرحال جو شخص اس حقیقت پر نظر رکھتا ہے کہ وہ گندگی سے پیدا ہوتا ہے، گندگی کے ساتھ جیتا ہے اور مرنے کے بعد گندگی کا شکار ہو جائے گا، وہ اپنی خوبصورتی پر فخر نہیں کر سکتا۔ انسانی خوبصورتی کی مثال پودوں کی ہے جو کچرے کے ڈھیر پر اگتی ہے جو بظاہر خوش کن لگتی ہے حالانکہ اس کی اصل گندگی ہے۔ یا انسانی حسن کی مثال بیابان کے پھولوں اور نباتات کی ہے جو خوش کن لگتی ہیں لیکن جب کچھ دیر بعد ان پر ہوا چلتی ہے تو ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ اگر انسانی حسن دائمی ہو اور تمام عیب و داغ سے پاک ہو، تب بھی کسی کو کسی ایسے شخص پر مغرور اور تکبر کرنے کا حق نہیں ہے جو خوبصورت نہیں ہے کیونکہ جس طرح کسی کی خوبصورتی ذاتی نہیں ہے (جیسا کہ اس نے اسے خود نہیں بنایا ہے) اسی طرح کسی اور کی خوبصورتی کی کمی بھی ذاتی نہیں ہے۔ خوبصورتی پائیدار یا دیرپا نہیں ہے۔ ہر وقت ، یہ فکر رہتی ہے کہ یہ مہاسوں ، چوٹ ، یا کسی اور بیماری کی وجہ سے ختم ہوسکتا ہے یا ختم ہوسکتا ہے۔ ہر دن اور رات ہمیں ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جہاں لوگ اپنی خوبصورتی کھو چکے ہیں [لہذا خوبصورتی جیسی عارضی اور عارضی چیز پر فخر اور تکبر رکھنا سراسر احمقانہ اور مکروہ ہے]۔

تکبر کی تیسری وجہ طاقت اور طاقت: طاقت اور طاقت تکبر کی ایک اور وجہ ہے۔ اس کا علاج ان بیماریوں اور بیماریوں پر غور کرنا ہے جو انسانوں پر مسلط کی گئی ہیں۔ اگر کسی کو انسانی بے بسی کا نمونہ دیکھنے کی ضرورت ہے تو ، یہ اس وقت دیکھا جاسکتا ہے جب ایک چھوٹا سا جسمانی عضو درد سے متاثر ہوتا ہے جو انسان کو تمام نااہل سے زیادہ نااہل اور تمام مایوس لوگوں سے زیادہ مایوس بناتا ہے۔ انسانی بے بسی کی کیفیت یہ ہے کہ اگر مکھی کسی چیز کو لے بھی جائے تو اسے واپس نہیں مل پاتا۔ اگر کوئی معمولی کیڑا، مچھر یا چیونٹی کسی کے کان یا ناک میں داخل ہو جائے تو وہ بغیر کسی موت کے مار ڈالیں گے۔ اگر کوئی کانٹا پاؤں یا جسم کے کسی دوسرے حصے میں پھنس جائے تو وہ چلنے سے قاصر ہو جائے گا۔ ایک دن تک رہنے والا بخار طاقت کے اتنے نقصان کا سبب بن سکتا ہے کہ برسوں کی غذائیت اس کی تلافی نہیں کرسکتی۔ جو کانٹا بھی برداشت نہیں کر سکتا، مچھر سے لڑ نہیں سکتا، یا مکھی سے اپنا دفاع نہیں کر سکتا، اسے اپنی طاقت اور طاقت پر فخر کرنا چاہیے اور فخر کرنا

چاہیے؟ انسان کتنا ہی مضبوط کیوں نہ ہو، گدھا، گائے، ہاتھی یا اونٹ سے زیادہ طاقتور نہیں ہو سکتا۔ کیا کوئی اس خصوصیت پر فخر کا اظہار کر سکتا ہے جس میں جانور برتر ہیں؟

تکبر کی چوتھی اور پانچویں اسباب - دولت کی کثرت اور حامیوں ، مددگاروں ، پیروکاروں اور مداحوں کی کثرت : تکبر کی ایک وجہ دولت کی کثرت ہے۔ ایک اور وجہ دوستوں ، مددگاروں ، پیروکاروں اور مداحوں کی کثرت ہے۔ اس میں بادشاہوں (سرکاری حکام) کی طرف سے دیئے گئے عہدوں کی وجہ سے تکبر بھی شامل ہے۔ یہ تکبر حسن اور طاقت پر تکبر کی طرح نہیں ہے کیونکہ خوبصورتی اور طاقت انسانی خصلتوں کا حصہ ہیں جبکہ دولت اور دوستوں کی بڑی تعداد ان سے باہر ہے۔ اس قسم کا تکبر انتہائی برا ہے جیسے کوئی اپنے گھوڑے یا گھر پر تکبر کا اظہار کرتا ہے۔ اب اگر گھوڑا مر جائے یا گھر تباہ ہو جائے تو یہ تکبر ختم ہو جائے گا، اور انسان ذلیل ہو جائے گا [کیونکہ وہ ذاتی صفات سے محروم ہے، اس لیے وہ زیادہ عارضی ہیں]۔ جو شخص بادشاہوں سے مرتبہ یا عزت حاصل کرنے کے بعد تکبر کا اظہار کرتا ہے وہ فطری صفات سے محروم ہے اور ایک ایسے دل پر بھروسہ کرتا ہے جو ابلتے ہوئے برتن سے زیادہ پریشان ہے۔ بادشاہوں کے دل بہت جلد بدل جاتے ہیں۔ جب وہ کسی سے مایوس ہوجاتے ہیں تو ، وہ کسی خوفناک حالت میں ڈالنے کے لئے کسی بھی چیز سے باز نہیں آتے ہیں۔ جو شخص کسی ایسی چیز پر تکبر کرتا ہے جو کسی کی فطری فطرت کا حصہ نہیں ہے، وہ خالص جاہل ہے۔ مثال کے طور پر دولت ایک ایسی خصوصیت ہے جو کسی کے لیے فطری نہیں ہے اور یہ ایک ایسا امتیاز ہے جسے چور ایک لمحے میں چرا سکتا ہے اور ایک امیر شخص کو ذلیل اور محتاج بنا سکتا ہے۔ وہ صفات جو کسی کے لیے ذاتی نہیں ہوتیں، دائمی نہیں ہوتیں، بلکہ وہ آخرت میں مصائب اور عذاب کا باعث بنتی ہیں۔ ان خوبیوں پر فخر کرنا جہالت ہے۔ مزید یہ کہ یہ خدا کے ہاتھ میں ہیں جنہوں نے یہ صفات عطا کی ہیں نہ کہ انسانی ہاتھوں میں۔ اگر وہ چاہے تو انہیں تمہارے لیے سنبھال لے اور اگر چاہے تو انہیں پکڑ لے آپ صرف ایک خریدے ہوئے غلام ہیں کیونکہ آپ کو کسی بھی چیز پر کوئی اختیار نہیں ہے۔ ان حقائق سے واقف شخص تکبر نہیں کر سکتا۔ کیا اس حالت میں کوئی شخص (جس کا سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے) اپنی قابلیت، مال، طاقت اور کمال پر فخر کر سکتا ہے یا اپنے نفس کو ذلیل سمجھ سکتا ہے؟ یہ حال ہر اس ذہین شخص کا ہے جو بصیرت کا مالک ہو۔ ایسا سمجھتا ہے کہ وہ نہ تو اپنے آپ کا مالک ہے، نہ ہی اپنے جسم، اعضاء اور نہ ہی مال کا۔ اس کے باوجود، انسان نقصانات، خواہشوں، مصائب اور بیماریوں سے گھرا ہوا ہے جو ہر وقت کسی کی تباہی کا خطرہ بناتے ہیں۔ یہ تکبر کی وجوہات کے علاج کا طریقہ ہے جو انسانی فطرت کے لئے اندرونی نہیں ہیں۔

تکبر کی چھٹی وجہ علم: علم پر تکبر کرنا ایک مہلک بیماری ہے۔ بعض اوقات اس کا علاج بہت مشکل ہو جاتا ہے اور اس بیماری سے صحت یاب ہونے کے لیے سخت محنت اور جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح خدا کے نزدیک علم کی عزت بہت زیادہ ہے اسی طرح بندوں میں بھی عظیم ہے۔ علم کے مقابلے میں دولت اور خوبصورتی کا ایک معمولی مقام ہے، بلکہ علم اور اعمال کی روشنی ان کی تعریف اور تعظیم عطا کرتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: عالم کی غلطی عوام کو گمراہ کرتی ہے۔ شریعت الٰہی میں علم کی اتنی خوبیاں درج ہیں کہ یہ تصور کرنا مشکل ہے کہ کوئی عالم اپنے بارے میں زیادہ نہیں سوچے گا اور کسی کی حیثیت کو جاہل سے بلند نہیں سمجھے گا۔

علم پر تکبر کا علاج یہ ہے کہ عالم کو دو باتوں پر غور و فکر کرنا چاہیے۔ ایک یہ کہ خدا کے ثبوت ایک عالم (یا علمی الہیات دان) پر زیادہ مکمل اور مضبوط ہیں۔ مزید یہ کہ جو کچھ جاہل سے برداشت کیا جاتا ہے، اس کا دسواں

حصہ بھی کسی عالم کی طرف سے برداشت نہیں کیا جاتا، کیونکہ جو شخص علم اور علم کے بعد خدا کی نافرمانی کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کے حق ادا نہ کرنے کا بدترین گناہ کرتا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَٱتۡلُ عَلَيۡهِمۡ نَبَأَ ٱلَّذِيٓ ءَاتَيۡنَٰهُ ءَايَٰتِنَا فَٱنسَلَخَ مِنۡهَا

"اور ان لوگوں کو ایک ایسے شخص کا حال پڑھا دو جسے ہم نے اپنی آیتیں عطا کی تھیں، لیکن وہ شخص ان میں سے نکل گیا [اس وجہ سے کہ وہ اپنے اوپر الٰہی نعمتوں کا قدر نہ کرتا تھا اور اس کے بجائے عارضی اور قلیل مدتی نعمتوں کی طرف دوڑتا تھا]۔ (سورة البقرة سورة البقرة آیت ۱۷۵)

اگلی آیت میں، خدا نے اسی شخص کے بارے میں یہ کہا:

فَمَثَلُهُۥ كَمَثَلِ ٱلۡكَلۡبِ إِن تَحۡمِلۡ عَلَيۡهِ يَلۡهَثۡ

"لہذا ، اس شخص کی حالت ایک کتے کی طرح بن گئی جو اگر آپ اسے مارتے ہیں تو ہوا کے لئے ہانپتا ہے اور اگر آپ اسے تنہا چھوڑ دیتے ہیں تو پھر بھی ہوا کے لئے ہانپتا ہے۔" (سورة البقرة آیت 7، آیت 176)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے مندرجہ بالا دو آیات کی وضاحت میں کہا ہے کہ بلعام باورہ (حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں بنی اسرائیل کی طرف سے ایک اعلیٰ روحانی صفت کا حامل بزرگ) کو خدا کی معرفت عطا کی گئی تھی، لیکن اس کی قدر نہیں کی اور اس پر دنیاوی خواہشوں کو ترجیح دی۔ اور خدا اسے ایک کتے سے مشابہت رکھتا ہے جو ہر حالت میں ہوا کے لئے ہانپتا ہے۔ بلعام بھی ایک کتے کی طرح برتاؤ کرتا تھا، کیونکہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ حکمت کے خزانے اس کو [خدائی سخاوت اور سخاوت سے] کتنا ہی عطا کیا جائے یا نہ دیا جائے، وہ کسی بھی حالت میں اپنی خواہشات کو ترک نہیں کرے گا۔ عالم کے لیے یہی خطرہ سب سے بڑا ہے کہ ایک عالم کو اپنے اعمال اور برائیوں کے لیے زیادہ احتساب اور حساب کتاب کا نشانہ بنایا جائے گا کیونکہ ان کا عوام پر دیرپا اثر پڑتا ہے، وہ لوگ جو زمانے کے خاتمے کے بعد انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں، لوگوں کو حق کی طرف رہنمائی کرنے اور انہیں ابدی خوشی اور لامتناہی کامیابی کی طرف لے جانے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے]۔ وہ کون عالم نہیں ہے جس نے لوگوں کو نیکی کی تلقین کی اور اپنے آپ کو اس سے محروم رہے؟ ایک عالم جو اپنے مرتبے کو جاہل سے افضل سمجھتا ہے، اسے یہ سوچنا چاہیے کہ اگرچہ کسی کی حیثیت ایک جاہل سے بالاتر ہے، لیکن ایسے کے مقابلے میں ایک عالم زیادہ خطرناک حالت میں ہے [اس کی توقع اس وجہ سے کہ وہ عوام سے اعلیٰ اخلاقی سطح پر ہے اور عوام کے لیے ایک اعلیٰ مثال قائم کرے گا]۔ [کا ادراک] یہ خطرہ بذات خود تکبر کی راہ میں رکاوٹ ہے۔

اگر کوئی آنے والے خطرات پر غور کرے گا تو اس میں تکبر کا ذرہ برابر بھی نہیں بچے گا اور وہ مخلوقات میں سے ایک عظیم انسان ہونے کا تصور بھی نہیں کرے گا۔ اس کی تمثیل ایک غلام کی ہے جسے اس کے آقا نے کچھ کام کرنے کا حکم دیا ہے۔ [یہ تمثیل بہت مناسب ہے کیونکہ تمام انسان خدا کے غلام ہیں اور خدا ان کا مالک سب سے بڑا ہے)۔ اس نے یہ کام شروع کیے لیکن ان میں سے کچھ چھوڑ دیا۔ ان میں سے کچھ کام کیے گئے لیکن ناقص طریقے سے کیے گئے اور کچھ مکمل کیے گئے لیکن وہ شک کرتے رہے کہ وہ اپنے آقا کی مرضی کے مطابق یہ کام کرنے میں کامیاب ہوئے یا نہیں۔ اس دوران ایک مخبر نے اسے اطلاع دی کہ "تیرے آقا نے تمہیں بلایا ہے اور وہ

تمہیں تمہاری جائیداد سے محروم کر دے گا اور تمہیں ذلیل کرے گا۔ وہ آپ کو گرمی میں تیز دھوپ میں اپنے دروازے کے باہر کھڑا کرے گا۔ جب آپ انتہائی پریشان اور بے بس ہوجائیں گے تو ، وہ آپ کا احتساب کرے گا۔ وہ کام جو آپ نے صحیح طریقے سے مکمل نہیں کیے یا بالکل مکمل نہیں کیے، وہ آپ سے ان کے بارے میں پوچھ گچھ کرے گا اور آپ کی سزا کے لیے اپنا فیصلہ اعلان کرے گا۔ پھر آپ کو ایک تاریک کال کوٹھری میں قید کر دیا جائے گا جہاں آپ ہمیشہ رہیں گے اور آپ کو ذرا سا بھی آرام نہیں ملے گا۔" وہ غلام یہ بھی جانتا ہے کہ اس کے آقا نے بہت سے غلاموں کے ساتھ وہی سلوک کیا ہے ، حالانکہ ان میں سے کچھ کو معاف کردیا گیا ہے۔ لیکن وہ نہیں جانتا کہ وہ غلاموں کے کس گروہ سے تعلق رکھتا ہے، وہ لوگ جو سخت عذاب میں ملوث ہیں یا جن کو معافی کا اعلان دیا گیا ہے۔ اس حقیقت پر غور کرنے سے نچلے نفس کو عاجزی کی حالت میں رکھا جائے گا۔ تکبر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ اپنی نظر میں کوئی غیر اہم ہو جائے گا۔ غم اور خوف انسان کے دل و دماغ پر حاوی ہو جائے گا اور انسان مخلوقات میں سے کسی بھی عاجز اور غیر اہم شخص پر تکبر کرنے سے قاصر رہے گا، بلکہ وہ سب کے ساتھ اس امید پر عاجزی سے پیش آئے گا کہ عذاب الٰہی کے وقت دوسرا شخص شفاعت کرنے والا ہو سکتا ہے۔ عالم کے لیے گہری غور و فکر کے دروازے کھلے ہیں، اگر کوئی شخص یہ دیکھے کہ اس نے گناہ کے ارتکاب سے الٰہی احکام کی کتنی خلاف ورزی کی ہے، نہ صرف اس نے بیرونی اعضاء کو گناہوں کے ارتکاب کے ذریعہ کے طور پر استعمال کیا ہے بلکہ اس کا باطنی وجود گناہوں اور گناہوں کا مرکز رہا ہے جس میں دکھاوا (*ریا*)، حسد، غرور (عجوب) اور منافقت (*نفق*) شامل ہیں)۔ ظاہری طور پر، [اس طرح کے عالم یا علمی الہیات دان] کا آخری اختتام اچھا نہیں لگتا۔ اگر کوئی عالم ان خطوط پر سوچتا ہے تو وہ تکبر کی غلامی سے آزاد ہو جائے گا۔

دوسری بات جس کے بارے میں ایک عالم کو سوچنے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ تکبر (عظمت اور عظمت) صرف خدا کے لیے موزوں ہے۔ اگر کوئی تکبر کر رہا ہے تو وہ خدا کی ناراضگی کا مستحق ہو گا اور اسے خدا کا بے دخل غلام قرار دیا جائے گا۔ خدا کسی سے عاجزی چاہتا ہے۔ یہ خدائی اقوال میں سے ایک ہے، "تمہاری قدر میرے ساتھ اس وقت تک موجود ہے جب تک کہ تمہارے اپنے دل میں اپنی کوئی قیمت نہیں ہے۔ اگر آپ اپنی ذات کی قدر سمجھتے ہیں تو آپ کی میرے قریب کوئی قیمت نہیں ہے"۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک عالم کو چاہیے کہ وہ اپنی ذات سے صرف وہی اعمال (اعمال) لے لے جو خدا کو پسند ہے [اور ہر اس چیز سے باز آنا چاہیے جسے خدا ناپسند کرتا ہے، کیونکہ خدا اور راہ خدا کے عالم سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ عوام سے اعلیٰ اخلاقی اور اخلاقی معیار رکھتا ہے]۔ اس حقیقت پر غور و فکر کرنے سے تکبر کا خاتمہ ہو جائے گا، حالانکہ ایک عالم کے پاس یہ یقین ہے کہ اس نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے یا اس نے یہ تصور کیا ہے کہ وہ کبھی گناہ نہیں کرے گا، اس سے اس کے دل سے تکبر کا اندھیرا بھی دور ہو جائے گا۔ اس قسم کے غور و فکر، بصیرت اور غور و فکر نے انبیاء علیہم السلام سے تکبر کو دور کرنے میں مدد کی۔ ان کے پاس یہ یقین تھا کہ جو شخص خدا کے جلال و عظمت اور عظمت کی اس صفت میں خدا کا مقابلہ کرتا ہے وہ خدا کی طرف سے نیچے (نیچے) ہو جاتا ہے۔ یہ خدا کا حکم ہے کہ آپ اپنے نچلے نفس کو پست اور حقیر سمجھیں تاکہ خدا کے قریب آپ کا درجہ بلند ہو۔

تکبر کی ساتویں وجہ - خوف خدا: اطاعت و عبادت کے اعمال پر تکبر ایک بہت بڑی فتنہ ہے اور علاج کا طریقہ یہ ہے کہ تمام مخلوقات کے تئیں عاجزی کرنا اپنے آپ پر واجب کیا جائے اور یہ جان لیا جائے کہ کسی عالم پر تکبر نہ کرنا چاہیے، چاہے وہ اپنے علم پر عمل کرنے میں کتنا ہی کیوں نہ ہو۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۗ

"کہہ دو (اے محمد)! کیا علم رکھنے والے اور علم نہیں برابر ہو سکتے ہیں؟ (سورۃ البقرۃ باب 39، آیت 9)

اس آیت کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات اور نبوی روایات ہیں جو علم کی فضیلت کی تصدیق کرتی ہیں۔ اگر کوئی عبادت گزار یہ کہے کہ یہ آیات کسی ایسے عالم کے بارے میں نازل ہوئی ہیں جو کسی کے علم پر عمل کرتا ہے نہ کہ کسی عالم کے بارے میں جو گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ نے اس آیت پر غور نہیں کیا:

إِنَّ ٱلْحَسَنَٰتِ يُذْهِبْنَ ٱلسَّيِّـَٔاتِ ۚ

"بے شک نیک اعمال برائیوں کو مٹا دیتے ہیں [جیسا کہ خدا نے اپنی غلطیوں، برائیوں اور خطاکاروں اور گناہوں کو مٹانے کا حکم دیا ہے کہ اپنی زندگی کا رخ موڑ کر ان کو مٹا دیا جائے۔" یہ خدا پر ایمان لانے اور اس عقیدے کے مضمرات پر عمل کرنے سے ہوتا ہے جو کسی بھی ممکنہ سطح پر دوسروں کی مدد کرتے ہیں۔" (سورۃ البقرۃ الیاہ، آیت ۱۱۴)

جس طرح یہ ممکن ہے کہ کسی عالم کو اس کے علم کی وجہ سے جوابدہ ٹھہرایا جائے اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ علم کسی عالم کی نجات اور اس کے گناہوں کا کفارہ بن جائے۔ چونکہ نمازی کو علم کے ساتھ ہونے والے سلوک کے بارے میں معلوم نہیں ہوتا، اس لیے احتساب ہوگا یا نجات ملے گی، اس لیے نمازی کے لیے عالم کی تذلیل کرنا جائز نہیں ہے۔ اس کے بجائے ، کسی عالم کے ساتھ عاجزی سے رہنا چاہئے [ایک عالم کے پاس موجود علم کے احترام میں]۔ یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس طرح علم رکھنے والوں کو یہ موقع فراہم کیا جا رہا ہے کہ وہ عبادت گزاروں سے برتر رہیں اور تکبر کریں کیونکہ علم عبادت سے افضل ہے۔ جس طرح نمازیوں کو علماء پر تکبر نہ ہونا چاہیے اسی طرح علماء کو بھی تکبر سے پرہیز کرنا چاہیے اور دونوں کو اپنے نفس کے بارے میں اندیشہ رکھنا چاہیے۔ انسان کو اپنے نچلے نفس پر نگہبان اور اس کی صحیح تربیت کے ذمہ دار مقرر کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر انسان کے لیے مناسب ہے کہ وہ اپنے نچلے نفس سے خوفزدہ رہے اور دوسروں کے معاملات میں امید اور مثبت خیالات غالب ہوں۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان صرف بیرونی جسمانی اعضاء سے عبادت کرتا ہے، لیکن دل میں کچھ پوشیدہ گناہ پیدا ہوتے ہیں جس کی وجہ سے وہ عذاب الٰہی کا مستحق ہو جاتا ہے۔ [کبھی کبھی] ایک شخص بظاہر برائیوں میں ملوث ہوتا ہے لیکن اس کے دل میں خدا کی محبت، خلوص، خدا کے خوف اور احترام کے روشن چراغ ہوتے ہیں۔ خدا کسی کے دل کی کیفیت [اس طرح] اپنے گناہوں کے کفارے میں بدل دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ قیامت کے دن سامنے آئے گا جب بہت سے کھلم کھلا برے لوگ بہت سے عبادت گزاروں سے بہتر ہوں گے۔ یہ ممکن ہے اور ، ان معاملات میں ، کسی کو دور کے امکانات کو قریب ترین امکانات کے طور پر سوچنا چاہئے اور یہ حالت اس وقت پیدا ہوگی جب آپ اپنے نچلے نفس سے خوفزدہ ہوں۔

ذہانت کا تقاضا ہے کہ آپ اس بات پر توجہ نہ دیں کہ دوسروں کے لئے کیا ممکن ہے ، لیکن آپ کو اپنے آپ سے متعلق معاملات پر غور کرنا چاہئے جو تشویش کا سبب ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنے گناہوں کی سزا کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس کے علاوہ، کسی دوسرے کے خدائی عذاب کی وجہ سے کسی کے خدائی عذاب میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ اگر آپ اس طریقہ کار کو اپناتے ہیں تو آپ کبھی بھی اپنے آپ کو کسی اور سے برتر یا بہتر نہیں سمجھیں گے۔ دو طرح کے لوگ ہیں، بعض وہ ہیں جو تم سے بہتر ہیں اور بعض وہ ہیں جو تم سے بدتر ہیں۔ آپ کو لوگوں کے ان دونوں گروہوں کے ساتھ عاجزی ہونی چاہیے۔ اگر کوئی آپ سے بہتر ہے [باطنی صفات ، ذاتی خصوصیات ، نیکی ، صداقت اور روحانیت میں] تو آپ کو ایسے شخص سے مل کر خوش ہونا چاہئے اور یہ خواہش ہونی چاہئے کہ خدا آپ کو ایسا ہی بنائے۔ اگر کوئی بدتر ہے تو آپ کو یہ سوچنا چاہیے کہ شاید یہ شخص نجات حاصل کر سکتا ہے جبکہ آپ کو نجات مل سکتی ہے - ہو سکتا ہے کہ ایسا شخص اپنے باطن میں کوئی اچھا کام کرے

جو کسی کے لیے اچھا ہو یا کسی کی کوئی اچھی عادت ہو جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس پر رحم کرے اور اس کی توبہ قبول کر لے اور اسے خوبصورت اعمال کے ساتھ اچھا انجام دے۔ میرے نیک اعمال صرف ظاہری ہو سکتے ہیں [خدا کے ساتھ اخلاص کی کمی کی وجہ سے کوئی باطنی فضیلت نہ ہو] جو میرے لیے اچھا نہیں ہے، اس کے بجائے ان عبادتوں میں چھپے ہوئے نقصانات کا خطرہ ہے [جیسے کہ میری ظاہری مذہبیت اور دکھاوے سے دکھاوا کرنا یا دنیاوی فوائد حاصل کرنا] جو کسی بھی اجر کو باطل کر سکتے ہیں۔ اس عبادت کی قبولیت اور قربت۔ اس طرح کے لوگوں کے مختلف گروہوں سے نمٹنے کے بعد ہی عقل کامل ہو جائے گی اور کوئی شخص [نیکی میں مہارت حاصل کرکے] [اخلاقی] قائدانہ کردار کا مستحق ہو جائے گا۔ بہرحال جو شخص نقصان کے امکان کا باضمیر ہو، جیسا کہ تقدیر کے مصنف (خدا) نے اپنی تقدیر میں مصیبت لکھی ہے، اسے کبھی تکبر نہیں ہونا چاہیے، یہ بہتر ہے کہ خوف ایسے شخص پر غالب ہو جائے اور اس کے نتیجے میں ہر ایک کو ایک سے بہتر سمجھے۔

خود تکبر اور اس کے نقصانات کی مذمت

تکبر کی برائی خدا کی کتاب اور نبوت کے احادیث میں ثابت ہوتی ہے جیسا کہ خدا فرماتا ہے:

وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا

"اور وہ اسی سوچ میں رہے کہ وہ اچھے کام کر رہے ہیں [اور ان کے ذریعہ کچھ بھی غلط نہیں کیا جا سکتا]۔"
(سورة البقرة آیت 18، آیت 104)

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ انسان اپنے اعمال کے بارے میں اچھے خیالات اور راستبازی رکھتا ہے، ایسے وقت جب وہ گمراہی پر ہوتا ہے اور کبھی جب وہ گمراہی پر نہیں ہوتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نبوت میں فرمایا:

ثَلٰثٌ مُهْلِكَاتٌ شُحٌّ مُطَاعٌ وَهَوًى مُتَّبَعٌ وَإِعْجَابُ الْمَرْءِ بِنَفْسِهِ

"تین چیزیں تباہ کن ہیں - کنجوسی جس کا کوئی پیروکار ہے، نچلے نفس کی بنیادی خواہشات جس کا وہ پیروکار ہے، اور ایک شخص جو اپنے نفس کو عظیم سمجھتا ہے [خود تکبر کی حالت میں]"۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ہلاکت دو چیزوں میں ہے: مایوسی اور راستبازی ۔ انہوں نے ان دونوں چیزوں کو یکجا کیا کیونکہ سعدہ (ابدی خوشی اور لامتناہی کامیابی) محنت، تلاش اور جدوجہد کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔ مایوس شخص نہ تو کوشش کرتا ہے اور نہ ہی جدوجہد کرتا ہے۔ ایک نیک انسان کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ پہلے ہی اپنے مطلوبہ مقاصد حاصل کر چکا ہے اور اس عقیدے کی وجہ سے کوشش بھی نہیں کرتا۔ پہلے سے موجود چیز [یا اس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے] کی تلاش نہیں کی جاتی ہے اور ناممکن کی بھی تلاش نہیں کی جاتی ہے۔ ایک خود راستباز شخص یہ سوچتا ہے کہ اس نے ابدی خوشی اور لامتناہی کامیابی حاصل کر لی ہے اور ایک مایوس شخص یہ سمجھتا ہے کہ اس کی تلاش ناممکن ہے۔ الہامی کہاوت یہ ہے:

فَلَا تُزَكُّوٓا۟ أَنفُسَكُمْ

"اپنے آپ کو پاکیزگی، پاکیزگی اور تقویٰ کا منسوب نہ کرو۔" (سورة البقرة 53، آیت 32)

کسی نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ کب برا ہوتا ہے؟ اس نے جواب دیا، "جب کوئی سوچتا ہے کہ 'میں اچھا ہوں'. یہ معلوم ہونا چاہئے کہ خود راستبازی کے نقصانات بے شمار ہیں۔ دوسری چیزوں کے علاوہ ، یہ تکبر پیدا کرتا ہے اور تکبر سے بہت سے نقصانات پیدا ہوتے ہیں۔ یہ نقصانات عوام کے ساتھ ہیں۔ خدا سے متعلق معاملات میں خود راستبازی کے نسبتا زیادہ نقصانات ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص راستبازی میں ملوث ہو تو وہ گناہوں کو بھول جاتا ہے اور ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا۔ انسان بعض گناہوں کو مکمل طور پر بھول جاتا ہے اور اگر ان میں سے کچھ گناہوں کو یاد کرتے ہیں تو وہ ان کو مٹانے کے لیے کچھ نہیں کرتا اور یہ سوچتا ہے کہ میں (صرف) نیک کام کرتا ہوں۔ میرے 'گناہ' گناہ نہیں ہیں۔ اگر وہ موجود ہیں تو ، وہ اتنے معمولی ہیں کہ انہیں کسی اصلاح یا کفارے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے بجائے، کوئی یہ سوچتا ہے کہ کسی کے بڑے اور چھوٹے گناہ خدا نے معاف کر دیے ہیں۔ انسان اپنی عبادات اور اعمال صالح کو بہت زیادہ سمجھتا ہے، ان پر تکبر اور تکبر کا اظہار کرتا ہے، بلکہ وہ ان کو خدا پر احسان کرنے والا سمجھتا ہے اور بھول جاتا ہے کہ وہ اللہ کے فضل و کرم کی وجہ سے نیک اعمال کرنے کی توفیق رکھتا ہے۔ جب انسان اپنے اعمال پر صداقت کا اظہار کرتا ہے تو اس کے نقصانات سے آنکھیں بند کر لیتا ہے جو اس بات کا اشارہ ہے کہ اس کی ساری محنت ضائع ہو جاتی ہے۔ اگر ظاہری اعمال پاک نہ ہوں اور ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک نہ ہوں تو ان کا نفع بہت کم ہے۔ صرف وہی شخص جو (خدا سے) غالب ہو وہ خود راستبازی کے نقصانات کا پتہ لگاتا ہے۔ جس شخص میں نیکی کا شکار ہو وہ اپنی نفس پر تکبر کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ پر تکبر کرتا ہے، اور یہ سمجھتا ہے کہ وہ اللہ کے عذاب سے محفوظ اور محفوظ ہے جس طرح اس کا اللہ تعالیٰ کے ہاں مرتبہ ہے، اس کی عظمت ہے، بلکہ اس کے پاس اللہ تعالیٰ پر یہ فضل اور حق ہے جو اللہ تعالیٰ کو اپنے اعمال پر نظر رکھتا ہے اور اس کا اجر عطا فرماتا ہے۔ خدا پر نام نہاد فضل ، حقیقت میں ، خدا کی نعمتیں ہیں ، اور کسی کو عطا کی گئی ہیں۔ خود راستبازی انسان کو اپنے آپ کی تعریف کرنے اور اپنے آپ کو باطنی پاکیزگی سے منسوب کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

جب کوئی شخص اپنی رائے، اعمال اور عقل پر خود کو بڑھاتا ہے تو وہ نہ تو دوسرے سے فائدہ اٹھاتا ہے اور نہ ہی کسی سے مشورہ کرتا ہے، بلکہ اپنی رائے پر اصرار کرتا ہے اور کسی عالم سے پوچھنا اپنے آپ کی توہین سمجھتا ہے۔ بعض اوقات، کوئی شخص ذہن میں غلط خیالات پر خود راستبازی سے صرف اس وجہ سے خوشی محسوس کرتا ہے کہ وہ کسی کے دل میں نہیں بلکہ کسی اور کے دل میں ہوا ہے، پھر وہ اپنے صحیح یا غلط خیالات پر اصرار کرتا ہے نہ تو کسی نصیحت کرنے والے کی نصیحت کو سنتا ہے اور نہ ہی کسی واعظ کے کسی واعظ کو قبول کرتا ہے۔ اس کے بجائے، کوئی دوسروں کو اس طرح دیکھتا ہے جیسے وہ جاہل ہے اور اپنی غلطیوں پر اصرار کرتا ہے۔ اگر دنیاوی معاملات میں غلط رائے کا اظہار کیا گیا ہے تو انسان اپنے مقصد سے محروم ہو جاتا ہے اور اگر عقائد سے متعلق معاملات میں ہوتا ہے تو اسے ہمیشہ کے لیے نقصان پہنچایا جاتا ہے۔ اگر کسی نے اپنی (غلطی) رائے پر بھروسہ نہ کیا ہو اور قرآن کی روشنی سے روشنی حاصل نہ کی ہوتی، علماء دین سے مدد طلب کی ہوتی، علم کے مطالعے اور حکمت کے اجتماعات میں ثابت قدم رہتی ہوتی، اہل علم و دانش سے قانونی معاملات سے متعلق سوالات کے جوابات مانگنے کا عمل جاری رہتا ، پھر یقینا کوئی سچائی تک پہنچ جاتا۔ راستبازی کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ انسان کامیابی کے قیاس (قیاس یا وہم) میں مبتلا ہو جاتا ہے، اور اس لیے کوشش اور کوشش کرنے میں سستی کا شکار ہو جاتا ہے، اور یہ سمجھتا ہے کہ وہ ہر عمل کا محتاج نہیں ہے، اگرچہ وہ اعمال سے غافل نہیں ہے، اور یقینی تباہی اس کا مقدر ہے۔ *ہم اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے لیے* حسن توفیق کی خوبصورتی کے خواہاں ہیں۔

نفس کی صداقت کے اسباب اور ان کا علاج

واضح رہے کہ تکبر کی اسباب بھی نفس کی وجوہات ہیں۔ تکبر کی وجوہات پہلے بھی بیان کی جا چکی ہیں۔ بعض اوقات، خود راستبازی ان اسباب کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے جو تکبر کا سبب نہیں بنتیں، جیسے کسی کی غلط رائے پر خود راستبازی جو کسی کی اپنی جہالت کی وجہ سے کسی کو اچھا لگتا ہے۔ خود راستبازی اور خود تعریف کی آٹھ وجوہات ہیں:

پہلا سبب: جسمانی صفات اور خصوصیات جیسے جسم کی خوبصورتی (جسمانی ساخت)، ظاہری شکل، صحت، طاقت، اعضاء کا توازن، چہرے کی خوبصورتی، آواز کی خوبصورتی وغیرہ پر خود پرستی اور خود کی تعریف کرنا ہے اور اس کے نتیجے میں انسان یہ بھول جاتا ہے کہ جسمانی خوبصورتی خدا کی نعمت ہے جو زوال پذیر اور فنا ہونے والی ہے۔ اس کا علاج وہی ہے جو ہم نے تکبر کے باب میں لکھا ہے کہ جو شخص اپنی خوبصورتی پر تکبر رکھتا ہے وہ اپنے آغاز اور اختتام کی گندگی کا تصور کرے اور یہ سوچے کہ کتنے خوبصورت اور خوبصورت لوگ زمین میں سوتے ہیں (ان کی وفات کے بعد ان کی قبروں میں دفن ہوگئے) اور ان کے پھولوں جیسے چہرے ان کی قبروں کے اندر گندگی کے ڈھیر بن گئے ہیں۔

دوسرا سبب: یہ ہے کہ انسان اپنی طاقت اور طاقت پر خود راستبازی اور خود پرستی رکھتا ہے جو اس میں یہ خواہش پیدا کرتا ہے کہ وہ جنگ میں حملہ آور ہو، اپنے آپ کو تباہی میں ڈال دے، دشمن کو سب سے پہلے مارنے والا ہو۔ اس کے علاج کا پہلے ذکر کیا گیا تھا کہ اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ بخار کا ایک دن کسی میں عظمت کے تمام خیالات کو نکال سکتا ہے اور اس کی تمام طاقت کو ضائع کر دے گا جس کی وجہ سے وہ فخر کے ساتھ گھومتا ہے۔ اگر کسی شخص کو اپنی قدرت اور طاقت پر خود پرستی اور خود پرستی ہے تو یہ ممکن ہے کہ خدا کسی فرد (یا لوگوں یا قوم کے پورے گروہ کو) پر مصیبت مسلط کر دے اور اس طاقت اور طاقت کو چھین لے جس نے ان کے تکبر کو ہوا دی ہے۔

تیسرا سبب: یہ ہے کہ انسان اپنی ذہانت، حکمت، بصیرت اور دور اندیشی پر خود راستبازی اور خود کی تعریف کرے اور یہ سوچے کہ وہ دنیاوی اور دینی معاملات کے پیچھے باریکیوں اور باطنی حکمت سے بخوبی واقف ہے۔ ایسا شخص خود رائے (اپنی رائے سے متاثر ہو) اور کسی سے مشورہ نہیں کرتا ، اس کے بجائے ، وہ تمام لوگوں کو مطلق جاہل سمجھتا ہے جو کسی سے متفق نہیں ہیں۔ ایسے شخص کا علم اور بصیرت رکھنے والوں سے کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ ایسا شخص لوگوں کی بات بھی غور سے نہیں سنتا کہ میں اپنی رائے اور عقل میں مکمل ہوں اور مجھے کسی کی ہدایت کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ تمام اہل علم مجھ سے کمتر ہیں اور مجھ سے کم اور ذلیل ہیں۔ اس (تکبر، راستبازی اور خود پرستی) کا علاج خدا کا شکر ادا کرنا ہے کہ اس نے ایک عقل اور فہم عطا فرمایا۔ یہ بھی سوچنا چاہیے کہ اگر کوئی ذہنی بیماری میں مبتلا ہو جائے تو کیا وہ ذہین اور سمجھدار شخص ہونے کا دعوٰی کر

سکے گا؟ یہ ممکن ہے کہ کوئی ایسی بیماری میں مبتلا ہو جائے جس کی وجہ سے وہ تمام شعور اور شعور سے غافل ہو جائے اور [اس کے نتیجے میں] وہ [بچگانہ طور پر] سڑکوں پر گھومتا رہے، اور چھوٹے بچے کسی کے اعمال کو دیکھیں گے اور انہیں تفریح سمجھیں گے اور ان پر ہنسیں گے۔ یہ ممکن ہے کہ کسی کی عقل پر خود پرستی اور تکبر رکھنے اور عقل دینے والے کا شکر ادا نہ کرنے سے اس کی عقل چھین لی جائے۔ ایک مومن کو چاہیے کہ وہ اپنے علم اور عقل کو کم سمجھے، اگرچہ وہ ادراک، ذہین اور تعلیم یافتہ ہو، جس کے پاس معلومات کا ایک وسیع دائرہ ہو۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان علم کی کثرت اور معلومات کی وسعت کے باوجود جاہل رہتا ہے اور یہ کہ دوسری معلومات [جو وہ جانتا ہے] وہ چیز ہے جو دوسرے جانتے ہیں۔ جب دوسرے انسانوں کے مقابلے میں کسی کے علم کی ایسی حالت ہے تو خدا کے مقابلے میں اس کی علم کی کیفیت کیا ہو گی جس کے علم میں وہ وسعت ہے جو بے شمار سمندروں سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ کسی کی عقل کو ناقص سمجھنا [اور کسی کے علم کو بہت کم سمجھنا] ہی حکمت ہے۔ دیکھنا

ان احمقوں پر جو کسی اور کو ان سے زیادہ ذہین نہیں سمجھتے ، حالانکہ دوسرے ان کی حماقت پر ہنستے ہیں۔ خود کو راستبازی اور خود کی تعریف کرکے احمقوں کی فہرست میں اضافہ نہ کریں۔ ذہنی طور پر کمزور شخص اپنی عقل کی کمی اور اپنی حماقت سے واقف نہیں ہوتا، وہ سمجھتا ہے کہ وہ ذہین ہے۔ بہتر یہ ہے کہ کسی کی عقل کا معروضی طور پر جائزہ لیا جائے، کسی اور کی رائے پر بھروسہ نہ کیا جائے، خاص طور پر اپنے دوستوں پر جو گلابی تصویر پینٹ کرتے ہیں اور ان کی جھوٹی تعریف سے کسی کی صداقت اور خود تعریف میں اضافہ کرتے ہیں۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ ہاشمی نسب کے بعض لوگوں کی طرح اپنے نسب پر خود کی صداقت اور خود پرستی ہو (بنو ہاشم وہ قبیلہ ہے جس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق تھا)۔ ان میں سے بہت سے لوگ یہ خود فریبی کا خیال رکھتے ہیں کہ ان کے نسب کی عظمت ان کی نجات کی ضامن ہے ، اور ان کو ان کے آباؤ اجداد کی وجہ سے معاف کیا جائے گا [جو تقویٰ اور اخلاقی فضیلت کے نمونے تھے]۔ اشرافیہ کے کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تمام لوگ ان کے خادم اور غلام ہیں۔ اس کا علاج یہ سوچنا ہے کہ میں نے اپنے آباؤ اجداد کی مخالفت کی اور حماقت کی وجہ سے یہ سوچنے لگا کہ میں ان کے برابر ہو گیا ہوں، حالانکہ یہ میری غلطی ہے۔ میں ان کے نقش قدم پر چل کر ان کی طرح بن سکتا ہوں، لیکن میں ان کی پیروی نہیں کرتا۔ کیا انہوں نے خود راستبازی پر عمل کیا؟ ان کے پاس خود راستبازی کہاں تھی؟ اس کے بجائے ، وہ مکمل عاجزی کے مجسمے تھے۔ خدا کا خوف ان کی رگوں میں اور ان کے وجود کے ریشے میں سرایت کر گیا تھا۔ وہ پست ترین چیزوں کو اپنے سے برتر سمجھتے تھے۔ ان کی اپنی ذات (*نفس*) ان کی نظر میں ذلیل اور ذلیل تھی حالانکہ وہ اپنے نسب کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کے علم، اطاعت الٰہی اور عاجزی اور ان جیسی دیگر خوبصورت صفات کی وجہ سے تھے۔ ان کی طرح بننے کے لیے ضروری ہے کہ کوئی ان کی پیروی کرے اور ان کی اچھی عادات کو اپنائے۔ خدا انسانی نسب اور شجرہ نسب کے بارے میں مندرجہ ذیل کہتا ہے:

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ إِنَّا خَلَقۡنَـٰكُم مِّن ذَكَرٖ وَأُنثَىٰ

"اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت (یعنی آدم اور حوا سے پیدا کیا ہے) اس لیے انسانیت کا نسب شروع سے لے کر آخر تک ایک ہی نسب ہے۔ (سورة البقرة باب ۴۹، آیت ۱۳)

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے شجرہ نسب (نسل، نسل، رنگ، شجرہ، قبیلہ، فرقہ جات اور قوموں) کے لحاظ سے آپ کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے [کیونکہ آپ سب خدا کی نظر میں برابر ہیں اور نسل، رنگ، علاقے، ثقافت، قومیت اور

اس طرح کی دیگر صفات کی بنیاد پر کسی پر برتری حاصل نہیں ہے)۔ تم میں سے ہر ایک ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا ہوا ہے۔ اس آیت کے بعد اللہ تعالیٰ نسب کے فوائد (حکمت) کی وضاحت فرماتا ہے:

وَجَعَلْنَٰكُمْ شُعُوبًا وَقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوٓا۟ ۚ

"اور اس نے تمہیں مختلف قوموں اور قبیلوں میں بنا دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو اور پہچانو۔" (سورة البقرة باب ۴۹، آیت ۱۳)

[نسلی، نسلی، رنگ، علاقائی، قبائلی اور قوم پرستانہ اختلافات کے پیچھے الہی حکمت یہ ہے کہ ایک دوسرے کو جاننا، ان کی قدردانی کرنا، ان کا احترام کرنا اور ایک دوسرے سے محبت کرنا اور انصاف اور مساوات کی بنیاد پر ایک دوسرے کے ساتھ خوشگوار اور ہم آہنگی کا رشتہ قائم کرنا]۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ امتیاز اور عزت کی بنیاد پرہیزگاری، تعظیم اور خدا سے ڈرنے پر ہے نہ کہ نسب پر:

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ ٱللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ ۚ

"اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو اللہ سے زیادہ خوف و تنگی اور ڈرنے والا ہے (اور اللہ اس کا فیصلہ کرتا ہے، تم نہیں ہو۔" (سورة البقرة باب ۴۹، آیت ۱۳)

پانچواں سبب: یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو ظالم حکمرانوں کے مددگاروں اور حامیوں سے منسوب کر کے اپنی صداقت اور خود پرستی حاصل کرتا ہے اور ایمان اور علم کے اہل سے اپنی وابستگی کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ اس کا علاج یہ ہے کہ ظالم حکمرانوں اور ان کے ساتھیوں کی ذلت آمیز حرکتوں پر ایک نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ وہ خدا کے بندوں پر کس طرح ظلم و ستم کرتے ہیں اور دیکھیں کہ وہ خدا کی راہ میں کس قدر شرمناک فساد کا بیج بوتے ہیں۔ یہ لوگ خدا کے غضب کی زد میں ہیں۔ اگر کوئی ان کے چہروں کو جہنم میں دیکھ سکتا ہے جو گندگی سے بھرے ہوئے ہیں اور ان سے بدبو کی لہریں نکل رہی ہیں تو وہ اس قدر نفرت اور بغض پیدا کرے گا کہ وہ ان کے نام بھی نہیں لیں گے بلکہ اپنے آپ کو ان کے ساتھ تمام روابط سے بری الذمہ قرار دے گا اور جو ان سے تعلق رکھتا ہے اس کو ملامت کرے گا۔ اگر ان پر یہ بات ظاہر ہو جائے تو قیامت کے دن یہ ظالم لوگ کتنی ذلت برداشت کر رہے ہیں، فرشتے ان کے بالوں کو کھینچ کر جہنم میں گھسیٹ رہے ہیں، کوئی اپنے آپ کو کتوں اور سے منسوب کرنا پسند کرے گا لیکن یہ نہیں چاہے گا کہ کوئی ان انسانوں سے منسوب کرے جن کے اندر برے اور مکار ہیں۔ ظالم لوگوں کی اولاد کا حق اگر اللہ تعالیٰ انہیں ظلم سے بچاتا ہے تو وہ اللہ کا شکر ادا کریں کہ وہ خدا کی راہ کی حفاظت پر اللہ تعالیٰ کریں اور اللہ سے اپنے آباؤ اجداد سے اس شرط پر معافی مانگیں کہ وہ ایمان دار ہوں۔

چھٹا سبب: یہ ہے کہ کوئی شخص اولادوں، نوکروں، رشتہ داروں، دوستوں، مددگاروں اور پیروکاروں کی کثرت پر خود راستی اور خود اعتمادی کا اظہار کرے جیسا کہ مکہ کے کافر کرتے تھے۔ اس کا علاج وہی ہے جیسا کہ تکبر کے سلسلے میں بیان کیا گیا ہے کہ انسان کو اپنی اور ان لوگوں کی کمزوری پر غور کرنا چاہیے جن کی کثرت سے فخر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی سوچنا چاہیے کہ ہر شخص ایک محتاج اور غیر اہم انسان ہے جو نہ تو اپنے نفع کا مالک ہے اور نہ ہی کسی کے نقصان کا مالک ہے۔ اس کے اوپری حصے میں ، ان لوگوں کی وجہ سے خود راستبازی اور خود پرستی کا اظہار کرنے کا کیا فائدہ ہے جو موت کے ساتھ [ایک سے] الگ ہوجائیں گے؟ ایک

شخص اکیلے اپنی قبر پر جائے گا۔ نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ غم میں شریک کوئی ہمدرد واقف شخص نہیں ہوگا ، کوئی باپ نہیں ہوگا ، کوئی اولاد نہیں ہوگی ، کسی کے اپنے لوگ کسی کو اپنے ہاتھوں سے قبر میں ڈال دیں گے اور کسی کو کیڑے مکوڑوں ، سانپوں اور بچھوؤں کے حوالے کریں گے۔ یہ وہ وقت ہوگا جب ان سب کی ضرورت پڑے گی لیکن وہ کچھ کام نہیں آئیں گے۔ اسی طرح قیامت کے دن آنکھیں پھیر لیں گے بلکہ وہ بھاگ جائیں گے قرآن مجید نے اس دن کے مناظر کو اس طرح پیش کیا ہے:

يَوْمَ يَفِرُّ ٱلْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ ﴿٣٤﴾

وَأُمِّهِۦ وَأَبِيهِ ﴿٣٥﴾ وَصَٰحِبَتِهِۦ وَبَنِيهِ ﴿٣٦﴾

"اس دن انسان اپنے بھائی، ماں، باپ، بیوی اور اولاد سے بھاگ جائے گا۔" (سورۃ البقرۃ آیت 80، آیت 34-36)

ان لوگوں کی موجودگی پر فخر کرنے یا ان کی موجودگی پر فخر کرنے کا کیا فائدہ ہے جو ان کی ضرورت کے وقت کوئی فائدہ نہیں رکھتے اور [جب سب سے زیادہ ضرورت ہو] اس سے پرہیز کریں گے؟ قبر میں، قیامت کے دن اور *پل سیرت* پر (جس کے دوسرے سرے پر جہنم پر ایک تنگ پل ہے جس کے دوسرے سرے پر جنت ہے جو بالوں سے پتلا اور تلوار سے تیز ہے اور ہر شخص کو قیامت کے دن اس پل سے گزرنا پڑے گا جیسا کہ نبوی کی تعلیمات میں بیان کیا گیا ہے) انسان کو صرف اس کے اعمال اور اللہ کے فضل سے فائدہ ہوگا۔ جن کے پاس نہ اپنے نفع اور نقصان کا اختیار ہے اور نہ ہی اپنی زندگی اور موت پر کوئی اختیار ہے، وہ کسی اور کو کیا فائدہ دے سکتے ہیں؟

ساتواں سبب: یہ ہے کہ انسان اپنے مال اور مادی اثاثوں پر خود راستبازی اور خود کی تعریف کرتا ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ دولت اور مادی املاک کے نقصانات اور غریبوں کی فضیلت اور جنت میں داخل ہونے میں ان کی ترجیح پر ایک نظر ڈالیں۔ مزید برآں، یہ دیکھنا چاہیے کہ دولت ایک ایسی چیز ہے جو آتی جاتی ہے، اس کی کوئی مستقل حیثیت نہیں ہے۔ نیز ، دولت کوئی ایسی خصوصیت نہیں ہے جو مومنوں کے لئے مخصوص ہے کیونکہ بہت سے کافروں کے پاس زیادہ دولت ہے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک مسجد میں داخل ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: اے ابوذر! اپنا سر اٹھا لو!" جب اس نے ایسا کیا تو اس نے ایک بہت ہی اچھے کپڑے پہنے ہوئے آدمی کو دیکھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے دوبارہ سر اٹھایا اور اس کی نظر ایک ایسے شخص پر پڑی جس کے کپڑے بہت پرانے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

هٰذَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِنْ قِرَابِ الْأَرْضِ

"یہ شخص اللہ کے نزدیک تمام زمین سے بہتر ہے۔" (بیان کردہ *احادیث* کا مجموعہ *ابن حبان فی صحیح* ابو ذر رضی اللہ عنہ سے

یہ اور اسی طرح کی دیگر تمام روایات جو پچھلی کتابوں (ابواب میں) دنیاداری سے پرہیز، دنیاداری کے نقصانات اور دولت کے نقصانات کے بارے میں مذکور ہیں، امیر کے پست مقام اور غریب کی عزت کا واضح ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ ان روایات کو مدنظر رکھتے ہوئے کسی مسلمان سے یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنے مال پر خود راستبازی اور خود پرستی کرے۔ اس کے بجائے اگر کسی مومن کے پاس مال و دولت ہو تو ایسے شخص کو یہ خوف ہونا

چاہیے کہ وہ مال کے حقوق اور ذمہ داریوں کو پورا نہ کر سکے گا۔ جس کے پاس اس قسم کی صداقت اور خود پرستی ہے، اس کا مال اپنے لیے ذلت کے سوا کچھ نہیں ہے۔

آٹھواں سبب: یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی غلط رائے پر خود راستبازی اور خود کی تعریف کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا

"یہ لوگ اس سوچ میں ہیں (غلط قیاس) کہ وہ اچھے کام کر رہے ہیں [اگرچہ وہ نہیں ہیں]۔" (سورۃ البقرۃ آیت 18، آیت 104)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رائے کی صداقت اور خود پرستی کے بارے میں فرمایا: "اس قوم کے لیے آخرت کی طرف (قیامت سے پہلے دنیا کے آخری مرحلے) لوگوں کا اپنی رائے پر صداقت اور خود پرستی کا رجحان غالب ہو جائے گا۔ پچھلی قومیں اس رجحان کی وجہ سے تباہ ہو گئیں کہ وہ فرقہ وارانہ گروہوں میں شامل ہو گئے، ہر امت کئی فرقوں میں بٹ گئی، ہر فرقہ اپنے عقائد کو درست سمجھتا تھا۔ (یہ روایت ایک روایت کی طرف اشارہ کر رہی ہے ابو ثعلبہ رضی اللہ عنہ سے ابو *داؤد* اور *ترمذی کے بارے میں* احادیث *کا* مجموعہ ہے

بدعت *اور گمراہی کے تمام لوگ* ان (دو) چیزوں پر اصرار کرتے ہیں کیونکہ ان کی رائے پر صداقت اور خود پرستی ہے [اور یہ تکبر فرقہ وارانہ تفرقہ کا باعث بنا]۔ *بدعت (بدعۃ) کے بارے میں* صداقت اور نفس کی تعریف کا مفہوم یہ ہے کہ انسان اس عمل کو بہتر سمجھتا ہے، جو اس کی خواہش سے پیدا ہوا ہے اور اپنی فکر میں اسے صحیح سمجھتا ہے۔ اس قسم کی صداقت کا علاج بہت مشکل ہے کیونکہ غلط رائے رکھنے والا شخص اپنی غلطیوں سے واقف نہیں ہو سکتا اور اس بیماری کا علاج نہیں ہو سکتا جس سے وہ واقف نہ ہو۔ جہالت ایک ایسی بیماری ہے جسے سمجھا نہیں گیا۔ تاہم ، ایک گنوسٹک (خدا کا جاننے والا) کسی جاہل کو اپنی غلطی سے آگاہ کرسکتا ہے اور اس بیماری کو دور کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہے ، لیکن اگر وہ جاہل کسی کی جہالت پر فخر کرتا ہے تو پھر وہ گنوسٹک کیا کرسکتا ہے؟ جو شخص گنوسٹک پر بھی توجہ نہیں دیتا، جس کی بات سن سکتی ہے اور اپنی بیماری کو ختم کر سکتی ہے، وہ بالکل برعکس جاتا ہے اور گنوسٹک کو مورد الزام ٹھہراتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کسی پر ایک مصیبت مسلط کی ہے [کہ وہ اپنی غلط رائے پر فخر کرتا ہے اور] یہ تباہ کن ہے، لیکن وہ اسے نعمت سمجھ کر خوش ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی بیماری کا علاج بھی ممکن نہیں ہے۔ کسی ایسی چیز سے کیسے نفرت کر سکتا ہے جسے وہ اپنے لیے امتیاز کا ذریعہ سمجھتا ہے؟ اس کا اعلیٰ سطحی علاج یہ ہے کہ کسی کی رائے کو ہمیشہ مشکوک سمجھا جائے ، دوسرے لفظوں میں ، یہ سوچیں کہ کسی کی رائے غلط ہوسکتی ہے اور کسی کی رائے کی صداقت پر انحصار نہیں کرتی۔

جو شخص اپنی زندگی کا ہر لمحہ تعلیم اور تعلیم کے لیے وقف نہیں کر سکتا، اسے دینی سوالات میں الجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ انسان کو صرف اللہ کی وحدانیت پر ایمان رکھنا چاہیے اور یہ کہ اس کا کوئی شریک نہیں ہے، اس جیسا کوئی نہیں ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم سچے طور پر اس کے نبی ہیں اور جو کچھ وہ لے کر آئے ہیں وہ حق ہے۔ اس کے علاوہ انسان کو چاہیے کہ وہ پیشوں متقی پیشروؤں کے طریقے پر عمل کریں، قرآن مجید اور نبوت

کے احکام کو بغیر کسی بحث و دلائل کے قبول کریں، اور بغیر کسی سوال کے خدا سے خوف و ہراس اور خوف اختیار کریں، گناہوں سے دور رہیں۔ اور نیک اعمال کرتے رہو اگر کوئی شخص اپنے علم کی کمی کے باوجود دینی مباحثوں میں ملوث ہو اور اپنے آپ کو عقائد کے تعصب اور بدعت (بدعت یا دینی معاملات میں نئی چیزیں جو قائم اصولوں کی خلاف ورزی کرتی ہیں) اور گمراہی (*دلالہ*) سے محفوظ نہ رہے، تو وہ غیر محسوس طور پر تباہ ہو جائے گا (روحانی طور پر بولنے کے ساتھ ساتھ اس کے مادی وجود پر بھی گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں)۔ مکمل طور پر علم کے لیے وقف لوگوں کی ذمہ داریاں کم نہیں ہیں۔ سب سے پہلے، انہیں دلائل اور شرائط سے واقفیت حاصل کرنی چاہیے۔ اس واقفیت کو حاصل کرنے کا مرحلہ اتنا مفصل ہے کہ بعض اوقات سچائی کو جاننا مشکل ہوجاتا ہے [کیونکہ سچائی کی راہ میں ایسی لطافتیں ہیں جن کو سمجھنے میں زندگی بھر کی مسلسل کوششیں درکار ہوتی ہیں]۔ اس بے پناہ سمندر کے کناروں پر صرف وہی لوگ پہنچتے ہیں جو علم میں مضبوطی سے پیوست ہیں اور جن کے پاس علم کی روشنی ہے [جو ان کے اندر کی روحوں کو روشن کرتی ہے اور اندر کے تمام تاریکیوں کو دور کرتی ہے]۔ اس طرح کے لوگ بہت کم ہیں۔ اکثر لوگوں نے علماء کی ظاہری شکل اختیار کی ہے لیکن ان کے باطن میں جہالت کا راج ہے۔

تکبر اور غفلت کی مذمت

ہوشیار اور ہوشیار رہنا انسان کے لیے ابدی خوشی اور لامتناہی کامیابی کا سبب ہے اور غرور اور غفلت (زندگی کے حقیقی مقصد سے غفلت اور برائی کے حملے سے جو بالآخر باطن کو مکمل تاریکی میں غرق کر دیتی ہے) میں غرق ہونا ابدی غم اور عذاب کا سبب ہے۔ خدا کے غلام کے لیے ایمان اور معرفت سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں اور اس نعمت کے حصول کا ذریعہ دل کی توسیع ہے (جو باطنی روشنی کے ذریعے ہوتا ہے جو باطنی ذرا پاک کرنے کے لیے روحانی جدوجہد کا نتیجہ ہوتا ہے)۔ اس کے برعکس کفر اور زیادتی سے بدتر کوئی چیز نہیں اور یہ برائی صرف ان لوگوں کا مقدر بن جاتی ہے جو جہالت کی تاریکی اور دل کی تاریکی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ بصیرت رکھنے والوں کے دلوں کی مثال اس طرح ہے:

۞ ٱللَّهُ نُورُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ ۚ مَثَلُ نُورِهِۦ كَمِشْكَوٰةٍ فِيهَا مِصْبَاحٌ ۖ ٱلْمِصْبَاحُ فِى زُجَاجَةٍ ۖ ٱلزُّجَاجَةُ كَأَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّىٌّ يُوقَدُ مِن شَجَرَةٍ مُّبَٰرَكَةٍ زَيْتُونَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَلَا غَرْبِيَّةٍ يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِىٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ۚ نُّورٌ عَلَىٰ نُورٍ ۗ يَهْدِى ٱللَّهُ لِنُورِهِۦ مَن يَشَآءُ ۚ وَيَضْرِبُ ٱللَّهُ ٱلْأَمْثَٰلَ لِلنَّاسِ ۗ وَٱللَّهُ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيمٌ ﴿٣٥﴾

"اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔" اس کے نور کی مثال ایک طاق کی مانند ہے جس کے اندر چراغ ہے، چراغ شیشے کے اندر ہے، شیشہ گویا ایک موتی [سفید] ستارہ ہے جو زیتون کے بابرکت درخت کے تیل سے روشن ہوا ہے،

نہ مشرق کا اور نہ مغرب کا، جس کا تیل آگ سے چھوئے بغیر ہی تقریبا چمکتا ہے۔ روشنی پر روشنی۔ اللہ جسے چاہتا ہے اپنے نور کی طرف ہدایت دیتا ہے۔ اور اللہ لوگوں کے لیے مثالیں بیان کرتا ہے اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔" (سورۃ البقرۃ باب ۲۴، آیت ۳۵)

غافل لوگوں کے دلوں کی کیفیت اس آیت میں واضح ہوتی ہے:

أَوْ كَظُلُمَٰتٍ فِي بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَغْشَىٰهُ مَوْجٌ مِّن فَوْقِهِۦ مَوْجٌ مِّن فَوْقِهِۦ سَحَابٌ ۚ ظُلُمَٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ إِذَآ أَخْرَجَ يَدَهُۥ لَمْ يَكَدْ يَرَىٰهَا ۗ وَمَن لَّمْ يَجْعَلِ ٱللَّهُ لَهُۥ نُورًا فَمَا لَهُۥ مِن نُّورٍ ﴿٤٠﴾

"یا وہ ایک ناقابل فہم سمندر کے اندر اندھیرے کی مانند ہیں جس پر لہروں نے ڈھکی ہوئی ہے، جس پر لہریں ہیں، جن کے اوپر اندھیرے کے بادل ہیں، اور بعض پر اندھیرے کے بادل ہیں۔ جب کوئی ہاتھ نکالتا ہے تو اسے مشکل سے دیکھ سکتا ہے۔ اور جس کو اللہ تعالیٰ نے نور نہ دیا وہ اس کے لیے نور نہیں ہے۔ (سورۃ البقرۃ باب 24، آیت 40)

بصیرت رکھنے والے وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے اور ان کے دلوں کے دروازے اپنے سامنے جھکنے کے لیے کھول دیتا ہے۔ غفلت کے لوگ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ گمراہ کرنا چاہتا ہے اور ان کے دلوں کو حق اور ہدایت کے لیے سچائی اور ہدایت کے لیے تنگ کرنا چاہتا ہے۔ یہ وہ بدبخت لوگ ہیں جن کے لیے بصیرت کا دروازہ نہیں کھلتا، بلکہ وہ اپنی خواہشات کو نچلے نفس اور شیطانی تفکرات اور افکار کو اپنا رہنما اور رہنما سمجھتے ہیں۔

تکبر اور غفلت کی مذمت کیوں ضروری ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ تکبر اور غفلت تمام ابدی دکھوں اور لبوں کی ابتدا ہے اور تمام تباہی کا سرچشمہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان راستوں کی وضاحت ضروری ہے جو غرور کے لیے داخل ہونے کا موقع فراہم کرتی ہیں اور ان حالات کی تفصیل بیان کرنا ضروری ہے جہاں تکبر بہت زیادہ ہے، تاکہ طالب (علم الٰہی کی طرف جانے والی حق کی راہ پر) ان راستوں کو تلاش کر سکے، تاکہ وہ نفس کو ان پر چلنے سے روک سکے۔ ہم لوگوں کے ہر گروہ کی غفلت پر روشنی ڈالیں گے۔ اگرچہ یہ اقسام بہت سی ہیں لیکن ہم ان کا مثال کے طور پر ذکر کریں گے تاکہ ہم ان جیسی دوسری اقسام کے بارے میں انتباہات حاصل کر سکیں۔ بہت سے گروہ ایسے ہیں جو تکبر اور غفلت میں مشغول ہیں۔ تاہم چار گروہ تمام گروہوں کے نمائندے ہیں۔ وہ عالم ہیں، دنیاداری سے پرہیز کرنے والے، روحانی مسافر اور اشرافیہ (دولتمند، طاقتور اور بااثر)۔

غلطیوں اور فریب سے بچنا ممکن ہے: شجاع لوگ راہ کی ہر مشکل کو عبور کرتے ہیں اور اگر کسی کی نیت صحیح ہو تو وہ راستے کی پوشیدہ رکاوٹوں کا پتہ لگاتا ہے اور ان پر قابو پانے کے لیے حکمت عملی تلاش کرتا ہے۔ اگر کوئی انسان چاہے تو ، وہ کھلے آسمان میں اڑنے والے پرندے کو نیچے گرا سکتا ہے ، حالانکہ وہ میلوں کے فاصلے پر ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی سمندر کی گہرائی سے مچھلی نکالنا چاہتا ہے تو وہ ایسا کر سکتا ہے، وہ سونا، چاندی اور دیگر قیمتی دھاتیں نکالنے کے لیے پہاڑ کھود سکتا ہے، جنگل سے جنگلی درندوں کو پنجرے میں باندھ

سکتا ہے، شیروں، ہاتھیوں اور دیگر خونخوار درندوں پر قابو پا سکتا ہے، سانپوں اور اژدھوں پر قابو پا سکتا ہے اور ان کے منہ سے زہر نکال سکتا ہے۔ شہتوت کے درخت کے پتوں سے ریشم بنایا جا سکتا ہے، زمین پر کھڑے ہو کر عددی علم کے ذریعے ستاروں کی تعداد اور ان کی لمبائی اور چوڑائی معلوم کی جا سکتی ہے۔ انسان حکمت عملیوں کا ذخیرہ ہے۔ ایسی کوئی مشکل نہیں ہے جسے انسانی حکمت عملی سے حل نہ کیا جا سکے اور دنیا میں کوئی ایسی تخلیق نہیں ہے جو انسان حکمت عملی کے تابع نہ ہو اور اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال نہ کر سکے۔ انسان گھوڑے کو سواری کے لیے استعمال کرتا ہے، کتے کو شکار کے لیے، باز کو پرندوں کے شکار کے لیے، مچھلی پکڑنے کے لیے جال کا استعمال کرتا ہے اور اسی طرح اس طرح کی بے شمار حکمت عملی اس دنیا میں ہر لمحہ دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان تمام حکمت عملیوں کو اس لیے استعمال کیا جاتا ہے تاکہ اغراق و مقاصد کو پورا کیا جا سکے۔ جب انسان دنیاوی مقاصد کے حصول کے لیے مختلف طریقوں اور حکمت عملیوں کو استعمال کرتا ہے تو کیا کوئی دل کی اصلاح کے لیے بھی ایسا ہی نہیں کر سکتا؟ یہ صرف انسانی توہم پرستی ہے، کچھ بھی مشکل یا ناممکن نہیں ہے، صرف شرط ہمت ہے۔ روحانی جدوجہد کے کانٹے دار راستے پر قدم رکھ کر پیچھے نہیں ہٹنے والے بے شمار لوگ گزرے ہیں۔ انہوں نے دل کی اصلاح کو ناممکن یا ناقابل تصور نہیں سمجھا اور نہ ہی اس سے شکست کھائی۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں "پرہیزگار پیشرو" (*سلف الصالحین*) کہا جاتا تھا۔ اس کے بعد ان کے پیروکار اور شاگردوں نے سچے دل کے ساتھ ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اور وہ بھی کامیاب رہے۔ اب بھی وہ لوگ جو پختہ ارادے، پختہ ارادے اور مکمل حوصلے کے ساتھ، مایوس ہوئے بغیر اس کانٹے دار وادی کو عبور کرتے ہیں، وہ کامیاب ہوں گے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ لوگ اپنے دنیاوی کاموں کے لیے جتنی حکمت عملی اور منصوبہ بندی کرتے ہیں اور اس کے لیے وہ جتنی ہمت اور عزم کا مظاہرہ کرتے ہیں، وہ اس کا دسواں حصہ آخرت سے متعلق کاموں میں بھی استعمال نہیں کرتے۔

غلطیوں اور فریب سے بچنے کے لیے تین چیزیں ضروری ہیں: اگر انسان غلطیوں اور فریب سے بچنا چاہتا ہے تو لازمی طور پر اس کے پاس تین چیزیں ہونی چاہئیں: عقل، علم اور معرفت (*معارفہ* یا گہری بصیرت، بصیرت کی وضاحت، تمام شکوک و شبہات اور ابہام کو دور کرنا جو الٰہی قربت اور قربت کے ساتھ آتے ہیں)۔ عقل سے مراد اصل نور اور فطری قدیم انسانی فطرت ہے [جو گندگی اور کیچڑ میں ڈوبی ہوئی نہیں ہے، جو الٰہی طور پر اس کی اصل شکل میں تخلیق کی گئی تھی،] جس کے ذریعے انسان چیزوں کی حقیقت کو سمجھتا ہے۔ ذہانت اور تیزپن کا تعلق انسانی فطرت سے بھی ہے اور حماقت اور کثافت کا تعلق بھی اصل فطرت سے ہے۔ ایک گھنا شخص وہم سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ لہٰذا انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ فطرت کے لحاظ سے ذہین اور تیز ہو۔ اگر کوئی فرد ذہانت کی نوعیت پر نہیں ہے تو اس کا حصول ناممکن ہوگا سوائے اس کے کہ اصل عقل موجود ہو۔ اس صورت میں ، تجربے کے ساتھ عقل کو بڑھایا اور تیز کیا جاسکتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابدی خوشی اور لامتناہی کامیابی کی تمام حالتوں کی بنیاد عقل اور عقل پر ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

تَبَارَکَ اللّٰہُ الَّذِیْ قَسَّمَ الْعَقْلَ بَیْنَ عِبَادِہٖ اَشْتَاتًا اَنَّ الرَّجُلَیْنِ یَسْتَوِیْ عَمَلُهُمَا وَبِرُّهُمَا وَصَوْمُهُمَا وَصَلَاتُهُمَا وَلٰكِنَّهُمَا يَتَفَاوَتَانِ فِى الْعَقْلِ كَالذَّرَّةِ فِىْ جَنْبِ اُحُدٍ وَمَا قَسَّمَ اللّٰهُ لِخَلْقِهٖ حَظًّا هُوَ اَفْضَلُ مِنَ الْعَقْلِ وَالْيَقِيْنِ

"مبارک ہے خدا کی ہستی جس نے اپنے بندوں میں مختلف انداز میں عقل تقسیم کی۔ دو افراد اپنے اعمال میں برابر ہیں، ان کے نیک اعمال، روزے، نماز سب برابر ہیں، لیکن وہ عقل میں بہت مختلف ہیں جیسے کوہ احد کے پاس ایک ذرہ (یعنی ان کی عقل میں ایک دنیا کا فرق ہے جیسے ذرے کو ایک بڑے پہاڑ سے تشبیہ دینا)۔ اللہ تعالیٰ نے عقل اور یقین سے بڑھ کر کوئی نعمت پیدا نہیں کی۔ (اس حدیث کو طاوس نے روایت کیا ہے اور حکیم ترمذی نے اس حدیث میں نقل کیا ہے *نوادر الاصول*)

ذہانت، افہام و تفہیم، فطری عقل یہ سب خدا کی عظیم نعمتیں ہیں۔ اگر یہ نعمت [کسی کو] عطا نہ کی جائے اور اس کے بجائے اگر حماقت اور حماقت [انسان] کی فطری فطرت میں ڈال دی جائے تو اس میں کوئی کمی نہیں ہے۔ غلطیوں اور وہم سے بچنے کے لیے دوسری چیز گنوسس (*معارفہ*) ہے۔ گنوسس سے مراد چار معاملات کا علم ہے: نفس کو جاننا، خدا کو جاننا، دنیا کی حقیقت کو جاننا، اور آخرت کا جاننا۔ نفس کو جاننے کا مطلب یہ ہے کہ اپنی بندشی [خدا کے سامنے] اور اپنی موروثی نااہلی اور بے بسی کا اقرار کرنا [خدا کے حکم کے تحت چلنے والی چیزوں کی مجموعی اسکیم میں]۔ مزید یہ کہ یہ بھی جاننا چاہیے کہ میں اس دنیا میں [حضوری الٰہی میں ابدی زندگی کی آخری منزل کی طرف] مسافر ہوں اور یہ خواہشات [نچلی ذات سے] میرے مزاج سے کوئی مطابقت نہیں رکھتیں۔ میرے مزاج کے مطابق صرف خدا کی گنوسس اور الہی بصیرت ہے"۔ اس حقیقت کو اس وقت تک نہیں جان سکتا جب تک کہ ایک بندہ [خدا کا، یعنی انسان] اپنے نفس اور اپنے رب کے بارے میں گہری اندرونی تفہیم پیدا نہ کرلے۔ اس گنوسس کو کیسے حاصل کیا جائے؟ اس سلسلے میں ، آپ کو "روح کے اسرار" (باب 1) اور "الہی شکرگزاری" (باب 12) کے ابواب میں تفصیل سے زیر بحث موضوعات کا حوالہ دینا چاہئے۔ ان ابواب میں ہم نے نچلے نفس اور اس کی خصوصیات کی طرف اشارہ کیا ہے جو اس معاملے میں کافی رہنمائی فراہم کرتی ہیں۔ اس کے بعد گنوسس کا کمال کا مرحلہ آتا ہے۔ اس کا تعلق علم *مکاشفہ* کے علم سے ہے جو اس کتاب کا موضوع نہیں ہے (روحانی نقاب کشائی کا باطنی علم رومی اور ابن عربی جیسے دوسرے عظیم روحانی آقاؤں نے احاطہ کیا ہے۔ غزالی نے بنیادی طور پر عملی روحانیت پر توجہ مرکوز کی ہے جس پر عام لوگ کام کر سکتے ہیں جو انسان کو اندرونی روحانی تطہیر اور تبدیلی کی طرف لے جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں روحانی مسافر کی اندرونی جستجو کے خلوص اور خدائی سخاوت کی وجہ سے ابدی سچائیوں کی روحانی نقاب کشائی کی طرف لے جا سکتا ہے جو اسے ممکن بنانے کے لیے ناگزیر ہے)۔

دنیا اور آخرت کی حقیقت کو جاننے کے لیے "دنیاداری سے پرہیز" (باب 14) اور "اپنی موت پر غور کرنا" (باب 20) کے ابواب سے مدد لینا چاہیے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ دنیا کا آخرت سے کوئی موازنہ نہیں ہے۔ جب کوئی ان چاروں معاملات کی گہری تفہیم حاصل کرے گا تو ، فریب اور غلطیوں سے بچانے کے امکانات روشن ہوجائیں گے۔ الٰہی غنوسی الٰہی محبت کو (دل اور روح کے باطن میں) ہلکا اور متحرک کرے گی، یہ جانتے ہوئے کہ آخرت انسان کو اس (آخرت کی طرف مائل کرے گی) اور دنیا کو جاننے سے اس کی طرف نفرت پیدا ہوگی۔ کوئی اس عمل کو سب سے بڑا کام سمجھے گا جو انسان کو خدا کی طرف راغب کرتا ہے اور آخرت میں فائدہ مند ہے۔ جب یہ نیت دل پر حاوی ہو جائے گی تو ہر معاملے میں نیت درست ہوگی۔ انسانی ضروریات کا خیال رکھنے، کھانا کھانے، کپڑے پہننے وغیرہ کا مقصد ان سے آخرت کی طرف روحانی راستے پر گامزن ہونے میں مدد حاصل کرنا ہوگا۔ تمام وہم و فریب ارادے کی صحت کے ذریعے دور ہو جائیں گے، کیونکہ وہم اور غلطیاں اس بات سے پیدا ہوتی ہیں کہ وہ اپنے خفیہ مقاصد میں کشش تلاش کرتا ہے اور دولت، شہرت اور عزت کی طرف جھکاؤ رکھتا ہے جو نیت [اور عزم] کو کمزور کرتا ہے۔ جب تک کوئی شخص آخرت پر دنیا کو ترجیح نہیں دے گا اور اپنی خواہشات کو خدا کی رضا پر غالب نہیں لے گا، وہ اس فریب میں پھنسا رہے گا۔

روحانی راستے پر کیسے چلنا ہے؟ انسان اپنی عقل کے ذریعے نفس کے خالق نفس (نفس) اور خالق نفس (خدا) کا *علم و فہم حاصل* کرتا ہے۔ یہ تفہیم دل پر الہی محبت کا غلبہ پیدا کرتی ہے جو ایک تیسری چیز کی ضرورت کو جنم دیتی ہے جو روحانی راستے پر چلنے کا طریقہ جاننا ہے - وہ کون سے اعمال ہیں جو خدا کے قریب یا دور ہونے کا سبب بنتے ہیں؟ مزید یہ کہ آخرت کی راہ میں کون سی رکاوٹیں ہیں، کتنے مشکل مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، ان رکاوٹوں کو دور کرنے کا طریقہ کیا ہے، اور ان مشکل مراحل کو کیسے عبور کیا جائے؟ ان تمام سوالات کا جواب

[غزالی کی شاہکار کتاب" *"احیاء العلوم الدین*" یا "خدا کی راہ کی معرفت احیاء" میں ملتا ہے۔ عبادت الٰہی کی شرائط عبادت کے بارے میں ان ابواب میں پائی جاتی ہیں جو کتاب "خدا کی راہ کا احیاء" کی پہلی جلد یا چوتھائی میں ہیں جو اس تالیف میں شامل نہیں ہیں] اور ان پر عمل پیرا ہونا چاہیے اور ان پر عمل نہ کرنے کے نقصانات کا مطالعہ کرنا چاہیے اور ان سے پرہیز کرنا چاہیے۔ [معاشرتی اور عوامی] معاملات کے ابواب [جو کتاب "خدا کی راہ کا احیاء" کی دوسری جلد یا چوتھائی میں ہیں جو بھی اس تالیف میں شامل نہیں ہیں] میں [معاش کمانے اور] معاشیات سے متعلق قانونی معاملات کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ جو چیزیں ضروری ہیں، انہیں شریعت الٰہی کی روشنی میں حاصل کرنا چاہیے اور جو چیزیں غیر ضروری ہیں، ان سے پرہیز کرنا چاہیے جو شریعت الٰہی میں بیان کردہ طریقے کے مطابق ہے۔ اندرونی تخریبی صفات کے ابواب [جو کتاب "خدا کی راہ کی احیاء" کی تیسری جلد یا چوتھائی میں ہیں جو حصہ دوم میں اس تالیف میں اختصار کے ساتھ شامل ہیں] میں ، کسی کو ان تمام رکاوٹوں کا علم حاصل کرنا چاہئے جو خدا کی راہ پر چلنے سے روکتی ہیں۔ حضوری الٰہی تک پہنچنے کی رکاوٹیں قابل مذمت (منفی، بری اور تباہ کن) باطنی خصلتیں، صفات، مزاج، میلانات اور مزاج ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو پہچاننا چاہیے اور ان کے علاج کے بارے میں جاننا چاہیے [جو اس تالیف میں اختصار کے ساتھ مرتب کیے گئے ہیں لیکن غزالی کی اصل کتاب میں ان کی مکمل شکل میں پایا جا سکتا ہے]۔ داخلی تعمیری اور لچکدار صفات کے ابواب سے [جو کتاب "خدا کی راہ کے علم کا احیاء" کی چوتھی جلد یا چوتھائی میں ہیں جو حصہ سوم میں اس تالیف میں اختصار کے ساتھ شامل ہیں]، کسی کو مثبت داخلی قابل تعریف خصلتوں، صفات، مزاج، میلانوں اور مزاج کا علم سیکھنا چاہیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب ایک قابل مذمت صفت دل سے مٹا دی جاتی ہے تو اس کی جگہ ایک اچھی قابل تعریف داخلی خوبی کے ساتھ تبدیل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ جب کوئی ان تمام باتوں کو جانتا ہے تو یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہر قسم کی غلطیوں اور فریب سے بچانے کے قابل ہو جائے گا جن کا ہم نے [کتاب "خدا کی راہ کی بحالی" میں ذکر کیا ہے۔ یہاں اس بات کی حقیقت یہ ہے کہ خدا کی محبت روحانی مسافر صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر حاوی ہو اور دنیا کی طرف ذرا بھی جھکاؤ نہ ہو، اس کی مرضی مضبوط ہونی چاہیے جس کے نتیجے میں لچک پیدا ہوتی ہے۔ مثبتیت ، امید پرستی ، اندرونی امن ، ابدی خوشی ، اور لازوال کامیابی ، ارادہ صحت مند (پختہ) ہونا چاہئے اور یہ اس وقت ہوگا جب کوئی جانتا ہے کہ ہم نے کیا لکھا ہے [یہاں]۔

حصہ 3: اندرونی تعمیری اور لچکدار خصلتیں - مثبت داخلی خصوصیات جو لچک، مثبتیت، امید پرستی، اندرونی سکون، خوشی، ابدی مسکن، اور لامتناہی کامیابی کو ابدی انفرادی اور اجتماعی انسانی کامیابی کا آغاز کرتی ہیں

بے پناہ اچھائی کا ایک ذریعہ مثبت اندرونی خصوصیات ، مزاج اور رجحانات کا ہونا ہے جو بدلے میں زندگی کے بارے میں مثبت نقطہ نظر پیدا کرتے ہیں اور زندگی میں مثبت ، تعمیری اور فائدہ مند کام کرنے کے لئے مثبت توانائی کا اخراج کرتے ہیں۔ پچھلے آٹھ ابواب میں منفی اندرونی خصلتوں پر گہرائی سے نظر ڈالنے کے بعد، ان سے چھٹکارا پانے کے نقطہ نظر سے، اب وقت آگیا ہے کہ مثبت داخلی خصوصیات پر نظر ڈالی جائے جو ایک فرد اور پوری قوموں کو بدل دیتی ہیں۔ وہ خوبیاں جن کو غزالی نے ابتدائی وضاحت میں "ابدی خوشی کی کیمیا" یا کسی کی زندگی کو بہتر بنانے اور اسے نیکی کے مظہر میں تبدیل کرنے کے لیے تبدیلی کا ایجنٹ قرار دیا ہے۔ غزالی کی کتاب "*احیاء العلوم الدین*" یا "خدا کی راہ کی احیاء" کی چوتھی اور آخری جلد میں دس ابواب یا کتابیں ان مثبت داخلی خصوصیات کی وضاحت کرتی ہیں جو انفرادی اور اجتماعی حیات نو اور تبدیلی کے لیے درکار ہیں۔ یہ انتہائی سبق آموز دس ابواب مندرجہ ذیل طور پر مختصر شکل میں پیش کیے گئے ہیں۔

باب گیارہویں - اپنی غلطیوں اور زیادتیوں کا ادراک کرنا اور توبہ مانگنا، معافی مانگنا اور مرتکب گناہوں کی اصلاح کرنا۔

غزالی کی پہلی کتاب *" احیئ العلوم الدین" یا "راہ خدا کی راہ کا احیاء" کی چوتھی جلد یا چوتھائی میں* ہے جس میں انسان کی اپنی غلطیوں، کوتاہیوں اور زیادتیوں کا ادراک کرنے اور ان کے ساتھ ہونے والی اپنی غلطیوں کی تلافی کرنے اور ان کے خلاف کی جانے والی غلطیوں کی تلافی کرنے اور سب سے پہلے اور سب سے اہم بات ہے۔ اپنے نفس کے خلاف۔ دوسروں کے خلاف کی جانے والی غلطیاں کسی کے اپنے دل اور روح کو نقصان پہنچاتی ہیں کیونکہ وہ کسی کو کسی بھی روحانیت سے محروم کر دیتے ہیں اور اپنے نفس پر بھاری بوجھ ڈالتے ہیں۔ اپنے آپ اور دوسروں کے خلاف غلطیوں میں ثابت قدمی انسان کو ان کے لئے بے حس اور عادی بنا دیتی ہے ، جس سے کسی کی اپنی حتمی تباہی اور اندرونی شعور کی موت کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ وہ اندر کی گہرائی میں بھاری وزن رکھتے ہیں ، کسی کو اندرونی سکون اور سکون سے محروم کرتے ہیں۔ ہم جس کائنات میں ہیں ، اس کی وجہ و معلول کی نشاندہی کی گئی ہے اور ہر عمل کے نتائج پیدا ہوتے ہیں ، سازگار یا ناموافق ، جو ہمارے اعمال کی مثبتیت اور منفی کی وسعت کے مطابق ہوتے ہیں۔ لہٰذا اپنی غلطیوں کا ادراک کرنا اور اس سے اپنے آپ پر اور دوسروں پر کس طرح اثر پڑتا ہے، جذباتی، نفسیاتی، ذہنی اور روحانی ہر سطح پر اپنی فلاح و بہبود کے لیے ضروری ہے۔ غزالی نے اپنی اصلاح کی طرف اس پہلے قدم پر گہرائی سے نظر ڈالی ہے جو یہاں مختصر شکل میں اس طرح پیش کیا گیا ہے:

گناہوں سے توبہ کرنا اور غیب کے جاننے اور عیبوں کو چھپانے والے کی طرف رجوع کرنا (خدا) روحانی راہ کا پہلا قدم ہے اور [روحانی] منزل پر پہنچنے والوں کا ایک قیمتی سامان ہے۔ روحانی مسافر الٰہی کی راہ پر گامزن سب سے پہلے توبہ کا راستہ اختیار کریں۔ توبہ ان لوگوں کے لئے استقامت کی کلید ہے جو [اپنی زندگی کے دنیاوی معمولات میں ڈوبنے کی وجہ سے اپنی زندگی کے حقیقی مقصد کی طرف کھو چکے ہیں اور نچلے حصے کے ناقابل تسخیر اثر کی وجہ سے ان کے اندرونی وجود میں تاریکی کی وجہ سے]۔ خدا کی حضوری کے قریب آنے والے توبہ کے ذریعے قربت اور قربت تلاش کرتے ہیں۔ انبیاء (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کے ذریعے اپنی ابدی خوشی اور دائمی کامیابی حاصل کرتے ہیں، خاص طور پر ہمارے باپ حضرت آدم علیہ السلام کے لیے، یہ نجات اور راہ روحانی راہ میں اعلیٰ درجات حاصل کرنے کا ذریعہ بن گیا۔ ان کی اولاد کے لیے مناسب ہے کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کے نقش قدم پر چلیں۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ کوئی گناہ اس لیے کرے کہ وہ گمراہی کرنے والے آدم علیہ السلام کی اولاد سے ہو۔ لیکن چونکہ باپ نے توبہ کے ذریعے اپنی غلطی کا کفارہ اور کفارہ ادا کیا ہے، اس لیے بیٹا [اور بیٹی] دونوں معاملات میں باپ سے مشابہت رکھنا ضروری ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے غلطی کی لیکن وہ بہت دیر تک پچھتاوے اور پچھتاوے کے آنسو بہاتے رہے۔ اگر کوئی شخص اسے صرف غلطی کرنے میں اپنا سردار سمجھتا ہے اور توبہ میں اس کی پیروی نہیں کرتا ہے تو وہ گمراہ اور نافرمان اور سرکش ہے اور اسے اپنے باپ (آدم) سے منسوب کرنے اور اس کا پیروکار ہونے کا دعویٰ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نیکی اور

شرافت کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگ ہونا [اور اس میں مکمل طور پر غرق ہونا] فرشتوں کی پہچان ہے اور برائی میں مکمل طور پر غرق ہونا شیطان کا [دائمی] پیشہ ہے۔

برائی میں الجھنا یا اس میں ٹھوکر کھانا اور پھر (اپنی حماقت کا ادراک کرنا) نیکی کی طرف رجوع کرنا انسان کا کام (فطرت یا امتیازی خصوصیات) ہے، جس میں اپنی فطرت میں دونوں صفات ہیں، [دونوں] اچھائی اور برائی کی صفات ہیں۔ اب یہ [مکمل طور پر] اپنے آپ پر منحصر ہے کہ وہ یا تو انسان بن جائے یا شیطان (شیطان) سے منسوب ہو۔ اگر کوئی شخص گناہ کرنے کے بعد توبہ کرتا ہے تو یہ کہا جائے گا کہ اس نے اپنی انسانیت کی شہادت فراہم کی ہے۔ جو شخص بغاوت پر اصرار کرتا ہے [انسانی شائستگی کی حدود سے تجاوز کرکے تجاوز کرنے والے اعمال سے جو کسی کی انفرادی اور / یا اجتماعی فلاح و بہبود کو خطرے میں ڈالتے ہیں] ، ایسے شخص کے بارے میں کہا جائے گا کہ وہ اپنے آپ کو شیطان سے منسوب کرنا چاہتا ہے۔ جہاں تک اپنے آپ کو فرشتوں سے منسوب کرنے کا سوال ہے تو یہ انسانی امکان کے دائرے سے خارج کر دیا گیا ہے کہ انسان صرف نیک اعمال کرتا ہے اور کوئی گناہ نہیں کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی ساخت [یا فطری اور ابتدائی انسانی فطرت میں] اچھائی اور برائی دونوں کا اس قدر پختہ امتزاج اور امتزاج ہے کہ ان کے درمیان صرف پچھتاوے کی گرمی کے ذریعے یا جہنم کی آگ کے ذریعے ہی علیحدگی ہو سکتی ہے۔ انسانی جوہر (*جوہر*) کو شیطان کی فریب اور برائی سے پاک کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اسے دونوں حرارتوں میں سے کسی ایک میں غرق کر دیا جائے۔ اب یہ کسی کا استحقاق ہے کہ وہ کس گرمی کا انتخاب کرتا ہے۔ جس گرمی کو وہ برداشت کرنے کے قابل سمجھتا ہے، اس کی طرف بڑھنا چاہیے، ورنہ موت کے بعد کوئی موقع نہیں ملے گا، وہاں اس کا ٹھکانہ یا تو جنت میں ہوگا یا جہنم میں۔ دین میں توبہ بہت اہم مقام رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کے اس حصے میں (موجودہ تصنیف کا حصہ سوم اور غزالی کی "خدا کی راہ کی معرفت کا احیاء" کی جلد 4 میں نجات بخش صفات کے بارے میں سب سے پہلے اس کا ذکر کرنا ضروری تھا تاکہ اس کی حقیقت، حالات، علامات، اسباب، اشارے، ثمرات اور نتائج، نقصانات اور رکاوٹیں، روحانی مسافر کے علاج کے طریقہ کار کی تفصیلات، سب [روحانی مسافر کے لیے] واضح ہو جاتے ہیں۔ ان تمام معاملات کی وضاحت چار ابواب (سیکشنز) میں کی جائے گی۔

توبہ کی حقیقت اور تعریف

توبہ تین چیزوں کا نام ہے جو اس ترتیب میں پائی جاتی ہیں: پہلا، علم؛ دوسرا، [وجود] کی حالت؛ تیسرا، [نتیجہ] اعمال۔ اس میں دوسرے کے لیے پہلا اور تیسرے کے لیے دوسرا ضروری ہے۔ یہ ترتیب اور ترتیب مرئی یا مادی (*ملک*) اور غیب یا روحانی (*ملاکوت*) دائروں میں الہی طریقے کے مطابق ہے۔ ان تینوں کی وضاحت اس طرح کی جائے گی۔

علم یہ جاننا ہے کہ گناہوں میں [فطری طور پر] بہت زیادہ نقصانات ہیں۔ ان کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ گناہ بندے اور محبوب کے درمیان پردہ بن جاتے ہیں۔ جب یہ حقیقت دل پر حاوی ہو جاتی ہے کہ انسان محبوب تک پہنچنے اور ملنے سے محروم ہو جائے گا تو یہ احساس تکلیف کا باعث بنتا ہے کیونکہ کوئی شخص کسی بھی طرح

محبوب سے جدائی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ انسان اس [گنہگار] عمل پر افسوس کا اظہار کرتا ہے جو کسی (یعنی عاشق) اور اپنے محبوب کے درمیان پردہ بن گیا۔ اس پچھتاوے کو شرمندگی کہا جاتا ہے اور یہی توبہ کی دوسری چیز ہے جو (وجود) کی کیفیت ہے۔ جب یہ پچھتاوا دل پر حاوی ہو جاتا ہے تو اس سے ایک اور حالت پیدا ہوتی ہے جسے کسی خاص عمل کا ارادہ کہا جاتا ہے۔ اس عمل کا تعلق زمانے کے تینوں ادوار (ماضی، حال اور مستقبل) سے ہے - حال کے ساتھ تاکہ وہ ان گناہوں کو چھوڑ دے جو پہلے کرتے تھے۔ مستقبل کے ساتھ اس معنی میں کہ کوئی شخص آنے والی زندگی میں اس گناہ (یا منفی، نقصان دہ، نقصان دہ، برے یا اخلاقی طور پر قابل مذمت عمل) کو چھوڑنے کا عزم کرتا ہے، یہ محبوب سے ملاقات میں رکاوٹ ہو گا۔ ماضی کے ساتھ تاکہ گناہ کی وجہ سے ہونے والے نقصان کا کفارہ کیا جائے اگر اس کا کفارہ ہو سکے۔

نیت اور عمل کی کیفیت کا سرچشمہ وہ علم ہے جسے ایمان اور یقین (*یقان*) کہا جا سکتا ہے۔ ایمان اس حقیقت کا تعین ہے کہ گناہ ایک مہلک زہر ہے اور یقین دل میں اس یقین کی پختہ جڑ ہے کہ کوئی شک باقی نہیں رہتا۔ جب ایمان اور یقین کا نور دل کے افق کو ڈھانپ لیتا ہے تو افسوس اور غم اور شرمندگی کی آگ بھڑک اٹھتی ہے کیونکہ انسان اس نور کی روشنی میں دیکھتا ہے کہ وہ کسی خاص عمل کی وجہ سے محبوب سے دور ہو گیا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی اندھیرے میں ہوتا ہے جب اچانک صبح کی روشنی نمودار ہوتی ہے ، یا بادل دور ہوجاتے ہیں اور اس کے بعد طلوع آفتاب ہوتا ہے اور محبوب اچانک دیکھا جاتا ہے جو موت کے دہانے پر ہے۔ یہ دیکھ کر دل میں محبت کی آگ بھڑک اٹھتی ہے اور اس کی گرمی انسان کو [محبوب کو بچانے کے لیے] کوئی حکمت عملی اختیار کرنے پر قائل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح، جب گناہ تباہی کو قریب لاتے ہیں، تو ایمان اور یقین کی روشنی کسی کو باہر نکلنے کا راستہ دکھاتی ہے۔ مختصرا یہ کہ علم، شرمندگی اور حال و مستقبل میں گناہوں کو ترک کرنے، ماضی کی غلطیوں کا کفارہ ادا کرنے اور تلافی کرنے کی نیت کے امتزاج کو توبہ کہا جاتا ہے۔

توبہ کی ذمہ داری کا مفہوم: سب سے پہلے انسان یہ سیکھا جاتا ہے کہ ضروری اور واجب صرف وہی ہے جو ابدی سعادت اور دائمی کامیابی کے حصول کا ذریعہ ہے، اور ابدی تباہی سے نجات کا ذریعہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرنا، اگر اس کا تعلق ابدی سعادت یا ابدی عذاب (*شقاوہ*) سے نہ ہو، تو فرض ہونے کے لحاظ سے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ایسی چیزوں میں ملوث ہونے کا کوئی فائدہ نہیں ہے جو ہمارے موجودہ اور مستقبل کے مقاصد سے متعلق نہیں ہیں۔ اس سے یہ سیکھا جاتا ہے کہ واجب صرف وہی چیز ہے جو ابدی خوشی اور ابدی کامیابی کے حصول کا ذریعہ ہے۔ یہ تب ہوتا ہے جب انسان فرض کا مفہوم جانتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ قیامت کے دن خدا کی نظر سے بڑھ کر کوئی خوشی اور کامیابی نہیں ہے۔ مزید یہ کہ جو شخص اس عظیم کامیابی سے محروم ہو تو اس شخص کی بدقسمتی اور ناکامی پر کوئی شک نہیں ہے۔ جو شخص بصیرت الٰہی کی اعلیٰ کامیابی سے محروم ہے وہ وہ ہے جو نچلی نفس کی خواہشات کا قیدی اور یرغمال ہو جو اپنے اور خدا کے درمیان پردہ بن جائے گی۔ ایسا شخص جدائی کی آگ کا شکار ہو گا [محبوب سے جو ایک ایسی آگ ہے جو دل کی گہرائیوں میں جلتی ہے اور اندرونی غم اور غم کی وجہ سے کسی کو سکون نہیں ملتی] اور جہنم کی آگ سے بھی۔ انسان یہ سیکھتا ہے کہ بندہ خدا سے ملاقات اور اس کی بصیرت سے دور ہوتا ہے، جب کوئی نچلے نفس کی خواہشات میں ملوث ہوتا ہے، عارضی دائرے (دنیا) سے لگاؤ رکھتا ہے، اور ان چیزوں پر گر جاتا ہے جن سے بچنا ضروری ہے۔ جو شخص بصارت الٰہی کے قریب ہوتا ہے وہ وہ ہے جو اپنے دل کا رشتہ دنیا کی چمک سے الگ کر دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف مکمل طور پر توجہ دیتا ہے، خدا کی یاد سے لگاؤ پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، اپنی صلاحیت اور خدا کی محبت کے مطابق الٰہی عظمت اور حسن کی معرفت تلاش کرتا ہے۔

ایسا شخص یہ سمجھتا ہے کہ جس طرح گناہوں کی وجہ سے خدا سے انحراف انسان کو گنہگار، نافرمان اور شیطان قرار دیا جاتا ہے، انہی وجوہات کی بنا پر خدا کی ملاقات سے پردہ اٹھانے کا حقدار ہو گا اور وہ شخص کہلاتا ہے جو حق کی طرف بھٹک گیا ہے۔ ان تمام باتوں کے بارے میں جاننے کے بعد اس حقیقت پر شک نہیں ہوگا کہ قربت الٰہی کی خاطر ضروری ہے کہ اس راستے سے انحراف کیا جائے جو انسان کو اس سے دور کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی راہ سے انحراف ان تین چیزوں کے بغیر ممکن نہیں جنہیں علم، شرمندگی اور عزم کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک یہ معلوم نہیں ہو جائے گا کہ گناہ محبوب سے دوری کی وجہ ہیں، پچھتاوا نہیں ہوگا اور نہ ہی کسی کو دور دراز کی راہ پر چلنے کا درد محسوس ہو گا اور جب تک وہ معشوق سے جدائی کے درد کی راہ پر سفر نہیں کرے گا، وہ (قربت الٰہی کی راہ پر) واپسی کا تصور بھی نہیں کرے گا۔ (محبوب کی راہ پر) واپسی کا مطلب گناہوں کو ترک کرنے کا عزم ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محبوب تک پہنچنے کے لیے یہ تین ذرائع (علم، شرمندگی اور عزم) درکار ہیں۔

عقل کب کامل ہوتی ہے؟ عقل کی حقیقت اس وقت تک کامل نہیں ہوتی جب تک کہ ہوس، غصہ اور تمام قابل مذمت باطنی خوبیاں جو شیطان انسانوں کو گمراہ کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے، کمال تک محدود نہیں ہو جاتیں۔ انسانی عقل چالیس سال کی عمر میں مکمل ہوتی ہے لیکن عقل کی ابتدا اس وقت مکمل ہوتی ہے جب کوئی بلوغت کو پہنچتا ہے۔ اس کے اشارے سات سال کی عمر میں ظاہر ہونا شروع ہوجاتے ہیں۔ ہوس شیطان کی فوج ہے اور عقل فرشتوں کی فوج ہے۔ جب یہ دونوں لشکر ایک جگہ جمع ہوتے ہیں تو وہ [ایک دوسرے سے] ٹکرا جاتے ہیں یہاں تک کہ ایک [لشکر] دوسرے کے سامنے اپنی زمین پر قابو پانے سے قاصر رہتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ دن اور رات کی طرح روشنی اور تاریکی ایک دوسرے کے ساتھ جمع نہیں ہوتے، اگر ایک غالب ہو تو دوسرے کا وجود کسی شکل یا شکل میں نہیں رہتا۔ چونکہ عقل کے کمال سے پہلے بچپن اور جوانی میں انسان پر ہوس غالب ہو جاتی ہے، اس لیے شیطان کے پاؤں پہلے ہی مضبوط ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دل عام طور پر خواہشات کی محبت اور لگاؤ میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ بعد میں، جب عقل ظاہر ہوتی ہے، جو خدا کی جماعت اور فوج ہے اور خدا کے دوستوں کے لیے نجات بخش ہے، تو وہ آہستہ آہستہ انہیں خدا کے دشمنوں کے ہاتھوں سے چھڑاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر عقل میں طاقت اور کمال نہیں ہے تو شیطان اپنا کام کرے گا اور اس جنگ کا فاتح ہو گا۔

لَأَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهُۥٓ إِلَّا قَلِيلًا

"سوائے چند لوگوں کے، میں ان کی تمام اولاد کو محکوم کر دوں گا (شیطان خدا کو بتا رہا ہے کہ وہ بنی آدم یعنی نسل انسانی کو ہلاک کرنے کے باغی ارادوں سے خدا کو بتا رہا ہے، جب اللہ تعالیٰ نے انہیں قیامت تک مہلت دی تھی، حکمت الٰہی کی وجہ سے، اس سے پہلے کہ وہ تکبر کی وجہ سے آدم علیہ السلام کے سامنے رکوع کرنے سے انکار کر کے خدا کی موجودگی سے دور ہو جائے۔ حسد اور انا پرستی)۔ (سورة البقرة باب ١٧، آیت ٦٢)

جب عقل مضبوط اور مکمل ہو جاتی ہے تو اس کا پہلا کام ہوس کی گرفت کو توڑنا، [پرانی مضبوط اور برائی] عادات کو ترک کرنا، اور زبردستی خدا کی عبادت کی طرف مائل کرنا اور شیطانی فوجوں کو ایک زبردست شکست دے دینا ہوتا ہے۔ توبہ کا یہی مطلب ہے کہ انسان اس راستے سے ہٹ جاتا ہے جس کا سردار شیطان ہے، جس کا راہبر ہوس ہے، اور اس کے بجائے اس راستے پر چلتا ہے جو خدا کے پاس لاتا ہے۔

ہوس عقل کی جگہ لے لیتی ہے: ہر انسان میں ہوس عقل کے ہونے سے پہلے ہی ہوتی ہے۔ عقل کی مہنگی [انسانی مزاج میں] ہوس کی مہنگی کی جگہ لے لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خواہشات کی پیروی میں جو بھی عمل کیا گیا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ ہر انسان ان سے توبہ کرے، چاہے وہ نبی ہو یا عام۔ کسی کو یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ توبہ صرف آدم علیہ السلام کی ایک خاص خصوصیت تھی، بلکہ یہ ایک ابدی حکم ہے جو بنی نوع انسان کے ہر فرد پر لکھا گیا ہے۔ اس کے خلاف کچھ بھی فرض کرنا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ الٰہی راستہ بدل نہ جائے۔

اگر کوئی شخص بلوغت کے دوران کفر یا جہالت پر تھا تو اس پر توبہ کرنا لازم ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے والدین کی وجہ سے مسلمان ہو اور اسلام کی حقیقت کو نہ جانتا ہو (اپنی روحانی تجدید اور تبدیلی کے لیے امن اور ارادہ الٰہی کی اطاعت کا راستہ) تو اس پر لازم ہے کہ وہ اپنی جہالت اور غفلت سے توبہ کرے۔ یہ توبہ اس طرح ہو گی کہ انسان کوشش کرے کہ وہ اسلام کی حقیقت کو سمجھ لے اور جان لے کہ جب تک وہ خود مسلمان نہ ہو اس وقت تک والدین کے اسلام سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ جب انسان یہ جانتا ہے تو یہ بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ خواہشوں سے وابستگی اور غفلت سے محبت سے توبہ کی جائے اور سیدھی راہ پر چلنا بھی ضروری ہو جائے۔ دوسرے لفظوں میں شریعت الٰہی سے صحیح اخلاق کی حدود پر عمل کرنا اور واجب فرائض (مثلا نماز، روزہ، صدقہ) کی تکمیل کرنا، چاہے وہ [دوسروں کو] دینا ہو یا دوسروں سے لینا، کچھ کرنا یا کچھ نہ کرنا، اور یہ مرحلہ توبہ کا سب سے مشکل مرحلہ ہے۔ اس مرحلے پر زیادہ تر لوگ تباہ ہو گئے کیونکہ وہ خواہش کے باوجود توبہ کرنے کے قابل نہیں تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ توبہ ہر فرد پر ذاتی طور پر واجب ہے۔ [چونکہ سے] کوئی بھی انسان اس سے غافل نہیں رہ سکتا، جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام جیسے پرعزم نبی (علیہ السلام) اس سے غافل نہیں رہ سکتے، دوسرے لوگ (جو روحانی کمال میں بہت کم ہیں) ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟

ہوس دل پر زنگ لگا دیتی ہے: جس میں کوئی بھی ہوس ملوث ہے، وہ دل پر ایک قسم کی تاریکی ڈال دیتا ہے بالکل اسی طرح جیسے منہ سے نکلنے والی بھاپ سے آئینے پر تاریکی ڈالتی ہے۔ اگر شہوت کی مسلسل پیروی کی جائے تو تاریکی کی پرت پر پرت کی وجہ سے دل کا تاریکی گہرا ہو جاتا ہے اور اس میں زنگ کی طرح کچھ ہو جاتا ہے۔ ہوس کی وجہ سے دل پر زنگ لگانے کا ذکر قرآن مجید میں اس طرح ہوا ہے:

كَلَّا ۖ بَلْ ۜ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ

"اس کے بجائے، ان کے دلوں پر زنگ پڑ گیا ہے کیونکہ انہوں نے [اپنے برے اعمال کے لحاظ سے] کیا ہے۔"
(سورة البقرة سورة البقرة آیت نمبر 14)

اگر زنگ گہرا ہو جائے تو اسے دل کی مہر لگانے کے مترادف سمجھا جاتا ہے [تاکہ عقل اور اندرونی سکون اور روحانی روشنی کی روشنی اس میں داخل نہ ہو] جیسا کہ آئینے پر زنگ لگا دیا جاتا ہے جسے اگر زیادہ دیر تک تنہا چھوڑ دیا جائے تو اس میں پالش کرنے کی کوئی صلاحیت باقی نہیں رہتی ہے اور اس طرح کے آئینے کو بیکار قرار دیا جاتا ہے (ایک گزر گیا معاملہ ہے کیونکہ اسے دوبارہ بحال نہیں کیا جا سکتا)۔ بہر حال ، جس طرح آئینے کو صاف کرنے کے لئے یہ کافی نہیں ہے تاکہ اسے کوئی اضافی زنگ نہ مل سکے ، اس کے بجائے ، اس کے بجائے ماضی میں حاصل ہونے والے زنگ کو دور کرنا بھی ضروری ہے۔ اسی طرح دل کے لیے یہ کافی نہیں کہ وہ مستقبل میں خواہشات کی پیروی سے صرف توبہ کرے، بلکہ ماضی میں جو گناہ کیے گئے ہیں ان سے بھی توبہ کی جائے

تاکہ ماضی کے گناہوں کی تاریکی مٹ جائے۔ جس طرح گناہوں سے دل تاریک ہو جاتا ہے، اسی طرح دل روشن اور نیک اعمال سے روشن ہوتا ہے۔ اطاعت الٰہی گناہوں کے اندھیروں کو دور کرتی ہے اور روشنی پھیل جاتی ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کی طرف مندرجہ ذیل نبوت کی روایت میں اشارہ کیا گیا ہے:

أَتْبِعِ السَّيِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُهَا

"گناہ کے بعد صالح کام کرنا چاہیے۔ نیک اعمال اس گناہ کو مٹا دیں گے (یہ عظیم الشان رعایت قتل، چوری، دوسروں کے جائز حقوق غصب وغیرہ جیسے بڑے گناہوں پر لاگو نہیں ہوتی، کیونکہ ان کے لیے معافی الٰہی کے حصول کے لیے کفارہ اور کفارہ ضروری ہے کیونکہ یہ خود عظیم الشان رحمت ہے کہ کسی بھی گناہ کو مناسب کفارہ کے ساتھ معافی الٰہی کے دائرے سے خارج نہیں کیا گیا)۔ (حدیث مجموعہ *ترمذی* سے ابو ذر *رضی اللہ عنہ سے روایت* ہے)

توبہ کی قبولیت کا دارومدار اس کی شرائط کی تکمیل پر ہے

اگر آپ توبہ کے مفہوم کو سمجھ چکے ہیں تو آپ کو اس معاملے میں کوئی شک نہیں ہونا چاہیے کہ ہر صحیح توبہ کو قبول کیا جاتا ہے۔ وہ لوگ جو گہری بصیرت کی روشنی سے دیکھتے ہیں اور قرآن کی روشنیوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ہر صحت مند دل [جو ہر عیب اور باطنی کیفیت سے پاک ہے] اللہ کے ہاں قبول کیا جاتا ہے۔ وہ آخرت میں اللہ کی قرب کی خوشیاں اور لذتیں پائے گی اور ہمیشہ کی آنکھوں سے خدا کی آنکھوں کو دیکھے گی۔ وہ اس حقیقت سے بھی واقف ہیں کہ ہر دل اپنی ابتدا میں صحت مند پیدا ہوا ہے [اور ہر عیب اور گھناؤنی باطنی کیفیات سے پاک ہے جو بعد میں حاصل ہوتی ہے، جیسے جیسے انسان دنیاوی زندگی میں ترقی کرتا ہے اور راستی کی راہ سے انحراف کرنا شروع کر دیتا ہے] جیسا کہ نبی روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ ہر بچہ *'فطرہ'* (انسان کی حقیقی فطری اصل فطرت جو پوری طرح خدا کی مرضی کے مطابق ہے) پر پیدا ہوتا ہے۔ الٰہی حقیقت اور ابدی آفاقی سچائیاں اور اس خدائی امانت کی طرف مائل ہے جو انسان کو واضح طور پر عطا کیا گیا ہے، یعنی توحید اور خدا کی گنوسس)۔ (یہ روایت نبوی کے مجموعے سے نقل کی گئی ہے *صحیح بخاری* اور *صحیح مسلم* صحابہ کرام ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے

گناہوں کے اندھیرے اور گناہوں کی دھول کی وجہ سے دل کی تندرستی ختم ہو جاتی ہے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ شرمندگی اور پچھتاوے کی آگ اس خاک کو جلا کر راکھ بنا دیتی ہے۔ راستبازی کی روشنی، دل کے چہرے سے گناہوں کی تاریکی کو دور کر دیتی ہے۔ گناہوں کا اندھیرا، نیک اعمال کی روشنی کو برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ جس طرح رات کا اندھیرا دن کی روشنی کے سامنے نہیں رہ سکتا، بالکل اسی طرح جیسے گندگی صابن کے سامنے نہیں رہتی، بالکل اسی طرح جیسے شہنشاہ اپنے لیے گندے کپڑے منتخب کرنا پسند نہیں کرتا، اسی طرح حقیقی شہنشاہ (خدا) اپنے آپ سے قربت اور قربت کے لیے گندے گندے دلوں کا انتخاب نہیں کرتا۔ پھر جس طرح گندے کام کرنے کے لیے کپڑے پہننے سے ان کو گندا کر دیا جاتا ہے اور صابن اور گرم پانی سے دھوئے بغیر صاف نہیں ہوتے، اسی طرح دلوں کو ہوس میں استعمال کرنے سے وہ اس قدر گندے اور گندے ہو جاتے ہیں کہ آنسوؤں اور پچھتاوے کے پانی کے بغیر وہ پاک اور پاک نہیں ہوتے۔ ہر پاک اور پاک دل کو اس طرح قبول کیا جاتا ہے اور پسند کیا جاتا ہے جس طرح صاف ستھرے کپڑے پسند کیے جاتے ہیں۔ لہٰذا آپ پر (دل و نفس) کی تطہیر واجب ہے تاکہ وہ الٰہی کی مقدر کے مطابق الٰہی کی قبولیت کا شرف حاصل کرے۔ قرآن مجید میں اس قبولیت کو نجات کہا گیا ہے:

قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّىٰهَا

"یقینا نجات اس شخص کو ملی جس نے اسے پاک کیا۔" (سورۃ البقرۃ باب 91، آیت 9)

یہ معلوم رہے کہ توبہ کا مطلب گناہوں کو ترک کرنا ہے۔ کسی چیز کو ترک کرنا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ کوئی اس کی تفہیم پیدا نہ کرے۔ چونکہ توبہ واجب ہے، اس لیے توبہ کے ذرائع بھی واجب ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گناہوں کو سمجھنا واجب ہے۔ گناہ کا مطلب یہ ہے کہ کچھ کرنے یا نہ کرنے کے الٰہی احکامات کی مخالفت کی جائے۔ ہم گناہوں کی بعض اقسام اور ان کے باہمی تعلق کی طرف اشارہ کریں گے۔ صرف اللہ تعالیٰ ہی اپنی رحمت اور فضل و کرم سے ہدایت حاصل کرنے کی صلاحیت عطا کرنے والا ہے۔

انسانی صفات کے مطابق گناہوں کی اقسام: انسان میں بے شمار صفات اور خصوصیات ہیں جیسا کہ روح کے اسرار کی وضاحت میں بیان کیا گیا ہے (باب اول)۔ تاہم، وہ [انسانی] خصلتیں اور باطنی صفات جو گناہوں [اور برائیوں کو] کو اکساتے ہیں چار اقسام میں تقسیم ہیں: الہامی صفات، شیطانی صفات، حیوانی صفات اور حیوانی صفات۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی ساخت مختلف عناصر سے بنی ہے اور ہر عنصر انسان کے اندر اپنا اثر و رسوخ چاہتا ہے۔ یہ چار خوبیاں انسان کے اندر اپنے الگ الگ اثرات ظاہر کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر الہامی صفات کا مطلب یہ ہے کہ انسان میں تکبر، تکبر، زبردستی، حمد و ثنیٰ، دولت، عزت، اثر و رسوخ اور طاقت کی خواہش ہے اور وہ چاہتا ہے کہ وہ تمام مخلوقات پر برتر ہو جائے (یہ صفات صرف ہر چیز کے مالک اور خالق کے لیے موزوں ہیں) جیسا کہ انسانی وجود اپنی حالت کی زبان سے پکارتا ہے:

أَنَا۠ رَبُّكُمُ ٱلْأَعْلَىٰ

"میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں۔" (سورۃ البقرۃ باب 79، آیت 24) (بعض روحانی مرشد یا اولیاء اور گنوسٹک نے کہا ہے کہ کوئی انسان ایسا نہیں ہے جس کے باطن میں وہ نہ ہو جس کا اعلان فرعون نے کیا تھا جس کا ذکر اس اوپر کی آیت میں کیا گیا ہے)

اس صفت سے اتنے بڑے گناہ پیدا ہوتے ہیں کہ لوگ ان کا احساس بھی نہیں کرتے اور ان کو گناہوں میں شمار کرتے ہیں، حالانکہ وہ انتہائی تباہ کن ہیں اور ان گنت گناہوں کی ابتدا کرتے ہیں۔ تیسری جلد ["*احیاء العلوم الدین*" یا "خدا کی راہ کی معرفت کا احیاء" یا اس موجودہ تصنیف کے باب 1 تا 10 میں] میں ان گناہوں کو بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ دوسری خوبی شیطانی ہے جو حسد ، بغاوت ، بہانے ، دھوکہ دہی ، دھوکہ دہی ، تنازعات اور انتشار کو جنم دیتی ہے۔ اسی صفت کی بنیاد پر انسان اپنے آپ کو اور دوسروں کو دینی معاملات میں برائی، منافقت، بدعت اور بدعت (بدعت) کا حکم دیتا ہے [ایسی چیزیں لانے کے لیے جو الٰہی کی طرف سے مقرر نہیں ہیں، بنیادی طور پر اس کی انا اور پست نفس سے پیدا ہوتی ہیں]، بے ایمانی اور دیگر تخریب کاری۔ تیسری خوبی حیوانی ہے جو بے شمار برائیوں کو جنم دیتی ہے جیسے لالچ، لالچ، پیٹ اور شرم کی ہوس، چوری، یتیموں کے جائیدادوں میں غبن اور اللہ کے قانون کی تعمیل نہ کرنے والی کوششوں میں استعمال کے لیے مال جمع کرنے کی خواہش وغیرہ۔ چوتھی صفت وحشیانہ ہے جو غصہ، بغض ، لوگوں کو مارنا، لوگوں کو لعنت دینا، ان کو قتل کرنا اور ان کے اثاثوں کو تباہ کرنا جیسے بے شمار مکروہ معاملات کو بھی پروان چڑھاتا ہے اور یہ گناہ دوسرے بے شمار گناہوں کی طرف پھیل جاتے ہیں۔

چار [انسانی] صفات کی فطری ترتیب: پیدائش کے لحاظ سے یہ چار صفات [انسان میں] بتدریج پیدا ہوتی ہیں۔ سب سے پہلے ، حیوانی خصوصیات کا غلبہ ہوتا ہے ، اس کے بعد ، حیوانی خصوصیات کا غلبہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد ، دونوں خوبیاں مل کر عقل کو دھوکہ دہی ، دھوکہ دہی اور بہانے کی راہ پر ڈال دیتی ہیں۔ اس مقام پر شیطانی صفات اٹھ کھڑی ہوتی ہیں اور آخر میں ربوبیت کی صفات اٹھ کھڑی ہوتی ہیں (الٰہی صفات صرف اللہ تعالیٰ کی ہیں اور اس غلام کے لیے بالکل نالائق ہیں جو دنیا کی زندگی میں عاجز اور پست رہنا چاہیے)۔ دوسرے لفظوں میں انسان تمام مخلوقات پر برتری اور غلبہ حاصل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ چنانچہ انسان ہر موقع پر گمراہ غرور کا اظہار کرتا ہے، برتری اور تکبر کا اظہار کرتا ہے، دوسروں کی توہین کرتا ہے تاکہ اپنی عزت و عظمت کا اظہار کرسکے، مختصر یہ کہ تمام گناہوں کا سرچشمہ اور اصل یہ چار صفات ہیں۔ گناہ ان سے نکلتے ہیں اور [انسانی] اعضاء اور اعضاء میں پھیل جاتے ہیں۔ بعض گناہ دل سے وابستہ ہو جاتے ہیں مثلا کفر، بدعت اور منافقت۔ بعض گناہوں کا تعلق آنکھوں اور کانوں سے ہے مثلا بغض اور حسد، بعض کا تعلق معدے اور شرم سے ہے اور بعض گناہوں کا تعلق ہاتھوں، پیروں اور دیگر جسمانی اعضاء سے ہوتا ہے۔ چونکہ یہ تمام گناہ واضح ہیں، اس لیے ان کی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

بے پناہ گناہوں کی تقسیم: ہم شریعت الٰہی کی شہادت اور روحانی روشنی کی روشنی سے جانتے ہیں [جو گنوسٹکس اور دیگر روحانی طور پر روشن خیال افراد کے پاس ہے] کہ تمام الٰہی شریعت کا مقصد مخلوقات کو خدا کے قریب لانا اور [روح کی آنکھ سے] الٰہی بصیرت کے اعزاز سے پرورش پانا ہے۔ تاہم خدا کی قربت اور بصیرت کا امتیاز حاصل کرنے کے لیے انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ خدا کے صحیفوں اور انبیاء سے الٰہی ہستی اور صفات (صفات) کی تفہیم حاصل کرے۔ قرآن مجید مندرجہ ذیل آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے:

وَمَا خَلَقْتُ ٱلْجِنَّ وَٱلْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ

"میں نے (یعنی خدا) کو پیدا کیا ہے جن اور انسان صرف میری عبادت کرنے کے لیے ہیں (سورة البقرة باب 51، آیت 56)

دوسرے لفظوں میں جنوں اور انسانوں کی تخلیق کا مقصد یہ ہے کہ وہ خدا کے بندے بنیں۔ بندہ اس وقت تک بندہ نہیں بن سکتا جب تک کہ وہ اپنے رب کی ربوبیت اور اپنی نفس کی بندش کی گہری سمجھ پیدا نہ کر لے اور جب تک کہ وہ یہ نہ سمجھ لے کہ رب کون ہے اور نفس کیا ہے۔ انبیاء اس عظیم مقصد کے لیے بھیجے گئے تھے [کہ انسانوں کو اپنے رب سے اور خدا کی بندش اور اس کے فرائض و ذمہ داریوں کے لحاظ سے ان کی ذات کی حقیقت سے آشنا کریں]۔ لیکن یہ مقصد اس دنیاوی زندگی کے خاتمے کے بعد پورا نہیں ہوتا [کیونکہ اس عظیم مقصد کو اسی دنیاوی وجود میں حاصل کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ اس میں ابدی زندگی اور ابدی خوشی اور اس میں دائمی کامیابی کا دارومدار اسی پر ہے]۔ یہی وجہ ہے کہ ایک نبی روایت (حدیث نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں دنیا کو آخرت کے لیے کھیت کے طور پر بیان کیا گیا ہے [کیونکہ اس کھیت کی کاشت اچھی ہو یا برا، آخرت میں کاشت کرنے والے کی خوشی یا غم کے لیے کٹائی کی جاتی ہے]۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ احکام الٰہی پر عمل کرنے کا مقصد اپنی دنیاوی زندگی کی حفاظت ہے [تاکہ انسان ایک صحت مند زندگی گزار سکے جس میں باطنی سکون اور خوشی اور تکمیل کا نشان ہو] کیونکہ دنیا کی زندگی خدا کی طرف جانے کی راہ کا ذریعہ ہے۔ اس دنیا میں آخرت سے جن دو چیزوں کا تعلق ہے وہ ہیں دولت اور نفس۔ اس طرح [اس عارضی دنیاوی زندگی میں] انسانی کارنامہ کے تین درجات ہیں: پہلا خدا کی معرفت اور قربت کی ڈگری ہے جو دلوں میں محفوظ ہے۔ دوسرا نفس کی حفاظت ہے جس کا تعلق جسم [انسانوں کے جسمانی وجود] سے ہے۔ تیسرا دولت اور مادی املاک کا تحفظ ہے جو لوگوں

سے متعلق ہے [اور انسانی تہذیبوں کے زندہ رہنے اور پھلنے پھولنے کے لئے ضروری تجارت اور معیشت کی شکل میں ان کی اجتماعی فلاح و بہبود]۔

گناہوں کی درجہ بندی بھی اسی خطوط پر ہے۔ دوسرے لفظوں میں سب سے بڑا گناہ وہ ہے جو عوام کے لیے معرفت کا دروازہ بند کر دے۔ اس کے بعد سب سے بڑا گناہ وہ ہے جو لوگوں کی زندگی کو مشکل اور ان کے لیے تنگ کر دیتا ہے۔ اس کے بعد سب سے بڑا گناہ وہ ہوتا ہے جو عوام پر معیشت کے دروازے بند کر دیتا ہے۔ بہرحال نیک اعمال کے تین درجات ہیں: خدا کے علم اور دلوں میں قربت کی حفاظت، جسموں میں جانوں کی حفاظت اور ان مالوں کی حفاظت جو خدا کے بندوں (یعنی انسانوں) کے پاس موجود ہیں [ان کے معاشی مفادات اور فلاح و بہبود کی حفاظت کے لیے]۔ یہ تینوں چیزیں شریعت الٰہی کے مقاصد ہیں۔ [اس دنیا میں کسی بھی قوم کا تصور نہیں کیا جا سکتا جو اپنے نسلی، نسلی، ثقافتی اور مذہبی تنوع کی خصوصیت رکھتا ہو] جو ان [مقاصد] سے متفق نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عقل یہ بھی قبول نہیں کر سکتا کہ اللہ تعالیٰ مخلوقات کے ان کے راستے اور ان کی دنیا (دنیا) سے متعلق معاملات کی اصلاح کے لیے کوئی نبی بھیجے اور پھر انہیں ایسے کام کرنے کا حکم دے جو اس کو اور اس کے انبیاء کو جاننے کی راہ میں رکاوٹ پیدا کریں یا لوگوں کی زندگیوں کو تباہ کر دیں۔ یا ان کی جائیدادوں کو تباہ کر دیں۔

خدا کی معرفت حواس کے دائرے سے خارج ہے: اگر آپ سمجھتے ہیں کہ پانچ حواس کے ذریعے سچائی کا پتہ لگانا پانچ حواس تک محدود ہے تو پھر آپ اور گدھے میں کیا فرق ہوگا؟ یہاں تک کہ گدھا بھی پانچ حواس کے ذریعے چیزوں کو سمجھتا ہے۔ آپ (اے انسان!) گدھے سے اس لیے ممتاز ہیں کہ آپ اپنے اندر ایک نزاکت (یعنی روح) [اس کی فطری قدیم شکل میں جس پر خدا نے اسے اصل میں '*فطرہ*' کی حالت میں پیدا کیا تھا - انسان کی حقیقی فطری داخلی اصل فطرت جو مکمل طور پر خدا کی مرضی، الہی حقیقت، حضور الٰہی اور ابدی آفاقی سچائیوں کے مطابق ہے اور اس الہی امانت کی طرف مائل ہے جس سے انسان کو واضح طور پر عطا کیا گیا ہے، یعنی توحید اور خدا کی گنوسس]۔ یہ وہی لطافت ہے جو سب سے پہلے آسمانوں، زمینوں اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی گئی تھی اور انہوں نے اس باریکی کے ساتھ آنے والے بوجھ کی ذمہ داری لینے سے اپنی نااہلی کا اظہار کیا۔ اس کے بعد اس لطافت کو انسان کے سامنے پیش کیا گیا [جس نے اسے دنیاوی قیام سے پہلے روحوں کے دائرے میں قبول کیا]۔ قرآن مجید میں اس کی وضاحت اس طرح ہوئی ہے:

إِنَّا عَرَضْنَا ٱلْأَمَانَةَ عَلَى ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ وَٱلْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَن يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا ٱلْإِنسَٰنُ ۖ إِنَّهُۥ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ﴿٧٢﴾

"ہم نے امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا لیکن انہوں نے اس کو اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈرنے لگے۔ انسان نے اسے اٹھا لیا جو یقینا ظالم تھا اور [اس امانت سے جاہل تھا]۔ (سورة البقرة سورة البقرة آیت 72)

یہ وہی لطافت ہے جو ان چیزوں کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتی ہے جو حواس کے دائرے (دائرے) سے خارج ہیں۔ جانوروں اور درندوں میں یہ لطافت نہیں ہے [لہذا ، وہ گنوسس یا الہامی علم اور قربت حاصل کرنے سے قاصر ہیں]۔

ایک فرد جو اس لطافت کو استعمال نہیں کرتا ، اسے ضائع کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ علم اور معلومات کی حد صرف وہی ہے جو حواس کے ذریعہ سمجھی جاتی ہے ، اور جانوروں اور درندوں کے اسی [زمرہ میں] شامل ہے [کیونکہ ایسا شخص انسان ہونے کے معنی تک پہنچنے میں ناکام رہا ہے ، اور اپنی زندگی کے حقیقی مقصد تک پہنچنے میں ناکام رہا ہے ، جس کا حصول ابدی خوشی اور ابدی کامیابی کا باعث بنتا ہے]۔

اے اسلام کے بھائیو! آپ کو [خاص طور پر] [لاپرواہی، لاپرواہی اور لذت پسندانہ انداز میں کام کرکے] ایسا نہیں ہونا چاہیے! جو شخص چیزوں کو صرف حواس سے سمجھتا ہے، وہ خدا کو بھول جاتا ہے کیونکہ خدا کی ہستی حواس کے ذریعے نہیں دیکھی جاتی۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کو بھول جاتا ہے وہ اپنے نفس کو بھول جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں وہ اس دنیاوی وجود اور اس کی مادی کشمکش کے بیابان میں کھو جاتا ہے اور اپنے نقصان کے لیے اپنے آپ کو نقصان پہنچاتا ہے، باطنی سکون اور تکمیل کی کمی کے لحاظ سے، اپنی زندگی کے اصل مقصد اور اس کے نتیجے میں ابدی خوشی اور لامتناہی کامیابی سے بالکل غافل اور غافل ہو جاتا ہے]۔ اس کے بعد انسان "افق" پر چڑھنے کے قابل نہیں ہوتا ہے اور [اپنی غفلت اور غفلت کی وجہ سے] حیوانوں کے درجے پر اتر جاتا ہے اور اس [نیچے] درجے پر مطمئن ہو جاتا ہے۔ ایسا شخص درحقیقت خدا کی طرف سے عطا کی گئی اس امانت میں غبن کرنے والا ہے، الٰہی نعمتوں کا انکار کرنے والا (یا انکار کرنے والا) اور اپنے آپ کو عذاب الٰہی کے تابع کرنے والا ہے۔ ایسے شخص کی حالت جانوروں سے بھی بدتر ہوتی ہے۔ جانور موت کے وقت ہر چیز سے بری ہو جاتے ہیں، لیکن انسان مرنے کے بعد بھی اس ذمہ داری سے بری نہیں ہوتا۔ اس کے بجائے جو امانت انسان کو عطا کی گئی ہے اسے اس کے مالک (خدا) کے پاس واپس کرنا پڑے گا کیونکہ یہ امانت اپنے آپ کو اس کی طرف کھینچے گی اور اسی کے پاس اپنا ٹھکانہ تلاش کرے گی۔ [الٰہی امانت ، جو وہ لطافت ہے جو خدا نے ہر انسان کو عطا کی ہے ، جو روح ہے ، اس دنیاوی قیام کے اختتام پر اس کے مالک (خدا) کو اس کی قدیم شکل میں واپس کرنے کی ضرورت ہے ، لیکن اس کے علاوہ اس کے ساتھ ہی اس کو دنیا کی زندگی میں حاصل کرنے کا کام سونپا گیا تھا۔ یہ وہ شکل ہے جس میں وہ اپنے خالق کو محبوب کے ساتھ مکمل ہم آہنگی، امن اور قربت کی حالت میں جانتا ہے۔ روح کو اس دنیا میں بھیجا گیا ہے کہ وہ اپنی آسمانی ابتدا کی طرف واپس جانے کا راستہ تلاش کرے ، اپنے خالق کے پاس واپس۔ یہ اس وقت ہوگا جب روح کو دنیاوی زندگی میں حاصل کی جانے والی تمام قسم کی نیچائی، برائی اور منفی باتوں سے پاک کیا جائے گا، ایک بہادر روحانی جدوجہد کے ذریعے اسے اس کی قدیم اعلیٰ حالت میں تبدیل کرنے کے لیے جو الٰہی معرفت سے نوازا گیا ہے۔]

یہ [الہامی] "اعتماد" کیسی ہے؟ یہ امانت اس درخشاں سورج کی مانند ہے جو ابدیت کے افق سے طلوع ہوا اور اس فانی [انسانی] جسم میں غروب ہو گیا ہے [سچائی کی تلاش کے ذریعے اور روح کی تزکیہ کے لیے ایک غیر متزلزل جدوجہد شروع کر کے اسے خدا کی حضوری میں چڑھایا جا سکتا ہے]۔ جب اس جسم کا نظام الٹا ہو جائے گا تو یہ سورج مغرب کی طرف سے طلوع ہو گا (قیامت کی آمد کی سب سے بڑی نشانیوں میں سے ایک سورج کا مشرق کی بجائے مغرب سے طلوع ہونا ہے) اور اپنے خالق اور فیشن کرنے والے کی حضوری میں سفر کرے گا۔ یا تو اندھیرے کی حالت میں یا اس کی چمک اور روشنی میں اضافہ ہوا۔ چمکدار سورج بغیر کسی پردے کے اپنے رب کے دربار میں پہنچے گا یہاں تک کہ تاریکی میں لپٹا ہوا سورج بھی [خدائی حضور] تک پہنچے گا کیونکہ خدا کی ہستی ہر چیز کی آخری واپسی کی جگہ ہے، لیکن وہ نیچے کی طرف منہ کرے گی۔ اس کی سمت "اعلیٰ ترین طبقہ" کی بجائے نیچے کی طرف منہ کرے گی (اعلیٰ ترین کی طرف انسانی کامیابی کی چوٹی کی طرف اشارہ کرتی ہے) [کیونکہ انسان کی اخلاقی اور روحانی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے آپ کو نچلے سے نچلے درجے کی حالت سے نکال دے اور اس کے بجائے، [روحانی طور پر] اونچائی کی طرف چڑھیں]۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

وَلَوْ تَرَىٰٓ إِذِ ٱلْمُجْرِمُونَ نَاكِسُوا۟ رُءُوسِهِمْ عِندَ رَبِّهِمْ

"جب آپ دیکھیں گے تو آپ کو ایک عجیب کیفیت نظر آئے گی۔ یہ مجرموں کو خدا کے سامنے سر جھکا دیا جائے گا۔ (سورۃ البقرۃ 32، آیت 12)

اس آیت الٰہی سے ثابت ہوتا ہے کہ قیامت کے دن گنہگار بھی دربار الٰہی میں موجود ہوں گے لیکن خدا کے فرمانبردار بندوں کی طرح نہیں ہوں گے بلکہ ان کے چہرے پیچھے کی طرف موڑ دیں گے اور اوپر کی طرف چڑھنے کی بجائے زمین کی طرف نیچے کی طرف مائل ہوں گے نچلے بیس نفس کا جو ضدی غلط سر کی حماقتوں میں خود کو ظاہر کرتا ہے]۔ اس پر بندے کا کوئی اختیار نہ ہوگا (بے شک یہ ان کاموں کا بدلہ ہے جو انہوں نے اپنے دنیا میں کیا تھا۔" جو شخص نیکی کی توفیق سے محروم ہو جائے گا تو اس پر حکم الٰہی اس طرح نافذ کر دیا جائے گا کہ وہ ہدایت الٰہی کی راہ پر آگے نہ بڑھ سکے گا۔ بلکہ وہ گمراہ ہو جائے گا اور گمراہی کی وادیوں میں بھٹک جائے گا۔ ہم گمراہی سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں اور جاہلوں میں شمار ہونے سے بھی پناہ مانگتے ہیں۔

نجات کے حصول والے: یہ وہی ہیں جنہوں نے علم الٰہی اور قربت حاصل کی۔ وہ "سب سے سرفہرست ہیں" (*مقربین السبقین* یا روحانی اشرافیہ جو انسانی نسل سے سب سے زیادہ کامیابی حاصل کرنے والے ہیں، جب وہ انسانی کامیابی کی چوٹی پر پہنچے اور ابدی خوشی اور ابدی فتح کی زندگی کا آغاز کرتے ہوئے)۔ جو لوگ نیکوکاروں کے نقش قدم پر چلے گئے اور نیکی کی راہ میں سبقت حاصل کیے بغیر گنوسٹکوں کی طرح وہ بھی کامیاب ہوں گے [اگرچہ وہ سب سے زیادہ کامیابی حاصل کرنے والوں کے روحانی درجے تک نہیں پہنچے تھے] لیکن وہ "دائیں ہاتھ کے لوگ" کہلائے جائیں گے۔ خدائی جزا جو "سب سے اوپر" کو دیا جائے گا وہ الفاظ میں کسی بھی بیان سے بالاتر ہوگا۔ قرآن مجید میں جو تمثیلی حوالہ کے طور پر ذکر کیا گیا ہے اس کے بارے میں صرف یہ کہا جا سکتا ہے:

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ أُخْفِىَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ

"کوئی شخص ان باتوں کو نہیں جانتا جو خدا نے آنکھوں کی ٹھنڈک کے لیے چھپی ہوئی ہیں۔" (سورۃ البقرۃ 32، آیت 17)

حدیث قدسی میں ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خدا کی طرف سے نقل کیا ہے:

أَعْدَدْتُ لِعِبَادِيَ الصَّالِحِينَ مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلَىٰ قَلْبِ بَشَرٍ

"میں نے اپنے نیک بندے کے لیے وہ چیز تیار کی ہے جو نہ آنکھوں نے دیکھی، نہ کانوں نے سنی اور نہ کسی انسان کے دل میں ان کا خیال آیا۔"

گنوسٹکس اسی ریاست کے متلاشی ہیں جو کسی انسانی دل کو نہیں ہوا ہے۔ وہ کسی بھی آسمانی شریک حیات ، پھل ، دودھ ، شہد ، شراب ، زیورات ، لباس اور اس طرح کی دوسری آسمانی چیزوں کے لئے لالچی نہیں ہیں۔ اگر انہیں یہ

چیزیں مل بھی جائیں گی تو وہ ان سے مطمئن نہیں ہوں گے، بلکہ وہ اس خواب الٰہی کی خوشنودی کی تلاش کریں گے جو ابدی نعمت اور لامتناہی فتح کی انتہا اور لذت و خوشی کی انتہا ہے۔ ربیعۃ بصری رحمہ اللہ ان پر جو تمام اولیاء اور غنوسٹکس میں سب سے اوپر تھیں، کسی نے پوچھا کہ تم جنت میں کس چیز کی طرف مائل ہو گی یا کس کی خواہش رکھتی ہو؟ اس نے جواب دیا: پہلے گھر کا مالک اور پھر گھر کا مالک ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے گھر کے مالک سے محبت نے انہیں گھر کی محبت سے غافل کر دیا، بلکہ اس نے انہیں اس کے سوا ہر چیز سے غافل کر دیا یہاں تک کہ وہ اپنے وجود سے غافل ہو گئے۔ ان کی تمثیل اس عاشق کی طرح ہے جو محبوب کا چہرہ دیکھنا چاہتا ہے اور اس میں اس قدر مگن ہے کہ دل میں کوئی اور خیال اور خواہش نہیں ہے، حتیٰ کہ اپنے نفس کے لیے بھی نہیں۔ اس کے بجائے، انسان جسم کے ہر زخم سمیت ہر چیز سے غافل ہو جاتا ہے، محبوب کے چہرے سے پردہ اٹھانے کا انتظار کرتا ہے۔ اس حالت کو "محبت میں فنا" کہا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسان اپنے محبوب کی محبت میں اس قدر غرق ہو گیا ہے کہ اسے محبوب کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ کسی کے تمام خیالات اور تصورات کا مرکز صرف ایک ہی توجہ ہے۔ کسی کے دل و دماغ میں کسی اور کے لیے بھی کوئی جگہ نہیں بچتی۔ جب خدا کی یاد میں وہ [باطنی روحانی] کیفیت حاصل ہوتی ہے تو اسے آخرت میں ایسی نعمتیں عطا کی جاتی ہیں کہ ان کا خیال بھی کسی انسان کے دل میں نہیں آیا۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک بہرا اور اندھا شخص آواز کی شکل اور رنگ کی نوعیت کو نہیں جانتا، لیکن اگر آنکھوں اور کانوں کے پردے اٹھا دیئے جائیں تو وہ رنگ اور آواز کی شکل اور نوعیت کو جان لے گا اور پھر وہ جان لے گا جس کا کوئی دل میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ دنیا بھی ایک پردہ ہے۔ جب اسے اٹھایا جائے گا تو ایسی بہت سی چیزیں ظاہر ہوں گی جن کا دنیا کی زندگی میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے بعد پاک اور خوبصورت زندگی کی لذت حاصل ہو جائے گی اور پھر اس آیت کا موضوع واضح ہو جائے گا:

وَإِنَّ ٱلدَّارَ ٱلْآخِرَةَ لَهِيَ ٱلْحَيَوَانُ ۚ لَوْ كَانُوا۟ يَعْلَمُونَ

"اور آخرت کی زندگی ہی ہمیشہ رہنے والی ہے اگر وہ جانتے (سورۃ البقرۃ البقرۃ القرآن 29، آیت 64)

ایک چھوٹا سا گناہ کیسے بڑا ہوتا ہے؟

واضح رہے کہ چھوٹے گناہ مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر کبیرے گناہ بن جاتے ہیں:

پہلی وجہ - اصرار اور استقامت : پہلی وجہ یہ ہے کہ کوئی معمولی گناہ پر اصرار کرتا ہے اور اصرار کرتا ہے۔ اسی لیے یہ مشہور کہاوت ہے کہ اصرار کے ساتھ کوئی گناہ معمولی نہیں رہتا اور توبہ کے ساتھ کوئی گناہ بڑا نہیں رہتا۔ اس کہاوت کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی بڑے گناہ کے ارتکاب کے بعد باز آجائے اور دوسرے کبیرہ گناہ کے ارتکاب سے باز رہے تو امید ہے کہ اس کا گناہ معاف ہو جائے گا۔ اس کے برعکس معمولی گناہ سے متعلق معاملہ سخت ہے جس پر استقامت اور استقامت ہے۔ اس کی تشبیہ ایک چٹان کی طرح ہے جس پر پانی قطرہ قطرہ ٹپکتا ہے [طویل عرصے تک اس مسلسل ٹپکنے کے نتیجے میں چٹان پر کوئی نشان یا یہاں تک کہ سوراخ بھی ہوتا ہے]۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

خَيْرُ الْأُمُورِ أَدْوَمُهَا وَإِنْ قَلَّ

"بہترین معاملات وہ ہوتے ہیں جو استقامت اور استقامت کے ساتھ چلائے جاتے ہیں حالانکہ وہ تعداد میں کم کیوں نہ ہوں"۔ (بیان کردہحضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر صحیح بخاری *اور* صحیح مسلم کے مجموعے میں حدیث کا مجموعہ ہے

اس کی وجہ یہ ہے کہ چیزوں کو ان کے مخالفین سے پہچانا جاتا ہے [اور ان کی اہمیت کو سراہا جاتا ہے] [جیسے روشنی کو تاریکی کی وجہ سے، نیکی کو برائی کی وجہ سے، علم کو جہالت کی وجہ سے، ظلم کی وجہ سے عدل، سختی کی وجہ سے مہربانی اور بدصورتی کی وجہ سے خوبصورتی وغیرہ] چنانچہ اس نبوت کی روایت یہ ثابت کرتی ہے کہ بہت کم اعمال جو مستقل طور پر کیے جاتے ہیں وہ زیادہ فائدہ مند ہوتے ہیں۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بہت سے اعمال جو ایک وقت میں کیے جاتے ہیں وہ نفس کی اصلاح اور دل کی تطہیر کے لیے اتنے زیادہ فائدہ مند نہیں ہیں [اس کے مقابلے میں کہ ایک طویل عرصے تک مستقل طور پر کیا جائے، اگرچہ وہ تعداد میں کم ہی کیوں نہ ہوں]۔ اسی طرح اگر کوئی چھوٹے گناہ کرنے پر اصرار کرتا ہے تو وہ دل کو تاریک کرنے میں زیادہ طاقتور اور مہلک ہو جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ کوئی شخص بڑے گناہ کا ارتکاب نہیں کرتا جب تک کہ اس نے پہلے بھی چھوٹے گناہ نہ کیے ہوں۔ مثال کے طور پر ، اچانک نہیں کرتا لیکن پہلے ایسا کرنے کا ارادہ ہوتا ہے۔ اسی طرح قاتل اچانک قتل نہیں کرتا بلکہ پہلے دشمنی اور بغض ہوتا ہے۔ تمام بڑے گناہوں میں یہ کیفیت ہوتی ہے کہ چھوٹے گناہ ان کے پیش خیمہ کے طور پر پائے جاتے ہیں۔ اگر ہم کسی بڑے گناہ کو اچانک کسی چھوٹے گناہ کے بغیر اس کے پیش خیمہ کے طور پر فرض کر سکتے ہیں، تو اس کی معافی کی امید ایک معمولی گناہ کے مقابلے میں ہے جس پر انسان اپنی ساری زندگی قائم رہا ہے۔

دوسری وجہ - گناہ کو چھوٹا اور غیر اہم سمجھنا: دوسری وجہ جو چھوٹے گناہوں کو بڑے ہونے کا سبب بنتی ہے وہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے گناہوں کو معمولی سمجھتا ہے [اور کسی قسم کی فکر یا فکر کے قابل نہیں]۔ ہر وہ گناہ جسے بندہ اپنے دل میں بڑا سمجھتا ہے، خدا کے نزدیک چھوٹا ہو جاتا ہے اور جو گناہ معمولی سمجھا جاتا ہے، خدا کے نزدیک بڑا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گناہوں کو بڑا سمجھنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے اعمال کو دل سے غلط سمجھتا ہے اور ان کو بغض کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ چنانچہ اس ناپسندیدگی اور بغض کی وجہ سے انسان اس گناہ کے بہت سے اثرات کو قبول نہیں کرتا۔ اس کے برعکس، گناہ کو معمولی سمجھنے کا مطلب یہ ہے کہ گناہوں سے محبت اور جھکاؤ ہے۔ اس کے نتیجے میں، انسان اس گناہ سے بہت سے اثرات قبول کرتا ہے۔ [ہر باضمیر انسان کا] مقصد اطاعت الٰہی کے ذریعے دل کو روشن کرنا ہے۔ دل کو گناہوں سے آلودہ کرنا [الہامی] حرام ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلْمُؤْمِنُ يَرَى ذَنْبَهُ كَالْجَبَلِ فَوْقَهُ يَخَافُ اَنْ يَقَعَ عَلَيْهِ وَالْمُنَافِقُ يَرَى ذَنْبَهُ كَذُبَابٍ مَرَّ عَلَى اَنْفِهِ فَطَارَهُ

"ایک مومن اپنے گناہ کو اپنے سر پر لٹکا ہوا پہاڑ سمجھتا ہے جو گرنے والا ہے، اور منافق اپنے گناہ کو اس مکھی سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا جو کسی کی ناک سے گزر کر اس پر پھسل جاتی ہے"۔ (بیان کردہحدیث کا مجموعہ *صحیح بخاری* عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے

مومن چھوٹے گناہ کو بھی بڑا سمجھتا ہے۔ اس کی وجہ خدا کی عظمت، قدرت اور قابلیت کا علم ہے۔ خدا نے ایک نبی پر وحی کی کہ "تحفے کی کمی کو نہ دیکھو، بلکہ اس کی عظمت کو دیکھو جس نے تمہیں تحفہ بھیجا ہے۔ اپنے

گناہ کو معمولی نہ سمجھو، بلکہ اس کی عظمت اور عظمت کو اپنے گناہ کے ساتھ سمجھیں، جس کے ساتھ آپ نے مقابلہ کیا تھا"۔ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیروکاروں سے کہا ہے کہ تم ایسے اعمال کرتے ہو جو تمہاری نظر میں بالوں سے زیادہ باریک ہوتے ہیں حالانکہ ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ان کو مہلک سمجھا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ کی عظمت سے بخوبی واقف تھے۔ چنانچہ عظمت الٰہی کے مقابلے میں چھوٹے گناہ بھی ان کی نظر میں بڑے گناہوں سے کم نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک جاہل کسی چیز کو چھوٹی (غیر اہم) نظر انداز کرتا ہے لیکن ایک عالم (عالم شخص) اسی چیز کو اہم سمجھتا ہے۔ کچھ چیزیں جو عام لوگوں کی طرف سے نظر انداز کی جاتی ہیں، ایک گنوسٹک کی طرف سے معاف نہیں کی جاتیں۔

تیسری وجہ - گناہوں کے ارتکاب سے خوشی: تیسری وجہ جو چھوٹے گناہوں کے بڑے ہونے کا سبب بنتی ہے وہ یہ ہے کہ انسان گناہوں کے ارتکاب کے بعد خوشی محسوس کرتا ہے، اس پر فخر کرتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ جو کچھ اس نے کیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے خاص فضل اور فضل و کرم کی وجہ سے ہے۔ مزید یہ کہ انسان اس حقیقت سے غافل ہے کہ یہ عمل ایک خامی اور الٰہی کی ناراضگی کا سبب تھا اور کرنے والے کے لیے بری نشانی تھی۔ اس میں لذت حاصل کرنے کے مترادف ایک چھوٹا سا گناہ کبیر ہو جاتا ہے اور اس حد تک اس کا تاریکی دل میں پھیل جاتا ہے۔ کچھ گنہگار (ظالم) اپنے گناہ (غلطی) کی تعریف مانگتے ہیں، فخر کا اظہار کرتے ہیں، اور اس پر فخر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر ، ایک کہتا ہے ، "کیا تم نے نہیں دیکھا کہ میں نے اسے کس طرح برباد کیا؟" ایک بحث کرنے والا یا بحث کرنے والا کہتا ہے ، "کیا آپ نے دیکھا کہ میں نے اپنے مخالف کو کس طرح ذلیل کیا؟ میں نے اس کی غلطیوں کو ظاہر کرکے اسے شرمندہ کیا۔ بھرے ہوئے سامعین کے سامنے ان کی تذلیل کی گئی۔ پھر میں نے اسے بحث میں اس طرح دھوکہ دیا کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ایک تاجر کہتے ہیں، 'میں نے اسے جعلی کرنسی دے کر بیوقوف بنایا اور اسے بڑا نقصان پہنچایا۔ یہ بہت افسوس کی بات ہے کہ وہ بیوقوف بن گیا اور اسے نقصان بھی اٹھانا پڑا۔ یہ اور ان جیسی باتیں چھوٹے گناہوں کو بھی بڑے گناہوں میں بدل دیتی ہیں۔ گناہ تباہ کن ہیں۔ اگر کوئی شخص ان میں ملوث ہو جاتا ہے، شیطان کا اثر پڑ جاتا ہے، جو اسے گناہوں اور گناہوں کے ارتکاب پر مجبور کرتا ہے، تو یہ غم اور افسوس کی جگہ ہے نہ کہ خوشی کی۔ کیا آپ نے کوئی ایسا شخص دیکھا ہے جو دشمن کے زیر تسلط ہونے کو اپنی عظمت سمجھتا ہے اور اپنی شکست پر فخر کرتا ہے؟ مزید یہ کہ کیا ایک باضمیر انسان اس قسم کے [برائے] کام کرنے کے بعد خوش ہو سکتا ہے جو محبوب (خدا) کو ناخوش بناتے ہیں؟ ایسے شخص کی مثال ایک مریض کی طرح ہوتی ہے جو دوائی کی بوتل ٹوٹنے پر خوش ہوتا ہے۔ کیا ایسا مریض دوا کے بغیر صحت یابی کا امیدوار ہے؟

چوتھی وجہ – حکم الٰہی سے سہارا لینا: ایک اور وجہ جس کی وجہ سے کسی چھوٹے گناہ کو کبیر میں لے جاتا ہے وہ یہ ہے کہ خدا کی پردہ [اپنے گناہوں اور بدایوں کا پردہ اٹھانا] اور تحمل اور نرم پٹے کو یہ نہ جاننا کہ [خدا کے نرم پٹے سے فائدہ اٹھانا] [غلط طور پر گناہوں کے ارتکاب کی ترغیب کے طور پر لینا] الٰہی کی ناراضگی کا سبب ہے۔ اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ اس کا گناہ یا گناہ خدا کی رحمت کی علامت ہے تو یہ اس کی جہالت، غرور کے اظہار کے لیے صحیح جگہ [اور وقت] سے بے خبری اور خدا کی گرفت سے بے خوف ہونے کے مترادف ہے۔ ایسے لوگوں کے مزاج کی تمثیل مندرجہ ذیل آیت میں بیان کی گئی ہے:

وَيَقُولُونَ فِيٓ أَنفُسِهِمۡ لَوۡلَا يُعَذِّبُنَا ٱللَّهُ بِمَا نَقُولُۚ

"اور وہ دلوں میں یہ کہتے ہیں کہ وہ ہمیں یہ کہنے کی سزا کیوں نہیں دیتا؟" (سورة البقرة آیت ۵۸، آیت ۸) [ایسے

لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ چونکہ خدا کی طرف سے کسی کے گناہوں اور گناہوں کی سزا فوری طور پر ظاہر اور فوری نہیں ہوتی، اس لیے یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کے ساتھ کچھ بھی برائی نہیں ہو گی، چاہے وہ کچھ بھی کریں۔ وہ اسے ایک حوصلہ افزائی اور لائسنس کے طور پر لیتے ہیں جب تک کہ وہ آخر کار اس دنیا اور آخرت میں پکڑے نہ جائیں۔

پانچواں وجہ - گناہ کا اظہار اور اعلان: کسی چھوٹے گناہ کے بڑے ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ کوئی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے پھر لوگوں کو بتاتا ہے کہ اس نے کیا کیا ہے یا اس جگہ پر کیا ہے جہاں لوگ دیکھ رہے ہیں۔ جو شخص ایسا کرتا ہے، وہ اس پردہ کو پھاڑنا چاہتا ہے جو خدا نے اپنے گناہ پر ڈال دیا ہے اور لوگوں کو اس گناہ کے ارتکاب پر اکسانا چاہتا ہے، جنہیں اس کے بارے میں آگاہ کیا گیا ہے یا کسی نے ان کی موجودگی میں وہ گناہ کیا ہے۔ اس صورت میں ایک گناہ پہلے سے تھا اور دو گناہ مزید جمع ہو گئے تھے، اسی لیے یہ گناہ کبیرہ گناہ بن جائے گا۔ اگر کوئی شخص لوگوں کو اظہار اور ظاہر کرنے کے علاوہ وہی گناہ کرنے پر اکساتا ہے تو یہ چوتھا گناہ ہوگا اور یہ انتہائی مہلک ہو جائے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

كُلُّ النَّاسِ مُعَافًى إِلَّا الْمُجَاهِرِيْنَ يَبِيْتُ أَحَدُهُمْ عَلَى ذَنْبٍ قَدْ سَتَرَهُ اللهُ عَلَيْهِ
فَيُصْبِحُ فَيَكْشِفُ سِتْرَ اللهِ وَيَتَحَدَّثُ بِذَنْبِهِ

"سب لوگوں کو معاف کر دیا جائے گا سوائے ان لوگوں کے جو اپنے گناہوں کو ظاہر کرتے ہوئے ادھر ادھر گھومتے ہیں۔ ایک شخص گناہ کرنے کے بعد بستر پر لیٹ جاتا ہے اور خدا اس گناہ کو رات کے اندھیرے میں چھپاتا ہے۔ لیکن جب صبح ہوتی ہے تو وہ اس گناہ کو ظاہر کرتا ہے جسے خدا نے چھپایا ہے اور لوگوں کو اس کے بارے میں بتاتا ہے۔ (بیان کردہ *احادیث* کا مجموعہ *صحیح بخاری* اور *صحیح مسلم* ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے

اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اور نعمتوں میں شامل ہے وہ یہ ہے کہ وہ [لوگوں میں] نیکی صفات کو ظاہر کرتا ہے اور برے اعمال کو چھپاتا ہے اور کسی کے رازوں کو ظاہر نہیں کرتا۔ جو شخص اپنے عیبوں اور گناہوں کو بے نقاب کرتا ہے وہ اس شخص کی مانند ہے جو اس نعمت الٰہی کی ناشکری کرتا ہے اور اس الٰہی صفت کو عملی طور پر رد کرتا ہے۔ ایک گنوسٹک نے کہا، "پہلی بات یہ ہے کہ [خدا کا] بندے کو گناہ بھی نہیں کرنا چاہیے لیکن اگر کوئی ایسا کرے تو دوسروں کو راضی نہیں کرنا چاہیے، ورنہ وہ دو گناہ کرے گا"۔ منافقین کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ ایک دوسرے کو برائی پر آمادہ کرتے ہیں۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

الْمُنَافِقُونَ وَالْمُنَافِقَاتُ بَعْضُهُم مِّن بَعْضٍ ۚ يَأْمُرُونَ بِالْمُنكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوفِ

"منافق مرد اور منافق عورتیں، بعض لوگ بعض کو برائی کا حکم دیتے ہیں اور ایک دوسرے کو نیکی سے روکتے ہیں۔" (سورة البقرة سورة البقرة آیت 67)

چھٹا وجہ - ایک رہنما یا کوئی ممتاز شخص گناہ کا ارتکاب کرتا ہے: بعض گناہ اس لیے بھی بڑے ہو جاتے ہیں کہ وہ کسی ایسے شخص کی طرف سے کیے گئے ہیں جس کی دینی شریعت کے معاملات میں لوگ پیروی کرتے ہیں، کیونکہ لوگ جو کچھ کرتے ہیں اس کی پیروی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر، ایک مذہبی عالم ریشم پہنتا ہے، یا سونے کی گاڑیوں پر سوار ہوتا ہے، بادشاہوں [یا سرکاری عہدیداروں یا سیاسی طاقت کے حامل لوگوں] سے مشکوک دولت

لیتا ہے یا ان کی مدد کرتا ہے کہ انہیں ان کے غلط کاموں کا احساس نہ دلایا جائے، اور صرف وقار کی خاطر علم میں ملوث ہو۔ یہ گناہوں کی وہ اقسام ہیں جن میں سادہ دل لوگ ان کی پیروی کرتے ہیں۔ ایسے علماء ایک دن مر جائیں گے لیکن ان کی برائی دنیا بھر میں پھیلتی رہے گی۔ وہ شخص کتنا خوش نصیب ہے جس کے گناہ [موت کے وقت] ایک کے ساتھ دفن ہو جاتے ہیں؟ [مذہبی] علماء (یا رہنما یا رجحان طے کرنے والوں سے متعلق معاملہ خطرناک ہے جن کی طرف لوگ دیکھتے ہیں اور اس معاملے میں ان کے پیروکاروں کی بڑی تعداد ہوتی ہے) خطرناک ہے کیونکہ ان پر بڑی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ جب وہ نیکی کرتے ہیں تو اگر کوئی ان کی پیروی کرتا ہے تو ان کے اجر الٰہی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اگر کوئی عالم دنیا کی شان و شوکت کو ترک کر کے اس سے بیزار رہے، صرف ضروری چیزوں پر راضی رہے، لامحدود قدرت الٰہی پر بھروسہ کرے گا، اپنے لیے پرانے کپڑے کو ترجیح دے گا، اور لوگ اس کے لیے نیک عادات پر عمل پیرا ہوں گے تو اسے صرف اپنے اعمال کا اجر نہیں ملے گا بلکہ ہر وہ شخص جس نے اس کی پیروی کی ہے اسے ملے گا۔ ان کا اجر بھی ہر شخص کو دیا جائے گا۔ اگر کوئی شخص دنیاوی شان و شوکت کی طرف مائل رہے تو جو لوگ (دنیاوی اور سماجی) درجے میں نچلے درجے کے ہیں وہ اس سے مشابہت رکھنے کی کوشش کریں گے، لیکن وہ اپنی مالی حالت کی وجہ سے اس میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ وہ بادشاہوں [یا سیاسی یا معاشی طور پر طاقتور لوگوں] کی خدمت کرنے اور اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے ناجائز ذرائع سے دولت کمانے پر مجبور ہوں گے۔ اس طرح ، صرف ایک شخص کو ان کے تمام اعمال [برے یا نقصان دہ رجحانات میں پیروکاروں کا] کا مقصد قرار دیا جائے گا۔ دونوں ریاستوں میں جس طرح کسی اسکالر [یا لیڈر یا ٹرینڈ سیٹر] کے ہونے سے فائدہ ہوتا ہے، اسی طرح نقصان بھی ہوتا ہے، اور ان دونوں کا واضح اثر ہوتا ہے۔

گناہوں کی تاریکی دل سے کیسے نکلی جاتی ہے؟ گناہوں کا اندھیرا دو چیزوں سے دور ہو جاتا ہے: پہلی پچھتاوے اور شرمندگی کی آگ اور دوسری روحانی کشمکش کی شدت [مستقبل میں برائیوں کو ترک کرنے کے لیے]۔ [ان دونوں میں توبہ کی ضرورت ہے]۔ توبہ کے بہت سے درجات ہیں۔ ان کی ابتدائی ڈگریاں بھی فوائد سے بھری پڑی ہیں۔ بعد کی ڈگریاں فضیلت کی اعلیٰ سطح پر ہیں۔ سہل بن عبداللہ تستاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بندہ ہر حالت اور حالت میں اپنے رب کا محتاج ہے۔ ہر حالت میں خدا کی طرف رجوع کرنا بہتر ہے، چاہے وہ اچھی ہو یا بری۔ مثال کے طور پر اگر کوئی گناہ کر رہا ہے تو دعا کرے کہ اے اللہ! براہ کرم میرے گناہ پر پردہ ڈال دو۔ جب کوئی گناہ سے فارغ ہو جائے تو دعا کرے کہ اے اللہ! میری غلطی معاف کر دے۔" توبہ کرنے کے بعد دعا کرنی چاہئے کہ مجھے گناہ کرنے سے محفوظ رکھو۔ اگر کوئی کوئی نیکی کرے تو دعا کرے کہ اے خدا! میرے اس کام کو قبول کریں'۔ کسی نے اس سے پوچھا کہ کون سی توبہ گناہوں کی معافی کا سبب بنتی ہے؟ آپ نے فرمایا: توبہ کی ابتدا توبہ ہے پھر اس کی طرف لوٹ آنا ہے پھر توبہ ہے۔ توبہ سے مراد جسمانی اعضاء کے اعمال ہیں، خدا کی طرف لوٹنا دل کے اعمال سے مراد ہے، اور خدا کی طرف توبہ کرنا مخلوقات سے غافل ہونا اور خدا کی طرف مکمل طور پر توجہ دینا اور اس گناہ کے لیے خدا سے معافی مانگنا ہے جس میں ملوث ہے، اس کے علاوہ خدائی نعمتوں کو مسترد کرنا اور خدا کا شکر ادا کرنا ترک کرنا جیسے عیبوں سے معافی مانگنا ہے۔ امید ہے کہ اس کے بعد کسی کو معاف کر دیا جائے گا اور رب العالمین کے ہاں پناہ مل جائے گی۔ توبہ کے بعد بھی کچھ مراحل ہیں۔ پہلا مرحلہ تنہائی ہے، پھر استقامت ہے، پھر علم کی تلاش ہے، پھر غور و فکر ہے، پھر [خدا سے] التجا کرنا، پھر معراج [الٰہی کے ساتھ] پھر خفیہ گفتگو [خدا کے ساتھ]۔ لیکن یہ سب حالتیں اس بندے کے دل پر نازل ہوتی ہیں جس کی رزق علم ہے، رکھ رکھنا الہی ذکر ہے، توکل رضا الٰہی ہے، صحابی توکل خدا پر ہے، ایسے دل پر اللہ تعالیٰ اپنی خاص توجہ دیتا ہے اور اسے عرش پر اٹھا دیتا ہے جہاں اسے عرش الٰہی کے حامیوں میں جگہ ملتی ہے۔ کسی نے ان سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول پوچھا:

اَلتَّائِبُ حَبِيْبُ اللّٰهِ

"توبہ کرنے والا خدا کا محبوب ہے"۔

اس نے جواب دیا، "توبہ کرنے والا شخص خدا کا محبوب ہو گا جب کسی میں درج ذیل صفات پائی جائیں گی:

ٱلتَّٰٓئِبُونَ ٱلْعَٰبِدُونَ ٱلْحَٰمِدُونَ ٱلسَّٰٓئِحُونَ
ٱلرَّٰكِعُونَ ٱلسَّٰجِدُونَ ٱلْءَامِرُونَ بِٱلْمَعْرُوفِ
وَٱلنَّاهُونَ عَنِ ٱلْمُنكَرِ وَٱلْحَٰفِظُونَ لِحُدُودِ ٱللَّهِ

یہ وہ لوگ ہیں جو توبہ کرتے ہیں، اللہ کی عبادت کرتے ہیں، اللہ کی حمد کرتے ہیں، روزہ رکھتے ہیں، اللہ کے سامنے سجدہ کرتے ہیں، لوگوں کو نیکی اور نیک کاری کی نصیحت کرتے ہیں، برائی سے روکتے ہیں، اور اللہ کی حدود کی حفاظت کرتے ہیں۔ (سورة البقرة القرآن، آیت ۹، آیت ۱۱۲)

کسی کو "محبوب" کہا جاتا ہے جب کوئی اپنے پیارے کا اتنا فرمانبردار ہوتا ہے کہ وہ اس کے قریب بھی نہیں آتا جس سے محبت کی جاتی ہے۔ اس وضاحت کا مقصد یہ ہے کہ توبہ کے دو فوائد ہیں: پہلا فائدہ یہ ہے کہ گناہ مٹا دیا جاتا ہے اور ایسا ہو جاتا ہے جیسے کسی نے کبھی گناہ نہیں کیا۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ انسان قرب الٰہی کے درجات کو اس حد تک حاصل کر لیتا ہے کہ وہ (خدا کا) محبوب بن جاتا ہے۔ پھر گناہوں کا کفارہ اور کفارہ مختلف درجے ہوتے ہیں، بعض گناہوں کو اس طرح مٹا دیا جاتا ہے جیسے وہ کبھی موجود نہ ہوں، بعض گناہوں کو توبہ کے مطابق کم کیا جاتا ہے، لیکن گناہوں کے خاتمے میں بھی یہی اثر ہوتا ہے۔

جعفر صادق رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے چار دیگر چیزوں میں چار چیزوں کو چھپایا ہے، یعنی اطاعت میں رضامندی الٰہی، اس لیے اطاعت کے معمولی عمل کو بھی معمولی نہ سمجھیں، ممکن ہے کہ اس میں اللہ کی رضا پوشیدہ ہو۔ [الہامی] گناہوں میں غضب ہے، اس لیے ایک معمولی گناہ کو بھی معمولی نہ سمجھو، یہ ممکن ہے کہ گناہ ہی غضب الٰہی کا سبب ہو۔ بندوں میں گنوسس [خدا کے] لہٰذا کسی بندے (انسان) کو حقیر یا حقیر نہ سمجھیں، یہ ممکن ہے کہ وہ شخص خدا کا مباشرت ہو۔ [خدا] دعا میں قبولیت، اس لیے کسی بھی موقع پر خدا سے دعا (دعا) نہ چھوڑیں، اس میں [خدا] کی قبولیت ہو سکتی ہے"۔

توبہ کی دوا اور گناہوں پر اصرار کے علاج کا طریقہ

معلوم رہے کہ انسان دو طرح کے ہوتے ہیں: ایک یہ کہ وہ نوجوان جس میں برائی کی طرف کوئی جھکاؤ نہ ہو، جس کی پرورش نیکی اور شرافت پر ہو، اور برائی سے دور رہنا اس کے مزاج (فطرت یا باطنی ساخت) میں ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

يَعْجَبُ رَبُّكَ مِنَ الشَّابِّ لَيْسَتْ لَهُ صَبْوَةٌ

"تیرا رب اس نوجوان پر حیران ہے جو برائی کی طرف مائل نہیں ہے۔ لیکن ایسے لوگ شاذ و نادر ہی ہوتے ہیں۔ (بیان کردہحدیث کے مجموعے *مسند احمد* اور *طبرانی* عتبہ بن عامر رضی اللہ عنہا

دوسری قسم میں وہ لوگ شامل ہیں جو گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں۔ ان کو مزید دو قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے: توبہ کرنے والے اور گناہوں پر اصرار کرنے والے۔ میں اس باب میں وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ گناہوں پر اصرار کرنے کا علاج کیا ہے اور کون سی دوا اس بیماری کو ختم کرنے اور شفا دینے میں موثر ہے۔

یہ بات واضح طور پر معلوم ہونی چاہیے کہ توبہ نجات ہے اور یہ بازیافت دوا کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ دوا سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے ، یہ ضروری ہے کہ کوئی بیماری سے آگاہ ہو۔ طب کا مطلب ان وجوہات کے خلاف جانا ہے جو کسی بیماری کے وجود کا سبب بنتے ہیں۔ اگر کوئی کسی خاص بیماری کا علاج کرنا چاہتا ہے تو ، اس بیماری کو جنم دینے کی وجہ کو ختم کرنا چاہئے۔ مزید برآں ، یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہر چیز اس کے برعکس سے کالعدم ہوجاتی ہے۔ اگر اس اصول کی روشنی میں دیکھا جائے تو گناہوں پر اصرار کی وجہ غفلت اور ہوس ہے۔ غفلت کا برعکس علم ہے اور ہوس کا برعکس یہ ہے کہ انسان ان عوامل پر صبر کرتا ہے جو جذبات اور ہوس کو ہوا دیتے ہیں۔ غفلت (یا غفلت) گناہوں کی جڑ ہے۔ غفلت کے علاج کے لیے جو دوا تیار کی جائے گی اس میں صبر کی تلخی کے ساتھ علم کی مٹھاس کے اجزاء ہوں گے۔

علماء کرام کی ذمہ داریاں: جب کوئی گناہ کرنے والا شخص کو احساس ہو یا معلوم ہو کہ اس نے گناہ کیا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی عالم کے ہاتھوں شفا حاصل کرے۔ اگر کوئی اپنی بیماری کو تسلیم نہیں کرتا تو ایک عالم کو چاہیے کہ وہ اس کی تشخیص کرے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ایک عالم ایک ملک، شہر، محلہ، مسجد (خدا کی عبادت اور تسبیح کی جگہ جہاں لوگ خدا سے تعلق اور تعلق حاصل کرنے کے لیے جاتے ہیں) یا لوگوں کے گروہ کا ذمہ دار ہو اور انہیں خدا کی راہ کے بارے میں تعلیم دے، ان کو ان چیزوں کی وضاحت کرے جو ان کے لیے نقصان دہ ہیں۔ ان کو ان چیزوں سے آگاہ کریں جو ان کے لیے (روحانی) فائدہ مند ہیں، ان کو تفصیل سے بتائیں کہ *سعادت* (ابدی خوشی اور لامتناہی کامیابی) اور *شکوہ* (ابدی عذاب اور مکمل ناکامی) کا باعث بنتے ہیں۔ ایک عالم کو چاہیے کہ وہ رہنمائی کرنے سے پہلے لوگوں کے پوچھنے کا انتظار نہ کرے، بلکہ ایک عالم کو چاہیے کہ وہ لوگوں کو کسی کے پاس آئیں یا ان کی زیارت کریں اور انہیں سیدھی راہ پر گامزن کریں کیونکہ علماء [اور روحانی مرشد] انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں۔ ہدایت اور تعلیم میں انبیاء کرام علیہم السلام کا ہمیشہ سے یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ اپنے ارد گرد گھومتے پھرتے ہیں، لوگوں کو پکارتے ہیں، ہر گھر میں جاتے ہیں اور انہیں حق کی راہ کی دعوت دیتے ہیں، ہر ایک کو خدا کی راہ کے بارے میں نصیحت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ عام طور پر لوگ اپنے دلوں کی بیماریوں سے واقف نہیں ہوتے، اسی لیے علماء کو چاہیے کہ وہ خود ان کی رہنمائی کریں۔ بیرونی [جسمانی] بیماریوں سے متعلق معاملات میں ، کوئی شخص خود معالج سے رابطہ کرسکتا ہے ، مثال کے طور پر ، اگر کسی کو وٹیلیگو (جلد کی بیماری ہے جس کی خصوصیت جلد کے پیچ ہیں) یا اس کے چہرے پر نشانات ہیں تو وہ آئینے میں دیکھ کر اپنی

بیماری کی حالت جان سکتا ہے۔ لیکن ہر ایک کے پاس آئینہ نہیں ہوتا ہے اور کسی کو اس وقت تک اپنی بیماری کا پتہ نہیں چلے گا جب تک کہ کوئی دوسرا اس کے بارے میں نہ بتاتا۔ یہ ذاتی طور پر تمام علماء پر واجب ہے کہ وہ لوگوں کی روحانی بیماریوں سے نکالنے کی مدد کریں اور ان کی رہنمائی کریں۔ لوگ جاہل پیدائشی ہوتے ہیں، اس لیے راہ الٰہی کے اصولوں اور تفصیلات سے متعلق معاملات میں لوگوں تک پہنچنا ضروری ہے۔ دنیا بیماروں کے مسکن کی مانند ہے جو زمین کے نیچے ہے وہ مر چکا ہے اور جو اس کی سطح پر ہے وہ بیمار ہے۔ دل کی بیماریاں جسم کی بیماریوں سے زیادہ ہوتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ اس دنیا کے ہسپتالوں میں روحانی امراض کے مریضوں کی تعداد جسمانی بیماریوں کے مریضوں سے زیادہ ہے۔ علماء [اور روحانی رہنما] اس ہسپتال کے ڈاکٹر ہیں اور سرکاری عہدیدار اس کے منتظم [اور نگہبان] ہیں۔ اگر کوئی مریض اپنے معالج کی تجویز کو قبول نہ کرے اور معالج کی تجویز کردہ دوا نہ لے تو اس مریض کو حکومتی حکام کے حوالے کر دیا جائے تاکہ وہ دوسرے لوگوں کو ان کی بیماری سے بچ سکیں۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک مریض جو روک تھام پر عمل نہیں کرتا ہے یا تو پاگل ہو جاتا ہے یا جیلر کے حوالے کر دیا جاتا ہے تاکہ وہ ایک کو قید کر سکے اور اپنے آپ کو اور دوسروں کو ان کی [متعدی] بیماری سے بچا سکے۔

دل کی بیماریاں کیوں زیادہ ہیں؟ جسمانی امراض کے مقابلے میں دل کی بیماریاں زیادہ ہوتی ہیں۔ اس کی تین وجوہات ہیں: پہلی وجہ یہ ہے کہ مریض کو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کس بیماری سے متاثر ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس (دل کے بیماریوں) کا نتیجہ اس دنیا میں نظر نہیں آتا، جبکہ جسمانی امراض کا نتیجہ اس دنیا میں نظر آتا ہے جس کے نتیجے میں موت واقع ہوتی ہے۔ لہٰذا لوگ جسمانی بیماریوں سے خوفزدہ ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اگر وہ خود ٹھیک نہ ہوئے تو موت انہیں زمین سے غائب کر دے گی۔ دل کے گناہوں (بیماریوں) کا نتیجہ دل کی موت ہے۔ لیکن دنیا (دنیاوی زندگی) میں اس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا، اسی لیے گناہوں کے خلاف نفرت کم ہے۔ اگرچہ انسان جانتا ہے کہ انسان نے گناہ کیا ہے، لیکن وہ اپنے گناہوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا اور توبہ اور معافی مانگنے سے متعلق معاملات میں خدا پر بھروسہ کرتا ہے۔ تاہم، کوئی جسمانی بیماریوں کے لیے خدا پر بھروسہ نہیں کرتا، بلکہ ایک ڈاکٹر سے دوسرے ڈاکٹر تک بھاگتا ہے۔ تیسری وجہ سب سے اہم اور بنیادی ہے، بلکہ یہ بذات خود ایک لاعلاج بیماری ہے اور وہ یہ ہے کہ دلوں کے طبیب [قریب] موجود نہیں ہیں۔ جن لوگوں کو ان بیماریوں میں مبتلا کیا جا سکتا ہے وہ علماء ہیں، لیکن وہ خود آج کل بدترین [روحانی] بیماریوں میں مبتلا ہیں [کیونکہ ان میں خود روحانی کمال اور اس کے نتیجے میں روحانی بیماریوں کے علاج میں مہارت کی کمی ہے]۔ جب وہ خود کو ٹھیک کرنے سے قاصر ہیں تو وہ دوسروں کا علاج کیسے کرسکتے ہیں؟ یہ [روحانی] بیماریاں (دل کی) پھیلی ہوئی ہیں اور شاذ و نادر ہی کوئی ان سے بچ پاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ علماء کا یہ عیب ظاہر نہیں ہوتا اور وہ (علماء کرام) مخلوقات کو [روحانی راستے سے] روکتے ہیں اور انہیں ایسی چیزیں بتاتے ہیں جو اس بیماری کو بڑھاتی ہیں۔ ان بیماریوں میں سب سے زیادہ تباہ کن دنیا کی محبت (دنیاداری) ہے اور جو خدا کی راہ کے معالجین پر غالب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دوسروں کے لیے علاج تجویز کرتے ہیں لیکن خود بھی اس بیماری میں مبتلا ہیں جس کی وجہ سے یہ اس قدر وسیع ہو جاتا ہے کہ یہ وبائی تناسب اختیار کر رہا ہے۔

[روحانی بیماریوں کی] ڈاکٹروں کی کمی تخلیقات کو تباہی کا تجربہ کرنے کا سبب بن رہی ہے۔ جن لوگوں کو ڈاکٹر اور معالج ہونا چاہئے وہ سادہ ذہن کی تخلیقات کو لوٹنے اور مختلف طریقوں سے انہیں گمراہ کرنے کے لئے مختلف ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں۔ اگر وہ ان کے ساتھ بھلائی نہیں کر سکتے تو انہیں ان کے ساتھ بے ایمانی نہیں کرنی چاہیے، اگر وہ اصلاح نہیں کر سکتے تو کم از کم انہیں بدتر نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے بجائے ان کے لیے بہتر ہے کہ وہ خاموش رہیں کیونکہ جب بھی وہ منہ کھولتے ہیں تو ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان کے پاس آئیں اور یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب وہ لوگوں کو مغفرت کی جھوٹی امیدیں دیں اور خدا میں

امید کے اسباب کو ترجیح دیں اور رحمت الٰہی کی دلائل کا ذکر کریں۔ اور جان بوجھ کر ان روایات کا ذکر کرنے سے گریز کریں جن میں لوگوں کو خدا کے غضب کا ذکر کر کے عذاب الٰہی سے ڈرایا گیا ہے۔ اس طرح کے خطبات میں لوگوں کو بہت اطمینان ملتا ہے اور یہ چیزیں ان کے کانوں میں مٹھاس ڈالتی ہیں اور دلوں کو اثاثہ فراہم کرتی ہیں۔ جب لوگ ان نام نہاد "علماء" کے اجتماعات سے واپس آتے ہیں تو گناہوں کے ارتکاب کی ان کی جرات کچھ اور بڑھ جاتی ہے اور خدا کی فیاضی پر ان کا بھروسہ کچھ بڑھ جاتا ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اگر کوئی ڈاکٹر جاہل اور بے ایمان ہے تو وہ اپنے مریض کو ایک مہلک دوا دے دیتا ہے جو صحت فراہم کرنے کے بجائے مریض کو موت کے جبڑے میں دھکیل دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مریض کو وہ دوا نہیں دی جاتی جس کی ضرورت ہوتی ہے اور اسے وہ دوا اس طرح نہیں دی جاتی جس طرح اسے دی جانی چاہیے۔

گناہوں کے اسباب کا علاج: اب یہاں گناہوں کے اسباب (برائیوں اور برائیوں کو) کا علاج بیان کیا جائے گا۔ "گناہوں کی سزا فوری نہیں ہے اور کسی کو نظر نہیں آتی" کی پہلی وجہ کا علاج یہ ہے کہ یہ سوچنا ہے کہ مستقبل میں جو کچھ ہونے والا ہے وہ ضرور ہو گا [اگرچہ یہ تاخیر ہو اور دنیا کی زندگی میں نظر نہ آئے] اور وہ دن دور نہیں ہے، بلکہ یہ کسی ایسے شخص کے بہت قریب ہے جس کے پاس اسے دیکھنے کی آنکھیں ہوں۔ مزید یہ کہ موت انسان کے اتنی قریب ہوتی ہے جتنی جوتوں کے فیتے پہننے والے۔ ہو سکتا ہے کہ قیامت قریب ہو (کیونکہ موت آخرت کی زندگی کا آغاز ہے اور قیامت کا سفر ہے) اور چند لمحوں کے بعد ہونے والا ہے۔ یہ بھی سوچنا چاہیے کہ انسان فطری طور پر اپنے مستقبل کی بہتری کے لیے سخت محنت کرتا ہے، مشکلات برداشت کرتا ہے، مثال کے طور پر، سمندر کے راستے سفر کرتا ہے [تجارت، تجارت، تعلیم وغیرہ کے لیے طویل اور مشکل سفر پر]، صحراؤں میں اس امید پر گھومتا ہے کہ ان سفروں سے اسے جو فائدہ ملے گا وہ آنے والی زندگی میں اس کی مدد کرے گا۔ یہی نہیں، اگر کوئی بیمار ہو جائے اور کوئی طبیب جو مومن نہیں ہے، اسے بتاتا ہے کہ ٹھنڈا پانی اس کی صحت کے لیے مضر ہے اور یہاں تک کہ اسے موت کے قریب بھی لے آتا ہے، اگرچہ ٹھنڈا پانی کسی کے لیے بہت سکون بخش ہوتا ہے لیکن اسے چھونے تک نہیں دیتا۔ یہ بات قابل غور ہے کہ کوئی شخص کافر کے مشورے پر [پیاس بجھانے کے لیے ٹھنڈا پانی پینے] دنیاوی لذت کو ترک کر دیتا ہے۔ یہ اچھی طرح سے معاملہ ہوسکتا ہے کہ معالج اچھا ہے لیکن اس بات کا کوئی ثابت شدہ معجزہ نہیں ہے کہ معالج کے پاس طبی مہارت کی سطح موجود ہے کہ وہ ہر وقت صحیح ہو۔ دوسری طرف پیغمبروں کی سچائی پر ثابت معجزات موجود ہیں۔ انسان کو یہ خیال کرنا چاہیے کہ وہ کسی کافر پر ایمان لائے جا سکتا ہے لیکن اس کے لیے کسی نبی پر ایمان نہیں لا سکتا۔

دوسری وجہ کا علاج اسی طرح کیا جا سکتا ہے۔ اگر گناہوں کی لذتوں پر اصرار کا غلبہ ہے تو جان بوجھ کر اسے ترک کر دینا چاہیے اور یہ سوچنا چاہیے کہ اگر کوئی دنیا کی زندگی کی لذتوں کو چھوڑ نہیں سکتا جو چند دنوں کے قابل ہے تو وہ ابدی زندگی کی لذتوں کو کیسے چھوڑ سکتا ہے جو ہمیشہ کے لیے قائم رہتی ہے۔ اگر کوئی شخص اس زندگی میں [گناہوں کی لذت سے بچنے] کے درد کو برداشت نہیں کر سکتا جو چند دنوں کی قدر ہے اور اس چھوٹی سی تکلیف پر صبر نہیں کر سکتا تو پھر جہنم کا درد کیسے برداشت کر سکتا ہے۔ مزید یہ کہ جب کوئی شخص ان دنیاوی نعمتوں پر صبر نہیں کر سکتا جو ناخوشگوار واقعات سے بھری ہوئی ہیں تو وہ آخرت کی پاکیزہ اور پاکیزہ نعمتوں کے ساتھ کیسے صبر کر سکتا ہے۔

تیسری وجہ کے علاج کے بارے میں، یعنی توبہ کی قبولیت کی امید میں توبہ کرنے سے گریز کرنا [بعد میں گناہوں سے لطف اندوز ہونے اور عمر میں بڑھاپے یا بڑھاپے کو پہنچنے کے بعد]، انسان کو یہ سوچنا چاہیے کہ جہنم کے باشندوں کی چیخ و پکار کی وجہ یہ تاخیر ہو گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ گناہوں سے توبہ میں تاخیر کریں گے جو

کسی کی موت پر ختم ہو جاتی ہے [کیونکہ زندگی کی تمام توقعات کے باوجود موت کا وقت نامعلوم ہے، اور ہر عمر کے لوگ مختلف وجوہات کی بنا پر مر جاتے ہیں]، اس کے بعد توبہ کا کوئی موقع باقی نہیں رہے گا۔ ممکن ہے کہ کوئی شخص توبہ سے پہلے مر جائے اور اگر اسے زندہ بھی مل جائے تو وہ کیسے جان سکتا ہے کہ وہ گناہوں کو ترک کرنے کے قابل ہو جائے گا جبکہ وہ اب ایسا کرنے کے قابل نہیں ہے کیونکہ گناہوں کو ترک نہ کرنے کی وجہ جو آج موجود ہے وہ بھی بعد میں موجود ہو سکتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بعد میں مسلسل غلط کام کرنے سے عادات مضبوط ہوجائیں۔ جس کی عادت نہ بنی ہو تو اسے چھوڑنا آسان ہو جاتا ہے اگر وہ اسے چھوڑنا چاہتا ہے تو اسے چھوڑنا آسان ہو جاتا ہے لیکن اگر کسی کی عادت قائم ہو تو اسے خواہش کے باوجود اسے چھوڑنا مشکل ہو جاتا ہے۔ پریویریکٹر کی مثال کسی ایسے شخص کی ہے جو درخت کو ہٹانا چاہتا ہے ، لیکن درخت مضبوط ہے اور اسے آسانی سے نہیں ہٹایا جاسکتا ہے اور اگلے سال ایسا کرنے کے لئے ایک چھوڑ دیتا ہے۔ یہ بات اچھی طرح جانتی ہے کہ درخت جتنا بھی عرصہ رہتا ہے، اس کی جڑیں پھیلتی اور مضبوط ہوتی جاتی ہیں اور جیسے جیسے عمر بڑھتی جاتی ہے وہ کمزور ہوتا جاتا ہے۔ اس سے بڑی حماقت اور کیا ہو سکتی ہے کہ جب کوئی جسمانی طاقت کے باوجود نسبتا کمزور درخت کو ہٹانے کے قابل نہ ہو تو وہ اپنی کمزور حالت میں مضبوط درخت کو کیسے ہٹا سکتا ہے؟

چوتھی وجہ کا علاج یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت اور فضل کا انتظار ہے، اس کی وضاحت پہلے بھی کی جا چکی ہے۔ اس کی مثال اس شخص کی مثال ہے جو اپنا سارا مال اور مال صدقہ میں خرچ کر دیتا ہے، اپنے گھر والوں کو مفلس کر دیتا ہے اور اس کا انتظار کرتا ہے کہ اللہ غیب سے ایک رزق بھیجے یا ایک خزانہ بنجر زمین میں عطا فرمائے۔ گناہوں کی معافی حاصل کرنے کے امکانات [توبہ ، کفارہ اور اصلاح کے بغیر] ایک خزانہ تلاش کرنے کے امکانات کے برابر ہیں۔ یا ایسے شخص کی مثال اس شخص کی مانند ہے جو کسی ایسے شہر میں رہتے ہوئے اپنا مال سامنے کے صحن میں چھوڑ دیتا ہے جہاں دن کی روشنی میں سامان لوٹ لیا جاتا ہے، اور کہتا ہے کہ خدا پر توکل ہے جو اس کے مال کو لوٹ مار سے بچائے گا، اگرچہ وہ اسے محفوظ جگہ پر رکھنے کے قابل ہو۔ ان مثالوں میں ، چوروں سے خزانہ تلاش کرنا یا اپنے سامان کی حفاظت کرنا ناممکن ہے۔ جو شخص اس طرح کی امانت (یا غلط توقعات) کی وجہ سے روزی روٹی چھوڑ دیتا ہے یا لاپرواہی سے اپنا سامان [کسی غیر محفوظ مقام پر] رکھتا ہے، وہ بہت بڑا بے وقوف ہے۔ اسی طرح اپنے گناہوں کی معافی ممکن ہے، لیکن مغفرت کی امید پر گناہوں کا کام کرنا اور توبہ نہ کرنا انتہائی جہالت ہے۔

پانچویں علت کا علاج یعنی انبیاء علیہم السلام کی صداقت پر شک کرنا وہ عوامل ہیں جو انبیاء کی سچائی اور سچائی کو ثابت کرتے ہیں۔ جو شخص شک کرتا ہے اسے کہا جائے گا کہ جن انبیاء کے پاس معجزات تھے جو حق پر ہونے کی دلیل تھے، جنہوں نے ہمیں بتایا کہ آخرت کا ایک ایسا عالم ہے جو اس دنیا سے الگ ہے اور مرنے کے بعد انسان اس دنیا سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ کیا آپ کو اس خبر کی سچائی پر یقین ہے یا یہ ناممکن ہے جیسے ایک شخص کا ایک ہی وقت میں دو جگہوں پر موجود ہونا ناممکن ہے؟" اگر کوئی جواب دے کہ اسے یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے [کہ انبیاء حق پر تھے] تو ایسے شخص سے بحث کرنا بیکار ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ اسے اس میں شک ہے تو اس سے پوچھا جائے گا کہ اگر کوئی اجنبی آپ کو خبر دے کہ جب آپ تیار شدہ کھانا چھوڑ کر اپنے گھر سے نکلے تو سانپ نے آپ کے کھانے میں اپنا منہ ڈال دیا اور اسے اپنے زہر میں ملا دیا۔ اگر آپ اس اجنبی کی سچائی پر یقین رکھتے ہیں تو کیا آپ پھر بھی وہ کھانا کھائیں گے یا اسے چھوڑ دیں گے، حالانکہ یہ تمام کھانوں میں سب سے زیادہ ذائقہ ہوسکتا ہے؟" کوئی اس کا جواب دے گا، "میں ایسا کھانا نہیں کھاؤں گا، یہاں تک کہ اگر وہ اجنبی جھوٹ بول رہا ہے، میں احتیاط کے لیے اسے نہیں کھاؤں گا۔ زیادہ سے زیادہ، وہ کھانا ضائع ہو جائے گا [اگر اجنبی جھوٹ بول رہا ہے]۔ لیکن اگر وہ اجنبی سچ بول رہا ہے تو یہ کھانا میرے لیے مہلک ہو گا۔ پھر ایسے شخص سے کہا جائے گا کہ تم کسی نامعلوم اجنبی پر ایمان لاتے ہو اور اس خبر پر یقین کر کے اپنا کھانا پھینک دو، اگرچہ اجنبی کے پاس کوئی دلیل یا

ثبوت نہ ہو، تو پھر اس بات کا امکان ہے کہ کسی نے حسد میں یہ بات کہی ہو یا یہ بات اس لیے کہی ہو کہ آپ کو پریشان کر دیا ہو۔ دوسری طرف انبیاء علیہم السلام کے اقوال ہیں جن کی تصدیق معجزات سے ہوئی ہے، اولیاء، علماء اور دانشمندوں میں اتفاق رائے پایا جاتا ہے لیکن آپ نہ تو انبیاء کی بات کو قبول کرتے ہیں اور نہ ہی ان کی طرف سے دی جانے والی خبروں کو قبول کرتے ہیں۔ عوام میں سے جاہل اس بحث کا موضوع نہیں ہیں، کیا عقل مند میں سے کوئی ایسا ہے جو نہ قیامت پر یقین رکھتا ہو اور نہ ہی اجر و عذاب کا قائل ہو؟ اس کی ظاہری شکل پر اختلافات ہو سکتے ہیں لیکن اس کے وجود کے بارے میں تمام عقلمندوں میں متفقہ اتفاق رائے ہے۔ اگر ان کی خبر سچی ہے تو آپ ایسے عذاب کے قریب پہنچ چکے ہوں گے جو ہمیشہ قائم رہے گا اور اگر وہ جھوٹ بول بھی رہے ہیں تو آپ کو کوئی خاص نقصان نہیں ہوگا، آپ کا نقصان صرف یہ ہے کہ آپ دنیا کی کچھ نعمتیں حاصل نہیں کر پائیں گے۔
مخاطب کے پاس ذرا سی بھی عقل ہو تو توبہ میں ذرا بھی تاخیر نہیں کرے گا کیونکہ دنیاوی زندگی چاہے کتنی ہی لمبی کیوں نہ ہو وہ ابدی زندگی کے برابر نہیں ہو سکتی۔ اگر ہم یہ فرض کریں کہ دنیا اناج سے بھری ہوئی ہے اور ایک پرندہ دس لاکھ سال بعد ایک دانہ چوری کرتا ہے اور پھر رک جاتا ہے اور دس لاکھ سال بعد دوسرے دانہ کو چوری کرتا ہے [اور اسی طرح جاری رہتا ہے]، تو اس صورت میں بھی تمام دانے ختم ہو جائیں گے [ایک دن] لیکن ابدی زندگی میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔ لہٰذا عقل رکھنے والا شخص اس [عارضی] زندگی کی لذتوں پر صبر کر کے ابدی سعادت اور لازوال فتح حاصل کرنے میں سستی کا مظاہرہ کیسے کر سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک ایسے شخص سے کہا جس کی عقل اس طرح کے معاملات کی تحقیق اور ادراک سے قاصر تھی کہ اگر تم سچ کہہ رہے ہو کہ آخرت نہیں ہے اور یہ زندگی ہی ہمارے پاس ہے تو تم اور میں دونوں نجات پائیں گے۔ لیکن اگر میں سچ کہہ رہا ہوں (آخرت کے وجود اور اس کی ابدی زندگی کے بارے میں) تو تم تباہ ہو جاؤ گے اور میں نجات حاصل کروں گا۔ بہرحال ایک ذہین انسان کو ہر حال میں امن اور احتیاط کی راہ پر چلنا چاہیے۔

باب 12 - مصیبتوں، آزمائشوں اور مصیبتوں کے سامنے صبر کے ذریعے لچک اور نعمتوں اور ان تمام اچھائیوں کے لیے شکر گزاری

اتار چڑھاؤ کسی کی زندگی کا لازمی حصہ ہیں۔ ذاتی اور اجتماعی سانحات، حادثات، طاعون، آفتیں، پیاروں کا کھونا، مادی نقصانات، زندگی میں ناکامیاں اور چیلنجز، بیماریاں، غم، مشکلات، جنگیں، بھوک، غربت، بے روزگاری، انتشار، معاشرتی انتشار اور بدامنی، مایوسی، اندرونی اور ظاہری سکون کی کمی، پریشانی، خطرات اور دوسروں کی زیادتیوں پر غصہ وغیرہ اس دنیاوی وجود میں انسانی تجربے کا ناگزیر حصہ ہیں۔ یہ تمام ناخوشگوار اور تکلیف دہ حالات ان سے بچنے کی پوری کوشش کے باوجود پیدا ہوسکتے ہیں۔ اگر کوئی اپنے بہترین رویے میں رہنے کا انتظام کرتا ہے تو ، دوسرے بھی ایسا کرنے کے قابل نہیں ہوسکتے ہیں جس کے نتیجے میں غصہ ، تنازعات اور مختلف دوسرے منفی جذبات اور اندرونی اور بیرونی انسانی حالتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس طرح کی منفی باتوں کے سامنے ہتھیار ڈالنا اور ان کے ذریعہ ٹوٹے ہوئے دل ، مایوس اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونا ، اور منفی جذبات ، غصہ ، غم ، مایوسی اور افسردگی میں الجھ جانا ہمیشہ آسان ہوتا ہے۔ اس طرح کے ناخوشگوار حالات کے آغاز میں مؤثر طریقے سے نمٹنے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ اپنی پوری صلاحیت کے مطابق صبر اور صبر سے کام لیا جائے۔ صبر کی خوبیاں بے شمار ہیں، جس کے نتیجے میں انفرادی اور اجتماعی انسانی فلاح و بہبود کے لیے بے پناہ بھلائی ہوتی ہے۔

صبر کی آئینہ دار تصویر شکر گزاری ہے جو کسی کی نعمتوں کو شمار کر رہی ہے، یہاں تک کہ وہ نعمتیں بھی جو خوراک، ہوا، سانس، صحت، خوشحالی، امن، سلامتی، خوشی، پہننے کے لیے کپڑے اور اپنے آپ کو شدید موسمی حالات، دوستی، تعلقات، خاندان اور اپنے ذہن، دل اور عقل سے محفوظ رکھنے کے لیے معمولی سمجھی جاتی ہیں۔ شکر گزاری ہر اچھی چیز کے لئے شکر گزار اور تعریف کرنا ہے۔ صبر کی طرح ، شکر گزاری اور شکر گزاری انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی فلاح و بہبود کے لئے بے پناہ روحانی فوائد فراہم کرتی ہے۔ غزالی نے اپنی *عظیم تصنیف "احیئ العلوم الدین"* یا "خدا کی راہ کے علم کا احیاء" کی چوتھی جلد میں دوسری کتاب سے ان بے پناہ انسانی صفات کا شاندار علاج یہاں مختصر شکل میں اس طرح پیش کیا ہے:

ایمان کے دو حصے ہیں، آدھا صبر اور آدھا شکرگزاری۔ یہ صفات الٰہی کی دو صفات ہیں اور الٰہی ناموں سے دو نام ہیں - *صبور* (ایک کامل صبر کے ساتھ) اور *شکور* (ایک کامل شکر گزار)۔ صبر اور شکر گزاری کی حقیقت سے ناواقف ہونا ایمان کے دونوں حصوں سے ناواقف ہونا اور خدا کی دو صفات سے ناواقف ہونا ہے۔ ایمان کے بغیر الٰہی قربت حاصل نہیں ہوتی، اور ایمان کا راستہ اس ہستی کو جاننے کے بغیر نہیں طے کیا جا سکتا جس پر ایمان رکھنے کی ضرورت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کے دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالنا ضروری ہے - صبر اور

شکرگزاری۔ چونکہ یہ دونوں [ایمان کے] ایک دوسرے کے ساتھ مل گئے ہیں، اس لیے ان دونوں کو ایک ہی کتاب میں سات ابواب میں بیان کیا جائے گا۔

صبر کی تشریح

صبر کی فضیلت: اللہ تعالیٰ نے صبر کرنے والوں کی بے شمار خوبیاں بیان کی ہیں۔ قرآن مجید نے ستر سے زائد مقامات پر صبر کا ذکر کیا ہے۔ ان آیات میں بہت سی اعلیٰ درجات اور نیکی کو صبر سے منسوب کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر خدا فرماتا ہے:

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا

"اور ہم نے ان میں سے بہت سے پیشوا پیدا کیے جب وہ صبر کرتے تھے اور لوگوں کو ہمارے حکم سے (سیدھے راستے) کی رہنمائی کرتے تھے۔ (سورۃ البقرۃ باب 32، آیت 24)

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنَىٰ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ بِمَا صَبَرُوا

اور تیرے پروردگار کا عمدہ کلام (اے محمد!) بنی اسرائیل کی خدمت ان کے صبر کے سبب سے پوری ہوئی۔ (سورۃ البقرۃ باب 7، آیت 137)

وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِينَ صَبَرُوا أَجْرَهُم بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ

"اور جو لوگ صبر کرتے ہیں ہم انہیں ان کے اعمال کی اجر ضرور دیں گے۔" (سورۃ البقرۃ باب ١۶ آیت ٩۶)

أُولَٰئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُم مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوا

"ان لوگوں کو ان کے صبر کی وجہ سے دوگنا انعام ملے گا۔" (سورۃ البقرۃ البقرۃ آیت 54)

إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُم بِغَيْرِ حِسَابٍ

"صبر کرنے والوں کے لیے بے پناہ اجر ہے۔" (سورۃ البقرۃ سورۃ 39، آیت 10)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صبر کے بدلے بے پناہ خدائی اجر عطا کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ تمام نیک اعمال میں سے یہی (صبر) صرف وہی ہے جس کا اللہ تعالیٰ کا اجر لامحدود ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے صبر کرنے والوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کے ساتھ ہے۔

وَٱصۡبِرُوٓاْۚ إِنَّ ٱللَّهَ مَعَ ٱلصَّٰبِرِينَ

"اور صبر کرو۔ بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے یہاں تک کہ اللہ ان کے لیے آسانی کے دروازے کھول دے۔ (سورۃ البقرۃ آیت ۸، آیت ۴۶)

ایک جگہ پر صبر کرنے والوں کے لیے رحمت، برکت اور ہدایت کی صفات کو یکجا کیا گیا ہے۔ ان تینوں صفات کو ملا کر کسی دوسرے عبادت گزار سے منسوب نہیں کیا گیا ہے:

أُوْلَٰٓئِكَ عَلَيۡهِمۡ صَلَوَٰتٞ مِّن رَّبِّهِمۡ وَرَحۡمَةٞۖ وَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلۡمُهۡتَدُونَ

"ان پر ان پر ان کے رب کی طرف سے سلام اور رحمت ہے اور وہی ہدایت پانے والے ہیں۔" (سورۃ البقرۃ باب 2 آیت 157)

صبر کی فضیلت اور فضیلت کے بارے میں نبوتیوں کی بہت سی روایات موجود ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلصَّبْرُ نِصْفُ الْإِيْمَان

"صبر ایمان کا آدھا حصہ ہے۔" (بیان کردہ *احادیث میں ابو نعیم* اور *خطیب* رضی اللہ عنہ سے بیان کیا گیا ہے

ایک روایت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو چیزیں تمہیں کم دی گئی ہیں ان میں یقین اور صبر شامل ہیں۔ جس شخص کو ان دونوں سے زیادہ حصہ ملے، یہاں تک کہ رات کی نمازوں اور ناپسندیدہ روزوں میں بھی زیادہ حصہ نہ ہو، اس کی کوئی فکر کی کوئی وجہ نہیں ہے [کیونکہ یقین اور صبر کسی کے حق میں بھاری ہے]۔ آج آپ جس حالت میں ہیں اس میں اگر آپ اس میں صبر کرتے ہیں تو یہ میرے نزدیک اس سے زیادہ بہتر ہے کہ تم اتنے اچھے اعمال لاؤ جو تم سب مل کر کر رہے ہیں۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ میرے جانے کے بعد دنیا تمہارے لیے کھل جائے گی اور تم ایک دوسرے کو برا سمجھو گے۔ اس وقت ، آسمانوں کے باشندے (آسمانی مخلوقات) آپ کو برا سمجھیں گے۔ جو شخص اس حالت میں صبر کرے اور اپنے آپ کو (تمام برائیوں کا احتساب اور خود احتسابی کی حالت میں) قبول کرے تو اسے اللہ کی طرف سے پورا اجر ملے گا۔ اس کے بعد آپ نے مندرجہ ذیل شلوک پڑھا:

مَا عِندَكُمۡ يَنفَدُۖ وَمَا عِندَ ٱللَّهِ بَاقٖۗ وَلَنَجۡزِيَنَّ ٱلَّذِينَ صَبَرُوٓاْ أَجۡرَهُم

"جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ برباد ہو جائے گا، اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ ہمیشہ رہنے والا اور ہمیشہ رہنے والا ہے۔" اور بے شک ہم صبر کرنے والوں کو ان کے اعمال کا عمدہ بدلہ دیں گے (سورۃ البقرۃ باب ۱۶ آیت ۹۶)

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی داؤد علیہ السلام پر وحی بھیجی کہ میرے کردار کو اختیار کرو اور میرے کردار کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ میں بہت صبر کرتا ہوں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے *انصار (*مدینہ کے باشندوں نے ظلم و ستم سے بچنے کے لیے مکہ سے فرار ہونے والے مسلمانوں کی میزبانی کی) کی زیارت کی تو آپ نے ان سے پوچھا: کیا تم ایمان دار ہو؟ سب خاموش رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہاں ہم مومن ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: تمہارے ایمان کی نشانی کیا ہے؟ انصار نے فرمایا: جب ہمیں خوشحالی ملتی ہے تو ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہیں، جب ہمیں مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو صبر کرتے ہیں، اور ہم (خدا کے فیصلے) کو قبول کرتے ہیں۔ فرمایا: رب کعبہ کی قسم! تم مومن ہو (کیونکہ یہ سچے مومنوں کی خصوصیات ہیں)۔ (بیان کردہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: جب تم ناپسند کی چیزوں پر صبر کرو گے تو تم اپنی پسند کو حاصل کرو گے۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے نام ایک مفصل خط لکھا اور اس میں دیگر باتوں کے علاوہ لکھا: صبر اختیار کرو اور یاد رکھو کہ صبر دو طرح کا ہے، ایک دوسرے سے افضل ہے، مصیبتوں پر صبر کرنا افضل ہے اور اس سے بھی زیادہ افضل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں پر صبر کیا جن سے اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے۔ انسانیت کی بہتری کے لیے الٰہی حکمت، اگرچہ وہ مطلوبہ اور خوشگوار معلوم ہو سکتے ہیں]۔ جان لو کہ صبر ایمان کی بنیادی بنیاد ہے اور اس لیے کہ *تقویٰ* (تقویٰ اور خوف و ہرز) تمام نیک اعمال پر سب سے افضل ہے اور یہ صبر سے پیدا ہوتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایمان کی بنیادیں چار ستونوں پر ہیں: یقین، صبر، جدوجہد [اللہ کی راہ میں خاص طور پر باطنی روحانی کشمکش کے لحاظ سے] اور عدل (ہر ایک کے ساتھ اور ہر چیز میں عدل و انصاف)۔ فکری طور پر صبر اب بھی ایک اچھی خوبی ہے، تاہم اس بات کو اس وقت تک پوری طرح سمجھا نہیں جا سکتا جب تک کہ ہم صبر کی حقیقت اور اس کے معنی کی وضاحت نہ کریں۔

صبر کی حقیقت اور معنی

صبر - خدا کی راہ کا ایک مقام ، روحانی کشمکش کی منزل (*سلوک*): یہ معلوم ہونا چاہئے کہ صبر خدا کی راہ کے مراکز میں سے ایک مقام ہے اور روحانی مسافروں کی منزلوں میں سے ایک منزل ہے۔ خدا کی راہ کے تمام مقامات تین معاملات میں پائے جاتے ہیں: پہلا، فہم یا معرفف؛ دوسرا، [اندرونی روحانی] حالتیں؛ تیسرا، اعمال یا [ظاہری جسمانی] اعمال۔ ان میں سے ، تفہیم وہ بنیادی معاملہ ہے جو [روحانی] حالتوں کو جنم دیتا ہے جس کے نتیجے میں [شرف] اعمال پیدا ہوتے ہیں۔ ان تینوں میں سے ، تفہیم درخت سے مشابہت رکھتی ہے ، حالتیں شاخوں سے ملتی جلتی ہیں ، اور اعمال پھلوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔ روحانی مسافروں کی تمام منزلیں ایسی ہی ہیں۔ صبر فہم اور [اندرونی روحانی] حالت کے امتزاج کا نام ہے۔ عمل وہ پھل ہے جو ان دونوں (فہم اور باطنی روحانی حالت) کے وجود کے نتیجے میں وجود میں آتا ہے۔ اب ہم ان تینوں معاملات پر روشنی ڈالیں گے۔

فرشتوں ، انسانوں اور جانوروں کے درمیان موجود ترتیب (ترتیب) کی تفہیم کے بغیر صبر کی تفہیم حاصل نہیں کی جا سکتی۔ صبر ایک عجیب و غریب انسانی خصوصیت ہے [جو چیزوں کی مجموعی اسکیم میں کسی دوسری تخلیق کے ذریعہ شریک نہیں ہے]۔ جانوروں اور فرشتوں میں صبر کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، جانوروں میں ان کی موروثی غلطی کی وجہ سے اور فرشتوں میں ان کے فطری کمال کی وجہ سے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جانوروں پر ہوس مسلط کر دی گئی ہے اور وہ اس کے تابع ہو چکے ہیں کہ ان کی نقل و حرکت یا خاموشی کی وجہ محض ہوس ہے۔ ان کے پاس کوئی باطنی طاقت نہیں ہے جو ان کے اندر اس ہوس کو روکے اور انہیں ان کے اس مقصد سے روک سکے۔ ہوس کا مقابلہ کرنے میں ، تحمل اور مخالفت کی طاقت کو برقرار رکھنا صبر ہے۔ فرشتوں کو صرف

اس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ رب تعالی کی خواہش کریں اور اس سے ان کی قربت اور قربت کے درجات سے راضی ہوں۔ ان میں ایسی ہوس نہیں رکھی گئی ہے جو انہیں الٰہی قربت اور رب عظیم کی ہستی کی تڑپ سے دور کردے۔ اور نہ ہی انہیں کسی ایسی فوج کی ضرورت ہے جو انہیں ان قوتوں پر قابو پانے اور محکوم کرنے پر مجبور کرے جو انہیں خدائی حضوری سے روکتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ قوتیں جو کسی کو حضور الٰہی سے روکتی ہیں وہ ان میں ہوس اور خواہشات پیدا نہیں ہوئی ہیں۔ دوسری طرف انسان کو ہوس اور وہ طاقت بھی ملی ہے جس کے ذریعے انسان ہوس پر غالب آ سکتا ہے۔ انسان کی تخلیق کے آغاز میں جانوروں کی طرح عیبوں (خامیوں اور کمزوریوں) کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے کہ اس میں خوراک کی ہوس کے علاوہ کوئی اور ہوس نہیں تھی جس کی اسے ضرورت تھی۔ کچھ عرصہ بعد [جیسے جیسے کوئی زندگی میں ترقی کرتا گیا] ، ایک میں کھیل (کھیل) ، آرائش اور خوبصورتی کی ہوس پیدا ہوئی۔ اس کے بعد [جیسے جیسے کوئی شخص زندگی میں مزید ترقی کرتا گیا اور بلوغت کو پہنچا] شادی کی ہوس پیدا ہوئی۔ یہ خواہشات مخصوص ترتیب میں ظاہر ہوتی ہیں۔ پہلے تو اپنے اندر صبر کی طاقت نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ صبر ایک فوج کا نام ہے جو دوسری فوج کے خلاف ثابت قدم اور ثابت قدمی سے کھڑی ہے جب ان کے مقاصد اور مقاصد کے درمیان تصادم کی وجہ سے ان کے درمیان جنگ جاری رہتی ہے۔ صرف ایک ہی فوج جو بچے میں موجود ہوتی ہے، وہ خواہشات ہیں جو جانوروں میں بھی موجود ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے انسان کا درجہ [دوسری تمام مخلوقات پر] افضل کر دیا ہے اور اس کا درجہ جانوروں سے بلند رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انسان کا وجود مکمل ہو جاتا ہے (انسان بلوغت کے وقت بالغ ہونے اور جسمانی نشوونما کی عمر کو پہنچ جاتا ہے، اگرچہ ذہنی، نفسیاتی، جذباتی اور فکری نشوونما کا مکمل پیمانہ چالیس سال کی عمر کے آس پاس ہوتا ہے) خدا ہر فرد کے لیے دو فرشتے مقرر کرتا ہے، ان میں سے ایک کو صحیح راستہ سکھاتا ہے اور دوسرا صحیح راستے پر چلنے میں مدد کرتا ہے۔ ان دو فرشتوں کی وجہ سے ہی انسان کو جانوروں پر امتیاز حاصل ہے۔ اس کے علاوہ انسان کی اور بھی خصوصیات ہیں، پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ خدا کی معرفت رکھتا ہے اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اس کے ساتھ لایا گیا پیغام کو سمجھتا ہے جو اسی پیغام کی انتہا ہے جو زمین پر انسانی تاریخ میں دوسرے تمام الہامی انبیاء کی طرف سے لایا گیا تھا)، اور دوسری خصوصیت یہ ہے کہ تمام معاملات کے انکشاف اور ان کے حتمی انجام سے متعلق حکمت اور اسباب کو سمجھنے کی خصوصیت ہے۔ یہ دونوں صفات یا خصوصیات اس فرشتے سے بھی حاصل ہوتی ہیں جو ہدایت اور رہنمائی کا ذمہ دار ہے۔ جانوروں کے پاس نہ تو خدا اور اس کے رسول کی گنوسس ہے اور نہ ہی وہ ان کے انجام کو جانتے ہیں۔ اس کے بجائے ، وہ صرف وہی راستہ دیکھتے ہیں جس کی وہ ایک خاص وقت پر خواہش کرتے ہیں اور صرف ان چیزوں کا انتظار کرتے ہیں جو انہیں مزیدار لگتے ہیں۔ یہ ان کی حالت اس حد تک ہے کہ اگر وہ بیمار بھی ہوں اور انہیں کوئی فائدہ مند دوا دی جائے تو نہ تو وہ اسے قبول کریں گے اور نہ ہی اس کے فوائد قبول کریں گے۔

انسان ہدایت کی روشنی سے جانتا ہے کہ شہوت کی پیروی اس کے حتمی انجام (اختتام) کے لحاظ سے نقصان دہ ہے۔ لیکن صرف یہ جاننا کافی نہیں ہے کہ ہوس کی پیروی انسان کے لیے نقصان دہ ہے، بلکہ ہر نقصان دہ چیز کو ترک کرنے کی طاقت ہونی چاہیے۔ انسان ان چیزوں سے واقف ہے جو کسی کو نقصان پہنچاتی ہیں لیکن ان کو ترک کرنے یا روکنے کی طاقت نہیں رکھتی جیسے بیماریاں [اور لذیذ کھانا، مشروبات اور ایسی چیزیں جو کسی کی صحت کے لیے نقصان دہ ہیں]۔ اس صورت میں انسان کو اس قابلیت اور طاقت کی ضرورت ہوتی ہے جس کے ذریعے وہ ہوس کو دور کر سکتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اتنی روحانی کشمکش کر سکتا ہے کہ اس کی نچلی نفس (نفس) کے ساتھ اس کی رگڑ، استدلال اور دشمنی ختم ہو جائے [اور اس کے نتیجے میں ادنیٰ نفس ہر چیز کے تابع ہو جائے جو اچھا ہے]۔ اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ مقرر کیا ہے جو انسان کو ہدایت کی راہ میں رکھتا ہے اور ان لشکروں سے اس کی مدد اور مدد کرتا ہے جو کوئی نہیں دیکھتا۔ ان لشکروں کا فرض ہے کہ وہ ہوس کی فوجوں سے لڑیں اور ان کو پسپا کریں۔ کبھی یہ [فرشتہ] لشکر کمزور ہو جاتے ہیں اور کبھی مضبوط ہو جاتے ہیں۔ ان کی

کمزوری یا طاقت کا انحصار اس بات پر ہے کہ کسی کو خدا کی طرف سے کتنی مدد ملی ہے۔ یہ مخلوقات کے لیے ہدایت کے نور کی طاقت یا کمزوری کی طرح ہے۔

راہ الٰہی کی قوت اور شہوت کی قوت: سمجھنے کی آسانی کی خاطر ہم اس صفت کو جو انسان کو جانوروں پر فضیلت دیتی ہے اسے "خدا کی راہ کی قوت" اور اس کے مضمرات کی تلاش میں آنے والی ہوس کو "شہوت کی قوت" قرار دیں گے۔ اب ہمیں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ راہ الٰہی کی طاقت اور ہوس کی طاقت کے درمیان جنگ چل رہی ہے۔ کبھی پہلی [قوت] دوسرے پر غالب آجاتی ہے اور کبھی دوسری پہلی کو شکست دیتی ہے۔ اس جنگ کا میدان جنگ [انسان کا] دل ہے۔ اللہ تعالیٰ کی راہ کی طاقت کو فرشتوں کی مدد ملتی ہے جو خدا کی جماعت کے مددگار ہیں اور شہوت کی قوت کو شیطان اور اس کی جماعت سے مدد ملتی ہے جو خدا کے مخالفین کے مددگار ہیں۔ صبر یہ ہے کہ خدا کی طرف جانے والی راہ کی قوت ہوس کی قوت کے خلاف ثابت قدم اور ثابت قدم رہے۔ اگر بندہ (یعنی انسان) ثابت قدم رہے اور حریف کو شکست دے اور ہمیشہ اس کی مخالفت پر تٹ رہتا ہے تو یہ خدا کی جماعت کی مدد کرنے کے مترادف ہے اور صبر کرنے والوں کے گروہوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص کمزور اور شکست کھا جاتا ہے یہاں تک کہ شہوت کی قوت اس حد تک محکوم ہو جاتی ہے کہ وہ صبر کرنے سے قاصر ہو جائے تو وہ شیطان کی جماعت میں شامل ہو جاتا ہے۔

روحانی حالت اور اس کے ثمرات: اس وضاحت کا نتیجہ یہ ہے کہ ہوس کو ترک کرنا ایک ایسا عمل ہے جو صبر کی حالت میں وجود میں آتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں صبر کی کیفیت کا پھل ہوس کو ترک کرنا ہے۔ مزید یہ کہ صبر راہ الٰہی کی قوت ہے جو ہوس کی قوت کے خلاف ثابت قدم رہتی ہے۔ خدا کی راہ کی قوت کا تسلسل اور دوام ایک ایسی کیفیت ہے جو خواہشات کو سمجھنے اور ان کی مخالفت کے اسباب کو سمجھنے سے حاصل ہوتی ہے۔ جب کسی کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ ہوس خدا کی دشمن ہے اور راہ کی راہ میں ڈاکو ہے تو راہ الٰہی کی طاقت مضبوط ہو جاتی ہے۔ یہ یقین وہ سمجھ ہے جسے "ایمان" (ایمان) سمجھا جاتا ہے۔ جب راہ الٰہی کی قوت مضبوط ہوتی ہے تو انسان اپنی استقامت میں انحراف (کمزور) نہیں ہوتا اور وہ اعمال خود بخود انجام دیے جاتے ہیں جو ہوس کے اثرات کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شہوت کو ترک کرنے کا مرحلہ راہ الٰہی کی طاقت کو سمجھے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا جو شہوت کی قوت کے برعکس ہے۔

اپنے مقصد کی طرف لوٹیں: [خلاصہ میں،] صبر نینچ نفس کی شہوت کی قوت کے خلاف جنگ میں راہ الٰہی کی قوت کی استقامت ہے۔ یہ لڑائی [کشمکش اور مسلسل کشمکش] انسان کی مخصوص خصوصیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ *کرمان کٹیبین*' (ہر انسان کے دو کندھوں پر دو فرشتے جو اس شخص کے تمام اعمال کو اچھے ہوں یا برے، زندگی بھر کے انسانی اعمال کے ایک رجسٹر میں درج کرتے ہیں جو قیامت کے دن خدا کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں تاکہ اس شخص کو یا تو ابدی سعادت حاصل کرنے والا ہو یا ابدی عذاب کا حصول حاصل کرنے والے) ہر شخص پر مقرر کیا جاتا ہے سوائے ان لوگوں کے جو پاگل ہیں اپنی ذہنی صلاحیتیں کھو چکے ہیں اور ان میں کسی بھی چیز کا احساس نہیں ہے جو لفظ کے طبی معنوں میں بچی ہے) اور بچے (وہ لوگ جو بلوغت کو نہیں پہنچتے ہیں کیونکہ یہی وہ مقام ہے جب کوئی عقل حاصل کرتا ہے اور اپنے اعمال کا خدائی جوابدہ بن جاتا ہے) اور اپنے اعمال کو ریکارڈ نہیں کرتے۔ ہم نے پہلے بھی یہ لکھا ہے کہ اگر فرشتوں کو ان سے فائدہ اٹھانے کے لیے توجہ دی جائے تو وہ اسے نیک عمل کے طور پر درج کرتے ہیں اور اگر ان سے پرہیز کیا جاتا ہے (کسی بھی معاملے میں برائی کے فیصلے کرنے اور اس فیصلے کے نتائج پر عمل کرنے کے لیے]۔ وہ اسے برائی کے طور پر لکھتے ہیں۔ پاگل اور بچوں میں ان سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت نہیں ہے (فرشتہ قوتیں یا خدا کی طرف جانے کی قوت) [کیونکہ ان میں تمام

معاملات میں صحیح یا غلط کا فہم نہیں ہے]، اسی لیے ان سے توجہ دینے یا پرہیز کرنے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ وہ صرف ان لوگوں کے اعمال کو ریکارڈ کرتے ہیں جو ان پر توجہ دینے یا ان سے بچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

لیکن بعض اوقات ہدایت کی روشنی کا طلوع کم عمری میں ہی شروع ہو جاتا ہے اور یہ نور سمجھ بوجھ (بلوغت) کے وقت مکمل اور کامل ہو جاتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے صبح کی روشنی مدھم ہوتی ہے لیکن جب سورج طلوع ہوتا ہے تو وہ مکمل ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ ہدایت کامل نہیں ہے اور اگر کوئی شخص اس کے مضمرات پر عمل نہ کرے تو اس کی آخرت کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا، لیکن وہ دنیاوی نقصان سے بچ نہیں سکے گا۔ جو شخص کسی بچے کا سرپرست یا ذمہ دار ہے (جیسے والدین کی طرح)، اور [اس بچے کے لیے] مہربان اور شفقت بھی رکھتا ہے، اور [فطری طور پر] *کرمان کاتبین'* کی طرح نیک مزاج ہے، اسے چاہیے کہ وہ بچے کے دل کی کتاب پر اچھائی اور برائی کے تمام تصورات (معیار یا خیالات) نقش کرے۔ اس کے بعد اس کتاب کا منظر عام پر آتا ہے، اگر بچہ نیکی کرتا ہے تو بچے کی تعریف کرتا ہے اور اگر بچہ کوئی برا کام کرتا ہے تو بچے کو اس کے خلاف نصیحت اور سرزنش کی جاتی ہے۔ سرپرست یا ذمہ دار فرد جس کی دیکھ بھال اور تربیت کے تحت بچے کے ساتھ اس قسم کا معاملہ ہوتا ہے ، وہ فرشتہ کی عادات کا وارث ہوتا ہے اور ان کی [شرف] کردار کی خصوصیات کا قابل اعتماد کیریئر ہوتا ہے۔ بچے کے فائدے کے لیے فرشتہ کے کردار کی خصلتوں، صفات اور عادات کو بروئے کار لاتے ہوئے ایسا شخص فرشتوں کی طرح خدا کی قربت حاصل کرے گا اور خدا کے انبیاء اور مقربوں کے گروہوں (*صدقین* یا اولیاء اور گنوسٹک) میں شامل ہو جائے گا۔

صبر کرنے والوں کے تین درجے: جب شہوت ختم ہو جاتی ہے اور خدا کی راہ کی طاقت غالب ہو جاتی ہے، اور مسلسل روحانی کشمکش اور طویل استقامت کے بعد کسی کے لیے صبر آسان ہو جاتا ہے، تو بندہ [اس وقت] [روحانی] مقام حاصل کرتا ہے جسے "*رضا*" یا رضا الٰہی کی قبولیت کہا جاتا ہے۔ اس کی تفصیل کتاب "الٰہی کی مرضی کی قبولیت" (باب 16) میں تفصیل سے بیان کی جائے گی۔ کچھ گنوسٹکس نے کہا ہے کہ صبر کے لوگوں کے تین درجات ہیں۔ ایک ڈگری ہوس کو ترک کرنا یا توبہ کرنے والوں کی ڈگری ہے۔ دوسری (دوسری درجہ) یہ ہے کہ الٰہی کی مرضی قبول ہو اور وہ ہے پرہیز کرنے والوں کا درجا [ادنیٰ نفس کی خواہشات سے جسے *زاہدین* بھی کہا جاتا ہے]۔ تیسرا درجہ، خدا کے ساتھ جو سلوک کرتا ہے اس سے محبت کرنا ہے [چاہے وہ اچھا ہو یا برا، مطلوبہ ہو یا ناپسندیدہ، آسانی ہو یا مصیبت، خوشحالی یا مصیبت]۔ یہ خدا کے دوستوں اور مقربوں کا درجہ ہے۔ ہم [خدائی] محبت کی کتاب (باب 16) میں وضاحت کریں گے کہ [خدا] کی محبت کا [روحانی] مقام الٰہی کی مرضی کی قبولیت کے [روحانی] مقام سے برتر ہے، جو بدلے میں صبر کے [روحانی] مقام سے برتر ہے۔

واضح رہے کہ صبر کو شریعت کے احکام کے لحاظ سے مختلف اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے جیسے واجب (*فرد*)، ناپسندیدہ (اختیاری یا *نفلہ)*، ناپسندیدہ (*مکروح*) اور حرام (*حرام*)۔ لہٰذا ان چیزوں پر صبر کرنا واجب ہے جو ناپسندیدہ چیزوں پر حرام ہیں، ناپسندیدہ چیزوں پر ناپسندیدہ یا اختیاری ہیں۔ ان چیزوں پر صبر کرنا حرام ہے جن کی شریعت الٰہی میں حرام ہے۔ مثال کے طور پر، اگر کوئی کسی کو قتل کرنا چاہتا ہے تو اس کے ساتھ صبر نہیں کرنا چاہیے [اور اس کو ہونے سے روکنے کے لیے جو ضروری ہے وہ کرنا چاہیے]۔ اس پر صبر کرنا ناجائز ہو گا [کیونکہ یہ شریعت الٰہی کی خلاف ورزی ہو گی]۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو ہراساں کرے یا اس کے ساتھ جنسی زیادتی کرے جس سے اس کا غصہ اور غیرت پیدا ہو لیکن وہ صبر کی وجہ سے اس کا اظہار نہ کرے اور اپنی بیوی کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے اس کا خاموش تماشائی بن جائے تو یہ صبر حرام ہے اور اس کو ہر طرح سے روکنا واجب ہے۔

اس درجہ بندی کا مقصد یہ ہے کہ ہم صبر کے بارے میں شریعت الٰہی کے معیار کو سمجھیں۔ نبوی احادیث میں صبر کو نصف ایمان قرار دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر قسم کا صبر قابل تعریف ہے، بلکہ صرف یہ کہ صبر اچھا ہے جو شریعت الٰہی کی نظر میں اچھا ہے، ورنہ بدن کو بلا وجہ تکلیف پہنچانے کا کوئی اجر یا ثواب الٰہی نہیں ہے۔

ایک نوکر کو تمام ریاستوں میں صبر کی ضرورت ہوتی ہے

واضح رہے کہ زندگی میں جن حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ دو طرح کے ہوتے ہیں، یا تو وہ اپنی خواہشات کے مطابق ہوتے ہیں یا وہ ناپسندیدہ ہوتے ہیں اور وہ ان کو ناپسند کرتے ہیں۔ ان دونوں حالتوں میں ایک نوکر کو صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ پسندیدہ حالتوں میں صحت، دولت، شہرت، رشتہ داروں، دوستوں، مددگاروں اور پیروکاروں کی کثرت، دولت و مال کی زیادتی، دنیا کی تمام خوشیاں اور نعمتیں شامل ہیں۔ ان حالات میں بندے کو صبر کی اشد ضرورت ہوتی ہے کیونکہ اگر کوئی شخص نفس نفس کو روکتا اور اسے تمام دنیاوی لذتوں اور لذتوں سے آزاد چھوڑ دیتا ہے، اگرچہ یہ لذتیں جائز ہیں، تو پھر اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ سرکش اور تکبر کرنے والا ہو جائے گا۔ قرآن مجید کے مطابق انسانی مزاج کی یہ خاص خصوصیت ہے کہ جب انسان خوشحالی میں ہوتا ہے تو بغاوت پر جھک جاتا ہے:

كَلَّآ إِنَّ ٱلْإِنسَٰنَ لَيَطْغَىٰٓ ﴿٦﴾ أَن رَّءَاهُ ٱسْتَغْنَىٰٓ ﴿٧﴾

"بے شک انسان اپنے آپ کو خوشحال اور کفیل اور خود کفیل دیکھتا ہے تو وہ سرکشی کا سہارا لیتا ہے۔ (سورۃ البقرۃ سورۃ البقرۃ القرآن آیت 6-7)

یہی وجہ ہے کہ بعض عرفان کہتے ہیں کہ مومن مشکلات میں صبر کرتا ہے لیکن خدا کا مقرب (صدق) فلاح و بہبود کی حالت میں صبر کا مظاہرہ کرتا ہے۔ سہل بن عبداللہ تستاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سلامتی اور خوشحالی پر صبر کرنا سختی پر صبر کرنے سے زیادہ مشکل ہے۔ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے دنیاوی مالوں اور مالوں کے دروازے کھل گئے تو کہنے لگے: جب ہم کمی اور تنگدستی سے آزمایا گیا تو ہم نے اسے صبر سے برداشت کیا اور اس آزمائش اور مصیبت میں کامیاب ہوئے۔ اب ہمیں دولت اور خوشحالی کے ساتھ آزمایا جا رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ہم اس کے ساتھ صبر نہ کر سکیں اور [اگر ایسا ہوتا ہے] تو ہم [اس آزمائش] میں ناکام ہوجائیں گے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پیغمبر کی وفات کے بعد خوف خدا کی وجہ سے خوشحالی میں ملوث ہونے سے خود کو روکنے میں ناکامی کا خدشہ ظاہر کیا۔ وہ اس میں بھی فاتح نکلے ، کیونکہ انہوں نے تسلیم کیا کہ اپنے آپ کو خدا کی راہ پر گامزن رکھنے کے لئے مصیبت اور خوشحالی دونوں میں صبر کی ضرورت ہے۔

دوسری قسم میں وہ حالات شامل ہیں جو کسی کی خواہشات کے مطابق نہیں ہیں۔ یہ حالات تین قسمیں ہو سکتے ہیں: وہ جو کسی کے اختیار میں ہوں مثلا اچھے اور برے اعمال (جو اس کی صلاحیت رکھتے ہیں)، دوسری وہ جو کسی

کے اختیار میں نہیں ہیں مثلا مشکلات اور حادثات، اور تیسری بات یہ کہ وہ ابتدا میں کسی کے اختیار میں نہیں ہیں بلکہ بعد میں ان کے بارے میں کچھ کرنے کی توفیق ہے۔

اپنی کشمکش اور مشکلات کو چھپانا صبر کا کمال ہے: صبر کا کمال اپنی بیماری، غربت اور دیگر تمام مشکلات کو (تمام لوگوں سے) چھپانا ہے۔ صبر کی ان درجہ بندیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ صبر تمام حالتوں اور اعمال میں واجب ہے۔ جو شخص اپنے آپ کو ہوس سے بچانے کے لیے تنہائی اختیار کرتا ہے، وہ صبر سے غافل نہیں ہو سکتا، چاہے وہ کس حد تک تنہا رہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شیطانی اشارے دل پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ان اشاروں سے پیدا ہونے والی پریشانی اور پریشانی تنہائی میں بھی کسی کو باطنی سکون حاصل نہیں کرتی۔ دل میں دو طرح کے خیالات پیدا ہوتے ہیں - یا تو ان چیزوں کے بارے میں جو کسی نے کھو دیا ہے اور ان کی بازیابی یا اصلاح کرنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے ، یا ان چیزوں کے بارے میں جو مستقبل میں حاصل کرنا ممکن ہے۔ خیالات ، چاہے وہ [ماضی میں] کھوئی ہوئی چیزوں کے بارے میں ہوں یا مستقبل میں ملنے والی چیزوں کے بارے میں ، دونوں صورتوں میں کوئی وقت ضائع کرتا ہے۔ دل انسان کا ایک آلہ ہے [جو انسانی وجود کا جوہر ہے] اور اس کی زندگی اس کا اثاثہ ہے۔ اگر کسی کا دل *ایک لمحے کے لیے بھی* ذکر الٰہی اور غور و فکر سے غافل رہے تو یہ بہت بڑا نقصان ہوگا۔ یاد سے مراد دل کا وہ عمل ہے جو خدا کی آرزو اور اس کے ساتھ قربت کو پروان چڑھاتا ہے۔ غور و فکر سے مراد وہ عمل ہے جس کے ذریعے انسان خدا کی گنوسس حاصل کرتا ہے اور اس گنوسس کو الہی محبت کے حصول کا ذریعہ بناتا ہے۔ یہ اس وقت ممکن ہے جب دل کے خیالات جائز امور میں ہوں [جو کسی کی دنیاوی زندگی کے لیے ضروری ہیں، جیسے رزق کے ذرائع اور ہر وہ چیز جو اس کے حصول میں مدد کرتی ہے]۔ تاہم ، زیادہ تر وقت ایسا نہیں ہوتا ہے کیونکہ اکثر ، دل کے خیالات میں ہوسوں اور ان کے حصول کے لئے حکمت عملی شامل ہوتی ہے [ان خیالات کا مرکزی نقطہ ہیں]۔ یہ شخص ہمیشہ ان لوگوں کے ساتھ جھگڑا کرتا رہتا ہے جنہوں نے ایک بار بھی کسی کی مرضی کے خلاف کام کیا ہے، یا کسی کو یہ توہم پرستی (شبہ) ہے کہ وہ کسی کے خلاف جا سکتا ہے۔ اس کے بجائے وہ لوگ جو کسی کے لیے انتہائی مخلص، مخلص اور پرہیزگار ہوتے ہیں اور اپنی خیر سگالی حاصل کرنے کے لیے ساری زندگی مصروف رہتے ہیں، یہ شخص انہیں اپنا دشمن بھی سمجھتا ہے اور ان کو محکوم کرنے اور ان کے دل سے مخالفت کے تمام خیالات کو مٹانے کی حکمت عملی کے بارے میں سوچتا ہے۔ مختصرا یہ کہ یہ ان کی دائمی عیاشی ہے [کیونکہ وہ مسلسل ان منفی خیالات میں ڈوبے ہوئے ہیں] اور ان کے دن اور راتیں ان [منفی اور دشمنی] غور و فکر میں گزارتی ہیں [جو ان کی روحانی راہ اور فلاح و بہبود کے لیے نقصان دہ ہیں]۔

شیطان کے دو لشکر: یہ سب شیطان کی فرشیں ہیں۔ حقیقت میں، شیطان کے پاس دو فوجیں ہیں، ایک فوج جو اڑتی ہے اور دوسری فوج جو چلتی ہے۔ فوج جو اڑتی ہے ، اشارے سے مراد ہے اور فوج جو چلتی ہے ، ہوس سے مراد ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شیطان آگ سے پیدا ہوا ہے اور انسان کو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے۔ اس مٹی میں آگ بھی ہے۔ اس کے مزاج میں سکون ہے اور آگ کا مزاج حرکت ہے۔ اس لیے بھڑکتی ہوئی آگ کے بارے میں یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ حرکت نہیں کرے گی۔ اس کے بجائے ، یہ اپنی موروثی فطرت کے مطابق مستقل حرکت پر ہے۔ شیطان جسے آگ سے پیدا کیا گیا تھا اسے حکم دیا گیا تھا کہ وہ سکون حاصل کرے اور اس مخلوق کے سامنے سجدہ کرے جو مٹی سے پیدا کی گئی ہے۔ لیکن شیطان نے اس حکم کو قبول کرنے سے انکار کر دیا، تکبر اور نافرمانی کا مظاہرہ کیا، اور اس حکم کی اطاعت سے انکار کرنے کی یہی وجہ بیان کی کہ "مجھے آگ سے پیدا کیا گیا ہے، جبکہ آدم (باپ البشر) کو خاک سے پیدا کیا گیا ہے [لہذا، میں اس سے برتر ہوں اور کسی کمتر کے سامنے عاجزی کا مظاہرہ کرنا کسی برتر کے لائق نہیں ہے]"۔ پس جب اس شیطان نے ہمارے باپ آدم علیہ السلام کو سجدہ نہیں کیا تو پھر وہ اپنی اولاد (بنی نوع انسان) کو کیسے سجدہ کرے گا؟ اولاد کے سامنے سجدہ کرنے کا مقصد ان کے دلوں میں پیدا ہونے والے اشاروں سے پرہیز کرنا ہے۔ اگر شیطان اپنے اعمال سے باز آجائے تو یہ انسان کے

خوف سے اپنے غلط اعمال کو چھوڑ کر انسان کے تابع ہونے کے مترادف ہوگا۔ سجدے کی روح اطاعت اور اطاعت ہے۔ پیشانی کو زمین پر رکھنا اس کا جسم ہے۔ پیشانی کو زمین پر رکھنے کے عمل کو سجدہ کہا جاتا ہے۔ اگر اس فعل کو عاجزی اور عاجزی کے لیے استعمال کیا جاتا تو اس کا تصور اس عمل سے کیا جا سکتا تھا۔

[موضوع کا خلاصہ:] اس کے باوجود آپ کو خول کی وجہ سے موتی سے غافل نہیں ہونا چاہیے، جسم کی وجہ سے روح کا، اور چھلکے (بیرونی خول) کی وجہ سے پیتھ (کور یا جوہر) سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔ اس بات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ بیرونی دائرے (چیزوں اور معاملات کی ظاہری ظاہری شکلیں) میں پھنس جائیں اور غیب [روحانی] دائرے سے غفلت کریں [ہر چیز اور ہر معاملے کے بنیادی یا جوہر کو جاننے کے لئے]۔ ایسا نہ ہو کہ آپ صرف بیرونی (مرئی) دائرے میں پھنس جائیں اور غیب کے دائرے سے غافل ہو جائیں۔ تم جانتے ہو کہ شیطان تمہارا ابدی دشمن ہے جسے تمہیں گمراہ کرنے کے لیے مہلت دی گئی ہے۔ اب یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ آپ کی اطاعت کو قبول کرے گا یا آپ کے دل میں اشارے ڈالنے سے باز آئے گا، سوائے اس کے کہ جب آپ کے تمام خیالات اور غور و فکر ایک ہی ہو اور وہ یہ ہے کہ آپ خدا کے غور و فکر میں مکمل طور پر مگن ہو جائیں۔ اس صورت میں شیطان یقینا تم تک پہنچنے کی کوئی راہ نہ پائے گا اور تم خدا کے ان بندوں میں شامل ہو جاؤ گے جو سچے ہیں اور اس کی سلطنت سے باہر ہیں۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ کے دل میں کوئی خدائی غور و فکر نہ ہو اور آپ کے دل میں شیطانی اشارے بھی نہ ہوں۔ یہ شیطان ایک سیال عنصر ہے جو انسانی رگوں میں خون کی گردش کی طرح گردش کرتا ہے۔ یہ ایک مائع مادہ سے بھرا ہوا پیالے کی طرح ہے۔ اگر اب کوئی چاہتا ہے کہ کپ میں مائع مادہ اور اس میں ہوا بھی برقرار رہے تو یہ ممکن نہیں ہے ، یا کپ میں کوئی ہوا اور مائع مادہ بھی نہیں ہے۔ یہ بھی ظاہری طور پر ممکن نہیں ہے ، بلکہ ، جس حد تک مائع مادہ کپ سے غائب ہے ، اس حد تک ہوا کپ کو بھر دے گی۔ دل کی بھی یہی حالت ہے۔ اگر وہ (دل) اچھے غور و فکر سے بھرا ہوا ہو تو وہ شیطان کی مداخلت سے محفوظ رہے گا، ورنہ اس حد تک غفلت کرے گا کہ شیطان اس میں مداخلت کرے گا۔ یہ اس حد تک ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص ایک لمحے کے لیے بھی غفلت برتتا ہے تو غفلت کے اس لمحے میں شیطان کے سوا اس کا کوئی ساتھی نہیں ہوگا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَن يَعْشُ عَن ذِكْرِ ٱلرَّحْمَٰنِ نُقَيِّضْ لَهُۥ شَيْطَٰنًا فَهُوَ لَهُۥ قَرِينٌ

"اور جو شخص رحمان (خدا) کی یاد سے اندھا ہو جاتا ہے تو ہم اس پر شیطان ڈال دیتے ہیں تاکہ وہ ہر وقت اس کے ساتھ رہتا ہے [جو ہر قسم کی نیکی سے باز رہنے اور ہر قسم کی منفی باتوں کی طرف لے جانے کے لیے اس کا ساتھی بن جاتا ہے]۔ (سورة البقرة باب 43، آیت 36)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يُبْغِضُ الشَّابَّ الْفَارِغَ

"بے شک خدا ایک بیکار نوجوان کو ناپسند کرتا ہے (جو نوجوان یا عورت کچھ نہ کرنے میں وقت گزارتا ہے یا اپنا وقت ضائع کرتا ہے) [کیونکہ ان کا وقت اور جوانی کی توانائیاں غلط، منفی، غیر پیداواری، بیکار اور وقت ضائع کرنے والی کوششوں میں استعمال ہو رہی ہیں]۔

بیکار جوانی کو ناپسند کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی ایسا کام نہ کرے جس سے اس کا دل کسی جائز کام میں مشغول ہو جائے یا راہ الٰہی سے متعلق غور و فکر میں مشغول ہو جائے تو وہ بظاہر بیکار نظر آئے گا لیکن حقیقت میں شیطان نے اپنے دل میں اپنا ٹھکانہ بنا لیا ہوگا اور اپنی اولاد کو بڑھانے کے مقصد پر عمل پیرا ہوگا بیکار نوجوانوں کے دل کا۔ تمام جانوروں کے مقابلے میں شیطان سب سے زیادہ افزائش نسل کرتا ہے، کیونکہ اس کی فطری فطرت میں آگ ہوتی ہے اور اگر کوئی خشک چیز آگ کی راہ میں آجاتی ہے تو وہ تیزی سے پھیلتی رہتی ہے۔ نوجوان کے دل میں ہوس کا وجود بالکل آگ کے سامنے آنے والی سوکھی گھاس کی طرح ہے۔ پھر جس طرح آگ (خشک لکڑی) کے لیے خوراک (ایندھن) نہ ہونے کی وجہ سے وہ خاموش ہو جاتی ہے، اسی طرح اگر ہوس کا وجود ختم ہو جائے تو شیطان کچھ نہیں کر سکے گا اور اپنے ہاتھوں سے اپنا ٹھکانہ جلانے پر مجبور ہو جائے گا۔ اگر آپ اس پر غور کریں گے تو ، یہ کافی حد تک واضح ہوجائے گا کہ آپ کا بدترین دشمن آپ کے دل کی وہ خوبی ہے جسے آپ ہوس کہتے ہیں۔

صبر کی دوا اور اس میں مدد حاصل کرنے کا طریقہ

واضح رہے کہ جس نے یہ بیماری دی ہے اس نے بھی اس کی دوا سے آگاہ کیا ہے اور اس سے شفا یابی کا وعدہ بھی کیا ہے۔ اگرچہ صبر ایک انتہائی مشکل عمل ہے، لیکن علم اور عمل کے میگما (امتزاج) کے ذریعے اسے حاصل کرنا ممکن ہے۔ علم اور عمل وہ دو دوائیں ہیں جو دل کی تمام بیماریوں کے لیے ادویات تیار کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ بیماری کی قسم پر منحصر ہے ، اس کے مطابق صحیح علم اور عمل کی ضرورت ہوگی۔

مختلف قسم کی وجوہات ہیں جو صبر کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ ہر وجہ اس کے برعکس سے ٹھیک ہوتی ہے۔ اس وجہ کو ختم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جس کی وجہ سے یہ بیماری پیدا ہوئی ہے۔ ہم علاج کے طریقہ کار کا تعین کرنے کی کچھ مثالیں فراہم کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ، ایک فرد کرنے کی ہوس سے صبر کا خواہاں ہے۔ لیکن کسی کا پرائیوٹس پر کوئی اختیار نہیں ہے، یا پرائیوٹس پر اس کا اختیار نہیں ہے لیکن آنکھوں پر کوئی اختیار نہیں ہے، یا آنکھوں پر اس کا اختیار نہیں ہے لیکن دل پر اس کا کوئی اختیار نہیں ہے، جو ہر وقت شہوت کا مرکز رہتا ہے اور الٰہی کی یاد سے باز رہتا ہے۔ غور و فکر اور نیک اعمال پر استقامت کرنا۔ یہ ایک بیماری ہے اور اس کے علاج کی تفصیلات یہ ہیں جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ صبر راہ الٰہی کی قوت اور قوت ہوس کے درمیان جنگ کا نام ہے۔ اگر ہم ان میں سے کسی ایک کو کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس طاقت کو مضبوط کرنا ہوگا تاکہ وہ غالب ہو جائے اور ہمیں دوسری طاقت کو کمزور کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ محکوم ہو جائے۔ اس معاملے میں (مثال کے طور پر) ہم چاہتے ہیں کہ راہ الٰہی کی قوت غالب ہو جائے اور شہوت کی قوت کمزور ہو جائے۔

ہوس کی قوت کیسے کمزور ہو جاتی ہے؟ ہوس کی قوت کو کمزور کرنے کے تین طریقے ہیں۔ ایک یہ ہے کہ اس کی اصل طاقت کا جائزہ لیا جائے اور دیکھیں کہ اسے اپنی طاقت کہاں سے مل رہی ہے۔ اگر ہم اس پر غور کریں گے تو ہم دیکھیں گے کہ اس کی طاقت شاندار کھانے سے ملتی ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ مسلسل روزہ رکھا جائے اور روزہ افطار کرنے کے وقت اس قدر کم مقدار میں کھانا چاہیے جس سے شہوت پیدا نہ ہو۔ مثال کے طور پر گوشت سے پرہیز کرنا چاہیے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ان تمام اسباب کو ترک کر دیا جائے جو فوری طور پر ہوس کو

اکساتے ہیں۔ آنکھوں سے ہوس کو اکسایا جاتا ہے [عام طور پر ممنوعہ چیزیں جو جذبات کو تقویت دیتی ہیں]، آنکھیں دل میں حرکت کا سبب بنتی ہیں، اور دل ہوس کو ترغیب دیتا ہے اور حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سب سے پہلے آنکھوں کے نظاروں کو محدود کرنا ہے اور اس کو پورا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ تنہائی اختیار کی جائے [نہ صرف ذاتی طور پر بلکہ کسی بھی ایسی چیز کے استعمال سے گریز کرنا جس کی وجہ سے غلط چیزوں کو دیکھنے کا امکان ہو]، اور ایسے مواقع سے دور رہنا جہاں خوبصورت چہروں کو دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلنَّظْرَةُ سَهْمٌ مَسْمُوْمٌ مِنْ سِهَامِ اِبْلِيْسَ

"یہ نظر شیطان کے تیروں میں سے ہے جو زہر میں ڈوبے ہوئے ہیں"۔

شیطان اس تیر کو اس طرح چلاتا ہے کہ وہ کبھی بھی اپنا ہدف نہیں چھوڑتا۔ کوئی ڈھال بھی نہیں ہے جو تیروں کے اس بیراج کو روک سکے ، سوائے آنکھیں بند کرنے یا ہدف سے دور کھڑے ہونے کے۔ شیطان ان تیروں کو خوبصورت چہروں (جسمانی ظاہری شکل ، گرافک تصاویر اور ڈسپلے) کے ذریعے فائر کرتا ہے۔ اگر کوئی ایسی نظروں کے اثر سے باہر نکل سکتا ہے تو وہ اپنے آپ کو ان زہریلے تیروں سے بچا سکتا ہے۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ خواہشات کی تسکین کے لیے جائز ذرائع اختیار کیے جائیں۔ سے اپنے آپ کو بچانے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ شادی کی جائے [اور وہ لوگ جو پہلے ہی شادی شدہ ہیں وہ اپنی شادیوں پر توجہ مرکوز اور وفادار رہیں]۔ اس طرح نفس دنیٰ مطمئن ہو جائے گا اور غلط طریقوں سے اپنے آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش نہیں کرے گا، کیونکہ جو نفس ادنیٰ چاہتا ہے، وہ جائز چیز میں پہلے سے موجود ہے (یعنی اس مثال میں شادی) تو پھر حرام ذرائع اختیار کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ زیادہ تر لوگوں کے لئے ، یہ علاج کا سب سے فائدہ مند طریقہ ہے کیونکہ اچھے کھانے کی مقدار کو ختم کرنا اور دیگر ضروری اشیائے خوردونوش کو کم کرنا صحت کو متاثر کرسکتا ہے اور کوئی دوسرا کام کرنے میں سست ہوجاتا ہے۔ پس یہ علاج کے تین اسباب ہیں: پہلا علاج یعنی خوراک کاٹنا ہے، ایسا ہی ہے جیسے کسی سرکش جانور کا کھانا ختم کر دیا جائے تاکہ وہ کمزور ہو جائے اور اس کی طاقت کم ہو جائے اور ختم ہو جائے۔ دوسرا علاج کی مثال یہ ہے کہ کتے کے سامنے سے گوشت اور چارہ کسی جانور کے سامنے سے نکال دیا جائے تاکہ جب کتا گوشت دیکھے اور جانور چارہ دیکھے تو ان کے اندرونی وجود میں کوئی اشتعال نہ ہو۔ علاج کا تیسرا طریقہ یہ ہے کہ کتے کو کوئی ایسی چیز دی جائے جس کی طرف وہ مائل ہو اور جو اسے مطمئن کرے ، تاکہ اس کے پاس اتنی طاقت باقی رہ جائے جو اسے اپنے نظم و ضبط اور تربیت کے ساتھ صبر کرنے کی اجازت دے سکے۔

خدا کی راہ کی طاقت کو مضبوط بنانا: پچھلی بحث ہوس کی قوت کو کمزور کرنے کے بارے میں تھی۔ اب ہم راہ الٰہی کی طاقت کی مضبوطی پر بات کریں گے۔ راہ الٰہی کی قوت کو دو طریقوں سے تقویت دی جا سکتی ہے: ایک یہ ہے کہ روحانی جدوجہد کے فوائد اور اس کے ثمرات (مثبت مضمرات) کے بارے میں اپنے ایمان اور دنیاوی معاملات کے لیے ادنیٰ نفس کی ترغیب دی جائے۔ اس کی ترغیب دینے کا طریقہ ان روایات کے ذریعے ہے جو صبر کی فضیلت میں درج ہیں اور ہم نے دنیاوی امور کے حتمی انجام کی فضیلت کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس پر مزید غور و فکر کرنے کے لئے، نیز راہ خدا سے متعلق معاملات بھی۔ ایک روایت کے مطابق کسی مصیبت کا جزا اور اجر اللہ تعالیٰ (بشرطیکہ کوئی اسے چیخ و پکار اور شکایت کے بغیر صبر سے برداشت کرے]، اس مصیبت کے نتیجے میں کھوئی ہوئی چیز سے زیادہ ہے۔ لہٰذا بصیرت اور باطنی آنکھ (یا حکمت) کے حامل لوگ اس طرح کی مشکلات کے خواہاں ہیں کیونکہ جو کچھ دکھی شخص نے کھو دیا ہے وہ کل (مستقبل میں) اگر آج نہیں تو ختم ہو جائے گا کیونکہ اس کا مقصد نہیں تھا، تاہم کھوئی ہوئی چیز کی جگہ ایسی چیز حاصل کی گئی جو ہمیشہ کے لیے اس

کے ساتھ رہے گی۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی ناقص مصنوع بیچ رہا ہے اور بدلے میں کچھ اچھا حاصل کرتا ہے۔ ظاہر ہے ، کسی کو خراب مصنوع کی موت پر افسوس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کا تعلق عقیدہ سے ہے جو ایمان کی طرف سے ہے۔ کبھی یہ گنوسس کمزور ہوتا ہے ، کبھی مضبوط ہوتا ہے۔ اگر مضبوط ہو تو خدا کی راہ کی طاقت بھی مضبوط ہوتی ہے اور بہت زیادہ توانائی پیدا ہوتی ہے۔ اگر کمزور ہے تو خدا کی راہ کی طاقت بھی کمزور ہے۔ اس گنوسس یا ایمان کی طاقت [خدا پر] کو یقین بھی کہا جاتا ہے۔ یہ یقین غیر متزلزل صبر کا محرک ہے۔ لیکن دنیا کے لوگوں میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جنہیں استقامت اور صبر کی استقامت عطا کی گئی ہو۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آہستہ آہستہ راہ الٰہی کی قوت پر، ہوس کی قوت اور نچلے نفس کی خواہشات پر غلبہ پیدا کیا جائے اور رفتہ رفتہ اسے اس جنگ کا عادی بنایا جائے کہ جب اسے فتح کا ذائقہ ملتا ہے تو وہ فورا بے باک ہو جاتا ہے اور اس پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے۔ اس تسلط کو حاصل کرنا [ہوس کی قوت اور نچلی نفس پر] حاصل کرنا مشکل نہیں ہے۔ سخت محنت اور مسلسل مشق کا عادی ہونا، کام کرنے والے اعضاء کو مضبوط بناتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بھاری وزن اٹھانے والوں، کسانوں اور سپاہیوں میں درزوں، عطر فروشوں، علماء الہیات (*فقہ*) اور روحانی مسافروں (صوفیوں) سے زیادہ طاقت ہوتی ہے، کیونکہ ان کے اعضاء مسلسل [جسمانی] محنت کی کمی اور ایسا کرنے کے عادی نہ ہونے کی وجہ سے کمزور رہتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس شخص میں صبر کی طاقت نہ ہو اور وہ روحانی جدوجہد نہ کرتا، راہ الٰہی کی قوت اس حد تک کمزور ہو جاتی ہے کہ وہ اس قدر کمزور ہو جاتا ہے کہ وہ ہوس پر غالب نہیں آ سکتا۔ جبکہ جو شخص نچلے نفس کو ہوس کی مخالفت کرنے کا عادی بناتا ہے، جب چاہے اس پر حاوی ہو جاتا ہے۔

دنیا اور آخرت کی بادشاہی: تورات، انجیل، زبور، قرآن اور موسیٰ اور ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے اور تمام آسمانی کتابیں نازل کی گئی ہیں تاکہ مخلوقات کو دائمی سلطنت کی طرف دعوت دیں اور انہیں دنیا میں بادشاہ کی حیثیت سے رہنے اور آخرت میں بادشاہ بننے کی نصیحت کریں۔ دنیا کی بادشاہت یہ ہے کہ وہ پرہیز کرے اور اپنی ہر چیز سے لاتعلقی اختیار کرے، اور کم مادی اموال سے مطمئن ہو۔ آخرت کی بادشاہت یہ ہے کہ *وہ رزق (بقعہ) اللہ تعالیٰ کی قرب حاصل کرنے کے بعد حاصل کی جائے جس کا کوئی معدوم نہیں ہے (فانا)* اور وہ عزت حاصل کرنا ہے جو ذلت سے متاثر نہ ہو اور آنکھوں کی وہ ٹھنڈک حاصل کرے جو اس دنیا میں چھپی ہوئی ہے اور کوئی نفس اس سے واقف نہیں ہے۔ شیطان مخلوقات (انسانوں) کو اس دنیا کی بادشاہی کی طرف دعوت دیتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جو لوگ اس دنیا کی سلطنت کے پیچھے بھاگ رہے ہیں انہیں آخرت کی سلطنت نہیں ملتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا اور آخرت دو شریک بیویوں کی طرح ہیں - ایک دوسرے کی موجودگی میں نہیں رہ سکتا۔ مزید یہ کہ شیطان جانتا ہے کہ اگر کسی کو دنیا (دنیاوی دولت، جائیداد، گلیمر اور طاقت) مل جائے تو وہ باقی نہیں رہتا، اس لیے وہ دنیا کو ترغیب دیتا ہے تو صرف یہی نہیں کہ اگر کسی کو دنیا مل جائے تو وہ سکون سے نہیں رہنے دیتا۔ اس کے بجائے ، وہ کسی سے حسد کرتا ہے ، مختلف طریقوں سے پریشان کرتا ہے ، اور نئے تنازعات اٹھاتا ہے۔ تمام دنیاوی اموال و جائیدادوں کی یہ حالت ہے، پہلی بات تو یہ ہے کہ ان کا حصول مشکل ہے اور اگر حاصل ہو جائے تو ان کو برقرار رکھنے کے لیے بہت سی حکمت عملی تیار کرنی پڑتی ہے، انتہائی مشکلات برداشت کرنی پڑتی ہے اور اگر انہیں برقرار رکھا جاتا ہے تو کب تک؟ یہ ختم ہو جائے گا کیونکہ کسی کے لیے موت سے بچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے چاہے وہ حکمران ہو یا حکمراں۔

پرہیز ڈومینین کیوں ہے؟ پرہیز کا مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنی ہوس اور غضب پر قابو پا لیتا ہے اور یہ دونوں راہ الٰہی کی قوت اور ایمان کے اشارے کے تابع ہو جاتے ہیں۔ یہ اصل تسلط ہے۔ حقیقی تسلط کا مطلب مکمل آزادی ہے۔ انسان اس وقت آزاد کہلانے کا مستحق ہے جب وہ غصے اور ہوس سے بچنے کی صلاحیت رکھتا ہے، ورنہ اگر کوئی ہوس کا قیدی بن جاتا ہے تو کبھی اپنے اعضاء کا غلام ہوتا ہے اور کبھی کسی اور کے مقاصد کا غلام ہوتا ہے۔ بلکہ انسان ایک قسم کا جانور بن جائے گا جس کا اپنے وجود پر کوئی اختیار نہیں ہوتا، بلکہ وہ دوسروں (انسانوں) کے ہاتھوں محکوم ہو جاتا ہے جو اس کی گردن میں گریبان ڈال کر اسے جس طرح چاہیں اور جہاں چاہیں لے جاتے ہیں۔ انسان اس میں کتنا بڑا فریب ہے کہ وہ غلام بننے کے بعد (اپنی پست نفس کی حقیر خواہشات کی جو فطرت میں حیوانی اور حیوانی ہے] یہ سوچتا ہے کہ وہ مالک ہے [اور اپنی تقدیر اور وجود کا مالک ہے] اور اپنی خواہشات کا غلام بننے کے بعد یہ سوچتا ہے کہ ربوبیت کی خوبیاں کسی میں پیدا ہوئی ہیں؟ ایسا شخص دنیا میں ذلیل بھی ہے اور آخرت میں بھی ذلیل کیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پرہیز ہی اصل سلطنت ہے اور اس سلطنت کے ذریعے انسان آخرت کی (ابدی کامیابی اور ابدی) سلطنت حاصل کرتا ہے۔ جن لوگوں کو شیطان نے دھوکہ دیا وہ دنیا اور آخرت دونوں جگہوں پر خسارے میں رہے اور جن لوگوں کو استقامت کی توفیق عطا کی گئی وہ دنیا اور آخرت دونوں میں کامیاب رہے۔

شکر گزاری کی وضاحت

اس باب میں تین عناصر ہیں: پہلا شکر گزاری کی فضیلت، اس کی حقیقت کی وضاحت، اقسام اور احکامات ہیں۔ دوسری برکت اور ان کی اقسام کی حقیقت ہے، خاص یا عام کے لحاظ سے؛ تیسرا یہ ہے کہ صبر یا شکر گزاری سے کیا افضل ہے۔

پہلا عنصر - شکر اور اس کی فضیلت: ایک طرف قرآن مجید نے یاد الٰہی کی تعریف اس طرح کی ہے:

وَلَذِكۡرُ ٱللَّهِ أَكۡبَرُۗ

"اور اللہ کا ذکر بہت بڑا کام ہے۔" (سورة البقرة البقرة آیت نمبر ۴۵)

دوسری طرف [الہامی] شکر کو یہ [عظیم] اعزاز عطا کیا گیا کہ اس کا ذکر [الہامی] ذکر کے ساتھ کیا گیا تھا۔ چنانچہ کہا گیا:

فَٱذۡكُرُونِيٓ أَذۡكُرۡكُمۡ وَٱشۡكُرُواْ لِي وَلَا تَكۡفُرُونِ

"مجھے یاد کرو کہ میں تمہیں یاد کروں گا اور میرا شکر ادا کروں گا اور ناشکری نہ کرو اور ناشکری نہ کرو۔ (سورة البقرة باب 2، آیت 152)

یاد الٰہی کے ساتھ ساتھ شکر گزاری کا ذکر اس کی فضیلت کے کمال کی دلیل دیتا ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

مَّا يَفْعَلُ ٱللَّهُ بِعَذَابِكُمْ إِن شَكَرْتُمْ وَءَامَنتُمْ ۚ

"اگر تم شکر ادا کرو اور ایمان لاؤ تو اللہ تمہیں عذاب دے گا؟" (سورۃ البقرۃ سورۃ البقرۃ آیت ۱۴۷)

وَسَنَجْزِى ٱلشَّٰكِرِينَ

"اور اللہ تعالیٰ شکر گزاروں کو جلد اجر عطا فرمائے۔" (سورۃ البقرۃ سورۃ البقرۃ آیت ۱۴۵)

ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر فرمایا ہے کہ الٰہی کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا نعمتوں میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ اس میں کوئی استثناء نہیں ہے جبکہ دیگر نعمتوں میں استثناء ہیں جیسے خوشحالی کی فراہمی، نمازوں کو قبول کرنا، رزق فراہم کرنا، مغفرت کرنا اور توبہ قبول کرنا، یہ سب استثناء کے ذکر کے ساتھ آتے ہیں۔ یہ سب اس کی مرضی سے ہم آہنگ ہیں۔ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ شکر گزاری ایک عمدہ چیز ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی مرضی کے مطابق نہیں بنایا بلکہ واضح طور پر اپنی نعمتوں میں اضافہ کرنے کا وعدہ کیا۔ شکر گزاری کے ایک اچھی صفت ہونے میں کس طرح شک ہو سکتا ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے اس صفت کا ذکر کیا ہے:

وَٱللَّهُ شَكُورٌ حَلِيمٌ

"اور اللہ بہت شکر گزار ہے (اگرچہ وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں سے بھری ہوں جو ہم نیکی اور نیکی کی راہ میں کرتے ہیں) اور بردبار ہے۔" (سورۃ البقرۃ سورۃ البقرۃ آیت ۱۷)

عطا رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ آپ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کی زیارت کے لیے گئے اور ان سے پوچھا کہ آپ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات میں جو عجیب و غریب چیز دیکھی اس کے بارے میں بتائیں۔ یہ سن کر وہ رونے لگی اور بولی، "اس کی کون سی کیفیت عجیب نہیں تھی؟ ایک رات وہ میرے پاس آیا اور میرے ساتھ میرے کمبل کے نیچے میرے بستر پر لیٹ گیا یہاں تک کہ اس کا جسم میرے جسم کو چھو گیا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا: اے ابوبکر کی بیٹی! مجھے چھوڑ دو تاکہ میں اپنے رب کی عبادت کر سکوں۔ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں آپ کی قربت چاہتا ہوں، لیکن یہ آپ کی خواہش ہے'۔ پھر میں نے اسے اجازت دے دی۔ وہ پانی کے کنٹینر کے پاس گئے اور زیادہ پانی استعمال کیے بغیر وضو کیا۔ اس کے بعد وہ (خدا کی رحمت) میں کھڑے ہو گئے۔ نماز کے دوران وہ رونے لگے یہاں تک کہ اس کے آنسو اس کے سینے پر بہنے لگے۔ اس کے بعد وہ سجدہ کیا اور رونے لگا۔ پھر اس نے سجدہ کیا اور اس میں رونے لگا اس نے سجدہ سے سر اٹھایا اور پھر رونے لگا۔ وہ روتے رہے یہاں تک کہ صبح ہو گیا اور بلال رضی اللہ عنہ انہیں صبح کی نماز کی اطلاع دینے آئے۔ میں نے ان سے پوچھا: یا رسول اللہ! تم اتنے روتے ہو جب کہ خدا نے تمہارے ماضی اور مستقبل کے تمام گناہ معاف کر دیے ہیں؟" آپ نے فرمایا: کیا مجھے شکر گزار بندہ نہیں بننا چاہیے کیونکہ میں اللہ کا شکر ادا کر رہا ہوں؟ اور جب اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں درج ذیل آیت نازل کی ہے تو میں کیسے رونا نہ کروں:

إِنَّ فِي خَلْقِ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ وَٱخْتِلَٰفِ ٱلَّيْلِ وَٱلنَّهَارِ
وَٱلْفُلْكِ ٱلَّتِي تَجْرِي فِي ٱلْبَحْرِ بِمَا يَنفَعُ ٱلنَّاسَ وَمَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ
مِنَ ٱلسَّمَآءِ مِن مَّآءٍ فَأَحْيَا بِهِ ٱلْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا
مِن كُلِّ دَآبَّةٍ وَتَصْرِيفِ ٱلرِّيَٰحِ وَٱلسَّحَابِ ٱلْمُسَخَّرِ
بَيْنَ ٱلسَّمَآءِ وَٱلْأَرْضِ لَأَيَٰتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿١٦٤﴾

بے شک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات اور دن کے آنے جانے میں اور انسانوں کے نفع کے لیے سمندروں میں کشتیوں کے چلنے میں اور اس پانی میں جو اللہ نے آسمان سے اتارا اور اس سے مردہ زمین میں زندگی پیدا کرنے میں ہر قسم کے جانداروں میں جو اس نے زمین میں پھیلا دیا ہے اور ہواؤں کے بدلنے میں اور آسمان اور زمین کے درمیان چلنے والے بادلوں میں یقینا عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ (سورۃ البقرۃ باب 2، آیت 164) (بیان کردمحدیث کا مجموعہ *صحیح مسلم* حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی بھی حالت میں رونا بند نہیں کرنا چاہیے۔ بندے کا دل چٹان کی طرح سخت ہوتا ہے بلکہ اس کی سختی میں زیادہ سخت ہوتا ہے۔ یہ سختی صرف رونے سے ہی دور ہوتی ہے، چاہے وہ خوف سے روئے یا شکر گزاری سے روئے۔

شکر گزاری کی حقیقت: شکر گزاری روحانی مسافروں کے اسٹیشنوں میں سے ایک [روحانی] مقام ہے۔ یہ مقام علم، عمل اور [باطنی] حالت کے [تین اصولوں] پر مشتمل ہے۔ ان تینوں میں سے ، علم اس اسٹیشن کی ابتدا ہے۔ علم [اندرونی روحانی] حالت کو جنم دیتا ہے اور ریاست [عمدہ] اعمال کو جنم دیتی ہے۔ علم کا مفہوم یہ ہے کہ وہ نعمت دینے والے کی طرف سے حاصل ہونے والی نعمتوں کو پہچان لیں، حالت وہ خوشی ہے جو انسان کو اس نعمت کے حصول کے بعد حاصل ہوتی ہے اور عمل برکت دینے والے کی رضامندی (الٰہی احکام) کے مطابق عمل کرنا ہے۔ اس عمل کا تعلق دل، [جسمانی اعضاء اور] اعضاء اور زبان سے ہے - یہ تینوں ہیں۔

پہلا اصول - علم: اس سلسلے میں انسان کو تین معاملات کا علم ہونا چاہیے: ایک نعمت کا؛ دوسرا یہ ادراک کہ یہ نعمت کسی کے حق میں نعمت ہے؛ تیسرا یہ کہ عطا کنندہ کی ہستی اور ان صفات کا جو ثواب عطا کرتی ہیں اور اسے مکمل کرتی ہیں۔ جہاں تک اللہ تعالیٰ کے بارے میں ہے تو انسان کو یہ علم ہونا چاہیے کہ تمام نعمتیں صرف اللہ کی طرف سے ہیں، وہی حقیقی دینے والا ہے، تمام درمیانی ذرائع (دینے والے اور وصول کنندہ کے درمیان) اس کے اختیار اور محکومی میں ہیں۔ یہ اعلیٰ ترین عرفہ ہے جو تقدیس *اور توحید الٰہی کے بعد آتا* ہے لیکن یہ اعلیٰ درجے کا ہے۔ ایمان کی گنوسس میں سے سب سے پہلے تسبیح الٰہی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ خدا تمام خامیوں سے بالاتر ہے اور اس کے بعد یہ الٰہی وحدانیت ہے جو یہ جاننا ہے کہ وہ ہستی جو تمام عیبوں سے پاک سمجھی جاتی ہے، وہ ایک ہے، اس کا کوئی شریک اور شریک نہیں ہے، اس کے بعد یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ جو کچھ وجود کے دائرے

میں موجود ہے وہ اسی وجود کی تمام مخلوقات ہیں جو ایک ہے اور جو کچھ [مخلوقات میں] ایک کو عطا کیا گیا ہے وہ اس کی طرف سے ثواب کے طور پر انسان کو عطا کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ گنوسس پچھلے دو گنوسس کے بعد آتا ہے، اسی لیے اس کا درجہ پچھلے دو سے بلند ہے کیونکہ اس میں تسبیح الٰہی اور وحدانیت کے اقرار کے ساتھ ساتھ قدرت کے کمال کا اقرار اور ایجاد اور تخلیقی نفاست کا کمال بھی ہے۔

درمیانی ذرائع کو حکم الٰہی پر عمل کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے: بہرحال اگر کوئی دوسرے ذرائع سے خدا کی نعمتیں حاصل کرتا ہے تو اسے سمجھنا چاہیے کہ یہ دوسرا شخص اس نعمت کو اس لیے پہنچانے پر مجبور تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس دوسرے شخص پر اپنا ارادہ مسلط کیا اور وہ تمام عوامل پیدا کیے جن کی وجہ سے اس شخص کو دینے پر مجبور کیا گیا۔ اور اس نے اپنے دل میں یہ بات رکھ دی کہ "میرے لیے دنیا اور آخرت کی تمام بھلائی اور فلاح و بہبود کسی کو دینے پر منحصر ہے"۔ جب یہ خیال خدا کی طرف سے دل میں پیدا ہوتا ہے تو اس سوچ کے مضمرات پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں بچتا۔ لہٰذا یہ بات سمجھنی چاہیے کہ اگر دوسرا شخص آپ کو کوئی چیز دے رہا ہے تو وہ آپ کو اس کے فائدے کے لیے نہیں بلکہ اس کے اپنے فائدے کے لیے دیا جا رہا ہے۔ اگر دوسرے شخص کو آپ کو دینے میں کوئی فائدہ نہیں ہوتا تو وہ آپ کو نہ دیتا۔ اگر دوسرا شخص یہ نہ جانتا کہ اس کا فائدہ آپ کے فائدے میں شامل ہے تو ، ایسے شخص نے کبھی بھی آپ کو فائدہ نہیں پہنچایا ہوتا۔ اب آپ کو فائدہ پہنچا کر ، دوسرا شخص اپنے فائدے کا خواہاں ہے اور وہ آپ کا [حقیقی] محسن یا دینے والا نہیں ہے ، اس کے بجائے اس نے آپ کو اپنے لئے ایک متوقع نعمت کا ذریعہ بنایا ہے۔ حقیقی دینے والا کوئی اور شخص ہے جس نے ظاہری دینے والے کو آپ کے لئے محکوم کیا اور اس کے دل میں ایسے عقائد اور ارادے پیدا کیے جس نے اسے آپ تک اس نعمت پہنچانے پر مجبور کیا۔

اگر آپ ان باتوں کو اس طرح سمجھتے ہیں تو آپ کو خدا کی وجود اور اعمال کی گنوسیس حاصل ہو جائے گی اور آپ توحید پرست بن جائیں گے، آپ کو (الٰہی) شکر گزاری پر اختیار حاصل ہو جائے گا، بلکہ صرف اسی وجہ سے آپ کو "اللہ کا بے حد شکر گزار بندہ" کہا جائے گا۔ شکر گزاری کے لیے ضروری ہے کہ تمام نعمتیں خدا کی طرف سے ہیں، اگر اس میں ذرا سا بھی شک ہو تو نہ تو کوئی اس نعمت کا حق ادا کر سکے گا اور نہ ہی اس کے دینے والے کے۔ انسان کو نہ تو ظاہری عطا کنندہ پر بھروسہ کرنا چاہیے اور نہ ہی اس پر فخر کرنا چاہیے ورنہ یہ اس کے علم میں کمی ہو گی اور علم کی کمی صحیح اعمال کے ضیاع کا باعث بن سکتی ہے۔

دوسرا اصول - حالت: یہ [باطنی روحانی] حالت برکت کی ابتدا کے گنوسس (*معارفہ*) سے حاصل ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ [برکت دینے والے] سے عاجزی، نیکتری، اور خوفزدہ دل کے ساتھ راضی ہونا۔ یہ حالت بھی شکر گزاری ہے جس طرح گنوسس کو [شکرگزاری کی حالت] کہا گیا ہے ، لیکن ریاست کو اس وقت شکر گزاری کہا جائے گا جب وہ اپنے تمام شرائط کا احاطہ کرے گی۔ ان میں سب سے اہم شرط یہ ہے کہ نعمت صرف دینے والے کے ساتھ ہے، نعمت یا ثواب سے نہیں۔ شاید آپ کو یہ سمجھنے میں دشواری پیش آئے گی۔ چنانچہ ہم آپ کو ایک مثال کے ذریعے اس کی وضاحت کرتے ہیں۔ ایک بادشاہ ہے جو سفر پر نکلتا ہے۔ اس نے انعام کے طور پر کسی کو گھوڑا عطا کیا۔ گھوڑے کو حاصل کرنے کے بعد یہ شخص تین وجوہات کی بناء پر خوش ہوسکتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انسان صرف اس ثواب سے خوش ہوتا ہے جو گھوڑا ہے کیونکہ یہ ایک قیمتی ثواب ہے اور اس سے اچھی سواری حاصل کی جا سکتی ہے جو اس کی مرضی کے مطابق ہے۔ ظاہر ہے ، اس قسم کی خوشی صرف وہی شخص محسوس کرتی ہے جو بادشاہ کی پرواہ نہیں کرتا ، اس کے بجائے اس کا واحد مقصد صرف گھوڑا ہے۔ فرض کریں کہ اگر کسی کو یہ گھوڑا جنگل میں مل جاتا تو وہ بھی اتنا ہی خوش ہوتا۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ کوئی

گھوڑے کو حاصل کرنے پر خوش نہیں ہوتا بلکہ اس کے بجائے خوش بھی ہوتا ہے کیونکہ یہ گھوڑا بادشاہ کی مہربانی اور مہربانی کا ثبوت ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ کے دل میں ایک کے لئے جگہ ہے۔ اگر کسی کو یہ گھوڑا جنگل میں مل جاتا یا بادشاہ کے علاوہ کسی اور کو دیا جاتا تو اسے ذرا سی بھی خوشی نہ ہوتی کیونکہ اسے گھوڑے کی ضرورت نہیں ہے یا جو وہ چاہتا ہے، جیسے بادشاہ کے دل میں جگہ ملنا، گھوڑے سے کہیں زیادہ ہے۔ تیسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ گھوڑے کو حاصل کرنے پر خوش ہو کیونکہ وہ بادشاہ کی خدمت کے لیے اس پر سوار ہونا چاہتا ہے یا سفر کی مشکلات کو برداشت کرنے کے لیے گھوڑے پر سوار ہونا چاہتا ہے، بادشاہ کی قربت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص [بادشاہ کے دربار میں] وزیر بننے کے لئے مسلسل محنت کے بعد ترقی کرے۔ اس شخص کو بادشاہ کے دل میں جگہ بنانے کا کوئی اعتراض نہیں ہے کیونکہ کوئی اس کا زیادہ خیال نہیں کرتا، بلکہ وہ اس قدر قربت کا طالب ہے کہ جو کچھ بھی بادشاہ لوگوں کو عطا کرتا ہے، وہ اسے ثالث بنا کر کرتا ہے [اور اس ثالث کے ذریعے لوگوں کو عطا کرتا ہے]۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کا درجہ صرف ان لوگوں کو دیا جاتا ہے جو انتہائی قریبی اور قابل اعتماد ہوتے ہیں، اس کے علاوہ کوئی شخص وزارت کا طالب نہیں ہوتا بلکہ صرف بادشاہ کی قربت، بادشاہ کا اعتماد اور بادشاہ کی مسلسل بصیرت کی عزت چاہتا ہے۔ اگر [اس طرح] کسی کو وزارت اور [بادشاہ کے ساتھ] قربت میں سے ایک کا انتخاب دیا جائے تو وہ قربت کا انتخاب کرے گا۔

یہ [شکر گزاری کے تین درجے] ہیں۔ اس میں ، پہلی ڈگری کا کوئی فائدہ نہیں ہے کیونکہ اس میں کسی کی تمام توجہ کا مرکز گھوڑا ہے۔ گھوڑے کو حاصل کرنے پر خوش ہوتا ہے اور دینے والے سے غافل ہوتا ہے، چاہے وہ بادشاہ ہو یا نچلے درجے کا شخص۔ اسی طرح جو شخص نعمت حاصل کرنے کے بعد اور اسے اپنے مقصد کے لیے موزوں سمجھنے کے بعد اس میں کھو جاتا ہے وہ شکر گزاری سے بہت دور ہوتا ہے۔ دوسری ڈگری شکر گزاری کے معنی میں اس لحاظ سے شامل ہے کہ برکت حاصل کرنے والا اپنے دینے والے سے راضی ہو لیکن یہ خوشی دینے والے کی ہستی سے نہیں بلکہ یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ کسی کو نعمت کا مستحق سمجھتا ہے جس سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ مستقبل میں اسے مزید نعمتیں عطا کرے گا۔ یہ ان نیک بندوں کا حال ہے جو عذاب کے خوف سے نیکی کرتے ہیں اور اجر کی امید رکھتے ہیں اور شکر ادا کرتے ہیں۔ مکمل شکر گزاری تیسری ڈگری میں ہے۔ دوسرے لفظوں میں، برکت حاصل کرنے والا اس خیال سے خوش ہوتا ہے کہ وہ برکت کو خدا کی قربت حاصل کرنے کا ایک ذریعہ بنائے گا۔ اس کی نشانی یہ ہے کہ انسان دنیا سے خوش نہیں ہے، بلکہ وہ صرف اتنی دنیا پر مطمئن ہے جو دنیا کی زندگی میں مدد کر سکتی ہے، ان دنیاوی نعمتوں پر پچھتاوا ہو جو عبادت سے غافل ہو جاتی ہے اور حق کی راہ سے روکتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نعمت اس میں موجود لذت کی وجہ سے مقصد نہیں ہے، بالکل اسی طرح جیسے گھوڑے کا وصول کرنے والا اس لیے خوش نہیں ہوتا کہ وہ مضبوط اور تیز دوڑتا تھا، بلکہ اسے بادشاہ کی حضوری میں پہنچنے کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے تاکہ وہ مسلسل بادشاہ کی بصیرت اور قربت کی عزت حاصل کرسکے۔ چنانچہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: شکر برکت دینے والے کا خواب ہے، نعمت کا نظارہ نہیں ہے۔ یہ اعلیٰ [روحانی] مقام وہ شخص حاصل نہیں کر سکتا جس کی دنیا کی تمام لذتیں معدے اور جنسی اعضاء تک محدود ہیں، ادراک کا دائرہ رنگ اور آواز تک محدود ہے، [بجائے] دل کو تمام [مادی] لذتوں سے پاک ہونا چاہیے اور تمام [جسمانی] ادراک سے ناآشنا ہونا چاہیے۔ اگر دل صحت مند ہے تو اسے صرف خدا کی یاد، عرفان اور [خدائی] حضوری میں خوشی ملتی ہے۔ اس دل کو ان چیزوں (الٰہی یاد، گنوسس اور حضور) سے خوشی نہیں ملتی جو بری عادات سے متاثر ہوئی ہیں۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اگر کوئی اس [اعلیٰ ترین] درجے پر شکر گزاری نہیں کر سکتا تو اسے دوسری ڈگری کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہیے۔ پہلی ڈگری کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ دوسری اور تیسری ڈگری میں بھی بہت فرق ہے۔ دوسرے درجے میں انسان کا مقصد بادشاہ ہے تاکہ بادشاہ گھوڑا دے سکے اور تیسرے

درجے میں مقصد گھوڑا ہے تاکہ وہ اسے بادشاہ کی قربت حاصل کرنے کا ذریعہ بنا سکے۔ ان دونوں میں کتنا بڑا فرق ہے کہ ایک اللہ کا طالب ہے تاکہ وہ ایک کو برکت عطا کرے اور دوسرا وہ برکت کا طالب ہے تاکہ وہ ان کے وسائل سے خدا تک پہنچ سکے۔

تیسرا اصول - کسی کی خوشی کے مطابق عمل: تیسرا اصول یہ ہے کہ کسی کو عطا کنندہ کی معرفت سے ملنے والی خوشی کے مضمرات پر عمل کیا جائے۔ یہ عمل دل ، زبان اور جسمانی اعضاء سے تعلق رکھتا ہے ، تینوں سے۔ دل کے عمل کا مفہوم یہ ہے کہ بندہ نیکی کا ارادہ رکھتا ہے اور اس نے تمام مخلوقات کے لیے نیکی کو چھپا رکھا ہے۔ زبان کے ذریعے عمل کا مفہوم خدائی حمد کے ذریعے ہے جو شکر گزاری کی نمائندگی کرتا ہے۔ اعضاء کے ذریعے اعمال کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو اس کی اطاعت میں استعمال کیا جائے اور گناہوں کو ترک کرنے میں ان سے مدد طلب کی جائے۔ لہذا، آنکھوں کے ذریعے شکر گزاری ایک مومن کی ہر غلطی کو چھپانا ہے جس پر ایک نظر ڈالتی ہے۔ کانوں کے ذریعے شکر گزاری مومنوں کی ان تمام خامیوں کو چھپانا ہے جو کانوں سے معلوم ہوتے ہیں۔ زبان کے ذریعے شکر گزاری ایسے الفاظ ادا کرنا ہے جو خدا کو خوش کریں۔ اگر اعضاء کو اس طرح استعمال کیا جائے تو یہ ان [الہامی] نعمتوں کا شکر گزار بن جاتا ہے جو [الہامی] مقرر کیا گیا ہے۔

الٰہی *توحید* یا نفس کی فنا کا نظریہ: اس پر دو عقائد ہیں۔ ایک کو الٰہی وحدانیت کا نظریہ کہا جاتا ہے۔ جو لوگ اس میں کامل ہیں ان کا خیال ہے کہ شکر گزار اور قدردانی کرنے والا عاشق اور محبوب ایک ہی ہستی کے دو نام ہیں۔ ان کی نظر میں خدا کے سوا کوئی چیز موجود نہیں ہے۔

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ

"سب کچھ فنا ہو رہا ہے سوائے اس کے ہستی کے [کیونکہ وہ واحد ہستی ہے جو ابدی، ابدی اور خود زندہ ہے جس کا کوئی آغاز اور اختتام نہیں ہے، وہ جو کسی دوسرے وجود کے بغیر موجود ہے اور باقی تمام مخلوقات اس کے وسیلہ سے موجود ہیں]۔" (سورة البقرة البقرة والبقرة آیت 88)

یہ اعلان ان کے دلوں کی آواز ہے۔ یہ نظریہ حقیقت پر مبنی ہے اور اس میں آغاز سے کم ابدی "شروعات" اور لامتناہی ابدی "اختتام" کے بارے میں دونوں سچائیاں موجود ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کے سوا کوئی ہستی نہیں ہے جو خود موجود ہے، بلکہ [خدا کے سوا] کسی اور چیز کے لیے اس طرح کا وجود ہونا ناممکن ہے۔ حقیقی وجود وہ ہے جو اس کے اپنے وجود کے ذریعے موجود ہے۔ کوئی ایسی چیز جو اپنے وجود سے موجود نہیں ہو سکتی، اس کا وجود اس کے اپنے وجود کے ذریعے نہیں ہوگا، بلکہ یہ دوسرے [وجودوں] سے وابستہ ہوگا۔ یہ اس حد تک ہے کہ اگر اس کے اپنے وجود کو کسی دوسرے پر انحصار کیے بغیر دیکھا جائے تو اس کا اپنا وجود غیر یقینی ہوگا۔ حاضر وہ ہے جو اپنے طور پر موجود ہے اور جو وجود اپنے وجود پر موجود ہے وہ ایسا ہے کہ اگر باقی سب کا وجود ختم ہو جائے تو اس کے اپنے وجود پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اگر کوئی وجود ہے جو اپنے وجود سے موجود ہے اور باقی سب بھی اپنے وجود سے موجود ہیں تو اسے "*قیوم* " کہا جاتا ہے اور "*قیوم*" اس ہستی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا [جسے ہم خدا کہتے ہیں] کیونکہ وہ "*حیوٗ القیوم*" (زندہ اور خود موجود) ہوگا۔ یہ صفت صرف اس ایک ہستی کی ہے۔ اگر آپ اسے اس نقطہ نظر سے دیکھیں تو یہ واضح ہو جائے گا کہ ہر چیز کا منبع اور انحصار صرف وہی ہے، جو ایک ہستی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صرف وہی شکر گزار ہے، صرف وہی ہے جو شکر گزار ہے، صرف وہی عاشق ہے، اور صرف وہی محبوب ہے۔ چنانچہ جب حبیب بن حبیب رحمہ اللہ نے یہ آیت پڑھی:

إِنَّا وَجَدْنَٰهُ صَابِرًا ۚ نِّعْمَ ٱلْعَبْدُ ۖ إِنَّهُۥٓ أَوَّابٌ

"بیشک ہم نے اسے (ایوب علیہ السلام) صبر کرتے ہوئے پایا، وہ بہت اچھے بندے تھے، وہ اللہ کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔" (سورۃ البقرۃ آیت ۳۸، آیت ۴۴)

آپ نے فرمایا: اللہ پاک ہے! یہ کتنا عجیب بات ہے [جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے]! وہی ہے جس نے (حضرت ایوب علیہ السلام) کو صبر کی توفیق عطا کی اور وہی ہے جو اس کی حمد کرتا ہے اور جس طرح اس نے اپنی حمد کی تعریف کی ہے وہی تسبیح کرنے والا ہے۔ وہی محبت ہے اور وہ محبوب ہے۔ یہ ایک اعلیٰ درجہ ہے۔ آپ اسے ایک ایسی مثال کے ذریعے سمجھ سکتے ہیں جو آپ کی عقل کی حد کے قریب ہے۔ یہ مثال یہ ہے کہ جب کوئی مصنف اپنی تحریر کو پسند کرتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی ذات کو پسند کیا ہے۔ اسی طرح جب کوئی تخلیق کار اپنی ایک تخلیق کو پسند کرتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے وہ اپنی ذات کو پسند کرتا ہے۔ یا باپ اپنے بچے کو اس معنی میں پسند کرتا ہے کہ ایسا ہی اس کا بچہ ہے، گویا اسے اپنے وجود کو پسند ہے۔ اللہ کے سوا جو کچھ دنیا میں ہے، وہ سب اسی کی تحریر اور تخلیق ہیں۔ اگر وہ اپنی تحریر یا تخلیقات سے محبت کرتا ہے تو گویا وہ اپنے وجود سے محبت کرتا ہے۔ یہ الٰہی وحدانیت کا نظریہ ہے۔ *صوفیاء* (روحانی مسافر یا حق کے متلاشی) اسے "نفس کی فنا" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اپنے ہستی سے اور اللہ کے سوا ہر چیز سے معدوم ہو چکا ہے اور ہر جگہ صرف ایک سچا ہستی کو نظر آتا ہے [کیونکہ وہ واحد موجود ہے]۔ ایک شخص جو ان [روحانی] حقیقتوں کو نہیں سمجھتا وہ ان کی تردید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ "ایک انسان کیسے معدوم ہو سکتا ہے جب اس کا سایہ چار گز لمبا ہو اور وہ ایک دن میں ایک یا دو کلو آٹا کھاتا ہو؟" اپنی جہالت کی وجہ سے جاہل ، نفس کی فنا (فانا) کے دعوے پر ہنستے ہیں۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ گنوسٹکس کا یہ مقدر ہے کہ جاہل ان کی بات کو نہیں سمجھتے ، ان پر ہنستے ہیں ، اور ان کے دلوں کو مذاق اڑانے کے تیروں سے زخمی کرتے ہیں۔

مقصد کی طرف لوٹنا: [سچے] انبیاء (خدا) کے آنے کا مقصد ان کی دعوت ہے کہ وہ لوگوں کو الٰہی وحدانیت کے کمال تک پہنچیں۔ تاہم ، جو راستہ انسان کو وحدت کے کمال کی طرف لے جاتا ہے اس میں بے شمار رکاوٹیں ہیں اور ایک طویل اور مشکل سفر کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ الٰہی قانون اس مشکل راستے پر چلنے اور اس مشکل سفر کو مکمل کرنے کا طریقہ دکھاتا ہے۔ جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ شکر گزاری سے خدا کے لیے کیا فائدہ ہوتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے خدا کو کوئی فائدہ نہیں ملتا، یہ خالص بندوں کے فائدے کے لیے ہے۔ ہم ایک مثال کے ذریعے اس نکتے کی وضاحت کریں گے۔ فرض کریں کہ کوئی بادشاہ اپنے کسی نوکر کو سفر کرنے کے لیے سوار، کپڑے اور انحصار بھیجتا ہے جو دور دراز جگہ پر رہتا ہے تاکہ سفر کے بعد بادشاہ کے قریب آجائے۔ بادشاہ کے نوکر کو قریب لانے کے لئے دو معاملات ہوسکتے ہیں۔ پہلا [معاملہ] یہ ہے کہ بادشاہ کا نوکر کو قریب لانے کا مقصد یہ ہے کہ نوکر بادشاہ کی خدمت کرے اور کسی مہم میں حصہ لے کر بادشاہی کی طاقت کا ذریعہ بن جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ بادشاہ کو اس میں کوئی ذاتی فائدہ نہ ہو اور نوکر بھی وہ خدمت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا جس سے بادشاہ کو تمام پریشانیوں سے نجات مل جائے۔ مختصرا یہ کہ نوکر ایک ایسا وجود ہے جس سے بادشاہ کے تسلط میں کوئی فرق نہیں پڑے گا، چاہے وہ کمی ہو یا اضافہ، اس صورت میں اگر بادشاہ نوکر کو سوار، کپڑے اور سفر کا سامان فراہم کرتا ہے تو یہ بادشاہ کا شاہی عطیہ ہے۔ اس کا واحد مقصد یہ ہے کہ نوکر ان وسائل کو بادشاہ کے قریب جانے کے لیے استعمال کرے اور شاہی موجودگی میں ہونے کا اعزاز حاصل کرے۔ کنگ کا اپنا فائدہ مقصد نہیں ہے۔ بندوں کا حال ایک ہی ہے۔ اللہ کی طرف سے جو کچھ انہیں ملتا ہے وہ ان کے اپنے درجات بلند کرنے کے لیے ہے نہ کہ اللہ کے فائدے کے لیے۔

اس مثال میں پہلی صورت میں، [سفر کے بعد] بادشاہ کے قریب آنے والا نوکر اس وقت تک شکر گزار نہیں ہو سکتا جب تک کہ نوکر نوکر کی طرف سے واجب الادا خدمت نہ کرے۔ دوسری صورت میں، ایک نوکر یا تو شکر گزار ہو سکتا ہے یا مسترد کرنے والا ہو سکتا ہے۔ اس معاملے میں شکر گزاری کا طریقہ یہ ہوگا کہ بادشاہ کی طرف سے عطا کردہ احسانات کو ان کوششوں میں استعمال کیا جائے جو بادشاہ پسند کرتا ہے اور انہیں اپنی مرضی کے مطابق خرچ نہیں کرتا ہے۔ مسترد کرنے کا طریقہ یہ ہوگا کہ ان نعمتوں کو ان چیزوں پر خرچ کیا جائے جو بادشاہ کو ناپسند ہیں یا کسی ایسے سفر پر خرچ کریں جس سے نوکر بادشاہ سے زیادہ دور ہوجائے۔ چنانچہ اگر نوکر کپڑے پہنتا اور گھوڑے پر سوار ہوتا اور بادشاہ کی طرف سے سفر میں بھیجے گئے سامان کو خرچ کرتا تو کہا جائے گا کہ نوکر نے بادشاہ کا شکریہ ادا کیا کیونکہ نوکر نے یہ سب چیزیں بادشاہ کی پسندیدہ کوششوں پر خرچ کیں۔ لیکن اگر نوکر شاہی لباس پہن کر گھوڑے پر سوار ہو لیکن وہ راستہ چنا جو بادشاہ کی مخالف سمت میں جاتا ہے کہ کسی کو بادشاہ کے قریب لانے کے بجائے ایک اور دور کر دیا جائے تو کہا جائے گا کہ نوکر نے ان نعمتوں کو مسترد کر دیا اور انہیں بادشاہ کے خلاف استعمال کیا۔ اسی طرح وہ شخص (خادم) بھی نعمتوں کے انکار میں ملوث ہے جو شاہی اوقاف سے فائدہ نہیں اٹھاتا ہے، وہ کپڑے نہ پہن کر، سواری نہ کر اور اس سفر میں مسافر کا رزق نہ لے کر بیکار بیٹھ جائے۔ اس شخص کا مسترد پہلے سے کم ہے۔

مخلوقات کا یہ حال ہے! اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا۔ ابتدائی طور پر انہیں ہوس کے استعمال کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ ان کے جسم مکمل طور پر ترقی پذیر ہوجائیں۔ خواہشات کا استعمال انہیں قرب الٰہی سے دور کر دیتا ہے جبکہ ان کی ابدی سعادت اور دائمی کامیابی کی سعادت صرف الٰہی کی قربت میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسی نعمتیں پیدا کیں جو انہیں (انسانوں) کو خدا کے قریب کھینچتی ہیں اور ان کو استعمال کرنے کی صلاحیت بھی دیتی ہیں۔ قرآن مجید نے انسان کی اللہ تعالیٰ سے قربت اور دوری کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا ٱلْإِنسَٰنَ فِىٓ أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ

"ہم نے انسان کو بہترین سانچوں میں پیدا کیا ہے۔" (سورۃ البقرۃ باب 95، آیت 4)

ثُمَّ رَدَدْنَٰهُ أَسْفَلَ سَٰفِلِينَ ﴿٥﴾

إِلَّا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَعَمِلُوا۟ ٱلصَّٰلِحَٰتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ﴿٦﴾

"اس کے بعد ہم سب سے نچلے درجے کی طرف اترتے ہیں سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک اور نیک اعمال انجام دیں، ان کے لیے عظیم الٰہی اجر ہے جو کبھی ختم نہیں رہتا۔" (سورۃ البقرۃ باب 95، آیہ 5-6)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ایسی ہتھیار ہیں کہ ان کے ذریعے بندہ سب سے نچلے درجے سے ابدی سعادت اور دائمی کامیابی کے درجے کی طرف بڑھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آلات بندوں کے لیے پیدا کیے ہیں اور اس بات کی پرواہ نہیں کرتا کہ کوئی اس کے قریب آئے یا نہیں۔ تاہم، خادم کو یہ استحقاق حاصل ہے کہ وہ ان آلات کو [الٰہی] اطاعت یا گناہ (نافرمانی) میں مدد کے لیے استعمال کرے۔ اگر کوئی اطاعت کرے گا تو اسے شکر گزار کہا جائے گا کیونکہ اس نے اپنے رب کی رضامندی حاصل کی ہے۔ اگر کوئی نافرمانی کرے گا تو اسے منکر یا ناشکرا کہا جائے گا کیونکہ اس نے ایسے کام کیے ہیں جو اس کے رب کو ناپسند ہیں۔ اگر بندے نے خدا کی نعمتوں (نعمتوں)

کو اطاعت یا نافرمانی میں استعمال نہ کر کے معطل رکھا تو یہ بھی اللہ کی نعمتوں کا انکار ہے [ان کو نافرمانی کے رجحانات کو دور کرنے کے لیے استعمال نہ کرنا]۔ دنیا میں پیدا کی جانے والی تمام چیزیں بنیادی طور پر بندوں (انسانوں) کے لیے آلات ہیں اور ان کے ذریعے سے ایک بندہ آخرت کی ابدی خوشی اور دائمی کامیابی اور خدا کی قرب کی سعادت حاصل کر سکتا ہے۔ ہر فرمانبردار بندہ اپنی اطاعت کے مطابق اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر گزار ہے اور ہر وہ شخص جس نے ان نعمتوں کو استعمال نہیں کیا یا ہر گنہگار جس نے خدا سے دوری کی راہ میں ان کا استعمال کیا وہ اللہ کے سوا کسی اور کی محبت میں ناشکرا اور حد سے تجاوز کرنے والا ہے۔

شکر گزار نعمتیں

شکر گزاری کا دوسرا جزو وہ نعمتیں ہیں جو شکر گزاری کے قابل ہیں۔ یہاں نعمتوں کی حقیقت، ان کی اقسام اور درجات (درج) کی وضاحت کی جائے گی۔ مزید برآں، وہ چیزیں جو خاص نعمتوں کے طور پر تشکیل دیتی ہیں اور وہ چیزیں جو مشترکہ نعمتوں کی حیثیت سے تشکیل دیتی ہیں ان کی وضاحت کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر اتنی نعمتیں نازل کی ہیں کہ ان کا شمار بھی نہیں کیا جا سکتا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَإِن تَعُدُّوا نِعْمَتَ ٱللَّهِ لَا تُحْصُوهَآ

"اور اگر تم خدا کی نعمتوں کو گننا شروع کرو گے [جو لامحدود اور بے شمار ہیں]، تو تم ان کو کسی بھی گنتی میں شمار نہیں کر پاؤ گے۔" (سورۃ البقرۃ باب ۱۴، آیت ۳۴)

نعمت کی حقیقت اور اس کی اقسام: یہ جان لینا چاہیے کہ ہر اچھائی، ہر لذت، ہر خوشی، ہر وہ چیز جس کی تلاش کی جاتی ہے، اور ہر وہ چیز جو مفید اور مفید ہے، وہ ایک نعمت ہے لیکن اصل نعمت آخرت میں ابدی خوشی اور دائمی کامیابی ہے۔ آخرت میں ابدی خوشی اور لازوال کامیابی کے علاوہ کوئی بھی چیز جسے نعمت کہا جاتا ہے، یا تو یہ کہنا غلط ہے یا یہ ایک تمثیلی استعمال ہے۔ مثال کے طور پر ایک دنیاوی نعمت جو آخرت میں مدد نہیں کرتی، اسے نعمت کہنا غلط ہے۔ اس اصطلاح کا اطلاق کسی ایسی چیز پر کرنا درست ہے جو کسی ایک یا ایک سے زیادہ ذرائع سے آخرت میں ابدی سعادت اور لازوال کامیابی تک پہنچنے کا ذریعہ ہو، کیونکہ وہ چیز حقیقی نعمت کے حصول کا سبب ہے۔ وہ نعمتیں اور لذتیں جو آخرت کی ابدی سعادت اور لازوال کامیابی کے ذریعہ ہیں یا اس میں مدد کرتی ہیں، ان کی وضاحت کے لیے ہم ان کو کئی اقسام میں تقسیم کریں گے:

نعمتوں کی پہلی تقسیم: اگر ہم تمام معاملات کو اپنے آپ سے منسوب کریں تو چار طرح کے معاملات ہوں گے: پہلی وہ چیزیں جو دنیا و آخرت دونوں کے لیے فائدہ مند ہوں جیسے علم اور خوبصورت اخلاق، آداب، کردار اور باطنی مزاج (*حسن الخلق*)؛ دوسرا، وہ معاملات جو دنیا و آخرت دونوں میں غیر مفید ہیں جیسے جہالت اور بد اخلاق۔ آداب، کردار اور اندرونی مزاج تیسری بات یہ ہے کہ وہ چیزیں جو دنیا کے لیے نفع مند ہیں لیکن آخرت کے لیے غیر مفید ہیں، مثلاً خواہشات میں لذت حاصل کرنا۔ چوتھی بات یہ ہے کہ وہ معاملات جو دنیا کے لیے نقصان دہ ہیں لیکن آخرت کے لیے فائدہ مند ہیں مثلاً خواہشات پر قابو پانا اور ادنیٰ نفس کی مخالفت کرنا۔ پہلی قسم جو دنیا اور آخرت دونوں کے لیے فائدہ مند ہے وہ حقیقی نعمت ہے، جیسے علم اور خوبصورت اخلاق، آداب، کردار اور باطنی طبیعت۔ [دوسرے] قسم جو دونوں میں غیر فائدہ مند ہے وہ حقیقی مشکل ہے جو علم کے برعکس ہے جو جہالت ہے ، اور خوبصورت

کردار کی خصوصیات کے برعکس ہے جو برے کردار کی خصوصیات ہیں۔ تیسری قسم جو دنیا کے لیے فائدہ مند ہے لیکن آخرت کے لیے فائدہ مند نہیں ہے، اہل بصیرت اور حکمت اسے خالص سختی قرار دیتے ہیں اور جاہل اسے نعمت سمجھتے ہیں۔ اس کی تمثیل ایسی ہے جیسے کسی کو زہر سے بھرا ہوا شہد مل جائے۔ اگر کوئی زہر سے واقف ہو تو شہد کو آفت سمجھے گا اور اگر کوئی اس سے ناواقف ہو تو اسے نعمت سمجھے گا۔ چوتھی قسم جو دنیا کے لیے نقصان دہ ہے لیکن آخرت کے لیے فائدہ مند ہے، عقل اور حکمت کے لوگ اسے نعمت اور جہالت کو مصیبت سمجھتے ہیں۔ اس کی تمثیل ایک کڑوی دوا کی مانند ہے جس کا ذائقہ برا ہوتا ہے جو عارضی ہوتا ہے، لیکن اس کے ذریعے حاصل ہونے والی صحت خوش آئند اور دیرپا ہوتی ہے۔ اگر بچے کو پینے کے لیے کڑوی دوا دی جائے تو وہ اسے مشکل سمجھ کر اسے کھانے پر راضی نہیں ہوگا سوائے اس کے کہ بچہ اسے لینے پر مجبور کر دیا جائے جبکہ ایک باشعور اور مہذب انسان خوشی سے کڑوی دوا پیتا ہے۔ اتنا ہی نہیں، جو دوائی یا اس کے اجزاء فراہم کرتا ہے یا اس کی تیاری میں مدد کرتا ہے اور ایسے شخص کا شکر گزار ہوتا ہے اور احسان کا مقروض محسوس کرتا ہے، ایسے شخص کے قریب آنا چاہتا ہے اور تحائف کی بارش کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جاہل دوست ذہین دشمن سے زیادہ نقصان دہ ہے۔ ہر انسان اپنے نچلے نفس کا دوست ہوتا ہے لیکن وہ جاہل دوست ہوتا ہے، اسی لیے وہ انسان کے ساتھ ایسا سلوک کرتا ہے جس طرح دشمن بھی کسی کے ساتھ سلوک نہیں کرتا۔

برکتوں کی دوسری تقسیم: دنیاوی ذرائع میں اچھے اور برے دونوں کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ بہت کم ذرائع ایسے ہیں کہ ان میں صرف بھلائی ہو اور برائی نہ ہو۔ مال، شہرت، اولاد، رشتہ دار اور دیگر تمام وسائل ایسے ہیں کہ ان میں اچھائی اور برا دونوں ہیں۔ اس طرح کے ذرائع کو مزید تین قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے: پہلی قسم وہ اسباب ہیں جن کا فائدہ نقصان سے زیادہ ہو مثلا اپنی ضرورت کے مطابق مال اور شہرت وغیرہ۔ دوسری قسم وہ اسباب ہیں جن کا نقصان اکثریت کے لیے فائدہ سے زیادہ ہوتا ہے مثلا بہت زیادہ دولت، وسیع شہرت وغیرہ۔ تیسری قسم وہ اسباب ہیں جن کا نفع اور نقصان برابر ہے۔ یہ وہ معاملات ہیں جو مختلف افراد کے لیے مختلف ہیں، مثال کے طور پر ایک متقی شخص اچھے مال سے فائدہ اٹھاتا ہے، چاہے وہ بہت زیادہ ہی کیوں نہ ہو کیونکہ وہ اسے صدقہ اور عطیہ کے ذریعے خدا کی راہ میں خرچ کرتا ہے۔ اگر کسی کے پاس یہ خدائی عطا کردہ صلاحیت ہے تو دولت کی کثرت اس کے لیے نعمت ہوگی۔ کچھ بدقسمت لوگوں کو تھوڑی سی دولت سے نقصان پہنچایا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں، وہ اسے غیر اہم سمجھتے ہیں، ہر وقت اپنے رب سے شکایت کرتے ہیں، اور زیادہ کے لیے لالچ رکھتے ہیں۔ ایسے شخص کے لیے یقینا یہ دولت ذلت اور تکلیف کا باعث ہے۔

نعمتوں کی تیسری تقسیم: نیکی سے متعلق تمام معاملات تین قسمیں ہیں، ایک پہلو میں: وہ جو اپنے آپ میں مطلوب ہیں؛ دوسرا، وہ جو دوسری چیزوں کے لیے تلاش کی جاتی ہیں [اور اپنے آپ میں نہیں]؛ اور تیسری وہ چیزیں جو اپنے آپ میں اور دوسری چیزوں کے لیے تلاش کی جاتی ہیں۔ پہلی قسم جو اپنے آپ میں مطلوب اور محبوب ہے ان میں الٰہی کی بصیرت کی لذت اور اس سے ملاقات شامل ہے۔ یہ آخرت کی ابدی خوشی اور دائمی کامیابی کی سعادت ہے اور یہ ہمیشہ کے لیے ہے۔ ابدی خوشی اور لازوال کامیابی کی یہ سعادت اس کے ذریعے سے کسی اور چیز کو حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی ہے، بلکہ یہ اپنے لیے تلاش کی جاتی ہے اور یہ خود مقصد ہے۔ دوسری قسم یا دیگر چیزوں کے لیے جن چیزوں کی تلاش کی جاتی ہے ان میں *درہم* اور *دینار* (سونے اور چاندی کے سکے جو پرانی کرنسی تھے، دوسرے لفظوں میں پیسہ اور دولت) شامل ہیں۔ اگر دنیاوی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کوئی اور چیز مقرر کی جاتی تو سونا، چاندی اور پتھروں میں کوئی فرق نہ ہوتا (کیونکہ یہ سب قیمت و اہمیت کے لحاظ سے برابر ہوتے]، لیکن چونکہ وہ (مال و دولت) دنیاوی لذتوں کے حصول کا ذریعہ ہیں اور ان کے وسائل سے دنیاوی آسائشیں آسانی اور مصلحت کے ساتھ حاصل کی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے آپ میں جاہلوں کے محبوب بن گئے۔ وہ جاہلوں کے اس حد تک محبوب ہو چکے ہیں کہ وہ انہیں جمع کرتے ہیں، انہیں زمین میں دفن

کرتے ہیں (انہیں دوسروں کی پہنچ اور علم سے دور بہت سی جگہوں پر خفیہ اور محفوظ طریقے سے ذخیرہ کرتے ہیں)، انہیں دکھاوے سے خرچ کرتے ہیں، اور یہ سوچتے ہیں کہ پیسہ اور دولت اپنے آپ میں مقصد ہیں۔ ایسے لوگوں کی تمثیل ایک ایسے شخص کی ہے جو کسی دوسرے سے محبت کرتا ہے اور اسی کی وجہ سے وہ بھی اس پیغمبر سے محبت کرنا شروع کر دیتا ہے جو ایک دوسرے کے پیغامات پہنچاتا ہے اور ان کی ملاقات کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اس کے بعد رسول کی محبت اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ انسان حقیقی محبوب کو بھول جاتا ہے اور زندگی بھر محبوب کا نام بھی نہیں لیتا اور اس کے بجائے اپنے آپ کو رسول کی محبت اور اس کی خدمت میں مصروف کر دیتا ہے۔ یہ انتہائی جہالت اور کھلی گمراہ کاری ہے۔ تیسری قسم میں وہ معاملات شامل ہیں جو اپنے آپ میں اور دوسری چیزوں کے لئے بھی تلاش کیے جاتے ہیں ، جیسے صحت اور حفاظت۔ ان کی بھی تلاش کی جاتی ہے کیونکہ صحت حاصل کرنے کے بعد انسان کو الہی یاد اور غور و فکر کرنے کی صلاحیت حاصل ہوتی ہے جس کے نتیجے میں انسان کو خدا کی طرف لے جاتا ہے۔ اس کے علاوہ انسان کو ان ذرائع سے دنیاوی لذتیں بھی حاصل ہوتی ہیں۔ صحت کی تلاش اپنے آپ میں بھی ہے کیونکہ بعض اوقات انسان پیدل چلنا نہیں چاہتا ہے (جیسا کہ سواری یا سواری کا عادی ہے]، اس کے باوجود وہ چاہتا ہے کہ دونوں پاؤں ٹھیک ہوں، حالانکہ دونوں پیروں کی حفاظت کی تلاش کی جائے کیونکہ وہ چلنے کا ذریعہ ہیں، لیکن چونکہ حفاظت اپنے آپ میں محبوب ہے۔ اسی وجہ سے اس کی تلاش کی جاتی ہے۔

ان تینوں اقسام میں اصل نعمت پہلی قسم ہے، دوسرے لفظوں میں آخرت کی ابدی خوشی اور لازوال کامیابی کی سعادت جو اپنے آپ میں تلاش کی جاتی ہے۔ جو چیز اپنے آپ میں اور دوسری چیزوں کے لیے بھی تلاش کی جاتی ہے وہ بھی نعمت ہے لیکن پہلی نعمت کے مقابلے میں یہ درجہ کم ہے۔ جو چیز اپنے آپ میں نہیں بلکہ دوسری چیزوں جیسے پیسے اور دولت کے لیے تلاش کی جاتی ہے، اسے برکت نہیں کہا جائے گا کیونکہ وہ اپنے آپ میں نعمتیں ہیں، بلکہ انہیں نعمت کہا جائے گا کیونکہ وہ ذریعہ ہیں۔ لہٰذا یہ صرف اس شخص کے لیے نعمتیں ہیں جو ان کے بغیر اپنی ضروریات پوری نہیں کر سکتے۔ اگر کسی فرد کا مقصد علم و عبادت ہے اور اس کے پاس اپنی ضرورت کے مطابق مال (مالی وسائل) ہے تو ایسے شخص کے لیے سونا اور پتھر دونوں برابر ہیں، کیونکہ انسان کو نہ تو ان کے وجود میں دلچسپی ہوگی اور نہ ہی ان کے عدم وجود میں۔ اگر وہ کسی کو غور و فکر اور عبادت سے روکیں گے تو وہ مصیبتوں کا پیش خیمہ ہوں گے اور کسی کے لیے برکت نہیں ہوں گے۔

نعمتوں کی چوتھی تقسیم: نیکی سے متعلق تمام معاملات کو دوسری قسم میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اچھائی کی تین قسمیں ہیں: فائدہ مند ، خوشگوار اور خوبصورت۔ خوشگوار وہ چیز ہے جس کا فائدہ فوری طور پر معلوم ہوتا ہے۔ فائدہ مند وہ ہے جو اس کے حتمی اختتام کے لحاظ سے فائدہ مند ہے۔ خوبصورت وہ ہے جو ہر حال میں اچھا ہے۔ برائی کی بھی تین قسمیں ہیں: نقصان کا سبب بننے والا ، بدصورت اور نقصان دہنا۔ نیکی میں جس چیز میں تینوں قسم کی اچھائی ایک میں جمع ہوتی ہے وہ علم اور حکمت ہے جو علم و دانش کے لوگوں کی نظر میں فائدہ مند بھی ہے اور لذت بخش اور خوبصورت بھی ہے۔ برائی میں ، اس کی مثال جہالت ہوگی - یہ نقصان کا سبب بننے والا ، بدصورت اور نقصان دہ ہے۔ جاہل شخص یہ جان کر درد محسوس کرتا ہے کہ "میں جاہل ہوں، لیکن یہ دوسرا شخص جاننے والا ہے"، اور اس وقت اپنے عیبوں کو سمجھتا ہے اور اس سے دکھ ہوتا ہے۔ اس موقع پر علم کی لذت کی خواہش سر اٹھاتی ہے لیکن حسد، تکبر اور جسمانی ہوس کسی کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں دو مخالف قوتیں ایک کو دو مخالف سمتوں میں کھینچتی ہیں اور دونوں صورتوں میں تکلیف میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اس کی روح تنگ ہو جاتی ہے، علم حاصل کرنے کی صورت میں تکبر چھوڑ کر تعلیم کی ذلت برداشت کرنی پڑتی ہے اور سب سے بڑھ کر اس کے لیے ہوس کو ترک کرنا پڑتا ہے۔ علم نہ حاصل کرنے کی صورت میں وہ اپنی کمی کا ادراک کرتا رہتا ہے۔ ایسا شخص مسلسل [ایک قسم] سزا برداشت کر رہا ہے۔

برکتوں کی پانچویں تقسیم: یہ نعمت ہر لذت پر لاگو ہوتی ہے۔ لذتیں تین قسمیں ہیں: فکری ، جسمانی جو کچھ جانوروں میں عام ہیں ، اور جسمانی جو تمام جانوروں میں مشترک ہیں۔ فکری لذتوں کی مثالوں میں علم اور حکمت شامل ہے کیونکہ اس لذت کو آنکھوں، کانوں، ناکوں، ذائقے، معدے یا نجی اعضاء سے محسوس نہیں کیا جاتا، بلکہ اس کی لذت کو صرف دل ہی محسوس کرتا ہے کیونکہ یہ اس صفت (خصوصیت) کے لیے مخصوص ہے جسے عقل کہا جاتا ہے۔ تمام لذتوں میں سے ، یہ سب سے کم پایا جاتا ہے حالانکہ یہ تمام لذتوں میں سب سے زیادہ برتر ہے۔ اس کی کمی کی وجہ یہ ہے کہ علم کی لذت کو صرف ایک عالم (علم کا مالک) ہی سمجھ سکتا ہے اور حکمت کی لذت کو صرف عقلمند (باطنی روشنی یا علم کا مالک) ہی سمجھ سکتا ہے۔ کتنے لوگ علم و دانش رکھتے ہیں؟ ہر کوئی جانتا ہے [کہ بہت سارے نہیں ہیں]۔ زیادہ تر لوگ (جو علم اور عقلمند ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں یا مشہور ہیں) عالم اور نام و ظاہری شکل میں عقلمند ہیں [صرف لیکن حقیقت میں، حقیقی علم اور باطنی روشنی سے محروم ہیں]۔

علم کی فضیلت اور امتیاز کی وجہ یہ ہے کہ اس کی لذت ہمیشہ انسان کے ساتھ رہتی ہے اور نہ دنیا میں اور نہ ہی آخرت میں کبھی کم ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسا ساتھی ہے جو ہر وقت کسی کے ساتھ رہتا ہے اور اہل علم اس سے بور نہیں ہوتے۔ باقی تمام لذتیں انسان کو تھکا دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر کھانے سے جسم میں سستی پیدا ہو جاتی ہے، جماع سے فارغ ہونے کے بعد تھکاوٹ اور بھاری پن کا احساس ہوتا ہے، لیکن علم اور حکمت کے سمندر میں کتنا ہی تیر کر غوطہ لگا دے، اس کے مزاج پر وزن کا احساس نہیں ہوتا اور جسم تھکاوٹ کا شکار نہ ہوتا۔ جو شخص اس طرح کی مخصوص اور برتر چیز حاصل کرنے کی صلاحیت کے باوجود کسی کمتر چیز پر آباد ہو جاتا ہے اور چند دن کی لذتوں کے پیچھے بے بسی سے بھٹکتا ہے، تو ایسے شخص کے پاگل پن اور بدقسمتی پر کون شک کر سکتا ہے؟ جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ عام آدمی علم کی لذت کو کیوں نہیں سمجھ سکتے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں اس کا شوق بھی نہیں ہے اور جس میں شوق نہیں ہے اس میں کوئی فہم اور شدید خواہش نہیں ہے۔ شدید خواہش شوق کے تابع ہے۔ اگر شوق نہ ہو تو خواہش بھی نہیں ہوگی یا خواہشات کی پیروی نے ان کے مزاج میں ہلچل مچا دی ہے اور ان کے دلوں میں بیماری پیدا کر دی ہے۔

دوسری قسم کی لذت جو جسمانی ہے اور کچھ جانوروں کے ساتھ مشترکہ ہے جیسے غلبہ، برتری، سب سے آگے ہونے کی لذت۔ اس قسم کی خوشی میں، کچھ جانور انہیں انسانوں جیسے شیر، چیتے اور دیگر طاقتور جانوروں کے ساتھ بھی بانٹتے ہیں۔ تیسری قسم کی لذت جو جسمانی ہے اور تمام جانوروں کے ساتھ مشترک ہے، اس میں معدے کی لذت (کھانا اور کھانا) اور شرم کے اعضاء شامل ہیں۔ یہ خوشیاں سب سے زیادہ وسیع اور عام ہیں ، حالانکہ وہ تمام لذتوں میں سب سے کم اور سستی ہیں۔ چنانچہ زمین پر موجود تمام جاندار ان کو انسانوں کے ساتھ اس حد تک بانٹتے ہیں کہ چھوٹے چھوٹے کیڑے بھی ان میں لطف اندوز ہوتے ہیں۔ جو شخص اس لذت سے اوپر اٹھتا ہے وہ تسلط اور طاقت (دوسروں پر حکمرانی یا اختیار) کی لذت کا شکار ہو جاتا ہے۔ جو شخص اس لذت سے اوپر اٹھ جاتا ہے وہ تیسرے (اس وضاحت میں سب سے پہلے) لذت میں مشغول ہو جاتا ہے یہاں تک کہ علم اور حکمت کی لذت کسی میں حاوی ہو جاتی ہے، خاص طور پر خدا کی ہستی (*ذات*) اور صفات (*صفات*) *کی معرفت (معارفہ)* کسی کو ایسی لذت دیتی ہے کہ اسے کسی اور چیز میں نہیں ملتا۔ یہ ان لوگوں کا درجہ ہے جو اللہ کے قریب لائے گئے ہیں (*صدیقین* یا گنوسٹکس)۔

دل کی چار قسمیں: اس وضاحت کی روشنی میں دل کی چار قسمیں ہیں۔ ایک قسم کا دل صرف خدا سے محبت کرتا ہے اور اس وقت تک سکون نہیں پاتا جب تک کہ خدا کی عرفت میں اضافہ جاری نہ رہے۔ دوسری قسم کا دل یہ بھی نہیں جانتا کہ خدا کی معرفت میں موجود لذتوں کی اقسام ہیں۔ یہ صرف شہرت ، کنٹرول (اختیار اور طاقت) ، دولت ، اور تمام جسمانی لذتوں اور لذتوں میں لذت تلاش کرتا ہے۔ تیسرا دل زیادہ تر حالات میں ذکر الٰہی *(ذکر)*، *غور و فکر اور معرفت* (معارفہ) کے ذریعے خدا سے قربت پاتا ہے، لیکن بعض اوقات انسانی صفات اس پر اپنا اثر ڈالتی ہیں۔ چوتھے دل میں اکثر انسانی خصلتیں حاوی ہوتی ہیں لیکن بعض اوقات یہ علم اور علم کے چشموں سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ ان میں سے پہلی قسم کا دل ممکن نہیں ہے۔ اگر ہم فرض کریں کہ یہ ممکن ہے تو پھر وہ تعداد میں اتنے کم ہیں جو غیر موجود کے قریب ہیں۔ دنیا دوسری قسم کے دل سے بھری ہوئی ہے۔ تیسری اور چوتھی قسم کے دل موجود ہیں لیکن کم تعداد میں ، اس کے بجائے انہیں نایاب کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ جس زمانے میں انبیاء علیہم السلام کے زمانے کے قریب تھے، اس زمانے میں ایسے دلوں کی کثرت تھی۔ جیسے جیسے زمانہ نبوت بتدریج دور ہوتا گیا، اس قسم کے دلوں کی تعداد بھی کم ہوتی گئی اور یہ عمل قیامت تک جاری رہے گا۔

برکتوں کی چھٹی تقسیم: یہ تقسیم تمام [اقسام اور تقسیم] نعمتوں پر غالب ہے۔ اس تقسیم کا خلاصہ یہ ہے کہ نعمتیں دو قسمیں ہیں: ایک وہ نعمت ہے جو اپنے آپ میں انسان کے مقصد کی چوٹی ہے اور وہ آخرت کی ابدی سعادت اور دائمی کامیابی ہے اور اس میں چار معاملات شامل ہیں: وہ وجود اور رزق جس کا کبھی معدوم نہیں ہونا (*فنا*)، وہ خوشی جس میں کوئی غم شامل نہ ہو، وہ علم جس کے ساتھ کسی جہالت کے ساتھ نہ ہو، اور وہ دولت اور آسائش جس میں کوئی غربت نہ ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَاعَيْشَ اِلَّاعَيْشُ الْآخِرَةِ

"آخرت کی زندگی اور آسائش کے سوا کوئی زندگی اور راحت نہیں ہے"۔ (بیان کردہ*حادیث* کا مجموعہ *صحیح بخاری* اور *صحیح مسلم* انس رضی اللہ عنہ سے ہے

آپ نے خوشی کے موقع پر اس بات کا ذکر کیا تاکہ نفس نفس دنیاوی خوشیوں سے مطمئن نہ ہو اور اس بات پر غور کرے کہ اس زندگی کے بعد ایک ایسی زندگی بھی ہے جس کا کوئی انتہا نہیں ہے، صرف خوشی ہو گی جو کبھی غم میں تبدیل نہیں ہوگی۔

ہدایت کے مراحل: (حق اور ابدی حقیقتوں کی طرف) ہدایت ایک ایسی حقیقت ہے جس کے بغیر کوئی بھی شخص ابدی خوشی اور دائمی کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ [ہدایت سب سے بڑی نعمتوں میں سے ایک ہے جو شکر گزاری کے قابل ہے۔] انسان کسی ایسی چیز کی خواہش کر سکتا ہے جس میں اس کی آخرت کی سعادت شامل ہو، لیکن اگر وہ یہ بھی نہ جانتا کہ اس کی نجات کس مادے میں مضمر ہے، اور [اپنے باطن اور بیرونی دنیا میں] انتشار کا سبب بننے والی چیزوں کو اپنی اصلاح سمجھتا ہے تو وہ محض نیکی کرنے کی نیت سے فائدہ نہیں اٹھائے گا۔ اگر ہدایت غائب ہو تو ارادہ، قابلیت اور ذرائع [نیک کام کرنے کے لیے] کوئی فائدہ نہیں رکھتے [لہٰذا انسان کو سعادت، نجات اور ابدی خوشی اور لامتناہی کامیابی کی راہ کی طرف لے جانے کے لیے ہدایت ناگزیر ہے]۔ رہنمائی کے تین مراحل ہیں۔ پہلا مرحلہ اچھائی اور برائی کی تفہیم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام بندوں کو یہ نعمت عطا کی ہے - بعض کو عقل عطا فرما کر [جو کہ نیکی اور برائی میں تمیز کرنے کا ذریعہ ہے، اور یہ صلاحیت پوری دنیا کے انسانوں کو عطا کی گئی ہے] اور بعض کو اپنے انبیاء کے ذریعے پیغام بھیج کر۔ آسمانی کتابیں، انبیاء کریم اور باطنی بصیرت اور حکمت

(جو چاروں طرف انسانوں کو عطا کی گئی ہے) رہنمائی کا ذریعہ ہیں۔ ان ذرائع سے کسی کو نہیں روکا جا سکتا۔ صرف وہی لوگ جن کے دل تکبر، حسد اور دنیا سے محبت سے عاری ہیں، ان ذرائع کے حصول پر عمل کرتے ہیں۔ جن کے دلوں میں تکبر، حسد اور دنیا سے محبت بھری ہوئی ہے، یا عقل پر پردہ ڈالنے والے ذرائع میں پھنسے ہوئے ہیں، اگرچہ آنکھیں روشن ہوں تو ان کے لیے قرآن نے ارشاد فرمایا:

فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى ٱلْأَبْصَـٰرُ وَلَـٰكِن تَعْمَى ٱلْقُلُوبُ ٱلَّتِى فِى ٱلصُّدُورِ

"حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، بلکہ جو دل ان کے سینے میں ہیں وہ اندھے ہو جاتے ہیں [اور عقل و ادراک کی صلاحیت کھو دیتے ہیں]۔ (سورۃ البقرۃ البقرۃ والصندوق، آیت 46)

وہ چیزیں جو عقل اور ادراک پر پردہ ڈالتی ہیں ان میں عادات، اپنی روایات سے لگاؤ [اور پرورش]، اپنے آباؤ اجداد کی [فکری اور نظریاتی] وراثت کو محفوظ رکھنے کی خواہش شامل ہیں۔ قرآن مجید نے اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:

إِنَّا وَجَدْنَآ ءَابَآءَنَا عَلَىٰٓ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰٓ ءَاثَـٰرِهِم مُّقْتَدُونَ

"[کچھ لوگ کہتے ہیں کہ] ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو اس طریقہ کار (طرز زندگی یا سوچنے کے عمل) پر پایا ہے اور [صرف] [صرف] ان کی پیروی کر رہے ہیں [اس کے پیچھے کوئی دلیل کے بغیر]۔" (سورۃ البقرۃ باب 43، آیت 23)

تکبر، حسد، برتری کی پیچیدگی ایسی چیزیں ہیں جو دلوں کو اندھا کر دیتی ہیں اور انہیں ہدایت کی راہ پر چلنے سے روکتی ہیں۔ ہدایت کا دوسرا مرحلہ پہلے مرحلے کے بعد آتا ہے اور روحانی جدوجہد (*مجاہدہ*) کے نتیجے میں حاصل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے ہر حال میں ہدایت کے ساتھ عطا فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے [بغیر کسی استثناء کے پوری انسانیت سے وعدہ کے طور پر]:

وَٱلَّذِينَ جَـٰهَدُوا۟ فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا

"جو لوگ ہماری راہوں میں جہاد کرتے ہیں ہم انہیں یقینا اپنی راہوں کی طرف رہنمائی کریں گے۔" (سورۃ البقرۃ البقرۃ القرآن آیت نمبر 69)

رہنمائی کا تیسرا مرحلہ دوسرے مرحلے کے بعد ہوتا ہے۔ یہ ہدایت ایک ایسی روشنی ہے جو روحانی جدوجہد کے کمال کے بعد، نبوت کے دائرے اور ہدایت کے دائرے میں چمکتی ہے۔ اس نور کی وجہ سے انسان کو ان چیزوں کا علم ملتا ہے جو عقل کے ذریعے سے معلوم نہیں ہو سکتے، جس پر الٰہی قانون، احکام اور ممنوعات کا دارومدار ہے، اور جن کے ذریعے علم کا حصول ممکن ہے۔ اس ہدایت کو مطلق ہدایت کہا جاتا ہے۔ اس کے سوا باقی تمام ہدایت اس کے مقدمے اور پردے ہیں۔ یہ ہدایت ایسی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے خاص طور پر اپنے ساتھ منسوب کیا ہے، کیونکہ تمام ہدایت کا منبع خدا کی ہستی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ إِنَّ هُدَى ٱللَّهِ هُوَ ٱلْهُدَىٰ ۗ

"کہہ دو (اے محمد!) اس میں کوئی شک نہیں کہ ہدایت کا راستہ وہی ہے جو اللہ کی طرف سے ہے۔" (سورۃ البقرۃ باب 2، آیت 120)

اس (خدا کی طرف سے) کو "زندگی" کہا جاتا ہے:

أَوَمَن كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَٰهُ وَجَعَلْنَا لَهُۥ نُورًا يَمْشِى بِهِۦ فِى ٱلنَّاسِ

"ایک شخص جو اس سے پہلے (دل اور روح کی موت کی وجہ سے) مر چکا تھا، پھر ہم نے اسے زندہ کر دیا، پھر ہم نے اس کو ایسی روشنی عطا کی کہ وہ اس نور کے ساتھ لوگوں کے درمیان گھومتا پھرتا ہے۔" (سورۃ البقرۃ باب 6، آیت 122)

مندرجہ ذیل آیت میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

أَفَمَن شَرَحَ ٱللَّهُ صَدْرَهُۥ لِلْإِسْلَٰمِ فَهُوَ عَلَىٰ نُورٍ مِّن رَّبِّهِۦ ۚ

"جس شخص کا دل اللہ تعالیٰ نے اپنی مرضی کے تابع ہونے کی راہ کے لیے کھول دیا ہے، وہ اپنے رب کی طرف سے نور پر ہے۔" (سورۃ البقرۃ باب ۳۹، آیت ۲۲)

روح - ایک عظیم نعمت: غور کریں کہ کس طرح جسمانی اعضاء اور اعضاء ، ادراک اور طاقت کا فائدہ ایک لطیف بخارات پر منحصر ہے جس کا مرکز (رہائش گاہ) دل ہے ، جس سے یہ پھیلی ہوئی رگوں کے ذریعے پورے جسم میں گردش کرتا ہے۔ جیسے ہی یہ جسم کے کسی عضو تک پہنچتا ہے، اس میں احساس، ادراک، حرکت اور طاقت پیدا کرتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے ایک [روشنی] چراغ جو [تاریکی] گھر میں گھومتا ہے اور یہ چراغ جہاں بھی پہنچے گا، یہ روشنی وہاں پہنچ جائے گی۔ لہٰذا گھر کا کوئی بھی کونا جہاں یہ چراغ پہنچے گا، وہاں روشنی پہنچنے کا سبب بنے گا۔ اگرچہ یہ نور خدا کی تخلیق اور ایجاد ہے لیکن اس نے اپنی حکمت سے چراغ کو اس کا سبب بنایا ہے۔ اس لطیف بخارات کو ڈاکٹروں کی اصطلاح میں "روح" کہا جاتا ہے۔ اس کا ٹھکانا دل ہے۔ دل کے ساتھ اس کی تمثیل یہ ہے کہ روح کو چراغ کے شعلہ سے مشابہت ملی ہے، دل برتن کی مانند ہے، دل کا کالا خون بتی کی مانند ہے، اس کے لیے رزق چراغ کے لیے تیل کی مانند ہے، اور اس کی وجہ سے پورے جسم میں جو زندگی ہے، چراغ کی وجہ سے گھر کے اندر کی روشنی کی طرح ہے۔ اگر چراغ میں تیل کھا جاتا ہے تو چراغ بجھ جاتا ہے، اسی طرح روح کا چراغ اس وقت بجھ جاتا ہے جب رزق کا استعمال بند ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ جب کبھی کبھی بتی جل کر راکھ ہو جاتی ہے اور چراغ تیل سے بھرا ہوا ہونے کے باوجود تیل جذب کرنے کی صلاحیت برقرار نہیں رکھتا تو اسی طرح دل میں جو خون ہے وہ دل کی گرمی کی وجہ سے جل سکتا ہے اور رزق کے باوجود روح کا چراغ بجھ جاتا ہے کیونکہ رزق قبول کرنے کی صلاحیت اب نہیں رہتی جو روح کے مستقل وجود کو یقینی بناتی ہے۔ اس کے علاوہ جس طرح چراغ کبھی کبھار اندرونی وجوہات کی بنا پر بجھ جاتا ہے جیسے تیل کھل جاتا ہے یا بتی جل جاتی ہے، اسی طرح یہ ہوا جیسی بیرونی وجوہات کی وجہ سے بھی بجھ جاتا ہے۔ اسی طرح روح کبھی کسی داخلی وجہ سے معدوم ہو جاتی اور کبھی خارجی وجوہات کی بنا پر جیسے قتل جس سے اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ چراغ اس میں تیل کے

استعمال کی وجہ سے یا بتی کے جلنے کی وجہ سے، یا کسی کے اس پر پھونکنے کی وجہ سے، یا ہوا کے راستے میں آنے کی وجہ سے، چاہے وہ کیسے ہی بجھ جائے، یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کے حکم سے وجود میں آتی ہیں۔
انسانی روح کا بھی یہی حال ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے کہ یہ کس طرح معدوم ہو یا کیسے بجھ جائے، یہ خدا کے علم میں اور اس کے ابدی حکم کے مطابق ہے۔ محفوظ شدہ لوح (خدا کی کتابوں کی کتاب جس میں ماضی، حال اور مستقبل کا علم ہے) ہر روح کے لیے ایک آخری وقت ہے۔ جب یہ وقت ختم ہو جائے گا تو روح کا جسم کے ساتھ رشتہ ختم ہو جائے گا اور یہ خاتمہ صرف وہی ہو گا جیسا کہ تقدیر کے مصنف (خدا) نے لکھا ہے (مقرر کیا ہے)۔

جس طرح چراغ بجھنے سے گھر کا اندھیرا ہو جاتا ہے، اسی طرح روح کے جسم سے نکلنے سے پورے جسم میں تاریکی پھیل جاتی ہے اور نور کا عمل ختم ہو جاتا ہے جو [پہلے] روح سے حاصل کیا گیا تھا، دوسرے لفظوں میں، حواس، ادراک، ارادے اور ان تمام چیزوں کی روشنی جو "زندگی" کی اصطلاح سے گھیرے ہوئے ہیں۔ روح بھی ایک راز ہے اور الٰہی کی نعمتوں کی طرف ایک واضح اشارہ ہے اور اس موضوع کی صداقت کا [الہامی] اعلان ہے:

قُل لَّوْ كَانَ ٱلْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَـٰتِ رَبِّى لَنَفِدَ ٱلْبَحْرُ قَبْلَ أَن تَنفَدَ كَلِمَـٰتُ رَبِّى وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِۦ مَدَدًا

"کہہ دو اگر میرے رب کی باتوں کو لکھنے کے لیے سمندر سیاہی بن جائے تو میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے ہی سمندر ختم ہو جائے گا، اگرچہ ہم بھی اس کے ساتھ مل کر لے آئیں۔" (سورة البقرة آیت 18، آیت 109)

ایک شخص ان تمام باتوں کو جاننے کے باوجود، اللہ کی نعمتوں کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے اور ان کا شکر ادا نہ کرتا ہے، وہ بہت بدقسمتی ہے، رحمت الٰہی سے دور اور عذاب الٰہی کے قریب ہے۔

لوگوں کو شکر گزاری کیوں نہیں ہوتی؟

جب کسی ذہین انسان کی نظر کسی چیز پر پڑتی ہے یا دل میں کسی چیز کا خیال آتا ہے تو اس میں خدا کی نعمتوں کی تلاش ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ لوگ جہالت اور غفلت کی وجہ سے خدا کا شکر ادا نہیں کرتے، کیونکہ جن لوگوں کے دل اور آنکھیں غفلت اور جہالت کے موٹے پردے سے ڈھکے ہوئے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کی کسی نعمت کو نعمت نہیں سمجھتے۔ جب انہیں کسی نعمت کا علم بھی نہیں ہے تو پھر وہ اس کا شکر کیسے ادا کر سکتے ہیں؟ اگر وہ کسی نعمت کا ادراک رکھتے ہیں تو شکر گزاری کا جو طریقہ وہ جانتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ *وہ* حمد *للہ* یا شکر *اللہ* کو زبان سے کہیں اور اسے کافی سمجھیں۔ وہ نہیں جانتے کہ شکر گزاری کا مطلب یہ ہے کہ اس نعمت سے متعلق حکمت (مقصد اور ارادہ) کی تکمیل میں برکت کو استعمال کیا جائے اور یہ کہ حکمت خدا کی اطاعت ہے۔ اگر لوگوں کے پاس یہ دو فہم ہیں اور پھر بھی خدا کا شکر ادا نہیں کرتے ہیں تو اس کی وجہ شیطان اور خواہشات کے غلبے کے سوا کچھ نہیں ہے۔

نعمتوں کے ساتھ غفلت کے اسباب: نعمتوں سے غفلت کی بہت سی وجوہات ہیں۔ ان میں سے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ لوگ اپنی جہالت کی وجہ سے نعمتوں کو برکت نہیں سمجھتے، جو لوگوں کو عام طور پر حاصل ہوتی ہے، اس لیے وہ ان کے لیے شکر گزار نہیں ہیں [کیونکہ انہیں ہر ایک کا ناقابل تنسیخ پیدائشی حق سمجھا جاتا ہے کیونکہ انہیں عام طور پر کوئی خاص چیز نہیں سمجھا جاتا ہے]۔ ان کے نزدیک برکتیں خاص ہونی چاہئیں [یا کسی کو خاص طور پر دی جائیں اور تمام یا لوگوں کی اکثریت کے لیے مشترک نہ ہونی چاہئیں]، دوسرے لفظوں میں، اگر کوئی ایسی چیز ہے جس کے پاس خاص طور پر [صرف] ہو تو اسے نعمت کہا جا سکتا ہے۔ جہاں تک کھانے پینے یا جسمانی نظام کی فضیلت (مختلف جسمانی اعضاء کی صلاحیتیں اور افادیت اور وہ ہر فرد کی مدد کیسے کرتے ہیں جس کے بغیر زندگی انتہائی مشکل ہوسکتی ہے) کا تعلق ہے تو ہر بڑے، چھوٹے، امیر، غریب، نمایاں، ادنیٰ (معاشرتی طور پر غیر اہم) [افراد] میں ان میں مشترک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ نعمتیں کیسے ہو سکتی ہیں [ان کے غلط نقطہ نظر میں]؟ یہی وجہ ہے کہ وہ تازہ ہوا کو نعمت بھی نہیں سمجھتے، حالانکہ یہ ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ اگر کسی کا گلا ایک لمحے کے لیے نچوڑ دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے [جسم میں] تازہ ہوا کا گزرنا رک جاتا ہے، تو تازہ ہوا نہ ملنے سے موت کو گلے لگانا پڑ سکتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص عوامی حمام میں قید ہو یا کسی ایسی جگہ پر قید ہو جہاں صرف گرم ہوا گزرتی ہے یا کوئی کسی گہرے کنویں میں گر جائے جہاں نمی کی وجہ سے ہوا بھاری ہو تو وہ دم گھٹنے کی وجہ سے مر سکتا ہے۔ فرض کریں کہ اگر کوئی گرم عوامی غسل خانے یا گہرے کنویں کے پھنسے نکلنے میں کامیاب ہو جائے اور آپ ایسے شخص سے تازہ ہوا کی قدر و قیمت کے بارے میں پوچھیں تو وہ اسے ایک نعمت سمجھ کر اس کے لیے شکر ادا کرے گا۔ یہ انتہائی جہالت ہے کہ لوگ نعمت کو اسی وقت نعمت سمجھتے ہیں جب وہ ان سے چھین لی جاتی ہے۔ کبھی کبھی وہ نعمت ایک بار پھر واپس آتی ہے اور کبھی کبھی نہیں ہوتی ہے ، کسی کو ہر حال میں شکر گزاری کرنی چاہئے [چاہے وہ کمی ہو یا کثرت ، ہونا یا نہ ہونا کیونکہ آج ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ چیزوں کے لحاظ سے ، کل ختم ہوسکتا ہے]۔

آپ نے کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا ہوگا جو اپنی آنکھوں کے لیے خدا کا شکر ادا کرتا ہو، حالانکہ یہ بہت بڑی نعمت ہے۔ لیکن جب آنکھوں کی روشنی ختم ہو جاتی ہے، اور کوئی اندھا ہو جاتا ہے تو اس نعمت کی قدر ہوتی ہے۔ اگر خوش قسمتی سے کسی کی بینائی واپس آ جاتی ہے تو وہ اس کے لیے شکر ادا کرتا ہے لیکن جب تک اس کے پاس دیکھنے والی آنکھیں نہیں ہیں وہ اسے نعمت نہیں سمجھتا کیونکہ عام طور پر دنیا میں لوگوں کی آنکھیں ہوتی ہیں۔ کوئی سوچتا ہے کہ جو چیز اتنی عام ہے، وہ نعمت کیسے ہو سکتی ہے؟ اس کی تمثیل ایک متکبر غلام کی ہے جو آداب سے عاری ہے اور ہر وقت گستاخی کی وجہ سے مارا پیٹا جاتا ہے۔ اگر کچھ دیر کے لیے مار پیٹ رک جائے تو اسے نعمت سمجھا جائے گا اور اگر یہ مکمل طور پر بند ہو جائے گا تو وہ تکبر ہو جائے گا اور شکر گزاری چھوڑ دے گا۔ [یہ تمثیل ہر ایک پر لاگو ہوتی ہے کیونکہ ہر شخص خدا کا غلام ہے اور اپنے آقا اللہ تعالیٰ کے ساتھ آداب اور وفاداری کا محتاج ہے۔] لوگوں کی حالت یہ ہے کہ وہ صرف اس دولت (یا خصوصیت) پر شکر گزار ہوتے ہیں جو انہیں اپنے آس پاس کے دوسرے لوگوں پر کچھ امتیاز دیتا ہے، چاہے وہ دولت کم ہو یا زیادہ۔ اس کے علاوہ وہ دیگر تمام نعمتوں کو نظر انداز کرتے ہیں [اور ان کا شکر ادا نہیں کرتے]۔

ایک فقیر کی شکایت کی کہانی: ایک غریب شخص نے دل کے آدمی سے اپنی غربت اور ایک بڑا خاندان ہونے کی شکایت کی اور کہا کہ میں اپنی خراب حالت کی وجہ سے بہت پریشان اور پریشان ہوں۔ گنوسٹک نے اس سے پوچھا، "کیا تم دس ہزار *درہم* (ایک پرانی سونے کی کرنسی اور یہ رقم بہت بڑی ہے) لے کر اندھے ہو سکتے ہو؟" اس نے کہا نہیں۔ گنوسٹک نے پھر پوچھا، "کیا تم دس ہزار *درہم* لے کر گونگا ہونے پر راضی ہو سکتے ہو؟" اس نے کہا نہیں۔ گنوسٹک نے پوچھا، "کیا تم دس ہزار *درہم* لینا پسند کرتے ہو اور لنگڑا ہو جاؤ؟" انہوں نے ایک بار پھر اس کو مسترد کردیا۔ گنوسٹک نے پوچھا، "کیا تم دس ہزار *درہم* لینا پسند کرو گے اور اپنا ہاتھ کھونا پسند کرو گے؟" اس نے

یہ بھی قبول نہیں کیا۔ گنوسٹک نے پوچھا، "کیا آپ دس ہزار درہم کے عوض اپنا دماغ کھونا پسند کریں گے؟" اس نے کہا نہیں۔ پھر اس نے کہا کہ تمہارے رب نے تمہیں پچاس ہزار *درہم* کی دولت دی ہے حالانکہ تم اپنی تنگدستی اور تنگی کا رونا روتے ہو۔

ابن سمک رحمہ اللہ ایک *خلیفہ* کے پاس گئے جس کے پاس اس وقت پانی کا گلاس تھا۔ *خلیفہ* نے ان سے مشورہ مانگا۔ آپ نے فرمایا: فرض کرو کہ تم بہت پیاسا ہو اور یہ گلاس تم سے چھین لیا جائے اور تمہیں کہا جائے کہ یہ تمہیں اس وقت تک واپس نہیں کیا جائے گا جب تک کہ تم اپنا سارا مال نہ چھوڑو [اور تمہیں پانی حاصل کرنے کا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے]۔ کیا آپ ایک گلاس پانی کی خاطر اپنی ساری دولت چھوڑ دیں گے؟" اس نے جواب دیا: بے شک میں سارا مال چھوڑ دوں گا۔ ابن سماک نے پوچھا، "اور اگر آپ پر شرط ہے کہ آپ اپنی پوری سلطنت چھوڑ دیں؟" *خلیفہ* نے فرمایا: اس حالت میں میں اپنی پوری سلطنت چھوڑنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کروں گا۔ آپ نے فرمایا: سلطنت کی حالت ایسی ہے کہ اسے ایک گلاس پانی کے بدلے چھوڑ دیا جا سکتا ہے، پھر آپ کو اس پر زیادہ خوش نہیں ہونا چاہیے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پیاس کے وقت پانی کا ایک گھونٹ اتنا بڑا فضل ہے کہ اس کے حصول کے لیے پوری دنیا کی سلطنت کو بھی قربان کیا جا سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی خاص نعمتیں: چونکہ انسان کے مزاج ان نعمتوں کو ایک مخصوص اور مخصوص نعمتیں سمجھتے ہیں، اس لیے وہ عام نعمتوں کو برکت نہیں سمجھتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ان میں سے کچھ نعمتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو کچھ معاملات میں آپ کے لیے مخصوص ہیں۔ کوئی انسان ایسا نہیں ہے جس کے پاس ان نعمتوں میں سے چند نہ ہوں، جو کسی کے لیے مخصوص ہوں اور تمام لوگوں میں نہ پائی جائیں، صرف ایک ہی کے پاس ہوں یا ان میں بہت کم لوگوں کا حصہ ہو۔ چنانچہ تین ایسی باتیں ہیں جن میں ہر شخص اپنی خصوصیت اور خصوصیت کا قائل ہوتا ہے اور اس کے لیے اپنی تعریف کرتا ہے۔ وہ عقل ، اندرونی خصوصیات (کردار کی خصوصیات ، طرز عمل ، اندرونی مزاج وغیرہ) اور علم ہیں۔

جہاں تک عقل کا تعلق ہے تو ہر انسان خدا سے مطمئن ہے کہ اس نے انسان کو دنیا کا انتہائی ذہین انسان بنایا ہے اور اس کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے عقل مانگتے ہیں ورنہ عام طور پر لوگ اپنی عقل کی مقدار سے مطمئن نظر آتے ہیں۔ یہ عقل کی خصوصیت ہے کہ جو عقل سے عاری ہے وہ اس سے مطمئن نظر آتا ہے اور جس میں عقل موجود ہے وہ بھی خوش رہتا ہے۔ بہرحال اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ وہ تمام انسانوں میں سب سے زیادہ ذہین ہے اور اگر یہ بھی ایک حقیقت ہے تو اسے خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے جس نے اسے یہ سب سے بڑی نعمت عطا کی ہے اور اگر وہ حقیقت میں دنیا کا سب سے ذہین شخص نہیں ہے تو اس کے باوجود شکر گزاری اس پر واجب ہے کہ یہ نعمت اس میں موجود ہے۔

صفات و صفات کی کیفیت یہ ہے کہ آس پاس کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو دوسروں کے عیبوں پر نظر نہ رکھے اور ان پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار نہ کرے، حالانکہ وہی خامیاں کسی میں موجود ہو سکتی ہیں۔ لیکن کوئی دوسروں کی غلطیوں کی مذمت کرتا ہے کیونکہ وہ اپنے آپ کو ان سے آزاد سمجھتا ہے۔ اگر کوئی شخص حقیقت میں اس عیب سے عاری ہے جس میں دوسروں کا ملوث ہے تو اسے چاہیے کہ وہ اس کے لیے خدا کا شکر ادا کرے کہ اس نے اس برائی سے بچا لیا ہے جبکہ دوسرے اس میں ملوث ہیں۔

جہاں تک علم کا تعلق ہے تو ہر شخص اپنی پوشیدہ کیفیات اور دل میں پوشیدہ خیالات سے واقف ہے [جو دوسروں سے چھپانے سے بہتر ہے]۔ وہ حالتیں اور خیالات ایسی ہیں کہ اگر وہ لوگوں پر ظاہر ہو جائیں تو ان کی ساری ساکھ تباہ ہو جائے گی۔ اسی طرح ہر شخص چند باتوں کا علم رکھتا ہے جو اپنے سوا کوئی اور نہیں جانتا۔ اس صورت حال میں، ہر ایک کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے کسی کے عیبوں پر پردہ ڈالا اور [اس کے بجائے] کسی کی اچھی خوبیوں کو نمایاں کیا [اور عوامی طور پر ظاہر کیا]۔ یہ وہ تین معاملات ہیں جن میں ہر شخص اپنی خصوصیت اور خصوصیت کا اقرار کرتا ہے اور اس کا اقرار کرتا ہے۔

ایمان اور یقین ہی حقیقی دولت ہے: جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے گہری بصیرت عطا کی ہے اسے صرف *معارفہ، یقین* اور ایمان *کی دولت سے خوش ہونا چاہیے۔* بلکہ ہم ایسے علماء کو جانتے ہیں جن کو مغرب سے مشرق تک حکمرانوں کے قبضے میں تمام دولت، مددگار اور پیروکار دے دیے جائیں اور ان سے کہا جائے کہ وہ ان کے علم کے بدلے میں ان کو قبول کریں اور اگر وہ اپنا سارا علم ترک نہیں کرنا چاہتے تو اس کا تھوڑا سا حصہ چھوڑ دیں۔ وہ اس پیش کش کو قبول نہیں کریں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ علم کی برکت ہی آخرت میں اللہ تعالیٰ کی قربت اور قربت پیدا کرتی ہے۔ اس کے بجائے اگر ان سے کہا جائے کہ تم آخرت میں جس کمال کی توقع کر رہے ہو وہ تو تو حاصل ہو گا اور اس میں کسی کمی کی توقع نہیں ہے بلکہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ علم میں مشغول ہونے سے جو لذت تمہیں ملتی ہے وہ ہمیں دے دو اور ان کی جگہ دنیاوی لذت لے لو۔ وہ اس طرح کے تبادلے پر راضی نہیں ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ علم کی لذت ابدی ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگی، ہمیشہ رہے گی، چوری نہیں کی جا سکتی، چھین نہیں سکتی، کم نہیں کی جا سکتی، یہ ایک پاک اور پاک لذت ہے جس میں گندگی نہیں ہے، جبکہ دنیاوی لذتوں اور لذتوں میں خامیاں ہیں۔ ان میں کیچڑ اور پریشانی ہوتی ہے، ان کا خوف ان میں ملنے والے اطمینان سے زیادہ ہوتا ہے، ان کا غم ان کی خوشی سے زیادہ ہوتا ہے، ان کا غم ان کے سکون سے زیادہ ہوتا ہے۔ یہ (دنیاوی) لذت ویسی ہی رہی ہے جس طرح ہم نے اسے بیان کیا ہے اور مستقبل میں بھی ایسا ہی رہے گا۔

دنیاوی لذتیں اور لذتیں صرف اس لیے پیدا کی گئی ہیں کہ ناقص عقل کے مالک اپنے جال میں پھنس جائیں اور ان کے فریب میں پھنس جائیں اور جب وہ ان کے فریب میں پھنس جائیں تو یہ لذتیں اور لذتیں ان سے بچ جاتی ہیں اور ان کے قریب ہونے سے انکار کر دیتی ہیں۔ یہ تمام پریشانیاں اور مشکلات حملہ آور ہوتی ہیں ، کیونکہ کوئی شخص دیکھنے کے دھوکہ سے بیوقوف بن جاتا ہے۔ اگر کوئی عقل کا استعمال کرتا اور نگاہوں کو جھکا دیتا [دنیا کی شان و شوکت جیسی غیر ضروری چیزوں کو نہ دیکھنے کی وجہ سے]، اور [غیر ضروری چیزوں] کو گھٹیا سمجھتا تو وہ ساری زندگی محفوظ رہتا۔ یہ کہنا بھی بالکل درست نہیں ہے کہ جو لوگ دنیا کی لذتوں (دنیاوی لذتوں، لذتوں اور عیاشیوں سے پرہیز کرتے ہیں جو انسان کے تمام باطنی لذتوں کو کھا جاتے ہیں) صبر کے درد میں مبتلا ہوتے ہیں کیونکہ حقیقت میں دنیا کی طرف مائل ہونے والے انتہائی تکلیف میں مبتلا ہوتے ہیں۔ جذباتی ، نفسیاتی اور روحانی مصائب)۔ بعض اوقات وہ دنیا (دنیاوی آسائشیں، لذتیں اور لذتیں) چاہتے ہیں لیکن یہ ان سے بہت دور بھاگ جاتی ہے۔ بعض اوقات وہ بے پناہ جدوجہد اور مشقت کے بعد دنیا (دنیاوی آسائشیں، لذتیں، لذتیں اور مادی کامیابیاں) حاصل کرتے ہیں لیکن اس کی حفاظت کے بارے میں فکر مند رہتے ہیں۔ ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ دنیا سے بچنے والوں کو اس مصیبت کے بعد صبر کی سختی برداشت کرنی پڑتی ہے، لیکن آپ اس سکون کو کیوں بھول جاتے ہیں جو کسی کو حاصل ہونے والا ہے؟ جو لوگ دنیاوی لذتوں کے پیچھے بھاگتے ہیں وہ یہاں (دنیا میں) مصائب میں مبتلا ہیں اور آخرت کا عذاب بھی ان کا انتظار کر رہا ہے۔ وہ اپنے نچلے نفس پر مندرجہ ذیل آیت پڑھیں:

وَلَا تَهِنُوا۟ فِى ٱبْتِغَآءِ ٱلْقَوْمِ ۖ إِن تَكُونُوا۟ تَأْلَمُونَ فَإِنَّهُمْ يَأْلَمُونَ كَمَا تَأْلَمُونَ ۖ

وَتَرۡجُونَ مِنَ ٱللَّهِ مَا لَا يَرۡجُونَ ۗ

"اور مخالف قوم (گروہ) کے پیچھے چلنے کی ہمت نہ کھوئی [تاکہ تم پر ان کے حملوں کو روکیں]۔ اگر تمہیں تکلیف پہنچتی ہے تو وہ بھی اسی طرح تکلیف پہنچتے ہیں جس طرح تم کو تکلیف پہنچتی ہے۔ اور تم اللہ کی طرف سے ایسی چیزوں کی امید رکھتے ہو جس کی وہ امید نہیں رکھتے۔ (سورة البقرة سورة 4، آیت 104)

غفلت اور غفلت کرنے والے دل کا علاج: اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ شکر گزاری کا راستہ لوگوں پر محدود ہو گیا ہے کیونکہ وہ ظاہری اور باطنی اور عام اور خاص نعمتوں سے ناآشنا ہیں۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس غفلت اور غفلت کا علاج کیا ہے؟ اس کا کوئی نہ کوئی علاج ہونا چاہیے جو تجویز کیا جا سکے اور اس سے بے خبر دلوں کی غفلت کو دور کیا جا سکے تاکہ لوگ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو محسوس کرنے لگیں۔ یہ ممکن ہے کہ اس احساس کے بعد ، وہ [خدائی] شکر گزاری کرنا شروع کردیں۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ وہ دل جو بصیرت سے محروم نہیں ہیں، ان کا علاج یہ ہے کہ وہ ان مشترکہ نعمتوں پر غور و فکر کریں جن کا ذکر ہم پچھلے صفحات میں کر چکے ہیں۔ سست دل رکھنے والے نعمت کو نعمت نہیں سمجھتے جب تک کہ وہ ان کے لیے مخصوص نہ ہو یا ان سے چھین لیا جائے اور بعد میں ان کے پاس واپس کر دیا جائے۔

ایسے دلوں کا علاج یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ان لوگوں کی طرف دیکھتے ہیں جو ان سے کمتر ہوتے ہیں اور *صوفیاء* کے نقش قدم پر چلتے ہیں جن کا روزمرہ کا معمول ہسپتالوں کا دورہ کرنا ہوتا ہے۔ قبرستانیں اور جیلیں۔ وہ ہسپتالوں کا دورہ کرتے تھے تاکہ وہاں مریضوں کو ٹھیک ہوتے دیکھ سکیں اور ان کی بیماریوں کے بارے میں معلوم کریں اور یہ دیکھیں کہ آیا ان میں وہی بیماریاں ہیں یا نہیں [ان کے دل کو تسلی دینے اور ان کے لیے دعا کرنے کے علاوہ]۔ اگر وہ اپنے آپ میں نہیں ملتے تو وہ خدا کا شکر ادا کرتے تھے کہ اس نے انہیں حفاظت اور صحت عطا کی۔ وہ قیدیوں کی حالت اور ان کو درپیش سزائیں دیکھنے کے لیے جیلوں کا دورہ کرتے تھے تاکہ خدا کا شکر ادا کریں کہ انہوں نے انہیں گناہوں سے نجات دلائی ورنہ وہ جیل میں قیدیوں کی جگہ ہو سکتے تھے۔ وہ قبرستانوں (قبرستانوں) میں جاتے تھے تاکہ وہاں قبروں کو دیکھ کر ان قبروں کے باشندوں کا تصور کریں جن کی سب سے پیاری خواہش کسی نہ کسی طرح دنیا میں واپس آنا ہے، چاہے وہ ایک دن کے لیے ہی کیوں نہ ہو۔ وہ لوگ جنہوں نے گناہ کیا [اور اب دنیا میں نہیں ہیں] [دنیا میں] لوٹنا چاہتے ہیں تاکہ ان کی زندگی میں کیے گئے گناہوں کا کفارہ ان کا کفارہ ہو جائے۔ فرمانبردار لوگ اس لیے لوٹنا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے نیک اعمال میں اضافہ چاہتے ہیں جس طرح قیامت کا دن نقصان کا دن ہے فرمانبردار اپنے نقصان کا احساس کریں گے جب دیکھیں گے کہ وہ اس سے کہیں زیادہ قادر تھے جو وہ کر سکتے تھے اور اس دن اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ افسوس! انہوں نے اپنا قیمتی وقت ضائع کیا اور ہزاروں قیمتی لمحات محض جائز چیزوں میں گزارے۔ (قیامت کے دن) گنہگار کا نقصان ظاہر ہے۔

جب کوئی شخص قبرستان میں جاتا ہے اور میت کی قبروں کی زیارت کرتا ہے (ان کی تعظیم کرتا ہے اور ان کے رب سے ان کی معافی مانگتا ہے اور مرنے کے بعد ان کی زندگی میں آسانی کی دعا کرتا ہے) تو اس بات کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ ان قبروں میں موجود تمام لوگ چاہے وہ اچھے ہوں یا برے ہوں، وہ سب دنیا میں واپس جانے کے خواہاں ہیں تاکہ یا تو اپنے برے اعمال کا کفارہ ادا کریں یا ان کے اعمال میں اضافہ کریں۔ کسی کو سوچنا چاہیے،

"میں خوش قسمت ہوں کہ خدا نے مجھے اپنی ماضی کی غلطیوں کا کفارہ ادا کرنے اور اس کی اطاعت کے کاموں میں اضافہ کرنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ مجھے اپنی زندگی کے باقی دن خدا کی اطاعت میں گزارنے چاہئیں۔ میرا ایک ایک سانس خدا کی نعمت ہے۔ مجھے اس نعمت کی قدر کرنی چاہیے [اور اس نعمت کو ان کاموں میں استعمال کر کے اس کے مطابق عمل کرنا چاہیے جو میرے رب کو پسند کرتے ہیں جو مجھے اپنی زندگی کے مقصد کو الٰہی گنوسس کے ذریعے ابدی خوشی اور ابدی کامیابی کی شکل میں حاصل کرنے میں مدد دیتے ہیں اور اس دنیاوی زندگی میں اس کے قریب آتے ہیں]"۔ انسان نعمت کا شکر صرف اس کو سمجھنے کے بعد ہی کرتا ہے۔ پس اگر کوئی شخص زندگی کو نعمت سمجھتا ہے تو یقینا وہ اپنی زندگی کے باقی تمام دن ان کاموں میں گزارے گا جن کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ درحقیقت زندگی آخرت کے لیے بھروسہ یا رزق (زاد) کے حصول کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ اگر انسان اس نعمت کا شکر کرے گا تو وہ کبھی بھی اس کے مقصد سے غافل نہیں ہوگا [اور اس کے پاس راستبازی کے سوا کچھ نہیں ہوگا]۔

دنیاوی مصائب کے پانچ پہلو: دنیا میں جو بھی مشکلات اور آفتیں ہوں جیسے غربت، بیماری اور خوف ان میں پانچ پہلو ہیں جن کے بارے میں ایک عقل مند کو خوش ہونا چاہیے اور ان کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ ان پانچ پہلوؤں میں سے ایک یہ ہے کہ اس وقت کسی پر جو مصیبت یا بیماری نازل ہوئی ہے، اس سے کہیں زیادہ شدید آفت یا مہلک بیماری ممکن ہے کیونکہ کوئی بھی الٰہی مقدر میں مداخلت نہیں کر سکتا۔ اگر وہ کسی مصیبت کو دوگنا کر دے یا کسی بیماری کی شدت کو بڑھا دے تو اس کے بارے میں کون کچھ کر سکتا ہے؟ کوئی بھی شخص خدا کو ایسا کرنے سے منع نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس کی راہ میں رکاوٹیں کھڑا کر سکتا ہے۔ لہٰذا انسان کو یہ سوچ کر شکر گزار ہونا چاہیے کہ اللہ کی مہربانی اور رحمت سے اس سے بڑی مصیبت نہیں بھیجی۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ مصیبت دنیاوی معاملات میں نازل ہوئی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ تمہارے ایمان میں کوئی مصیبت آ جائے اور اس میں بہت زیادہ نقصان پہنچائے گا۔ چنانچہ جب ایک شخص نے سہل بن عبداللہ تستری رحمہ اللہ کو بتایا کہ چور اس کے گھر میں داخل ہوئے ہیں اور اس کا مال لوٹ کر فرار ہو گئے ہیں تو سہل نے کہا: اللہ کا شکر کرو! اگر شیطان چور کے بجائے تمہارے دل میں گھس جاتا اور تمہارے گھر کی بجائے تمہارے دل میں گھس جاتا اور تمہارے ایمان کو اللہ اور اس کی وحدانیت کو برباد کر دیتا تو تم کیا کرتے؟ یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان الفاظ میں اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے تھے: اے اللہ! میرے ایمان سے متعلق کسی مصیبت میں مبتلا نہ فرما۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھے کوئی ایسی مصیبت نہیں آتی جس میں چار الٰہی نعمتیں نہ ہوں۔ پہلی بات یہ کہ خدا کی راہ میں ایسا نہیں *ہوا*۔ دوسرا، یہ اس سے زیادہ نہیں ہے جو اس کی مقدار میں ہے۔ تیسرا، میں اسے [خدا کے حکم کے طور پر] قبول کرنے سے محروم نہیں کیا جا رہا ہوں۔ چوتھی بات یہ ہے کہ میں اس کے بدلے کی توقع کرتا ہوں (صبر کے ساتھ برداشت کرنے کے لیے)۔

مصائب پر شکر گزاری کی تیسری وجہ یہ ہے کہ ہر گناہ کی سزا آخرت تک ملتی ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ اس گناہ کی تلافی کے لیے دنیا میں مصیبت بھیجی۔ پھر دنیاوی مشکلات بعض اوقات چھوٹی اور ہلکی رہتی ہیں لیکن آخرت کا عذاب دائمی ہے لیکن اگر دائمی نہیں تو اس میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ دنیا میں اب بھی تسکین کے کچھ ذرائع موجود ہیں لیکن آخرت میں ان لوگوں کے لیے تسکین کے تمام ذرائع ختم ہو جاتے ہیں جن کو ان کی دنیاوی برائیوں کی سزا ملتی ہے، اسی لیے وہاں [عذاب الٰہی] میں کمی نہیں آئے گی۔ نبوی احادیث میں یہ بھی ثابت ہے کہ جو شخص دنیا میں عذاب برداشت کرے گا اسے آخرت میں عذاب نہیں ملے گا۔ مصائب پر شکر گزاری کا چوتھا پہلو یا وجہ یہ ہے کہ انسان یہ سوچے کہ جو مصیبت مجھ پر آئی تھی وہ محفوظ لوح میں لکھی گئی تھی (حکم الٰہی کے

ذریعہ مقرر کی گئی تھی)، وہ ضرور آنا تھا، تو وہ آ گیا ہے۔ یہ ممکن تھا کہ یہ آفت آنے والی آفت سے بھی بڑی ہوتی۔ لہٰذا جو کچھ نہیں ہوا وہ میرے لیے ایک نعمت ہے اور مجھے اس کے لیے خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔
پانچواں پہلو یا وجہ یہ ہے کہ مصیبت کا بدلہ اللہ تعالیٰ اس مشکل سے کہیں زیادہ ہے۔

دنیا کی مصیبتیں اور مصائب آخرت کی راہیں ہیں: دنیا کی مشکلات دو وجوہات کی بنا پر آخرت کی راہ ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ جس بنیاد پر مریض کو کڑوی دوا دی جاتی ہے اور بچوں کو کھیلنے سے روکا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ کڑوی دوا مریض کے لیے نعمت ہے کیونکہ اس مشکل کے بعد اسے سکون مل سکتا ہے۔ اسی طرح بچوں کو ہر وقت کھیلنے سے روکنا بچے کے لیے ایک نعمت ہے کیونکہ اگر کسی کو کھیلنے کی مکمل آزادی دی جائے تو وہ علم اور آداب سے محروم رہے گا اور زندگی بھر کے لیے نقصان میں رہے گا۔ یہی حال دولت، جائیداد، خاندان اور رشتہ داروں، دوستوں، اعضاء وغیرہ کی ہے۔ یہ سب چیزیں انسان کو پیاری ہیں۔ بعض اوقات ان کی وجہ سے انسان تباہ ہو جاتا ہے، اگرچہ عقل ایک انتہائی قیمتی اور عمدہ چیز ہے لیکن اس کی وجہ سے بھی تباہی سے گزرنا پڑتا ہے۔ قیامت کے دن وہ چاہتے ہیں کہ پاگل ہو یا اولاد ہو جائیں تاکہ وہ اپنی عقل سے خدا کی راہ میں ملاوٹ نہ کرتے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ان ذرائع میں صرف برائی کا پہلو ہو۔ ان میں انسانوں کے لیے خاص طور پر راہ الٰہی کے حوالے سے بہتری ہو سکتی ہے۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ یہ معاملات (مال، مال، عیال، رشتہ دار، دوست، اعضاء وغیرہ) اللہ تعالیٰ کی راہ میں بہتری کا سبب ہیں تو بھی اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت بہت وسیع ہے اور وہ اس بات سے خوب واقف ہے کہ اپنے بندوں کے لیے ان سے بہتر کیا ہے۔ قیامت کے دن جب بندے دیکھیں گے کہ انہیں دنیا میں جن مصیبتوں اور مصیبتوں کا اجر دیا گیا ہے ان کا بدلہ دیا جا رہا ہے تب وہ اللہ کا شکر ادا کریں گے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجی گئی مشکلات اور مصیبتیں انسان کو [زندگی اور خدا کی طرف جانے کا راستہ] سکھانے کے طریقے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں پر فضل و کرم والدین کی اولاد پر مہربانی اور مہربانی سے کہیں زیادہ ہے اور اس سے کہیں زیادہ مکمل اور پائیدار ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ دنیا کی مشکلات آخرت کی راہ کیوں ہیں، یہ ہے کہ انسان کی مہلک غلطیوں میں سب سے اوپر دنیا کی محبت ہے اور نجات کا سب سے بڑا سبب دل کو دنیا کی محبت سے دور رکھنا ہے۔ اگر دنیاوی نعمتیں ان کی تلاش کے بغیر حاصل ہوتیں اور ان کے حصول کی راہ میں کوئی مشکل نہ آتی تو دل دنیا کی طرف مائل ہوتے اور دنیاوی اسباب سے اس حد تک وابستہ ہوتے کہ دنیا ان کے لیے جنت بن جاتی۔ جب موت اور [دنیا سے] علیحدگی کے لمحات قریب آتے تو دل اس سے جدائی برداشت نہ کرتا۔ لیکن اگر وقتا فوقتا مشکلات آتی رہیں اور پریشانیوں سے مسلسل نمٹا جاتا ہے تو دل دنیا سے بور ہو جاتا ہے اور اس سے وابستہ نہیں ہوتا۔ اس کے بجائے، مسلسل مشکلات دنیا کو جیل سمجھنے کا سبب بنتی ہیں اور [موت کے وقت] اس دنیا کو چھوڑنا جیل سے رہائی کے مترادف ہو جاتا ہے [اور اس میں آزادی تلاش کرنا]۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّةُ الْكَافِرِ

"دنیا مومنوں کے لیے قید خانہ ہے اور کافروں کے لیے جنت ہے۔" (بیان کردہحدیث کا مجموعہ صحیح *مسلم* ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے

انسان کو اس وقت کافر کہا جاتا ہے جب وہ خدا سے بچتا ہے اور صرف دنیا کی تلاش میں رہتا ہے، اس کے حصول پر مطمئن ہوتا ہے اور اس کی لذتوں کو تلاش کرنے پر خوش ہوتا ہے۔ مومن وہ ہے جس کا دل دنیا سے الگ ہو اور

اس قید خانے سے آزادی حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف ہو۔ کفر ظاہری اور خفیہ دونوں ہے۔ جس حد تک دنیا کی محبت دل میں رہتی ہے، اس حد تک خدا کے ساتھ شرک کا شرک پوشیدہ رہتا ہے۔ مطلق توحید وہ ہے جو مطلق کو اپنا محبوب بناتا ہے۔

یہ وہ وجوہات ہیں جن کی وجہ سے مشکلات کی خوشی ہونی چاہیے۔ مشکلات پر پچھتاوا ہونا ایک فطری بات ہے۔ اس کی تمثیل انجکشن کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی شخص (جو اس کا انتظام کرنے کا اہل ہے) اسے مفت میں کرے یا کسی مریض کو کڑوی دوا لینے کی ضرورت ہو تو ظاہر ہے کہ انجکشن لگوانے اور کڑوی دوا لینے میں تکلیف ہوتی ہے۔ اس کے باوجود ، ایک انجکشن لگانے والے شخص اور معالج کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مصیبت کے ساتھ ساتھ خوشی بھی ہوتی ہے، یعنی بیماری سے نجات بھی ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انجکشن اور کڑوی دوا لینے کے بعد جہاں درد ہوتا ہے وہاں خوشی بھی ہوتی ہے۔ دنیا کی مشکلات کو بھی اسی طرح سمجھنا چاہیے۔ وہ تلخ ادویات اور جسم پر سرجری سے مشابہت رکھتے ہیں۔ ان کی وجہ سے عارضی طور پر تکلیف ہوتی ہے لیکن آخر میں ، کسی کو راحت اور سکون ملتا ہے۔

صبر اور شکر گزاری کی ڈگریاں: صبر میں بہت سی ڈگریاں ہوتی ہیں۔ اعلیٰ ترین ڈگری یہ ہے کہ مشکل کو برا سمجھا جائے اور اس کے بارے میں شکایت نہ کریں۔ صبر کے تمام درجات جس میں تمام اعلیٰ اور نیچ درجات شامل ہیں، الٰہی کی رضا کی قبولیت کا درجہ، اس کے بعد یہ مشکلات پر خدا کا شکر ادا کرنے کا درجہہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صبر میں درد کا احساس ہوتا ہے، یہ ممکن ہے کہ مرضی الٰہی کی قبولیت میں نہ تو تکلیف ہو اور نہ ہی کوئی خوشی ہو، جبکہ شکر گزاری خوشی سے خالی نہیں ہو سکتی۔ جس طرح صبر کے بے شمار درجات ہوتے ہیں، اسی طرح شکر گزاری کے بھی بے شمار درجات ہوتے ہیں۔ ہم نے صرف اس کی اعلیٰ ترین ڈگری کا ذکر کیا ہے۔ صبر کے بہت سے درجات ہیں۔ اسی طرح شکر گزاری کی بھی بہت سی ڈگریاں ہوتی ہیں۔ ہم نے اس کی اعلیٰ ترین ڈگری کی وضاحت کی ہے۔ اس حقیقت کا تعین کرنا ہے کہ تمام نعمتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بغیر کسی حق کے حاصل کی جاتی ہیں، یہ جاننا کہ خدا کا شکر ادا کرنا بھی ایک نعمت ہے، عاجزی سے رہنا، یہ تمام معاملات شکر گزاری ہیں اور درجات کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اسی طرح کم چیزوں پر اعتراض کرنا، دینے والے کے ساتھ خوبصورت آداب سے پیش آنا، تمام نعمتوں کو اچھی طرح سے قبول کرنا، چھوٹی چھوٹی نعمتوں کو بڑا سمجھنا وغیرہ یہ سب شکر گزاری ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ تمام اعمال اور روحانی حالتیں صبر اور شکر گزاری میں شامل ہیں اور وہ بے شمار ہیں اور درجات میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

باب 13 - خدا سے خوف رکھنا تمام غلطیوں کے خلاف ایک پختہ روک تھام کے طور پر اور خدا سے امید رکھنا مثبتیت اور امید کے ایک آلے کے طور پر

انسانی اعمال پر لگام لگانے کی ضرورت ہے کیونکہ وہ آسانی سے قابو سے باہر ہوسکتے ہیں جس سے افراد، ساتھی انسانوں اور بڑے پیمانے پر دنیا کو مصائب کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ اپنے خلاف اور دوسروں کے خلاف جو غلطیاں کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ان کے لئے اندرونی اور ظاہری پابندیوں کی ضرورت ہے۔ خدا سے ڈرنا، جو کسی کے دل کی گہرائیوں میں سرایت کر گیا ہے، خیالات، الفاظ اور اعمال میں ہر قسم کی غلطیوں اور منفیات کے خلاف ایک زبردست اندرونی روک تھام ہے۔ یہ جاننا کہ خدا ہمارے وجود کے ہر ریشے پر ہمیشہ چوکس رہتا ہے، یہاں تک کہ ہمارے باطنی خیالات اور احساسات کو بھی جانتا ہے، اور یہ کہ خدا ہمیشہ ہمارے غلط اعمال میں رکاوٹ ڈالنے اور ہم سے پیدا ہونے والی کسی بھی منفی چیز کے لیے ہم پر الزام لگانے کی صلاحیت رکھتا ہے، ایک اخلاقی پابندی ہے جو ہمیں تمام منفی چیزوں سے روکتی ہے - خیالات، الفاظ، احساسات، اعمال میں، اور وجود کی حالت۔

خدا کے خوف کی آئینہ دار تصویر خدا میں امید ہے۔ مایوسی اور غم کے حالات میں یہ بے پناہ اندرونی مدد اور طاقت کا ذریعہ ہے۔ یہ جاننا کہ خدا ہر چیز کو درست کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے ، یہاں تک کہ بظاہر مایوس کن حالات میں بھی ، بے پناہ حوصلہ افزائی اور الہام کا ذریعہ ہے جو کسی کو مشکل حالات میں مثبت اعمال کی طرف راغب کرتا ہے ، اور چیزوں کو غلط ہونے کے بعد درست کرتا ہے۔ خوف اور امید کو متوازن کرنے کی ضرورت ہے تاکہ کوئی فرد کو منفی باتوں سے روکتا ہے جبکہ دوسرا مثبتیت کی طرف لے جاتا ہے۔ غزالی نے اپنی *عظیم تصنیف "احیاء العلوم الدین"* یا "خدا کی راہ کی معرفت کا احیاء" کی چوتھی جلد یا چوتھائی کتاب میں اس اہم موضوع کا بھرپور مطالعہ کیا ہے جو مختصر شکل میں اس طرح پیش کیا گیا ہے:

واضح رہے کہ خوف اور امید (*خدا*) ایسے دو پر ہیں جو ان کی مدد سے خدا کے مقرب اڑتے ہیں اور بلند مقام پر چڑھتے ہیں۔ یہ دو ایسی سواریاں ہیں جن پر سوار ہو کر آخرت کی خطرناک راہیں طے کی جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی قربت اور جنت کی منزل بہت فاصلے پر واقع ہے اور ان کی طرف جانے والی راہیں خطرات سے بھری پڑی ہیں جس کی وجہ سے ان راستوں پر چلنے والے مسافر تھکے ہوئے ہیں اور اعضاء اور اعضاء کو مشکلات میں ڈال دیتے ہیں، اس منزل تک پہنچنے کے لیے امید کی سواری [خدا کے ساتھ] ناگزیر ہے۔ اسی طرح جہنم کی ہولناک آگ سے بچنا

اور آخرت میں (اپنے گناہوں کی وجہ سے) المناک عذاب سے بچنا [خدا کے خوف کے بغیر] ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا دونوں کی حقیقت، ان کی فضیلت اور ان دونوں کے درمیان [ظاہری] تضاد اور ان کے امتزاج کی وضاحت ضروری ہے۔ چنانچہ اس کتاب کو دو ابواب میں تقسیم کیا جا رہا ہے۔ سب سے پہلے ہم [خدا کے ساتھ] امید کی کیفیت کی وضاحت کریں گے اور پھر دوسرے باب میں خوف کی کیفیت کی وضاحت کریں گے۔

امید کی حقیقت، اس کی فضیلت، امید کی دوا اور اسے حاصل کرنے کا طریقہ

امید کی حقیقت: یہ بات معلوم ہو جائے کہ امید روحانی مسافروں اور مجادد کرنے والوں کے مقام میں سے ایک مقام ہے اور طالب علیہ السلام کی حالت میں سے ایک مقام ہے۔ اگر کسی شخص کی باطنی صفت قائم ہو جائے اور اس کی روح میں قائم ہو جائے تو اسے مقام کہا جاتا ہے اور اگر وہ صفت عارضی ہو اور جلدی ختم ہو جائے تو اسے حالت (حالت) کہلاتا ہے۔ دل کی باطنی صفات میں یہ تقسیم ہے [اسٹیشنوں اور حالتوں کی جو روحانیت کی اہم اصطلاحات ہیں]۔ ریاست کو ریاست کہا جاتا ہے کیونکہ یہ تیزی سے بدلتا ہے، اور اس کا تجربہ دل کی تمام خوبیوں سے ہوتا ہے۔ امید [باطنی روحانی] حالت، علم اور اعمال کے ذریعے مکمل ہوتی ہے، یہ تینوں - کیونکہ علم حالت کا سبب ہے اور حالت (صحیح روحانی اور جسمانی) اعمال کا سبب ہے لیکن مجموعی طور پر امید صرف ایک حالت کا نام ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جو چیز آپ کو ناپسندیدہ (ناپسندیدہ) یا محبوب (مطلوب) معلوم ہوتی ہے وہ تین حالتوں سے پاک نہیں ہے - یہ یا تو حال میں موجود ہوگی ، یا ماضی میں موجود ہے ، یا آپ مستقبل میں اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ اگر آپ کے دل میں ماضی میں ہونے والے کسی وجود کے بارے میں کوئی خیال آتا ہے تو اسے یاد یا ذکر کہا جاتا ہے۔ اگر یہ حال میں موجود ہے تو اسے ادراک کہا جاتا ہے اور اگر مستقبل میں اس کا وجود متوقع ہے اور یہ آپ کے دل پر حاوی ہے تو اسے توقع اور انتظار کہا جاتا ہے۔ اگر وہ چیز جس کی توقع کی جا رہی ہے یا اس کا انتظار کیا جا رہا ہے وہ ناپسندیدہ ہے اور اس سے دل میں درد ہوتا ہے تو اسے خوف کہا جاتا ہے اور اگر وہ مطلوب ہے اور آپ کو اس کے انتظار میں خوشی اور خوشی ملتی ہے تو اسے امید کہا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امید اس چیز کا نام ہے جو آپ کو خوش کرتی ہے اور یہ آپ کے لیے محبوب ہے۔ لیکن اگر آپ کسی ایسی چیز کا انتظار کر رہے ہیں جو آپ کو محبوب ہو اور آپ اسے حاصل کرنے کے خیال سے خوش ہو جائیں تو یقینا آپ کے پاس ایسے وسائل ہوں گے کہ ان کے ذریعے آپ محبوب تک پہنچ جائیں گے۔ اگر ایسا ہے تو یہ امید ہے اور اگر آپ کے پاس اس تک پہنچنے کے ذرائع نہیں ہیں اور آپ صرف محبوب سے ملاقات کی توقع کر رہے ہیں [یا جو آپ چاہتے ہیں] وہ خود فریبی اور حماقت ہے۔ اگر ذرائع کے وجود یا عدم وجود کا علم نہ ہو تو اس طرح کے انتظار کو خواہش یا فضول خواہش (*تمنا) کہا جاتا* ہے کیونکہ اس میں بلا وجہ انتظار پایا جاتا ہے۔

امید کا اطلاق کہاں ہے؟ امید اور خوف کا اطلاق ان چیزوں پر ہوگا جن کا وجود یقینی نہیں ہے، بلکہ یہ مشکوک ہے، اور امید ان چیزوں پر لاگو نہیں ہوتی جن کا وجود یقینی ہے۔ مثال کے طور پر طلوع آفتاب کے بارے میں یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ "میں طلوع آفتاب کے لیے پر امید ہوں"، کیونکہ طلوع آفتاب اور غروب آفتاب دونوں کا وجود یقینی ہے، تاہم یہ کہنا درست ہے کہ، "مجھے بارش کی امید ہے یا [مستقبل میں] خشک سالی کا خوف ہے"۔

یہ حقیقت دلوں پر ظاہر ہوتی ہے کہ دنیا آخرت کا کھیت ہے اور دل کی تمثیل زمین کی مانند ہے، ایمان بیجوں کی طرح ہے، اطاعت الٰہی زمین کو جوتنے اور اس کی صفائی کرنے کے مترادف ہے۔ پانی کے چینلز کھودنا اور ان کے ساتھ کھیتوں کو سیراب کرنا؛ وہ دل جو دنیا میں ڈوبا ہوا ہے اور اپنی لذتوں میں مشغول ہے وہ اس بنجر زمین کی مانند ہے جو بیج نہیں رکھتا، قیامت کا دن فصل کاٹنے کا دن ہے کیونکہ تم اس دن وہی کاٹو گے جو دنیا کی زندگی میں بویا ہے آخرت کی فصل ایمان کے بیج کے بغیر ممکن نہیں ہے اور دل کی برائی اور بد اخلاق، اخلاق، اخلاق اور اخلاق کے برے مزاج اور باطنی مزاج کی موجودگی میں ایمان کو بہت کم فائدہ ہوتا ہے۔ جس طرح بنجر زمین میں کوئی بیج نہیں رہتا، چاہے اسے پانی سے کتنا ہی سیراب کیا جائے، اسی لیے اگر کسی بندے کو معافی کی امید ہو تو اسے اپنی امید کو کسان کی امید پر قائم کرنا چاہیے۔ لہٰذا ایک کسان جو کھیتی باڑی کے لیے اچھی (زرخیز) زمین کا انتخاب کرتا ہے، اس میں اچھے بیج ڈالتا ہے اور ہر ممکن طریقے استعمال کرتا ہے تاکہ بیج زمین کی سطح کے نیچے سے [صحت مند] پودوں [یا فصلوں] کی شکل میں اٹھ اٹھیں، [کھیت زمین] کو بروقت پرورش یا سیراب (سیراب کریں) حاصل کریں، جڑی بوٹیوں کو دور کر دیں اور ان تمام رکاوٹوں کو دور کر دیں جو پودوں کی نشوونما کو متاثر کرتی ہیں یا فصل کو نقصان پہنچاتی ہیں۔ اس کے بعد کسان کو خدا سے یہ توقع ہے کہ وہ کسی کی کاشت کو آسمانی اور زمینی تباہی سے بچائے گا، پھر اس طرح کے انتظار اور توقع کو امید کہا جاتا ہے۔ اگر کسی نے کسی پہاڑی اور پتھریلی زمین میں بیج بویا ہو جہاں اس کی آبپاشی کا کوئی ذریعہ نہ تھا، کیونکہ وہاں پانی نہیں پہنچ سکتا تھا، اس کے علاوہ اس نے اس کی پرورش نہیں کی اور اس کے بجائے فصل کی کٹائی کا انتظار کرنا شروع کر دیا، تو یہ انتظار جائز نہیں ہے، بلکہ یہ تکبر اور حماقت ہے اور یہ امید نہیں ہے [جیسا کہ کوئی شخص اس کے حصول کے لیے ہر ممکن طریقے استعمال کرنے میں ناکام رہا ہے امید]۔ اسی طرح اگر کسی نے کسی اچھی (زرخیز) زمین میں بیج بویا لیکن اس کے بعد کے تمام مراحل میں غفلت برتے، اس کو پانی نہیں دیا، بلکہ ایسے موسمی حالات یا مقامات پر بارش اور متوقع بارش کا انتظار کیا جہاں یا تو بارش نہیں ہوتی یا بارش ہوتی ہے لیکن یہ کاشتکاری کی تمام ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کافی نہیں ہے، پھر اس طرح کے انتظار کو [فضیل] خواہش (*تمنا*) کہا جاتا ہے اور یہ امید (*رج*) *نہیں ہے*۔

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ امید کا اطلاق صرف اس محبوب کے انتظار پر ہوتا ہے جس کے لیے وہ تمام ذرائع استعمال کیے جاتے ہیں جو بندے کے دائرے میں ہیں، اور صرف وہی ذرائع باقی ہیں جو بندے کے دائرہ اختیار سے باہر ہیں، اور یہ خدا کا فضل ہے کہ اگر اسے [تمام معاملات میں] شامل کیا گیا ہے، تمام رکاوٹیں اور خراب کرنے والے [ان معاملات سے] دور رہتے ہیں۔ مومن بندے کا یہ حال ہے کہ اگر کوئی دل کی سرزمین پر ایمان کے بیج بوئے، اسے عبادت کے پانی سے سیراب کرے، اسے برے اخلاق، آداب، باطنی صفات اور مزاج کے کانٹوں سے محفوظ رکھے اور خدا کے فضل سے یہ توقع رکھتا ہے کہ اس کا ایمان مرنے تک قائم رہے گا۔ اور دل کی فصل قیامت کے دن کٹائی کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو یہ انتظار حقیقی معنوں میں امید (*ریجا*) ہے اور یہ ایک عمدہ خوبی (اندرونی خصوصیت) ہے۔ یہ امید انسان کو اپنے ایمان کو برقرار رکھنے پر مجبور کرے گی اور [خدائی] عرفان کے وقت نجات کو یقینی بنانے کے لیے پرورش کے تمام ذرائع پر مسلسل کام کرتے ہوئے اس کی پرورش کرے گی۔ لیکن اگر کسی نے دل کی زمین میں بیج بویا ہو لیکن بعد میں اس کی پرواہ نہ کی، یہاں تک کہ وہ پانی نہ دینے کی وجہ سے خشک ہو جائے یا زیادہ بارش کی وجہ سے برباد ہو جائے یا اس کے برے اخلاق، آداب، باطنی صفات اور مزاج کی جڑی بوٹیوں اور کانٹوں کی وجہ سے برباد ہو جائے، فصل پر غالب آ جائے یا دنیاوی لذتوں کے کیڑے اس پر حملہ کر دیں، اور ان تمام غفلت اور کوتاہیوں کے باوجود انسان معافی کا انتظار اور انتظار کرتا رہا تو یہ انتظار اور توقع حماقت اور تکبر ہے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلْاَحْمَقُ مَنْ اَتْبَعَ نَفْسَهٗ هَوَاهَا وَتَمَنّٰى عَلَى اللّٰهِ

"بے وقوف وہ شخص ہے جو اپنے نفس کو اپنی پست خواہشات کے تابع بناتا ہے اور پھر خدا سے توقعات رکھتا ہے"۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ أَضَاعُواْ ٱلصَّلَوٰةَ وَٱتَّبَعُواْ ٱلشَّهَوَٰتِۖ فَسَوۡفَ يَلۡقَوۡنَ غَيًّا

"ان کے بعد (انبیاء اور ان کے سچے پیروکار) ایسے نالائق لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی نمازوں کو برباد کیا اور اپنی پست نفس سے حقیر اور پست خواہشات کی پیروی کی۔ ایسے لوگ جلد ہی [اپنے غلط کاموں سے پیدا ہونے والی غلطیوں] کو دیکھیں گے۔ (سورۃ البقرۃ القرآن باب 19، آیت 59)

بہرحال ایک بندہ جو اطاعت الٰہی کی کوشش کرتا ہے اور گناہوں سے پرہیز کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور فضل و کرم سے نعمتوں کی تکمیل کی امید کا مستحق ہے اور نعمتوں کی تکمیل یہ ہے کہ وہ جنت میں داخل ہوجائے۔ ایک گنہگار جو توبہ کرتا ہے اور اپنے گناہوں کا کفارہ دیتا ہے ، اسے اپنی توبہ قبول کرنے کی امید رکھنے کا حق ہے۔ اگر کوئی شخص توبہ سے پہلے اپنے گناہوں کو برا سمجھتا ہے، اپنے نیک اعمال سے راضی ہو، اپنے نفس کی مذمت کرتا ہے، توبہ کا خواہاں ہے، توبہ کی خواہش رکھتا ہے، تو اس کی توبہ کی توفیق کی امید رکھنی چاہیے، کیونکہ گناہوں کو برا سمجھنا اور توبہ کی خواہش کرنا توبہ کی طرف راغب کرنے کا ذریعہ ہے۔ امید کا مرحلہ امید کے کمال کے بعد آتا ہے جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے:

إِنَّ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَٱلَّذِينَ هَاجَرُواْ وَجَٰهَدُواْ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ أُوْلَٰٓئِكَ يَرۡجُونَ رَحۡمَتَ ٱللَّهِ

"بے شک جو لوگ ایمان لانے والے ہیں اور ہجرت کرنے والے (ہجرت ظاہری اور باطنی دونوں طرح کی ہے جس طرح باطنی ہجرت برائی سے نیکی کی طرف ہے، ادنیٰ سے اعلیٰ کردار کی طرف، مادیت سے غیر مادی یا روحانی کی طرف ہے) اور خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے ہیں، وہی ہیں جو خدا کی رحمت کی امید رکھتے ہیں۔" (سورۃ البقرۃ آیت 218)

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ یہ وہی لوگ ہیں جن کو رحمت الٰہی کی امید کا حق حاصل ہے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ امید ان لوگوں کے لیے مخصوص ہے، کیونکہ ان کے علاوہ کچھ لوگ بھی ہیں جن کے پاس امید ہے، حالانکہ ان کے پاس امید کا حق نہیں ہے کیونکہ یہ حق صرف وہی لوگوں کے پاس ہے۔ اور جو شخص سر سے پاؤں تک ناپسندیدگی میں ڈوبا ہوا ہے اور نہ اپنے نفس کو برا سمجھتا ہے اور نہ اس کی توبہ اور اللہ کی طرف رجوع کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اگر وہ معافی کی امید رکھتا ہے تو وہ اس احمق کی مانند ہے جو بنجر زمین میں بیج بوتا ہے اور نہ اسے پانی پلانے اور نہ اسے صاف کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ یحییٰ بن معاذ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک سب سے بدترین فریبی یہ ہے کہ انسان بغیر کسی شرم اور پشیمانی کے گناہ کرتا رہتا ہے، مغفرت کی امید میں اللہ تعالیٰ کی توقع کرتا ہے، آگ کے بیج بونے کے بعد جنت کے پھلوں کا انتظار کرتا ہے، فرمانبرداروں کا مسکن مانگتا ہے۔ جنت) گناہوں اور گناہوں کے ذریعے، بغیر کسی عمل کے اللہ کا بدلہ مانگتا ہے، اور ظلم و زیادتی کے باوجود (دوسروں کے حقوق کو پامال کرنے اور غصب کرنے کے معاملے میں) خدا کی طرف سے بھلائی کا خواہاں ہے۔

امید کے بعد جدوجہد: ہم نے امید کی حقیقت پر بہت روشنی ڈالی ہے۔ اگر اس کا خلاصہ کیا جائے تو ، اس معاملے کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ ایک ایسی حالت ہے جو زیادہ تر ذرائع کے وقوع پذیر ہونے کے بعد علم کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ اس ریاست کا تقاضا یہ ہے کہ جو ذرائع پورے نہیں ہوئے ہیں، باقی تمام ذرائع کی تکمیل (استعمال) کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ کاشتکاری کی مثال میں جو شخص زرخیز زمین میں اچھے بیج بوتا ہے، ضرورت کے مطابق اسے سیراب کرتا ہے، ایسے شخص کی امید سچی ہوگی اور اس زمین (کھیت) کی دیکھ بھال کرنے پر آمادہ کرے گا اور اس میں اگنے والی جڑی بوٹیوں اور کانٹوں کو صاف کر کے اس زمین (کھیت کو) کی دیکھ بھال کرے گا اور اسے باقاعدگی سے پانی دے گا اور فصل کی کٹائی تک کوئی غفلت نہیں کرے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امید کا برعکس مایوسی اور ناامیدی ہے، اگر کوئی شخص کسی چیز سے مایوس ہو تو اس کے لیے جدوجہد کر کے اپنے آپ کو مشکل میں نہیں ڈالتا۔ صرف وہی شخص جدوجہد کرتا ہے جس کو کچھ حاصل کرنے کی امید ہے۔ لہٰذا جو شخص جانتا ہے کہ اس کی زمین بانجھ ہے، بیج بیکار ہیں اور پانی اس زمین کی پہنچ سے باہر ہے، تو وہ یقینی طور پر اس زمین کی دیکھ بھال سے دور رہے گا۔ امید قابل تعریف ہے کیونکہ یہ عمل کے لئے اکساتا ہے ، اور مایوسی قابل مذمت ہے کیونکہ یہ کسی کو کچھ بھی کرنے سے روکتی ہے (مناسب اعمال)۔ [خدا سے] خوف [خدا میں] امید کے برعکس نہیں ہے، بلکہ یہ روحانی جدوجہد (سلوک) کے سفر میں اس کا ساتھی ہے، بلکہ یہ عمل کا ایک ایجنٹ ہے۔ لیکن اس کا طریقہ مختلف ہے، اس میں امید کی خواہش ہے اور اس میں خوف کی روک تھام ہے۔ اگر کسی میں اپنے آپ میں امید کی کیفیت ہے تو اس کے لیے نیک اعمال میں زیادہ کوشش اور اطاعت الٰہی کے اعمال میں استقامت کا تقاضا ہوتا ہے چاہے وہ اندرونی روحانی حالتوں میں تبدیلی کیوں نہ ہو۔ ایک طویل مدت کے دوران روحانی کوششیں اور اچھے اعمال میں ثابت قدمی کے ذریعے خدا پر توجہ مرکوز کرنا خدا سے التجا کرنے میں خوشی کا باعث بنے گا اور کوئی شخص نرمی (عاجزی) اور ربط کے ساتھ خدا سے اپنی ضروریات کا مطالبہ کرے گا۔ اگر کسی کے پاس یہ کیفیت نہیں ہے تو یہ سمجھ لیا جانا چاہیے کہ وہ [خدا میں] امید کے مقام سے دور ہے اور اس کے بجائے تکبر اور [فضول] خواہش (تمنا) کی وادی میں گھرا ہوا ہے۔ یہ امید کے بارے میں تفصیلات ہیں ، علم جس کے نتیجے میں امید پیدا ہوتی ہے ، اور ایسے اعمال جو امید سے پیدا ہوتے ہیں۔

امید رکھنے کے لیے امید اور قائل کرنے کی فضیلت یہ ہے کہ خدا کے خوف سے کیے گئے اعمال سے امید کے ساتھ اعمال افضل ہیں کیونکہ صرف وہی شخص خدا کے قریب ہے جو اس سے زیادہ محبت کرتا ہے اور محبت امید کے ساتھ بڑھتی ہے۔ اس کی تمثیل دو بادشاہوں کی طرح ہے، ان میں سے ایک اس کی سخاوت کی امید سے خدمت کی جاتی ہے اور دوسرے کو اس کے خوف سے خدمت دی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ پہلے سے دوسرے سے زیادہ پیار کیا جائے گا۔ چنانچہ شریعت الٰہی میں موت کے وقت *خدا کے بارے میں امید اور حسن رائے* رکھنے کے لیے بہت سی قائل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَا تَقْنَطُوا۟ مِن رَّحْمَةِ ٱللَّهِ

"اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا!" (سورۃ البقرۃ 39، آیت 53)

اس آیت میں مایوسی کو مکمل طور پر حرام کیا گیا ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے حالات میں یہ روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک وحی الٰہی بھیجی جس میں ان سے پوچھا گیا: کیا تم جانتے ہو کہ میں نے تمہارے اور یوسف (ان کے سب سے پیارے بیٹوں) کے درمیان جدائی کیوں رکھی ہے؟ اس لیے کہ تم نے اس کے بھائیوں سے کہا تھا کہ

جب انہوں نے تم سے کہا تھا کہ یوسف علیہ السلام ان کے ساتھ کھیلنے کے لیے نکل جاؤ، تاکہ حسد کی وجہ سے اسے ہمیشہ کے لیے نکال دیا جائے:

وَأَخَافُ أَن يَأْكُلَهُ ٱلذِّئْبُ وَأَنتُمْ عَنْهُ غَٰفِلُونَ

'مجھے ڈر ہے کہ اسے بھیڑیا کھا جائے گا جبکہ تم [سب نے] اس سے غفلت کی ہے۔' (سورۃ البقرۃ باب 12، آیت 13)

تم بھیڑیے سے کیوں ڈرتے تھے اور مجھ سے امید کیوں نہیں رکھتے تھے؟ تم نے یوسف کے بھائیوں کی غفلت دیکھی، تم نے میری حفاظت کی طرف کیوں نہیں دیکھا؟"

حدیث *قدسی* میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِي بِي فَلْيَظُنَّ بِي مَا شَاءَ

"میں اپنے بندے کے ساتھ ہوں جس طرح میرا بندہ مجھ کے بارے میں سوچتا ہے (انسان کے ساتھ میرا سلوک میرے بارے میں اس کی رائے کے مطابق ہوتا ہے، اس لیے انسان کو خدا کے بارے میں اچھی رائے رکھنی چاہیے اور اس سے بھلائی کی توقع کرنی چاہیے، لیکن اللہ کے بارے میں اپنی نیک رائے کی تائید ان کوششوں اور کوششوں سے کرنی چاہیے جو اس کو پسند کرتی ہیں)۔ لہذا کسی کو مجھ سے جو بھی رائے دینا چاہتی ہے اس کا ہونا چاہئے۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *حدیث* کا مجموعہ *ابن حبان* وثیلہ بن عسقا رضی اللہ عنہ سے

ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے شخص کے پاس گئے جو موت کے دہل میں تھا اور اس سے پوچھا: تم اپنے آپ کو کس حالت میں پاتے ہو؟ آپ نے فرمایا: "میں اپنے دل میں ان گناہوں کا خوف پاتا ہوں جو میں نے کیے ہیں اور خداوند کی رحمت کی امید رکھتے ہیں۔" نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کے دل میں یہ دونوں چیزیں (امید اور خوف) یکجا ہو جائیں اللہ تعالیٰ اس شخص کو اپنی امیدوں کے مطابق عطا فرماتا ہے اور اس سے بچاتا ہے جس سے وہ ڈرتا ہے۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *احادیث* کے مجموعے *ترمذی*، *نسائی* اور *ابن ماجہ* انس رضی اللہ عنہ پر ہیں۔

گناہوں کی زیادتی کی وجہ سے ایک آدمی شدید مایوسی کی کیفیت میں تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا: تمہارا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ تم اللہ کی رحمت سے مایوس ہو۔ ایک نبی روایت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی: مجھ سے محبت کرو اور اس سے محبت کرو جو مجھ سے محبت کرتا ہے اور مجھے لوگوں میں محبوب بنا۔ اس نے پوچھا: میں تمہیں لوگوں میں محبوب کیسے بنائوں؟ فرمایا لوگوں میں میرا ذکر کرو اور میری نعمتوں اور نعمتوں کا ذکر کرو اور انہیں یاد کرو تاکہ وہ میری نعمتوں سے واقف رہیں۔
بعض لوگوں نے یحییٰ بن اختم رحمہ اللہ کو ان کی وفات کے بعد خوابوں میں دیکھا۔ اس سے پوچھا گیا کہ خدا نے تم کے ساتھ کیسا سلوک کیا (تمہاری موت کے بعد)؟ اس نے جواب دیا: اللہ نے مجھے اپنے سامنے کھڑا کیا اور کہا: اے برے بوڑھے! تم نے فلاں گناہ کیے ہیں!" اپنے اعمال کا رجسٹر سن کر [میں نے اپنی زندگی میں کیا] ، میں الہی

خوف سے مغلوب ہوگیا۔ پھر میں نے کہا: اے خدا! کیا حدیث میں تمہارے بارے میں اس طرح بیان نہیں کیا گیا تھا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کیا روایت ہے؟ میں نے جواب دیا: عبد الرزاق نے مجھے روایت کی ہے، انہوں نے معمر سے روایت کی ہے جنہوں نے زہری سے روایت کی ہے کہ انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے جبرائیل علیہ السلام سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا ہے:

أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِيْ بِيْ فَلْيَظُنَّ بِيْ مَا شَاءَ

"میں اپنے بندے کے ساتھ ہوں جس طرح میرا بندہ میرے بارے میں سوچتا ہے، اس لیے کسی کو مجھ سے جو بھی رائے دینا چاہتی ہے" اور مجھے تیرے بارے میں یہ قیاس تھا کہ تو مجھے عذاب نہیں دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جبرائیل علیہ السلام نے سچ کہا، میرے نبی نے سچ کہا، انس، معمر اور زہری سب نے سچ کہا، تم بھی سچ بولو۔ پھر مجھے عزت کا لباس دیا گیا اور آسمانی بندوں نے مجھے جنت کی طرف لے گئے۔ اس وقت، میں نے [اپنے آپ سے] کہا، 'یہی وہ چیز ہے جسے خوشی کہا جاتا ہے'!

امید کے حصول کا طریقہ اور طریقہ: یہ معلوم رہے کہ امید دو افراد کو درکار ہے۔ سب سے پہلے وہ شخص جس پر غم اور مایوسی کا غلبہ ہو اور عبادت ترک کر دے۔ دوسرا وہ شخص ہے جو خدا کے خوف میں غالب ہو اور عبادت میں اس قدر قائم رہتا ہے کہ وہ پریشان ہو جاتا ہے اور اپنے گھر والوں کو بھی پریشان کر دیتا ہے۔ دونوں افراد اعتدال پسندی کی حدود سے تجاوز کر چکے ہیں اور [دو مخالف] انتہاؤں کی طرف مائل ہیں۔ دونوں کو ایک ایسے علاج کی ضرورت ہے جو انہیں اعتدال پسندی کی راہ پر لے آئے۔ لیکن وہ خود گمراہ گنہگار جو [الہامی] اطاعت کو ترک کرنے کے باوجود معافی کا خواہاں ہے جس سے معافی کا مستحق ہو جائے، ایسے شخص کے لیے امید مہلک ہے۔ جس طرح شہد سرد مزاج کے لوگوں کے لیے ایک علاج ہے لیکن گرم مزاج کے لوگوں کے لیے نقصان دہ ہے۔ ایسے شخص کے لیے صرف خوف یا ایسے ذرائع سے فائدہ مند ہے جو خوف پیدا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو شخص لوگوں کو نصیحت اور نصیحت کرتا ہے وہ بیماری اور اس بیماری کی اسباب پر نظر رکھے اور ہر بیماری کے برعکس علاج کرے، نہ کہ کسی ایسی چیز سے جس سے بیماری کو بہتر بنانے کے بجائے اس میں اضافہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مقصد اعتدال پسندی ہے اور ہر [انسانی] صفت اور صفت میں اعتدال پسندی کی ڈگری کو پسند کیا گیا ہے اور یہ ڈگری بہترین ہے۔ اگر کوئی [انسانی] معیار یا خصوصیت اعتدال کی ڈگری سے انحراف کر رہی ہے، چاہے وہ حد سے زیادہ ہو یا کمی کی طرف، وہیں علاج کی ضرورت ہے تاکہ یہ اعتدال کی ڈگری پر واپس آجائے۔ کسی ایسے علاج کی ضرورت نہیں ہے جو اسے اعتدال کی ڈگری سے مزید انحراف کرتا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: عالم وہ ہوتا ہے جو نہ تو لوگوں کو اللہ کی رحمت سے مایوس کرتا ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بے خوف ہوجاتا ہے۔ ہم امید کے اسباب بیان کرنے کے قائل ہیں لیکن ہر فرد کے لیے نہیں، بلکہ صرف اس شخص کے لیے جو خدا کی رحمت سے مایوس ہو چکا ہے یا اس کے لیے جو خدا کے خوف سے مغلوب ہے۔ قرآن اور نبوی کی روایات ایک ہی معنی بیان کرتی ہیں کیونکہ دونوں میں خوف اور امید پر مبنی تعلیمات شامل ہیں جو مختلف قسم کے مریضوں کے علاج کے لیے تمام ذرائع ہیں۔ ان ذرائع کا علم اور ان کے استعمال کا طریقہ ان علماء کو پہنچا دیا گیا ہے جو انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں تاکہ وہ ان ذرائع کو عقلمند اور تجربہ کار طبیب کی طرح استعمال کر سکیں اور مریض کے لیے مناسب علاج تجویز کر سکیں، نہ کہ ایک بے وقوف اور جاہل طبیب کی طرح جو تمام ادویات کو ہر بیماری کے لیے مفید سمجھتا ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے کہ وہ بیماری کیا ہے۔

خوف کی حقیقت

خوف کی حقیقت: یہ معلوم ہونا چاہئے کہ خوف دل میں وہ درد اور اضطراب ہے جو مستقبل میں متوقع مشکلات کے خیال سے پیدا ہوتا ہے۔ امید کی تشریح میں خوف کی حقیقت کو بھی واضح کیا گیا ہے۔ جس شخص کو خدا سے حسرت اور واقفیت ہو، اس کے دل پر حق غالب رہتا ہے، اور ہر وقت حسن الٰہی کی گواہی میں غرق رہتا ہے، اسی لیے وہ مستقبل کی طرف توجہ نہیں دیتا اور اس کے دل میں نہ تو خوف ہوتا ہے اور نہ ہی مستقبل کی امید، بلکہ اس کی باطنی کیفیت خوف اور امید دونوں حالتوں سے افضل ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں حالتیں (خوف و امید) دو لگام کی مانند ہیں جو نفس کے جنگلی گھوڑے کو اعتدال سے انحراف نہیں ہونے دیتیں اور دل میں خوف اور امید کی کمی ادنیٰ نفس کی تابعداری کی تلقین کرتی ہے۔ واسطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ خوف اللہ اور اس کے بندے کے درمیان پردہ ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اگر سچائی دلوں پر نازل ہو جائے تو امید یا خوف کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔ چنانچہ اگر عاشق کے دل میں محبوب کی گواہی کے دوران اس میں جدائی کا خوف ہو تو وہ محبوب کی خوبصورتی کے نظارے سے لطف اندوز نہیں ہو سکے گا اور اس کی بصارت ناقص رہے گی، حالانکہ تمام مقامات کی چوٹی دائمی بصارت کا ہونا ہے، اور نفع کی کوئی امید اور نقصان کا خوف اس کو توڑ نہیں سکتا۔

خوف کے اجزاء کی ساخت: امید کی طرح ، خوف بھی تین چیزوں پر مشتمل ہے: علم ، [باطنی] حالت [وجود] ، اور اعمال۔ علم سے مراد اس وجہ کا ادراک ہے جو نقصان پہنچاتا ہے۔ مثال کے طور پر ، کسی نے کسی بادشاہ کی بے عزتی کا اظہار کیا یا شاہی حکم کے خلاف بغاوت کی اور بعد میں اسے گرفتار کر کے بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس صورت حال میں یقینا کسی کو قتل ہونے کا خوف ہو گا، حالانکہ یہ بھی ممکن ہے کہ بادشاہ کسی کو معاف کر دے، یا کسی طرح رہا ہو جائے لیکن اس کے دل میں ضرور قتل ہونے کا خوف ہو گا۔ پھر یہ خوف ان وجوہات کی طاقت کے تناسب سے مضبوط ہو گا جو اس قتل کی ضمانت دے گا، مثال کے طور پر، جرم کی شدت، یا بادشاہ کا دشمنی اور حسد ہے، یا بادشاہ کا انتقامی مزاج ہے، یا ایسے لوگوں سے گھرا ہوا ہے جو بادشاہ کو انتقام لینے پر اکساتے ہیں، یا کسی شفاعت کرنے والے سے محروم ہونا، یا ان تمام وسائل سے محروم ہونا جو بادشاہ کے غصے کو ختم کردیں گے یا دل میں انتقام کی آگ بجھا دیں گے۔ اگر یہ تمام وجوہات یکجا ہوجائیں اور ملزم بھی ان کے بارے میں جانتا ہو تو اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی کے دل میں قتل ہونے کا خوف بہت مضبوط ہو جائے گا۔ اس حد تک کہ یہ اسباب کمزور یا کم ہوں گے، اس حد تک خوف کا درد کم ہوگا۔

بعض اوقات خوفزدہ شخص اس لیے خوفزدہ نہیں ہوتا کہ کسی نے جرم کیا ہے، بلکہ جس شخص سے ڈرایا جا رہا ہے اس کی کوئی خصوصیت اس میں خوف پیدا کر رہی ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی وحشی جانور کے پنجوں میں پھنس جائے تو وہ یقینا اس جانور سے ڈرے گا کیونکہ وہ اس کی حیوانی فطرت اور خصوصیت سے واقف ہے اور وہ جانتا ہے کہ حیوانیت اس کی محبوب صفت ہے، حالانکہ یہ صفت صوابدیدی (غیر مجبوری) ہے کیونکہ بعض اوقات جانور اپنے شکار کو نقصان نہیں پہنچاتا اور بغیر کسی نقصان کے اس کے پاس سے گزر جاتا ہے۔ بعض اوقات ، کسی ایسی خصوصیت سے خوف ہوتا ہے جو غیر صوابدیدی (مجبوری) ہے اور خوفزدہ کی فطرت میں موروثی ہے جیسے تیزی سے بہتے ہوئے پانی میں گرنا یا آگ میں پھنس جانا۔ انسان پانی اور آگ سے ڈرتا ہے کیونکہ پانی کی فطری فطرت ڈوبنا ہے اور آگ کی فطری فطرت جلنا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ برائی کی وجوہات کی گہری تفہیم دل میں جلن اور پریشانی پیدا کرتی ہے اور باطن میں درد پیدا کرتی ہے۔ اس شدت اور اندرونی درد کو خوف کہا جاتا ہے۔ اسی طرح بعض اوقات خدا سے ڈرنا خدا کے وجود کی معرفت اور صفات کی وجہ سے ہوتا ہے کہ اگر وہ پوری دنیا کو ہلاک کر دے گا تو وہ نہ تو اس کی پرواہ کرے گا اور نہ ہی کوئی اسے اس سے روک سکتا ہے اور نہ ہی اس کی ہلاکت پر اسے ملامت کر سکتا ہے۔ بعض اوقات بندہ اپنے گناہوں کی وجہ سے خوفزدہ ہو جاتا ہے اور بعض اوقات یہ دونوں مل جاتے ہیں [خوف کی کیفیت پیدا کرنے کے لیے]۔ پھر جس حد تک یہ یقین پختہ ہو جاتا ہے کہ جو کچھ بھی ہے وہ خدا کے ہاتھ میں ہے، وہ کسی چیز یا کسی کی محتاج نہیں ہے، وہ جو کچھ بھی کرے گا، اس پر کوئی الزام نہیں لگاتا، جبکہ بندے (انسان) ہر حال میں احتساب کے مراحل سے گزریں گے، اس حد تک خوف بڑھ جائے گا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ جو شخص اپنی ذات سے زیادہ واقف ہے اس میں خدا سے زیادہ خوف ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

وَاللّٰهِ إِنِّي لَأَخْشَاكُمْ لِلّٰهِ وَأَتْقَاكُمْ لَهُ

"خدا کی قسم! میں تم سب میں اللہ سے سب سے زیادہ ڈرنے والا ہوں۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث کا مجموعہ *صحیح بخاری* انس رضی اللہ عنہ سے

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں درج ذیل باتیں بیان کی گئی ہیں:

إِنَّمَا يَخْشَى ٱللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ ٱلْعُلَمَٰٓؤُا۟

"خدا کے بندوں میں سے صرف وہی لوگ ہیں جنہیں علم سے نوازا گیا ہے، خدا سے خوف رکھتے ہیں [جیسا کہ حقیقی علم خدا کی معرفت کی طرف جاتا ہے جو خدائی حضوری کو متاثر کرتا ہے جس کی وجہ سے اس کے مالک کے لیے خیالات، احساسات، قول، اعمال اور اس بلند روحانی حالت کے خلاف ہونے کی کیفیت میں مشغول ہونا ناممکن ہو جاتا ہے]۔ (سورۃ البقرۃ 35، آیت 28)

خوف کے اثرات: جب خدا کی صفات اور گناہوں کی یہ معرفت مکمل ہو جاتی ہے تو اس سے دل میں خوف پیدا ہوتا ہے اور اس کے باطن میں شدت پیدا ہوتی ہے تو اس شدت کے اثرات دل سے جسم کے دوسرے اعضاء میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ یہ شدت اور خوف جسمانی کمزوری ، پیلا پن ، رونا وغیرہ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ بعض اوقات اس حالت کی گرمی کا اتنا اثر ہوتا ہے کہ یہ مایوسی اور ناامیدی کی کیفیت میں بدل جاتی ہے۔ جسمانی اعضاء خوف کا یہ اثر رکھتے ہیں کہ انہیں گناہوں سے روکا جاتا ہے اور اطاعت کے اعمال کے تابع کر دیا جاتا ہے تاکہ ماضی کی غلطیوں کا کفارہ ادا کیا جا سکے، اور مستقبل کے لیے اچھی طرح سے تیاری کی جا سکے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ خدا سے ڈرنے والا وہ نہیں ہے جو روتا ہے اور اپنے آنسو پونچھتا ہے بلکہ وہ شخص ہے جو اس چیز کو ترک کر دیتا ہے جس سے عذاب سے ڈرایا جاتا ہے۔ ابو القاسم حکیم رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جو شخص کسی چیز سے ڈرتا ہے وہ اس سے بھاگ جاتا ہے لیکن جو اللہ سے ڈرتا ہے وہ اس کی رحمت کی آغوش میں پناہ لیتا ہے۔ ذننون مصری رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ بندہ کب ڈرتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب کوئی شخص ایسے مریض کی طرح ہو جاتا ہے جس کی بیماری خطرناک ہوتی ہے اور موت کے خوف سے نقصان دہ کھانے سے روکتا ہے۔ خوف خدا کا انسان کی صفات (خصوصیات اور باطنی صفات) پر اثر یہ ہے کہ خواہشات کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور دنیاوی لذتیں اس حد تک پست ہو جاتی ہیں کہ وہ تمام گناہ جو پہلے کسی کے لیے محبوب تھے، برے نظر آنے لگنے لگتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس شخص کو شہد پسند ہے لیکن یہ جھکاؤ اس وقت نفرت میں بدل جاتا ہے جب یہ معلوم

ہوتا ہے کہ اس میں زہر ملا ہوا ہے، اسی طرح خوف کی گرمی خواہشوں کو جلا دیتی ہے، [جسمانی] اعضاء [مہذب] آداب پیدا کر دیتے ہیں، دل میں عاجزی، عاجزی، تقوی، تکبر، عداوت، حسد جیسی مذمت صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔ انسان کی پوری توجہ اپنے خوف کی طرف مڑ جاتی ہے اور کسی اور طرف دیکھنے کا کوئی عقل نہیں بچتا۔ انسان روحانی جدوجہد (*مجاہدت*)، خود احتسابی، یا اپنے بداعمالوں پر اپنے آپ کو ٹھہراتے ہوئے (*محاصبہ*) اور الٰہی (*مراقبہ*) کے بارے میں غور و فکر میں مصروف رہتا ہے۔ ہر لمحہ ، ہر قدم اٹھاتا ہے ، اور ایک ایک لفظ جو بولتا ہے ، اتنا قیمتی ہوجاتا ہے کہ وہ اسے ضائع نہیں کرتا۔ اس کے بجائے ، کوئی ان کے بارے میں بہت محافظ بن جاتا ہے [ان کو کھونے سے بچنے کے لئے ان کی حفاظت کرکے]۔ انسان کی حالت اس شخص کی حالت بن جاتی ہے جو کسی خونخوار درندے کے پنجوں میں پھنس جاتا ہے اور اسے معلوم نہیں ہوتا کہ کوئی اس کی طرف سے کسی لمحہ بھر کی غفلت کا فائدہ اٹھا کر اس سے بچ سکتا ہے یا اس کا کھانا بنتے ہوئے اس کے پنجوں میں مر جائے گا۔ اگر کوئی شخص اس طرح کی صورتحال میں پھنس جاتا ہے تو اس کا دل اور دماغ اور بیرونی اور باطن صرف آزادی تلاش کرنے کے راستے میں الجھے ہوئے ہیں، اس کے ذہن میں [اس حالت میں] کوئی اور خیال بھی نہیں آتا۔ یہ اس شخص کا حال ہے جو (خدا سے) ڈرا ہوا ہے۔ بعض صحابہ کرام *صحابہ* کرام اور ان کے پیروکاروں کا یہی حال تھا کہ خوف ان کی ہر رگ اور ہر ریشہ پر غالب ہے۔

اعمال میں خوف کے درجے: جس حد تک انسان کا خوف قوی ہے، اللہ تعالیٰ کی *صفت عظمت کی* معرفت (معارفہ*) اور ادنیٰ نفس کے عیبوں کا ادراک موجود ہے، اس حد تک روحانی کشمکش (*مجاہدہ*)، خود احتسابی یا اپنے گناہوں پر الزام* لینا (محاصبہ*) اور الٰہی* پر غور و فکر) زیادہ مضبوط ہیں۔ اپنے اعمال میں خوف کے اثرات کا سب سے کم درجہ یہ ہے کہ وہ ان کاموں سے دور رہتا ہے جو شریعت الٰہی کے احکام کے تحت حرام ہیں۔ شریعت الٰہی کی ممنوعات سے دور رہنے کو سختی کہا جاتا ہے۔ اگر خوف پختہ ہو تو وہ ان باتوں سے بھی دور رہے گا جن کے شریعت الٰہی میں حرام ہونے کا امکان موجود ہے، دوسرے لفظوں میں انسان ان باتوں سے بھی دور رہتا ہے جو یقینی طور پر حرام نہیں ہیں اور اس طرح مشکوک ہیں۔ اس درجے کو *تقویٰ* کہا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان مشکوک معاملات کو ترک کر کے ان معاملات پر عمل کرتا ہے جو یقینی طور پر جائز ہیں۔ بعض اوقات ، کوئی ان معاملات کو چھوڑ دیتا ہے جو بظاہر ٹھیک ہوتے ہیں لیکن ان کو اس خوف کی وجہ سے چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ شکوک و شبہات کا شکار ہوسکتے ہیں۔ اس درجے کو "*صدق فی التقوا*" کہا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس درجے کو صرف ان چیزوں کا استعمال کرتے ہوئے اگلے درجے تک لے جائے جن کی واقعی ضرورت ہے [اور ان کے جائز ہونے کا یقینا] مثال کے طور پر، کوئی اضافی گھر نہیں بناتا جس میں وہ رہائش پذیر نہ ہو، وہ ایسی خوراک جمع نہیں کرتا جو وہ کھاتا ہے، وہ دنیاداری کی طرف مائل نہیں ہوتا، اور انسان جانتا ہے کہ دنیا ایک ایسی چیز ہے جس سے کوئی الگ ہو جائے گا، اور [اس کے نتیجے میں] خدا کے سوا کسی اور چیز کے بارے میں سوچنے میں ایک سانس بھی ضائع نہیں کرتا، تو اس ڈگری کو "*صدق*" (سچائی یا مکمل لگن) کہا جاتا ہے۔ ایسے شخص کو صدیق کہنا بالکل مناسب ہے (سچائی والا شخص یا گنوسٹک یا خدا کا قریبی اور دوست)۔ اس ترتیب کے مطابق *تقویٰ* میں صداقت شامل ہے اور دیانت پرستی کو رعایت میں شامل کیا گیا ہے اور پاکیزگی میں عفت و پاکیزگی شامل ہے جو ہوس کو اکسانے والوں سے پرہیز کرنے کا نام ہے۔

خدا کا خوف مقصد ہے: حقیقت میں، خدا کا خوف مقصد ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کا ارادہ (اپنے بندوں) کو اپنے وجود سے ڈرانے والا نہ ہوتا تو نہ اپنے بندوں کو گناہ کرنے کی اجازت دیتا اور نہ ہی ان کے لیے گناہ کرنا آسان بناتا اور نہ ہی ان کو گناہوں کا ذریعہ فراہم کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گناہوں کا ذریعہ فراہم کرنا خدا کی رحمت سے دور کرنے کے مترادف ہے، پھر بندے کی طرف سے پہلے گناہ سے پہلے کوئی گناہ نہیں ہوا تھا جس کی بنیاد پر وہ گناہ کا مستحق قرار دیا جاتا اور گناہوں کے ذرائع کو آسان بنا دیا جاتا تھا۔ اسی طرح اطاعت سے پہلے بندے کے پاس کوئی

ایسا نیک عمل نہیں تھا جو کسی کو زیادہ نیک اعمال کا مستحق بنا دیتا اور اس کے لیے نیکی کا راستہ روشن کرتا۔ یہ سب الٰہی مقدر کے راز ہیں چاہے کوئی اس پر راضی ہو یا نہ ہو۔ اس ہستی کی کسی بھی چیز سے بے وابستگی یہ ہے کہ اس نے بغیر کسی پیشگی وجہ کے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بغیر کسی پیشگی وجہ کے کسی انسان کے اعلیٰ ترین درجات عطا کیے، تاکہ مخلوقات میں سے کوئی بھی اس کا مقابلہ کرنے کا دعویٰ نہ کر سکے۔
دوسری طرف اس نے ابو جہل کو بغیر کسی غلطی کے نچلے درجے تک پہنچا دیا۔ وہ ہستی جس کی غفلت (اور کسی سے یا کسی چیز سے عدم وابستگی) کی کیفیت ایسی ہے، اس کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ و شوکت سے ڈرنا ضروری ہے۔

خوف و غضب کی فضیلت اور اس کی نصیحتیں: خوف کی فضیلت منطقی استنباط (*قیاس*) کے ساتھ ساتھ قرآنی آیات اور نبوت دونوں سے ثابت ہوتی ہے۔ کسی چیز کی فضیلت کو دیکھنے کے لیے منطقی استنباط کا طریقہ یہ ہے کہ یہ دیکھنا ہے کہ اس سے انسان کو ابدی خوشی اور بصیرت الٰہی کی لامتناہی فتح کی طرف لے جانے میں کس قدر مدد ملتی ہے کیونکہ یہ ایک مومن بندے کا اصل مقصد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس حد تک کوئی چیز ابدی خوشی اور ابدی کامیابی تک پہنچنے میں مدد دے سکتی ہے، اس حد تک اس میں فضیلت کی سطح ہوگی۔

اس سے پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ سے ملاقات اور ابدی سعادت اور دائمی کامیابی کا حصول اس کی محبت اور تڑپ کے بغیر ممکن نہیں ہے اور محبت الٰہی عرفہ کے بغیر حاصل نہیں ہوتیں اور الٰہی گنوسی کو یاد الٰہی کے دائمی ہونے کے بغیر حاصل نہیں ہوتا، اور الٰہی ذکر اور غور و فکر کے ساتھ ثابت قدم رہنے کے لیے) دل کی دنیا سے لاتعلقی ضروری ہے اور دنیا سے دل کا لگاؤ اسی وقت ٹوٹ جاتا ہے جب بندہ دنیاوی لذتوں اور خواہشات کو ترک کر دیتا ہے اور خواہشات کو ختم کرنے کے لیے خوف کی آگ کی ضرورت ہوتی ہے۔ خوف وہ آگ ہے جو خواہشات کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے، اسی لیے صرف وہی خوف افضل ہو گا جو خواہشات کو جلا دیتا ہے، گناہوں سے بچاتا ہے، اور اطاعت کی تلقین کرتا ہے۔ پھر جس حد تک خواہشات جل جائیں گی، گناہ کم ہو جائیں گے اور جس حد تک اطاعت ظاہر ہو گی (بڑھے گی) اس حد تک وہ (ابدی خوشی اور ابدی کامیابی) افضل ہو گی۔ یہ خدا پرستی کے درجات میں فرق کی حقیقت ہے۔ خوف [خدا] کیوں افضل ہے؟ چونکہ ایک خادم اس کے ذریعے حاصل کرتا ہے، اس لیے کردار کی خصوصیات جیسے عفت، پاکیزگی، ایمانداری، عاجزی اور روحانی کوششیں ہوتی ہیں۔ ان کردار کی خصوصیات کی فضیلت پر شک نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح خوف کی فضیلت منطقی استنباط کے ساتھ ساتھ آیات اور روایات دونوں سے ثابت ہوتی ہے۔

خوف کی فضیلت میں آیات اور اعمال: خوف کی فضیلت میں بے شمار [نبوت] روایات ہیں۔ خوف کی فضیلت کے بارے میں یہ جاننا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کی طرف جانے والے چاروں [روحانی] مقامات یعنی [الہامی] ہدایت، [الہامی] رحمت، [الہامی] علم، اور [الہامی] رضامندی کو ان تین آیات میں جمع کیا ہے:

هُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِينَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُونَ

"جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں ان کے لیے (ان کے پروردگار) کی طرف سے ہدایت اور رحمت تھی۔"
(سورة البقرة آیت ۷، آیت ۱۵۴)

إِنَّمَا يَخْشَى ٱللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ ٱلْعُلَمَٰٓؤُا۟

"وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔" (سورة البقرة 35، آیت 28)

رَّضِىَ ٱللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا۟ عَنْهُ ۚ ذَٰلِكَ لِمَنْ خَشِىَ رَبَّهُۥ

"اللہ ان سے راضی ہے اور وہ اللہ سے راضی ہیں۔" یہ اس کے لیے ہے جو اپنے رب سے ڈرتا ہے۔ (سورة البقرة سورة البقرة آیت ٨)

پہلی آیت میں ہدایت اور رحمت ہے، دوسری آیت علم اور تیسری آیت اللہ کی رضا ہے، یہ سب پرہیزگاروں کے لیے مخصوص ہیں۔ [الہی] علم خوف کا نتیجہ ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: پرہیزگار لوگوں کو رفیق اعلیٰ صحابی رضی اللہ عنہ کی رفیق اعلیٰ کی رفاقت حاصل ہوگی اور ان کے اس بلند مقام میں کوئی شریک نہیں ہوگا۔ انہیں یہ رفاقت اس لیے ملے گی کہ خوف الٰہی صرف علم رکھنے والے ہی کرتے ہیں اور اہل علم انبیاء کے وارث ہونے کے ناطے اس رفاقت کا حق رکھتے ہیں اور انبیاء علیہم السلام کی صحابہ کرام کی صحابہ کرام کی رفاقت حاصل ہے۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بیماری کے دوران جو ان کی وفات کا سبب بنی ان کو یہ اختیار دیا گیا کہ اگر وہ چاہیں تو دنیا میں رہیں یا اگر چاہیں تو خدا کی طرف لوٹ جائیں گے اور اس پر فرمایا:

اسالک الرفیق الاعلی

"میں تجھ سے صحابی اعظم کا مطالبہ کرتا ہوں (میں تجھ سے تیری ابدی رفاقت کا مطالبہ کرتا ہوں)۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حضرت *عائشہ* رضی اللہ عنہا کی روایت سے صحیح بخاری *اور* صحیح مسلم کے مجموعے *میں* احادیث شامل ہیں۔

فضیل بن عیاد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے وہ ہر قسم کی بہتری کی طرف لے جاتا ہے۔ شبلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب بھی میں اللہ سے ڈرتا تو میرے لیے حکمت اور معروضی عبرت کا ایک نیا دروازہ کھل گیا جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا کہ آج کوئی ایسا شخص نہیں جس کا میں حساب کتاب نہ کروں گا، لیکن دیانت دار لوگ (جو اپنے تمام خیالات، احساسات، قول و اعمال کی وجہ سے اپنے آپ کو ذمہ دار سمجھتے ہیں) اس سے مستثنیٰ ہیں۔ مجھے ان کا احتساب اور حساب کتاب کرنے میں شرم آتی ہے۔ وہ احتساب سے اوپر اٹھ چکے ہیں [جیسا کہ انہوں نے پہلے ہی اپنی دنیاوی زندگی کے دوران رضاکارانہ طور پر ایسا کیا ہے]۔ خدا کا خوف احتیاط اور پرہیزگاری ، تعظیم اور خدا سے خوف پر مبنی ہے۔

کیا خوف یا امید کا غلبہ یا دونوں کی اعتدال پسند سطح برتر ہے؟

امید اور خوف دو دوائیں ہیں جو دلوں کو شفا دیتی ہیں۔ یہ دوائیں اپنے آپ میں کوئی قابل تعریف خوبیاں نہیں ہوتیں لیکن جس حد تک وہ کسی بیماری کے علاج میں فائدہ مند ہوں گی اس حد تک ان میں کمال حاصل ہوگا۔ لہٰذا اگر دل میں بے خوفی کا مرض ہے اور یہ خطرہ ہے کہ یہ شخص اپنے آپ کو خدا کے عذاب سے محفوظ سمجھتے ہوئے دنیاوی لذتوں اور لذتوں میں مشغول رہے تو اس صورت میں خوف (خدا) سے افضل ہے۔ اگر دل میں مایوسی اور ناامیدی کا غلبہ ہو تو امید (خدا سے) افضل ہو گی۔ اسی طرح اگر کسی بندے پر گناہوں کا غلبہ ہو تو (خدا) کا خوف زیادہ ہو گا۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ خوف بالکل افضل ہے جس طرح روٹی لیموں کے پانی سے افضل ہے (جسے "*سکنجابین*" کہا جاتا ہے جو روایتی طب میں لیموں یا سرکہ اور شہد کے ساتھ کچھ دیگر قدرتی جڑی بوٹیوں سے بنایا جاتا ہے) کیونکہ روٹی بھوک کی بیماری کا علاج کرتی ہے جبکہ *سکنجابین* جگر سے پت کا علاج کرتی ہے۔ بھوک کی بیماری غالب ہے کیونکہ [لیموں کے پانی سے زیادہ] روٹی کی ضرورت ہوتی ہے، اس لیے روٹی افضل ہے۔ اس سلسلے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ خدا کا خوف اس کی غالب ضرورت کی وجہ سے افضل ہے کیونکہ لوگوں پر گناہوں اور خود فریبی کا غلبہ ہے۔ اگر ہم خوف اور امید کے سرچشموں پر ایک نظر ڈالیں تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ امید افضل ہے کیونکہ امید کا سرچشمہ [الہامی] رحمت ہے اور خوف کا سرچشمہ [الہامی] غضب ہے۔ جو شخص ان [الہامی] صفات پر غور و فکر کرتا ہے جو خدا کی مہربانی اور سخاوت کے حق میں دلیل دیتے ہیں، تو وہ دل میں خدا کی محبت کو زیادہ پروان چڑھاتا ہے اور [روحانی] محبت کے مقام سے بلند کوئی مقام نہیں ہے۔ خوف کی صورت میں بندے کی توجہ ان الٰہی صفات پر ہوتی ہے جو اس کے غضب اور ناراضگی کے بارے میں بحث کرتی ہیں۔ ان صفات کے نتیجے میں خوف بڑھ جاتا ہے اور انسان کو اتنی الٰہی محبت اور حسرت حاصل نہیں ہوتی جتنی امید کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔

برتری کے بجائے اصلاحی : حقیقت میں ، خوف اور امید کی نہ تو اپنے آپ میں ضرورت ہے اور نہ ہی وہ مقصد ہیں ، بلکہ ان کی ضرورت کسی اور چیز کے لئے ہے۔ میری رائے میں، وہ چیزیں جو دوسروں کے لیے ضروری ہیں، ان کے لیے "برتر" کے بجائے "اصلاحی" کا لفظ استعمال کرنا زیادہ درست ہے۔ اگر اس اصول کو قبول کر لیا جائے تو ہم کہیں گے کہ زیادہ تر لوگوں کے لیے خوف امید سے زیادہ اصلاحی ہے کیونکہ زیادہ تر لوگ گناہوں پر غالب ہیں اور وہ صرف خوف کے کوڑے سے ہی گناہوں کو ترک کر سکتے ہیں۔ امید ان کو بے باک بنا سکتی ہے جبکہ خدا پرست لوگ جو ظاہری اور باطنی مخلوقات میں پاک ہو چکے ہیں، اعتدال اور خوف اور امید کے درمیان توازن اصلاحی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ قول بہت مشہور ہے، "اگر کسی مومن کے خوف اور امید کو تول دیا جائے تو وہ برابر ہو جائے گا"۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک بیٹے سے کہا کہ اللہ سے بہت ڈرو اور یہ خیال کرو کہ اگر تم دنیا کے تمام نیکیوں کو اپنے ساتھ لے جاؤ گے تو وہ خدا کی طرف سے قبول نہیں ہوں گے اور بہت امید رکھتے ہیں اور سوچو کہ اگر تم دنیا کے تمام گناہ جمع کرو ۔ وہ اب بھی تمہیں معاف کر دے گا۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر یہ اعلان کیا جائے کہ ایک شخص کے سوا تمام لوگ جہنم میں جائیں گے تو مجھے امید ہے کہ وہ ایک شخص ہوں گے اور اگر یہ اعلان کیا جائے گا کہ ایک شخص کے سوا تمام لوگ جنت میں جائیں گے تو مجھے وہ خوف ہو گا کہ وہ ایک شخص ہوں۔ یہ [خدا سے] خوف اور امید کی اعلیٰ ترین ڈگری ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی امید اور خوف ہی برابر ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی گنہگار شخص یہ اعلان سنتا ہے کہ ایک کے سوا تمام لوگ جہنم میں جائیں گے، تو وہ یہ سمجھے گا کہ جہنم میں جانے سے مستثنیٰ شخص وہی ہے اور وہ خود فریبی میں پڑ سکتا ہے۔

جو لوگ مضبوط دل رکھتے ہیں اور اپنی معرفت میں کمال رکھتے ہیں ، ان کا خوف اور امید برابر ہے، اور ان پر صرف امید کا غلبہ نہیں ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس حالت میں تھے کہ وہ ہر وقت اپنے دل کی جانچ پڑتال کرتے تھے اور اپنے دل کی پوشیدہ بیماریوں کو جاننے میں بہت احتیاط برتتے تھے یہاں تک کہ وہ حذیفہ رضی اللہ عنہ سے پوچھتے تھے کہ کیا تم نے مجھ میں منافقت کی کوئی نشانیاں دیکھی ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر نفاق کی علامات کا علم عطا فرمایا۔ آج کون ہے جو اپنے دل کو نفاق اور پوشیدہ شرک سے پاک کرے اگر کسی نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اس کا دل پاک ہو گیا ہے تو وہ اللہ کے حساب سے کس حد تک بچایا جا سکتا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دل میں تطہیر کا خیال ڈال دیا ہو لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے؟ اگر کسی کے پاس دل کی تطہیر بھی ہو تو پھر اس نے یہ کیسے طے کیا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے آخری حصے تک اسی طرح رہے گا؟ جب یہ صورتحال ہے تو ، کوئی نڈر کیسے ہوسکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ مومن کے لیے ضروری ہے کہ وہ خوف اور امید دونوں کا حامل ہو اور دونوں کے درمیان توازن اور مساوات کی ضرورت ہو۔ عام لوگوں پر امید کا غلبہ ان کی سمجھ اور علم کی کمی کا ثبوت ہے۔ چنانچہ قرآن مجید نے ان دو صفات کو یکجا کیا ہے جہاں بندوں کی صفات کا ذکر کیا گیا ہے:

يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ

"وہ امید اور خوف کے ساتھ اپنے رب سے دعا کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔" (سورۃ البقرۃ باب 32، آیت 16)

لیکن عمر رضی اللہ عنہ جیسے بلند عزم والے لوگ کہاں ہیں جو امید اور خوف کے درمیان توازن برقرار رکھ سکتے ہیں؟ یہی وجہ ہے کہ موجودہ دور میں خوف لوگوں کے لیے اس شرط پر زیادہ موزوں ہے کہ وہ مایوسی، اعمال کو ترک کرنے اور ناامیدی میں ڈوبے ہوئے نہ ہوں۔ بعض لوگ اس خوف سے کہ وہ گناہ گار ہیں اور ان کی بخشش کی امید نہیں رکھتے ہیں اور نیک کاموں کو چھوڑ دیتے ہیں اور گناہوں میں ڈوبے ہوئے ہیں اس طرح کا خوف فائدہ مند ہونے کے بجائے نقصان دہ ہے۔ فائدہ مند خوف وہ ہے جو انسان کو اعمال کی طرف راغب کرتا ہے، خواہشات کی طرف نفرت پیدا کرتا ہے، اور دنیا کی طرف مائل ہونے کی اجازت نہیں دیتا ہے۔ یہ خوف نہیں ہے کہ دل میں کوئی خیال آیا اور اس کے اعضاء پر کوئی اثر پڑے جس سے برے اعمال سے نفرت پیدا ہو، یا کسی کو نیک کاموں پر آمادہ کیا جائے۔ [خدا سے] خوف بھی وہ نہیں ہے جو مایوسی کا سبب بنتا ہے۔ ان تمام اقوال کا خلاصہ یہ ہے کہ دونوں (امید اور خوف کی صفات) کا امتزاج ضروری ہے۔ لیکن جب تک موت نہیں آتی، خوف زیادہ فائدہ مند اور موزوں ہوتا ہے، اور موت کے وقت خدا کی رحمت کی امید اور اچھی توقع زیادہ موزوں ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خوف ایک ایسا کوڑا ہے جو بندے کو صحیح اعمال کی طرف راغب کرتا ہے لیکن وہ جو مرنے والا ہے اور نہ تو اس میں (نیک اور پاکیزہ) اعمال کرنے کی صلاحیت نہیں ہے، یا خوف کے ذرائع کو برداشت کرنا اس طرح ہے جیسے خوف [مرنے والے] کے دل کو ڈبو دیتا ہے اور موت کے قریب لے جاتا ہے، جبکہ امید دل کو مضبوط کرتی ہے اور خدا کی محبت کو اپنے وجود کی ہر رگ اور ریشے میں سرایت کرتی ہے۔ بندے کی ابدی خوشی اور دائمی کامیابی اس میں ہے کہ خدا کی محبت کے چراغ دل کو روشن کریں اور اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی خواہش کریں۔ جو شخص خدا سے ملنا چاہتا ہے، خدا ایسے سے ملنا چاہتا ہے۔ محبت، حسرت، ملاقات کی خواہش کا مقصد خدا کی معرفت ہے اور اس کا نتیجہ محبت ہے۔ ہر شخص کا مالک مرنے کے بعد اس کی طرف لوٹنا واجب ہے اور یہیں پر اس کا آخری ٹھکانہ اور منزل ہے۔ جو شخص اپنے محبوب سے ملتا ہے، وہ اپنی محبت کے مطابق خوشی کی حد کا تجربہ کرتا ہے۔ جو شخص اپنے محبوب سے الگ ہو جاتا ہے، وہ اپنی محبت کے مطابق درد کا تجربہ کرتا ہے۔ اگر کسی کے دل میں شریک حیات، بچوں، گھر، زمین، جائیداد، دوستوں، رشتہ داروں کی محبت کا غلبہ ہو تو یہ ایک ایسا شخص ہے جس کی تمام محبوب چیزیں دنیا میں ہیں- دنیا کسی کی جنت ہے کیونکہ جنت اس مخصوص جگہ کا نام ہے

جو کسی کی تمام پسندیدہ اور محبوب چیزوں کو یکجا کرتی ہے۔ ایسے شخص کی موت جنت سے نکالنے کے مترادف ہے کیونکہ موت کسی اور اپنی محبوب چیزوں کے درمیان پردہ بن جاتی ہے اور یہ ایک ایسی تکلیف ہے جسے صرف سختی کے ساتھ ہی برداشت کیا جا سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیاوی لوگ موت سے ڈرتے ہیں اور اس زندگی کو چھوڑ کر رخصت ہونا پسند نہیں کرتے۔

جب کہ جس شخص کا محبوب خدا ہے اور جس کے پاس صرف الٰہی کی یاد، غور و فکر اور خدا کی معرفت کی خواہش اور دنیاوی رکاوٹوں اور وابستگیوں کو اپنے لیے نقصان دہ سمجھتا ہے، ایسے شخص کے لیے دنیا ایک قید خانہ ہے، یہاں انسان کو ایک لمحے کے لیے بھی سکون نہیں ملتا اور ہر وقت اس قید خانے سے نجات حاصل کرنے اور اپنے محبوب سے ملنے کی کوشش کرتا ہے۔ اب آپ کو اس احساس پر غور کرنا چاہیے جو قیدی کو جیل سے رہائی کے وقت اپنے محبوب سے ملنے پر ہوتا ہے۔ یہ وہ خوشی ہے جو ایک مومن خادم کو جسم کی قید سے نجات پانے کے بعد سب سے پہلے ملتا ہے۔ یہ (خوشی) اللہ تعالیٰ کے بدلے سے الگ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے مقرر کیا ہے۔ یہ الٰہی جزا کیا ہے؟ یہ ایک ایسی چیز ہے جسے نہ کسی آنکھوں نے دیکھا ہے، نہ کسی کانوں نے سنا ہے اور نہ ہی کسی دل کو اس کا خیال آیا ہے۔ اللہ نے ان لوگوں کے لیے یہ ثواب تیار کر رکھا ہے جو آخرت کی زندگی کو دنیا کی زندگی پر ترجیح دیتے ہیں اور اس سے مطمئن ہوتے ہیں اور اس سے مطمئن ہوتے ہیں۔ اسی طرح دنیا سے رخصت ہونے کے وقت کافر کو جو تکلیف پہنچتی ہے وہ اس عذاب سے الگ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نافرمان بندوں کے لیے مقرر کی ہے۔ اس میں مختلف قسم کے مصائب ، زنجیریں ، پھنسنے اور ذلت اور حقارت کے ذرائع ہیں۔ ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اپنی مرضی کے تابع ہونے کی حالت میں موت عطا فرمائے اور ہمیں صالحوں کے ساتھ شامل کرے۔ اس دعا کی قبولیت کی امید خدا کی محبت حاصل کیے بغیر نہیں ہے اور خدا کی محبت اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی محبت دل سے دور نہ ہو جائے اور دل کی ان تمام رکاوٹوں سے وابستگی جو الٰہی محبت کے حصول میں رکاوٹ بن رہی ہیں، دولت کی طرح منقطع ہو جاتی۔ شہرت ، وطن ، وغیرہ۔ بہرحال موت کے وقت امید کا غلبہ اصلاحی ہے کیونکہ اس سے محبت پیدا ہوتی ہے اور ہوس کی آگ بجھ جاتی ہے اور دنیا کی محبت کو دل سے دور کر دیتی ہے۔

ناخوشگوار اختتام کے بارے میں گنوسٹکس کا خوف

تمام آیات اور روایات کو سننے کے بعد صرف ایک بے وقوف یا جاہل شخص ہی ہو سکتا ہے جو بے خوف ہو۔ یہ خدا کا بہت بڑا احسان ہے کہ امید کی نرم ہوا کے ساتھ گنوسٹکس کے دلوں کو تازہ رکھیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ان کے دل خوف سے جل جاتے۔

برا یا ناخوشگوار اختتام کا معنی: خراب اختتام کے دو درجات ہوتے ہیں جن میں ایک دوسرے سے زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ پہلی ڈگری جو مشکل ہے وہ یہ ہے کہ جب کوئی موت کے دہانے میں ہوتا ہے اور اس کے ساتھ دل کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ خدا کے بارے میں شک کرنے لگتا ہے یا خدا کا انکار کرنا شروع کر دیتا ہے اور اسی حالت میں مر جاتا ہے۔ یہ شک و تردید ایک ایسی گرہ ہے جو ایک اور خدا کے درمیان ہمیشہ کے لیے پردہ پیدا کر دیتی ہے اور دائمی پردہ انسان کو اللہ سے دوری اور عذاب کی طرف لے جاتا ہے۔ برے انجام کا دوسرا درجہ، جو پہلے سے کم ہوتا ہے،

وہ یہ ہے کہ موت کے وقت انسان کا دل دنیاوی معاملات یا دنیاوی خواہشات کی کسی بھی شہوت سے حاوی ہو جاتا ہے جو دل اور دماغ کو اس حد تک دھندلا دیتا ہے کہ تمام حواس اس میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ اس حالت میں، [دل و دماغ میں] ہوس کے علاوہ کسی اور چیز کے لیے کوئی جگہ باقی نہیں رہے گی۔ اگر اس حالت میں روح چھین لی جائے تو دل کی لذت کی وجہ سے خدا کے سوا کسی اور کی طرف توجہ مرکوز کی جاتی۔ یہ ایک اور خدا کے درمیان پردے کی ایک شکل ہے۔ پردہ [اس طرح جو خدا سے دوری کی علامت ہے] [الہامی] عذاب کی دعوت دیتا ہے کیونکہ جو آگ خدا کی طرف سے روشن کی گئی ہے وہ پردہ کے لوگوں کے لیے ہے۔ ایک مومن جس کا دل صحت مند ہو اور دنیا سے غافل ہو اور دل سے خدا پر توجہ مرکوز کر کے یہ آگ ایسے شخص سے کہتی ہے کہ اے مومن! میرے پاس سے گزر جاؤ۔ آپ کی روشنی نے میرے شعلوں کو بجھا دیا ہے۔"

برے انجام کے اسباب: وہ اسباب جو کسی کو برے انجام تک لے جاتی ہیں بے شمار ہیں اور ان کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا لیکن اجتماعی طور پر ان کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے:

پہلی وجہ شک اور انکار: یہ بات یقینی طور پر معلوم ہونی چاہیے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ، اس کے انبیاء اور اس کی کتابوں پر سادہ ایمان سے محروم ہو اور بحث و مباحثہ میں مشغول ہو تو اسے اس خطرے کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ ایسے شخص کی مثال کسی ایسے شخص کی ہے جس کا جہاز سمندر کے بیچ میں الٹ گیا ہو اور اب سمندر کی سرکش لہروں سے گھرا ہوا ہے۔ یہ لہریں ہر جگہ گھومتی ہیں۔ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ [ایسی صورتحال میں] کوئی بحفاظت ساحل پر پہنچ جائے کیونکہ زیادہ تر لوگ اس صورتحال میں مر جاتے ہیں (ڈوب جاتے ہیں)۔ یہی وجہ ہے کہ الٰہی ہستی اور صفات کی حقیقت کی تلاش خالص جہالت ہے اور خطرات کے سمندر میں دھکیلنے کے مترادف ہے۔ لیکن جو لوگ عقل کی حدود سے نکل کر نبوت اور عرفان کے افق پر چمکنے والی روحانی نقاب کشائی (روشنی) کی روشنی تک رسائی حاصل کرتے ہیں وہ کامیابی کے ساتھ سلامتی کے ساحلوں پر پہنچ جاتے ہیں۔ ہر عام آدمی کے لیے اس کمال تک پہنچنا ممکن نہیں ہے کیونکہ بہت کم لوگ اس درجے تک پہنچتے ہیں۔ لہٰذا بحث و مباحثے کا راستہ بے شمار خطرات سے بھرا ہوا ہے۔ ایک بار جب وہ لوگ ان خطرات سے بچ جاتے ہیں جو سادہ لوح اور جہنم کی آگ کے خوف سے ہیں تو اطاعت الٰہی میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ وہ بحث و مباحثوں کی غیر ضروری ضرورت پر اپنا وقت ضائع نہیں کرتے۔

شک و تردید کی وجہ سے برے انجام کی دوسری شکل یہ ہے کہ حقیقت پر ایمان کمزور ہے اور دنیا کی محبت دل پر حاوی ہے۔ ایمان کی کمزوری کی حد تک خدا کی محبت بھی کمزور ہوگی لیکن اس حد تک دنیاداری کی محبت مضبوط ہوگی۔ یہ طاقت اس حد تک ہوگی کہ خدا کی محبت کے لیے دل میں کوئی صلاحیت باقی نہیں رہے گی بلکہ یہ محبت ایک گزرتی ہوئی سوچ کا درجہ اختیار کرے گی جو چند لمحوں کے لیے پیدا ہوتی ہے اور ختم ہو جاتی ہے۔ اس کا اثر اتنا مضبوط نہیں ہے کہ وہ نچلے نفس کی مخالفت کرے اور اسے شیطانی راستے سے ہٹا دے۔ اس صورتحال کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ انسان سر سے پاؤں تک ہوس میں ڈوب جاتا ہے اس حد تک کہ اس کا دل سخت اور تاریک ہو جاتا ہے۔ پھر یہ تاریکی اور سختی گناہوں کے تناسب سے بڑھ جاتی ہے یہاں تک کہ ایمان کا چراغ جو مدھم روشنی نکل رہا تھا، اچانک بجھ جاتا ہے اور انسان کو یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ دل میں ایمان کا نور باقی نہیں ہے۔ [اس کے نتیجے میں،] اندھیرا کسی کی فطرت ، مزاج اور مقصد بن جاتا ہے۔ موت کی تکلیف میں، خدا کی محبت میں یہ کمزوری اور بھی بڑھ جاتی ہے کیونکہ انسان کو دنیا سے آنے والی علیحدگی کا احساس ہوتا ہے، یعنی اپنے محبوب کے دل پر حاوی ہے۔ علیحدگی کا یہ احساس انسان کو درد کا احساس دلاتا ہے اور اس وقت اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ دنیا اور دنیا کے درمیان جدائی موت کی وجہ سے ہوگی اور موت خدا کی طرف سے ہے۔

چنانچہ انسان موت کو برا سمجھتا ہے اور یہاں یہ خطرہ ہے کہ دنیا کی محبت کے شوق میں خدا سے دشمنی شروع ہو جائے گی۔ اس کی مثال ایک ایسے شخص کی ہے جو اپنے بیٹے سے کچھ محبت رکھتا ہے لیکن اسے اپنے مال سے بہت محبت ہے۔ اس صورت حال میں اگر بیٹا اپنی دولت ضائع کر دے تو اپنے بیٹے سے جو تھوڑی سی محبت تھی وہ نفرت میں بدل جائے گی اور وہ اپنے بیٹے کو اپنا دشمن سمجھنے لگے گا۔ اگر کسی کی روح اس وقت چھین لی جائے جب اس کے دل میں خدا سے نفرت یا دشمنی کا احساس پیدا ہو رہا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا انجام ایک منحوس ہو گا اور ہمیشہ کے لیے برباد ہو جائے گا۔ اس تفصیل سے ثابت ہوتا ہے کہ اس صورت حال میں انسان کا انجام برا ہوا کیونکہ اس کے دل پر دنیا کی محبت حاوی تھی اور اس کا جھکاؤ دنیاوی اسباب کی طرف تھا اور اس کے ایمان میں کمزوری تھی جس کی وجہ سے خدا کی محبت بھی کمزور تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص دنیا کی محبت کو محکوم اور خدا کی محبت کو اپنے دل میں غالب پاتا ہے، اگرچہ دنیا کی محبت دل میں موجود ہو تو وہ اس خطرے سے بہت دور ہے۔

دوسرا سبب - گناہ: اب برے انجام کی دوسری وجہ کا ذکر کیا جائے گا۔ یہ وجہ [خدا کی] شک اور انکار کی حالت میں مرنے کے مقابلے میں نسبتا ہلکا ہے، اور یہ جہنم میں ابدی زندگی گزارنے کی ضمانت نہیں دیتا۔ اس قسم کے خاتمے کی دو وجوہات ہیں، ایک گناہوں کی کثرت ہے جبکہ ایمان مضبوط ہے، دوسرا ایمان کی کمزوری ہے جبکہ گناہ کم ہیں۔ پہلی وجہ یعنی گناہوں کی کثرت کے بارے میں تفصیل یہ ہے کہ انسان گناہ کا ارتکاب اس لیے کرتا ہے کہ اس پر ہوس کا غلبہ ہوتا ہے اور حسرت اور عادت کی وجہ سے ہوس دل میں جڑ جاتی ہے۔ وہ چیزیں جن کا کوئی زندگی بھر عادی تھا، وہ اسی لمحے ذہن میں آتے ہیں۔ چنانچہ اگر کوئی شخص اطاعت کی طرف مائل ہو تو وہ مرنے کے وقت بھی اطاعت کی طرف توجہ دیتا ہے، اسے یاد کرتا ہے اور اس کا ذکر کرتا ہے۔ جو گناہوں کی طرف مائل ہوتا ہے وہ موت کے وقت بھی دل پر حاوی ہوتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ روح اس حالت میں چھین لی جاتی ہے جب کسی کے دل پر کسی نہ کسی دنیاوی ہوس یا گناہ کا غلبہ ہوتا ہے۔ اس طرح انسان خدا سے پردہ ڈال لیتا ہے اور اس کے حق میں انجام کا بہت بڑا خطرہ ہوتا ہے۔

اگر کسی کے دل میں خوف نہ ہو تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس کے پاس بہت سی غلطیاں ہیں، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا دل خواہشات اور خواہشات سے خالی نہیں ہے۔ بلکہ انسان نفس کی خواہشات کے تابع ہے، بدبختی اس پر غالب ہے اور اس سے دل کی غفلت دیکھنے کی اجازت نہیں دیتی، موت سے قربت انسان کو بیدار نہیں کرتی، گناہوں کی کثرت اس کے باطن میں ہلچل پیدا نہیں کرتی، خوفزدہ ہونے کی کیفیت کو دیکھنے سے دل پر کوئی اثر نہیں ہوتا، اور برے انجام کا خوف گناہوں کے ارتکاب سے نہیں روکتا۔ عجیب بات یہ ہے کہ جب ہم دنیاوی دولت جمع کرنا چاہتے ہیں تو ہم کاشت کرتے ہیں، پودے لگاتے ہیں، کاروبار کرتے ہیں، سمندروں میں بحری جہازوں پر سفر کرتے ہیں، صحراؤں میں گھوڑوں کو دوڑاتے ہیں، اور سفر کی مشکلات اور مصائب برداشت کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر ہم کسی عقلی درجے کے خواہاں ہیں تو ہم علم حاصل کرتے ہیں، ساری رات جاگتے رہتے ہیں اور یاد کرتے ہیں، اپنی رزق کی تلاش میں کوشش کرتے ہیں اور جدوجہد کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے رزق کے وعدے پر یقین نہیں رکھتے، ہم رزق کے انتظار میں اپنے گھروں میں بیٹھ کر نہیں بیٹھتے اور صرف نماز نہیں مانگتے۔ "اے خدا! ہمیں رزق دے دو!" لیکن جب ہمارے سامنے دائمی سلطنت کے بارے میں سوال آتا ہے یا جنت کا ذکر کیا جاتا ہے تو ہم صرف اس بات پر راضی ہو جاتے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں معاف کرو ، ہم پر رحم کرو!"، اگرچہ عظیم ہستی ، جس پر ہم بھروسہ کرتے ہیں ، کھل کر اعلان کرتا ہے:

وَأَن لَّيۡسَ لِلۡإِنسَـٰنِ إِلَّا مَا سَعَىٰ

"اور انسان کو وہی ملے گا جو اس نے کوشش کی ہے۔" (سورة البقرة باب 53، آیت 39)

وَلَا يَغُرَّنَّكُم بِٱللَّهِ ٱلۡغَرُورُ

"ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہیں خدا کے بارے میں دھوکہ دہی میں ڈال دے۔" (سورة البقرة باب 35، آیت 5)

[بدقسمتی سے،] یہ تمام آیات نہ تو ہمیں خبردار کرتی ہیں اور نہ ہی ہمیں تکبر اور خواہشات کی وادیوں سے نکالتی ہیں۔ حقیقت میں، اعمال کے بغیر نجات کی امید رکھنا اور اس بات کا یقین رکھنا کہ ہم نے [مطلوبہ] اعمال کرنے کے بعد نجات حاصل کی ہے، ایک بہت بڑا نقصان ہے۔

اگر کوئی شخص غور سے دیکھے اور اپنے باطن کا جائزہ لے تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ یہ مختلف قسم کے جنگلی درندوں اور زہریلی مخلوقات جیسے غصہ، ہوس، دشمنی، حسد، تکبر، خود راستبازی وغیرہ سے بھرا ہوا ہے۔ یہ تمام اندرونی خصوصیات (کردار کی خصوصیات اور اندرونی مزاج) وہ درندے ہیں جو غفلت کی حالت میں ہر وقت کسی پر حملہ کرتے ہیں۔ تاہم ، انسان ان اندرونی درندوں اور نقصان دہ جانوروں کی حیوانیت سے ہونے والی اذیت کو محسوس اور احساس نہیں کرتا ہے۔ جب پردے اٹھائے جائیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ ان جانداروں نے تمہیں کتنا نقصان پہنچایا ہے اس وقت ، آپ کو پتہ چل جائے گا کہ آپ کو ان اندرونی درندوں سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے کیوں نصیحت کی گئی تھی۔ اگر آپ ان [اندرونی] درندوں پر قابو پانا چاہتے ہیں یا ان نقصان دہ جانوروں کو مارنا چاہتے ہیں تو ، آپ کو موت سے پہلے ان پر قابو پانے کی ضرورت ہوگی ، اور آپ کو دنیا سے اپنی موت سے پہلے ان کے خاتمے کے انتظامات کرنے کی ضرورت ہوگی۔ اگر آپ ایسا نہیں کرتے ہیں تو یاد رکھیں ، وہ آخر میں آپ کو کھا جائیں گے۔

باب 14 - خدا کے سامنے مطلق محتاجی کی عاجزی پیدا کرنا، غربت کو برداشت کرنا، اور دنیاداری اور مادیت پرستی سے پرہیز کرنا

لالچ اور مادہ پرستی ہمارے دور کی دو وبا ہیں، دونوں افراد اور قوموں کی سطح پر۔ روح کی یہ دو باطنی بیماریاں افراد اور قوموں کو نہ ختم ہونے والی لالچ کی طرف لے جاتی ہیں، جس سے روح کا خالی پن ہوتا ہے، اور تنازعات اور جنگیں غیر منصفانہ طور پر دوسروں کی ملکیت کو چھیننے اور اس پر قبضہ کرنے کے لیے پیدا ہوتی ہیں، باہمی دشمنیوں کو فروغ دیتی ہیں اور اس کے نتیجے میں نفرت اور محرومیاں پیدا ہوتی ہیں جو انفرادی سطح پر اندرونی امن اور سکون اور اجتماعی سطح پر قوموں اور برادریوں کے درمیان دوستی کی اجازت نہیں دیتیں۔ اس طرح کا لالچ کچھ لوگوں میں غربت اور مایوسی کو فروغ دیتا ہے جبکہ دوسرے عیش و عشرت سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ان دو کمزور انفرادی اور اجتماعی برائیوں کا علاج خدا کے حضور اپنی محتاجیت کا ادراک، فضل اور صبر کے ساتھ غربت کو برداشت کرنا اور دنیاداری اور مادیت سے پرہیز کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزی ، اپنی بہتری کے لئے صبر کے ساتھ غربت برداشت کرنا ، استقامت اور دنیاداری اور مادیت پرستی سے پرہیز کرنا عظیم باطنی خوبیاں اور روحانی صفات ہیں جو روح کی سخاوت کا باعث بنتی ہیں ، جس میں انسان کسی سے بدلے میں کچھ حاصل کیے بغیر ، کلام کے ہر معنی میں بے پناہ عطیات کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ دوسروں کے پاس جو کچھ ہے اس سے اس طرح کی غفلت اخلاص، سچائی، سخاوت، غربت یا محرومی سے بے خوفی، خدا پر توکل اور توکل، صبر اور ایمانداری کی کوشش، خاص طور پر غربت میں، لوگوں اور قوموں کے درمیان داخلی اور ظاہری امن اور دیگر بہت سی مثبت داخلی خصوصیات کا باعث بنتی ہے۔ غزالی نے اپنی *عظیم تصنیف* "*احیاء العلوم الدین*" یا "خدا کی راہ کے علم کا احیاء" کی چوتھی کتاب میں چوتھی کتاب میں اس اہم موضوع کا ایک شاندار اور بصیرت انگیز مطالعہ پیش کیا ہے جو یہاں مختصر شکل میں اس طرح پیش کیا گیا ہے:

یہ جان لینا چاہیے کہ دنیا (دنیاداری) خدا کے خلاف ہے۔ بہت سے لوگ اس کے دھوکے میں پھنس کر گمراہ ہوئے ہیں اور بہت سے لوگ اس کے دھوکے میں پھنس کر ٹھوکر کھا گئے ہیں۔ اس کی دوستی گناہوں اور برائیوں کی جڑ ہے اور اس کی مخالفت تمام نیکیوں اور نیکیوں کی اصل ہے۔ یہاں ہم دنیاداری سے دور رہنے اور اس سے پرہیز کرنے کی فضیلت کی وضاحت کریں گے کیونکہ یہ داخلی تعمیری اور لچک دینے والی صفات (*منجیات*) میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے [جو انفرادی اور اجتماعی سطح پر ایک مثبت داخلی تبدیلی لاتے ہیں]۔ دنیا و آخرت کے مسائل سے نجات

کی کوئی امید نہیں ہے جب تک کہ دل دنیا سے مکمل طور پر الگ نہ ہو جائے اور اس کی دو صورتیں ہیں: یا تو دنیا کسی سے دور رہے جسے غربت کہا جاتا ہے یا وہ اپنی مرضی سے دنیاداری سے الگ ہو جاتا ہے جسے پرہیز کہا جاتا ہے۔ ان دونوں صورتوں میں [روحانیت میں] ابدی خوشی اور دائمی فتح (سعدہ)، [دنیاوی زندگی میں] کامیابی اور نجات [آخرت میں] کے حصول میں مدد کرنے میں مختلف درجات ہیں۔ سب سے پہلے، ہم غربت [روحانی اور مادی] اور [دنیاداری] کی حقیقت، ان کی اقسام، حالات اور [الہامی] احکام کی وضاحت کریں گے۔ پہلے حصے میں ہم غریبی پر بات کریں گے اور دوسرے حصے میں پرہیز پر بات کریں گے۔

غربت یا مطلق محتاجیت کی حقیقت، مادی اور روحانی دونوں، خدا کے سامنے اور روحانی مسافر کی اندرونی حالتیں

غربت ان چیزوں کی کمی کا نام ہے جن کی ضرورت ہے۔ جن چیزوں کی ضرورت نہیں ہے ان کی کمی کو غربت نہیں کہا جاتا۔ اسی طرح اگر ضرورت کی چیزیں موجود ہوں اور ضرورت مند کا ان پر قابو ہو تو ایسے شخص کو غریب نہیں کہا جائے گا۔ اگر آپ اس نکتے کو سمجھ چکے ہیں تو آپ کو اس بات پر شک نہیں ہوگا کہ ہر وہ وجود جو خدا کے سوا ہے، غریب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ، اس کے وجود کی ضرورت ہے اور کسی بھی چیز کی موجودگی یا وجود بالکل خدا کے فضل اور مرضی پر منحصر ہے۔ اگر کوئی چیز وجود کے دائرے میں ہے اور اسے اپنے وجود کے لیے کسی اور وجود کی ضرورت نہیں ہے تو وہ بالکل امیر ہے اور ایسا صرف ایک وجود ہے جو خدا کی ہستی ہے۔ خدا کا وجود خود کفیل ہے، اس کا وجود کسی اور کسی چیز کا محتاج نہیں ہے، اس کے سوا ہر چیز اپنے وجود کے لیے اس ایک وجود کی محتاج ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے:

وَٱللَّهُ ٱلْغَنِىُّ وَأَنتُمُ ٱلْفُقَرَآءُ ۚ

"اور اللہ امیر اور بے نیاز ہے (کسی کی محتاج یا کسی چیز کا محتاج نہیں ہے، جو ہر چیز کا مالک ہے اور اس میں سے کسی کی ضرورت نہیں ہے) لیکن تم سب غریب ہو [اس کے سامنے اور ہر چیز کے لیے اس کے محتاج ہو اس حد تک کہ تمہارا اپنا وجود اسی پر منحصر ہے]۔ (سورة البقرة باب ۴۷، آیت ۳۸)

یہاں ہمارا مقصد اللہ تعالیٰ کے حضور فقر یا محتاجی کے مطلق مفہوم میں جانا نہیں ہے، بلکہ ہمارا مقصد خاص طور پر مال اور مادی اموال کی غربت کی وضاحت کرنا ہے، ورنہ اس کے بارے میں سوچنے کے لیے آنا چاہیے کہ بندے کی بے شمار ضروریات ہوتی ہیں، ان میں سے بعض ضروریات ایسی ہیں کہ وہ دولت سے پوری ہو جاتی ہیں اور خاص طور پر ان کی وضاحت کرنا یہاں ہمارا مقصد ہے۔ چنانچہ ہم کہتے ہیں کہ جس شخص کے پاس مال یا مادی مال نہیں ہے وہ اس مادے کے لحاظ سے غریب ہے جو اس کے پاس نہیں ہے لیکن اسے اس کی ضرورت ہے۔ پھر اگر ہم اس پر غور کریں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی غربت میں پانچ حالتیں ہیں:

پہلی ریاست: یہ بہترین ریاست ہے [اس میں رہنے کے لئے]۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر کوئی دولت حاصل کرتا ہے تو اس کے بارے میں برا محسوس کرتا ہے اور اس کی موجودگی سے پریشان ہوتا ہے، اسے قبول کرنے میں ہچکچاتا

ہے، اسے برا سمجھتا ہے اور اپنے آپ کو اس کی برائی سے بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس حالت کو پرہیز کہا جاتا ہے اور جس شخص میں یہ کیفیت ہو اسے پرہیز *(زاہد) کہا* جاتا ہے۔

دوسری حالت: یہ ہے کہ انسان کو دولت کی اتنی خواہش نہ ہو کہ وہ اسے حاصل کرنے پر خوش ہو اور اس سے اتنی نفرت نہ ہو کہ اسے اس کے حصول پر تکلیف ہو۔ اس کے بجائے ، اس میں اتنی ہمت ہے کہ اگر اسے مل جائے تو وہ اسے چھوڑ سکتا ہے۔ ایسی حالت کا مالک [خدا کی مرضی کے مطابق] کہا جاتا ہے۔

تیسری بات: یہ ہے کہ انسان دولت حاصل نہ کرنے پر اسے ترجیح دیتا ہے کیونکہ دل اس کی طرف کچھ جھکاؤ رکھتا ہے لیکن کیا یہ اتنا مضبوط نہیں ہے کہ اس کے لیے جدوجہد کرے۔ اس کے بجائے اگر کسی کو اسے بغیر کسی مشقت اور محنت کے مل جاتا ہے تو وہ اس سے خوش ہوتا ہے لیکن اگر اسے حاصل کرنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ اس کی تلاش میں عیش و عشرت چھوڑ دیتا ہے۔ اس طرح کی حالت رکھنے والے کو مطمئن کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اس سے مطمئن ہوتا ہے جو کسی کے ساتھ موجود ہے اور زیادہ [دولت] حاصل کرنے کے رجحان کے باوجود ، جو کچھ موجود نہیں تھا اسے حاصل کرنے کے لئے جدوجہد نہیں کی۔

چوتھی کہا: یہ ہے کہ انسان اپنی نااہلی اور کمزوری کی وجہ سے دولت نہ مانگے، ورنہ دل میں اس کی خواہش موجود ہو اور ہر اس حکمت عملی پر عمل کرے جس سے دولت حاصل ہو سکے، اگرچہ اس سے مشکلات پیدا ہوں یا وہ دولت کی تلاش میں مصروف ہو لیکن کوشش کرنے کے بعد بھی اسے حاصل نہیں ہوتا۔ اس ریاست کے مالک کو لالچی کہا جاتا ہے۔

پانچویں حالت: یہ ہے کہ انسان کو ضرورت کی وجہ سے مال اور مادی اموال کی ضرورت ہے جس سے وہ محروم ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی کے پاس بھوکا ہے لیکن اس کے پاس روٹی نہیں ہے یا جس کے پاس کپڑے نہیں ہیں۔ جس کی یہ کیفیت ہے وہ ضرورت سے مجبور کہلاتا ہے، چاہے اس کی تلاش کی خواہش کمزور ہو یا مضبوط۔ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ کوئی ضرورت کے ساتھ مجبور ہونے کی حالت میں ہو اور اس چیز کی طرف مائل نہ ہو جس کے لئے وہ مجبور ہے۔

یہ [غربت کے لحاظ سے انسانوں کی] پانچ ریاستیں ہیں۔ ان حالتوں میں سب سے اوپر پرہیز ہے اور اگر مجبوری کو پرہیز کے ساتھ جوڑ دیا جائے تو یہ انتہائی اعلیٰ کیفیت ہے۔ پھر ایک ایسی ریاست ہے جو ان پانچوں ریاستوں سے بلند ہے اور وہ وہ ریاست ہے جہاں ایک نوکر دولت اور مادی املاک کی موجودگی یا کمی کو برابر سمجھتا ہے۔ اگر کسی کو دولت ملتی ہے تو اس سے دل نہ خوش ہوتا ہے اور نہ ہی دکھی ہوتا ہے، اسی طرح اگر دولت نہ ملتی تو دل اس سے نہ تو خوش ہوتا ہے اور نہ ہی دکھی ہوتا ہے۔ اگر کسی شخص کے پاس یہ حالت ہو کہ دنیا کے تمام خزانے جمع کر کے کسی کے حوالے کر دیے جائیں تو اس سے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچتا کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ تمام خزانے [آسمانوں اور زمین] کے ہیں اگرچہ وہ اس کے قبضے میں ہیں - آج وہ اس کے پاس ہیں، کل وہ کسی اور کے پاس جائیں گے۔ لہٰذا ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے [کوئی مادی ملکیت رکھنے یا نہ ہونے کی حالت]۔ ایسے شخص کو غافل کہا جاتا ہے کیونکہ وہ مال اور مادی جائیداد رکھنے یا نہ ہونے سے غافل ہے۔ غافل اور امیر دو الفاظ ہیں جن کے مختلف معنی ہیں۔ [لفظ] دولتمند یا آسودہ اللہ پر اور اللہ کے بندوں پر جو بہت سے مال رکھتے ہیں یہ لوگ

دولت کی کثرت سے خوش ہیں کیونکہ وہ اس دولت کو اپنے پاس رکھنے کے محتاج ہیں۔ اس لحاظ سے انہیں غریب کہا جا سکتا ہے۔ لیکن جو شخص غافل ہے اسے نہ تو اس بات کی پرواہ ہے کہ مال اس کے قبضے میں آجائے اور نہ ہی اس مال کے قبضے سے نکلنے کی پرواہ کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مال رکھنے کی وجہ سے نہ تو انسان کو اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی اس سے راضی ہوتا ہے کہ وہ اسے رکھنے پر مجبور ہو اور ایسا بھی نہیں کہ اس کے پاس مال نہ ہو جس کی وجہ سے اسے رکھنے کی خواہش ہو۔ اس غافل شخص کو دولت سے غافل یا خود کفیل کہنا مناسب نہیں ہے کیونکہ غفلت کے باوجود انسان کو بہت سی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے (جیسے دولت سے غافل رہنے کے لیے اللہ کی مدد کرنا)۔

پرہیز اور غفلت: پرہیز [دنیاداری] ایک عظیم [روحانی] درجہ ہے، بلکہ اسے صالحین اور پرہیزگاروں کا اعلیٰ ترین درجہہ کہا جا سکتا ہے، جبکہ غافل [جو دولت رکھنے یا اس کے نہ ہونے کو برابر سمجھتا ہے] خدا کے مقربوں میں سے ہے۔ اس لحاظ سے پرہیزگاری غافل کے لیے نقصان دہ ہے کیونکہ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ پرہیزگاروں کے نیک اعمال خدا کے مقرب کے گناہوں کے برابر ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا سے بغض پرہیز میں پایا جاتا ہے اور یہ اس میں مشغول ہونے کے مترادف ہے، بالکل اسی طرح جیسے دنیا کا عاشق دنیا میں مشغول ہوتا ہے اور اللہ کے سوا کسی اور چیز میں مشغول ہونا ایک اور خدا کے درمیان پردہ ہے۔ آپ اور خدا کے درمیان کوئی دوری نہیں ہے تاکہ اس دوری کو "پردہ" کہا جا سکے، اس کے بجائے، وہ آپ کی اپنی رگ سے زیادہ قریب ہے۔ وہ کسی جگہ اور جگہ تک محدود نہیں ہے تاکہ آسمان اور زمین تمہارے اور اللہ کے درمیان پردہ بن جائیں۔ اس کے بجائے، آپ کی مصروفیات [اور جنون] جو خدا کے سوا کسی اور سے متعلق ہیں وہ پردہ ہیں۔ نفس اور خواہشوں میں آگاہی کرنا بھی اللہ کے سوا کسی اور کی آکش کے مترادف ہے کیونکہ تم ہمیشہ اپنی نفسوں اور خواہشوں میں مشغول رہتے ہو اس لیے تم اللہ سے پردہ کر رہے ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص اپنی نفس کی محبت میں مشغول ہے وہ خدا سے انحراف کر چکا ہے، اسی طرح اگر کوئی شخص اپنی ذات سے نفرت کرنے میں مصروف ہے تو وہ شخص بھی خدا کی طرف توجہ نہیں دیتا۔ اس کی تمثیل ایک ایسے اجتماع کی ہے جس میں عاشق اور محبوب دونوں موجود ہوتے ہیں جہاں حریف اندر آتا ہے۔ اگر عاشق کا دل محبوب کے رقیب پر مرکوز ہو جائے اور حریف کے بارے میں برا سوچنا شروع کر دے تو کہا جائے گا کہ جس حالت میں عاشق حریف سے ناراضگی میں مصروف رہتا ہے، وہ محبوب کی طرف دیکھنے کی خوشی سے محروم ہو جاتا ہے۔ اگر عاشق محبوب کی محبت میں ڈوبا ہوا ہوتا تو نہ کسی نے حریف کی طرف ذرا برابر بھی توجہ دی ہوتی اور نہ ہی حریف کی مداخلت پر کوئی توجہ دی ہوتی اور نہ ہی اپنی ناپسندیدگی کے اظہار میں کوئی وقت ضائع کرتا۔ لہٰذا جس طرح معشوق کی حضوری میں غیر محبوب کی طرف محبت سے دیکھنا یا غیر محبوب کی طرف کوئی توجہ دینا محبت میں شریک حیات (شرک) سے منسوب کرنے کے مترادف ہے اور عاشق کی غلطی ہے۔ کمال یہ ہے کہ محبت یا ناپسند میں غیر محبوب کی طرف کوئی توجہ نہ دی جائے۔ جس طرح دل میں دو محبتیں بیک وقت یکجا نہیں ہو سکتیں، اسی طرح دشمنی اور محبت کو بیک وقت یکجا نہیں کیا جا سکتا۔ جو شخص دنیا سے محبت میں مبتلا ہے وہ غفلت کی حالت میں اللہ تعالیٰ کی راہ پر گامزن ہے اور جو اس سے غافل ہے وہ خدا کے قرب کی راہ پر اس طرح چل رہا ہے جس کی توقع کی جاتی ہے کہ وہ حضوری الٰہی کی حالت حاصل کر لے گا۔

ان تفصیلات سے آپ کو معلوم ہوگا کہ [غربت کے لحاظ سے انسانوں میں] کل چھ درجات ہیں جن میں سب سے زیادہ درجے اس شخص کی ہے جو غافل ہو پھر پرہیز کرے پھر راضی ہو اور پھر راضی ہو اور آخر میں لالچی ہو۔ جہاں تک مجبور کا تعلق ہے، پرہیزگاری، رضا الٰہی اور قناعت سے راضی ہونا، ان سب کا تصور کیا جا سکتا ہے اور اس لیے مجبور شخص کی ڈگری کا دارومدار اسی پر ہے۔ لفظ غریب کا اطلاق پانچوں درجات کے لوگوں پر ہوتا ہے۔ مادی معنوں میں غافل شخص کو غریب کہنا درست نہیں ہے، لیکن اس اصطلاح کا اطلاق ایسے شخص پر کرنا درست

ہے کیونکہ اس بات سے غافل ہے کہ تمام معاملات میں عمومی طور پر اور خاص طور پر مادیت پرستی سے غفلت میں انسان خدا کا محتاج ہے۔ غافل شخص کو غریب کہنا ایسا ہی ہے جیسے کسی کو [خدا کا] بندہ کہا جائے جو خدا کے سامنے اپنی بندشی کے بارے میں یہ سمجھ رکھتا ہو، حالانکہ خادم کا لفظ عام طور پر تمام مخلوقات پر لاگو ہوتا ہے۔ تمام غفلت اور غفلت کرنے والے افراد کے مقابلے میں کسی پر مسکین کا لفظ استعمال کرنا زیادہ مناسب ہے جو خدا کے سامنے اپنی غربت اور ہر چیز کی مطلق ضرورت کا گہرا ادراک رکھتا ہے اور اس لیے وہ اس نام کا زیادہ مستحق ہے۔ لہذا، لفظ غریب دونوں معنوں میں عام ہے [مادی املاک کی کمی کے ساتھ ساتھ خدا کے لیے مطلق محتاجیت]۔

خدا کے حضور مادی اور روحانی دونوں طرح کی غربت یا مطلق محتاجیت کی فضیلت

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھا کہ لوگوں میں کون اچھا ہے تو انہوں نے فرمایا: وہ دولتمند شخص جو اپنے مال اور اپنی ذات میں اللہ کا حق ادا کرتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایسا شخص اچھا ہے لیکن جس کے بارے میں میں پوچھ رہا ہوں وہ وہ شخص نہیں ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! پھر کون سا شخص بہتر ہے؟" نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ غریب جو اپنی محنت سے خرچ کرتا ہے۔ (بیان کردہحدیث کا مجموعہ *ابو منصور الدیلمی*۔ ایک مشہور روایت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

يدخل فقراء امتى الجنة قبل اغنيائهم بخمس مائة عام

"میری قوم کے غریب لوگ امیروں سے پانچ سو سال پہلے جنت میں داخل ہو جائیں گے [جیسا کہ امیر کو ان کے مال کی الٰہی احتساب کے لیے روکا جائے گا اور انہوں نے اسے کس طرح خرچ کیا یا خرچ نہیں کیا]۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *ابوہریرہ رضی اللہ عنہ* سے حدیث *کا* مجموعہ ترمذی

اس روایت کا مطلب یہ ہے کہ جو غریب پرہیز کرتا ہے وہ دولت کی خواہش کے ساتھ امیر سے پانچ سو سال پہلے جنت میں داخل ہوگا۔ ایک روایت کے مطابق فرشتہ جبرائیل علیہ السلام نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کی اور خدا کی طرف سے یہ پیغام پہنچایا کہ اے محمد! اللہ تمہیں سلام بھیجتا ہے اور پوچھتا ہے کہ کیا تم چاہتے ہو کہ میں پہاڑوں کو سونے میں بدل دوں اور تم جہاں بھی ہو تم تمہارے ساتھ چلتے رہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سر جھکا کر فرمایا:

يَاجِبْرَئِيْلُ إِنَّ الدُّنْيَا دَارُ مَنْ لَا دَارَ لَهُ وَمَالُ مَنْ لَا مَالَ لَهُ وَلَهَا يَجْمَعُ مَنْ لَا عَقْلَ لَهُ

فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ ثَبَّتَكَ اللّٰهُ بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ

"اے جبرائیل! دنیا اس کا گھر ہے جس کے پاس گھر نہیں ہے اور وہ اس کا مال ہے جس کے پاس دولت نہیں ہے اور یہ اس شخص کے ذریعہ جمع کیا جاتا ہے جس کے پاس عقل نہیں ہے۔ جبرائیل علیہ السلام نے کہا: اے محمد! اللہ نے تمہیں پختہ کلام پر ثابت قدم رکھا ہے۔" (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے* حدیث کا مجموعہ *ترمذی* حدیث کے مجموعہ *مسند احمد میں بھی مروی ہے:*

ایک روایت میں عیسیٰ علیہ السلام اپنے سفر کے دوران ایک ایسے شخص کے پاس سے گزرے جو زمین پر سو رہا تھا۔ اس نے اسے جگایا اور کہا: اے سونے والے! اٹھو اور خدا کو یاد کرو!" اس نے جواب دیا: تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ میں نے دنیا کو دنیا کے لوگوں کے لیے چھوڑ دیا ہے!" یسوع نے کہا،" اے دوست! سو جاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی فرمائی:

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِۦٓ أَزْوَٰجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ ۚ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ

"اور اپنی آنکھیں اس بات پر نظر نہ ڈالو کہ ہم نے مختلف جماعتوں کو ان چیزوں کو فائدہ پہنچایا ہے جو ان کے لیے آزمائش کے طور پر ہیں، کیوں کہ وہ صرف دنیا کی زندگی کی رونق ہیں۔" اور تیرے رب کی طرف سے رزق بہت بہتر اور دائمی ہے (سورۃ البقرۃ باب 20، آیت 131)

غریبوں کی مخصوص اقسام کی فضیلت - متفق، متنازعہ اور سچ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

طُوبَىٰ لِمَنْ هُدِيَ إِلَى الْإِسْلَامِ وَكَانَ عَيْشُهُ كَفَافًا وَقَنَعَ بِهِ

"بشارت اس شخص کے لیے ہے جسے خدا کی مرضی کے تابع ہونے کی راہ پر گامزن کیا گیا ہو، جس کی معیشت کسی کی ضروریات کے مطابق ہو، اور وہ اس سے مطمئن ہو"۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *فضالہ بن عبید* رضی اللہ عنہ سے حدیث *کا* مجموعہ ترمذی

يَا مَعْشَرَ الْفُقَرَاءِ أَعْطُوا اللّٰهَ الرِّضٰى مِنْ قُلُوبِكُمْ تَظْفَرُوا بِثَوَابِ فَقْرِكُمْ وَإِلَّا فَلَا

"اے مسکینوں کی گروہ ! اپنے دلوں میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ متفق ہو جاؤ تاکہ تمہیں غریبی کا بدلہ ملے، ورنہ تمہیں یہ نہیں ملے گا۔ (بیان *کردہابو ہریرہ رضی اللہ عنہ* سے روایت میں احادیث *ابومنصور الدیلمی* بیان کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی: ٹوٹے ہوئے دل والوں کی طرف سے مجھے تلاش کرو۔ اس نے پوچھا: یہ کون ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ مسکین ہیں جو سچے ہیں۔

یہ پوشیدہ نہیں ہے کہ قناعت کا برعکس لالچ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: لالچ دراصل غربت ہے اور لوگوں سے مایوسی (ان سے کوئی توقع نہ رکھنا) دولت ہے۔ جو شخص لوگوں کے مال و مال سے کوئی امید نہیں رکھتا اور راضی ہو وہ ان سے غافل رہتا ہے۔ حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہر روز ایک فرشتہ

عرش کے نیچے سے پکارتا ہے: اے ابن آدم! آپ جس تھوڑا سا سے مطمئن ہیں وہ بہت سے لوگوں سے بہتر ہے جو آپ کو باغی بناتا ہے۔" حضرت ابودردہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ کوئی ایسا شخص نہیں جس کی عقل میں کوئی عیب نہ ہو۔ چنانچہ جب دنیا میں اضافہ ہوتا ہے تو اس پر انسان بے حد خوش ہوتا ہے، حالانکہ رات اور دن دونوں اپنے زمانے کے محل کو گرانے میں مصروف رہتے ہیں اور اس پر اسے کوئی پچھتاوا نہیں ہوتا۔ یہ بدبخت شخص نہیں جانتا کہ اگر کسی کی عمر کم ہو جائے تو مادی جائیدادوں میں اضافہ کرنے کا کیا فائدہ؟ کسی دانشمند سے پوچھا گیا کہ دولت کیا ہے؟ تو اس شخص نے جواب دیا کہ یہ تمہاری خواہشات اور خواہشات کو کم کرنا ہے اور صرف ضروری چیزوں سے مطمئن ہونا ہے۔

فقر اور امیر کے درمیان کیا افضل ہے اس کی حقیقت: ہم نے صبر کی بحث میں اس اصول کا ذکر کیا ہے کہ جو چیز اپنے آپ میں مقصد نہیں ہے بلکہ کسی اور چیز کے حصول کا مقصد ہے، اس کی فضیلت اور کمال کا اندازہ مقصد کی فضیلت اور کمال سے لگایا جا سکتا ہے۔ جس طرح ایک مقصد ہے، اسی طرح ہوگا جس طرح اس مقصد کے حصول کے ذرائع ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیاوی مال و مال کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے کیونکہ وہ بندے کو خدا تک پہنچنے سے روکتے ہیں۔ اسی طرح غربت بھی اپنے آپ میں مقصد نہیں ہے بلکہ اس کی تلاش اس لیے کی جاتی ہے کیونکہ یہ اس رکاوٹ کو دور کرتی ہے جو خدا تک پہنچنے سے روکتی ہے۔ لیکن بہت سے دولتمند لوگ ایسے ہیں جن کے مال و دولت نے انہیں حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اور عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کی طرح خدا سے دور نہیں کیا۔ دوسری طرف بہت سے غریب ایسے بھی ہیں جن کی غربت نے انہیں اپنے اصل مقصد (خدا کی تلاش کو) سے دور کر دیا۔ دنیا میں انسان کا اصل مقصد یہ ہے کہ بندہ خدا سے محبت کرے اور اس سے لگاؤ اور اس کی خواہش رکھتا ہو۔ یہ مقصد صرف اس وقت حاصل ہو سکتا ہے جب کوئی شخص خدا کی گنوسس (الہامی قربت، قربت اور علم) حاصل کرے اور گنوسس کے علاقے میں قدم رکھنا اور اس کو عبور کرنا [دنیاوی] مصروفیات اور الجھنوں کی موجودگی میں ممکن نہیں۔ جس طرح دولت رکاوٹ بن سکتی ہے، اسی طرح غربت بھی رکاوٹ بن سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عرفان اور الٰہی قربت کے حصول میں اصل رکاوٹ دنیا کی محبت ہے جسے الٰہی محبت کے ساتھ جوڑنا ناممکن ہے۔

جس کے دل میں کسی چیز سے محبت ہو وہ اس میں ڈوب جاتا ہے، چاہے وہ اس کی جدائی میں ڈوبا ہو یا اس کی موجودگی میں۔ پھر کچھ لوگ جدائی میں زیادہ ڈوبے ہوئے ہیں اور کچھ [اپنے پیارے شخص یا چیز کی حضور] میں ڈوبے ہوئے ہیں کیونکہ یہ سب ان کے حالات اور میلانات کے اختلافات پر منحصر ہے۔ دنیا غفلت کرنے والوں کی محبوبہ ہے [جو اپنے وجود کے اصل مقصد کے لیے زندہ نہیں ہیں]۔ جو لوگ اپنے محبوب سے علیحدگی اختیار کر چکے ہیں وہ اس کے حصول کے غور و فکر میں ڈوبے ہوئے ہیں اور جو لوگ اپنے محبوب کی قربت حاصل کر چکے ہیں وہ اس کی حفاظت میں غرق ہو جاتے ہیں اور اس سے زیادہ سے زیادہ حد تک قربت سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إِنَّ رُوحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِي رَوْعِي أَحْبِبْ مَنْ أَحْبَبْتَ فَإِنَّكَ مُفَارِقُهُ

"روح القدس (جبرائیل) نے میرے دل میں یہ بات ڈال دی ہے: جس سے بھی تم محبت کرو [یا جو کچھ بھی] تو یقینا اس سے جدا ہو جائے گا۔"

اس نبی روایت میں کہا گیا ہے کہ محبوب سے جدائی [ہمیشہ] ایک دل دہلا دینے والا اور انتہائی شدید واقعہ (تجربہ) ہے۔ اس لیے تمہیں اس شخص سے محبت کرنی چاہیے جس سے تمہیں جدا نہ ہونا پڑے گا اور وہ محبوب صرف خدا ہی ہو سکتا ہے جو تم سے کبھی جدا نہیں ہو گا اور کسی ایسی چیز سے محبت نہیں کرو جو ہر حال میں تم سے الگ ہو جائے گی اور وہ ہے دنیا۔ اگر تم دنیا سے محبت رکھتے ہو تو تم خدا سے ملنا پسند نہیں کرتے۔ اسی طرح آپ کی موت اس حالت پر ہوگی کہ آپ اسے برا سمجھتے ہیں اور موت کی وجہ سے آپ کا محبوب (دنیا، دنیاوی چیزیں، وابستگیوں، رشتوں، مال اور مال) سے آپ کا تعلق [دائمی] طور پر منقطع ہو جائے گا۔ پھر محبوب سے جدائی اس حد تک تکلیف دہ ہوتی ہے کہ دل میں اس سے لگاؤ ، تڑپ اور محبت ہوتی ہے۔ جس کے پاس دنیا ہے وہ اس سے وابستہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس شخص کے مقابلے میں جس کے پاس دنیا (دنیاوی وسائل اور وسائل) بھی نہیں ہے لیکن پھر بھی اس کی تلاش کا لالچ ہے، ایسے شخص کو دنیا سے علیحدگی پر مزید تکلیف اور اذیت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ہماری نیت کو اب تک اس تفصیلی وضاحت سے واضح کر دیا جانا چاہیے تھا کہ غربت افضل ہے اور تمام مخلوقات کے لیے زیادہ موزوں ہے سوائے دو استثناء کے: پہلی بات یہ کہ کسی کی غفلت [دنیاداری] ایسی ہے کہ دولت کی موجودگی یا عدم موجودگی دونوں ایک کے برابر ہیں۔ دوسری بات یہ کہ جب کوئی غربت میں ہو تو زندگی کے تسلسل کے لیے صرف ضروری رقم سے مدد مانگتا ہے۔ یہ بحث ہے کہ غربت اور امیر کے درمیان کیا بہتر ہے۔

غربت کی حالت میں غریب کے آداب: غریب کے کچھ باطنی اور کچھ ظاہری آداب ہوتے ہیں اور ان کا تعلق کسی کے اعمال اور لوگوں سے ملنے سے ہوتا ہے۔ ہر غریب کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان آداب پر عمل کرے۔

باطنی آداب: باطن کے آداب یہ ہیں کہ کسی کی غربت کی کیفیت کو حقیر نہ سمجھا جائے۔ دوسرے لفظوں میں خدا کے اس عمل کو برا نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ اس کا عمل کرنے والا ہے۔ نفس غریبی کو برا سمجھ سکتا ہے لیکن اس لیے نہیں کہ یہ خدا کا کام ہے۔ بلکہ بعض اوقات خدا کا شکر گزار ہوتا ہے [اس کے اچھے اثرات کے لئے جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے]۔ یہ سب سے نچلی درجے ہے اور مسکین پر اس پر عمل کرنا واجب ہے اور اس کے برعکس عمل کرنا حرام ہے کیونکہ اس سے غربت کا اجر ضائع ہوتا ہے۔

اس سے زیادہ درجہ یہ ہے کہ انسان اپنی غربت سے متفق ہے [کیونکہ یہ خدا کی مرضی ہے]۔ اس سے بھی زیادہ درجہی یہ ہے کہ انسان غربت کا طالب ہے اور اس سے خوش ہے کیونکہ وہ مال کی آفتوں اور نقصانات سے واقف ہے، اللہ تعالیٰ پر مکمل توکل رکھتا ہے، اس کا یہ یقین ہے کہ اسے یقینا رزق ملے گا، نہ تو اپنی ضروریات سے زیادہ تلاش کرتا ہے اور نہ ہی مطلوبہ رقم سے زیادہ حاصل کرنا پسند کرتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ غربت کے ذریعے سزا اور جزا دونوں دیتا ہے۔ اگر اجر الٰہی کا مقصد کسی کے لیے ہو تو اس کا اشارہ یہ ہے کہ اس کے پاس اخلاق اچھے ہیں، اخلاق و اخلاق اور باطنی مزاج ہے، وہ خدا کی اطاعت رکھتا ہے، اپنی حالت (دوسروں کے لیے) غربت کی شکایت نہیں کرتا، بلکہ وہ اپنے غریب ہونے پر خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔ اگر کسی شخص کو غربت کی سزا دی جا رہی ہے تو اس کا اشارہ یہ ہے کہ وہ بد مزاج اور بد مزاج ہو جاتا ہے، اپنے رب کی اطاعت کو ترک کر دیتا ہے اور اس کی نافرمانی کرنا شروع کر دیتا ہے، اپنی حالت پر شکایت کرتا ہے، خدا کے فیصلے سے ناراضگی اور ناپسندیدگی کا اظہار کرتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر غریب اچھا نہیں ہوتا، بلکہ صرف وہی غریب قابل تعریف ہے جو اپنی غربت سے ناراض نہ ہو، بلکہ اس کے فوائد سے خوش اور مطمئن ہو۔ ایک مشہور قول ہے کہ جب کسی بندے کو کوئی چیز عطا کی جاتی ہے تو اس سے کہا جاتا ہے کہ وہ اسے تین چیزوں کے ساتھ قبول کرے: عیش و عشرت، پریشانی اور بے چینی اور قیامت کے دن اللہ تعالی۔

ظاہری آداب: ظاہری آداب جن پر ایک غریب کو عمل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، ان میں کسی کے سامنے اپنے محتاج کا ہاتھ نہ بڑھانا، ظاہری شکل و صورت کو اتنا اچھا رکھنا شامل ہے کہ لوگ کسی کو محتاج نہ سمجھیں، نہ کسی سے کسی کی حالت کی شکایت کریں اور نہ ہی اپنی غربت کو ظاہر کریں، بلکہ اسے زیادہ سے زیادہ خفیہ رکھیں اور یہ بھی چھپائیں کہ وہ اپنی غربت کو خفیہ رکھ رہا ہے۔ اعمال میں آداب یہ ہے کہ غریب کو امیر کے سامنے اس کی دولت کی وجہ سے عاجزی کا اظہار نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس کے سامنے باوقار رہنا چاہیے۔ کم از کم ، ایک غریب کو امیروں کے ساتھ نہیں بیٹھنا چاہئے اور نہ ہی وہ چاہتے ہیں کہ وہ ایک کے ساتھ بیٹھیں کیونکہ یہ وہی چیزیں ہیں جو لالچ اور لالچ کو جنم دیتی ہیں۔

دنیاداری سے پرہیز کی وضاحت

پرہیز کی حقیقت: یہ بات واضح رہے کہ روحانی مسافروں اور خدا کے متلاشیوں کے مراکز میں سے پرہیز (مادیت اور دنیاداری سے) ایک اہم مقام ہے۔ یہ اسٹیشن، دوسرے اسٹیشنوں کی طرح، علم، [وجود] کی [باطنی] حالت، اور اعمال پر مشتمل ہے۔ ریاست سے مراد وہ حالت ہے جسے پرہیز کہا جاتا ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ کسی شخص میں کسی چیز (دنیاوی یا مادیت پسندی) کے لیے جھکاؤ باقی نہ رہتا اور وہ (میلانا) کسی ایسی چیز کے لیے پیدا ہوتا ہے جو اس سے بہتر ہو۔ جس چیز کی طرف جھکاؤ ختم ہو چکا ہے اسے پرہیز کہا جاتا ہے اور جس چیز کی اب وہ خواہش کرتا ہے اور جس کی طرف جھکاؤ رکھتا ہے اس حالت کو محبت کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پرہیز کو دو چیزوں کی ضرورت ہے - ایک چیز جس سے انحراف کرنے کی ضرورت ہے ، اور دوسری چیز جس کی طرف مائل ہونے کی ضرورت ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ جس چیز کی طرف کوئی جھکاؤ رکھتا ہے وہ سونے اور چاندی کی طرف مائل ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے نہ کہ پتھر اور اینٹوں جیسی چیز۔ یہ بھی ضروری ہے کہ دوسری چیز پہلی سے بہتر ہو تاکہ اس کی طرف جھکاؤ غالب آجائے۔ جو دنیا کو آخرت کے بدلے بیچتا ہے وہ دنیا سے پرہیز کرتا ہے اور جو آخرت کو دنیا کے لیے بیچتا ہے وہ آخرت سے پرہیز کرتا ہے تاہم ، یہ رواج ہے کہ لفظ پرہیز صرف اس شخص کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے جو دنیا سے پرہیز کرتا ہے۔ جب یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ پرہیز محبوب چیز کو چھوڑنا ہے تو خود بخود یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ جو شخص محبوب کو چھوڑ دیتا ہے وہ اس سے بھی زیادہ کچھ حاصل کرتا ہے، ورنہ اس سے بھی زیادہ محبوب کو حاصل کیے بغیر کسی محبوب کو چھوڑ دینا کیسے ممکن ہے؟

پرہیز کے مختلف درجے: جو شخص اللہ کے سوا ہر چیز سے اس حد تک الگ ہو جاتا ہے کہ جنت کا لالچ بھی نہیں ہوتا، وہ وہی ہے جو صرف خدا سے محبت کرتا ہے۔ ایسے شخص کو "مطلق پرہیز" کہا جائے گا (*زاہد مطلق*)۔ جو شخص ہر دنیاوی لذت سے دور رہتا ہے لیکن آخرت کی لذتوں کی طرف مائل ہوتا ہے جیسے آسمانی بیوی، زمین، نہر، پھل وغیرہ کی طرف مائل ہوتا ہے، ایسا شخص بھی پرہیز کرتا ہے لیکن اس کا درجہ پہلے سے کم ہوتا ہے۔ جو شخص دنیا کی کچھ لذتوں کو ترک کر دیتا ہے اور دوسروں کو نہیں چھوڑتا، مثال کے طور پر اس میں دولت کا لالچ نہیں ہے بلکہ شہرت کا لالچ ہے، وہ بہت کچھ نہیں کھاتا بلکہ اپنے آپ کو زیادہ خوبصورت بناتا ہے، ایسا شخص

"مطلق پرہیزگار" کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ پرہیز کرنے والوں میں ایسے شخص کی درجہی توبہ کرنے والے میں سے کسی شخص کی ڈگری کی طرح ہے جو کسی گناہوں سے توبہ کرتا ہے لیکن دوسروں سے نہیں۔ اس قسم کی پرہیز بھی درست ہے جس طرح بعض گناہوں سے توبہ کرنا درست ہے کیونکہ توبہ کا مطلب حرام چیزوں کو ترک کرنا ہے اور پرہیز سے مراد ان جائز چیزوں کو ترک کرنا ہے جو نچلے نفس کو راحت اور لذت فراہم کرتی ہیں۔ جس طرح یہ سمجھ سے بالاتر نہیں ہے کہ کوئی کچھ حرام چیزوں کو چھوڑ دے، اسی طرح عقل کے خلاف بھی یہ نہیں ہے کہ وہ بعض جائز چیزوں کو چھوڑ دے۔ البتہ جو شخص صرف حرام چیزوں کو ترک کرنے پر غور کرے گا اسے پرہیز نہیں کہا جائے گا کیونکہ اس لفظ کا تعلق خاص طور پر حلال چیزوں سے ہے۔ [لہذا،] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اصطلاح کے اعتبار سے پرہیز کا مطلب یہ ہے کہ دنیا سے اپنی خواہش (خواہش) کو دور کر کے آخرت کی طرف مائل کیا جائے یا خدا کے سوا کسی اور سے اپنا رشتہ توڑ کر خدا کے ساتھ تعلق قائم کر دیا جائے۔ یہ ایک بہت ہی اعلی ڈگری ہے۔

ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ پرہیز کرنے والے کی طرف سے ترک کی گئی چیز سے مطلوبہ چیز بہتر ہونی چاہیے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ جس چیز کو وہ ترک کر دے، اس پر اس کا اختیار (طاقت، قابلیت یا دائرہ اختیار) ہو کیونکہ کسی چیز پر اس کا کوئی اختیار نہیں ہے، اسے ترک کرنے کا کوئی مطلب نہیں ہے اور خواہش کا زوال صرف اس وقت ہوتا ہے جب کوئی کسی چیز کو ترک کر دیتا ہے۔ چنانچہ جب کسی نے ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کو پرہیز کا نام دے کر مخاطب کیا تو اس نے جواب دیا: پرہیز کرنے والا عمر بن عبد العزیز (ایک نیک خلیفہ ہے جو ایک وسیع سلطنت پر بے پناہ سیاسی طاقت اور اختیار کے باوجود اپنی تقویٰ اور پرہیز کے لیے مشہور تھا) جس کے سامنے دنیا ہاتھ باندھ کر سامنے آئی۔ لیکن اس نے اپنا چہرہ بھی اس کی طرف نہیں موڑا۔ میں نے کیا پرہیز کیا ہے؟"

علم کے معنی: [جیسا کہ پہلے بحث کی گئی ہے، پرہیز علم، باطنی کیفیت اور اعمال پر مشتمل ہے۔] علم جو اس کا ثمر ہے وہ یہ ہے کہ پرہیز کرنے والا اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ جس چیز کو ترک کیا جا رہا ہے وہ اس چیز کے مقابلے میں معمولی ہے جس کی خواہش کی جا رہی ہے۔ جو شخص جانتا ہے کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ ابدی ہے اور آخرت بہتر اور پائیدار ہے، دوسرے لفظوں میں اس کی لذتیں اپنے آپ میں اچھی ہیں اور ابدی ہیں، بالکل اسی طرح جیسے قیمتی جواہرات برف کے خوبصورت ٹکڑوں سے اچھے اور زیادہ پائیدار ہیں اور برف کے ٹکڑوں کے مالک کو ان کو زیور کے عوض بیچنے میں کوئی مشکل نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر برف کے مالک کو جواہرات کے بدلے برف کے ٹکڑے دینے کی پیش کش کی جاتی ہے تو ، کوئی خوشی سے اس پر راضی ہوجائے گا۔ یہ دنیا اور آخرت کی مثال ہے دنیا اس برف کی مانند ہے جو سورج کی روشنی میں رکھی جاتی ہے اور آہستہ آہستہ پگھل رہی ہے اور مکمل طور پر معدوم ہونے کے قریب ہے اور آخرت اس جوہر کی مانند ہے جس کا کوئی معدوم نہیں ہے۔ دنیا اور آخرت کے درمیان اس فرق کی حد تک اس حد تک اس میں دائمی اور ابدی (آخرت) کی خواہش ہوتی ہے۔ پرہیز کے بارے میں صرف اتنا ہی علم درکار ہے، دوسرے لفظوں میں یہ جاننا کافی ہے کہ آخرت بہتر اور دائمی ہے۔ بعض اوقات وہ لوگ بھی اس حقیقت سے واقف ہوتے ہیں جو اپنے علم کی کمزوری اور یقین کی وجہ سے یا خواہشات کے غلبے کی وجہ سے یا شیطان کے محکوم ہونے کی وجہ سے یا اس کے جھوٹے وعدوں سے دھوکہ کھا جانے کی وجہ سے دنیاداری کو اس وقت تک ترک کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے جب تک کہ موت ان کو (دنیا اور اس کی زندگی سے) چھین نہ لے۔ پھر ان کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں بچتا کہ وہ پچھتاوا کریں اور جو کچھ انہوں نے کھو دیا ہے اس پر ماتم کریں۔

عمل کا مفہوم: اب اس عمل کی وضاحت کی جائے گی جو پرہیز کی حالت میں کی جاتی ہے۔ اس عمل کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ایک چیز کو پیچھے چھوڑ دیا جائے اور دوسری چیز کو اپنایا جائے جو پیچھے رہ جانے والی چیز سے بہتر ہو۔ پرہیز کا تقاضا ہے کہ جس چیز سے کوئی پرہیز کر رہا ہے اسے مکمل طور پر ترک کر دیا جائے اور جس چیز سے پرہیز کرنا چاہیے وہ دنیا ہے جس میں اس کے تمام ذرائع اور اشارے شامل ہیں۔ پرہیز کرنے والے کو چاہیے کہ وہ دنیا کی محبت کو اپنے دل سے نکال کر اس کی جگہ اطاعت الٰہی کی محبت میں داخل کرے۔ پھر جس چیز کو دل سے نکال دیا جائے اسے آنکھوں، ہاتھوں اور باقی ماندہ تمام اعضاء سے نکال دیا جائے اور ان اعضاء کو اطاعت الٰہی میں استقامت اور استقامت کے لیے استعمال کیا جائے۔ صرف دنیا کی محبت کو [دل سے] نکالنا کافی نہیں ہے، اس کے بجائے اطاعت الٰہی بھی ضروری ہے۔

پرہیز کی عمدگی

اللہ تعالیٰ نے مختلف مواقع پر پرہیز کی تعریف کی ہے اور اپنے بندوں (انسانوں) کو اس پر آمادہ کیا ہے۔ اس نے کہا:

وَقَالَ ٱلَّذِينَ أُوتُوا۟ ٱلْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ ٱللَّهِ خَيْرٌ لِّمَنْ ءَامَنَ

"اور وہ لوگ جو عقل اور عقل سے مالا مال تھے کہنے لگے: تم پر ہائے افسوس! اللہ کی طرف سے اجر اس شخص کے لیے بہتر ہے جو ایمان لائے ہو۔ (سورۃ البقرۃ البقرۃ آیت 80)

اس آیت میں پرہیز کو علماء (سچے علم اور گہری فہم والے) سے منسوب کیا گیا ہے اور پرہیز کو علم کی صفت (صفت اور باطنی صفت) سے منسوب کیا گیا ہے۔ یہ ایک اعلی تعریف ہے۔ ایک اور جگہ آپ نے فرمایا:

أُو۟لَـٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُم مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوا۟

"ان لوگوں کو صبر کے بدلے میں دوگنا اجر ملے گا۔" (سورۃ البقرۃ البقرۃ آیت 54)

قرآنی تفسیر کے علماء نے وضاحت کی ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پرہیز پر صبر کیا [اور اس وجہ سے دوگنا ثواب کے مستحق ہو گئے]۔ ایک جگہ آپ نے فرمایا:

إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى ٱلْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا

"ہم نے زمین کی چیزوں کو اس کی زینت و آرائش کا سبب بنایا ہے تاکہ لوگوں کو آزمایا جائے کہ اس میں کون اچھا کام کرتا ہے۔" (سورۃ البقرۃ آیت 18، آیت 7)

تفسیر قرآنی کے بعض علماء نے اس کی تشریح اس شخص کی طرف اشارہ کی ہے جو دنیا میں زیادہ پرہیز کرتا ہے پھر اس سے پرہیز کو "نیک عمل" قرار دیا گیا ہے۔ ایک اور موقع پر انہوں نے کہا:

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِۦٓ أَزْوَٰجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ ۚ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ

"اور اپنی آنکھیں اس بات پر نظر نہ ڈالو کہ ہم نے مختلف جماعتوں کو ان چیزوں کو فائدہ پہنچایا ہے جو ان کے لیے آزمائش کے طور پر ہیں، کیوں کہ وہ صرف دنیا کی زندگی کی رونق ہیں۔" اور تیرے رب کی طرف سے رزق بہت بہتر اور دائمی ہے۔ (سورۃ البقرۃ باب 20، آیت 131)

ٱلَّذِينَ يَسْتَحِبُّونَ ٱلْحَيَوٰةَ ٱلدُّنْيَا عَلَى ٱلْءَاخِرَةِ

"یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے آخرت پر دنیا کی زندگی کو ترجیح دی۔" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 3)

اس آیت میں کافروں کے کردار کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن وہ ہے جس کی صفت اس کے برعکس ہو، دنیا کے مقابلے میں آخرت سے محبت کرتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

وَمَنْ اَصْبَحَ وَهَمُّهُ الدُّنْيَا شَتَّتَ اللّٰهُ عَلَيْهِ اَمْرَهُ وَفَرَّقَ عَلَيْهِ ضَيْعَتَهُ وَجَعَلَ فَقْرَهُ بَيْنَ عَيْنَيْهِ وَلَمْ يَاْتِهِ مِنَ الدُّنْيَا اِلَّا مَا كُتِبَ لَهُ وَمَنْ اَصْبَحَ وَهَمُّهُ الْاٰخِرَةُ جَمَعَ اللّٰهُ لَهُ هَمَّهُ وَحَفِظَ عَلَيْهِ ضَيْعَتَهُ وَجَعَلَ غِنَاهُ فِي قَلْبِهِ وَاَتَتْهُ الدُّنْيَا وَهِيَ رَاغِمَةٌ

"جو شخص صبح اٹھتا ہے اور دنیا کی پریشانیوں میں غرق ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایسے شخص کے معاملات کو منتشر کر دیتا ہے تاکہ وہ اب سب کچھ سنبھالنے کے قابل نہ ہو اور ان کے بارے میں پریشانیوں اور پریشانیوں میں ڈوب جائے، اور اس کے معاشی معاملات مشکل ہو جائیں اور اس کی محتاجی اور غربت کو سامنے لاتے ہیں۔ اور کسی کو صرف اتنا ہی ملتا ہے جو دنیا سے ایک کے لئے مقدر ہے۔ اور جو شخص آخرت کے تأمل میں غرق ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس شخص کی ہمت کو اکٹھا کرتا ہے (ہمت اور عزم سے متاثر کرتا ہے) اور اپنی معیشت (معاشی معاملات) کی حفاظت کرتا ہے اور اس کے دل میں امیر (اعتماد اور کفایت) ڈال دیتا ہے اور دنیا ایسے ذلیل ہو جاتی ہے۔ (بیان کردہحدیث کا مجموعہ *ابن ماجہ زید بن ثابت* رضی اللہ عنہ سے

اِذَا رَاَيْتُمُ الْعَبْدَ وَقَدْ اُعْطِيَ صَمْتًا وَزُهْدًا فِي الدُّنْيَا فَاقْتَرِبُوا مِنْهُ فَاِنَّهُ يُلَقَّى الْحِكْمَةَ

"جب تم کسی ایسے بندے کو دیکھو جسے خاموشی اختیار کی گئی ہو (جو خاموش رہتا ہے اور زیادہ بکواس نہیں کرتا اور نہ ہی زیادہ باتیں کرتا ہے) اور اسے دنیا میں پرہیز کا فضل کیا گیا ہو تو اس کے قریب ہو جاؤ کیونکہ ایسے شخص کو حکمت سے تعلیم دی جا رہی ہے۔ (بیان کردہ*ابن خلاد* رضی اللہ عنہ سے حدیث *کا* مجموعہ ابن ماجہ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَن يُؤْتَ ٱلْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِىَ خَيْرًا كَثِيرًا

"جس کو حکمت عطا کی گئی ہے، اس نے بہت بڑی نیکی حاصل کی ہے۔" (سورۃ البقرۃ باب 2، آیت 269)

چنانچہ ایک مشہور کہاوت ہے کہ جو شخص چالیس سال تک دنیا میں پرہیز کرتا ہے تو خدا اپنے دل سے حکمت کے چشمے نکلتا ہے اور وہی حکمت کی باتیں اس کی زبان سے نکلتی ہیں۔ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: یا رسول اللہ! کون سا شخص بہتر ہے؟" اس نے جواب دیا:

كُلُّ مُؤْمِنٍ مَخْمُومُ الْقَلْبِ صَدُوقُ اللِّسَانِ

"ہر وہ مومن جو پاک دل ہے اور دل سے پاک ہے اور وہ کسی سے بغض و عداوت اور بغض نہیں رکھتا اور زبان کا سچا ہو (صرف سچ بولتا ہے)۔

ہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! 'دل کا پاکیزہ' کس کا ذکر کیا جا رہا ہے؟ آپ نے فرمایا: وہ پرہیزگار، صاف دل انسان جس میں کوئی بے ایمانی، غداری، دھوکہ دہی، جھوٹ، تدلی، سرکشی اور حسد نہیں ہے۔ ہم نے پوچھا: اس سے بہتر شخص کون ہے؟ اس نے جواب دیا:

اَلَّذِيْ يَشْنَأُ الدُّنْيَا وَيُحِبُّ الْآخِرَةَ

"وہ شخص جو دنیاداری کو ناپسند کرتا ہے اور آخرت سے محبت کرتا ہے (بے شک وہ پرہیزگار ہے)۔ (بیان کردہسہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے حدیث کا مجموعہ *ابن ماجہ*

ایک اور روایت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إِنْ أَرَدْتَ أَنْ يُحِبَّكَ اللّٰهُ فَازْهَدْ فِي الدُّنْيَا

"اگر تم چاہتے ہو کہ خدا تم سے محبت کرے تو تمہیں دنیا میں پرہیز کرنا چاہیے۔" (بیان کردہسہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے حدیث کا مجموعہ *ابن ماجہ*

اس نبوت میں پرہیز کو خدا کی محبت کا سبب قرار دیا گیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ خدا کے چاہنے والوں کے لیے (اور جن سے خدا محبت کرتا ہے) ان کے لیے اعلیٰ درجے ہیں کیونکہ پرہیز [خدا کی راہ میں] اعلیٰ ترین مقاموں میں سے ایک مقام ہے۔ ایک اور روایت میں انہوں نے کہا:

مَنْ آثَرَ الدُّنْيَا عَلَى الْآخِرَةِ ابْتَلَاهُ اللهُ بِثَلَاثٍ هَمًّا لَا يُفَارِقُ قَلْبَهُ أَبَدًا وَفَقْرًا لَا يَسْتَغْنِي أَبَدًا وَحِرْصًا لَا يَشْبَعُ أَبَدًا

"جو شخص دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتا ہے، اللہ تعالیٰ اس شخص کو تین چیزوں سے دوچار کرتا ہے: ایسا غم جو کبھی دل سے الگ نہیں ہوتا، ایسی غربت جو کبھی دولت میں تبدیل نہیں ہوتی، اور ایسی حرص جو کبھی مطمئن نہیں ہوتی"۔ (بیان کردہحضرت *عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ* سے *حدیث کا* مجموعہ طبرانی

ایک اور روایت میں انہوں نے کہا، "ایک نوکر کا ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ گمنامی کسی کے لیے شہرت سے زیادہ محبوب نہ ہو جائے، اور چیزوں کی کمی چیزوں کی کثرت سے زیادہ محبوب نہ ہو جائے"۔ (بیان کردہحدیث کا مجموعہ *مسند الفردوس* حضرت *علی بن طلحہ* رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ اختیار عطا فرمایا کہ اگر میں چاہوں تو مکہ میں کی پوری وادی بیتحا کو سونے میں تبدیل کر دیا جائے۔ میں نے خدا سے التجا کی، اے اللہ! میں ایک دن بھوکا رہنا چاہتا ہوں اور دوسرے دن ، اپنا پیٹ بھر کر کھانا چاہتا ہوں۔ جس دن میں بھوکا رہوں گا ، میں تیرے سامنے روؤں گا اور التجا کروں گا ، اور جس دن میں اپنا پیٹ بھر کھاؤں گا ، میں تیرا شکر ادا کروں گا اور اس کی تعریف کروں گا۔" حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کہیں جا رہے تھے اور فرشتہ جبرائیل ان کے ساتھ تھے۔ جب وہ کوہ صفا کے پاس پہنچے تو اس نے کہا: اے جبرائیل! میں اس ہستی کی قسم کھاتا ہوں جس نے تمہیں سچائی کے ساتھ بھیجا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شام اس حالت میں شروع ہوئی ہے کہ ان کے پاس مٹھی بھر جو یا گندم کا آٹا بھی نہیں ہے۔ اس نے بمشکل یہ کہا کہ آسمان کے پار سے ایک زور دار گرج سنائی دی جس سے وہ خوفزدہ ہوگیا۔ اس نے جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا، "یہ آواز کیا ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ نے قیامت کی آمد کا حکم دیا ہے؟ جبرائیل علیہ السلام نے جواب دیا، "نہیں، یہ *اسرافیل* ہی ہے جو تمہاری باتوں کو سن کر نیچے آ گیا ہے۔" *اسرافیل* نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور فرمایا: جو تم نے کہا وہ خدا نے سنا ہے اور اس نے مجھے زمین کی کنجیاں لے کر تمہارے پاس بھیجا ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ اگر تم چاہو تو میں *تہامہ* کے پہاڑوں کو زمرد میں تبدیل کر دوں گا۔ بیرل ، سونا اور چاندی جو آپ جہاں بھی جائیں گے۔ اور اگر تم چاہو تو نبی بادشاہ بن سکتے ہو (جیسے نبی داؤد اور سلیمان علیہ السلام) یا اگر تم چاہو تو نبی غلام رہ سکتے ہو۔ جبرائیل علیہ السلام نے نبی کو خدا کی خاطر عاجزی کا مظاہرہ کرنے کا اشارہ کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات تین مرتبہ فرمائی: میں خدا کے نبی اور غلام کی حیثیت سے رہنا چاہتا ہوں (اللہ کے نزدیک سب سے بڑا مقام اور عزت خدا کے بندے کا ہے جو اللہ کے ساتھ قربت اور قربت کی اعلیٰ ترین حالت ہے)۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید فرمایا:

إِذَا أَرَادَ اللهُ بِعَبْدٍ خَيْرًا زَهَّدَهُ فِي الدُّنْيَا وَرَغَّبَهُ فِي الْآخِرَةِ وَبَصَّرَهُ بِعُيُوبِ نَفْسِهِ

"جب اللہ تعالیٰ کسی کے لیے بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو وہ انسان کو دنیا میں پرہیز کرتا ہے اور آخرت کی طرف مائل ہوتا ہے اور اپنے نفس کے عیبوں سے آگاہ کرتا ہے۔ (بیان کردہحدیث کا مجموعہ *مسند الفردوس*)

اِزْهَدْ فِي الدُّنْيَا يُحِبَّكَ اللهُ وَازْهَدْ فِيمَا أَيْدِي النَّاسِ يُحِبَّكَ النَّاسُ

"دنیا میں پرہیز کرو، اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا اور لوگوں کے پاس جو کچھ ہے اس سے پرہیز کرے گا، لوگ تم سے محبت کریں گے (یعنی دنیا سے دل کی لاتعلقی الٰہی محبت کے حصول کا باعث بنتی ہے، اور لوگوں کے پاس جو کچھ ہے اس سے دل کی لاتعلقی اور ان سے کوئی توقع نہ رکھنے کی وجہ سے وہ تم سے محبت کرتے ہیں)۔

ضروریات زندگی میں پرہیز کی تفصیلات: یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ جن چیزوں میں لوگ مشغول ہوتے ہیں وہ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ان میں سے کچھ بیکار ہیں اور کچھ توہم پرست ہیں [اس کے علاوہ دیگر ضروری یا اہم ہیں]۔ اہم چیزوں میں کھانا اور پینا شامل ہے۔ جہاں تک بیکار کا تعلق ہے، ہم ان کی تفصیلات فراہم نہیں کر سکتے کیونکہ وہ بے شمار ہیں، تاہم ضروری چیزوں کو آسانی سے شمار کیا جا سکتا ہے۔ ضروری چیزوں کی مقدار، اقسام اور اوقات میں، بیکار کو شامل کرنا ممکن ہے۔ لہٰذا یہاں پرہیز کے طریقہ کار کی وضاحت کی جا رہی ہے۔ زندگی میں جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ چھ ہیں: کھانا، کپڑے، رہائش، خاندانی زندگی کے ذرائع، خاندان اور دولت۔

پہلی ضرورت - خوراک: پہلی ضرورت خوراک ہے۔ کسی کو صرف اتنی ہی خوراک کی ضرورت ہوتی ہے جو کسی کی جسمانی طاقت اور توانائی کو برقرار رکھ سکے۔ پرہیز کا تقاضا ہے کہ وہ اس کی لمبائی اور چوڑائی کو کم کرے۔ لمبائی کسی کی عمر کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جس شخص کے پاس ایک دن کا کھانا ہوتا ہے وہ اس سے مطمئن نہیں ہوتا، اس کے بجائے وہ زیادہ کا لالچی ہوتا ہے۔ چوڑائی کا تعلق کھانے کی مقدار ، قسم اور وقت سے ہے۔ لمبی زندگی کی امید کو کم کرکے [ذخیرہ اندوزی کی مدت] کی لمبائی کو کم کیا جا سکتا ہے۔ کھانے میں کم سے کم پرہیز یہ ہے کہ بھوک کو کم کرنے کے لئے ضروری مقدار پر مطمئن کیا جائے جب یہ محسوس ہوتا ہے اور بیمار ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ جو شخص اس حالت میں ہے وہ دن کے وقت جو کھانا کھاتا ہے اس میں سے رات کے لئے کچھ بھی نہیں رکھے گا۔ یہ [کھانے میں پرہیز] کی ایک بہت ہی اعلی ڈگری ہے۔ دوسری ڈگری یہ ہے کہ ایک ماہ یا چالیس دن تک کھانا جمع کرتا ہے۔ تیسری ڈگری ایک سال تک خوراک جمع کرنا ہے اور یہ کمزور ترین قسم کے پرہیز کرنے والے لوگوں کی حالت ہے۔ جو ایک سال سے بھی زیادہ ذخیرہ کرتا ہے، اسے کسی بھی ڈگری میں پرہیز نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی ایک سال سے زیادہ زندہ رہنے کی توقع رکھتا ہے ، جو لمبی زندگی کی امیدیں رکھتا ہے [جو روحانی بیماریوں میں سے ایک ہے جو لوگوں کو ذخیرہ اندوزی ، چوری ، غبن اور جمع کرنے پر آمادہ کرتی ہے ، اکثر دوسروں کی قیمت پر] اور لمبی امیدوں کا مالک پرہیز نہیں کرسکتا ہے۔ لیکن اگر کسی کے پاس آمدنی کا باقاعدہ ذریعہ نہ ہو اور وہ لوگوں سے پیسے لینے پر آمادہ نہ ہو تو ایک سال سے زیادہ دولت کو ذخیرہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن وہ لوگ جو خدا پر توکل کی شرط رکھتے ہیں اور پرہیز کو ٹھیک نہیں سمجھتے۔

دوسری ضرورت - کپڑے: انسان کی دوسری ضرورت لباس ہے اور لباس میں سب سے کم درجہ یہ ہے کہ ایسا لباس ہو جو سردی اور گرمی سے بچائے اور جسم کو ڈھانپے۔ بعض سنتوں نے فرمایا ہے کہ لباس ایسا ہونا چاہیے کہ وہ عام لوگ پہنیں (سادہ کپڑے) اور ایسے کپڑے نہ پہنیں جس سے آپ مشہور ہو جائیں یا لوگ آپ کی طرف دیکھیں۔ ابو سلیمان دارانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کپڑے تین قسمیں ہیں: ایک وہ لباس ہے جو صرف اللہ کی خاطر ہے اور وہ لباس ہے جو جسم کو قانونی طور پر ڈھانپتا ہے۔ دوسرا وہ لباس ہے جو اس کی نرمی کے لئے پہنا جاتا ہے۔ اور تیسرا لباس ہے جس کا مقصد بیرونی خوبصورتی اور آرائش ہے۔ ایک گنوسٹک نے کہا، "جس کے کپڑے پتلے ہیں، اس کا خدا تک پہنچنے کا راستہ بھی پتلا ہے (وہ سراسر کپڑے پہننے کی وجہ سے مذہبیت اور روحانیت سے محروم ہے)"۔

تیسری ضرورت - رہائش: خلاصہ کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ جو شخص ضرورت کے لیے [رہائش] تلاش کرتا ہے اسے ضرورت کی حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔ دنیا کی وہ تمام چیزیں جو ضرورت کی حدود میں ہیں، خدا کی راہ کے اوزار ہیں اور اس کے لیے وسیلہ ہیں، اور جو چیزیں ضروریات سے تجاوز کرتی ہیں وہ خدا کی راہ کے خلاف ہیں۔ اس اصول کو سامنے رکھتے ہوئے رہائش کا مقصد یہ ہے کہ کوئی شخص گرمی، سردی اور بارش سے محفوظ رہے، لوگوں کی نظروں سے دور رہے، اور ان کے نقصان سے محفوظ رہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے جس حد تک گھر کی ضرورت ہے، اس سے بڑھ کر جو چیز ہے وہ بیکار ہے، اور تمام فضول چیزیں دنیاداری کے حکم میں ہیں، اور جو بیکار چیزوں کا متلاشی ہے یا ان کے لیے جدوجہد کرتا ہے وہ پرہیز سے بہت دور ہے۔

چوتھی ضرورت - گھریلو اشیاء: اس میں پرہیز کے بہت سے درجات ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اعلیٰ ترین حالت یہ ہے کہ ان کے پاس صرف ایک کنگھی اور ایک پیالہ تھا۔ ایک بار جب کسی شخص کو اپنی انگلیوں سے اپنی داڑھی کو کنگھی کرتے ہوئے دیکھا تو اس نے اپنی کنگھی پھینک دی۔ دوسری بار جب اس نے اسے دیکھا تو وہ اپنے ننگے ہاتھوں سے ندی کا پانی پی رہا تھا [ان سے ایک پیالہ بناتے ہوئے]۔ یسوع نے پیالہ پھینک دیا کیونکہ اس نے سوچا کہ اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ گھریلو ضروریات سے متعلق تمام سامان کی ایسی حالت ہے۔ جس مقصد کی تلاش کی جا رہی ہے اس کے لیے ہر چیز کی ضرورت ہے۔ اگر کسی چیز سے کوئی مقصد وابستہ نہیں ہے اور اس کے بغیر کسی کی ضروریات پوری کی جا سکتی ہیں تو یہ دنیا اور آخرت دونوں میں انسان کے لیے مشکل کا باعث ہے۔ جس چیز کی بالکل ضرورت ہے، اس کی کم درجے پر مطمئن ہونا چاہیے جو یہ دیکھنا ہے کہ آیا یہ مقصد کے لیے کافی ہے یا نہیں۔ اس میں ایک اعلی ڈگری یہ ہے کہ ہر کام کے لئے ایک الگ ٹول ہونا چاہئے ، لیکن آلہ عام معیار کا ہے۔ اگر ایک ہی چیز کے لیے متعدد اوزار موجود ہوں یا وہ اعلیٰ معیار کے ہوں تو پھر کسی کو پرہیز کی تمام اقسام سے خارج کر دیا جائے گا اور اسے بیکار کاموں میں ملوث سمجھا جائے گا۔

پانچویں ضرورت – خاندان اور شادی: حقیقت یہ ہے کہ بعض حالات میں نکاح نہ کرنا افضل ہوتا ہے جیسا کہ غزالی کی *کتاب "احیاء العلوم الدین"* یا "خدا کی راہ کے علم کا احیاء" کی دوسری جلد میں بیان کیا گیا ہے۔ اس صورت میں نکاح نہ کرنا پرہیز ہے۔ لیکن جب خواہش غالب ہو جاتی ہے اور شادی کے بغیر اس کا ازالہ نہیں کیا جا سکتا تو نکاح واجب ہے۔ اس معاملے میں ، شادی نہ کرنا پرہیز نہیں ہے۔ لیکن اگر نکاح نہ کرنے میں کوئی حرج نہ ہو اور نکاح کی وجہ سے کسی پر کوئی مصیبت نہ آ نہ جائے اور شادی اس لیے نہ ہو کہ دل شریک حیات کی طرف مائل ہو جائے گا، شریک حیات سے دل کا لگاؤ ہو جائے گا اور دل اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل ہو جائے تو اس صورت حال میں نکاح نہ کرنا پرہیز ہے۔ اگر کسی کے پاس یہ یقین ہے کہ شریک حیات اللہ تعالیٰ کی یاد سے غفلت نہیں کرے گا لیکن پھر بھی رفاقت اور جماع سے بچنے کے لیے نکاح نہیں کرے گا تو یقینا یہ پرہیز نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اولاد نہ صرف نسل انسانی کے تسلسل اور نبوت کے پیروکاروں کی تعداد میں اضافے کا مقصد ہے بلکہ یہ ایک عبادت کا عمل ہے اور جماع میں جو لذت حاصل ہوتی ہے وہ نقصان دہ نہیں ہے، بشرطیکہ لذت واحد مقصد نہ ہو [کیونکہ اس کے دوسرے مقاصد گناہوں سے دور رہنا اور عصمت کی حفاظت کرنا شامل ہے، حیا اور روحانیت ، عبادت الٰہی کے لئے طاقت تلاش کرنا ، گناہ کی چیزوں کو دیکھنے سے نگاہوں کو کم کرنا ، اور خاندان کی خدمت کرکے خدا کی راہ پر چلنا]۔ یہ اس شخص کی طرح ہے جو کھانا پینا چھوڑ دیتا ہے کیونکہ کھانے پینے میں مزہ آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ پرہیز نہیں ہے کیونکہ یہ انسانی جسم کو ضائع کرتا ہے (نقصان پہنچاتا ہے) بالکل اسی طرح جیسے شادی نہ کرنے سے نسل انسانی کو ضائع کیا جاتا ہے [کیونکہ اگر لوگ شادی کرنا چھوڑ دیں تو انسانی نسل کا خاتمہ ہو جائے گا]۔ لہٰذا جماع کی لذت سے بچنے کے لیے نکاح نہ کرنا جائز نہیں ہے۔ جنید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں یہ پسند کرتا ہوں کہ ایک مبتدی روحانی مسافر کے صورت میں اپنے دل کو تین چیزوں میں نہ ڈالے ورنہ اس کی حالت بدل

جائے گی: ایک پیشے میں؛ دوسرا، پیغمبری روایات کی تلاش میں [کیونکہ یہ علم تاریخی طور پر وقار اور شہرت کا ذریعہ رہا ہے]؛ شادی میں تیسرا"۔

چھٹی ضرورت - دولت اور شہرت: یہ دونوں چیزیں مذکورہ بالا تمام پانچ ضروریات کو پورا کرنے کا ذریعہ ہیں۔ شہرت کا مطلب ہے لوگوں کے دلوں پر قبضہ کرنا، دوسرے لفظوں میں، لوگوں کے دلوں میں اپنے لیے جگہ بنانا تاکہ وہ اپنے اعمال اور مقاصد میں مدد کر سکیں۔ شہرت یا لوگوں کے دلوں میں جگہ بنانے کی ضرورت یا تو فوائد حاصل کرنے یا نقصانات کو دور کرنے یا کسی کے ظلم سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ہے۔ جہاں تک فوائد حاصل کرنے کا تعلق ہے تو اگر کسی کے پاس دولت ہے تو اس مقصد کے لیے شہرت کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ اپنی تمام ضروریات کو پورا کرنے کے لیے لوگوں کی خدمات حاصل کرنے کے لیے ادائیگی کر سکتا ہے، چاہے وہ کسی کا احترام کرے یا نہ کرے، وہ پیسہ کمانے کے لیے خدمت فراہم کرے گا۔ نقصانات کو دور کرنے کے معاملے کے بارے میں ، دوسرے لفظوں میں ، اپنے آپ کو متوقع نقصانات سے بچانے کے لئے محتاج ہونا ، ایک ایسے ملک میں ضرورت ہے جہاں انصاف کی پابندی نہیں ہے ، یا کسی پڑوسیوں سے گھرا ہوا ہے جو کسی کے ساتھ ظلم کرتے ہیں۔ شہرت کی تلاش کرنے والا تباہی کی راہ پر گامزن ہے۔ یہ پرہیز کرنے والوں کا طریقہ ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں جگہ بنانے کی کوشش نہ کریں۔ عبادت میں مسلسل مصروفیت اور خدا کی راہ پر چلنے سے ہی لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول ہوگی اور ان کے دلوں میں عزت اور وقار پیدا ہوگا اور وہ لوگوں کے نقصانات اور ظلم سے محفوظ رہے گا اور تمام مذاہب کے لوگوں میں محبت اور احترام کے جذبات پیدا ہوں گے۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دولت اور شہرت کی ایک مقدار کی ضرورت ممنوع نہیں ہے بلکہ اس کے بجائے ضرورت سے زیادہ دولت اور شہرت مہلک زہر ہیں۔ ان دونوں چیزوں کا فائدہ اسی وقت ہوتا ہے جب وہ ضرورت کی حد سے تجاوز نہ کریں۔ جو شخص خدا کی طرف جانے کا راستہ پاک رکھتا ہے اور شکوک و شبہات سے پرہیز کرتا ہے، نفس کی نفسیات پر عمل کرتا ہے اور اسے ضروریات کی حدود میں محدود رکھتا ہے، وہ احتیاط اور تدبر کی راہ پر گامزن ہے اور یقینا نجات کے لیے مقرر کردہ گروہ میں شامل ہے۔

باب 15 - انسانوں کو درپیش ہر معاملے پر خدا کی وحدت، قادر مطلق اور مطلق قدرت کا ادراک کرنا اور خدا پر توکل پیدا کرنا

یہ جانتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ قادر مطلق، غالب ہے، حاضر ہے، جاننے والا، دیکھنے والا، سننے والا، محبت کرنے والا، رحم کرنے والا، سب کی دیکھ بھال کرنے والا، محیط ہے اور ساتھ ہی ساتھ مظلوموں، کمزوروں، ذلیل شدوں اور مظلوموں کی طرف سے مناسب سزا اور انصاف کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ اس سے ہمیں بے پناہ اعتماد اور خود اعتمادی ملتی ہے کہ ہم بالآخر اچھے ہاتھوں میں ہیں، خدا کی حفاظت اور گھیرے میں ہیں، اس سے قطع نظر کہ ہم کس ظاہری صورتحال میں ہیں، اگرچہ یہ مایوسی، مایوس کن اور حوصلہ شکنی محسوس ہو سکتی ہے، اور آخر میں، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا اور خدا کی رحمت کی وجہ سے چیزیں بہتر ہو جائیں گی، پرووڈنس اور فیاضی۔ اس خود اعتمادی اور اعتماد کو اس احساس سے مزید تقویت ملتی ہے کہ غلط کام کرنے والوں اور ظالموں کی ظاہری طاقت محض ایک پٹا ہے جسے خدا نے یہ جانچنے کے لئے بڑھایا ہے کہ وہ کس طرح برتاؤ کرتے ہیں اور آخر کار ، ان کے اعمال کا الزام لگایا جائے گا۔ جو لوگ اپنے ہاتھوں سے تکلیف اٹھاتے ہیں ان کو خدا کی طرف سے عزت اور طاقت دی جائے گی، اگر اس زندگی میں نہیں تو اس زندگی کے بعد شروع ہونے والی زندگی میں جہاں خدا کا کنٹرول اور طاقت، جو پہلے ان کی روحانی اندھے پن کی وجہ سے دنیاوی زندگی میں بہت سے لوگوں کے لیے واضح نہیں تھی، ان تمام لوگوں کو واضح طور پر دیکھا جاتا ہے جو پہلے خدا کی مخلوقات پر ظلم اور زیادتیوں کا ارتکاب کرنے کی ہمت کرتے تھے۔ اس اندرونی اندھے پن کی وجہ سے بظاہر استثنیٰ کے ساتھ۔

اس خدائی وحدت اور طاقت پر یقین اور یقین عاجزی لاتا ہے، جو انسانوں کے ساتھ برتاؤ میں ایک نرم صفت ہے، اس کے علاوہ لوگوں اور قوموں کے درمیان تعلقات کو خراب کرنے والے تکبر کو ختم کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس کے نتیجے میں یہ باہمی احترام، باہمی حقوق اور ذمہ داریوں کو تسلیم کرنے اور مشترکہ بھلائی کے لیے امن اور ہم آہنگی کے ساتھ کام کرنے کی تحریک کو فروغ دیتا ہے۔ انفرادی سطح پر، یہ کسی کو مایوسی، افسردگی، غم، پست حوصلے سے باہر نکالتا ہے، اور رکاوٹوں اور چیلنجوں کے باوجود اپنی بہترین صلاحیتوں کو آگے بڑھانے کے لیے زندگی کے بارے میں مثبت نقطہ نظر اور استقامت سے متاثر کرتا ہے۔ یہ اپنی حدود کو بھی ظاہر کرتا ہے اور ان تمام معاملات کے حتمی نتائج کے لئے خدا پر بھروسہ اور بھروسہ رکھتا ہے جو وہ اپنی زندگی اور بڑے پیمانے پر معاشرے میں حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ خدا پر توکل مصیبتوں کے سامنے عزم کو سخت کرتا ہے، صبر کے ساتھ اور غموں اور مایوسیوں کو روکتا ہے جب چیزیں ہماری مرضی کے مطابق نہیں چلتی ہیں، کیونکہ تمام معاملات کا حتمی انجام صرف خدا کے پاس ہوتا ہے جو تمام معاملات کا حتمی اختیار اور تصرف کرنے والا ہے۔ غزالی نے اپنی عظیم

تصنیف "*احیاء العلوم الدین*" یا "خدا کی راہ کی معرفت کا احیاء" کی پانچویں کتاب میں اس اہم موضوع پر شاندار اور بصیرت افروز کا مطالعہ مختصر شکل میں اس طرح پیش کیا ہے:

واضح رہے کہ توکل اللہ تعالیٰ کی راہ میں منزلوں میں سے منزل ہے اور یقین رکھنے والوں کے مقام میں سے ایک مقام ہے۔ بلکہ، یہ الٰہی گنوسس (*معارفہ* یا قربت اور قرب و قربت) کے لوگوں کے اعلیٰ درجات سے ایک اعلیٰ درجے ہے۔ خدا پر توکل علم کے لحاظ سے گہرا اور وسیع ہے اور عمل کے لحاظ سے انتہائی مشکل ہے۔ اس کی فہم کے لحاظ سے مادی ذرائع پر زور دینا اور ان پر اعتماد کرنا توحید اور *توحید* میں خدا کے ساتھ شرک سے منسوب کرنے کے مترادف ہے۔ اس سے مکمل طور پر غفلت برتانا نبوت کے طریقے اور شریعت الٰہی پر تنقید کرنے کے مترادف ہے۔ یہ ناقابل فہم ہے کہ کسی کو ذرائع پر اعتماد ہونے کے ساتھ ساتھ ان کو نظر انداز کرنے کے ساتھ ساتھ [ایک ہی وقت] (خدا پر بھروسہ تمام ممکنہ مادی ذرائع کو استعمال کرنے اور اس کے لیے منصوبہ بندی کرنے کے ساتھ ساتھ چلتا ہے، لیکن ان کے ثمرات کے لیے خدا پر اعتماد اور بھروسہ رکھنا)۔

خدا پر توکل کے مفہوم کو سمجھنا کہ وہ توحید الٰہی کے تقاضوں کے مطابق ہو اور عقل اور قانون الٰہی کے خلاف نہ ہو، بہت مشکل اور لطیف ہے۔ اس کی لطافت اور پوشیدگی کی وجہ سے ہی اس کی حقیقت سے صرف وہی لوگ آگاہ ہو سکتے ہیں جن کو علم سے نوازا گیا ہو اور جن کی آنکھوں میں حق کا نور ہو۔ دوسروں میں ان معاملات کی حقیقتوں کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ حقیقتیں سچے علماء پر ظاہر ہوتی ہیں [جو صوفیانہ روحانی بصیرت رکھتے ہیں] اور وہ ان کی وضاحت خدا کے دوسرے بندوں کو کرتے ہیں۔ اس باب میں، ہم سب سے پہلے خدا پر توکل کی فضیلت کو ایک تعارف کے طور پر بیان کریں گے، اور پھر ہم وحدت الٰہی [اور خدا پر توکل پیدا کرنے کے لیے اس کے مضمرات] کی وضاحت کریں گے۔

اللہ تعالیٰ پر توکل کی فضیلت

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَعَلَى ٱللَّهِ فَتَوَكَّلُوٓاْ إِن كُنتُم مُّؤۡمِنِينَ

"اور اللہ پر بھروسہ کرو اگر تم ایمان دار ہو۔" (سورۃ البقرۃ باب 5، آیت 23)

وَمَن يَتَوَكَّلۡ عَلَى ٱللَّهِ فَهُوَ حَسۡبُهُۥٓۚ

"جو شخص اللہ پر توکل کرے گا اللہ ہی اس کے لیے کافی ہے۔" (سورۃ البقرۃ باب 65، آیت 3)

إِنَّ ٱللَّهَ يُحِبُّ ٱلْمُتَوَكِّلِينَ

"بیشک اللہ توکل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔" (سورۃ البقرۃ سورۃ 3 آیت 159)

اس مقام کی عظمت کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے کہ جو شخص حاصل کرتا ہے وہ خدا کی محبت حاصل کرتا ہے اور خدا اس کا نگہبان بن جاتا ہے! کیونکہ جس شخص کو اللہ کافی ہے، جسے اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے اور اس کی حفاظت کرتا ہے، وہ بہت کامیاب انسان ہے کیونکہ ایسے محبوب کو عذاب نہیں ملے گا اور نہ ہی اللہ سے دور اور پردہ نہیں پڑے گا۔ جو شخص اللہ کے سوا کسی اور سے کفایت چاہتا ہے وہ وہی ہے جس نے اللہ پر توکل چھوڑ دیا ہے۔ ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَن يَتَوَكَّلْ عَلَى ٱللَّهِ فَإِنَّ ٱللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ

"اور جس نے اللہ پر توکل کیا تو بے شک اللہ غالب حکمت والا ہے۔" (سورۃ البقرۃ آیت ۸، آیت ۴۹)

دوسرے لفظوں میں، وہ اتنا غالب ہے کہ جو اس کی حفاظت میں آتا ہے، وہ ایسے شخص کو ذلیل نہیں ہونے دیتا، جو اس کی عدالت میں وکالت کرتا ہے، وہ کسی کی درخواست کو مسترد نہیں کرتا، اور جو اس کی حکمت عملی پر بھروسہ کرتا ہے وہ اس سے مایوس نہیں ہوتا۔ خدا کے سوا سب کچھ محکوم ہے۔ سب بندے اسی پر محتاج ہیں اور اسی کے سامنے محتاج ہیں، بالکل اسی طرح جیسے تم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان پر بھروسہ کیسے کیا جا سکتا ہے؟ ایک آیت میں ارشاد ہے:

إِنَّ ٱلَّذِينَ تَعْبُدُونَ مِن دُونِ ٱللَّهِ لَا يَمْلِكُونَ لَكُمْ رِزْقًا فَٱبْتَغُوا۟ عِندَ ٱللَّهِ ٱلرِّزْقَ وَٱعْبُدُوهُ

"جن لوگوں کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو وہ تمہیں روزی فراہم کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ پس اسی سے اپنا رزق مانگو اور اسی کی عبادت کرو۔ (سورۃ البقرۃ البقرۃ القرآن آیت 17)

وَلِلَّهِ خَزَآئِنُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ وَلَٰكِنَّ ٱلْمُنَٰفِقِينَ لَا يَفْقَهُونَ

"اور آسمانوں اور زمین کے سب خزانے اللہ ہی کے لیے ہیں لیکن منافق نہیں جانتے۔" (سورۃ البقرۃ باب 63، آیت 7)

قرآن مجید میں وحدانیت کے بارے میں جو تشریح کی گئی ہے اس میں تنبیہ کی گئی ہے کہ اللہ کے سوا کسی اور پر بھروسہ نہ کیا جائے اور صرف ایک اور ناقابل تسخیر (جو ہر چیز کو زیر کرتا ہے) (خدا) پر بھروسہ کیا جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو خدا کا ہے، اللہ تعالیٰ اس شخص کو ہر قسم کے دکھ اور مصائب سے بچاتا ہے اور اس جگہ سے رزق فراہم کرتا ہے جس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اور جو دنیا سے تعلق رکھتا ہے ، خدا ایسا دنیا کے حوالے کرتا ہے [جو انسان کو پریشان ، افسردہ اور بے چین رکھتا ہے جب تک کہ وہ مر نہ جائے]۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث کا مجموعہ *طبرانی صغیر* عمران بن الحسین رضی اللہ عنہ پر

"جو شخص سب سے زیادہ امیر بننا چاہتا ہے اسے خدا پر اس سے زیادہ بھروسہ کرنا چاہیے جو سامنے ہے"۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث میں عبداللہ بن عباس *رضی اللہ عنہ سے* حکیم *اور بیہقی* کا مجموعہ بیان کیا گیا ہے

اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی: وہ بندہ جو مخلوقات کے بجائے میری رسی کو تھامے ہوئے ہے، میں اسے آسمان و زمین کے فریب سے نجات دلاتا ہوں۔ حضرت ابراہیم بن ادہم رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے ایک راہب سے پوچھا کہ تم کہاں کھاتے ہو؟ اس نے جواب دیا: یہ میرا سر درد نہیں ہے، میرے رب سے پوچھو کہ وہ مجھے کہاں سے کھانا کھلاتا ہے؟ ایک گنوسٹک نے کہا ، "جب میں نے خدا کو اپنا نگہبان بنایا (*وکیل*) ، تو مجھے ہر اچھائی کا راستہ مل گیا"۔

خدا پر توکل کی ابتدا کی حقیقت جو الٰہی وحدانیت ہے: یہ معلوم ہونا چاہیے کہ خدا پر توکل ایمان کے دروازوں میں سے ہے جو علم، [روحانی] حالت اور عمل پر مشتمل ہے۔ اسی طرح خدا پر توکل ان تین چیزوں سے حاصل ہوتا ہے: علم جو اصل ہے، عمل جو پھل (نتیجہ) ہے، اور حالت جو خدا پر توکل کا مقصد ہے۔

علم: علم اصل چیز ہے اور اسے ایمان کہا جاتا ہے کیونکہ ایمان کا مطلب یقین ہے اور دل کی ہر تصدیق کو علم کہا جاتا ہے اور اگر یہ علم مضبوط ہو جائے تو اسے یقین (*یقان*) کہا جاتا ہے۔ یقین کی بہت سی قسمیں ہیں لیکن یہاں ہم صرف اس قسم کا ذکر کریں گے جس پر توکل خدا پر منحصر ہے اور اس قسم کو توحید الٰہی اور *توحید* کہا جاتا ہے جس سے مراد یہ ہے:

لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ

"اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔"

اس بیان میں خدا کی وحدانیت کا اقرار ہے اور اس قسم میں خدا کی قدرت کا یقین ہے۔ اس گواہی سے وہ ایمان جو خدا پر توکل کی بنیاد ہے وہ مکمل ہو جاتا ہے۔ ایمان کی تکمیل کا مفہوم یہ ہے کہ یہ بیان انسان کے دل کی ایک لازمی صفت ہے جو پھر غالب صفت بن جائے گی [زندگی کے تمام معاملات میں خدا پر اس توکل کو پیدا کرنے سے، ان کے خیالات، احساسات، قول و فعل میں جو ان سے نکلتے ہیں]۔ جہاں تک وحدت الٰہی اور وحدانیت کا تعلق ہے تو یہ اصل اصول ہے۔

الٰہی توحید کے چار درجے ہیں: توحید اور توحید کے چار درجات ہیں: پہلا درجہ دانے کا ہے، دوسرا درجہ دانے کا ہے، تیسرا درجہ اندرونی جلد کا اور چوتھا درجہ بیرونی خول کا۔ ہم اخروٹ کی مثال سے اس کی وضاحت کریں گے۔ اس کی دو کھالیں ہوتی ہیں پھر گٹھلی ہوتی ہے اور دانے کے اندر تیل ہوتا ہے جسے کرنل کا دانا کہا جا سکتا ہے۔ الٰہی وحدانیت کا پہلا درجہ یہ ہے کہ بندہ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ اپنی زبان سے کہتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں لیکن اس کا دل اس سے غافل ہے جیسے منافقین کی وحدانیت کی گواہی ہے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ اس قول کا مفہوم معلوم کیا جائے جیسا کہ عام مسلمان کرتے ہیں۔ یہ عام لوگوں کی الہی وحدانیت اور ان کا ایمان ہے۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ حق کی روشنی سے اس کا مفہوم بے نقاب ہو جاتا ہے تاکہ اس کا مشاہدہ کیا جا سکے۔ یہ ان لوگوں کا [روحانی] مقام ہے جنہوں نے خدا سے قربت حاصل کی ہے (*مقربین* یا گنوسٹک یا خدا کے دوست اور مقرب) اس نقاب کشائی کا مفہوم یہ ہے کہ انسان بہت سی چیزوں کو دیکھتا ہے اور ان کا علم

حاصل کرتا ہے لیکن ہر چیز کے منبع اور ماخذ کو ہستی یکتا، ناقابل تسلم، قادر مطلق (خدا) سمجھتا ہے۔ چوتھا درجہ یہ ہے کہ کوئی شخص صرف اس ایک ہستی (خدا) کے وجود کو دیکھتا ہے [روح کی اندرونی آنکھ سے]، ہر چیز میں صرف اس کا وجود دیکھتا ہے۔ یہ ان لوگوں کی الٰہی وحدانیت ہے جنہوں نے خدا کا قرب حاصل کیا ہے۔ *صوفی* اس کو "فنا فی التوحید" *کہتے* ہیں، دوسرے لفظوں میں یہ لوگ اپنے نفس اور دیگر تمام مخلوقات کو خدا کی ہستی کے سامنے معدوم اور فنا سمجھتے ہیں۔ پہلا شخص صرف زبان سے وحدت اور وحدت پر یقین رکھنے والا ہے۔ دوسرا وہ شخص ہے جو اپنے دل کے لحاظ سے الٰہی وحدت اور وحدانیت کا یقین رکھتا ہے اور اس اثبات کے بیان کا مفہوم معلوم کرتا ہے، لیکن دل میں جو عقائد ہیں وہ اس کے خلاف ہیں، وہ ان کی تردید نہیں کرتا۔ الٰہی وحدانیت کا یہ عقیدہ دل پر ایک گرہ ہے جو دل کی روشنی اور توسیع کی اجازت نہیں دیتا۔ تیسرا درجہ، وہ شخص ہے جو توحید الٰہی اور وحدانیت پر ایمان لاتا ہے جو صرف ایک ہی عمل کرنے والا کا گواہ ہوتا ہے، دوسرے لفظوں میں یہ حقیقت کا معاملہ کسی پر واضح ہو جاتا ہے اور وہ صرف ایک ہی کام کرنے والے کو دیکھنا شروع کر دیتا ہے اور وہ تمام معاملات کی حقیقت کو دیکھنا شروع کر دیتا ہے [جس طرح حکمت کے دروازے اور روشنی کے نئے راستے کھل جاتے ہیں]۔ چوتھا درجہ اس شخص کا ہے جو صرف ایک ہستی کا گواہ ہے، اللہ کے سوا کوئی وجود نہیں دیکھتا، وہ دنیا کی چیزوں کو کثرت اور کثرت کے ذریعے نہیں دیکھتا بلکہ انہیں وحدت کی شکل سے دیکھتا ہے۔ یہ توحید الٰہی اور توحید کا اعلیٰ ترین درجہ ہے۔

یہ الٰہی وحدانیت اور توحید میں مومنوں کے چار درجات اور [روحانی] مقام ہیں۔ جہاں تک چوتھے (اعلیٰ ترین) درجے کا تعلق ہے تو یہ بیرونی علوم (خارجی علم یا *علم معملہ*) کے دائرہ کار سے باہر ہے [بلکہ علم *مکاشفہ* یا علم نقاب کشائی کے دائرے میں داخل ہوتا ہے]، اس لیے اسے یہاں بحث کا موضوع بنانا بیکار ہے [کیونکہ اس کتاب کا مقصد یہ نہیں ہے] اور خدا پر توکل کرنا (*توکل*) اس پر مبنی نہیں ہے، بلکہ خدا پر توکل کی کیفیت تیسری قسم کی وحدت اور توحید سے حاصل ہوتی ہے۔ پہلی قسم منافقت ہے، دوسری قسم محض یقین ہے، اب صرف تیسری قسم باقی رہ گئی ہے، کیونکہ خدا پر توکل اسی پر قائم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا پر توکل کے لیے صرف دل کی تشخیص کافی نہیں ہے، اس کے بجائے روحانی نقاب کشائی اور *شہادت* بھی ضروری ہے۔

توحید الٰہی اور وحدانیت کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ یہ بات آپ پر ظاہر ہو جاتی ہے کہ خدا کے سوا کوئی کرنے والا نہیں اور تخلیق، رزق، عطیہ، روکنے، زندگی، موت، دولت، غربت وغیرہ جیسی چیزیں جن کا کوئی نام دیا جا سکتا ہے، ان کا خالق اور پیدا کرنے والا صرف خدا ہے اور اللہ کے سوا کوئی اور نہیں۔ جب تم پر یہ بات ظاہر ہو جائے گی تو تم اللہ کے سوا کسی اور کی طرف نہیں دیکھو گے اللہ ہی سے ڈرو گے تمہیں اللہ ہی کی طرف سے امید ہو گی اور اللہ ہی پر توکل کرو گے اور اللہ ہی پر بھروسہ کرو گے اور وہی پیدا کرنے والا ہے اور وہی موجد کرنے والا ہے اس کے سوا تمام وجودیں مغلوب اور محکوم ہیں اور وہ آسمانوں اور زمین کی سلطنتوں میں سے ایک معمولی ذرہ بھی اپنے خالق کی مرضی کے خلاف منتقل کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ جب کسی کے لیے روحانی نقاب کشائی کے دروازے کھلتے ہیں، تو وہ [روحانی] گواہی کے ساتھ اور بھی واضح ہو جاتے ہیں۔

دل کے مالک کے ساتھ قلم کی گفتگو

اب ہم توکل اللہ (توکل) کی وضاحت کے لیے قلم کی مثال پیش کریں گے۔ ایک روحانی مسافر (*سالک*) جس کا دل خدا کے نور سے منور تھا، اس نے ایک کاغذ دیکھا جو پہلے سفید تھا لیکن بعد میں [اس پر تحریروں کی وجہ سے] سیاہ ہو گیا۔ اس نے اخبار سے پوچھا کہ تمہارا چہرہ سیاہ کیوں ہو گیا؟ اس نے جواب دیا کہ آپ کا یہ سوال انصاف پر مبنی نہیں ہے۔ میں نے اپنا چہرہ خود سیاہ نہیں کیا۔ سیاہی سے پوچھیں۔ یہ سیاہی کے برتن میں رہتا تھا جو اس کا ٹھکانہ تھا۔ پھر سیاہی نے اپنے ملک کو چھوڑ دیا اور میرے چہرے کو اپنی منزل بنا لیا اور ظلم اور طاقت کے ساتھ مجھ پر آباد ہونے لگی۔ روحانی مسافر نے کہا، "تم سچ کہہ رہے ہو"۔ اس کے بعد اس نے سیاہی سے پوچھا ، "آپ

نے کاغذ کو سیاہ کیوں کیا؟" اس نے کہا، "تم نے میرے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ میں سیاہی کے برتن میں سکون کے ساتھ بیٹھا تھا اور اس سے باہر نکلنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ قلم نے اپنے شیطانی لالچ کی وجہ سے مجھ پر ظلم کیا اور مجھے اپنا ملک (گھر یا ٹھکانہ) چھوڑنے پر مجبور کیا، مجھے بے گھر کر دیا، میرا اتحاد بکھیر دیا اور مجھے اس سفید میدان (کاغذ) میں بکھیر دیا اور مجھے تباہ کر دیا۔ اس لیے آپ کو میرے بجائے قلم سے پوچھنا چاہیے۔
روحانی مسافر نے کہا کہ تم سچ کہہ رہے ہو، پھر قلم سے اس کے ظلم کے بارے میں پوچھا اور پوچھا، "تم نے سیاہی کو اس کے ملک سے نکال کر اس کے پیاروں سے کیوں الگ کیا؟" اس نے جواب دیا، "آپ کو ہاتھ اور انگلیوں سے پوچھنا چاہیے۔ میں صرف سبز سرکنڈہ (ڈنٹھل) کی شکل میں ندی نالوں کے پاس کھڑا تھا۔ ایک شخص چاقو لے کر میرے پاس آیا ، میری کھال اتار دی ، مجھے میرے کپڑوں سے پھاڑ دیا ، مجھے جڑ سے نکال کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ پھر اس نے ایک ٹکڑا لیا ، اسے تراش دیا ، اس کا سر کاٹ دیا [اسے تنگ کرنے کے لئے] ، پھر مجھے کڑوی اور سیاہ سیاہی میں ڈبو دیا۔ وہ مجھ سے خدمات لیتا ہے اور مجھے اپنے سر پر چلنے پر مجبور کرتا ہے۔ میرا پورا جسم پہلے ہی اس کے ہاتھ سے زخمی ہے۔ اب آپ میرے زخموں پر اپنے سوالات کا نمک چھڑک رہے ہیں تاکہ اس سے بھی زیادہ سوزش پیدا ہو۔ اسی لیے مجھ سے دور رہو اور اس شخص سے یہ سوال پوچھو جس نے مجھے بغیر پاؤں اور ہاتھوں کے بنایا ہے۔ روحانی مسافر نے قلم کی سچائی کا بھی پتہ لگایا پھر ہاتھ سے پوچھا، "تم قلم کو اپنی خواہشات کے لیے استعمال کرنے کی خواہش کو نظر انداز کرکے اس پر اتنا ظلم کیوں کرتے ہو؟" ہینڈ نے جواب دیا، "میں صرف گوشت، ہڈیوں اور خون کا مجموعہ ہوں۔ کیا تم نے گوشت کا کوئی ٹکڑا دیکھا ہے جو ظلم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، یا ایک ایسا جسم جو خود ہی حرکت کرتا ہے؟ میں صرف ایک سواری کا پہاڑ ہوں جس پر ایک سوار سوار ہے۔ اس سوار کو قابلیت (*قدرہ) کہا* جاتا ہے۔ وہ سوار مجھے ادھر ادھر گھومتا ہے اور مجھے زمین کے مختلف حصوں میں گھومنے پر مجبور کرتا ہے۔ کیا آپ دیکھتے ہیں کہ درخت اور چٹانیں اس وقت تک اپنی جگہ سے خود نہیں ہوتیں جب تک کہ کوئی انہیں منتقل نہ کرے؟ میرا ہاتھ اور مردہ لوگوں کے ہاتھ اپنی شکل اور شکل میں ایک جیسے نظر آتے ہیں۔ پھر کیا بات ہے کہ مردہ لوگوں کے ہاتھ قلم نہیں اٹھاتے بلکہ میرا ہاتھ اسے اٹھاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قلم سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ آپ کو یہ سوال قابلیت کے لئے پوچھنا چاہئے۔ میں صرف ایک سوار سوار ہوں جسے ایک سوار اپنے کوڑے کی طاقت سے حرکت کرنے پر مجبور کرتا ہے۔"

روحانی مسافر ہاتھ سے جواب پر یقین کرتا ہے اور قابلیت سے پوچھتا ہے ، "آپ کو ہاتھ استعمال کرنے کا کیا حق ہے؟ آپ اسے اپنے مقاصد کے لئے کیوں استعمال کرتے ہیں اور آپ اسے حرکت دینے پر مجبور کیوں کرتے ہیں؟" ایبلٹی نے جواب دیا ، "مجھے الزام نہ دیں۔ اکثر اوقات ، الزام لگانے والا شخص خود مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے اور جس پر الزام لگایا جاتا ہے وہ بے گناہ ثابت ہوتا ہے۔ تم پر میری حالت ظاہر نہیں کی گئی۔ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ میں نے ہاتھ پر سوار ہو کر کچھ غلط کیا ہے؟ میں اس کی حرکت سے پہلے ہی اس پر سوار تھا لیکن میں خاموشی سے سو رہا تھا۔ میری خاموشی اور نیند کی حالت ایسی تھی کہ لوگ مجھے مردہ یا معدوم سمجھتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں ، میں نہ تو خود فعال تھا اور نہ ہی میں نے کچھ اور حرکت دی یہاں تک کہ ایک قاصد (اکسانے والا) آیا اور مجھے حرکت میں لا اور مجھے وہ کام کرنے پر مجبور کیا جس کے لئے آپ مجھے ملامت کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ میرے اندر اتنی طاقت نہیں تھی کہ میں اس کے حکم کی نافرمانی کروں۔ میں اس کی خواہش کے مطابق کام کرنے پر مجبور تھا۔ اس قاصد کا نام ارادہ ہے۔ میں اسے صرف اس کے نام اور اس کے عمل سے جانتا ہوں کہ ایک دن اس نے مجھ پر حملہ کیا اور مجھے میری گہری نیند سے جگایا اور مجھے ہاتھ حرکت دینے پر مجبور کیا۔ مجھے اس کے حکم کے مطابق کام کرنے کے سوا کوئی راستہ نہیں ملا۔

روحانی مسافر نے کہا، "تم سچ کہہ رہے ہو"۔ اس کے بعد اس نے ارادے سے پوچھا، "آپ کو کیا ہوا تھا کہ آپ نے پرسکون اور مطمئن صلاحیت [جو سوئی ہوئی تھی] کو بگاڑ دیا اور اسے حرکت پر مجبور کیا تاکہ اس کے پاس آپ کے حکم کی تعمیل کرنے کے سوا کوئی راستہ نہ ہو؟" ارادہ نے جواب دیا، "مجھ پر الزام لگانے میں اتنی جلدی نہ کرو۔ یہ ممکن ہے کہ مجھے ایسا کرنے پر مجبور کیا گیا ہو اور آپ بغیر کسی وجہ کے مجھ پر الزام لگا رہے ہوں۔ میں خود ہی نہیں اٹھا ، لیکن مجھے اٹھنے کے لئے مجبور کیا گیا تھا۔ میں خود ہی نہیں بیدار ہوا ، بلکہ ، مجھے ایک بے پناہ اور ناقابل تلافی طاقت نے بیدار کیا ہے ، ورنہ ، میں بہت پرسکون تھا اور اپنی جگہ پر رہ رہا تھا۔ دل کی صحن سے عقل کی زبان سے علم کا ایک قاصد میرے پاس آیا اور مجھے حکم دیا کہ میں اس قابلیت کو جگاتا ہوں۔ لہٰذا ، مجبوری میں ، میں نے صلاحیت کو بیدار کیا۔ میں علم و عقل سے مغلوب اور محکوم ہوں اور میں نہیں جانتا کہ

میرے کس جرم کی وجہ سے مجھے علم و عقل کے تابع بنایا گیا ہے اور مجھے ان کا تابع اور فرمانبردار قرار دیا گیا ہے۔ جب تک یہ طاقتور قاصد میرے پاس نہیں آیا، میں پرسکون اور پرسکون تھا۔ اب یہ میرا حاکم ہے، چاہے وہ عادل ہو یا ظالم، میں اس کے حکم کی تعمیل کرنے پر مجبور ہوں۔ جب وہ مجھے کسی چیز کا حکم دیتا ہے تو ، میرے پاس اس کی مخالفت کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ میں اپنی زندگی کی قسم کھاتا ہوں کہ جب وہ کسی بھی معاملے میں پریشان اور ہچکچاہٹ کا شکار ہوتا ہے تو میں خاموش رہتا ہوں لیکن میری توجہ اسی کی طرف ہوتی ہے۔ جب وہ کوئی حتمی فیصلہ کرتا ہے تو ، میں اپنی فطرت کے مطالبے سے مجبور ہوجاتا ہوں کہ اس کی اطاعت کریں اور صلاحیت کو بیدار کریں۔ اب آپ کو علم مانگنا چاہیے اور اپنی تنقید کو مجھ سے دور رکھنا چاہیے۔

روحانی مسافر نے کہا کہ تم سچ بول رہے ہو، پھر علم، عقل اور دل کی طرف متوجہ ہوا اور ان کو ملامت کی کہ وہ قابلیت کو اکسانے کے لیے ارادے کو محکوم کر رہے ہیں۔ عقل نے جواب دیا، "میں ایک [روشنی دینے والا] چراغ ہوں جو خود سے روشن نہیں کیا گیا ہے بلکہ کسی اور نے مجھے روشن کیا ہے"۔ دل نے جواب دیا، "میں ایک گولی ہوں جو خود نہیں پھیلی ہے لیکن کسی اور نے مجھے پھیلا دیا ہے"۔ علم نے کہا، "میں ایک کتبہ ہوں جو عقل کا چراغ روشن ہونے کے بعد دل کی تختی کی سفیدی پر نقش ہو جاتا ہے۔ میں خود کندہ نہیں ہوتا بلکہ کوئی اور مجھ پر کندہ ہوتا ہے۔ اس لیے آپ کو اس قلم سے پوچھنا چاہیے جو میرے اوپر کندہ ہے"۔ اس کشمکش کے بعد روحانی مسافر کو کوئی ایسا جواب نہیں ملتا جو کسی کو مطمئن کر سکے تاکہ وہ اس سے مطمئن ہو سکے۔ اس لیے روحانی مسافر حیران اور پریشان ہو جاتا ہے اور کہتا ہے، "میں طویل عرصے سے اس راستے پر چل رہا ہوں اور بہت سی منزلیں عبور کر کے یہاں پہنچا ہوں۔ راستے میں جس سے بھی میں نے ملاقات کی ، میں نے وہی سوال پوچھا ہے۔ سب نے مجھے کسی اور کے حوالے کر دیا۔ اگرچہ میں اس جدوجہد سے خوش تھا کیونکہ ہر جواب معقول تھا اور دل کو قائل کرتا تھا لیکن یہ آخری جواب میری سمجھ سے باہر ہے۔ علم کہتا ہے کہ میں ایک کتبہ ہوں جو قلم کی نوک کے نیچے سے پیدا ہوا ہے، اگرچہ قلم سرکنڈوں سے بنا ہوا ہے، لوہے یا لکڑی سے بنایا گیا ہے اور کتبہ سیاہ یا سرخ سیاہی سے بنایا گیا ہے اور چراغ آگ سے روشن کیا گیا ہے۔ یہاں میں تختی، چراغ اور کتبے کی باتیں سن رہا ہوں حالانکہ مجھے ان میں سے کوئی نظر نہیں آتا۔ اس کے جواب میں علم فرماتا ہے کہ تمہارا سرمایہ (دولت) کم ہے اور تمہارا رزق محدود ہے، تمہاری سواری کمزور ہے اور جس راستے پر تم سفر کرتے ہو اس کے بے شمار خطرات ہیں۔ اس لیے آپ کے لیے بہتر ہے کہ آپ اس راستے کو چھوڑ کر ایک الگ راستہ اختیار کریں کیونکہ آپ اس کے اہل نہیں ہیں۔ جو کسی چیز کا مستحق ہے اسے اس تک پہنچنے کے ذرائع فراہم کیے جاتے ہیں۔ اگر آپ واقعی اس راستے پر سفر مکمل کرنا چاہتے ہیں تو اسے بہت غور سے سنیں:

تین دائرے: یاد رکھیں ، آپ کے اس سفر کے لئے تین دائرے ہیں۔ ان میں سے *ایک عالم الملک و شہادت* کا عالم ہے جسے الٰہی قادر مطلق اور قدرت کے ظہور کا عالم بھی کہا جاتا ہے۔ کاغذ، سیاہی، قلم، ہاتھ وغیرہ ایک ہی دائرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ آہستہ آہستہ ان چیزوں سے آگے بڑھے۔ دوسرا فرشتوں کا عالم ہے جو میرے بعد آتا ہے (یعنی علم)۔ جب آپ مجھ پر غالب آجائیں گے تو آپ اس سلطنت کی منزلوں تک پہنچ جائیں گے۔ میں نہیں جانتا کہ آپ ان میں کیسے محفوظ رہیں گے۔ تیسرا ہے مطلق الٰہی عظمت یا حاکمیت کا دائرہ (*عالم الجباروت*)۔ آپ نے اس کی پہلی تین منزلیں طے کی ہیں، یعنی قابلیت، نیت اور علم۔ یہ دائرہ پہلے دو دائروں کے درمیان ایک ذریعہ کے طور پر کام کرتا ہے۔ جو شخص زمین پر چلتا ہے وہ *عالم الملک و شہادت* پر چلتا ہے۔

***فرشتوں کے دائرے کا آغاز عالم ملکوت*:** فرشتوں کے دائرے کی ابتدا یہ ہے کہ آپ اس قلم کو دیکھتے ہیں جو دل کی تختی پر لکھتا ہے اور اس یقین کو حاصل کرتے ہیں جس سے پانی پر چلنا مکمل ہوتا ہے۔ آپ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ضرور سنا ہوگا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ذکر کیا گیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پانی پر چلتے تھے تو آپ نے فرمایا:

لَوِ ازْدَادَ يَقِيْنًا لَمَشٰى عَلَى الْهَوَاءِ

'اگر اس کے پاس زیادہ یقین ہوتا تو ، وہ ہوا میں چل پڑتا'۔

علم کی یہ تقریر سن کر روحانی مسافر نے کہا، "میں اپنی حالت کے بارے میں حیران ہوں۔ آپ نے جس راستے کی نشاندہی کی ہے اس کے خطرات سے میرا دل کانپ رہا ہے۔ مجھے یقین نہیں ہے کہ آیا میں اس وسیع خطرناک علاقے کو عبور کر سکتا ہوں جس کی آپ نے نشاندہی کی ہے۔ کیا آپ مجھے قلم کے کسی اشارے کے بارے میں بتا سکتے ہیں؟" علم نے کہا: "اس کی ایک نشانی ہے اور وہ یہ ہے کہ تم اپنی آنکھیں کھولو، ان کی روشنی کو جمع کرکے میری طرف دیکھو۔ اگر آپ وہ قلم دیکھیں جو دل کی تختی پر بیان لکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے تو آپ کو فرشتوں کے دائرے کا اہل قرار دیا جائے گا کیونکہ جو شخص مطلق الٰہی سلطنت یا *عالم الجباروت (عالم الجباروت)* کے دائرے سے فرشتوں کے دائرے میں آگے بڑھتا ہے وہ اس قلم کو دیکھنا شروع کر دیتا ہے! یہی وجہ ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت کے آغاز میں مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی تو آپ نے قلم کا مشاہدہ کیا:

اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ﴿٣﴾

الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ﴿٤﴾

عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ﴿٥﴾

پڑھو اور تیرا رب غالب اور بزرگ ہے جس نے قلم سے سکھایا اور انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔
(سورۃ البقرۃ باب ۹۶، آیہ ۳-۵)

روحانی مسافر نے کہا، "میں نے اپنی آنکھیں کھلی ہیں اور بڑی توجہ سے دیکھنے کی کوشش کی ہے لیکن [پھر بھی] میں نے نہ تو وہ قلم دیکھا ہے اور نہ ہی لوحی۔ اگر میں نے کوئی قلم دیکھا ہے تو وہ بیرونی قلم ہے جو لکھنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ علم نے فرمایا: جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ عجیب ہے! کیا آپ نے نہیں سنا کہ گھر کا مالک جس طرح سے گھر کا مالک ہے، کیا گھر میں سامان ہے؟ کیا تم نہیں جانتے کہ خدا کی ہستی کسی اور مخلوق سے مشابہت نہیں رکھتی؟ اس کا ہاتھ دوسرے ہاتھوں کی طرح نہیں ہے، اس کا قلم دوسرے قلموں سے مشابہت نہیں رکھتا اور اس کی گفتگو کسی دوسری گفتار سے مشابہت نہیں رکھتی۔ یہ الہی معاملات ہیں اور ان کا تعلق فرشتوں کے دائرے سے ہے۔ خدا نہ جسم ہے اور نہ ہی وہ کسی جگہ کے اندر ہے، جبکہ باقی تمام چیزیں جسم ہیں اور اپنی جگہوں پر۔ اس کا ہاتھ نہ گوشت ہے اور نہ خون اور نہ ہی ہڈیاں، دوسرے ہاتھوں کے برعکس جو گوشت، خون اور ہڈیوں کا مجموعہ ہیں۔ اس کا قلم نہ تو سرکنڈوں سے بنا ہے اور نہ ہی اس کی لوح لکڑی سے بنی ہے۔ اس کی زبان نہ تو حروف اور آوازوں سے بنی ہے اور نہ ہی اس کا نشان نقوش سے بنا ہوا ہے اور اس کی سیاہی رنگوں سے بنی نہیں ہے۔ اگر آپ معاملات کو اس طرح نہیں دیکھتے ہیں جیسے وہ واقعی ہیں ، تو آپ کی کمی ہے۔ حقیقت میں مکمل انسان وہ ہے جو خدا کو برتر اور پاک سمجھتا ہے اور اس کی کمی وہ ہے جو اس سے مشابہت رکھتا ہے۔ آپ دونوں [گروہوں] کے درمیان ہیں، نہ تو یہاں سے تعلق رکھتے ہیں اور نہ ہی وہاں۔ مجھے بتاؤ کہ تم نے خدا کو جسموں اور صفات سے کس طرح مستثنیٰ قرار دیا ہے؟ تم نے اس کی کلام کو کسی حرف اور آواز سے خالی کیسے سمجھا؟ آپ اس کے ہاتھ ، قلم اور لوح کے بارے میں ہچکچاتے ہیں۔ جو شخص خدا کو ظاہری اجسام سے مشابہت سمجھتا ہے وہ محض ایک مشابہت کر رہا ہے اور جو اسے ایک باطنی معنی سمجھتا ہے جو صرف بصیرت کی آنکھ سے دیکھا جاتا ہے تو یہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ خدا کو ان (انسانیوں) مماثلتوں سے بالاتر سمجھتا ہے اور تسبیح و ثنا کی راہ پر گامزن ہے۔ اب اس راستے پر چلنا چاہیے اور دل کے اندر خدائی احکام کو سننا چاہیے، تاکہ وہ روشنی کی روشنی کا راستہ تلاش کر سکے۔

جب روحانی مسافر نے یہ بصیرت انگیز گفتگو سنی تو اسے اپنی غلطیوں کا علم ہوا اور اسے احساس ہوا کہ وہ [خدا کے جسموں سے] مشابہت اور تسبیح الٰہی کے درمیان معلق ہے۔ اس احساس کے ساتھ ہی اپنے دل میں غصے کی آگ بھڑک اٹھی اور چونکہ دل کے چراغ میں ایسا پاکیزہ اور ہلکا تیل تھا جو آگ کے بغیر بھی جلنے کے لیے تیار تھا،

اس لیے جب علم کی آگ اس تک پہنچی تو وہ روشنی پر روشنی بن گئی۔ یہ دیکھ کر علم نے روحانی مسافر سے کہا، "اس موقع سے فائدہ اٹھاؤ اور اپنی آنکھیں کھولو، شاید تمہیں رہنمائی مل جائے"۔ چنانچہ انسان نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور خدا کا قلم اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ اس پر ظاہر ہو گیا جو تسبیح الٰہی کے لیے ناگزیر ہے۔ یہ نہ تو سرکنڈوں سے بنا ہے ، نہ ہی لکڑی سے بنا ہے اور نہ ہی اس کے تیز دھارے سے۔ یہ انسانی دلوں پر مختلف قسم کے علوم لکھنے میں مصروف ہے۔ اس کی نوک ہر دل کی سطح پر ہوتی ہے، اگرچہ بظاہر اس کی نوک نہیں ہوتی۔ روحانی مسافر یہ دیکھ کر حیران رہ گیا اور کہا کہ حقیقت میں علم یقینا بہترین ساتھی ہے [کیونکہ اس کے بغیر ہم سب جاہل ہیں]۔ اللہ تعالیٰ اسے بہترین جزا عطا فرمائے۔ قلم کی وہ تمام خصوصیات جن کے بارے میں اس نے مجھے بتایا ، وہ سب نظر آنے لگے۔ اب وہ قلم میرے لیے دوسرے قلموں کی طرح نہیں رہا۔ اس کے بعد روحانی سیاح نے علم کو الوداع کہا اور اس کا شکریہ ادا کیا اور اس سے کہا کہ میں کافی عرصہ آپ کے ساتھ رہا، اب میں نے قلم کے پاس جا کر اس سے اس کی حالت کے بارے میں پوچھنے کا عزم کیا ہے۔

روحانی مسافر اور قلم کے درمیان گفتگو: چنانچہ روحانی مسافر قلم کے پاس آیا اور اس سے پوچھا، "اے قلم! آپ ہر وقت لوگوں کے دلوں میں علم کیوں لکھتے رہتے ہیں جب تک کہ یہ علم ارادوں کو بھڑکانے اور قابلیت بلند نہ ہو اور رضاکارانہ کام نہ کر لیں؟ قلم نے کہا کہ کیا تم اس بات کو بھول گئے ہو جو تم نے قادر مطلق اور قدرت کے عالم میں دیکھا تھا؟ کیا آپ نے قلم سے سنے ہوئے جواب کو نظرانداز کیا ہے؟ جہاں تک مجھے یاد ہے، اس نے [دلوں پر] لکھنے کی ذمہ داری قبول نہیں کی، اس نے اسے خدا کے سپرد کر دیا۔ روحانی مسافر نے کہا کہ میں نہ تو یہ بھولا ہوں اور نہ ہی میں نے قلم کے جواب کو نظر انداز کیا ہے۔ قلم نے جواب دیا، کیا تم نے نہیں سنا کہ خدا نے آدم (انسانیت کے باپ) کو اپنی صورت پر پیدا کیا؟ آپ کو بادشاہ کے دائیں ہاتھ سے میری حالت کے بارے میں پوچھنا چاہئے۔ میں اس کے کنٹرول میں ہوں، وہی ہے جو مجھے حرکت دیتا ہے، میں اس کے کنٹرول میں ہوں۔ یعنی خدا کے قلم اور انسان کے قلم میں محکوم ہونے کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر کوئی فرق ہے تو ، یہ صرف بیرونی ظاہری شکل کے درمیان فرق ہے۔ روحانی مسافر نے پوچھا، "بادشاہ کے داہنے ہاتھ سے کیا مراد ہے؟" قلم نے جواب دیا کہ اس کا مفہوم وہی ہے جو نیچے آیت میں بیان کیا گیا ہے:

وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ ۚ

"اور آسمان اس کے داہنے ہاتھ پر لپٹا جائے گا۔" (سورۃ البقرۃ سورۃ البقرۃ آیت 67)

اسی طرح قلم بھی اس کے داہنے ہاتھ میں ہے، وہ اسے اپنی مرضی کے مطابق گھماتا ہے۔

روحانی مسافر کا دائیں ہاتھ کی طرف سفر: اس گفتگو کے بعد روحانی مسافر نے دائیں طرف سفر کرنا شروع کیا۔ وہاں کسی نے حیرت انگیز حیرت انگیز دیکھی تھی۔ قلم کے مقابلے میں ان کا ایک حصہ بھی نہیں تھا۔ یہ عجائبات ایسے تھے جن کی وضاحت الفاظ میں نہیں کی جا سکتی، بلکہ اگر ان کی وضاحت ہزاروں کتابوں میں کی جائے تو ان میں سے سوویں حصے کی بھی وضاحت نہیں کی جا سکتی تھی۔ مختصرا ، یہ دائیں ہاتھ ہے لیکن دوسرے دائیں ہاتھ کی طرح نہیں ہے۔ اس کا ایک بازو ہے لیکن دوسرے بازوؤں کی طرح نہیں۔ اس کی انگلیاں ہیں لیکن ان میں دوسری انگلیوں سے ذرا بھی مماثلت نہیں ہے۔ روحانی مسافر نے قلم کو دائیں ہاتھ سے حرکت دیتے ہوئے دیکھا پھر سمجھ لیا کہ قلم نے جو کچھ ظاہر کیا ہے وہ درست ہے۔ حقیقت میں ، یہ سب دائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ چنانچہ روحانی مسافر نے داہنے ہاتھ سے پوچھا کہ یہ قلم کے گرد کیوں گھومتا ہے تو اس نے جواب دیا کہ میرا جواب وہی ہے جو ہاتھ نے قادر مطلق اور قدرت کے ظہور کے دائرے سے دیا تھا، دوسرے لفظوں میں اس نے اس حرکت کو قابلیت (*قدرہ*) سے منسوب کیا)۔ میں بھی یہی کہتا ہوں - یہ صلاحیت کا کھیل ہے"۔ یہ سن کر روحانی مسافر اس قابلیت کی طرف چلا گیا، جہاں اس نے ایسے عجائبات دیکھے، اس نے پہلے ان میں سے ایک ٹکڑا بھی نہیں دیکھا تھا۔ خوفزدہ ہو کر ایک نے پوچھا، "تم دائیں ہاتھ کو کیوں حرکت دیتے ہو؟" قابلیت نے جواب دیا، "میں صرف ایک خصوصیت ہوں، آپ کو اس خصوصیت کے حامل (مالک) سے پوچھنا چاہیے - وہ جو اس خصوصیت کی خصوصیت رکھتا ہے - سب سے زیادہ طاقتور۔ صرف اس خصوصیت کا حامل ہی آپ کو اس کی وجہ سے آگاہ کرسکتا ہے۔ یہ خصوصیت محض اس کے ہولڈر کے تابع ہے"۔ یہ جواب سن کر روحانی مسافر قادر مطلق (خدا)

سے پوچھنے کی ہمت کرنے کے قریب تھا، [لیکن] اس کے قدموں کی مضبوطی [حق کی راہ پر] عطا ہو گئی اور قادر مطلق کی طرف سے یہ پکار سنائی دی:

لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُونَ

"وہ جو کچھ بھی کرتا ہے، کوئی بھی اس سے سوال نہیں کر سکتا جبکہ باقی سب سے پوچھ گچھ کی جا سکتی ہے کہ وہ کیا کرتے ہیں۔" (سورۃ البقرۃ باب 21، آیت 23)

یہ سن کر روحانی مسافر کانپنے اور خوف سے مغلوب ہو گیا اور بے ہوش ہو گیا۔ ایک طویل عرصے تک اس کا شکار رہا۔ جب کوئی ہوش میں آیا تو کہنے لگا: اے اللہ! آپ تمام خامیوں ، خامیوں ، عیبوں اور کمزوریوں سے بالاتر ہیں۔ آپ کی شان و شوکت عظیم ہے! میں تجھ سے توبہ کرتا ہوں اور صرف تجھ پر بھروسہ کرتا ہوں اور اس حقیقت پر یقین رکھتا ہوں کہ تو ایک اور واحد ، ناقابل تلافی ، غالب اور غالب حکمران ہے۔ میں تیرے سوا کسی سے نہیں ڈرتا اور نہ میں تیرے سوا کسی سے امید رکھتا ہوں میں تیری بخشش اور تیری قبولیت پر تیری غضب سے پناہ مانگتا ہوں۔ میرے سامنے کوئی راستہ نہیں ہے سوائے اس کے کہ میں تجھ سے عاجزی کے ساتھ دعا کرتا ہوں کہ اے اللہ! میرا دل کھول تاکہ میں تجھے جان سکوں۔ میری زبان کی گرہ کھول دے تاکہ میں تیری حمد و ثنا کر سکوں۔ اس دعا کے جواب میں حضرت الٰہی کی طرف سے اعلان کیا گیا، "ہوشیار رہو! آگے نہ بڑھیں! تسبیح اور حمد میں لالچ نہ کرو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جاؤ اور جو کچھ وہ تمہیں دیتا ہے اسے لے لو اور جس چیز سے وہ تمہیں روکتا ہے اس سے باز آؤ۔ اور جو وہ آپ سے کہنے کے لئے کہتا ہے وہ کہو۔ دیکھو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دربار الٰہی میں یہ دعا کی ہے:

سُبْحَانَکَ لَا اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ

'تجھے جلال ہے! آپ تمام خامیوں ، خامیوں ، عیبوں اور کمزوریوں سے بالاتر ہیں۔ میں آپ کی پوری تعریف بھی نہیں کر سکتا۔ آپ ویسے ہی ہیں جیسے تو نے اپنے آپ کی تعریف کی ہے!"

روحانی مسافر نے التجا کی، "اے تمام کائنات کے مالک! اگر زبان کو اس حد سے تجاوز کرنے کی اجازت نہیں ہے تو کیا دل کو تیری معرفت کا لالچ ہو سکتا ہے؟" جواب آیا، "کیا آپ گنوسٹک سے بھی آگے بڑھنا چاہتے ہیں! سب سے بڑے گنوسٹک (*صدیق اکبر*) [ابوبکر رضی اللہ عنہما) کے پاس جاؤ جو تمام انبیاء کے مقابلے میں قرب اور گنوسی میں سب سے اوپر مقام رکھتے ہیں، اور ان کی پیروی کریں۔ کیا تم نے نہیں سنا کہ اس نے کیا کہا؟

اَلْعِجْزُ عَنْ دَرْکِ الْاِدْرَاکِ اِدْرَاکٌ

'ادراک کو سمجھنے میں ناکامی ادراک ہے'۔

میری طرف سے تیرا حصہ یہ ہے کہ تو میری حضوری سے محروم ہے۔ آپ میں یہ طاقت نہیں ہے کہ آپ جلال اور جمال کی *خوبصورتی* کو دیکھ سکیں"۔

یہ سن کر روحانی مسافر اس راستے پر واپس چلا گیا جس سے گزر رہا تھا۔ قلم، علم، نیت اور قابلیت وغیرہ سے جو بھی سوال پوچھے تو اس نے ان سے معافی مانگی اور اپنی جہالت کا اقرار کیا اور کہا کہ مجھے معاف کردو، میں اس راستے سے اجنبی (نیا) تھا۔ جو اجنبی ہے وہ [نئے علاقوں سے] خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ میں نے آپ کو مسترد کر دیا، یہ مکمل طور پر میری غلطی اور جہالت ہے۔ اب مجھے آپ کے بہانے سے آگاہ کیا گیا ہے اور اب میں اس حقیقت سے واقف ہوں کہ تمام دائرے [عالم *الملک و شہادت*)، عالم ملکوت (عالم *الملکوت*) اور مطلق عظمت یا حاکمیت کے دائرے (*عالم الجباروت*)]، صرف ناقابل تلافی کا حکم نافذ ہوتا ہے۔ آپ سب اس کے حرکت پذیر عمل سے چلتے ہیں اور اس کی ہمہ گیر طاقت سے مغلوب اور محکوم ہو جاتے ہیں۔ وہی پہلا (*الاول*) ہے، وہی آخرت ہے، وہی ظاہر ہے، وہی پوشیدہ ہے۔"

اول اور آخری، ظاہری اور پوشیدہ کے درمیان کشمکش: جب روحانی مسافر نے ان تفصیلات کو عالم الملک و شہادت *یا ظاہری دنیا کے ظہور کے عالم کے باشندوں کو سمجھایا* تو وہ حیران رہ گئے اور پوچھنے لگے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ پہلا اور آخری، پوشیدہ اور ظاہر ہے کیونکہ یہ صفات ایک دوسرے کے مخالف ہیں؟ جو پہلا ہے وہ آخری نہیں ہوگا اور جو چھپا ہوا ہے وہ ظاہر نہیں ہوگا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ، "وہ تمام وجودوں سے بہت بالاتر ہے کیونکہ تمام وجود اس کے وجود کے حکم سے وجود میں آئے۔ وہی آخری ہے کیونکہ جو لوگ (روحانی) راہ پر چلتے ہیں، وہی ان کی آخری منزل ہے۔ اگر وہ راستے میں ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں تو ان کے راستے اور ان کے سفر کا اختتام اسی کے وجود میں ہے۔ اس طرح، وہ گواہی میں آخری لیکن وجود میں سب سے پہلے ہے۔ یہ اس کا حال ہے پوشیدہ اور ظاہر وہ لوگ جو مرئی دنیا (پہلے دائرے) میں رہتے ہوئے اپنے پانچ حواس سے اس کا ادراک کرنا چاہتے ہیں، وہ ان کے لیے پوشیدہ ہے۔ جو لوگ اپنے دلوں کے نور کی روشنی سے اس کی تلاش کرتے ہیں وہ ان کے لیے ظاہر ہے۔ یہ توحید الٰہی اور توحید کی حقیقت کا عملی مفہوم ہے۔ دوسرے لفظوں میں جن لوگوں پر یہ حقیقت نازل ہوئی ہے کہ حقیقی عمل کرنے والا صرف ایک ہی ہستی ہے، ان کے لیے یہ ان کی وحدانیت اور توحید کا طریقہ ہے۔

خدا پر توکل کی حالتیں اور اعمال

خدا پر توکل کا [روحانی] مقام علم، حالت اور عمل سے بنا ہے۔ علم کا ذکر پہلے بھی کیا جا چکا ہے۔ اب یہ اس حالت کے بارے میں سنیں کہ حقیقت میں خدا پر توکل ہے۔ علم اس کی ابتدا ہے اور عمل اس کا پھل (نتیجہ) ہے۔ یہ جاننا چاہیے کہ خدا پر توکل امانت سے آتا ہے، دوسرے لفظوں میں، کسی نے اپنا کام کسی اور کے سپرد کیا ہے، اور کسی پر بھروسہ کیا ہے۔ جس شخص کو اپنا کام سونپا گیا ہے وہ امانت دار ہے، جو کام سونپتا ہے وہ امانت دار کہا جاتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ امانت دار کو امانت دار پر پورا بھروسہ ہو اور وہ کسی کو نااہل نہ سمجھے۔ لہٰذا دل میں امانت دار پر اعتماد ہونا چاہیے۔ دنیاوی جھگڑوں میں مقرر ہونے والے وکیلوں کی بھی یہی حالت ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر کوئی آپ پر جھوٹے الزام لگاتا ہے یا آپ کی ملکیت والی چیز کو ناجائز طور پر چھین لے جاتا ہے تو آپ اس ظلم کے خاتمے کے لیے ایک وکیل مقرر کرتے ہیں جو قاضی کی عدالت میں آپ کی آواز بن جاتا ہے اور آپ کو الزام لگانے والے کی ناانصافی اور دھوکہ دہی سے نجات دلانے کی کوشش کرتا ہے۔

آپ کو اپنے وکیل (ٹرسٹی) پر بھروسہ کرنے والے اور اس وقت تک ٹرسٹی شپ سے مطمئن نہیں سمجھا جائے گا جب تک کہ آپ چار معاملات پر یقین نہ رکھیں: پہلا یہ کہ ٹرسٹی کے پاس اعلی سطح کی رہنمائی ہے [آپ کے لئے صحیح کام کرنے کے لئے]، دوسرا [ٹرسٹی کی آپ کے لئے ضروری کام کرنے کی صلاحیت]، تیسرا [آپ کے مقدمے کی وکالت کرنے میں] اعلی سطح کی فصاحت و بلاغت ہے، اور چوتھا [ٹرسٹی] مکمل محبت اور احسان [آپ کے لئے] ہے۔ رہنمائی ضروری ہے تاکہ امانت دار دھوکہ دہی کی جگہوں سے اس حد تک واقف ہو کہ وہ ایسی باریکیوں کو دیکھے جو واضح نہیں ہیں [اور آپ کے لیے خطرہ ہیں]۔ قابلیت اور طاقت اس لیے ضروری ہے کہ امانت دار پوری ہمت کے ساتھ حق کا اعلان کر سکے اور کسی بھی کام میں ہچکچاہٹ نہ برتے، کسی سے نہ ڈرے، کسی سے نہ شرمائے اور نہ ہی بزدلی کا شکار ہو۔ اکثر اوقات امانت دار کو دوسرے فریق کے دھوکہ دہی کی وجہ معلوم ہو جاتی ہے لیکن خوف، بزدلی، شرم یا کسی اور وجہ سے اس کا اظہار کرنے سے قاصر ہو جاتا ہے اور سچ کا اعلان کرنے میں کمزور ہو جاتا ہے۔ فصاحت و بلاغت ضروری ہے تاکہ ایک امانت دار مؤثر طریقے سے اظہار کر سکے جو قابلیت کی ایک قسم بھی ہے، اگرچہ اس کا تعلق زبان سے ہے۔ فصاحت و بلاغت کے ذریعے انسان دل کے معاملات کو اس طرح بیان کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے کہ سننے والا متاثر ہو جائے ورنہ یہ ضروری نہیں کہ کوئی شخص مخالف فریق کے فریب کو دریافت کرنے کے بعد بے نقاب کر دے اور سچائی کو اس طرح بیان کرے کہ سننے والے

کو قائل کر سکے۔ محبت ضروری ہے تاکہ امانت دار (وکیل) امانت دار کے لیے پوری کوشش کر سکے اور کسی کے لیے ضروری کام کرنے سے باز نہ رہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صرف دھوکہ دہی کے دلائل سے آگاہ ہونا، سچائی کے اظہار کی صلاحیت رکھنا اور فصاحت و بلاغت کے موتی پھیلانا مقدمے کی کامیابی کے لیے کافی نہیں ہے، جب تک کہ امانت دار امانت دار کے وجود اور حالات میں دلچسپی نہ لے اور ان کے معاملات کو اپنا نہ سمجھے۔ اگر پیسہ کمانا ہی واحد مقصد ہے تو ، ٹرسٹی کو اس بات کی پرواہ نہیں ہوگی کہ امانت دینے والا شخص فاتح ہے یا شکست کھا گیا ہے یا کوئی اپنے حقوق حاصل کرتا ہے یا انہیں کھو دیتا ہے۔

اگر امانت دار کو ان چار معاملات میں سے کسی ایک معاملے میں بھی شک ہو اور امانت دار کو اس معاملے میں کمزور سمجھا جائے یا اپنے امانت دار کے مقابلے میں مخالف فریق کے امانت دار کو چاروں معاملات میں مضبوط پایا جائے تو وہ اپنے امانت دار (وکیل) پر مکمل اطمینان اور اعتماد نہیں کر سکتا۔ انسان ہر وقت اپنے دل میں شکوک و شبہات کا شکار رہے گا اور اپنے امانت دار سے اس غلطی کو دور کرنے کی کوشش کرے گا تاکہ مخالف فریق کا فائدہ ختم ہو سکے۔ جس حد تک امانت دار کو چاروں معاملات میں اپنے امانت دار پر یقین ہو اس حد تک اس کے دل میں اعتماد اور اطمینان ہو گا کہ وہ مطلوبہ مقصد حاصل کر لے گا۔ جہاں تک لوگوں کے عقائد اور قیاس آرائیوں کا تعلق ہے، وہ اپنی طاقت اور کمزوریوں میں ایک جیسے نہیں ہیں، بلکہ ناقابل بیان اختلافات ہیں۔ لہٰذا ، یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ [ٹرسٹی] کو سونپنے والے لوگوں میں ان کے عقائد [یا اعتماد کی سطح] اور اس کے نتیجے میں [ٹرسٹی پر] اعتماد اور اطمینان میں وسیع تضادات ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ کسی کا امانت دار پر اعتماد نہ ہو جبکہ دوسرے کا اعتماد اس سطح پر پہنچ جائے جہاں اس میں کوئی کمزوری باقی نہ رہے۔

اب آپ اس وضاحت سے اعتماد کی حقیقت کو جان چکے ہوں گے اور اس سے توکل خدا (*توکل*) کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اگر *اعتقاد* اور روحانی نقاب کے ذریعے سے آپ کے دل میں یہ بات پختہ ہو جائے کہ اللہ کے سوا کوئی عمل کرنے والا نہیں ہے۔ یہ بھی یقین رکھیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے حالات و حالات سے بخوبی واقف ہے اور ان کے لیے کافی ہونے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے، اس کی مہربانی آسمانوں اور زمین کی تمام مخلوقات اور ہر ذرے پر محیط ہے اور ان میں سے ہر چیز پر مشتمل ہے۔ یہ بھی یقین رکھو کہ اس کی قدرت و قدرت میں کوئی قید نہیں ہے، اس کے علم پر کوئی پابندی نہیں ہے، اس کی مہربانی اور فیاضی پر کوئی پابندی نہیں ہے جس کے آگے کوئی احسان اور فیاضی نہیں ہے۔ اگر خدا کے بارے میں یہ تمام عقائد اور خیالات آپ میں پختہ ہو جائیں گے تو یقینا آپ اس پر توکل کریں گے اور ہر حال و صورت میں آپ کی توجہ اسی پر رہے گی، اس کے سوا کسی اور کی طرف توجہ نہیں دیں گے، نہ آپ کے اپنے وجود پر اور نہ ہی اپنی قدرت اور طاقت پر کیونکہ کوئی طاقت نہیں ہے۔ خدا کے سوا اور طاقت اور طاقت

اللہ تعالیٰ پر توکل نہ ہونے کی وجوہات: اگر کسی کے دل میں خدا پر توکل کی یہ کیفیت نہ ہو تو اس کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں، یا تو ان چار معاملات میں سے کسی ایک میں یقین کمزور ہو جائے گا یا اس کی وجہ دل کی کمزوری، بزدلی اور پریشان کن خیالات ہو سکتی ہیں۔ بعض اوقات یقین کمزور نہیں ہوتا، لیکن توہم پرستی دل پر حاوی ہو جاتی ہے اور باطنی مزاج میں نفرت اور کوتاہی پیدا کر دیتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی عقل مند شخص کو قبر میں یا میت کے کمرے یا بستر پر قبر میں لیٹنے کے لیے کہا جائے تو وہ اس بات پر کبھی راضی نہیں ہو گا، حالانکہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ لاش پتھر کی طرح بے جان اور بے حرکت ہے اور اسے نقصان پہنچانے کی طاقت نہیں ہے۔ اور اللہ کا یہ طریقہ نہیں کہ کسی کو مرنے کے بعد زندہ کرے اور اللہ زندہ کرنے پر قادر ہے یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے خدا کسی مصنف کے ہاتھ میں قلم کو سانپ میں تبدیل نہیں کرتا، یا بلی کو شیر میں تبدیل نہیں کرتا، حالانکہ وہ قلم کو سانپ اور بلی کو شیر میں تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عقل مند میں یہ یقین ہے کہ میت کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا لیکن پھر بھی وہ کسی میت کو بستر پر رکھ کر سونے یا اس کے ساتھ قبر میں ایک رات تنہا گزارنے پر راضی نہیں ہوتا، اگرچہ اسے کسی اور بے جان مادی چیز کا خوف نہ ہو۔ حقیقت میں ، یہ بزدلی اور خوف ہے اور ایک قسم کی کمزوری ہے۔ بہت کم لوگ ایسی کمزوریوں سے محروم ہیں۔ کچھ لوگ اس حد تک بزدل ہوتے ہیں کہ ان کی بزدلی ایک بیماری کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور وہ صرف تنہا ہونے کے تصور سے خوفزدہ ہوجاتے ہیں ، مردہ کے ساتھ تنہا ہونے کے بارے میں بھول جاتے ہیں۔

اطمینان اور یقین ہے: اس بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ خدا پر توکل کے کمال کے حصول کے لیے دل اور یقین دونوں کی طاقت درکار ہوتی ہے، اسی وقت دل کو اطمینان اور سکون ملتا ہے۔ پھر نہ تو صرف یقین کی طاقت کافی ہے اور نہ ہی یہ صرف اطمینان کا ذریعہ ہے جب تک کہ دل میں طاقت نہ ہو۔ درحقیقت دل کی تسکین ایک چیز ہے اور یقین دوسری (الگ) چیز ہے۔ کبھی کبھی ، کسی کو یقین ہوتا ہے لیکن اطمینان نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کے پاس یقین ہے لیکن وہ اطمینان اور سکون جو اسے اپنی آنکھوں سے حقیقت کی گواہی دے کر حاصل ہوتا ہے وہ وہاں نہیں ہے۔ ابتدا میں یقین اطمینان پیدا نہیں کرتا، بلکہ یہ آہستہ آہستہ نفس کو سکون میں بناتا ہے (*نفس المطینہ*) [یعنی نچلی نفس اپنی بنیادی خواہشات اور منفی صفات کے ساتھ، ایک ایسی نفس میں تبدیل ہو جاتی ہے جو خدا کے ساتھ امن میں ہے اور ہر اس اچھی چیز کے ساتھ جو پہلے تصور بھی نہیں کی جا سکتی تھی]۔ بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جن میں یقین نہیں ہوتا بلکہ اطمینان حاصل ہوتا ہے، مثلا وہ لوگ جو غلط اور مضر عقائد پر عمل پیرا ہوتے ہیں جن پر ان کا کوئی یقین نہیں ہوتا لیکن پھر بھی ان سے ضد اور اپنے غلط اور مضر عقائد کے خلاف ہر چیز کی بے اعتنائی کی وجہ سے ان سے مطمئن ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بزدلی اور بے باکی انسانی مزاج کا حصہ ہے اور ان کی موجودگی میں یقین کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ پر توکل کی مخالفت کرنے کی ایک وجہ ہے جس طرح ایک وجہ یہ بھی ہے کہ امانت کے لیے درکار مذکورہ بالا چار معاملات میں سے ایک [یا زیادہ] میں یقین کمزور ہے۔ جب یقین اور اطمینان کے تمام اسباب کو یکجا کر دیا جائے [بشمول امانت کے لیے ضروری چار معاملات] تو انسان اللہ تعالیٰ پر مطلق یقین پیدا ہو جاتا ہے [اور اس لیے اس پر مکمل توکل رکھتا ہے]۔

خدا پر توکل کی تین درجے: پچھلے صفحات میں، خدا پر توکل اور خدا پر توکل کی حالت کی حقیقت کی وضاحت کی گئی ہے۔ اب ہم اس حالت کے درجات کی وضاحت کریں گے۔ خدا پر توکل کی کل تین درجے ہیں جو خدا پر بھروسہ کی حالت کی طاقت یا کمزوری پر مبنی ہیں۔ پہلی ڈگری وہی ہے جو ابھی بیان کی گئی ہے، یعنی ایک خادم (انسان) کا اعتماد خدا کی طرح ہے جو ایک امانت دار شخص کو اپنے امانت دار پر رکھتا ہے (یا موکل کو اپنے وکیل پر ہے)۔ دوسری درجہی جو پہلے سے زیادہ ہے وہ یہ ہے کہ خدا کے ساتھ امانت کرنے والے کی حالت ماں کے ساتھ بچے کی طرح ہے - بچہ نہ تو اپنی ماں کے علاوہ کسی اور کو جانتا اور نہ ہی پہچانتا ہے اور نہ ہی ماں کے علاوہ کسی اور سے التجا کرتا ہے اور نہ ہی کسی اور پر بھروسہ کرتا ہے۔ بچہ جب اپنی ماں کو دیکھتا ہے تو اس سے چمٹ جاتا ہے، اگر وہ مارتی ہے تو بھی بچہ اس میں پناہ لیتا ہے، اگر اس کی موجودگی یا غیر موجودگی میں کچھ ہوتا ہے تو بچے کے ہونٹوں پر صرف ماں کا نام آتا ہے (یعنی بچہ صرف ماں کے لیے روتا ہے)، بچے کے دل میں صرف ماں کا خیال آتا ہے، اور ماں کا گلے لگانا ہی بچے کی واحد پناہ گاہ ہے۔ ایک بچے کو ماں کی دیکھ بھال ، کفایت شعاری اور پیار پر مکمل اعتماد اور یقین ہوتا ہے جو ادراک سے خالی نہیں ہے۔ جس حد تک ایک بچے میں عقل ہوتی ہے ، بچہ اسے سمجھتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ماں میں اعتماد اور یقین بچے کی فطرت بن گیا ہے۔ تاہم اگر بچے سے اس عادت یا فطرت کے بارے میں پوچھا جائے تو وہ نہ تو اس کی وضاحت کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کی تفصیلات کو ذہن میں لا سکتا ہے۔

جس کا دل خدا پر مرکوز ہے، ایسے شخص کی نظر صرف اس کی مہربانی پر ہوگی اور اس کی بخشش اور سخاوت پر بھروسہ کرے گا۔ انسان کو اس کے لیے ایسی شدید محبت ہوگی جو بچہ اپنی ماں سے رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ وہی ہے جو خدا پر توکل کرتا ہے۔ ایک بچے کو بھی اپنی ماں پر اعتماد ہوتا ہے۔ اس (دوسرے) درجے (توکل کی) اور سابقہ (پہلے) درجے میں فرق یہ ہے کہ جو شخص اس درجے میں ہے وہ خدا پر ایسا توکل کرنے والا ہے کہ وہ اس امانت میں فنا (معدوم) ہو جاتا ہے۔ ایسا شخص خدا پر توکل کی حقیقت کی طرف مائل نہیں ہوتا، بلکہ وہ صرف اس ذات کی طرف مائل ہوتا ہے جس پر بھروسہ کیا جاتا ہے، ایسے شخص کے دل میں اس کے سوا کسی اور کے لیے جگہ نہیں بچتی، جب کہ خدا پر توکل کرنے والا شخص اللہ پر توکل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ کوشش اور جدوجہد سے خدا پر توکل کرنے والا شخص ہے جبکہ دوسری ڈگری میں ایک شخص اپنی فطری فطرت کے لحاظ سے اعتماد کا حامل شخص ہے۔ اول درجے میں انسان خدا پر توکل میں فنا نہیں ہوتا، کیونکہ ایسا شخص خدا پر توکل کی طرف مائل ہوتا ہے اور شعوری طور پر اس سے واقف ہوتا ہے، اور یہ اس شخص کی طرف دیکھنے میں رکاوٹ ہے جس پر بھروسہ کیا جا رہا ہے۔

خدا پر توکل کا تیسرا درجہ، جو کہ سب سے اعلیٰ درجہ، یہ ہے کہ بھروسہ کرنے والا شخص خدا کے سامنے اپنی حرکات و سکنات اور خاموشی میں، ایک مردہ شخص کی طرح ہے جو نہانے والے کے ہاتھوں میں ہے [جو لاش کو دفن کرنے سے پہلے دھوتا ہے]، دوسرے لفظوں میں، اپنے نچلے نفس کو مردہ سمجھتا ہے جو ابدی صلاحیت (خدا) کے ارد گرد گھومتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے ایک مردہ جسم کو اپنی مرضی سے منتقل کیا جاتا ہے۔ نہانے والا۔ ایسے قابل اعتماد شخص کے پاس یہ پختہ یقین ہے کہ حرکت، قابلیت، ارادہ، علم اور تمام صفات کا سرچشمہ صرف ایک ہستی ہے اور ہر چیز اس کی مرضی کے بغیر پیدا ہوتی ہے۔ یہ شخص کسی غیر متوقع واقعہ کے انتظار میں ہے اور اس بچے سے مختلف ہے جو اپنی ماں کے پیچھے بھاگتا ہے، اس کا کپڑا کھینچتا ہے، اس سے التجا کرتا ہے، جبکہ یہ شخص اس بچے کی طرح ہے جس کی یہ توقع ہے کہ اگر کوئی اس کا لباس نہیں پکڑے گا تو اس کی ماں خود ہی کسی کی تلاش میں نکل جائے گی، وہ پھر بھی بچے کو اپنی گود میں اٹھائے گی ، اگر بچہ کھانا نہیں مانگتا ہے تو ، وہ پھر بھی پہل کرے گا اور اسے فراہم کرے گا۔ خدا پر اس درجے کا توکل اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ امانت دار جو خدا کی رضا اور توجہ پر بھروسہ رکھتا ہو، اپنے لیے کچھ نہ مانگے، اور اس کا شکر گزار ہو جو وہ مانگے بغیر بھی عطا کرے گا، بلکہ جس چیز سے پوچھا جا رہا ہے، وہ خود اس سے بہتر عطا فرمائے۔ لہٰذا اس نے پہلے ہی بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے جس کی کوئی تلاش نہیں کر سکا اور نہ ہی ان کا حقدار ہونے کا کوئی حق حاصل کیا ہے۔ یہ آخری اور اعلیٰ درجے کا تقاضا ہے جبکہ دوسرے درجے کا تقاضا ہے کہ وہ خدا کے سوا کسی اور سے پوچھنے سے باز رہے۔

خدا پر بھروسہ کرنے والے لوگوں کے تین درجے ہیں: خدا پر بھروسہ کرنے والوں میں تین درجات ہیں۔ پہلی ڈگری روحانی اشرافیہ اور گنوسٹک سے تعلق رکھتی ہے، جو بغیر کسی رزق کے ناہموار ، ویران مقامات اور جنگلوں میں گھومتے ہیں اور خدا پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اس دوران ، اگر انہیں جنگلوں میں کوئی ایسی چیز مل جائے جو ان کے پیٹ کو بھر دے تو وہ اسے لے لیتے ہیں ، ورنہ ، وہ ثابت قدم رہیں گے اور خدا کی مرضی سے متفق ہوں گے۔ کبھی کبھی وہ لوگ بھی بھوکے مرتے ہیں جو اپنے ساتھ سامان لے جاتے ہیں جو یا تو ضائع ہو سکتے ہیں، یا ختم ہو سکتے ہیں، یا غلط راستے پر چلے جاتے ہیں اور ان کا سامان ختم ہو جاتا ہے۔ موت ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔ یہ ان لوگوں کے لیے آتا ہے جن کے پاس رزق ہے اور جن کے پاس رزق نہیں ہے، اس لیے اللہ کے رزق پر بھروسہ کرنے کے بعد مرنا بہتر ہے۔

دوسری ڈگری یہ ہے کہ وہ اپنے گھر یا کسی ایسے مقام تک محدود ہو جائے جو یا تو کسی شہر یا گاؤں میں ہو جہاں انسانی آبادی ہو اور وہاں رہتے ہوئے وہ الٰہی کی یاد اور غور و فکر میں مشغول ہو۔ یہ درجہی پہلی درجے سے کم ہے، لیکن یہ بھی خدا پر توکل ہے کیونکہ انسان خدا کی رزق پر بھروسہ کرنے کے لیے معیشت اور رزق کے بیرونی ذرائع کو ایک طرف رکھ دیتا ہے اور یہ یقین رکھتا ہے کہ خدا کسی کی ضروریات کو پوشیدہ ذرائع سے پورا کرے گا۔ اس شخص کی نظر شہر یا گاؤں کے لوگوں پر نہیں بلکہ اس ہستی پر ہے جو شہر کے لوگوں کو رزق فراہم کرتا ہے۔ یہ بھی خدا کا فضل ہے کہ وہ لوگوں کو ایسے شخص کی طرف توجہ دینے اور ان کی دیکھ بھال کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

تیسری درجے یہ ہے کہ گھر تک محدود نہ رہے، اس کے بجائے باہر جانا چاہیے اور ان تمام شرائط کے ساتھ جو گزالی کی *عظیم تصنیف "احیاء العلوم الدین"* یا "خدا کی راہ کی احیاء" کی دوسری جلد) میں مذکور ہیں، روزی روٹی کمانے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔ ایسا شخص اس شرط پر توکل اور توکل کی حدود سے باہر نہیں ہوگا کہ وہ اپنی کفایت شعاری، طاقت، مرتبہ یا مہارت پر انحصار نہ کرے کیونکہ یہ چیزیں ایک لمحے میں ختم ہو سکتی ہیں، بلکہ اس کی نظریں حقیقی رزق پر ہیں جس نے ان چیزوں کی حفاظت کی اور اس کے لیے ذریعہ معاش کو آسان بنایا۔ خدا کے مقابلے میں بادشاہ کے ہاتھ میں قلم کی طرح کمانے کے لیے اپنی صلاحیت، قابلیت اور طاقت پر غور کرنا چاہیے۔ بادشاہ کے ساتھیوں کی نظریں اس کے قلم پر نہیں بلکہ اس کے دل پر ہیں کہ وہ کیا سوچے گا اور وہ کس کی طرف توجہ دے گا اور کس کے بارے میں فیصلہ کرے گا۔

جو شخص اپنے بچوں کے لیے کماتا ہے یا مسکینوں اور مسکینوں پر خرچ کرنے کے لیے کماتا ہے وہ وہ ہے جو اپنے جسم سے کماتا ہے لیکن اپنے دل سے الگ ہو جاتا ہے۔ ایسے شخص کی حالت اس شخص کے مقابلے میں بہتر

اور قابل تعریف ہے جو صرف گھر پر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ روزی روٹی کمانے اللہ تعالیٰ پر توکل کے خلاف نہیں ہے اگر شرائط پوری ہو جائیں اور خدا کے علم اور قرب کا خیال رکھیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ وبا میں توکل خدا کے بارے میں

ہم یہاں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے ایک تاریخی واقعہ پیش کرتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ پر توکل کی مزید وضاحت کی جا سکے۔ ایک مرتبہ آپ نے دوسرے صحابہ کرام کے ساتھ شام کا سفر کیا۔ جب وہ دمشق کے قریب جبیعہ پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ شام میں وباء (بوبونک طاعون - ایک متعدی یا متعدی وبائی بیماری جو زہر آلود اور تباہ کن ہے) کے پھیلاؤ سے شدید متاثر ہوا ہے [جس کے نتیجے میں اس خطے میں بہت سی اموات ہو رہی تھیں]۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ کیا انہیں شام میں داخل ہونا چاہیے یا نہیں۔ اس سوال کے نتیجے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ایک گروہ نے کہا ، "ہم بوبونک طاعون کی وجہ سے وہاں نہیں جائیں گے کیونکہ [ان حالات میں] وہاں جانا بھڑکتی ہوئی آگ میں کودنے کے مترادف ہے۔" دوسرے گروہ نے کہا: ہم جائیں گے اور اللہ پر توکل کریں گے اور جو کچھ ہمارے لیے مقرر کیا گیا ہے وہ ہم اس سے نہیں بچیں گے اور نہ ہی موت سے ڈریں گے اور نہ ہی ان لوگوں کے گروہ میں شامل ہوں گے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

أَلَمْ تَرَ إِلَى ٱلَّذِينَ خَرَجُوا۟ مِن دِيَـٰرِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ ٱلْمَوْتِ

کیا تمہیں ان لوگوں کا قصہ معلوم نہیں جو موت سے بچنے کے لیے اپنے گھروں سے نکل گئے اور وہ ہزاروں لوگ تھے۔" (سورۃ البقرۃ باب 2، آیت 243)

دونوں گروہ عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور اس معاملے میں آپ سے رائے طلب کی۔ شام میں داخل ہونے پر اصرار کرنے والے گروہ نے کہا کہ ہمیں خدا کی تقدیر سے بھاگنا نہیں چاہیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہاں ہم اللہ تعالیٰ کے مقدر سے بچ جائیں گے۔ اس کے بعد آپ نے ایک مثال سناتے ہوئے کہا کہ فرض کریں کہ تم میں سے کسی کے پاس بکریاں اور دو وادیاں ہیں جو انہیں چرانے کے لیے لے جائیں۔ ان میں سے ایک وادی سرسبز ہے اور دوسری خشک اور بنجر ہے۔ اگر یہ شخص سرسبز و شاداب وادی کو اپناتا ہے تو وہ خدا کے حکم اور مقدر کے مطابق بکریوں کو چرنے دے گا اور اگر وہ خشک اور بنجر وادی میں جائے گا تو خدا کے مقدر اور حکم سے وہ دوبارہ ایسا کرے گا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس قول کی صداقت کا تعین کیا۔ اس کے بعد انہوں نے عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کو رسول کے ذریعے ان کے پاس لانے کی درخواست کی۔ وہ ایک دن بعد پہنچے اور اختلاف رائے کا یہ نکتہ ان کے سامنے پیش کیا گیا۔ عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس معاملے میں میری رائے وہی ہے جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے سنی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ کی پاک ہے! اگر اس معاملے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت موجود ہو تو اس معاملے پر اختلاف کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ براہ کرم ہمیں بتائیں کہ اس نے کیا کہا۔ عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے یہ بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے سنی ہے کہ آپ نے فرمایا:

إِذَا سَمِعْتُمْ بِالْوَبَاءِ فِي أَرْضٍ فَلَا تَقْدَمُوا عَلَيْهِ وَإِذَا وَقَعَ وَأَنْتُمْ بِهَا فَلَا تَخْرُجُوا فِرَارًا مِنْهَا

'اگر آپ نے سنا ہے کہ کہیں وبا چل رہی ہے تو وہاں نہ جائیں [کیونکہ آپ کو اس کا سامنا کرنا پڑے گا، اس کے نتیجے میں اسے دوسروں میں مزید پھیلا دیا جا رہا ہے] اور اگر یہ (وبا) کسی ایسی جگہ سے شروع ہو جائے جہاں آپ پہلے سے موجود ہیں تو اس سے فرار نہ ہوں [کیونکہ اس کے نتیجے میں یہ دور دور تک پھیل جائے گا جس سے اس پر قابو پانا مشکل یا ناممکن ہو جائے گا]۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ نبوت سن کر بے حد خوش ہوئے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ انہوں نے اس مسئلے پر نبوت کی ہدایت کے مطابق رائے دی اور آپ نے تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ییبعہ سے اپنے ساتھ واپس لے آئے۔ (یہ روایت اور سارا واقعہ اس میں بیان کیا گیا ہے حدیث کا مجموعہ *صحیح بخاری*)

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے *توکل* نہ کرنے پر اتفاق کیا۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ انہوں نے صرف یہ نہیں کہا کہ "مجھے خدا پر توکل ہے" پھر وبائی زون میں داخل ہوئے ، بلکہ انہوں نے بہترین طریقہ استعمال کیا ، جو پیغمبری رہنمائی کے ذریعہ جانا جاتا ہے ، پھیلاؤ کو روکنے کے لئے وبائی زون میں داخل نہ ہونے کے لئے ، پھر اس کی کامیابی کے لئے خدا پر بھروسہ کیا۔ چنانچہ انہوں نے اس طرح خدا پر توکل کا اظہار کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کے معاملات میں *توکل (یعنی* یہ کہنا کہ میں خدا پر توکل کرتا ہوں، پھر ضروری کام نہ کرنا) کوئی ضرورت نہیں ہے [اس طرح کے جان لیوا حالات میں، اس کے بجائے زندگی اور انسانی فلاح و بہبود کے لیے ہر ممکن طریقے بروئے کار لانا چاہیے پھر اس کی کامیابی کے لیے خدا پر بھروسہ کرنا چاہیے]۔

وبائی علاقوں سے فرار نہ ہونے کا حکم: یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر خدا پر توکل کرنے میں اپنے آپ کو نقصان دہ چیزوں سے محفوظ رکھنا شامل نہیں ہے (یعنی صرف یہ کہنا کہ "مجھے خدا پر توکل ہے" ضروری کام کیے بغیر) تو پھر اس زمین سے فرار ہونے سے کیوں منع کیا گیا ہے جہاں آپ رہتے ہیں، اور وہاں ایک وبا پھیل جاتی ہے؟ میڈیکل سائنس میں وبا کی وجہ ہوا قرار دی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی صورتحال میں ہوا نقصان دہ ہے اور نقصان دہ چیزوں سے پرہیز کرنا سب سے بہترین علاج ہے تو پھر وبائی مرض سے فرار ہونے کی اجازت کیوں نہیں دی گئی؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ نقصان دہ چیزوں سے بچنا اتفاق رائے سے ہے نہ کہ خدا پر توکل کرنے کے خلاف۔ مثال کے طور پر ، نقصان دہ چیزوں سے تحفظ کے لئے سرجری کی جاتی ہے۔ تاہم ، ایسا لگتا ہے کہ وبائی زون سے فرار ہونا ایک الگ معاملہ ہے۔ یہ درست ہے کہ وبا کی وجہ ہوا ہے لیکن صرف بیرونی جسم سے ٹکرانے والی ہوا اس کا سبب نہیں بن سکتی، بلکہ جب گندی اور خراب ہوا سانس کے ذریعے جسم میں داخل ہوتی ہے تو یہ اندرونی جسم میں دل، پھیپھڑوں اور جھلیوں پر اپنے مضر اثرات چھوڑ دیتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وبا جسم کے بیرونی حصے کو متاثر نہیں کرتی بلکہ جسم کے اندرونی نظام کو متاثر کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی کسی شہر میں رہتا ہے اور وہاں وبائی مرض پھیل جاتا ہے تو اس بات کا زیادہ امکان ہے کہ کوئی اس کے اثرات سے محفوظ نہ رہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس وبا کا کسی پر زیادہ اثر نہ پڑے۔ اس صورت میں ، وبائی مرض سے بچنا اس کے خلاف تحفظ کی ایک توہم پرستی ہوگی۔ تاہم ، اگر وبائی زون سے فرار ہونے کی واحد وجہ یہی ہوتی تو پھر بھی یہ ٹھیک ہوتا ، لیکن اس کی ممانعت کی اور بھی بہت سی وجوہات ہیں۔ ان میں اس کی وجہ یہ بھی شامل ہے کہ اگر صحت مند افراد کو وبائی علاقوں سے نکلنے کی اجازت دی جائے تو شہر میں بیماروں اور مریضوں کے علاوہ کوئی نہیں بچے گا اور شہر میں کوئی بھی نہیں بچے گا جو انہیں خوراک، پانی اور ادویات دے سکے اور اپنی بیماریوں کی وجہ سے وہ اپنی ضروریات پوری نہیں کر سکیں گے۔ اس صورت میں شہر سے صحت مند لوگوں کا نکلنا بیماروں اور بیماروں کو ہلاک کرنے کے مترادف ہے کیونکہ ان کی صحت یابی کا امکان اس شرط پر موجود ہے کہ صحت مند لوگ وہیں رہیں گے اور انہیں مناسب دیکھ بھال فراہم کریں گے۔ مسلمانوں کو [پیغمبری روایت میں] ایک ایسی عمارت سے بیان کیا گیا ہے جہاں [عمارت] کا ایک حصہ دوسرے کو سہارا دیتا ہے [اور اس

کے نتیجے میں پوری عمارت کھڑی ہے] یا ان کا تشبیہ جسم سے دی گئی ہے، اگر اس کا ایک حصہ درد میں ہے تو جسم کے دوسرے تمام اعضاء اس درد کو محسوس کرتے ہیں۔ ہمارے اندازے میں فرار ہونے کی ممانعت کی وجہ یہی باہمی تعاون، ہمدردی، محبت اور بھائی چارہ ہے۔ اس کی اور بھی وجوہات ہو سکتی ہیں جو خدا بہتر جانتی ہیں۔ لیکن جو لوگ شہر میں داخل نہیں ہوئے ہیں ان کے لیے حکم دیا گیا ہے کہ وہ اس علاقے سے باہر رہیں کیونکہ نہ تو ان پر زہریلی اور زہریلی ہوا نے حملہ کیا ہے اور نہ ہی شہر کے بیماروں کو اس حد تک ضرورت ہے کہ اگر وہ (باہر کے لوگ) داخل نہ ہوں تو وہ (بیمار اور مریض) مر جائیں گے کیونکہ ان کی دیکھ بھال کرنے والے لوگ پہلے سے موجود ہیں۔ لیکن اگر شہر میں کوئی ایسا نہ بچا جو مریضوں کی دیکھ بھال کر سکے اور ان کے کھانا، پانی اور ادویات کا خیال رکھ سکے تو اس صورت میں کچھ لوگ ان کی مدد کے لیے شہر (یا وبائی علاقہ) میں داخل ہو سکتے ہیں اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہوگی کہ ان کے اس عمل کو قابل تعریف عمل قرار دیا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نقصان کا اندیشہ ایک توہم پرستی کا معاملہ ہے [جیسا کہ یہ ہو سکتا ہے یا نہیں ہوسکتا ہے] اور لوگوں کو خطرے سے بچانا [اور اس وجہ سے جانیں بچانا] ایک خاص معاملہ ہے [جیسا کہ اس کی یقینی ضرورت ہے]۔ یہی وجہ ہے کہ طاعون اور وبا سے بچنے کو میدان جنگ سے بھاگنے قرار دیا گیا ہے (*حدیث* کے مجموعہ *مسند احمد* میں عائشہ رضی اللہ عنہا پر منقول ہے) کیونکہ وبا سے متاثرہ شہر [یا علاقے] سے فرار ہونا زندگیوں کو تباہ کرنے کے مترادف ہے۔

یہ لطیف اور پیچیدہ معاملات ہیں۔ جو شخص ان کو نظر انداز کرتا ہے اور صرف نبوی کے بیانات کے ظاہری الفاظ اور مفہوم کو دیکھتا ہے، وہ اکثر ان معاملات کے بارے میں غلطیوں اور غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ عبادت گزاروں اور پرہیز کرنے والوں کو اکثر ان غلطیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ وہ اپنی کمی علم اور کوتاہی کی وجہ سے غلطیاں کرتے ہیں۔ یہ علم کا اعزاز ہے کہ ایسے معاملات میں علم رکھنے والا شخص بصارت کے فریب میں نہیں پھنستا، بلکہ وہ بظاہر مختلف چیزوں کو یکجا کرکے صحیح راستہ تلاش کرتا ہے۔

باب 16 - خدا کے ساتھ محبت، حسرت اور قربت، اور خدا کی مرضی اور حکم کو قبول کرنا اندرونی امن، سکون اور خوشی کو فروغ دینے کے لیے ضروری ہیں

تمام اعلیٰ باطنی خوبیوں میں محبت سب سے افضل ہے۔ یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو سب کو فتح کرتی ہے اور ہر اس چیز کو مٹا دیتی ہے جو منفی، گھناؤنی اور تباہ کن ہے۔ یہ گہرے روحانی مضمرات کے ساتھ سب کو فاتح اور سب سے آزاد کرنے والا اندرونی معیار ہے۔ لیکن یہاں جس محبت کا ذکر کیا جا رہا ہے، جو محبت کی اعلیٰ ترین شکل ہے، وہ الٰہی محبت یا الٰہی سے محبت ہے۔ یہ الہی محبت ساتھی انسانوں اور ساتھی مخلوقات کی محبت میں داخل ہوتی ہے کیونکہ وہ سب بغیر کسی استثناء کے خدا کے خاندان کا حصہ ہیں۔ وہ محبت جو صرف جسمانی بھوک سے محبت ہے وہ اس حیثیت تک پہنچنے سے قاصر ہے۔ جب عوام اور قوموں کے درمیان باہمی محبت ہو تو انصاف اور تنازعات کے حل کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ایک الہی صفت ہے جو انسان کو عطا کی گئی ہے اور تحفے میں دی گئی ہے تاکہ وہ ہر منفی اور گھناؤنی چیز کو زیر کرے اور ان تمام زنجیروں کو توڑ دے جو روح کو روحانی عروج کی سب سے بڑی بلندیوں تک پہنچنے سے روکتی ہیں۔ ایک ایسی کیفیت جب انسان اپنے آپ سے اور اپنے باطن کے ساتھ سکون میں رہتا ہے تو وہ ساتھی انسانوں کے لیے محبت پیدا کرتی ہے۔ یہ محبت ہی ہے جو نفرت پر فتح حاصل کرتی ہے، روح کو چنگل سے آزاد کرتی ہے جو اسے تھامے ہوئے ہے اور اسے خدائی حضوری میں چڑھنے دیتی ہے۔ خدائی محبت ساتھی انسانوں کے لئے محبت میں تبدیل ہوتی ہے ، اندرونی اور بیرونی سکون اور سکون کی طرف لے جاتی ہے جس کے لئے انسان اپنی روح کی گہرائی میں ترس جاتا ہے۔ محبت ان سب چیزوں کے لئے راستہ روشن کرتی ہے جو اچھائی ہے۔ خدا کی تڑپ اور خدا کے ساتھ قربت (*شوق* اور *انس*) روحانی راہ میں بہت بڑے محرک ہیں جو ابدی خوشی اور کبھی نہ ختم ہونے والی فتح کی طرف لے جاتے ہیں۔ خدا کے فیصلوں پر راضی ہونا اگرچہ یہ کسی کی پسند کے مطابق نہ ہو اور قبول کرنا مشکل بھی ہو، اپنے آپ کو پورے دل سے خدا کی مرضی کے تابع کرنا انسان کو تمام پریشانیوں ، پریشانیوں ، غموں اور مایوسی سے نجات دلاتا ہے۔ یہ کسی کو چیزوں کو بہتر بنانے کے لئے نئے طریقے تلاش کرنے اور انسانیت کو درپیش ذاتی اور اجتماعی مسائل کو حل کرنے کے لئے کام کرنے کے نئے طریقے تلاش کرنے اور آؤٹ آف باکس سوچ کو استعمال کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ غزالی نے اپنی *عظیم تصنیف "احیٰ العلوم الدین"* یا "خدا کی راہ کی احیاء" کی چوتھی جلد کے چھٹے باب یا کتاب میں محبت، حسرت اور خدا کے ساتھ قربت اور حکم الٰہی کے ساتھ امن کے بارے میں گہرائی، بصیرت انگیز اور مہارت سے بھرپور وضاحت پیش کی ہے۔ یہ یہاں مختصر شکل میں اس طرح پیش کیا گیا ہے [22]:

روحانی درجات میں محبت کو بہت بلند مقام حاصل ہے کیونکہ محبت کے بعد کے تمام مقام اس کے تابع ہوتے ہیں جیسے حسرت، قربت اور الٰہی کی قبولیت اور ان سے پہلے کے تمام مقام جیسے توبہ، صبر، پرہیز وہ تمام عوامل ہیں جو محبت کی طرف لے جاتے ہیں۔ الٰہی محبت پر ایمان رکھنا بہت مشکل ہے کیونکہ بعض علماء نے اس کے امکان کی نفی کی ہے [کہ کوئی واقعی الہی محبت حاصل کر سکتا ہے] اور اس بات کا اظہار کیا ہے کہ الٰہی محبت کا مفہوم [ان کی غلط رائے میں] اطاعت اور عبادت میں ثابت قدم رہنا ہے اور جہاں تک حقیقی [الہامی] محبت کا تعلق ہے، خدا کے ساتھ یہ ناممکن ہے کیونکہ اس طرح کی محبت صرف اپنی نوعیت کے کسی شخص کے ساتھ ہی حاصل کی جا سکتی ہے۔ ان علمی متکلمین نے نہ صرف محبت کے حصول کے امکان کی نفی کی ہے بلکہ انہوں نے محبت کے دیگر اہم عوامل جیسے قربت، حسرت، خدا سے التجا کرنے کی خوشی کی بھی نفی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ضروری ہو گیا ہے کہ ہم اس معاملے کی حقیقت (سچائی) کو واضح کریں [تاکہ اس موضوع پر تمام غلط فہمیوں اور علم کی کمی کو عقلی انداز میں دور کیا جا سکے]۔

اس کتاب میں ہم سب سے پہلے شریعت الٰہی سے محبت کی شہادت پیش کریں گے، پھر اس کی حقیقت اور اسباب پر روشنی ڈالیں گے، پھر وضاحت کریں گے کہ محبت کا حق صرف اللہ تعالیٰ کا ہے اور سب سے بڑی خوشی بصیرت الٰہی کی خوشنودی ہے اور یہ لذت ان لوگوں کے لیے کئی گنا بڑھ جائے گی جو الٰہی کی شہادت رکھتے ہیں - دنیا میں (ان کی دنیاوی زندگی کے دوران) خدا کے ساتھ علم، قربت اور قربت)۔ اس کے بعد ہم خدا کی محبت کو مضبوط کرنے اور طاقت دینے کے اسباب بیان کریں گے، اس سلسلے میں لوگ کیوں مختلف نظر آتے ہیں، پھر یہ وضاحت کی جائے گی کہ لوگ الٰہی معرفت حاصل کرنے سے قاصر کیوں ہیں۔ محبت کے بارے میں تفصیلی بحث کے بعد ہم خدا کی تڑپ کے مفہوم اور بندے کی خدا سے محبت کی نشانیاں بیان کریں گے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی تڑپ کا مفہوم بیان کیا جائے گا۔ اس کے بعد وصیت الٰہی کی قبولیت کے معنی اور فضیلت بیان کی جائے گی۔ آخر میں خدا کے چاہنے والوں کے بارے میں روایات اور ان کے اقوال کا ذکر کیا جائے گا۔

شریعت مقدس سے محبت الٰہی کے دلائل اور دلائل: مسلمانوں میں اس بات پر مکمل اتفاق ہے کہ بندے پر خدا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنا واجب ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر محبت واجب ہے تو اس کے وجود کو کیسے رد کیا جا سکتا ہے؟ اور جن لوگوں کو تم نے الٰہی اطاعت میں استقامت قرار دیا ہے، یہ کیسے درست ہو سکتا ہے کیونکہ اطاعت محبت کا ثمر ہے اور اس کے تابع ہے، جیسا کہ پہلے محبت ہے اور پھر محبوب کی اطاعت ہے؟ سب سے پہلے، ہم دلائل [مندرجہ ذیل ہیں] فراہم کریں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُۥ

"وہ ان سے محبت کرتا ہے ، اور وہ اس سے محبت رکھتے ہیں۔" (سورۃ البقرۃ باب 5، آیت 54)

وَٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ

"اور جو لوگ ایمان لائے وہ اللہ سے بہت محبت رکھتے ہیں۔" (سورۃ البقرۃ باب 2 آیت 165)

یہ دونوں آیات نہ صرف محبت کے وجود کو ثابت کرتے ہیں بلکہ اس میں شدت اور کمی کا ثبوت بھی فراہم کرتے ہیں۔
نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہت سی نبوت کی روایات میں خدا کی محبت کو ایمان کی شرط قرار دیا ہے۔
ایک روایت میں ابو زرین عقیلی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ایمان کیا ہے؟" اس نے جواب دیا:

أَنْ يَكُونَ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا

"یہ ہے کہ اللہ اور اس کا رسول بندے کے نزدیک ان کے سوا سب کے مقابلے میں زیادہ محبوب ہو جاتے ہیں"۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث کا مجموعہ *مسند احمد*)

ایک مشہور نبوی روایت کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام نے موت کے فرشتے سے پوچھا کہ کیا تم نے کسی ایسے دوست کو دیکھا جو کسی دوست کو قتل کرے؟ اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف وحی نازل فرمائی: اے ابراہیم! کیا تم نے کوئی عاشق دیکھا ہے جو اپنے محبوب سے ملنا نہیں چاہتا؟" حضرت ابراہیم علیہ السلام نے موت کے فرشتے سے فرمایا: اب میری جان لے لو! لیکن یہ بات صرف ان بندوں کے دلوں پر کھل جاتی ہے جو اپنے دل سے خدا سے محبت کرتے ہیں اور اس کی خواہش رکھتے ہیں۔ جب انہیں پتہ چلتا ہے کہ موت محبوب سے ملاقات کا سبب ہے تو ان کے دل اس کی طرف کھینچ جاتے ہیں۔ ان کے پاس کوئی دوسرا محبوب نہیں ہے جس کی کشش اور کشش وہ محسوس کریں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا میں فرمایا:

اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِي حُبَّكَ وَحُبَّ مَنْ أَحَبَّكَ وَحُبَّ مَا يُقَرِّبُنِي إِلَى حُبِّكَ وَاجْعَلْ حُبَّكَ أَحَبَّ إِلَيَّ مِنَ الْمَاءِ الْبَارِدِ

"اے خدا! مجھے اپنی محبت عطا فرما اور ان لوگوں کی محبت جو تجھ سے محبت رکھتے ہیں اور ان چیزوں کی محبت جو مجھے تیری محبت کے قریب لے جاتی ہیں اور تیری محبت کو ٹھنڈے پانی سے زیادہ محبوب بنا دے جب میری پیاس بجھانے کے لیے اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔

ایک صحرائی باشندہ (جو عام طور پر خانہ بدوش یا دور دراز صحرائی دیہاتوں سے تعلق رکھتے ہیں اور سادہ لوح لوگ ہیں جو اپنی زندگی اور معاش میں مشکلات برداشت کرنے کے عادی ہیں اور عام طور پر شہر کے لوگوں کے عادی اخلاق سے واقف نہیں ہیں] نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور پوچھا: یا رسول اللہ! قیامت کا دن کب آئے گا؟" نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں ان سے پوچھا کہ تم نے قیامت کے لیے کیا تیاری کی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے نہ تو بہت نماز پڑھی اور نہ میں نے بہت روزہ رکھا بلکہ میں اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہوں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ

"آپ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن سے آپ محبت کرتے ہیں۔"

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے اس دن سے پہلے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس سے زیادہ خوش کبھی نہیں دیکھا تھا کہ وہ اللہ اور اس کے رسول سے بے پناہ محبت رکھتے تھے اور جانتے تھے کہ وہ ہمیشہ ان کے ساتھ رہیں گے، اس کے تابع اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے ساتھ۔ ان کے لیے بے پناہ خوشی کا باعث تھا]۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *احادیث* کا مجموعہ *صحیح بخاری* اور *صحیح مسلم* انس رضی اللہ عنہ سے ہے

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: خدا کے عاشقوں کو جو خوشی ملتی ہے وہ انہیں دنیا کی تلاش سے روکتی ہے اور انہیں تمام انسانوں سے بے نیاز بنا دیتی ہے۔ حضرت ابو سلیمان دارانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں بعض لوگ ایسے بھی ہیں جنہیں جنت اور اس کی برکتوں سے خدا سے روکا نہیں جاتا، تو دنیا ان کو اللہ سے کیسے روک سکتی ہے؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تین لوگوں کے پاس سے گزرے جن کے جسم کمزور اور زرد نظر آ رہے تھے۔ اس نے ان سے پوچھا کہ تمہاری یہ حالت کیوں ہے؟ کہنے لگے جہنم کے عذاب کے ڈر سے آپ نے فرمایا: بے شک اللہ اس سے بچائے گا جو اس سے ڈرتا ہے۔ اس کے بعد وہ راستے میں آگے بڑھا اور تین اور لوگوں کو دیکھا جو پہلے تین سے زیادہ کمزور اور زرد تھے اور ان سے پوچھا، "آپ کی یہ حالت کیوں ہے؟" انہوں نے جواب دیا کہ جنت کی خواہش اور تڑپ نے اس کا سبب بنا ہے! آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ وہ چیز دے گا جس کی تمہیں بہت خواہش ہے۔ اس کے بعد وہ راستے میں آگے بڑھا اور تین اور لوگوں کو دیکھا جو اس سے پہلے ملنے والوں کے مقابلے میں اور بھی زیادہ کمزور اور پیلے رنگ کے تھے۔ اس نے ان سے پوچھا کہ تمہاری یہ حالت کیوں ہے؟ انہوں نے کہا، "ہم خدا سے محبت رکھتے ہیں! [اور اس محبت میں ہم ہر چیز سے غافل ہو گئے ہیں۔] آپ نے فرمایا: تم اللہ کے قریبی ہو۔ تم اللہ کے قریبی ہو۔"

حرم بن حیان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب کوئی مومن اپنے رب کو پہچانتا ہے، اس سے محبت کرتا ہے اور جب اس سے محبت کرتا ہے تو اس کی طرف توجہ اور توجہ مرکوز ہو جاتی ہے، اور جب اس توجہ اور توجہ کی مٹھاس پاتا ہے تو وہ دنیا کی طرف خواہش سے نہیں دیکھتا اور نہ ہی آخرت کی طرف دیکھتا۔ ایسا شخص اس دنیا میں جسم کے ساتھ اور آخرت میں اپنی جان کے ساتھ رہتا ہے۔ یحییٰ بن معاذ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مغفرت تمام گناہوں پر محیط ہے، اس کی قبولیت کی کیا حالت ہوگی؟ اس کی قبولیت (*رضا*) میں تمام امیدوں کا احاطہ کیا گیا ہے، اس کی محبت کی حالت کیا ہوگی؟ اس کی محبت انسان کو عقل و شعور سے غافل کر دیتی ہے، اس کی محبت بھری محبت کی کیا کیفیت ہو گی؟ اس کی محبت (*موضمہ*) خدا کے سوا سب کچھ بھول جاتی ہے، اس کی شفقت آمیز نرمی (*لطف*) کا کیا حال ہوگا؟ یحییٰ بن معاذ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میری رائے میں خدا کی محبت کا ایک ذرہ ستر سال کی عبادت سے بہتر ہے جو محبت سے پاک ہو۔ اب ہم محبت کی حقیقت کی وضاحت کریں گے کیونکہ اس کے معنی میں کچھ پیچیدگی ہے۔

محبت کی حقیقت، اس کے اسباب اور خدا کی اپنے بندے سے محبت کا مفہوم

یہ موضوع اس وقت تک واضح اور قابل فہم نہیں ہو گا جب تک کہ اس بات کی وضاحت نہ کی جائے کہ محبت کی حقیقت کیا ہے، اس کے اسباب اور شرائط کیا ہیں، اور خدا کے بندے کے لیے محبت کا کیا مطلب ہے۔ سب سے پہلے، ہم کچھ بنیادی معاملات کی وضاحت کریں گے۔

محبت کی حقیقت: پہلی بات یہ ہے کہ محبت کا تصور بھی اس وقت تک نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ گہری ادراک اور ادراک نہ ہو جائے، کیونکہ انسان صرف اس چیز سے محبت کر سکتا ہے جسے وہ سمجھنے کے قابل ہو، اسی لیے یہ خوبی بے جان اشیاء میں نہیں پائی جاتی کیونکہ ان میں نہ تو ادراک ہے اور نہ ہی ادراک، بلکہ یہ اس شخص کی

صفت (موروثی خصوصیت) ہے جو ایک زندہ ادراک والا وجود ہے۔ اس کے بعد ادراک یا تو ادراکی ہستی (شخص یا فرد) کے مزاج کے لیے سازگار اور موزوں ہوتے ہیں اور کسی کو لذت دیتے ہیں یا وہ اس (مزاج) کے خلاف ہوتے ہیں اور اس کو نقصان پہنچاتے ہیں کیونکہ وہ ادراکی ہستی کو نہ تو لذت کے لحاظ سے متاثر کرتے ہیں اور نہ ہی نقصان کے لحاظ سے۔ اس طرح ادراک تین قسمیں ہیں: وہ جو ادراک کرنے والے کے مزاج کے مطابق ہوں اور جو ان سے محبت کرتا ہے اس کے لیے خوش کن ہوں۔ وہ جو ادراک کرنے والی ہستی سے ناپسند کرتے ہیں جو ان سے تکلیف اٹھاتے ہیں یا ان سے نفرت کرتے ہیں۔ اور وہ ادراک جو نہ تو خوشی کا سبب بنتے ہیں اور نہ ہی تکلیف کا سبب بنتے ہیں، وہ نہ تو محبوب ہیں اور نہ ہی نفرت کرتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ ، وہ چیزیں جو کسی کے لئے خوشگوار ہیں ، وہ کسی کے لئے پیاری ہیں۔ کسی چیز کے لیے محبوب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا مزاج اس کی طرف مائل ہوتا ہے اور کسی چیز سے نفرت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا مزاج اس سے نفرت کرتا ہے یا ناپسند کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ، محبت [انسانی] مزاج کا اس چیز کی طرف جھکاؤ ہے جس سے انسان کو خوشی یا خوشی ملتی ہے۔ اگر یہ رجحان پختہ اور شدید ہو جائے تو اسے شدید محبت کہا جاتا ہے۔ اسی طرح نفرت یہ ہے کہ مزاج اس چیز سے بیزار ہو جاتا ہے جس سے کسی کو تکلیف ہوتی ہے۔ جب یہ نفرت میں شدت آتی ہے تو ، یہ نفرت بن جاتی ہے۔

حواس اور محبت کے ادراک: دوسری بات یہ ہے کہ جب محبت ادراک اور ادراک کے تابع ہو جائے گی تو اس کی تقسیم اسی طرح کی جائے گی جس طرح ادراک اور حواس کے لیے کی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر احساس کے لئے ، ان چیزوں میں سے کسی خاص چیز کا ادراک ہوتا ہے جو سمجھی جاتی ہیں (مثال کے طور پر ، بینائی کا احساس جو آنکھ میں رہتا ہے ، اشیاء کی شکلوں اور شکلوں کو سمجھتا ہے)۔ ہر احساس کو بعض ادراک سے لذت اور لذت ملتی ہے اور یہ لذت مزاج کو اس کی طرف مائل کرنے کا سبب بنتی ہے اور صحت مند مزاج کے لیے وہ ادراک محبوب ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر آنکھوں کی لذت اور لذت ان ادراک میں ہوتی ہے جو آنکھ سے محسوس ہوتی ہیں جیسے خوبصورت چیزیں اور خوبصورت چہرے۔ کان کی لذت اور لذت ان ادراک میں ہے جو کان سے محسوس ہوتے ہیں جیسے سریلی گیت اور تازگی کی آوازیں۔

ناک کی لذت اور خوشی ان ادراک میں ہے جو ناک کے ذریعے محسوس کی جاتی ہیں جیسے خوشگوار خوشبو۔ اسی طرح ذائقہ کی لذت کھانوں میں ہوتی ہے اور چھونے کی لذت نرم اور نرم چیزوں میں ہوتی ہے کیونکہ یہ چیزیں جو ادراک کی جاتی ہیں وہ حواس کو لذت بخشتی ہیں اور اسی وجہ سے انہیں محبوب سمجھا جاتا ہے اور صحت مند مزاج ان کی طرف مائل ہوتا ہے۔ جہاں تک پانچوں حواس کی لذتوں اور لذتوں کا تعلق ہے، جانور بھی انسانوں کے ساتھ ساتھ ان میں حصہ لیتے ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی شخص محبت کو پانچ حواس کے ادراک تک محدود رکھتا ہے اور کہتا ہے کہ خدا کو پانچ حواس سے نہیں سمجھا جاتا اور اسی لیے خدا سے محبت کرنا ناممکن ہے۔ اس صورت میں انسان کی وہ خصوصیت (خصوصیت) جو ہم فرض کر رہے ہیں وہ غلط ہو جائے گی اور چھٹی حس (جو پانچ بیرونی حواس کے علاوہ انسان کے پاس ہے) بیکار ہو جائے گی جس کی بنیاد پر انسان کو جانوروں پر امتیاز اور برتری حاصل ہے اور چھٹی حس کو عقل سمجھا جا سکتا ہے۔ [اندرونی] روشنی، دل، یا اس طرح کا کوئی اور لفظ تاہم، یہ کہنا غلط ہوگا کہ [خدا سے محبت کرنا ناممکن ہے کیونکہ خدا کو پانچ حواس سے نہیں سمجھا جاتا] کیونکہ باطنی بصیرت [اور روشنی] بیرونی فہم سے زیادہ طاقتور اور طاقتور ہے۔ آنکھ کے مقابلے میں دل زیادہ ادراک کرتا ہے اور معانی کی خوبصورتی کا ادراک جو عقل کے ذریعے کیا جاتا ہے وہ ظاہری صورتوں کی خوبصورتی سے کہیں زیادہ ہے جو آنکھ سے محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ مقدس الٰہی امور کے بارے میں دل کا ادراک مکمل لذت اور لذت فراہم کرے گا جو پانچوں حواس کے ادراک کے دائرے (حدود یا حدود) سے خارج ہو جائے گا اور صحت مند مزاج اور صحیح عقل ان کی طرف زیادہ مضبوطی سے مائل ہو جائے گی اور محبت کا مفہوم یہ ہے کہ دل اس چیز کی طرف مائل ہو جس

کا ادراک لذت بخش اور لذت بخش ہو۔ ہم جلد ہی اس کی تفصیلات فراہم کریں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ صرف وہی شخص خدا کی محبت کا انکار کر سکتا ہے جو جانوروں کی سطح پر ہے اور [پانچ خارجی] حواس کے ادراک سے اوپر اٹھنے سے قاصر ہے۔

محبت کی اسباب: تیسری بات یہ ہے کہ انسان اپنے نچلے نفس سے محبت کرتا ہے اور بعض اوقات اپنے نچلے نفس کی خاطر کسی دوسرے شخص سے محبت کرتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص دوسرے کی وجود کی خاطر دوسرے سے محبت کرے بغیر اپنے نچلے نفس کی خاطر ایسا کرے؟ جہاں تک [روحانی] کمزوروں کا تعلق ہے، وہ اس سوال کا جواب نفی میں دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ ممکن نہیں ہے کہ انسان کسی دوسرے سے صرف دوسرے کی وجود کے لیے محبت کر سکے اور اس محبت کا اپنے وجود سے کوئی تعلق نہیں ہے (یعنی کسی دوسرے سے محبت کرنا اور اس کے بدلے میں کچھ واپس نہ چاہتا)۔ حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کی محبت ممکن بھی ہے اور موجود بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم یہاں محبت کے اسباب اور ان کی اقسام کی وضاحت کریں گے۔

یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ ہر زندہ شخص کے لیے پہلا محبوب اپنا اور اپنا وجود ہے۔ نفس کی محبت کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا مزاج اپنے وجود کے دائمی ہونے اور اپنے عدم وجود اور موت کی نفرت کی طرف مائل ہے۔ فطرت کے لحاظ سے صرف وہی چیز محبوب ہے جو عاشق کے لیے موزوں ہے، اور نفس کے لیے اس کے دائمی وجود سے زیادہ سازگار اور کیا ہو سکتا ہے، اور اپنے عدم وجود اور موت سے زیادہ ناموافق اور کیا ہو سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ انسان زندگی سے محبت کرتا ہے اور موت سے نفرت کرتا ہے۔ اس نفرت کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ کوئی بھی اپنی موت پر راضی نہیں ہوتا اور موت کو برا نہیں سمجھتا۔ لیکن اگر کسی کو زندگی میں بے پناہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور مصائب برداشت کرتے ہیں تو موت کے ساتھ مصائب کا خاتمہ ٹھیک ہو سکتا ہے لیکن اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ موت کو پیار کرتا ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے دکھوں اور مصائب کا خاتمہ چاہتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ انسان فطری فطرت کے لحاظ سے موت اور عدم سے نفرت کرتا ہے اور وجود کے دائمی ہونے سے محبت کرتا ہے۔ جس طرح دائمی وجود محبوب ہے اسی طرح وجود کا کمال بھی محبوب ہے کیونکہ جو نامکمل ہے اس میں کمال نہیں ہے اور نقصان بھی کمال کے مقابلے میں عدم کی طرح ہے۔ عدم وجود، خواہ وہ [باطنی] صفات کا ہو یا وجود، کسی کی نفرت کا مستحق ہے۔ جس طرح وجود کی دائمیت محبوب ہے اسی طرح کمال کی صفت کا وجود بھی محبوب ہے۔ یہ اس فطرت میں موروثی ہے جو خدا نے باطنی انسانی مزاج میں عطا کی ہے۔ خدا کا راستہ تبدیل نہیں ہوتا۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کا پہلا محبوب اپنا ہی ہوتا ہے، پھر اس کے جسمانی اعضاء، دولت، اولاد، خاندان اور رشتہ داروں کی حفاظت محبوب ہوتی ہے۔ اعضاء کی حفاظت اس لیے محبوب ہے کہ وجود کا کمال اور دوام ان پر منحصر ہے، دولت اس لیے محبوب ہے کہ یہ وجود کے دائمی ہونے کا آلہ ہے۔ باقی تمام چیزوں کو اس طرح اخذ کیا جا سکتا ہے۔ انسان اپنے بچے سے محبت کرتا ہے، اگرچہ اس سے اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور اس میں اسے تکلیفوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے، کیونکہ بچہ مرنے کے بعد اس کی جگہ لے گا اور اس کے جانے کے بعد اس کی آنے والی نسلیں جاری رہیں گی، اور یہ اس کے اپنے وجود کے تسلسل کے مترادف ہے، اور اس میں اس کا دائمی وجود پاتا ہے۔ یہی حال اپنے وسیع خاندان اور رشتہ داروں کا ہے کیونکہ انسان ان سے اپنے نفس کے کمال کی وجہ سے محبت کرتا ہے، کیونکہ وہ اپنے نفس کو ان کی وجہ سے مضبوط سمجھتا ہے، اور ان کا کمال اس کے لیے فخر کا باعث ہے۔ دولت، تعلقات، بیرونی عوامل انسانی بازوؤں کی طرح ہیں جو انسان کو مکمل کرتے ہیں۔ لہٰذا وجود کا

وجود، کمال اور دائمی وجود کسی کو محبوب ہے اور اس کے مخالف ہر چیز کو ناپسند کیا جاتا ہے۔ یہ **محبت کی پہلی وجہ** ہے [جو کسی کے اپنے وجود کا کمال اور دائمی ہے]۔

محبت کی دوسری وجہ احسان ہے۔ انسان کسی کے ساتھ احسان یا نیکی سے محبت کرتا ہے اور انسان کی فطری فطرت میں داخل ہو گیا ہے کہ وہ کسی پر احسان کرنے والوں سے محبت کرے۔ جو شخص کسی کو عطا کردہ نعمتوں کی وجہ سے محبت کرتا ہے وہ مہربان کی ہستی سے محبت نہیں کرتا بلکہ احسان سے محبت کرتا ہے۔ احسان محسن کا عمل ہے، اگر وہ قائم نہ رہے تو محبت بھی باقی نہیں رہتی، حالانکہ محسن کی ہستی رہتی ہے، گویا محبت کی کثرت یا کمی کا دارومدار احسان کی کثرت یا کمی پر ہے۔

محبت کی تیسری وجہ یہ ہے کہ کسی چیز سے اس کے وجود کی وجہ سے محبت کی جائے نہ کہ اس کے وجود سے حاصل ہونے والے کسی فائدے یا نفع کی وجہ سے بلکہ اس کا وجود ہی نفع ہے۔ یہ حقیقی اور ابدی محبت ہے اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ محبت ہمیشہ کے لیے قائم رہے گی، نہ کہ اس کے وجود سے آنے والے کسی فائدے یا نفع کی وجہ سے، بلکہ اس کا وجود ہی نفع ہے۔ یہ حقیقی اور ابدی محبت ہے اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ محبت ہمیشہ رہنے والی ہے۔ تمام صحت مند مزاج خوبصورت پھولوں، تصاویر، خوبصورت آوازوں کے ساتھ چمکدار رنگ کے پرندوں وغیرہ سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگ ان چیزوں کو دیکھ کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ بہرحال یہ سب چیزیں لذت بخش اور لذت بخش ہیں اور ایسی ہر چیز محبوب ہے۔ ہر خوبصورتی کا ادراک خوشگوار ہوتا ہے۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ خدا خوبصورت ہے تو وہ ہر اس شخص کا محبوب ہو گا جس پر اس کی عظمت اور خوبصورتی نازل ہوئی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إِنَّ اللّٰهَ جَمِيلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ

"خدا خوبصورت ہے اور خوبصورتی سے محبت کرتا ہے" (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے حدیث کا مجموعہ *صحیح مسلم* عن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

محبت کی چوتھی وجہ خوبصورتی ہے۔ خوبصورتی بھی محبت کی ایک اہم وجہ ہے۔ لیکن خوبصورتی کیا ہے؟ اس کی وضاحت کرنا ضروری ہے۔ وہ لوگ جو ظاہری شکل پر نظر رکھتے ہیں اور احساسات اور ادراک کے قیدی ہیں، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ حسن یہ ہے کہ انسان کے پاس متوازن اعضاء، چہرے کے اچھے خدوخال، سرخ اور ہلکا رنگ اور قد اچھا ہو۔ عام طور پر ایسے لوگوں کو خوبصورت کہا جاتا ہے کیونکہ یہ وہ خصوصیات ہیں جو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے پاس یہ قیاس ہے کہ کوئی چیز جو آنکھ سے نہیں دیکھی جا سکتی، خیال میں گھیرے میں نہ آئے، اور اچھی رنگت اور خدوخال سے خالی ہو، وہ خوبصورت نہیں ہے اور مشابہت یا مطلوبیت کی حد تک بھی نہیں پہنچتی، حالانکہ یہ ایک غلط خیال ہے۔ خوبصورتی کا انحصار ان چیزوں پر نہیں ہوتا جو آنکھ سے دیکھی جا سکتی ہیں یا جسمانی ساخت کے توازن یا ہلکے سرخ رنگ پر دیکھی جا سکتی ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ تحریر خوبصورت ہے، یہ آواز خوبصورت ہے، یہ گھوڑا اچھا ہے، بلکہ ہم یہ کہنے کی حد تک جاتے ہیں کہ یہ کپڑا خوبصورت ہے اور یہ برتن خوبصورت ہے۔ آواز، تحریر اور دیگر تمام چیزوں کی خوبصورتی کا کیا مطلب ہے؟ اگر حسن صرف چہرے میں موجود ہے، اگرچہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ آنکھ کو خوبصورت تحریر میں خوشی ملتی ہے، کان کو خوبصورت گیتوں میں خوشی ملتی ہے، دنیا کے تمام ادراک یا تو اچھے ہیں یا برے، تو خوبصورتی کا کیا مطلب ہے جو ہر چیز میں مشترک ہے؟ ہم اس پر کچھ روشنی ڈالیں گے۔

ہر چیز کی خوبصورتی اس بات میں ہے کہ جو کمال اس کے لیے موزوں ہے یا ممکن ہے، وہ اس میں جمع ہو جاتا ہے۔ اگر اس کے تمام ممکنہ کمالات کسی چیز میں جمع ہو جائیں تو وہ خوبصورت کہلانے کا مستحق ہے، اور اگر کچھ کمالات موجود ہیں اور کچھ نہیں ہیں تو وہ چیز اس کے کمالات کی حد تک خوبصورت ہو گی۔ مثال کے طور پر ، ہر گھوڑے کو خوبصورت نہیں کہا جاسکتا ہے ، اس کے بجائے صرف اس گھوڑے کو خوبصورت کہا جائے گا جس میں وہ تمام خصوصیات ہیں جو ایک اچھے گھوڑے کے لئے ضروری ہیں - ظاہری شکل ، ساخت ، رنگ ، رفتار ، لگام پر اس کے ردعمل کی خوبصورتی وغیرہ۔ خوبصورت تحریر وہ ہے جس میں لکھنے سے متعلق تمام کمالات جمع ہوں جیسے حروف اور الفاظ کا توازن، روانہ، ترتیب، تنظیم کی خوبصورتی وغیرہ۔ ہر چیز کا ایک کمال ہوتا ہے جو اس کے لئے مخصوص ہوتا ہے اور کسی اور چیز سے مخصوص نہیں ہوتا بلکہ دوسری چیز میں اس کمال کی عدم موجودگی کو دوسری چیز کے لئے خوبصورتی کہا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز کی خوبصورتی اس کمال میں ہے جو اس کے لیے مخصوص ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن کمالات کی بنیاد پر گھوڑے کو اچھا کہا جاتا ہے وہ وہی نہیں ہوں گے جن کی بنیاد پر انسان کو اچھا کہا جاتا ہے اور جن خصوصیات کی بنیاد پر کسی تحریر کو اچھا کہا جاتا ہے وہ گھوڑے کو اچھا کہنے کے لیے وہی نہیں ہوں گے۔ اس اصول کی بنیاد پر تمام معاملات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

یہاں آپ کہہ سکتے ہیں کہ جن چیزوں کا ابھی ذکر کیا گیا ہے وہ صرف آنکھ سے نہیں بلکہ کچھ دوسرے حواس جیسے آواز (کانوں سے ادراک کیا جاتا ہے) اور ذوق سے بھی ادراک کرتے ہیں جو دوسرے حواس سے متعلق ہیں، یہ ثابت کرتے ہیں کہ خوبصورتی کا تعلق حواس اور احساسات سے ہے، تاہم ان چیزوں کا ادراک جو [پانچ] حواس میں سے کسی کو بھی محسوس نہیں کر سکتے، کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ خوبصورتی کا انحصار صرف حواس اور احساسات کے ادراک پر نہیں ہوتا بلکہ وہ چیزیں جو حواس سے محسوس یا ادراک نہیں کر سکتیں ان میں خوبصورتی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ، یہ کہا جاتا ہے کہ یہ کردار کی خصوصیت اچھی ہے ، یہ علم اچھا ہے ، یہ خوبی اچھی ہے ، یہ طرز عمل اچھے ہیں۔ خوبصورت کردار کی خصوصیات سے مراد علم، شائستگی، بہادری، خدا سے ڈرو، مہربانی، فکر مند، غور و فکر اور دیگر اچھے کردار کی خصلتیں، اندرونی مزاج اور مزاج ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی پانچوں حواس کے ذریعہ نہیں سمجھا جاتا ہے ، بلکہ وہ باطنی بصیرت (*بصیرہ*) کی روشنی یا روشنی سے ادراک کرتے ہیں۔ یہ تمام خوبصورت کردار کی خصوصیات محبوب ہیں اور جس کے پاس ان کا مالک ہے وہ بھی کسی ایسے شخص کا محبوب ہے جو ان کردار کی خصوصیات سے واقف ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ انسانی مزاج میں یہ بات موجود ہے کہ وہ اپنے انبیاء اور صحابہ کرام سے محبت کریں گے، حالانکہ انہوں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا ہے [یا یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ کیسا نظر آتے ہیں]۔

کچھ لوگ اپنے مذہبی پیشواؤں سے بے حد محبت کرتے ہیں اور ان کے دفاع میں اپنا سارا مال خرچ کرتے ہیں اور ان لوگوں کی تردید کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے ہیں جو ان پر تنقید کرتے ہیں، حالانکہ انہوں نے انہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا اور اگر وہ انہیں دیکھتے ہیں تو شاید وہ ان کی شکلیں بھی پسند نہ کریں۔ اس کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے ان کی ظاہری شکل اور شکل و صورت کی وجہ سے ان سے محبت نہیں کی بلکہ ان کی باطنی شکل (یعنی ان کا علم، سمجھ، اعلیٰ کردار کی خصوصیات، خدا کے ساتھ قربت وغیرہ) دیکھ کر ان سے شدت سے محبت کی ہے۔ ان کی ظاہری شکلیں خاک میں گھل مل کر خاک بن گئی ہیں، اب بھی ان سے محبت کرتا ہے اور ان کے باطنی صفات اور صفات کی وجہ سے ان کے لیے وقف رہتا ہے جیسے ان کا ایمان، خوف خدا، علم کی وسعت، دین کی نزاکتوں سے واقفیت، راہ الٰہی کے علم کو پھیلانے کے لیے جدوجہد کرنا۔ یہ تمام چیزیں خوبصورت ہیں اور یہ تمام خوبیاں بہترین ہیں۔ ان کی خوبصورتی کا ادراک صرف باطنی بصیرت کی روشنی سے ہوتا ہے کیونکہ حواس ان

کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے محبت کرنے والوں کا یہی حال ہے۔ جو شخص اس سے محبت کرتا ہے وہ اس کی ہڈیوں، جسم، جلد، اعضاء، شکل و صورت سے محبت نہیں کرتا کیونکہ یہ چیزیں معدوم ہو چکی ہیں یا کسی اور چیز میں تبدیل ہو چکی ہیں لیکن وہ (غیر جسمانی اور غیر مادی) چیزیں باقی رہ گئی ہیں جن کی وجہ سے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خدا کے قربت، قربت، قربت اور معرفت کے درجے پر پہنچے) ، دوسرے لفظوں میں ، اس کے عظیم کردار کی خصوصیات اور خوبصورت اندرونی خوبیاں ہیں۔ اس سے محبت انہی خوبیوں کی وجہ سے ہے، حالانکہ ظاہری شکل معدوم ہو چکی ہے۔

ان تمام خوبصورت باطنی صفات کی ابتدا اور وجہ علم اور قابلیت (*قدرہ*) ہے، دوسرے لفظوں میں ان بزرگوں نے معاملات کی حقیقت کا علم حاصل کیا اور نچلی ذات کی خواہشات اور خواہشات پر قابو پا کر اپنے نفس کو خوبصورت باطنی صفات، مزاج اور مزاج سے آراستہ کرنے کی صلاحیت حاصل کی۔ باقی تمام باطنی صفات اسی علم اور قابلیت سے پیدا ہوتی ہیں اور ان دونوں کو کسی ظاہری احساس سے ادراک نہیں کیا جاتا اور ان کی کوئی ظاہری شکل، شکل اور رنگ نہیں ہے جو آنکھ پر ظاہر ہو سکے اور اس کے نتیجے میں اسے محبوب سمجھا جا سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خوبصورتی اندرونی کردار اور عادات میں موجود ہے۔ اگر علم اور قابلیت خوبصورت باطنی کردار کا سرچشمہ نہ ہوتی تو یہ معاملہ محبت کی وجہ نہ ہوتا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حقیقی محبوب خوبصورت باطنی کردار کا اظہار ہے جسے قابل تعریف کردار اور خوبصورت صفات کہا جاتا ہے اور ان کا منبع علم اور قابلیت ہے۔ یہ اظہار انسانی فطرت کے لئے محبوب ہے ، حالانکہ اسے [ظاہری] حواس سے محسوس نہیں کیا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب لوگ حاتم طائی کی سخاوت اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی بہادری کی داستانیں سنتے ہیں تو بے قابو اور غیر محسوس طور پر ان سے محبت کرنے لگتے ہیں، حالانکہ حاتم کی سخاوت آنکھوں سے ادراک نہیں ہوتی اور نہ ہی خالد کی بہادری کی خوبی آنکھوں سے دیکھی جاتی ہے اور یہ محبت نہ تو ان کی ظاہری شکل دیکھ کر پیدا ہوتی ہے اور نہ ہی اس سے کسی متوقع نفع کی وجہ سے ہوتی ہے وہ جو ان لوگوں تک پہنچ سکتے ہیں جو ان سے محبت کرتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ محبت کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ محبوب عاشق پر کوئی احسان کرتا ہے، بلکہ محبوب کو محبوب کے ہونے کی وجہ سے پیار کیا جاتا ہے (اس وجہ سے کہ محبوب کا ہے اور کسی اور چیز کے لیے نہیں)، اگرچہ محبوب کی کوئی نعمت عاشق تک نہیں پہنچتی۔ محبوب کا وجود محبوب ہے کیونکہ ہر خوبصورتی محبوب ہے۔ شکلیں دو قسمیں ہیں - بیرونی اور باطنی۔ ظاہری شکل یا ظاہری شکل آنکھ سے دیکھی جاتی ہے اور باطنی شکل کو باطنی بصیرت (*بصیرہ*) سے سمجھا جاتا ہے۔ جو شخص باطنی بصیرت سے عاری ہے وہ نہ تو اس (باطنی خوبصورتی) کو محسوس کرتا ہے اور نہ اس سے کوئی لذت حاصل کرتا ہے اور نہ اس سے محبت کرتا ہے اور نہ اس کی طرف مائل ہوتا ہے۔ جس کی باطنی بصیرت بیرونی حواس سے زیادہ مضبوط ہو، وہ بیرونی معانی پر باطنی معانی کو ترجیح دیتا ہے اور انہیں محبوب سمجھتا ہے۔ دو افراد میں بہت بڑا فرق ہے کہ ان میں سے ایک دیوار پر ڈرائنگ کو اس کی ظاہری خوبصورتی کی وجہ سے پسند کرتا ہے اور دوسرا اپنی باطنی خوبصورتی کی وجہ سے نبی سے محبت کرتا ہے۔

محبت کی پانچویں وجہ ایک خفیہ موزونیت (مطابقت) ہے جو عاشق اور محبوب کے درمیان موجود ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ دو انسانوں کے درمیان ایک مضبوط تعلق یا رشتہ خوبصورتی یا کسی اور فائدے کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کی روحوں کی مطابقت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ ہم نے اس پر غزالی کی *کتاب "احیاء العلوم الدین" کی دوسری جلد یا چوتھائی کتاب* پر روشنی ڈالی ہے جو اس مقالے میں شامل نہیں ہے۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ محبت کی پانچ وجوہات ہیں۔ پہلی بات یہ کہ انسان اپنی ذات اور کمال کے وجود اور استحکام سے محبت کرتا ہے۔ دوسرا یہ کہ ان لوگوں سے محبت کریں جو کسی پر احسان کرتے ہیں اور کسی کے وجود اور دائمی زندگی میں مدد کرتے ہیں اور کسی میں جہالت کا مقابلہ کرتے ہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ کسی ایسے شخص سے محبت کریں جس نے کوئی احسان نہ کیا ہو لیکن دوسروں نے اس سے فائدہ اٹھایا ہو۔ چوتھا یہ ہے کہ کسی ایسے شخص سے محبت کرنا جو اپنے وجود میں خوبصورت ہو، چاہے وہ ظاہری شکل میں ہو یا باطنی شکل یا معنی میں۔ پانچواں یہ ہے کہ کسی ایسے شخص سے محبت کریں جس کے ساتھ خفیہ مطابقت ہو۔ اگر یہ پانچوں وجوہات [محبت] ایک شخص میں جمع ہو جائیں تو اس شخص کی محبت مکمل ہو جائے گی اور بہت اونچی سطح پر ہو جائے گی۔ اگر کسی کا بچہ خوبصورت، خوش اخلاق، علم والا، عقلمند ہو، لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے، کسی کی اچھی خدمت کرتا ہے اور فرمانبردار ہے تو والدین کو اس بچے سے بے پناہ محبت ہوتی ہے تو یہ محبت اس حد تک مضبوط اور وسیع ہو جائے گی کہ یہ کردار کی خصوصیات ایک میں مکمل ہوں گی۔ اب ہم وضاحت کریں گے کہ ان تمام [پانچ] اسباب [محبت] کا کمال اور جمع ہونا صرف خدا کے وجود میں ہی ممکن ہے اور حقیقت میں، وہ محبت کا مستحق ہے۔

خدا ہی محبت کا مستحق ہے

اگر کوئی شخص خدا کی طرف مائل نہ ہو بلکہ خدا کے سوا کسی اور کی طرف مائل ہو تو یہ اس کی عدم فہم اور علم الٰہی سے دوری کا ثبوت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ گہری باطنی بصیرت رکھنے والوں کے لیے خدا کے سوا کوئی اور محبت کا مستحق نہیں ہے اور کوئی اور محبوب کہلانے کا اہل نہیں ہے۔ یہ دعویٰ بغیر کسی ثبوت کے نہیں ہے اور ہم آنے والے صفحات میں یہ ثابت کریں گے کہ محبت کی پانچوں وجوہات کا امتزاج صرف خدا کے وجود میں ہی ممکن ہے۔ یہ کسی کے سوا کسی اور میں ممکن نہیں ہے، جیسا کہ خدا کے سوا کسی اور کے پاس زیادہ سے زیادہ ایک یا دو وجوہات ہیں اور وہ بھی تمثیلی معنوں میں، بلکہ کسی کے [صرف] قیاس اور فکر کے معنوں میں۔ دوسری طرف خدا میں ان تمام [پانچ] اسباب کا مجموعہ اور امتزاج حقیقی ہے۔ جب ہم اس معاملے کو پوری تفصیل سے بیان کریں گے تو بصیرت رکھنے والوں پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ بے وقوف اور احمق کا یہ خیال کہ خدا کی محبت ناممکن ہے، درست نہیں ہے۔ بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے کہ خدا کے سوا کسی سے محبت نہ کی جائے۔ اب ہم ان میں سے ہر ایک کا الگ الگ جائزہ لیں گے [تاکہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ کسی سے محبت کرنے کی یہ پانچ وجوہات صرف خدا پر لاگو ہوتی ہیں اور اس کے علاوہ کوئی نہیں]۔

پہلی وجہ: پہلی وجہ جس کی وضاحت کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کو محبوب سمجھتا ہے اور اس کے دائمی، دائمی وجود اور کمال کا خواہاں ہے۔ انسان تباہی، عدم وجود، عیب اور کمال کی رکاوٹوں سے نفرت کرتا ہے۔ یہ چیزیں ایک زندہ انسان کی فطری فطرت میں پائی جاتی ہیں۔ جو شخص اپنی نفس کو جانتا ہے اور اپنے رب کو پہچانتا ہے، وہ یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کا وجود خود نہیں ہے، بلکہ اس کا وجود، استقامت اور کمال اور ہر چیز کا وجود خدا پر منحصر ہے اور اسی کا حق ہے۔ وہی اپنے وجود کا خالق ہے، وہی ہے جو اپنے وجود کی حفاظت کرتا ہے، وہی ہے جو کمال کی صفات پیدا کرتا ہے اور ان کو مکمل کرتا ہے، وہی ہے جو ایسے اسباب پیدا کرتا ہے جو انسان کو کمال کی طرف لے جاتا ہے، وہی ہدایت پیدا کرتا ہے جو ان ذرائع کو استعمال کرنے کے لیے رہنمائی کرتا ہے، ورنہ بندے کا وجود کچھ بھی نہیں ہے، یہ محض عدم ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اسے اپنے عمل سے پیدا نہ

کرے اور تخلیق کے بعد اگر وہ اپنا فضل نہ کرے تو وہ تباہ ہو جائے گا اور اگر وہ اسے پورا نہ کرے تو وہ ناقص رہے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی وجود نہیں ہے جو اپنے وجود سے موجود ہو۔ ہر وجود اس زندہ اور خود کو زندہ کرنے والے (خدا) کی طرف سے وجود میں آتا ہے جس کا وجود اس کے اپنے وجود سے ہے۔ اگر خدا کا جاننے والا (*عارف* یا گنوسٹک) اپنے وجود سے محبت رکھتا ہے تو اس ہستی سے بھی محبت کرے گا جس پر اس کا اپنا وجود انحصار کرتا ہے اور اس سے فائدہ اٹھا رہا ہے اور اس سے وجود حاصل کر رہا ہے، بشرطیکہ وہ اسے خالق، موجود، ارتقاء کنندہ، [تمام مخلوقات اور وجودوں] کا محافظ اور اپنے وجود سے موجود سمجھے۔ اگر کسی کو ایسی ہستی سے محبت نہیں ہے تو کہا جائے گا کہ وہ نہ تو اپنے نفس کو جانتا ہے اور نہ ہی اپنے رب کو۔ محبت [خدا] یا الٰہی عرفہ (معارفہ) کو جاننے کا پھل (نتیجہ) ہے۔ جب محبت نہیں ہوگی تو گنوسس نہیں ہوگا اور جس حد تک یہ گنوسس کمزور ہوگا اس حد تک محبت کمزور ہوگی اور جس حد تک گنوسس مضبوط ہوگا اس حد تک محبت مضبوط ہوگی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی شخص کو اپنی ذات سے محبت ہو لیکن اپنے رب سے نہیں؟ جو سورج کی سختی کو برداشت کرتا ہے، سایہ سے بھی محبت کرتا ہے، اور جو سایہ سے محبت کرتا ہے، وہ ان درختوں سے بھی محبت کرتا ہے جن کی وجہ سے سایہ قائم ہوتا ہے اور وجود رکھتا ہے۔ خدا کی صلاحیت کے ساتھ ہر موجودہ (موجود) چیز کا رشتہ درختوں کے ساتھ سایہ کی طرح ہے۔ سایہ کا وجود درختوں کے ذریعے سے ہے اور روشنی کا وجود سورج کے ذریعے سے ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ، سایہ اپنے وجود کے لئے درختوں کے تابع ہے ، اور روشنی کا وجود سورج کے تابع ہے۔ اسی طرح، ہر چیز کا وجود جو موجود ہے، اس ایک ہستی کے تابع ہے۔ سب چیزیں اس کی قابلیت اور تخلیقی صلاحیتوں کی مثالیں ہیں۔

اگر انسان کے لیے اپنے نفس سے محبت کرنا ضروری ہے تو اس ہستی سے محبت کرنا بھی ضروری ہے جس سے اس نے وجود حاصل کیا تو اس کی حقیقت، باطنی صفات، باطنی و خارجی وجود، باطنی معانی اور جسمانی ساخت میں، اسے دائمی [اس زندگی کے بعد شروع ہونے والی ابدی زندگی کی شکل میں] حاصل کیا جاتا ہے۔ تاہم ، اس محبت کا تجربہ صرف وہی شخص کرسکتا ہے جو مذکورہ بالا حقائق کو جانتا ہے جیسا کہ ان کی وضاحت کی گئی ہے۔ جس کا دل نیچی نفس کی خواہشات میں مبتلا ہو، اپنے خالق اور رب سے غافل ہو، اور اس کے دل میں خدا کی محبت نہ ہو، اور صرف ہوس اور ظاہری ظاہری شکل پر نظر رکھتا ہو، دوسرے لفظوں میں، ظاہری دنیا (مادی دائرہ) کے دائرے میں قیدی رہتا ہے جس میں کسی کا کوئی فرق نہیں ہے۔ بلکہ جانور بھی اس میں حصہ لیتے ہیں۔ فرشتوں کے دائرے میں صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جو فرشتوں سے مشابہت رکھتا ہو۔ جو جانوروں کے دائرے میں ہے اور اس دائرے میں نیچے اترتا ہے، اس حد تک وہ فرشتوں کے دائرے سے دور ہو جائے گا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ محبت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ کسی ایسے شخص سے محبت کرنا جو کسی پر احسان کرتا ہے، پیسے سے مدد کرتا ہے، ہر معاملے میں مدد کرتا ہے، ہر وقت مدد کے لیے تیار رہنا، دشمنوں سے بچاتا ہے، حسد کرنے والوں کی برائیوں سے بچاتا ہے، نفس، اولاد، خاندان اور رشتہ داروں سے متعلق تمام مقاصد میں مدد کرتا ہے۔ ایسا عام طور پر محبوب ہوتا ہے۔ یہ وجہ یہ بھی تقاضا کرتی ہے کہ خدا کے سوا کسی سے محبت نہ کی جائے۔ اگر اللہ تعالیٰ کے حق کی ادراک درست ہو جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ جو احسان کرتا ہے وہ صرف وہی ہے۔ جہاں تک اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر جو نعمتیں دی ہیں ان کو تحریری طور پر شامل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ نعمتیں بے شمار ہیں جیسا کہ خدا نے خود کہا تھا:

وَإِن تَعُدُّواْ نِعْمَتَ ٱللَّهِ لَا تُحْصُوهَآ

"اگر آپ خدا کی نعمتوں کو گننا شروع کردیں تو ، ان کو گنتی میں بھی نہیں لایا جا سکتا [کیونکہ وہ بے شمار اور بے شمار ہیں]۔" (سورة البقرة باب ۱۴، آیت ۳۴)

ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ایسی ہیں جن کا شمار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ [خدا کے بندوں، یعنی انسانوں] کا ذکر صرف ان نعمتوں کے لحاظ سے کیا جا سکتا ہے [جو وہ دوسروں پر کرتے ہیں] تمثیلی معنوں میں۔ حقیقی محسن صرف خدا ہی ہے۔ فرض کریں کہ کسی نے آپ کو اپنے تمام خزانے دے دیئے ہیں اور آپ کو خرچ کرنے کا مکمل استحقاق دیا ہے۔ اگر آپ یہ سوچنا شروع کر دیتے ہیں کہ کسی نے آپ کو خزانے دے کر اور آپ کو خرچ کرنے کا استحقاق دے کر آپ پر بہت بڑا احسان کیا ہے، تو یہ غلط سوچ ہوگی۔ سب سے پہلے، آپ کو چار معاملات پر غور کرنا چاہیے، پھر آپ پر احسان کی حقیقت واضح ہو جائے گی۔

سب سے پہلے اس شخص کا وجود ہے جو آپ کو خزانہ دے رہا ہے۔ دوسرا ، ایک کے ساتھ دولت کی موجودگی۔ تیسرا، اس پر مکمل کنٹرول رکھنا۔ چوتھا ، دولت آپ کے حوالے کرنے کے دل میں خیال۔ اب ہم آپ سے پوچھتے ہیں کہ اس شخص کو کس نے پیدا کیا؟ کس نے کسی کو دولت دی پھر اس پر اختیار اور اختیار دیا؟ آپ کو دولت حوالے کرنے کے لئے منتخب کرنے کا ارادہ کس نے اپنے دل میں ڈال دیا؟ تیری محبت کو کس نے دل میں ڈال دیا؟ کسی کو یہ خیال کیسے آیا کہ اس دنیا اور اگلی دنیا میں کسی کی اپنی بہتری اور فلاح و بہبود آپ پر احسان کرنے میں ہے؟ انسان اپنے دل کے اصرار پر عمل کرنے کا پابند ہے کہ وہ آپ کو مال یا جائیداد دے دے اور اس کی مخالفت نہیں کر سکتا، اس کی وجہ کیا ہے؟ اگر آپ اس پر غور کریں گے تو آپ کو ان تمام سوالوں کا جواب مل جائے گا اور یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اصل محسن صرف اللہ ہی ہے جس نے آپ پر احسان کرنے پر مجبور کیا اور آپ کے لیے [اپنے دل] کو محکوم کیا اور وہ عوامل مسلط کیے جو آپ پر احسان کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ احسان کرنے والے شخص کا ہاتھ صرف ایک ذریعہ ہے جس کے ذریعے خدا کی نعمتیں اس کے بندوں تک پہنچائی جاتی ہیں۔ اس معاملے میں ، ایک پانی کے چینل کی طرح مجبور ہوتا ہے جو پانی کو بہنے دینے پر مجبور ہوتا ہے۔ اگر آپ ثالث کو اپنا محسن سمجھتے ہیں اور اس کے لئے شکر گزار ہونا شروع کرتے ہیں تو یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ آپ حقیقت سے ناواقف ہیں۔

جب بھی انسان [دوسروں پر] کوئی احسان کرتا ہے تو وہ اپنے نفس پر کرتا ہے، کسی بھی مخلوق پر ایسا کرنا ممکن نہیں ہے۔ اگرچہ کوئی احسان کا روپ اختیار کرتا ہے لیکن اس کا بدلہ پہلے سے تلاش کرتا ہے، چاہے وہ دنیا میں ہو، جیسے دنیا کسی کے لیے فتح ہو جائے یا کسی کے تابع ہو اور اس کی بے پناہ تعریف کرے، اس کی سخاوت کی کہانیاں دور دور تک پھیل جاتی ہیں، اور لوگ اپنی اطاعت اور محبت کے پھول برسانے لگتے ہیں۔ یا آخرت میں اللہ تعالیٰ کے ہاں زیادہ سے زیادہ ثواب حاصل کرے۔ جس طرح کوئی شخص اپنا مال بلا وجہ دریا میں نہیں ڈالتا، اسی طرح بغیر کسی مقصد کے اپنا مال دوسرے ہاتھ میں نہیں ڈالتا۔ یہ مقصد کسی کا مقصد ہے۔ اگر کسی نے آپ کو دولت دی ہے تو آپ کسی کا مقصد نہیں ہیں، بلکہ آپ صرف اپنے مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں، چاہے وہ مقصد اس کا تذکر، شہرت، عزت، دنیا کی عظمت ہو، یا آخرت میں عزت، عظمت اور ثواب الٰہی ہو۔ اس شخص نے (جس نے آپ پر احسان کیا ہے) آپ کو اپنا مال دے کر اپنا مقصد پورا کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی شخص آپ کا محسن نہیں ہے، بلکہ وہ اپنے نفس کا محسن ہے۔ کوئی شخص دولت کے بدلے میں کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے ، جسے وہ اس سے بہتر سمجھتا ہے۔ اگر یہ بہتر نہ ہوتا تو کوئی آپ پر اپنا مال خرچ نہ کرتا۔ اس کے بارے میں سوچیں ، کوئی آپ

کی شکر گزاری یا محبت کا مستحق نہیں ہے اور اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک وجہ یہ ہے کہ خدا کی طرف سے ان عوامل کے مسلط ہونے کے بعد جو کسی کو احسان کرنے پر آمادہ کرتے تھے، وہ آپ کو وہ دولت [یا جائیداد یا مادی قبضہ] دینے پر مجبور ہو گیا اور اس کی مخالفت کرنے سے قاصر تھا۔ اس کی تمثیل ایک بادشاہ کے خزانچی کی ہے جسے بادشاہ حکم دیتا ہے کہ وہ کسی کو شاہی انعام سے نوازے۔ جو شخص یہ انعام حاصل کرتا ہے وہ خزانچی کو اپنا محسن نہیں سمجھ سکتا کیونکہ اس شاہی حکم کو ملنے کے بعد خزانچی اس کی تعمیل کرنے پر مجبور تھا اور اس کی مخالفت کرنے سے قاصر تھا۔ اگر بادشاہ خزانچی کی مرضی پر انعام کا معاملہ ملتوی کرتا تو خزانچی اسے نہ دیتا۔ اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ محسن کو اپنی مرضی پر چھوڑ دے تو وہ ایک جعلی سکہ بھی خرچ کرنے پر راضی نہیں ہو گا، لیکن پہلے اس نے اپنے دل میں مال دینے کی وجوہات اور مراعات پیدا کیں، پھر دل میں یہ خیال پیدا کیا کہ مال دینے کے لیے اس کے لیے دنیاوی اور دوسری دنیاوی فائدے ہیں۔ اس دینے پر منحصر ہے اور اسی وجہ سے کوئی اسے دیتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان دولت دیتا ہے اور اس کے بدلے میں وہ لیتا ہے جو اس کی نظر میں دولت سے بہتر ہے۔ اس معاملے میں کسی کی مثال تاجر یا تاجر کی ہے اور تاجر محسن نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ دولت دینے کا معاوضہ لے رہا ہے۔ یہ ایک الگ بات ہے جسے کسی نے معاوضہ کے طور پر یا تو حمد یا الٰہی اجر قبول کیا [بجائے اس کے کہ وہ مالی یا مادی اجر وصول کرے]۔ معاوضے کے لیے ضروری نہیں کہ اسے محسوس کیا جائے بلکہ لذتیں اور فوائد مال کی جگہ لے سکتے ہیں اور بعض اوقات دولت کا بہترین بدلہ بن سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ احسان ایک ایسی چیز ہے جس کا کوئی بدلہ نہیں لیتا، دوسرے لفظوں میں دینے والا اس طرح دیتا ہے کہ دینے والا اس سے کوئی لذت حاصل نہ کرے اور نہ ہی اس سے کوئی فائدہ اٹھاتا اور انسان میں اس قسم کی نعمتوں کا وجود ناممکن ہے۔ اس قسم کی نعمتوں کا منبع اور عطا کرنے والا صرف اللہ ہی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات پر جو نعمتیں کی ہیں، ان میں اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی پوشیدہ فوائد نہیں ہیں، تمام فوائد مخلوقات کو حاصل ہوتے ہیں۔ اس تفصیل سے یہ واضح ہے کہ خدا کے سوا کسی اور کے لیے احسان کا لفظ استعمال کرنا یا تو جھوٹ ہے یا صرف ایک تمثیلی حوالہ ہے۔ خدا کے سوا کسی اور میں فضل کا وجود ناممکن ہے، بالکل اسی طرح جیسے تاریکی اور روشنی کا امتزاج کرنا ناممکن ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی تمام صفات کی طرح اس صفت الٰہی میں بے مثال اور تنہا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے جاننے والے کو چاہیے کہ وہ کسی ظاہری محسن کی بجائے خدا سے محبت کرے جو کوئی حقیقی احسان کرنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتا۔ اصل محسن صرف خدا ہی ہے اور وہی اس محبت کا مستحق ہے۔ اگر کوئی شخص اللہ کے سوا کسی اور کو مہربان سمجھتا ہے، ایسے شخص کے فضل سے محبت کرتا ہے تو یہ اس کی جہالت اور احسان کے معنی اور مقصود سے ناآشنا ہونے کا ثبوت ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ انسان کسی محسن سے محبت کرتا ہے حالانکہ وہ احسان کسی پر نہیں بلکہ کسی اور پر ہو۔ یہ چیزیں انسانی مزاج میں پائی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر، اگر آپ کو کسی ایسے رہنما کے بارے میں بتایا جائے جو انصاف کرتا ہے، [ان لوگوں کے مسائل سے بخوبی واقف ہے جن کا وہ ذمہ دار ہے]، لوگوں کے ساتھ شفقت اور سخاوت سے پیش آتا ہے، ان کے ساتھ عاجزی سے پیش آتا ہے، اگرچہ وہ رہنما آپ سے ہزاروں میل دور ہے [دنیا کے کسی دوسرے حصے میں] لیکن آپ اپنے دل میں اس رہنما سے محبت کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ دوسری طرف آپ ایک ایسے لیڈر کے بارے میں سنتے ہیں جو ظلم و ستم کے لیے جانا جاتا ہے، جو مغرور ہے، برے ہے، پریشان کن ہے اور آپ سے دور ملک کا لیڈر ہے، تو آپ سے دوری اور دوری کے باوجود آپ اس لیڈر سے نفرت کرتے ہیں۔ آپ کے دل میں ان دونوں رہنماؤں کے لئے مختلف جذبات ہیں اور یہ فرق کافی نمایاں ہے۔ آپ کا ایک کی طرف انتہائی جھکاؤ ہے اور دوسرے کے لئے انتہائی نفرت ہے۔ محبت اور نفرت کی یہ کیفیت اس وقت ہوتی ہے جب آپ ایک لیڈر کی فیاضی سے محروم ہو جاتے ہیں اور دوسرے کے ظلم سے محفوظ رہتے ہیں اور بظاہر آپ کے لیے وہاں جانے کا کوئی امکان نہیں ہے جہاں وہ عادل رہنما یا ظالم رہنما حکومت کرتا ہے۔ لیکن عادل لیڈر سے آپ کی

محبت صرف اس وجہ سے ہے کہ یہ لیڈر ایک محسن ہے، اس لیے نہیں کہ آپ نے کسی احسان سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اس وجہ سے یہ بھی ضروری ہے کہ آپ خدا سے محبت کریں، بلکہ اس کے سوا کسی اور سے محبت نہ کریں، سوائے اس کے کہ آپ کے پاس خدا کے سوا کسی اور سے تعلق رکھنے کی کوئی وجہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام مخلوقات پر فضل کرنے والا اور فضل و کرم سے الٰہی فضل و کرم دینے والا وہی ہے اور اس کے سوا کوئی نہیں ہے۔ سب سے پہلے آپ نے ان کو وجود کی دولت عطا کی، پھر انہیں اعضاء عطا کیے اور ان کے لیے ضروری ذرائع عطا کرکے اپنی نعمتوں کو پورا کیا۔ اس کے علاوہ اللہ نے انہیں راحت اور آسانی کے وہ اسباب عطا کیے جو ضروریات کے دائرے میں نہیں آتے بلکہ ان میں ضرورت کا نام و نشان موجود ہے، پھر اس نے مزید نعمتیں عطا کیں جو ضروریات میں شمار نہیں ہوتیں۔ انسانی جسم میں ضروری چیزوں کی مثالیں دل، جگر اور سر ہیں، ضروری اعضاء آنکھیں، پاؤں اور ہاتھ ہیں اور خوبصورتی کے لیے اضافی چیزوں میں محراب والی بھنو، ہونٹ، گال، بادام کی شکل کی آنکھیں وغیرہ شامل ہیں۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن کا وجود نہ ہونے کی صورت میں انسانی ضروریات اور ضروریات پر کوئی اثر نہیں پڑے گا کیونکہ ان چیزوں کا تعلق صرف خوبصورتی سے ہے۔ غیر جسمانی چیزوں میں ضروری چیزوں کی مثال پانی اور خوراک ہے، ضروری چیزوں میں ادویات، گوشت اور پھل شامل ہیں اور اضافی چیزوں میں درختوں کی ہریالی اور خوبصورتی، پھولوں اور پھولوں کی کلیوں کی خوبصورتی، کھانے پینے اور پھلوں کا ذائقہ شامل ہیں۔ یہ [اضافی] چیزیں ہیں، اگر موجود نہیں ہیں تو وہ کسی بھی ضرورت یا ضروریات کو پورا نہیں کرتیں۔ یہ تین قسم کی نعمتیں جو ضروری اور ضروری ہیں، اور اضافی [خوبصورتی] چیزیں ہر جاندار میں موجود ہیں۔ بلکہ وہ زمین کے ذرے سے لے کر عرش الٰہی کی بلندی تک تمام مخلوقات میں موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صرف خدا ہی رحم کرنے والا ہے اور اس کے سوا کوئی بھی مہربان نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی انسان محسن ہے تو وہ احسان اللہ تعالیٰ کی مخلوقات کی اچھی چیزوں میں سے ایک اچھی چیز ہے۔ وہی ہے جو حسن کا خالق ہے، وہی ہے جو محسن کا خالق ہے، اور وہی نعمتوں کے ذرائع کا خالق ہے۔ اس لحاظ سے خدا کے سوا کسی اور سے محبت کرنا محض جہالت اور حماقت ہے۔ جو شخص یہ جانتا ہے وہ خدا کے سوا کسی اور سے محبت نہیں کرتا۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ انسان کسی چیز سے صرف اس لیے محبت کرتا ہے کہ وہ خوبصورت ہے اور اس کی خوبصورتی کے سوا اور کوئی مقصد نہیں ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے ، یہ فطری انسانی فطرت میں موروثی ہے۔ خوبصورتی کو دو قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے: پہلا وہ حسن ہے جو آنکھ سے محسوس کیا جاتا ہے اور دوسرا وہ خوبصورتی ہے جس کے لیے لازمی طور پر باطنی بصیرت کی روشنی کی ضرورت ہوتی ہے۔ پہلی قسم کی خوبصورتی کو بچہ بھی سمجھتا ہے، بلکہ اسے کوئی جانور یا پرندہ بھی سمجھتا ہے، لیکن دوسری قسم کی خوبصورتی کو صرف وہی سمجھتے ہیں جو "دل کے لوگ" کہلانے کے قابل ہوتے ہیں۔ وہ دوسرے لوگ ان کے ساتھ اس لقب کا اشتراک نہیں کرتے جو صرف دنیاوی زندگی کے ظاہری پہلوؤں کو دیکھتے ہیں اور ظاہری کے سوا کچھ نہیں دیکھتے۔ خوبصورتی ہر اس شخص کے لئے محبوب ہے جو اسے سمجھتا ہے۔ جو لوگ اپنے دل سے حسن کو سمجھتے ہیں وہ حسن کو دل سے محبوب سمجھتے ہیں۔ اس کی مثال انبیاء علیہم السلام اور سچے علماء (اولیاء و سنوتیوں کی محبت ہے) ان کی اعلیٰ (عظیم) صفات اور خوبصورتی کی وجہ سے۔ ان کی محبت دلوں میں ہے، اگرچہ ان کے چہرے اور ظاہری شکلیں آنکھوں سے پوشیدہ ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جو اندرونی شکل کی خوبصورتی سے مراد ہے جو حواس کے ذریعہ محسوس نہیں کی جاتی ہے ، تاہم ، کوئی بھی ان نشانیوں کو سمجھتا ہے جو ان کے اعلی کردار کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ جب دلوں کو اس بات کا یقین ہو جاتا ہے تو دل ان کی طرف مائل ہو جاتے ہیں اور ان سے محبت کرتے ہیں۔ لہٰذا جب کوئی شخص کسی مصنف کی تحریر یا کسی شاعر کی شاعری یا کسی فنکار کی تصویر یا کسی معمار کی تعمیر کو دیکھتا ہے تو اس مصنف، شاعر، فنکار اور معمار کی اندرونی خوبیاں ان پر ظاہر ہو جاتی ہیں جن کی وجہ سے یہ کام وجود میں آیا۔ ان کے کاموں کا بنیادی مقصد ان کا علم اور قابلیت ہے۔ پھر ان کے بارے میں جو کچھ معلوم ہے اس کی عظمت، خوبصورتی اور برتری کی حد تک ان کا علم برتر اور مکمل ہو گا۔ قابلیت کے حامل شخص کی ایسی حالت ہے۔ قابلیت کے حامل ہستی کی اعلیٰ عزت اور مرتبہ کی حد تک، اس

حد تک قابلیت برتر اور مکمل ہوگی۔ کیونکہ معلوم لوگوں میں سب سے اونچا اور سب سے بڑا معلوم خدا کی ہستی کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ ترین ہستی (خدا) سے وابستہ علم تمام علوم میں سب سے اعلیٰ اور عظیم علم ہوگا جو کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت (*معرفہ*) ہے۔ پھر درجے کے لحاظ سے وہ چیزیں عزت اور برتری رکھتی ہیں جو خدا کی معرفت سے مخصوص ہیں یا اس کے قریب ہیں۔ جس حد تک کوئی چیز خدا کی معرفت سے قریب سے جڑی ہوئی ہے، اس حد تک اسے عظمت، عزت اور امتیاز حاصل ہوگا۔

گنوسٹکس کے خوبصورت کردار کی خصوصیات ، اندرونی خصوصیات ، مزاج اور مزاج تین چیزوں پر مشتمل ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ان لوگوں کے پاس خدا کا علم ہے، فرشتوں کا علم ہے، نازل شدہ کتابیں اور الٰہی قوانین ہیں۔ دوسری بات یہ کہ وہ اپنی اور خدا کے دوسرے بندوں کی اصلاح اور تطہیر کرنے اور روحانی طور پر ان کی اصلاح اور رہنمائی کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ تیسری بات یہ کہ وہ برائیوں اور باطنی عیبوں اور خواہشات سے پاک ہو گئے ہیں جو انسان کو نیکی اور راستبازی کی راہوں سے روکتی ہیں اور انہیں برائی کی راہوں پر چلنے پر مجبور کرتی ہیں۔ ان تین معاملات کی وجہ سے لوگ انبیاء، ان کے جانشینوں، علماء اور عادل اور سخی پیشواہوں سے محبت کرتے ہیں۔

علم، قابلیت اور پاکیزگی: اب آئیے ان تینوں معاملات پر الٰہی صفات (صفات) کے سلسلے میں نظر ڈالتے ہیں۔ علم کی کیفیت یہ ہے کہ ان تمام لوگوں کے تمام علوم جو پہلے آئے اور اب بھی ہیں اور مستقبل میں آئیں گے، ان کا اللہ تعالیٰ کے علم سے کوئی موازنہ نہیں ہے۔ اس کا علم ہر اس چیز پر محیط ہے جو موجود ہے، اور اس کے ہر علم سے باہر کوئی چیز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَلَا فِي ٱلْأَرْضِ

"اس کے پاس آسمانوں اور زمین سے ذرہ بھر بھی غائب نہیں۔" (سورۃ البقرۃ 34، آیت 3)

ایک شلوک میں پوری تخلیق کو مخاطب کیا گیا ہے:

وَمَآ أُوتِيتُم مِّنَ ٱلْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا

"اور تمہیں علم دیا گیا ہے لیکن وہ بہت کم ہے۔" (سورۃ البقرۃ سورۃ البقرۃ آیت 85)

بلکہ اگر آسمانوں اور زمین کے تمام باشندے اس کے علم کو گھیرنے کے لیے متحد ہو جائیں کہ چیونٹی یا مچھر کیسے پیدا ہوا، وہ اس کے علم کے ایک چھوٹے سے حصے تک بھی نہیں پہنچ سکیں گے اور صرف اس علم کو حاصل کریں گے جو وہ چاہتا ہے۔ تخلیقات میں جو بھی تھوڑا سا علم ہے وہ اس کی تعلیم کی وجہ سے ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

خَلَقَ ٱلْإِنسَٰنَ ۝٣

عَلَّمَهُ ٱلْبَيَانَ ﴿٤﴾

"اس نے انسان کو پیدا کیا اور بولنے کی تعلیم دی (فصاحت و بلاغت ، اپنے آپ کو سمجھانے کی صلاحیت ، پیچیدہ اور لطیف باتوں کو بیان کرنا ، اور دوسروں کی گفتگو اور بیان سے سیکھنا)۔ (سورة البقرة باب 55، آیت 3-4)

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر علم کی خوبصورتی اور امتیاز محبوب ہے یا یہ اس شخص کے لیے زینت اور کمال ہے جو اس سے مزین ہے تو اس لحاظ سے انسان کو صرف خدا سے محبت کرنی چاہیے۔ علماء کا علم اس کے علم کے مقابلے میں محض جہالت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے علم کو تمام مخلوقات کے مشترکہ علم پر ناقابل تصور فضیلت حاصل ہے کیونکہ اس کے علم کی کوئی حد نہیں ہے جبکہ مخلوقات کا علم محدود ہے اور اس کا ایک اختتام ہے۔

قابلیت (قدرہ، طاقت ، ذرائع، کسی چیز کو انجام دینے یا اسے وجود میں لانے کا علم) بھی کمال کی صفت ہے اور اس کے مقابلے میں نااہلی ایک خامی یا نقص ہے۔ ہر کمال، عظمت، امتیاز اور برتری محبوب ہے اور اس کے ادراک میں خوشی ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی شخص علی علیہ السلام اور خالد رضی اللہ عنہ کی اپنے ہم عصروں پر بہادری اور امتیاز کے بارے میں سنتا ہے تو اس کے دل میں خوشی کے جذبات جھنجھوڑ جاتے ہیں۔ ان کی بہادری کی مہم جوئی کے بارے میں سن کر کوئی اتنا خوش ہوتا ہے کہ اگر کوئی اپنی آنکھوں سے ان کی مہم جوئی کا مشاہدہ کرتا تو اس کی خوشی کیا ہوتی؟ اب خدا کے بندوں کی صلاحیتوں اور بہادری کا موازنہ خدا کی بہادری سے کریں۔ مخلوقات میں سے اس شخص کو لے لیجئے جو سب سے زیادہ طاقتور ہو، وسیع ترین تسلط اور طاقت کا مالک ہو، تمام برائیوں کو نچلے نفس سے مٹانے کی تمام انسانوں کی سب سے بڑی صلاحیت رکھتا ہو، اپنے اور دوسروں کی نفس (روح سے متعلق پوشیدہ معاملات) سے متعلق معاملات میں گہری بصیرت کا حامل ہو، اور ان پر قابو پانے کی مکمل صلاحیت رکھتا ہو۔ اس شخص کو لے لو اور پھر دیکھو کہ ایسا شخص بے پناہ طاقت، طاقت، وسیع کنٹرول اور صلاحیت کے باوجود اپنی موت، زندگی، موت کے بعد جی اٹھنے، نفع یا نقصان پر اس حد تک اختیار نہیں رکھتا کہ ایسا شخص اپنی بینائی اور کانوں کی سماعت کو بھی روکنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ زبان کی تقریر اور جسم کی بیماریاں۔ ایسے بے شمار معاملات ہیں جن میں انسان اپنے اور دوسروں کے لیے کچھ کرنے سے قاصر ہے جو اس کی صلاحیتوں سے متعلق ہیں۔ اور وہ معاملات جن کا کسی کی صلاحیتوں سے کوئی تعلق نہیں ہے ، وہ مکھی کے پروں کے سائز کے برابر کام کرنے سے قاصر ہے۔ پھر جو قابلیت کسی کی اپنی ذات پر اور دوسروں پر ہے وہ نہ تو اس کا اپنا کام ہے اور نہ ہی وہ خود موجود ہے، بلکہ جس طرح خدا نے انسان کو پیدا کیا ہے اسی طرح خدا نے اس کی صلاحیت اور اس کے ذرائع کو پیدا کیا اور اسے اپنی صلاحیتوں سے متعلق کام کرنے کے قابل بنایا۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ خدا کے بندوں میں سے کسی کو قابلیت ، سیاست ، تسلط ، حکمرانی اور کمال کی وجہ سے محبت ہو لیکن خدا سے محبت نہ کرے ، حالانکہ طاقت اور طاقت صرف خدا کے لئے موزوں ہے جو سب سے غالب اور سب سے بڑا ہے۔ وہ غالب ہے، غالب ہے، تمام علم کا احاطہ کرنے والا اور تمام صلاحیتوں کا مالک ہے۔ آسمان اس کے داہنے ہاتھ میں لپٹا ہوا ہے، جو کچھ زمین پر یا نیچے ہے وہ اس کے اختیار میں ہے، اور تمام مخلوقات کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں ہے۔ اگر وہ زمین پر موجود تمام مخلوقات کو تباہ کر دے تو اس کی سلطنت سے ذرہ برابر بھی کم نہیں ہوگا۔ اس کے بندوں میں سے جو کوئی طاقت یا طاقت رکھتا ہے، وہ سب اس کی اعلیٰ قدرت اور قدرت کی نشانیوں میں سے ہے۔ خوبصورتی، عظمت، عظمت، غلب، برتری اور برتری اسی کے لیے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی کو اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے محبوب سمجھنا ممکن ہو تو اس محبت کا مستحق صرف وہی ہے جو تمام صلاحیتوں کا مالک ہے، اللہ تعالیٰ ہے۔

نفس نفس کی تمام عیبوں، خامیوں اور برائیوں سے *تطہیر اور تطہیر* ایک صفت ہے جو انسان کو اس کے مالک سے محبت کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہ خوبصورتی بھی ہے اور اس کا تعلق اندرونی شکل سے ہے۔ اگرچہ تمام انبیاء اور گنوسٹک عیبوں، گناہوں اور برائیوں سے بالاتر تھے، لیکن تطہیر کا تقدس اور کمال صرف اس ایک ہستی کے لیے ممکن ہے جو پاکیزہ اور جلال اور عظمت کا مالک ہو۔ باقی تمام مخلوقات میں کچھ عیبیاں ہیں، بلکہ زیادہ تر مخلوقات عیبوں اور خامیوں کا مجسمہ معلوم ہوتی ہیں، بلکہ یہ حقیقت کہ وہ مخلوقات ہیں، بہت سی چیزوں سے نااہل، محکوم اور محتاج ہونے کی وجہ سے اپنے آپ میں عیبیاں اور خامیاں ہیں۔ لہٰذا کمال صرف خدا کے لیے مخصوص ہے۔ اگر اللہ کے سوا کسی اور کے پاس کوئی کمال ہے تو وہ بھی اسی کی نعمت ہے۔ کمال کی چوٹی تک پہنچنا انسان کے دائرہ کار میں نہیں ہے کیونکہ کمال کی چوٹی حاصل کرنے کا سب سے کم درجہ یہ ہے کہ ایک بندہ اب [خدا کا] محکوم نہیں رہتا اور اب وہ اپنے وجود کا محتاج نہیں رہتا اور اللہ کے سوا کسی کے پاس یہ صفت نہیں ہے۔ بلکہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے اس صفت کا حصول ناممکن ہے۔ وہ کمال کے ساتھ اس امتیاز کا واحد حامل ہے، وہی ہے جو ہر عیب سے پاک ہے، وہی ہے جو تمام برائیوں سے پاک ہے۔ اگر تقدس اور تمام عیبوں سے تطہیر کو بھی حسن اور کمال سمجھا جائے اور یہ صفت محبت کا سبب ہے تو حقیقت میں یہ صفت صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے۔ اگر اللہ کے سوا کسی اور کو اس صفت میں حصہ ملا ہے تو اسے دوسرے مخلوقات کے مقابلے میں صرف کمال کہا جاتا ہے۔

پانچواں سبب: محبت کی پانچویں وجہ مطابقت اور مشابہت ہے کیونکہ کوئی [یا کوئی شخص] جو دوسرے سے مشابہت رکھتا ہے، اس کی طرف مائل ہوتا ہے۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ بچہ بچے کی طرف مائل ہوتا ہے، بڑا بڑے کی طرف اور ہر جانور اپنی اپنی نسل کی طرف جھکتا ہے اور وہ دوسری جنس سے بھاگ جاتا ہے۔ ہر علم رکھنے والا شخص علم میں یکساں پس منظر رکھنے والے شخص کی طرف مائل ہوتا ہے اور بڑھئی کسان کے برعکس دوسرے بڑھئی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے لیے ثبوت کے قیام کی ضرورت نہیں ہے، لیکن تجربہ اور مشاہدہ اس کا واضح ثبوت ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مطابقت محبت کی ایک اہم وجہ ہے۔ البتہ ہم آہنگی بعض ظاہری طور پر ہوتی ہے اور کبھی کسی پوشیدہ چیز میں ہوتی ہے جس کا علم ضروری نہیں ہوتا، مثلا اتفاق سے کسی معاملے پر دو افراد کا اتحاد ہو، حالانکہ وہ نہ تو ایک دوسرے کو دیکھے ہیں اور نہ ہی ایک دوسرے کے مال کا لالچ رکھتے ہیں جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلْاَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُجَنَّدَةٌ فَمَا تَعَارَفَ مِنْهَا اِئْتَلَفَ وَمَا تَنَاكَرَ مِنْهَا اِخْتَلَفَ

"روحیں ایک مشترکہ فوج (گروپ) ہیں۔ ان میں سے جو لوگ [اس دنیا میں آنے سے پہلے] ایک دوسرے کو جانتے ہیں، وہ اکٹھے ہوتے ہیں [اور اس دنیا میں بھی اچھی طرح سے ملتے ہیں]۔ جو لوگ [اس سے پہلے روحوں کے دائرے میں] اجنبی تھے، وہ ایک دوسرے سے الگ رہتے ہیں [اور اس دنیا میں مادی دائرے میں جمع نہیں ہوتے، نہ ملتے ہیں اور نہ ہی اکٹھے ہوتے ہیں کیونکہ ان کے پاس روحانی میدان میں مطابقت نہیں ہے]"۔

اس روایت میں ، "واقف" سے مراد "مطابقت" اور "اجنبی" سے مراد "عدم مطابقت" ہے۔ بہرحال ہم آہنگی بندے اور خدا کے درمیان محبت کی ایک اہم وجہ بھی ہے۔ یہ مطابقت ظاہری نہیں ہے لہذا ان دونوں کا چہرہ اور ظاہری شکل ایک ہی ہے ، اس کے بجائے ، دونوں کے درمیان اندرونی مطابقت ہے۔ یہ مطابقت بعض اوقات ان معاملات میں ہوتی ہے جو کتابوں میں لکھی جا سکتی ہیں اور بعض اوقات ایسی باتوں میں جو کتابوں میں لکھنا اور درج کرنا ناممکن ہے تاکہ وہ حسد الٰہی کے پردے کے پیچھے چھپے رہیں تاکہ الٰہی رازوں کو ان لوگوں سے محفوظ رکھا جا سکے جو اپنی

روحانی خواہشات کی وجہ سے ان کے لائق نہیں ہیں۔ راہ روحانی میں گمراہی اور حضرت الٰہی کی طرف اعلیٰ روحانی راستے پر آگے بڑھنے کی صحیح نیت اور اعلیٰ عزم نہ ہونا اور ان کو چھپانا درست ہے تاکہ جب گنوسس کی راہ پر مسافر اپنی منزل پر پہنچیں تو ان کے سامنے یہ راز خود ہی (فضل الٰہی سے) بے نقاب ہو جاتے ہیں۔ وہ معاملات جن میں خدا اور انسان کے درمیان مطابقت ہے اور جو کتابوں میں لکھی جا سکتی ہیں، ان باطنی صفات اور صفات کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن میں بندہ اللہ کے قریب ہوتا ہے جن پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک نبوی روایت میں بیان ہے کہ انہوں نے فرمایا:

تَخَلَّقُوا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ

"اپنے آپ کو خدا کے کردار سے آراستہ کرو (یعنی حقیقی طور پر پرہیزگار بنیں)۔

دوسرے لفظوں میں ایسے خوبصورت کردار اور باطنی مزاج اور مزاج کو اپنانا چاہیے جو الٰہی صفات میں شامل ہوں جیسے نیکی، علم، دوسروں کے ساتھ حسن سلوک اور ان پر رحم کرنا، سخاوت، مہربانی، اچھی نصیحت، دوسروں کو ہدایت کا راستہ دکھانا، انہیں برائی سے روکنا، یہ سب الٰہی شریعت کے احکام ہیں۔ ان کو حاصل کرکے خدا کے قریب آتا ہے۔ یہ قربت جگہ اور جسم کی قربت نہیں ہے، بلکہ یہ قربت ان باطنی صفات اور صفات کی ہے جن سے خدا مزین ہے۔ جن باتوں کو کتابوں میں لکھنے کی اجازت نہیں ہے اللہ تعالیٰ نے مندرجہ ذیل آیت میں اشارہ کیا ہے:

وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلرُّوحِ ۖ قُلِ ٱلرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّى

"وہ تم سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ جان میرے رب کے حکم سے ہے۔ (سورۃ البقرۃ سورۃ البقرۃ آیت 85)

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ روح ایک خدائی معاملہ ہے اور انسانی عقل سے بالاتر ہے۔ (اس آیت اور دیگر متعلقہ معاملات کی ایک عمدہ وضاحت کے لیے، براہ کرم اس کتاب کے باب 1 کا حوالہ دیں "روح کے اسرار کی وضاحت")۔ روح کی وجہ سے فرشتوں کو حکم دیا گیا کہ وہ آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ کریں جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

إِنَّا جَعَلْنَٰكَ خَلِيفَةً فِى ٱلْأَرْضِ

"ہم نے تمہیں (انسانوں) کو زمین پر خلیفہ بنایا ہے۔" (سورۃ البقرۃ 38، آیت 26)

چنانچہ اس مطابقت کی وجہ سے انسان خدا کی سرپرستی کا مستحق بن گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے:

إِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ آدَمَ عَلٰى صُوْرَتِهٖ

"اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام اور تمام انسانوں کو اپنی صورت پر پیدا کیا جیسا کہ آدم علیہ السلام پوری انسانیت کا باپ ہے)۔

اس روایت کی بنیاد پر ، کم عقل کے حامل کچھ لوگوں نے یہ سوچا ہے کہ شکل (یا تصویر) سے مراد صرف بیرونی شکل ہے جو حواس کے ذریعہ سمجھی جاتی ہے۔ ان کے اس گمان کی وجہ سے انہوں نے اللہ کے لیے بدن اور اعضاء کا تصور کیا ہے اور اسے دوسری چیزوں سے تشبیہ دی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی پناہ میں اس کمی عقل سے محفوظ رکھے اور ان کی رہنمائی فرمائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس روایت میں اس ہم آہنگی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا: میں بیمار تھا لیکن تم نے میری عیادت نہیں کی! موسیٰ علیہ السلام نے کہا: میں آپ کی عیادت کیسے کر سکتا تھا (اور تم کیسے بیمار ہو سکتے تھے)؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرا فلاں بندہ بیمار تھا اور تم نے اس کی عیادت نہیں کی۔ اگر تم اس سے ملنے جاتے تو تم مجھے اس کے قریب پاتے ۔" لیکن یہ مطابقت اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب انسان [پہلے] فرض عبادات انجام دیتا ہے اور ان کے بعد خدا کے قریب آنے والے اعمال اور راستبازی کے راستے پر فضیلت حاصل کرتا ہے۔ حدیث *قدسی* میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا يَزَالُ الْعَبْدُ يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰى أُحِبَّهُ فَإِذَا أَحْبَبْتُهُ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِهِ وَبَصَرَهُ الَّذِي يُبْصِرُ بِهِ وَلِسَانَهُ الَّذِي يَنْطِقُ بِهِ

"میرا بندہ مجھ کے قریب آتا ہے (اختیاری، اضافی، الٰہی ذمہ داریوں کے لحاظ سے اس سے بالاتر اور اس سے بالاتر اور اس سے زیادہ) اعمال [عبادت، عقیدت اور خدمت] کے ذریعے یہاں تک کہ میں کسی سے محبت نہ کروں۔ جب میں کسی سے محبت کرنے لگتا ہوں تو میں اس کی سماعت بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، میں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، میں اس کی زبان بن جاتا ہوں جس سے وہ بولتا ہے (یعنی خدائی مدد اور قربت انتہائی خلوص اور یکسانیت کے ساتھ راہ الٰہی پر جدوجہد کرنے کے نتیجے میں اس کی زندگی کے تمام پہلوؤں میں شامل ہو جاتی ہے)۔ (اس حدیث کو اس حدیث میں نقل کیا گیا ہے *احادیث* کا مجموعہ *صحیح بخاری* ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے

اس وضاحت کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کی وجوہات میں سے مطابقت محبت کی سب سے اہم وجہ ہے۔ اگرچہ یہ ایک اچھی اور مضبوط وجہ ہے لیکن اس کا وجود بہت کم ہے۔ اگر ہم غور و فکر کریں تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ پانچوں وجوہات [کسی سے محبت کرنے یا کسی سے محبت کرنے کی] حقیقت میں صرف خدا میں یکجا ہیں نہ کہ تمثیلی اور استعاراتی معنوں میں یا اشارے کے ذریعے۔ یہ تمام وجوہات اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت اونچی سطح پر یکجا ہیں کیونکہ باطنی بصیرت رکھنے والوں کی نظر میں صرف معقول اور قابل قبول محبت صرف خدا کی ہے جبکہ کوتاہ نظر رکھنے والوں کی نظر میں اصل محبت خدا کے سوا کسی اور کی محبت ہے۔

یہ بات بھی غور کرنے کے قابل ہے کہ تخلیقات کی محبت میں شریک ہوسکتا ہے کیونکہ آپ کسی خاص وجہ سے کسی سے محبت کرسکتے ہیں اور دوسرا شخص اسی وجہ سے اس محبت میں شریک ہے اور اسی وجہ سے ، آپ کسی دوسرے شخص سے بھی محبت کرتے ہیں۔ محبت میں شریک ہونا ایک قسم کی غلطی ہے اور محبوب کے کمال کی سطح سے انحراف کا ثبوت ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کا محبوب کسی نہ کسی خوبی میں منفرد ہو اور بظاہر کوئی اور محبوب میں موجود اس خوبی کا اشتراک نہ کرے۔ اگر ایسا شخص موجود ہے تو پھر بھی یہ ممکن ہے کہ [اس معیار میں] شریک شریک موجود ہو اور آپ کو اس کا علم بھی نہ ہو یا مستقبل میں کسی اور میں اس طرح کی خوبی کا وجود ناممکن ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات اور صفات اعلیٰ درجے اور درجے پر ہیں اور اللہ العظمی

اور حسن کی ان صفات میں کوئی شریک نہیں ہے، اس وقت ایسا کوئی شخص موجود نہیں ہے اور نہ ہی مستقبل میں اس طرح کا وجود ہونے کا کوئی امکان ہے۔ اس سے سیکھا جاتا ہے کہ اس کی محبت میں کوئی حصہ نہیں ہو سکتا اور اسی لیے وہ کسی بھی عیب سے پاک ہے، بالکل اسی طرح جس طرح اس کی بلند صفات میں شریک ہونا نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ ہی حقیقی محبت اور محبت کے کمال کا مستحق ہے اور یہ حق ایسا ہے کہ اس میں کوئی شریک نہیں ہے۔

الہی غنوسی اور الہی بصیرت کی لذت

اس عنوان کے تحت ہم وضاحت کریں گے کہ لذت کی اعلیٰ ترین سطح الہی عرفان اور چہرے الٰہی کی بصیرت ہے اور یہ کہ اس لذت کو کسی اور پر ترجیح دینا ممکن نہیں ہے۔ یہ ترجیح صرف وہی دے سکتا ہے جو اس لذت سے محروم ہو۔

انسانی مزاج اور ان کی لذتیں: یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ تمام لذتیں انسان میں جمع ہونے والی ادراک اور بہت سی قوتوں اور مزاجوں کے تابع ہیں۔ ہر طاقت اور مزاج کے لیے الگ الگ لذت ہوتی ہے۔ اس لذت کا مفہوم یہ ہے کہ ہر مزاج یا مزاج اپنے مقصد کو حاصل کرتا ہے جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے۔ انسانی مزاج بلا وجہ پیدا نہیں کیا گیا ہے، بلکہ ہر مزاج ایک ایسے معاملے کے لیے تشکیل دیا گیا ہے جو اس کا مقصد ہے۔ مثال کے طور پر ، غصے کا مزاج مطمئن ہونے اور انتقام کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی خوشی تسلط تلاش کرنے یا انتقام لینے میں ہے۔ یہ انتقام اور اطمینان اس کا مقصد ہے۔ کھانے کی خواہش کا مزاج خوراک حاصل کرنے اور اس کے ساتھ [جسمانی] وجود کا تسلسل تلاش کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی خوشی اس کھانے میں ہے جو اس کا مقصد ہے۔ سننے، دیکھنے اور سونگھنے کے مزاج کی بھی یہی حالت ہے۔ ہر مزاج کو اپنے مقصد کے حصول میں خوشی ملتی ہے۔ ایک بھی مزاج ایسا نہیں ہے جو اپنے مقصد کے حصول سے لطف اندوز نہ ہو۔ اسی طرح دل کا مزاج بھی ہوتا ہے جسے الٰہی نور کہا جاتا ہے۔ اس مزاج کو باطنی بصیرت، ایمان کی روشنی اور یقین بھی کہا جاتا ہے۔ تاہم ، اصطلاحات مختلف ہوسکتی ہیں ، لیکن معنی اہم ہیں۔ بہرحال دل اپنی ایک صفت کی وجہ سے جس کے ذریعے معانی (معاملات کی حقیقت) کو سمجھتا ہے، دوسرے جسمانی اعضاء سے الگ حیثیت رکھتا ہے۔ یہ معنی نہ تو خیالی ہیں اور نہ ہی انہیں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر کائنات کی تخلیق اور اس کی ضرورت ایک ایسے خالق کی طرف ہے جو ابدی اور حکمت والا ہے، جو الٰہی صفات سے مزین ہے۔ اس مزاج کو عقل بھی اس شرط پر کہا جاتا ہے کہ کسی کو عقل کے بارے میں بحث و دلائل سے متعلق طریقوں میں استعمال ہونے والی طاقت یا قابلیت کے لحاظ سے نہ سوچے کیونکہ عام طور پر لوگ عقل کو ان معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ حقیقت میں عقل وہ صفت ہے جو انسان کو جانوروں سے ممتاز کرتی ہے اور اس کے ذریعے سے انسان الٰہی معرفت کا ادراک کرتا ہے۔ یہ واضح طور پر واضح ہے کہ یہ ایک بہترین معیار ہے۔

دل کا مزاج: یہ مزاج اس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ اس کے ذریعے تمام معاملات کی حقیقتوں کو سمجھا جا سکے۔ اس مزاج کا مقصد علم اور معرفت ہے اور اس کی لذت اسی میں مضمر ہے جس طرح دوسرے مزاجوں کی لذتیں ان

چیزوں میں ہوتی ہیں جو ان کے مقاصد ہیں۔ جہاں تک علم کی لذت اور الٰہی عرفیت کا تعلق ہے، کوئی بھی اس کی تردید نہیں کر سکتا۔ ایسا ہوتا ہے کہ اگر کسی کو کسی معمولی چیز کی تفہیم یا علم حاصل ہو جائے تو وہ اس سے خوش ہو جاتا ہے اور جو شخص کسی چیز سے ناواقف رہتا ہے، اگرچہ وہ معمولی کیوں نہ ہو، وہ غمگین رہتا ہے۔ لوگ غیر اہم چیزوں کو سمجھنے پر فخر کا اظہار کرتے ہیں اور ان کی زبانیں ہر چیز کا اظہار کرتی ہیں جو وہ جانتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس علم سے بہت لطف اندوز ہوتے ہیں اور اسے اپنے وجود کا کمال سمجھتے ہیں۔ ربوبیت کی صفات میں سے علم سب سے بڑی صفت ہے اور کمال کی معراج ہے۔ چنانچہ جب کسی شخص کو علم کی وجہ سے تعریف کی جاتی ہے تو وہ اس سے بے حد خوش ہوتا ہے کیونکہ اس طرح انسان اپنے وجود کے کمال اور اپنے علم کے کمال کے بارے میں سننے کو ملتا ہے، اس پر فخر کرتا ہے اور اس میں خوشی پاتا ہے۔

اسٹیٹ کرافٹ (کسی ملک کی انتظامیہ) اور سیاسی حکمت عملی کے علم میں جتنی خوشی ملتی ہے، اسے زراعت اور پودے لگانے کے علم میں اس سطح کی خوشی نہیں ملتی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ہستی اور صفات اور فرشتوں اور آسمانوں اور زمین کے رازوں کے علم سے جتنی خوشی حاصل ہوتی ہے، اسی حد تک لذت گرامر اور شعر کے علم سے حاصل نہیں ہوتی۔ اس سلسلے میں حقیقت یہ ہے کہ علم کی لذت اس کی عزت و فضیلت کے مطابق ہے۔ علم کا اعزاز اس کے مضمون کے اعزاز سے پہچانا جاتا ہے۔ علم و فہم میں سب سے افضل فہم یا علم وہ ہے جو سب سے زیادہ لذت بخشتا ہے اور ان کی عزت کا دارومدار موضوع کی عزت پر ہوتا ہے۔ ہم دنیا میں اللہ تعالیٰ سے زیادہ عزتمند، برتر، بلند اور باوقار کسی چیز کو نہیں جانتے جو ہر چیز کا خالق ہے، وہی ہے جس نے ان کو مکمل کیا، انہیں حسن سے نوازا، ایک بار ان کو وجود میں لایا پھر ان کو زندہ کرے گا، وہی ہر چیز کا منصوبہ ساز اور کمپوز کرنے والا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ عدالت الٰہی کے علاوہ کوئی اور دربار ہو جو حاکمیت، خوبصورتی، کمال اور عظمت کی تمام بلندیوں پر محیط ہو؟ نہ تو خدا کی عظمت کے اسباب کا تصور کرنا ممکن ہے اور نہ ہی ریاستوں کے عجائبات کا احاطہ کرنا ممکن ہے۔ حمد و ثنا کرنے والوں کی زبانیں خاموش ہیں اور قلم تھکے ہوئے نظر آتے ہیں (عجائبات الٰہی کے بارے میں لکھنے سے قاصر)۔ اگر آپ کو اس حقیقت میں شک ہے تو آپ کو اس معاملے میں شک نہیں ہونا چاہیے کہ ربوبیت کے رازوں کا علم اور تمام وجودوں پر محیط الہامی امور کی تنظیم سب سے اتر، سب سے زیادہ لذت بخش اور پاک ترین ہے۔ اگر کوئی یہ علم حاصل کر لے تو اس کا حق یہ ہے کہ وہ اپنے وجود کو فضیلت اور کمال سے مالا مال سمجھے اور اس سے خوش ہو اور اس پر فخر کرے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علم لذت بخش ہے اور تمام علوم میں سب سے زیادہ لطف اندوز اللہ تعالیٰ کی ہستی کا علم، صفات، اعمال اور زمین اور عرش الٰہی کے درمیان پھیلی ہوئی بے پناہ سلطنت کی حکمت اور نظم و نسق کا علم ہے۔ گنوسس کی لذت [جس کا اس علم میں چھوٹا سا حصہ ہے] تمام لذتوں میں سب سے بڑی لذت ہے۔ یہ ہوس، غصہ اور دیگر حواس کی دیگر تمام لذتوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ موثر، مضبوط اور پائیدار لذت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو شخص دنیا میں خدا کو نہیں پہچانتا وہ اسے آخرت میں نہیں دیکھ سکتا۔ جو شخص دنیا کی زندگی میں خدا کی معرفت سے راضی نہ ہو وہ آخرت میں الٰہی بصارت سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص دنیا کی زندگی سے کچھ اپنے ساتھ نہیں لے سکتا ہے تو اس میں کوئی نئی چیز نہیں آئے گی۔ جب تک کوئی بوائی نہیں کرتا، وہ [فصل] کیسے کاٹے گا؟ ہر شخص [قیامت کے دن] اسی [روحانی] حالت [یا اس کی کمی] پر جی اٹھے گا جس پر وہ مر گیا ہے اور وہ اس حالت پر مر جائے گا جس پر اس نے اپنی زندگی گزاری ہے۔ لہٰذا جس حد تک کسی کو الٰہی عرفان کا بھروسہ (رزق) حاصل ہو گا، اس حد تک اسے خوشی ملے گی، اور وہی گنوسس الٰہی بصیرت میں اختتام پذیر ہو گا جو لذت کو کئی گنا بڑھا دے گا۔ یہ بالکل عاشق کی خوشی کی طرح ہے جو محبوب کو دیکھ کر کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ ایک تو یہ کہ انسان ایک خیال میں ڈوبے ہوئے تھے اور اس میں لطف اندوز ہو رہے تھے، پھر اچانک محبوب کا چہرہ اس کے سامنے آ جاتا ہے، اب جو خوشی ملے گی وہ کئی گنا بڑھ

جائے گی، بلکہ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ یہ نظارہ لذت کی انتہا ہے۔ جنت کا حال یہ ہے کہ جو شخص اس میں داخل ہوتا ہے اسے وہ تمام نعمتیں حاصل ہوتی ہیں جو وہ چاہتا ہے لیکن جو صرف خدا سے ملنا چاہتا ہے اسے کسی اور چیز میں خوشی نہیں ملے گی۔ خلاصہ یہ ہے کہ انسان جنت کی نعمتوں کو اس حد تک حاصل کرے گا کہ اس کا دل خدا کی محبت سے منور ہو اور محبت الٰہی عرفان کے مطابق ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ابدی سعادت اور دائمی کامیابی کا اصل سبب خدا کی معرفت ہے۔ الٰہی قانون نے اسے ایمان (ایمان) کے طور پر سمجھا ہے [لیکن ایمان دراصل گنوسس سے مراد ہے]۔

خدا کی محبت کو کامل کرنے کے ذرائع: آخرت میں سب سے زیادہ خوش اور خوشحال شخص وہ ہوگا جو خدا کی محبت میں سب سے زیادہ پختہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آخرت کا مفہوم خدا کے پاس آنا اور اس سے ملنے کا شرف حاصل کرنا ہے۔ ایک عاشق کے لیے اس سے بڑی نعمت اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ ملاقات کی طویل خواہش کے بعد محبوب کے پاس آئے اور اس حالت میں [محبوب کے] وژن کی سعادت کو مستقل طور پر حاصل کرے کہ خوشی کو برباد کرنے کے لیے کوئی رکاوٹ نہ ہو، نہ کوئی دشمن، کوئی حسد، کوئی مخالف اور نہ ہی اس بصارت کے ٹوٹنے کا کوئی خوف نہ ہو۔ لیکن یہ نعمت محبت کی قوت (شدت) کے متناسب ہو گی۔ محبت کی حد تک لذت کی حد ہوگی۔ بندے کو دنیا کی زندگی میں الٰہی کی محبت سے فائدہ ہوتا ہے کیونکہ خدا کی عقل کی کسی نہ کسی سطح پر ہر مومن کے دل میں ہوتی ہے کیونکہ کوئی بھی مومن شخص کسی نہ کسی محبت سے خالی نہیں ہوتا۔ تاہم جسے "شدید محبت" کہا جاتا ہے، وہ ہر فرد میں موجود نہیں ہے، بلکہ یہ لوگوں کی اکثریت میں موجود نہیں ہے۔ محبت کی یہ معراج دو طریقوں سے حاصل کی جاتی ہے:

پہلا مطلب یہ ہے کہ بندہ اپنے رشتے کو دنیاوی وابستگیوں اور الجھنوں سے توڑ دیتا ہے اور خدا کے سوا کسی اور کی محبت کو دل سے نکال دیتا ہے۔ دل ایک کنٹینر کی طرح ہے - اس میں سرکہ ڈالنے کی گنجائش نہیں ہے جب تک کہ اس سے بھرنے والا پانی نہیں ہٹایا جائے۔ یہ توقع نہیں کی جانی چاہیے کہ خدا کی محبت [دل میں] دنیاوی وابستگیوں کے ساتھ مل کر رہ سکتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے سینے میں دو دل پیدا نہیں کیے۔ محبت کا کمال یہ ہے کہ انسان اپنے دل کی گہرائیوں سے خدا سے محبت کرتا ہے۔ جب تک کوئی شخص اللہ کے سوا کسی اور کی طرف مائل نہیں رہے گا، دل کا ایک حصہ اللہ کے سوا کسی اور کے ساتھ مشغول رہے گا۔ جس حد تک کوئی خدا کے سوا کسی اور کے ساتھ مشغول ہے، اس حد تک محبت کی کمی ہوگی۔ دل کو تمام برائیوں سے پاک کرنے اور اسے ہر قسم کی محبتوں سے خالی کرنے کا خدا نے حکم دیا ہے۔

شہادت لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ (خدا کے سوا کوئی معبود نہیں) کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور نہ ہی اللہ کے سوا کوئی محبوب ہے کیونکہ محبوب وہی ہے جو خدا (یا مالک) ہے کیونکہ بندے (یا بندے) کا مطلب یہ ہے کہ وہ قید ہو رہا ہے اور مالک وہ ہے جس کے قید میں عاشق ہے۔ ہر عاشق اپنے محبوب کا قیدی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

أَرَءَيْتَ مَنِ ٱتَّخَذَ إِلَـٰهَهُۥ هَوَىٰهُ

"کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہشوں سے ایک معبود بنایا ہے اور اس کے پیچھے بھاگ رہا ہے؟" (سورة البقرة باب 25، آیت 43)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أَبْغَضُ إِلٰهٍ عُبِدَ فِي الْأَرْضِ الْهَوَىٰ

"زمین پر جس بدترین خدا کی عبادت کی جاتی ہے وہ ادنیٰ نفس کی خواہشات ہے [کیونکہ یہ زمین پر تمام برائیوں ، مصیبتوں ، مصائب ، فتنوں اور فتنوں کی جڑ ہے]۔

ایک اور روایت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ قَالَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُخْلِصًا دَخَلَ الْجَنَّةَ

"جو شخص سچے دل سے کہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ تو وہ جنت میں داخل ہوگا"۔

اخلاص کا مفہوم یہ ہے کہ بندہ اپنا دل صرف خدا کے لیے وقف کر دیتا ہے اور دل میں اللہ کے سوا کسی اور کے لیے جگہ نہیں بچتی، خدا ہی عبادت کے لائق معبود بن جاتا ہے، وہ اپنے دل کا محبوب بن جاتا ہے اور وہ دل کا مقصد بن جاتا ہے۔ جو شخص اس حالت میں ہے اس کے لیے دنیا (دنیاداری، دنیاوی وابستگی، اور الجھنیں) قید خانے سے کم نہیں ہے کیونکہ یہ ایک اور محبوب کی نظر کے درمیان رکاوٹ ہے۔ ایک ایسے شخص کا تصور کیجئے جس کے پاس صرف ایک ہی محبوب ہو اور وہ ایک طویل عرصے سے اپنے محبوب سے ملنے کا شدید خواہشمند ہو اور محبوب کے نظارے کا بے چینی سے انتظار کر رہا ہو لیکن قید خانہ کی دیواریں اور لوہے کی گرل اس کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ اچانک جیل سے آزاد ہو جاتا ہے۔ پھر کسی کی خوشی کی شدت کیا ہوگی؟ [بہت] اپنے محبوب کے ساتھ ہمیشہ اور ہمیشہ کے لیے رہنے کا خیال [آزادی اور آزادی کی اس حالت میں] بہت سکون بخش اور تازگی بخش ہو گا!

بہرحال دنیا کی محبت کی طاقت (دنیاداری اور دنیاوی وابستگی) خدا کی محبت کی کمزوری کی ایک اہم وجہ ہے۔ دنیا سے محبت میں شریک حیات ، بچوں ، رشتہ داروں ، زمین ، جانوروں ، باغات ، تفریح وغیرہ سے محبت شامل ہے۔ ایسا شخص دنیا کی محبت میں قید ہے اور اس کی نعمتوں کی طرف مائل ہوتا ہے اور اسی کی وجہ سے خدا کی محبت میں نقصان برداشت کرتا ہے۔ دنیا کے لیے جتنی تڑپ ہے، خدا کی تڑپ میں کمی آئے گی۔ دنیا میں جس حد تک کسی کو حصہ ملتا ہے، اس حد تک آخرت میں اس کا حصہ کم ہوتا جاتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے مغرب کے قریب ہوتا جاتا ہے اتنا ہی مشرق سے دور ہوتا جاتا ہے۔ دنیا اور آخرت مشرق اور مغرب کی طرح ہیں۔ روحانیت کے اہل دل نے اپنی آنکھوں سے گواہ ہے کہ دل سے دنیاداری کی محبت کو مٹانے کے لیے ضروری ہے کہ پرہیز کا راستہ اختیار کیا جائے، صبر میں استقامت کا مظاہرہ کیا جائے اور خوف اور امید کے ساتھ الٰہی کی اطاعت کی جائے۔ پچھلے ابواب میں، ہم نے توبہ، صبر، پرہیز، [خدا سے] خوف اور [خدا میں] امید کے [روحانی] مقامات کی وضاحت کی ہے۔ ان مرتبات کو حاصل کرنے کی کوشش الٰہی محبت کے حصول کے دو ذرائع میں سے ایک ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی بھی چیز یا کسی اور کے دل کو خالی کر دیا جائے۔ یہ (یعنی اندرونی تبدیلی) خدا ، قیامت کے دن ، اور جنت اور جہنم پر ایمان رکھنے سے شروع ہوتا ہے جو خوف اور امید کو جنم دیتا ہے۔ اس کے بعد توبہ اور صبر پیدا ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ دل کی کیفیت اس طرح بدل جاتی ہے کہ دولت، مادی اموال اور دنیاوی لذتوں کی طرف ذرا سی بھی جھکاؤ باقی نہ رہے، بلکہ وہ تمام برائیوں اور گندگی سے پاک ہو جاتا ہے، محبت الٰہی

کے پاک چراغ دل میں روشن ہو جاتے ہیں اور اس میں الہی عرفہ اور الہی محبت کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے). توبہ اور صبر جیسے روحانی مقام دل کی تطہیر کے ابتدائی سہولت کار ہیں۔ یہ تطہیر محبت الٰہی کے دو ذرائع میں سے ایک ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ معرفت الٰہی کو مضبوط کرنا: معرفت الٰہی کو مضبوط کرنا اور اسے دل میں اچھی طرح پھیلانا دل میں خدا کی محبت کو مضبوط کرنے کا دوسرا ذریعہ ہے۔ یہ تب ممکن ہوتا ہے جب دل کو تمام دنیاوی وابستگیوں اور مصروفیات سے پاک کیا جائے۔ اس کی تمثیل زمین میں بیج بونے سے پہلے اس سے جڑی بوٹیوں کو ہٹانے کی ہے۔ یہ [الہامی] محبت کا دوسرا عنصر ہے۔ جب یہ بیج [تمام نجاستوں اور برائیوں سے پاک کرنے کے بعد خدا کی راہ میں روحانی جدوجہد کی شکل میں] بویا جاتا ہے اور اس کی دیکھ بھال کی جاتی ہے [مسلسل پانی پینے، اگنے والی جڑی بوٹیوں کو ہٹانے اور اسے موسمی نقصانات سے بچانے کے لحاظ سے]، تو اس میں سے آہستہ آہستہ محبت اور الٰہی گنوسیس کا پودا نکلتا ہے، اور یہ مسلسل ایک بڑے مضبوط درخت کی شکل اختیار کرتا ہے اور اسے پاکیزگی کا عظیم بیان کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید نے اس تمثیل کے طور پر بیان کیا ہے:

ضَرَبَ ٱللَّهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِى ٱلسَّمَآءِ

"اللہ تعالیٰ پاکیزگی کے اس عظیم بیان کی مثال بیان کرتا ہے کہ یہ ایک عظیم درخت کی مانند ہے جس کی جڑیں مضبوط اور گہری ہیں اور اس کی شاخیں آسمان پر اونچی ہو رہی ہیں۔" (سورۃ البقرۃ باب ۱۴، آیت ۲۴)

قرآن مجید میں اس عظیم بیان کی طرف مزید اشارہ کیا گیا ہے:

إِلَيْهِ يَصْعَدُ ٱلْكَلِمُ ٱلطَّيِّبُ وَٱلْعَمَلُ ٱلصَّٰلِحُ يَرْفَعُهُۥ ۚ

"نیک باتیں اس تک پہنچتی ہیں اور نیک اعمال انہیں اس کی طرف اٹھاتے ہیں۔ (یہاں ہم خدا کی حضوری میں چڑھتے ہوئے نیک اعمال میں جدوجہد کرنے اور سبقت حاصل کرنے کا راز اور حکمت سیکھتے ہیں، اپنے عمل کرنے والے کے روحانی درجات اور درجات کو بلند کرتے ہیں، الٰہی گنوسس اور زندگی کے حقیقی مقصد کے حصول اور اس کے نتیجے میں ابدی خوشی اور ابدی کامیابی حاصل کرتے ہیں)۔ (سورۃ البقرۃ باب 35، آیت 10)

"پاکیزگی کا عظیم بیان" گنوسس (*معارفہ*) کی طرف اشارہ ہے اور نیک اعمال اس کے نالی اور خادموں کی طرح ہیں۔ نیک اعمال کے ذریعے دلوں کو پاک کیا جاتا ہے اور اس باطنی پاکیزگی اور بے باکی کا نتیجہ ابدی زندگی کا حصول ہوتا ہے۔ اگر نیک اعمال رک جائیں تو دل کی پاکیزگی بھی ختم ہو جائے گی۔ نیک اعمال کا مقصد یہ عرفان ہے اور علم ان اعمال کی نوعیت کو جاننا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ علم سب سے پہلے اور سب سے اہم ہے۔ پہلا علم ظاہری امور کا علم ہے اور اس کا مقصد اعمال اور اعمال ہیں۔ اس علم سے دل کو تمام برائیوں اور نجاستوں سے پاک کیا جاتا ہے تاکہ وہ حق کی روشنی حاصل کرنے کے قابل ہو جائے اور پھر الٰہی علم سے آراستہ ہو جائے۔ علم الٰہی کے علم کا دوسرا نام "علم *المکاشفہ*" ہے اور یہ دوسرا علم ہے [روحانی روشنی کے لیے درکار جو انسان کو حضور الٰہی کی طرف لے جاتا ہے]۔

جب کوئی شخص الٰہی معرفت کا علم حاصل کرتا ہے تو وہ لازمی طور پر [الہامی] محبت حاصل کرتا ہے [جس میں خدا ایک سے محبت کرتا ہے اور وہ خدا سے محبت کرتا ہے]۔ یہ بالکل ایک اعتدال پسند شخص کی طرح ہے جو کسی خوبصورت چیز کو دیکھ کر اس کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور اس میں لطف اندوز ہوتا ہے۔ لذت فطری طور پر محبت کے تابع ہے اور محبت گنوسس کے تابع ہے۔ بندہ (خدا کا) اس گنوسس تک صرف اس وقت پہنچ سکتا ہے جب وہ دنیاوی مصروفیات (الجھنوں اور وابستگوں) سے اپنا رشتہ توڑ دے اور یہ رشتہ توڑنے کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ وہ فکر کی سست رفتاری، الٰہی کی یاد کی دائمی ہو، اور خدا کے وجود، صفات، حاکمیت اور اس کی تمام مخلوقات میں مسلسل غور و فکر کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ جو لوگ اس درجے تک پہنچتے ہیں وہ دو طرح کے ہوتے ہیں: وہ جو مضبوط ہوتے ہیں جو سب سے پہلے خدا کی معرفت حاصل کرتے ہیں اور خدا کے وسیلہ سے باقی سب کچھ پہچانتے ہیں اور جانتے ہیں۔ اور وہ کمزور جن کی معرفت اعمال اور اعمال سے شروع ہوتی ہے اور اس سے آگے بڑھتے ہوئے وہ ہر چیز کرنے والے تک پہنچتے ہیں

زیادہ تر لوگوں کے لئے [جو دوسری قسم کے ہیں] ، یہ طریقہ آسان ہے۔ قرآن مجید نے اپنی بہت سی آیات میں لوگوں کو غور و فکر، غور و فکر، جانچ پڑتال اور [ہر جگہ پھیلی ہوئی خدا کی نشانیوں سے اخذ کرنے] کی دعوت دی ہے اور [انسانیت] کو اس راستے کی طرف رہنمائی کی ہے۔ اگر اب آپ یہ کہیں کہ یہ دونوں طریقے آپ کو مشکل لگتے ہیں اور آپ چاہتے ہیں کہ آپ کو کوئی آسان طریقہ سمجھایا جائے تو ہم کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ کے وسیلہ سے مخلوقات کی تفہیم حاصل کرنے والا پہلا طریقہ درحقیقت عام لوگوں کے لیے مشکل، لطیف اور ناقابل فہم ہے۔ اس سے ہمیں صرف دوسرا راستہ چھوڑ جاتا ہے جو زیادہ تر لوگوں کی عقل سمجھتا ہے۔ اگر لوگ اس [آسان] راستے کو مشکل سمجھتے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ واقعی مشکل ہے بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ وہ غور و فکر بھی نہیں کرتے، اور ادنیٰ نفس کی طرف سے دنیاوی خواہشات اور جسمانی لذتوں میں مشغول رہتے ہیں۔ ہم اس طریقہ کار پر تفصیلی بحث نہیں کر سکتے کیونکہ یہ ایک وسیع اور بے مثال موضوع ہے اور اس کی بہت سی قسمیں (ذیلی شاخیں) ہیں جن کا شمار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ آسمانوں کی بلندی سے لے کر زمین کی گہرائیوں تک کوئی ذرہ ایسا نہیں ہے جو خدا کی قابلیت کی کمال، حکمت کی تکمیل، عظمت کی بلندی کے بارے میں بحث نہ کرے۔ اور عظمت کی چوٹی؛ یہ بے شمار ذرات ہیں اور ہر ذرہ میں اس کے لیے بے شمار دلائل موجود ہیں۔

قُل لَّوْ كَانَ ٱلْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَٰتِ رَبِّى لَنَفِدَ ٱلْبَحْرُ قَبْلَ أَن تَنفَدَ كَلِمَٰتُ رَبِّى وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِۦ مَدَدًا

کہہ دو (اے محمد! "اگر میرے رب کی باتوں کو لکھنے کے لیے سمندر سیاہی بن جائے تو میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے ہی سمندر ختم ہو جائے گا، اگرچہ ہم اس کے جیسا بھی اضافہ کر لیں۔" (خدا باطنی روحانی علم اور تجربے کے بے پناہ سمندر کی وسعت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔) (سورۃ البقرۃ آیت 18، آیت 109)

اس باطنی روحانی علم میں مشغول ہونا "*علم المکاشفہ" کے سمندر میں غوطہ لگانے کے مترادف ہے اور اسے غیر اہم انداز میں خارجی علم (* علم المعاملہ) *کی درجہ بندی کے تحت لکھنا بھی مناسب نہیں* ہوگا۔ تاہم ، کچھ تمثیلوں کے ساتھ اس کی مختصر وضاحت کی جاسکتی ہے۔

اعمال الٰہی کی تفہیم کے ذریعے خالق کی معرفت: حقیقت میں مذکورہ بالا طریقوں میں سے سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ اعمال الٰہی کی تفہیم کے ذریعے خدا کی معرفت حاصل کی جائے۔ ہمیں اعمال الٰہی پر ایک نظر ڈالنی چاہیے جن میں وہ اعمال بھی شامل ہیں جو بہت سے دوسرے اعمال الٰہی کے مقابلے میں چھوٹے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ

اللہ تعالیٰ کی قدرت کے عجائبات سے بھرے ہوئے ہیں۔ زمین اور اس پر رہنے والی مخلوقات فرشتوں اور آسمانی سلطنتوں کے مقابلے میں بہت چھوٹی اور غیر اہم ہیں۔ ذرا زمین کی کمیت اور سائز کو لے لیں، جو بظاہر بہت وسیع ہے، لیکن سورج جو ہمیں چھوٹا لگتا ہے، زمین سے ہزاروں گنا بڑا ہے۔ ایک طرف سورج کی وسعت کو دیکھیں اور دوسری طرف کائنات کی وسعت دیکھیں جس کا وہ حصہ ہے۔ سورج کی وسعت اور کائنات کی وسعت میں کوئی موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ جو کچھ ہم دیکھ سکتے ہیں وہ پہلے آسمان کی حدود ہیں، اور یہ آسمان اس کے اوپر کے آسمانوں کے مقابلے میں کافی چھوٹا ہے۔ پھر یہ سات آسمان تخت الٰہی کے مقابلے میں ایک وسیع و عریض صحرا میں رکھے گئے لوہے کے ٹکڑے کی مانند ہیں اور تخت الٰہی (*عرش*) کے مقابلے میں تخت الٰہی کے مقابلے میں سات آسمانوں کی طرح ہے۔ سورج، کائنات، تخت الٰہی اور عرش الٰہی کی وسعت پر نظر ڈالیں اور ان کا موازنہ زمین سے کریں تاکہ دیکھیں کہ یہ زمین کتنی چھوٹی، غیر اہم اور ادنیٰ ہے! بلکہ زمین (زمین پر زمین) زمین کے سمندروں کے مقابلے میں بہت چھوٹی ہے۔

اگر انسان عجائبات الٰہی پر غور کرے تو وہ گنوسس حاصل کرے گا جو مذکورہ بالا طریقوں کے مقابلے میں حاصل کرنا آسان ہے۔ جب گنوسس میں اضافہ ہوتا ہے تو [خدائی] محبت بھی بڑھ جاتی ہے۔ اگر آپ خدا سے ملنا چاہتے ہیں اور اس کی خواہش رکھتے ہیں اور خدا کی ابدی سعادت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو دنیا پرستی (دنیاوی شان و شوک، چمک، وابستگی اور الجھنیں) کی تلاش سے پرہیز کریں، یاد الٰہی اور غور و فکر کو اپنے آپ پر فرض کریں، یہ ممکن ہے کہ مسلسل روحانی کوششوں کے ذریعے آپ کو الہی عرفان اور محبت میں حصہ ملے۔ یاد رکھیں کہ دنیاوی لذتوں کو چھوڑنے سے آپ کو وہ تسلط ملے گا جو آپ کے تصور سے کہیں زیادہ وسیع اور ابدی ہوگا۔

محبت الٰہی میں لوگوں کے درمیان اختلافات کی وجوہات: تمام مومنین بنیادی محبت میں شریک ہیں [جو خدا کی تمام مخلوقات کے لیے خدا کی ہستی سے پیدا ہوتی ہے]۔ تاہم ، محبت کے مختلف درجات ہیں اور یہ اختلافات اس لئے ہیں کہ لوگ اپنی سمجھ اور گنوسس اور دنیا سے محبت میں مختلف ہیں۔ چیزوں کے درمیان اختلافات ان چیزوں کے پیچھے [ابتدائ] وجوہات کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ الٰہی محبت کا سبب گنوسس ہے۔ اگر Gnosis کم و بیش ہے تو ، یقینا محبت میں اضافہ یا کمی ہوگی۔ اکثر لوگ اللہ تعالیٰ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے نام (ہر نام ایک صفت الٰہی کی نمائندگی کرتا ہے) اور صفات کے لحاظ سے جو کچھ سنا اور حفظ کیا ہے اس سے زیادہ نہیں جانتے اور نہ سمجھنے کی وجہ سے وہ ان کے ایسے [غلط] مفہوم کا تصور کرتے ہیں کہ خدا ان سے بہت بالاتر ہے۔ بعض لوگ ان اسماء الٰہی اور صفات کی حقیقتوں سے بخوبی واقف نہیں ہوتے، لیکن وہ ان کے غلط مفہوم کا تصور بھی نہیں کرتے، بلکہ وہ ایمان کے طور پر سنتے اور قبول کرتے ہیں اور بحث و مباحثہ میں الجھے بغیر اعمال میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ "دائیں ہاتھ" کے لوگ ہیں [جنہوں نے حفاظت اور بالآخر نجات حاصل کی ہے]۔ جو لوگ غلط مفہوم سمجھتے ہیں وہ گمراہی کی راہ پر گامزن ہیں اور جو لوگ (اسماء و صفات کی حقیقت) کو جانتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے قریبی ہیں (اور قرب و معرفت میں پوری انسانیت میں سب سے آگے ہیں]۔

چونکہ لوگ مثالوں سے معاملات کو سمجھتے ہیں، اس لیے ہم سب سے پہلے ایک مثال دیں گے کہ لوگ ایک ہی چیز کی محبت میں کس طرح مختلف ہیں۔ اگر کوئی مصنف کی وجہ سے کسی مصنف کے بارے میں بہت زیادہ سوچتا ہے اور مصنف کی فضیلت اور تحریر میں کمال پر یقین رکھتا ہے اور اسی مصنف کی دوسری کتاب سامنے آتی ہے جو پہلی کتاب سے بھی بہتر ہے تو یقینا مصنف سے محبت اور بھی بڑھ جائے گی اور مصنف کی فضیلت اور کمال کا یقین اور بھی بڑھ جائے گا۔ تمام علم اور مہارتیں اسی حالت میں ہیں۔ جس کے پاس غنوسی ہے اور اس میں اضافہ ہوتا ہے اس کی محبت متناسب طور پر بڑھ جاتی ہے۔ دوسری طرف ایک ہے جو اچھی باتوں کی پرواہ نہیں کرتا اور

بری چیزوں کی طرف مائل ہوتا ہے) جو اگر اسے سنتا ہے تو صرف وہی سنتا ہے کہ فلاں شخص ایک مصنف ہے جس نے اچھی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ایسا شخص یہ نہیں جانتا کہ ان کتابوں میں کون سے علم چھپے ہوئے ہیں اور [مصنف کی کتابوں کے بارے میں] کسی کی تفہیم محض سطحی ہے اور اس کی محبت بھی کم سے کم ہے۔ باطنی بصیرت رکھنے والا شخص محض سننے سے مطمئن نہیں ہوتا، بلکہ مصنف کی کتابوں کے صفحات پڑھتا ہے، اپنی کوششوں سے علم کے چمکدار موتی تلاش کرتا ہے، ان کتابوں میں بکھرے ہوئے عجائبات سے آشنا ہونا چاہتا ہے، اور جب کوئی ان کوششوں میں کامیاب ہوتا ہے تو اس کی محبت کئی گنا بڑھ جاتی ہے کیونکہ کوئی تخلیق یا تحریر خالق کی فضیلت اور کمال کی دلیل دیتی ہے۔ مؤلف۔ اب اس پر ایک اور مثال کی روشنی میں غور کریں۔ یہ دنیا خدا کی تخلیق اور تصنیف شدہ کتاب ہے۔ ایک عام انسان کے پاس یہ علم اور یقین ہے، لیکن یہ محض سطحی اور سرسری ہے، جب کہ باطنی بصیرت رکھنے والا شخص اس کی تفصیلات جاننا چاہتا ہے، ان پر اس حد تک غور و فکر کرتا ہے کہ عقل کو حیران کرنے والی چھوٹی چھوٹی چیزوں میں عجائبات تلاش کرتا ہے۔ اس تفصیلی مطالعہ سے صفات کی عظمت و عظمت اور کمال میں اضافہ ہوتا ہے اور اس سلسلے میں اس کی محبت دل میں اضافہ ہوتی ہے۔ پھر جیسے جیسے کسی کا علم [خدا کے بارے میں] بڑھتا جاتا ہے، اس حد تک اس کی معرفت اور [خدا] کی محبت بھی بڑھتی جاتی ہے۔

الہی عجائبات کا سمندر ایک بے پناہ سمندر ہے جس میں ساحل نہیں ہے۔ لہٰذا یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ اس گنوسس کے حامل اپنی محبت میں مختلف ہیں۔ [کی سطح] محبت بھی مختلف ہے [مختلف لوگوں میں] ان پانچ وجوہات کی وجہ سے جن کی ہم پہلے وضاحت کر چکے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ، کچھ لوگ خدا سے محبت کرتے ہیں کیونکہ وہی ہے جو ان کو اجر دیتا ہے اور ان پر احسان کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ محبت خدا کی ذات سے نہیں ہے اور اس لیے کمزور ہے اور کمزوری کی نشانی یہ ہے کہ خدا کی طرف سے ملنے والی نعمتوں میں تبدیلیوں کی وجہ سے ان کی محبت کی سطح بھی بدل جاتی ہے۔ لہٰذا مصیبت کے وقت ان کی محبت کی کیفیت آسانی اور راحت کے وقت سے مختلف ہوگی۔ وہ شخص جو خدا کے وجود سے محبت کرتا ہے یا اس سے اس لیے محبت کرتا ہے کہ وہ اس کے کمال، خوبصورتی، حسد کی وجہ سے اس کا مستحق ہے [تاکہ الٰہی رازوں کو ان لوگوں سے بچانے کے لیے جو ان کے اپنے روحانی خواہشات کی وجہ سے ان کے لائق نہیں ہیں، روحانی راہ میں غلطی کرتے ہیں، اور خدا کی حضوری کی طرف اعلیٰ روحانی راستے پر آگے بڑھنے کے لیے صحیح نیت اور اعلیٰ ارادہ رکھتے ہیں]۔ اور عظمت اور اس محبت میں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ الٰہی نعمتوں میں تنوعات ہیں۔ یہ وہ وجوہات ہیں جن کی محبت کی سطح مختلف ہے اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ آخرت کی ابدی خوشی اور لازوال کامیابی بھی محبت کی مختلف سطحوں کی وجہ سے مختلف ہوگی۔

الہٰی کی تڑپ

خدا کی تڑپ کے معنی : خدا کی حسرت سے انکار نہیں کرنا چاہئے کیونکہ جب محبوب مقصد ہوتا ہے تو حسرت ضروری ہے۔ اس موضوع کے تحت، ہم یہ سمجھانا چاہیں گے کہ ایک گنوسٹک یقینا خدا کے لیے تڑپ رکھتا ہے، بلکہ، وہ خدا [محبوب] کے لیے تڑپ رکھنے پر مجبور ہوتا ہے۔ ہم اس دعوے کو دو طریقوں سے ثابت کریں گے: پہلا تجربہ اور مشاہدے کی بنیاد پر اور دوسرا روایات کے ذریعے۔

پہلا طریقہ تجربے اور مشاہدے کے ذریعے: ہمیں اس بارے میں زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ ہم نے محبت کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ اس سلسلے میں کافی ہونا چاہیے۔ اگر محبوب آنکھوں سے غائب ہو گیا ہے تو محبوب کی نظر کی تڑپ ایک فطری بات ہے۔ اگر محبوب کسی کے سامنے موجود ہو یا محبوب کی حضوری حاصل ہو تو حسرت نہیں ہے کیونکہ حسرت محبوب کی تلاش کا نام ہے اور جو چیز حاصل کی گئی ہے اس کی تلاش نہیں ہے۔ جس چیز کا ادراک نہیں کیا جا سکتا، اس کی خواہش نہیں کی جا سکتی۔ لہٰذا اگر کسی نے کسی فرد کو نہیں دیکھا ہے یا اس کے بارے میں نہیں سنا ہے تو یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ایسے شخص کے لیے ترس رہے گا۔ ادراک کا کمال وژن میں ہے۔ اگر کسی کا محبوب مستقل نظر میں ہے تو اس کے لیے محبوب کی تڑپ نہیں رہے گی۔ ہم ایک مثال کے ذریعے اس کی وضاحت کریں گے۔

اگر کسی کا محبوب اس شخص سے غائب ہو جائے جو مسلسل اس کے بارے میں سوچتا رہتا ہے، تو وہ محبوب کے وژن کے ذریعے اپنی سوچ کو مکمل کرنے کی خواہش کرے گا۔ لیکن اگر محبوب کا خیال دل سے غائب ہو جائے اور وہ اسے بھول جائے تو حسرت کا وجود ہی نہیں رہتا۔ یہ بھی معقول نہیں ہے کہ معشوق کو دوبارہ دیکھنے کے بعد دوبارہ محبوب کی تڑپ شروع ہو جائے کیونکہ حسرت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اپنے دل میں موجود خیال کی تکمیل کو بصیرت کے ذریعے تلاش کر رہا ہے۔ کبھی کبھی کوئی اپنے محبوب کو اندھیرے میں دیکھتا ہے اور اس وقت معشوق کو روشنی میں دیکھ کر اپنی نظر کو پورا کرنے کی خواہش رکھتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی محبوب کا چہرہ دیکھے لیکن بال یا دیگر خصوصیات کو نہیں۔ اس صورت میں بھی، کسی کو اب بھی محبوب کی زیادہ خوبصورت خصوصیات دیکھنے کی خواہش ہو سکتی ہے جو پہلے نہیں دیکھی گئی تھیں۔

خدا کے معاملے میں ، دونوں صورتوں کا تصور کیا جاسکتا ہے ، بلکہ ، ایک گنوسٹکس لازمی طور پر دو وجوہات کی بناء پر خدا کے لئے ترس رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو الہامی معاملات عرفان پر نازل ہوتے ہیں وہ بظاہر واضح اور روشن ہیں لیکن حقیقت میں وہ بہت لطیف اور پیچیدہ ہیں اور ان کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک پتلے پردے کے پیچھے سے دیکھے گئے تھے، اس لیے کچھ معاملات چھپے ہوئے تھے اور بصیرت کا کمال حاصل نہیں ہوا تھا۔ بلکہ اس وژن کو تخیل کے ساتھ ملا دیا گیا ہے جس کی وجہ سے گنوسٹک کے دل میں گندگی اور کیچڑ پیدا ہوتی ہے۔ اس کے اوپر ، اگر دنیاوی زندگی [اس کے تمام مسائل اور الجھنوں کے ساتھ] اس پر اپنا سایہ ڈالتی ہے تو ، اس گنوسس کی ساری لذت ختم ہوجاتی ہے۔ واضح بصارت کا کمال بصارت (*مشاہدہ*) اور روحانی نور (*تجلی*) کے بجلی کے امتزاج سے ہوگا اور یہ آخرت سے پہلے ممکن نہیں ہے۔ گنوسٹک کا مقصد الٰہی بصیرت اور روحانی نور کی بجلی کا حصول ہے، اس لیے ضروری ہے کہ دل اس کے لیے تڑپ رکھے۔ دوسرے لفظوں میں اس چیز کی تکمیل کی خواہش ہونی چاہیے جس کے اہم عوامل کی تفہیم دنیاوی زندگی میں کسی نے حاصل کی ہو۔

[الٰہی کے لیے] حسرت کے لیے یہ پہلی ضروری ضرورت تھی۔ اب دوسری ضروری ضرورت یہ ہے کہ کچھ دوسری چیزوں کو دیکھنے کے بعد کچھ چیزوں کی تڑپ ہو جو خدا کے معاملے میں بھی ممکن ہے۔ خدائی معاملات بے شمار ہیں اور ان کی کوئی حد نہیں ہے۔ تمام معاملات کسی بندے پر نازل نہیں ہوتے، بلکہ بعض معاملات کو بے نقاب کیا جاتا ہے اور بعض (کثرت) اپنی پیچیدگی اور نزاکت کی وجہ سے پردہ ڈال دیا جاتا ہے۔ ایک گنوسٹک اس طرح کے معاملات کے وجود کے بارے میں جانتا ہے اور اعتراف کرتا ہے کہ جو کچھ جانتا ہے اس کے مقابلے میں بہت زیادہ معاملات ہیں جن کے بارے میں کوئی نہیں جانتا۔ لہذا، ایک شخص (گنوسٹک) باقی معاملات کو اپنے علم کے دائرے میں لانے کی خواہش رکھتا ہے۔ جہاں تک پہلی آرزو کا تعلق ہے کہ انسان پوری وضاحت اور روشنی کے

ساتھ خدا کی معرفت حاصل کرے گا، آخرت میں تکمیل کے ساتھ حاصل کیا جائے گا۔ پہلی حسرت کے معنی میں جسے "بصیرت"، "ملاقات" یا "دیکھنا" کہا جاتا ہے، اس دنیا (دنیاوی زندگی) میں اس حسرت کی تکمیل ممکن نہیں ہے۔

حسرت کے لیے دوسرا ضروری شرط یہ ہے کہ انسان تمام علم حاصل کر لے جائے، نہ اس زندگی میں ممکن ہے اور نہ ہی آخرت میں، کیونکہ اس حسرت کی تکمیل (مکمل تکمیل) اس طرح کی خواہش کی جاتی ہے کہ بندہ نے تمام معاملات کو اس طرح ظاہر کیا ہے جو جمال الٰہی سے متعلق ہے۔ عظمت ، صفات ، حکمت اور اعمال جن کے بارے میں خدا جانتا ہے ، لیکن یہ ناممکن ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کا علم لامحدود ہے۔ ایک بندے کو ہمیشہ معلوم ہوگا کہ خدا کی خوبصورتی اور عظمت سے بہت سی ایسی باتیں باقی ہیں جو کسی پر بے نقاب نہیں ہوئی ہیں۔ اس لیے کسی کی خواہش پوری نہیں ہو گی، خاص طور پر وہ شخص جو اپنے موجودہ [روحانی] نقطہ نظر سے اعلیٰ [روحانی] درجات دیکھتا ہے اور زیادہ [روحانی] درجات کا خواہاں ہوگا۔

دوسرا طریقہ روایت کے ذریعے: الٰہی کی خواہش کی تصدیق کا دوسرا طریقہ روایت کے ذریعے ہے۔ اس بارے میں بہت سی روایات ملتی ہیں۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعاؤں میں اللہ تعالیٰ سے التجا کرتے تھے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْاَلُکَ الرِّضَا بَعْدَ الْقَضَاءِ وَبَرْدَ الْعَیْشِ بَعْدَ الْمَوْتِ وَلَذَّةَ النَّظَرِ اِلٰی وَجْهِکَ الْکَرِیْمِ وَالشَّوْقَ اِلٰی لِقَائِکَ

"اے خدا! میں تجھ سے اپنے فیصلے پر اطمینان مانگتا ہوں [جو کچھ تو میرے راستے میں بھیجتا ہے، چاہے وہ آسانی ہو یا مصیبت]، موت کے بعد [تیری محبت بھری آغوش میں] سکون کی زندگی، تیرے بابرکت چہرے کو دیکھنے کی خوشی، اور تجھ سے ملنے کی تڑپ۔

ابو دردہ رضی اللہ عنہ نے کعب احبار رضی اللہ عنہ سے کہا کہ وہ دونوں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب تھے اور کعب احبر تورات کے ایک یہودی عالم اور صحابی ہونے سے پہلے ربی تھے) تورات کی ایک آیت بیان کریں۔ انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ پرہیزگاروں کو مجھ سے ملاقات کی بہت خواہش ہوتی ہے اور میں ان سے ملنے کی بہت خواہش رکھتا ہوں۔ کعب احبار رضی اللہ عنہ نے اسی موضوع پر تورات کی ایک اور آیت منقول کی ہے کہ "جو مجھ سے طالب ہے وہ مجھے پائے گا اور جو میرے سوا کسی اور کا طالب کرے گا وہ میرے سوا کوئی اور پائے گا۔ حضرت ابودردہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے یہی باتیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے سنی ہیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی روایات میں منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا: اے داؤد! میرا پیغام زمین کے لوگوں تک پہنچانا کہ میں اس شخص کا محبوب ہوں جو مجھ سے محبت کرتا ہے، میں اس شخص کا ساتھی ہوں جو میرا ساتھی ہے، میں اس شخص کا مباشرت ہوں جو میری یاد سے واقف ہے، میں اس شخص کا دوست ہوں جو میرا دوست بنتا ہے، مجھے وہ شخص پسند ہے جو مجھے پسند کرتا ہے، اور میں اس کا فرمانبردار ہوں جو میرا حکم مانتا ہے میں اس شخص کے دل کی کیفیت کو اچھی طرح جانتا ہوں جو مجھ سے محبت کرتا ہے اور میں اپنے لیے ایسے شخص کو قبول کرتا ہوں اور میں ایسے شخص سے اس قدر محبت کرتا ہوں کہ میری مخلوقات میں سے کسی کو بھی ایسے پر ترجیح نہیں دی جاتی۔ اے زمین کے لوگو! دنیاوی تکبر کا پردہ پھاڑ دو اور میرے عجائبات کی طرف قدم بڑھاؤ، رفاقت، میرے ساتھ رہنا اور مجھ سے قربت رکھو، میں تم سے قربت رکھوں گا اور تم سے محبت کرنے میں سب سے آگے رہوں گا۔ میں نے اپنے دوستوں کا باطنی مزاج اور مزاج

اپنے دوست ابراہیم کے مزاج اور مزاج سے پیدا کیا ہے، موسیٰ کے جس سے میں نے بات کی تھی، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج اور مزاج کو جس سے میں نے پاک کیا تھا۔ میں نے ان لوگوں کے دلوں کو پیدا کیا ہے جو میرے لیے آرزو کرتے ہیں اور میں نے انہیں اپنی شان سے بلند کیا ہے۔

ایک گنوسٹک نے کہا کہ خدا نے اپنے ایک دوست پر وحی کی، "میرے کچھ بندے ایسے ہیں کہ وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں اور میں ان سے محبت کرتا ہوں، وہ مجھ سے تڑپتے ہیں اور میں ان کی تڑپ رکھتا ہوں، وہ مجھے یاد کرتے ہیں اور میں انہیں یاد کرتا ہوں، اور وہ مجھے دیکھتے ہیں اور میں ان کی طرف دیکھتا ہوں۔ اگر تم ان کے راستے پر چلے تو میں تم سے محبت کروں گا اور اگر تم ان کے راستے سے ہٹ جاؤ گے تو میں تم سے ناراض ہو جاؤں گا۔ آپ نے عرض کیا: اے اللہ! ان کی نشانیاں کیا ہیں؟" اللہ تعالیٰ نے فرمایا، "وہ دن کے سایہ کو اس طرح دیکھتے ہیں جیسے ایک مہربان چرواہا اپنی بکریوں پر نظر رکھتا ہے (وہ دن کے تمام لمحات کو خدا کے قریب آنے کے لیے محفوظ رکھتے ہیں اور انہیں فضول بکواس یا فضول کوششوں میں ضائع نہیں ہونے دیتے ہیں)۔ وہ غروب آفتاب کی خواہش کرتے ہیں جیسے پرندے شام کو اپنے گھونسلے کے لیے ترستا ہے [تاکہ وہ اپنی راتیں خدا کے لیے وقف کر دیں]۔ جب رات اپنے بازوؤں کو پھیلاتی ہے اور اندھیرا نازل ہوتا ہے، بستر کھول دیے جاتے ہیں، راز ظاہر ہوتے ہیں، اور عاشق محبوب کے بازوؤں میں پہنچ جاتا ہے، پھر وہ میری طرف قدم بڑھاتے ہیں، میرے سامنے سجدہ کرتے ہیں، میری گفتگو کے ساتھ مجھ سے سرگوشی *کرتے ہیں (کلام* یا کتاب الہامی وحی ہے)، اور ان کے لیے میرے اجر (مادی اور غیر مادی) کے ذریعے مجھ سے التجا کرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ چیخ چیخ کر روتے ہیں، کچھ خاموشی سے روتے ہیں، کچھ [مجھ سے جدائی کے غم میں] زور دار شور مچا دیتے ہیں، کچھ میرے سامنے شکایت کرتے ہیں، کچھ بیٹھے ہیں، کچھ کھڑے ہیں، کچھ رکوع کرتے ہیں، اور کچھ سجدہ کرتے ہیں۔ ان کی تمام شکایات، التجا اور کوششیں میری نظر میں بے پناہ عزت ہیں۔ سب سے پہلے، میں انہیں تین باتیں دوں گا: اول، میں ان کے دلوں میں اپنی روشنی ڈالوں گا تاکہ وہ [دوسروں کو] میری خبریں دیں جس طرح میں [آسمانی مخلوقات کو] ان کی خبریں دیتا ہوں۔ دوسری بات یہ کہ اگر ان کے اور آسمانوں اور زمین کے درمیان کوئی چیز ان کے خلاف آجائے تو میں اسے ان کی خاطر حقیر سمجھوں گا [اور کسی بھی چیز کو ان کو کسی بھی صورت اور شکل اور شکل میں نقصان پہنچانے کی اجازت نہیں دوں گا]۔ تیسری بات یہ کہ میں اپنا مقدس چہرہ ان کی طرف موڑ دوں گا اور تم جانتے ہو کہ میں ان کو کیا دینا چاہتا ہوں جن کی طرف میں اپنا چہرہ موڑتا ہوں۔"

اللہ تعالیٰ کی اپنے بندے سے محبت: خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اپنے بندے (یعنی انسان) سے محبت یہ ہے کہ وہ انسان کو دنیاوی جالوں اور گناہوں سے دور رکھتا ہے، اپنے باطن کو دنیاوی نجاستوں (برائیوں ، غلطیوں اور خامیوں اور عیبوں) سے پاک کرتا ہے اور اپنے دل سے پردہ اٹھا کر اس کے قریب آتا ہے یہاں تک کہ بندہ کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ دل سے خدا کی گواہی دے رہا ہے۔ اور بندے کی خدا سے محبت یہ ہے کہ انسان اس (باطنی) کمال کو حاصل کرنے کی طرف مائل ہو جس سے وہ محروم ہے۔ ظاہر ہے کہ جس چیز سے انسان محروم ہے، اس کے حصول کی تڑپ ہوتی ہے اور اسے حاصل کرنے کے بعد اس سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ اب اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ خدا کی بندے سے محبت مشکوک ہے اور بندے کو کیسے پتہ چلے گا کہ وہ خدا کا محبوب ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ محبت کی کچھ نشانیاں ہیں جو اس کے حق میں بحث کرتی ہیں۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إِذَا أَحَبَّ اللّٰهُ عَبْدًا ابْتَلَاهُ فَإِذَا أَحَبَّهُ الْحُبَّ الْبَالِغَ اقْتَنَاهُ

"جب اللہ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اس کو تکلیف دیتا ہے اور جب وہ کسی سے بہت محبت کرتا ہے تو اس کو اپنے لیے خاص بناتا ہے۔"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إِذَا أَحَبَّ اللّٰهُ عَبْدًا جَعَلَ لَهُ وَاعِظًا مِنْ نَفْسِهِ وَزَاجِرًا مِنْ قَلْبِهِ يَأْمُرُهُ وَيَنْهَاهُ

"جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو وہ اپنے نفس میں ایک نصیحت کرنے والا مقرر کرتا ہے اور اس کے دل میں ایک ایسا راستہ پیدا کرتا ہے جو برے کاموں سے روکتا ہے"۔ وہ ایک کو حکم دیتے ہیں اور ایک کو روکتے ہیں۔ (بیان کردہحدیث کا مجموعہ *مسند الفردوس* عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ

إِذَا أَرَادَ اللّٰهُ بِعَبْدٍ خَيْرًا بَصَّرَهُ بِعُيُوبِ نَفْسِهِ

"جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے لیے بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اپنے نچلے نفس کی خامیوں میں سے کسی کو بتا دیتا ہے تاکہ وہ روح کی تطہیر اور تزکیہ کے ساتھ روحانیت کی اعلیٰ درجوں پر چڑھ سکے]۔ (بیان کردہحدیث کا مجموعہ *مسند الفردوس* عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ

تمام نشانیوں میں سے سب سے اہم اور خاص نشانی یہ ہے کہ بندہ خدا سے محبت کرتا ہے اور اسی نشانی سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ خدا اپنے بندے سے کس حد تک محبت رکھتا ہے۔ اور جو عمل یہ ثابت کرتا ہے کہ بندے کا محبوب خدا ہے وہ یہ ہے کہ بندے کے تمام ظاہری و باطنی، پوشیدہ اور کھلی باتوں کا نگہبان صرف خدا ہی ہے، وہی ہے جو نصیحت کرتا ہے، وہی ہے جو بندے کے ذہن میں [اپنی زندگی کو بہترین طریقے سے چلانے کا] راہ ہموار کرتا ہے۔ وہی ہے جو اپنے اعضاء کو نیک کاموں میں مصروف کرتا ہے، وہی ہے جو اپنے باطنی اور خارجی وجود کو سیدھی راہ پر گامزن رکھتا ہے، وہی ہے جو اپنے تمام خیالات کو ایک مرکزی نکتے پر مرکوز کرتا ہے۔ وہی ہے جو دنیا پرستی سے باز آتا ہے، وہی ہے جو اپنے سوا کسی اور سے انکار کرتا ہے، وہی ہے جو تنہائی میں اس سے التجا کرنے کی لذت بخشتا ہے تاکہ وہ اس کا عادی ہو جائے، اور وہی ہے جو اس کے اور اس کی معرفت کے درمیان پردہ اٹھا دیتا ہے۔ یہ اور اس طرح کی دیگر نشانیاں ، بندے کی خدا سے محبت کی دلیل دیتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے فیصلوں سے اتفاق کرنا، اس کی حقیقت اور فضیلت : خدا کے فیصلوں سے اتفاق کرنا (*رضا*) محبت کے ثمرات کا پھل ہے لیکن لوگوں کی اکثریت ان پر اس کی حقیقت ظاہر نہیں کرتی۔ اس کے مفہوم میں جو شک اور ابہام موجود ہے، اس سے صرف وہی لوگ واقف ہیں جنہیں الٰہی کی طرف تعبیر کا علم اور خدا کی راہ کی تفہیم *سے نوازا گیا ہے*۔ بعض لوگ خدا سے اتفاق کرنے سے انکار کرتے ہیں کیونکہ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ کسی ایسے معاملے پر کیسے اتفاق ہو سکتا ہے جو کسی کی مرضی کے خلاف ہو۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر ہر حکم، ہر فیصلے اور ہر چیز سے اتفاق کرنا ضروری ہے کیونکہ یہ خدا کا عمل ہے تو بندے کے لیے گناہوں اور کفر سے متفق ہونا بھی ضروری ہے۔ بعض سادہ لوح لوگ خدا کے فیصلوں سے متفق ہونے کے انکار کرنے والوں کے اس قول سے دھوکہ کھا گئے اور یہ سوچنے لگے کہ گناہوں اور برائیوں سے متفق ہونا، اور کفر اور گناہ کو رد کرنا اور اعتراض نہ کرنا، حکم الٰہی کو قبول کرنے اور خدا کے فیصلوں سے متفق ہونے کا مقام ہے۔ یہ الٰہی راز ہیں۔ اگر خدا کی راہ کے اسرار محض ظاہری انسانی اعمال کے مطالعے سے ظاہر ہو جاتے ہیں یا قرآن کی تلاوت سے واضح ہو جاتے ہیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مندرجہ ذیل دعا نہ پڑھی ہوتی:

اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ وَعَلِّمْهُ التَّأْوِيْلَ

"اے خدا! اسے اپنی راہ کی سمجھ اور تفسیر کا علم عطا فرما۔ (بیان کردہ *احادیث* کے مجموعے *صحیح بخاری*، *صحیح مسلم* اور *مسند احمد*)

جو لوگ کہتے ہیں کہ صرف ان باتوں پر صبر ممکن ہے جو خواہشات کے خلاف ہوں یا مشکلات ہیں، اور اللہ کے فیصلے سے متفق ہونا ممکن نہیں ہے، وہ درحقیقت محبت کا انکار کر رہے ہیں۔ جب خدا کی محبت ثابت ہو جائے اور یہ بھی واضح ہو جائے کہ انسان اپنی پوری ہمت کے ساتھ خدا کی محبت میں غرق ہو سکتا ہے تو یہ بھی پوشیدہ نہیں رہتا کہ عاشق (اندرونی مجبوری یا محرک قوت سے) محبوب کے ہر عمل اور قول سے متفق ہونے پر مجبور ہے۔ یہ اتفاق دو طریقوں سے ہوتا ہے: پہلا یہ کہ انسان کو کوئی غم یا تکلیف اس حد تک محسوس نہیں ہوتی کہ اگر کسی کو کوئی چوٹ یا تکلیف بھی پہنچتی ہے تو اسے ذرا سا بھی درد محسوس نہیں ہوتا ہے۔ اس کی مثال اس شخص کی ہے جس کا دل کسی بات میں مگن ہو اور اس کے نتیجے میں وہ کسی اور چیز کو نہیں سمجھتا۔ یہی حال ایک عاشق کی ہے جو مکمل طور پر محبوب کی محبت یا وژن میں ڈوبا ہوا ہے، جو اس محبت میں ڈوبنے کی وجہ سے اذیت ناک واقعات کو برداشت کرتا ہے۔ پھر عاشق کو کسی تکلیف کا احساس نہیں ہوتا جب اس کا کرنے والا محبوب کے علاوہ کوئی یا کچھ اور ہو۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اگر محبوب عاشق کے وجود کو کوئی تکلیف پہنچاتا ہے تو اس کا ادراک کیسے ہو سکتا ہے؟ دل کی محبت میں مشغول ہونا ایک اہم لذت ہے۔ جب عام محبت میں ، کسی کو معمولی درد محسوس نہیں ہوتا ہے تو ، محبت کی بڑی مقدار میں بڑا درد کیسے محسوس کرسکتا ہے؟ جس طرح درد کی شدت ممکن ہے اسی طرح محبت کی شدت بھی ممکن ہے اور جس طرح پانچ حواس سے محسوس کی جانے والی خوبصورتی مضبوط ہوتی ہے اسی طرح محبت بھی مضبوط ہوتی ہے جو باطنی بصیرت کے ذریعے باطنی خوبصورتی کو دیکھنے سے ہوتی ہے۔ الٰہی حسن و جلال کا کسی اور خوبصورتی اور جلال سے کوئی موازنہ نہیں ہے۔ جس شخص پر الٰہی حسن و جلال کا تھوڑا سا حصہ نازل ہوتا ہے، ہوش و حواس کھو دیتا ہے اور اس سے اس قدر مست ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے تمام حالات سے غافل ہو جاتا ہے۔

محبوب کے اعمال سے متفق ہونے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ انسان درد اور تکلیفوں کو محسوس کرے، لیکن وہ ان سے متفق ہو جائے (ان سے شکایت نہ کرنے کی وجہ سے) بلکہ اس کی خواہش اور نیت ہو۔ یہ اس شخص کی حالت کی طرح ہے جو (کاروباری) منافع کے حصول کی خاطر سفر کی سختیاں برداشت کرتا ہے اور مشکلات کی پرواہ نہیں کرتا، کیونکہ متوقع منافع بہت پیارا ہوتا ہے۔ اللہ کے بندوں کا حال یہ ہے کہ جب انہیں اللہ کی طرف سے کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو انہیں یقین ہوتا ہے کہ جو ثواب انہیں ملے گا وہ ان کے لیے جمع کر دیا گیا ہے پس وہ اس یقین کی وجہ سے اس مصیبت سے متفق ہو جاتے ہیں اور اس کی طرف مائل ہو جاتے ہیں بلکہ وہ اس سے محبت کرتے ہیں اور اس کے لئے خدا کا شکر ادا کرتے ہیں۔ یہ اس صورت میں ہوتا ہے جب کوئی مصیبت کے بدلے میں خدا کا بدلہ ذہن میں رکھتا ہے۔ اگر کوئی شخص ثواب الٰہی کو مدنظر نہ رکھتا بلکہ محبت اس حد تک غالب ہو جاتی ہے کہ محبوب کی رضامندی حاصل کرنا ہی اس کا واحد مقصد ہے، صرف وہی ہے جو مطلوب اور محبوب ہے، اور اس میں جزا کی کوئی خواہش نہیں ہوتی، بلکہ اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں لیتا، تو محبوب کی قبولیت حاصل کرنا اس کا واحد مقصد اور مقصد بن جاتا ہے۔

حرم بن حبان رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب مومن اپنے رب کو پہچانتا ہے تو اس سے محبت کرتا ہے اور جب اس سے محبت کرتا ہے تو اس کی طرف توجہ مرکوز کرتا ہے اور جب اس کی طرف توجہ مرکوز کرنے میں خوشی محسوس

ہوتی ہے تو نہ دنیا کو شہوت کی نگاہوں سے دیکھتا ہے اور نہ آخرت کی طرف سستی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ایسا شخص دنیا میں اپنے جسم کے ساتھ رہتا ہے اور اس کی روح آخرت میں ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے طریقے کے بارے میں پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلْمَعْرِفَةُ رَاسُ مَالِيْ وَالْعَقْلُ اَصْلُ دِيْنِيْ وَالْحُبُّ اَسَاسِيْ وَالشَّوْقُ مَرْكَبِيْ وَذِكْرُ اللّٰهِ اَنِيْسِيْ وَالثِّقَةُ كَنْزِيْ وَالْحُزْنُ رَفِيْقِيْ وَالْعِلْمُ سَلَاحِيْ وَالصَّبْرُ رِدَائِيْ وَالرِّضَا غَنِيْمَتِيْ وَالْعِجْزُ فَخْرِيْ وَالزُّهْدُ حِرْفَتِيْ وَالْيَقِيْنُ قُوَّتِيْ وَالصِّدْقُ شَفِيْعِيْ وَالطَّاعَةُ حُبِّيْ وَالْجِهَادُ خُلُقِيْ وَقُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلَاةِ

"[الہامی] غنوسی میرا سرمایہ (اثاثہ) ہے، عقل میرے ایمان کی بنیاد ہے، [الہامی] محبت میری بنیاد ہے، [خدا کے لیے] تڑپ میرا سوار پہاڑ ہے (وہ سفر جو مجھے میری روحانی جستجو میں لے جاتی ہے)، خدا کی یاد میرا قریبی دوست ہے، [راہ الٰہی میں] پختہ قدم میرا خزانہ ہے، غم میرا ساتھی ہے، علم میرا ہتھیار ہے [جہالت اور برائی کے اندھیرے کے خلاف]۔ صبر میری شال ہے، عاجزی میرا غرور ہے، پرہیز میرا پیشہ ہے، یقین میری قدرت ہے، سچائی میری شفاعت ہے، اطاعت میری محبت ہے، راہ الٰہی میں جہاد کرنا میرا باطنی کردار اور مزاج ہے اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک دعا میں ہے۔

ذذون نون مصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس ہستی نے روحوں کے لشکروں کو پیدا کیا، اس نے گنوسٹک کی روحوں کو شاندار اور آسمانی بنایا، اس لیے انہوں نے خدا کی تڑپ رکھی، مومنوں کی روحوں کو روحانی بنایا، اس لیے وہ جنت کی طرف مائل ہوئے اور غافل لوگوں کی روحوں کو جسمانی بنا دیا۔ چنانچہ وہ دنیا کی طرف مائل ہوتے ہیں (جو انہیں اس میں غرق کر کے ڈبو دیتی ہے جو انہیں مکمل طور پر کھا جاتی ہے)۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ الٰہی کی تڑپ خدا کی ایک [مقدس] آگ ہے جو وہ اپنے قریبی دوستوں کے دلوں میں اترتی ہے جو دلوں میں موجود ارادوں، خیالات، جالوں اور حاجتوں کو جلا دیتی ہے، اور ان کے دلوں میں ان کا کوئی وجود باقی نہیں رہتا۔ یہ محبت، لگاؤ، حسرت اور الٰہی کی قبولیت کے بارے میں کافی تفصیل ہے اور ہم اس پر متفق ہوں گے۔ اور صرف خدا ہی ہر طرح کی نیکی اور راستبازی کا باعث ہے۔

باب 17 - کسی بھی خود غرضی سے پاک نیت پیدا کرنا، تمام معاملات میں اخلاص اور سچائی کے لیے لگن

خالص نیت جو محض خدا کی رضا کے لیے خدا کی قبولیت اور مدد کو یقینی بنانے میں ایک طاقتور عنصر ہے اور سب کے لیے بے پناہ فوائد اور نعمتوں کا ذریعہ ہے۔ دنیاوی مفادات کے خفیہ مفاد سے کی جانے والی چیزیں شاذ و نادر ہی پھل دیتی ہیں اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ ایک الہی راز ہے جس کی وضاحت غزالی کے بعد کی وضاحت میں کی جائے گی۔ اسی طرح اخلاص یا صرف خدا کی رضا کے لیے کام کرنا جس کا مقصد کسی بھی دنیاوی فائدے کا کوئی پوشیدہ مقصد نہ

ہو، چاہے وہ مادی ہو یا غیر مادی - انسان کو روحانی راہ پر چڑھنے کی طرف راغب کرتا ہے۔ خالص نیت اور خلوص سے اعمال کی قبولیت، برکتیں اور نتائج میں بے پناہ اضافہ ہوتا ہے، تاکہ چھوٹی چھوٹی کامیابیاں بھی طویل مدتی بنیادوں پر بے پناہ فائدے اور اچھائی کا ذریعہ بن سکیں۔ دونوں ہی (خالص ارادے اور خلوص) عظیم روحانی صفات ہیں جو روحانی راستے کے مقام ہیں جو الٰہی معرفت (معارفہ) اور اس کے نتیجے میں ابدی خوشی اور لامتناہی کامیابی کی طرف لے جاتی ہیں۔ روحانی راستے پر ان کے گہرے اثرات کے علاوہ، وہ خصوصیات کسی کی زندگی میں زبردست مثبت توانائیاں پیدا کرتی ہیں اور ان کو آزاد کرتی ہیں۔

حق سے عقیدت (*صدق*) تمام معاملات میں، چاہے وہ دنیاوی ہو یا ابدی، اس کی تلاش اور اس کے مطابق زندگی گزارنا، روحانی مسافروں کی ایک لازمی خوبی ہے، جس کے دنیوی وجود اور ساتھی انسانوں کے ساتھ معاملات پر بہت زیادہ اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ غزالی کی ان اعلیٰ باطنی خصوصیات کا گہرائی سے تجزیہ اس طرح بیان کیا گیا ہے جو ان کی *عظیم تصنیف* "*احیئ العلوم الدین*" یا "خدا کی راہ کی احیاء" کی چوتھی جلد کے ساتویں باب یا کتاب سے مندرجہ ذیل ہے:

واضح رہے کہ ایمان کی باطنی بصیرت اور قرآن کی روشنی کے ذریعے اہل دل پر یہ وحی نازل ہوئی ہے کہ علم اور عمل کے بغیر ابدی خوشی اور دائمی کامیابی کا حصول ناممکن ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام لوگ ناقابل تلافی نقصان کے دہانے پر ہیں سوائے اہل علم کے اور اہل علم سوائے اہل عمل کے ناقابل تلافی نقصان کے دہانے پر ہیں اور تمام اہل عمل ناقابل تلافی نقصان کے دہانے پر ہیں سوائے اہل مخلص کے جو بے نیاز کام کرتے ہیں۔ خود غرضی اور مذموم خفیہ مقاصد ، خالص الٰہی کے چہرے کی تلاش میں]، اور تمام مخلص لوگ بڑے خطرے میں ہیں [نچلے نفس اور شیطان کے اعلیٰ روحانی راستے میں پھنسنے کی وجہ سے]۔ نیت کے بغیر عمل مشکل ہے اور اخلاص کے بغیر نیت دکھاو، منافقت اور گناہ ہے، اور اخلاص کی تصدیق اور تحقیق کے بغیر اخلاص بصیرت کا فریب ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اللہ کے سوا کسی اور کی نیت کے ساتھ مل کر کام کرنے کے لیے یہ فرمایا ہے:

وَقَدِمْنَآ إِلَىٰ مَا عَمِلُوا۟ مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنَٰهُ هَبَآءً مَّنثُورًا

"ہم ان کے اعمال کی طرف رجوع کریں گے (دنیا میں) پھر انہیں اس طرح بے کار کر دیں گے گویا وہ بکھری ہوئی خاک ہو چکے ہیں۔" (سورۃ البقرۃ باب 25، آیت 23)

ہم نہیں جانتے کہ جو شخص نیت کی حقیقت سے واقف نہ ہو اس نیت کو کیسے درست کر سکتا ہے، اور کس طرح مخلص ہو سکتا ہے جس نے نیت کی اصلاح کی ہو لیکن اسے اخلاص کی کوئی سمجھ نہ ہو، اور وہ اپنے نچلے نفس سے سچائی کا مطالبہ کیسے کر سکتا ہے جو سچائی کا مطلب نہیں جانتا۔ ہر بندہ جو خدا کی اطاعت اور عبادت کرنا چاہتا ہے اس کی پہلی ذمہ داری ہے کہ وہ صحیح نیت کا علم حاصل کرے، پھر سچائی اور اخلاص کی گہری سمجھ حاصل کرے جو نجات اور سلامتی کا سبب ہے، اور اس کے بعد [مخلص] عمل کے ذریعے نیت کی اصلاح کرے۔ ہم ان تینوں معاملات پر تین الگ الگ حصوں میں بحث کریں گے۔

عمدگی اور ارادے کی حقیقت

نیت کی فضیلت: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَا تَطْرُدِ ٱلَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِٱلْغَدَوٰةِ وَٱلْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُۥ

"ان لوگوں کو جو اپنے رب کو صبح و شام اس کی رضا کی تلاش اور رضامندی کے لیے پکارتے ہیں ان کو نہ ہٹا۔ (سورۃ البقرۃ باب 6، آیت 52)

اس آیت میں تلاش اور خواہش سے مراد ان کی نیت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَلِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوَى فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ
فَهِجْرَتُهُ إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى دُنْيَا يُصِيبُهَا أَوِ امْرَأَةٍ يَتَزَوَّجُهَا
فَهِجْرَتُهُ إِلَى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ

"اعمال ارادوں پر منحصر ہوتے ہیں۔ ہر فرد کو اس کی (حقیقی باطنی) نیت کے مطابق اجر ملے گا [اس عمل کی ظاہری شکل اور اس کی سمجھی جانے والی نیکی اور شرافت سے قطع نظر]۔ جو شخص اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ میں ہجرت کرے تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کرے اور جو دنیا کی خاطر ہجرت کرے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لیے ہجرت کرے تو اس کی ہجرت اس چیز کے لیے ہے جس کی طرف ہجرت کی گئی ہے۔ (بیان کردہ*حضرت* عمر رضی اللہ عنہ سے صحیح بخاری *اور* صحیح مسلم کے مجموعے میں حدیث جمع کی گئی ہے

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا:

إِن يُرِيدَآ إِصْلَٰحًا يُوَفِّقِ ٱللَّهُ بَيْنَهُمَآ

"اگر دونوں افراد (ایک شوہر کی طرف سے اور ایک بیوی کی طرف سے، جو اپنے جھگڑوں اور اختلافات کے بعد ایک شوہر اور بیوی کو صلح کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، جس کی وجہ سے ان کی شادی ٹوٹ سکتی ہے) اصلاح چاہتے ہیں [شادی شدہ جوڑے کی حالت اور ان کے درمیان انتہائی خلوص کے ساتھ پرامن اور دوستانہ مصالحت]، پھر اللہ تعالیٰ (صلح کی کوشش کرنے والے دونوں لوگوں کے نیک اور نیک ارادوں کی برکت سے) ان (شوہر اور بیوی) کو صلح کرے گا [ان کی شادی کو بچا کر اور انہیں امن، ہم آہنگی، باہمی محبت اور احترام کے ساتھ دوبارہ اکٹھا کرکے]۔ (سورۃ البقرۃ سورۃ البقرۃ آیت ۳۵)

اس آیت میں نیت کی پاکیزگی اور شرافت کو کامیابی کا سبب قرار دیا گیا ہے۔ ایک روایت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى صُوَرِكُمْ وَأَمْوَالِكُمْ وَإِنَّمَا يَنْظُرُ إِلَى قُلُوبِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ

"اللہ تمہارے چہروں اور مال کو نہیں دیکھتا، بلکہ تمہارے دلوں اور اعمال کو دیکھتا ہے۔" (بیان کردہحدیث کا مجموعہ *صحیح مسلم* ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے

خدا دل کو دیکھتا ہے کیونکہ یہ ارادے کی نشست ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت میں کہا ہے کہ جس کی نیت صرف دنیا کی تلاش ہے اللہ تعالیٰ غربت کو دونوں آنکھوں کے درمیان ڈال دیتا ہے اور وہ دنیا کی طرف مائل ہونے کے بعد دنیا سے الگ ہو جاتا ہے۔ جس کی نیت آخرت ہے، اللہ تعالیٰ اس کے دل میں غنائت پیدا کرتا ہے اور اس کے لیے اپنا مال جمع کرتا ہے اور ایسا شخص دنیا کو پرہیز کر چھوڑ دیتا ہے۔ (بیان کردہ *زید بن اسلم* رضی اللہ عنہ سے حدیث *کا* مجموعہ ابن ماجہ

نیت کی حقیقت: یہ معلوم ہونا چاہیے کہ نیت دل کی ایک ایسی کیفیت ہے جس کے ارد گرد دو معاملات ہیں علم اور عمل۔ علم سب سے پہلے اس لیے آتا ہے کہ یہ اس کیفیت کی بنیاد ہے اور عمل اس کے بعد آتا ہے کیونکہ یہ علم کا ثمر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر عمل یعنی رضاکارانہ حرکت یا خاموشی، تین معاملات سے تکمیل تک پہنچتا ہے: علم، نیت اور قابلیت۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان نہ تو کسی ایسی چیز کا ارادہ کر سکتا ہے جس کے بارے میں وہ جانتا بھی نہ ہو، اور نہ ہی کوئی ایسا کام کر سکتا ہے جس کا کوئی ارادہ نہ ہو۔ چنانچہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نیت ضروری ہے۔ نیت سے مراد کسی ایسے معاملے کے لیے دل میں حرکت کرنا ہے جو کسی کی حالت یا مادی ملکیت کے لیے موزوں ہو۔ انسان کو اس طرح پیدا کیا گیا ہے کہ بعض معاملات موزوں ہیں اور کچھ غیر موزوں ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ان معاملات کے حصول کی طرف مائل ہو جو موزوں ہیں اور ان معاملات سے چھٹکارا حاصل کرنا ضروری ہے جو انسانی فلاح و بہبود کے خلاف ہیں یا نامناسب ہیں۔ مناسب اور غیر موزوں کے درمیان فرق کرنے کے لئے ، چیزوں [اور معاملات] کی تفہیم کی ضرورت ہے۔ لہٰذا کوئی ایسا کھانا نہیں کھا سکتا جو اسے نظر نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے حصول کے لیے عقل و فہم اور رہنمائی پیدا کی ہے جنہیں ظاہری اور باطنی حواس کہا جاتا ہے۔

اگرچہ یہ کافی نہیں ہے کہ انسان صرف کھانے کے بارے میں جانتا ہو اور اس کی موزونیت سے واقف ہو یا اسے آنکھوں سے دیکھے، بلکہ کھانے کی طرف خواہش کا ہونا بھی ضروری ہے، نیچی ذات کا میلان اور اس کی ہوس بھی ہونی چاہیے۔ چنانچہ بیمار شخص کھانے کو دیکھتا ہے اور جانتا ہے کہ وہ کسی کے لیے موزوں ہے لیکن اس کے باوجود اسے نہیں کھاتا کیونکہ اندر سے محرک قوت کی طاقت نہیں ہے اور دل میں بیماری کی وجہ سے خواہش نہیں ہے۔ پھر یہ خواہش اور محرک قوت [یا ہوس] بھی کافی نہیں ہوتی، بلکہ بعض اوقات انسان کھانا دیکھتا ہے اور اسے کھانا چاہتا ہے لیکن کسی معذوری [یا نااہلی یا نااہلی] کی وجہ سے اس سے قاصر رہتا ہے۔ لہٰذا، خوراک کے استعمال کے عمل کو مکمل کرنے کے لیے صلاحیت اور فعال اعضاء [الہامی طور پر] پیدا کیے گئے ہیں۔ اعضاء قابلیت کی وجہ سے حرکت کرنا شروع کردیتے ہیں ، اور قابلیت اندرونی محرک قوت کا انتظار کرتی ہے جو علم اور تفہیم یا رائے اور عقیدے کے تابع ہے۔ دوسرے لفظوں میں جب یہ معلوم ہو جائے کہ کوئی معاملہ کسی کے لیے موزوں ہے اور اس کے لیے ضروری ہے اور اس کے خلاف کوئی مخالف قوت موجود نہیں ہے تو نیت پیدا ہو جاتی

ہے اور جھکاؤ ظاہر ہوتا ہے۔ جب نیت ہوتی ہے تو قابلیت اعضاء کو اس طرح حرکت دیتی ہے جیسے قابلیت نیت کی خادم ہے اور نیت یقین اور افہام و تفہیم کے حکم کے تابع ہے۔ پھر اس تفصیل سے ثابت ہوتا ہے کہ نیت درمیانی صفت کا نام ہے اور اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ نفس کا ان معاملات کی طرف مائل ہو جو انسان کے مقصد کے مطابق ہوں اور دل میں میلان کی پیدائش کی طرف ہوں، چاہے یہ معاملات حال میں مناسب ہوں یا آخر میں (مستقبل میں یا آخرت میں)۔ یہاں سب سے پہلے محرک وہ مقصد ہے جس کی تلاش کی جا رہی ہے اور یہ وہی ہے جسے "سبب" یا "محرک" کہا جاتا ہے اور یہی مقصد مطلوبہ مقصد ہے اور اٹھنے کے عمل کو "مقصد" اور "ارادہ" کہا جاتا ہے۔ جب صلاحیت اعضاء کو ارادے کی خدمت کے لئے حرکت دیتی ہے تو ، اسے "عمل" کہا جاتا ہے۔ تاہم ، عمل کرنے کی صلاحیت کبھی ایک وجہ یا ڈرائیور سے ، کبھی بیک وقت دو اسباب سے ، کبھی دو اسباب سے متحرک ہوتی ہے لیکن دونوں اسباب میں سے ایک صلاحیت کو متحرک کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے ، کبھی ایک وجہ [صلاحیت کو عمل میں لانے کے لئے] کافی ہوتا ہے لیکن دوسرا سبب اس کا مددگار بن جاتا ہے۔ اس طرح ارادے کی چار قسمیں ہیں جن کو مندرجہ ذیل بیان کیا گیا ہے:

پہلی قسم - خالص ارادہ: پہلی قسم [ارادہ] یہ ہے کہ [اعمال کا صرف ایک ہی سبب یا ڈرائیور] ہے۔ مثال کے طور پر ، ایک جنگلی جانور کسی شخص پر حملہ کرتا ہے۔ لہذا، جب کوئی اسے دیکھتا ہے، تو اچانک اٹھتا ہے۔ یہاں درندے سے بھاگنے کے سوا کوئی محرک نہیں ہے کیونکہ کسی نے درندے کو دیکھا ہے اور اسے اپنے لئے نقصان دہ سمجھا ہے۔ چنانچہ درندے کو دیکھ کر دل میں فرار ہونے کی ترغیب پیدا ہوتی ہے اور خواہش (میلانا) پیدا ہوتی ہے۔ اس کی وجہ سے ڈرائیور اور خواہش نے قابلیت کے مطابق کام کیا ہے۔ اس صورت میں یہ کہا جائے گا کہ اس شخص کی نیت صرف درندے سے بچنا ہے اور اٹھنے کا کوئی دوسرا ارادہ نہیں ہے۔ اس طرح کی نیت کو خالص نیت کہا جاتا ہے اور اس نیت کے مطابق عمل کرنے کو اخلاص کہا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ، یہ ایک ایسا عمل ہے جس میں [ایک ہی ارادے کے علاوہ] کسی اور چیز کی شمولیت ، شرکت اور مجموعہ نہیں ہے۔

دوسری قسم - دو محرک قوتوں یا اسباب کا مجموعہ: دوسری قسم [ارادہ] یہ ہے کہ دو محرک قوتیں یا اسباب ایک دوسرے میں جڑے ہوئے ہیں، اور دونوں اپنے حقوق میں فعال [اسباب] ہیں اور ایک وجہ دوسرے پر منحصر نہیں ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ کسی کا محتاج رشتہ دار کسی سے مدد مانگتا ہے جو اس کی غربت اور قرابت داری کی وجہ سے رشتہ دار کی ضرورت پوری کرتا ہے جبکہ یہ جانتا ہے کہ اگر درخواست گزار فقیر نہ ہوتا تو پھر بھی قرابت داری کی وجہ سے اس کی ضرورت پوری کرتا، یا اگر درخواست گزار قرابت داری کے لحاظ سے نہ ہوتا۔ [درخواست گزار کی غریبی] کی وجہ سے پھر بھی کوئی ضرورت پوری کرتا۔ اس کے ساتھ ہی دل میں یہ یقین بھی ہے کہ اگر کوئی امیر رشتہ دار اس سے پوچھتا تو ضرور مدد کرتا اور اگر کوئی غریب اجنبی مانگتا تو مدد کرنے سے انکار نہ کرتا۔ اس معاملے میں ، دو ڈرائیوروں یا وجوہات کو اتفاق سے جوڑ دیا گیا ہے جس سے ایک کو کارروائی کا اشارہ ملتا ہے۔ یہاں ایک وجہ دوسرے کا مددگار ہے، اس لیے ہم اسے "دو محرک قوتوں کا مجموعہ" کہتے ہیں۔

تیسری قسم - شراکت داری: تیسری قسم [ارادہ] یہ ہے کہ دو وجوہات یا ڈرائیوروں میں سے کوئی بھی اکیلے کسی عمل کو اکسا نہیں سکتا۔ اس کے بجائے ، دونوں کا امتزاج ، صلاحیت کو متحرک کرتا ہے۔ مرئی دائرے میں اس کی مثال یہ ہے کہ دو کمزور افراد ایک دوسرے کو بھاری چیز اٹھانے میں مدد کرتے ہیں جسے وہ انفرادی طور پر پوری کوشش سے نہیں اٹھا سکتے تھے۔ ایک اور مثال یہ ہے کہ کسی کا امیر رشتہ دار آتا ہے اور کچھ رقم مانگتا ہے جو دینے سے انکار کرتا ہے۔ پھر ایک غریب اجنبی آتا ہے اور اتنی ہی رقم مانگتا ہے جو ایک بار پھر دینے سے انکار

کرتا ہے۔ اس کے بعد ایک غریب رشتہ دار آتا ہے اور اتنی ہی رقم مانگتا ہے جس سے انکار نہیں کیا جاتا گویا دو اسباب یا محرک قوتوں یعنی رشتہ داری اور غربت کے رشتوں کے امتزاج کے بعد کوئی حرکت میں آ جاتا ہے۔ اس قسم کی نیت کو شراکت داری کہا جاتا ہے [دو یا دو سے زیادہ محرک قوتوں یا کسی کو عمل میں لانے کا سبب]۔

چوتھی قسم - تعاون: چوتھی قسم [ارادہ] یہ ہے کہ اگر دو اسباب یا محرکات میں سے صرف ایک قابل اعتماد ہو تو پھر بھی وہ عمل کا محرک بن جاتا ہے جبکہ دوسرا سبب قابل اعتماد نہیں ہے۔ تاہم ، اگر دوسری وجہ پہلی وجہ کے ساتھ منسلک ہے تو ، یہ یقینی طور پر مدد کرسکتا ہے اور اسے آسان بنانے میں موثر ہے۔ مرئی دائرے میں اس کی مثال یہ ہے کہ ایک کمزور شخص ایک طاقتور شخص کو بھاری وزن اٹھانے میں مدد کرتا ہے۔ اگر طاقتور شخص تنہا ہوتا تو پھر بھی اسے اٹھا سکتا تھا جبکہ کمزور شخص اسے اپنے بل بوتے پر اٹھانے کے قابل نہیں ہوتا حالانکہ ایسا شخص طاقتور شخص کی مدد کرنے کے قابل ہوتا ہے [اسے اٹھانے میں آسان] اس کی ایک اور مثال یہ ہے کہ نمازیں پڑھنے اور صدقہ کرنے کا معمول ہوتا ہے اور اس مخصوص وقت پر کچھ لوگ ملنے آتے ہیں، لیکن وہ معمول کے مطابق عبادات کرتا رہتا ہے۔ اگر زائرین نہ آتے تو بھی مزاج پر کچھ بھاری ہونے کے باوجود اپنے معمولات کو پورا کیا جاتا، لیکن زائرین کی آمد اور ان کی طرف دیکھنے سے کچھ آسانی اور کمی پیدا ہوئی، اس کے نتیجے میں یہ معمول اپنی سختی کے باوجود ہلکا پھلکا ہو گیا۔ اگرچہ یہ یقین ہے کہ اگر مہمان نہ آتے تو پھر بھی وہ اپنے معمولات کو وقت پر پورا کر لیتا، اور اگر کسی کے پاس یہ معمول نہ ہوتا تو وہ شہرت حاصل کرنے کے لیے [مہمانوں کے سامنے] کچھ بھی نہ کرتا۔ ہم اس قسم کے ارادے کو "تعاون" کہہ سکتے ہیں۔ آخری تین اقسام (دوسری سے چوتھی قسم) کی اس تقسیم کا نتیجہ یہ ہے کہ دوسرا ڈرائیور یا وجہ ایک ساتھی یا ساتھی یا مددگار ہوگا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اعمال ارادے کے تابع ہوتے ہیں اور ان سے اپنے احکامات لیتے ہیں جیسا کہ نبوت روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ اعمال ارادے کے تابع ہیں، گویا اعمال ارادے کے تابع ہیں اور تابعدار کی کوئی اہمیت نہیں ہے، کیونکہ حیثیت تمام اعمال کے پیچھے محرک قوت کے طور پر کمانڈر کی ہے۔ اچھا ہو یا برا۔

اطاعت (اللہ تعالی) دلوں کی خوراک اور غذا ہے۔ ان تغذیات کا مقصد دلوں کو شفا دینے کے سوا کچھ نہیں ہے اور یہ کہ وہ آخرت کی رزق اور سلامتی حاصل کریں اور اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی برکتیں اور ابدی خوشی اور لازوال کامیابی حاصل کریں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا اصل مقصد ابدی سعادت اور دائمی کامیابی کی لذت حاصل کرنا ہے۔ صرف وہی شخص جو خدا کی محبت اور گنوسس پر مرتا ہے اسے خدا سے ملنے کا شرف حاصل ہے۔ اور صرف وہی جو غنوسی کا مالک ہے وہ خدا سے محبت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور وہی جو خدا کو کثرت سے یاد کرتا ہے وہ اللہ سے وابستہ ہو سکتا ہے۔ [خدا سے] لگاؤ الٰہی کی یاد کے دائمی کے ذریعے حاصل ہوتا ہے اور گنوسس [خدا] کی محبت کے دائمی کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ دل اس وقت تک یاد الٰہی اور غور و فکر میں مشغول ہونے کے لیے آزاد نہیں ہے جب تک کہ وہ دنیاوی مصروفیات سے آزاد نہ ہو جائے، اور وہ دنیاوی مصروفیات سے اس وقت تک آزاد نہیں ہو سکتا جب تک کہ ادنیٰ کی خواہشات اس سے الگ نہ ہو جائیں، اس حد تک کہ وہ نیکی اور صداقت کی طرف مائل ہو جائے اور اس کی نیت شروع کر دے اور برائی سے نفرت پیدا کر لے۔

تمام نیکیوں اور فرمانبرداریوں سے جس چیز کا مطالبہ کیا جاتا ہے وہ آخرت ہے اور ہر برائیوں سے جس چیز کا مطالبہ کیا جاتا ہے وہ دنیا ہے نہ کہ آخرت ۔ نفس کا تمام نیکیوں کی طرف جھکاؤ اور تمام برائیوں سے دور ہونا، دل کو الٰہی یاد اور غور و فکر کے لیے آزاد کرتا ہے۔ البتہ یہ اس وقت قائم رہتا ہے جب نیک اعمال اور اطاعت کے

اعمال پر استقامت کی جائے اور عضو گناہوں سے پرہیز کرتے ہیں کیونکہ اعضاء اور دل کا رشتہ ہوتا ہے۔ اس رشتے کی وجہ سے ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اعضاء اور دل میں فرق یہ ہے کہ دل حاکم اور سپہ سالار کا کردار ادا کرتا ہے اور اعضاء رعایا یا خادم کی طرح ہوتے ہیں اور ان کی خدمت اور اطاعت سے دل کی صفات مضبوطی سے جڑ جاتی ہیں اور مضبوط ہو جاتی ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ دل مقصد ہے [کیونکہ نیت دل میں پیدا ہوتی ہے جو اصل محرک ہے] اور اعضاء آلات ہیں اور ان کے دونوں ذرائع سے انسان مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔

عمدگی ، حقیقت اور خلوص کی ڈگری

اخلاص کی فضیلت: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَمَآ أُمِرُوٓاْ إِلَّا لِيَعۡبُدُواْ ٱللَّهَ مُخۡلِصِينَ

"انہیں حکم دیا گیا تھا کہ وہ خدا کی عبادت اس طرح کریں کہ وہ خدا کی راہ میں صرف اسی کے لیے اخلاص رکھیں۔" (سورۃ البقرۃ باب ۹۸ آیت ۵)

أَلَا لِلَّهِ ٱلدِّينُ ٱلۡخَالِصُ ۚ

"یاد رکھو، خدا کی طرف عبادت اور راستہ خالص اور سچے خدا کے لیے ہے [اور اس کے علاوہ کچھ نہیں]۔ (سورۃ البقرۃ 39، آیت 3)

فَمَن كَانَ يَرۡجُواْ لِقَآءَ رَبِّهِۦ فَلۡيَعۡمَلۡ عَمَلٗا صَٰلِحٗا وَلَا يُشۡرِكۡ بِعِبَادَةِ رَبِّهِۦٓ أَحَدَۢا

"جو شخص اپنے رب سے ملنے کی امید رکھتا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ نیک عمل کرے اور اپنی عبادت میں اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرے۔" (سورۃ البقرۃ 18، آیت 110)

یہ آیت ان لوگوں کے لیے نازل کی گئی ہے جو اللہ کے لیے نیک اعمال کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ لوگوں سے تعریف و ثناء چاہتے ہیں جو ان کے فائدے کے لیے حکم اللہ تعالیٰ کے خلاف ہے۔ حسن رحمہ اللہ نے اس حدیث *قدسی* (ایک نبوی روایت جو اس کے ماخذ کے لیے اللہ تعالیٰ سے منسوب ہے) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اخلاص (بغیر کسی مادی یا دنیاوی مقاصد کے خالص خدا کی خاطر کچھ کرنا) میرے رازوں میں سے ایک راز ہے۔ میں اسے اپنے بندوں میں سے اس شخص کے دل میں پہنچاتا ہوں جس سے میں محبت کرتا ہوں۔ (امام ابوالقاسم قشیری نے اپنی کتاب میں بھی نقل کیا ہے)*الرسالۃ قصیریہ* رضی اللہ عنہ سے روایت ہے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَامِنْ عَبْدٍ يُخْلِصُ لِلّٰهِ الْعَمَلَ اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا اِلَّا ظَهَرَتْ يَنَابِيْعُ الْحِكْمَةِ مِنْ قَلْبِهٖ عَلٰى لِسَانِهٖ

"وہ بندہ جو چالیس دن تک اللہ کی راہ میں اپنے عمل کو پاک کرتا ہے، اس کے دل سے زبان تک حکمت کے چشمے بہتے ہیں"۔ (بیان کردہابن عدی رضی اللہ عنہ سے حدیث کا مجموعہ ابو موسی رضی اللہ عنہ

بنی اسرائیل کی روایات میں لکھا ہے کہ ایک عبادت گزار ایک طویل عرصے تک خدا کی عبادت میں مصروف رہتا تھا۔ ایک مرتبہ کچھ لوگ ان کے پاس آئے اور کہا کہ یہاں ایک قوم ہے جو خدا کے بجائے درخت کی عبادت کرتی ہے۔ یہ سن کر نمازی غصے میں آ گیا اور کلہاڑی لی اور درخت کی جڑ سے کاٹنے کے لیے درخت کی طرف بڑھنے لگا۔ راستے میں ، اس کی ملاقات ایک بوڑھے شخص سے ہوئی جو دراصل بھیس بدل کر شیطان تھا جس نے اس سے پوچھا ، "تم کہاں جا رہے ہو؟" اس نے کہا، "میں اس درخت کو کاٹنا چاہتا ہوں"۔ شیطان نے جواب دیا: تمہارا اس سے کیا لینا دینا؟ تم نے اپنی عبادت چھوڑ دی اور اپنی [تقوی] منگنی کو بلا وجہ ختم کر دیا۔ نمازی نے کہا کہ یہ بھی عبادت ہے۔ شیطان نے کہا، "میں تمہیں کسی بھی حالت میں اس درخت کو کاٹنے کی اجازت نہیں دے سکتا"۔ یہ کہہ کر وہ نمازی سے کشتی کرنے لگا جس نے اسے زمین پر پھینک دیا اور اس کے سینے پر بیٹھ گیا۔ شیطان نے کہا، "مجھے چھوڑ دو، میں تمہیں ایک بات بتانا چاہتا ہوں [اگر تم مجھے چھوڑ دو گے تو تمہارا فائدہ ہو گا]۔ نمازی کھڑا ہوا۔ شیطان نے اس سے کہا، "خدا نے نہ تو تم پر اس درخت کو کاٹنا فرض کیا ہے اور نہ ہی اس قوم کی ذمہ داری ہے جو اس درخت کی عبادت کرتی ہے! دنیا میں خدا کے بہت سے نبی ہیں، اگر وہ چاہے تو اپنے کسی بھی نبی کو اس درخت کو کاٹنے کے لیے بھیج سکتا ہے۔ نمازی نے کہا کہ میں اس درخت کو ضرور کاٹ دوں گا۔ جب شیطان نے دیکھا کہ مذاکرات مددگار نہیں ہیں تو اس نے جنگ (لڑائی) کا اعلان کیا۔ چنانچہ ان دونوں کے درمیان ایک بار پھر لڑائی شروع ہوئی اور عبادت گزار نے اسے دوبارہ شکست دے کر زمین پر چپٹا کر اس کے سینے پر بیٹھ گیا۔ جب شیطان نے دیکھا کہ باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے تو اس نے کہا، "میں تمہیں ایک ایسی بات بتانا چاہتا ہوں جو تمہارے لیے بہت بہتر ہے۔" عبادت گزار نے اس سے کہا کہ وہ اسے بتائے کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ شیطان نے نمازی سے کہا کہ وہ پہلے اپنے سینے سے اتریں اور اس نے اس کی تعمیل کی۔ شیطان نے کہا: "تو محتاج اور مسکین آدمی ہے۔ آپ کے پاس کچھ بھی نہیں ہے! آپ ان لوگوں پر بوجھ ہیں جو آپ کی ضروریات کو پورا کرتے ہیں۔ آپ کا دل چاہتا ہے کہ آپ کے بھائیوں کی مدد کرنے کے لئے کافی اثاثے ہوں ، اپنے پڑوسیوں کے ساتھ اچھا سلوک کریں ، اور آپ کو پیٹ بھر کر کھانا کھائیں تاکہ آپ کو لوگوں کی ضرورت نہ رہے اور ان کی مدد کے لئے خود کفیل ہوجائیں۔ عبادت گزار نے کہا، "یقینا یہ میرے دل کی خواہش ہے!" شیطان نے کہا، "اگر یہ معاملہ ہے تو بس گھر چلے جاؤ۔ میں ہر رات آپ کے بستر کے پاس دو دینار (سونے کے سکے) رکھوں گا۔ آپ یہ رقم اپنے آپ پر اور اپنے خاندان پر خرچ کر سکتے ہیں. یہ آپ کے لیے اور دوسرے مسلمانوں کے لیے جو میں نے آپ کے سامنے پیش کی ہے اس سے بہتر نصیحت ہے کہ اس درخت کو کاٹ دیں جو اس کی جگہ پر قائم رہے گا۔ اس درخت کو کاٹنے سے اس کے عبادت کرنے والوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور اس کے رکھ رکھاؤ سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ عبادت گزار نے شیطان کی اس تجویز پر غور کیا اور اپنے دل میں سوچا، "یہ بوڑھا ٹھیک ہے! میں نبی نہیں ہوں، اس لیے نہ تو میرے لیے ضروری ہے کہ میں اس درخت کو کاٹوں اور نہ ہی خدا نے مجھے اس درخت کو کاٹنے کا حکم دیا ہے تاکہ اگر میں اسے نہ کاٹوں تو میں گناہ کروں گا۔ بوڑھے آدمی کی طرف سے پیش کردہ تجویز زیادہ منافع بخش ہے!" لہذا، اس نے بوڑھے آدمی [جو بھیس بدل کر شیطان تھا] کے ساتھ معاہدہ کیا اور قسم کھائی کہ وہ درخت کو نہیں کاٹے گا۔ اس کے بعد وہ رات گزارنے کے لئے اپنی عبادت گاہ واپس آگیا۔ صبح اس نے وعدے کے مطابق اپنے بستر کے پاس دو دینار دیکھے۔ دوسرے دن بھی ایسا ہی ہوا۔ تیسرے دن ، اسے کچھ نہیں ملا۔ وہ بہت غصے میں آگیا اور اس حالت میں کلہاڑی لے کر اپنے کندھے پر رکھ کر

چلنے لگا۔ راستے میں ، وہ اسی بوڑھے آدمی کے بھیس میں شیطان سے ملا جس نے پوچھا ، "آپ کہاں جانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟" نمازی نے کہا، "میں اس درخت کو کاٹنے جا رہا ہوں!" شیطان نے کہا: اللہ کی قسم! تم جھوٹے ہو! تم نہ تو وہاں پہنچ سکتے ہو اور نہ ہی اس درخت کو کاٹ سکتے ہو!" یہ سن کر نمازی نے بوڑھے کو پکڑ کر زمین پر پھینکنے کی کوشش کی۔ شیطان نے کہا، "یہ خیال نہ کرو کہ تم ایسا کر سکتے ہو۔" اس کے بعد شیطان نے نمازی کو پکڑ کر زمین پر پھینک دیا اور اس کے سینے پر بیٹھ گیا اور نمازی اپنی دونوں ٹانگوں کے درمیان پھنسے ہوئے پرندے کی طرح پھڑپھڑانے لگا۔ عبادت گزار نے اپنی پوری کوشش کی لیکن آزاد نہ ہو سکا۔ اس نے ہار مان لی اور کہا، "مجھے جانے دو اور مجھے بتاؤ کہ میں نے پہلے تم پر کیسے قابو پایا اور اس بار تم نے مجھ پر کیسے قابو پایا؟" شیطان نے کہا: پہلی بار تم نے اللہ کی خاطر غضب کے ساتھ آگے بڑھے اور تمہاری نیت آخرت تھی (اور کوئی دنیاوی نفع یا فائدہ) نہیں تھی، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے مجھے تمہارے تابع کر دیا۔ اس بار تم اپنے نچلے نفس اور دنیا (دنیاوی فائدے) کی خاطر ناراض ہو گئے، اسی لیے میں نے تم پر قابو پا لیا ہے!" اس واقعہ سے اللہ تعالیٰ کا یہ قول ثابت ہوتا ہے:

وَلَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ (٣٩)

إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ ٱلْمُخْلَصِينَ (٤٠)

"میں ان سب کو گمراہ کر دوں گا سوائے تیرے بندوں کے جو (تیرے راستے) سچے ہیں۔" (سورة البقرة باب 15، آیہ 39-40)

انسان شیطان سے [اور اس کے پھنسوں، اشاروں، سازشوں اور انسانی زندگیوں کی تباہی] سے صرف [خدا کے ساتھ] اخلاص کے ذریعے چھٹکارا حاصل کرتا ہے۔

اخلاص کی حقیقت: ہر چیز میں دوسری چیزوں کے اختلاط کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ جب کوئی چیز دوسری چیزوں سے پاک اور پاک ہو جاتی ہے تو اسے "پاکیزہ" کہا جاتا ہے اور اس کے تطہیر کے نتیجے میں جس عمل کا نتیجہ نکلتا ہے اسے "*اخلاص*" کہا جاتا ہے۔ ہم نے ارادے کی حقیقت کی وضاحت کی ہے اور اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ارادہ کسی وجہ (یا اکسانے والے) کی تحریک ہے جو کسی کے مقصد کے لئے موزوں ہے۔ اگر سبب ایک ہے اور عمل صرف اسی ایک وجہ سے کیا گیا ہے تو اسے اخلاص کہا جاتا ہے، بشرطیکہ وہ سبب کسی کے مقصد کے مطابق ہو۔ لفظ "اخلاص" خاص طور پر اس عمل کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو صرف خدا کی قربت کے لیے کیا گیا ہے اور خدا کے سوا ہر چیز کی نجاست سے مکمل طور پر پاک اور پاک ہے۔ ایک شخص جس کے عمل کا سبب دکھاوا کر رہا ہے، وہ [روحانی] تباہی کے خطرے میں ہے۔ یہاں ہم اس بات پر بحث کرنا چاہتے ہیں کہ جو سبب خدا سے قرب حاصل کرنے کی نیت سے حرکت میں آتا ہے [یا اکساتا ہے]، [لیکن] پھر اس میں ایک اور سبب (پہلا سبب) گھل مل جاتا ہے، چاہے یہ دوسرا سبب دکھاوے کی وجہ سے ہو یا نہ دکھاوے کا۔

اس کی مثال اس شخص کی ہے جو خدا کا قرب حاصل کرنے کی نیت سے روزہ رکھتا ہے لیکن اس کا مقصد (صحت سے متعلقہ) پرہیز کرنا بھی ہے، یا حج کی ادائیگی [خدا کی قربت کی نیت سے بھی] حج کرتا ہے، یا حج میں شامل [جسمانی] نقل و حرکت کی وجہ سے اعتدال پسند مزاج پیدا کرتا ہے، یا اپنے ملک میں اپنے آپ کو خطرے سے بچانے

یا دور رہنے کے لیے حج کرتا ہے کسی دشمن سے یا اپنی بیوی اور اولاد سے تنگ آ چکا ہو اور حج کی وجہ سے ان سے دور رہنا چاہتا ہو، یا کسی مصروفیت سے تھک جانے کے بعد کچھ راحت حاصل کرنے کے لیے حج کرتا ہو، یا اپنے گھر کی حفاظت کے لیے جاگنے کے لیے رات کو دیر یا صبح سویرے *نماز* پڑھتا ہو۔ یا کوئی شخص اپنے مال و مال کی حفاظت اور لالچی لوگوں کی برائیوں سے بچنے کے ارادے سے علم حاصل کرے، یا تعلیم و واعظ کا اجتماع منعقد کرے [پھر خدا کی قربت کی تلاش کے ارادے سے بلکہ بوریت کی وجہ سے بھی] اور بولنے کی خوشی حاصل کرنا چاہتا ہے، یا روحانی مسافروں (*صوفیوں*) اور علماء کی حمایت کرتے ہیں تاکہ وہ کسی کو اپنے دلوں میں عزت و احترام کا حامل رکھیں اور عام لوگ بھی کسی کو احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس کے ساتھ نرمی سے پیش آتے ہیں کیونکہ وہ خدا پرستوں کی حمایت کرتا ہے، یا قرآن لکھتا ہے کیونکہ لکھنے سے ہاتھ کی تحریر میں مسلسل بہتری آتی ہے، یا وضو کیا جاتا ہے۔اللہ تعالیٰ کی قربت حاصل کرنے کے ارادے سے بلکہ وضو کرکے جسم کو سکون بخشنا یا غسل کرنا [پھر جسمانی پاکیزگی کے ساتھ خدا کی قربت حاصل کرنے کے ارادے سے بلکہ جسمانی بو کو دور کرنے کے لیے] یا نبوت کی روایات بیان کرنا [خدا کی قربت حاصل کرنے کے ارادے سے بلکہ لوگوں کو اونچے مقامات پر اپنا نام لینے کے لیے)، یا کسی مسجد میں *اعتکاف*، [اللہ تعالیٰ کی قربت حاصل کرنے کے ارادے سے] گھر کا کرایہ بچانے کے لیے، یا روزہ رکھنا [اللہ تعالیٰ کی قربت حاصل کرنے کے ارادے سے بھی] اپنے آپ کو بچانے کے لیے یا یہ سوچتا ہے کہ کھانے سے کوئی کام نہیں کر سکے گا، یا کسی طالب کاری کی ضرورت پوری کرے [خدا کی قربت حاصل کرنے کی نیت سے بلکہ اس لیے بھی] کہ وہ اس سے تنگ آ چکا ہے بھکاری کا پوچھنا، یا کسی بیمار کی عیادت کرنا تاکہ وہ شخص یا رشتہ دار بیمار ہو تو عیادت کریں، یا ان میں سے کوئی کام اس لیے کرے کہ لوگ ان اعمال کے لیے کسی کا ذکر کریں اور کسی کی تعریف کریں اور ان کی وجہ سے شہرت حاصل کریں۔ ان تمام صورتوں میں اگر نیت بھی ان مقاصد میں سے کسی کے ساتھ اللہ کا قرب حاصل کرنا ہو تو اس کا عمل اخلاص کی تعریف سے باہر نکل جائے گا (یعنی عمل اب مخلص نہیں رہے گا) اور یہ نہیں کہا جائے گا کہ یہ عمل خالص خدا کی خاطر کیا گیا تھا۔ بلکہ یہ شرک یا اللہ کے سوا کسی اور میں مل جائے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر دنیاوی لذتوں سے کوئی لذت ایسی ہو کہ ادنیٰ نفس اس کی طرف مائل ہو، اس کی خواہش کرے اور کسی عمل میں جگہ تلاش کرے تو اس لذت کی وجہ سے اخلاص پر منفی اثر پڑے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان ہر وقت ادنیٰ نفس اور خواہشات کی لذتوں میں ڈوبا رہتا ہے اور شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی عمل یا عبادت ان لذتوں اور خواہشات سے خالی ہو۔ چنانچہ ان اعمال اور عبادات کو مخلص قرار نہیں دیا جا سکتا (کیونکہ وہ صرف اللہ کی خاطر اخلاص سے نہیں کیے گئے تھے]۔ چنانچہ یہ کہا گیا ہے کہ اگر کوئی ایسا لمحہ حاصل کر لے جو خالصتا خدا کی خاطر ہے تو وہ لمحہ اس شخص کی نجات اور سلامتی کے لیے کافی ہو گا۔ یہ اخلاص کے وجود کی نایاب ہونے کی وجہ سے ہے، کیونکہ دل کو نجاستوں اور لذتوں سے پاک کرنا اور پاک کرنا انتہائی مشکل ہے، بلکہ پاکیزہ اور مخلص عمل ایسا ہے کہ اس کا سبب اور محرک اللہ تعالیٰ کی قربت کی تلاش کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اگر یہ لذتیں اور خواہشات ان اعمال کے واحد محرک اور اسباب ہیں تو ان اعمال کرنے والے کو ان اعمال کی وجہ سے مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا اور یہ بات ظاہر ہے، لیکن اگر ان اعمال کی نیت اللہ تعالیٰ کی قربت حاصل کرنا ہے اور ان لذتوں کی خواہشات بھی اس کے ساتھ مل جاتی ہیں تو پھر یہ عمل اللہ کی خاطر پاک نہیں رہتا۔ اعمال میں دنیاوی لذتوں کا اضافہ تین صورتیں اختیار کر سکتا ہے: جمع یا شراکت یا تعاون کی صورت میں ہو گا، اور ان صورتوں کی وضاحت پہلے بھی ہو چکی ہے۔

اخلاص کا مفہوم یہ ہے کہ اعمال میں کسی بھی قسم کی نجاست [خود غرضی، برے اور غلط ارادے اور ارادوں] سے پاک ہو، خواہ وہ کم ہوں یا کثرت، اور ان کے عمل کا مقصد صرف اللہ تعالیٰ کا قرب ہے اور اس کے علاوہ کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس طرح کے اعمال کا تصور صرف ان لوگوں سے ہی کیا جا سکتا ہے جو خدا سے محبت کرتے ہیں اور

آخرت کی جستجو میں ڈوبے ہوئے ہیں اور ان کے دلوں میں دنیا کی محبت کے لیے اس حد تک کوئی جگہ نہیں بچی کہ وہ کھانا پینا بھی پسند نہیں کرتے۔ کھانے پینے کی طرف ان کا جھکاؤ فطرت کی پکار کو پورا کرنے کے مترادف ہے جو انسانی جسم کی ضرورت اور تقاضہ ہے۔ اسی طرح کھانا پینا بھی انسان کی ضرورت اور تقاضہ ہے۔ وہ کھانے کی طرف اس لیے مائل نہیں ہوتے کہ وہ غذا ہے یا یہ لذت بخش ہے، بلکہ وہ اس کی طرف مائل ہو جاتے ہیں کیونکہ خوراک جسم کو توانائی اور طاقت دیتی ہے اور اسی سے خدا کی عبادت اور اطاعت کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ وہ بھوک کی برائی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں، اس لیے انہیں کھانے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ ان کے دلوں میں غیر ضروری ضروریات کی طرف جھکاؤ نہیں ہوتا، بلکہ وہ مطلوبہ رقم پر مطمئن ہوتے ہیں اور اسے خدا کی راہ کی ضرورت سمجھتے ہیں۔ جس کی توجہ کا واحد مرکز اپنے تمام خیالات و اعمال میں خدا ہے، یہاں تک کہ جب کوئی کوئی چیز کرتا ہے جیسے کھانے یا قدرت کی پکار کا جواب دینے کے لئے، تو اس کے اعمال پاک ہوتے ہیں اور اس کی تمام حرکات و سکنات میں اس کی نیت درست ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ شخص عبادت کے لیے طاقت حاصل کرنے اور مستقبل میں اطاعت کے کاموں کے لیے جسم کو آرام دینے کے لیے سوتا ہے۔ اس صورت میں اس کی نیند بھی عبادت بن جاتی ہے اور اسے مخلص کا درجہ دیا جاتا ہے اور جس کے پاس یہ کیفیت نہیں ہے اس کے لیے اخلاص کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ اخلاص ایسے شخص سے شاذ و نادر ہی ظاہر ہوتا ہے، ورنہ عام طور پر کسی کی ساری عبادت دنیاوی مقصد کے لیے ہوتی ہے۔ جس شخص میں اللہ اور آخرت کی محبت غالب ہو تو اس کے تمام حرکات و سکنات اس اثر کے غلبے کی وجہ سے اخلاص بن جاتی ہیں اور اس کا ہر عمل خلوص کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ دوسری طرف ایک ایسا شخص ہے جس کے پاس دنیا سے محبت ہے، دنیاوی طاقت اور حکومت [اپنے باطن میں] غالب ہے، ایسے شخص کا اللہ کے سوا کسی اور کی طرف مجموعی طور پر جھکاؤ ہے اور یہ [باطنی] صفت (خدا کے سوا کسی اور کی خواہش کی) اس کی تمام حرکات و سکنات پر حاوی ہے اور کسی کی عبادت میں سے کسی کو بھی نماز کی طرح حاوی نہیں ہے۔ روزہ اور صدقہ اس سے محفوظ رہتا ہے۔

اخلاص کی کمی کا علاج: اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ اخلاص کی کمی ایک بیماری ہے اور اس کا علاج نفس نفس کی لذتوں کا خاتمہ ہے، دنیا سے لالچ کو دور کرنا اور آخرت سے اس طرح وابستگی پیدا کرنا ہے کہ وہ دل پر حاوی ہونا شروع ہو جائے۔ اس طرح اخلاص کسی کے لیے آسان ہو جائے گا۔ کتنے اعمال ہیں جن میں انسان تھکاوٹ اور تشکلیں برداشت کرتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ وہ خالص خدا کی خاطر کچھ کر رہا ہے، اگرچہ اس کے بارے میں اس کا خیال غلط ہے؟ اس خود فریبی کی وجہ یہ ہے کہ انسان اس تخریب کاری کی وجہ نہیں جانتا اور اسے اپنے اعمال کو تمام خرابیوں سے پاک سمجھنے کی غلط فہمی ہوتی ہے۔ ایک گنوسٹک نے اپنی تیس سال کی نماز صرف اس لیے دہرائی کہ ایک دن جب وہ مسجد پہنچا تو نماز باجماعت شروع ہو چکی تھی اور اسے پہلی صف میں جگہ نہیں ملی اور وہ دوسری صف میں نماز پڑھنے پر مجبور ہو گیا اور اس میں شرمندہ تھا۔ اس واقعہ کے بعد انہیں احساس ہوا کہ وہ پہلی صف میں نماز پڑھتے ہیں کیونکہ لوگ ان کی طرف دیکھتے تھے جس سے وہ خوش ہوتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ وہ دوسری صف میں کھڑے ہو کر شرمندہ محسوس کرتے تھے۔ اس خیال کے ساتھ انہیں احساس ہوا کہ ان کی تیس سال کی نمازیں [مسجد میں] ضائع ہو چکی ہیں اور انہیں دہرانے کی ضرورت ہے [اس بار ان کو خلوص نیت کے ساتھ صرف خدا کی خاطر اور کسی اور مقصد کے لیے نہیں اور اس کے علاوہ کسی کے لیے نہیں]۔ یہ ایک لطیف تباہی ہے اور ہر کوئی اسے سمجھنے کے قابل نہیں ہے۔ شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ لوگ [تقویٰ] اعمال میں خرابیوں سے محفوظ رہتے ہیں، اور صرف وہی لوگ ان سے آگاہ ہوتے ہیں اور اپنی حفاظت کے بارے میں سوچتے ہیں، جنہیں خدا نے نیکی کرنے کی توفیق عطا کی ہے۔ بے پرواہ کرنے والے دیکھیں گے کہ ان کے اعمال آخرت میں ضائع ہو گئے ہیں قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت اسی کی طرف اشارہ کرتی ہے:

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُم بِٱلْأَخْسَرِينَ أَعْمَٰلًا ﴿١٠٣﴾

ٱلَّذِينَ ضَلَّ سَعۡيُهُمۡ فِي ٱلۡحَيَوٰةِ ٱلدُّنۡيَا وَهُمۡ يَحۡسَبُونَ أَنَّهُمۡ يُحۡسِنُونَ صُنۡعًا ﴿١٠٤﴾

"ان سے کہہ دو کیا ہم تمہیں ان لوگوں کے بارے میں بتائیں جو اپنے اعمال میں نقصان اٹھانے والے ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کی دنیا میں محنت رائیگاں چلی گئی ہے اور ان کے پاس یہ خیال ہے کہ وہ نیک اعمال کر رہے ہیں۔ (سورۃ البقرۃ آیت 18، آیت 103-104)

اس تباہی کا سب سے بڑا ہدف علماء یا علماء علماء ہیں، کیونکہ زیادہ تر علماء دین کی تبلیغ کے لیے کام کرتے ہیں، اور وہ دوسروں پر غلبہ حاصل کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں [کیونکہ وہ کچھ ایسا کر رہے ہیں جو دوسرے لوگوں کی اکثریت نہیں کر رہتے]، [دوسروں کے دلوں پر] طاقت حاصل کرنے اور ان کی پیروی کرنے میں خوشی ہوتی ہے۔ اور تعریف اور تعریف دل کو خوشی سے اچھلنے کا سبب بنتی ہے۔ شیطان ان کے سامنے اس بات کو مشکوک بناتا ہے اور کہتا ہے کہ تمہارا مقصد خدا کی راہ کی تبلیغ کرنا اور اس شریعت کا دفاع کرنا ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی ہے۔ ارد گرد بہت سے مبلغین موجود ہیں جو عام عوام اور حکومتی رہنماؤں کی اصلاح کے لیے کام کرنا اپنا احسان سمجھتے ہیں، اور جب لوگ ان کی بات سنتے ہیں اور ان کے مشوروں پر عمل کرتے ہیں تو ان کی خوشی کی کوئی حد نہیں ہوتی ہے۔ یہ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ اس لیے خوش ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی راہ اور مخلوق کی اصلاح میں مدد کے لیے منتخب کیا ہے، حالانکہ ان کی حالت ایسی ہے کہ اگر سادہ ذہن لوگ ان جیسے کسی دوسرے عالم کے پاس اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے جائیں تو غم اور حسد ان کو ہلاک کر دیں گے۔ اگر ان کا مقصد لوگوں کو نصیحت کرنا اور نصیحت کرنا ہوتا تو وہ اس کے لیے خدا کا شکر ادا کرتے کیونکہ اس نے انہیں ایک بڑی ذمہ داری کو دوسروں پر ڈال کر بچا لیا اور انہیں ایک نازک اور خطرناک ذمہ داری سے محفوظ رکھا۔ شیطان اس مقام پر بھی انہیں تنہا نہیں چھوڑتا اور ان سے کہتا ہے کہ آپ کے پچھتاوے کی اصل وجہ یہ ہے کہ آپ کو راہ الٰہی کی تبلیغ، علم کی حفاظت اور مخلوق کی اصلاح کے بدلے سے محروم کر دیا گیا ہے۔ یہ غریب شخص نہیں جانتا کہ خدا کے فیصلے کے سامنے سر جھکانے کا اس سے کہیں زیادہ خدائی اجر ہے جو مخلوق کی رہنمائی سے حاصل ہوتا ہے۔ اس آزمائش میں صرف وہی لوگ ثابت قدم رہتے ہیں جو شیطان کے فریب اور نیچی نفس کے فریب سے واقف ہوں اور اپنے نفس کو آزماتے رہتے ہیں۔ بہرحال اخلاص کی حقیقت کو جاننا اور اس پر عمل کرنا ایک گہرا سمندر ہے۔ بہت سے لوگ اس میں ڈوب جاتے ہیں اور شاذ و نادر ہی اس سے بچ جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا ذکر درج ذیل آیت میں استثناء کے طور پر کیا گیا ہے:

إِلَّا عِبَادَكَ مِنۡهُمُ ٱلۡمُخۡلَصِينَ

"[شیطان نے خدا سے اپنی گفتگو میں کہا ہے کہ وہ آدم علیہ السلام کی تخلیق کے بعد سب کو گمراہ کر دے گا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں اور شیطان کو اس کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دے گا، شیطان کی اطاعت سے صریح انکار اور اللہ کا حکم کہ شیطان کو ہمیشہ کے لیے اس کی رحمت سے دور کر دے۔] سوائے ان لوگوں کے جو سچے ہیں تیرے بندوں میں سے (جن پر میں (شیطان) اثر انداز نہیں کر سکتا، ان میں سے ایک اور نچلی نفس کی خواہش ہے۔ (سورۃ البقرۃ القرآن، آیت نمبر 40)

بندے کو چاہیے کہ وہ ان لطیف باتوں پر گہری نظر رکھے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ غفلت کی حالت میں شیطان کا پیروکار نہ ہو جائے۔

کسی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اخلاص کے بارے میں پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أَنْ تَقُولَ رَبِّيَ اللَّهُ ثُمَّ تَسْتَقِيمُ كَمَا أُمِرْتَ

"یہ وہ ہے کہ تم کہتے ہو کہ اللہ میرا رب ہے، پھر اس پر قائم رہو اور اسی طرح قائم رہو جیسا تمہیں حکم دیا گیا ہے۔" (بیان کردہحدیث کا مجموعہ *ترمذی*)

یعنی تم نہ اپنی خواہشوں کی عبادت کرتے ہو اور نہ ہی اپنی نفس کی عبادت کرتے ہو بلکہ صرف اپنے رب کی عبادت کرو اور اس پر ثابت قدم رہو جس طرح تمہیں صبر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ نبوت اللہ کے سوا سب سے تمام امیدوں کو ختم کرنے کی طرف اشارہ کرتی ہے اور حقیقت میں یہی اخلاص ہے۔

وہ خطرات اور رکاوٹیں جو خلوص میں کیچڑ کا سبب بنتی ہیں: بہت سے خطرات (خراب کرنے والے) ہیں جو اخلاص میں کیچڑ کا سبب بنتے ہیں۔ ان میں سے کچھ ظاہر ہیں، کچھ پوشیدہ ہیں، کچھ کمزوری کے ساتھ ظاہر ہیں، اور کچھ طاقت سے پوشیدہ ہیں۔ تاہم ، ان کی ڈگریوں میں فرق کو مثالوں کے بغیر سمجھنا ناممکن ہے ، لہذا ہم سب سے پہلے دکھاوے کی ایک مثال کا ذکر کرتے ہیں۔ خلوص دکھاوے یا دکھاوے سے زیادہ خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک نمازی نماز میں مصروف رہتا ہے اور انتہائی خلوص کے ساتھ نماز پڑھتا ہے۔ اس دوران کچھ لوگ آ گئے جہاں کوئی نماز پڑھ رہا تھا۔ شیطان نے اسے ایک اچھا موقع سمجھا جو وہاں پہنچا اور ایک سے کہنے لگا، "بہت اچھی طرح دعا کرو تاکہ جو لوگ آپ کو دیکھ رہے ہیں وہ ایک اچھا تاثر حاصل کریں اور آپ کو راستباز سمجھ کر آپ کا احترام کریں گے، اور آپ کو حقارت سے نہیں دیکھیں گے، اور نہ ہی آپ کے خلاف غیبت کریں گے"۔ یہ سن کر انسان اعضاء میں عاجزی اختیار کر لیتا ہے اور زیادہ سکون کے ساتھ نماز پڑھتا رہتا ہے اور اپنی نمازوں میں زیادہ ظاہری خوبصورتی پیدا کرتا ہے۔ یہ ظاہری دکھاوا ہے جو ابتدائی روحانی مسافروں کے لیے بھی واضح ہے۔ یہ دکھاوے کی پہلی ڈگری ہے۔

دوسری ڈگری یہ ہے کہ روحانی مسافر (عبادت گزار) اس خطرے کو سمجھتا ہے اور اس سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے حکمت عملی اختیار کرتا ہے۔ یہ روحانی مسافر شیطان کی اطاعت نہیں کرتا اور اس کی طرف توجہ نہیں دیتا، بلکہ انسان اپنی نماز میں اسی طرح مشغول رہتا ہے جس طرح لوگوں کی آمد سے پہلے تھا۔ شیطان ایک بار پھر نیکی اور نیکی کی لبادہ میں انسان کے پاس آتا ہے اور کسی سے کہتا ہے کہ لوگ تمہاری پیروی کرتے ہیں، تیرے نقش قدم پر چلتے ہیں، تمہاری ہر حرکت پر نظر رکھو، جو کچھ بھی تم کرتے ہو اس سے ان کے اپنے اعمال پر اثر پڑتا ہے، اور وہ تمہاری ہر عمل کو ایک نمونہ سمجھتے ہیں، اگر تم نیکی کرو گے تو تمہیں ان کے اعمال کا بدلہ بھی ملے گا۔ اور اگر آپ کو اپنے اعمال میں سستی آتی ہے تو آپ کو ان کے اعمال میں بھی سستی کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے گا۔ لہذا، آپ کو دوسرے لوگوں کے سامنے اچھی طرح سے کام کرنا چاہئے۔ تاکہ وہ عاجزی کے ساتھ تمہاری پیروی کریں اور اپنے اعمال کو خوبصورتی سے سنواریں۔ یہ ڈگری پہلے سے زیادہ لطیف اور پیچیدہ ہے۔ بعض اوقات جو لوگ شیطان کی پہلی تدبیر سے دھوکہ نہیں کھاتے، وہ دوسرے سے دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ یہ بھی [دکھاوے کی ایک شکل] ہے جو خلوص کو باطل کرتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر کسی کی نظر میں عاجزی اور عبادت کی خوبصورتی میں کوئی نیکی ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ لوگ ان سے محروم رہیں تو پھر وہ تنہائی میں یہ عبادت کیوں نہیں کرتا؟ مزید برآں ، یہ بھی قبول نہیں کیا جاسکتا ہے کہ دوسرے لوگوں کی ذات کسی کے اپنے آپ کے مقابلے میں زیادہ پیاری ہے اور کسی اور کی اپنی ذات سے زیادہ بہتری چاہتا ہے۔ یہ محض ایک شیطانی نصیحت ہے جو

کسی کو دھوکہ دے رہی ہے کہ وہ پیروکار ہو اور [اس کے نتیجے میں] کسی کو دکھاوا میں ڈال رہا ہو۔ وہ شخص جو پیروی کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، جو اپنے نفس میں ثابت قدم ہے، جس کا دل روشن ہے، اور اس کی روشنی کی کرنیں دوسروں تک پہنچتی ہیں اور انہیں بھی روشن کرتی ہیں۔ اس صورت میں، یقینا کسی کو پیروی کرنے کا الٰہی اجر ملے گا لیکن شیطانی قائل [ابھی ذکر کیا گیا ہے] محض ایک فریب کی نصیحت ہے، تاہم، پیروکار کو یقینا اس کی پیروی کرنے کا اجر الٰہی ملے گا، جبکہ جس شخص کی پیروی کی جا رہی ہے وہ اس نصیحت کو [ناجائز طور پر] تسلیم کرنے کا ذمہ دار ہوگا اور یہاں تک کہ [الہانی] کو ایک ایسی خصوصیت ظاہر کرنے کی سزا بھی مل سکتی ہے جو کسی میں بھی نہیں ہے۔

تیسری درجہ دوسری سے بھی زیادہ لطیف اور پیچیدہ ہوتی ہے جو کہ اپنے نچلے نفس کو آزمانا اور شیطان کے فریب سے آگاہ ہونا اور یہ جاننا کہ نجی اور عوامی (باطنی اور ظاہری) [روحانی] حالت میں فرق محض دکھاوا ہے اور یہ کہ یہ نمازیں وہی ہونی چاہئیں جو دوسروں کے سامنے ہیں اور جب کوئی کوشش کرے تو اپنی ذات اور خدا کے سامنے شرمندہ ہونا چاہیے غیر معمولی طور پر صرف دوسرے لوگوں کی خاطر عاجزی کو اپنانا۔ اس کے بجائے تنہائی میں اپنے نفس پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے اور اپنی دعاؤں میں وہی نیکی اور خوبصورتی پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے جو دوسروں کے سامنے دعاؤں میں پیدا ہوتی ہے۔ یہ بھی پوشیدہ (خفیہ) دکھاوے کی ایک شکل ہے، اگرچہ اس کا بظاہر احساس نہیں ہوتا کیونکہ کوئی شخص تنہائی میں اچھی طرح سے دعا کرتا ہے تاکہ وہ دوسروں کے سامنے اچھی طرح سے دعا کر سکے، اس طرح اس کی نگاہیں نجی اور عوامی دونوں طرح کے لوگوں پر ہوتی ہیں۔ خلوص اس وقت ہوتا ہے جب انسان اور جانور اپنی نظروں میں برابر ہو جاتے ہیں تاکہ جس طرح کوئی جانوروں کے سامنے اپنی عبادت کو خوبصورت نہیں بناتا اسی طرح دوسروں کے سامنے بھی ایسا نہ کرے۔ دکھاوے سے دور رہنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ مخلوقات کی طرف کسی کا میلان ویسا ہی ہونا چاہیے جیسا کہ اس کا پتھروں کی طرف ہے، چاہے وہ عوامی ہو یا نجی طور پر، ورنہ وہ دونوں حالتوں (حالات) میں تخلیقات میں مشغول سمجھا جائے گا۔ یہ شیطان کا ایک انتہائی لطیف دھوکہ ہے اور اس کے بارے میں شاذ و نادر ہی آگاہ کیا جاتا ہے۔

چوتھی درجہ، جو تمام درجات میں سب سے زیادہ لطیف ہے، یہ ہے کہ جب کوئی عوامی اجتماع میں دعا کر رہا ہوتا ہے، تو شیطان کسی کو عاجزی اختیار کرنے پر آمادہ نہیں کرتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ وہ اس دھوکہ دہی میں نہیں پھنس جائے گا۔ شیطان نفرت کے ساتھ ایک سے کہتا ہے، "خدا کی عظمت اور عظمت اور اس کی ہستی کے تقدس پر غور کرو جس کے سامنے تم عبادت میں کھڑے ہو، اور ڈرو کہ وہ تمہارے دل کو دیکھے جبکہ تم اس سے غافل ہو"۔ یہ سن کر انسان فورا دل میں توجہ حاصل کر لیتا ہے اور اپنے اعضاء پر عاجزی اور عاجزی اختیار کر لیتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ یہ عمل خالص اخلاص ہے، اگرچہ یہ خالص فریب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان نے تنہائی میں عاجزی اور دل کی موجودگی کو اپنایا ہوگا اور اس وقت خدا کی عظمت پر غور کیا ہوگا، نہ کہ خاص طور پر کسی عوامی اجتماع میں۔ اس فریب سے بچنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ کسی کا دل تنہائی میں بھی یاد الٰہی میں مصروف رہتا ہے جس طرح عوامی اجتماع میں ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ جب لوگ پہنچتے ہیں تو ان کے دل کی کیفیت تنہائی میں ہونے کے مقابلے میں مختلف ہو جاتی ہے اور اس وقت تک کسی کو مخلص نہیں سمجھا جائے گا۔ جب تک کسی کا دل جانوروں کی طرف دیکھنے کے مقابلے میں مختلف ہو جاتا ہے، وہ اخلاص کی بے باکی سے دور رہتا ہے اور اس کا باطن دکھاوے کے پوشیدہ شرک سے آلود ہو جاتا ہے، جو ایک تاریک سیاہ رات میں سیاہ چٹان پر رینگنے والی سیاہ چیونٹی کی رینگنے سے زیادہ پوشیدہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک روایت میں بیان کیا گیا ہے۔ صرف وہی شخص جس کی بصیرت گہری ہو اور اسے خدا کی طرف سے حفاظت، کامیابی اور ہدایت عطا کی گئی ہو وہ شیطان سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ ورنہ شیطان ان لوگوں کو ہلاک کرنے پر تلا

ہوا ہے جو عبادت الٰہی کا ارادہ کرتے ہیں اور ایک لمحے کے لیے بھی ان سے غافل نہیں رہتا، یہاں تک کہ وہ انہیں دکھاوے پر مجبور نہ کرے، اور وہ نہ صرف بڑی باتوں میں ایسا کرتا ہے بلکہ اللہ کے بندوں کے ہر عمل پر اس حد تک کڑی نظر رکھتا ہے کہ دنیاوی معاملات کو بھی نہیں چھوڑتا۔

فضیلت اور سچائی کی حقیقت

سچائی کی فضیلت: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

رِجَالٌ صَدَقُوا۟ مَا عَـٰهَدُوا۟ ٱللَّهَ عَلَيْهِ ۖ

"بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو جب اللہ سے عہد لیا تو وہ اس میں سچے تھے۔" (سورۃ البقرۃ باب ٣٣، آیت ٢٣)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِيْ إِلَى الْبِرِّ وَالْبِرُّ يَهْدِيْ إِلَى الْجَنَّةِ وَإِنَّ الرَّجُلَ لَيَصْدُقُ حَتّٰى يُكْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ صِدِّيْقًا وَإِنَّ الْكَذِبَ يَهْدِيْ إِلَى الْفُجُوْرِ وَالْفُجُوْرُ يَهْدِيْ إِلَى النَّارِ وَإِنَّ الرَّجُلَ لَيَكْذِبُ حَتّٰى يُكْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ كَذَّابًا

"صداقت صداقت انسان کو راستبازی کی طرف لے جاتی ہے اور صداقت جنت کی طرف لے جاتی ہے۔ اور ایک شخص [بلند ارادہ] سچا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے سچا (*صدق*) لکھا جائے۔ اور باطل برائی کی طرف لے جاتا ہے اور برائی جہنم کی طرف لے جاتی ہے۔ اور انسان جھوٹ بولتا ہے یہاں تک کہ وہ خدا کے سامنے جھوٹا نہ ہو جائے۔ (بیان کردہ*احادیث* میں صحیح *بخاری* اور صحیح *مسلم* عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ پر جمع کیے گئے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ چار صفات ہیں جن میں سے ایک شخص میں موجود ہو تو نجات حاصل ہو سکتی ہے، سچائی، شرم، خوبصورت باطنی صفات اور صفات اور شکر گزاری۔ محمد بن علی کنفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم نے خدا کی راہ کو تین عناصر پر مبنی پایا ہے: پہلا سچائی، دوسرا حق اور تیسرا عدل و انصاف ۔ انصاف کا تعلق دل سے ہے۔ سچائی کا تعلق اعضاء سے ہے اور سچائی عقل سے تعلق رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر وحی کی کہ جو شخص مجھے اپنے باطن میں جانتا ہے تو میں اس شخص کو تمام مخلوقات کے سامنے کھلم کھلا پہچانتا ہوں۔ ایک شخص جو شبلی رحمۃ اللہ علیہ کے اجتماع میں تھا چیخ چیخ کر اٹھ کھڑا ہوا اور چند لمحوں میں دوڑتا ہوا دریائے دجلہ میں کود پڑا۔ شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اگر یہ شخص سچا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اسی طرح نجات عطا فرمائے گا جس طرح اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نجات دی تھی اور اگر وہ جھوٹا ہے [لوگوں کی نظروں میں کسی دنیاوی مقصد کے لیے ان کی امانت حاصل کرنے کے لیے روحانی

وجد کی کیفیت کا بہانہ کرنے کے لیے]. خدا اسے اسی طرح غرق کر دے گا جس طرح اس نے فرعون کو غرق کر دیا تھا۔ وحب بن منبہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے تورات کے حاشیوں میں بائیس جملے لکھے دیکھے ہیں جنہیں بنی اسرائیل کے صالحین اجتماعی طور پر پڑھتے تھے۔ وہ جملے یہ ہیں: کوئی خزانہ علم سے زیادہ نفع بخش نہیں ہے، کوئی مال علم سے نفع بخش نہیں ہے، کوئی نسب غصے سے زیادہ ذلت آمیز نہیں ہے، کوئی ساتھی اعمال سے زیادہ خوبصورت نہیں ہے، کوئی دوست جہالت سے زیادہ عیب دار نہیں ہے، خوف خدا سے بڑھ کر کوئی عزت نہیں ہے، کوئی مہربانی خواہش ترک کرنے سے بڑھ کر نہیں ہے، کوئی عمل غور و فکر سے افضل نہیں ہے۔ صبر سے کوئی نیک عمل افضل نہیں ہے، کوئی برائی تکبر سے زیادہ ذلت آمیز نہیں ہے، نرمی سے زیادہ کوئی دوا نرم نہیں ہے، کوئی بیماری حماقت سے زیادہ تکلیف دہ نہیں ہے، کوئی نبی حق سے زیادہ عدل و انصاف پر مبنی نہیں ہے، کوئی دلیل سچائی سے زیادہ علمی نہیں ہے، کوئی غربت لالچ سے زیادہ ذلت آمیز نہیں ہے، کوئی آسودگی ذخیرہ اندوزی سے زیادہ ذلت آمیز نہیں ہے۔ صحت سے بہتر کوئی زندگی نہیں ہے، پاکیزگی سے زیادہ خوشگوار کوئی معیشت نہیں ہے، کوئی عبادت عاجزی سے بہتر نہیں ہے، کوئی پرہیز قناعت سے بہتر نہیں ہے، کوئی محافظ خاموشی سے زیادہ محفوظ نہیں ہے اور کوئی غیر حاضر موت سے زیادہ قریب نہیں ہے۔

سچائی کی حقیقت، اس کے مفہوم اور درجے: سچائی کا لفظ چھ معانی پر ہوتا ہے: الفاظ میں سچائی، نیت میں سچائی، عزم میں سچائی، عزم کی تکمیل میں سچائی، اعمال میں سچائی، اور راہ الٰہی کے تمام روحانی مقام (*مقامات*) کی تحقیق میں سچائی). جس شخص کو ان چھ معنوں میں سچائی سے منسوب کیا گیا ہے وہ سچا ہے (*صدق* یا عرفان یا خدا کا مقرب) [اس وضاحت سے ظاہر ہوتا ہے کہ سچائی اپنی مجموعی حیثیت میں، ان چھ معاملات میں اس پر عمل پیرا ہونے سے، انسان کو انسانی کامیابی کی بلندی اور اعلیٰ ترین روحانی درجات کی طرف لے جاتی ہے جو انسان کو حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس کے برعکس ، جھوٹ اور اس کے تمام مظاہر جیسے دھوکہ دہی ، بے ایمانی ، ناانصافی ، نفرت وغیرہ پر عمل پیرا ہونا ، کسی کو نچلے درجے کی گہرائیوں کی طرف لے جاتا ہے ، مکمل تاریکی اور انتہائی ناکامی۔ پھر سچوں کے بہت سے درجات ہیں۔ جو شخص کسی خاص معاملے میں سچا ہو اور اس معاملے میں سچا کہا جائے جس کی سچائی کسی میں پائی جاتی ہے۔ اب ہم ان تمام اقسام کی وضاحت کریں گے۔

سچائی کی پہلی ڈگری الفاظ میں ہے: یہ سچائی خبر پہنچانے کے ساتھ ہے اور ان الفاظ میں ہے جو خبروں (یا واقعات) کو پہنچانے کے بارے میں ہیں۔ خبروں کا تعلق ماضی کے ساتھ ساتھ حال اور مستقبل دونوں سے ہے۔ اس میں وعدوں کو پورا کرنا بھی شامل ہے۔ ہر بندے پر لازم ہے کہ وہ اپنی باتوں کی حفاظت کرے اور جب کوئی زبان سے کوئی لفظ کہے تو اسے سچائی کے ساتھ کرنا چاہیے۔ یہ سچائی کی سب سے روشن اور واضح قسم ہے۔ جو شخص اپنی زبان کو جھوٹ سے بچائے گا اور حقیقت کے خلاف باتیں نہ کہے وہ سچا کہلائے گا۔ البتہ اس سچائی کے دو پہلو ہیں: ایک یہ کہ اشاروں سے دور رہنا جیسا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جھوٹ نہیں ہے۔ اشاروں سے دور رہنا اس قسم کی سچائی کا کمال ہے کیونکہ اسے جھوٹ کے متبادل کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ جھوٹ کی ممانعت اس لیے کی گئی ہے کہ جھوٹ میں کسی چیز کو اس طرح سمجھایا جاتا ہے جو حقائق کے منافی ہے۔ بہرحال زبان (الفاظ) کے ذریعے سچائی کا کمال یہ ہے کہ صریح جھوٹ کے ساتھ ساتھ اشاروں سے بھی دور رہیں (وہ الفاظ جو جان بوجھ کر دوہرے معنی اور لطیف جھوٹ کو بیان کرتے ہیں جو لوگوں کو غلط نتائج پر پہنچاتے ہیں) اور دوسرا کمال یہ ہے کہ جو کچھ بھی کہتا ہے اس کے معنی کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی مندرجہ ذیل آیت پڑھے گا:

وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضَ

"میں نے اپنا منہ اس کی طرف رخ کیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔" (سورۃ البقرۃ الباب 6، آیت 79)

لیکن اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ سے منحرف ہو اور دنیاوی خواہشات اور امیدوں میں مبتلا ہو تو وہ جھوٹا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں (سورۃ البقرۃ سورۃ 1 آیت 5) یا کہتا ہے کہ میں تیرا بندہ ہوں لیکن خدا کی بندش کے لحاظ سے کسی میں کچھ بھی نہیں ہے اور اس کے بجائے وہ اپنی ذات یا دنیا یا دنیاوی خواہشات کو اپنا معبود سمجھتا ہے۔ پھر ایسا شخص کسی کی باتوں میں سچا نہیں سمجھا جائے گا۔ جو شخص کسی چیز کی غلامی رکھتا ہے، وہ اس کا خادم بن جاتا ہے [اور اس کے نتیجے میں اپنی حقیقی آزادی کھو دیتا ہے]۔
حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے سرکشوں کو مخاطب کرتے تھے: اے جہانوں کے بندو! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

تَعِسَ عَبْدُ الدِّينَارِ تَعِسَ عَبْدُ الدِّرْهَمِ وَعَبْدُ الْحُلَّةِ وَعَبْدُ الْخَمِيصَةِ

"تباہی دینار کے خادم کے لیے ہے ، تباہی *درہم* کے خادم کے لیے ہے، کپڑوں کے خادم کے لیے اور کھانے کے خادم کے لیے ہے"۔ (بیان کردہ*حادیث* کا مجموعہ *صحیح بخاری* ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے

اس نبوت کی روایت میں لوگوں کو اس چیز سے منسوب کیا گیا ہے جس کے وہ تابع ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا سچا بندہ وہ ہے جو سب سے پہلے اللہ کے سوا کسی اور سے نجات حاصل کرتا ہے۔ اس آزادی کے بعد دل (اللہ کے سوا کسی اور سے) خالی ہو جائے گا اور اللہ کی غلامی کا یقین اس میں پختہ ہو جائے گا۔ یہ عقیدہ انسان کو الٰہی محبت میں غرق کر دے گا اور اس کا ظاہری و باطنی وجود خدا کے سوا کسی اور کی ہر قید اور پھنسے سے آزاد ہونے کے بعد اطاعت الٰہی میں مشغول ہو جائے گا اور اس کا مقصد اللہ کے سوا کسی اور چیز کی طرح باقی نہیں رہے گا۔ اس روحانی مقام پر پہنچنے کے بعد انسان اعلیٰ روحانی درجات پر چڑھ جاتا ہے جنہیں "آزادی" کہا جاتا ہے، دوسرے لفظوں میں وہ اپنے طور پر خدا کے لیے کسی بھی ارادے سے آزاد ہو جاتا ہے، بلکہ خدا کسی کے لیے جو کچھ بھی چاہتا ہے، چاہے وہ قربت کے لیے ہو یا دوری کے لیے، وہ اس سے مطمئن ہو جاتا ہے اور اس کی نیت فنا ہو جاتی ہے (*فنا*) خدا کی نیت میں۔ ایسا شخص دو مرتبہ آزاد ہو جاتا ہے: پہلی بار اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے آزاد ہو جاتا ہے اور دوسری بار اپنے نفس سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اس وقت انسان اپنے نچلے نفس کے لحاظ سے معدوم ہو جاتا ہے اور اپنے رب کے حوالے سے زندہ رہتا ہے ، یعنی جب وہ حرکت کرتا ہے تو حرکت کرتا ہے اور جب وہ اسے ساکت کر دیتا ہے تو وہ ساکت رہتا ہے۔ اگر وہ کسی کو مصیبت سے دوچار کرتا ہے تو وہ اس سے مطمئن رہتا ہے کیونکہ اس میں کسی چیز کی تلاش ، خواہش ، درخواست ، التجا یا اعتراض کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی ہے ، بلکہ وہ خدا کے سامنے بن جاتا ہے ، جیسے نہانے والے کے ہاتھ پر مردہ لاش (تدفین سے پہلے لاشوں کو دھونے کی رسم ادا کرنے کا ذمہ دار)۔ یہ اللہ تعالیٰ کی بندش میں سچائی کی شدت ہے۔ سچائی وہ ہے جس کا وجود رب کے لیے ہے نہ کہ اس کے نچلے نفس کے لیے۔ یہ خدا کے دوستوں اور مقربوں کا درجہ ہے اور خدا کے سوا کسی اور سے نجات اللہ کے دوستوں اور مقربوں میں شامل ہے، اس کے بعد خدا کی بندش حاصل ہوتی ہے۔ اس درجے سے پہلے کسی کو *صادق* (سچا یا سچائی سے وابستہ) نہیں کہا جا سکتا۔

سچائی کی دوسری ڈگری نیت اور ارادے میں ہے: ارادے اور ارادے کی سچائی کا بنیادی نکتہ خلوص ہے۔ دوسرے لفظوں میں، بندہ (خدا کا) صرف ہر عمل اور ہر حرکت یا خاموشی میں خدا کی نیت رکھتا ہے۔ اگر نفس نفس کی لذتیں اس کے ساتھ مل جائیں تو نیت کی سچائی باطل ہو جائے گی اور ایسے شخص کو جھوٹا کہا جا سکتا ہے، جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاص کے بارے میں ایک نبی روایت میں بیان کیا گیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ قیامت کے دن کسی عالم سے پوچھا جائے گا کہ کیا اس نے اپنے علم کے مطابق کام کیا ہے جس کے بارے میں عالم بے شمار حوالہ دے گا وہ کام جو کسی نے انجام دیئے تھے۔ اللہ تعالیٰ اس پر فرمائے گا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو بلکہ تم چاہتے ہو کہ لوگ تمہیں عالم کہیں گے۔ یہاں عالم کے اعمال کی تردید یا تردید نہیں کی گئی بلکہ کسی کی نیت کی تردید کی گئی ہے [کیونکہ یہ محض خدا کی خاطر نہیں تھا]۔ ایک گنوسٹک نے کہا کہ نیت میں وحدت الٰہی کی صحت (مکمل حضور) [اس لحاظ سے کہ یہ خالص خدا کی خاطر ہے نہ کہ کسی دنیاوی یا خفیہ خود غرضی کے لیے] سچائی ہے۔ سچائی کے ایک معنی کا نتیجہ یہ ہے کہ نیت خالص ہونی چاہیے اور وہ ہی خلوص ہے۔ ایک سچا شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ مخلص ہو۔

سچائی کا تیسرا درجہ عزم میں ہے: بعض اوقات کسی چیز کے لیے عزم ہو جاتا ہے اور (مثال کے طور پر) دل میں کہتا ہے، "اگر خدا مجھے دولت عطا کرے تو میں وہ سب کچھ صدقہ میں دوں گا یا اس کا آدھا حصہ اللہ کی راہ میں خرچ کر دوں گا۔ اگر اللہ تعالیٰ مجھے اختیار دے گا تو میں اپنی ذمہ داریوں کو انصاف اور انصاف کے ساتھ ادا کروں گا اور ظلم و ستم کر کے یا مخلوقات کے ساتھ غیر منصفانہ اور جانبدارانہ رویہ اختیار کر کے خدا کی نافرمانی نہیں کروں گا۔ صدق *فی الانیمہ* میں سچائی ایک شخص میں عزم میں مضبوط ہوتی ہے اور نیت میں پختہ ہوتی ہے۔ جب ہم ان معانی میں "سچ" کہتے ہیں تو اس سے مراد وہ شخص ہے جس کا عزم نیکی سے متعلق معاملات میں مکمل اور مضبوط ہو اور اس میں کوئی انحراف یا کمزوری یا ہچکچاہٹ نہ ہو۔

سچائی کا چوتھا درجہ، عزم کی تکمیل میں ہے: بعض اوقات انسان اس لیے فیصلہ کرتا ہے کہ اس کے لیے زیادہ محنت نہیں کرتی، لیکن جب اس عزم کے مطابق عمل کرنے کا وقت آتا ہے اور اس پر عمل کرنے کی صلاحیت بھی ہوتی ہے تو نفس کی خواہشات کو تقویت مل جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے تمام عزائم کو ایک طرف رکھ دیا گیا۔ یہ صورت حال عزم کی تکمیل میں سچائی کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

رِجَالٌ صَدَقُوا۟ مَا عَـٰهَدُوا۟ ٱللَّهَ عَلَيْهِ ۖ فَمِنْهُم مَّن قَضَىٰ نَحْبَهُۥ وَمِنْهُم مَّن يَنتَظِرُ ۖ

"کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے عہد کیا اور اسے پورا کیا اور وہ اس میں سچے تھے۔ پھر ان میں سے ایسے بھی ہیں جنہوں نے اپنی منتیں پوری کر لی ہیں اور بعض ایسے ہیں جو ان کی پورائی کے منتظر ہیں۔ (سورۃ البقرۃ باب ۳۳، آیت ۲۳)

کچھ اور بھی ہیں جنہوں نے خدا کے ساتھ اپنے عہد کی خلاف ورزی کی اور ان کے بارے میں مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی:

وَمِنْهُم مَّنْ عَـٰهَدَ ٱللَّهَ لَئِنْ ءَاتَىٰنَا مِن فَضْلِهِۦ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُونَنَّ مِنَ ٱلصَّـٰلِحِينَ ﴿٧٥﴾

فَلَمَّآ ءَاتَىٰهُم مِّن فَضْلِهِۦ بَخِلُواْ بِهِۦ وَتَوَلَّواْ وَّهُم مُّعْرِضُونَ ﴿٧٦﴾

فَأَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِى قُلُوبِهِمْ إِلَىٰ يَوْمِ يَلْقَوْنَهُۥ بِمَآ أَخْلَفُواْ ٱللَّهَ مَا وَعَدُوهُ وَبِمَا كَانُواْ يَكْذِبُونَ ﴿٧٧﴾

"ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو اللہ سے قسم کھاتے ہیں کہ اگر اللہ انہیں اپنے فضل سے بہت کچھ دے تو وہ صدقہ و خیرات کریں گے اور بہت سے نیک کام کریں گے۔" پھر جب اللہ نے انہیں اپنا فضل عطا کیا تو اس میں بخل کرنے لگے اور وہ اس کے خلاف گمراہی کرنے کے عادی ہو گئے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے عذاب کے طور پر ان کے دلوں میں نفاق قائم کر دیا جو اس دن تک قائم رہے گا جب تک کہ انہوں نے اللہ کے ساتھ اپنے عہد کی خلاف ورزی کی اور اس لیے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔ (سورة البقرة القرآن آیت 9 آیت 75-77)

یہاں عزم کو عہد کے طور پر، عہد کی خلاف ورزی کو جھوٹ بولنے کے طور پر، اور عہد کی تکمیل کو سچائی کے طور پر سمجھا گیا ہے۔ یہ سچائی تیسری درجے کی سچائی سے زیادہ مضبوط ہے کیونکہ بعض اوقات نفس نفس کا عزم کرتا ہے لیکن جب عمل کرنے کا وقت آتا ہے تو خواہشات کی ہلچل اور ان کے وسائل کی دستیابی انسان کو عزم کی تکمیل اور اس پر عمل کرنے سے روکتی ہے۔ ابو سعید ہزاز رحمۃ اللہ علیہ نے خواب میں دیکھا کہ دو فرشتے آسمان سے اترتے ہیں اور اس سے پوچھتے ہیں کہ صداقت کیا ہے؟ اس نے جواب دیا، "اپنے عہد کو پورا کرنا سچائی ہے"۔ فرشتوں نے اس بات کا پتہ لگایا اور واپس آسمان پر چڑھ گئے۔

سچائی کی پانچویں ڈگری اعمال اور اعمال میں ہے: اعمال (یا اعمال) میں سچائی یہ ہے کہ انسان مسلسل ایسی صورتحال سے بچنے کی کوشش کر رہا ہے جہاں کسی کے بیرونی اعمال [جھوٹے طور پر] کسی ایسی چیز کے حق میں دلیل نہیں دیتے ہیں جو کسی کے باطن میں بھی موجود ہے۔ اعمال میں سچائی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اعمال (یا اعمال) کو ترک کر دیا جائے [جو کچھ ظاہر ہوتا ہے اس میں منافقت کے خوف کی وجہ سے] بلکہ اس کا باطنی وجود ایسا ہونا چاہیے کہ وہ ظہیر کو معلوم کرے۔ ایک ظاہری شخص وہ ہے جو چاہتا ہے کہ لوگ کسی کو قابل تعریف داخلی خصوصیات سے نوازا جائے جس کی بنیاد پر اس کے [ظاہری] اعمال ظاہر ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگ جو نماز پڑھتے ہیں، وہ اپنی نمازوں میں عاجزی کا ظہور اختیار کرتے ہیں، حالانکہ ان کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ لوگ ان کو دیکھیں، لیکن ان کے دل نماز کے دوران خدا سے غافل رہتے ہیں۔ ان کا مشاہدہ کرنے والا شخص یہ سمجھتا ہے کہ وہ خدا کے سامنے عاجزی اور فرمانبرداری کی حالت میں کھڑا ہے، اگرچہ وہ اپنے باطن میں بازار میں کھڑا ہے اور غرق ہو رہا ہے۔ اعمال اور اعمال ، ان کی وجود کی حالتوں سے ، ان کے باطنی وجود کی [ادراک] حالت کی عکاسی کرتے ہیں ، لیکن حقیقت میں ، یہ ان کے باطنی وجود کی [حقیقی] حالت نہیں ہے۔ چنانچہ وہ جھوٹ میں ڈوبے ہوئے ہیں اور ان سے اعمال میں سچائی کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ کچھ لوگ بڑے شائستگی ، سکون اور وقار کے ساتھ چلتے ہیں ، حالانکہ ان کے اندرونی وجود میں نہ تو شائستگی ہے اور نہ ہی سکون۔ یہ لوگ بھی اپنے اعمال میں سچے نہیں ہیں، حالانکہ وہ نہ تو مخلوقات کی طرف مائل ہیں اور نہ ہی دکھاوا کرنے والے اپنے مقصد کا مظاہرہ کرتے ہیں۔
صرف وہی شخص اعمال کے باطل سے محفوظ رہ سکتا ہے جس کی باطن اور خارجی ہستی ایک جیسی ہو یا جس کا باطنی وجود بیرونی وجود سے بہتر ہو۔ اس خوف کی وجہ سے بعض لوگ اپنی ظاہری شکل کو برا اور کپڑوں کو دھول آلود رکھتے ہیں تاکہ کوئی بھی اپنی ظاہری شکل کو اپنے باطنی وجود کی بھلائی کے لیے دلیل نہ دے سکے۔
اگر باطنی وجود ان کی ظاہری شکل کے مطابق اچھا نہیں ہے اور لوگ ان کے بارے میں اچھا سوچتے ہیں تو یہ جھوٹ ہوگا۔ اگر بیرونی وجود جان بوجھ کر باطن کے مخالف ہے [تاکہ کوئی شخص اپنی ناپسندیدہ باطنی حقیقت کے خلاف باہر سے اچھا نظر آئے گا] تو اسے دکھاوا کہا جائے گا جو اخلاص کو ختم کر دے گا، اور اگر غیر ارادی طور

پر ایسا کرنے کا معاملہ ہے تو سچائی ختم ہو جاتی ہے۔ سچائی یہ ہے کہ بیرونی اور باطنی مخلوق ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگی اور ہم آہنگی میں ہیں۔ اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ ظاہری اور باطن کے درمیان یہ ہم آہنگی بھی سچائی کی ایک قسم ہے۔

سچائی کی چھٹی ڈگری روحانی اسٹیشنوں میں ہے: یہ سچائی کی ایک انتہائی اعلی اور نایاب ڈگری ہے۔ اس کا تعلق راہ الٰہی کے روحانی مقامات سے ہے جیسے خوف اور امید، تقدیس الٰہ، پرہیزگاری، رضا الٰہی کو قبول کرنا، خدا پر توکل کرنا، خدا سے محبت وغیرہ۔ جب لوگوں کے اندر سچائی کے کچھ عناصر موجود ہوں اور جب یہ عناصر (ان روحانی مقاموں کی حقیقتوں کے حصول کی صورت میں) ظاہر ہو جائیں تو پھر یہ اصطلاح (روحانی حالتوں میں سچائی) ان پر لاگو ہوتی ہے۔ ان عناصر کے علاوہ [ان روحانی مراکز میں سچائی کے کچھ مضمرات اور حقیقتیں] ہیں۔ جو شخص ان معاملات کی حقیقتوں تک پہنچتا ہے وہ ایک مکمل سچا شخص ہے۔ جب کوئی چیز کسی میں غالب ہو جاتی ہے اور اس کی حقیقت ایک میں کامل ہو جاتی ہے تو جس کو اس سے نوازا جاتا ہے اسے سچا کہا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر کہا جاتا ہے کہ فلاں روحانی جدوجہد میں سچا ہے، یعنی روحانی جدوجہد ایک میں غالب ہے۔ یا کہا جاتا ہے کہ فلاں خدا کے خوف میں سچا ہے، دوسرے لفظوں میں خدا کی حقیقت ایک میں کامل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَّيْسَ ٱلْبِرَّ أَن تُوَلُّوا۟ وُجُوهَكُمْ قِبَلَ ٱلْمَشْرِقِ وَٱلْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ ٱلْبِرَّ مَنْ ءَامَنَ بِٱللَّهِ وَٱلْيَوْمِ ٱلْءَاخِرِ وَٱلْمَلَٰٓئِكَةِ وَٱلْكِتَٰبِ وَٱلنَّبِيِّۦنَ وَءَاتَى

ٱلْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِۦ ذَوِى ٱلْقُرْبَىٰ وَٱلْيَتَٰمَىٰ وَٱلْمَسَٰكِينَ وَٱبْنَ ٱلسَّبِيلِ وَٱلسَّآئِلِينَ وَفِى ٱلرِّقَابِ وَأَقَامَ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتَى ٱلزَّكَوٰةَ وَٱلْمُوفُونَ

بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَٰهَدُوا۟ ۖ وَٱلصَّٰبِرِينَ فِى ٱلْبَأْسَآءِ وَٱلضَّرَّآءِ وَحِينَ ٱلْبَأْسِ ۗ أُو۟لَٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ صَدَقُوا۟ ۖ

"راستبازی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اپنا چہرہ مشرق یا مغرب کی طرف موڑ دیں۔ بلکہ صداقت یہ ہے کہ وہ خدا پر اور قیامت کے دن اور فرشتوں پر اور کتابوں اور رسولوں پر یقین کرے اور رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کو (جو اپنے مال اور مال سے دور ہیں) کے لیے (سفر کی وجہ سے) محتاج ہو جاتے ہیں۔ (جنہیں تم ضرورت کی وجہ سے مدد مانگتے ہو) قیدیوں کو آزاد کر دیتے ہیں [ان لوگوں کو جن پر انہوں نے ظلم کیا ہے ان کو اس شرط پر کہ وہ برائی کو چھوڑ دیں گے اور اس وقت سے نیک زندگی گزاریں گے]، اور وہ بھی نماز پڑھتا ہے، زکوٰۃ ادا کرتا ہے اور اپنے عہد کو پورا کرتا ہے، حلف ، وعدے) جب عہد کیے جاتے ہیں۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جو مفلسی اور بیماری اور جنگ میں صبر کرتے ہیں یہی لوگ سچے ہیں۔" (سورة البقرة باب 2 آیت 177)

سچے کی ڈگریاں: اس پوری وضاحت کا نتیجہ یہ ہے کہ ان [مختلف] روحانی اسٹیشنوں میں سچائی کی بے شمار درجات موجود ہیں۔ بعض اوقات بندے کے پاس بعض معاملات میں سچائی ہوتی ہے لیکن بعض معاملات میں نہیں۔ اگر کوئی شخص تمام معاملات میں سچا ہے تو وہ شخص حقیقت میں سچا ہے۔ احادیث میں منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی کی کہ جب میں اپنے کسی بندے کو اپنا محبوب بناتا ہوں تو اس پر ایسی مصیبتیں اور مصیبتیں بھیجتا ہوں کہ اگر وہ پہاڑوں پر بھیجے جائیں تو وہ ان کو برداشت نہ کر سکتے۔ پھر میں دیکھتا ہوں کہ کس طرح کوئی میری مصیبتوں پر سچائی اختیار کرتا ہے۔ اگر کوئی صبر کرتا ہے تو میں اسے اپنا دوست اور محبوب بناتا ہوں اور اگر کوئی زور دار ہنگامہ مچاتا ہے اور میرے بارے میں مخلوقات سے شکایت کرتا ہے تو میں

کسی کو رسوا کرتا ہوں اور ایسے کی پرواہ نہیں کرتا۔ سچائی کی نشانی یہ ہے کہ مصیبتیں اور اطاعت دونوں (لوگوں کی آنکھوں اور علم) سے پوشیدہ رہتے ہیں اور مخلوقات کو ان سے آگاہ ہونا برا سمجھتا ہے۔

باب 18 - تمام خامیوں ، منفی اور برائیوں کے لئے اپنے آپ کو ذمہ دار بنانے کے لئے خود کا جائزہ اور خود تشخیص

اپنے اعمال پر ایمانداری اور معروضی طور پر غور کرنا اور اپنے آپ کو اور دوسروں کے خلاف ہونے والی کسی بھی زیادتی پر اپنے آپ کو سزا دینے کے لئے اپنے اعمال پر گہری نظر ڈالنا ، خدائی رہنمائی ، انصاف ، انصاف ، اصلاح نفس اور روح کی تطہیر کے حصول کا ایک زبردست طریقہ ہے ، جو انسان کے بنیادی حصے کے کمال کی روحانی راہ میں ترقی کے لئے ناگزیر ہیں۔ ایک غیر جانچ شدہ زندگی خود کو ایک ہی غلطیوں اور برے کاموں کو بار بار دہراتے ہوئے دیکھتی ہے۔ دوسری طرف ، اپنی خامیوں ، خامیوں ، غلطیوں اور بد اعمالوں کو تلاش کرنے کے لئے تنقیدی خود جائزہ لینے سے پہلے اپنے لئے اور پھر ساتھی انسانوں کے لئے چیزوں کو بہتر بنانے کا راستہ ہے۔ یہ باہمی تعلقات میں اصلاحات اور استحکام پیدا کرتا ہے، اور عوام اور قوموں کے درمیان ہم آہنگی اور امن کو فروغ دیتا ہے۔ انسان جس سکون کی تلاش کرتا ہے وہ اندر سے شروع ہوتا ہے اور خود تشخیص اس کا آغاز اپنے اندر سے ہوتا ہے۔ خود کا جائزہ لینا اور اپنے آپ کو کام پر لے جانا سچائی کی راہ پر چلنے والے روحانی مسافروں کے لیے اہم خصوصیات ہیں اور ذاتی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر اصلاح کے لیے ناگزیر ہتھیار ہیں۔ غزالی نے چوتھی جلد کے آٹھویں باب یا کتاب میں اپنی *عظیم تصنیف "احیٰ العلوم الدین"* یا "خدا کی راہ کی معرفت احیاء" میں اس موضوع کی بصیرت انگیز وضاحت پیش کی ہے۔ یہ یہاں مختصر شکل میں اس طرح پیش کیا گیا ہے [24]:

خود احتسابی (*مراقبہ*) اور خود شناسی کی وضاحت (*محاصبہ*)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَنَضَعُ ٱلْمَوَٰزِينَ ٱلْقِسْطَ لِيَوْمِ ٱلْقِيَٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ۖ وَإِن كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ أَتَيْنَا بِهَا ۗ وَكَفَىٰ بِنَا حَٰسِبِينَ

"قیامت کے دن ترازو قائم کر دیا جائے گا تاکہ کسی کے ساتھ ظلم نہ ہو۔ اور اگر کسی کا کام سرسوں کے دانے کے برابر ہو تو ہم اسے وہاں پیش کریں گے تاکہ دنیا کی زندگی میں اس کی نیکی جمع کی گئی برائیوں سے زیادہ ہو یا اس

کے برعکس، اور ہم ہر ایک کو حساب دینے کے لیے کافی ہیں (ان کے اعمال یا برائیوں کے لیے کہ ان کے اعمال کا بدلہ ان کے مطابق عدل و انصاف کے ساتھ پورا اجر دیں]۔ (سورة البقرة القرآن باب 21 / آیت 47)

وَوُضِعَ ٱلْكِتَٰبُ فَتَرَى ٱلْمُجْرِمِينَ مُشْفِقِينَ مِمَّا فِيهِ وَيَقُولُونَ يَٰوَيْلَتَنَا

مَالِ هَٰذَا ٱلْكِتَٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّآ أَحْصَىٰهَا ۚ

وَوَجَدُوا۟ مَا عَمِلُوا۟ حَاضِرًا ۗ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَدًا

"جب اعمال کا دفتر (جو عمر کو پہنچنے کے بعد ہر ایک کے لیے جمع کیا جاتا ہے) کے سامنے رکھا جائے گا تو آپ مجرموں کو دیکھیں گے کہ اس میں جو کچھ لکھا ہے اس سے ڈرتے ہیں اور کہیں گے: افسوس ہمارے ہاں! اعمال کا یہ نامہ اس قدر عجیب ہے کہ اس میں کسی چیز کو لکھنے سے نہیں بخشا گا، چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا گناہ اور جو کچھ انہوں نے [اپنی دنیاوی زندگی میں] کیا وہ اس میں موجود پائیں گے اور تیرا رب کسی پر ظلم نہیں کرے گا اور نہ کسی پر ظلم کرے گا۔ (سورة البقرة القرآن آیت نمبر 49)

يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ ٱللَّهُ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُهُم بِمَا عَمِلُوٓا۟ ۚ أَحْصَىٰهُ ٱللَّهُ وَنَسُوهُ ۚ وَٱللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ شَهِيدٌ

"جس دن اللہ سب کو زندہ کرے گا پھر ان کو بتائے گا جو کچھ وہ کیا کرتے تھے۔" اللہ تعالیٰ نے ان سب چیزوں کو محفوظ رکھا ہے جنہیں یہ لوگ بھول گئے ہیں۔ اور اللہ ہر چیز پر گواہ ہے [اچھا ہو یا برا، جو دنیا میں خفیہ یا کھلم کھلا کیا جاتا ہے]۔ (سورة البقرة القرآن، باب ۵۸، آیت ۶)

يَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ ٱلنَّاسُ أَشْتَاتًا لِّيُرَوْا۟ أَعْمَٰلَهُمْ ﴿٦﴾

فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُۥ ﴿٧﴾

وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُۥ ﴿٨﴾

"اس دن لوگ گروہ گروہ ہو کر لوٹیں گے تاکہ سب اپنے اعمال کو دیکھیں گے۔ چنانچہ جس نے نیکی کا ذرہ کیا ہو وہ اسے دیکھے گا اور جس نے ذرہ برائی کا کام کیا ہے وہ بھی اسے دیکھے گا [لہٰذا اس دنیا میں کسی کو نیکی یا برائی کو معمولی نہیں سمجھنا چاہیے اور اسے کوئی نتیجہ نہیں سمجھنا چاہیے، کیونکہ ہر کام کے نتائج مختلف درجات کے ہوتے ہیں جو فوری طور پر ظاہر نہیں ہو سکتے]۔ (سورة البقرة سورة البقرة آیت نمبر (۹)

ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ

"پھر ہر ایک کو اپنے اعمال کا پورا بدلہ دیا جائے گا، اور اس میں انہیں کسی قسم کی ناانصافی یا ناانصافی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔" (سورة البقرة باب 2 آیت 281)

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا وَمَا عَمِلَتْ مِن سُوٓءٍ تَوَدُّ لَوْ

أَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهُۥٓ أَمَدًۢا بَعِيدًا ۗ وَيُحَذِّرُكُمُ ٱللَّهُ نَفْسَهُۥ ۗ

"اس دن ہر شخص اپنے سامنے کیے گئے نیک اعمال اور برے اعمال کو بھی پائے گا اور اپنے اور اس دن کے درمیان بہت زیادہ فاصلہ رکھنا چاہتا ہے۔ اور اللہ تمہیں اپنے ذات سے ڈرتا ہے تاکہ تم اپنے اور دوسروں کے لیے ہر قسم کے ظلم سے باز آؤ۔ (سورة البقرة سورة 30)

وَٱعْلَمُوٓا۟ أَنَّ ٱللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِىٓ أَنفُسِكُمْ فَٱحْذَرُوهُ

"اور جان لو کہ اللہ جانتا ہے جو تمہارے دلوں میں چھپی ہوئی ہے، پس اس سے ڈرو (اور اس کے علم سے جو تمہارے دلوں میں چھپی ہوئی ہے اور وہ تمہیں روکنے اور ان پر الزام ڈالنے کی صلاحیت رکھتا ہے]۔ (سورة البقرة باب 2، آیت 235)

ان نیک آیات کی روشنی میں اہل بصیرت نے یہ جان لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں (انسانوں) پر ہر وقت نگہبان ہے اور ان کے اعمال کا حساب کتاب کیا جائے گا اور ان سے ہر چھوٹی سی چیز کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ان خطرات سے نجات کا واحد راستہ یہ ہے کہ نفس کا مسلسل احتساب کیا جائے اور اس کے اعمال پر سچائی سے نظر رکھی جائے اور ادنیٰ نفس کو ہر سانس اور ہر حرکت کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص (قیامت کے دن) کے سامنے نچلے نفس کا احتساب کر سکتا ہے تو قیامت کے حساب کتاب میں کمی آئے گی اور ہر سوال کا جواب پہلے سے ہی اس کے ذہن میں موجود ہو جائے گا اور اس کا آخری انجام بہترین ہو گا۔ جو شخص نفس کو جوابدہ نہیں ٹھہراتا ہے وہ ہمیشہ پچھتاوے میں پھنس جاتا ہے اور قیامت کے دن اس کی احتساب کا عرصہ طویل ہو جائے گا اور وہ اپنے گناہوں کی ذلت میں ڈوب جائے گا اور غضب الٰہی کو حاصل کر لے گا۔ باطنی بصیرت رکھنے والے جانتے ہیں کہ قیامت کی رسوائی سے بچنے کا واحد راستہ ہر اس معاملے میں اطاعت ہے جس کی اس نے اطاعت کا حکم دیا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے صبر اور چوکسی کا حکم دیا ہے۔

انہوں نے (باطنی بصیرت رکھنے والے) اپنے نچلے نفس کی نگرانی کی ہے اور اس کے بعد اس کی حالتوں پر [سختی] نظر رکھی ہے، پھر انہوں نے اس کا احتساب کیا ہے، پھر اسے [اس کے غلط کاموں کے لیے] سزا دی، پھر روحانی طور پر [اس کی اصلاح و تطہیر، تطہیر اور خدائی کی حضوری میں معراج کے لیے] کوشش کی ہے، پھر اس سے سختی سے نمٹا ہے۔ لہٰذا ، وہ چوکسی کے چھ اسٹیشنوں (خود احتسابی اور خود تشخیص) سے گزرے۔ آئیے ان چھ اسٹیشنوں کی وضاحت کریں اور اس چوکسی کی حقیقت اور فضیلت کی وضاحت کریں ، اور اس کے ہونے کے لئے ضروری اقدامات کی وضاحت کریں۔ ان تمام مقامات کی ابتدا نفس نفس ہے جو نفس کو اس کی حالتوں کے تابع کرنے اور اس کی حالت کی نگرانی کے تابع کرنے کے بعد حاصل ہوتی ہے اور اگر احتساب سے نقصان (پادری نفس کی زیادتی یا زیادتی اور اس کے نتیجے میں انسان کی روحانی زندگی، راہ الٰہی اور خدا کے سامنے کھڑے ہونے والے نقصانات) کا انکشاف ہوتا ہے تو اسے ناراضگی اور سزا کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ رہنمائی، تطہیر اور اندرونی روشنی]۔

اس پر نچلے نفس کی جانچ پڑتال کا پہلا اسٹیشن: جو لوگ کاروبار و تجارت میں مصروف ہیں اور کاروباری سامان میں شراکت دار ہیں، ان کا مقصد منافع کے سوا کچھ نہیں ہے۔ جس طرح ایک تاجر اپنے کاروباری ساتھی سے پہلے کاروبار کرنے کے لیے کاروبار کے حوالے کر کے اپنے ساتھی سے مدد لیتا ہے، پھر حساب کتاب کرتا ہے، اسی طرح عقل آخرت کا تاجر ہے اور اس کا مقصد جسے نفع کہا جا سکتا ہے، روح کی تطہیر ہے کیونکہ اس کی نجات اور کامیابی کا دارومدار اسی پر ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّىٰهَا ﴿٩﴾

وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّىٰهَا ﴿١٠﴾

"بیشک جس نے اسے پاک کیا اور مایوس ہونے والا نقصان وہ ہے جس نے اسے تباہ کر دیا (گناہوں اور برائیوں اور برائیوں اور اور ہر قسم کی منفی باتوں سے)۔ (سورۃ البقرۃ باب 91، آیہ 9-10)

نفس کامیاب ہو جاتا ہے اور نیک اعمال کے ذریعے نجات حاصل کرتا ہے اور عقل اس کاروبار میں نفس سے مدد لیتا ہے، اسے استعمال کرتا ہے اور اسے ان کاموں کے لیے محکوم کرتا ہے جن پر اس کی تطہیر کا دارومدار ہوتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے ایک تاجر اپنے کاروباری شراکت دار سے مدد لیتا ہے جو کاروباری لین دین کا ذمہ دار ہوتا ہے، اور بالکل اسی طرح جیسے کاروباری شراکت دار جو منافع کی خواہش سے پہلے کچھ شرائط عائد کرنا چاہتا ہے، پھر اس پر نظر رکھتا ہے، پھر اس کا حساب کتاب کرتا ہے، پھر اگر کسی کو اکاؤنٹنگ میں کوئی تضاد یا بے ایمانی نظر آتی ہے تو اس کا جواب دیتا ہے۔ اسی طرح عقل نفس سے انہی چار باتوں کو تلاش کرتی ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ عقل اس پر کچھ شرائط اور ذمہ داریاں مقرر کرے، اسے کامیابی کا راستہ دکھائے، اور اسے ہدایت کرے کہ وہ اس راستے سے انحراف نہ کرے اور اس پر استقامت کے ساتھ چلتا رہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ کسی کو کسی بھی وقت اس (نفس) پر نظر رکھنے میں کوتاہی نہیں کرنی چاہیے کیونکہ اگر اس کے ساتھ ذرا سی بھی غفلت کی جائے تو وہ بے ایمانی کا ارتکاب کرے گا اور اس سے اصل سرمایہ بھی ضائع ہو جائے گا۔ نفس ایک بے ایمان ملازم کی طرح ہے جسے کاروباری سامان سونپا گیا ہے جو سامان کے ساتھ تنہا ہونے پر خود کو بے ایمانی سے باز نہیں رکھتا ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ نفس کو احتساب کے تابع کیا جانا چاہیے کہ آیا اس نے اس پر مقرر کردہ تمام شرائط پوری کی ہیں یا نہیں۔ یہ ایک ایسی تجارت ہے جس کا نفع جنت اور انبیاء علیہم السلام کی رفاقت کی صورت میں *سدرۃ المنتہ* (خدا کے سامنے روحانی معراج کا سب سے اونچا مقام جہاں انسان کبھی پہنچ سکتا ہے) کی صورت میں ملے گا۔ اس تجارت کا حساب کتاب (جوابدہی) تمام باریک بینی کی تفصیلات کو دیکھ کر احتیاط سے کیا جانا چاہیے، اور اس کے منافع پر نظر رکھنی چاہیے جو کوئی دنیاوی منافع کے لیے کرتا ہے اس سے زیادہ اس پر نظر رکھنی چاہیے کیونکہ اس کے مقابلے میں دنیاوی منافع بہت معمولی ہے۔ مزید برآں، دنیاوی منافع، چاہے وہ کتنا ہی کیوں نہ ہو، باقی نہیں رہتا۔ نیکی میں کیا نیکی ہے جو دائمی نہ ہو؟

لہٰذا ہر شخص جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی ذات کا احتساب کرے اور اس کی ہر حرکت، میلان، خیالات اور لذتوں میں سختی سے کام لے کیونکہ انسانی زندگی کا ہر سانس ایک ایسا قیمتی زیور ہے جس کا کوئی ثانی نہیں ہے اور اس کے ساتھ کوئی متبادل نہیں ہے۔ کوئی بھی ایسا انمول خزانہ خرید سکتا ہے جو کبھی ابدیت تک ختم نہیں ہوگا۔ ان قیمتی سانسوں (لمحات) کو ضائع کرنا یا انہیں تباہ کن کاموں میں استعمال کرنا ایک ایسا بڑا نقصان ہے جسے کوئی بھی ذہین شخص برداشت نہیں کر سکتا۔ صبح کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے بعد ہر صبح ایک لمحہ گزارنے کے لئے تنہائی اختیار کرنی چاہئے ، اپنے آپ پر شرائط طے کرنا چاہئے ، بالکل اسی طرح جیسے کاروباری شخص کاروباری سامان سونپنے سے پہلے شرائط طے کرنے کے لئے اپنے کاروباری ساتھی سے ملتا ہے۔ اس ملاقات میں عقل نفس کو بتائے کہ میرے پاس اپنی زندگی کے سوا کوئی سرمایہ نہیں ہے، اگر وہ ضائع ہو گیا تو میں سب کچھ کھو دوں گا اور میں بے سہارا اور محروم رہوں گا اور کاروبار کرنے اور منافع کمانے کی کوئی امید باقی نہیں رہے گی۔ آج ایک نیا دن ہے، اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک بار پھر موقع دیا ہے اور میری زندگی میں مزید وقت دیا ہے اور اس لیے مجھے بڑا اجر عطا فرمایا۔ اگر میں مر جاتا تو میری خواہش ہوتی کہ میں ایک اور دن کے لیے دنیا میں واپس آ جاؤں تاکہ جب میں [دنیا میں] واپس آؤں تو میں نیک کام کر سکوں [اور اپنے برائیوں کا ازالہ کر سکوں]۔ پس تو اپنے آپ کو مردہ سمجھنا چاہیے اور اس کو دنیا میں واپس بھیج دیا گیا ہے۔ ہوشیار! اور اس دن کو ضائع نہ ہونے دو ہر سانس [جو میں لیتا ہوں] ایک ایسا خوبصورت زیور ہے جو انمول ہے! اے نفس! آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ دن اور رات میں چوبیس لمحے ہوتے ہیں اور ایک نبی روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک دن اور رات میں چوبیس خزانے بچھائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک خزانہ کسی کے سامنے کھول دیا جاتا ہے اور وہ اس خزانے کو اپنے نیک اعمال کی روشن روشنیوں سے بھرا ہوا دیکھتا ہے جو اس لمحے میں کیا گیا تھا۔ ان روشنیوں کی گواہی، جو خود مختار حاکم (خدا) کے قربت کے ذریعہ ہیں، انسان کو بے پناہ خوشی سے بھر دیتی ہے۔ پھر ایک تاریک خزانہ کھولا جاتا ہے جس میں بدبو اور شدید اندھیرا ہوتا ہے۔ یہ اس لمحے کا خزانہ ہے جس میں کوئی گناہ کرتا ہے اور وہ اس خزانے کو دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ پھر ایک اور خزانہ کھول

دیا جاتا ہے جس میں کوئی سوتا ہے یا غفلت کرتا ہے یا دنیاوی مصروفیات میں مصروف ہوتا ہے۔ اس خزانے کو خالی دیکھ کر پچھتاوا اور محرومی محسوس ہوتی ہے اور اسے اتنا پچھتاوا ہوتا ہے جیسے کسی بڑے کاروبار میں بہت بڑا نقصان اٹھایا گیا ہو، حالانکہ اگر کوئی چاہتا تو نقصان سے بچا جا سکتا تھا۔ انسان کی زندگی کے لمحات کے یہ خزانے اس کی پوری زندگی کے دوران کھل جاتے ہیں، اس لیے انسان کو اپنے نفس سے کہنا چاہیے کہ آج کے خزانوں کو بھرنے کی کوشش کرو اور انہیں نیک اعمال کے قیمتی جواہرات سے محروم نہ رکھو جو تمہاری ابدی سلطنت کا ذریعہ ہیں۔ سستی ، سستی اور سکون کی تلاش کو پیچھے چھوڑ دیں اور آپ کی سلطنت آپ سے چھین کر کسی اور کے حوالے نہ ہونے دیں اور آپ کو صرف پچھتاوا چھوڑ دیا جائے۔ یہاں تک کہ اگر تم جنت کو حاصل کرو تو سستی کی وجہ سے آپ کو جو نقصان اٹھانا پڑے گا وہ آپ کو سکون حاصل نہیں کرے گا اگرچہ یہ بے چینی جہنم کی بے چینی سے کم ہو۔ ایک گنوسٹک نے کہا، "ہم قبول کرتے ہیں کہ گناہوں کو معاف کیا جا سکتا ہے لیکن [پھر بھی] کوئی شخص [گناہوں کی معافی کے بعد بھی] راستبازوں کے [بلند روحانی درجات اور] درجات حاصل نہیں کرے گا"۔

یہ نفس کو مشورہ تھا کہ وقت کو [مفید کوششوں میں دانشمندی سے] استعمال کیا جائے۔ اس کے بعد اس کے بارے میں نصیحت کی جائے کہ وہ ساتوں اعضاء یعنی آنکھیں، کان، زبان، پیٹ، شرم اعضاء، ہاتھ اور پاؤں ہیں۔ ان اعضاء کا کنٹرول نفس کے حوالے کر دیا جائے اور اس سے کہنا چاہیے کہ یہ اعضاء تمہاری رعایا ہیں اور وہ اس تجارت میں تمہارے خادم ہیں اور اس تجارت کا انجام ان کے تعاون سے ہو گا۔ جہنم کے سات دروازے ہیں اور ہر عضو ایک دروازے سے بندھا ہوا ہے۔ یہ دروازے اس شخص کے لیے بنائے گئے ہیں جو ان اعضاء کے ذریعے خدا کی نافرمانی کرتا ہے۔ وہ دروازے سے جہنم میں داخل ہوگا جس کا عضو اللہ کی نافرمانی کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ نفس کو نصیحت کرنی چاہیے کہ وہ ان اعضاء کو گناہوں اور غلط کاموں سے بچائے۔ مثلاً آنکھ کو یہ کہنا چاہیے کہ وہ اس چیز کو نہ دیکھے جس کی طرف دیکھنا ناجائز ہے یا غلط ہے، کسی کی پرائیوٹ کی طرف نہ دیکھے، اور نہ کسی مومن کی طرف حقارت سے دیکھے، بلکہ کسی ایسی چیز کو دیکھنے سے بچنا چاہیے جس کی ضرورت نہ ہو، اگرچہ اس کی طرف دیکھنا جائز ہو۔ کیونکہ خدا اپنے بندوں کو بیکار نگاہوں پر بھی جوابدہ رکھے گا، بالکل اسی طرح جیسے وہ بیکار باتوں کے بارے میں سوال کرے گا۔ پھر صرف ان معاملات سے آنکھیں روکنا کافی نہیں ہے بلکہ ان معاملات میں مشغول ہونا بھی ضروری ہے جو اس تجارت کے لیے مفید ہوں۔

یہ معاملات ایسے ہیں کہ ان کے لیے آنکھیں پیدا کی گئی ہیں، مثلاً خدا کی مخلوقات کو سبق حاصل کرنے کی نگاہ سے دیکھنا (ان کی تخلیق کے لیے حکمت الٰہی اور ان کی طرف کس طرح اشارہ کرتے ہیں) یا ان کی پیروی کے سلسلے میں نیک نیک کاوشوں کو دیکھنا، اللہ کی کتاب اور نبوت کی طرف دیکھنا اور ان سے فائدہ اٹھانے کے لیے حکمت کی کتابوں کا مطالعہ کرنا۔ دوسرے اعضاء کو بھی اسی طرح ان کی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا جائے اور ان معاملات سے روکنا چاہیے جو راہ الٰہی (دین) سے متعلق تجارت کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ خاص طور پر زبان اور پیٹ سے احتیاط برتنی چاہیے کیونکہ زبان فطری طور پر حرکت کرتی ہے (جو کچھ کہنا چاہتی ہے اور اکثر اس کے نتائج کی پرواہ کیے بغیر کرتی ہے] اور اس حرکت میں اس میں کوئی مشکل نہیں ہوتی۔ غیبت کرنا، پیٹھ کے پیچھے شکایت، باطن کی پاکیزگی کا دعویٰ کرنا، ساتھی مخلوقات کی مذمت، تنقید، لوگوں کو بری مرضی کرنا، دوسروں پر ظلم و ستم کی دعا کرنا، گستاخی اور فحاشی کرنا، ان تمام معاملات میں زبان کے گناہ بہت اچھے ہوتے ہیں۔ ان تمام معاملات کی وضاحت "زبان کے نقصانات کی کتاب" (باب 4) کے باب میں کی گئی ہے۔ زبان عام طور پر ان معاملات کے پیچھے دوڑتی ہے، حالانکہ اس کی تخلیق کا مقصد الہی ذکر ہے، مخلوقات کو یاد الٰہی میں مشغول ہونے کی نصیحت کرنا، تعلیمی مباحثوں میں حصہ لینا، خدا کے بندوں کو خدا کی راہ سے آگاہ کرنا اور انہیں ہدایت کا راستہ دکھانا، دو مسلمانوں کو صلح کرنا ہے جو کسی معاملے میں باہمی دشمنی رکھتے ہیں۔ اور اسی طرح کے نیک کام کرتے ہیں [اس کے ساتھ برائی، نقصان دہ اور نقصان دہ معاملات کرنے کے بجائے]۔ نفس کے لیے بھی یہی شرط ہونی چاہیے کہ وہ یاد الٰہی کے سوا کسی اور چیز پر سارا دن زبان کو حرکت نہ دے کیونکہ مومن کی گفتار الٰہی ہے اور اس کی آنکھ خدا کی نشانیوں سے سبق حاصل کرنے کا باعث ہے۔ اور ہماری روحوں کے اندر اور [مومن] کی خاموشی [خدائی] عبادت ہونی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

مَّا يَلْفِظُ مِن قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ

"جب قریب ہی کوئی تیز رفتار دیکھنے والا ہوتا ہے تو کوئی ایک لفظ بھی نہیں بولتا ہے (*کیرامان کاتیبین* یا اللہ تعالیٰ کے دو فرشتے جو بلوغت کو پہنچنے کے بعد ہر انسان کے ساتھ جاتے ہیں اور اپنے تمام قول و فعل کو اپنے اعمال کے دفتر میں درج کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں جو قیامت کے دن خدا کے سامنے پیش کیے جائیں گے تاکہ اس شخص کو زمین پر زندگی کی آزمائش میں کامیاب یا ناکام قرار دیا جائے اور اس کا بدلہ ابدی زندگی میں اس کا بدلہ دیا جائے۔ (سورۃ البقرۃ باب 50، آیت 18)

معدے کو لالچ ترک کرنے کی نصیحت کی جائے اور حلال کھانے سے کم کھانے کی تلقین کی جائے، مشکوک کھانے سے روکے، ہوس سے باز رہے، اور صرف ضرورت کی مقدار پر قناعت کی جائے۔ اس سلسلے میں نفس کو یہ دھمکی دی جا سکتی ہے کہ اگر وہ معدے کے احکامات کی خلاف ورزی کرے تو اسے معدے کی تمام خواہشوں سے روک دیا جائے گا، اس طرح حاصل ہونے والی خواہشات کو کھو دے گا اور اس سے بھی کہیں زیادہ۔ تمام اعضاء کو ایک جیسی شرائط کے ساتھ ترتیب دیا جانا چاہئے [جو ان کے لئے موزوں ہیں]۔ مختلف اعضاء کے گناہ پوشیدہ نہیں ہیں اور نہ ہی ان کی اطاعت پوشیدہ ہے۔ لہٰذا حالات آسانی سے قائم کیے جا سکتے ہیں اور ہر عضو کو گناہوں کو ترک کرنے اور نیک اعمال میں باقاعدگی کے تابع کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد نفس کو دن میں کئی بار اطاعت کے ان اعمال کی یاد دلائی جا سکتی ہے، پھر نفس کو ان عبادات کے بارے میں نصیحت کرنی چاہیے جو وہ کثرت سے کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ عبادت کے غیر معمولی کاموں کی نوعیت اور ذرائع کے بارے میں تفصیلات واضح طور پر بیان کی جانی چاہئیں۔ ان شرائط کی ہر روز ضرورت ہوتی ہے، لیکن جب انسان ان کا عادی ہو جاتا ہے اور نفس بھی ان شرائط کو پورا کرنے میں تعاون کرتا ہے تو ان شرائط کو قائم رکھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ نفس کو غفلت اور سستی سے ڈرایا جائے اور اسے سرکش کی طرح نصیحت کی جائے کیونکہ نفس فطری طور پر سرکش اور اطاعت الٰہی سے حقارت کرنے والا اور غلامی سے انحراف کرنے والا ہے۔ تاہم ، نصیحت اور نظم و ضبط اس پر موثر ہے۔ اس طرح کے حالات مسلط کرنا نفس کی پرورش اور پرورش کا ابتدائی مرحلہ ہے۔ یہ کارروائی کرنے سے پہلے احتساب کے لئے خود کو ذمہ داری کا نشانہ بنانا ہے اور بعض اوقات یہ احتساب کارروائی کے بعد کیا جاتا ہے۔ وہ تشخیص جو نفع یا نقصان کا تعین کرنے اور ان کی رقم کا تعین کرنے کے لئے کی جاتی ہے اسے احتساب (محسبہ) کہا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر خدا کا کوئی بندہ اس بات کا تعین کرنے کے لیے اپنے اعمال پر نظر رکھتا ہے کہ آیا وہ کوتاہی کر چکا ہے یا زیادتی کا ارتکاب کر چکا ہے تو اسے خود احتسابی میں شامل کیا جاتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے سامنے احتساب کرنے سے پہلے اپنے نفس کا محاسبہ کرو اور ان کے تولنے سے پہلے ان کا تولنا کرو اور قیامت کے دن دربار الٰہی میں اپنے بارے میں اس عظیم فیصلے کے لیے تیار رہو جاؤ جو تمہاری ابدی نجات یا ابدی عذاب کے حصول کے بارے میں اپنے بارے میں بڑے فیصلے کے لیے قیامت کے دن عدالت میں حاضر ہو جاؤ۔ ہر شخص کو تمام معاملات کو تولنا چاہیے اور ان پر اچھی طرح غور کرنا چاہیے [ان کے حتمی نتائج کو دیکھتے ہوئے] پھر ان پر عمل کرنا چاہیے۔

ادنیٰ نفس کی جانچ پڑتال کا دوسرا مقام - غور و فکر: جب انسان اپنے نفس کی نصیحت سے فارغ ہو جائے اور اوپر بیان کردہ شرائط مقرر کر دے تو اس کے لیے غور و فکر پر توجہ دینی چاہیے، دوسرے لفظوں میں اپنے اعمال پر غور و فکر کرنا چاہیے اور ان پر گہری نظر ڈالنی چاہیے اور اس کی حفاظت کے نقطہ نظر سے اپنے نفس پر کڑی نظر رکھنی چاہیے۔ کیونکہ اگر نفس کو تنہا چھوڑ دیا جائے تو وہ سرکش ہو جائے گا اور نقصان دہ اور نقصان دہ اور کمزور طریقے سے کام کرے گا۔ غور و فکر پر مزید بحث سے پہلے، آئیے اس کی فضیلت کی وضاحت کرتے ہیں۔

غور و فکر کی فضیلات: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرشتہ جبرائیل علیہ السلام سے *احسان* کے بارے میں پوچھا جس پر آپ نے فرمایا:

أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ

"خدا کی عبادت کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو (اور تم اسے نہیں دیکھ سکتے، وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔" (بیان کردہ*حضرت* عمر رضی اللہ عنہ سے صحیح *بخاری اور* صحیح *مسلم* کے مجموعے میں حدیث جمع کی گئی ہے

["احسن" یا روحانیت کی علامت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان الفاظ سے ملتی ہے: "خدا کی عبادت کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، اور جب تم ابھی تک اسے نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ واقعی تمہیں دیکھتا ہے"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کامل انسان یا تو اپنی روح کی آنکھ سے خدا کی گواہی دینے کی حالت میں ہے یا اگر وہ اس بلند روحانی مقام تک پہنچنے کے قابل نہیں ہے تو وہ دائمی غور و فکر کی کیفیت میں ہے کہ وہ ہمیشہ خدا کی نظر میں ہے۔ یہ روحانیت غصہ، نفرت، حسد، حسد، حسد، تکبر، لالچ، ناانصافی، بے صبری، انا پرستی، نسل پرستی، جنونیت ، انتہا پسندی، خود راستبازی، انتقام، سختی دل، جہالت، بزدلی، برے خیالات کو تفریح فراہم کرنے، شہرت/کنٹرول/طاقت کی ہوس اور تمام منفی خصلتوں اور رجحانات سے چھٹکارا حاصل کرکے اپنی روح کو خوبصورت بنانے کی ٹھوس کوششوں سے حاصل ہوتی ہے۔ اور محبت، صبر، شکرگزاری، عفو، مہربانی، شفقت، سخاوت، عاجزی، شرافت، خدا اور تمام انسانوں کے لیے اخلاص، خدا پر توکل، یاد الہامی، پاکیزگی، تمام مثبت صفات اور رجحانات جیسی تمام اچھی خوبیوں کو پیدا کر کے اپنی روح کو خوبصورت بنا کر اپنی روح کو خوبصورت بناتا ہے اور اس طرح زندگی کے تمام معاملات میں خدائی تحفظ اور رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ یہ انسانی حاصلات کی اعلیٰ ترین سطح ہے جس تک پہنچنے کی کوشش کی جاتی ہے، تاکہ اپنی روح کے اندر تاریکی کو مکمل طور پر ختم کر کے انسانی صلاحیتوں کا ادراک کیا جا سکے اور اس کے نتیجے میں حکمت کی الہی روشنی حاصل کی جا سکے جس میں زندگی کے تمام سوالات کے جوابات ملتے ہیں جیسے میں کون ہوں، کہاں سے آیا ہوں، کہاں جا رہا ہوں، زندگی کا مقصد کیا ہے، خدا نے سب کچھ کیوں پیدا کیا، اور حقیقی خوشی اور کامیابی کیا ہے؟ یہ وہ جگہ ہے جہاں خدا کے مخلص متلاشی خدا کے ادراک یا عرفان کی حالت حاصل کرتے ہیں ، جو روحانی کامیابی کی معراج ہے ، جس کے نتیجے میں مکمل داخلی سکون ، لامتناہی خوشی اور لازوال کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

أَلَمْ يَعْلَم بِأَنَّ ٱللَّهَ يَرَىٰ

"کیا یہ شخص نہیں جانتا کہ خدا اسے [ہر وقت کسی کے بیرونی اور باطنی دونوں مخلوقات میں] دیکھ رہا ہے۔"
(سورۃ البقرۃ سورۃ البقرۃ والبقرۃ آیت ۱۴)

إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا

"بیشک اللہ تم کو خوب جاننے والا اور دیکھ بھال کرنے والا ہے۔" (سورۃ البقرۃ سورۃ البقرۃ آیت ۱)

حضرت ابوعثمان مغربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ راہ روحانی میں سب سے اہم چیزیں غور و فکر، خود احتسابی اور حکمت کے لحاظ سے اعمال کی سیاست ہیں (یعنی صحیح علم کے مطابق اپنے اعمال کا انتظام کرنا)۔ آپ نے فرمایا: جب تم لوگوں کے درمیان بیٹھو تو نفس اور دل کو نصیحت کرنے کے ساتھ بیٹھ جاؤ [تاکہ وہ غلط خیالات، احساسات، قول و اعمال سے انحراف نہ کریں]، اور لوگوں کے آپ کے اجتماعات میں آنے سے دھوکہ نہ کھائیں [جیسا کہ وہ آپ کو روحانی استاد سمجھتے ہیں] کیونکہ وہ آپ کے ظاہری حصے کو دیکھتے ہیں۔ جبکہ خدا تمہارے باطن میں دیکھتا ہے۔" محمد بن علی ترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس ہستی کے بارے میں غور کرو جس سے تم غائب نہیں ہو، اس کا شکر اس کے لیے شکر گزار رہو جس کی نعمتیں تم سے منقطع نہیں ہوتیں، اس کے ساتھ اپنی اطاعت کا رشتہ رکھو جس سے تم غافل نہیں ہو، اور اس شخص کے لیے اپنی عاجزی کرو جس کی سلطنت اور طاقت سے تم بچ نہیں سکتے۔ ایک گنوسٹک نے کہا ، "خدا ان لوگوں کو پسند کرے گا جو اپنے دلوں کی حفاظت کرتے ہیں ، جو ان سے نکلنے والی ہر چیز کے لئے جوابدہ ہوکر اپنے آپ کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں ، اور جو آخرت کی طرف اپنے سفر کے لئے اعتماد تیار کرتے ہیں۔" ذنون مصری رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ ایک بندہ جنت کیسے حاصل کرے گا؟ آپ نے جواب دیا: پانچ باتوں کے ذریعے سے (روحانی جدوجہد میں) استقامت جس میں کوئی انحراف نہ ہو، کوشش جس میں کوئی غفلت نہ ہو، خدا کے بارے میں غور و فکر (یعنی خدا کی دل پر مسلسل نگاہوں کو محسوس کرنا) عوامی اور نجی طور پر، اپنی [ناگزیر] موت کا انتظار کرنا اور اس کی تیاری کے ساتھ [راہ الٰہی میں مخلصانہ کوشش کرکے]۔ اور نفس کے احتساب کے ذریعہ اس سے پہلے کہ وہ [الہامی] جوابدہ ہو"۔

غور و فکر کی حقیقت اور اس کے درجات

غور و فکر کی حقیقت یہ ہے کہ انسان نگہبان (خدا) کا خیال رکھتا ہے اور اپنی پوری توجہ اس کی طرف مرکوز کرتا ہے۔ *صوفیاء* کے نزدیک غور و فکر دل کی وہ کیفیت ہے جو ایک قسم کے علم اور قربت کے ذریعے حاصل کی جاتی ہے۔ اس کیفیت کی وجہ سے کچھ اعمال اعضاء سے نکلتے ہیں اور کچھ دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ حالت یہ ہے کہ دل مسلسل نگہبان (خدا) کی طرف دیکھتا رہتا ہے، اس میں مشغول رہتا ہے، اس کی طرف مائل ہوتا ہے اور اس کی طرف توجہ دیتا ہے۔ یہ علم و دانش یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دل کے رازوں اور اس کے پوشیدہ معاملات کو جانتا ہے، اپنے بندوں کے اعمال پر ہر وقت نظر رکھتا ہے، اور ان کی ذات سے نکلنے والے تمام اعمال سے آگاہ ہے۔ دل کے راز اس پر بالکل اسی طرح ظاہر ہوتے ہیں جس طرح انسان کی ظاہری شکل انسان پر عیاں ہوتی ہے، بلکہ یہ خدا پر اس سے بھی زیادہ عیاں ہے۔ جب یہ سمجھ ہر طرح کے شکوک و شبہات سے پاک ہو جاتی ہے تو وہ دل پر غالب ہو جاتی ہے اور اسے گھیر لیتی ہے۔ یہ غلبہ اس لیے ضروری ہے کہ بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کے بارے میں انسان کا یقین ہے، لیکن وہ دل پر حاوی نہیں ہوتے، بالکل اسی طرح جیسے موت کا یقین کا علم موجود ہے لیکن وہ دل پر حاوی نہیں ہوتا۔ چنانچہ جب گہری فہم دل پر حاوی ہو جاتی ہے تو یہ انسان کو نگہبان (خدا) کی طرف مائل کرتی ہے اور اپنے پورے وجود کی سمت کو نگہبان کی طرف موڑ دیتی ہے۔ جنہوں نے اس گنوسس میں یقین حاصل کیا ہے وہ خدا کے دوست اور مقرب ہیں۔

خدا کے مقربوں کے درجات (گنوسٹکس): خدا کے مقرب کی دو قسمیں ہیں: *صدیق* (گنوسٹک) اور *اصحاب یمین* ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا غور و فکر بھی دو درجے کا ہے۔ ایک درجہہ خدا کے ان مقربوں سے تعلق رکھتا ہے جو گنوسٹک (*صدیقین*) ہیں۔ یہ الہامی عظمت اور عظمت کا ایک غور و فکر ہے۔ اس غور و فکر کا نتیجہ یہ ہے کہ دل اللہ تعالیٰ کی گواہی میں غرق ہو جاتا ہے اور اس کے خوف سے ٹوٹ جاتا ہے اور اس میں اس کے سوا کسی اور کی طرف مائل ہونے کی ذرا سی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ اس غور و فکر کے اعمال دل میں سرایت کر رہے ہیں اور جہاں تک جسمانی اعضاء کا تعلق ہے تو ان کا حلال چیزوں کی طرف بھی کوئی جھکاؤ نہیں ہے، وہ حرام اور ناجائز (غیر اخلاقی اور غلط) چیزوں کی طرف کیسے مائل ہو سکتے ہیں؟ جب اعضاء اطاعت الٰہی کے اعمال میں سرگرم ہو جاتے ہیں، تو ایسا لگتا ہے کہ وہ نظم و ضبط اور [روحانی راستے میں سبقت حاصل کرنے کے لیے] تیار ہو گئے ہیں۔ لہٰذا انہیں صحیح راستے پر گامزن رکھنے کے لیے کسی حکمت عملی کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ جو رعایا کا مالک ہے، وہ خود ہی ان کی اصلاح کرتا ہے۔ دل [انسانی وجود کا] مالک ہے، جب وہ رب میں غرق ہو جاتا ہے تو اعضاء بغیر کسی کوشش کے اس کی راہ پر چلتے ہیں۔ لیکن یہ ہر انسان کی حالت نہیں ہے اور یہ حالت اس شخص کی ہے جس کی ایک ہی فکر ہے اور اس نے اللہ کی طرف سے اسے باقی تمام پریشانیوں سے بچا لیا ہے۔ جو شخص اس درجے کو حاصل کرتا ہے وہ مخلوقات سے اس قدر غافل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے آس پاس کے لوگوں کو بھی نہیں دیکھ سکتا اگرچہ آنکھیں کھلی ہوں اور ان کی باتیں نہیں سن سکتیں حالانکہ وہ بہرا نہ ہو۔ آپ کو یہ حالتیں ان لوگوں میں ملیں گی جو دنیا کے بادشاہوں (سیاسی حکام) کے احترام سے بھرے ہوئے ہیں۔ کچھ شاہی خادم اپنے بادشاہوں کی عزت اور خدمت میں اس قدر مگن ہوتے ہیں کہ ان کے ساتھ کچھ بھی ہو، وہ کسی چیز کا احساس نہیں کرتے اور نہ ہی محسوس کرتے ہیں۔ اور یہ ریاست صرف ان لوگوں کے لیے مخصوص نہیں ہے، بلکہ وہ لوگ ایک ہی حالت میں ہیں جو کسی دنیاوی کام میں مکمل طور پر مگن ہیں، یا کسی سوچ میں اس حد تک ڈوبے ہوئے ہیں کہ کچھ لوگ سوچتے ہوئے راستہ بھول جاتے ہیں، یا اپنی منزل سے بہت دور چلے جاتے ہیں اور انہیں یاد نہیں ہے کہ وہ کہاں جا رہے تھے اور کس مقصد کے لیے نکلے تھے۔ ایک گنوسٹک نے کہا ، "میں کچھ لوگوں کے پاس سے گزرا جو [کھیل کے طور پر کمانوں کے ساتھ] تیر چلا رہے تھے۔ ایک شخص ان سے کچھ فاصلے پر [اکیلا] بیٹھا تھا۔ میں اس سے بات کرنے کے ارادے سے اس کی طرف بڑھا۔ اس نے (میری نیت کو محسوس کرتے ہوئے) کہا کہ میں تم سے بات کرنے سے زیادہ خدا کی یاد کو ترجیح دیتا ہوں۔ میں نے اس سے کہا، "تم اکیلے بیٹھے ہو!" اس نے کہا کہ میرے ساتھ میرا رب اور دو فرشتے ہیں جو میرے اعمال لکھنے والے ہیں۔ میں نے اس سے پوچھا ، 'جو لوگ تیر چلا رہے

ہیں ان میں سے کون جیت سکتا ہے؟' آپ نے فرمایا: جسے اللہ معاف فرمائے۔ میں نے اس سے پوچھا: [شہر کی طرف] راستہ کہاں ہے؟ اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا پھر اٹھ کر چلنے لگا اور کہا: (اے پروردگار! تمہاری اکثر تخلیقات تم سے غافل ہیں۔" یہ اس شخص کی تقریر ہے جو خدا کی گواہی میں ڈوبا ہوا ہے، صرف اس سے بات کرتا ہے، اور صرف اس کے بارے میں سنتا ہے۔ ایسے شخص کو زبان اور اعضاء کے بارے میں غور و فکر کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اعضاء دل کے حکم پر چلتے ہیں۔

دوسرا درجہ (غور و فکر) داہنے والوں میں سے نیک لوگوں کے لیے ہے یہ وہ لوگ ہیں جن کا ان پر یہ یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی تمام ظاہری اور باطنی کیفیات سے واقف ہے لیکن جلال و جلال کی گواہی دے کر انہیں نشہ نہیں کرتا، بلکہ ان کے دل اعتدال کی سطح پر رہتے ہیں اور وہ اعمال اور حالات کی طرف مائل رہتے ہیں۔ بلکہ وہ اپنے اعمال میں ثابت قدم رہتے ہیں اور غور و فکر سے خالی نہیں ہوتے۔ لیکن ان میں اللہ تعالیٰ سے شرمندگی غالب رہتی ہے اور نہ تو وہ کچھ بھی کرنے کی ہمت کرتے ہیں اور نہ ہی کوئی کام کرنے سے ہچکچاتے ہیں۔ مزید یہ کہ وہ ہر اس عمل سے باز آتے ہیں جو قیامت کے دن انہیں ذلت کا نشانہ بناتا ہے۔ وہ قیامت کا انتظار نہیں کرتے، بلکہ دنیا کو قیامت کا میدان سمجھتے ہیں اور اللہ کو ان کی حالت سے آگاہ سمجھتے ہیں۔

یہ خدا کے بارے میں بندوں (انسانوں) کے درمیان غور و فکر کے مختلف درجات ہیں۔ جس کے پاس یہ ڈگری ہے، اسے اپنی تمام حرکات، خاموشی، خیالات، لمحات اور صلاحیتوں پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ دیکھنے کو دو بار ہونا چاہئے: پہلے کارروائی سے پہلے ، اور دوسرا کارروائی کے بعد۔ عمل سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ آیا وہ جو عمل کر رہا ہے وہ خاص طور پر خدا کے لیے کیا گیا ہے یا نچلے نفس کی خواہش پر عمل کرنے کے لیے کیا گیا ہے یا شیطان کی پیروی کرنے کے لیے۔ اس مقام پر ، کسی کو اس وقت تک غور کرنا چاہئے جب تک کہ صحیح چیز سچائی کی روشنی سے کسی پر ظاہر نہ ہوجائے۔ اگر کسی کی حرکت (عمل) نچلے نفس کی خواہشات کے لیے ہے تو اسے خدا سے شرم محسوس کرنی چاہیے اور اس سے باز آنا چاہیے پھر اس کی طرف مائل ہونے پر اپنے نفس کو ملامت کرنی چاہیے، اس عمل کو برا سمجھنا چاہیے، اور خدا کے سامنے اپنے آپ کو ذلیل کرنے کی کوشش کی مذمت کرنی چاہیے۔

ادنیٰ نفس کی جانچ پڑتال کا تیسرا مقام - عمل کے بعد نفس کی جوابدہی: میمون بن ابی مہران رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بندہ اس وقت تک پرہیزگاروں میں شامل نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اپنے نفس کا احتساب نہ کرے، بالکل اسی طرح جیسے تاجر اپنے کاروباری ساتھی کے ساتھ کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ، دونوں شراکت دار اپنے کاروبار کو انجام دینے کے بعد اکاؤنٹنگ کرتے ہیں اور نفع و نقصان کا تعین کرتے ہیں۔ حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مومن اپنے نفس کی حفاظت کرتا ہے اور اللہ کی خاطر اس کا حساب کتاب کرتا ہے۔ قیامت کے دن احتساب کا بوجھ ان لوگوں پر ہلکا ہوگا جو دنیا میں اپنی ذات کی ذمہ داری مکمل کرتے ہیں اور جو لوگ ایسا نہیں کرتے ان کے لیے یہ بہت زیادہ ہوگا۔ اس کے بعد انہوں نے خود احتسابی کی وضاحت اس طرح کی کہ "ایک مومن کسی چیز کو پسند کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں آپ کو پسند کرتا ہوں اور آپ کو فائدہ مند سمجھتا ہوں، تاہم آپ کے اور میرے درمیان ایک رکاوٹ (غور و فکر اور احتساب) کھڑی ہے۔ یہ احتساب کارروائی سے پہلے کیا جاتا ہے۔ کبھی مومن غلطی کر دیتا ہے، پھر وہ اپنے نفس کی طرف لوٹ جاتا ہے اور پوچھتا ہے کہ اس عمل (یا عمل) سے تمہارا کیا ارادہ تھا؟ خدا کی قسم! تم سے کوئی عذر قبول نہیں کیا جائے گا اور اگر اللہ چاہے تو میں اس غلطی کو دوبارہ کبھی نہیں دہراؤں گا۔ انہوں نے مندرجہ ذیل آیت کی وضاحت کرتے ہوئے مزید کہا:

وَلَآ أُقۡسِمُ بِٱلنَّفۡسِ ٱللَّوَّامَةِ

"اس نفس کی قسم جو اپنے آپ کو ملامت کرتا ہے!" (سورۃ البقرۃ سورۃ البقرۃ آیت 2)

ایک مومن اپنے نفس کو ملامت کرتا ہے اور پوچھتا ہے کہ ان باتوں سے تمہارا کیا ارادہ تھا؟ جب آپ نے یہ کھایا تو آپ کا ارادہ کیا تھا؟ اس مشروب سے تمہارا مقصد کیا تھا؟" دوسری طرف شخص آگے بڑھتا ہے اور کسی بھی

معاملے میں نفس کو ملامت نہیں کرتا [اور جو چاہتا ہے کرتا ہے چاہے وہ صحیح ہو یا غلط، نفع بخش ہو یا نقصان دہ ، قانونی ہو یا ناجائز]. مالک بن دینار رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے پر رحم فرمائے جو اپنے نفس سے یہ کہتا ہے کہ کیا تم نے فلاں غلطی نہیں کی؟ کیا تم نے فلاں گناہ نہیں کی؟ پھر اس پر ڈانٹتے ہیں اور اس پر پٹا ڈالتے ہیں اور اسے کتاب الٰہی کے تابع کر دیتے ہیں اور اسے اس کی راہبری بناتے ہیں۔ یہ بھی نفس کو ملامت کرنے کا ایک طریقہ ہے۔

نچلے نفس کی جانچ پڑتال کا چوتھا مقام - غلط کرنے کے بعد نفس کو سزا دینا: جب کوئی بندہ اپنے نفس کو جوابدہ ٹھہراتا ہے اور یہ دیکھتا ہے کہ وہ گناہوں (گناہوں) سے بچ نہیں سکا ہے اور اللہ کے حقوق پوری طرح پورا نہیں ہوا ہے، اور اسے اس حالت میں تنہا نہیں چھوڑنا چاہیے کیونکہ اگر کوئی اسے اس حالت میں چھوڑ دیتا ہے، گناہوں کا ارتکاب اس کے لیے آسان ہو جائے گا اور نفس گناہوں کا اس حد تک عادی ہو جائے گا کہ ان سے دور رہنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ یہ مکمل تباہی کے مترادف ہے جو نفس گناہوں کی عادت ڈال دیتا ہے۔ لہٰذا اس کی سزا دینا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص شہوت کے ساتھ مشکوک لقمہ کھائے تو اس کی سزا بھوکا رہنا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی شخص یا کسی ایسی چیز کی طرف دیکھے جس کو دیکھنا جائز نہ ہو تو اسے کسی چیز کی طرف نہ دیکھ کر آنکھ کو سزا دینی چاہیے۔ اسی طرح تمام جسمانی اعضاء کو ان کے جرائم کی سزا دے کر انہیں ان کی خواہشات سے روکنا چاہیے۔ آخرت کی طرف سفر کرنے والے روحانی مسافروں کا یہی طریقہ تھا۔ حسن بن ابی سنان رحمۃ اللہ علیہ ایک نئی عمارت کے پاس سے گزرے اور آخر میں کسی سے پوچھا کہ یہ کب بنائی گئی؟ اس کے بعد اس نے اپنی توجہ اپنی ذات کی طرف مبذول کرلی اور اس سے کہا، "تم نے ایک بیکار سوال پوچھا ہے۔ میں تمہیں ایک سال کا روزہ سزاؤں گا!" چنانچہ انہوں نے پورے ایک سال تک [روزانہ صبح سے شام تک] روزہ رکھا۔ مالک بن دیغم رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت رباء قیسی رحمہ اللہ عصر کی نماز کے بعد ہمارے پاس آئے اور ہمارے والد صاحب سے دریافت کیا۔ ہم نے اسے بتایا کہ وہ سو رہا ہے۔ یہ سن کر اس نے کہا: کیا یہ سونے کا وقت ہے؟ وہ اس وقت کیوں سو رہا ہے؟' وہ یہ کہہ کر چلا گیا۔ ہم نے اس کے پیچھے ایک آدمی کو یہ بتانے کے لئے دوڑایا کہ اگر وہ چاہیں تو ہم اپنے والد کو جگا دیں گے۔ وہ شخص واپس آیا اور کہنے لگا کہ وہ (رباح قیسی) کسی نہ کسی خیال میں اس قدر مگن تھا کہ اس نے میری بات بھی نہیں سنی (لیکن پھر بھی میں پیغام پہنچانے کے لیے اس کا پیچھا کرتا تھا]. میں نے دیکھا کہ وہ قبرستان میں گیا اور اپنے نفس کو طعن کرنے لگا اور کہنے لگا کہ تم نے کیوں کہا کہ وہ اس وقت سو رہا ہے؟ کیا تم پر یہ کہنا واجب تھا؟ کوئی جب چاہے سو سکتا ہے۔ آپ کون ہیں جو اس پر سوال کریں؟ آپ کو کیا پتہ چلا کہ یہ سونے کا وقت ہے یا نہیں؟ آپ نے ایک ایسے معاملے کے بارے میں اپنا منہ کھول دیا جس سے آپ اچھی طرح واقف نہیں ہیں۔ آپ نے ایک خوفناک غلطی کی ہے اور میں آپ کو اس کی سزا ضرور دوں گا اور وہ سزا یہ ہے کہ سونے کے لئے میری پیٹھ فرش کو نہیں چھوؤں گی سوائے اس کے کہ جب بیماری مجھے آجائے یا میں اپنا دماغ کھو دوں۔ تم پر افسوس ہے! کیا آپ شرمندہ نہیں ہیں؟ تم کب تک لوگوں کو ڈانٹو گے اور اپنی گمراہی سے غافل رہو گے؟" یہ کہہ کر وہ رونے لگا۔ اس نے مجھے بھی نہیں دیکھا۔ میں نے اسے اسی حالت میں چھوڑ دیا اور واپس آ گیا ہوں'.

وہاب بن منبہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص ایسا تھا جو طویل عرصے سے خدا کی عبادت کرتا تھا، اسے اللہ کی طرف سے ضرورت تھی۔ انہوں نے ستر ہفتوں تک روحانی جدوجہد اس طرح کی کہ وہ ہفتے میں صرف سات خشک کھجوریں کھاتے تھے اور دن رات خدا کی عبادت کرتے تھے۔ ستر ہفتوں کے بعد، اس نے اپنی ضرورت کے لیے خدا سے دعا کی، لیکن وہ [خدائی] پوری نہیں ہوئی۔ پھر اس نے اپنے دل سے کہا کہ اگر تم میں کوئی بھلائی ہوتی تو تمہاری دعا قبول ہوتی۔ اس وقت ایک فرشتہ اس کے پاس آیا اور اس سے کہا: اے ابن آدم! آپ کا یہ لمحہ (ادراک اور اس کی عیبوں کے لیے نفس کی مذمت کرنے کا] آپ کی تمام پچھلی عبادت سے بہتر ہے۔ خدا نے [اب] آپ کی ضرورت پوری کر دی ہے [اس احساس کے نتیجے میں اور اس کی ذمہ داری جہاں اس کا تعلق تھا]. ابو طلحہ رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ میں اپنے باغ میں نماز پڑھتے ہوئے ایک پرندے کے بارے میں سوچنے لگے۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد اس نے اپنی مرضی سے اپنی غلطی کے کفارے کے طور پر اپنا باغ صدقہ میں دے دیا۔ سمجھدار

اور دور اندیش لوگ اپنے نفس کو اس طرح سزا دیتے تھے۔ یہ حیرت کی بات ہے کہ لوگ دوسروں کو ان کے گناہوں اور گناہوں کی سزا دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اگر وہ ان کو معاف کر دیں گے تو وہ سرکش اور قابو سے باہر ہو جائیں گے، لیکن دوسری طرف آپ نے نفس کو اس کی خواہشات پر چھوڑ دیا ہے، حالانکہ وہ آپ کا بدترین دشمن ہے اور اس کی سرکشی بہت زیادہ ہے، اور اس کی سرکشی سے ہونے والا نقصان اس سے کہیں زیادہ ہے۔ دوسرے لوگ زیادہ سے زیادہ آپ کی دنیاوی زندگی میں مصیبتیں پیدا کر سکتے ہیں، جبکہ آپ کی ذات تمہاری آخرت کو تباہ کرنے والی ہے۔ اگر تم عقل کی دولت سے مالا مال ہو تو تم یہ بات اچھی طرح جانتے ہو کہ آخرت کی زندگی کے سوا کوئی حقیقی زندگی نہیں ہے، اس میں ابدی اور ابدی نعمتیں ہیں اور آپ کی اپنی ذات اس زندگی کو تباہ کرنے والی ہے، اسی لیے یہ سزا کا زیادہ مستحق ہے۔

پادری نفس کی جانچ پڑتال کا پانچواں مقام روحانی جدوجہد: روحانی جدوجہد (*مجاہدہ*) یہ ہے کہ جب آپ اپنے نفس کا احتساب کریں اور دیکھیں کہ نفس نے کوئی گناہ کیا ہے تو اسے وہ سزائیں دیں جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ اگر آپ دیکھتے ہیں کہ نفس روحانی معمولات (*اوراد و وظیف*، نمازیں، نمازیں، کتاب الٰہی کی تلاوت، خدا کے مقربانوں کی حکمت اور تعلیمات کا مطالعہ کرنے، دیگر عبادات اور عبادتیں) پر عمل کرنے میں سستی کر رہے ہیں تو اسے مزید روحانی کاموں سے دوچار کریں اور اسے دیگر عبادات اور عبادات کے لیے وقف کر دیں (*اوراد*) ماضی کی غلطیوں اور نقصانات کی تلافی کرنے کے لئے۔ جو لوگ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے تھے وہ ایسا ہی کرتے تھے۔ جہاں تک سوال یہ ہے کہ آپ کا نفس آپ کی اطاعت نہیں کرتا یا باقاعدگی سے عبادتوں، دعاؤں اور روحانی کوششوں سے متفق نہیں ہے، تو پھر اس کے علاج کا کیا طریقہ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ اسے وہ روایات سکھائیں جو روحانی طور پر جہادت کرنے والوں کی فضیلت بیان کرتی ہیں اور سب سے زیادہ فائدہ مند علاج یہ ہے کہ اس کے بندوں میں سے خدا کے بندے کی صحبت اختیار کی جائے جو عبادت میں محنت کرتا ہے، ایسے شخص کی بات غور سے سنتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے، ایسے کے اعمال کا مشاہدہ کرتا ہے اور ان کی پیروی کرتا ہے۔

نچلے نفس کی جانچ پڑتال کا چھٹا مقام - نفس کو تنقید کا نشانہ بنانا: آپ کا سب سے بڑا دشمن آپ کے اندر ہے اور وہ نفس ہے۔ اس کی تخلیق اور اس کی فطری فطرت میں یہ لکھا گیا ہے کہ وہ برائی کا حکم دیتا ہے، برائی کی طرف مائل ہوتا ہے اور نیکی سے بچتا ہے۔ اس کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اس کی اصلاح کرے اور پاک کرے اور اس کی ٹیڑھائی کو دور کرے اور اسے ظلم و زیادتی سے روکے۔ اگر آپ اس کے پٹے کو ڈھیلا کردیتے ہیں تو ، یہ باغی ہوجائے گا اور قابو سے باہر ہوجائے گا ، پھر آپ اس تک نہیں پہنچ پائیں گے۔ اگر تم اسے ڈانٹتے رہو اور اسے اللہ کے عذاب سے ڈراتے رہو تو وہی نفس وہ نفس بن جاتا ہے جو اپنے آپ کو ملامت کرتا ہے جس کی قسم اللہ تعالیٰ نے کھائی ہے۔ امید کی جا سکتی ہے کہ اصلاح اور تبدیلی کے بتدریج عمل کے ذریعے یہ نفس مزید ترقی کرے گا اور وہ نفس بن جائے گا جو امن میں ہے (*نفس المطینہ*) جسے خدا کی طرف سے حکم دیا گیا ہے کہ اسے خدا کے مخلص بندوں کے زمرے میں اس طرح شامل کیا جائے کہ خدا اس سے راضی ہو اور وہ خدا سے راضی ہو۔ [یہ سب ارتقاء اور نفس کے ایک باغی ہستی سے ایک ایسی ہستی میں تبدیل ہونے کے تمام مراحل ہیں جس سے خدا راضی ہے، روحانی کوششوں کے ساتھ اس کی تبدیلی کے بعد، جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے۔] لہٰذا کسی بھی لمحے نفس سے غفلت نہ برتیں، بلکہ اس کے ساتھ استدلال کرو، اسے نصیحت کرو اور اس کی تضحیک کرو۔ آپ کو دوسروں کو نصیحت اور تبلیغ نہیں کرنی چاہیے جب تک کہ آپ اپنے آپ کو نصیحت اور تبلیغ نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی: اے مریم کے بیٹے! پہلے اپنے آپ کو نصیحت کرو اور جب تم اس سے فارغ ہو جاؤ تب ہی لوگوں کو نصیحت کرو ورنہ مجھ سے شرم آ جاؤ۔

اس کا طریقہ یہ ہے کہ آپ اپنی ذات پر توجہ دیں اور اس سے کہیں کہ آپ کتنے بے وقوف اور احمق ہیں کہ آپ اپنے آپ کو ذہین، سمجھدار اور عقلمند سمجھتے ہیں لیکن آنے والی [ابدی] زندگی کے بارے میں کچھ بھی منصوبہ بندی نہیں کرتے۔ جنت اور جہنم تمہارے سامنے ہیں اور عنقریب تم ان میں سے کسی ایک کے پاس چلے جاؤ گے۔ اس کے باوجود، آپ خوش ہو جاتے ہیں، زور سے ہنستے ہیں، بیکار کوششوں میں مشغول ہو جاتے ہیں، حالانکہ آپ کو

جلد ہی ایک خطرناک مرحلے (دنیاوی وجود کا خاتمہ) کا سامنا کرنا پڑے گا۔ موت تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ وہ آج یا کل آپ کو اپنے چنگل میں پھنسا دے۔ تم سمجھتے ہو کہ موت تم سے بہت دور ہے، لیکن یہ ممکن ہے کہ خدا کے علم میں یہ بہت قریب ہو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ موت تمہیں اچانک پکڑ لے گی؟ نہ کوئی قاصد آئے گا اور نہ ہی کوئی پیشگی اطلاع دے گا۔ نہ ہی کسی مخصوص تاریخ اور وقت پر ملاقات ہوگی اور نہ ہی موت کی آمد کا کوئی خاص موسم ہے۔ نہ تو یہ رات اور دن تک محدود ہے اور نہ ہی یہ جوانی یا بڑھاپے کے لیے مخصوص ہے۔ بلکہ انسان کی ہر سانس آخری ہو سکتی ہے اور ہر لمحہ موت کا پیش خیمہ ہو سکتا ہے۔ اگر موت اچانک نہیں آتی ہے تو اچانک ایک بیماری واقع ہوتی ہے جو موت کی طرف لے جاتی ہے۔ پھر تمہیں کیا ہو گیا کہ تم موت کی تیاری نہیں کرتے حالانکہ وہ تمہاری رگ سے بھی زیادہ قریب ہے کیا تم اللہ کے ان الفاظ پر غور نہیں کرتے؟

اقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُونَ ﴿١﴾ مَا يَأْتِيهِم مِّن ذِكْرٍ مِّن رَّبِّهِم مُّحْدَثٍ إِلَّا اسْتَمَعُوهُ وَهُمْ يَلْعَبُونَ ﴿٢﴾ لَاهِيَةً قُلُوبُهُمْ ۗ

انہوں نے کہا کہ عوام کے احتساب کا وقت آگیا ہے لیکن وہ اب بھی غفلت میں ملوث ہیں اور اس سے غافل ہیں۔ ان کے رب کی طرف سے جو نصیحت ان کے پاس آتی ہے وہ اسے اس طرح سنتے ہیں کہ وہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور ان کے دل اس کی طرف جھکتے نہیں (سورة البقرة القرآن باب 21 آیت 1 تا 3)

اگر تم اللہ کے خلاف گناہ کرنے کی جرات کرتے ہو کہ تم یہ یقین رکھتے ہو کہ اللہ تمہارے اعمال کی نگرانی نہیں کر رہا تو یہ تمہارا کفر ہے اور اگر تم اسے اپنے اعمال پر نگہبان سمجھنے کے بعد بھی گناہ کرتے ہو تو یہ تمہارے لیے بڑی شرمندگی اور رسوائی کی بات ہے۔ اے نفس! اگر آپ کا کوئی نوکر یا [چھوٹا] بہن بھائی آپ کی نافرمانی کرتا ہے تو آپ کو کتنا غصہ آتا ہے اور آپ اسے کتنا برا سمجھتے ہیں؟ تو پھر آپ کی ہمت کیسے ہوئی کہ خدا کی ناراضگی اور سزا کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ عذاب الٰہی سے نمٹ سکتے ہیں؟ بالکل نہیں! یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ اگر آپ کو ہماری (غزالی) کی باتوں پر یقین نہیں ہے تو خود اس کا تجربہ کریں اور تھوڑی دیر کے لیے چلچلاتی دھوپ میں کھڑے ہو جائیں یا کچھ دیر کے لیے گرم عوامی غسل میں اپنے آپ کو بند کر لیں یا اپنی انگلی آگ کے شعلے پر رکھیں اور دیکھیں کہ کیا آپ میں اس درد کو برداشت کرنے کی طاقت ہے یا نہیں۔ کیا آپ اپنے عقیدے سے دھوکہ کھا رہے ہیں کہ آپ فضل الٰہی کے حقدار ہیں [قطع نظر اس سے قطع نظر کہ آپ برائیوں کے معاملے میں کیا کرتے ہیں] یا آپ کے اس عقیدے سے کہ خدا آپ کی عبادت کا محتاج نہیں ہے؟ اگر ہم جو سوچ رہے ہیں وہ درست ہے تو ہم آپ سے پوچھتے ہیں کہ آپ دنیاوی معاملات میں فضل الٰہی پر کیوں بھروسہ نہیں کرتے اور آپ اپنے دنیاوی مقاصد کے حصول کے لیے ذاتی حکمت عملی اور منصوبے اور کوششیں کیوں کرتے ہیں؟ جب آپ کو ایک دنیاوی ضرورت ہوتی ہے جو پیسے کے بغیر ممکن نہیں ہے، تو آپ اپنی ضرورت کے پیسے حاصل کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ ہم آپ سے پوچھتے ہیں کہ تم اس وقت فضل الٰہی پر کیوں توکل نہیں کرتے کہ وہ تمہیں کسی پوشیدہ خزانے کی اطلاع دے یا اپنے بندوں میں سے کسی کو تمہاری مدد کے تابع کر دے جو آپ کی طرف سے بغیر کسی کوشش کے آپ کو ضروری چیز فراہم کرے؟ کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ اللہ تعالیٰ آخرت میں مہربان اور مہربان ہے مگر دنیا میں نہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ اللہ کے طریقہ کار میں کوئی تبدیلی نہیں آتی اور دنیا اور آخرت کا مالک ایک ہے۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ انسان کو کوشش کیے بغیر کچھ نہیں ملتا۔ اے ملزم نفس! آپ کی منافقت حیران کن ہے ، اور آپ کے جھوٹے دعوے حیرت انگیز ہیں! تم اپنی زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتے ہو، لیکن منافقت کا اثر تم پر واضح ہے! اب تم اس کتے کی طرح دنیا کی تلاش میں مگن ہو جو ہڈی چبانے میں مصروف ہے، اپنے اردگرد کے ماحول سے بالکل غافل ہے، ایک دھوکہ دہی کے ساتھ آخرت سے مکمل طور پر غافل ہے، اور موت کے بعد کے واقعات کو غیر اہم سمجھتا ہے۔ یہ ایمان کی نشانی نہیں ہے۔ ایسا لگتا ہے

کہ آپ قیامت پر یقین نہیں رکھتے اور آپ کو لگتا ہے کہ آپ مرنے کے بعد تمام قیدیوں اور مصائب سے آزاد ہو جائیں گے۔ آپ کا یہ قیاس غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

أَيَحْسَبُ ٱلْإِنسَٰنُ أَن يُتْرَكَ سُدًى ﴿٣٦﴾

أَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّن مَّنِيٍّ يُمْنَىٰ ﴿٣٧﴾ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوَّىٰ ﴿٣٨﴾ فَجَعَلَ مِنْهُ

ٱلزَّوْجَيْنِ ٱلذَّكَرَ وَٱلْأُنثَىٰٓ ﴿٣٩﴾ أَلَيْسَ ذَٰلِكَ بِقَٰدِرٍ عَلَىٰٓ أَن يُحْـِۧىَ ٱلْمَوْتَىٰ ﴿٤٠﴾

"کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ دنیا میں اپنے اعمال کا احتساب کیے بغیر تنہا رہ جائے گا؟" کیا یہ شخص صرف نطفہ کا ایک قطرہ نہیں تھا جو بعد میں [رحم میں] جمے ہوئے خون کا ٹکڑا بن جاتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسے انسان بنایا، پھر اس کے اعضاء کو دو قسموں میں بنایا: مرد اور عورت۔ کیا اللہ مردوں کو زندہ کرنے پر قادر نہیں ہے؟ (سورة البقرة باب 75، آیہ 36-40)

اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہیں اکیلے چھوڑ دیا جائے گا تو یہ تمہاری جہالت اور کفر ہے۔ اپنے بارے میں سوچیں کہ کیا آپ ہمیشہ اسی طرح تھے جیسے آپ اب ہیں؟ آپ کی حقیقت کیا تھی؟ آپ صرف ایک نطفہ کا قطرہ تھے! آپ کو اپنا وجود اس [نطفہ کے قطرے] سے ملا ہے۔ پھر کیا اللہ کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ تمہیں موت کے بعد زندہ کر دے؟ اگر آپ موت کے بعد کی زندگی پر یقین رکھتے ہیں تو پھر آپ اس کے لئے تیاری کیوں نہیں کرتے؟ ہمیں حیرت ہوتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اگر کوئی بچہ آپ کو بتاتا ہے کہ آپ کے کپڑوں میں بچھو ہے تو آپ اسی لمحے اپنے کپڑے نکال کر پھینک دیتے ہیں اور آپ کوئی ثبوت نہیں مانگتے اور نہ ہی کوئی دلیل مانگتے ہیں۔ کیا انبیاء، علماء، دانشمندوں اور گنوسٹکوں کے اقوال کو بھی اتنی اہمیت نہیں ہے جتنی آپ کی نظر میں بچے کی گفتہ ہے، جسے دنیا کے تمام لوگ ناتجربہ کار اور عقل سے محروم قرار دیتے ہیں؟ کیا یہ ذہانت ہے اور کیا اسے ایک سمجھدار انسان کا رویہ کہا جا سکتا ہے؟ ہم یہ بات اس حد تک کہتے ہیں کہ اگر آپ کا حال جانوروں پر ظاہر ہو جائے تو وہ آپ کا مذاق اڑائیں گے اور آپ کی عقل و ادراک پر ماتم کریں گے!

اے بدبخت نفس! اگر آپ ان سب باتوں پر یقین رکھتے ہیں اور ان کو سچ سمجھتے ہیں تو پھر آپ ان پر عمل کرنے میں کیوں گریز کرتے ہیں حالانکہ موت گھات لگا کر پڑی ہوئی ہے؟ یہ ممکن ہے کہ یہ آپ کو توبہ کا موقع دیئے بغیر آپ کو چھین لے۔ اگر آپ کو موت کے بارے میں یقین ہے اور معلوم ہے کہ یہ اچانک آ سکتا ہے تو پھر آپ ہاتھ پر ہاتھ ڈال کر بیکار کیوں بیٹھے ہیں؟ اگر ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ خدا نے آپ کو زندگی کے سو سال کی شکل میں مہلت دی ہے تو کیا یہ سو سال طویل عرصہ بغیر کسی جدوجہد کے مکمل ہو سکتا ہے اور کیا حقیقت میں ایسا کیے بغیر کچھ بھی خود بخود ہو جائے گا؟ اگر فرض کریں کہ ہم یہ قبول کرتے ہیں کہ روحانی کوششیں اور کوششیں زندگی کے آخری حصے میں [بڑھاپے میں] فائدہ مند ہیں جو کسی کو اعلی روحانی درجات تک لے جاتی ہیں، تو ہم کیسے جان سکتے ہیں کہ اس کو پورا کرنے کے لیے آپ کے پاس زندگی باقی رہے گی؟ ہم سمجھتے ہیں کہ آپ ہوس سے باز نہیں آنا چاہتے ، اور آپ کو اپنے آپ کو ہوس سے روکنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر آپ اس دن کا انتظار کر رہے ہیں جب ہوس کی مخالفت کرنا تکلیف دہ نہیں ہوگا تو ایسا دن نہیں آئے گا۔ اللہ تعالیٰ نے نہ تو ایسا دن پیدا کیا ہے اور نہ ہی وہ کوئی دن پیدا کرے گا۔ جنت ناپسندیدہ اور ناپسندیدہ چیزوں، مصائب اور مصائب سے گھری ہوئی ہے اور یہ چیزیں ذات پر آسان نہیں ہیں۔

اے نفس! تم اپنے نیک کاموں کو کل تک ملتوی کر رہے ہو۔ کتنے کل پہلے ہی آ چکے ہیں اور آج میں تبدیل ہو چکے ہیں، لیکن آپ نے [ابدی زندگی کی تیاری کے بارے میں کچھ کرنے کی طرف] ذرا بھی آگے نہیں بڑھایا اور اب بھی کل کے وعدے میں مصروف ہیں؟ ہم یہ نہیں سمجھتے کہ آپ کسی بھی کل میں کام کر سکتے ہیں، بلکہ آپ کسی بھی (نیک عمل) سے قاصر ہیں کیونکہ ہوس ایک درخت کی مانند ہے جس کی جڑیں ہر روز مضبوط ہوتی جاتی ہیں۔ جب اسے جڑ سے اکھاڑ دیا جائے اور پھینک دیا جائے جبکہ وہ صرف ایک [چھوٹا] پودا یا کمزور درخت ہو تو اس میں کوئی مشکل نہیں ہے۔ لیکن جب یہ ایک بہت بڑا درخت بن جاتا ہے اور اس کی جڑیں مٹی میں پھیل جاتی ہیں اور اس کی شاخیں آسمان کی طرف چوڑی اور اونچی ہوتی ہیں تو اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکنا آسان نہیں رہا۔ یہ بالکل ایسا

ہی ہے جیسے ایک نوجوان شخص کسی درخت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا ارادہ رکھتا ہے پھر اسے ہر روز کل تک ملتوی کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ بوڑھا ہو جاتا ہے اور جب کوئی بڑھاپے میں درخت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ ایسا کرنے سے قاصر ہوتا ہے۔ ایک ، اس لئے کہ کوئی بوڑھا ہو گیا ہے ، اور دوسرا اس لئے کہ درخت زمین میں مضبوطی سے جڑ گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس درخت کو آپ جوانی میں جڑ سے اکھاڑ نہیں سکتے تھے، آپ بڑھاپے میں جڑ سے اکھاڑ نہیں پائیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ بڑھاپے کی روحانی جدوجہد ایک بہت بڑی مشکل ہے۔ اے نفس! اگر تم ان واضح باتوں کو نہیں سمجھ سکتے اور تاخیر کو اپنی عادت بنا سکتے تو پھر تم اپنے آپ کو عقلمند کیوں سمجھتے ہو؟ اس سے بڑی حماقت اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان معاملات کو نہ سمجھا جائے جو واضح طور پر واضح ہیں؟ شاید آپ کہیں گے کہ میں نیک اعمال پر قائم نہیں رہ سکتا کیونکہ مجھے خواہشات کی لذتوں کا لالچ ہے اور مصائب اور مصائب پر صبر کرنا میرے لیے بہت مشکل ہے۔ آپ کا یہ قول انتہائی احمقانہ ہے۔ اگر تمہیں خواہشات اور لذتوں کا لالچ ہے تو پھر تم ان خواہشوں اور لذتوں کی تلاش کیوں نہیں کرتے، جو ہمیشہ ہمیشہ قائم رہیں گی، اور [اس کے علاوہ] وہ ہر طرح کی نجاستوں اور گندگی سے عاری ہیں؟ لیکن یہ خواہشات جنت میں پائی جاتی ہیں نہ کہ دنیا میں اور ان کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ دنیا کی خواہشات کو نظر انداز کیا جائے، ورنہ بعض اوقات ایک لقمہ کی وجہ سے بہت سے لقبوں سے محروم ہونا پڑتا ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کسی کو کتنی ہی لمبی زندگی مل جائے، اس دنیا کی زندگی آخرت کی لامحدود ابدی زندگی کے مقابلے میں محدود ہے۔

اگر تمہارے پاس کوئی پناہ ہے تو وہ اللہ کی پناہ ہے۔ اگر نجات کا کوئی راستہ ہے تو وہ خدا کی طرف جاتا ہے۔ وہی تمہارا واحد پناہ گانا اور نجات دہندہ ہے۔ وہی ہے جو آپ کے مقصد کو پورا کر سکتا ہے، اور وہی ہے جو آپ کی التجا کا جواب دے سکتا ہے۔ اس کے سامنے سر جھکاؤ، اس کے سامنے عاجزی اور عاجزی کرو۔ جہاں تک تم جہالت رکھتے ہو اور جس حد تک تم گناہ کرتے ہو اس حد تک اس کے سامنے روتے رہو کیونکہ جو شخص اس کے سامنے روتا ہے اور اس کے سامنے عاجزی کرتا ہے وہی ہے جس پر وہ اپنی رحمت عطا کرتا ہے۔ وہ اس کی مدد کرتا ہے جو اس سے مدد مانگتا ہے، وہ مجبوروں اور محتاجوں کی دعا قبول کرتا ہے۔ آج تم اس کی طرف مجبور ہو گئے ہو اور اس کی رحمت کے محتاج ہو گئے ہو۔ باقی تمام راستے بند ہو گئے ہیں اور باقی تمام راستے تنگ ہو گئے ہیں۔ اپنے نفس کو تنقید کا نشانہ بنانا بھی موثر نہیں ہے۔ جس سے تم مانگتے ہو وہ مہربان اور مہربان ہے۔ اس کی رحمت لامحدود وسعت کا مالک ہے۔ اس کی سخاوت کبھی ختم نہیں ہوتی، اور اس کی معافی ہر طرف ہے۔ اور اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دو اور کہو کہ اے رحم کرنے والے رحم کرنے والا! اے مہربان ! اے روادار! اے جلال والا! اے مہربانی! بے شک میں گنہگار برے کام کرنے والا اور گمراہی کرنے والا ہوں میری سرکشی تمام حدود سے تجاوز کر گئی ہے اور میں بے شرمی کی حد تک گناہوں میں جسارت کر رہا ہوں۔ اے اللہ! ہر جگہ سے مایوس ہونے کے بعد میں تیرے دربار میں عاجزی، نیکتری، محتاجی اور غربت کے ساتھ روتا ہوں۔ میری طرف اپنی مدد جلدی فرما، میری تکلیف دور فرما، مجھے اپنی رحمت کی نشانیاں دکھاء، مجھے اپنی مغفرت عطا فرما، اور مجھے اپنی حفاظت کی طاقت عطا فرما! اے نفس! اپنے باپ آدم علیہ السلام کی پیروی کرو اور روتے ہوئے اور اپنی شرمندگی اور افسوس کا اظہار کرو۔

یہ نفس کو کام پر لینے کا طریقہ ہے جس پر نیک پیشروؤں نے عمل کیا۔ خدا سے ان کی التجا کا مقصد خدائی قبولیت حاصل کرنا تھا اور خود کو ذمہ دار کرنے کا مقصد نفس کو خبردار کرنا تھا۔ جو شخص خدا سے التجا کرنے اور نفس کو سزا دینے سے غفلت کرتا ہے وہ نفس کا مددگار نہیں ہے اور اس پر الٰہی کی ناراضگی بھی جلد ہی ظاہر ہو جائے گی [عام طور پر تنگ حالات اور زندگی میں ناقابل برداشت چیلنجز کی صورت میں]۔

باب 19 - اندرونی سکون اور روحانی تبدیلی کے لئے گہری اندرونی عکاسی اور غور و فکر ضروری ہے

عکاسی ایک اور ضروری روحانی خوبی ہے جو خود آگاہی اور اندرونی سکون کا باعث بنتی ہے۔ معلوم میں غور و فکر اور غور و فکر ، نامعلوم کے بارے میں آگاہی کے نئے راستے کھولتا ہے ، اس طرح معاملات میں نئی بصیرت پیدا ہوتی ہے۔ سچائی کے طلوع ہونے کے ساتھ ہی روحانی معاملات غور و فکر کی حالت میں واضح ہو جاتے ہیں۔ عکاسی گہری اندرونی آگاہی ، علم ، تفہیم اور حکمت کو فروغ دیتی ہے۔ انسانی تعلقات میں اس کے مثبت مضمرات کو کم نہیں سمجھا جا سکتا کیونکہ غور کرنے والا شخص ایک باضمیر شخص ہوتا ہے، جو ہر قدم سے پہلے سوچ بچار کرتا ہے اور کسی کو نقصان نہ پہنچانے کا خیال رکھتا ہے۔ غزالی کی اس موضوع پر حیرت انگیز تفسیر یہاں ان کی *عظیم تصنیف "احیئ العلوم الدین"* یا "خدا کی راہ کی معرفت کا احیاء" کی چوتھی جلد کی نویں کتاب سے مختصر شکل میں اس طرح پیش کی گئی ہے:

گہری اندرونی عکاسی (*تفکر*) اور غور و فکر (*تدبور*)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک روایت میں منقول ہے کہ ایک لمحے کے لیے گہرا غور و فکر اور غور و فکر پورے سال کی عبادت سے افضل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے *فکر* (گہری باطنی عکاسی یا کسی موضوع پر گہرائی، منظم اور بڑی تفصیل سے غور و فکر کرنے پر زور دیا ہے کیونکہ یہ دل کا نور ہے، روح کی پرورش ہے، اور علم کا جوہر ہے جو روحانی تبدیلی اور عروج کی راہ کو روشن کرتا ہے)، *تدبر* (غور و فکر یا سچائی تک پہنچنے کے لیے معاملات میں گہرائی سے دیکھنا)، گواہی دیتے ہوئے، اور سرٹیفکیٹ۔ واضح رہے کہ غور و فکر [روحانی] روشنیوں کی کلید، باطنی بصیرت (*بصیرت*) کا نقطہ آغاز ہے، علم پر قبضہ کرنے کا جال ہے، اور روحانی جواہرات (*معارف*) اور گہرے باطنی معانی (معانی) کا شکار کرنے کا ذریعہ ہے۔ لوگ عام طور پر یہ نہیں جانتے کہ کس طرح عکاسی کرنا ہے ، کیا معاملات کی عکاسی کرنا ہے ، وہ کیوں عکاسی کرتے ہیں ، عکاسی سے کیا طلب کیا جاتا ہے ، کیا یہ اپنے آپ میں طلب کیا جاتا ہے یا یہ کسی نتیجے کے لئے ایک مقصد ہے؟ اگر کسی نتیجے کے لیے اس کی ضرورت ہے تو وہ کیا نتیجہ ہے، چاہے وہ علم ہوں یا باطنی [روحانی] حالتیں یا دونوں۔ ان تمام حقائق کو واضح کرنا ایک مہم ہے۔ ہم پہلے غور و فکر کی حقیقت کی وضاحت کریں گے، پھر اس کے نتائج پر بات کریں گے، پھر ان معاملات پر روشنی ڈالیں گے جو غور و فکر کے تابع ہیں۔

غور و فکر کی فضیلت: خدا نے اپنی کتاب میں کئی مقامات پر غور و فکر اور غور و فکر کا حکم دیا ہے اور غور و فکر کرنے والوں کی تعریف کی ہے۔ اس نے کہا:

ٱلَّذِينَ يَذۡكُرُونَ ٱللَّهَ قِيَـٰمًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمۡ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلۡقِ

ٱلسَّمَـٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضِ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ هَـٰذَا بَـٰطِلًا

"یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کو کھڑے بیٹھے اور لیٹے ہوئے یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں غور و فکر کرتے ہیں: اے ہمارے رب! تم نے اس میں سے کوئی بھی چیز بیکار پیدا نہیں کی [بلکہ ہر چیز کے پیچھے جو اس کی تخلیق کے بعد موجود ہے اس کے پیچھے ایک عظیم مقصد اور حکمت الٰہی ہے]۔ (سورۃ البقرۃ سورۃ البقرۃ آیت 191)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ بعض لوگ اللہ تعالیٰ کے بارے میں فکر کر رہے تھے۔ فرمایا اللہ کی مخلوقات پر غور کرو کیوں کہ تم اللہ کے بارے میں صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے۔ (بیان کردہ حدیث کا مجموعہ *ابو نعیم فی الحلیہ*

عبید بن عمیر رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ آپ مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں سب سے عجیب بات بتائیں۔ عائشہ رضی اللہ عنہا یہ سن کر رونے لگی اور کہنے لگی کہ ان کے بارے میں سب کچھ عجیب تھا۔ ایک رات وہ میرے پاس آئے یہاں تک کہ میرا جسم اس کے جسم کو چھوا تو اس نے کہا: اے عائشہ! مجھے چھوڑ دے کہ میں اپنے رب کی عبادت کروں۔ اس کے بعد آپ نے چمڑے کے تھیلے میں موجود پانی سے وضو کیا، پھر نماز میں کھڑے ہوئے اور اتنے روئے کہ ان کی داڑھی [آنسوؤں] سے بھیگ گئی۔ اس کے بعد وہ سجدہ میں روتا رہا یہاں تک کہ زمین گیلی ہو گئی۔ پھر (نماز سے فارغ ہونے کے بعد) وہ اپنے پہلو میں لیٹ گئے یہاں تک کہ بلال رضی اللہ عنہ صبح سویرے (طلوع آفتاب کے بعد لیکن طلوع آفتاب سے پہلے) نماز کی اطلاع دینے کے لیے اس کے دروازے پر آئے۔ آپ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! تم کیوں روتے ہو؟ اللہ تعالیٰ نے تمہارے ماضی اور مستقبل کے تمام گناہ معاف کر دیے ہیں۔" آپ نے فرمایا: اے بلال! میں کیوں نہیں روؤں؟ آج رات خدا نے مجھ پر یہ آیت نازل کی ہے:

إِنَّ فِي خَلۡقِ ٱلسَّمَـٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضِ وَٱخۡتِلَـٰفِ ٱلَّيۡلِ وَٱلنَّهَارِ لَأٓيَـٰتٖ لِّأُوْلِي ٱلۡأَلۡبَـٰبِ

بے شک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات اور دن کے بدلنے میں عقلمندوں کے لیے نشانیاں ہیں (سورۃ البقرۃ سورۃ 3 آیت 190)

اس کے بعد انہوں نے کہا، 'جو شخص یہ آیت پڑھتا ہے لیکن اس پر غور نہیں کرتا اس کے لیے بہت نقصان ہے'۔ (بیان کردمحدیث کا مجموعہ *صحیح بن حبان* رباح رضی اللہ عنہ سے

فضیل بن عیاضؒ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ غور ایک ایسا آئینہ ہے جس میں تم اپنے نیک اور برے اعمال کو دیکھو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ تم بہت غور و فکر کرتے ہو۔ اس نے جواب دیا، "غور و فکر عقل کی بنیاد ہے"۔ سفیان بن عینیہ کہا کرتے تھے کہ اگر انسان میں غور ہو تو ہر چیز سے سبق حاصل کیا جا سکتا ہے۔ طاووس رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے شاگردوں نے ان سے پوچھا: یا خدا کی روح! کیا آج زمین پر تمہاری طرح کوئی ہے؟" اس نے جواب دیا: ہاں۔ وہ شخص میری طرح ہے جس کی گفتار الٰہی کی ذکرہ ہے، جس کی خاموشی عکاسی ہے، اور جس کی آنکھ عبرت حاصل کر رہی ہے۔ بشار رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر لوگ اللہ کی شان و شوکت پر غور کریں گے تو وہ کبھی بھی اللہ کی نافرمانی نہیں کریں گے۔ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عقل والے الٰہی کی یاد کے ذریعے غور و فکر کے عادی ہو جاتے ہیں اور الٰہی کی یاد کے عادی ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ ان کے دلوں سے حکمت نکل آ جائے۔ جنید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سب سے عمدہ اور افضل محفل وہ ہے جس میں غور و فکر کے گھوڑے *توحید* کے میدان میں دوڑتے ہیں، الٰہی عرفان کی ہوائیں لطف اندوز ہوتی ہیں، محبت کی شراب الٰہی کے سمندر سے پی جاتی ہے اور اچھی نظر آتی ہے (*حسن الذون*)() خدا پر ڈالا جاتا ہے"۔ امام شافعی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ معاملات کو صحیح طریقے سے دیکھنے سے غلطی سے بچایا جاتا

ہے، حقائق کی بنیاد پر استقامت انسان کو پچھتاوے سے بچاتا ہے، غور و فکر اور غور و فکر سے حکمت اور احتیاط ظاہر ہوتی ہے، ذہین لوگوں سے مشورہ استقامت اور پختہ بصیرت کو فروغ دیتا ہے، اس لیے عزم کرنے سے پہلے غور و فکر کرنا، کرنے سے پہلے غور و فکر کرنا اور انجام دینے سے پہلے مشورہ کرنا۔

غور و فکر کی حقیقت اور اس کے پھل: غور و فکر کا مفہوم یہ ہے کہ دل میں دو فہم موجود ہیں تاکہ وہ تیسری تفہیم کو جنم دیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ جو شخص دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتا ہے، یہ سمجھنا چاہتا ہے کہ آخرت کو اپنانا دنیا کو اپنانے سے بہتر ہے (دنیا کی زندگی میں مکمل طور پر غرق ہونا)، تو اس فہم کے حصول کے چار طریقے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ کسی اور سے یہ سننا ہے کہ آخرت کو ترجیح دینا دنیا کو ترجیح دینے سے بہتر ہے، ایسے شخص کی پیروی کرنا اور اس کی حقیقت کو سمجھے بغیر اس کا پتہ لگانا اور اپنے اعمال کے ذریعے صرف اس بات پر اعتماد کرنا اور آخرت کی طرف مائل ہو جائے۔ اس کو "تقلید" کہا جاتا ہے نہ کہ "سمجھ" (معارفہ)۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ انسان کو معلوم ہو کہ باقی رہنے والی چیز کو ترجیح دینا بہتر ہے اور پھر جان لیا جائے کہ آخرت ہمیشہ رہنے والی ہے۔ ان دونوں فہم سے تیسری سمجھ یہ حاصل کی جائے گی کہ آخرت کو ترجیح دینا بہتر ہے۔ یہ [تیسرا] تفہیم پہلے دو کے بغیر ممکن نہیں ہے اور ان دونوں [تفہیم] کو دل میں پیش کرنے کے لئے تیسرے کو پیدا کرنے کے لئے "عکاسی" ، یقین ، توقف [غور و فکر] ، اور غور و فکر کہا جاتا ہے۔ جہاں تک غور و فکر ، توقف اور غور و فکر کا تعلق ہے ، یہ مختلف الفاظ ہیں جو ایک ہی معنی کو ظاہر کرتے ہیں۔ غور و فکر کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے علم میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ تفہیم ملتی ہے جو پہلے موجود نہیں تھی۔ جب علم اور حکمت کے نکات دل میں جمع ہوتے ہیں اور ایک خاص ترتیب میں اکٹھے ہوتے ہیں تو اس سے ایک نئی تفہیم پیدا ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ، ایک تفہیم دوسری تفہیم کا پھل یا نتیجہ ہے ، اور جب نئی تفہیم ایک مختلف [سابق] تفہیم کے ساتھ مل جاتی ہے تو اس سے ایک اور نئی تفہیم پیدا ہوتی ہے۔ یہ نتائج اور پھل، علم، فہم اور غور و فکر اس طرح بڑھتے رہتے ہیں یہاں تک کہ موت اس کا خاتمہ کر دے یا کچھ ایسی رکاوٹیں سامنے آجائیں جو اس راستے کو روکتی ہیں۔ یہ طریقہ اس شخص کے لیے فائدہ مند ہے جو علم سے فائدہ اٹھاتا ہے اور غور و فکر کے طریقے سے واقف ہو۔ اکثر لوگ علم کی کثرت سے محروم ہیں کیونکہ ان کے پاس سرمایہ نہیں ہے، دوسرے لفظوں میں ان کے پاس وہ فہم نہیں ہیں جو دوسری (نئی) فہم کو جنم دیتی ہیں۔ اس کی مثال ایک ایسے شخص کی ہے جس کے پاس تجارتی سامان نہیں ہے اور وہ منافع کے حصول سے محروم رہتا ہے۔ کچھ لوگوں کے پاس تفہیم کا سرمایہ ہوتا ہے ، لیکن وہ نہ تو ان کے صحیح استعمال سے واقف ہیں اور نہ ہی وہ جانتے ہیں کہ دوسری تفہیم کو فروغ دینے کے لئے ان کو کس طرح درست کرنا ہے۔ لہٰذا، وہ اپنے سرمائے میں اضافہ کرنے کے قابل نہیں ہیں [اس طرح یہ جمود کا شکار ہے]۔ اس سرمائے کو استعمال کرنے اور اسے ایک فہم سے دوسری سمجھ اخذ کرنے کا طریقہ فطری طور پر روشنی الٰہی کے ذریعے دل میں ظاہر ہوتا ہے جیسا کہ انبیاء پر نازل ہوا تھا، لیکن آج کل یہ نایاب ہو گیا ہے۔ [تفہیم کے سرمائے کو استعمال کرنے کا صحیح طریقہ] کبھی کبھی مشق اور سیکھنے کے ذریعہ آتا ہے اور ، اب یہ سب سے عام طریقہ ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ غور کرنے والا شخص سمجھ بوجھ رکھتا ہے اور ان فہم کے نتائج اور ثمرات بھی رکھتا ہے، لیکن اس کے حصول کے احساس کو نہیں جانتا اور نہ ہی دوسروں کے سامنے اس کے اظہار کا طریقہ جانتا کیونکہ وہ اظہار کی صلاحیت سے محروم ہے۔

غور و فکر کے ثمرات اور نتائج: اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ غور و فکر کا مطلب یہ ہے کہ تیسری کو حاصل کرنے کے لیے دل میں دو فہم لائیں۔ غور و فکر کے ثمرات (نتائج) علم، اندرونی حالتیں، یا [اچھے، اعلیٰ اور راستباز] اعمال، یا تینوں ہو سکتے ہیں۔ تاہم ، اس کا خاص نتیجہ صرف علم ہے۔ یقینا جب علم دل سے حاصل ہوتا ہے تو دل کی کیفیت بدل جاتی ہے اور جب دل کی کیفیت بدلتی ہے تو اعضاء سے نکلنے والے اعمال بھی بدل جاتے ہیں، گویا عمل باطنی کیفیت کے تابع ہے، اور حالت علم کے تابع ہے، اور علم غور و فکر کے تابع ہے، اور غور و فکر ہر چیز کی اصل ہے اور ان کی کلید ہے۔ اس سے غور و فکر کی فضیلت ثابت ہوتی ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غور الٰہی سے افضل ہے کیونکہ اس میں الہی ذکر کے ساتھ ساتھ کچھ بھی اضافی ہے۔ لیکن دل کی الٰہی یاد [صرف زبان کے برعکس] اعضاء کے اعمال سے افضل ہے۔ بہرحال غور و فکر تمام اعمال سے افضل ہے، اس لیے کہا گیا ہے کہ غور و فکر ایک لمحہ عبادت کے پورے سال سے افضل ہے۔ بعض اہل عقل کا کہنا ہے کہ غور و فکر کرنے والا وہ شخص ہے جو دل کو قابل مذمت چیزوں (صفات اور کردار کی خصوصیات) سے قابل تعریف چیزوں (صفات اور کردار کی خصوصیات) کی طرف منتقل کرتا ہے اور اسے لالچ سے پرہیز اور قناعت کی

طرف موڑ دیتا ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ غور و فکر سے مراد خدا کی گواہی دینا ہے (*مشاہدہ*) اور پرہیزگاری سے خوف، تعظیم اور خدا کا خوف (*تقویٰ*)۔

اگر آپ غور و فکر کے ذریعے حالت کی تبدیلی کی حالت جاننا چاہتے ہیں تو اس کی مثال وہی ہے جو آخرت کے بارے میں پہلے بیان کی گئی ہے۔ اس مثال پر غور و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آخرت کو ترجیح دینا بہتر ہے۔ جب یہ سمجھ ہمارے دلوں میں یقین کے ساتھ پیوست ہو جاتی ہے تو وہ خود آخرت کی محبت اور دنیا میں پرہیز کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ ہم نے اس جھکاؤ کو [اندرونی روحانی] حالت کے ساتھ سمجھا ہے۔ اس سمجھ سے پہلے دل کی کیفیت ایسی تھی کہ وہ عارضی اور عارضی (دنیا) کو پسند کرتا تھا اور اس کی طرف مائل تھا اور آخرت سے مایوس تھا اور اس کی طرف بہت کم رجحان رکھتا تھا۔ لیکن جب یہ سمجھ حاصل ہوئی تو دل کی حالت مکمل طور پر بدل گئی، اس کے ارادے اور اس کے میلان میں تبدیلی واقع ہوئی۔ پھر ارادے کی تبدیلی نے اعضاء کو دنیا کو ایک طرف رکھ کر آخرت کے اعمال کی طرف مائل ہونے پر مجبور کر دیا۔

عکاسی کی پانچ ڈگری

غور و فکر کے پانچ درجات ہیں - پہلا یہ ہے کہ دوسرے لفظوں میں، دل میں [پہلے سے] دو فہم کو اکٹھا کرنا؛ دوسرا غور و فکر ہے جو پہلی دو تفہیم سے ایک نئی تفہیم حاصل کرنا ہے جو مقصد ہے۔ تیسری ڈگری یہ ہے کہ مطلوبہ فہم حاصل کیا جائے اور اس سے دل کو روشن کیا جائے۔ چوتھا درجہہ یہ ہے کہ دل فہم کی روشنی حاصل کرنے کے بعد اپنی سابقہ حالت سے بدل جاتا ہے۔ اور پانچواں درجہ یہ ہے کہ [جسمانی] اعضاء دل کی اس کی تبدیل شدہ حالت کے مطابق خدمت کرتے ہیں۔ جس طرح کسی پتھر کو لوہے سے ٹکرانے سے آگ پیدا ہوتی ہے جو کسی تاریک جگہ کو اپنی روشنی سے روشن کرتی ہے اور آنکھ اسے دیکھنا شروع کر دیتی ہے جبکہ اس نے پہلے اسے نہیں دیکھا تھا اور اعضاء عمل کے لیے جاگتے ہیں، اسی طرح فہم کی روشنی کے آگ کے پتھروں کی کیفیت بھی ہوتی ہے۔ اس آگ کے پتھر کا نام وہ عکس ہے جو دو تفہیم کو یکجا کرتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے آگ اور پتھر کا امتزاج اور دونوں کے درمیان ایک مخصوص امتزاج استعمال کیا جاتا ہے، اور بالکل اسی طرح جیسے لوہے کو ایک خاص انداز میں پتھر سے مارا جاتا ہے جس سے فہم کی روشنی پیدا ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح آگ لوہے سے پیدا ہوتی ہے اور دل اپنی روشنی سے بدل جاتا ہے اور اس سمت کی طرف مائل ہوجاتا ہے جس کی طرف وہ پہلے جھکاؤ نہیں رکھتا تھا اور اس آگ کی روشنی میں آنکھ ان چیزوں کو دیکھنے کے قابل ہوتی ہے جو پہلے دیکھنے کے قابل نہیں تھیں۔

اس کے باوجود ، غور و فکر کا ثمر علم اور ریاست دونوں ہیں۔ علم کی نہ تو کوئی حد ہے اور نہ ہی دلوں پر نازل ہونے والی روحانی حالتوں کی کوئی حد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی روحانی مسافر ان معاملات کو گھیرنا چاہتا ہے جہاں غور و فکر کی گنجائش ہے تو ایسا کرنا ممکن نہیں ہوگا کیونکہ غور و فکر کے بے شمار مواقع ہوتے ہیں اور اس کے ثمرات کی کوئی حد نہیں ہے۔ بہرحال ہماری کوشش ہوگی کہ ان تمام مواقع کو مختصرا تحریری طور پر بیان کیا جائے جو راہ الٰہی کی کاہشوں سے متعلق ہیں تاکہ ہم غور و فکر کے مواقع سے آگاہ ہوں۔

غور و فکر کے مواقع یا راستے: یہ جان لینا چاہیے کہ کبھی کسی ایسے معاملے میں غور و فکر ہوتا ہے جس کا تعلق راہ الٰہی سے ہے اور کبھی کسی ایسے معاملے میں جس کا تعلق راہ الٰہی سے نہیں ہے۔ یہاں ہماری فکر راہ الٰہی سے متعلق معاملات ہے، اس لیے ہم یہاں دیگر معاملات کو نظر انداز کرتے ہیں۔ راہ الٰہی سے مراد وہ معاملہ ہے جو بندے اور رب کے درمیان ہو۔ بندے کی تمام عکاسی یا تو اس کی اپنی باطنی خصوصیات یا باطنی کیفیات سے متعلق ہوتی ہے یا وہ خدا یا اس کی الہی صفات اور اعمال کے بارے میں ہوتی ہے۔ جو لوگ خدا کی راہ پر گامزن ہیں اور اس سے ملنے کے خواہشمند ہیں، ان کی حالت محبت کرنے والوں کی کیفیت سے زیادہ مماثلت رکھتی ہے۔ آئیے

فرض کریں کہ ایک سچا عاشق ہے اور کہتے ہیں کہ جو شخص پوری طرح محبت میں ڈوبا ہوا ہے، ایسے شخص کا عکس یا تو محبوب سے تعلق رکھتا ہے یا اپنے نفس سے ہے۔ اگر کوئی محبوب پر غور کرتا ہے تو وہ یا تو محبوب کی خوبصورتی پر غور کرتا ہے، یا محبوب کے وجود میں اس لیے غور کرتا ہے کہ وہ اس عکس سے لطف اندوز ہو سکے، یا ان صفات پر غور کرے جو محبوب کی اچھائی اور کمال سمجھی جاتی ہیں تاکہ غور و فکر کی لذت مزید بڑھ جائے۔ اگر کوئی شخص اپنی ذات پر غور کرے تو وہ دو حالتوں سے خالی نہیں ہوتا: یا تو وہ ان صفات کی عکاسی کرتا ہے جو محبوب کے قریب اچھی نہیں ہیں اور جو محبوب کی نظر میں ذلیل اور ذلیل کرتی ہیں، یا وہ ان صفات پر غور کرتا ہے جو محبوب کو پسند کرتی ہیں جو اسے محبوب کے قریب لے جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ کسی اور معاملے پر غور و فکر کرنا محبت سے خارج ہے اور نقصان کا سبب ہے کیونکہ سچا عاشق وہ ہے جو معشوق کی محبت میں مکمل طور پر غرق رہتا ہے، اس حد تک کہ کسی کے دل میں کسی اور سوچ یا غور و فکر کی گنجائش نہیں بچتی۔ خدا کا عاشق بھی ایسا ہی ہونا چاہیے اور اس کی نظر اور غور محبوب سے زیادہ نہ ہو۔

پہلی قسم کی عکاسی - نفس سے متعلق: جب تک بندے کا عکس اوپر بیان کردہ چار اقسام پر مرکوز رہے گا (تمام انسانی عکاس یا تو اس کی اپنی باطنی صفات یا کیفیات سے متعلق ہیں یا وہ خدا یا اس کی الٰہی صفات اور اعمال کے بارے میں ہیں)، انسان محبت کے مقصد سے الگ نہیں ہوتا۔ اب ہم ان چاروں اقسام کا الگ الگ جائزہ لیں گے۔ آئیے اپنی خود کی حالتوں اور خصوصیات (اندرونی کردار کی خصلتوں) پر غور کرنے سے متعلق پہلی قسم کو دیکھیں تاکہ آپ اچھ andے اور برے کے درمیان فرق کرسکیں۔ پھر وہ تمام معاملات جو خدا کو پسند یا ناپسند ہیں، دو قسم کے ہیں: ظاہری اعمال جیسے [الہامی] اطاعت اور گناہوں کے اعمال، اور باطنی اعمال جیسے نجات دہندہ باطنی صفات یا تباہ کن باطنی صفات (دل کی کردار کی خصوصیات)۔ ان تمام داخلی خصوصیات کا مرکز دل ہے۔ اطاعت اور گناہوں میں سے بعض ایسے بھی ہیں جن کا تعلق سات اعضاء سے ہے اور بعض کا تعلق پورے جسم سے ہے مثلا والدین کی نافرمانی کرنا یا کسی ناجائز جگہ پر رہنا۔ جن چیزوں کو خدا ناپسند کرتا ہے ان پر تین طریقوں سے غور کیا جانا چاہیے: اول، کیا خدا ان چیزوں کو پسند کرتا ہے یا نہیں؟ بعض اوقات کسی چیز [برائی] کی نفرت فوری طور پر ظاہر نہیں ہوتی ہے اور کسی کو چیزوں کو باریک بینی سے دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ اگر یہ معاملات خدا کو ناپسند ہیں تو پھر ان سے بچنے کا کیا طریقہ ہے؟ اور تیسری بات یہ کہ اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ اس وقت جو ناپسندیدہ صفت اس کے پاس ہے، اسے کیسے چھوڑ دینا چاہیے، یا اگر مستقبل میں اسے حاصل کرنے والا ہے، یا کسی کے پاس ماضی میں تھا اور اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اس کی تلافی کیسے کی جائے۔ اسی طرح ، کسی کو ان تینوں طریقوں سے محبوب چیزوں پر غور کرنا چاہئے۔ [خلاصہ میں،] ہم نے اس [پہلے] قسم [نفس سے متعلق عکاسی] کو چار اقسام میں شامل کیا ہے: اطاعت کے اعمال، گناہ، تباہ کن صفات، اور نجات دہندہ صفات۔ ہم ہر قسم کی مثال کے ساتھ بیان کریں گے تاکہ روحانی مسافر اس سے دوسری تمام اقسام کو اخذ کر سکیں تاکہ کسی کے لیے وسیع میدان میں غور و فکر کا دروازہ کھل جائے۔

پہلی قسم - گناہ: ہر صبح انسان کو سات اعضاء کا تفصیل سے اور باقی جسم کا عمومی احتساب کرنا چاہیے۔ اگر وہ گناہ میں ملوث ہیں تو اسے ترک کر دینا چاہیے۔ اگر وہ کل گناہ میں ملوث ہو تو اس کی تلافی [کفارہ کے ذریعے] کرنی چاہیے۔ اور اگر کوئی کل اس میں شامل ہونے والا ہے تو اسے اس سے بچنے کے لئے تیار رہنا چاہئے اور اس سے دور رہنا چاہئے۔ مثال کے طور پر زبان کے اعمال کا جائزہ لینا چاہیے اور یہ تصور کرنا چاہیے کہ وہ مسلسل غیبت، جھوٹ، خود کو فروغ دینے اور خود پروجیکشن (خود اعتمادی، تکبر، انا پرستی اور خود راستبازی کے اجزاء ہیں)، دوسروں کا مذاق اڑانا، لوگوں کی گفتگو کاٹنے، دوسروں کو برا کہنے اور بیکار معاملات میں مداخلت کرنے میں مصروف ہے۔ سب سے پہلے اس بات کو پختہ کر دینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ان چیزوں کو شدید ناپسند کرتا ہے، پھر قرآنی آیات اور نبوی کی روایات پر غور و فکر کرے جو عذاب الٰہی کے بارے میں پیشگی تنبیہ کرتے ہیں، پھر دیکھے کہ اپنے گناہوں کی وجہ سے خدا کے عذاب کا مستحق ہونے والا ہے [اور اس لیے اس پر اپنے سوا کوئی قصور نہیں ہے]۔ اس کے بعد اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ کس طرح اپنے آپ کو ان گناہوں سے بچایا جائے اور جان لیا جائے کہ ان گناہوں سے بچنے کا کوئی راستہ اس کے سوا نہیں کہ تنہائی اختیار کی جائے اور ایسے متقی اور پرہیزگار شخص کی صحبت اختیار کی جائے جو ہر اس بات پر سزا دیتا ہے جو خدا کو ناپسند ہے۔

اسی طرح کانوں کے بارے میں غور کرنا چاہیے کہ اس کے ذریعے سے غیبت، جھوٹ، فضول باتیں، فحش باتیں اور بدعت (بدعت *یا مستند روایت سے انحراف)* سنائی دیتی ہے۔ یہ باتیں بہت عام ہیں اور کسی سے بھی سنی جا سکتی ہیں، اس لیے انسان کو ان سے اپنے آپ کو تنہائی سے بچانا چاہیے یا حق کی نصیحت کرکے اور برائی کے خلاف نصیحت کرنا چاہیے [حکمت ، نرمی اور خوبصورتی کے ساتھ] کیونکہ یہ سختی کے برعکس صحیح بات کو صحیح طریقے سے حاصل کرنے کے لیے ضروری چیزیں ہیں جو معاملات کو مزید خراب کرتی ہیں۔ معدے پر غور کریں کہ اس کا گناہ کھانے پینے میں ہے۔ بعض اوقات یہ زیادہ کھانے کی وجہ سے ہوتا ہے، اگرچہ یہ کھانا حلال ہے کیونکہ خدا کو لالچ پسند نہیں ہے، اس سے ہوس میں اضافہ ہوتا ہے، جو خدا کے دشمن شیطان کا ہتھیار ہے، اور بعض اوقات وہ حرام اور مشکوک چیزیں کھا کر گناہ کا ارتکاب کرتا ہے۔ کھانے سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ کھانا کہاں سے آ رہا ہے (چاہے وہ خالص اور حلال ذرائع سے آ رہا ہو یا ناپاک اور ناجائز ذرائع سے]۔ پھر یہ صرف کھانے پینے کے لیے مخصوص نہیں ہے، بلکہ اس کے لباس اور رہائش گاہ پر غور کرنا چاہیے کہ آیا یہ کسی کے لیے حلال ذرائع سے یا حرام یا مشکوک ذرائع سے دستیاب ہوئے ہیں۔ کسی کو یہ دیکھنے کے لئے آمدنی کے ذرائع پر بھی غور کرنا چاہئے کہ آیا وہ قانونی ہیں یا نہیں۔ اگر وہ ناجائز ہیں (یا غیر اخلاقی ہیں جیسے دھوکہ دہی، چوری، دھوکہ دہی اور ڈکیتی) تو انسان کو آمدنی کے قانونی ذرائع پر غور کرنا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ کس طرح حرام (حرم) کے معاملات سے دور رہ سکتا ہے اور اپنے نفس کو اس بات پر قائل کر سکتا ہے کہ تمام عبادات حرام چیزیں کھانے سے ضائع ہو جاتی ہیں [یا اپنے فائدے کے لیے ناجائز آمدنی کا استعمال] کیونکہ عبادت کی بنیاد حلال غذا کھانا ہے [یا حلال اور حلال ذرائع سے روزی روٹی کمانا]۔ تمام اعضاء پر یکساں طور پر غور کرنا چاہیے۔ یہاں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ کافی ہے۔ امید ہے کہ غور و فکر کے ذریعے ان کیفیات کی صحیح اور حقیقی تفہیم حاصل کرنے والا سارا دن ان اعضاء پر نظر رکھے گا اور یہ نگرانی اعضاء کو گناہوں سے بچائے گی۔

دوسری قسم: اطاعت کے اعمال: متلاشی خدا یا مسافر (*سالک*) کو چاہیے کہ وہ ان اعمال پر غور کرے جو کسی پر واجب کیے گئے ہیں، دوسرے لفظوں میں یہ دیکھنا چاہیے کہ ان کو کس طرح انجام دیا جائے، ان کو عیبوں اور خامیوں سے کیسے بچایا جائے، اور اگر ان میں کوئی عیب واقع ہو جائے تو اس کی تلافی عبادت کے ذریعے کیسے کی جا سکتی ہے۔)، اور تمام اعضاء کے بارے میں سوچیں اور ان سے خدا کو کون سے اعمال پسند ہیں۔ مثال کے طور پر یہ خیال کرنا چاہیے کہ آنکھ اس لیے پیدا کی گئی ہے کہ وہ جو کچھ دیکھتی ہے اس سے سبق سیکھے، آسمانوں اور زمین کی الٰہی خوبصورتی کا مشاہدہ کرے اور کتاب اللہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کا مطالعہ کرے۔ اس کے تمام اعضاء، جسمانی وجود، مال، مال، نوکروں، بچوں وغیرہ کو اسی طرح جانچنا چاہیے کیونکہ یہ سب چیزیں وہ آلات ہیں جن کے ذریعے خدا کی اطاعت کی جا سکتی ہے۔ اپنی گہرائی سے غور و فکر کے ذریعے اطاعت الٰہی کی راہیں تلاش کرنی چاہئیں پھر ان باتوں کی تلاش کریں پھر اپنے آپ کو عبادت الٰہی کی طرف مائل کریں۔ اس کے بعد نیت کے خلوص پر غور کرنا چاہیے تاکہ (راستباز) عمل ہر طرح سے پاک اور پاک ہو۔

تیسری قسم - تخریبی صفات: تیسری قسم میں وہ خطرناک صفات (باطنی کردار کی خصلتیں، مزاج اور مزاج شامل ہیں) جو دل میں مرکوز ہیں۔ ان میں ہوس اور لالچ کا غلبہ، غصہ، کنجولی، تکبر، خود راستبازی، دکھاو، حسد، دوسروں کے بارے میں برے خیالات رکھنا، غفلت، غرور وغیرہ شامل ہیں۔ اپنے دل کا جائزہ لینا چاہیے کہ یہ [قابل مذمت اور منفی خصلتیں] دل میں پائی جاتی ہیں یا نہیں۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ دل ان صفات سے پاک ہو گیا ہے تو اسے دل کی جانچ کے طریقہ کار کے بارے میں سوچنا چاہیے اور ان اشاریوں کو تلاش کرنا چاہیے جو اس تشخیص کو ثابت کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص عاجزی اور تکبر سے استثنیٰ کا دعویدار ہے تو اسے بازار میں جانا چاہیے اور اپنے سر پر لکڑیوں کا ایک پیکٹ ڈالنا چاہیے (پرانے زمانے میں عاجزی اور عاجزی کی نشانی) تاکہ اس کی عاجزی کا اندازہ لگایا جا سکے۔ پہلے وقتوں میں لوگ (روحانی راہ میں جدوجہد کرتے ہوئے) اپنے آپ کو اسی طرح آزمایا کرتے تھے۔ اس غور و فکر کا مقصد یہ دیکھنا ہے کہ دل ان ناپسندیدہ صفات سے وابستہ ہے یا نہیں۔ اگر اشارے ان صفات کی موجودگی کو ظاہر کرتے ہیں تو انسان کو ان چیزوں پر غور کرنا چاہیے جس سے یہ صفات اپنے آپ کو بری نظر آئیں اور یہ بات واضح ہو جائے کہ ان صفات کا سرچشمہ جہالت، غفلت اور باطنی برائی ہے۔ اگر کسی شخص کو اپنے نفس میں تکبر کا احساس ہو تو وہ نفس کو اس کی حماقت سے آگاہ کرے اور اسے سمجھائے کہ آپ اپنے نفس کو (عزت و آبارت) میں بڑا سمجھتے ہیں بلکہ وہ بڑا ہے جو خدا کی نظر میں بڑا ہے اور یہ بات مرنے کے بعد ہی معلوم ہو گی کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کون بڑا ہے۔ جب یہ معلوم ہو جائے کہ تکبر مہلک ہے اور

اس کی ابتدا حماقت ہے تو اس کے علاج پر غور کرنا چاہیے اور اس کے علاج کے لیے یہ حکمت عملی اختیار کرنی چاہیے کہ وہ عاجز لوگوں کے طریقے اختیار کرے۔ اسی طرح اگر کسی میں خوراک کی لالچ اور ہوس ہو تو اسے یہ سوچنا چاہیے کہ یہ درندوں کی صفت ہے۔ اگر کھانے کی ہوس یا جماع کی ہوس میں کوئی کمال ہوتا تو وہ خدا اور فرشتوں کی صفت ہوتی جیسے علم و قابلیت اور جانوروں کو یہ صفت نہ ملتا۔ جس حد تک یہ ہوس کسی پر غالب ہو گی، اس حد تک انسان جانوروں سے مشابہت رکھتا ہے اور خدا کے قریب فرشتوں سے دور ہو جائے گا۔

چوتھی قسم - نجات دہندہ خصلتیں: نجات دہندہ صفات (اعلیٰ باطنی خصلتیں، مزاج اور مزاج جو دل میں مرکوز ہیں) ہیں توبہ، پچھتاوا اور گناہوں پر شرمندگی، مصیبتوں میں صبر، نعمتوں پر شکر گزاری، خوف خدا، امید، دنیا میں پرہیز، اخلاص، اطاعت الٰہی میں سچائی، خدا سے محبت اور اس کی تعظیم کرنا، اعمال الٰہی کی قبولیت، الٰہی کی تڑپ، عاجزی عاجزی وغیرہ۔ ایک بندے کو چاہیے کہ وہ ہر روز اپنے دل کی طرف دیکھے اور دیکھے کہ ان صفات میں سے کون سی خوبی ہے جو انسان کو خدا کے قریب لے جاتی ہے۔ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ کسی کو کسی خاص صفت کی ضرورت ہے تو یہ سوچنا چاہیے کہ یہ صفات [باطنی] حالتیں ہیں اور حالتیں علم کا ثمر ہیں اور علم [اور فہم] غور و فکر کا ثمر ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی شخص اپنے نفس کے لیے توبہ اور پشیمانی کی حالتوں کا ارادہ رکھتا ہے تو اس کے لیے سب سے پہلے اپنے تمام گناہوں کا جائزہ لینا چاہیے، ان پر غور کرنا ہوگا، ان سب کو اپنے نفس پر یکجا کرنا ہوگا، اور ان کو اپنے دل میں بڑا سمجھنا ہوگا۔ اس کے بعد انسان کو گناہوں کے بارے میں شریعت الٰہی میں آنے والی ملامت پر ایک نظر ڈالنی چاہیے، اور دل میں یہ یقین رکھنا چاہیے کہ وہ خدا کی ناراضگی حاصل کرنے والا ہے [ان میں ان کی مسلسل موجودگی اور استقامت کی وجہ سے]۔ اس سوچ کو اس وقت تک جاری رکھا جاتا ہے جب تک کہ دل میں شرمندگی اور پچھتاوے کی کیفیت پیدا نہ ہو جائے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص شکر گزاری کی کیفیت حاصل کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ پہلے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور نعمتوں کا مطالعہ کرے اور یہ سوچے کہ اس نے اپنے گناہوں پر اپنا خوبصورت پردہ ڈال دیا ہے [تاکہ اس کی گھناؤنی کیفیت کو عوام کے سامنے ظاہر نہ کیا جائے، اور یہ احساس اس شخص کو شکر گزاری سے بھر دیتا ہے]۔ جب کوئی شخص خدا کی محبت اور تڑپ کی کیفیت پیدا کرنا چاہتا ہے تو اسے خدا کی خوبصورتی اور عظمت اور خدا کی عظمت اور بلندی پر غور کرنا چاہیے۔ ایسا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے خدا کی حیرت انگیز حکمت [جو ہمارے ارد گرد ہماری حالتوں، زندگین، تخلیقات، فطرت اور ہمارے ارد گرد کی ہر چیز اور ہمارے باطن میں واضح ہے] پر نظر ڈالیں اور اس کی خوبصورت الہی صفات (صفات) پر نظر ڈالیں، پھر اس کی عظمت اور خوبصورتی پر غور و فکر کریں۔ اگر خوف خدا کی کیفیت مطلوب ہو تو پہلے اپنے اپنے باطنی اور ظاہری گناہوں پر نظر ڈالنی چاہیے پھر اس کی موت پر غور کرنا چاہیے اور موت کے بعد اس کے سامنے آنے والے واقعات اور نظریات پر غور کرنا چاہیے (جو نبوت کی روایات میں واضح طور پر بیان کیے گئے ہیں]، مثال کے طور پر، موت سے پہلے، موت کی اذیتوں سے نمٹنا پڑتا ہے، فرشتوں (*منکر نکیر*) سے پوچھ گچھ کرنی پڑتی ہے جو مرنے کے بعد قبر کی سزا دیتے ہیں، اس کے سانپوں، بچھوؤں اور کیڑوں کا سامنا کرنے پر غور کرنا چاہیے، پھر صور پھونک دیا جائے گا، قیامت کا میدان پھیلا دیا جائے گا، اس دن کی ہولناکیوں اور احتساب کی شدت پر غور کرنا چاہیے جب ہر ذرے کے لیے جوابدہ ٹھہرایا جائے گا (وہ چھوٹی سی چیز جسے دنیا کے دوران غیر اہم سمجھا جاتا تھا قیام)۔ یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن مجید نے جہنم کے بارے میں کیا روایت کی ہے۔ اگر امید کی کیفیت مطلوب ہو تو جنت کی نعمتوں اور آسائشوں، اس کے باغات، درختوں، نہروں اور اس کے باشندوں پر غور کرنا چاہیے اور غور کرنا چاہیے کہ یہ تمام نعمتیں اور آسائشیں ابدی ہیں۔

یہ خارجی یا وحی علم (*علون المعاملہ*) اور اچھی اور بری باطنی صفات میں غور و فکر کا طریقہ ہے۔ ایک مبتدی روحانی مسافر کو چاہیے کہ وہ اپنا وقت ان عکاس میں اس وقت تک مصروف رکھے، جب تک کہ اس کا دل اعلیٰ اور اعلیٰ باطنی صفات، خصوصیات، مزاج اور مزاج سے مزین نہ ہو جائے، عظیم روحانی درجات سے روشن ہو جائے اور اس کا باطن اور بیرونی وجود تمام ناپسندیدہ خصلتوں سے پاک ہو جائے۔ یہاں اس مقام پر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اگرچہ ان معاملات میں غور کرنا ایک عمدہ عبادت ہے لیکن یہ اصل مقاصد نہیں ہیں۔ خدا کے عرفان اور مقربوں کا اصل مقصد یہ ہے کہ وہ خدا کی عظمت اور خوبصورتی پر غور کریں اور اس عکس میں اس طرح غرق ہو جائیں کہ وہ اپنے نفس سے بھی فنا ہو جائیں [تاکہ نفس کا کوئی نشان باقی نہ رہے اور کوئی شخص اپنی حضوری کو حاصل کرے]، دوسرے لفظوں میں، وہ اپنے نفس کو نظر انداز کرتے ہیں، ان کی اپنی حالتیں، ان کے اپنے روحانی مقامات، ان کی اپنی اندرونی خوبیاں اور سب کچھ۔ محبوب کے عکس میں ان کی حالت محبوب کو دیکھنے پر سچے عاشق کی

حالت کی طرح ہے۔ اس وقت انسان میں یہ شعور بھی نہیں ہوتا کہ وہ اپنی کیفیت پر ایک نظر ڈالے، اپنی خوبیوں پر توجہ دے سکے، بلکہ وہ دنگ رہ جاتا ہے اور اپنی ذات کا سب کچھ بھول جاتا ہے۔ محبت کرنے والوں کے لیے یہ سب سے زیادہ لذت ہے۔

یہاں جس غور و فکر کا ذکر ہو رہا ہے وہ ان معاملات سے متعلق ہے جو دلوں کو اعلیٰ باطنی صفات، خصوصیات، مزاج اور مزاج سے آراستہ کرتے ہیں تاکہ وہ قربت اور معشوق سے ملاقات کی لذت حاصل کرے۔ اگر کوئی پوری زندگی دل کی اصلاح میں گزارے تو وہ قربت اور معشوق سے ملاقات کی لذت کب حاصل کرے گا؟ خدا میں فنا (*فانا*) خدا کے متلاشیوں کا اصل مقصد ہے، اور خدا کے گنوسٹک اور مقربوں کے لیے خوشنودی کی چوٹی ہے۔ ایک روحانی مسافر کو چاہیے کہ وہ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، ایک معمول بنائے اور دن رات اس پر عمل کرے اور ہر وقت نفس سے غفلت نہ برتے، ان [قابل مذمت باطنی] صفات سے جو انسان کو خدا سے دور کرتی ہیں، اور ان [باطنی] حالتوں سے غافل نہ ہو جو انسان کو خدا کے قریب لاتے ہیں۔ بلکہ ہر روحانی مسافر کو چاہیے کہ وہ اپنی تمام اچھی اور بری صفائیوں، گناہوں اور اطاعت کے اعمال کو نوٹ کرنے کے لیے ایک نوٹ بک رکھے، اور ہر روز ان کی طرف دیکھے تاکہ نفس کو آزمایا جا سکے [یہ دیکھنے کے لیے کہ آیا کوئی تمام بری صفائیوں کو قابو کرنے اور ختم کرنے اور اپنے دل و روح کو تمام اچھی خوبیوں سے آراستہ کرنے میں بہتر ہو رہا ہے یا نہیں]۔

تباہ کن اور نجات دہندہ اندرونی خصوصیات: اگرچہ ان گنت تباہ کن خصوصیات ہیں لیکن نجات دہندہ خصوصیات بھی ہیں۔ تاہم ، اگر دس تباہ کن اور دس نجات بخش خصوصیات پر گہری نظر رکھی جائے تو یہ کافی ہوگا۔ یہ دس تخریبی صفات یہ ہیں: کنجولی، تکبر، تکبر، دکھاو، حسد، غصہ، لالچ، ضرورت سے زیادہ ہوس، دولت سے محبت اور شہرت اور طاقت سے محبت۔ امید ہے کہ جو شخص ان سے اپنے آپ کو بچائے گا وہ اپنے آپ کو تمام مذمت صفات سے بچا سکے گا [کیونکہ یہ دس تمام برائیوں اور برائیوں اور منفیات کا سرچشمہ ہیں]۔ پھر نجات بخش صفات [جو مثبتیت، شرافت، عظمت، سکون، نیکی اور کامیابی سے آراستہ ہیں] ہیں شرم اور گناہوں پر پچھتاو، مصیبتوں میں صبر، خدا کی مرضی کو قبول کرنا، چاہے وہ اچھی ہو یا برے، تمام نعمتوں پر شکر گزاری، خدا سے خوف اور امید کے درمیان توازن رکھنا، دنیا میں پرہیز کرنا، اعمال میں اخلاص۔ خدا کی تمام مخلوقات کے ساتھ اچھا سلوک ، خدا کی محبت ، اور خدا کی خاطر عاجزی۔ اگر یہ بیس خوبیاں روحانی مسافر کی کتاب میں درج ہیں تو علاج مشکل نہیں رہتا۔ علاج کا طریقہ یہ ہے کہ انسان ان بیس معاملات میں سے کسی ایک پر غور و فکر سے شروع ہوتا ہے۔ جب ایک بری خوبی کا خاتمہ ہو جاتا ہے تو وہ اسے نوٹ بک میں عبور کر سکتا ہے، اس کے بارے میں فکر کرنا چھوڑ سکتا ہے، خدا کا شکر ادا کر سکتا ہے کہ اس نے اس برائی سے نجات دلائی اور اس سے اپنے دل کو پاک کر دیا، اور جان لیا کہ اس برائی کے دل کو صرف خدا کی دی ہوئی قابلیت اور مدد سے پاک کر دیا ہے۔ اگر خدا نے یہ معاملہ اپنے آپ پر چھوڑ دیا ہوتا تو کوئی شخص اپنے دل سے برائی کا ذرہ برابر بھی مٹا نہ پاتا۔ اس کے بعد باقی ماندہ معاملات پر توجہ دینی چاہیے اور ان میں سے ہر ایک پر غور و فکر کرنا چاہیے اور ان کو دور کرنا چاہیے۔ جب ایسا ہوتا ہے تو ، کسی کو اسے نوٹ بک میں اس وقت تک عبور کرنا چاہئے جب تک کہ وہ تمام تباہ کن خصوصیات سے آزاد نہ ہوجائے۔ پھر نجات دہندہ باطنی صفات کے لیے بھی ایسا ہی کرنا چاہیے اور ان اعلیٰ صفات کو ایک ایک کر کے اپنانا چاہیے اور جب ایسا ہوتا ہے تو انہیں نوٹ بک میں لکھ دینا چاہیے، یہاں تک کہ تمام اعلیٰ باطنی صفات حاصل کر لی جاتیں۔ یہ ایک فعال روحانی مسافر (*مرید) کا معمول ہونا چاہیے۔*

یہ بیرونی علم (*علوم المعاملہ*) میں غور و فکر کا طریقہ تھا جسے متقی اور علماء نے اپنایا تھا۔ جب وہ اس طریقے سے کام کرتے تھے تو ان میں اپنی ذات کی طرف کوئی جھکاؤ باقی نہیں رہتا تھا بلکہ وہ ان عکاس سے آگے بڑھ کر الٰہی جلال و جلال پر غور کرتے تھے اور دل کی آنکھ سے حسن الٰہی کی لذت کو دیکھتے تھے۔ تاہم ، یہ عکس صرف اس وقت حاصل ہوتا ہے جب انسان تمام تخریبی خصوصیات سے الگ ہوجاتا ہے اور تمام نجات دہندہ اعلیٰ خصوصیات سے مزین ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر یہ (گواہی) اس سے پہلے ظاہر ہوتا ہے تو ، یہ بجلی کی چمک کی طرح ناقص اور عارضی ہوگا جو چمکتا ہے اور پھر غائب ہوجاتا ہے۔ جو شخص تخریبی خصلتوں سے چھٹکارا حاصل کیے بغیر اور باطنی ذات کو نجات دلانے والی صفات کے ساتھ عبادت کرنے میں مشغول ہوتا ہے، وہ اس عاشق کی مانند ہے جو اپنے محبوب کے ساتھ تنہائی پاتا ہے [بے پناہ کوشش کے بعد] لیکن سانپ اور بچھو اس وقت کسی کے کپڑوں میں رینگتے ہوئے کسی کو کاٹ رہے ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان نقصان دہ مخلوقات کے کاٹنے سے

ہونے والا درد اس تنہائی کی تمام لذتیں (بے پناہ محنت اور مصائب کے بعد محبوب کے ساتھ) کھو جائے گا اور تمام لذتیں برباد ہو جائیں گی۔ تباہ کن خوبیاں بھی سانپ اور بچھو کی طرح نقصان دہ ہیں اور وہ الٰہی حسن کی دیکھ بھال کی لذت کو تباہ کرنے والی ہیں۔ ان تباہ کن صفات کی وجہ سے قبر میں [اس دنیا سے ناگزیر ہلاکت کے بعد] جو درد محسوس ہوگا وہ سانپ اور بچھو کے کاٹنے سے [جسمانی] درد سے کہیں زیادہ ہوگا۔ اس تفصیل سے پتہ چلتا ہے کہ کس طرح ایک بندے کو اپنے نفس کی مطلوبہ اور ناپسندیدہ صفات پر غور کرنا چاہیے۔

دوسری قسم کی عکاسی - خدا کی عظمت، عظمت اور عظمت میں: دوسری قسم کی عکاسی یہ ہے کہ بندہ خدا کی عظمت، عظمت اور عظمت کی عکاسی کرتا ہے۔ اس انعکاس کے دو مقام ہیں: پہلا مقام جو افضل ہے وہ ہے کہ الٰہی ہستی اور صفات پر غور کیا جائے اور اسماء الٰہی کے معانی پر غور کیا جائے [جہاں ہر الٰہی نام ایک مخصوص الہامی صفت یا صفت کی نمائندگی کرتا ہے جو وجود کے ہر دائرے میں اس کے ہر پہلو اور مظہر میں پھیلا ہوا ہے]۔ [تاہم،] یہ وہ مقام ہے جس پر [عام آدمیوں کے لئے] حرام کیا گیا ہے جیسا کہ [ایک نبوت میں] کہا گیا ہے کہ اللہ کی مخلوقات میں غور کرو اور اس کے وجود میں غور نہ کرو۔ اس کی ممانعت اس لیے کی گئی ہے کہ عقل [خدا کے وجود کے عکس میں] حیران ہو جاتی ہے۔ صرف خدا کے گنوسٹک اور مقرب ہی اس کی طرف اپنی نگاہیں اٹھانے کی ہمت کرتے ہیں۔ تاہم ان میں بھی اس منظر کے دائمی ہونے کی ہمت نہیں ہے۔ مخلوق کی آنکھوں کے مقابلے میں عظمت الٰہی کی حالت سورج کی روشنی کے مقابلے میں چمگادڑوں کی آنکھوں کی حالت کی طرح ہے۔ چمگادڑ سورج کی روشنی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ یہ دن کے وقت چھپ جاتا ہے اور رات کو سورج کی بقیہ روشنی میں یہ ادھر ادھر اڑتا ہے۔ اور خدا کے عرفان اور مقربوں کی حالت (*صدیقین* جو قرآنی حکم کے مطابق انبیاء کے بعد اعلیٰ درجے کے مالک ہیں) کی حالت سورج میں ایک عام انسان کی طرح ہے جو سورج کی طرف دیکھ سکتا ہے، لیکن اس نظر کے دائمی ہونے کے لیے کوئی برداشت نہیں کرتا، بلکہ یہ خطرہ یہ ہے کہ مسلسل سورج کی طرف دیکھ کر کوئی شخص بینائی کھو دے گا۔ سورج کی طرف ارادے سے دیکھنا، اگرچہ یہ تھوڑی دیر کے لیے کیوں نہ ہو، آنکھوں کو نقصان پہنچانے کا سبب بنتا ہے۔ اسی طرح خدا کی ہستی کو دیکھنے سے حیرت اور حیرت پیدا ہوتی ہے اور عقل پریشان ہو جاتی ہے۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ الٰہی ہستی اور صفات کو اپنے عکس کا مرکز نہ بنایا جائے کیونکہ بہت سی عقلیں اس عکس کو برداشت نہیں کر سکتیں۔ البتہ علماء نے جو تھوڑا سا غور و فکر کیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جگہ اور ماحول اور سمتوں سے آزاد ہے، وہ نہ کائنات میں ہے اور نہ اس سے باہر، نہ اس سے وابستہ ہے اور نہ ہی اس سے الگ ہے۔ کچھ لوگوں کی عقل اس سلسلے میں اس قدر حیران اور پریشان ہو گئی کہ انہوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ ان میں ان باتوں کو سننے یا سمجھنے کی طاقت نہیں تھی۔ کچھ لوگ اس سے کم سطح کی وضاحت بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ جب ان سے کہا گیا کہ خدا اس سے بلند ہے کہ اس کے پاس سر، پاؤں یا ہاتھ، آنکھیں یا کوئی اور جسم ہے جو کسی مقدار یا جسامت میں فٹ ہو سکتا ہے تو ان لوگوں نے اس بات کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور یہ کہنے لگے کہ یہ اللہ کی عظمت و عظمت کی کمی ہے۔ ان بے وقوف لوگوں کا خیال تھا کہ عظمت اور عظمت انسان جیسے اعضاء رکھنے میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان اپنے جسم کو جانتا ہے اور اسے عظیم سمجھتا ہے، اور جو چیزیں اپنی صفات میں اپنی ذات کے برابر نہیں ہیں، وہ انہیں عظیم نہیں سمجھتا۔ زیادہ تر لوگوں کی عقل ایسی ہی ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان ظالم، جاہل اور ناشکرا ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک نبی سے فرمایا کہ میرے بندوں کو میری صفات نہ بتائیں کیونکہ وہ ان سے انکار کریں گے بلکہ انہیں وہ باتیں بتاؤ جو وہ سمجھ سکتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں۔ [خدا] کا احترام، قانون الٰہی اور [خدا] کی مخلوقات (انسانیت) کی اصلاح کا تقاضا ہے کہ ہم خدا کے وجود کے پیچھے نہ جائیں [کیونکہ ہم اپنی محدود عقل سے اس کو سمجھنے کے قابل نہیں ہیں]۔

دوسرا مقام [خدا کی عظمت، عظمت اور عظمت پر غور کرنے کا] یہ ہے کہ ہم خدا کے اعمال، اس کی قابلیت، قدرت اور تخلیقی صلاحیتوں کے عجائبات اور اس کی مخلوقات کے ساتھ اس کے حیرت انگیز معاملات سے متعلق معاملات پر غور کرتے ہیں۔ یہ معاملات ان کی عظمت ، عظمت ، شان و شوکت اور برتری کی تصدیق کرتے ہیں۔ وہ اس کے علم کے کمال، حکمت کے کمال، اس کی صلاحیتوں کے کمال اور اس کی مرضی کے نفاذ کے بارے میں بھی بحث کرتے ہیں۔ ہمیں اس کی صفات کی بجائے اس کی صفات کے اثرات اور مظاہر کو دیکھنا چاہیے کیونکہ ہم اس کی صفات کو دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتے جس طرح ہم سورج کو نہیں دیکھ سکتے۔ زمین کی روشنی سورج کی روشنی کے اثر کی وجہ سے ہوتی ہے اور ایک اثر اس شخص کی طرف اشارہ کرتا ہے جو اثر انداز ہو رہا ہے

اگرچہ اثر انداز ہونے والا نظر نہ آتا۔ زمین پر موجود ہر چیز خدا کی صلاحیتوں کا اثر یا اشارہ ہے اور اس کے وجود کی روشنی سے ایک روشنی ہے۔ عدم یا عدم سے بڑا کوئی تاریکی نہیں ہے اور کوئی روشنی وجود سے زیادہ واضح نہیں ہے۔ تمام چیزوں کا وجود خدا کی ہستی کا نور ہے کیونکہ تمام چیزیں اس کے وجود کے ذریعے موجود ہیں جبکہ اس کا وجود خود ہی موجود ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح موجود چیزوں کی روشنی سورج کی وجہ سے ہوتی ہے [جب وہ سورج کی روشنی سے نظر آتی ہیں، ورنہ وہ اندھیرے میں ڈوب جاتیں]، اور سورج خود ہی روشن ہوتا ہے۔ جب سورج زیادہ روشن ہو جاتا ہے تو اس کی تصویر ایک کنٹینر میں رکھے گئے پانی میں دیکھی جا سکتی ہے کیونکہ آنکھیں اس کی تصویر پر اس طرح رہ سکتی ہیں جیسے پانی کے ذریعے سورج کی چمک کسی حد تک کم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اعمال الٰہی بھی ان اعمال کے کرنے والے (خدا) کی گواہی کا ذریعہ ہیں۔ ہم اس کی صفات کو دیکھتے ہیں اور اس کے وجود کی روشنی سے حیران نہیں ہوتے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

تَفَكَّرُوا فِي خَلْقِ اللّٰهِ وَلَا تَتَفَكَّرُوا فِي ذَاتِ اللّٰهِ

"خدا کی مخلوقات پر غور کرو، اس کے وجود کی عکاسی نہ کرو"۔

ہوس اور نفس کی فریب میں پھنسے ہوئے آپ آسمانوں اور زمین کی سلطنتوں کو دیکھنے سے غافل ہو گئے ہیں اور اب آپ کی نظر میں سلطنت کے مالک اور مالک کی خوبصورتی کی بھی کوئی اہمیت باقی نہیں ہے۔ تمہاری تمثیل اس چیونٹی کی مانند ہے جس نے ایک عالیشان محل میں گھر بنایا ہو۔ وہ محل بلند ، خوبصورت اور مضبوط ہے۔ اس کے خوبصورت حصوں میں نوکر کھڑے ہیں اور قیمتی سامان سے بھرے ہوئے ہیں۔ اگر وہ چیونٹی اپنے سوراخ سے نکل کر اپنی بہن سے مل جائے اور بات کرنے کی توفیق بھی مل جائے تو وہ اپنے تاریک اور تنگ گھر، کم خوراک کی فراہمی اور اپنی معاشی حالت کے علاوہ کسی اور موضوع پر بھی بات نہیں کر سکتی، حالانکہ اس کا ٹھکانہ ایک خوبصورت محل میں ہے۔ اسے اپنی بہن کو یہ بتانا چاہیے تھا کہ وہ ایک عالیشان محل میں رہتی ہے، جس کی دیواریں سونے سے بنی ہیں اور چاندی کا فرش ہے، اس میں خوبصورت لوگوں کا ہجوم ہے جو عمدہ اور قیمتی چیزوں سے مزین ہیں۔ لیکن یہ غریب چیونٹی محل کے بارے میں کچھ نہیں جانتی اور نہ ہی اس کی بینائی اس کے ٹھکانوں اور کھانے سے زیادہ ہے کیونکہ وہ اپنی کوتاہی کی وجہ سے ان معاملات سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ لیکن آپ کی مجبوری کیا ہے؟ تم اپنے تنگ اور ادنیٰ گھر میں رہتے ہوئے، خدا کے وسیع و عریض محل، اس کی اونچی چھتوں اور اس کے خوبصورت سامان اور سامان سے غافل کیوں ہو؟ آپ اس کے آسمانوں میں رہنے والے اس کے فرشتوں سے واقف نہیں ہیں۔ تم آسمان کے بارے میں اتنا ہی جانتے ہو جتنا چیونٹی اپنے گھر کی چھت کے بارے میں جانتی ہے۔ فرشتوں سے آپ کی واقفیت صرف اس حد تک ہے کہ چیونٹی آپ سے یا گھر کے دوسرے رہائشیوں سے واقفیت ہے۔ تاہم چیونٹی میں اس سے زیادہ سمجھ بوجھ کی صلاحیت نہیں ہے اور نہ ہی اس کی چھوٹی سی عقل میں محلات کے عجائبات کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس، آپ کے پاس آسمانی سلطنت میں عکاسی کے گھوڑوں کو چلانے اور اس کے عجائبات کی تفہیم حاصل کرنے کی صلاحیت ہے۔ آپ اس صلاحیت سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے؟

اب ہم اپنے قلم کو غور و فکر کا مزید ذکر کرنے سے روکتے ہیں۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس کی کوئی حد نہیں ہے۔ اگر ہم اپنی لمبی عمر اس کی تشریح میں گزار بھی دیں تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو عرفہ عطا کیا ہے اس کی وضاحت نہیں کر سکیں گے، اگرچہ جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ اللہ کے علماء اور مقربان کے علم کے مقابلے میں بہت کم ہے اور جو کچھ علماء اور مقربان جانتے ہیں وہ خدا کے معزز پیغمبروں کے علم کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ اور جو قابل احترام نبیوں کے پاس ہے، وہ خدا کے قریب فرشتوں کی گنوسس کے سامنے کچھ بھی نہیں ہے۔ پھر اگر تمام فرشتوں، جنوں اور انسانوں کے علم کو خدا کے علم کے سامنے رکھا جائے تو اسے علم کہنا بھی درست نہیں ہوگا، بلکہ اسے حیرت، حیرت، عیب، کوتاہی اور بے معنی کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ تمام خامیوں سے بڑھ کر وہ ہستی ہے جس نے اپنے بندوں کو معرفت عطا کی اور انہیں بتایا کہ:

وَمَآ أُوتِيتُم مِّنَ ٱلْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا

"تمہیں علم دیا گیا ہے لیکن بہت کم ہے۔" (سورة البقرة سورة البقرة آیت 85)

یہ ان طریقوں پر ایک سرسری بحث تھی جن پر لوگوں کو غور کرنا چاہئے۔ یہاں خدا کی ہستی پر غور کرنے کے طریقے کا ذکر نہیں کیا گیا بلکہ صرف خدا کی مخلوقات کی عکاسی کا ذکر کیا گیا ہے تاکہ انسان کو خالق (خدا) کی معرفت حاصل ہو تاکہ اس کی عظمت، خوف اور قابلیت کا ادراک [دل] میں پیدا ہو۔ جس حد تک خدا کی تخلیق اور دستکاری کے عجائبات کی گنوسس میں اضافہ ہوگا، اس حد تک اس کی عظمت ، عظمت اور عظمت کی گنوسس میں اضافہ ہوگا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے آپ کسی عالم سے اپنے علم کی بنیاد پر محبت کرتے ہیں اور آپ کو اس علم کی سمجھ ہے۔ اگر آپ کو اس عالم کا کوئی اور علم ملے یا کوئی انوکھا شعر یا کوئی اور خوبصورت کتاب یا کسی سے کوئی نئی تحقیق ملے تو اس عالم کے لیے آپ کی محبت اور بھی بڑھ جاتی ہے اور اس کی عزت اور عزت مزید بڑھ جاتی ہے۔ اس طرح کے ہر جملے، شعر کا ایک جملہ، اور اس طرح کی تحقیق آپ کے دل میں اس کی عزت اور تعریف میں اضافہ کرتی ہے اور اس کے درجات کو مزید بلند کرتی ہے۔ اسی طرح خدا کی مخلوقات پر بھی غور و فکر کرنا چاہیے۔ یہ آسمان (کائنات اور اس سے ماورا) اور زمین اور جو کچھ اس کے درمیان ہے وہ اس کی کتاب اور تحریر ہے اور یہ تصنیف کا ایک بہت بڑا کام ہے۔ آپ ساری زندگی اس کا مطالعہ کر سکتے ہیں، لیکن یہ کبھی ختم نہیں ہوگا، اور ہر دن، نئے انکشافات اور نئی تفہیم کے دروازے اور راستے آپ کے لیے کھلیں گے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر شخص کا غور و فکر اور گواہی میں صرف اتنا ہی حصہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی اعلیٰ حکمت سے اپنی کاوشوں، روحانی کوششوں، اخلاص، استقامت اور سب سے بڑھ کر خدا کی مرضی کے مطابق تقسیم کیا ہے۔

ہم اس بحث کو یہیں ختم کریں گے۔ "شکر گزاری کی کتاب" (باب 12) میں، ہمارا موضوع خدا کی مخلوقات تھا۔ البتہ یہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ ہم پر عطا کیا ہے وہ اس کا فضل و ثواب اور فضل ہے اور یہاں یہ اس حقیقت کے حوالے سے موجود ہے کہ یہ اس کا عمل ہے اور ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے۔ یہاں ہم نے جن چیزوں پر غور کیا ہے ان پر ایک فلسفی کی طرف سے بھی غور و فکر کیا جاتا ہے، تاہم ایک ایسے شخص کا عکس جس کو خدا کی عطا کردہ قابلیت اور کامیابی (*توفیق* عطا کی گئی ہے) ہدایت *اور ابدی سعادت اور دائمی کامیابی* کا *ذریعہ بن* جاتا ہے۔ آسمانوں اور زمین میں کوئی ذرہ ایسا نہ ہو کہ اللہ ان میں سے بعض کو ہدایت دے اور بعض کو گمراہ نہ کر سکے بہرحال جو شخص ان معاملات میں اللہ تعالیٰ کے اعمال اور صفات کے نقطہ نظر سے غور و فکر کرتا ہے تو وہ خدا کی عظمت و عظمت کی گنوسس حاصل کرتا ہے اور ان سے ہدایت حاصل کرتا ہے۔ اور جس کی نگاہ ایک چیز کو علت اور دوسری نتیجہ ہونے پر ہو جس کا تمام اسباب و اسباب اور اسباب کے موجد سے کوئی تعلق نہ ہو، وہ گمراہ ہو جاتا ہے۔ ہم گمراہی سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں اور اس سے دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی مہربانی اور فضل سے ہر اس موقع سے بچائے جہاں جاہلوں کے پاؤں بھٹک جاتے ہیں۔

باب 20 - اپنی موت اور دنیاوی زندگی کے خاتمے پر غور کرنا اور کبھی نہیں بھولنا اور ابدی زندگی کی تیاری کرنا

یہ سمجھنا کہ یہ دنیاوی زندگی محض ابدی زندگی کا راستہ ہے اور اپنی موت ، غلطی اور اپنے حتمی اور ناگزیر انجام کا ادراک کرنا ، اپنی زندگی کے اصل مقصد سے غفلت ، غفلت اور غفلت کے خلاف اور دولت جمع کرنے ، مادہ پرستانہ جنون ، ناانصافیوں ، دوسروں کے ساتھ ہونے والی برائی اور اپنے عارضی اور عارضی دنیاوی وجود کے دوران ساتھی انسانوں کے ساتھ تنازعات کے خلاف ایک طاقتور تریاق ہے۔ بعض اوقات اپنے ساتھی انسانوں پر خود غرضی اور جبر کی کارروائیاں کی جاتی ہیں، جو پرہیزگاری کی چھپی ہوئی ہیں کہ یہ ہماری آنے والی نسلوں کے لیے کیا جا رہا ہے۔ یہ بھی ایک غلط فہمی ہے کیونکہ وہی انجام آنے والی نسلوں کا انتظار کرے گا جیسا کہ یہ ہمارا انتظار کر رہا ہے۔ نیک مقاصد صرف نیک ذرائع سے ہی حاصل کیے جا سکتے ہیں اور نیک مقاصد حقیر ذرائع سے حاصل نہیں کیے جا سکتے کیونکہ مقاصد ذرائع کا جواز پیش نہیں کرتے۔ یہ سمجھنا کہ آخری وطن کی بازگشت ابدیت کے گھر میں صرف خدا کے پاس ہے، اور دنیا کی زندگی کے اس دنیاوی وجود میں کسی کے اعمال یا بداعمالیوں کے مطابق جو حالت ہو گی، وہ برائی کے خلاف اس کی تمام شکلوں اور مظاہر میں ایک طاقتور روک تھام ہے۔ اپنے انجام کو دیکھتے ہوئے ، لمبی زندگی کی امید کو مختصر کرکے چیزوں کو صحیح تناظر میں رکھتا ہے تاکہ اس زندگی کے خاتمے کے فورا بعد شروع ہونے والی ابدی زندگی کو نقصان پہنچے۔ یہ ہمیں اپنے موجودہ لمحات اور مواقع سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے میں مدد کرتا ہے اور ہمیں راستبازی اور خود اصلاح کی راہ پر گامزن رکھتا ہے۔ غزالی کی اس موضوع پر تفصیل یہاں ان کی *عظیم تصنیف "احیاء العلوم الدین"* یا "خدا کی راہ کی احیاء کی علم" کی چوتھی جلد کی دسویں اور آخری کتاب سے مختصر شکل میں اس طرح پیش کی گئی ہے:

وہ شخص جو موت سے شکست کھا جائے گا، جس کا آخری آرام گاہ قبر میں ہو گا، جس کے ساتھی سانپ، بچھو اور کیڑے مکوڑے ہوں گے، جن کا وعدہ قیامت کا دن ہے، جس کا ٹھکانا یا تو جنت ہے یا جہنم، ایسے شخص کے لیے مناسب ہے کہ وہ موت کے بارے میں سوچے [جو ابدیت کی طرف جانے کے لیے دنیا کے سفر کا اختتام ہے]، اپنے آپ سے اس کا ذکر کرے، اس کی تیاری کرے، اس پر غور و فکر کرے، اس کے لیے ترس لے [کیونکہ یہ وہ ناگزیر چیز ہے جس کا سامنا ہر ایک کو کرنا پڑے گا، اور ہر وہ شخص جو یہاں نہیں ہے وہ پہلے ہی اس کے نتائج کا سامنا کر چکا ہے اور اب اس کے نتائج سے نمٹ چکا ہے]، اس کا انتظار کرو [کیونکہ یہ ابدیت میں جانے کا راستہ ہے، اور محبوب سے ملنا ہے اگر کوئی اس کے لیے خواہش کرتا ہے، کام کرتا ہے اور جدوجہد کرتا ہے۔ ایسے شخص کے لیے مناسب ہے کہ اپنی ذات کو اپنی زندگی میں مردہ سمجھا جائے، کیونکہ جو چیز آنے والی ہے وہ قریب ہے اور دور وہ چیز ہے جو نہیں آئے گی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهُ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ

"ذہین وہ ہے جو اپنے نفس کو دباتا ہے [اپنی خواہشات اور خواہشات کے پیچھے بھاگنے سے]، اور موت کے بعد آنے والی زندگی کے لیے کام کرتا ہے۔"

یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر کسی چیز کو بار بار یاد نہ کیا جائے یا اس کا ذکر نہ کیا جائے تو کوئی اس کی صحیح تیاری نہیں کر سکتا۔ بار بار ذکر اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک کہ ان معاملات پر توجہ نہ دی جائے جو ہمیں موت کی یاد دلاتے ہیں۔ چنانچہ ہم موت، اس کی تیاری، اس سے وابستہ امور، آخرت اور جہنم اور جنت کے حالات کا ذکر کریں گے تاکہ اللہ کا بندہ اس کے لیے تیاری کر سکے کیونکہ اس سفر کا وقت آ گیا ہے، زندگی مختصر ہوتی جا رہی ہے [جس طرح دنیا میں خدا کے حکم سے ہم میں سے ہر ایک کو مختص کیا گیا وقت ہر گزرتے دن سے کم ہوتا جا رہا ہے]۔ اب ایک چھوٹی سی زندگی باقی ہے لیکن لوگ اس سے غافل ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُونَ

انہوں نے کہا کہ عوام کے احتساب کا وقت قریب آ گیا ہے لیکن وہ غفلت اور غفلت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ (سورۃ البقرۃ البقرۃ البقرۃ آیت 1)

سب سے پہلے، ہم موت سے متعلق معاملات کی وضاحت کریں گے جو اس سے پہلے کی زندگی سے شروع ہو کر صور پھونکنے تک ہے۔ یہ آٹھ موضوعات پر مشتمل ہے۔

دنیا بھر کے سفر کے اختتام کی تیاری

اپنی موت کا ذکر کرنا اور اس کو کثرت سے یاد کرنا: یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ جو شخص دنیا میں مگن ہو، اس کے فریب میں ڈوبا ہوا ہو، اور اس کی خواہشات کی محبت میں ڈوبا ہوا ہو، ایسے شخص کا دل یقینا موت سے غافل ہے، موت کا ذکر کبھی کسی کی زبان پر نہیں آتا اور نہ ہی دل میں اس کا خیال آتا۔ اگر کوئی کسی کے سامنے بھی اس کا ذکر کرتا ہے تو ، وہ نفرت اور نفرت کے ساتھ چہرہ موڑ دیتا ہے ، اور اس ذکر کو شدید ناپسند کرتا ہے۔ پھر افراد کی تین قسمیں ہوتی ہیں: کچھ دنیا میں مکمل طور پر غرق ہوتے ہیں، کچھ توبہ کرنے والے ہوتے ہیں، اور کچھ شدید غنوسی اور فہم رکھتے ہیں۔ پہلی قسم کے لوگ موت کا ذکر نہیں کرتے اور اگر وہ اس کا ذکر کرتے ہیں تو ، وہ اسے دنیا سے علیحدگی کے پچھتاوے سے جوڑتے ہیں اور اس کی خدمت کرنا شروع کردیتے ہیں [اپنی زندگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس میں زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہونے کے لئے]۔ اس طرح موت کا ذکر کرنے سے وہ خدا سے زیادہ دور اور دور ہوجاتے ہیں۔ جو لوگ توبہ کرتے ہیں، وہ اپنی موت کو کثرت سے یاد کرتے ہیں تاکہ ان کے دلوں سے خوف اور خوف دور ہو جائے تاکہ وہ اپنی توبہ مکمل کر لیں (اپنے گناہوں کا کفارہ دے کر، عبادت الٰہی میں سبقت حاصل کریں، اور اپنی زندگی کے اختتام سے پہلے راہ الٰہی پر چلتے ہیں]۔ بعض اوقات وہ موت کو ناپسند کرتے ہیں لیکن صرف اس لیے کہ ان کی توبہ مکمل ہونے سے پہلے اور اس سے پہلے کہ وہ رزق جمع کرنے کے قابل ہو جائیں [خدا کی راہ میں نیک اعمال کے لیے]۔ ایسے شخص کو اس سے ناپسند کرنے میں معذرت کی جاتی ہے کیونکہ کوئی اسے واضح طور پر ناپسند نہیں کرتا، بلکہ وہ اپنے گناہوں کی وجہ سے خدا سے ملاقات سے محروم ہونے کا خوف رکھتا ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے وہ شخص جو محبوب سے ملاقات سے محروم ہونے سے ڈرتا ہے، اس لیے وہ اس ملاقات کی تیاری کر رہا ہے اور محبوب کی خواہش کے مطابق اپنے آپ کو سجایا جا رہا ہے۔ ایسے شخص کے بارے میں یہ نہیں کہا جائے گا کہ وہ اپنے محبوب سے ملنا پسند نہیں کرتا، اور اس کا اشارہ یہ ہے کہ وہ محبوب سے ملاقات کی تیاری میں مصروف ہے، اور سوائے اس کے کہ اس کی کوئی اور مصروفیت نہیں ہے، ورنہ

اسے پہلی قسم میں شمار کیا جائے گا۔ خدا کا عرفان یا مباشرت وہ ہے جو ہمیشہ موت کو یاد کرتا ہے اور ایسا کرتا ہے [پوری طرح سے] یہ جانتے ہوئے کہ وہ موت کے بعد محبوب سے ملاقات کرے گا۔ عاشق محبوب سے ملنے کا وقت کبھی نہیں بھولتا۔ ایسا شخص اکثر موت کی جلد آمد کا خواہاں ہوتا ہے اور اس کی آمد پر خوش ہوتا ہے تاکہ گناہوں کے گھر سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکے اور تمام کائنات و وجود کے رب (رب العالمین) کی طرف منتقل ہو سکے۔ توبہ کرنے والے کو موت کو مسترد کرنے کے لئے معذرت کی جاتی ہے اور اس شخص کو موت پسند کرنے کے لئے بھی معاف کیا جاتا ہے۔ ان دونوں شخصیات میں سے سب سے زیادہ اعلیٰ درجے کا وہ شخص ہے جو اپنی بات اللہ کے سپرد کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ، کوئی شخص اپنے لئے موت یا زندگی کو ترجیح نہیں دیتا ، بلکہ اس کے بجائے ، صرف وہی جو اپنے رب کو محبوب ہے وہ اس کے لئے محبوب ہے۔ محبت الٰہی کی شدت کی وجہ سے ایسا شخص مشیت الٰہی کی قبولیت کے اعلیٰ مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ یہ مطلوبہ مقصد اور حصول کا سب سے اوپر ہے۔ بہرحال اپنی موت کو یاد کرنے میں بڑی فضیلت اور الٰہی اجر ہے۔ دنیا میں ڈوبے ہوئے شخص کو بھی موت کی یاد سے یہ فائدہ مل سکتا ہے جو انسان کو اس (دنیا) سے دور کرنا شروع کر دیتا ہے، اور یہ یاد لذتوں سے مایوس ہو جاتا ہے، اور لذتوں اور خواہشات کو خراب کرنا نجات اور نجات کے ذرائع میں سے ہے۔

اپنی موت کو یاد کرنے کی فضیلت : نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أَكْثِرُوا مِنْ ذِكْرِ هَادِمِ اللَّذَّاتِ

"لذتوں کو مٹانے والے (یعنی موت) کو زیادہ یاد رکھو"۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ لذتوں کو موت کی یاد سے اس وقت تک کیچڑ میں ڈال دیا جائے جب تک کہ آپ کا دل ان سے بچنا شروع نہ کر دے اور خدا پر توجہ مرکوز نہ کر لے۔ دنیا مومن کے لیے قید خانہ ہے، جب تک کوئی شخص دنیا کی قید خانے میں قید رہتا ہے، نفس کو نظم و ضبط کرنے، شیطان کے خلاف مزاحمت میں اور خواہشات سے دور رہنے میں مختلف قسم کی مشکلات برداشت کرتا ہے۔ موت انسان کو ان مشکلات سے نجات دلاتا ہے۔

اپنی موت کی یاد کو مضبوطی سے جلانے کا طریقہ: لوگ اس سے غافل اور غافل ہیں کیونکہ وہ اس کے غور و فکر اور یاد میں مشغول نہیں ہوتے، اور اگر کوئی اس کا ذکر بھی کرے تو آزاد دل کے ساتھ ایسا نہیں کرتا، بلکہ وہ ایک ایسے دل کے ساتھ ایسا کرتا ہے جو دنیاوی خواہشات میں مبتلا ہو۔ لہٰذا اس کا ذکر کرنے سے دل پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اپنی موت کی یاد کو مضبوطی سے جڑنے کا طریقہ یہ ہے کہ دل کو اس یاد کے علاوہ ہر چیز سے خالی کر دیا جائے اور ہر وقت یہ خیال رکھنا جیسے موت کسی کے سامنے ہے، بالکل اسی طرح جیسے کوئی مسافر کسی خطرناک وادی سے گزرتا ہے یا سمندر میں سفر کرتا ہے، پوری طرح سفر پر مرکوز ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر اپنے انجام کی یاد دل میں اسی طرح رہے تو امید کی جاتی ہے کہ اس کا اثر دل پر پڑے گا۔ موت کو یاد کرنے کا ایک فائدہ مند طریقہ یہ ہے کہ ان لوگوں کے بارے میں سوچیں جو ہم عمر کے ہم عصر تھے اور ایک جیسے تھے اور زندگی کی سرگرمیوں میں مصروف نظر آتے تھے، لیکن اب وہ قبر کے بستر میں ہیں۔ ان کے کتنے بڑے درجات تھے، وہ کتنے خوشحال تھے لیکن گندگی نے ان کے تمام عہدوں اور القابات کو مٹا دیا ہے، ان کی بیویاں بیوہ اور بیوہ بن گئی ہیں، ان کے بچوں نے ایک ماں باپ کھو دیا ہے، ان کی دولت [اور ان کے پیچھے چھوڑی گئی جائیدادیں] سب ختم ہو چکی ہیں، اور [معاشرتی] اجتماعات ان سے اس حد تک خالی ہیں کہ اب کوئی ان کا ذکر بھی نہیں کرتا جیسے وہ پہلے پیدا ہوئے یا موجود بھی نہیں تھے۔ اگر ہر شخص کا اس طرح جائزہ لیا جائے اور ان کی حالت، ان کی موت کے حالات، ان کی شکل و صورت و شکل، ان کی فعالیاں، ان کی دیگر مصروفیات کو دل میں لایا جائے اور ان پر غور کیا جائے کہ وہ کس طرح زندگی میں غرق ہو گئے، موت کو بھول گئے اور وہ (غلطی سے) یہ سمجھتے کہ ان کے پاس تمام وسائل موجود ہیں اور ان کی طاقت اور جوانی کبھی ختم نہیں ہوتا۔ لہذا ، وہ کھیلوں ، کھیل اور تفریح میں مصروف تھے اور موت سے غافل رہے جو تیزی سے ان کے قریب آتی تھی [ان سب اور غلط فہمیوں کے باوجود ، وہ اب بھی بالآخر اپنے انجام کا سامنا کرتے ہیں اور اب یہاں نہیں ہیں]۔ ایسے ہی ایک شخص کی طرف دیکھ کر جو عیش و عشرت میں مشغول دیکھا گیا تھا لیکن اب [قبر میں] پاؤں ٹوٹ چکے ہیں اور جسم بکھر چکا ہے۔ زندگی میں بہت باتیں کرتے تھے اور ہنسی پھیلاتا تھا لیکن اب کیڑے مکوڑوں نے زبان کھا لی ہے اور مٹی نے دانت کھا لیے ہیں۔

ایک شخص اپنے لئے اچھی منصوبہ بندی کرتا تھا ، تیزی سے بہتر انتظامات کرتا تھا جس کی اگلے دس سالوں تک بھی ضرورت نہیں تھی ، حالانکہ اپنے اور موت کے درمیان صرف ایک ماہ کا فاصلہ تھا اور کسی کو اس کا کوئی احساس بھی نہیں تھا ، یہاں تک کہ موت ایک ایک ایک وقت پر پکڑ لی جس کی کسی نے کبھی توقع نہیں کی تھی۔ اچانک موت کا فرشتہ کسی کے سامنے نمودار ہوا اور اس نے اپنے کانوں میں جنت یا جہنم کا اعلان کیا۔

اس مقام پر ، کسی کو اپنے آپ کو دیکھنا چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ وہ بالکل ان کی طرح ہے [جو گزر چکے ہیں اور جو اس کے ہم عصر ہیں] ، کسی کی غفلت اور غفلت کی حالت بالکل ان کی طرح ہے ، اور وہ ان کی طرح ہی انجام ہونے کا خطرہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سعادت اور کامیابی والا وہ ہے جو دوسروں سے سبق حاصل کرے۔ ان خیالات اور غور و فکر کے ساتھ ساتھ اگر کوئی قبرستان میں جانا اور بیماروں کی عیادت کرنا معمول بنا دے تو اس کے دل میں موت کا خیال تازہ رہے گا بلکہ اس پر غالب آجائے گا (اس حد تک کہ کسی کے اعمال اور پوری حالت کو صحیح سمت میں لے جائے گا، اور چیزوں کو صحیح تناظر میں رکھنا]۔ امید کی جاتی ہے کہ اس صورت حال میں کوئی موت کی تیاری کرے گا اور دھوکہ دہی کی خصوصیت والی دنیا کو ایک طرف رکھ دے گا۔ صرف موت کا ذکر کرنا اور اسے سطحی طور پر یاد کرنا زیادہ فائدہ مند نہیں ہے۔ جب بھی دل میں کسی اچھی چیز کا خیال پیدا ہوتا ہے تو آپ کو سوچنا چاہیے کہ ایک دن آپ کو اس سے علیحدگی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

لمبی عمر کی امیدوں، امیدوں کو کم کرنا، لمبی امیدوں کی وجوہات اور علاج کا طریقہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إِنَّ أَشَدَّ مَا أَخَافُ عَلَيْكُمْ خَصْلَتَانِ اتِّبَاعُ الْهَوَى وَطُولُ الْأَمَلِ، فَأَمَّا اتِّبَاعُ الْهَوَى
فَإِنَّهُ يَصُدُّ عَنِ الْحَقِّ وَأَمَّا طُولُ الْأَمَلِ فَإِنَّهُ الْحُبُّ لِلدُّنْيَا ثُمَّ قَالَ أَلَا إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى
يُعْطِي الدُّنْيَا مَنْ يُحِبُّ وَيُبْغِضُ وَإِذَا أَحَبَّ عَبْدًا أَعْطَاهُ الْإِيمَانَ، أَلَا إِنَّ لِلدِّينِ أَبْنَاءً وَ
لِلدُّنْيَا أَبْنَاءً فَكُونُوا مِنْ أَبْنَاءِ الدِّينِ وَلَا تَكُونُوا مِنْ أَبْنَاءِ الدُّنْيَا، أَلَا إِنَّ الدُّنْيَا قَدِ
ارْتَحَلَتْ مُوَلِّيَةً أَلَا إِنَّ الْآخِرَةَ قَدِ ارْتَحَلَتْ مُقْبِلَةً أَلَا وَإِنَّكُمْ فِي يَوْمِ عَمَلٍ لَيْسَ فِيهِ
حِسَابٌ أَلَا وَإِنَّكُمْ تُوشِكُونَ فِي يَوْمِ حِسَابٍ لَيْسَ فِيهِ عَمَلٌ

"میں آپ سے دو چیزوں سے سب سے زیادہ خوفزدہ ہوں: ایک آپ کی اپنی خواہش (نچلے نفس کی خواہشات) کی پیروی کرنا ہے اور دوسرا لمبی امیدیں [یا لمبی زندگی کی توقع] رکھنا ہے۔ اپنی مرضی پر چلنا، سچائی کی راہ سے روکتا ہے اور لمبی امیدوں کا مطلب دنیا سے محبت ہے۔ [پھر اس نے کہا] یاد رکھو، اللہ تعالیٰ ہر انسان کو دنیا عطا فرماتا ہے، چاہے وہ کسی سے محبت کرے یا ناپسند کرے، لیکن وہ ایمان (اس پر اور ابدی حقیقتوں میں جو لازمی طور پر اس سے وابستہ ہیں] اس کو عطا کرتا ہے جس سے وہ محبت کرتا ہے۔ یاد رکھو کہ بعض لوگ راہ الٰہی کے بیٹے ہیں اور بعض دنیا کے بیٹے ہیں۔ راہ الٰہی کے بیٹے بنیں نہ کہ دنیا کے بیٹے۔ خبردار رہو آخرت تمہارے پاس آنے والی ہے آج، آپ اس دن میں ہیں جب آپ [آنے والی ابدی زندگی کے لیے اچھی تیاری کے لیے] کام کر سکتے ہیں اور اس میں کوئی احتساب نہیں ہے۔ عنقریب تم حساب کے دن (قیامت میں) ہو جاؤ گے اور اس میں کوئی عمل نہیں ہو گا (کیونکہ اس کے دنیوی سفر کے اختتام پر عمل کرنے کا وقت گزر چکا تھا]۔ (بیان کردہ احادیث کا مجموعہ ابن ابی الدنیا

لمبی امیدوں کی دو وجوہات ہیں (یا لمبی عمر کی امیدیں اور توقعات ہیں): ایک جہالت اور دوسری دنیا کی محبت (دنیاداری)۔ دنیا کی محبت کا مفہوم یہ ہے کہ جب انسان اپنی خواہشات، لذتوں اور مصروفیات کا عادی ہو جاتا ہے تو

دنیا سے الگ ہونا اس پر بہت بوجھ پڑ جاتا ہے اور اس سے موت پر غور کرنے سے روکتا ہے کیونکہ موت ہی اس جدائی کی وجہ ہے۔ انسان فطری طور پر کسی ایسی چیز سے دور کرتا ہے جسے وہ ناپسند کرتا ہے۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ انسان ہمیشہ جھوٹی امیدوں اور خواہشات میں مبتلا رہتا ہے، جو کسی کی خواہش کے مطابق ہوتا ہے۔ لہٰذا دنیا میں رہنا بالکل اپنی خواہش کے مطابق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان ہمیشہ اس کے بارے میں سوچتا ہے اور اپنے لیے ہر وہ چیز سمجھتا ہے جو رزق کی ضروریات ہیں جیسے شریک حیات، بچے، گھر، دوست، رشتہ دار، سواری اور دنیا کے تمام ذرائع۔ انسان کا دل اس فکر میں اس قدر مگن ہو جاتا ہے کہ موت سے غافل ہو جاتا ہے، اس کی قربت کو پسند نہیں کرتا، اگر کبھی دل میں موت کا خیال آتا ہے کہ وہ مر جائے گا اور اس کے لیے تیاری کرنے کی ضرورت ہے تو وہ پہلے سے ہی دعا کرتا ہے، نفس سے وعدہ کرتا ہے کہ ابھی بہت وقت ہے، میں بڑا ہو کر توبہ کروں گا۔ جب کوئی بڑا ہوتا ہے تو اسے بڑھاپے میں ملتوی کر دیتا ہے۔ جب کوئی بوڑھا ہو جاتا ہے تو وہ کہتا ہے، "جب میں گھر بنانے کا کام کر لوں گا یا سفر سے واپس آؤں گا یا کسی بچے کے مستقبل کے لیے کچھ کروں گا یا کسی دشمن سے نمٹوں گا تو میں توبہ کروں گا"۔ انسان نفس کے ساتھ اس طرح پیش قدمی کرتا ہے اور توبہ کو کبھی نہ ختم ہونے والی زنجیر میں تاخیر کرتا رہتا ہے (ملتوی کرتا ہے)، کیونکہ جس چیز میں وہ ملوث ہوتا ہے، وہ دس اور نئی چیزوں کو جنم دیتی ہے یہاں تک کہ تاخیر لمبی اور لمبی ہو جاتی ہے، نئی مصروفیات پیدا ہوتی ہیں اور ان کو مکمل کرنے کے لیے ترغیبات زور سے بڑھ جاتی ہیں، یہاں تک کہ وعدہ شدہ وقت [کسی کے آخری انجام کا] آ جاتا ہے اور موت ایک ایسے وقت میں [دنیاوی زندگی سے] چھین لیتا ہے جس کا کسی نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس وقت ، کسی کا افسوس اور غم دیکھنے کے قابل ہے۔ کوئی سوچتا ہے کہ جو شخص دنیا میں مصروف ہے اسے کبھی کبھی فرصت ملے گی۔ یہ محض ایک غلط فہمی ہے کیونکہ کسی کو صرف اس وقت فرصت مل سکتی ہے جب وہ اپنے آپ کو دنیا سے مکمل طور پر الگ کر لے۔

جہالت یہ ہے کہ انسان کو اپنی جوانی پر بہت اعتماد ہوتا ہے اور وہ سوچتا ہے کہ جوانی میں موت نہیں آئے گی، حالانکہ یہ خالص حماقت اور جہالت ہے۔ اگر کوئی اپنے ارد گرد نظر ڈالے تو اسے معلوم ہوگا کہ بوڑھے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بہت سی اموات ہوتی ہیں جو بڑھاپے سے پہلے ہوتی ہیں۔ جب تک ایک بوڑھا موت کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے، ہزاروں نوجوان اور بچے پہلے ہی موت کو گلے لگا چکے ہیں۔ بعض اوقات ، کوئی موت کو اپنی صحت کے نقطہ نظر سے دور سمجھتا ہے (اچھی صحت انسان کو یہ یقین دلانے پر دھوکہ دیتی ہے کہ وہ بڑھاپے سے پہلے نہیں مرے گا) اور اچانک موت کے امکان کو اہمیت نہیں دیتا۔ کوئی نہیں جانتا کہ اچانک موت ناممکن نہیں ہے۔ اگر اچانک موت کو ناممکن سمجھا جائے تو اچانک بیماری کو ناممکن نہیں سمجھا جا سکتا، بلکہ بیماری اچانک ظاہر ہو جاتی ہے اور جب کوئی بیمار ہوتا ہے تو کون کہہ سکتا ہے کہ موت دور نہیں ہے؟ اگر یہ غافل اور غافل شخص یہ سوچے اور سمجھتا ہے کہ موت کے لیے کوئی خاص وقت مختص نہیں ہے بلکہ یہ بچپن، جوانی، بڑھاپے میں، سردی، گرمیاں، موسم بہراں، موسم خزاں، دن یا رات میں کسی بھی وقت آ سکتا ہے تو امید کی جاتی ہے کہ موت کسی کی نظر میں اہمیت اختیار کر لے گی اور اس کی تیاری مکمل کر سکے گا۔ لیکن ان معاملات سے ناواقفیت اور دنیا سے محبت کسی کے سامنے ہے اور کوئی یہ نہیں سوچتا کہ ایسا کسی کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ کوئی جنازے میں جاتا ہے لیکن یہ نہیں سمجھتا کہ [ایک دن] لوگ اپنے جنازے میں اس طرح چلیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ جنازے میں جانا عادت بن گیا ہے اور لوگوں کو مردہ دیکھنا اتنی بار ہوا ہے کہ انسان اس کا عادی ہو گیا ہے۔ اب جنازہ دیکھ کر نہ تو کسی کی اپنی موت کا احساس ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی اس کے بارے میں سوچتا ہے۔ لیکن موت صرف ایک بار آئے گی، یہ پہلی اور آخری بار ہوگی۔ اس کے باوجود ، تعصب کو استعمال کرنا محض جہالت اور حماقت ہے۔

جب یہ بات واضح ہو جائے کہ اپنی موت کو دور دراز سمجھنے کی وجہ جہالت اور دنیا سے محبت (دنیاداری) کے مترادف ہے تو اس کا علاج جاننا بھی ضروری ہے۔ کسی بیماری کی وجہ کو دور کرکے اس کا علاج کیا جاسکتا ہے۔ جہالت کا علاج سوچ کی وضاحت اور پاک دلوں سے حکمت کی باتیں سننے سے ہو سکتا ہے۔ تاہم دنیا کی محبت کا علاج مشکل ہے۔ یہ ایک ایسی بیماری ہے جس کے علاج نے پہلے اور آخری (پہلے اور بعد کی نسلوں کے ریشے) کو تھکا دیا ہے۔ اس کا علاج اس بندے کے سوا کچھ نہیں ہے جو قیامت کے دن (قیامت کے دن) پر ایمان رکھتا ہے اور جو کچھ اس میں ہے اس کا بدلہ اور عذاب ہے جب قیامت کے دن یقین کامل ہو جائے گا تو دنیا کی محبت دل سے نکل جائے گی کیونکہ کسی اعلیٰ چیز کی محبت دل سے کسی کمتر چیز کی محبت کو ختم کر دیتی ہے۔ یہاں ایک

طرف دنیا اپنے تمام مسائل کے ساتھ ہے اور دوسری طرف آخرت اپنی تمام خوبصورتی، خوبصورتی اور شان و شوکت کے ساتھ ہے۔ جب انسان ان دونوں پر دل کی صفائی، سستی اور سادگی کے ساتھ غور کرے گا تو دنیا کی طرف ذرا سا بھی جھکاؤ باقی نہیں رہے گا، اگرچہ اسے مشرق سے مغرب کی حکومت مل جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کسی شخص کو اس وسیع دنیا کا ایک چھوٹا سا حصہ ملتا ہے تو وہ بھی کیچڑ سے خالی نہیں ہوتا۔ جس کے دل میں آخرت پر یقین ہے تو ایسا شخص دنیا کی محبت کو اپنے دل میں کیسے مضبوط کر سکتا ہے؟ ہر وقت اپنے اعضاء پر نظر ڈالنا چاہیے اور یہ سوچنا چاہیے کہ وہ کتنے خوبصورت، زندہ دل اور مضبوط ہیں لیکن جلد ہی قبر میں موجود کیڑے مکوڑے ان کو اپنا کھانا بنائیں گے۔ جسم کا ایک بھی حصہ ایسا نہیں ہوگا جسے کیڑے مکوڑے نہ کھائیں گے۔ اگر کسی کے پاس کوئی چیز رہ جائے تو وہ صحیح علم اور نیک اعمال ہوں گے۔ ان معاملات میں غور و فکر کے ساتھ ساتھ دیگر متعلقہ امور پر بھی غور کرنا چاہیے جیسے قبر کی سزا، فرشتوں سے سوال کرنا، قیامت کا دن، قیامت کے واقعات، اور اس عظیم دن پر عدالت میں حاضری اور جوابدہ۔ یہ معاملات ایسے ہیں کہ اگر کوئی ان پر غور کرے تو موت کی یاد [دل میں] تازہ رہتی ہے اور اس کے لیے تیاری کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔

لمبی اور مختصر امیدوں کے لحاظ سے لوگوں کی ڈگری: لوگ اس سلسلے میں مختلف ہیں (طویل یا مختصر زندگی گزارنے کے لئے ان کی امیدوں اور توقعات کے لحاظ سے)۔ کچھ لوگ گزر بسر کے خواہاں ہیں اور ہمیشہ کے لئے دنیا میں رہنا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے بارے میں فرماتا ہے:

يَوَدُّ أَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ أَلْفَ سَنَةٍ

"ان میں سے کچھ ایک ہزار سال کی زندگی چاہتے ہیں۔" (سورۃ البقرۃ باب 2، آیت 96)

کچھ لوگ بڑھاپے تک زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ یہ وہ انتہائی عمر ہے جس کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ دنیا سے شدید محبت میں پھنسے ہوئے ہیں۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلشَّيْخُ شَابٌّ فِي حُبِّ طَلَبِ الدُّنْيَا وَإِنِ الْتَفَّتْ تَرْقُوَتَاهُ مِنَ الْكِبَرِ إِلَّا الَّذِينَ اتَّقَوْا وَقَلِيلٌ مَّا هُمْ

"بوڑھا دنیا کی تلاش (یا دوڑنے) کی محبت میں جوان ہوتا ہے، اگرچہ بڑھاپے کی وجہ سے اس کے اعضاء ٹیڑھے ہو گئے ہیں، لیکن ایسے لوگ خدا پرست نہیں ہوتے، اور وہ (یعنی خدا سے ڈرنے والے، تقدس اور خوف رکھنے والے) تعداد میں بہت کم ہوتے ہیں۔" (بیان کردہ *احادیث* کا مجموعہ *صحیح بخاری اور صحیح مسلم* ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے

کچھ لوگوں کو ایک سال سے زیادہ امید نہیں ہوتی، اس لیے وہ ایک سال کے لیے اپنی ضروریات کا انتظام کرتے ہیں، سردیوں میں وہ گرمیوں کے لیے جمع ہو جاتے ہیں اور گرمیوں میں سردیوں کے لیے جمع ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ جب وہ ایک سال تک چیزیں جمع کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو وہ عبادت الٰہی میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگ ایک سال سے بھی کم عرصے تک زندہ رہنے کی توقع کرتے ہیں۔ وہ موجودہ سیزن میں اگلے سیزن کی تیاری نہیں کرتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کو ایک دن سے زیادہ [زندہ رہنے کی] امید نہیں ہے۔ وہ صرف آج کی تیاری کرتے ہیں اور کل کی تیاری میں مصروف نہیں ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: کل کے رزق کی فکر نہ کرو، اگر تمہاری زندگی میں کل آئے تو کل کا رزق بھی اس کے ساتھ آئے گا اور اگر تمہاری زندگی میں کل کا وجود نہیں ہے تو تمہیں دوسروں کی زندگیوں کی فکر نہ کرنی چاہیے چلا جائے گا]"۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی امیدیں ایک لمحے سے بھی زیادہ نہیں ہوتی! جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عبداللہ بن عمر! جب آپ صبح پہنچیں تو شام کی فکر نہ کریں اور جب آپ شام کو پہنچیں تو صبح کی فکر نہ کریں۔ بعض لوگوں نے ایک لمحے کا بھروسہ بھی نہیں کیا، اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قدرت کی دعوت پوری کرنے کے بعد

فورا خاک سے وضو کیا (تیمم - پانی کی عدم موجودگی یا دور ہونے میں خاک کے ساتھ ظاہری پاکیزگی کے لیے کیا جاتا ہے، جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ ظاہری اور باطنی پاکیزگی کی کیفیت برقرار رکھی تھی) اگرچہ پانی زیادہ دور نہیں تھا اور استعمال کیا جاتا تھا یہ کہنے کے لئے، "شاید میں پانی تک نہ پہنچ سکوں [اور اس سے پہلے بھی میری روح چھین لی جائے گی]"، گویا موت اس کے سامنے ہے اور اس کے پاس آنے والی ہے۔ ایسا شخص [خدا] سے اس طرح دعا کرتا ہے جیسے یہ اس کی آخری دعا ہے [جو خدا کے سامنے انتہائی خلوص اور دل کی حضوری کے ساتھ کی جاتی ہے]۔ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بھی اسی حالت میں تھے، اس لیے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ایمان کی حقیقت کے بارے میں پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے کوئی قدم نہیں رکھا جب میں نے گمان کیا تھا کہ میں ایک اور قدم اٹھا سکوں گا۔ (بیان کردہ *افریقی* بزرگ اسود حبشی رحمہ اللہ کے بارے میں منقول ہے کہ جب وہ رات کو نماز پڑھتے تھے تو ادھر ادھر دیکھتے تھے۔ کسی نے اس سے پوچھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا ، جس پر اس نے جواب دیا ، "میں [ادھر ادھر دیکھتا ہوں] کہ موت کا فرشتہ کہاں سے آ رہا ہے"۔

یہ لوگوں کے مختلف درجات اور درجات کی وضاحت ہے [لمبی عمر کے لئے ان کی امیدوں اور توقعات کے لحاظ سے]۔ انہیں اللہ کی طرف سے ان کے درجات کے مطابق بدلہ دیا جاتا ہے جس شخص کی امید اور امید ایک ماہ کے لیے ہے، وہ اس شخص سے مختلف ہے جس کی توقع ایک ماہ سے زیادہ ہو چاہے وہ ایک دن سے زیادہ ہی کیوں نہ ہو، دونوں کے پاس ایک جیسی ڈگری نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں عدل و انصاف ہے اور وہ ان کو برابر کر کے ظلم نہیں کرتا (کیونکہ اس معاملے میں وہ برابر نہیں ہیں)۔ وہ کہتے ہیں:

فَمَن يَعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَيۡرٗا يَرَهُۥ

"جو شخص ذرہ کے برابر نیکی کرے گا وہ اسے (خدا کے حضور میں) دیکھے گا۔ (سورة البقرة سورة البقرة آیت ۷)

امیدوں اور امیدوں کو کم کرنے کا اثر اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ نیک اعمال کی طرف پیش قدمی کی جائے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قابلیت اور کامیابی کی نشانی یہ ہے کہ موت کی آنکھوں کے سامنے ہو، انسان ایک لمحے کے لیے بھی اس سے غافل نہ ہو اور اپنے آخری انجام کے لیے ہمیشہ تیار رہے۔ اگر کوئی شخص شام تک زندہ ہے تو اس پر اللہ کا شکر ادا کرے جس طرح اس نے اس کی اطاعت کا موقع دیا اور اس بات پر خوش ہو کہ اس کا دن ضائع نہ ہوا بلکہ اس میں سے اس کا حصہ مل گیا اور اس میں سے اس کا حصہ مل گیا۔ وہ آخرت کے لیے محفوظ کر لیا گیا ہے پھر صبح کا آغاز اسی شکر گزاری کے ساتھ ہوتا ہے، [ہدایت اور صحیح نصیحت] اور اطاعت الٰہی کے ساتھ سنتا ہے۔ یہ کام صرف وہی شخص آسانی سے کر سکتا ہے جس کا دل کل کے لیے پریشانیوں اور منصوبہ بندی اور حکمت عملی سے پاک ہو اور کل کیا ہونے والا ہے اس کی فکر نہ ہو۔ ایسے شخص کو موت کے بعد ابدی خوشی اور لامتناہی فتح حاصل ہوگی اور اپنی زندگی میں آخرت کی تیاریوں اور اللہ سے التجا کی خوشنودی حاصل کرنے کی وجہ سے خوش رہے گا۔ ایسے شخص کے لیے موت ابدی سعادت اور دائمی کامیابی کے حصول کا ذریعہ ہے اور زندگی ابدی خوشی اور دائمی کامیابی کو بڑھانے کا ذریعہ ہے۔ اے انسان! اپنے انجام کے بارے میں خیال کو ہر وقت اپنے دل میں رکھیں۔ زندگی تمہیں [دنیا سے] دور کر رہی ہے اور تمہاری نفس غفلت میں مبتلا ہے۔ امید ہے کہ تمہاری سفر ختم ہو جائے اور تمہاری منزل قریب ہی ہو صرف اعمال کی طرف بڑھنے سے ہی آپ منزل کی آسائشیں حاصل کر سکتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی بھی اس نعمت کا انتظار نہیں کرتا، سوائے اس نعمت کا جو کسی کو سرکش کر دے، یا کسی ایسی غربت کا انتظار نہیں کرتا، جو خدا کی اطاعت سے غافل ہو جائے، یا کسی ایسی بیماری کا جو جسمانی طور پر معذور ہو جائے، یا بڑھاپے کی جو عقل کو باطل کر دے۔ یا ایسی موت کے لیے جو جلد آنے والی ہے، یا دجال اور *دجال* کے لیے گمشدگی کا بدترین شخص ہے جس کا انتظار کیا جا رہا ہے، یا قیامت اور قیامت کے دن کے لیے انتہائی سخت اور تلخ ہے۔ (بیان کردہ *احادیث* کا مجموعہ *ترمذی* ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِغْتَنِمْ خَمْسًا قَبْلَ خَمْسٍ شَبَابَكَ قَبْلَ هَرَمِكَ وَصِحَّتَكَ قَبْلَ سُقْمِكَ وَ غِنَاكَ قَبْلَ فَقْرِكَ وَفَرَاغَكَ قَبْلَ شُغْلِكَ وَحَيَاتَكَ قَبْلَ مَوْتِكَ

"پانچ چیزوں سے پہلے پانچ چیزوں کی قدر کرو [اور ان کو صحیح کاموں میں دانشمندی سے استعمال کرو]: بڑھاپے سے پہلے اپنی جوانی، اپنی بیماری سے پہلے، اپنی غربت سے پہلے اپنی خوشحالی، اپنی مصروفیات سے پہلے آپ کا فارغ وقت اور اپنی موت سے پہلے کی زندگی۔" (بیان کردہ احادیث *کا* مجموعہ ابن ابی الدنیا

ایک اور روایت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

نِعْمَتَانِ مَغْبُونٌ فِيهِمَا كَثِيرٌ مِنَ النَّاسِ اَلصِّحَّةُ وَالْفَرَاغُ

"دو نعمتیں ایسی ہیں کہ اکثر لوگ ان میں نقصان اٹھاتے ہیں: صحت اور فرصت (آرام یا مہلت)۔ (بیان کردہ حدیث مجموعہ *صحیح بخاری* عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے

اس نبوی روایت کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کو ان دونوں نعمتوں سے نوازا جاتا ہے لیکن انسان ان دونوں نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کے قابل نہیں ہوتا، لیکن جب وہ چلے جاتے ہیں تو ان کی اہمیت اور اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ٱلَّذِى خَلَقَ ٱلْمَوْتَ وَٱلْحَيَوٰةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا

"وہ اللہ ہے جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تمہیں آزمائے تاکہ تم میں سے کون زیادہ نیک اعمال کرتا ہے۔" (سورۃ البقرۃ سورۃ البقرۃ آیت 2)

موت کی دھڑکن میں درد: یہ معلوم ہونا چاہیے کہ موت کے درد کا اندازہ صرف وہی کر سکتا ہے جو اس مرحلے سے گزر چکا ہو۔ جس شخص نے اس درد کا تجربہ نہیں کیا ہے وہ وقتا فوقتا آنے والے درد اور مشکلات کا اندازہ لگا سکتا ہے یا لوگوں کو ان کے آخری لمحات کی شدت کا مشاہدہ کرکے کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ منطقی استنباط سے یہ استدلال کیا جا سکتا ہے کہ جس عضو یا عضو میں روح نہیں ہوتی، اسے کوئی درد محسوس نہیں ہوتا، اور اگر روح موجود ہو تو درد کا احساس بھی موجود ہے۔ اس سے سیکھا جاتا ہے کہ درد کو روح سمجھتی ہے۔ چنانچہ جب کسی شخص کو چوٹ لگتی ہے تو اس کا اثر روح تک پہنچتا ہے اور جس حد تک وہ روح تک پہنچتا ہے، اس حد تک وہ درد محسوس کرتا ہے، کیونکہ درد گوشت، خون اور جسم کے دیگر حصوں میں پھیل جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روح کو کم درد کا سامنا کرنا پڑتا ہے ، تاہم ، اگر ایسا ہے کہ درد اور تکلیف کا مرکز خاص طور پر روح ہے اور روح کے سوا کچھ نہیں ہے ، تو درد کی شدت کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ موت کی تکلیف [زندگی کے آخری لمحات میں] اسی درد سے مراد ہے جو روح کے وجود پر نازل ہوتا ہے اور اس کے تمام اجزاء میں پھیل جاتا ہے یہاں تک کہ روح کا کوئی حصہ جو پورے جسم میں پھیلا ہوا ہے، وہاں نہیں رہتا جہاں یہ درد داخل نہیں ہوا اور نہ پہنچا۔ موت کا درد روح کے وجود پر حملہ کرتا ہے اور اس کے تمام حصوں میں پھیل جاتا ہے کیونکہ وہ (روح) ہر رگ سے، ہر جوڑ، ہر عضو سے نکالا جا رہا ہے، مختصر یہ کہ سر سے پیر تک ہر عضو سے روح کو نکال کر نکال دیا جاتا ہے۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ روح کو کتنی تکلیف اور تکلیف برداشت کرنی پڑتی ہے۔

جہاں تک سوال کا تعلق ہے کہ جب انسان زخمی ہوتا ہے یا مارتا ہے تو بہت چیختا ہے لیکن موت کے وقت چیختا نہیں حالانکہ آپ کہتے ہیں کہ موت کی تکلیف میں جو درد ہوتا ہے وہ زیادہ ہوتا ہے۔ [اس کی وجہ کیا ہے؟]" اس کا جواب یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ صدمے کی وجہ سے مرنے والے شخص کی زبان بند ہو جاتی ہے (بولنے کے قابل نہیں ہے) اور وہ چیخنے کے قابل نہیں ہے۔ درد اتنا شدید ہوتا ہے کہ اس حملے سے دل، دماغ اور جسم سب ناکارہ ہو

جاتے ہیں۔ ساری طاقت ختم ہو جاتی ہے، تمام اعضاء کمزور ہو جاتے ہیں، التجا کرنے کی کوئی طاقت نہیں بچتی، عقل الگ ہو جاتی ہے، زبان سے بول چھین لی جاتی ہے، اعضاء بے حرکت ہو جاتے ہیں، دل کے دبے ہوئے جذبات کو نکالنے کے لیے زور سے چیخنا چاہتا ہے اور درد اور غم سے کچھ سکون ملتا ہے، لیکن کوئی چیخ نہیں سکتا۔ اگر بائیں (مرنے والے شخص میں) کچھ طاقت ہو تو روح کی رخصتی کے وقت حلق اور سینے سے ایک دبے ہوئے آواز نکلتی ہے، رنگ خاک کا رنگ بدل جاتا ہے گویا وہ خاک ظاہر ہوتی ہے جو انسان کی اصل ہے، تمام رگیں کھینچنا شروع ہو جاتی ہیں کیونکہ ہر طرف اندر سے درد ہوتا ہے، آنکھیں اوپر کی طرف بڑھتی ہیں ، ہونٹ سکڑ جاتے ہیں ، زبان اندر کھینچی جاتی ہے ، انگلیاں سبز ہوجاتی ہیں۔ آپ جسم کی حالت کے بارے میں کیا پوچھتے ہیں جس کی ہر رگ کھینچی جا رہی ہے؟ اگر جسم کی ایک رگ کھینچی جائے تو درد کی شدت کی وجہ سے چیخنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہاں تمام رگیں کھینچ رہی ہیں، پھر آہستہ آہستہ تمام اعضاء مرنے لگتے ہیں۔ دونوں پاؤں مر جاتے ہیں، پہلے دونوں پاؤں ٹھنڈے ہو جاتے ہیں، پھر پنڈلی، پھر رانیں، پھر ہر عضو کے لیے درد کے بعد درد ہوتا ہے، پھر شدت کے بعد شدت کا سامنا کرنا پڑتا ہے یہاں تک کہ روح اپنی کھینچنے کے دوران گلے تک پہنچ جاتی ہے۔ اس وقت دنیا اور دنیا کے لوگوں سے آنکھیں منہ پھیر لیتی ہیں، توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے اور غم اور شرمندگی کا غلبہ چھا جاتا ہے۔ مختصرا یہ کہ موت کی سختی، درد اور تلخی کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری انسانیت کو تعلیم دینے کے لیے خدا سے دعا فرمائی:

اَللّٰهُمَّ هَوِّنْ عَلٰى مُحَمَّدٍ سَكَرَاتِ الْمَوْتِ

"اے خدا**!** محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے موت کی سختی کو آسان بنا دو**!**"

عام لوگ (عام لوگ) ان مصیبت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اور نہ ہی ان سے پناہ مانگتے ہیں کیونکہ چیزوں کا ادراک ان کے واقعے سے پہلے ہی نبوت کے نور اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ قربت کی روشنی سے ہوتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے انبیاء اور مقربوں کو موت کا خوف زیادہ ہوتا ہے [کیونکہ وہ اس سے پہلے ہی جانتے ہیں کہ اس کا کیا مطلب ہے، جبکہ باقی انسانیت اس وقت تک نہیں جانتی اور اس سے غافل رہتی ہے جب تک کہ وہ خود اس کا تجربہ نہ کرلیں]۔

موت کے وقت کون سے اعمال بہتر ہیں؟ ایک اچھی بات جو موت کے وقت ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ مرنے والا شخص پرسکون ہو اور شہادت کی تلاوت ("خدا کے سوا کوئی معبود نہیں [لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ]") کی تلاوت اس کی زبان پر رہتی ہے، اور دل میں خدا کے لیے اچھی رائے اور جذبات ہوتے ہیں۔ گواہی کے اس بیان کا اظہار ایک اچھی نشانی ہے۔ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَقِّنُوْا مَوْتَاكُمْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ

"اپنے مرنے والوں کو یہ پڑھنے کی تلقین کرو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ)"۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اپنے مرنے والے افراد کی عیادت کرو اور ان کو نصیحت کرو کیونکہ وہ ایسی باتیں دیکھ رہے ہیں جو تم گواہی نہیں دیتے اور ان کو نصیحت کرو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں پڑھیں۔ نصیحت کرنے والے کو نصیحت پر اصرار نہ کرنا چاہیے اور اس میں نرمی کا استعمال کرنا چاہیے کیونکہ بعض اوقات مرنے والے کی زبان حرکت نہیں کرتی۔

اس وضاحت کا نتیجہ یہ ہے کہ جب انسان موت کو گلے لگاتا ہے تو اس کے دل میں خدا کے سوا کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ اگر دل میں خدا کے سوا کچھ نہ تلاش کرے گا تو اس کی موت محبوب کے پاس جانے کا ذریعہ ہو گی اور اپنے محبوب کے پاس جانے سے بڑی برکت نہیں ہو سکتی۔ اگر کسی کا دل دنیا میں مصروف ہو اور اس کی لذتوں سے جدائی کی وجہ سے غمگین ہو اور اس کی تلاوت صرف لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اس کی زبان پر ہو جبکہ دل اس کا پتہ نہ لگاتا

تو اس کا معاملہ خطرے سے خالی نہیں ہے، سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ اپنی نعمتوں سے نوازے اور اس کی محض بات قبول کرے۔ بہرحال اس وقت خدا کے بارے میں اچھی رائے رکھنا بہتر ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نوجوان کی عیادت کی جو مرنے والا تھا۔ اس نے اس سے پوچھا، "آپ اس وقت اپنے آپ کو اس حالت میں کیسے پاتے ہیں؟" اس نے کہا: میں خدا سے امید رکھتا ہوں اور اپنے گناہوں سے ڈرتا ہوں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ دونوں چیزیں جب ایک بندے میں جمع ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس چیز کو عطا فرماتا ہے جس کی وہ توقع کرتا ہے اور اس چیز سے نجات دلاتا ہے جس سے وہ ڈرتا ہے۔ مرنے کے وقت بندے کی نیکیوں کا ذکر کرنا بہتر ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں اس کی اچھی رائے ہو۔

ہم نے موت کے دوران مرنے والے شخص کی حالت، تدفین سے پہلے اور دفن ہونے کے بعد مرنے والوں کی حالت کی وضاحت کی ہے (غزالی کی اس وضاحت میں سے کچھ اختصار کے مفاد میں یہاں چھوڑ دیا گیا ہے)۔ ہم پہلے بھی واضح کر چکے ہیں کہ اگر میت ان لوگوں میں سے ہو جن پر غضب الٰہی ہوگا تو قبر کے اندھیروں اور کیڑوں کا سامنا کرنا پڑے گا، قبر میں فرشتوں سے پوچھ گچھ کرے گا، پھر قبر کا عذاب ہوگا۔ الٰہی کی سزا کے اس سے بھی زیادہ مشکل مراحل وہ ہیں جن کا سامنا قبر کے بعد کیا جائے گا جیسے کہ صور پھونکنا، قیامت کے دن قیامت کا جلاؤ، خدا کے سامنے پیش کیا جانا، کم و بیش ان چیزوں کے بارے میں سوال کرنا جو دنیا کی زندگی میں عدل و انصاف کے ساتھ کام نہ کرنے کی وجہ سے ہوئی ہیں، اعمال کو ترازو میں تولنا [اچھے یا برے کے لحاظ سے ان کی قیمت کا تعین کرنا، مادہ یا خالی دکھاوے رکھنا]، پھر سیرت کے پل کو عبور کرنا جو استرا پتلا ہو گا، پھر کسی کے ازلی سعادت اور ابدی کامیابی (*سعدہ*) یا ابدی عذاب اور ناکامی کے حصول کے بارے میں [آخری] فیصلے کا انتظار کرنا (*شقوہ*)۔ آپ کے لیے ضروری ہے کہ آپ ان خطرات اور خطرات کا ادراک حاصل کریں اور ان پر یقین کریں اور [دل میں] پختہ اثر ڈالیں، پھر ان میں طویل غور و فکر کریں، تاکہ ان خطرات سے بچنے کے لیے آپ کی تیاری مکمل کرنے کی ترغیب اور زور آپ کے دل میں پیدا ہو۔

خدا کی بصارت اور خدا کا چہرہ دیکھنا: اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے:

لِّلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَىٰ وَزِيَادَةٌ

"جو لوگ نیکی کرتے ہیں ان کے لیے نیکی کے ساتھ ساتھ اضافی بھلائی بھی ہوتی ہے۔" (سورۃ البقرۃ باب ۱۰، آیت ۲۶)

یہ اضافی نیکی خدا کا وژن اور اس کے بابرکت چہرے کی گواہی ہے۔ یہ ایک ایسا غیر معمولی لذت ہے کہ اسے ملتے ہی جنت کے باشندے دیگر تمام نعمتوں اور نعمتوں کو بھول جائیں گے۔ "کتاب محبت الٰہی" (باب 16) میں اس بصیرت الٰہی کی حقیقت بیان کی گئی ہے اور کتاب الٰہی اور نبوت کی دلائل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے جو [روایتی طریقہ کار] کے منکر اور منکر کے عقائد کی تردید کرتے ہیں۔ جریر بن عبداللہ بجالی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں بیٹھے تھے۔ اس نے چودھویں رات کے چاند کی طرف دیکھا اور فرمایا: تم اپنے رب کو اسی طرح دیکھو گے جس طرح تم اس چاند کو دیکھتے ہو۔ آپ چاند کو دیکھنے کے لئے [مقابلہ میں] ایک دوسرے پر نہیں گرتے ہیں۔ اگر ممکن ہو تو طلوع آفتاب سے پہلے اور غروب آفتاب سے پہلے نمازوں سے پہلے تھک نہ جائیں اور ان کو اچھی طرح سے ادا کریں۔ اس کے بعد انہوں نے یہ آیت پڑھی:

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوبِهَا

اور سورج نکلنے سے پہلے اور غروب ہونے سے پہلے اپنے رب کی حمد و ثنا کر۔ (سورۃ البقرۃ باب 20، آیت 130) (بیان کردہ حدیث مجموعے *صحیح بخاری* اور *صحیح مسلم* رباح رضی اللہ عنہ پر

حدیث کے مجموعہ صحیح مسلم سے *مروی* ہے جس میں صہیب الرومی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی کہ جن نے نیک عمل کیے اس میں نیکی ہے اور اضافی نیکی بھی ہے۔ "جب بہشتی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور دوزخی والے جہنم میں داخل ہو جائیں گے تو ایک پکارنے والا پکارے گا: اے جنت والو! اللہ تعالیٰ کا تم سے وعدہ ہے جو اب وہ تم سے پورا کرنا چاہتا ہے۔" اہل جنت کہیں گے کہ یہ کیا وعدہ ہے؟ کیا اس نے ہمارے وزن کو (ترازو میں) بھاری نہیں کیا کیا اس نے ہمارے چہروں کو روشن نہیں کیا؟ کیا اس نے ہمیں جنت میں داخل نہیں کیا؟ اور کیا اس نے ہمیں جہنم سے نہیں بچایا؟ اس کے بعد پردہ اٹھا لیا جائے گا اور وہ اللہ تعالیٰ کے مبارک چہرے کی طرف دیکھیں گے۔ پھر فرمایا: ان کے لیے اس سے زیادہ محبوب کوئی چیز نہیں ہو گی۔

خدا کی گواہی کے بارے میں نبوت کی روایت بہت سے صحابہ کرام نے بیان کی ہے۔ بصیرت الٰہی کی عزت تمام نیکیوں، تمام فضیلت اور تمام نعمتوں کی معراج اور انتہا ہے۔ پچھلے صفحات میں جہاں جنت کی برکتوں کا ذکر کیا گیا ہے (اس کام میں چھوڑ دیا گیا ہے) اس عظیم نعمت کے مقابلے میں غیر اہم ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی خوشی اور بصارت الٰہی کی ابدی خوشی اور لامتناہی فتح جو ان کو حاصل ہوگی وہ لامحدود اور ابدی ہو گی، بلکہ جنت کی لذتوں کا اس لذت اور اس لذت کا کوئی موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہم یہاں اس موضوع پر مزید بحث نہیں کرنا چاہتے کیونکہ اس پر "الٰہی محبت کی کتاب، خواہش اور خدائی مرضی کی قبولیت" (باب 16) میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ یہاں ہم صرف اتنا کہیں گے کہ جنت کے ساتھ بندے کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہونا چاہیے کہ وہاں اپنے حقیقی مالک اور محبوب (خدا) سے ملاقات کا شرف حاصل ہو۔ جنت کی باقی نعمتوں میں ، یہاں تک کہ چراگاہوں میں چرنے والے جانور بھی آپ کے شریک اور شریک ہیں۔

کتاب کے اختتام پر خدا کی رحمت کی وسعت کا ذکر بشارت کے طور پر کرنا

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بشارت دینا پسند کرتے تھے۔ ہمیں امید کرنی چاہیے کہ خدا ہمیں اس دنیا اور آخرت میں ایک اچھا انجام عطا کرے گا۔ ہم اس کتاب ("خدا کی راہ کے احیاء کی بحالی") کا اختتام رحمت الٰہی کی وسعت کی خوشخبری کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ يَٰعِبَادِىَ ٱلَّذِينَ أَسْرَفُوا۟ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا۟ مِن رَّحْمَةِ ٱللَّهِ ۚ

إِنَّ ٱللَّهَ يَغْفِرُ ٱلذُّنُوبَ جَمِيعًا ۚ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلْغَفُورُ ٱلرَّحِيمُ

"ان سے کہہ دو (اے محمد! (خدا تمہیں بتاتا ہے:) اے میرے بندو، جنہوں نے اپنے جانوں پر ظلم کیا ہے! اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں۔ بے شک اللہ سب گناہ معاف فرما دیتا ہے۔ بیشک وہ بخشنے والا اور زبردست رحم کرنے والا ہے۔" (سورۃ البقرۃ 39، آیت 53)

وَمَن يَعْمَلْ سُوٓءًا أَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهُۥ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ ٱللَّهَ يَجِدِ ٱللَّهَ غَفُورًا رَّحِيمًا

"جو شخص کوئی غلط کام کرے یا اپنی جان پر ظلم کرے پھر اللہ سے معافی مانگے، تو وہ خدا کو بہت بخشنے والا اور بہت مہربان پائے گا۔" (سورۃ البقرۃ سورۃ البقرۃ آیت 110)

ہم اس کتاب میں اور کسی اور میں اپنے قلم سے کی گئی ہر غلطی کے لیے خدا سے معافی مانگتے ہیں۔ ہم اپنے الفاظ کے لیے بھی خدا سے معافی مانگتے ہیں جو ہمارے اعمال سے میل نہیں کھاتے۔ ہم اپنے فہم و علم کے دعوے سے، ہر اس علم اور عمل سے بھی خدا سے معافی مانگتے ہیں جس سے ہم خدا کی رضا چاہتے تھے لیکن اس نیت میں اس کے سوا کسی اور کو گھل مل جاتے ہیں، اس وعدے کے لیے جو ہم نے اپنے نفس سے کیا تھا [اس کی اصلاح اور تطہیر کے لیے] لیکن ہم اس کی تکمیل میں ناکام رہے، ہر نعمت کے لیے جو ہمیں عطا کی گئی تھی لیکن ہم نے اسے گناہ میں استعمال کیا۔ اس غلطی کی وجہ سے جس میں ہم خود ملوث تھے لیکن ہم نے اسے دوسروں سے منسوب کیا یا تو واضح طور پر یا تمثیلی طور پر، اور اس خیال کی وجہ سے جو کسی کتاب یا تقریر یا تعلیم کو تصنیف کرنے کی ترغیب بن گئی لیکن یہ صرف لوگوں کو دکھانے یا مصنوعی پن یا کسی غیر حقیقی وجہ سے تھی۔ ان تمام معاملات کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت مانگنے کے بعد ہم امید کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو پڑھنے، لکھنے یا سننے والوں کو اپنی مغفرت اور برکتیں عطا فرمائے گا اور ہمارے تمام ظاہری اور باطنی گناہوں پر رحم کرے گا کیونکہ اس کی مہربانی عام ہے، اس کی رحمت وسیع ہے، اور تمام مخلوقات اس کی اوقاف میں شامل ہیں۔ ہم بھی خدا کی مخلوق ہیں۔ ہمارے پاس اس کے فضل و سخاوت کے سوا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور برکتوں کے سو حصے ہیں (اللہ نے اپنی رحمت کو سو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے)۔ ان میں سے خدا نے *جنوں* اور انسانوں، جانوروں، پرندوں، کیڑوں اور رینگنے والوں پر ایک رحمت نازل کی ہے۔ اس [خدائی رحمت کا حصہ] [جو زمین پر موجود ہے] کی وجہ سے، وہ ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور دینے کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ اور اس نے اپنی رحمت کے ننانوے حصے محفوظ رکھے ہیں اور قیامت کے دن ان کو اپنے بندوں پر استعمال کرے گا۔ (بیان کردہحدیث کا مجموعہ *صحیح مسلم* ابو ہریرہ اور سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ وہ عرش الٰہی کے نیچے سے ایک تحریر نکالیں گے جس میں لکھا جائے گا کہ میری رحمت میرے غضب پر حاوی ہے اور میں سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہوں۔ اس کے بعد جہنم سے دوگنا لوگ نکالے جائیں گے جتنے بھی جنت میں ہیں۔ (بیان کردہ*احادیث* کا مجموعہ *صحیح بخاری* اور *صحیح مسلم*) اللہ تعالیٰ قیامت کے دن مومنوں سے پوچھے گا کہ کیا تم سے ملاقات آپ کو محبوب تھی؟ وہ کہیں گے: ہاں اے ہمارے رب! خدا پوچھے گا: کیوں؟ وہ کہیں گے ہم تیری مہربانی اور بخشش کی امید رکھتے تھے اللہ فرمائے گا میں نے اپنی بخشش کو اپنے اوپر فرض کر دیا ہے (بیان کردہ*حدیث* کے مجموعے *مسند احمد* اور *طبرانی*)

ایک نبوت روایت میں منسوخ ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن حکم دے گا: "ہر اس شخص کو جہنم سے نکال دو جس نے میرا ذکر کیا یا مجھ سے ڈرتا تھا"۔ (بیان کردہحضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ *سے روایت ہے* کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے اس سے بھی زیادہ محبت رکھتا ہے جو ماں کی اولاد سے محبت کرتی ہے۔ (بیان کردہحدیث کے مجموعے *میں صحیح بخاری* اور *صحیح مسلم* حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قیامت کے دن جس کی نیکی گناہوں سے تجاوز کر جائے گا وہ بغیر کسی حساب کے جنت میں داخل ہو گا اور جس کے اعمال اور گناہ برابر ہوں گے تو اس کا کوئی احتساب ہوگا تو اسے جنت میں داخل کیا جائے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت اس شخص کے لیے ہو گی جس نے اپنے نفس کو ہلاک کر دیا ہو اور جس کی پیٹھ اپنے گناہوں کے بوجھ سے جھکی جائے گی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طویل نبوت کی روایت کے اختتام پر قیامت اور پل *سیرت کا ذکر* کیا پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم دے گا کہ جس کے دل میں دینار جسامت کی کوئی خوبی ہو اسے جہنم سے نکال دیں۔ فرشتے ایسے لوگوں کو باہر نکالیں گے اور اس طرح بے شمار لوگ باہر نکلیں گے۔ فرشتے کہیں گے: اے اللہ! جن لوگوں کے بارے میں تو نے ہمیں حکم دیا تھا، ہم نے ان میں سے کسی کو نہیں چھوڑا۔ پھر اللہ فرمائے گا کہ واپس جا کر جس کے دل میں ذرے کے برابر کوئی بھلائی ہو اسے جہنم سے نکال دو۔ پس بے شمار مخلوقات جہنم سے نکل آئیں گی فرشتے کہیں گے: اے اللہ! جن لوگوں کے بارے میں تو نے حکم دیا ہے ان میں سے کوئی بھی جہنم میں نہیں رہا۔" ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ اس روایت کو نقل کرنے کے بعد فرمایا کرتے تھے کہ اگر تم مجھے اس روایت کے بارے میں معلوم نہ کرو تو یہ آیت پڑھو:

إِنَّ ٱللَّهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۖ وَإِن تَكُ حَسَنَةً يُضَٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِن لَّدُنْهُ أَجْرًا عَظِيمًا

"بے شک اللہ تعالیٰ ذرے کے برابر ظلم نہیں کرے گا، اور اگر کوئی نیک کام کرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے کئی گنا بڑھا دے گا اور اپنی طرف سے اس سے بھی زیادہ بڑا بدلہ دے گا۔" (سورۃ البقرۃ آیت 40)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوئے اور فرمایا: میرے سامنے قومیں دکھائی دی گئیں اور میں نے دیکھا کہ ایک نبی اپنے پیروکاروں کے ایک بڑے گروہ کے ساتھ وہاں سے گزر رہا تھا اور دوسرا نبی صرف ایک چھوٹے سے لوگوں کے ساتھ وہاں سے گزر رہا تھا۔ اور ایک اور نبی صرف دس افراد کے ساتھ وہاں سے گزرتا تھا اور ایک اور نبی صرف پانچ افراد کے ساتھ وہاں سے گزرتا تھا اور ایک اور نبی اکیلے وہاں سے گزرتا تھا۔ اور پھر میں نے دیکھا تو لوگوں کی ایک بڑی تعداد دیکھی اور توقع کی کہ شاید وہ میری امت سے ہیں، لیکن مجھے بتایا گیا کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم ہے۔ پھر مجھے دیکھنے کو کہا گیا۔ میں نے افق کو ڈھانپ کر ایک بہت بڑا ہجوم دیکھا۔ مجھے اس طرح نظر آنے کے لئے کہا گیا تھا۔ اس لیے میں نے ایک بہت بڑی تخلیق دیکھی۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ تمہارے پیروکار ہیں اور ان کے آگے ستر ہزار لوگ ہیں جن کا نہ حساب کتاب ہوگا اور نہ ان کے لیے کوئی عذاب آئے گا۔ اس کے بعد لوگ چلے گئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں بتایا کہ یہ ستر ہزار لوگ کون ہوں گے۔ اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپس میں کہنے لگے کہ ہم شرک میں پیدا ہوئے تھے لیکن بعد میں ہم نے اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔ یہ لوگ ہمارے بچے ہوں گے [جو کفر میں پیدا نہیں ہوئے تھے]۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس گفتگو کی خبر سنی [اور ان قیاس آرائیوں کو حل کرنے کا فیصلہ کیا کہ یہ لوگ کون ہیں جو بغیر کسی حساب کتاب اور حساب کتاب کے جنت میں داخل ہوں گے]۔ فرمایا کہ وہ نہ اپنے آپ کو داغدار کرتے تھے اور نہ منکر پڑھتے تھے اور نہ کسی چیز میں برائی دیکھتے تھے اور وہ اپنے رب پر بھروسہ کرتے تھے۔ یہ سن کر عکاشہ بن محسن نے اٹھ کھڑے ہوئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا: "براہ کرم خدا سے دعا کریں کہ وہ مجھے ان میں سے ایک بنائے۔ آپ نے فرمایا: اے اللہ! اسے ان میں سے ایک بنائیں۔" پھر ایک اور شخص نے اٹھ کر (نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کہا کہ خدا سے دعا کرو کہ وہ مجھے بھی ان میں سے ایک بنا دے۔ اس نے کہا، "اوکاشا آپ سے پہلے ہو چکا ہے"۔ (بیان کردہحدیث کا مجموعہ *صحیح بخاری* عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جبرائیل علیہ السلام میرے پاس حارہ کی سمت سے آئے اور فرمایا: اپنی قوم کو بشارت دو کہ جو شخص اس حالت میں مر جائے کہ اس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا ہو۔ ایسا ہی جنت میں داخل ہوگا۔ میں نے اس سے پوچھا: اگرچہ کسی نے چوری اور کیا ہے؟ جبرائیل علیہ السلام نے کہا: ہاں اگرچہ کسی نے چوری اور کیا ہو۔ یہ سوال و جواب تین بار دہرایا گیا۔ (بیان کردہ*احادیث* کے مجموعے *صحیح بخاری* اور *صحیح مسلم*) حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی:

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِۦ جَنَّتَانِ

"جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا ہے تو اس کے لیے دو جنت ہیں۔" (سورۃ البقرۃ باب 55، آیت 46)

ایک اور پیغمبری روایت کے مطابق ، ایک مہم کے دوران ، ڈیرے بنائے گئے جہاں بعد میں ایک چھوٹا لڑکا ملا۔ وہ دن بہت گرم تھا۔ اچانک ایک عورت خیمے سے باہر نکلی اور اس بچے کی طرف بھاگتی ہوئی جہاں وہ کھڑا تھا۔ اس کا خاندان اس کے بالکل پیچھے تھا۔ عورت نے اپنے بچے کو اٹھایا اور اسے مضبوطی سے گلے لگا لیا۔ اس کے بعد وہ پتھریلی سطح پر لیٹ گئی اور اپنے بچے کو گرمی سے بچانے کے لئے دوبارہ گلے لگا لیا اور کہنا شروع کیا ، 'میرے بیٹے! میرے بیٹے!" یہ دیکھ کر لوگ رونے لگے [اپنے بچے کے لیے ماں کی شدید محبت اور محبت]۔ اس کے بعد لوگ چلے گئے۔ اسی اثناء میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آئے اور لوگوں نے آپ کو اس بات سے آگاہ کیا۔ وہ ان کی ہمدردی اور رحم سے خوش تھے۔ اس کے بعد انہوں نے انہیں بشارت دی اور کہا: کیا تم اس عورت کی طرف سے اس کے بچے پر رحم و کرم کے بہاؤ پر حیران ہو؟ لوگوں نے کہا: ہاں یہ بات ہے۔ آپ صلی

اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ تم سب پر اس عورت سے زیادہ مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔ اس کے بعد لوگ بے پناہ خوشی اور شاندار خوشخبری کے ساتھ اپنے راستے پر چلے گئے۔ (بیان کردحضرت عمر رضی اللہ عنہ سے صحیح بخاری *اور* صحیح مسلم کے مجموعے میں حدیث جمع کی گئی ہے

یہ روایات اور جو کچھ ہم نے "امید کی کتاب" (باب 13) میں بیان کیا ہے، ہمیں رحمت الٰہی کی وسعت اور وسعت کی خوشخبری دیتے ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ خدا ہمارے ساتھ وہ سلوک نہیں کرے گا جس کے ہم مستحق ہیں [ہماری اپنی غلطیوں ، کمزوریوں ، غلطیوں ، زیادتیوں اور ظلموں کی وجہ سے] ، بلکہ وہ ہمارے ساتھ اس طرح کا سلوک کرے گا جو اس کی عظمت اور عظمت کے مستحق ہے ، اس کی مہربانی ، فضل ، رحمت اور سخاوت سے بھرا ہوا ہے۔

باب 21 - اپنے آپ کو آزاد کرنے کے لیے دانشمندی چاہے وہ کسی بھی وقت، جگہ اور حالات سے قطع نظر اندرونی سکون ، سکون اور خوشی حاصل کرے

غزالی کی عظیم تصنیف *"* احیئ العلوم الدین*" یا "خدا کی راہ کے علم کی احیاء"* کی *چوتھی اور آخری جلد کی آخری کتاب کے اختتام پر* لچک، مثبتیت، اندرونی امن، سکون، ابدی خوشی اور لامتناہی فتح کے حصول کے لیے روحانی جدوجہد کے اہم نکات پر غور کرنے کے قابل ہے۔ اس مقصد کے لیے غزالی کی لازوال حکمت کو یہاں ایک بار پھر ایک اہم روایت کی شکل میں بروئے کار لایا جائے گا جو زندگی کے اصل مقصد کے حصول کے راستے کی وضاحت کرتا ہے۔ غزالی نے اپنی کتاب "*ایوحل ولد*" یا "میرے پیارے بیٹے" میں اس روایت کا تذکرہ کیا ہے جو غزالی کی تین جلدوں پر مشتمل مختصر کتابوں کے مجموعے "*مجمع رسا الامام غزالی*" یا "امام غزالی کی مختصر کتابوں کا مجموعہ" میں موجود ہے[27]:

کہا جاتا ہے کہ طالب علموں اور مریدوں میں سے جو روحانی مرشد کی رہنمائی میں اپنی روحوں کو تمام بری خواہشات اور رجحانات سے پاک کرنے کے حصول کے ذریعے روحانی کمال اور روشن خیالی حاصل کرتے ہیں، جس نے اس کے نتیجے میں تربیت اور ہدایت کے ذریعے روح کی یہ تطہیر اور خدا کے سامنے اعلیٰ مقام حاصل کیا ہے۔ شیخ شقیق بلخی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد اور شاگرد حاتم العاصم رحمہ اللہ تھے جو بعد میں شیخ شقیق کی روحانی تربیت اور رہنمائی سے ایک عظیم روحانی مرشد بن گئے۔ ایک دن شیخ شقیق بلخی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"اے حاتم! کتنے عرصے سے میری صحبت (روحانی قربت) میں ہوں اور جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اسے سن رہا ہوں؟

حاتم عاصم رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا: تینتیس سال!

شیخ شقیق بلخی نے پوچھا:

"اس طویل عرصے میں، تمہیں مجھ سے کیا فائدہ ہوا ہے؟"

حاتم عاصم رحمہ اللہ نے فرمایا:

"[میں] نے [آپ سے] آٹھ فوائد حاصل کیے ہیں۔"

شیخ شقیق بلخی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"*انا للہ و انا الائے راجعون*."
"ہم اللہ ہی کے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔"

شیخ شقیق بلخی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اے حاتم! میں نے اپنی زندگی تدریس اور تربیت میں گزاری ہے ، اور آپ نے مجھ سے صرف آٹھ فوائد حاصل کیے ہیں؟"

حاتم عاصم رحمہ اللہ نے فرمایا:

"اے میرے استاد! اگر تم نے مجھ سے سچ پوچھا تو حقیقت وہی ہے جو میں نے تم سے کہی تھی۔ مجھے مزید کسی فائدے کی ضرورت نہیں ہے اور علم سے حاصل ہونے والے یہ فوائد کافی ہیں کیونکہ مجھے یقین ہے کہ میں ان آٹھ فوائد کے ذریعے دنیا اور آخرت کی زندگی میں نجات حاصل کروں گا۔

شیخ شقیق بلخی رحمہ اللہ نے ان سے پوچھا:

"ٹھیک ہے! مجھے بتائیں ، وہ آٹھ فوائد کیا ہیں؟"

حاتم العصم کے بیان کردہ فوائد

"اے میرے استاد! **پہلا فائدہ** یہ ہے کہ میں نے اس دنیا کے لوگوں کو دیکھا اور دیکھا کہ ہر ایک کا ایک محبوب ہے۔ لیکن لوگوں کے یہ محبوب ایسے ہیں کہ ان میں سے بعض (یعنی محبوب) ان کے ساتھ رہتے ہیں یہاں تک کہ ان کی بیماری موت لے آتی ہے، ان میں سے کچھ موت تک ان کے ساتھ رہتے ہیں، کچھ ان کے ساتھ رہتے ہیں یہاں تک کہ وہ قبروں تک پہنچ جاتے ہیں، اور دفن کرنے کے بعد تمام محبوب وہاں سے واپس آتے ہیں۔ ان کا کوئی بھی محبوب ان کے ساتھ قبروں میں نہیں جاتا تاکہ وہاں ان کے ساتھ رہ سکے اور ان کی صحبت [اندھیرے ، تنہائی ، تنگ نظری اور وحشت میں] ان کی صحبت فراہم کرے۔ میں نے اس پر غور کیا اور اپنے آپ سے کہا کہ صرف وہی ایک اچھا محبوب ہے جو قبر میں ان کے ساتھ جاتا ہے اور اپنے عاشق کے ساتھ رہتا ہے، جو صحبت فراہم کرے گا، جو قبر کو روشن کرے گا، جو قیامت اور اس کی منزلوں پر شریک ہو گا (قیامت تک دفن ہونے کے بعد جن مقامات سے گزرتا ہے)۔ میں نے دیکھا کہ صرف ایک ہی محبوب جس میں یہ [اچھی] صفات ہیں وہ میرے نیک اعمال ہیں۔ اس کے بعد میں نے اپنے نیکی کو اپنا محبوب بنا لیا تاکہ وہ میرے ساتھ میری قبر میں چلے جائے، مجھے اپنی صحبت فراہم کرے، میری قبر میں روشن شمع بن جائے، آخرت کے تمام مراحل میں میرا ساتھی ہو گا، اور مجھ سے کبھی جدا نہ ہو گا۔

شیخ شقیق بلخی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"شاباش اے حاتم! آپ نے بہت اچھی بات کہی ہے۔ اب دوسرا فائدہ بیان کیجئے۔

"اے میرے استاد! **دوسرا فائدہ** یہ ہے کہ میں نے دنیا کے لوگوں کی طرف دیکھا تو دیکھا کہ ہر کوئی نفس کی لذتوں اور خواہشات کی پیروی کر رہا ہے اور ہر کوئی ادنیٰ نفس کی خواہشات کے تابع ہے۔ یہ دیکھ کر میں نے مندرجہ ذیل آیت (قرآن) پر غور کیا:

وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِۦ وَنَهَى ٱلنَّفْسَ عَنِ ٱلْهَوَىٰ ﴿٤٠﴾

فَإِنَّ ٱلْجَنَّةَ هِىَ ٱلْمَأْوَىٰ ﴿٤١﴾

"لیکن جس نے اپنے پالنے والے کی موجودگی کے خوف میں کھڑے ہو کر اپنے نفس کو حقیر خواہشات سے روکا ہو تو جنت اس شخص کے لیے آرام گاہ ہو گی۔" (سورة البقرة باب 79، آیہ 40-41)

میں نے یہ یقین پیدا کیا کہ حکمت قرآن صحیح ہے اور اللہ کی کتاب حق ہے۔ پھر میں نے اپنے نفس کے خلاف ایک محاذ کھڑا کیا اور اس کی مخالفت کرنے کا عزم کر لیا۔ میں نے اسے (یعنی اپنی نچلی نفس) اس شکل میں ڈھال لیا کہ میں نے اس کی کسی بھی خواہش کو پورا نہیں کیا یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں سکون اور اطمینان حاصل کرنے لگا۔

شیخ شقیق بلخی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ تمہارے اچھے اعمال میں اپنی نعمتیں عطا فرمائے۔ اب تیسرا فائدہ بیان کیجئے۔

"اے میرے استاد! **تیسرا فائدہ** یہ ہے کہ جب میں نے لوگوں کی طرف دیکھا تو میں نے دیکھا کہ ہر شخص بڑی تکلیف اور محنت کے ساتھ اس فانی دنیا کی جائیدادوں (پیسہ، دولت، سامان) کو جمع کرنے میں مصروف ہے اور بہت خوش ہے کہ اس کے پاس بہت زیادہ مال اور مادی اثاثے ہیں۔ لیکن جب میں نے قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت پر غور کیا:

مَا عِندَكُمْ يَنفَدُ ۖ وَمَا عِندَ ٱللَّهِ بَاقٍ ۗ

"جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ ہمیشہ رہنے والا ہے۔" (سورة البقرة باب ۱۶ آیت ۹۶)

پھر جو کچھ بھی میں نے دنیا میں جمع کیا وہ سب خدا کی راہ میں خرچ کر کے اسے متقی مسکینوں اور بھکاریوں میں تقسیم کر دیا تاکہ وہ (وہ مادی مال جو میں نے خدا کی راہ میں تقسیم کیا تھا) میری امانت کے طور پر اللہ تعالیٰ کے پاس جمع ہو جائے اور بے پناہ بھلائی اور فدیہ کا ذریعہ بن جائے آخرت کی زندگی میں نجات ہے۔"

شیخ شقیق بلخی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اے حاتم! اللہ تعالیٰ آپ کو اپنا اجر عطا فرمائے۔ آپ نے بہت اچھی بات کہی ہے اور بہت اچھا کام کیا ہے۔ اب چوتھا فائدہ بیان کیجئے۔

"اے میرے استاد! **<u>چوتھا فائدہ</u>** یہ ہے کہ میں نے دنیا کے لوگوں کی طرف دیکھا اور دیکھا کہ ان میں سے کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شان و شوکت اور عزت اس قوم یا قبیلے (گروہ کی) کی ہے جو بڑا اور طاقتور ہے، اسی لیے وہ اپنے قبیلے (قوم یا گروہ) پر فخر کا اظہار کر رہے ہیں۔ ان میں سے بعض ایسے ہیں کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ عظمت مال و مال اور خاندان اور رشتہ داروں کی کثرت سے حاصل ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ اپنے مال و اولاد پر فخر کا اظہار کر رہے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہیں کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی شان و شوکت غصے کا مظاہرہ کرنے، مار پیٹنے، قتل، قتل اور لوٹ مار میں ہے اور وہ اس پر فخر کا اظہار کرتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی شان و شوکت فضول خرچی میں ہے، اسی لیے وہ اپنے فضول خرچی کو اعزاز کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور اس پر فخر کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن میں نے اس آیت پر غور کیا جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ ٱللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ

"بے شک تم میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو اس سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔" (سورة البقرة باب ۴۹، آیت ۱۳)

لہٰذا یہ درست اور سچ ہے اور مخلوقات کے خیالات جھوٹے اور غلط قیاس آرائی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے *تقویٰ* اختیار کیا تاکہ میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک اعلیٰ ترین مقام رکھنے والے میں شمار ہوں۔

شیخ شقیق بلخی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اے حاتم! اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو۔ آپ نے بہت اچھی بات کہی ہے۔ اب پانچواں فائدہ بیان کرو۔

"اے میرے استاد! **<u>پانچواں فائدہ</u>** یہ ہے کہ میں نے ان لوگوں کو دیکھا جو ایک دوسرے کے بارے میں شکایت کر رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ یہ سب حسد، حسد اور دشمنی کی وجہ سے کر رہے تھے اور اس کی بنیادی وجہ عظمت، عظمت، مال، دولت اور علم کی خواہش اور مقابلہ ہے۔ میں نے قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیت پر غور کیا جس میں ارشاد ہے:

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُم مَّعِيشَتَهُمْ فِى ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا

"*ہم ہی ہیں جو دنیا کی زندگی میں ان کے درمیان رزق تقسیم کرتے ہیں۔*" (سورة البقرة سورة البقرة آیت 32)

پھر میں نے سوچا کہ اللہ تعالیٰ نے ابتدا سے ہی اموال اور درجات مقرر کیے ہیں اور اس معاملے میں کسی کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے کسی سے مقابلہ نہیں کیا اور نہ ہی حسد کیا اور خدا کی تقسیم اور اس کی تقدیر پر راضی رہا اور پوری دنیا کے ساتھ [اللہ کی تمام مخلوقات کے خلاف تمام حسد اور دشمنی چھوڑ کر]۔

شیخ شقیق بلخی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اے حاتم! آپ سچ کہہ رہے ہیں اور آپ صحیح کام کر رہے ہیں۔ اب چھٹا فائدہ بیان کرو۔

"اے میرے استاد! **چھٹا فائدہ** یہ ہے کہ جب میں نے لوگوں کی طرف دیکھا تو میں نے دیکھا کہ ہر شخص کسی نہ کسی وجہ سے کسی اور سے دشمنی کر رہا ہے۔ پھر میں نے مندرجہ ذیل آیت پر غور کیا:

إِنَّ ٱلشَّيْطَٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَٱتَّخِذُوهُ عَدُوًّا

"بے شک *شیطان* تمہارا دشمن ہے پس اسے اپنا دشمن سمجھو۔" (سورۃ البقرۃ باب 35 آیت 6)

اس کے بعد مجھے یہ یقین ہو گیا کہ خدا کا قول سچا ہے، مجھے شیطان کے سوا کسی اور سے دشمنی نہیں کرنی چاہیے۔ اس کے بعد سے میں شیطان کو اپنا دشمن سمجھتا تھا اور اس کے کسی حکم کی تعمیل نہیں کرتا تھا۔ اس کے بجائے، میں نے [خدا] کی اطاعت پیدا کی اور خدا تعالیٰ کے احکام پر عمل کیا اور صرف اس کی عبادت اور غلامی کو اپنایا۔ سیدھا راستہ *سیرت المستقیم* ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے:

أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَٰبَنِىٓ ءَادَمَ أَن لَّا تَعْبُدُوا۟ ٱلشَّيْطَٰنَ ۖ إِنَّهُۥ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ

"کیا میں نے تم سے یہ وعدہ نہیں لیا کہ اے بنی آدم! شیطان کا کبھی کہا نہ مانو ۔ بے شک وہ تمہارا صریح دشمن ہے اور میری ہی عبادت کرو کیونکہ یہی سیدھا راستہ ہے۔ (سورۃ البقرۃ باب 36، آیت 60)

شیخ شقیق بلخی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اے حاتم! آپ نے بہت اچھا کام کیا اور بہت اچھی بات کہی۔ اب ساتواں فائدہ بیان کرو۔

"اے میرے استاد! **ساتواں فائدہ** یہ ہے کہ میں نے لوگوں کی طرف دیکھا اور دیکھا کہ ہر شخص اپنی روزی روٹی اور رزق کی تلاش میں مصروف ہے اور سخت جدوجہد میں مصروف ہے۔ اس سلسلے میں حلال اور *حرام* میں فرق بھی نہیں کیا جا سکتا بلکہ مشکوک اور حرام کمائی سے ذلیل کیا جا رہا ہے۔ پھر میں نے مندرجہ ذیل آیت پر غور کیا:

وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِى ٱلْأَرْضِ إِلَّا عَلَى ٱللَّهِ رِزْقُهَا

"اور زمین پر کوئی جاندار ایسا نہیں جس کی رزق اللہ کے پاس نہ ہو۔" (سورۃ البقرۃ القرآن، باب 11، آیت 6)

پھر میں نے یقین کر لیا کہ حکمت قرآن حق ہے اور صحیح ہے اور میں بھی ان جانداروں میں ہوں جو زمین پر موجود ہیں۔ چنانچہ میں نے خدا کی عبادت میں مشغول ہو گیا اور یہ یقین پیدا ہو گیا کہ وہ میرے لیے رزق لے کر آئے گا کیونکہ اس نے مجھے رزق دینے کا وعدہ کیا ہے۔

شیخ شقیق بلخی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"آپ نے بہت اچھا کام کیا اور بہت اچھی بات کہی۔ اب آٹھواں فائدہ بیان کیجئے۔

"اے میرے استاد! **آٹھواں فائدہ** یہ ہے کہ جب میں نے لوگوں کو دیکھا تو مجھے معلوم ہوا کہ ہر شخص کا انحصار [یا اعتماد] کسی نہ کسی چیز پر ہے۔ کچھ کو اپنی [مادی] املاک پر بھروسہ ہے ، کچھ دوسرے لوگوں پر بھروسہ کرتے ہیں [یا انحصار کرتے ہیں]۔ چنانچہ میں نے اس مقدس آیت پر غور کیا جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَن يَتَوَكَّلْ عَلَى ٱللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُۥٓ ۚ

"اور جو کوئی خدا پر توکل کرتا ہے اس کے لیے وہی کافی ہے۔" (سورۃ البقرۃ باب 65، آیت 3)

وہوا حسبی و نعم الوکیل۔

"اور وہ میرے لیے کافی ہے اور وہ بہترین مددگار ہے۔"

چنانچہ میں نے ہر معاملے میں مکمل توکل اور بھروسہ اختیار کیا۔

شیخ شقیق بلخی رحمہ اللہ نے جب یہ آٹھ فوائد سنے تو فرمایا:

"اے حاتم! اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی *توفیق* عطا فرمائے ۔ آپ نے بہت اچھی باتیں کہی ہیں۔ میں نے *تورات*، *انجیل* (حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی انجیل علیہ السلام)، زبور (زبور) اور صحیح اور باطل میں قابل تعریف فرق (یعنی قرآن حکیم) میں دیکھا ہے کہ ان تمام کتابوں میں ان آٹھ فوائد کا ذکر کیا گیا ہے، یعنی چاروں کتابوں نے اپنی تعلیمات میں یہ آٹھ فوائد بتائے ہیں۔ جو کوئی ان [آٹھ اصولوں] پر عمل کرتا ہے وہ گویا اس نے چاروں [مقدس] کتابوں پر عمل کیا ہے۔

حصہ 4: رومی کے تین شہزادوں کے افسانے کے ذریعے باطنی وجود کے کمال کا روحانی راستہ اور زندگی کے مقصد کا ادراک

مولانا جلال الدین رومی (1207-1273ء) جو رومی کے نام سے مشہور ہیں، نے فارسی میں اپنے چھ جلدوں پر مشتمل شعری مجموعے میں روحانیت، اندرونی روحانی راستے، گنوسس اور الٰہی محبت کا ایک شاہکار لکھا ہے جسے "*متھنوی معانوی*" یا "گہرے روحانی معانی کے دوہیں" کے نام سے جانا جاتا ہے، جسے "*متھنوی*" یا "*مثنوی*" کے نام سے جانا جاتا ہے"جو پوری انسانی تہذیب کی اس موضوع پر سب سے زیادہ مہاکاوی شاعری ہے۔ اس شاہکار کے اختتام پر ، اس نے پورے روحانی راستے کا خلاصہ تین شہزادوں کے بارے میں ایک افسانے کی شکل میں کیا جو اپنی بیٹی سے شادی کرنے کے لئے چین کے شہنشاہ سے ملنے کے لئے سفر پر نکلے تھے جو اس کی بے مثال خوبصورتی کے لئے مشہور تھی۔ رومی نے پہلے دو شہزادوں کی کہانی سنائی اور تیسرے شہزادے کی کہانی کو ادھورا چھوڑ دیا اور اس وجہ سے "*متھنوی*" کو ادھورا چھوڑ دیا:

جب سورج دل کے افق سے غروب ہو جائے گا [1]

مثنوی ختم ہو چکی ہے اور خدا بہتر جانتا ہے۔

رومی نے مزید پیش گوئی کی:

[تینوں شہزادوں کی کہانی] کا بقیہ حصہ کسی شخص کے دل میں آئے گا، بغیر کسی سے بات کیے بغیر،

جس کے پاس زندہ روح ہے

"متھنوی" کے *آخری حصے سے تین شہزادوں کی کہانی* کے ساتھ ساتھ اس کہانی کی تکمیل کے ساتھ جیسا کہ رومی نے پیش گوئی کی تھی، یہاں اس راستے کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے جو کسی کو داخلی

[1] یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ اس شاہکار "*متھنوی*" کا موضوع رومی کے دل پر الہامی طور پر الہامی تھا۔ چونکہ یہ چھ جلدیں لکھنے کے بعد رک گیا ہے ، لہذا یہ اس کے لئے ایک الہی اشارہ ہے کہ اب وقت آگیا ہے کہ کتاب کو ادھورا چھوڑ دیا جائے۔ اس کی مزید وضاحت ان کے بیٹے مولانا بہاء الملتؒ نے کی ہے (ان کا اصل نام بہاء الدین ولاد تھا لیکن سلطان ولد کے نام سے مشہور تھے) نے کتاب کے آخر میں اپنی شاعری کے آخری اشعار کا اضافہ کرتے ہوئے کہا کہ ان کے والد نے پیشن گوئی کی ہے: "[تینوں شہزادوں کی کہانی] کا بقیہ حصہ ایک شخص کے دل میں آئے گا، بغیر بات کیے بغیر، جو زندہ (روشن خیال) روح کا مالک ہے"۔ رومی کی پیشن گوئی کے مطابق، کئی روشن خیال روحیں "*متھنوی*" کے اختتام سے متاثر ہوئیں۔ اس میں سے ، ہندوستان سے تعلق رکھنے والے ایک بزرگ مولانا الٰہی بخش کندیہلوی کا ایک نتیجہ اس عظیم شاہکار کے مطابق قریب ترین سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس کا اختتام اسی رگ میں ہوتا ہے جس طرح رومی نے چھ جلدوں میں جاری رکھا ہے ، اور خوبصورتی سے تین شہزادوں کی کہانی کا اختتام کیا ہے اور ایک اور کہانی کے ساتھ جو رومی نے تین بھائیوں کے بارے میں ادھوری چھوڑ دی ہے جن کے والد نے ایک *قاضی* کی دیکھ بھال میں میراث چھوڑ دی ہے (قاضی) اس سے کہا کہ وہ اپنی میراث اس بیٹے کو دے دے جو سب سے زیادہ سست ہے۔ اس موجودہ کتاب کے اس آخری حصے میں رومی کی تینوں شہزادوں کی نامکمل کہانی، ان کے بیٹے مولانا بہاء الملت(علیہ السلام بہاء الملت) کے اختتام پر قبضہ کیا جائے گا کہ ان کے والد نے "*متھنوی*" کو ادھوری کیوں چھوڑ دیا، اور مولانا *الٰہی بخش کانڈیہلوی کی "متھنوی" کا حتمی اختتام جب انہوں نے کہانی اور کتاب کو اس وقت ختم کیا جب وہ رومی کی پیشن گوئی کے مطابق ایسا کرنے کے لیے الہامی طور پر الہامی طور پر ایسا کرنے کے لیے الہامی طور پر الہامی الہامی کو متاثر کیا گیا تھا۔*

کمال، روحانی تبدیلی، زندگی کے حقیقی مقصد کے حصول اور اس کے نتیجے میں ابدی خوشی اور لامتناہی فتح کے لیے اختیار کرنا چاہیے:

ایک شہنشاہ کی روایت اور اس نے اپنے تین بیٹوں کو مشورہ دیا کہ وہ ڈومینین کے مختلف حصوں کا سفر کریں اور انہیں انتظامیہ اور سیٹ اپ کے بارے میں مخصوص ہدایات دیں اور انہیں ہدایت کی کہ وہ کسی خاص قلعے میں نہ جائیں اور یہاں تک کہ اس کے ارد گرد بھی نہ جائیں

ایک شہنشاہ تھا جس کے تین بیٹے تھے۔

تینوں سمجھدار اور عقلمند تھے۔

ان میں سے ہر ایک قابل تعریف تھا

سخاوت ، جنگ اور شان و شوکت میں۔

وہ سب شہنشاہ کے سامنے کھڑے ہو گئے

وہ شہنشاہ کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھے۔

بیٹے کی نظر سے ایک خفیہ راستہ ہے

والد کا کھجور کا درخت اس خفیہ راستے سے [اسے سیراب کرنے کے لیے] پانی کھینچتا ہے۔

اس حد تک کہ بیٹے کے چشمے کا پانی

باپ اور ماں کے باغات میں بہتا ہے۔

والدین کے باغات تازہ اور سیراب رہتے ہیں

اولاد کی آنکھوں سے جہاں سے خفیہ نہریں بہتی ہیں۔

جب [اولاد سے ماں باپ کی طرف بہنا] بیماری کی وجہ سے کمزور ہو جاتا ہے

کھجور کی شاخیں اور پتے خشک ہو جاتے ہیں۔

کھجور کی خشکی واضح طور پر کہتی ہے

یہ درخت اولاد سے [زندگی اور فلاح کا] پانی نکالتا ہے۔

اسی طرح ، بہت سے خفیہ دھارے

اے غفلت! آپ کی روح سے جڑے ہوئے ہیں [اپنے وجود کے درخت کو سیراب کرنے کے لئے]۔

اے تم جن لوگوں کو یہاں مخاطب کیا گیا ہے! آسمان اور زمین سے مواد نکالے گئے ہیں

اس حد تک کہ آپ کا جسم ان سے بنا ہے۔[2]

تم نے دنیا کے اجزاء سے جسم چرا لیا ہے

آپ نے یہاں اور وہاں سے ٹکڑے ٹکڑے کاٹ دیئے ہیں۔

زمین، سورج اور آسمان سے

آپ نے [دنیا سے] ان ٹکڑوں کو جسم اور روح پر چسپاں کیا ہے۔

خبردار رہیں! کیا آپ کو لگتا ہے کہ آپ مفت میں [ایسا کرنے کے لئے] فرار ہوجائیں گے؟

یہ اور وہ تم سے واپس نہیں لیا جائے گا؟

چوری شدہ سامان طویل عرصے تک نہیں ہوتا

وہ چوروں کو اس جگہ لے جا سکتے ہیں جہاں انہیں پھانسی دی جاتی ہے۔

یہ [جسم] مستعار مادہ سے بنا ہے، کسی کو اپنے پاؤں کو زمین پر نہیں ڈالنا چاہیے [گویا جسم دائمی ہے][3]

کیونکہ جو کچھ آپ نے ادھار لیا ہے، اسے واپس کرنا چاہیے۔

سوائے اس کے کہ میں نے انسان میں اپنی روح پھونک دی[4] (روح) جیسا کہ وہ اللہ کی طرف سے آئی ہے

[آپ بہتر] روح کا تعلق ہے کیونکہ باقی سب کچھ بیکار ہے۔

میں انہیں روح کے سلسلے میں بیکار کہہ رہا ہوں

ورنہ یہ (انسان کا جسم یا مادی وجود) بھی ایک مضبوط خالق نے بنایا ہے۔[5]

تینوں شہزادے اپنے والد کے تسلط میں مختلف ممالک کی طرف جارہے تھے جنہوں نے ان کو الوداع کہا اور اس کا مشورہ دہرایا کہ وہ دماغ کو اڑانے والے قلعے میں نہ جائیں

تینوں بیٹوں نے پختہ ارادے کے ساتھ سفر پر جانے کے لئے راستے پر چلنے کا فیصلہ کیا

اپنے باپ شہنشاہ کے ممالک کی طرف۔

ان کے شہروں اور قلعوں کی سیر میں

انتظامیہ کی نگرانی اور آمدنی میں اضافے کے لئے حکمت عملی بنانا۔

[مشکل] راستے پر چلنے کے ارادے کے وقت ، انہوں نے شہنشاہ سے اجازت طلب کی

[2] انسانی جسم کی ساخت دنیا کے بہت سے مواد سے بنی ہے۔

[3] جسم کو ایک دن زمین پر واپس لانے کی ضرورت ہوگی جب زندگی ختم ہو جائے گی کیونکہ یہ زمین سے مستعار لیے گئے مادے سے بنی ہے اور مستعار مواد کو لازمی طور پر وہیں واپس کرنا ہوگا جہاں سے وہ آئے تھے، سوائے اس روح کے جو مستعار مادے سے بنی نہیں ہے اور آسمانی الہامی اصل ہے۔

[4] قرآن مجید کی آیت (15:29) جو روح کی آسمانی ابتدا اور خدا کے ساتھ اس کے قریبی تعلق کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

[5] لہٰذا جسم بیکار نہیں ہے اور اسے ایک الہامی مقصد کے لیے تخلیق کیا گیا ہے جیسے کہ اس دنیاوی وجود میں روح کا ساتھی بننا اور روح کو ابدی خوشی اور ابدی کامیابی کی زندگی میں خدا کی قربت، محبت اور قربت میں اپنی آسمانی ابتدا کی طرف لوٹنے میں مدد کرنا۔

چونکہ اس نے ان میں پختہ عزم دیکھا، اس لیے اس نے انہیں اجازت دے دی۔

انہوں نے شہنشاہ کا ہاتھ بوسہ دیا جس نے انہیں الوداع کہا

تب شہنشاہ بادشاہ نے ان سے کہا۔

جہاں بھی تمہارے دل کی خواہش ہے وہاں جانے کی نیت کرو

خدا کی حفاظت میں آگے بڑھو۔

سوائے ایک قلعے کے جسے 'دماغ اڑانے والا' کہا جاتا ہے

کیونکہ یہ تاج کے خواہشمندوں کے لئے زندگی کو محدود بنا دیتا ہے۔

خدا کے واسطے تصویروں سے لدے اس قلعے سے

دور رہو اور خطرے سے ڈریں۔

اس کے سامنے ، پیچھے ، محرابوں ، چھت اور فرش پر

یہ سب تصاویر، کندہ کاری اور شکلوں سے بھرے ہوئے ہیں۔

زلیخہ کے گھر کی طرح جو اس کی تصویروں سے بھرا ہوا تھا

تاکہ حضرت یوسف علیہ السلام اس کی طرف دیکھنے پر مجبور ہوں۔[6]

چونکہ یوسف نے اس کی طرف نہیں دیکھا

اس نے چالاکی سے پورے گھر کو ہر جگہ اپنی تصویروں سے بھر دیا۔

لہذا ، جہاں بھی وہ خوبصورت چہرہ (یوسف) نظر آئے گا

نادانستہ طور پر اس کا چہرہ دیکھے گا۔

روشن آنکھوں کے مالکوں کے لیے، ایک اور واحد خدا

چھ سمتوں کو اپنے ثبوت کا مظہر بنایا۔

تاکہ جو بھی جانور اور چیز اگتی ہے وہ اسے دیکھتے ہیں

وہ خوبصورتی کے باغوں سے ناشتکاری پائیں گے[7]

یہی وجہ ہے کہ اس نے اس گروہ کو [روشن خیالی آنکھوں اور روحوں کے ساتھ] بتایا

تم جہاں بھی مڑو گے تم اس کا چہرہ دیکھو گے۔

اگر وہ پیاس سے پیالے میں سے پانی پیتے ہیں

وہ خدا کو پانی میں دیکھتے ہیں۔

---

[6] زلیخہ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو راغب کرنے کے لیے اپنی تصویریں اپنے پورے گھر میں لگا دیں تاکہ وہ اس کی طرف دیکھے بھی نہیں، اسے دیکھنے پر مجبور کریں۔

[7] جب سنت ، گنوسٹک اور خدا کے مقریب کائنات میں الہی کمال اور فضیلت کا مشاہدہ کرتے ہیں تو ، ان کی عرفیت اور الہی علم میں اضافہ ہوتا ہے کیونکہ یہ شک اور کفر کے تمام سائے سے بالاتر ان کی یقین کو گہرا کرنے کا کام کرتا ہے ، بالکل اسی طرح جیسے طلوع ہونے والے سورج جو تاریکی کو ختم کرتا ہے۔

کوئی عاشق نہیں ہے، جو پانی میں دیکھتا ہے

اے بصیرت والو! اپنا چہرہ

جب عاشق کا چہرہ اس میں فنا ہو گیا

مجھے بتائیں کہ ایسا کون پانی میں دیکھتا ہے؟

آسمانی صحابی کے چہرے پر وہ خدا کی خوبصورتی دیکھتے ہیں

بالکل اسی طرح جیسے پانی میں چاند کی عکاسی ، کیونکہ یہ اس کا شاہکار ہے جو محبت میں کسی بھی شریک شریک کو پسند نہیں کرتا [8]ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنی محبت میں شریک ہونے کی ناپسندیدگی صرف عاشق اور سچے لوگوں کے لیے ہے

یہ ناپسندیدگی شیطان اور چوپایوں کے لیے نہیں ہے۔

یہاں تک کہ اگر شیطان [خدا کو] عاشق بن جائے تو وہ شرط جیت جائے گا

وہ جبرائیل بن جائے گا اور شیطان مر جائے گا۔

"شیطان مسلمان ہو گیا" اس جگہ پر ظاہر ہوا

جہاں یزید اپنی مہربانی اور فیاضی سے بایزید بن گیا۔[9]

اس معاملے کی کوئی انتہا نہیں ہے [جو ابدی خزانے کے برابر ہے]، اے روشن آنکھوں اور روح والے!

ہوشیار! اپنے چہروں کو اس [دماغ اڑانے والا] قلعے سے بچائیں۔

ہوشیار! لالچ تمہیں گمراہ نہ کرے

تاکہ تم ابدی عذاب میں گر جاؤ

یہ ہر ایک کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے آپ کو خطرے سے بچائے

میری طرف سے یہ مخلصانہ نصیحت سنیں۔

آسانی کی تلاش میں ، سر میں عقل تیز ہونا بہتر ہے

روک تھام مصیبت کے تنگ اور تاریک ٹھکانے سے بہتر ہے۔

اگر اس باپ نے یہ نہ کہا ہوتا

اور کیا اس نے ان سے اس قلعے سے خود کو بچانے کے لئے نہیں کہا تھا۔

وہ خود اس قلعے کی طرف آگے نہیں بڑھتے

---

[8] خدا کے مخلص عاشق کبھی بھی خوبصورت آسمانی ساتھیوں کا ارادہ نہیں رکھتے، بلکہ اس خوبصورتی میں بھی وہ حسن الٰہی کی گواہی دیتے ہیں۔ ان کا ارادہ صرف اس کے لئے ہے جو صرف اس کی محبت میں کسی بھی شریک شریک کے ساتھ ملاوٹ سے پاک ہے۔ چونکہ خدا کا ایک گنوسٹک اور مباشرت خدا کا محبوب ہے، اس لیے اس کی محبت میں کسی بھی شریک کا ہونا الٰہی ناپسندیدگی کا تقاضا ہے کہ محبوب خدا کے سوا کسی اور کی طرف نہ دیکھے۔

[9] نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شیطان کے بارے میں فرمایا: سب کی طرح میرے ساتھ بھی شیطان بھی ہے، لیکن اللہ نے میری مدد کی اور اس طرح وہ مسلمان ہو گیا۔ رومی کہتے ہیں: "اس نبوت کی روایت کا اصل مطلب یہ ہے کہ اگر شیطان توبہ بھی کرے گا تو وہ اسی طرح ایک گنوسٹک بن جائے گا جس طرح یزید جیسا ظالم توبہ کرنے کے بعد بیازید کی طرح گنوسٹک بن سکتا ہے۔

ان کا اپنا جھکاؤ اس کی طرف نہیں تھا۔

کیونکہ یہ نامعلوم اور ویران تھا

یہ دوسرے قلعوں اور راستوں سے دور تھا۔

چونکہ اس نے انہیں اس سے منع کیا تھا، اس لیے ان کے دل اس بات سے متاثر ہو گئے

لالچ میں پڑ گیا اور خیالات کی گلی میں۔

اس ممانعت نے ان کے دلوں میں خواہش پیدا کی

اس راز کی حقیقت کی تحقیقات کرنے کے لئے۔

کون ہے ، جو اس چیز سے دور رہتا ہے جس سے روکا جاتا ہے؟

بلکہ انسان حرام چیزوں کا لالچ رکھتا ہے۔

پرہیزگاری کرنے والے اور ڈرنے والے ان چیزوں سے نفرت کرتے ہیں جن سے منع کی گئی ہے

نچلے نفس کی خواہشات کے لوگوں کے لئے ، ممانعت ایک ترغیب بن جاتی ہے۔

اسی لیے کہا گیا ہے کہ بہت سے لوگ اس کے ذریعے گمراہ ہو جاتے ہیں۔

یہ وہاں ہے کیونکہ بیدار لوگ اس کی رہنمائی کرتے ہیں۔[10]

شہزادوں نے کہا کہ وہ خدمات فراہم کریں گے

ہم "ہم نے سنا اور اطاعت کی" پر عمل کریں گے۔

ہم آپ کے حکم سے انحراف نہیں کریں گے

اپنی نعمتوں سے غافل ہونا کفر کے مترادف ہے

لیکن انہوں نے انشاء اللہ (اگر اللہ چاہا) نہیں کہا اور اس کی تسبیح نہیں کی

چونکہ وہ اپنے آپ پر انحصار کرتے تھے، اس لیے خدائی نعمتیں ان سے الگ تھیں۔

تمام راستوں کا مقصد صرف ایک ٹھکانہ ہے

یہ ہزاروں دانے ایک دانے سے آئے ہیں۔[11]

کھانے پینے کی اشیاء کی مختلف قسم

اگر آپ اس میں گہرائی سے دیکھیں تو سب ایک ہی چیز ہیں۔

جب آپ کھانے کی ایک چیز سے مطمئن ہوجاتے ہیں

پچاس دیگر اشیائے خوردونوش آپ کے لیے بیکار ہو جاتی ہیں۔

---

[10] قرآن مجید میں یہ خوبی ہے کہ سیاہ دل رکھنے والے بہت سے لوگ اس سے گمراہ ہوتے ہیں اور بیدار اور باخبر دل رکھنے والے اس کی رہنمائی کرتے ہیں جیسا کہ خود قرآن سے ثابت ہوتا ہے۔

[11] چونکہ دنیا بھر سے لوگ نماز کے لیے خانہ کعبہ کا رخ کرتے ہیں اس لیے ان میں اتحاد پایا جاتا ہے کیونکہ ان کا آخری مقصد ایک ہی ہوتا ہے۔ ایک دانے سے ہزاروں دانے پیدا ہوتے ہیں، اس لیے ایک ہی اصل ہونے کی وجہ سے ان میں اتحاد ہوتا ہے۔

اپنی بھوک میں آپ کو ایک چیز میں کثرت نظر آنے لگی ہے

جسے آپ ہزاروں سمجھتے [12]ہیں۔

شہنشاہ کے بیٹے قلعے کی طرف جاتے ہیں کیونکہ یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ ممنوعہ چیزوں کے لئے لالچی بنیں۔ انہوں نے باپ کی نصیحت کو بالکل منہ موڑ دیا اور مصیبت میں گر گئے اور ان کی ملامت کرنے لگے کہ کیا تمہارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا اور وہ روتے اور شرمندہ ہو کر کہنے لگے اگر ہم سنتے اور سمجھتے تو ہم دوزخیوں میں سے نہ ہوتے

اس موضوع کی کوئی حد نہیں ہے۔ وہ گروہ [بیٹوں کا]

[ممنوعہ] قلعے کا راستہ اختیار کیا۔

وہ ممنوعہ درخت کے قریب پہنچے

اور نیک لوگوں کے حلقے سے نکل آئے

معزز شہنشاہ کے حکم کی خلاف ورزی

وہ اس قلعے کی طرف بڑھے جس نے صبر کو تباہ کر دیا اور حواس کو اڑا دیا۔

وہ نصیحت کرنے والے عقل کے مشورے کے خلاف پہنچے

وہ دن سے اندھیری رات کی طرف منہ موڑ لیے۔

خوبصورت تصویروں سے بھرا ہوا قلعے کی طرف

پانچ دروازے سمندر کی طرف اور پانچ زمین کی طرف تھے۔

پانچ رنگ اور بو کے بیرونی حواس کی طرح تھے

پانچ سچائی کی تلاش کے لئے اندرونی حواس کی طرح تھے۔[13]

ان ہزاروں تصویروں اور فن پاروں کی وجہ سے

وہ خوشی اور بے تکلفی سے گھوم رہے تھے [ایک کے بعد ایک فنکارانہ شاہکار دیکھنے کے لئے]۔

تصویروں کے شراب کے شیشوں سے نشے میں مت ہوں[14]

تاکہ تم بت بنانے والے یا عبادت کرنے والے نہ بن جاؤ۔

تصاویر اور شکلوں کے شراب کے شیشوں سے آگے بڑھیں ، ان پر مت روکیں

شراب شراب کے گلاس میں ہے لیکن اس سے نہیں۔[15]

---

[12] ہمارے ارد گرد بکھری ہوئی الہی تخلیقات میں ظاہر ہونے والی متنوع شکلیں کثرت کے طور پر ظاہر ہوتی ہیں حالانکہ وہ ایک اور واحد خالق کی طرف اشارہ کرتی ہیں ، کسی ایسے شخص کے لئے جس کے پاس حقیقت کو دیکھنے کی اندرونی آنکھ نہیں ہے۔

[13] پانچ بیرونی دروازے پانچ بیرونی انسانی حواس کی طرح ہیں، پانچ اندرونی دروازے پانچ اندرونی حواس کی طرح ہیں۔ ان حواس کے زیر اثر انسان بعض اوقات اپنی عقل کھو دیتا ہے۔ اسی طرح ، جو لوگ ان دروازوں سے قلعے میں داخل ہوئے ، ان کا دماغ اور عقل کھو بیٹھے۔ ذہن کو اڑانے والے قلعے کی طرف جانے والے ان دروازوں کی یہ خصوصیت تھی۔

[14] بیرونی شکلیں اور شکلیں جو ان کی حقیقت کو جانے بغیر بیرونی آنکھ کو نظر آتی ہیں۔

[15] اس میں کوئی شک نہیں کہ ان بیرونی شکلوں کی خوبصورتی شراب کی طرح نشہ پیدا کرتی ہے۔ تاہم ، یہ خوبصورتی ان کی اپنی نہیں ہے

اپنے کان اس کی طرف کھول دو جس نے یہ مے عطا کی ہے

لہٰذا آپ وہاں سے آواز اور آوازیں سن سکتے ہیں۔

جس کی شکل نہیں ہے، وہ آپ میں حیرت پیدا کرتا ہے

ایک ٹولز کے بغیر ، لاتعداد اوزار بناتا ہے۔

ایک ہاتھ کے بغیر ہاتھ پیدا کرتا ہے

روح کی روح انسان کو فنکار بناتی [16]ہے۔

کیا اثر و رسوخ (خدا) کی اثر و رسوخ سے کوئی مماثلت ہے؟

کیا آوازوں اور رونے کا غم سے کوئی مماثلت ہے؟

رونا ایک شکل ہے اور غم [جو رونے کو جنم دیتا ہے] بے شکل ہے

انسان غم سے اپنے ہاتھ کاٹتا ہے جس کا ہاتھ نہیں ہوتا۔

اے شہادت کرنے والو! یہ مثالیں مناسب نہیں ہیں

یہ صرف سب کو سمجھانے کی ایک کمزور کوشش ہے۔[17]

شکل کے بغیر ایک کی تخلیقی صلاحیتیں ، شکل پیدا کرتی ہیں

جسم کو حواس اور اوزاروں سے تخلیق کرتا ہے۔

تاکہ کسی کو جو بھی شکل پسند آئے

جسم کو اچھے یا برے ہونے کی حالت میں لائے گا۔[18]

اگر یہ نعمت کی شکل ہے تو شکر گزار ہو جاتا ہے

اگر برکت حاصل کرنے میں تاخیر ہو جائے تو صبر کرنے والا ہو جاتا ہے۔

اگر یہ رحم اور مہربانی کی شکل ہے تو انسان خوش ہو جاتا ہے

اگر یہ غم کی شکل ہے تو اداس ہو جاتا ہے۔

اگر یہ کسی شہر کی شکل ہے تو اس کی طرف سفر کرتا ہے

اگر یہ تیر کی شکل ہے تو ، کوئی ڈھال اٹھاتا ہے۔

بلکہ یہ مستعار لی گئی ہے۔ آپ کو حقیقی خوبصورتی کی طرف رجوع کرنا چاہئے - وہ جو ان شکلوں کو خوبصورتی عطا کرتا ہے۔ ان کی بیرونی شکلوں کے شراب کے گلاسوں میں ، الٰہی خوبصورتی کی شراب ہے۔ اس پر توجہ دیں تو آپ اپنے دل پر روحانی روشنی کا تجربہ کریں گے۔ جب آپ کو خدائی محبت کی شراب مل جائے گی تو آپ کو بیرونی شکلوں تک محدود نہیں رکھا جائے گا کیونکہ اس کائنات کا ہر ایٹم خدا کا مظہر بن جائے گا۔

[16] [خدائی] ہستی بغیر اوزاروں اور شکلوں کے ، بے شمار شکلیں اور اوزار [ہمارے ارد گرد تخلیقات کی شکل میں] پیدا کرتی ہے۔ جو ہستی جسمانی ہاتھوں سے بالاتر ہے، اس نے بے شمار ہاتھ پیدا کیے۔ خدا کی ہستی جو تمام روحوں کی روح ہے، اس نے انسانوں میں فنکار کو پیدا کیا، اس لیے وہ حقیقی ہے، شکل کے ساتھ ہر چیز کی ابتدا اور موجد ہے۔

[17] خدا جو اثر و رسوخ رکھنے والا ہے اور کائنات جو اس کا اثر ہے، یہ صرف اس کی چند مثالیں ہیں۔ شکل کے بغیر ، شکل کے ساتھ تخلیقات کی کثرت پیدا کرتا ہے۔

[18] اللہ تعالیٰ نے صورتیں اور چہرے اس لیے پیدا کیے ہیں کہ وہ اپنی باطنی کیفیت کے مطابق جسم کے ساتھ اچھا یا برا کریں۔

اگر یہ خوبصورت لوگوں کی شکل ہے تو ، کوئی اس سے لطف اندوز ہوتا ہے

اگر یہ غیب دائرے کی شکل ہے تو ، کوئی تنہائی کو اپناتا ہے۔

اگر یہ ضرورت کی شکل ہے تو ، کوئی [روزی روٹی یا تجارت] کمانے کی طرف جاتا ہے

اگر یہ کسی کی جسمانی طاقت کی شکل ہے تو ، اس سے چھیننا اور غصب کرنا پیدا ہوتا ہے۔

یہ کسی بھی حد اور تخمینے کی حدود سے باہر ہے

لوگوں کو مختلف خیالات اور خیالات کے ذریعے کام کرنے پر مجبور کرنا[19]۔

بے شمار مذاہب اور پیشے

یہ سب خیالات اور خیالات کی شکل کے سائے ہیں۔

[عمارت کی] اوپری سطح پر ایک گروپ کھڑا ہے

زمین پر ان میں سے ہر ایک کا سایہ دیکھیں[20]۔

خیال کی شکل اونچی سطح پر ہے

اور اس کے نتیجے میں عمل ایسا ہوتا ہے جیسے ان کے سائے اعضاء پر ظاہر ہوتے ہیں۔

اعمال اعضاء پر ہوتے ہیں ، تاہم ، خیالات جو اعضاء کو چلاتے ہیں ، پوشیدہ ہیں

لیکن یہ دونوں ایک ساتھ اس کے اثر کو سامنے لانے میں جڑے ہوئے ہیں۔

مختلف کھانوں کی شکلوں کے نتائج

وہ طاقت اور طاقت ہے جو کسی بھی شکل کے بغیر ہے۔

جب یہ شکلیں بغیر صورت کے تابع ہوں

کچھ لوگ اسے مسترد کرنے میں کیوں مصروف ہیں؟

یہ شکلیں اپنے وجود کے بغیر ایک کی مرہون منت ہیں

تو پھر شکل والا ایسے شخص کو کیوں مسترد کرتا ہے جس نے اسے پہلے ہی وجود میں لایا ہے؟

ہر گھر کی چھت اور دیواروں کی شکل

معمار کے غور و فکر کا سایہ ہے۔

اگرچہ وہ جگہ جہاں فکر اور غور و فکر ہوتا ہے

[عمارت] کے پتھر، لکڑی اور اینٹوں میں نظر نہیں آتا۔

ہر چیز کا مطلق کرنے والا یقینا بے شکل ہے

---

[19] یہ کسی بھی اندازے کی حدود سے باہر ہے کہ ان گنت قسم کے خیالات اور خیالات جو مختلف انسانی اعمال، کوششوں اور کاموں کے محرک اور محرک بن جاتے ہیں جو اچھے اور برے دونوں ہیں۔

[20] یہ سمجھنے کے لیے کہ خیالات کس طرح ان اسباب کے اثرات ہیں اور اعمال کس طرح ہیں، کسی عمارت کی اوپری سطح پر کھڑے لوگوں کی مثال پر غور کرنا چاہیے جو اس سطح کے نیچے زمین پر سایہ ڈال رہے ہیں۔ اسی طرح خیالات کی شکل بالائی سطح پر ہے اور اعمال انسانی اعضاء پر ڈالے جانے والے سائے کی طرح ہوتے ہیں۔

شکل اس کے ہاتھ میں ایک آلہ کی طرح ہے۔

شکل کے بغیر ، کبھی پردے کے پیچھے سے

اپنے آپ کو الہی سخاوت سے ظاہر کرتا ہے جو شکل کے حامل[21] ہیں۔

تاکہ ہر شخص اس سے مدد طلب کرے

اس کے کمال، خوبصورتی اور قادر مطلق طاقت کے ذریعے۔

جب بے صورت اپنے آپ کو چھپاتا ہے

وہ لوگ ایک خیراتی ادارے کے طور پر رنگ اور بو کی سطح پر اترے۔[22]

عاجزی سے التجا کرنے اور اس کے لیے رونے کے ذریعے اور اس کے وجود میں فنا ہونے کے ذریعے بے شکل کو تلاش کریں

کیونکہ آپ کے پاس سوچ کے ذریعہ شکلوں کے سوا کچھ نہیں آئے گا۔

اگر آپ کو فارم کے بغیر اندرونی خوشی نہیں ہے تو

پھر جو بھی شکل آپ کو سمجھتی ہے وہ آپ کے لئے بہتر [23]ہے۔

جس شہر کی طرف آپ آگے بڑھ رہے ہیں

اے مسافر! آپ کو اس کی طرف کھینچا جاتا ہے ایک خواہش کے ذریعہ جو شکل کے بغیر ہے۔

باطنی طور پر ، حقیقت میں آپ خواہش کی طرف جارہے ہیں جو وقت ، جگہ اور شکل کے بغیر ہے

کیونکہ خوشی [خواہش کی تکمیل میں] زمان و مکان کے بغیر ہے، اگرچہ آپ اس مقصد سے ناواقف ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا سب کا رب ہے

کیونکہ راستے پر چلنا خواہش کی وجہ سے ہے۔[24]

تاہم ، کچھ نے دم کی طرف رخ کیا ہے

اگرچہ سر اصل چیز ہے ، جس پر سب کچھ منحصر ہے لیکن وہ سر کھو چکے ہیں۔

تاہم ، گمراہ لوگوں کے لئے سر کھو جاتا ہے

لیکن وہ دم کے ذریعے وہ دیتا ہے جو سر کے ذریعے دیا جانا چاہیے تھا۔

ایک سر کے ذریعے عطا کیا جاتا ہے ، دوسرا دم کے ذریعے عطا کیا جاتا ہے

---

[21] الہی روشنی کچھ قبول کرنے والے دلوں پر بجلی کی گرج کی طرح چمکتی ہے۔

[22] جب الٰہی روشنی رک جاتی ہے تو ، لوگ انسان ہونے کی ضروریات کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ کمال صرف ایک سے حاصل کیا جاتا ہے جس کی صورت نہیں ہے۔ ایک شکل دوسری شکل سے کمال حاصل کرنے کی کوشش گمراہی ہے سوائے خدا کے مقرب اور گنوسٹکس کے جن کو اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی ہدایت کے لیے منتخب کیا ہے۔ ورنہ شکل خود محتاج ہے۔ کسی اور شکل کی ضرورت کو پیش کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

[23] یہاں تک کہ اگر روحانی جدوجہد کے بعد، آپ اسے بغیر کسی شکل کے تصور نہیں کر سکتے، تو آپ اپنے تخیل کے بغیر جو بھی شکل آپ کے سامنے آتی ہے اسے متبادل کے طور پر استعمال کریں جب تک کہ آپ اسے بغیر شکل کے تصور کرنے کے قابل نہ ہوں۔

[24] چونکہ اوپر بیان میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ خواہش انسان کی تمام کاوشوں کا مقصد ہے اور تمام راستوں پر چلنا خواہش کی وجہ سے ہے اور خواہش کو قبول کرنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے، اس لیے اللہ سب کا رب ہے۔

دوسروں کے پاؤں اور سر دونوں کھو چکے ہیں۔

چونکہ سب کچھ کھو گیا تھا، اس لیے انہوں نے سب کچھ ڈھونڈ لیا

اس نقصان کی وجہ سے وہ ہر چیز کی طرف بھاگ[25] گئے۔

اس تصویر سے بھرے قلعے میں شہزادوں نے چینی شہنشاہ کی بیٹی کی تصویر دیکھی اور وہ سب بے ہوش ہو کر آزمائشوں اور مصیبتوں کا شکار ہو رہے تھے اور یہ جاننے لگے کہ یہ کس کی تصویر ہے

اس معاملے کی کوئی انتہا نہیں، یہ گروہ [تین شہزادوں کا]

ایک خوبصورت اور شاندار تصویر دیکھی.

انہوں نے اس سے بھی زیادہ خوبصورت دیکھے تھے

لیکن [اس تصویر کے ساتھ] وہ [محبت کے ایک بے پناہ سمندر میں] اتر گئے۔

کیونکہ انہیں اس پیالے کے ذریعے افیون ملی تھی

کپ دیکھا گیا لیکن افیون چھپا ہوا تھا۔[26]

دماغ اڑانے والے قلعے نے اپنا کام کیا

اس نے انہیں مصیبت کے گہرے کنویں میں ڈال دیا۔

خوبصورتی اور اسٹائل کا تیر ان کے دلوں میں گھس گیا

اے سلامتی دینے والے! ہمیں اس لامحدود دکھ سے پناہ دے۔

بے جان تصویر نے انہیں اندر سے جلا دیا

اس نے ان کے ایمان اور دلوں میں آگ بھڑک اٹھائی۔

اگر تصویر میں روح ہوتی تو کیا ہوتا؟

اس کی مصیبت ہر سیکنڈ میں ایک مختلف قسم کی ہوتی۔

شہزادوں کے دلوں میں تصویر کی محبت کے بعد سے

خنجر کی طرح تکلیف ہو رہی تھی۔

---

[25] خدا کے مختلف عبادت گزاروں اور متلاشیوں کے اس کے ساتھ مختلف معاملات ہیں۔ کچھ لوگوں نے اپنی توجہ خدا کے اعمال کی طرف مبذول کرلی ہے حالانکہ اصل مقصد اس کا وجود (*ذات*) ہے ، کیونکہ یہ حقیقی وجود ہے اور ہر چیز کی اصل ہے جو ایک اچانک وجود ہے۔ وہ بھی اس کی ہستی سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور ان کی توجہ بھی خدائی قبول ہے۔ نمازیوں کا ایک اور گروہ حق و صداقت کے اعمال کے ذریعے اپنی توجہ اور حق کی تلاش میں ہے۔ یہ عام نمازیوں کی سطح ہے۔ یہاں "ٹیل" سے مراد خدا کے اعمال ہیں۔ "سر" سے مراد خدا کی صفات ہیں۔ عبادت گزاروں کا ایک اور گروہ [روحانیت کی اعلیٰ سطح پر] الٰہی صفات کے ذریعے روحانی فوائد حاصل کرتا ہے جسے یہاں "سر" کہا جاتا ہے۔ یہ سطح [روحانی] اشرافیہ کی ہے۔ روحانیت کی اگلی اعلیٰ درجے اشرافیہ کی اشرافیہ یا سب سے اوپر کی اشرافیہ کی ہے (جیسا کہ قرآن نے سورة "*الواقعہ*" (56:10) کہا ہے) کیونکہ وہ صرف خدا کی ہستی پر توجہ دیتے ہیں اور بغیر کسی ذریعہ کے براہ راست اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ چونکہ انہوں نے الٰہی اعمال یا صفات کو اپنا مقصد نہیں بنایا، اس لیے انہوں نے الٰہی ہستی کو اپنا مقصد بنا لیا اور اس لیے وہ الٰہی ہستی تک پہنچ گئے۔

[26] یہاں خوبصورتی کو افیون سے مشابہت ملتی ہے۔ یہاں کپ سے مراد بیرونی شکل یا جسمانی شکل ہے۔ شکلیں نظر آتی ہیں لیکن ان کی افیون (مسحور کن اثر) چھپی ہوئی ہے۔ دماغ اڑانے والے قلعے نے تینوں شہزادوں کو مصیبت میں ڈال کر اپنا کام کیا۔

ان میں سے ہر ایک بادل کی طرح آنسو بہا رہا تھا

ان میں سے ہر ایک نے اپنا ہاتھ کاٹا اور کہا: ہائے ![27]

اب ہم جو کچھ دیکھ رہے ہیں ، شہنشاہ پہلے ہی دیکھ چکا تھا

اس بے مثال نے ہمیں بہت ساری نصیحتیں دیں۔

یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے بہت سے حقوق ہیں

جیسا کہ انہوں نے ہمیں [ہمارے اعمال کے تمام نتائج] سے واضح طور پر آگاہ کیا ہے۔

کہ اب جو کچھ تم بوتے ہو اس میں کانٹوں کے سوا کچھ نہیں نکلے گا

جہاں آپ ابھی اڑ رہے ہیں ، آپ کو اڑنے کے لئے جگہ نہیں ملے گی۔[28]

مجھ سے بیج لے لو تاکہ وہ تمہیں بہت زیادہ پیداوار دے

میرے پروں سے اڑ جاؤ تاکہ مصیبت کا تیر تم پر مارنے سے پہلے گر[29] جائے۔

آپ کو ان پر عمل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی

آخر میں آپ یہ بھی کہیں گے کہ ایسا کرنا ضروری تھا۔

جب انہوں نے کہا کہ "تم" تو یہ تم ہو لیکن جسم نہیں

اس کے بجائے ، یہ "آپ" ہے جو مادی دائرے سے بالاتر ہے اور حقیقی "آپ" ہے۔[30]

بیرونی "آپ" جسے آپ "آپ" کے طور پر سوچتے ہیں

[چھ] سمتوں سے ہے لیکن اصل "آپ" تمام سمتوں سے بالاتر ہے۔

اے موتی! آپ خول پر کیوں کانپتے ہیں؟

"آپ" کو اپنے طور پر نہ سمجھیں بلکہ اس پر غور کریں کہ اس میں کیا ہے وہ حقیقی "آپ"[31] ہے۔

یہ "آپ" ہی ہے جو آپ کو اپنے آپ سے غافل بناتا ہے

اپنے "آپ" کو حاصل کریں اور [اپنے آپ میں] دوہری پن کو عبور [32]کریں۔

آپ کے بیرونی "آپ" پر آپ کا حقیقی "آپ"

اسے ڈرانے اور قربِ الٰہی کو حاصل کرنے کے لیے آیا ہے

---

[27] وہ اس وقت جو کچھ دیکھ رہے تھے اور جو کچھ محسوس کر رہے تھے اس پر انہیں پچھتاوے سے بھرے ہوئے تھے ، جو شہنشاہ نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا جس نے انہیں زور و شور سے اور اصرار سے نصیحت کی تھی کہ وہ اس قلعے میں نہ جائیں۔

[28]اللہ تعالیٰ کے انبیاء پہلے ہی ہمیں بتا چکے ہیں کہ نفس کی خواہشات، خواہشات اور خواہشات کی پیروی کرنے سے صرف کانٹے (بدقسمتی، درد اور مصائب) بڑھیں گے۔ آپ کی سمت اور رفتار دنیاداری کی طرف ہے، اس میں کوئی نجات نہیں ہے، حقیقی کامیابی اور حقیقی خوشی ہے۔

[29] انبیاء کرام نے ہمیں بتایا ہے کہ ہمیں ان کے راستے پر چلنا چاہیے کیونکہ ایسا کرنے سے بے شمار [مادی اور غیر مادی] فوائد ہیں اور آزمائشوں اور فتنوں کا تیر آپ کو مارنے سے بہت کم ہو جائے گا۔

[30] "آپ" کے دو حصے ہیں - ایک آپ کا جسم اور دوسرا آپ کی روح۔ انبیاء علیہم السلام کی پیروی جو فائدہ مند ہے وہ جسم کا کام نہیں ہے بلکہ یہ روح کا ایک کام ہے جو زمان و مکان کی حدود سے بالاتر ہے۔

[31] آپ جسم کے اختتام (موت) پر کانپتے ہیں حالانکہ یہ صرف بیرونی خول ہے۔ اصلی "آپ" وہ روح ہے جو خول میں موتی ہے۔

[32] اپنے حقیقی "آپ" تک پہنچیں جو آپ کی روح ہے اور اپنے جسم کو اپنی حقیقت سمجھنے کی اس دوہری پن کو روکیں۔

آپ کا اصلی "آپ" آپ کے دوسرے "آپ" میں دفن ہے

میں اس شخص کا غلام ہوں جو کسی کے حقیقی "آپ" کو دیکھتا ہے۔

ہم نے اپنے باپ کا حکم چھوڑ دیا

ہم اس کی لامحدود سخاوت کے باغی ہو گئے۔

ہم نے شہنشاہ کے مشورے کو غیر اہم سمجھا

اس کی بے مثال سخاوت کے ساتھ

اب ہم سب ایک کھائی میں پھنس چکے ہیں

ہم بغیر کسی جنگ کے پریشان اور زخمی ہیں۔

ہم نے اپنی عقل اور حکمت پر انحصار کیا

جب تک کہ ہم اس مصیبت سے دوچار نہ ہوں۔

مرشد کا سایہ یاد الٰہی سے بہتر ہے

ایک اطمینان ہزاروں کھانوں اور پکوانوں سے بہتر ہے۔[33]

دیکھنے والی آنکھ تین سو ساٹھ لاٹھیوں سے بہتر ہے

ایسی آنکھ موتی اور کنکر میں فرق کرتی ہے۔

دکھ کی وجہ سے، ہم [کبھی نہ ختم ہونے والی] جدوجہد میں الجھ گئے

اس دنیا میں یہ کس کی شاندار تصویر ہے؟

انہوں نے اپنے سفر میں [اس اندرونی کیفیت کے ساتھ] اور بہت جدوجہد کے بعد [اسرار کو سلجھنے میں] آگے بڑھایا

گہری بصیرت رکھنے والے ایک روحانی رہنما نے ان پر یہ راز بتایا۔

گائیڈ سنی سنائی باتوں سے حقیقت کو نہیں جانتا تھا، اس کے بجائے علم ایک اندرونی الہامی روشنی کے ذریعے تھا

کیونکہ یہ راز کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو کچھ پردے ہٹانے سے بے نقاب ہو سکے۔

انہوں نے کہا کہ یہ تصویر سب سے خوبصورت تصویر کے لئے بھی قابل رشک تھی۔

یہ چین کی شہزادی کی تصویر ہے۔

چین کے بادشاہ کی ایک بیٹی ہے جو بے مثال ہے

ذاتی خصلتوں ، فضیلت اور بیرونی خوبصورتی میں۔

وہ پری اور روح کی طرح چھپی ہوئی ہے

وہ قلعے کے چھپے ہوئے پردوں میں ہے۔

---

[33] روحانی مرشد کے ساتھ صحبت رکھنے سے اخلاص [اور مقصد کی سچائی] اور اس کے کسی بھی نقصان میں پڑے بغیر روحانی راستے پر آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ یہ ذکر الٰہی کو موثر بنانے اور روحانی مسافر میں اطمینان اور صبر پیدا کرنے کی بھی شرط ہے اور یاد الٰہی کی ہزاروں کھانوں سے افضل ہے۔

کسی مرد یا عورت کے پاس اس کی طرف کوئی راستہ نہیں ہے
بادشاہ نے اسے تمام مصیبتوں اور مصیبتوں سے بچانے کے لیے چھپا رکھا ہے۔
یہاں تک کہ کسی کے ہونٹوں سے اس کا نام سننے سے بھی بادشاہ پریشان ہوجاتا ہے
شہزادی جہاں رہتی تھی وہاں ایک پرندہ بھی پنکھ نہیں پھینک سکتا تھا۔
وہ ریوڑ برباد ہے جو اس طرح کی محبت سے متاثر ہوتا ہے
خدا اس طرح کی محبت کو کسی کو نہیں آنے دے۔
یہ اس شخص کے لیے عذاب ہے جس نے حماقت کا بیج بویا
اور صحیح مشورے کو جعلی اور غیر اہم سمجھا جاتا ہے۔
ایسا شخص اپنی حکمت عملی پر منحصر تھا
یہ سوچنا کہ کوئی اپنی عقل کے ساتھ [تمام حالات] سے گزرے گا۔
[ایک مرشد کی] توجہ کا آدھا ذرہ بہتر ہے
جس کے ذریعے عقل کے منصوبے کو تین سو مرتبہ محفوظ کیا جاتا ہے۔
اے رہنما! اپنی منصوبہ بندی چھوڑ دیں
توجہ کے ساتھ آگے بڑھیں اور خوشی سے اپنی روح کو چھوڑ [34]دیں۔
یہ چند غور و فکر کے برابر نہیں ہے جو آپ کی عقل نے پیش کی ہے
جب تک آپ [مرشد کے وجود میں] فنا نہیں ہو جاتے، ان غور و فکر کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔
تم [مرشد سے] اس وقت تک فائدہ نہیں اٹھائیں گے جب تک کہ تم [مرشد کے وجود میں] فنا نہ ہو جاؤ
جاؤ اس فنا کو حاصل کرو اور روحانی مرشد کے وجود سے فائدہ اٹھاؤ۔

تینوں شہزادے واقعے کی مزید تحقیقات کر رہے ہیں اور سب سے بڑے بھائی کی گفتگو

تینوں اس مصیبت سے متاثر ہوئے ، ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوئے
تینوں میں ایک ہی درد ، غم اور غم تھا۔
تینوں ایک ہی فکر اور فکر کے ساتھی تھے
تینوں ایک ہی بیماری اور غم سے بیمار تھے۔
خاموشی سے ، تینوں کا خیال ایک ہی تھا

[34] اپنی منصوبہ بندی کو ترک کریں اور روحانی رہنما کی توجہ کی طرف بڑھیں۔ سچے مرشد کی رہنمائی میں اپنی منصوبہ بندی کو فنا کر دو جس کی توجہ آپ کی محدود منصوبہ بندی سے کہیں زیادہ فائدہ مند ہے۔

گفتگو میں ، تینوں کی ایک ہی دلیل تھی۔

بعض اوقات ، تینوں آنسو بہا رہے تھے

مصیبت کی میز پر، وہ خون چھڑکنے والے تھے۔

بعض اوقات ، تینوں ، دل کی بھڑکتی ہوئی آگ کی وجہ سے

چمنی کے جلنے کی طرح سانسیں لیں۔

بڑے نے کہا: اے بھائیو!

کیا ہم ایک دوسرے کو نصیحت کرنے والے مرد نہیں تھے؟

ہماری سلطنت کے لوگوں میں سے جس نے ہم سے شکایت کی

مشکلات، خوف، غربت اور زلزلے کے بارے میں۔

ہم ایسے لوگوں سے کہتے تھے کہ اس طرح کی بندشوں سے مایوس نہ ہوں

صبر سے کام لیں کیونکہ صبر وسعت کی کلید ہے۔

صبر کی یہ کلید کہاں چلی گئی؟

افسوس، کیا حیرت کی بات ہے! کیا قانون منسوخ ہو گیا ہے؟ کیا ہوا؟

کیا ہم تنازعات کی صورتحال میں یہ نہیں کہتے تھے؟

بہت ہنسیں چاہے آگ کے اندر ہی کیوں نہ ہوں۔

ہم نے جنگ میں ہر سپاہی کو مشورہ دیا

ہوشیار! آپ کے چہرے کا رنگ تبدیل نہیں ہونا چاہئے۔

ہم نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا

غلبہ حاصل کرنے کے لئے نیزے کی طرح آگے بڑھنا۔

ہم نے پوری دنیا کو صبر کا ٹھکانہ بتا دیا

کیونکہ صبر ہمیشہ سے ایک روشن چراغ اور رہنمائی کی روشنی رہا ہے۔

جب ہماری اپنی باری آئی [صبر کرنے کی]، تو ہم اتنے حیران کیسے ہوئے؟

بدصورت افراد کی طرح ، ہم بھی چادریں بن گئے جو چھپتی ہیں۔

اے دل! آپ نے سب کو ڈیوٹی میں سرگرم کر دیا

اب اپنے آپ کو متحرک بنائیں اور اس طرح کام کرنے میں شرمندہ ہوں۔

اے زبان! آپ ہی تھے جنہوں نے سب کو نصیحت کی تھی [صبر سے ثابت قدمی]

جب تمہاری باری آئی تو تم خاموش کیوں ہو گئے؟

اے عقل! آپ کے پیارے مشورے کو کیا ہوا؟

اب آپ کی باری ہے ، آپ کے ساتھ کیا ہوا [اور آپ کی منصوبہ بندی]؟

اے عقل! آپ دل سے لامحدود پریشانیوں کو دور کرتے تھے

آپ کی باری آ گئی ہے، مصیبت کو دور کریں [ہم اب ہیں]۔

جب آپ دوسروں کے درد میں علاج تھے

مہمان کی حیثیت سے جب درد آپ کے پاس آیا تو آپ خاموش ہو گئے۔

فوج کو چیلنج کرنے کا یہ آپ کا طریقہ تھا

اب آپ کے چیلنج اور آواز کو کس نے پکڑ لیا ہے؟

آپ نے پچاس سال تک ذہانت کے ساتھ جو کچھ بنایا

اس بنائی کا صرف ایک کپڑا پہنیں۔

تم ہمیشہ سر تھے، اب اپنے آپ کو دم مت بناؤ

اپنے پاؤں ، ہاتھ ، مونچھیں اور داڑھی نہ کھویں۔

شطرنج کے بورڈ پر چلنا آپ کا استحقاق ہے

اب اپنے آپ کو اچھے مزاج اور جوش و خروش میں لائیں [اپنا اگلا اقدام جیتنے کے لئے]۔

دلائل مکمل کرنے اور اپنے دلوں کی حالت بیان کرنے کے بعد تینوں شہزادوں نے اپنے محبوب اور مقصد چین کی سلطنت کی طرف ایک مہاکاوی سفر کا آغاز کیا تاکہ اپنے مقصد کے زیادہ سے زیادہ قریب جا سکیں حالانکہ محبوب سے ملاقات کا راستہ بند تھا کیونکہ مقصد کے زیادہ سے زیادہ قریب ہونا اب بھی اچھا ہے

جب تینوں شہزادوں کو محبت سے معذور ہونے کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا

محبت نے انہیں بے حد ذلیل کیا۔

انہوں نے یہ کہا اور فورا آگے بڑھے

اے میرے دوست! جو کچھ بھی ہونا تھا ، پہلے ہی ہو چکا تھا۔

انہوں نے صبر کیا اور اللہ کے سچوں میں شامل ہو گئے

پھر چین کے شہروں کی طرف بڑھے۔

انہوں نے اپنے والدین اور اپنا ملک چھوڑ دیا

چھپے ہوئے محبوب کی طرف جانے والا راستہ اختیار کیا۔

جیسا کہ ابراہیم ادہم عرش سے (وہ وارث ہونے والے تھے)

محبت نے انہیں بے بس اور مفلس بنا دیا۔[35]

---

[35] ابراہیم بن ادھم ایک عظیم بزرگ، گنوسٹک اور خدا کے قریبی تھے جو وسطی ایشیا میں قرون وسطی کے بادشاہ تھے۔ اس نے ابدی سچائیوں ، زندگی کے معنی اور مقصد ، اور الہٰی کے ساتھ قربت اور قربت کی تلاش کے لئے اپنی سلطنت کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اس کی قربانی کو خدائی

یا ابراہیم کی طرح عظیم نبی

اس نے اپنے آپ کو آگ میں ڈال دیا۔

یا اسماعیل کے پاک اور صابر کی طرح

اس نے شدید محبت اور اس کے تیز چاقو کے سامنے اپنا سر زمین پر رکھ دیا۔

اس کے دارالحکومت چین کے شہروں کے شہر میں رہنے اور چھپنے کے بعد ، سب سے بڑا بھائی بے چین ہو گیا اور اپنے آپ کو چین کے بادشاہ کے حوالے کرنا چاہتا تھا اور اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا جو اس کے دونوں بھائیوں نے اسے ایسا نہ کرنے کے لئے دیا تھا

یا تو میرا قدم مجھے اپنا مقصد دے گا

یا میں اپنے دل کی طرح اپنا سر وہاں رکھ دوں گا [ناحاصل محبت کے لئے اپنی جان قربان کرنے کے لئے]۔

یا تو میرے پاؤں مجھے اپنے مقصد کی طرف لے جائیں گے

یا دل کی طرح ، میں اپنے ہاتھ سے اپنا سر نیچے رکھوں گا۔

اے عاشقوں کے گروہ کی مذمت کرنے والے! اس گروپ کو تنہا چھوڑ دیں

جسے اللہ نے گمراہ کیا ہے تو آپ کس طرح ہدایت کریں گے

بڑے نے کہا: اے میرے بھائیو!

انتظار کی وجہ سے میری روح میرے ہونٹوں پر آ گئی ہے۔

مجھے اب پرواہ نہیں ہے، میرے اندر صبر نہیں بچا ہے

اس صبر نے مجھے آگ میں بٹھایا ہے۔

صبر کا مظاہرہ کرنا اب میرے اختیار سے باہر ہے

میری کہانی محبت کرنے والوں کے ذریعہ سیکھنے کے لئے ایک سبق بن گئی ہے۔

میں جدائی کی وجہ سے زندگی سے تنگ آ گیا ہوں

علیحدگی کی حالت میں زندہ رہنا منافقت ہے۔

جدائی کا یہ درد مجھے کتنا مارے گا؟

میرا سر ہٹا دو تاکہ محبت مجھے ایک نیا سر عطا کرے۔[36]

طور پر قبول کیا گیا ، اس نے اپنا مقصد حاصل کیا جس کے لئے اس نے آگے بڑھے اور خدا کے سب سے بڑے گنوسٹکس اور مباشرت میں سے ایک بن گیا۔

[36] خدا میں فنا (*فنا*) کے بعد خدا میں رزق کی کیفیت آتی ہے، دوسرے لفظوں میں جب معشوق (خدا) کی محبت اور مرضی میں نچلے نفس کی خواہشات ختم ہو جاتی ہیں تو ایک نئی زندگی آتی ہے جو کبھی نہ ختم ہونے والی ابدی زندگی ہے۔ اس کہانی کے ذریعے رومی روحانی راستے، اس کے نقصانات اور اس میں کامیابی کے رازوں کو واضح کر رہا ہے۔

میری محبت کی وجہ سے میرا ایمان زندہ ہے

اس زندگی اور سر کے ساتھ رہنا میرے لئے ایک توہین ہے۔[37]

جب جسم کی دھول ہٹا دی جاتی ہے تو میرا چاند چمک اٹھتا ہے

میری روح کا چاند صاف پانی پی رہا [38]تھا۔

میری روح نے ڈریک ہونے کا دعویٰ کیا ہے

یہ کب طوفانوں اور طوفانوں کے خلاف التجا کرتا ہے؟

بطخ جہاز کے ٹوٹنے اور ڈوبنے سے کیوں خوفزدہ ہوگی؟

پانی پر اس کا جہاز اس کے پاؤں ہیں [حفاظت کے لئے تیرنے کے لئے]۔

اس دعوے نے میری روح اور جسم کو زندہ رکھا ہے

میں اس دعوے کے بارے میں خاموش کیسے رہ سکتا ہوں؟

دوسرے دو بھائیوں نے بڑے بھائی کو نصیحت کرنے کی کوشش کی

ایسا کرنے کے خطرات سے خود کو بے خبر نہ رکھنا۔

ان کے زخموں پر نمک نہ ڈالنا [کیونکہ وہ بھی محبت سے متاثر تھے اور پھر وہ بڑے بھائی سے جدائی برداشت کرنے والے تھے]

جلد بازی اور شک کی وجہ سے یہ زہر نہ کھانا۔

کسی باشعور روحانی رہنما کی حکمت کے بغیر

جب آپ کے پاس دیکھنے والا دل نہیں ہے تو آپ راستے پر کیوں چلتے ہیں؟

عقل افراد کے لئے پروں کی طرح ہے [جو انہیں روحانی بلندیوں پر چڑھنے میں مدد دیتی ہے]

اگر آپ کے پاس عقل نہیں ہے تو روحانی مرشد کی عقل کو استعمال کریں۔

[دونوں چھوٹے بھائیوں نے بڑے بھائی کو نصیحت کی] ہوشیار! اسے گھبراہٹ کے ساتھ دیکھیں

ایسا دعویٰ نہ کریں یا ایسا کام نہ کریں۔

آپ ہمارے لئے ہماری زندگی اجیرن کر دیں گے

اے بھائی! کون آپ کو ایسا کرنے پر راضی کر رہا ہے؟

جو شخص اس راستے سے واقف نہیں ہے، سو سال تک مسلسل سفر کر سکتا ہے

اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی!

ہتھیاروں کے بغیر میدان جنگ میں نہ جائیں

اپنے آپ کو ان لوگوں کی طرح تباہی میں نہ ڈالیں جو پرواہ نہیں کرتے۔

---

[37] میں [گہری روحانی] معنی کی زندگی حاصل کرنا چاہتا ہوں، بیرونی زندگی [مادی دائرے میں] میرے لیے مشکل ہے۔
[38] روح کے جسمانی پابندیوں سے آزاد ہونے کے بعد روح روشن اور روشن ہو جاتی ہے۔

یہ سب کچھ انہوں نے کہا لیکن اس بے صبری سے بڑے بھائی نے کہا:

مجھے ان باتوں سے نفرت محسوس ہوتی ہے [جو آپ نے ابھی کہا]۔

میرا سینہ چمنی کی طرح آگ سے بھرا ہوا ہے

فصل تیار ہے، کٹائی کا وقت آگیا ہے۔

میرے سینے میں صبر تھا لیکن اب یہ نہیں ہے

شدید محبت نے صبر کی جگہ آگ لے لی ہے۔

جس رات یہ شدید محبت پیدا ہوئی ، میرا صبر دم توڑ گیا

وہ مر گیا لیکن آپ کو زندگی سے نوازا جائے۔

اے خطرات کی بات کرنے والے

میں اس سے اوپر اٹھ گیا ہوں ، ٹھنڈے لوہے کو ہتھوڑے نہ ماریں [کیونکہ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا]۔

میں الٹا ہو گیا ہوں، ہوشیار رہو، اپنے پیروں کو چھوڑ دو

میرے جسم کے حصوں میں سمجھ کہاں رہ گئی ہے؟

میں اپنا جھنڈا زمین میں ڈال دوں گا

یا تو میں اپنا سر کھو دوں گا یا محبوب کا چہرہ تلاش کروں گا۔

وہ آنکھ جو محبوب سے ملاقات سے تازہ نہ ہو

ایسی آنکھ اندھا ہونے سے بہتر ہے۔

بھائیوں نے ایک بار پھر بڑے بھائی کو نصیحت کی اور وہ اسے برداشت نہ کر سکا اور ایک پاگل عاشق اور پاگل کی حیثیت سے بادشاہ کے دربار میں جا کر محبت کی شدت کی وجہ سے اجازت مانگتا ہے نہ کہ کسی بدسلوکی کی وجہ سے

دونوں بھائیوں نے اس سے کہا: ہمارے دلوں میں

کیا یہ (آپ کی مصیبتوں) کا جواب آسمان کے ستاروں کی طرح ہے۔

اگر ہم نے یہ نہ کہا ہوتا تو یہ آپ کے ساتھ ناانصافی ہوتی

اگر ہم یہ کہتے ہیں تو آپ کا دل درد ہوتا ہے۔

وہ کھڑے ہوئے اور کہا: اے میرے پنے! الوداع

یہ دنیا اور اس میں موجود ہر چیز عارضی ہے۔

وہ کمان سے تیر کی طرح نکلا

کیونکہ بات کرنے کے لئے کچھ نہیں بچا تھا۔

وہ بے قابو ہو کر چینی بادشاہ کے سامنے آ گیا۔

اس نے بادشاہ کے سامنے زمین کو چومنے لگا۔
اس کے وجود کی ہر کیفیت بادشاہ پر واضح طور پر عیاں تھی
غم کا آغاز اور اختتام اور اس کی ہچکچاہٹ۔
بھیڑیں اپنی چراگاہوں میں مصروف ہیں
لیکن چرواہا اپنی حالت سے واقف ہے۔
"تم میں سے ہر ایک چرواہا ہے" کی وجہ سے وہ جانتا تھا کہ ریوڑ میں کون ہے
گھاس چرانے والا ہے اور جو [ریوڑ کے دوسرے جانوروں کے ساتھ] لڑ رہا [39]ہے۔
وہ (بادشاہ) اس گروہ کے درد اور مصائب سے آگاہ تھا
لیکن دانشمندی کی وجہ سے ، وہ خاموش رہا اور وہ راز ظاہر نہیں کیا جو وہ جانتا تھا۔
وہ معزز ان کی روحوں کے درمیان تھا
لیکن جان بوجھ کر خود کو گونگا بنا دیا۔
آگ کی شکل برتن کے نیچے ہے
آگ کی اندرونی حقیقت برتن میں ہے۔
اس کی شکل باہر ہے ، لیکن اس کی اندرونی حقیقت اندر ہے
عاشق کی اندرونی حقیقت - روح ، خون کی طرح رگوں میں ہے۔[40]
شہزادہ احترام سے بادشاہ کے سامنے بیٹھ گیا
تعارف کرانے والا شہزادے کا تعارف بادشاہ سے ملوانے والا تھا۔
اگرچہ بادشاہ پہلے سے ہی سب کچھ جانتا تھا
لیکن تعارف کرانے والے کو اب بھی متعارف کرانے کی اجازت دی۔
باطن میں Gnosis کی روشنی کا ایک ذرہ
اے محترم ! سو متعارف کروانے والوں سے بہتر ہے۔[41]
تعارف کرانے والے کو کان دینے کے لئے
پردہ پوش ہونے اور قیاس آرائی کی حالت میں ہونے کا اشارہ ہے۔
جس کے پاس دل کی دیکھنے والی آنکھ ہے

[39] سب سے بڑے بھائی اور بادشاہ کی حالت بھیڑ اور اس کے چرواہے کی طرح ہے جو اس کے کام میں مصروف ہے لیکن چرواہا اس پر کڑی نظر رکھتا ہے اور اس سے ذرا بھی غفلت نہیں کرتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے ہر ایک چرواہا ہے اور قیامت کے دن ان کے ریوڑ کے بارے میں پوچھ گچھ کی جائے گی اور ان سے پوچھا جائے گا۔ ایک چرواہا جانتا ہے کہ ریوڑ میں کون چرتا ہے اور کون لڑ رہا ہے۔
[40] روح محبوب کی مانند ہے۔ یہ جسم سے الگ ہے لیکن اس کا اثر رگوں میں ہوتا ہے جیسے رگوں میں خون کی گردش ہوتی ہے۔
[41] اگر گنوسس کا ایک ذرہ بھی دل میں موجود ہے تو اس سے پیدا ہونے والی روحانی نقاب *کشائی (کشف)* کسی تعارف یا مخبر کی فراہم کردہ معلومات سے کہیں زیادہ افضل ہے۔

اس طرح کی آنکھ قریب سے معائنہ کرے گی۔[42]

ایسی خبروں کا مقابلہ نہیں کیا جائے گا

اس کے بجائے ، کسی کی تصدیق دل کی آنکھ سے آتی ہے۔

اس کے بعد تعارف کرنے والے نے بادشاہ سے ذکر کیا

شہزادے کی حالت۔

آپ نے فرمایا: عالی جناب! وہ آپ کے احسانات کا محتاج ہے

براہ کرم اسے اپنی عزت کے مطابق شاہی سلوک عطا کریں کیونکہ اس نے آپ سے اپنی تمام امیدیں وابستہ کردی ہیں۔

اس نے اپنے آپ کو آپ کے ساتھ جوڑ دیا ہے

براہ کرم اس کی پریشانی کی حالت میں اس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھیں۔

بادشاہ نے کہا: جو بھی مقام اور زمین

اس نے درخواست کی ہے ، وہ مجھ سے حاصل کرے گا۔

جس ملک کو وہ پیچھے چھوڑ گیا ہے، میں اسے اس میں سے بیس گنا عطا کروں گا

میں اسے یہ عطا کروں گا اور اس کے ساتھ میری مہربانی اس کے اوپر ہے۔

تعارف کرانے والے نے کہا: جب سے آپ کی شان و شوکت نے اس میں شدید محبت کا بیج بویا ہے

تمہاری خواہش کے سوا اس میں اور کیا خواہش باقی ہے؟[43]

تمہاری غلامی اس کے لیے بہت موزوں رہی ہے

کہ اس کے دل سے حاکمیت کی خواہش مٹا دی گئی ہے۔

اس نے شاہی اور شاہی زندگی کھو دی

آپ کی خاطر ، اس نے سفر کے ساتھ صلح کی ہے۔

وہ صوفی جس نے روحانی وجد میں کپڑا پھینک دیا ہے

وہ کہاں سے کسی اور چیتھڑے پر توجہ دیتا ہے؟[44]

اس کے بارے میں سوچنا بھی کسی عاشق سے بہت دور ہے

اگر کوئی ایسا سوچتا ہے تو اس سر پر دھول ڈال دی جائے۔

---

[42] جس کے دل کی آنکھ کھل جاتی ہے وہ حقیقت کو سمجھنا شروع کر دیتا ہے اور معاملات کی تہہ تک پہنچ جاتا ہے۔

[43] شہزادے نے خوشحالی، طاقت، تسلط اور باقی سب کچھ چھوڑ کر غربت کو اپنایا ہے، اس کے دل میں تمہاری خواہش کے سوا کچھ نہیں بچا ہے۔ یہ ایک غلام کی خدا سے محبت کی مثال ہے جو کسی مادی نفع یا نقصان کی پرواہ کیے بغیر سچے دل سے اس کے ساتھ اپنی قسمت کو جوڑتا ہے۔

[44] شہزادے نے اپنی سلطنت کو پیچھے چھوڑ دیا جس کا موازنہ یہاں "صوفی" رگ سے کیا گیا ہے۔ ایک بار جب اسے پھینک دیا جاتا ہے تو ، وہ اسے کبھی واپس قبول نہیں کرے گا۔ ایک چیتھڑا پھینک دینا اور بعد میں اس پر پچھتاوا کرنا اور کسی اور سے دوسرے کو قبول کرنا اور اس کے لئے شوقین ہونا ، روحانی وجد کے لئے چیتھڑے کو کھونے کے مترادف ہوگا۔ یہ روحانی وجد انمول ہے اور اس کے قابل کچھ بھی نہیں ہے۔

زمین پر حاکمیت جسم کی عبادت کرنے والوں کے لیے جائز ہے
ہم محبت کی لامحدود سلطنت کے غلام ہیں۔[45]
وہ محبت کا عہدہ رکھنے والا ہے، براہ کرم اسے معزول نہ کریں
اسے اپنی محبت کے علاوہ کسی اور چیز میں مشغول نہ کرو۔
شہزادہ اپنی اندرونی کیفیت کی زبان سے کہہ رہا ہے: وہ مقام جو مجھے تیری نظر سے روکتا ہے
عملی طور پر ایک بیان ہے اور صرف نام میں ایک پوزیشن ہے۔
آپ کے پاس آنے میں اس کی تاخیر کی وجہ کیا ہے
[روحانی] قابلیت کی کمی اور جسم کی کمزوری تھی۔
اگر آپ بغیر تیاری کے کان میں جاتے ہیں
آپ ایک ذرہ کو بھی نہیں سمجھ پائیں گے۔
ایسا کوئی تیل اور بتی کے بغیر چراغ کی مانند ہو گا
اس کی روشنی نہ چھوٹی ہوگی اور نہ بڑی۔
یہ سمندر میں موجود زمین کے پرندے کی طرح ہے
اسے نقصان اور تباہی کے سوا اور کیا ملے گا؟[46]
یہ اس شخص کی طرح ہے جو پیسنے کے لئے گندم کے بغیر پیسنے والی چکی پر پہنچا ہے
اسے داڑھی اور بال گرد آلود اور سفید ہونے کے سوا کوئی انعام نہیں ملے گا۔
جو گندم کے بغیر ہیں، جنت کی پیسنے والی چکی
انہیں بالوں کی سرمئی اور کمر کی کمزوری دلائیں۔
لیکن جن لوگوں کے پاس گندم ہے ان کے لئے یہ پیسنے والی چکی
تسلط ، [خدائی] کام اور شاہی کا ایک معاون بن جاتا [47]ہے۔
اس کی کوئی انتہا نہیں ہے، اس کی تلاش نہ کریں
جاؤ اور [آگے بڑھنے کے لیے] صلاحیت حاصل کرو۔

---

[45] محبت کرنے والے الٰہی محبت کی لامحدود حاکمیت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔
[46] تعارف کرانے والا بادشاہ کو شہزادے کے بارے میں بتا رہا ہے کہ آپ کی موجودگی میں اس کی تاخیر محبت کی شدت کی کمی کی وجہ سے نہیں تھی۔ بلکہ وہ اپنی روحانی صلاحیت بڑھانے میں مصروف تھا اور اس کے علاوہ وہ کمزور تھا۔ اس حالت میں ، وہ نہ تو روحانی فوائد حاصل کرنے کے قابل تھا اور نہ ہی وہ ایسی خدمات انجام دینے کے قابل تھا جس کے لئے جسمانی سختی اور طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب تک اور جب تک کسی کے مقصد کو حاصل کرنے کی روحانی صلاحیت نہیں ہوتی، کوششیں بیکار ہیں۔ لہٰذا ایک روحانی مسافر کو روحانی راستے پر آگے بڑھنے اور بالآخر خدائی حضور میں ہونے کے لئے روحانی صلاحیت اور طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ایک بار پھر اس بات کی تمثیل ہے کہ الٰہی کی حضوری میں خدا کے ساتھ قربت یا قربت کی حالت میں ہونے کی ضرورت ہے۔
[47] اگر کوئی روحانی مسافر یا روحانی راہ پر مبتدی روحانی صلاحیت کے بغیر کسی مرشد کے پاس جاتا ہے تو ایسا شخص اس کی مانند ہے جو پیسنے والی چکی میں جاتا ہے جو پیسنے کے لئے گندم کے بغیر چل رہی ہے۔ ایسا ایک دھول کے ساتھ تمام بالوں کو بھوری نظر آنے کے ساتھ واپس آئے گا۔ روحانی صلاحیت کے بغیر ، وقت گزرنے کے ساتھ ، بوڑھے ، بھورے اور کمزور ہونے کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ جنت کی پیسنے والی چکی صرف ان لوگوں کو فائدہ پہنچاتی ہے جن کے پاس صحیح ایمان اور نیک اعمال کی گندم ہو۔

وہ آپ کے پاس آنے سے پہلے صلاحیت حاصل کرنے کا انتظار کرتا تھا

اس کی خواہش کی شدت [آپ کی بصیرت کے لئے] تمام حدیں عبور کر گئی لیکن صلاحیت حاصل نہیں کی گئی۔

انہوں نے کہا کہ صلاحیت بھی بادشاہ کے ذریعے حاصل کی جاتی ہے

روح کے بغیر جسم کب قابل ہوتا ہے؟[48]

بادشاہ کی مہربانی نے اس کے غموں کو جوڑ دیا

وہ بادشاہ کا شکار کرنے آیا تھا لیکن اس نے خود کو شکار کرلیا۔

وہ آپ کے جال میں پھنس گیا اور شکار کیا گیا

شکار کو نہ پکڑ کر وہ خود شکار ہو گیا۔

بے شک وہ شخص جو مال کا خواہاں ہے

پہلے اس کے ذریعہ قید ہوجائیں۔[49]

دنیا کے چہرے پر نشان کے بارے میں سوچیں کہ یہ اس کے برعکس ہے جو لگتا ہے

دنیا کے ہر غلام کا نام رب دنیا کہلاتا ہے۔

اے کم عقل اور مخالف راستوں والے جسم!

آپ نے لاکھوں آزاد روحوں کو قید کر دیا ہے۔[50]

تمام بہانے تھوڑی دیر کے لیے چھوڑ دو

موت سے پہلے چند گھنٹوں کے لیے آزاد زندگی گزاریں۔

اے مصروف جسم! مجھے اکیلا چھوڑ دو

تم نے میری زندگی برباد کر دی ہے، جاؤ اور کسی اور کو ڈھونڈو[51]۔

چینی بادشاہ نے غیر ملکی شہزادے کو اعزازات سے نوازا

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بادشاہ اسے انعام دیتا تھا

اس سورج کے ذریعے وہ چاند کی طرح پگھل جاتا تھا۔

عاشقوں کا پگھلنا صرف بڑھتا ہے

[48] تعارف کرانے والے نے کہا: وہ اب تک آپ سے دور رہا ہے کیونکہ وہ اپنی صلاحیت بڑھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اگرچہ یہ ابھی تک حاصل نہیں ہوا ہے ، لیکن وہ آپ کے لئے محبت کی شدت کی وجہ سے مجبور اور بے بس ہوگیا ہے۔ اب اس نے سوچا ہے کہ صلاحیت کا حصول بھی بادشاہ کے ذریعے ہوگا۔ روح کے جسم میں آنے کے بعد پوری صلاحیت کا حصول ہوتا ہے جو آپ (یعنی بادشاہ) دیں گے۔ ظاہر ہے ، جو آپ کا شکار کرنا چاہتا ہے ، وہ خود شکار ہو جائے گا۔

[49] محبوب چیز کا یہ قاعدہ ہے کہ انسان اسے حاصل کرنے کے بجائے پہلے اپنے آپ کو محبوب چیز کے حوالے کر دے۔ دنیاوی چیزوں کے بارے میں سوچیں کہ وہ جو لگتی ہیں اس کے برعکس ہیں۔ جو دنیا کا قیدی ہے اسے دنیا کا امیر کہا جاتا ہے۔

[50] جسم نے لاکھوں آزاد روحوں کو قید کر رکھا ہے۔

[51] رومی یہ کہہ رہا ہے اور اپنی موت کی درست پیشن گوئی اور پیشن گوئی کر رہا ہے۔ میری آزادی کا وقت آ گیا ہے۔ مجھے آزاد کرو اور کسی اور کو قید کرنے کے لئے تلاش کرو۔

تازگی میں بالکل اسی طرح جیسے چاند کمی کے مراحل میں ہے۔

تمام بیمار دوائیوں کی امید رکھتے ہیں

یہ بیمار [الٰہی محبت کے ساتھ] اس بیماری میں اضافے کی دعا کرتا ہے۔

تمام مریض صحت یابی کے لئے دوائیں تلاش کرتے ہیں اور یہ ایک

مزید غم، درد اور رونے کی تلاش کرتا ہے [خدا سے شدید محبت سے]۔

میں نے اس مشروب سے بہتر زہر نہیں دیکھا

اس بیماری سے بہتر کوئی صحت نہیں ہوگی۔

وہ اسی طرح بادشاہ کے سامنے کھڑا رہا

دل جلا دیا گیا تھا ، اور روح تھالی پر تھی [بادشاہ کے سامنے پیش کرنے کے لئے]۔

انہوں نے کہا کہ بادشاہ نے ہر اس شخص کا سر کاٹ دیا ہے جس نے اس کی بیٹی کی خواہش کا اظہار کیا تھا

لیکن میں ہر لمحہ بادشاہ کی وجہ سے قربان ہو رہا ہوں۔

محبت کے میدان میں اکیلے دو پاؤں سے نہیں بھاگ سکتا

محبت کے شطرنج کے تختے پر ، یہ حرکت صرف ایک سر سے نہیں کی جا سکتی۔

ہر ایک کے دو پاؤں اور ایک سر ہوتا ہے

ہزاروں فٹ اور سروں والی لاش کو جلا دیا جاتا ہے۔

چونکہ اس محبت کا مقصد لامحدود ہے

اس محبت کی گرمی کی شدت کے سامنے جہنم کی گرمی معمولی ہے۔[52]

جہنم کے بیان کا بیان، جس کے اوپر ایک پتلا اور تیز پل ہے جس پر ہر کوئی پیدل چل کر ابدی گھر میں اپنی آخری منزل تک پہنچے گا، مومن کو جلدی سے اس پر سے گزرنا چاہیے تاکہ مومن کی روشنی کی وسعت اسے بجھ نہ دے اور اس کا یہ قول کہ اے مومن ! میرے اوپر سے گزر جاؤ! بے شک تیرے نور نے میری آگ کو بجھا دیا ہے

اے محترم ! یہی وجہ ہے کہ مومن کی روشنی

جہنم کو کمزور اور بجھا دیتا ہے۔

وہ کہتا ہے: اے بزرگ! جلدی سے میرے اوپر سے گزر جاؤ

[52] شہزادے نے کہا: میں نے اس محبت کے حصول کے لیے اپنا مال اور سر قربان کر دیا ہے۔ اپنی انا اور خواہشات کی فنا اور معدوم ہونے کے بعد *وہ خدا کی ہستی (بقعہ) کے ذریعے رزق حاصل کرتا* ہے۔ عام لوگ اس محبت سے محروم ہیں کیونکہ ان کے پاس صرف دو پاؤں اور ایک سر ہے کیونکہ وہ محبت الٰہی کے حصول کے لیے کافی نہیں ہیں۔ انسان کی محبت (یعنی عورت کے لیے مرد کی محبت اور اس کے برعکس) ایک ہنگامہ پیدا کرتی ہے جو اس وقت ختم ہو جاتی ہے جب دو پاؤں اور سر ختم ہو جاتے ہیں (یعنی جب کسی کی زندگی ختم ہو جاتی ہے)۔ تاہم، حقیقی محبت (یعنی الٰہی محبت) کا ہنگامہ دن بدن شدت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ چونکہ اس محبت کا حتمی انجام اور منزل لامحدود ہے، وقت اور جگہ سے لامحدود اور ابدی ہے، اس لیے اس حقیقی محبت کی گرمی ناقابل فہم شدت کی ہے، جو جہنم کی گرمی کو بھی بونا کرتی ہے جو اس کی ناقابل برداشت شدت کے لیے جانا جاتا ہے۔

ورنہ تیری آگ میری آگ بجھا دے گی۔

کفر [دنیاوی زندگی میں گھناؤنے اعمال میں ظاہر ہوتا ہے] صرف جہنم کا بارود ہے

دیکھئے کہ یہ مومن کے باطنی نور سے کیسے بجھ جاتا ہے [جو دنیاوی قیام میں نیک اعمال میں ظاہر ہوتا ہے]۔

جلدی سے اپنا گن پاؤڈر [کسی روحانی رہنما یا کامل کے سپرد کریں]

پس نہ تمہیں دوزخ ٹھوکر مارے گی اور نہ اس کی چنگاریاں[53]

ایسے شخص سے آسمان کی طرف سے پوچھا جاتا ہے کہ ہوا کی طرح میرے اوپر سے گزر

ورنہ میرے پاس جو کچھ ہے وہ جعلی ہو جائے گا۔

کیونکہ تم کھیت کے مالک ہو، جبکہ میں صرف اس کے اناج چننے والا ہوں

میں صرف ایک بت ہوں جبکہ آپ چین کی سلطنت ہیں۔[54]

تیرے ساتھ اے ایمان والو! جہنم بھی خوف میں ہے اور جنت بھی خوف میں ہے

کوئی بھی آپ کے ساتھ امن نہیں ہے، نہ یہ اور نہ وہ۔

تینوں شہزادوں میں سے سب سے بڑا مر گیا اور دوسرے بھائی نے بادشاہ کی صحبت اختیار کر لی

اس کی زندگی کا خاتمہ اس لیے ہوا کیونکہ اسے صحت یاب ہونے کا وقت نہیں ملا

صبر بہت کمزور تھا ، اور اس کی روح اسے برداشت کرنے کے قابل نہیں [55]تھی۔

کافی دیر تک ، وہ اسے خوف سے برداشت کرتا رہا

اس کے مقصد اور مقصد کو حاصل کیے بغیر زندگی کا خاتمہ ہوا۔[56]

محبوب کا چہرہ اس سے غائب ہو گیا

وہ مر گیا اور محبوب کی باطنی حقیقت کا ساتھی بن [57]گیا۔

آپ نے فرمایا: اگرچہ محبوب کا لباس ریشم کا ہو

---

[53] اپنے باطن سے یہ بارود (منفی، برائی، گھناؤنے رجحانات اور جھکاؤ جو گھناؤنے اعمال میں تبدیل ہوتے ہیں) کو ہٹا دیں جو قیامت کے دن جہنم کے غضب کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اس بندوق کی طاقت کا مواد اپنے نفس کی گہرائیوں سے ایک کامل انسان ، ایک روحانی رہنما ، گنوسٹک یا الہی محبت کے مالک کے حوالے کریں تاکہ آپ کی روح میں کچھ بھی نہ بچتا جو جہنم کی آگ اور غضب کو اپنی طرف متوجہ کرے۔ انسان اپنے اندر اپنی لعنت اور نجات کے بیج رکھتا ہے۔ ابدی غم اور مصائب کی شکل میں لعنت، اور ابدی خوشی اور لامتناہی فتح کی شکل میں نجات۔

[54] مومن اور مخلص عاشق کی بلندی اور مرتبہ آسمان سے بھی بلند ہے اور ایسے شخص کا دل الٰہی کے ظہور کی جگہ ہے۔ جنت میں یہ خوبی نہیں ہے ، اسی وجہ سے ، جو حیثیت میں کم ہے وہ اعلی حیثیت والے کے ساتھ شرمندہ محسوس کرتا ہے۔ مختصرا یہ کہ مومن اپنی روحانی حیثیت میں جنت اور جہنم سے بلند ہوتا ہے۔

[55] سب سے بڑے بھائی اور شہزادے کو اپنے محبوب سے ملنے کا کوئی راستہ نہیں ملا اور اس کی زندگی اسی حالت میں ختم ہو گئی اور وہ جدائی کو برداشت نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی اس نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے ثابت قدمی کا صبر برقرار رکھا۔

[56] ایک طویل عرصے تک ، وہ اپنی محبت کا اظہار کرنے سے ڈرتا تھا ، اور آخر میں ، محبوب سے ملنے کے بغیر اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔

[57] وہ محبوب جو الٰہی محبت کا مظہر تھا اس کی موت کے بعد اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا اور وہ اس الہی حسن کے ساتھ متحد ہو گیا جو اس مظہر میں ظاہر تھا۔ اس طرح ، اسے اب کسی تخلیق میں الہی خوبصورتی اور الہی حقیقت کو دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ اس نے بغیر کسی پردے یا جدائی کے حقیقت کو گلے لگایا۔

بہتر یہ ہے کہ بغیر کسی پردے اور علیحدگی کے الہی خوبصورتی کو گلے لگائیں۔
میں بدن سے محروم ہو گیا ہوں اور بدن محبوب کے خیال سے محروم ہو گیا ہے
اب میں [حقیقی] محبوب کے ساتھ حقیقی ملاقات کی راہ میں مستقل اور آسانی سے چل رہا ہوں۔
یہ بحث صرف اس مقام تک بیان کی جاتی ہے
اس کے بعد جو کچھ آتا ہے اسے خفیہ رکھنا ہے۔[58]
گھوڑے اور لگام کی دوڑ دریا تک ہے
اس کے بعد ، آپ کی سواری لکڑی سے بنی سواری ہے۔
لکڑی کی سواری (کشتی) زمین میں بیکار ہے
لیکن یہ خاص طور پر دریا کے لوگوں کے لئے ایک گائیڈ ہے۔
یہ خاموشی لکڑی کی سواری ہے
سمندر کے لوگوں کے لیے خاموشی پر اصرار کیا گیا ہے۔[59]
وہ خاموشی جو آپ کو پریشان کرتی ہے
[الہی] محبت کے نعرے اٹھاتا ہے۔
میں اس نعرے کے شور سے بہرا ہو گیا ہوں جبکہ دوسرے لوگ اس سے غافل ہیں
تیز سماعت والے لوگ [دنیاوی معاملات میں] اس کہانی سے بہرے ہیں۔
ایک شخص خوابوں میں بلند آواز میں نعرے لگا رہا ہے
دسیوں ہزار گفتگو اور مباحثے کر رہے ہیں۔
ایک اور پہلے کے بالکل ساتھ بیٹھا ہے ، اس سے مکمل طور پر غافل ہے
ایسا شخص اس کے لئے سو رہا ہے اور آوازوں سے بہرا ہے اور چیخ و پکار سب سے پہلے سن رہا ہے۔[60]
جس کی لکڑی کی سواری (سمندر کے بیچوں بیچ) الٹ گئی ہے
پانی میں ڈوب گیا ہے اور خود مچھلی بن گیا [61]ہے۔
نتیجہ یہ ہے کہ [سب سے بوڑھا] شہزادہ دنیا چھوڑ گیا

---

[58] صرف اتنا ہی بحث میں الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے اور اس نقطہ سے آگے کی کوئی بھی چیز حقیقی محبوب (خدا، تعالیٰ) سے ملاقات ہے، اور یہ صرف تجرباتی ہے اور الفاظ کے ذریعے بیان نہیں کیا جا سکتا۔

[59] عام لوگوں کو اس باطنی روحانی کیفیت کی وضاحت نہیں کی جا سکتی جو صرف باطنی روحانی حالت کے لوگ ہی اس طرح سمجھ سکتے ہیں جیسے ایک کشتی جو زمین پر بیکار ہے۔ خاموشی باطنی روحانی حالت کے لوگوں کے لیے گفتگو ہے اور یہ ان کے لیے [خدائی] محبت کا نعرہ ہے کیونکہ ان کے پاس اس باطنی کیفیت کی باتیں سننے کے کان ہیں۔

[60] دنیاداری میں ملوث لوگ الہی محبت کی آوازوں سے غافل اور بہرے ہوتے ہیں جو باطنی روحانی حالت کے حامل شخص کو محسوس ہوتی ہے۔ اس کی تمثیل اس شخص کی طرح ہے جو خواب میں بہت کچھ سنتا ہے لیکن اس کے ساتھ بیٹھا شخص اس سے بالکل بے خبر ہے۔

[61] اب تک بحث اس شخص کے بارے میں رہی ہے جس کے پاس حقیقی باطنی روحانی تجربہ ہے (*ذوق یا ذوق*)۔ جو شخص الٰہی ہستی (*فنا*) میں فنا ہو چکا ہے اور اس میں گہرائی سے ڈوبا ہوا ہے، وہ باطنی تجربے کو بھی فنا پاتا ہے۔ ایسی مچھلی کی مانند ہے جو اس بے پناہ سمندر کی گہرائیوں اور چوڑائی میں تیرتی ہے اور اسے کشتی کی ضرورت نہیں ہے۔

جب وہ رخصت ہوا تو اس کی روح دردمند، غمگین اور گرم تھی۔[62]

دوسرا بھائی سب سے چھوٹا بھائی کی حیثیت سے سب سے بڑے بھائی کے جنازے میں آ رہا تھا اور بادشاہ نے دوسرے بھائی کو فراخدلی سے نوازا اور اس نے بادشاہ کو دیکھ کر لاکھوں اندرونی اور بیرونی دولت حاصل کی

سب سے چھوٹا بیمار تھا اور درمیانی

ابھی ابھی سب سے بڑے بھائی کی آخری رسومات میں آیا ہوں۔

بادشاہ نے اسے دیکھا اور جان بوجھ کر پوچھا: یہ کون ہے؟

کیونکہ وہ اسی سمندر سے تعلق رکھتا تھا اور وہ بھی ایک مچھلی ہے۔

تعارف کرانے والے نے کہا: وہ ایک ہی باپ کا بیٹا ہے

یہ بھائی مرنے والے بھائی سے چھوٹا ہے۔

بادشاہ نے اسے فراخدلی سے نوازا اور کہا: تم بے مثال ہو

اس نے اپنی فیاضی سے اس کا شکار کیا۔

اس بے مثال بادشاہ کی نعمت کی وجہ سے

اس نے اپنے اندر دوسری زندگی کے علاوہ ایک زندگی دیکھی۔

اس نے اپنے دل میں شاندار آواز اور جوش و خروش دیکھا

یہ وہ چیز ہے جو ایک صوفی کو سینکڑوں روحانی کوششوں میں بھی نہیں ملے [63]گی۔

اس نے اپنے دل میں ایک شاندار دنیا پایا [گنوسس اور الٰہی قربت کی]

یہ سو تنہائی کے بعد بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔

کھیت، دیواریں، پہاڑ اور چٹانیں چمک رہی تھیں

اس کے سامنے وہ پکے ہوئے انار کی طرح پھٹے ہوئے تھے۔

اس کے سامنے ہر ذرہ سورج کی طرح تھا

ہر لمحہ سو طریقوں سے ، یہ روحانی آغاز فراہم کرتا تھا۔

دروازہ کبھی کھلنے کی طرح اور کبھی کرن کی طرح بن گیا

دھول کبھی گندم بن جاتی تھی ، کبھی غذائیت کا ایک بڑا پیمانہ۔

اس کی آنکھوں کے سامنے آسمان (آسمان) پرانے سوکھے ہوئے گوشت کی طرح تھا

---

[62] سب سے بڑے بھائی کی حالت کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ محبت کے درد اور غم کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوا۔

[63] دوسرے بھائی کے دل پر بادشاہ کی روحانی توجہ کی وجہ سے ، اس کی اندرونی حالت ڈرامائی طور پر بدل گئی اور اس نے اپنے دل میں ایک نئی زندگی محسوس کی۔ اس نے اپنے دل میں محبت الٰہی کے لیے ایسا جوش و خروش دیکھا کہ ایک *صوفی* کو سینکڑوں روحانی تذکروں اور کوششوں میں بھی نہیں ملے گا (بنیادی طور پر طویل عرصے تک خلوت میں شدید الٰہی یاد اور غور و فکر کرنا)

اس کی آنکھوں کے سامنے ہر وقت ایک نئی تخلیق ہوتی تھی۔[64]

جب خوبصورت روح جسم کے قید سے آزاد ہو جاتی ہے

بے شک اللہ کی طرف سے آنکھ والی ہے

غیب کے دائرے سے لاکھوں چیزیں اس کے سامنے ظاہر ہوئیں

رازوں سے واقف افراد کی آنکھ جو کچھ دیکھ سکتی ہے وہ اس نے دیکھا۔

جو کچھ بھی اس نے کتابوں میں پڑھا

اس نے ان کی اندرونی حقیقت پر آنکھیں کھولیں۔

اس عظیم بادشاہ کے جلوس کی خاک سے

انہوں نے بصارت کو واضح کرنے والا اور بصارت بڑھانے والا کوہل تلاش کیا۔

وہ ایسے باغ میں اپنے کپڑے گھسیٹتے تھے

جہاں اس کے وجود کا ہر ریشہ یہ رونے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا کہ "کیا اور ہے؟"

پھولوں سے اگنے والا باغ ختم ہو جاتا ہے

ایک باغ جو دل سے نکلتا ہے وہ ہمیشہ کے لئے رہتا [65]ہے۔

ہم ایک یا دو گلدستے کا غلبہ رکھتے ہیں

کیونکہ ہم نے باغ کا دروازہ اپنے اوپر بند کر دیا ہے۔[66]

اس طرح کی چابیاں ، ہر وقت ، روٹی کے بدلے میں

اے میری جان! انگلیوں سے گر رہے ہیں۔

اگر آپ کچھ عرصے کے لئے روٹی کے بارے میں پریشان نہیں ہوجاتے ہیں

آپ کپڑوں ، جسمانی محبت اور عورتوں کے جنون میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔

جب آپ کے اندر ہوس اٹھتی ہے

آپ چاہتے ہیں کہ پورا ملک اور شہر عورتوں اور روٹی سے بھرا ہوا ہو۔[67]

---

[64] الٰہی روشنیوں کی کثرت کی وجہ سے پوری دنیا منور ہو گئی اور روحانی معنی خود کو ظاہر کرنے لگے اور ہر چیز الٰہی صفات اور کمالات کے مظہر کے طور پر ظاہر ہونے لگی۔ اب دنیا کا ہر ذرہ روحانی وحی (*کشف*) کا ذریعہ بن گیا اور اس کے لیے دروازے یا علم اور باطنی روحانی معنی کھلنے لگے۔ علم کا وہ دروازہ کبھی علم کا ذریعہ بن جاتا تھا اور کبھی علم خود ہی بن جاتا تھا۔ اب مادی جسمانی دائرہ (*عالم النسوط*) ان کے نزدیک اتنا ہی بے ارزش معلوم ہوتا تھا جتنا ان کے سامنے فرشتوں کا دائرہ تھا۔

[65] دوسرے شہزادے کے روحانی انکشافات کے بارے میں حیرت یا حیرت زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب روح کو جسم کی قید سے آزاد کیا جاتا ہے، خواہ وہ روحانی جدوجہد (*مجاہدہ*) کی وجہ سے نچلے نفس کو زیر کر کے آزاد کیا جاتا ہے یا کسی کامل مرشد (*شیخ الکامل*) کی صحبت کے ذریعے اسے ہر قسم کے روحانی وحی حاصل ہوتے ہیں۔ شہزادے نے بادشاہ کی صحبت کے ذریعے اس بلند باطنی حالت کو حاصل کیا جو ایک کامل روحانی رہنما کی تمثیل ہے، جو کسی کے وجود کے مرکز میں ایک بڑے پیمانے پر اندرونی روحانی تبدیلی لانے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ شہزادہ ہر اندرونی علم کے باغات میں ٹہل رہا تھا اور روحانی راستے میں دوسرے کامیابی حاصل کرنے والوں کی طرح مزید مانگ رہا تھا۔ مادی علوم گنوسس (معارفہ) کے باغ سے صرف چند گلدستے ہیں۔

[66] ہم حقائق اور روحانی دائرے کے علم سے غافل ہونے کی وجہ سے مادی علم سے مرعوب ہو گئے ہیں۔

[67] جب پیٹ بھر جاتا ہے تو ، آپ نجی حصوں کی ہوس سے متاثر ہوجاتے ہیں۔ پھر انسانی لالچ میں اضافہ ہوتا ہے اور انسان اپنی بڑھتی ہوئی ہوس اور لالچ کو پورا کرنے کے لئے دولت اور وسائل سے بھرے پورے ممالک اور شہروں کے پیچھے بھاگتا ہے جس کی کوئی حد نہیں ہے۔

تم سانپ ہوا کرتے تھے، شاید اب تم اژدہا بن گئے ہو گئے ہو

تم ایک سر والا سانپ تھے، اب تم سات سر ہو۔

سات سر والا اژدھا جہنم ہے

آپ کا لالچ اناج کی طرح ہے اور جہنم آپ کے لئے جال کی طرح ہے۔

جال پھاڑ کر اناج جلا دو

اس گھر کے نئے دروازے کھولیں[68].

اے بے شرم فقیر! چونکہ تم عاشق نہیں ہو

آپ کے پاس پہاڑ کی طرح ایک نامعلوم آواز ہے۔[69]

اگر آپ اپنے آپ کو اصلاح کرتے ہیں

عذاب الٰہی تمہارے سامنے پوشیدہ ہے

آپ دونوں جہانوں میں مالک اور منصف بن جاتے ہیں (یہ اور اگلا)۔

ایک ابدی بادشاہت تمہارے سامنے ظاہر ہو گی

یہ دو دن لمبا ، مستعار لیا گیا ، اور زندگی کی بیماریوں سے بھرا ہوا نہیں ہے۔

آپ جبری مشقت سے آزاد ہو جائیں گے اور اپنا کام خود کریں گے

آپ اپنا بادشاہ بن جائیں گے اور اپنا بگل پھونکیں گے۔[70]

جب گلا ہم پر زندگی تنگ کر رہا ہے

افسوس! گلے اور منہ دھول کھاتے ہیں۔

یہ منہ خاک کھانے والا ہے

لیکن وہ دھول جو رنگین ہو گئی ہے۔

یہ کباب، شراب اور چینی

اے بچے! یہ رنگین اور سجی ہوئی دھول کے سوا کچھ نہیں ہے۔

جب آپ نے کھانا ختم کیا اور یہ آپ کا گوشت اور خون بن گیا

---

[68] اپنے آپ کو اس لالچ اور ہوس سے دور کریں جو پھنسنے کے لئے اناج اور جال کی طرح ہیں ، تب ہی آپ کے لئے گہرے اندرونی روحانی معنی اور علم الٰہی کے دروازے کھل جائیں گے۔

[69] اگر آپ کے پاس خدائی محبت نہیں ہے جو اس طرح کے الہامی علم کے ساتھ آتی ہے تو آپ اس پہاڑ کی مانند ہیں جو آواز کو موڑ دیتا ہے اور اس سے بے خبر ہے۔ دوسرے لفظوں میں ، اس حالت میں آپ کا مادی علم کسی پہاڑ سے ہٹنے والی آوازوں کی طرح ہے۔

[70] جب عذاب الٰہی اپنے تمام غصے کے ساتھ آپ کے سامنے آتا ہے تو توبہ کرنے اور اصلاح کرنے میں بہت دیر ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی شخص اس وقت اصلاح کرے اور اپنے آپ کو درست کرے جب خدا کا عذاب چھپا ہوا تھا اور اس نے اسے نہیں دیکھا تھا تو وہ ایک بادشاہ کی مانند ہے اور ایسے شخص کو کوئی پریشان نہیں کر سکتا۔ جب غیب پر ایمان اس طرح موجود ہے تو ایک مستقل بادشاہی مل جاتی ہے اور آپ کو غلامی کی زندگی ختم ہو جائے گی، اس کے بجائے آپ کو آزادی ملے گی۔ منہ اور گلے کے یہ ذائقے اور لذتیں ہمارے لئے مہلک ہیں۔ الٰہی عذاب کے وقت ، کوئی ان پر پچھتاوا کرتا تھا اور اس کے بجائے خاک کھانا چاہتا تھا۔ اس دنیا میں جو کچھ بھی کھا رہا ہے، جس میں لذیذ چیزیں بھی شامل ہیں، وہ دھول کے سوا کچھ نہیں ہے جو رنگوں سے ڈھکی ہوئی ہے اور دنیا کی تمام لذیذ چیزیں رنگین اور سجی ہوئی خاک ہیں۔

اسے گوشت کا رنگ ملا اور وہ بھی گلی کی دھول ہے۔

زمین پر رنگ دھول سے کیا جاتا ہے

پھر سب کچھ خاک بن جاتا ہے۔[71]

ہندوستانی، قبچاقی، ترک، رومی اور ایتھوپیا

ان کی قبروں کے اندر ایک ہی رنگ بن جائیں۔

تاکہ آپ سمجھ سکیں کہ تمام رنگ اور نشانات ہیں

پردے ، دھوکہ دہی اور مستعار چیزیں۔

کیونکہ صرف ایک ہی رنگ جو باقی رہتا ہے وہ خدا کا رنگ ہے اور کچھ نہیں

باقی سب کچھ [مویشیوں میں کسی جانور کے ساتھ] گھنٹی کی طرح بندھا ہوا [72]سمجھیں۔

سچائی کا رنگ، خدا کا خوف اور الٰہی یقین

ہمیشہ خدا کے بندوں اور بندوں پر قائم رہے گا۔

شکوک و شبہ، کفر اور منافقت کا رنگ

نافرمان نفس پر ہمیشہ رہے گا۔

جیسا کہ فرعون اور اس کے سیاہ برے اعمال تھے

ان کا رنگ باقی ہے ، لیکن جسم ختم ہوگیا ہے۔

سچوں کے خوبصورت چہروں پر شان و شوکت اور چمک

قیامت تک قائم رہیں گے اگرچہ ان کے جسم غائب ہو جائیں

خدا دھول کو رنگ، مہارت اور مزاح عطا کرتا ہے اور

ان کی وجہ سے وہ لوگ جنگ میں مصروف ہیں جو بچگانہ مزاج رکھتے ہیں۔

آٹے سے بنی اونٹوں اور شیروں کی روٹیوں کو پکایا جاتا ہے

بچے لالچ سے انہیں چاٹتے ہیں۔

شیر اور اونٹ منہ میں روٹی بن جاتے ہیں

اس کا بچوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

---

[71] پہلے اس خاک کا رنگ کھانے اور پھلوں کا تھا، پھر اسے کھایا گیا اور گوشت اور خون کی شکل میں جسم کا حصہ بن گیا، پھر آخر میں وہ گوشت اور خون زمین کی خاک بن جائے گا۔ جسم جو خود خاک ہے وہ خاک سے پرورش پاتا ہے اور آخر میں قبر تک پہنچنے پر دوبارہ خاک بن جاتا ہے۔

[72] انسان اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے کہ وہ کہاں سے آئے ہیں اور اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے کہ ان کی عارضی دنیاوی زندگی کے دوران ان کی جلد کے رنگ بھی ہوں ، مرنے کے بعد ایک ہی رنگ کی دھول بن جاتے ہیں۔ ہر ایک کے لئے ایک ہی اختتام کا مقصد یہ پیغام گھر پہنچانا ہے کہ رنگوں ، نسلوں ، ثقافتوں اور ممالک کے اختلافات سب عارضی ہیں۔ حقیقت میں انسان کی ابتدا اور آخری انجام ایک ہی ہے۔ صرف ایک ہی چیز جو ہمیشہ کے لیے رہتی ہے وہ خدا کا رنگ ہے جو اس عارضی دنیاوی وجود میں نیک اعمال کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ "قبچاق" ایک یوریشین صحرا ہے جس میں کچھ خانہ بدوش ترک لوگ آباد ہیں۔ پالتو جانور یا مویشیوں سے منسلک گھنٹی اس کی ملکیت نہیں ہے ، بلکہ یہ ایک مستعار چیز ہے۔

بچوں کی طرح ہم نے بھی اپنے آپ کو دھول سے بھر دیا ہے

[اپنی زندگی کے مقصد کے حصول کے لیے] حقیقی ذرائع اور وسائل کو اپنانے کی کوشش ہمارے دماغ سے نکل گئی ہے۔

بچہ حماقت، قیاس آرائی اور شک میں مگن ہے

خدا کا شکر ہے کہ بچے میں جسمانی طاقت بہت کم ہوتی ہے۔[73]

افسوس ان بچوں کے لیے ہے جو بڑھاپے اور بوڑھے سال برداشت کر رہے ہیں

وہ لنگڑانے والی چیونٹیاں ہیں جو [دنیا] پر حکمرانی کر رہی ہیں۔

ایک بچے کے پاس سو جھگڑے اور جھگڑے ہوتے ہیں

خدا کا شکر ہے کہ بچہ حکمت عملی کے بغیر اور ہتھیاروں کے بغیر ہوتا ہے [اور اس وجہ سے کسی کو حقیقی نقصان پہنچانے سے قاصر ہے]۔

افسوس ان بداخلاق ، بداخلاق بچوں کے لئے ہے جو بڑے بوڑھے بالغ ہیں اور

ہر ایک کے لئے مصائب کا ذریعہ بن گیا ہے جو ان کے پاس موجود طاقت اور کنٹرول کی وجہ سے [حقیقی نقصان پہنچانے اور دنیا کو کمزور کرنے والے تنازعات کے بیج بونے کے لئے]۔[74]

جب جہالت اور ہتھیار مل جاتے ہیں

یہ ظلم اور جبر کی وجہ سے دنیا کو تباہ کرنے والا فرعون بن جاتا ہے۔

اے بیچارے! اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو اس کمی پر

کہ اس نے تمہیں ظلم اور کفر سے بچا لیا

شکر گزار رہو کہ تم مظلوم ہو اور ظالم نہیں

آپ ظلم و ستم اور ہر برائی سے محفوظ ہیں۔

خالی پیٹ نے خدا پرستی کا دعویٰ نہیں کیا

کیونکہ اپنے اندر موجود اس آگ کو ایندھن سے مدد نہیں ملتی [اس طرح اس کی شدت میں اضافہ ہوتا ہے]۔

خالی پیٹ شیطان کے لیے قید خانہ ہے

کیونکہ اس کے لیے روٹی تلاش کرنے کی فکر اسے چالاکی اور دھوکہ دہی سے روکتی ہے۔

اگر کوئی پھل پرانا ہو تو کچا نہ ہو

اسے کچا کہا جاتا ہے [چاہے وہ درخت پر کتنی دیر تک رہتا رہے]۔

---

[73] اگر کوئی چھوٹے بچوں کو سمجھانے کی کوشش کرے کہ آٹے سے بنے اونٹ اور شیر اصلی اونٹ اور شیر نہیں ہیں تو وہ اسے قبول نہیں کریں گے۔ ہم نے بھی بچوں کی طرح اپنے آپ کو دھول سے بھر دیا ہے اور اپنی زندگی کے اصل مقصد کے حصول کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے اس سے غافل ہو گئے ہیں۔

[74] بچے کی جہالت اور حماقت نقصان دہ نہیں ہے کیونکہ بچے میں زیادہ طاقت اور طاقت نہیں ہوتی ہے اور اگر اس سے لڑائی ہوتی ہے تو یہ ایک چھوٹی سی لڑائی ہے جس میں کوئی حقیقی نقصان نہیں ہوتا ہے۔ افسوسناک بالغ لوگ ہیں جو بچوں کی طرح کام کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ لنگڑانے والی چیونٹیاں ہیں جن کے پاس [سماجی و سیاسی] طاقت اور دولت ہے اور ان کی جہالت ہمارے ارد گرد اور دنیا میں بڑے پیمانے پر نقصان اور تباہی کا سبب بنتی ہے۔

یہاں تک کہ اگر وہ کچا [شخص] سو سال پرانا ہو جائے

ہر سمجھدار شخص کے لئے یہ ایک بچہ اور کچا ہے۔

چاہے بال اور داڑھی سفید ہو جائیں

ایک شخص اب بھی اسی بچپن ، خوف اور امید میں ہے۔[75]

اس مادی دائرے سے اوپر کے دائرے میں ہر چیز روحانی ہے

یہ خلاصہ کا خلاصہ ہے اور خدا پرست ہے۔

[باہری] شکل ایک سایہ ہے اور باطنی معنی [روشنی دینے والے سورج کی طرح] ہے

سایہ کے بغیر روشنی صرف ایک ویران جگہ پر پائی جاتی ہے۔

کیونکہ وہاں اینٹ پر اینٹ نہیں ہے

چاند کے لئے ، کوئی برا سایہ نہیں بچا تھا۔

اینٹ اگرچہ یہ سونے سے بنی ہے ، لیکن اسے ہٹانے کا مستحق ہے

جب اینٹوں کی جگہ ہوتی ہے تو [روحانی] وحی اور روشنی ہوتی ہے۔[76]

کوہ سینا کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تاکہ سایہ کو دور کیا جائے

اس الٰہی نور کی خاطر ٹکڑے ٹکڑے کرنا ایک چھوٹی سی بات ہے۔

جب خدا کا نور پہاڑ کے بیرونی حصے پر گرا

وہ پھٹ گیا تاکہ خدا کا نور بھی اس کے اندر پہنچ سکے۔

جب کوئی بھوک سے دوچار ہوتا ہے تو روٹی پکڑ لیتا ہے

لالچ کی وجہ سے ، منہ کھولتا ہے اور آنکھیں پھیل [77]جاتی ہیں۔

---

[75] دنیاوی مادہ پرست لوگوں کا بڑھاپا انہیں بچپن (ناپختگی اور جہالت) سے نہیں نکال سکتا۔ اگر کوئی شخص بڑھاپے میں بھی ذہین نہیں ہوتا ہے تو بڑھاپے کی وجہ سے بال سفید ہونے کے باوجود بچگانہ رویے کی وجہ سے بچگانہ ہوتا ہے۔ خوف اور امید دو طرح کے لوگوں سے تعلق رکھتی ہے: سب سے پہلے، یہ روحانی طور پر کامل ہونے والے ہیں جو خدائی قانون کا مقصد ہیں۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ انسان شریعت الٰہی پر عمل پیرا ہو اور اس کے احکام اور ممنوعات پر پوری تندہی سے عمل کرے، پھر اپنے نیک اعمال کو اتنا چھوٹا سمجھتا ہے کہ وہ الٰہی کی قبولیت کا مستحق ہو اور اس سے ڈرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انسان رحمت الٰہی پر نظر رکھتا ہے اور خدائی قبولیت کا امیدوار رہتا ہے۔ اس کی تمثیل اس کسان کی طرح ہے جو زمین پر کاشت کرتا ہے، بیج ڈالتا ہے اور اللہ کی رحمت سے بارش کا انتظار کرتا ہے۔ امید اور خوف کا دوسرا شخص بچگانہ ہوتا ہے جس میں کوئی کام (نیک عمل) نہیں کرتا اور پھر فصل کی کٹائی کے لیے کاشت کاری کی صورت میں الٰہی رحمت کی امید رکھتا ہے۔ یہ حقیقت میں تکبر اور دھوکہ ہے۔ دوسری قسم کے بچگانہ خوف اور امید کی ایک اور تمثیل یہ ہے کہ خدا کے خوف سے اپنے اعمال کو بہت چھوٹا سمجھتا ہے اور کام کرنا چھوڑ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ خدا مہربان ہے اور جو کام نہیں کرتا اس پر بھی احسان کرتا ہے۔ یہ خوف نہیں ہے ، یہ بزدلی ہے۔ یہ وہ خوف اور امید ہے جو ان لوگوں کے ذریعہ اپنایا جاتا ہے جو اچھے نتائج کے لئے کام نہیں کرتے ہیں ، اور یہ محض ایک بچگانہ رویہ ہے۔

[76] تمام اعمال کا خلاصہ راہ روحانی (*طریقت) میں کشمکش* ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کسی کو اپنی طرف کھینچتا ہے تو خدا میں فنا ہو جاتا ہے پھر اللہ تعالیٰ میں رزق حاصل ہوتا ہے۔ جسم کی بیرونی شکل یا اعمال سائے کی طرح ہیں اور ان اعمال کے روحانی معنی سورج کی طرح روشن ہیں۔ انسان کو بغیر سائے کے روشنی اس وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ خدا (فن) میں فنا حاصل کرتا ہے، یعنی نچلے نفس کی خواہشات اور صفات سے چھٹکارا حاصل کرتا ہے۔ جب انسانی رجحانات، کمزوریوں اور نچلی نفس کی اینٹوں کا سایہ ہٹا دیا جاتا ہے، تو روحانی روشنی اب سائے سے مسدود نہیں ہوتی ہے۔ جب اینٹوں کو ہٹانے سے بے لگام روشنی ہوتی ہے تو ، ان اینٹوں کو ہٹانے کے قابل ہے۔

[77] جب کوئی بھوک کا شکار ہوتا ہے تو روٹی کا ایک ٹکڑا لیتا ہے، منہ بڑا کھولتا ہے اور جلدی سے بڑے ٹکڑوں میں کھاتا ہے۔ مصر میں کوہ سینا کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام خدا سے گفتگو کرنے کے لیے وہاں گئے اور خدا سے خدا سے گفتگو کرنے کی درخواست کی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم مجھے نہیں دیکھ سکو گے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے کوہ سینا پر اپنے الہامی نوروں سے صرف ایک

یہ (کوہ سینا) کے لیے موزوں ہے کہ وہ لاکھوں ٹکڑوں میں ٹکڑے ٹکڑے ہو

اے زمین! آسمان کے درمیان سے ہٹ جاؤ۔

تاکہ آسمانی روشنی سائے کو جلا دے

اے دن کے دشمن! رات آپ کے سائے کی وجہ سے ہے۔

یہ زمین بچوں کی پرورش کے لیے ہے

بالغوں کے لئے اس میں ایک تنگ جگہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کیا ہے کہ زمین کی اولاد پیدا ہو گی

اس میں اس نے بچوں کی خاطر دودھ اڑایا ہے۔[78]

جھولوں کی زیادہ تعداد کی وجہ سے گھر تنگ ہو گیا ہے

اے اللہ! براہ کرم ان بچوں کو جلدی سے بالغ بنائیں۔

ہوشیار رہو اے جھولے! جگہ کو تنگ اور تنگ نہ بنائیں

تاکہ بالغ بالغ افراد آزادانہ طور پر گھوم سکیں۔

بچوں کی پرورش کے لئے گھر کو تنگ نہ کریں

تاکہ بالغوں کو وسعت مل سکے۔

دوسرے شہزادے میں اس کے خود کفیل ہونے کے احساس اور روحانی نقاب کشائی کی وجہ سے پیدا ہونے والی اس بات کی وجہ سے کہ وہ بادشاہ کے خلاف بغاوت کرنے کا ارادہ کر رہا تھا اور اس کی ناشکری کی وجہ سے بادشاہ کو اس کے بارے میں معلوم ہوا اور اس نے اس کے دل کو تکلیف پہنچائی اور اس کی روح کو اس طرح زخمی کیا کہ شہزادہ یہاں تک کہ اس سے واقف بھی نہیں

جب خرید و فروخت کے بغیر، مستقل ہو گیا

بادشاہ کے اندرونی وجود سے شہزادے کی روح کی اجرت

وہ بادشاہ کی روح سے روشنی سے روحانی پرورش حاصل کرتا تھا کیونکہ

اس کی روح کا چاند ، جیسے چاند سورج سے اپنی روشنی حاصل کرتا ہے۔

بے مثال بادشاہ سے ، روحانی اجرت

ہر وقت اس کی روح تک پہنچتا تھا۔

روشنی دکھائی، وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اور موسیٰ بے ہوش ہو گیا۔

[78] انسانی جسم سیارے زمین کی طرح ہے جو سایہ کا سبب بنتا ہے اور سورج کی روشنی کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے اور اسی وجہ سے رات غروب ہوتی ہے۔ جسم اور مادی دائرہ دنیاداری (مادیت پرستی) کے لوگوں کے لئے ایک گہوارہ ہے جو بچوں کی طرح ہیں اور پالہ بڑے بالغوں کے لئے بہت چھوٹا ہے۔ چنانچہ روحانی طور پر کامل افراد اپنی دنیاوی زندگیوں میں تنگی اور تنگ نظری کا شکار ہوتے ہیں۔ ان بچوں کے لئے (جو روحانی طور پر پروان چڑھے نہیں ہیں اور مادی اور جسمانی وجود کے جنون میں مبتلا ہیں) ، زمین مادی فوائد فراہم کرتی ہے جسے یہاں "دودھ" کہا جاتا ہے۔

عام لوگ کیا کھاتے ہیں نہیں

بلکہ وہ غذا جو فرشتے کھاتے ہیں۔

شہزادے نے [غلطی سے] اپنے اندر [بادشاہ سے] آزادی اور خود کفالت دیکھی

اس آزادی نے [بادشاہ کی طرف سے] بغاوت کو جنم دیا۔

کہ: کیا میں بادشاہ اور شہزادہ نہیں ہوں؟

میں نے اپنی زندگی کی باگ ڈور اس بادشاہ کو کیوں دی ہے؟[79]

جب میرا روشن چاند افق پر نمودار ہو جائے گا

پھر میں خاک کے تابع کیوں ہو جاؤں؟

میری ندی میں پانی ہے اور اب وقت آگیا ہے کہ [میں کون ہوں] فخر کرنے کا وقت آگیا ہے

میں اب آزاد ہوں، میں کسی اور کا غرور کیوں برداشت کروں؟

جب سر درد باقی نہیں ہے تو میں اپنے سر کے گرد بینڈ کیوں ڈالوں؟

گیلی آنکھوں اور زرد چہرے کا وقت باقی نہیں رہا۔

جب اب میرے پاس چاند کی طرح میٹھی ہونٹ اور گال ہیں

مجھے [اپنی اپنے] ایک اور دکان کھولنی چاہیے۔[80]

جب اس کا نچلا نفس انا کے ساتھ پھولنا شروع ہوا

اس نے بہت سی فضول باتیں بولنا شروع کردیں۔[81]

بادشاہ کا سمندر، جو تمام پانیوں (دریاؤں اور نہروں) کا ملنے کا مقام ہے

وہ کیوں نہیں جانتا کہ بہاؤ میں کیا ہے اور ندی میں کیا ہے؟

اس کی سوچ نے بادشاہ کے دل کو تکلیف پہنچائی

ان کی روحانی نعمت اور عطیات کی ناشکری کی وجہ سے۔

بادشاہ نے اپنے آپ سے کہا: اے بد اخلاق!

---

[79] دوسرا شہزادہ بادشاہ (کامل روحانی رہنما) سے روحانی فوائد اور برکتیں حاصل کرتا تھا جیسے چاند سورج سے اپنی روشنی حاصل کرتا ہے۔ اس کی روح کو ہر روز بادشاہ کی طرف سے ایک ناپ مقدار میں روحانی رزق ملتا تھا۔ یہ وہ غذا نہیں تھی جو عام لوگوں کو ملتی ہے ، بلکہ یہ ایک روحانی غذا تھی جو فرشتوں کو ملتی ہے۔ بادشاہ سے ملنے والے روحانی فوائد اور نعمتوں کی وجہ سے شہزادے نے یقین کرنا شروع کیا اور سوچنا شروع کیا کہ اس نے روحانی کمال حاصل کر لیا ہے اور اب اسے بادشاہ کی خدمت اور اطاعت کی ضرورت نہیں ہے۔ اس غلط سوچ اور اشارے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے تمام روحانی فوائد جو اسے بادشاہ کے ذریعے حاصل ہو رہے تھے وہ اس سے چھین لیے گئے۔ اس میں جو بغاوت پیدا ہوئی تھی وہ اس اشارے کی وجہ سے تھی کہ وہ بادشاہ اور شہزادہ ہے، یعنی اس نے روحانی کمال حاصل کر لیا ہے اور اب اسے بادشاہ کی ضرورت نہیں ہے اور اسے اپنی باگ ڈور بادشاہ کے حوالے نہیں کرنی چاہیے۔

[80] جب میں کامل ہو گیا ہوں تو میں کسی اور کی بات کیوں سنوں۔ جب میرے پاس روح کی اندرونی بیماریاں نہیں ہیں تو میں ایک روحانی مرشد کی صحبت کیوں رکھوں؟ اب مجھے خود ایک روحانی رہنما بننا چاہیے۔

[81] جب اس کی روحانی حالت کے اس مرحلے پر اس میں خود راستبازی اور انا پرستی پیدا ہوئی تو اس نے بہت سی غلط باتیں بولنا شروع کیں جو اس کی روحانی حالت کے لیے نقصان دہ تھیں اور اس حد تک کہ پسپائی اور زوال کا سبب بنتی تھیں۔ اندرونی روحانی تبدیلی اور اصلاح حاصل کرنے کے بعد ، اس طرح کے انا پرست خیالات کی وجہ سے رجعت پسندی کا خطرہ اب بھی موجود ہے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ میری فیاضی کی سزا ہے!

اس اچھے خزانے میں سے میں نے تیرے لئے کیا کیا؟

اور تم نے اپنی بری عادتوں کی وجہ سے میرے ساتھ کیا کیا؟

میں جنت کی سیڑھی بن گیا

تم مجھ سے لڑنے کے لئے تیر کمان بن گئے!

بادشاہ میں بخور کا درد نمودار ہوا

بادشاہ کے درد کا عکس اس کے اندرونی وجود میں آگیا۔

دولت کا پرندہ اپنے غضب کی وجہ سے کانپ رہا تھا

اس نے سائیڈ لائننگ کی منصوبہ بندی کرنے والے کے پردے توڑ [82]دیے۔

جب اس نوجوان نے اپنے اندر کو دیکھا

اس نے اپنے تاریک اعمال کا اثر دیکھا۔

مہربانی اور برکت کی وہ اجرت ضائع ہو گئی

اس کی خوشیوں کا گھر غم سے بھر گیا۔

جس نے اپنے آپ کو محبوب کی راہ میں دیکھا

کرنل چھوڑ دیا اور صرف بیرونی خول دیکھا۔

خدا میرے دشمن کو اپنے اندر جھانکنے پر بھی نہ ڈالے

کیونکہ ایسے شخص سے ہنگامہ آرائی اور تباہی کے سوا کچھ نہیں تھا۔[83]

دنیا میں شراب کی ممانعت ہو چکی ہے

کیونکہ آپ فوری طور پر کوئی ایسا شخص بن جاتے ہیں جو اپنے اندر دیکھتا ہے۔

آپ کے تخیل میں ، آپ کے سوا کوئی اور بہتر آپ کے پاس نہیں آتا ہے

یہ سب آپ کے اندر نچلے نفس کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔[84]

اے تم! اپنے آپ کو اپنے نچلے نفس سے الگ کر دو (نفس)

یہاں تک کہ تم اس میں قید رہو گے

اے محبوب! اپنی روح محبوب کے حوالے کر دو

---

[82] بادشاہ کو تکلیف پہنچی کیونکہ بادشاہ کی طرف سے اس پر اپنی فیاضی کے بعد بھی شہزادہ بغاوت کر رہا تھا۔ "دولت کا پرندہ" یعنی شہزادے کی دل کی اندرونی روحانی حالت بادشاہ کو سائیڈ لائن کرنے کے منصوبے کی وجہ سے بکھر گئی۔

[83] رومی کہتے ہیں کہ جو شخص روحانی کمال اور معرفت کی راہ میں مغرور ہوتا ہے وہ روحانی راہ کی حقیقت سے محروم ہو جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا نقصان اور تباہی ہے جو میں اپنے دشمن کی خواہش بھی نہیں کرتا۔

[84] شراب کو اس لیے حرام کیا گیا ہے کہ قرآن مجید کا ارشاد ہے: "شیطان شراب اور جوئے سے تم میں انتشار اور فتنہ پھیلانا چاہتا ہے"، دشمنی کی وجہ عام طور پر انا پرستی، خود راستبازی اور اپنے اندر جھانکنا اور اپنے آپ کو کسی اور سے بہتر سمجھنا ہے۔ الکحل اس نقصان دہ اندرونی حالت میں حصہ ڈالتا ہے۔ شہزادے کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔

تاکہ تم اس دوست کو دیکھ سکو جو تمہارے دل کو پریشان رکھتا ہے۔

اپنی روح محبوب کے حوالے کر دو اور آزاد ہو جاؤ

اس کے لئے صحیح کام کریں اور خوشی حاصل [85]کریں۔

نچلے نفس کو آپ پر حاوی نہ ہونے دیں

اسے اس کے دودھ سے چھٹکارا دیں۔

ہر چیز کا نشہ اور اثر ہوتا ہے

چاہے وہ دودھ ہو، شراب ہو یا شہد۔

اے انسان! گندم کے نشہ کو جانیں

اس نے آدم علیہ السلام کو بے خبر کر[86] دیا۔

شہزادہ آدم کی طرح آسمان سے الگ ہو گیا

جو بیل کے ساتھ کھیتی باڑی کے لیے کھیتوں میں ہل چلاتے تھے۔

وہ آنسو بہاتا تھا اور کہتا تھا: اے زبردست ڈاکو!

تم نے شیر کو بیل کی دم کے قیدی میں تبدیل کر دیا ہے۔

اے بد اور سرد نفس! آپ نے کیا

مہربان بادشاہ کے ساتھ بدتمیزی

گندم کے لالچ میں ، آپ نے جال کا انتخاب کیا ہے [جو پھنساتا ہے]

آپ کے لیے بیت کے طور پر استعمال ہونے والے گیہوں کا ایک ایک دانہ بچھو بن گیا ہے۔

انا پرستی کی فضا آپ کے سر کو بھر رہی تھی

اب اپنے پیروں میں پچاس ٹن کی زنجیر دیکھیں۔

شہزادہ اس طرح اپنے آپ پر رو رہا تھا

میں بادشاہ کا مخالف کیوں بن گیا؟

وہ ہوش میں آیا اور توبہ کر لیا

محبوب سے جدائی کا درد

رحم کرو! لاعلاج ہے۔

[85] جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ محبوب (خدا) کے حوالے کر دو پھر تمہارے پاس [روح کی آنکھ سے] نظر آئے گا۔ نچلے نفس کے زیر نہ جائیں اور اسے اس کی خواہشات سے محروم نہ کریں۔

[86] اپنے آپ کو تعریف میں دیکھنے کا نشہ کسی کو نقصان پہنچاتا ہے۔ جو بھی چیز اس کا سبب بنتی ہے، چاہے وہ حلال ہو یا ممنوع، اس سے پرہیز کرنا چاہیے۔ ہر چیز کا نشہ اور اثر ہوسکتا ہے جس کا کسی کے روحانی سفر کی روشنی میں جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ دیکھو کہ کس طرح گندم کھانے سے آدم علیہ السلام کو بے خبر کر دیا گیا اور اس سے اس حد تک دھوکہ کھا گیا کہ اس نے جنت میں اپنا ٹھکانہ کھو دیا جہاں اسے ہر طرح کی آسائشیں میسر تھیں اور زمین پر دھکیل دیا گیا جہاں وہ بے پناہ مشکلات اور کشمکش سے گزرا۔

اے اللہ! خدا کرے کہ انسانوں کی حالت بہتر نہ ہو

جب صبر کی کیفیت ختم ہو جاتی ہے تو انا اور اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

انسان کو نقصان پہنچانے کی طاقت نہ ہو!

کیونکہ اس زمانے میں انسان ایمان [اپنے آپ کو روکنے کے لیے] یا خود اصلاح کے راستے کی پرواہ نہیں کرتا تھا۔

مصیبتوں میں مبتلا انسان بہتر ہے

کیونکہ نیچی نفس نعمتوں کا انکار کرنے والا ہے اور گمراہ ہے [زندگی کے صحیح راستے سے کیونکہ وہ نقصان اور برائی کی طرف مائل ہے]۔

آزمائش اور مصیبت میں مبتلا انسان بہتر ہے

کیونکہ ایسا شخص ذلیل اور ذلیل اور بے بس ہوتا ہے [اس طرح مظلوم ہونے کی وجہ سے وہ خود ظالم نہیں بنتا]۔

اس شہزادے کی کہانی کی طرف لوٹتے ہیں جس نے اپنی بغاوت کی وجہ سے اپنے آپ کو بہت نقصان پہنچایا اور وہ بادشاہ کے دل سے زخمی ہو گیا اور روحانی راستہ مکمل کیے بغیر دنیا چھوڑ کر چلا گیا

کہانی کو مختصر کرنے کے لئے ، اندھے نچلے نفس کی رائے

ایک سال بعد شہزادے کو اس کی قبر پر لے گیا۔

جب بادشاہ روحانی جذب (سکر) سے صحت یاب ہونے کی طرف *لوٹ آیا (ساہو)*

اس کے مریخ جیسے غصے نے پہلے ہی خون بہایا تھا۔[87]

جب اس بے مثال نے اس کے تیروں کا مجموعہ دیکھا

اس نے ایک تیر غائب پایا۔

اس نے پوچھا کہ وہ تیر کہاں ہے اور خدا سے پوچھا

اس سے کہا گیا کہ جو اس پر حملہ کرتا ہے وہ تیرا تیر ہے۔

فیاض اور فیاض بادشاہ نے پہلے ہی اسے معاف کر دیا تھا

لیکن تیر پہلے ہی مار چکا تھا اور خون بہا چکا تھا۔

اس کا انتقال ہو گیا اور بادشاہ نے اس کی موت پر افسوس کا اظہار کیا

وہ سب کچھ ہے۔ وہ جان لیتا ہے، وہ [محافظ] دوست بھی ہے۔[88]

---

[87] جب بادشاہ گنوسس کے سمندر میں روحانی جذب کی اندرونی حالت سے واپس آیا تو اسے احساس ہوا کہ شہزادہ اپنے غصے کی وجہ سے مر گیا ہے۔ مریخ اپنی لالی کی وجہ سے غصے کی تمثیل کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ ایک نبی اور گنوسٹک کا غصہ ان کی طرف سے خدائی سزا کا سبب بن جاتا ہے۔ جب بادشاہ اپنی اندرونی حالت سے سنبھل گیا تو ، اس کا غصہ کم ہوگیا۔ وہ خدا کے پاس واپس آیا اور اس کے غصے کو کم کرنے کی وجہ سے اس سے التجا کی۔ اسے خدائی طور پر بتایا گیا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ انتقام اس کے غصے کی وجہ سے ہوا ہے۔

[88] شہزادہ مر گیا اور بادشاہ رونے لگا کیونکہ اگرچہ وہ اس کی موت کا سبب بن گیا ، پھر بھی وہ اس کا دوست ، اس کا مشیر ، اس کا سرپرست تھا اور شہزادے میں اندرونی تبدیلی لانے میں مدد کے لئے اپنی اندرونی روحانیت کا استعمال کرتا تھا۔

اگر دونوں موجود نہیں ہیں تو وہ سب کچھ نہیں ہے

وہ اپنی مخلوقات کا خاتمہ کرنے والا ہے اور وہ ان کے لئے ماتم کرنے والا بھی ہے۔[89]

وہ پیلا چہرہ شہید (شہزادہ) خدا کا شکر ادا کرتا تھا

کہ اس نے (بادشاہ) جسم پر مارا نہ کہ روح پر[90]۔

آخر میں بیرونی جسم [اپنے مقدر وقت] ختم ہونے کا پابند ہے

روح زندہ رہے گی اور کبھی نہ ختم ہونے والی ابدیت میں ہمیشہ کے لئے خوش رہے گی۔

اگر اس غصے پر عمل کیا جاتا تھا تو ، اس پر صرف جلد پر عمل کیا جاتا تھا

دوست بغیر کسی تکلیف اور تکلیف کے دوست کے پاس واپس آگیا۔

اگرچہ شہزادے نے بادشاہ کو روحانی راستے پر چلنے کا ذریعہ بنایا

بری آنکھ نے اس کا راستہ بند کر دیا [روحانی معراج کی طرف]۔

اور تیسرا شہزادہ اپنے دو بڑے بھائیوں کے مقابلے میں سست تھا

اس نے [کامیابی سے] [روحانی راستے کی ظاہری شکل اور باطنی معنی] دونوں کو حاصل کیا۔

شہزادی ، سلطنت ، حکومت ، اس نے ان سب کو لے لیا

یہ مناسب ہے کہ آپ اس سے حیران اور پریشان رہیں۔[91]

میں کہانی کی طوالت سے پریشان ہوں

میں گہرے روحانی معنوں کے سمندر میں ڈوب گیا ہوں، لیکن تم جلدی کرتے ہو۔[92]

اور اس وقت [نیچی نفس کی] ذلیل اور عاجزی اور [کامل روحانی مرشد سے] کی پاسداری کے ذریعے،

تیسرے شہزادے کو اپنا مقصد اسی مہربان سے ملا جو ہمارے کام کرتا ہے اور ہمیں اپنے مقاصد تک پہنچاتا [93]ہے۔

---

[89] خدا کا کمال اس وقت تک موجود نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس میں جانیں لینے اور ایک محافظ دوست اور مددگار ہونے کی دونوں خصوصیات نہ ہوں۔

[90] پرنس نے اپنی بعد کی زندگی میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کی غلطی کی سزا صرف اس کے جسم کو دی گئی ، اس کی روح اور ایمان کسی بھی انتقام سے محفوظ رہا۔ جسم صرف عارضی ہے جو ایک دن فنا ہونے والا ہے، اگر روح مر جاتی یا نقصان پہنچتی تو یہ مکمل تباہی ہوتی۔ جسم پر غصہ طاری ہو گیا تھا پھر اس کی روح روحوں کی روح میں واپس آ گئی۔

[91] تینوں شہزادوں میں سے سب سے چھوٹے نے سب سے بڑے بھائی کی طرح محبوب سے ملاقات کے حصول کی کوشش میں [روحانی راہ میں عجلت نہیں کی] اور نہ ہی اس نے درمیانی بھائی کی طرح کمال کا دعویٰ کیا۔

[92] رومی کہہ رہے ہیں: میں اس کہانی کی طوالت سے پریشان ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کہانی کا ہر حصہ مجھے اس حصے کے گہرے اندرونی معانی اور روحانی رازوں کی طرف بڑھاتا ہے ، اور میں اپنے آپ کو اس میں غرق پاتا ہوں۔

[93] صبر و استقامت کے ساتھ، روحانی کوشش، ذلت برداشت کرنے میں بردباری، مکمل عاجزی، حقیقی اخلاص، مقصد کی یکسانیت، حتمی مقصد پر توجہ مرکوز کرنے سے قطع نظر حالات کچھ بھی ہوں اور دیگر عظیم خوبیاں جو روحانی راہ کے طالب علموں اور مسافروں کے لیے ضروری ہیں، انہیں اپنے آخری مقصد تک پہنچانے کا سبب بنیں جہاں ان کے دوسرے دو بھائی اپنی روحانی جدوجہد میں خامیوں اور غلطیوں کی وجہ سے ناکام ہو گئے۔ آخر میں ، انہیں ان کی کوششوں کے لئے بھی خدائی طور پر قبول کیا گیا ، اگرچہ وہ خامیاں تھیں کیونکہ انہوں نے لڑکھڑانے سے پہلے اپنی پوری کوشش کی۔ سب سے کم عمر شہزادے نے خدائی قربت، قربت اور قبولیت کی دولت حاصل کی۔ یہ اعزاز صرف خدائی سخاوت اور سخاوت سے ہی ممکن ہے۔

رومی کی *مثنوی* کا خاتمہ - گہرے روحانی معانی کے اشعار[94]

میں صبر کو روحانی درجات پر چڑھنے کے لیے اپنی سیڑھی بناتا ہوں

تاکہ میں اپنی کوشش میں کامیابی کی بلندی تک پہنچ سکوں۔

ہر صبر کا حتمی نتیجہ کامیابی ہے

ہر تلخی کے بعد مٹھاس مل جاتی ہے۔

جب اس کی موجودگی میں میرے دل میں کچھ پیدا ہوتا ہے

کوئی آیات [شاعری] یا کوئی ایسی چیز جس کا دنیاوی معاملات سے کوئی تعلق نہ ہو۔

میں انہیں اس کی طرف سے بھیجے گئے سمجھتا ہوں

اس کے دل سے جو ایک چمکدار ستارے کی مانند ہے جو یمن میں نظر آتا ہے۔

میں اس کی عظمت اور تقدیس کے سامنے [عاجزی سے] اپنا سر جھکاتا ہوں

میں اپنے دل سے اس کا شکر گزار ہوں

میرے دل میں یہ بات اسی کی طرف سے ہے

کیونکہ ایک دل سے دوسرے دل تک ایک سوراخ ہے۔

اب جب میرے دل کی کھڑکی سے روحانی تحریک کا سورج غروب ہو گیا ہے

یہ (متھنوی) ختم ہو چکا ہے اور خدا بہتر جانتا [95]ہے۔

رومی کے بیٹے دی گنوسٹک ، کامل روحانی رہنما مولانا بہاء الملت کا اپنے والد سے گفتگو اور اس کی باتوں کی اطلاع دینے کے بعد ، متھنوی کا اختتام - گہرے روحانی معانی کے اشعار[96]

[94] رومی نے اچانک تیسرے شہزادے کی کہانی اور روحانی راستے کے ثمرات کا ادراک کیے بغیر ان آخری آیات کے ساتھ اپنے عظیم شاہکار کا اختتام کیا۔ اس نے پیش گوئی کی کہ اس کے بعد ایک زندہ روح آئے گی جو اس کہانی کو تین سست بھائیوں کے بارے میں ایک اور کہانی کے ساتھ مکمل کرے گی جن کے والد نے ایک جج کی دیکھ بھال میں وراثت چھوڑ دی تھی تاکہ یہ فیصلہ کیا جاسکے کہ سب سے زیادہ سست کون ہے اور اسے وراثت کے حوالے کرے گا۔

[95] میں روحانی غور و فکر کی حالت میں بیٹھوں گا اور الہٰی پر توجہ مرکوز کروں گا۔ میرے ذہن میں جو بھی خیالات آتے ہیں، اگر وہ دنیاوی خیالات نہیں ہیں، تو میں سمجھوں گا کہ وہ میرے دل میں الہامی طور پر بھیجے گئے ہیں۔ جب اس کے شعور کا عکس میرے دل پر پڑتا ہے تو میں اس کی عظمت اور تقدیس کا یقین کرتا ہوں اور اس کا شکر گزار ہو جاتا ہوں اور یہ سمجھتا ہوں کہ دل میں یہ خیالات اسی کی طرف سے آئے ہیں کیونکہ ایک دل سے دوسرے دل کی طرف ایک راستہ ہے [اگر وہ حقیقی محبت کی حالت میں جڑے ہوئے ہیں]۔ اس موقع پر اس "*متھنوی*" (گہرے روحانی معانی کے دوہیں) کے مضامین کی الہام کا سورج جو اس کی کھڑکی سے الٰہی حقیقت کی طرف کھلا ہوا تھا، اب غروب ہو گیا ہے اور یہ مضامین آنا بند ہو گئے ہیں۔ اس کے نتیجے میں، میں اس کتاب کو یہیں ختم کرتا ہوں اور خدا ہر چیز کے پیچھے اپنی حکمت کو جانتا ہے۔ رومی نے یہاں الہام الٰہی کو اس شاہکار کے ماخذ کے طور پر بے نقاب کیا ہے جو روحانی راہ پر چلنے اور اس کے نتیجے میں خدائی محبت کے حصول کے موضوع پر بہترین کتاب ہے۔ یہ قرآن مجید کے مفہوم اور پیغام کی بنیادی وضاحت بھی سمجھا جاتا ہے جو آنے والے زمانے میں پوری انسانیت کے لیے ہے۔

[96] مولانا کے بیٹے مولانا بہاء الملت (اصل نام بہاء الدین ولاد ہے) نے "*متھنوی*" کا یہ نتیجہ اس بات کی وضاحت کرنے کے لیے لکھا ہے کہ ان کے والد نے اس عظیم کتاب کو اچانک کیوں ختم کیا جبکہ تیسرے شہزادے کی کہانی کو ادھوری چھوڑ دیا۔ رومی نے اسے بتایا کہ اس کے

جب میرے والد (رومی) ایک طویل عرصے تک اس مثھنوی کے ساتھ رہے

میں نے خاموش رہے، میں نے اس سے کہا: اے زندہ جان!

کس وجہ سے آپ بات نہیں کر رہے؟

آپ نے خدا کی طرف سے آنے والے علم کا دروازہ اپنے دل میں کیوں بند کر دیا ہے؟

شہزادوں کی کہانی ختم نہیں ہوئی

تیسرے شہزادے کا موتی دھاگے سے باندھے بغیر رہا۔

رومی نے کہا: اس کے بعد میری بولنے کی صلاحیت اونٹ کی طرح سو گئی ہے

قیامت تک [متھنوی" *اور تینوں شہزادوں کی کہانی* پر کسی سے گفتگو نہیں ہوگی۔

اس کی وضاحت باقی ہے ، لیکن [میرے اندر] اندر

یہ بند ہو گیا ہے اور یہ باہر نہیں آتا۔

اس جگہ پر میری بولنے والی فیکلٹی اونٹ کی طرح سو گئی ہے

وہ فیکلٹی کہتی ہے: میں نے بولنے سے اپنا منہ بند کر دیا ہے۔

[اس دنیا سے] رخصت ہونے اور [ابدی زندگی کی] ندی میں کودنے کا وقت آ گیا ہے

اس کے وجود کے سوا سب کچھ فنا ہو رہا ہے اور ختم ہو رہا ہے۔

اس [کہانی] کا بقیہ حصہ زبان سے بات کیے بغیر آئے گا

ایک ایسے شخص کے دل میں جو ایک زندہ روح کا مالک ہے۔[97]

معاملہ ختم ہو گیا ہے اور میری زندگی بھی ختم ہو گئی ہے

[میرے محبوب کی طرف سے] جسم سے آزاد ہونے کی خوشخبری آئی ہے۔

میں روحوں کے دائرے کی وسعت تک پہنچ جاؤں گا

میں نمی کے اس قطرے سے گزر کر بے پناہ سمندر تک پہنچ جاؤں [98]گا۔

کیونکہ اس نمی کی وجہ سے یہ دنیا زندہ اور خوشگوار نظر آتی ہے۔

یہ نمی سمندر سے آئی ہے ، اسی وجہ سے ، یہ اچھا اور خوش ہے۔

جب روح مٹی اور گیلے پن کے درمیان زندہ ہے

پیچھے ایک زندہ روح آئے گی جو کہانی اور کتاب کو مکمل کرے گی۔

[97] یہیں سے رومی اپنے بیٹے کی پیشن گوئی کر رہا ہے کہ اس کے بعد کوئی آئے گا جو کہانی کو مکمل کرے گا اور اس طرح کتاب کو مکمل کرے گا۔ یہ کوئی ایسا شخص کرے گا جس کے پاس زندہ روح ہے، یعنی ایک روح جو خدائی حضوری اور علم کے ساتھ زندہ ہے۔ اس سے پہلے، رومی نے بھی حیرت انگیز طور پر پیش گوئی کی تھی کہ وہ اس عارضی دنیاوی قیام سے رخصت ہونے والے ہیں اور اپنے محبوب سے ابدی وجود میں ملنے کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔

[98] اب میں روحوں کے دائرے میں پہنچ جاؤں *گا*۔ اس سمندر کے مقابلے میں ہم جس مادی دائرے میں ہیں وہ نمی کا ایک قطرہ ہے اور اس میں روحوں کے دائرے کا اثر بہت کم ہے۔

غور کیجیے، سمندر کی دنیا میں یہ کیسا ہوگا؟[99]

سمندر ایک شہر کی مانند ہے اور نمی [اس شہر کے دروازے] کی مانند ہے

نمی کو ایک قطرہ سمجھیں اور سمندر بے حد اور لامحدود ہے۔[100]

اس نمی کے ذریعے جو زندگی کی طرح ہے، اندر آجائیں

محبوب کے سمندر میں تاکہ تم رزق حاصل کرو[101]

چونکہ اس طرف [دنیاوی وجود] سمندر سے نمی ہے

آپ اپنی روح کے ذریعے اس عظمت کو تلاش کرتے ہیں۔

دھول کے ذرے کا ہر حصہ کسی کو قبر میں لے جاتا ہے

روحوں کے سمندر سے نکلنے والی لہر، محبوب کے پاس لے جاتی [102]ہے۔

اپنے دل و جان سے محبوب سے ملاقات کی تلاش کرو

اللہ کا نام یاد کرو جس کی زبان اور ہونٹوں کے بغیر ہو۔

لہذا، آپ [جسم کی] اس قید اور اس عارضی دنیا سے آزادی حاصل کر سکتے ہیں

لہذا ، آپ ہمیشہ روحوں کے دائرے میں رہ سکتے ہیں۔

آپ کی زندگی کے بیج، بنجر زمین میں بوئے گئے

تیری طرف سے تاکہ آخر میں یہ تمہارا انجام ہو۔[103]

یہ قیمتی ، خوبصورت زندگی

آپ اسے [اچھے] معاوضے کے بغیر کیوں ضائع کرتے ہیں؟[104]

اے محنتی شخص! کیا تم نقصان برداشت نہیں کرو گے؟

جب آپ ایک باغ چھوڑ دیتے ہیں اور کانٹے دار زمین پر قبضہ کرتے ہیں؟

جب آپ اپنی محدود زندگی دیتے ہیں

اللہ کی راہ میں یہ لامحدود ہو جائے گا۔

بے شمار ، لامحدود اور بے شمار ہو جائے گا

10 دن کی زندگی جو ایشور کی غلامی میں گزرتی ہے۔

---

[99] یہ روح مٹی اور دھول اور مادی دائرے کی نمی کی تھوڑی مقدار کے درمیان زندہ ہے۔ کوئی اندازہ لگا سکتا ہے کہ روحوں کے دائرے میں اس کی زندگی کتنی عظیم ہوگی۔

[100] مادی دائرہ (جس دنیا میں ہم ہیں) ایک ایسے دروازے کی مانند ہے جو روحوں کے دائرے اور عالم *ملکوت کے شہروں کی طرف جاتا ہے*، اول الذکر ایک قطرے کی مانند ہے اور مؤخر الذکر دو سمندروں کی مانند ہیں۔

[101] روح کا وجود اور رزق کا دارومدار اس بات پر ہے کہ وہ محبوب کے سمندر میں ضم ہو جائے جس سے وہ آئی ہے۔

[102] خاک سے بنا انسانی جسم ایک قبر میں ختم ہو جاتا ہے۔ روح انسان کو محبوب (خدا) کی طرف لے جاتی ہے۔

[103] صرف جسم کی دیکھ بھال میں اپنی زندگی ضائع نہ کریں، ورنہ یہ آپ کی تباہی کا باعث بنے گا۔

[104] زندگی کا وہ حصہ جو اپنی ابدی ضروریات کا خیال رکھے بغیر صرف دنیاوی کاموں میں گزارا جاتا ہے وہ ضائع ہو گیا ہے۔ اگر دنیا کی محدود زندگی خدا کی تلاش میں صرف کی جائے تو یہ انسان کو ابدی ابدی زندگی کی طرف لے جاتی ہے۔

ہوشیار! اس بازار میں اپنی تجارت کریں

ایک کانٹے کے بدلے میں ، لاکھوں پھول لے جائیں۔

ایک بیج کے لئے جو تم بوتے ہو، تمہیں ملے گا

کروڑوں ہزاروں اناج، مہربان کے آشیرواد سے۔

گنتی صرف وہیں کی جاتی ہے جہاں اختتام ہوتا ہے

جس طرف خدا ہے ، یہ بے شمار ہے۔

اے علیحدگی والے حصے! اپنے پورے کی طرف جاؤ [جہاں سے تم آئے ہو]

انا کو عبور کریں اور خدا کی پناہ میں بھاگ جائیں۔

انسان کے اعمال اور باتوں سے

یہ واضح ہوجاتا ہے کہ روح کیسی ہے۔

روح کس روحانی درجے پر ہے، یہ کیا ہے؟

ایک مومن ، ایک کافر ، یا ایک گنوسٹک؟

سمندر کی مدد کے بغیر پانی کے کنٹینر میں پانی نہ رکھیں

تاکہ میٹھا پانی ناگوار نہ ہو۔[105]

ایک ساکت پانی ، بغیر کسی مدد کے ، خراب ہوجاتا ہے

اس کا اچھا رنگ، بو اور ذائقہ ختم ہو جاتا ہے.

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کے دو دن برابر ہوں

خسارے میں ہے اور شک میں ہے۔

اپنی حماقت میں ، میں یقین کے بغیر زندگی گزار رہا ہوں

ہوا سے بھرا ہوا خالی بیگ کی طرح[106]۔

اس کا غم ہر لمحہ بڑھتا جا رہا ہے

ہر لمحہ یہ بدتر اور کمزور ہوتا جا رہا ہے۔

جس نے خدا کی حضوری سے انکار کیا ، جہنم کی طرف جاتا ہے

سمندر کے میٹھے پانی کے بغیر ، یہ آگ اور سزا کی طرف بڑھتا ہے۔

اس سے پہلے کہ آپ کا معاملہ اس مقام پر پہنچ جائے [کوئی واپسی نہیں]

اور غفلت کی ہر سانس آپ کو پیچھے کی طرف چلنے پر مجبور کرتی ہے۔

---

[105] روح کے پانی کو روحوں کی روح کے سمندر سے جوڑنے کی ضرورت ہے، ورنہ اب بھی پانی ناگوار ہو جاتا ہے۔

[106] جس شخص کو ابدی حقیقتوں میں یقین نہیں ہوتا، وہ مسلسل روحانی راہ میں پیچھے ہٹتا رہتا ہے اور سمندر سے کوئی تعلق نہ ہونے کی وجہ سے اس کی روح کا پانی گندا ہو جاتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح اپنی اصل کی طرف لوٹ جاؤ

ستاروں اور نیلے آسمان کے اوپر سے گزریں۔

سورج اور چاند پر ہمت کا قدم رکھیں

اپنا سر اس دربار پر رکھ دو [خدا کی مرضی کے تابع ہونے کی حالت میں]۔

اپنی انا کو خدا کی خدمت پر خرچ کرو

تاکہ تم شیطان کی طرح جدا نہ ہو جاؤ

روحوں کے سمندر میں اپنی روح کا پانی خالی کر دو

تاکہ تم ایک بے پناہ سمندر بن جاؤ جس کا کنارہ نہ ہو

آئیے کہانی کو مختصر بنائیں کیونکہ میں پردے کے پیچھے چلا گیا ہوں [اپنی زندگی کے اختتام پر]

جی ہاں، خاموش رہو اور خدا بہتر جانتا ہے۔

خدا کا شکر ہے! یہ کتاب اپنے موضوع کے اختتام پر پہنچ چکی ہے

نقد رقم ضائع نہیں ہوئی ، اور یہ بھائیوں تک پہنچ گئی۔

یہ مجموعہ [متھنوی میں حکمت اور الہامی عرفان کی شاعری] جنت کی طرف ایک سیڑھی ہے

جو بھی اس پر چڑھنے کے لئے چڑھے گا ، وہ چھت پر پہنچے گا۔

آسمان کی چھت نہیں جو سبز ہو

اس کے بجائے ، یہ چھت ہے جو آسمان سے اونچی ہے۔[107]

آسمان کی یہ چھت خدا کی موجودگی سے اپنی پرورش پاتی ہے

اس کی دائمی گردش اس کی لامحدود محبت کو تلاش کرنے کی خواہش کی وجہ سے ہے۔[108]

رومی کی مثنوی کے اختتام کا آغاز - گہرے روحانی معانی کے دوہیں، جیسا کہ رومی نے پیش گوئی کی تھی کہ یہ ایک زندہ روح کے ذریعہ مکمل ہو جائے گی اور یہ مولانا الٰہی بخش کندہلوی نے کی ہے[109]

مولانا حسام الدین کی روحانیت کی شدت اور خواہش کی کشش[110]

---

[107] الہی حضور۔

[108] رومی کے بیٹے کی طرف سے "*متھنوی*" (گہرے روحانی معانی کے دوہیں) کا اختتام یہیں ختم ہوتا ہے۔ جیسا کہ رومی نے پیش گوئی کی ہے، اس عظیم کتاب کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک ہندوستانی گنوسٹک مولانا الٰہی بخش کانڈیہلوی نے مکمل کیا۔

[109] اس نقطہ نظر سے ، *متھنوی* کا اختتام مولانا الٰہی بخش کانڈیہلوی نے فراہم کیا ہے جس نے متنوی کی دو ادھوری کہانیوں کو بھی ختم *کیا* جو رومی نے ادھوری چھوڑ دی تھیں ، جس میں تینوں شہزادوں کی کہانی کا اختتام بھی شامل ہے۔

[110] مولانا ضیاء الحق حسام الدین رومی کے شاگرد تھے جو رومی کی زندگی میں ہی ایک کامل روحانی رہنما بن گئے۔ وہی تھے جنہوں نے رومی کو سب سے پہلے متنوی لکھنے پر آمادہ کیا اور وہ رومی کو لکھنا جاری رکھنے کے لیے کاغذات، قلم اور سیاہی فراہم کرتے تھے اور وہی تھے جنہوں نے اس عظیم شاہکار کو مرتب کیا اور اسے ہر دور تک پھیلایا۔ مولانا حسام الدین کی روحانیت کی تعریف کرتے ہوئے اور *مولانا* حسام الدین کی روحانیت کی تعریف کرتے ہوئے مولانا حسام الدین کی چھ جلدوں میں سے ہر ایک کا آغاز کیا ہے۔ مولانا الٰہی بخش کانڈیہلوی بھی مولانا حسام الدین کی روح کو مٹھنوی کے خاتمے کی تحریر کے پیچھے محرک قوت قرار دے رہے ہیں۔

مجھے [متھنوی کا] نتیجہ [لکھنے] کی طرف کھینچ رہا ہے۔
"گہرے روحانی معانی کے دوہیں" کو انجام کی طرف بڑھانا
روح کو سیدھے راستے کی طرف کھینچ رہا ہے۔
[شاعری] اشعار [میری طرف سے کسی شعوری کوشش کے بغیر] ہونٹوں سے غیر محسوس طور پر گر رہے ہیں
اے حسام الدین! آپ جو چاہیں کرو۔
چونکہ میری عقل کی باگ ڈور تیرے ہاتھ میں ہے
اسے جہاں چاہو کھینچیں، میری روح تمہارے نشے میں ہے۔
جب سورج کا عکس کسی پانی پر پڑا
پانی نے اس زبردست تحفے کے لئے سورج کا شکریہ ادا کیا۔
مولانا جلال الدین رومی کی روح
جو علم کا سمندر اور گنوسس کا چاند ہے۔
جب اس نے میرے دل کے کوہ سینا پر اپنا عکس ڈالا
خاک اور پانی سے بنا میرا جسم روشن ہو گیا۔
ہر لمحہ اونچے آسمان کا وہ چاند
میرے دل کے دروازے کو اشارہ کرتا ہے کہ اب۔
متھنوی کا اختتام شروع کریں
میرا مہر بند لفافہ کھولو۔
وہ کہانی کہو جو بغیر کہے [ادھوری] رہ گئی
وہ موتی جو دھاگے سے باندھے بغیر باقی رہ گیا تھا۔
جلدی سے اسے دھاگے میں باندھ دیں
ہمارا روحانی تعلق یقینا آپ تک پہنچے گا۔
چونکہ میں نے اپنی روحانی ڈگری نہیں دیکھی، اس لیے میں خاموش رہا
میں نے اپنا سر اس کے دروازے پر رکھ دیا۔
چونکہ بادشاہ کا حکم توڑنا موتی توڑنے سے زیادہ مشکل ہے
میں نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اس کے حکم کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا۔
...

تیسرے شہزادے کی حالت کی داستان جس نے اپنے دوسرے بھائی کی موت کے بعد بادشاہ کی قربت، قربت اور عرفان حاصل کی

چلو دوسری چیز کو پیچھے چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ تیسرا شہزادہ
جب اس کے دوسرے بھائی کی موت کی خبر سنی۔
بادشاہ کے شاہی دربار میں آیا
محبوب کے لیے درد کی حالت میں، شدید خواہش کے ساتھ ایک متلاشی کے طور پر۔
پروٹوکول کے طور پر ، تعارف کرانے والے نے [بادشاہ سے] کہا:
یہ تیسرا بھائی آپ کی رحمت کا زیادہ مستحق ہے۔
تمہاری محبت میں اس کے دونوں بازو کمزور ہو گئے ہیں
اس کی شکست پر پٹی کی ضرورت ہے۔
بادشاہ نے اس پر رحم کیا اور اسے باہر آنے کو کہا
شاہی مہربانی کے ساتھ اسے تخت پر اس کے پاس بیٹھنے کو کہا۔
اگرچہ وہ روحانی الہام کے ذریعے شہزادے کی [باطنی] حالت کو جانتا تھا
عجیب و غریب انداز میں ، اس سے اس کی حالت پوچھتی رہی۔
اس کی مہربانی سے ، اسے بہت تسلی دی
کہ اس نے اس درد اور غم کو اپنی روح سے دور کر دیا۔
اس نے اپنے مردہ بھائی کو دفن کر دیا
اپنی روح کو زندہ سے جوڑا۔
کچھ دنوں کے بعد شاہی کمپنی زوروں پر تھی
بادشاہ کا دل اس پر نرم ہو گیا۔
اس نے تمام بڑے چھوٹے خزانے اس کے حوالے کر دیے
اس کے لئے شاہی مہمان نوازی کھول دی۔
روح عطا کرنے والے بادشاہ کی سخاوت کے سمندر کی فراخدلی سے
اس کے دل کی کلی کھلنے لگی۔
اس کے دل میں بہت سے [روحانی] راز جمع تھے
وہ اپنے دوسرے بھائی کی طرح روشنی کا مجسمہ بن گیا۔
الٰہی قربت اور گنوسس کے مراحل پر
اس کی ڈگری میں اس کے دوسرے بھائی سے زیادہ اضافہ ہوا۔
وہ روحانی طور پر جدوجہد کرتے تھے اور روحانی راستے پر چلتے تھے
وہ [مخلص] کوشش کرتے تھے اور ان کے اندر کی روشنی مسلسل بڑھتی جا رہی تھی۔

لیکن اس نے خود ایک سبق سیکھا

اس نے اپنے دونوں بڑے بھائیوں کا مشورہ قبول کیا۔

وہ روحانی راستے کی گھاٹیوں سے بخوبی واقف ہو چکا تھا

وہ بہت احتیاط اور احتیاط برتتے تھے اور بہت خوش مزاج تھے۔

اس نے دیکھا کہ پہلے بھائی نے جلد بازی کی وجہ سے اپنی جان قربان کر دی

اور دوسرے کو خود غرور، خود غرضی اور انا پرستی کی وجہ سے اس کی قبر پر بھیج دیا گیا۔

انسان کو محبوب کی راہ پر چلنا چاہیے

آہستہ آہستہ ، صبر اور بردباری سے کوشش کریں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اے نوجوان! نرم، سست، بتدریج اور صبر کرنے والا نقطہ نظر حکمت کی جڑ ہے۔

ابن مسعود نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے:

اے پرہیزگار! صبر آدھا ایمان ہے۔

ورنہ محبوب کی خوبصورتی مکمل روشنی ہے

دل کی آنکھ اس کی خوبصورتی میں بکھر جاتی ہے۔

آپ اچانک خدائی بصیرت کو برداشت کرنے کے قابل نہیں ہیں

اپنے دل کے آئینے کو آہستہ آہستہ پالش کر دو تاکہ جہالت، غفلت اور برائی کی تمام دھول کو مٹا دیں اور اسے اپنے باطنی کردار اور وجود کی خوبصورتی سے چمکائیں۔

یہ بتدریج نقطہ نظر کسی کی روحانی صلاحیت کو بڑھانے کے لئے ہے

اس کی بے نقاب خوبصورتی نے اپنا دروازہ کب بند کیا؟

محبوب آسمان کے بیچ میں سورج کی مانند ہے

لیکن اے چمگادڑ! (سورج کو دیکھنے کے لیے) تمہاری آنکھ کہاں ہے؟

جاؤ، پہلے اپنی آنکھ کو جنم دو

پھر اسے محبوب کی طرف کھول دو۔

ورنہ آپ اس کی شاندار روشنی اور چمک کو برداشت نہیں کر پائیں گے

اس کا سورج آپ کے ستارے کو غروب کرے گا۔

آپ یا تو مر جائیں گے یا پاگل ہوجائیں گے ، مکمل طور پر اپنا دماغ کھو دیں گے

یہی وجہ ہے کہ بہت سے *لوگ مجذوب* بن گئے ہیں (وہ لوگ جو پہلے اس کو برداشت کرنے کی اپنی روحانی صلاحیت پیدا کیے بغیر جمال الٰہی کو دیکھ کر اپنا دماغ کھو چکے ہیں)۔

تنکا پہاڑ کا وزن برداشت نہیں کر سکتا

اس غم اور غم کے ل you ، آپ کو کسی ایسے شخص کی ضرورت ہے جس نے روحانی کمال حاصل کیا ہو۔
اس کے پہلے بھائی نے جلدی کی
اس نے خوف اور جھنجھلاہٹ کی حالت میں محبوب سے بے نقاب ملاقات حاصل کی۔
چونکہ محبوب سے خالص ملاقات اس کے لیے موزوں نہیں تھی
وہ کانپنے لگا ، ٹوٹ گیا اور مر گیا۔
جب تک جسم کا یہ پردہ نہ ہٹا دیا جائے
محبوب کے ساتھ بے نقاب شدہ ملاقات کب مل سکتی ہے؟
لیکن جب شدید محبت کا شیر اچانک بھاگتا ہے
عاشق کچے گوشت کی طرح اس کا شکار ہو جاتا ہے۔
شدید محبت کی پریشانی انسان کو جلدی کرنے کا سبب بنتی ہے
سمندر کی تہہ میں ایک خول کی طرح، کوئی [بارش] کے قطرے کے لیے منہ کھولتا ہے۔
لیکن بارش سے پہلے منہ کھولنا
درد اور مشکلات کے سوا کچھ حاصل نہیں کرتا۔
ایک ایسی عورت جس کو حیض نہ ہو اور بلوغت کو نہ پہنچا ہو
[افزائش کے لیے] نطفہ کو گھیرنے سے قاصر ہے۔

تیسرے شہزادے کی حالت اور اس کے ظاہری اور باطنی کمالات تک پہنچنے اور اس کی ضرورت کے اظہار اور اپنے مقصد تک پہنچنے میں صبر سے کام لینا

اور وہ تیسری قیمت سو احتیاطی تدابیر اور صبر کے ذریعے
گنوسس کے سمندر سے بارش کے بادلوں کی طرح نکلتا تھا۔
ہر رات بادشاہ کی روحانی صحبت کے ذریعے
ہر صبح خدا کی وحدانیت کی روشنیاں اس کے دل میں دوڑتی تھیں۔
روحانی صلاحیت کا حصول اور حکمت کا جوش و خروش
بادشاہ کی صحبت کی وجہ سے ہر لمحہ اس کے لیے نمودار ہوا۔
ہر وقت اس کے دل میں چاند کی سمت سے بادشاہ کی طرح
صبح شام اس کے دل پر نئی روشنی نازل ہوئی۔
اس نے اپنے مقصد کے علاوہ کسی اور چیز کے لیے سانس بھی نہیں لی
اس نے مہربان بادشاہ کے دل میں ایک چنگاری برقرار رکھی۔
ایسا بادشاہ جو مہربانی اور سخاوت سے بھرا ہوا ہو

میں اپنی ضرورت کا لفظ بھی اس کے سامنے کیوں لاؤں؟
ان کا احسان بغیر پوچھے بھی بے شمار آشیرواد دیتا ہے
میرا دل پوچھنے کے لئے چھلانگ لگانے کی ہمت کیسے کرے گا؟
ہمارا بادشاہ ایک صاف پالش آئینے کے دل کی طرح ہے
بادشاہ کے دل میں میرے لئے خطرے کی جگہ بھی ہے۔
اگر میں واقعی اس قیمتی موتی کا مستحق ہوں
اپنے احسان سے بادشاہ مجھے عطا کرے گا۔
اس کی مہربانی روحانی صلاحیت کے حامل ہر شخص کو عطا کرتی ہے
بے شک یہ کسی کے باطنی روحانی حالت کے مطابق ہے۔
کوئی بھی شخص جس کے پاس صلاحیت اور اہلیت ہے
بادشاہ کی طرف سے ایک شاہی عطیہ بغیر پوچھے آتا ہے۔
وہ بادشاہ جس پر سوئی کا سر بھی پوشیدہ نہیں ہے
مجھے اپنے مقصد کے حصول کے لئے مختلف راستوں پر کیوں دوڑنا چاہئے؟
میں اپنی فضول چیز اس کے سامنے کیوں پیش کروں؟
میں اس کے سامنے اپنی ضرورت کیوں ظاہر کروں؟
ہمارا بادشاہ روشن ، باشعور اور باشعور ہے
آخر میں وہ دل کی خواہشات کو پورا کرتا ہے۔
اے دل! صبر کریں کیونکہ یہ خوشی کی کلید ہے
اس میں بہت سے سکون اور خوشیاں ہیں۔
ایک دن بادشاہ نے کہا: اے مہربان روح!
آپ صبر و تحمل کا سمندر اور احسان کی کان ہیں۔
میں سلطنت اور سلطنت کی اپنی ذمہ داریوں سے پریشان ہوں
میرا دل واقعی وحدت کے بلند عرش سے جڑا ہوا ہے۔
میرا جانشین بنیں اور [سلطنت کا] کام کریں
تاکہ میں ان چیزوں سے چھٹکارا حاصل کر سکوں جو میرے دل کو پریشان کر رہی ہیں۔
میں تنہائی میں جانا چاہتا ہوں
میں گفتگو سے خاموش ہونا چاہتا ہوں۔
میرا دل پریشانیوں سے خالی ہو جائے گا

یہ الٰہی روشنیوں کا مظہر بن جائے گا۔

غور و فکر کا ایک لمحہ عبادت کے ایک سال کے قابل ہے

یہ غور و فکر الٰہی حسن میں حیرت ہے۔

جب شہزادے نے یہ بات سنی

بادشاہ کے احترام کے آداب کی وجہ سے ، اس نے اپنا سر اپنے پیروں پر رکھ دیا۔

خدا نہ کرے! ہوسکتا ہے کہ کوئی وقت نہ آئے جب آپ حکمرانی چھوڑ دیں

یا کسی ویران کمرے میں تنہائی اختیار کریں۔

میرے سر پر تیرا سایہ ہو

قیامت تک پردے میں رہو

اے اللہ! میری زندگی اتنی زیادہ نہ ہونے دو

کہ میں بادشاہ کے دور حکومت کا خاتمہ دیکھ رہا ہوں۔

ان خطوط پر بہت سی بات چیت ہوئی

لیکن بادشاہ شہزادے کا امتحان لے کر [سچائی] کی تلاش کر رہا تھا۔

یہ دیکھنے کے لئے کہ آیا اس کے دل میں شہرت اور طاقت کی کوئی خواہش ہے یا نہیں

یا بادشاہ کی طرح سلطنت اور تسلط کی شان و شوکت

کیا دل میں کوئی تکبر اور غرور ہے؟

یا اس کا باطن خدا کی تڑپ کی شراب میں مست ہے؟

بادشاہ نے دیکھا کہ شہزادے نے اس کے دماغ میں کوئی خیال نہیں پکایا

اس کے درخت میں اطاعت اور اخلاص کے پھلوں کے سوا کچھ نہیں پکتا تھا۔

چاہے وہ حیثیت اور تسلط سے محبت ، لالچ اور خواہش ہو

اس کے دماغ میں ، محبوب کی تڑپ کے سوا کوئی راستہ نہیں ملا۔

خدا اور اس کے خاص بندوں سے محبت کے علاوہ

اس کے دل میں کسی اور چیز کے لئے کوئی راستہ نہیں ہے۔

بادشاہ نے روحانی راستے کے تقاضوں کے مطابق اپنی اندرونی حالتیں پائیں

اس نے اپنے ہر قدم کو خدائی شریعت کی شاہراہ پر پایا۔

اس کے دل میں سلطنت کی طرف کوئی جھکاؤ نہیں ہے

وہ سمندر کا متلاشی ہے اور کشتی کا پابند نہیں ہے۔

اس نے امتحان کے مختلف پیمانے پر اسے بہت آزمایا

وہاں خالص سونے کے سوا کچھ نہیں تھا۔
بادشاہ نے اپنے ساتھیوں اور مددگاروں سے کہا کہ یہ نوجوان
لڑکی کی طرح روح کے سوا کسی اور چیز کا مستحق نہیں ہے۔
چاند کا سورج کے ساتھ جوڑنا بہتر ہے
جسم کا روح سے تعلق بہتر ہے۔
وہ اور وہ دونوں ایک دوسرے کے مستحق اور مطابقت پذیر ہیں
ان میں سے ہر ایک اپنے ساتھیوں سے افضل ہے۔
ایسی عورت ایسے مرد کے لئے موزوں ہے
اس طرح کا زیور اس انگوٹھی کے لیے موزوں ہے۔
[بادشاہ کے] تمام لوگوں نے اس رائے کی تعریف کی
ان سب نے کہا: براہ مہربانی جلدی کریں، یہ ایک بہترین موقع ہے.
بادشاہ نے حکم دیا اور انہوں نے ایک خوبصورت اجتماع کا اہتمام کیا
شادی کا ایک عمدہ اجتماع ترتیب دیا گیا تھا۔
دونوں کا ایک دل اور روح ایک دوسرے کے ابدی خواہش مند ہیں
ان کے رشتوں کو جائز بنانے کی قبولیت کی قسمیں پوری ہوئیں۔
ان کا بابرکت اتحاد ہوا
روح سے روح اور دل سے دل جڑ گیا۔
بتدریج استقامت کے ساتھ دونوں جہانوں کے معاملات درست رہتے ہیں
کیونکہ جلد بازی شیطان سے پیدا ہوتی ہے۔
اللہ تعالیٰ نے صبر کو تمام معاملات کے لیے عزم کا ذریعہ قرار دیا ہے
اس میں کوئی شک نہیں کہ صبر کرنے والا اپنی خواہشات کو پورا کرتا ہے۔
جس نے مصیبت برداشت کی اس نے خزانہ بھی حاصل کیا
جو سست ہو گیا وہ بھی مصیبت میں مر گیا۔
لیکن سست کے بارے میں ، دنیا کے لئے سست بہتر ہے
دنیاوی معاملات میں جلد بازی بری ہے۔
صبر کرو، دنیا اس کے حوالے کر دو
وہ آپ سے بہتر جانتا ہے کہ آپ کے لئے کیا اچھا اور برا ہے۔
دنیا کے لیے سست راہ الٰہی پر سرگرم ہے

شہزادے کی طرح جو تیسرا ہے۔

تینوں شہزادوں کے قصے کی تفسیر اور معانی کی تفصیل اور اس کی تشریح اور اس کو *عرفان / معرفہ* کے درجات سے جوڑنا - قربت، قربت اور علم کی کیفیت جو زندگی کے حقیقی مقصد کے حصول اور اس کے نتیجے میں ابدی خوشی اور لامتناہی فتح کا باعث بنتی ہے۔

اس کہانی سے مکمل سبق حاصل کریں

تاکہ آپ اس کہانی سے پوری طرح سے فائدہ اٹھا سکیں۔

انسانوں کو وہ کام کرنا چاہیے جو انہیں کرنا چاہیے

انہیں کہانیوں پر انحصار نہیں کرنا چاہئے۔

آپ نے کہانیوں میں اپنی پوری زندگی ضائع کر دی ہے

صبح قریب ہے، اپنی نیند سے جاگ جاؤ۔

بڑھاپے کی صبح آ گئی ہے اور رخصت ہونے کا وقت آ گیا ہے

ایسی کہانیوں میں ملوث نہ ہوں [جو آپ کو کہیں بھی یا کچھ بھی نہیں ملتے ہیں]۔

وہ کام کریں جو [آپ کے ابدیت کے سفر میں] راستے کے لئے ایک فراہمی کا کام کرے گا

وہ کرو جو تمہاری قبر میں چاند کی مانند روشن ہو گا۔

شام ہو چکی ہے اور سورج غروب ہو چکا ہے

اب دیر ہو چکی ہے، جلدی سے اپنے گھر واپس چلے جاؤ۔

طویل عرصے سے آپ نے روٹی اور مٹھائیاں کھائی ہیں

کیا آپ نے اس سے اپنے باطن میں کوئی خزانہ دیکھا ہے؟

آپ نے اپنے نچلے نفس کو اٹھایا اور یہ ایک بیل بن گیا

آپ نے اپنی آخری منزل کی طرف کب قدم اٹھایا ہے؟

لہذا اب اپنی ناگزیر روانگی کی تیاری کریں

مادی دائرے سے ، داخلی حقیقت کی طرف جائیں۔

وہی کھائیں جو آپ کے دل کی روشنی میں اضافہ کرے گا

اس سے دوسری دنیا کی طرف آپ کی کھڑکی کھل جائے گی۔

تمہاری قیمتی زندگی کاہلی میں ختم ہو گئی ہے

کچھ دن رہ گئے پھر تم غافل ہو گئے

جو کچھ بھی ہوا ہے، آپ اب بھی دوست کے پاس آ سکتے ہیں

دوست کی گلی میں تیزی سے اپنے قدم اٹھائیں۔

جو کچھ باقی رہ گیا ہے، اسے ضائع نہ ہونے دیں
یہاں تک کہ اگر آپ کو اپنے سر پر چلنا ہے تو ، اپنا سر محبوب کے پاؤں پر رکھیں۔
اے تم! چاہے تم سو برس تک اس کی نافرمانی کرو
اگر آپ اس پر دستک دیتے ہیں تو دروازہ اب بھی کھلا ہے۔
روح کیا ہے؟ یہ ایک پرندہ ہے جس میں مقدس اعلیٰ خصوصیات ہیں
اسے [جسم کے] پنجرے میں بند کر دیا جاتا ہے تاکہ گنوسس (خدا کے ساتھ قربت) حاصل کی جا سکے۔
روح کیا ہے؟ یہ مقدس [الہی] نسب کا ایک پرندہ ہے
یہ کمانے کی خاطر جیل کے اندر ہے۔
طوطا پڑھانے کی خاطر پنجرے میں ہے
لہٰذا ، یہ میٹھی آواز میں سیٹی بجانا سیکھ سکتا ہے۔
روح تجارت کی خاطر عدم سے آئی ہے
اس کی سمت ہر وقت ابدیت کی طرف ہوتی ہے۔
تربیت کے معاملے میں تمہارا نچلا نفس [تینوں شہزادوں کے] باپ کی طرح ہے
یہ آپ کو اس ذہن اڑانے والے قلعے میں جانے سے روکتا ہے۔
نیچی نفس جو برائی کی طرف مائل ہے، وہ آپ کو گناہوں کی طرف چلنے پر مجبور کرتا ہے
یہ آپ کو برائی، کفر اور بغاوت کی طرف بلاتا ہے۔
یہ آپ کو تصاویر سے بھرے ہوئے قلعے میں داخل ہونے سے روکتا ہے
کیونکہ یہ دنیاوی عقل کو مٹا دیتا ہے۔
یہ قلعہ پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی راہ کی تقدیس سے بھرا ہوا ہے
زندگی میں سیکھے گئے اسباق کی وجہ سے مادہ پرست ذہنیت کے لیے یہ ذہن کو اڑانے والا ہے۔
اس قلعے میں بادشاہ اور اس کی بیٹی کی تصویریں ہیں
اس میں آسمانی صحابہ، جنت اور خوبصورت محبت کا ذکر ہے۔
چونکہ "ہم نے بڑی آنکھوں والے آسمانی ساتھیوں کو نکاح کیا ہے" کا اعلان الٰہی طور پر کیا گیا ہے
دل کا موتی لالچ کی ڈور سے باندھ دیا گیا ہے۔
چونکہ انسان ازل میں پیدا ہوا ہے
[وہ مائل ہیں] منافع کمانے اور تمام نقصانات کو دور کرنے کی طرف [ان کی فطرت سے]۔
یہی وجہ ہے کہ ، الہی قانون کے محل میں
انسانوں کو خواہش اور خوف دونوں پیدا کرنے کے لئے تصاویر بنائی گئی ہیں۔

بعض اوقات لوگوں کو لالچ کی وجہ سے راہ پر چلنے پر مجبور کیا جاتا ہے [مختلف انعامات جیسے جنت، آسمانی نعمتیں اور صحابہ، سلطنت وغیرہ]۔

بعض اوقات انہیں جہنم کی کھائی سے ڈرایا جاتا ہے۔

باغی نچلے نفس، خوف کے وسیلے سے

زبردستی بادشاہ کے پاس لے جایا جاتا ہے۔

تاکہ وہ نفس جو خوشی یا زبردستی برائی کی طرف مائل ہو

بادشاہ اور اس کی بیٹی کا عادی ہو جاتا ہے۔

لیکن تینوں شہزادوں کی طرح ، دوسرے لفظوں میں ، انسان

اے دیکھنے والے آنکھوں والے! روحانی راستے کے لحاظ سے تین قسم کے ہیں۔

ایک وہ شخص ہے جو اپنی روح پر ظلم کرتا ہے ، دوسرا [سپیکٹرم کے دو سروں میں] بیچ میں ہوتا ہے

تیسرا وہ شخص ہے جسے نیکی اور نیک اعمال میں سب سے آگے بننے کی کوشش کی گئی ہو۔

پہلے شہزادے نے اپنی جان تباہ کر دی

وہ اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔

[شدید محبت کی] گرمی کی وجہ سے اس کی زندگی کا موتی ہاتھ سے نکل گیا

انہوں نے روحانی جدوجہد اور علم کے صحیح راستے کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

لیکن بادشاہ کی مہربانی نے اس کی مدد کی اور

[آخر میں] وہ [اپنی زندگی ختم ہونے کے بعد] خدا کے قبول شدہ لوگوں میں سے ایک بن گیا اور یہ حیرت انگیز ہے۔

جو اس کے لیے زندگی دیتا ہے وہ اسے اس کی طرف سے زندہ کرتا ہے

جو ایک زمرد دیتا ہے، اسے پوری کان [زمرد سے بھری ہوئی ہے]۔

وہ شعلوں سے پتنگوں کی طرح جل گیا

وہ ایک پاگل کی طرح کنویں میں گر گیا تھا۔

محبت کی جنگ میں بہادروں کی ضرورت ہوتی ہے

تاکہ انسان اپنی استطاعت کے مطابق محبت سے پورا ہو۔

اگر دوست مرنے کے ذریعے مل سکتا ہے

اللہ تعالیٰ کا راستہ بہت آسان ہوتا۔

[الہامی] محبت میں، ہر لمحہ، موت کی مختلف قسم ہوتی ہے

جس کی تلخی کے ساتھ موت کو سو خطرات محسوس ہوتے ہیں۔

دوسرے شہزادے نے روحانی کوشش اور کوشش کی

لیکن تکبر اور اندرونی انتشار میں الجھ گئے۔

اس نے اپنے آپ کو سورج (کامل روحانی رہنما) کا شریک بنایا

میں نے دعویٰ کرنا شروع کیا، "میں سچ ہوں"۔

اس کے بعد اس نے سڑک کی رکاوٹ کو نشانہ بنایا

موت کی منزل اس کے سامنے آئی۔

وہ اس راستے کی کمال کی وجہ سے رک گئے [جو کسی کو باطنی برائیوں کے ساتھ آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دیتا]

وہ اب بھی راستے کی خوبصورتی سے ایک ڈرافٹ پی رہا تھا۔

بادشاہ کی مہربانی نے اس کی روح کو خدائی طور پر قبول کیا [کیونکہ وہ اب بھی غلطیاں کرنے تک اس راستے پر جدوجہد کرتا رہا]

اس نے پھر بھی محبوب سے ملاقات کی [اس کی دنیاوی زندگی ختم ہونے کے بعد]۔

یہ اس کی صلاحیت یا کسی حق کی وجہ سے نہیں تھا

یہ سب بادشاہ کی مہربانی اور احسان تھا جو سب کا خالق ہے۔

اور تیسری قیمت سب سے آگے تھی [اس کی روحانی جدوجہد میں]

وہ اپنے دو بڑے بھائیوں سے آگے نکل گیا۔

وہ گنوسس کے راستے سے واقف ہو گیا

وہ بادشاہ کی حقیقت کا ساتھی بن گیا۔

انہوں نے روحانی کوششیں کیں، ان کے پاس علم الوہی پہنچا

ہر لمحہ الٰہی قربت بڑھتی جا رہی تھی۔

چونکہ اہل ایمان ، جب مراعات دی جاتی ہیں تو راستے پر چلتے ہیں

وہ اپنی بیٹی سے محبت کی وجہ سے بادشاہ کی طرف بھاگتے ہیں۔

لیکن جب ان کی نظریں خود بادشاہ پر پڑتی ہیں تو انہیں اپنی حماقت کا احساس ہوتا ہے

اس کے بعد انہوں نے چھپی ہوئی بیٹی کے لئے اپنی محبت کو بادشاہ کے لئے اپنی محبت کے تابع کردیا۔

چونکہ بادشاہ نے اس میں مکمل [روحانی] صلاحیت دیکھی [راہ کے کمالات تک پہنچنے کے لحاظ سے]

اس علم کے ساتھ بیٹی کو شادی میں دے دیا۔

اگرچہ دوسرے دو شہزادوں کو خدائی سخاوت نے قبول کر لیا

لیکن اس کے سامنے وہ [روحانی] ڈگری اور الٰہی قربت کی سطح کہاں تھی جو سب سے چھوٹے شہزادے کو ملی تھی؟

نامکمل لوگوں کو بادشاہ نے بھی عزت دی جب اس نے انہیں اپنے تخت پر بٹھایا

اس نے انہیں اپنا کہا اور ان پر دولت کی بارش کی۔

بوڑھا شہزادہ خود اپنی کوتاہیوں پر شرمندہ ہے

وہ تخت پر بیٹھ کر اداس اور شرمندہ ہے۔
اپنی غلطیوں اور غلطیوں کی وجہ سے اس کے دل میں کانٹے ہیں
وہ اپنی خامیوں کی وجہ سے درد برداشت کر رہے ہیں۔
یہی وجہ ہے کہ سب سے افضل مخلوق (پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:
جنت میں کوئی غم نہیں ہے، سوائے غفلت کے [الٰہی کی یاد سے اور راہ الٰہی پر چلنے میں]۔
اگر گنہگاروں کو جنت میں جانے کا راستہ فراہم کیا جائے
اگر انہیں شاہی قلعہ اور لباس دیا جائے۔
وہ اپنے بدصورت پیروں کو اور مور کی طرح دیکھتے ہیں
[پچھتاوے میں] سر جھکا کر شرمندہ ہیں۔
بدصورت شخص کے لئے شیشے کے محل کا کیا فائدہ ہے؟
ایسے شخص کے لئے ، ہر جگہ ایک حسد کا آئینہ ہے [کسی کو اپنی بدصورتی کی حقیقت دکھانے کے لئے]۔
اے چچا! اس معاملے کی کوئی انتہا نہیں ہے
ہمیں اس بادشاہ کی کہانی سنائیں جو [تینوں شہزادوں] میں شامل ہوا۔

اس بادشاہ کی روایت جس نے اپنی سلطنت کو پیچھے چھوڑ کر اپنے سفر میں شامل ہونے والے تینوں شہزادوں میں شامل ہو گیا

اے ضیاء الحق حسام الدین حسن!
مجھے [کہانی کے چوتھے شخص] یعنی بادشاہ کا حال سناؤ۔
جب وہ کوئی ایسا شخص بن گیا جس نے اپنی سلطنت سے دستبردار ہو گیا
وہ غربت کی حالت میں شہزادوں کے ساتھ رہا۔
اس نے اپنی سلطنت کو پیچھے چھوڑ دیا اور [ان کی اہم جدوجہد میں] ان کا ساتھی بن گیا
وہ ان کی صحبت میں ان کے ساتھ راستے پر چل رہا تھا۔
وہ متحد ہو کر ان کی خدمت کرنے میں سرگرم تھے
ہر طرح کی منافقت سے پاک دل کے ساتھ
ان کی [خدائی] محبت کا عکس [اس کی روح پر] اسے مسحور کر رہا تھا
ان کے سفر میں ، اس نے تینوں [شہزادوں] کے ساتھ یکجہتی کا مظاہرہ کیا۔
شدید محبت کے اس طرح کے بہت سے اثرات ہوتے ہیں

وہ ایک ایسے دل کی زنجیریں ہیں جس میں آزادی ہے۔

ایک عاشق کی صحبت ، آپ کو عاشق بناتی ہے

گنہگار کی صحبت آپ کو گنہگار بناتی ہے۔

ہر انسان دوسرے سے اخلاق اور کردار حاصل کرتا ہے

ایک کینٹالوپ اپنی [میٹھی] خوشبو دوسرے کینٹالوپ سے حاصل کرتا ہے۔

[کسی دوسرے شخص] کی صحبت کے اثر و رسوخ کا انکار کرنے والا بے وقوف ہے

جو شخص کسی اچھی کمپنی سے بھاگتا ہے وہ غفلت کرتا ہے۔

ایک کینٹالوپ دوسرے کینٹالوپ سے اپنا رنگ پکڑتا ہے

کسی دوسرے انسان کی صحبت کا اثر کیوں نہیں پڑے گا؟

وہ کتا غار کے لوگوں کا ساتھی بن گیا

جب تک کہ کتے کی خصوصیات اسے مکمل طور پر چھوڑ نہ دیں۔

خدا پرست لوگوں کے قدموں کی خاک بن جاؤ

تاکہ تم ان کے چاند سے روشنی حاصل کرو [جیسے روشن باطنی صفات]۔

چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اور مومن کے سوا کسی اور کا دوست نہ بناؤ۔

خوشبو کنٹینر کو خوشبودار بناتی ہے

کھاد زمین کو بدبو دیتی ہے۔

جب تیل پھولوں پر خرچ ہوتا ہے

یہ پھولوں کی خوشبو کا کنٹینر بن گیا۔

وہ بادشاہ شہزادوں کے ساتھ تھا۔

جب تینوں بھائیوں میں سے دو نے اپنی جانیں قربان کیں۔

وہ تیسرے کا ساتھی بن گیا۔

وہ ہر وقت ایک سچے عقیدت مند کی طرح ان کے سامنے موجود تھے۔

جب تیسرا چین کے بادشاہ کا داماد بن گیا۔

وہ ان کی خاص اشرافیہ میں شامل تھے۔

جب چین کے بادشاہ نے اس کی بے پناہ محبت اور عقیدت دیکھی

اور اپنے محبوب کے ساتھ اس کی خصوصی رفاقت۔

اس نے ان دونوں کو ایک روح اور دو لاشیں پائیں

[چین کا] بادشاہ دوستی میں اس کی طرف مائل ہو گیا۔
اس نے شفقت سے شہزادے سے کہا:
آپ کا یہ ساتھی ہر خادم کا فخر ہے۔
اس کا کوئی رغبت اور دل کی خواہش نہیں ہے سوائے اس کے کہ وہ تیری خدمت کرے
وہ آپ کی سوچ میں اتنا مگن ہے کہ وہ دنیا کی ہر چیز سے محروم ہو گیا ہے۔
اس جیسے شخص کو انعام دینا ضروری ہے
وہ جو اپنی نچلی نفس کی خواہشات کو ختم کرتا ہے۔
جس نے تیری خواہش میں اپنی خواہش کھو دی ہے
ایسے شخص کو بہت زیادہ انعام دیا جانا چاہیے۔
شہزادے نے اس کے پاؤں چومتے ہوئے کہا:
جو کچھ ہم سے پوشیدہ ہے وہ تمہیں کھلا واضح ہے
جب آپ کی کمپنی کو تلاش کرنے کی امید میں
میں نے اپنے سفر پر جانے کے لئے اپنا وطن چھوڑ دیا۔
یہ شخص جو اپنے ملک کا بہت کامیاب بادشاہ تھا۔
ہماری کمپنی کو اپنانے میں سرگرمی کا مظاہرہ کیا۔
اس نے ہماری خاطر اپنا ملک اور دولت چھوڑ دی
ہمارے لیے متحد اور غیر متزلزل حمایت میں، انہوں نے اپنے دل میں جھنڈا بلند کیا۔
ہماری وجہ سے انہوں نے بہت سے نشیب و فراز برداشت کیے
وہ اپنا ملک چھوڑ کر ہمارے دوست بن گئے۔
آپ کی مہربانی کا ایک مطالبہ ہے
یہ سخاوت اور رحم کی جگہ ہے۔
بادشاہ نے کہا کہ وہ اسے ایک اور ملک دے گا
اسے اس طرح عطا کیا جائے گا جو اس کے مرتبے کے مطابق ہو۔
بادشاہ نے اسے پہلے کے اندازے سے زیادہ قلعے اور ممالک عطا کیے
تیسرے شہزادے کی خاطر اس کے لئے باہر لایا گیا۔
جو کچھ اس کی آنکھوں نے نہیں دیکھا تھا وہ اس پر پہنچا دیا گیا تھا
جو کچھ اس کے کانوں نے نہیں سنا تھا وہ اس کے سامنے رکھا گیا۔
وہ چوتھا شخص بھی اپنے مقصد تک پہنچ گیا

وکیل کے ساتھ ایک مؤکل کی طرح، میزبان کے ساتھ مہمان کی طرح

اس امیر صاحب نے فرمایا: یہ ایسی قوم ہے کہ ان کا ساتھی بھی محروم نہیں رہتا[111]۔

دلوں کو برقرار رکھنا اور دوسروں کی خدمت کرنا

آپ کو ایک ایسا شخص بناتا ہے جس کی خدمت کی جاتی ہے اور آپ کو کامیابی ملتی ہے۔

خاص طور پر خدا کے لوگوں کی خدمت کرنا [جو واقعی اپنے آپ کو اس کے لیے وقف کرتے ہیں]

آپ کو اللہ کی عمدہ قبولیت عطا کرتا ہے اور تمہیں اللہ کے قریب لاتا ہے۔

وہ شخص جو ان لوگوں سے قربت حاصل کرتا ہے جنہوں نے خدا کا قرب حاصل کیا ہے

ایسے شخص پر خدا کی مہربانی خدا کے متعلقین کے ہاتھوں سے خرچ کی جاتی ہے۔

وہ شخص جو ان لوگوں سے قربت حاصل کرتا ہے جنہوں نے خدا کا قرب حاصل کیا ہے

اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور احسان کا مستحق ہو جاتا ہے۔

وہ شخص جس نے خدا کے دوستوں اور مقربوں پر مہربانی کا مظاہرہ کیا

ان کی خدمت میں مستعد ہو گئے۔

خدا کی نعمتوں کے مستحق بن گئے

ایسا شخص خدائی حمایت اور مدد کا وصول کنندہ بن گیا۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے:

اے پرہیزگار! ایک ان لوگوں کے ساتھ ہو گا جن سے وہ محبت کرتا ہے۔

جس نے کسی قوم سے محبت کی وہ اس قوم سے شمار ہوتا ہے

خدا کے دوستوں اور مقربوں کی محبت روح کا نور بن جاتی ہے۔

صرف خدا کی خاطر محبت اور ناپسندیدگی کو اپنے وجود کا حصہ بنائیں

تاکہ آپ محبوب کے دروازے پر قبولیت حاصل کریں۔

جب ان کے ساتھی بادشاہ کے پاس روحانی کشمکش نہیں تھی

پاکیزہ لوگوں کی محبت نے اس کی راہ پر چراغ ڈال دیا۔

جس کے پاس روحانی کوششیں، صلاحیت اور کوششیں نہیں تھیں

روحانی راستے کے لوگوں کا ساتھ رکھنا ان کی مدد کے لیے آیا اور بس۔

کوشش کرو کہ تم خود خدا کی قبولیت حاصل کرو

یا ان لوگوں سے وابستہ ہو جاؤ جو خدا نے قبول کیے ہیں۔

---

[111] نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک نبی روایت میں ارشاد ہے: خدا کے دوست اور مقرب وہ لوگ ہیں کہ جو شخص ان کی صحبت اختیار کرتا ہے وہ (روحانی راہ کے فائدے) سے محروم نہیں رہتا۔

یا تو [روحانی] راستے پر بھٹک جاؤ یا راستے کی جدوجہد کرنے والوں کے گرد گھومتے رہو

اس انوکھے انسان کی طرف سے آپ کے پاس چھوٹے بڑے خزانے آئیں گے۔

اے جان! اگر آپ ان دونوں میں سے ایک میں شامل نہیں ہیں

تم قیامت کے دن ذلیل ہو کر اٹھو گے

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا:

ہدایت کے معاملے میں آپ کو خود اس کا ذریعہ تلاش کرنا چاہیے۔

کس نے بغیر کسی ٹرینر کے پھل کو محفوظ کیا ہے [جس نے اسے پہلی جگہ پر بنانے کا طریقہ سکھایا]؟

مجھے بتائیں کہ پروں کے بغیر پرندہ کیسے اڑ سکتا ہے؟

[انسانی زندگی] کا جنگل خون، پھنسنے اور [وحشی] جنگلی درندوں سے بھرا ہوا ہے

ہر سمت میں گمراہی کا راستہ کھلا ہے۔

جنگل سانپوں سے بھرا ہوا ہے اور ہر طرف ہریالی ہے

اس پر قدم نہ رکھو اس کی مدد کے بغیر جو حفاظت کے جادوئی الفاظ پڑھتا ہے، ورنہ تم پریشان ہو جاؤ گے اور ناکام ہو جاؤ گے۔

یہ دنیا سرسبز و شاداب زمین ہے اور نچلی بنیاد نفس (*نفس*) سانپ ہے

خدا کے راستے کے بارے میں سوچیں کہ جنگل خطرات سے گھرا ہوا ہے۔

اگر سانپ آپ کو کاٹتا ہے تو ، آپ ٹوٹ جائیں گے اور پچھتاوا ہوجائیں گے

آپ جادوئی الفاظ کے پڑھنے والے کے بغیر مطمئن ہیں، آپ بے وقوف ہیں۔

اگر تیرے دل کے پاؤں کانٹے سے ٹکرا جائیں

سوئی کی نوک کے بغیر ، آپ اسے کیسے نکالیں گے؟

سوئی کی نوک کے بارے میں فکر کریں، جادوئی الفاظ حفظ کریں

ایک [کامل روحانی] رہنما تلاش کریں تاکہ آپ [بغیر کسی مشکل اور کسی غلطی کے گرنے] مشکل راستے پر چل سکیں۔

جنگل کانٹوں سے بھرا ہوا ہے اور چاروں سمتوں میں راستے ہیں

دیکھو، ہر قدم پر گڑھے ہیں.

جنگل خوفناک ہے اور ڈاکو اس میں چھپے ہوئے ہیں

ایک [کامل روحانی] رہنما تلاش کریں اور ایسے کی پیروی کریں۔

[روحانی] راستہ بہت مشکل ہے اور ہر جگہ وہ تیز قدموں والی غیر معمولی ہستی (شیطان) موجود ہے

جو راستے میں سینکڑوں ہارپ اور تنبورین بجا رہا ہے [تاکہ آپ کو راہ الٰہی سے دور کیا جا سکے]۔

راستہ مشکل ہے اور آپ کے سامنے ایک اندھیری رات ہے

اگر آپ نے کسی کا ہاتھ نہیں پکڑا تو آپ چلے جائیں گے۔

اے محبوب! اس معاملے کی وسعت کی کوئی انتہا نہیں ہے

"*مثنوی*" کو اب ختم کیا جانا چاہیے۔

اے بچے! خدا کے کاموں کا کوئی انتہا نہیں ہے

"*مثنوی*" کو ختم کیا جائے۔

"گہرے روحانی معانی کے دوہے" کی تکمیل

اب مولوی (رومی) سے ملنے والے روحانی اوقاف سے ہوا ہے اور ان سے منسوب کیا گیا ہے - گنوسٹک پار ایکسیلنس۔

اختتامی آیات

جو سچائی کی تلاش کرتا ہے وہ سچائی میں غرق ہو جاتا ہے اور اس کا مجسمہ بن جاتا ہے

ایسا ہی الٰہی مہربانی کا مجسمہ ہے اور الٰہی ہوا ہے۔

شیطانی برے کام نہ کرو اور شیطان نہ بنو

کسی کی روح کی خاک پر پانی ڈال دو [تاکہ اسے پاک اور پاک کیا جائے]۔

اپنا وقت حق کے سوا کسی اور چیز میں ضائع نہ کرو [اور اس روحانی راستے پر جو تمہیں اس کی طرف لے جاتا ہے]

اپنا پیٹ نہ بھرو اور اپنی روح کو بھوکا نہ رہنے دو۔

اس کے سوا کسی اور کی تصویر (تیرے دل میں) حق سے تیرا پردہ ہے

جو کچھ بھی ہے اس میں اس کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔

وہ بن جاؤ جو خدا کے وجود میں فنا ہو جاتا ہے [ادنیٰ نفس کی صفات سے چھٹکارا حاصل کرکے]، تب تم خدا کی طرف سے رزق حاصل کرو گے – ایک ایسی زندگی جو ابدی ہے اور کسی انجام کے تابع نہیں ہے

صبح کا پروردگار تمہاری روح میں ظاہر ہو گا۔

چھ جلدوں میں "*مثنوی*" کی ایک آواز ہے

اس کا جوہر خدا کے وجود (فانا) میں فنا کے سمندر میں غوطہ *لگانا* ہے۔

اگر تم اللہ کی راہ تلاش کر رہے ہو تو ہوشیار ہو جاؤ

اپنے اندر سے غفلت اور لاپرواہی کو دور کرو، جاگ جاؤ۔

سب سے پہلے الہی شریعت پر ثابت قدم رہو [اپنی ظاہری زندگی کو عبادت کے اعمال اور ساتھی انسانوں کے ساتھ اچھے سلوک کے ساتھ الٰہی احکامات کے ساتھ چلانا]

پھر روح کی اصلاح اور پاک کرنے کی کوششوں اور کوششوں کے ذریعے روحانی راستے پر چلیں۔

پہلے قدم میں ، اپنے پاؤں الہی قانون پر قائم رکھیں

اس کے بعد روحانی جدوجہد کے راستے پر چلیں۔

روح کو "طریقت" کے *ذریعے آراستہ* کرنا (خوبصورت باطنی صفات کے حصول کے لیے روحانی جدوجہد کا راستہ، روح کو اس کی تمام گھٹیا اور گھناؤنی صفات، عیبوں، عیبوں، منفی اور برے رجحانات سے پاک کرنا ضروری ہے

تاکہ آپ علم الٰہی، قربت، قربت اور علم (معارفہ) کے سمندر کو کامیابی سے عبور کر سکیں۔

اس معاملے کا کبھی خاتمہ نہیں ہوگا [اس کی وسعت، اہمیت اور تمام انسانیت کو حقیقی امن، ابدی خوشی اور لازوال کامیابی دینے میں اس کی وسعت، اہمیت اور مطابقت کی وجہ سے]

لہذا، مجھے تقریر کو مختصر بنانا چاہیے [اور یہاں *"متھنوی"* کو ختم کرنا چاہیے]۔ اللہ تعالیٰ تم پر سلام نازل فرمائے![112]

[112] اس موقع پر مولانا الٰہی بخش کانڈیہلوی کے اختتام کے بعد رومی کا عظیم شاہکار *"متھنوی"* یا "گہرے روحانی معانی کے دوہے" ختم ہو گیا ہے۔

اخیر

انسانی وجود کی بنیاد ہماری زندگیوں میں تمام منفی اور مثبتیت ، خوشی اور غم ، مصائب اور آسایش ، کامیابی اور ناکامی ، تنگی اور وسعت ، اور اندھیرے اور روشنی کا محور اور اصل ہے۔ اس کور کو انسان کا "دل" یا "روح" کہا جاتا ہے جسے ایک شدید اندرونی روحانی جدوجہد کے ذریعے تبدیلی کی ضرورت ہے تاکہ یہ لچک، مثبتیت، رجائیت، اندرونی سکون، سکون، خوشی، ابدی خوشی اور لامتناہی فتح کو جنم دے۔ یہ مقالہ، جو پوری انسانی تہذیب کے بہترین علمبرداروں میں سے ایک کی لازوال حکمت پر مبنی ہے، انسانی وجود کے مرکز میں موجود تمام رکاوٹوں کو منظم طریقے سے لچک، مثبتیت، رجائیت، اندرونی امن، سکون اور خوشی کے حصول کی طرف تیار کرتا ہے اور انسان کو ابدی خوشی اور اضطراب کے اس دور میں لامتناہی فتح کی شکل میں انسانی کامیابی کی چوٹی تک پہنچنے کی طرف لے جاتا ہے۔ ہنگامہ آرائی ، اور ہنگامہ آرائی۔

آس پاس کی دنیا میں رونما ہونے والے واقعات پریشان کن لگتے ہیں۔ تاہم ، ہم مختلف حالات پر اپنے ردعمل کو متاثر کرسکتے ہیں جن میں ہم اپنے آپ کو پاتے ہیں ، چاہے وہ ذاتی ہوں یا اجتماعی۔ ہم میں سے ہر ایک اپنے اندرونی روحانی وسائل کے ذخائر میں گہرائی میں گہرائی میں کھینچ کر ان سے مثبت طور پر نمٹنے کا انتخاب کرسکتا ہے ، اور ان کو اور اپنے انوکھے حالات اور چیلنجوں کا استعمال کرتے ہوئے ، اپنے آپ کو مثبت طور پر تبدیل کرنے کے لئے۔ یہ روحانی تبدیلی تمام منفی چیزوں کو مکمل طور پر ختم کرنے اور ان کی مختلف شکلوں میں تمام مثبت چیزوں کو متاثر کرنے کو یقینی بنائے گی، افراد میں سے بہترین کو سامنے لائے گی، جو اس کے بعد اپنی زندگی کے چیلنجوں سے مؤثر طریقے سے نمٹنے کے قابل ہوں گے۔ یہ داخلی تبدیلی ہماری حقیقی صلاحیت کو ظاہر کرتی ہے جو بدلے میں ہمارے ارد گرد ایک مثبت تبدیلی لاتی ہے۔ پہلے اس طرح سے اپنی مدد کرنا ، آخر میں دوسروں کی مدد کرتا ہے اور جب افراد کی اندرونی روشنی اور روشنی تیز ہوجاتی ہے تو ، یہ آس پاس کی ہنگامہ خیز دنیا میں نیکی کے لئے ایک ناقابل تسخیر قوت بن جاتی ہے۔ تاہم ، ایک ہزار میل کا سفر کہیں سے شروع ہونے کی ضرورت ہے اور یہی وہ ایک قدم ہے جو آپ کو اپنی خود شناسی ، اپنی زندگی کے حقیقی مقصد کے حصول ، اور اس کے نتیجے میں ابدی خوشی اور ابدی فتح حاصل کرنے کے لئے اٹھانے کی ضرورت ہے۔ یہ کتاب ہر متلاشی حق کو خود شناسی کی راہ پر گامزن کرے گی۔ آپ کی طرف سے ایک قدم کی ضرورت مثبت تبدیلی کی آپ کی خواہش ہے اور اس مقصد کے لئے ، آپ کو پہلے سے نامعلوم پانیوں کو تلاش کرنے کے لئے کھلے دل اور دماغ لانے کی ضرورت ہوگی۔ جو بھی ایسا کرنے کا انتخاب کرے گا ، اس کے نتائج سے خوش ہوگا۔

خدا کرے کہ آپ ابدی سچائیوں کے اس بے پناہ سمندر کے طوفانی پانیوں میں سفر کرتے ہوئے، حقیقی خود شناسی کی طرف اپنے سفر میں، زندگی کے حقیقی مقصد کے حصول، اور اس کے نتیجے

میں ابدی زندگی کی ابدی خوشی اور ابدی کامیابی کی طرف سفر میں، انسان کو لافانی بناتے ہوئے خدائی طور پر محفوظ اور رہنمائی حاصل کریں۔

مزید مطالعہ کے لیے تجویز کردہ کتابیں

اس مقالے میں زندگی کے حقیقی مقصد اور اس کے حصول کے راستے کو مختصر طور پر بیان کیا گیا ہے ، جس کے نتیجے میں ہماری پریشانی ، ہنگامہ آرائی یا انتشار کی حالت سے قطع نظر لچک ، مثبتیت ، امید ، اندرونی امن ، سکون ، خوشی ، ابدی خوشی ، اور لامتناہی کامیابی کا باعث بنتا ہے۔ اس موضوع کی وسعت اور شدت اس قدر ہے کہ پچھلی صدیوں میں ابدی حقیقتوں یا گنوسٹکس کے عظیم جاننے والوں نے اس کی وضاحت کرنے اور انسانیت کی راہ کو روشن کرنے کے لیے جلدیں لکھی ہیں۔ اس مقالے میں اس علم کے عظیم علموں میں سے ایک محمد الغزالی رحمۃ اللہ علیہ کی روحانیت اور روشن تحریروں کی روشنی میں اس کی وسعت کی جھلک پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس موضوع پر کچھ عظیم ترین کاموں کی فہرست دینا انتہائی اہمیت کا حامل ہے جو سب کے لیے انتہائی اہمیت اور فائدہ مند ہیں، جن سے تمام سچائی کے متلاشی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس مقام پر یہ پوچھنا مناسب ہے کہ "انسان زندگی کے مقصد اور ابدی خوشی اور لامتناہی کامیابی کے حصول کے طریقوں کا متعلقہ علم کہاں سے حاصل کر سکتا ہے تاکہ جو اس پر چلنا چاہتا ہے اس کے لیے راستہ واضح اور روشن اور وسیع ہو جائے اور اس علم پر عمل کرنے سے وہ اپنی زندگی کے مقصد تک پہنچ سکتا ہے اور اس طرح ابدی خوشی اور لامتناہی کامیابی کی کیفیت میں غرق ہو سکتا ہے؟" خوش قسمتی سے ، یہ عظیم علم ، اگرچہ آج کل بہت کم جانا جاتا ہے ، ہر اس شخص کے لئے دستیاب ہے جو اس سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ یہ مندرجہ ذیل تجویز کردہ حیرت انگیز تصانیف سے حاصل کیا جا سکتا ہے جو حق کے تمام مخلص متلاشیوں کے لیے راہ روشن کرتے ہیں:

1. قرآن مجید کے دس مقاصد کی روشنی میں قرآن مجید کا گہرائی سے مطالعہ کرتے ہوئے غزالی نے اپنی کتاب "*جواہر القرآن*" یا "جواہرات قرآن" میں بیان کیا ہے۔ ان دس مقاصد کا مطالعہ، ان کو سمجھنے اور ان کو اندرونی بنانے اور ان دس مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے قرآن کا مطالعہ کرنے سے فہم اور باطنی روحانی روشنی کے نئے راستے کھلیں گے۔
2. غزالی کی کتاب "*منہاج العابدین الا جنت رب* العالمین" یا "خدا کے عبادت کرنے والوں کے لیے بہترین راستہ" یا مختصر عنوان "عبادت گزاروں کے لیے بہترین راستہ"۔ اس کتاب میں زندگی کے مقصد اور ابدی خوشی اور لامتناہی کامیابی کے حصول کے راستے کو مختصرا بیان کیا گیا ہے۔
3. غزالی کی کتاب "*کیمیا سعادت*" (یا "*کیمیا السعدہ*") کا قابل ذکر تعارف جو انہوں نے فارسی زبان میں لکھا ہے یا "ابدی خوشی اور لامتناہی کامیابی کی کیمیا"، جو انسان کی ابدی خوشی، لافانیت اور حقیقی کامیابی کی وضاحت کرتا ہے۔ اس کتاب کا بقیہ حصہ بھی پڑھا جاسکتا ہے تاکہ مختصر طور پر چالیس مراحل کو جاننے کے لئے ، جو اس راستے پر آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔ اس کتاب کا قابل ذکر تعارف اس مقالے کے پہلے حصے میں نمایاں طور پر پیش کیا گیا ہے۔

4. غزالی کی چار جلدوں پر مشتمل حکمت کا مجموعہ "*احیاء العلوم الدین*" یا "خدا کی راہ کی احیاء" کے نام سے جانا جاتا ہے جسے "مذہبی علوم کا احیاء" بھی کہا جاتا ہے۔ یہ عظیم کتاب چالیس مختصر کتابوں میں منقسم ہے - ہر ایک روحانی راستے میں ایک قدم کی نمائندگی کرتی ہے، انسانی زندگی کے مقصد اور ابدی خوشی کے حصول کے راستے کی تفصیلی وضاحت پیش کرتی ہے۔ اس حیرت انگیز کتاب کی تیسری اور چوتھی جلدیں اس مقالے کے دوسرے اور تیسرے حصوں میں بہت زیادہ استعمال کی گئی ہیں۔
5. آخری لیکن کم از کم یہ ہے کہ مشرق اور مغرب دونوں کے سب سے زیادہ فروخت ہونے والے شاعر مولانا جلال الدین رومی، جو "رومی" کے نام سے مشہور ہیں، نے الہامی عرفان اور الہامی محبت پر پوری انسانی تاریخ کی سب سے بڑی شاعری لکھی، جسے "*مثنوی معنوی*" یا "گہرے روحانی معانی کے دوہیں" کہا جاتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے لئے اچھے ترجمے اور علمی وضاحت کے ساتھ اس کا مطالعہ کرنے کی سفارش کی جاتی ہے۔ یہ شاندار کتاب قرآن مجید کی گہری باطنی حکمت کو سامنے لاتی ہے۔ اس کی مدد سے انسان اپنی زندگی کا مقصد حاصل کر سکتا ہے اور اس کے نتیجے میں ابدی خوشی اور لامتناہی کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ اس حیرت انگیز کتاب کے اختتام نے اس مقالے کے آخری حصے کو سجایا ہے۔

تجویز کردہ کتابوں کی فہرست بہت بڑی ہوسکتی ہے ، کیونکہ حکمت کے لازوال خزانے ، جو ابدی خوشی کے آقاؤں کے پیچھے چھوڑے گئے ہیں - گنوسٹک یا ابدی سچائیوں اور الہی حکمت کے جاننے والوں - بہت زیادہ ہیں۔ تاہم ، ایک ہزار میل کا سفر کہیں سے شروع ہونے کی ضرورت ہے اور یہ مختصر فہرست ، ابدی خوشی اور لامتناہی کامیابی کی تلاش کے لئے اس عظیم سفر کا نقطہ آغاز اور اختتام دونوں ہوگی۔ درج ذیل کتابیں کسی کو ابدی سچائیوں کے اس بے پناہ سمندر کے طوفانی پانیوں میں ، کسی کو اندرونی روشنی، خود شناسی اور زندگی کے حقیقی مقصد کے حصول اور اس کے نتیجے میں ابدی خوشی اور ابدی فتح کے سفر میں مدد کریں گی:

تفسیر التستری (قرآن کریم کی عظیم تفاسیر) از سہل بن عبد اللہ التستری (مصنف)، یوسف میری (مدیر)، انابیل کیلر (مترجم)، علی کیلر (مترجم)

ناشر: فونس ویٹا (13 اپریل ، 2011)

آئی ایس بی این -10: 1891785192؛ آئی ایس بی این -13: 978-1891785191

منتخب آیات کی قرآن مجید کی یہ تفسیر وحی الٰہی کے گہرے معانی میں جاتی ہے اور اس کے اندر موجود جواہرات کو سامنے لاتی ہے۔

قرآن کا پیغام: محمد اسد (مدیر، مترجم) کی طرف سے متوازی ترجمہ کے ساتھ عربی متن کا مکمل بیان

ناشر: دی بک فاؤنڈیشن؛ ترمیم شدہ ایڈیشن (1 دسمبر 2008)

آئی ایس بی این -10: 1904510353؛ آئی ایس بی این -13: 978-1904510352

یہ قرآن مجید کی مکمل تفسیر یا تفسیر ہے۔

امام غزالی کی طرف سے پروردگار العالمین (منہاج العابدین) کے باغ تک عبادت گزاروں کا راستہ

ناشر: الباز پبلشنگ یو ایس اے (2011)

آئی ایس بی این -10: 1882216261؛ آئی ایس بی این -13: 978-1882216260

امام غزالی کی آخری کتاب روحانی کمال اور نور کے لیے سات قدمی راستے کا خاکہ پیش کرتی ہے۔

الغزالی کیمیا از خوشی 2 جلد ترتیب دیا گیا ہے از امام محمد الغزالی (مصنف)، جے آر کروک (مترجم)، لیلہ بختیار (تعارف)

ناشر: قاضی پبلی کیشنز ، انکارپوریٹڈ (1 جنوری ، 2007)

آئی ایس بی این -10: 1567446744؛ آئی ایس بی این -13: 978-1567446746

امام غزالی کی شاہکار "*کیمیا سعادت*" ابدی خوشی اور لامتناہی کامیابی کے تبدیلی کے ایجنٹ کا خاکہ پیش کرتی ہے۔

علوم دین کا احیاء (احیاء العلوم الدین) 4 جلد از امام محمد الغزالی (مصنف)، محمد مہدی الشریف (مترجم)

ناشر: دار القطب العلمیہ، بیروت، لبنان (2011)

ایس کے یو 1010021؛ آئی ایس بی این: 9782745159458

http://jamalon.com/en/1010021.html

امام غزالی علیہ السلام کی چار جلدوں پر مشتمل حکمت کا مجموعہ روحانی راہ کے ہر پہلو کو بیان کرتا ہے جس سے زندگی کے مقصد کے حصول اور اس کے نتیجے میں ابدی خوشی اور لامتناہی کامیابی حاصل ہوتی ہے۔

مثنوی (6 جلدیں) از مولانا جلال الدین رومی۔ آر اے نکلسن (مترجم)

http://www.dar-al-masnavi.org/about_nicholson.html

امریکہ میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والے شاعر رومی کی کتاب "*مثنوی معنوی*" یا "گہرے روحانی معانی کے دوہیں" چھ جلدوں پر مشتمل ایک شاندار کتاب ہے جس میں قرآن کی گہری باطنی حکمت، کسی کی زندگی کے گہرے معنی اور مقصد اور اس کے نتیجے میں ابدی خوشی اور لامتناہی کامیابی کو سامنے لایا گیا ہے۔ یہ روحانی گرو کی طرف سے Gnosis اور الہی محبت پر لکھی گئی اب تک کی بہترین روحانی شاعری ہے جو آنے والے تمام وقتوں کے لیے پوری انسانیت کے لیے رہنمائی کرنے والی روشنی ہے، الہی محبت کے بے پناہ سمندر میں ڈوب گیا ہے، ڈوب گیا ہے۔

کتابیات

[1] الغزالی، محمد۔ اردو ترجمہ: نقشبندی، محمد سعید۔*کیمیا* سعادت (کیمیا یا ابدی خوشی اور لامتناہی کامیابی کے لئے تبدیلی کا ایجنٹ)۔ لاہور، پاکستان: پروگریسو بکس، 1999۔ صفحہ 33-37۔ *اردو سے انگریزی ترجمہ اور مرتب کرنے والے کے ذریعہ انتخاب۔*

[2] الغزالی، محمد۔ انگریزی ترجمہ: بلال محمد عاصم۔*کیمیا سعادت* (ابدی نعمت کی کیمیا)۔ لاہور، پاکستان: قاضی پبلیکیشنز، 2001۔ پی پی 1-47۔*کمپائلر کے ذریعہ مختصر اور وضاحت کی گئی۔*

[3] الغزالی، محمد۔ انگریزی ترجمہ: بلال محمد عاصم۔*کیمیا سعادت* (ابدی نعمت کی کیمیا)۔ لاہور، پاکستان: قاضی پبلیکیشنز، 2001۔ صفحہ 48-68۔*کمپائلر کے ذریعہ مختصر اور وضاحت کی گئی۔*

[4] الغزالی، محمد۔ انگریزی ترجمہ: بلال محمد عاصم۔*کیمیا سعادت* (ابدی نعمت کی کیمیا)۔ لاہور، پاکستان: قاضی پبلیکیشنز، 2001۔ صفحہ 77-90۔*کمپائلر کے ذریعہ مختصر اور وضاحت کی گئی۔*

[5] الغزالی، محمد۔ انگریزی ترجمہ: بلال محمد عاصم۔*کیمیا سعادت* (ابدی نعمت کی کیمیا)۔ لاہور، پاکستان: قاضی پبلیکیشنز، 2001۔ پی پی 91-140۔*کمپائلر کے ذریعہ مختصر اور وضاحت کی گئی۔*

[6] الغزالی، محمد۔ انگریزی ترجمہ: بلال محمد عاصم۔*کیمیا سعادت* (ابدی نعمت کی کیمیا)۔ لاہور، پاکستان: قاضی پبلیکیشنز، 2001۔ پی پی 141-142۔*کمپائلر کے ذریعہ مختصر اور وضاحت کی گئی۔*

[7] الغزالی، محمد۔ اردو ترجمہ: الواجدی، ندیم۔*احیاء العلوم الدین* (خدا کی راہ کا احیاء) کراچی، پاکستان: دارالاشت، 1999۔ جلد 3 کتاب 1 ، صفحات 16-34 ، 38-43 ، 51-87۔ *اردو سے انگریزی ترجمہ اور مرتب کرنے والے کے ذریعہ انتخاب۔*

[8] الغزالی، محمد۔ اردو ترجمہ: الواجدی، ندیم۔*احیاء العلوم الدین* (خدا کی راہ کا احیاء) کراچی، پاکستان: دارالاشت، 1999۔ جلد 3 کتاب 2 ، صفحہ 87-133 *اردو سے انگریزی ترجمہ اور مرتب کرنے والے کے ذریعہ انتخاب۔*

[9] الغزالی، محمد۔ اردو ترجمہ: الواجدی، ندیم۔*احیاء العلوم الدین* (خدا کی راہ کا احیاء) کراچی، پاکستان: دارالاشت، 1999۔ جلد 3 کتاب 3 ، صفحات 133-135 ، 137 ، 139-147 ، 157 ، 158 ، 160-164 ، 172۔ *اردو سے انگریزی ترجمہ اور مرتب کرنے والے کے ذریعہ انتخاب۔*

[10] الغزالی، محمد۔ اردو ترجمہ: الواجدی، ندیم۔ *احیاء العلوم الدین* (خدا کی راہ کا احیاء) کراچی، پاکستان: دارالاشت، 1999۔ جلد 3 کتاب 4 ، صفحہ 174-258 سے انتخاب۔ *اردو سے انگریزی ترجمہ اور مرتب کرنے والے کے ذریعہ انتخاب۔*

[11] الغزالی، محمد۔ اردو ترجمہ: الواجدی، ندیم۔ *احیاء العلوم الدین* (خدا کی راہ کا احیاء) کراچی، پاکستان: دارالاشت، 1999۔ جلد 3 کتاب 5 ، صفحات 258-260 ، 262-264 ، 266 ، 268-269 ، 271-274 ، 277-279 ، 284-287 ، 291-292 ، 294-299 ، 302-314۔ *اردو سے انگریزی ترجمہ اور مرتب کرنے والے کے ذریعہ انتخاب۔*

[12] الغزالی، محمد۔ اردو ترجمہ: الواجدی، ندیم۔ *احیاء العلوم الدین* (خدا کی راہ کا احیاء) کراچی، پاکستان: دارالاشت، 1999۔ جلد 3 کتاب 6 ، صفحات 361-364 ، 319-320 ، 323-324 ، 326-327 ، 333 ، 340 ، 342 ، 344-348 ، 352-356 ، 358-361۔ *اردو سے انگریزی ترجمہ اور مرتب کرنے والے کے ذریعہ انتخاب۔*

[13] الغزالی، محمد۔ اردو ترجمہ: الواجدی، ندیم۔ *احیاء العلوم الدین* (خدا کی راہ کا احیاء) کراچی، پاکستان: دارالاشت، 1999۔ جلد 3 کتاب 7 ، صفحات 361-364 ، 367-371 ، 373 ، 375 ، 377-382 ، 383 ، 392-397 ، 399-401 ، 403 ، 405-410 ، 418 ، 423۔ *اردو سے انگریزی ترجمہ اور مرتب کرنے والے کے ذریعہ انتخاب۔*

[14] الغزالی، محمد۔ اردو ترجمہ: الواجدی، ندیم۔ *احیاء العلوم الدین* (خدا کی راہ کا احیاء) کراچی، پاکستان: دارالاشت، 1999۔ جلد 3 کتاب 8 ، صفحات 425-426 ، 430-435 ، 438 ، 442-449 ، 451-452۔ *اردو سے انگریزی ترجمہ اور مرتب کرنے والے کے ذریعہ انتخاب۔*

[15] الغزالی، محمد۔ اردو ترجمہ: الواجدی، ندیم۔ *احیاء العلوم الدین* (خدا کی راہ کا احیاء) کراچی، پاکستان: دارالاشت، 1999۔ جلد 3 کتاب 9 ، پی پی 452-456 ، 457-460 ، 475-480 ، 502-507 ، 512۔ *اردو سے انگریزی ترجمہ اور مرتب کرنے والے کے ذریعہ انتخاب۔*

[16] الغزالی، محمد۔ اردو ترجمہ: الواجدی، ندیم۔ *احیاء العلوم الدین* (خدا کی راہ کا احیاء) کراچی، پاکستان: دارالاشت، 1999۔ جلد 3 کتاب 10 ، صفحات 513-520 ، 522-534 ، 536-541 ، 544-559 ، 561-577 ، 627-629۔ *اردو سے انگریزی ترجمہ اور مرتب کرنے والے کے ذریعہ انتخاب۔*

[17] الغزالی، محمد۔ اردو ترجمہ: الواجدی، ندیم۔ *احیاء العلوم الدین* (خدا کی راہ کا احیاء) کراچی، پاکستان: دارالاشت، 1999۔ جلد 4 کتاب 1 ، صفحہ 17-18 ، 21 ، 27 ، 29 ، 33 ، 37-38 ، 41 ، 56 ، 60-64 ، 75 ، 85 ، 88 ، 90 ، 99 ، 101-103۔ *اردو سے انگریزی ترجمہ اور مرتب کرنے والے کے ذریعہ انتخاب۔*

[18] الغزالی، محمد۔ اردو ترجمہ: الواجدی، ندیم۔ *احیاء العلوم الدین* (خدا کی راہ کا احیاء) کراچی، پاکستان: دارالاشت، 1999۔ جلد 4 کتاب 2 ، صفحات 104-108 ، 113 ، 118 ، 126-129 ، 130 ، 133 ، 136-139 ، 141 ، 142 ، 144-145 ، 148 ، 165-

167 ، 170-169 ، 179-177 ، 189-188 ، 201 ، 202 ، 205-204 ، 209 ، 212-211 ، 227۔ *اردو سے انگریزی ترجمہ اور مرتب کرنے والے کے ذریعہ انتخاب۔*

[19] الغزالی، محمد۔ اردو ترجمہ: الواجدی، ندیم۔ *احیاء العلوم الدین* (خدا کی راہ کا احیاء) کراچی، پاکستان: دارالاشت، 1999۔ جلد 4 کتاب 3 ، صفحہ 234-228 ، 247-245 ، 251 ، 253 ، 262-258 ، 271-270 ، 277-274 ، 290-288۔ *اردو سے انگریزی ترجمہ اور مرتب کرنے والے کے ذریعہ انتخاب۔*

[20] الغزالی، محمد۔ اردو ترجمہ: الواجدی، ندیم۔ *احیاء العلوم الدین* (خدا کی راہ کا احیاء) کراچی، پاکستان: دارالاشت، 1999۔ جلد 4 کتاب 4 ، صفحات 297-290 ، 303-302 ، 307-306 ، 312-311 ، 331-328 ، 335-333 ، 340-339 ، 349 ، 351 ، 355 ، 357 ، 359 ، 360۔ *اردو سے انگریزی ترجمہ اور مرتب کرنے والے کے ذریعہ انتخاب۔*

[21] الغزالی، محمد۔ اردو ترجمہ: الواجدی، ندیم۔ *احیاء العلوم الدین* (خدا کی راہ کا احیاء) کراچی، پاکستان: دارالاشت، 1999۔ جلد 4 کتاب 5 ، صفحات 380-366 ، 395-391 ، 405-404 ، 438-437۔ *اردو سے انگریزی ترجمہ اور مرتب کرنے والے کے ذریعہ انتخاب۔*

[22] الغزالی، محمد۔ اردو ترجمہ: الواجدی، ندیم۔ *احیاء العلوم الدین* (خدا کی راہ کا احیاء) کراچی، پاکستان: دارالاشت، 1999۔ جلد 4 کتاب 6 ، صفحات 462-441 ، 470 ، 476-472 ، 486-482 ، 493-492 ، 516 ، 522-521 ، 542-541۔ *اردو سے انگریزی ترجمہ اور مرتب کرنے والے کے ذریعہ انتخاب۔*

[23] الغزالی، محمد۔ اردو ترجمہ: الواجدی، ندیم۔ *احیاء العلوم الدین* (خدا کی راہ کا احیاء) کراچی، پاکستان: دارالاشت، 1999۔ جلد 4 کتاب 7 ، صفحات 550-542 ، 565-563 ، 570-567 ، 573-572 ، 586-577۔ *اردو سے انگریزی ترجمہ اور مرتب کرنے والے کے ذریعہ انتخاب۔*

[24] الغزالی، محمد۔ اردو ترجمہ: الواجدی، ندیم۔ *احیاء العلوم الدین* (خدا کی راہ کا احیاء) کراچی، پاکستان: دارالاشت، 1999۔ جلد 4 کتاب 8 ، صفحات 596-587 ، 605-603 ، 610-606 ، 626-622 ، 632-631۔ *اردو سے انگریزی ترجمہ اور مرتب کرنے والے کے ذریعہ انتخاب۔*

[25] الغزالی، محمد۔ اردو ترجمہ: الواجدی، ندیم۔ *احیاء العلوم الدین* (خدا کی راہ کا احیاء) کراچی، پاکستان: دارالاشت، 1999۔ جلد 4 کتاب 9 ، صفحات 642-632 ، 646-645 ، 666-665۔ *اردو سے انگریزی ترجمہ اور مرتب کرنے والے کے ذریعہ انتخاب۔*

[26] الغزالی، محمد۔ اردو ترجمہ: الواجدی، ندیم۔ *احیاء العلوم الدین* (خدا کی راہ کا احیاء) کراچی، پاکستان: دارالاشت، 1999۔ جلد 4 کتاب 10 ، صفحات 668-666 ، 671-670 ، 681-676 ، 684-683 ، 690-688 ، 750-749 ، 794-789۔ *اردو سے انگریزی ترجمہ اور مرتب کرنے والے کے ذریعہ انتخاب۔*

[27] الغزالی، محمد۔ انگریزی ترجمہ (اردو ترجمہ سے): حسن، عرفان۔ *ایوہل ولد* (میرا پیارا بیٹا یا بیٹی) مجمع *رسا الامام غزالی* (مجموعہ مختصر کتابوں کا مجموعہ) کراچی، پاکستان: دارالاشاعت، 2004۔ جلد 1 ، صفحہ 13-17۔ انگریزی ترجمہ سے لیا گیا: http://www.ghazali.org/books/My%20Dear%20Beloved%20Son.doc

[28] رومی، مولانا جلال الدین محمد۔ اردو ترجمہ: حسین، قاضی سجاد۔ *مثنوی مولوی معنوی* (گہرے روحانی معانی کے دویات) 6 جلدیں۔ لاہور، پاکستان: الفیصل بک پبلشرز؛ شائع کرنے کی تاریخ نامعلوم ہے۔ اردو ترجمہ 1974ء میں مکمل ہوا۔ جلد 6 ، پی پی 342-344 ، 347-363 ، 373-374 ، 381-382 ، 389-391 ، 421-426 ، 441-442 ، 443-460 ، 466-467 ، 472-478 ، 505-506 ، 508-511 ، 520-526 ، 530۔ *اردو سے انگریزی ترجمہ اور مرتب کرنے والے کے ذریعہ انتخاب۔*

ضطراب، ہنگامہ آرائی اور ہنگامہ آرائی کے دور میں لچک، مثبتیت، اندرونی امن، ابدی خوشی اور لامتناہی کامیابی



یہ کتاب بے سہارا لوگوں کے لیے ایک مدد، ان پریشان لوگوں کے لیے ایک مدد ہوگی جن کی حالت ناقابل برداشت ہے، مایوسی، افسردگی، اداسی، مایوسی اور اندرونی خلا کی شکل میں اندرونی مصائب میں ڈوبے ہوئے لوگوں کے لیے راحت کا باعث بنے گی، اندھیروں میں گھرے ہوئے لوگوں کے لیے ایک روشنی، اپنی زندگی کی سچائی، مقصد اور معنی تلاش کرنے والوں کے لیے ایک رہنما ہوگی۔ اور ان لوگوں کے لئے ایک راستہ جو بہتر بننا چاہتے ہیں اور اپنے لئے ، اپنے خاندانوں ، اپنی برادریوں ، اپنی قوموں اور دنیا کے لئے چیزوں کو تبدیل کرنے کے خواہاں ہیں۔